اسلام کی احیائی تحریکیں

اور

عالمِ اسلام

سیّد قاسم محمود

اسلام کی احیائی تحریکیں

اور

عالمِ اسلام

سیّد قاسم محمود

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

297.8 Qasim Mehmood, Syed.
Islam ki Ehyai Tahrikain aur Aalm-e-Islam/
Syed Qasim Mehmood.- Lahore: Al-Faisal
Nashran, 2011.
852p.

1. Tehrik-e-Islam I. Title Card.

ISBN 969-503-829-8

مارچ 2012ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/1200 روپے

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

فہرست مضامین

اسلام کی احیائی تحریکیں اور اسلام

تحریک احیائے اسلام سے متعلق چند اصلاحات کا جائزہ

امتِ مسلمہ کا عروج و زوال

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا زمانہ

جہانگیر کے مذہب کا دوسرا رخ

حضرت مجدد الف ثانیؒ

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا اصلاحی پروگرام

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی قید خانے میں دعوت و تبلیغ

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا زمانہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا حیات نامہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے چند قدر شناس

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تنقیدی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تجدیدی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی معاشی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جماعت

سید احمد شہید کے پہلے پچیس سال

جہادی تحریک کی ضرورت

شاہ عبدالقادرؒ کا حجرہ

سید صاحبؒ کے تبلیغی دوروں کے نتائج

سید احمد شہیدؒ کا سیاسی ماحول

بنگال میں فرائضی تحریک

فرائضی تحریک کا نعرہ حق ”زمین اللہ کی ہے“

تیطومیاں کی تحریک

مسلمانان ہند کی پہلی عوامی تحریک

سیّدؒ کا مرید شاہ

جہاد سے پہلے حج

جہاد کا اعلان نامہ

میدانِ کارزار اور شہادت

تحریکِ جہاد کا اصل مقصد

تحریکِ جہاد کا تنقیدی جائزہ

شاہ ولی اللہ کی تحریک ایک نئے دور میں

سید احمد شہید کی سیاسی فراست

تحریک جہاد کے عقائد ونظریات

سن ستاون میں عام اقتصادی حالت

مغل دربار کے اندرونی حالات

اسباب بغاوتِ ہند

پراسرار روٹیاں اور کنول کا پھول

دس مئی کو طوفان کی آمد

مولوی محمد جعفر تھانیسری

مولانا فضل حق خیر آبادی

حاجی امداد علی مہاجر مکی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی

مولانا محمد قاسم نانوتوی

جنگ آزادی کی شکست کے اسباب

تحریک خدام کعبہ

انڈونیشیا کی احیائی تحریکیں

تحریک آزادی کا آغاز

انڈونیشی مسلمانوں کی پہلی مؤتمر

جمعیۃ المحمدیہ انڈونیشیا کی تجدیدی تحریک

انڈونیشیا کی دینی جماعتیں

"ماشومی" مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا

ملائشیا کے مسلمان

ملائیشیا کی اسلامی تحریکیں

جمال الدین افغانی ایران میں

مفتی محمد عبدہٗ اور تحریک اتحاد اسلامی

سید جمال الدین افغانی کے دستِ راست مفتی محمد عبدہٗ کے شاگردِ خاص سیّد محمد رشید رضا

تحریک اخوان المسلمین کے بانی شیخ حسن البناءؒ شہید

''سیّدات مسلمات'' کی قائد زینب الغزالی

سیّد قطب تختہ دار پر

شیخ عمر تلمسانیؒ

سنوسی تحریک۔ قائدین کا تعارف

سنوسی تحریک کے اثرات

سوڈان کی مہدیہ تحریک

الجزائر: سلطنت عثمانیہ کے بعد

مراکش میں احیائے اسلام کی تحریک

سینیگال میں اسلام

افریقہ کا دیو: نائیجیریا

ترکوں پر اسلام کے اثرات

چند مشاہیر ترکی

ایران میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش

انقلاب اسلامی کے محرکات

بوسنیا و ہرزیگووینا کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت

یورپ میں عثمانی سلاطین کا اسلامی کردار

چیچنیا میں اسلام اور مسلمان

☆......☆......☆

اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام

11 ستمبر 2001ء کو امریکہ کے سربہ فلک ٹریڈ سنٹر کے آناً فاناً تودہ خاک ہونے کے بعد صدر بش کے لاشعور میں بھڑکتی ہوئی ''کروسیڈ'' کی آتش انتقام نے کرۂ ارض پر آباد ہر مسلمان کے قلب وضمیر میں ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ بے شک صدر بش نے دوسرے ہی دن عالمی سیاسی مصلحتوں کے تحت امت مسلمہ سے زبانی کلامی معافی مانگ لی تھی، لیکن اس نے قلباً وعملاً اپنے حواری ملکوں کے تعاون سے دنیائے اسلام کو اپنی جارحانہ عسکریت ومعیشت میں لینے کا دائرہ تنگ کر دیا ہے۔ ''گیارہ ستمبر'' کی شام سے پہلے مسلمانانِ عالم کے خلاف جو شاطرانہ اور خفیہ چالیں پیٹھ پیچھے کی جا رہی تھیں، گیارہ ستمبر کی شب کے بعد وہ خنجر بکف ہو کر عریاں ہو گئیں۔ اس کے ردِ عمل سے مسلمانانِ عالم بھی، جو افیونیوں کی طرح صدیوں سے کرب واضطراب میں، سوچ میں پڑے رہتے تھے، اپنے صدیوں کے طویل خوابِ گراں سے چونکے، اور انہیں اپنی ذات کا شعور ہونے لگا اور دردِ آگہی نے انہیں بیدار کر کے لرزہ براندام کر دیا۔

جغرافیائی حالات:

آیئے ایک دفعہ پھر، ذرا نئی نظر سے، ایک نظر دنیا کے نقشے پر دوڑاتے ہیں۔ انڈونیشیا سے مراکش تک جو وسیع ہلالی حلقہ قائم ہے، وہ زبردست مسلم آبادی ہے۔ مسلم انڈونیشیا بحر الکاہل کے ساحل پر سنتری کی طرح کھڑا ہے تو مسلم مراکش بحر متوسط (بحیرہ روم) کے نکڑ کا پہرے دار ہے، اور آج اگر جبل الطارق مسلمانوں کے قبضہ اختیار میں نہیں ہے تو اس کے مقابلے میں مراکش کا شہر طنجہ مسلمانوں کی اہم چوکی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا براعظم افریقہ مسلم اکثریت کا براعظم ہے، جہاں 62 فیصد سے بھی زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ یونان، اٹلی، سپین اور فرانس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو بحرِ متوسط عالم اسلام کا گھریلو تالاب نظر آتا ہے۔ اس بحر کا 65 فی صد حصہ آج بھی مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ نہر سویز اور بحر قلزم کی مشہور بین الاقوامی آبی شاہراہیں بھی مسلمانوں کی ہیں اور وہ خلیج فارس بھی، جس پر ایک مدت سے بڑی طاقتوں کی حریصانہ نظریں لگی ہوئی ہیں، مسلمانوں ہی کی ہیں۔ اور باب المندب بھی مسلمانوں ہی کا ہے اور دردانیال اور باسفورس پر ترکی بیٹھا ہوا ہے۔ اب مشرق میں آیئے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا کا محل وقوع ایسا ہے کہ جس کسی کو بھی گزرنا ہے، انہی دونوں کے بیچ سے گزرنا ہے۔ پھر آبنائے ملاکا بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور جزائر مالدیپ بھی۔ اسی طرح مشرق ومغرب کے سنگم پر، بحر عرب کے ساحل پر پاکستان کھڑا ہے اور خلیج بنگال میں بنگلہ دیش۔

عالم اسلام کی سیاسی، جغرافیائی اور عسکری اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ امریکہ کو چھوڑ کر چار

براعظموں (ایشیا، افریقہ، یورپ اور آسٹریلیا) کے بری، بحری اور فضائی راستوں کا باہمی رابطہ اس خطے میں سے گزرے بغیر ممکن نہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے سمندر اور بحیرۂ روم کی تنگ پٹیاں، جو بین الاقوامی تجارت کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ عالم اسلام میں واقع ہیں۔ اس بین الاقوامی شہ رگ کو دبانے اور بند کرنے کی طاقت بھی عالم اسلام کو حاصل ہے اور اگر یہ چاہے تو بین الاقوامی اقتصادی زندگی مفلوج کر کے رکھ سکتا ہے۔

زرعی ومعدنی دولت:

اس قدرتی و جغرافیائی خصوصی فوائد کے علاوہ زرعی اور معدنی دولت بھی مسلم دنیا کو بدرجۂ اتم ودیعت ہوئی ہے۔ دنیا کی کل پیداوار میں مسلم دنیا کی پیداوار کا تناسب ملاحظہ ہو: پٹ سن 90 فی صد، قدرتی ربڑ 70 فی صد، عربی گوند 85 فی صد، مسالے 97 فی صد، کھجور اور اس کا تیل 65 فی صد، کپاس 35 فی صد، معدنیات میں سے ٹن 51 فی صد اور فاسفیٹ 32 فی صد۔ یہ بالکل اجارہ داری کی سی صورت ہے۔ اس کے علاوہ کچا لوہا، قدرتی گیس، تانبا، ایلومینیم، کوئلہ، باکسائٹ، مینگانیز، کرومائٹ، یورینیم، سونا، چاندی اور کوبالٹ میں اسلامی ممالک ثروت مند اور زرخیز ہیں۔ پٹرول اور تیل کی پیداوار میں بھی مسلم دنیا کو ایک طرح کی اجارہ داری حاصل ہے۔ صرف مشرق وسطی میں دنیا کی کل پیداوار کا 40 فیصد تیل نکلتا ہے۔

عددی طاقت:

مسلم دنیا کی عددی طاقت کو مختصراً یوں سمجھئے کہ دنیا میں ہر چوتھا آدمی مسلمان ہے۔ 2002ء میں دنیا کی آبادی چھ ارب سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان میں مسلمانوں کی کل تعداد ڈیڑھ ارب کے قریب ہے۔ آزاد وخود مختار مسلم ممالک کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس (او آئی سی) کے رکن ممالک کی تعداد 56 ہے۔

اقتصادی حالت:

ان 56 ممالک کی اقتصادیات مکمل طور پر مغرب کے رحم وکرم پر ہے۔ مغرب جب چاہے، مسلمانوں کا گلا گھونٹ دے۔ جب چاہے، اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دے۔ پوری مسلم دنیا مل کر تمام دنیا کی مجموعی قومی پیداوار (جی این پی) کے صرف چار فی صد کی مالک ہے۔ ان چار فی صد میں سے بھی تین فی صد پیداوار تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے حصے میں آتی ہے۔ دنیائے اسلام میں اقتصادی تضاد کی یہ صورت ہے کہ انتہائی امیر مسلم ملکوں کے ساتھ انتہائی غریب مسلم ممالک بھی رہ رہے ہیں۔ سعودی عرب کی آبادی کل مسلم دنیا کی آبادی کا فقط 1.3 فی صد ہے، لیکن اس کی سالانہ آمدنی مسلم دنیا کی کل سالانہ آمدنی کا 13 فی صد ہے۔ پاکستان کی آبادی مسلم دنیا کی کل آبادی کا 15 فی صد ہے، لیکن اس کی سالانہ مجموعی آمدنی مسلم دنیا کی کل آمدنی کا فقط 4 فی صد ہے۔

خوراک:

خوراک کے معاملے میں بھی مسلم دنیا خود کفیل نہیں ہے، حالانکہ اکثر وبیشتر ملکوں کا تعلق وانحصار زراعت پر ہے۔ مسلم دنیا اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے غیر مسلم ملکوں کی محتاج ہے۔ غیر ملکی امداد اور عالمی بینکوں کے

قرضے جو شگوفے کھلا رہے ہیں، وہ سب کو معلوم ہے۔ ہماری خود مختاری اور آزادی کی لگام دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ منصوبہ بندی اتنی ناقص ہے کہ تمام کے تمام اسلامی ممالک خوراک کے معاملے میں خسارے میں اور محتاجی میں جا رہے ہیں۔

باہمی تجارت:

اسلامی ملکوں میں باہمی اقتصادی تعاون و تجارت نہ ہونے کے برابر ہے۔ مسلم دنیا کی موجودہ کل تجارت تقریباً 110 ارب ڈالر ہے، لیکن اس میں سے برادر اسلامی ملکوں کی باہمی تجارت فقط 14 ارب ڈالر پر مشتمل ہے۔ دفاعی استحکام اور سلامتی کا یہ حال ہے کہ موجودہ مسلح افواج کی تعداد نیٹو اور (سابقہ) وارسا پیکٹ کی مشترکہ فوجوں سے بھی زیادہ ہے، لیکن اس کے باوجود فلسطین، کشمیر، افغانستان، بوسنیا، چیچنیا (اور اب عراق) وغیرہ میں جارحیت کا زبانی کلامی بھی جواب نہیں دیا جا سکا۔

ذہنی افلاس:

ذہنی افلاس اور تعلیمی غربت کی بھی مسلم دنیا میں کوئی کمی نہیں، حالانکہ اقتدار اور آزادی کی کلید "تعلیم" ہوتی ہے۔ تین چوتھائی اسلامی ممالک ایسے ہیں جو اپنے سالانہ بجٹ کا چار فی صد بھی تعلیم پر خرچ نہیں کرتے۔ عصرِ حاضر جو سائنس بلکہ کمپیوٹر سائنس کا دور ہے، اس میں حالت یہ ہے کہ پوری مسلم دنیا سائنس و ٹیکنالوجی پر اپنی مجموعی قومی پیداوار کا 0.5 فی صد سے بھی کم خرچ کرتی ہے۔ ہر دس لاکھ مسلمانوں میں صرف ایک سائنس دان ملتا ہے۔

سیاست و حکومت:

مسلم دنیا میں اب تک کوئی مؤثر اور قابل قبول سیاسی نظام وجود میں نہیں آ سکا۔ کہیں بادشاہت ہے، کہیں فوجی آمریت۔ کہیں پارلیمانی جمہوریت کا تجربہ ہو رہا ہے تو کہیں صدارتی طرزِ حکومت کا۔ کہیں امراء کی حکمرانی ہے تو کہیں شیوخ کی حکومت ہے۔ ایک جماعتی نظام کا تجربہ بھی کہیں کہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ سب تجربے ناکام ہو گئے۔ زیادہ تر رجحان خود مختار مرکزیت اور مطلق العنان آمریت کا ہے۔ "خلافت" جو کہ اسلام کے سیاسی نظام کی روح ہے، وہ تو بہت دور کی بات ہو کر رہ گئی ہے جب کہ حقیقت میں وہی دنیائے اسلام کے سیاسی و معاشی امراض کا مداوا ہے۔ مسلم ممالک کا اندرونی نظام بھی بہت کمزور، بودا اور نازک ہے۔ ذرا سی طاقت کے استعمال یا بے احتیاطی سے ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔ ادارے مستحکم نہیں، بنتے ہیں، بگڑ جاتے ہیں۔ پھر بنتے ہیں، پھر بگڑ جاتے ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کی آواز:

مذکورہ بالا بے شمار اندرونی، بیرونی، بین الاقوامی، اقتصادی، سیاسی، روحانی و باطنی مسائل کے باوجود دنیائے اسلام میں (خصوصاً افغانستان میں مغرب کی حالیہ سفاکانہ اور وحشیانہ کارروائیوں کے بعد) ایک نئی امنگ، آزادی کی نئی تڑپ، اسلامی نشاۃ ثانیہ اور احیائی و تجدیدی تحریک کی نئی آرزو پیدا ہوئی ہے۔ اسلامی ممالک پراگندہ ہونے کے باوجود اپنی اپنی جگہ، اپنے اپنے دائرے میں، اپنی اپنی حیاتِ اجتماعی کی تعمیرِ نو کے نئے چیلنج کے زیر اثر جہاں

رائج الوقت نظریات وافکار پر غور کررہے ہیں، وہاں اسلام کی حقانیت پر تفکر و تدبر بھی ہورہا ہے۔ پیش آمدہ حالات و جبر کے حوالے سے اسلام کی تفہیم و تعبیر کا عمل یوں تو ہمیشہ جاری رہا ہے، یونانی فسلفہ ہو یا مغربی تہذیب، مسلمان مفکروں اور اہل علم و دانش نے اس کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرنے سے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ پچھلی تین صدیوں میں، جب سے دنیائے اسلام مغرب کی محکوم ہوئی ہے، مفکروں اور دانشوروں نے بہت سے دستوری و قانونی مسائل پر اجتہادی رویہ اپنایا۔ شاہ ولی اللہ، سیّد جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، حسن البنا شہید، سیّد قطب شہید، محمد رشید رضا، قاسم امین، توفیق الحکیم، ضیا گوکلپ، علامہ اقبال، ڈاکٹر علی شریعتی، مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار احمد اور دوسرے بہت سے اہل علم نے درپیش علمی و فکری چیلنجوں کا اپنے اپنے انداز میں جائزہ لیا اور اپنی بصیرت کے مطابق مسلمانوں کے لیے بہترین لائحہ عمل کی نشاندہی کی۔

متعدد اسلامی ملکوں میں احیائے اسلام، تجدید دین اور نفاذ اسلام کی کوششیں ہورہی ہیں۔ اجتہاد کے ذریعے روایات و رسوم کو جدیدیت سے ہم آہنگ کیا جارہا ہے، بدعتیں دور کی جارہی ہیں۔ اس راہ پر عالم اسلام بڑھ بھی رہا ہے، جھجک بھی رہا ہے۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کرتے ہوئے امید کی کرن کی طرف آگہی کا مرحلہ آ گیا ہے۔ عامۃ المسلمین میں اپنی آزادی اور اپنے تشخص اسلامی کی پاسداری کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔ انقلاب بسر اقتدار طبقے کی دہلیز پر ہے۔ اب حکمران طبقوں کے لیے اسلام کو اپنے تحفظ و استحصال کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اسلام کی فعالیت اور انقلابی تحریک میں روز بروز شدت پیدا ہورہی ہے۔ تعبیر، تفہیم، تفسیر، اجتہاد، خیال افروزی، خرد افروزی، عقل و عشق، یہ سب اصطلاحیں اب ''نشاۃ ثانیہ'' کے جذبے کے تابع ہوگئی ہیں۔ ماضی کے تقاضوں اور حال کی ضرورتوں میں ایک نقطۂ اعتدال تلاش کیا جارہا ہے۔ مستقبل ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو جانتے ہیں کہ ماضی کے بوجھ تلے ڈوبنے سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ مستقبل میں جینے کی آرزو، ماضی میں جینے کی آرزو سے بڑھ گئی ہے۔

تحریک احیائے اسلام سے متعلق

چند اصطلاحات کا جائزہ

انڈونیشیا سے مراکش تک، ملکوں ملکوں، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو دل میں لئے، جتنی بھی تحریکیں حالیہ صدیوں میں اٹھتی رہی ہیں، ان سے متعلق لٹریچر جمع کیا اور پڑھنا شروع کیا تو چند اصطلاحیں ایسی تھیں جو بار بار سامنے آتی گئیں جو ان تمام تحریکوں میں مشترک نظر آئیں۔ اگر ان اصلاحات کی تعریف وتشریح ابتدا ہی میں ہو جائے تو متن کی راہوں پر چلتے ہوئے بار بار ان سے الجھنا نہیں پڑے گا۔

شکست:

کسی قوم کا انتشار یعنی جب وہ کمزور ہو کر ٹوٹنے لگتی ہے اور بالآخر ٹوٹ جاتی ہے۔ بقول ابن خلدون: "برسر اقتدار گروہ ملک کے بیشتر وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے اور اس طرح قوم میں بے چینی پیدا ہوتی ہے اور اس کی قوت متاثر ہوتی ہے۔" جو قوم چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے، وہ زوال آمادہ ہو جاتی ہے۔

جب قوم میں تخلیق کی صحیح صلاحیت باقی نہیں رہتی، یا جب قوم کامیابی کے نشے میں سرمست ہو جاتی ہے، یا جب قوم کی روح اور جسم انتشار کی نذر ہو جاتے ہیں۔

زوال:

کسی قوم کی وہ حالت جب وہ شکست کی منزل سے گزرنے کے بعد پستی کی اس سطح پر پہنچ جائے جہاں وہ اپنے وجود کے لیے دوسری قوموں کی محتاج ہو جائے (مثلاً جیسے موجودہ اسلامی ممالک مغرب کے محتاج ہیں)۔ اس کی خودمختاری بہت کم رہ جائے۔ بیشتر اہم قومی فیصلے کرنے میں دیگر اقوام سے حکم و ہدایت حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو۔ معاشی، سیاسی اور سماجی حیثیت سے دوسری قوموں کی دست نگر ہو اور اس طرح تخلیقی، علمی و فنی صلاحیتوں سے تقریباً محروم ہو جائے۔ ایک زوال رسیدہ قوم، جو اپنی خودمختاری کھو چکی ہو اور دوسروں کی محتاج ہو، اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار کو زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ زوال اسی قوم پر آتا ہے جسے کبھی عروج حاصل ہوا ہو۔ عروج کے بعد ہی زوال آسکتا ہے۔ اگر عروج ہی نہ ہوا تو زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عروج:

محض دولت کی فراوانی یا محض فتوحات و مقبوضات سے کوئی قوم عروج پر نہیں پہنچ جاتی اور نہ ہی دولت کی کمی

فوجی شکست کی وجہ سے زوال آمادہ ہو جاتی ہے۔ ایک قوم نہایت دولت مند ہونے کے باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کی کمی کی وجہ سے پسماندہ رہ سکتی ہے۔

اس کی خودداری کم ہو سکتی ہے۔ دوسری قوموں کی محتاج ہو سکتی ہے۔ تاریخ میں بار بار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ 'ملک میں دولت' کی فراوانی تھی، لیکن عقل و تدبر اور علوم و فنون میں پسماندہ ہونے کی وجہ سے قوم کو یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ پسماندگی کی کس منزل پر تھی۔

اسلامی تشخص کے حوالے سے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں اس اصول کو یوں بیان کیا جائے گا: ''عام طور پر خلافت امویہ یا عباسیہ اور ولید بن عبدالملک، ہارون و مامون اور عبدالرحمٰن ناصر کے عہد کو عروج کا زمانہ سمجھتے ہیں۔ اسلام کو وہ اسلامی تمدن کے مترادف خیال کرتے ہیں۔ اور اسلامی تمدن سے ان کی مراد بغداد و قرطبہ، دمشق، غرناطہ کا تمدن ہوتا ہے۔ وہ اسلام کی ترقی کو میناروں کی بلندی، فن تعمیر کی ترقی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ لیکن جو سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک عملی، روحانی، اخلاقی، اور معاشرتی مذہب ہے، ان کو بغداد اور قرطبہ کے عالیشان دارالخلافوں اور سربفلک مسجدوں کے بجائے مدینے کے جھونپڑوں میں عروج نظر آئے گا''۔

قوم:

مشترکہ تاریخ، مشترکہ زبان، مشترکہ مذہب، مشترکہ معاشرت، مشترکہ ثقافت و تہذیب رکھنے والے کئی کروڑ یا کئی ہزار لوگوں کی جمعیت جو سیاسی طور پر حق خود ارادیت کی حامل اور ایک واضح حدود والے علاقے پر قابض و آباد ہوں۔ فی الوقت ایسے ملوں کی تعداد، جہاں مسلم اقوام اکثریت کے ساتھ آباد ہیں، پچاس سے زیادہ ہے اور یہ سب اپنی ایک بین الاقوامی تنظیم ''اسلامی سربراہ کانفرنس'' بنائے ہوئے ہیں۔

اُمّت:

اللہ واحد، ختم رسالت ﷺ اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کی اجتماعی اور عالمگیر وحدت و طاقت۔ ان کا سرچشمۂ ہدایت قرآن و حدیث ہے۔

تحریک:

جمود و زوال کی کیفیت کے خلاف کسی ایک خیال یا جذبے کے تحت کسی ایک شخص (مجدد) یا اشخاص کے گروہ (جماعت) کے زیر اثر انقلاب خیز حرکت۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک ایسی انقلابی تحریکیں تین قسم کی ہیں:

1۔ خالص قومی و ملی تحریکیں، جن کا اصل موضوع ہے۔ جہادِ حریت اور استخلاص دیارِ مسلمین، یعنی مسلم ممالک کی سیاسی غلامی کا خاتمہ اور آزادی کا حصول۔

2۔ علماءِ کرام کی مساعی جن کا اصل ہدف ہے، تصحیحِ عقائد و اعمال، تعلیمِ کتاب و سنت، حفاظت، دین و شریعت اور باطل فرقوں کا ابطال اور جدید فتنوں کا استیصال۔

3۔ مثبت احیائی و تجدیدی مساعی جن کا معین مقصود ہے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبۂ دین حق یا بالفاظ دیگر اللہ کی

زمین پر اللہ کی حکومت کا قیام۔

اور یہ تینوں تحریکیں مل جل کر اور یہ جملہ مساعی بحیثیت مجموعی تسلسل ہیں امت محمد ﷺ کی تاریخ کے الف ثانی (یعنی دوسرے ہزار سال) کی تجدیدی مساعی کے سنہری سلسلے کا۔

احیا (Revival):

مرے ہوئے جسم میں از سر نو روح پھونکنا۔ زندہ کرنا، زندگی بخشنا۔ کسی خیال، عقیدے یا جذبے کو نئے سرے سے ابھارنے کی تحریک۔

نشاۃ ثانیہ (Renaisance):

حیاتِ نو، نئی زندگی۔ دوبارہ عروج، خصوصاً ان اسلامی علوم وفنون کا احیا جن کے چراغ سے مغرب کے اہل فکر و دانش نے اپنے چراغ روشن کیے۔

تجدید:

نیا بنانا، نئے سرے سے کوئی کام کرنا، جدت، تازگی، نیا پن۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اس اصطلاح کی وضاحت یوں کرتے ہیں: ''عموماً لوگ تجدد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدد کو مجدد کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو نیا طریقہ نکالے اور اس کو ذرا زور سے چلا دے، وہ مجدد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو بر سرِ انحطاط دیکھ کر اس کی دینوی حیثیت سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانے کی بر سرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام اور جاہلیت کا ایک نیا مخلوطہ تیار کر دیتے ہیں یا فقط نام باقی رکھ کر اس قوم کو جاہلیت کے پورے رنگ میں رنگ دیتے ہیں، ان کو مجدد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے حالانکہ وہ مجدد نہیں، متجدد ہوتے ہیں اور ان کا کام تجدید نہیں، تجدد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہے۔

جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا نام تجدید نہیں ہے اور نہ اسلام اور جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے، دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزا سے چھانٹ کر الگ کیا جائے، اور کسی نہ کسی حد تک اس کو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدد جاہلیت کے مقابلے میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے اور کسی خفیف سے خفیف جز میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔''

مجدد:

مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی مجدد کی تعریف میں رقم طراز ہیں: ''ہر وہ فرد جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی۔ جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔ اسلام کے جو خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اجاگر کیا، اُمت میں ایمانی روح پیدا کی، جس نے اس دین پر اس کے ماخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سرِ نو استوار کیا۔ نو وارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی اور اس امت کو کسی نئے فتنے میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لیے اس دین کی حفاظت کی، حدیث، فقہ کی تدوین جدید کا

کام انجام دیا، جنہاد دروازہ کھولا اور امت کو تشریح کا خزانہ عامرہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرے میں احتساب کا فرض ادا کیا اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی اور صحیح و حقیقی اسلام کی برملا و آشکار دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب و عقائد کے زمانے میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، جس نے دعوت و تذکیر اور انداز و تبشیر میں انبیائے کرام کی نیابت کی اور ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تیز و تند دھارے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلاخیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہہ جانے یا اس میں دب جانے سے محفوظ رکھا، جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے در پے خارجی حملوں کے سہار لینے کی قوت عطا کی، جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دام محبت سے اس دشمن کو شکار کیا، جو زور شمشیر اور نوک خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو خطیرۂ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی ﷺ کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور تحریر و ادب اور دل گداز و بلیغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیر دام کیا جو علمی مباحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔

ہجری اور عیسوی تقویم کا تقابلی خاکہ

یہ سلسلۂ تحریر اگرچہ تاریخ اسلام کے ایک اہم گوشے سے مخصوص ہے اور اسی لیے اس میں سنین کے حوالے ہجری تقویم کے مطابق ہونے چاہئیں، لیکن چونکہ ہمارے قارئین اپنی معاشرت و مدنیت کے باعث زیادہ تر عیسوی تقویم سے مانوس ہیں، لہٰذا دونوں تقویموں کا سرسری تقابلی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ سن ہجری کے حوالے کو سن عیسوی میں، اور سن عیسوی کے حوالے کو سن ہجری میں تبدیل کر کے دیکھا جا سکے کہ متعلقہ واقعہ تاریخ انسانیت کے کس حصے اور ماحول میں ظہور پذیر تھا۔

ہجری	عیسوی	یکم محرم	-----	ہجری صدی کا اختتام (شمسی قمری تقویم کے فرق کے ساتھ)
پہلی صدی 100-1	ساتویں صدی	16 جولائی 622ء	-----	3 اگست 718ء
دوسری صدی 200-101	آٹھویں صدی	24 جولائی 719ء	-----	11 اگست 815ء
تیسری صدی 300-201	نویں صدی	30 جولائی 816ء	-----	18 اگست 912ء
چوتھی صدی 400-301	دسویں صدی	7 اگست 913ء	-----	25 اگست 1009ء

پانچویں صدی 500-401	گیارہویں صدی	15 اگست 1010ء	-----	2 ستمبر 1106ء
چھٹی صدی 600-501	بارہویں صدی	22 اگست 1107ء	-----	10 ستمبر 1203ء
ساتویں صدی 700-601	تیرہویں صدی	29 اگست 1204ء	-----	16 ستمبر 1300ء
آٹھویں صدی 800-701	چودہویں صدی	5 ستمبر 1301ء	-----	24 ستمبر 1397ء
نویں صدی 900-801	پندرہویں صدی	13 ستمبر 1398ء	-----	2 اکتوبر 1494ء
دسویں صدی 1000-901	سولہویں صدی	21 ستمبر 1495ء	-----	19 اکتوبر 1591ء
گیارہویں صدی 1100-1001	سترہویں صدی	8 اکتوبر 1592ء	-----	26 اکتوبر 1688ء
بارہویں صدی 1200-1101	اٹھارویں صدی	15 اکتوبر 1689ء	-----	4 نومبر 1785ء
تیرہویں صدی 1300-1201	انیسویں صدی	24 اکتوبر 1786ء	-----	12 نومبر 1882ء
چودہویں صدی 1400-1301	بیسویں صدی	2 نومبر 1883ء	-----	21 نومبر 1979ء
پندرہویں صدی 1500-1401	اکیسویں صدی	9 نومبر 1980ء	-----	

امتِ مسلمہ کا عروج وزوال

عروج، زوال، پھر عروج، پھر زوال۔ اب تک تاریخ انسانیت یہی داستان دہراتی رہی ہے۔ تاریخ اسلام میں احیائی وتجدیدی تحریکیں وہاں اٹھتی رہی ہیں، جہاں زوال وپستی کے اسباب ووجوہ بہت نمایاں اور گھناؤنے ہو گئے تھے۔ امت مسلمہ کے عروج وزوال کا ایک اجمالی خاکہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے ایک مقالے میں کھینچا

تھا، جس کا اصل مقصد تو موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ لینا تھا، لیکن بطور پس منظر انہوں نے امت مسلمہ کے عروج وزوال کی داستان بھی اختصار کے ساتھ بیان کی تھی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب نے 1974ء میں سپرد قلم کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں۔

''اپنی ہیئت تشکیلی کے اعتبار سے امتِ محمد ﷺ کے دو حصے ہیں۔ پہلا امیین یعنی بنی اسماعیل، جسے اس امت کے قلب یا مرکز کی حیثیت حاصل ہے، اور دوسرا ''آخرین'' یعنی دیگر اقوام، خواہ وہ کرد ہوں یا ترک، اہل فارس ہوں یا اہل ہند، افغان ہوں یا مغل، اہل حبش ہوں یا بربر، مشرق بعید یعنی ملائیشیا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغرب بعید یعنی مراکش اور موریتانیہ سے۔

1۔ امت مسلمہ کا پہلا دورِ عروج ''امیین'' کی زیر سرکردگی لگ بھگ تین صدیوں پر پھیلا ہوا تھا، اس لیے کہ اگر یہ دیکھئے تو دورِ خلافت راشدہ، دورِ بنی اُمیہ اور دورِ بنی عباس کی مجموعی مدت سوا چھ سو سال بنتی ہے، لیکن اس میں سے اصل دبدبہ، مرکزیت اور خالص عربی شوکت وسطوت کا دور تین سو سال کو محیط ہے۔

2۔ اس کے بعد کے چار سو سال زوال کے دو ادوار پر مشتمل ہیں۔ اولاً شمال سے صلیبیوں کا سیلاب آیا، جس نے شام کے ساحلی علاقوں کو تاخت وتاراج کیا اور 1099ء میں یروشلم کو فتح کر کے مسجد اقصیٰ کی حرمت بھی پامال کی اور لاکھوں مسلمانوں کو بھی تہ تیغ کیا۔ اور پھر مشرق سے تاتاریوں کا سیلاب آیا، جس کے دوران نہ صرف یہ کہ لاکھوں نہیں، کروڑوں مسلمان قتل ہوئے، بلکہ 1258ء میں بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافت عباسیہ کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

3۔ اس کے بعد پھر دوسرا دورِ عروج آیا، لیکن ''امیین'' یعنی عربوں کی زیر قیادت نہیں بلکہ ''آخرین'' یعنی غیر عرب اقوام میں سے ایک نہایت قوی اور دانا قوم کی زیر قیادت۔ اللہ نے پہلے انہیں مسلمانوں کی پیٹھ پر عذاب کے کوڑے کے طور پر استعمال فرمایا اور بعد ازاں انہی کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی توفیق دے دی، بلکہ عالمِ اسلام کی قیادت بھی انہی کے حوالے کر دی۔ چنانچہ اولاً ترکانِ سلجوقی میدان میں آئے، پھر ترکانِ صفوی، ترکانِ تیموری اور ترکانِ عثمانی جن کے ہاتھوں عظیم سلطنتوں کی بنیاد پڑی۔

4۔ امت مسلمہ کا دوسرا دورِ زوال یورپی استعمار کے سیلاب کے نتیجے میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے علم وحکمت اور فلسفہ وسائنس کی قوتوں سے مسلح ہو کر یورپی اقوام جب بیدار ہوئیں تو پہلے انہوں نے دولتِ ہسپانیہ کو ہڑپ کیا اور پھر 1498ء میں راس امید کے راستے کی دریافت کے بعد مغربی استعمار کا سیلاب اس طویل بحری راستے کے ذریعے عالم اسلام کے دائیں بازو پر حملہ آور ہوا اور یہ عمل بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر تکمیل کو پہنچا، جب عظیم سلطنت عثمانیہ کا نام ونشان مٹ گیا اور صرف ایک چھوٹا سا ملک ترکی باقی رہ گیا۔ خلافتِ اسلامیہ کا چراغ گل ہو گیا اور پورا عالم اسلام یورپی اقوام کی براہ راست یا بالواسطہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اُمت مسلمہ کے اس دوسرے دورِ زوال کے تتمے کے طور پر 1967ء میں مسلمانوں کے عہد تولیت کے دوران

بھی دوسری بار مسجدِ اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور اس وقت سے مسلمانوں کا یہ قبلۂ اول ایک مغضوب و ملعون قوم کے قبضہ وتسلط میں ہے۔

زوال کے اسباب:

جب پوری دنیائے اسلام پر مغرب کا قبضہ وتصرف ہوگیا تو اہل فکر کو امت مسلمہ کے اسباب زوال جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی اور تقریباً ہر اسلامی ملک میں اپنے گریبان میں جھانکنے اور اپنے رویوں پر تنقید کرنے کا وطیرہ شروع ہوا۔ مثلاً انڈونیشیا کے شیخ الاسلام مولانا محمد بسیونی عمران نے دنیائے عرب کے مشہور مفسر و مفکر علامہ رشید رضا سے سوال کیا: ''قرآن مجید کے اس وعدے کے باوجود کہ اہل ایمان دنیا میں باعزت رہیں گے آج کل کے مسلمان ہر جگہ مجبور و مقہور کیوں ہیں؟'' اور اصرار کیا کہ اس کا جواب اپنے شہرۂ آفاق رسالہ ''المنار'' میں شائع کریں۔ علامہ رشید رضا نے یہ سوال شام کے مفکر امیر البیان علامہ شکیب ارسلان کو بھیج دیا۔ سوال کا دیکھنا تھا کہ ان کی حساس طبیعت نے اثر لیا اور ان کا اشہب قلم رواں ہوگیا۔ امیر البیان کا جواب ایک مقالے کی شکل میں بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوکر دنیائے اسلام میں مقبول و معروف ہوا۔ انہوں نے زوال کے ان دس اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالی (1) جانی اور مالی جہاد سے پہلوتہی (2) اپنے دین اور قوم سے غداری اور دشمنوں سے وفاداری (3) جہالت (4) کم علمی (5) اخلاق کا زوال (6) علماء اور حکمرانوں کا زوال (8) الحاد پروری (9) قدامت پسندی (10) اسلامی تہذیب اور مذہب سے رُوگردانی۔

ہر اسلامی ملک کے زندہ و حساس طبیعت کے مفکروں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے قومی و ملی دور کا اظہار کیا۔ برصغیر میں مولانا حالی کی ''مسدس'' وجود میں آئی:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اقبال نے اللہ تعالیٰ کے حضور، حاضر ہوکر شکوہ وشکایت سے اپنا دل چیر کر رکھ دیا:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

آزادی اور نشاۃ ثانیہ کی خواہش

مغربی استعمار سے سیاسی آزادی، معاشی نجات کے لیے اور اپنی دینی وروحانی اقدار اور مذہبی عقائد وروایات کے دوبارہ عروج کی خواہش ہر مسلمان کا جزو ایمان بن گئی۔ مفکروں، ادیبوں اور علمائے حق نے اسباب زوال کی گنتی کے بعد ان کے تنقیدی تجزیے کیے اور دوبارہ عروج کے لیے اسلام کے اصلی، حرکی، روشن اور مثبت پہلوؤں کو ازسرنو، پوری شدت وقوت سے اجاگر کیا۔ مثلاً مولانا سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

"شروع ہی سے اسلام کے قلب وجگر (اندرون) اور اس کے اعصاب پر ایسے (بیرونی) حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لاسکتا۔ دنیا کے دوسرے مذاہب جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی، اس سے کم درجے کے حملوں کو سہار نہ سکے اور انہوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور اپنی اصل شکل میں قائم رہا۔ ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح اور اس کے نظام عقائد کے لیے سخت خطرہ تھیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا۔ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر گیا اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں۔ تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال ورسوم، مادیت، نفس پرستی تعیشات، الحاد ولادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے اور ان کے سامنے سپر ڈال دے، لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی۔ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے تحریفات وتاویلات کا پردہ چاک کر دیا اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو اجاگر کیا۔ بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی۔ سُنّت کی پرزور حمایت کی۔ عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال ورسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا۔ مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی۔ جابر سلاطین کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا۔ عقلیت پرستی کا طلسم توڑا اور اسلام میں نئی قوت وحرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی۔ صاف معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے۔"

(دعوت وعزیمت، جلد اول)

تاریخ اسلام کو دیکھیں تو ہر وقت اور ہر کہیں روشنیوں کے کارواں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے منسوب یہ حدیث رسول ﷺ جگمگانے لگتی ہے:

"ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مآۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا"

"اللہ ہر صدی کے سر پر اس امت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لیے اس کے دین کو تازہ کریں گے"

حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد حنبل، امام غزالی، امام ابن تیمیہ، پھر

یہاں ہمارے برعظیم میں مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سیّد احمد شہید بریلوی اور ان کے رفقاء شیخ الہند اور علامہ اقبال، جزیرہ نمائے عرب میں شیخ محمد عبدالوہاب، لیبیا میں محمد بن علی سنوسی، سینیگال میں حاجی عمر تجانی، مالی میں احمد دلو یو، نائیجریا میں عثمان فودیو، سوڈان میں مہدی، الجزائر میں عبدالقادر، چیچنیا میں امام شامل، انڈونیشیا میں امام بونجول اور حاجی عمر سعید، مصر میں قطب شہید اور افغانستان میں حالیہ معرکہ حق و باطل۔ گویا ایک مجدد کا چراغ دوسرے مجدد کو، ایک تحریک کی ٹارچ دوسری تحریک کو منتقل ہو رہی ہے، اور جگمگ کرتا ایسا کشادہ اور وسیع منظر پیدا ہو گیا ہے جو پوری دنیائے اسلام پر چھایا ہوا ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا زمانہ

مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک

ہندو پاک کے پہلے مجدد، ایسے مجدد کہ جن کا نام ہی مجدّد پڑ گیا ہے، اور اچھے اچھوں کو ان کا اصلی نام یاد نہیں۔ مجدد کا لفظ بولتے ہی کانوں میں مجدد الف ثانی رس گھولنے لگتے ہیں اور روح میں حرارت سرسرانے لگتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسا وقت پایا تھا جب زمانہ منقلب ہو گیا تھا اور زمین الٹ گئی تھی۔ مغرب نے مشرق کی جگہ لے لی تھی اور مشرق نے مغرب کی۔ سورج بجائے مشرق کے، مغرب سے نکلنے لگا تھا، اور آج تک مغرب ہی سے نکل رہا ہے۔ عیسائیت، صیہونیت حتیٰ کہ ہندومت کے احیاء و تجدید کے لیے تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور اسلام ہر ملک اور ہر خطے میں زوال و پستی کے گہرے کنوئیں میں اترتا جا رہا تھا۔ آج تک ان کے عروج پانے کی رفتار میں کمی نہیں آئی، ہمارے گرنے کی رفتار میں البتہ اضافہ ہوتا رہا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس اجمال کی تفصیل میں جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مجدد کے زمانے میں اہل مغرب کی ترقیوں کا حال مولانا مودودی یوں سناتے ہیں

”اس دور میں مغرب قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہاں علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ ہیوم، کانٹ، نطشے، ہیگل، کومت، سٹوارٹ مل جیسے فلسفی پیدا ہوئے، جنہوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبیعیات میں گیلوینی اور وولٹا، کیمیا میں لاویزیر، پریسٹلے، ڈیوی اور برزیلیس، حیاتیات میں لینے، ہالر اور وولف جیسے محققین اٹھے جن کی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔

اسی زمانے میں کوئزنے، ترگوف، آدم سمتھ اور مالتھس کی دماغی کوششوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو، والٹیئر، مونٹیو ڈائڈرو، انگلستان میں تھامس پین، ولیم گوڈون، ڈیوڈ ہارٹلے، جوزف پریسٹلے، ارسمس ڈارون اور جرمنی میں گوئٹے، ہرڈر، شیلر، لسنگ اور ہولباش جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے

اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمرانی پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے افکار و نظریات کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔

''پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیب بیان کی ندرت اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے محدود افراد کو نہیں، بلکہ قوموں کو بہ حیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں۔ اخلاق بدل دیئے۔ نظام تعلیم بدل دیا۔ نظریہ حیات اور مقصدِ زندگی بدل دیا۔ تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا۔

''اسی زمانے میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی کے ساتھ پیدا کیے۔ اسی زمانے میں انجینئرنگ نے غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں جو پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ اسی زمانے میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فن جنگ نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعے سے فوجوں کو منظم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا، جس کی وجہ سے میدانِ جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلے میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔

فوجوں کی ترتیب اور عساکر کی تقسیم اور جنگی چالوں میں بھی پیہم تغیرات ہوئے اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں۔ رائفل ایجاد ہوئی۔ ہلکی اور سریع الحرکت میدانی توپیں بنائی گئیں۔ قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور کی گئیں اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلے میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بیکار کر کے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلے میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں، اور عالمِ اسلام کے عین قلب پر حملہ کر کے نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کر لیا۔''

مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے اپنے تبصرے میں جو حقائق بیان کئے ہیں، ان کی صحت و اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن انہوں نے پکی ہوئی تیار شدہ فصل کی تفصیل دی ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ اس کے لیے زمین کب تیار ہوئی اور بیج کب بوئے گئے؟

اس سوال کا جواب شیخ محمد اکرام نے اپنی تصنیف ''رودِ کوثر'' (صفحہ 167) میں دیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''یورپ کی جن ترقیوں اور مشرق کی جس پس ماندگی کا مولانا نے ذکر کیا ہے، وہ ان عوامل و اثرات کا قدرتی نتیجہ تھیں جو صدیوں سے کارفرما تھے اور جنھوں نے عہدِ اکبری تک ایک واضح صورت اختیار کر لی تھی۔

جب 1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کیا، اس وقت تک علمی، اخلاقی، روحانی اور عسکری اعتبار سے مسلمانوں کا پلہ اہل عرب سے بھاری تھا۔ اس کے بعد اسلامی ممالک پر منگولوں کی یورش ہوئی اور 1258ء میں سقوط بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ اس سیلاب بلا سے جو عظیم سیاسی اور دینی خطرات پیدا ہو گئے تھے، وہ تو اللہ کے فضل سے عارضی ثابت ہوئے اور اہل یورپ نے لا مذہب منگولوں سے مل کر دنیائے اسلام کے خلاف جو

منصوبے بنانے چاہے، انہیں بعض باتدبیر مسلمان زعمانے ناکام بنادیا، لیکن ''فتنۂ مغول'' نے مسلمانوں کی علمی برتری کا خاتمہ کردیا۔ خوارزم، بخارا، خراسان، ایران اور بغداد کے علمی مرکزوں کی ویرانی، کتب خانوں، مدرسوں اور تجربہ گاہوں کی تباہی اور علماء کے قتل وانتشار سے علم کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ پھراس کی بحالی نہ ہوسکی۔ بلکہ علم وتہذیب کے پرانے گہواروں میں اتنی دیر تک بربریت اور سفاکانہ جہالت کا دوردورہ رہا کہ ہمتیں پست ہوگئیں اور خیالات بدل گئے۔ مغلوں کی تباہ کاریوں سے پہلے اور بعد کے حالات پر غور کریں تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ سانچے، جس میں البیرونی جیسے محققین اور سائنس دانوں کے ذہن ڈھلتے تھے، ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ واقعیت پسندی کی جگہ فراریت اور علم کی جگہ تصوف کو فروغ حاصل ہوا۔ علم کا مفہوم بہت محدود ہوگیا۔ یعنی نئے علوم اخذ کرنا تو ایک طرف، سقوط بغداد سے پہلے جو علوم رائج تھے وہ بھی متروک مردود ہوگئے۔ ذہن گویا مفلوج ہوگئے اور جو لوگ اہل علم کہلاتے تھے، ان کا منتہائے مقصود حق کی تلاش نہ رہا بلکہ ایک نقطۂ عروج کی ترویج۔''

اہل مغرب کی تحریک احیائے علوم اور مذہبی نشاۃ ثانیہ پر رائے زنی کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام مرحوم رقم طراز ہیں: ''(مسلمانوں کی حالت زار کے برعکس) یورپ میں ایک نئی علمی زندگی کا آغاز ہوا اور تحریک کی ابتدا ہوئی، جسے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس میں ایک حد تک ان اثرات کو دخل تھا جو صقلیہ اور اندلس (ہسپانیہ) میں عربوں کے بلند علمی اور تدریسی معیار کی بدولت قریبی یورپ ممالک کے اہل علم پر پڑا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں کے تمدن اور علم وفن سے اہل مغرب کو جو واقفیت ہوئی، اس سے بھی ان کا ذہنی افق وسیع اور علمی معیار بلند ہوا، لیکن یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا اصل ذریعہ وہ یونیورسٹیاں تھیں، جو اس زمانے میں کثرت سے یورپ کے مرکزوں میں قائم ہوئیں۔ اس وقت وہاں بھی عالم اسلام کی طرح تعلیم وتدریس کی باگ ڈور علمائے مذہب کے ہاتھ میں تھی (مثلاً اوکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں بھی شروع میں دینی درسگاہیں تھیں) لیکن یورپ میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے نصاب میں توسیع ہوتی رہی، اور یہ یونیورسٹیاں دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کا مرکز بن گئیں۔ اس زمانے میں یورپ میں چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) کا آغاز ہوا، جس سے علم کی بے پناہ اشاعت ہوئی۔ کتابیں سستی ہوگئیں اور کتب خانے خاص خاص امراء یا اداروں کا اجارہ ہونے کی بجائے عوام کو بھی میسر ہونے لگے۔ اس کے علاوہ مغرب کی عسکری برتری کا، بالخصوص سمندروں پر اس کے بے روک ٹوک اقتدار کا آغاز بھی اس زمانے میں ہوا، اور اکبر کی تخت نشینی بلکہ بابر کی فتح پانی پت سے پہلے بحرِ ہند ایک ''پرتگیزی جھیل'' بن گیا تھا، جس میں جہاز رانی پرتگیزی اجازت ناموں کے بغیر مخدوش بلکہ ناممکن تھی۔''

مذکورہ بالا بیان میں شیخ محمد اکرام نے مولانا مودودی کے تبصرے پر نکتہ چینی نہیں کی، بلکہ ان کے بیان کو سراہتے ہوئے کچھ آگے بڑھایا، جس طرح کہ آئندہ سطور میں مولانا صاحب شیخ صاحب کی بات کو آگے بڑھا رہے ہیں: ''ہمارے ہاں تو چند اشخاص ہی بیدار ہوئے تھے، مگر وہاں (یورپ میں) قوموں کی قومیں جاگ اٹھی تھیں۔ یہاں صرف ''ایک جہت'' میں تھوڑا سا کام ہوا، اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کرڈالا گیا، بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا جس میں تیز رفتار پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی دو ایک چند کتابیں

خاص خاص علوم پر لکھی جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں۔ اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم وفن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہو گئیں۔ یہاں فلسفہ، اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک ہی رہی، جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا۔ اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہو گئے، جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علوم طبیعیہ اور قوائے مادیہ کا علم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا۔ اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی، اور اس ترقی کی بدولت اہل مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے مقابلے میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعاً محال تھا۔" (تجدید واحیائے دین)

علمی و فکری لحاظ سے مغرب اور مشرق (اسلامی ممالک) کے عدم توازن کا وہ حال تھا، جو اوپر بیان ہوا، لیکن سیاسی لحاظ سے معاملہ برعکس تھا۔ برطانیہ میں ملکہ الزبتھ اول کی حکمرانی تھی۔ ایران میں عباس صفوی کی فرماں روائی تھی جس کی سلطنت دجلہ سے لے کر سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ترکی خلافتِ عثمانیہ کا مرکز تھا۔ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کے ماتحت مغلیہ خاندان کی سلطنت اپنے عروج پر تھی، لیکن مذہبی، دینی، اخلاقی اور روحانی نقطۂ نظر سے تینوں بڑی اسلامی سلطنتوں میں اندر ہی اندر زوال شروع ہو چکا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ اور سلطنتِ صفوی فی الحال ہمارے موضوع سے قدرے دور ہیں۔ آگے چل کر ان پر بھی ہم اظہارِ خیال کریں گے۔ فی الحال حضرت مجدد کے بالکل اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالنا ہماری اہم ضرورت ہے، اور وہ بھی محض احیائے دین اور تجدید کے حیطۂ فکر کے تحت:

اکبر کا دین الٰہی۔ اسلام مخالف تحریک!

مغلیہ خاندان کے تیسرے بادشاہ جلال الدین اکبر (1542 - 1605ء) نے جو انتظامی، عسکری، مالی اور تہذیبی نظام قائم کیا، وہ مشرقی معیار کے مطابق خاصا بلند اور مغربی معیار سے کم نہ تھا، لیکن بعض ایسی کمزوریاں بھی تھیں جو آگے چل کر مہلک ثابت ہوئیں۔ خصوصاً اس کی مذہبی پالیسی مسلمانانِ ہند اور بڑے پیمانے پر خود اسلام کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوئیں، جن کا مداوا آج تک نہیں ہو سکا۔

ابتدا میں اکبر ایک سیدھا سادہ خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ وہ علماء، مشائخ اور صوفیا کا بے حد احترام کرتا تھا اور علمی و مذہبی حقائق کا متلاشی رہتا تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا کہ سیدھے سادے، خوش عقیدہ اور پابندِ مذہب لوگوں کی طرح ارکانِ مذہب کی دل و جان سے بجا آوری کرتا۔ اس نے اپنے باپ (ہمایوں) کے زمانے میں دنیا کا سرد گرم چکھا تھا اور طبیعت میں سوز و گداز اور روحانی رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ جب بارہ برس کی مایوسی اور سرگردانی کے بعد پھر تاج و تخت نصیب ہوا تو گردن خود بخود، رب کارساز کے سامنے سجدۂ شکر میں جھک جاتی۔

خاندان سوری کے بادشاہوں نے علمائے مذہب کو بڑا زور و اقتدار دے رکھا تھا۔ اس میں ملکی و سیاسی مصلحتیں بھی تھیں اور طبیعت کا لگاؤ بھی۔ اکبر نے یہ سلسلہ اور وسیع کر دیا۔ جا بجا قاضی اور مفتی مقرر کیے۔ مخدوم الملک شیخ الاسلام کی قدر و منزلت بڑھا دی اور صدر الصدور کو وہ اختیار دیئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ مخدوم الملک تو ملکی

امور میں اس کے مشیر اور رکن سلطنت تھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالغنی کا بھی وہ دل و جان سے معتقد تھا۔ کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا۔ ایک دفعہ جوتے ان کے سامنے اٹھا کر رکھے۔ شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا، تاکہ عبدالرحمٰن جامی کی ''چہل حدیث'' ان سے پڑھے۔ صدر الصدور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقویٰ و پرہیز گاری میں فرد تھے۔ ان کی تلقین و تعلیم سے یہ حال ہوا کہ نماز با جماعت کی پابندی تو ایک طرف اکبر خود اذان دیتا۔ امامت کرتا اور مسجد میں اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتا۔

اکبر کا عبادت خانہ

اکبر کو ایک دفعہ سلطان الہند خواجہ اجمیری چشتی سے عقیدت پیدا ہوگئی اور پھر تو یہ حال ہوا کہ ہر سال اجمیر جاتا تھا۔ کوئی مہم یا خاص مراد ہو تو اس کے علاوہ بھی۔ یک منزل سے پیدل جاتا تھا اور بعض منتیں تو ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور سیکری یا آگرے سے اجمیر تک پیدل گیا۔ وہاں ہزاروں لاکھوں روپے چڑھاتا اور پہروں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔

اکبر شیخ سلیم چشتیؒ کا بڑا معتقد تھا، اور جب جہانگیر پیدا ہونے والا تھا تو حصول برکت کے لیے اس کی والدہ کو شیخ کے حجرے میں بھیج دیا اور انہی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا کہ جو جگہ اتنی روحانی برکتوں کا سرچشمہ ہے، وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر ہونا چاہیے۔ چنانچہ 1571ء میں فتح پور سیکری کی شاندار عمارتیں بننی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہ ہند کا پایۂ تخت ہوگیا۔

یہاں اکبر ایک پرانے حجرے میں اکثر اپنا وقت مراقبوں، دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا۔ مذہبی امور میں بالآخر اس کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ 1578ء میں اس نے شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی جس کا نام ''عبادت خانہ'' رکھا گیا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آکر یہاں دربار خاص منعقد ہوتا تھا جس میں مشائخ وقت، علماء و فضلا اور چند مقرب درگاہ پیش ہوتے تھے اور بادشاہ کے سامنے مختلف مذہبی مسائل پر آزادانہ بحث و تمحیص کرتے۔ وہ کچھ ایسا پڑھا لکھا نہ تھا کہ ذاتی طور پر کسی کتاب کا مطالعہ یا کسی امر کی تحقیق کرنے پر قادر ہوتا۔ البتہ جو سنتا، اسے دماغ میں بٹھا لیتا۔ ان مجالس میں اسے محسوس ہوا کہ علماء ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کج بحثی، تکبر اور بہتان طرازی پر اتر آتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک نے کسی بات کو حرام قرار دیا تو دوسرے نے اسے حلال ٹھہرا دیا۔

مختلف فرقوں اور مذاہب کے نظریات سنتے سنتے اکبر کے عقائد میں پہلے ہی سے لغزش پیدا ہو چلی تھی، علماء کے اس رویئے نے اسے صرف علماء ہی سے نہیں بلکہ اس مذہب سے بھی بدگمان کر دیا جس کے نمائندگی کے وہ مدعی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسی زمانے میں شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کا تقرب حاصل ہو گیا۔ وہ اپنی ''آزاد خیالی'' کے باعث علماء کے ہاتھوں بہت تکلیفیں جھیل چکے تھے۔

اب ان کا زور توڑنے کے لیے انہوں نے ایک ''محضر'' تیار کیا، جس کی رو سے اکبر کو سلطان عادل اور ''جگت گرو'' قرار دیتے ہوئے اس مختلف فیہ دینی مسائل میں اجتہاد کے وسیع اختیارات دے دیئے اور اس پر اکابر علماء کے

دستخط بھی ثبت کرائے۔ اگرچہ ''محضر'' میں اس کی تصریح موجود تھی کہ بادشاہ ان اختیارات سے صرف ایسے امور میں کام لے گا جو نص کے خلاف نہ ہوں اور عوام کی بہبود کا باعث ہوں، تاہم ایک ایسے دور میں جب کہ مہدویت اور بھگتی تحریک کی مقبولیت اور آزاد صوفیانہ طریقوں کی ترویج سے ملک میں ایک روحانی انتشار رونما ہو چکا تھا اور دربار میں ظلِ الٰہی کے ہر ارشاد کی از روئے کتاب و سنت تاویلات پیش کرنے والے بھی موجود تھے تو نص شرعی کے سراسر خلاف بدعتوں کا رواج پانا باعثِ حیرت نہیں ہونا چاہیے۔

''عبادت خانے'' کی مجالس اور ابوالفضل جیسے ندیموں کی بدولت اکبر کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ سچائی کسی ایک مذہب کا اجارہ نہیں، بلکہ ہر مذہب میں اچھی اچھی باتیں موجود ہیں اور اس معاملے میں اسلام کو کوئی برتری نہیں دی جا سکتی۔ اس رجحان کو دیکھ کر ہندو پنڈتوں اور مسیحی پادریوں کو اسلام، شارع اسلام اور شعائر اسلام کے خلاف زبان درازی کا موقع مل گیا۔ ان مجالس کی ابتدا تو بے لاگ تحقیقات سے ہوئی تھی اور بادشاہ کی کوشش یہ تھی کہ ہر مذہب کے عقائد و شعائر معلوم کیے جائیں، لیکن کچھ تو مخالف مولویوں کی ضد میں کچھ اپنی ہندو رانیوں کی دل داری اور راجپوت راجاؤں کی تالیف قلوب اور کچھ ابوالفضل جیسے مشیروں کے زیر اثر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ارکان دین اور اسلامی عقائد کے متعلق پہلے تو شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا، پھر نماز، روزہ اور ان سب باتوں کو جن کا تعلق نبوت سے ہے ''تقلیدیات'' کا نام دے دیا گیا۔ اکبر شروع شروع میں سنیوں کی ضد میں شیعوں اور ایسے صوفیوں کی طرف مائل ہوا تھا جو عقائد میں نسبتاً آزاد اور بے باک تھے، لیکن جب تعریض کی نوبت ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل) سے گزر کر ائمہ اثنا عشریہ اور انبیائے کرام تک پہنچی تو یہ بھی پیچھے ہٹ گئے اور انہیں بھی تقلید کا ملزم ٹھہرا دیا گیا۔ یہی حال پارسی موبدوں اور پرتگیز پادریوں کا ہوا، جنہیں یہ خیال ہو چلا تھا کہ اکبر ان کا مذہب قبول کر لے گا۔ دراصل بادشاہ اور اس کے مشیر ہر مذہب کو اپنے علم و عقل کی کسوٹی پر کستے تھے اور جو چیز ان کی سمجھ میں نہ آتی (جیسے حشر و نشر، وحی، رسالت وغیرہ) اسے بے تکلف رد کر دیتے۔ چونکہ تحقیق کرنے والا فرد واحد، ایک مطلق العنان بادشاہ تھا، اس لیے اکثر لوگ اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر ریاکاری سے اور بادشاہ کے میلان کے مطابق سخن سازی سے کام لیتے۔

اکبر کے اس نئے مذہب یا مذہبی حکمتِ عملی کے واقعات کے عینی شاہد کئی ہیں، مثلاً بخشی نظام الدین (مصنف طبقاتِ اکبری)، ابوالفضل (مصنف اکبر نامہ و آئینِ اکبری)، ملا عبدالقادر بدایونی (مصنف منتخب التواریخ)، اسد بیگ (مصنف اکبر نامہ)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مصنف تاریخ حقی) اور ان کے بیٹے شیخ نور الحق محدث (مصنف زبدۃ التواریخ) اور پرتگیز پادری، جن کے تین وفود مختلف وقتوں میں آئے اور دربار اکبری سے مدتوں وابستہ رہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے رنگ اور اسلوب میں اکبر کے مذہب پر قلم اٹھایا ہے اور ان کے بعد آنے والے مؤرخین نے تو اس کے ''دین الٰہی'' پر دفتر کے دفتر قلم بند کیے ہیں۔ یہاں موضوع بحث کی ضرورت کی حد تک ان سب کا خلاصہ درکار ہے، اور جس خوبصورتی اور جامعیت سے مولانا مودودی مرحوم نے خلاصۃً نقشہ کھینچا ہے، وہ شاید و باید۔ لہٰذا مولانا صاحب ہی کا خلاصہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے، البتہ کہیں کہیں اضافے بھی کیے گئے ہیں جن کی

نشاندہی کے لیے توسین استعمال کی گئی ہیں:

''اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملتِ اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی، یہ کسی مہذب و شائستہ قوم کے لیے موزوں نہیں۔ نبوت، وحی، حشر ونشر، دوزخ و جنت، ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ قرآن کا کلام الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب وعذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ ہر آئینہ ممکن۔ معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا۔ ذاتِ نبویؐ پر اعتراضات کئے جاتے۔ خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد اور آپ کے غزوات وسرایا پر کھلم کھلا حرف گیریاں کی جاتیں، یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمدؐ سے بھی بے زاری ہوگئی اور جن کے ناموں میں یہ لفظ شامل تھے، ان کے نام بدلے جانے لگے۔ دنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی۔ بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجال کی نشانیاں ہادی اعظمؐ پر چسپاں کرنے لگے (العیاذ باللہ، العیاذ باللہ)۔ دیوان خانہ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ ابوالفضل نے نماز، روزہ، حج اور دوسرے دینی شعائر پر سخت اعتراضات کئے اور ان کا مذاق اڑایا۔ شعراء نے ان شعائر دینی کی ہجو لکھی جو عوام کی زبانوں تک جا پہنچی۔

ادھر حاشیہ نشینوں نے یہ بات اڑادی کہ بعثت نبوی پر ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد اسلامی شریعت کی عمر پوری ہو چکی ہے، لہٰذا ایک نئے دین اور ایک نئے شارع کی ضرورت ہے اور اس منصب کے لیے اکبر ہی سزاوار ہے۔ اس کی تصدیق میں جھوٹی پیش گوئیاں، اقوال اور اشعار پیش کئے گئے اور بالآخر ''دین الٰہی اکبر شاہی'' کا اعلان کر دیا گیا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نہم)

پرتگیز پادری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر مسلمان نہ رہا تھا، بلکہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ بادشاہ نے یہ حکم دے دیا تھا کہ نئی مسجدیں تعمیر نہ ہوں۔ پرانی مسجدوں کی مرمت نہ ہو۔ یہ کہ اس کے آخری ایام حکومت میں لاہور شہر میں کوئی مسجد نہ رہی تھی اور مسجدوں کو اصطبل بنادیا گیا تھا۔ ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے لیے ایک کے سوا سب بیویاں اپنے درباریوں میں تقسیم کر دیں اور پرتگیز پادریوں سے وعدہ کیا کہ میں حج کے بہانے گوا آؤں گا اور وہاں عیسائی ہو جاؤں گا۔

اکبر کا دینِ الٰہی

بہائی نظریئے کی بنیاد بھی دراصل اکبری عہد ہی میں پڑی تھی۔ اس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمدؐ کی بعثت پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی، اس لیے اب وہ منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریئے کو سکوں کے ذریعے پھیلایا گیا، کیونکہ اس زمانے میں نشر واشاعت کا سب سے زیادہ قوی ذریعہ یہی تھا۔ اس کے بعد ایک نئے دین اور نئی شریعت کی طرح ڈالی گئی، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر ایک مخلوط مذہب بنایا جائے، تاکہ شاہی حکومت مستحکم ہو۔ دربار کے خوشامدی ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی طرف سے پیشین گوئیاں سنانی شروع کر دیں کہ فلاں زمانے میں ایک نور کھشک مہما تما بادشاہ پیدا ہوگا۔ اسی طرح بندۂ زر علما نے بھی اکبر کو مہدی اور صاحب زماں اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک ''تاج العارفین'' صاحب یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسان کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت

سے خدا کا عکس (ظلِ الٰہی) ہی ٹھہرا دیا۔ عوام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا کہ حق اور صدق (عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں موجود ہیں۔ کوئی ایک ہی دین حق کا اجارہ دار نہیں۔ لہٰذا سب مذہبوں میں جو جو باتیں حق ہیں انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوتِ عام دینی چاہیے تاکہ ملتوں کے سب اختلافات مٹ جائیں۔ اسی طریق جامع کا نام دین الٰہی ہے۔ اس نئے دین کا کلمہ ''لا الہ الا، اکبر خلیفۃ اللہ'' تجویز کیا گیا۔ جو لوگ اس دین میں داخل ہوتے، ان کو دین اسلام سے توبہ کر کے ''دین الٰہی اکبر شاہی'' میں داخل ہونا پڑتا تھا اور داخل ہونے کے بعد ان کو لفظ ''چیلا'' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ سلام کا طریقہ بدل کر یوں کر دیا گیا کہ سلام کرنے والا ''اللہ اکبر'' اور جواب دینے والا ''جل جلالہ'' کہتا۔ یاد رہے کہ بادشاہ کا نام جلال الدین اور لقب اکبر تھا۔ چیلوں کو بادشاہ کی تصویر دی جاتی اور وہ اسے پگڑی میں لگاتے۔ بادشاہ پرستی اس دین کے ارکان میں ایک رکن تھی۔ ہر روز صبح کو بادشاہ کا درشن کیا جاتا اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اس کے سامنے سجدہ بجالایا جاتا۔ علماء کرام اور صوفیائے باصفا دونوں اپنے اس قبلۂ حاجات اور کعبۂ مرادات کو بے تکلف سجدہ فرماتے تھے اور صریح شرک کو ''سجدۂ تحیہ'' اور ''زمین بوسی'' جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ یہ وہی ملعون حیلہ بازی تھی جس کی پیشین گوئی رسول کریم ﷺ نے فرمائی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ حرام چیز کا نام بدل کر اس کو حلال کر لیا کریں گے۔

اس نئے دین کی بنیاد تو یہ کہہ کر رکھی گئی تھی کہ اس میں بلاکسی تعصب کے، ہر مذہب کی اچھی باتیں لی جائیں گی، مگر دراصل اس میں اسلام کے سوا ہر مذہب کی پذیرائی تھی اور نفرت وعداوت کے لیے صرف اسلام اور اس کے احکام وقوانین ہی کو مختص کر لیا گیا تھا۔ پارسیوں سے آتش پرستی لی گئی۔ اکبری محل میں دائمی آگ کا الاؤ روشن کیا گیا اور چراغ روشن کرنے کے وقت ''قیام تعظیمی'' کیا جانے لگا۔ عیسائیوں سے ''ناقوس نوازی'' اور ''تماشائے صورتِ ثالثِ ثلاثہ'' اور اسی قسم کی چند چیزیں لی گئیں سب سے زیادہ نظر عنایت ہندوویت پر تھی، کیونکہ یہ ملک کی اکثریت کا مذہب تھا اور پادشاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے اس کی استمالت ضروری تھی۔ چنانچہ گائے کا گوشت حرام کیا گیا۔ ہندو تہوار دیوالی، دسہرہ، راکھی، پونم، شیوراتری وغیرہ پوری ہندوانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ شاہی محل میں ہون کی رسم ادا کی جانے لگی۔ دن میں چار وقت آفتاب کی عبادت کی جاتی اور آفتاب کے ایک ہزار ناموں کا جاپ کیا جاتا۔ آفتاب کا نام جب زبان پر آتا ''جلت قدرتہ'' کے الفاظ کہے جاتے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ کندھے اور کمر پر جنیوڈالا جاتا اور گائے کی تعظیم کی جاتی۔ معاد (جزا سزا) کے متعلق عقیدۂ تناسخ تسلیم کر لیا گیا اور برہموں سے ان کے دوسرے بہت سے اعتقادات سیکھے گئے۔

اسلام کے معاملے میں تو بادشاہ اور درباریوں کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو اسلام سے ضد اور چڑ ہوگئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف دوسرے مذاہب والوں کی طرف سے جو بات دربار کا رنگ دیکھ کر فلسفیانہ وصوفیانہ انداز میں پیش کر دی جاتی، اسے وحی آسمانی سمجھ لیا جاتا اور اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم رد کر دی جاتی۔ علماء اسلام اگر اسلام کی طرف سے کوئی بات کہتے یا کسی گمراہی کی مخالفت کرتے تو انہیں ''فقیہ'' کے نام سے موسوم کیا

جاتا، جس کے معنی ان کی اصطلاحِ خاص میں احمق اور ناقابلِ التفات آدمی کے ہو گئے تھے۔ چالیس آدمیوں کی ایک کمیٹی مذاہب کی تحقیق کے لیے مقرر کی گئی تھی، جس میں تمام مذاہب کا مطالعہ بڑی رواداری، بلکہ عقیدت مندی کے ساتھ کیا جاتا تھا، مگر اسلام کا نام آتے ہی اس کا مذاق اڑایا جانے لگتا تھا، اور اگر اسلام کا کوئی حامی جواب دینا چاہتا تو اس کی زبان بند کر دی جاتی تھی۔ یہ برتاؤ اسی حد تک نہ رہا، بلکہ عملاً اسلام کے احکام کی دل کھول کر ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ سود، جوئے اور شراب کو حلال کیا گیا۔ شاہی مجلس میں نوروز کے موقع پر شراب کا استعمال ضروری تھا، حتیٰ کہ قاضی و مفتی تک پی جاتے تھے۔ ڈاڑھی منڈوانے کا فیشن عام کیا گیا اور اس کے جواز پر دلائل قائم کیے گئے۔ چچا زاد اور ماموں زاد بہن سے نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لڑکے کے لیے سولہ سال اور لڑکی کے لیے چودہ سال عمر نکاح مقرر کی گئی۔ ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت کی گئی۔ ریشم اور سونے کے استعمال کو حلال کیا گیا۔ شیر اور بھیڑیے کو حلال کیا گیا۔ سؤر کو اسلام کی ضد میں نہ صرف پاک بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ صبح آنکھ کھولتے ہی اسے دیکھنا مبارک خیال کیا جاتا تھا۔ مردوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا احسن ٹھہرایا گیا۔ اور اگر کوئی دفن ہی کرنا چاہے تو سفارش کی گئی کہ پاؤں قبلے کی طرف رکھے جائیں۔ اکبر خود اسلام کی ضد میں قبلے کی طرف پاؤں کر کے سونے کا التزام کرتا تھا۔ حکومت کی تعلیمی پالیسی بھی سراسر اسلام کے مخالف تھی۔ عربی زبان کی تعلیم اور فقہ و حدیث کا درس ناپسندیدہ سمجھا جاتا اور جو لوگ یہ علوم حاصل کرتے، وہ حقیر خیال کیے جاتے۔ علوم دینی کے بجائے حکمت و فلسفہ، ریاضی و تاریخ اور اس نوع کے علوم کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ زبان میں ہندیت پیدا کرنے کی طرف خاص میلان تھا اور عربی حروف کو زبان سے خارج کرنے کی بھی تجویزیں تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے دینی مدرسے ویران ہونے لگے اور اکثر اہلِ علم ملک چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگے۔

''یہ تو تھا حکومت کا حال۔ اور عوام کا حال یہ تھا کہ جو لوگ باہر سے آئے تھے، وہ ایران و خراسان کی اخلاقی و اعتقادی بیماریاں ساتھ لائے تھے اور جو لوگ ہندوستان ہی میں مسلمان ہوئے تھے، ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، اس لیے وہ پرانی جاہلیت کی بہت سی باتیں اپنے خیالات اور اپنی عملی زندگی میں لیے ہوئے تھے۔ ان دونوں قسم کے مسلمانوں نے مل جل کر ایک عجیب مرکب تیار کیا تھا، جس کا نام ''اسلامی تمدن'' تھا۔ اس میں شرک بھی تھا۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ اوہام و خرافات بھی تھے۔ اور نو ایجاد رسموں کی ایک نئی شریعت بھی تھی۔ دنیا پرست علماء و مشائخ نے نہ صرف اس مخلوطے سے موافقت کر لی تھی، بلکہ وہ اس نئے ''مت'' کے پروہت بن گئے تھے۔ لوگوں کی طرف سے ان کو نذرانے پہنچتے اور ان کی طرف سے لوگوں کو فرقہ بندی کا تحفہ ملتا۔

''پیرانِ طریقت کے ہاتھوں سے ایک اور بیماری پھیل رہی تھی۔ اشراقیت، رواقیت، مانویت اور ویدانیت کی آمیزش سے ایک عجیب قسم کا فلسفیانہ تصوف پیدا ہو گیا تھا جسے اسلام کے اعتقادی و اخلاقی نظام میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ طریقت و حقیقت، شرعِ اسلامی سے الگ اور اس سے بے نیاز قرار دی گئی تھیں۔ باطن کا کوچہ ظاہر سے جدا بنا لیا گیا تھا اور اس کے کوچے کا قانون یہ تھا کہ حدودِ حلال و حرام رخصت، احکامِ دین عملاً منسوخ، اور ہوائے نفس کے ہاتھ میں کُلّی اختیارات۔ جس فرض کو چاہے، ساقط کرے اور جس چیز کو چاہے، فرض بلکہ فرض الفرض بنا دے۔ جس حلال کو چاہے

حرام کر دے اور جس رسم کو چاہے حلال کر دے۔ ان عام پیرولوں سے بہتر جن کی حالت تھی، ان پر کم و بیش فلسفیانہ تصوف کے اثرات پڑے ہوئے تھے اور وحدت الوجود کے ایک غلط تصور نے خصوصیت کے ساتھ تمام قوائے عمل کو بے کار کر دیا تھا۔''

یہ حالات تھے، جب اکبر سلطنت کے ابتدائی ایام میں شیخ احمد سرہندی (1563ء - 1624ء) پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اس دور کے صالح ترین لوگ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی باللہ سے پہنچا تھا۔ جب حضرت کے ساتھ راہ و رسم کی ابتداء ہوئی تھی، اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے ایک دوست کو لکھا تھا: ''حال میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ ہی اس کی نشست و برخاست ہوئی ہے۔ اس دوران میں اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا، اس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دے گا۔''

آگے چل کر، تین سو سال بعد شیخ کے ایک عقیدت مند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ''تذکرہ'' میں شیخ سرہندی کو ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا: ''دعوت کا مقام دوسرا ہے اور ''عزیمتِ دعوت'' کا دوسرا۔ ضرور نہیں کہ ہر رہرو کی یہاں تک رسائی ہو۔ عہد ظہور دعوت میں ہزاروں اصحاب علم و کمال موجود ہوتے ہیں مگر دروازے کا کھولنے والا صرف مجدد العصر ہی ہوتا ہے، اور اس کے ظہور کے لیے ضروری نہیں کہ تمام اصحاب علم و حق بالکل معدوم ہو گئے ہوں۔ خود ہندوستان ہی کی تاریخ دیکھ لو، ہمیشہ ایسا ہی معاملہ نظر آئے گا۔ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہدِ جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء و مشائخ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود تھے، لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا وجودِ گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔''

اپنے ممدوح کو تن تنہا کاروبار کا کفیل قرار دیتے ہوئے ضروری تھا کہ اس کے ہم عصروں کے اوصاف کا رنگ کسی قدر پھیکا کیا جائے۔ چنانچہ مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں: ''معلوم ہے کہ اس عہد میں بڑے بڑے علماء و اصحاب خانقاہ موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے کوئی نہیں بستا۔ کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔ علماء میں شیخ وجیہہ گجراتی، شیخ علی متقی، شیخ جلال تھانیسری، ملا محمود جونپوری، مولانا یعقوب کشمیری، ملّا قطب الدین سہالوی، شیخ عبدالحق محدث، ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا الہداد جونپوری وغیرہم، اپنے وقتوں کے مالک اور علم و تعلّم کے بادشاہ تھے۔ بایں ہمہ دوسرے گوشوں اور کاموں میں وقت بسر کر گئے۔ اس راہ میں تو ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا۔ جو حالت اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام کابل و ترکستان و خراسان کی ہو رہی تھی، ان سب کے سامنے تھی۔ سب اس پر آہ و فغان بھی کرتے ہیں، مگر اس کے آگے معاملہ نہیں بڑھتا''۔

علماء حق کی آزمائش

اس بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''اس دور میں ایسے صالح ترین لوگ موجود تھے، جو اگرچہ اپنے

گردوپیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، مگر کم از کم اپنے ایمان اور عمل کو بچائے ہوئے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا، دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے"۔

میاں محمد افضل اپنی تالیف (اعلائے کلمۃ الحق کی روایت اسلام میں) کے صفحہ 221 پر رقم طراز ہیں: "اکبر نصف صدی پر مشتمل اپنی حکمرانی کے عرصے میں اسلام کی عمارت کو زمین بوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک جابر اور نشۂ اقتدار میں بدمست اور گمراہ جابر و قاہر بادشاہ کی پالیسیوں کے خلاف حق کی آواز بلند کرنا آسان نہ تھا، مگر چند لوگوں نے کلمۂ حق بلند کرنے کی کوشش کی، وہ واقعی جان سے کھیل گئے۔۔۔۔ اسلام کا یہ ایک دائمی اور زندہ معجزہ ہے کہ سخت سے سخت جابر حکمران کے دور میں بھی کلمۂ حق کہنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور فاسق و فاجر اور ظالم حکمرانوں کے سامنے تمام زبانیں خاموش رہتیں تو اسلام میں بہت بڑا رخنہ پیدا ہو جاتا اور دین حق میں بگاڑ کو روکنا محال ہوتا۔ چنانچہ دورِ اکبری میں بھی چند حضرات ایسے اٹھے جنھوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر حق بات کہی"۔

مثلاً صدر الدور شیخ عبدالنبی، انہوں نے ابتدا میں شیخ مبارک (ابوالفضل کے والد اور فساد کی جڑ) کی تیار کردہ اس "محضر" پر دیگر علمائے سو کے ساتھ دستخط ثبت کئے تھے جس میں بادشاہ کو "مجتہد" قرار دیا گیا تھا۔ تاہم بعد ازاں شیخ عبدالنبی نے بادشاہ کی کفر نوازی اور لادین پرستی (سیکولرازم) کی پالیسی سے کھلم کھلا اختلاف کیا۔ وہ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے۔ یہ وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہیں جنہوں نے اکبر کے والد بادشاہ ہمایوں کی اس بنا پر مخالفت کی تھی کہ "ہمایوں بادشاہ اسلام کو تباہ کرتا ہے اور کفر و اسلام کے مابین فرق نہیں کرتا"۔ انہی بزرگ کے خلفاء میں حضرت مجدد الف ثانی کے والد شیخ عبدالاحد بھی تھے، لیکن دنیا پرست بالکل نہ تھے۔ نہایت نیک، پارسا اور تقویٰ و پرہیز گاری میں فرد تھے۔ (رودِ کوثر)

اکبر عنفوان شباب میں علماء کا معتقد تھا۔ شیخ عبدالنبی کا اس قدر ادب کرتا تھا کہ ایک دفعہ ان کے جوتے اٹھا کر ان کے سامنے رکھے۔ بعد میں جب اکبر پر ہندوانہ رنگ چڑھنے لگا تب بھی شیخ اس کی توجہ شرع اسلامی کے رنگ کی طرف دلاتے رہے۔ ایک دفعہ بادشاہ اپنی سالگرہ کی تقریب میں بسنتی رنگ میں رنگے کپڑے پہن کر آیا تو شیخ عبدالنبی نے بادشاہ کو سب کے سامنے ٹوک دیا۔ شیخ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ انہوں نے ٹوکتے ہوئے عصا کو بادشاہ کی طرف حرکت دی اور عصا کا سرا بادشاہ کو لگا۔ اس وقت تو اکبر سب کے سامنے خاموش ہو گیا لیکن دل میں بہت برا محسوس کیا۔

حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ بادشاہ اور شیخ کے درمیان تصادم ناگزیر ہو گیا۔ اس کی فوری وجہ متھرا میں توہین رسالت کا واقعہ ہوا۔ ہندوؤں کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ بانی اسلام کی توہین کے واقعات شروع ہو گئے۔ متھرا میں مسلمانوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کرنے کے لیے اینٹیں اور دوسرا تعمیراتی ساز و سامان جمع کیا تو ایک با اثر برہمن نے اس پر قبضہ کر کے اسے مندر کی تعمیر میں لگا دیا۔ جب مسلمانوں نے مزاحمت کی تو اس نے پیغمبر اسلام کو گالیاں دیں اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شاتم رسول کے خلاف بادشاہ کے پاس شکایت کی گئی، لیکن بادشاہ نے توہین رسالت کے مرتکب ہندو کے خلاف کارروائی عمل میں لانے سے عمداً گریز کیا۔ بادشاہ نے توجہ نہ کیا، لیکن

مذہبی امور کے انچارج صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے حکم اور فتویٰ پر اس برہمن کو قتل کر دیا گیا۔ اس قتل پر اکبر نے شدید ردعمل کا اظہار کیا، کیونکہ اس کی ہندو رانیوں نے برہمن کے قتل پر باقاعدہ سوگ منایا تھا اور اکبر کو طعنے دیئے تھے کہ وہ بادشاہ ہو کر بھی علماء کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اکبر کو سخت تاؤ آیا اور چند ماہ بعد حج اور خیر خیرات کے کاموں کے بہانے صدر الصدور کو حجاز کی طرف بھیج دیا۔ یہ دراصل جلاوطنی تھی کیونکہ بادشاہ کی طرف سے یہ حکم بھی تھا کہ حجاز سے وہ بلا اجازت ہندوستان واپس نہ آئیں۔ شیخ عبدالنبی حجاز چلے گئے، حج ادا کیا، لیکن اگلے سال واپس آ گئے۔ اس پر انہیں بادشاہ کے حکم پر گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں فتح پور سیکری میں بادشاہ کے سامنے گرفتاری کی حالت میں پیش کیا گیا۔ اکبر نے ان سے نہایت درشت لہجے میں گفتگو کی اور ان کی اہانت کی۔ اس کے بعد بھرے دربار میں ان کے منہ پر مکا مارا۔ شیخ نے اس موقع پر نہایت جرأت کے ساتھ بادشاہ کی سب باتوں کا جواب دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں قیدِ سخت میں ڈال دیا جائے۔ حکم شاہی کی تعمیل ہوئی۔ وہ دیر تک قید خانے میں رہے۔ اسی دوران میں انہیں بادشاہ کے حکم پر گلا دبا کر ختم کر دیا گیا۔

ایک اور بزرگ شیخ منور بنی اسرائیل اکبر کے عتاب کا نشانہ بنے۔ ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ عہد اکبری میں پنجاب سے متعدد علمائے اسلام نے اکبری فتنوں کے خلاف آواز اٹھائی، جن کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ اکثر کو جلاوطن کیا گیا۔ شیخ منور لاہور میں مسند درس سنبھالے ہوئے تھے۔ بلند پایہ عالم تھے۔ فقہی احکام میں بہت سخت تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں علمائے سو کے اس فتوے کی تردید کی گئی تھی کہ توہین رسالت کے مجرم، شاتم رسول کو معافی دی جا سکتی ہے۔ وہ اسی بناء پر معتوب ٹھہرے۔ انہیں مسلسل پانچ سال تک گوالیار کے قلعے (عقوبت خانہ) میں قید رکھا گیا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جس میں ڈیڑھ ہزار کتابیں تھیں، بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ قید سے رہائی کے بعد انہیں انتہائی عسرت اور پریشانی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔

عہد اکبری میں سب سے زیادہ جرأت کا مظاہرہ جون پور کے ایک شیعہ عالم اور قاضی ملا محمد یزدی نے کیا۔ ملا یزدی نے جب بادشاہ کی بوالعجبیوں اور خرافات کا حال سنا تو کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر علی الاعلان یہ فتویٰ جاری کیا کہ "بادشاہ ہند جلال الدین اکبر گمراہ ہو چکا ہے اور اب اس کے خلاف جہاد واجب ہے"۔ ملا یزدی کی یہ حق گوئی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور اکبر کی اسلام دشمنی کے خلاف علماء کے درمیان اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ ایسا ہی ایک فتویٰ بنگال کے قاضی القضاۃ معز الملک نے بھی جاری کیا۔ اکبر نے ان دونوں علماء کو بہانے سے بلایا۔ جب وہ آگرے سے دس کوس پر فیروز آباد میں پہنچے تو حکم دیا گیا کہ ان دونوں کو الگ کر کے دریائے جون کے راستے گوالیار پہنچا دو، جہاں ملکی مجرموں کا جیل خانہ تھا۔ پھر حکم ہوا کہ ان کا خاتمہ کر دو۔ چنانچہ پہرے داروں نے انہیں ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا اور تھوڑی دور جا کر گرداب کی گود میں دفن کر دیا"۔ (رود کوثر)

اکبر نے تعداد ازواج میں اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیا تھا اور علمائے سو سے اپنے لئے متعہ بھی جائز قرار دلوایا تھا۔ بنگال کے عالم دین قاضی یعقوب مانک پوری نے متعہ کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ اکبر نے انہیں گوالیار کے قید خانے میں قید کرنے کا حکم دیا۔ وہ بنگال سے گوالیار کی طرف گرفتاری کی حالت میں لائے جا رہے تھے کہ حکم ملا

انہیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ حق گوئی کی پاداش میں قاضی یعقوب کو رستے ہی میں عدم آباد کا رستہ دکھا دیا گیا۔ جس کسی نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت کی تو اسے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ امرائے دربار قطب الدین کوکہ اور شہباز خان کنبوہ نے دلیری کے ساتھ بادشاہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ چونکہ دونوں نہایت با اثر امراء تھے، اس لیے اکبر ان پر غضبناک ہونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔

عہد اکبری کے حق گو علماء کی فہرست میں ایک نام شیخ عبدالقادر گیلانی اوچی کا ہے۔ وہ مخدوم موسیٰ پاک شہید کے بھائی تھے (جن کا مزار ملتان میں پاک گیٹ کے اندر ایک احاطے میں ہے)۔ دونوں بھائی اکبر کے دربار میں رہے۔ سلسلہ قادریہ سے تعلق تھا۔ دونوں نے غیر شرعی امور میں بادشاہ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے انہیں محل کے پاس ''عبادت خانے'' میں فرض نماز کے بعد نوافل پڑھتے دیکھا تو کہا کہ آپ کو نوافل گھر جا کر پڑھنے چاہئیں۔ اس پر شیخ نے بادشاہ سے کہا: ''یہ عبادت کی جگہ ہے اور یہاں آپ کی حکومت نہیں چلتی''۔ اس پر بادشاہ نے انہیں دارالحکومت اور دربار سے نکال دیا اور وہ اوچ جا کر لوگوں کے روحانی افادے میں مصروف ہو گئے۔ موسیٰ پاک شہید کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ نماز کا وقت ہو جانے پر دیوان خانے میں جا نماز بچھا کر عبادت میں مصروف ہو جاتے تھے اور بادشاہی رعب کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

شیخ حسین اجمیری (متولی درگاہ اجمیر) بھی ایک ایسے ہی حق گو فرد تھے۔ ایک بار اکبر اجمیر گیا تو شیخ حسین، بادشاہ کا استقبال وغیرہ کرنے کی بجائے اجمیر سے باہر چلے گئے۔ بادشاہ کو ان کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا اور عتاب کر کے انہیں درگاہ کی تولیت سے ہٹا دیا اور مکہ چلے جانے کا حکم دیا۔ شیخ حسین کچھ عرصے کے بعد حجاز سے واپس آئے لیکن دربار میں پہنچ کر ''سجدہ تعظیمی'' نہیں کیا۔ اس پر اکبر پہلے سے بھی زیادہ ناراض ہوا اور سندھ میں بھکر کے قلعے میں محبوس کر دیا، جہاں وہ کئی سال رہے۔ رہائی ملی تو دربار میں پہنچے لیکن آداب سلطانی بجالانے سے احتراز کیا۔ علاوہ ازیں بادشاہ کا عطیہ قبول کرنے سے بھی انکار کیا۔ بادشاہ کا عتاب پھر نازل ہوا۔

شیخ فرید کا شمار اکبر اور جہانگیر کے با اثر امراء میں ہوتا ہے۔ شیخ فرید راسخ العقیدہ شخص تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ اور ان کے خلیفہ خاص حضرت مجدد الف ثانی سے روابط تھے۔ حالات کی نزاکت دیکھ کر بادشاہ اکبر کو راہِ راست پر لانے کی سعی لاحاصل کرنے کی بجائے، شیخ فرید نے مناسب سمجھا کہ گمراہی، بدمذہبی اور لادینی کے جراثیم کو دربار سلطنت سے باہر پھیلنے سے روکا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے خصوصاً حضرت مجدد کی ہدایات اور رہنمائی میں کام کیا۔ شیخ فرید بخاری سیّد تھے۔ اپنی ذہانت، شجاعت، دانائی اور سخاوت کی بنا پر دربار سلطنت میں بہت رسوخ رکھتے تھے اور میر بخشی کے عہدے پر متمکن ہوئے تھے۔ جہانگیر نے انہیں ''صاحب سیف وقلم'' کا خطاب دیا تھا۔ نقشبندی بزرگوں کی اعانت کر کے شیخ فرید نے تجدید و احیائے اسلام کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں، اسی لیے خواجہ باقی باللہ نے وصیت کی تھی کہ شیخ فرید کے حقوق کا ان کے تمام مرید خاص خیال رکھا کریں۔

ملا واحدی اپنی کتاب ''تاثرات'' میں لکھتے ہیں: ''شیخ فرید وہ امیر ہیں جنہیں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے

مرتے وقت تمام بااثر امراء نے اپنا نمائندہ بنا کر جہانگیر کے پاس بھیجا تھا کہ ہم آپ کی حمایت کے لیے تیار ہیں مگر یہ فرمائیے کہ باپ کی طرح کوئی نیا دین تو کھڑا نہ کیجئے گا"۔

شہنشاہ جہانگیر کا دور آیا تو کچھ عرصہ تک عہدِ اکبری کے رسوم وطریقے رائج رہے۔ تاہم اسلام کی علانیہ مخالفت باقی نہیں رہی تھی۔ اس دور میں کچھ بزرگوں نے جان پر کھیل کر کلمۃ الحق بلند کیا۔ ان میں اہم ترین اور تاریخ ساز کردار شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی نے ادا کیا۔

جہانگیر کا مذہب

اکبر بادشاہ نے 1605ء میں وفات پائی اور مُلّا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" 1595ء پر ختم ہو جاتی ہے۔ ابوالفضل کا قتل 1602ء میں ہوا اور اکبر کے مرنے سے پہلے اس کی کتاب "آئین اکبری" اور "اکبر نامہ" ختم ہو گئے۔ پس اکبر کے مذہبی خیالات کے تغیرات کا ذکر آخری دس برس میں کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ شہنشاہ اکبر کے مذہبی خیالات ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں کہ آخری دس سال میں ان میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی۔

جہانگیر نے اپنی چھوٹی توزک میں باپ کے مرنے کا حال بہت دلچسپ لکھا ہے۔ روز سہ شنبہ، ہشتم جمادی الاولی کو میرے باپ مرشد کا سانس تنگ ہوا اور وقتِ رحلت قریب آ گیا۔ فرمایا "کسی آدمی کو بھیج کر میرے کل امراء اور مقربوں کو بلاؤ، تاکہ میں تجھ کو ان کے سپرد کروں، اور اپنا کہا سنا ان سے معاف کراؤں۔ انہوں نے برسوں میری ہم رکابی میں جانفشانی کی ہے"۔

امراء حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کی طرف منہ کر کے اپنا کہا سنا معاف کرایا اور چند فارسی اشعار پڑھے۔ مرنے کے وقت والد بزرگوار اور میرے مرشد نے فرمایا "میراں صدر جہاں کو بلاؤ کہ وہ کلمۂ شہادت پڑھے"۔ میراں صدر جہاں (اس وقت کے سب سے بڑے عالم) حاضر ہوئے اور دوزانو ادب سے بیٹھ کر کلمۂ شہادت پڑھنا شروع کیا۔ بادشاہ نے خود اپنی زبان سے کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھا، اور میراں صدر جہاں سے فرمایا کہ سرہانے بیٹھ کر سورۂ یاسین اور دعاء عدیلہ پڑھیں۔ جب میراں صدر جہاں نے سورہ یاسین پڑھ کر دعائے عدیلہ ختم کی تو بادشاہ کی آنکھ سے آنسو نکلے اور جان آفرین کو جاں سپرد کی"۔

گویا دینِ الٰہی کے موجد اکبر نے ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے وفات پائی۔ "رودِ کوثر" کے مصنف شیخ محمد اکرام کو اس اندراج پر شبہ ہے، لیکن وہ اپنے شبے کی وجہ بیان کرنے کی بجائے اس کے حق میں ثبوت و دلائل پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں "سفرِ انگلستان سرطامس رو، جو اس واقعے کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا اور جس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکر شاہی سے لکھا۔ اس کا خیال ہے کہ اکبر کی وفات بطور ایک مسلمان ہوئی۔ اسی طرح جب پرتگیز پادری بوٹیلر سے بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہ نے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر فوت ہوا تو پادری صاحب نے بڑے افسوس سے کہا کہ میری تو خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا، لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دین محمد ﷺ پر ہی مرا"۔

اس وقت اسلام کے لیے اکبر کے عقائد سے بھی زیادہ اہم مسئلہ اس کے جانشین کے مذہب کا تھا۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں کوشش ہو رہی تھی کہ جہانگیر کی بجائے جہانگیر کا بیٹا خسرو جانشین ہو۔ خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی اور خسرو راجا مان سنگھ کا قرابت دار تھا۔ ان دونوں نے اس کے حق میں کوشش کی، لیکن بعض مسلمان امراء اور بالخصوص شیخ فرید نے اس موقع پر بڑی قابلیت دکھائی۔ انہوں نے نہ صرف جہانگیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا۔ بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانینِ اسلام کا احترام کرے گا۔

پرتگیز پادری جو اس زمانے میں آگرے میں موجود تھے اور اکبر کو مرتے وقت ہی بپتسمہ دینے کے لیے لحظہ لحظہ کی خبر منگاتے رہتے تھے۔ اس واقعے کی نسبت لکھتے ہیں (بحوالہ ''رودِ کوثر''): امراء نے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانوناً حق دار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر (شیخ فرید) جسے دوسرے امراء نے اپنا نمائندہ چنا تھا، شہزادہ (جہانگیر) کے پاس آیا اور امراء کی طرف سے اس سے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے، بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدیؐ کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے خسرو یا اس کے طرف داروں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شہزادے نے ان شرطوں کو پورا کرنے کی قسم اٹھائی اور بہت سے طرفداروں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو چلا''۔

قدرت نے فطری طور پر جہانگیر کو بہتر استعداد اور صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ وہ جس طرح اپنے ذاتی حقوق، منافع اور عیش و عشرت کی حفاظت چاہتا تھا، اسی طرح وہ رعایا کے راحت و آرام اور آسودگی کا بھی خواہاں تھا۔ رعایا کا درد اس کے دل میں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ پر فرض ہے کہ وہ جنگل کے درندوں اور چرندوں اور ہوا کے پرندوں تک کی حفاظت کرے اور اپنے تخت کے نیچے کے جانوروں کی بھی حق رسی کرے''۔ چنانچہ وہ اپنی ''تو زک'' میں لکھتا ہے۔

> ''جلوس کے بعد سب سے پہلا حکم مجھ سے صادر ہوا کہ زنجیر عدل آویزاں کی جائے تاکہ اگر دارالعدالت کے کارپرداز ستم رسیدوں اور مظلوموں کی دادرسی میں سستی یا کوتاہی کریں تو یہ مظلوم اس زنجیر تک پہنچ کر بذاتِ خود مجھ کو آگاہ کر سکیں''۔

یہ چار من سونے کی زنجیر تھی جس کا ایک کنارہ قلعہ آگرہ کے شاہ برج پر تھا اور دوسرا کنارہ دریائے جمنا کے دوسرے کنارے پر ایک چٹان سے بندھوا دیا گیا تھا۔ اس زنجیر میں ساٹھ گھنٹیاں تھیں۔ یہ زنجیر استعمال کر کے فریادی براہ راست شہنشاہ کے حضور فریاد کر سکتا تھا۔

بارہ قوانین

جہانگیر ''تو زک'' میں لکھتا ہے: ''اس کے ساتھ ساتھ میں نے بارہ احکام صادر کیے تاکہ ان کو دستور العمل قرار دے کر تمام محروسہ ممالک میں ان پر عمل کیا جائے:

1۔ تمغا اور میر بحری نامی محصولات اور ہر قسم کے ٹیکس عائد کرنے کی ممانعت کر دی جو ہر صوبے اور ہر ڈویژن کے جاگیردار اپنے فائدے کے لیے، وصول کیا کرتے تھے۔

2۔ جن راستوں پر چوریاں اور ڈکیتیاں زیادہ ہوں اور راستے آبادیوں سے فاصلے پر ہوں، ان راستوں کے اوپر مسجدیں، سرائے اور کنوئیں بنوائے جائیں تاکہ ان راستوں پر آبادی رہے۔ سوداگروں اور تاجروں کو راستے میں ان کی اجازت کے بغیر نہ کھولا جائے۔

3۔ کافر ہو یا مسلمان جو بھی ممالک محروسہ میں رہتا ہو، اس کے مرنے پر اس کا مال اس کے ورثاء کو دیا جائے۔ کوئی شخص اس میں دست اندازی نہیں کرسکتا۔ اور اگر وارث نہ ہو تو اس ترکے کی حفاظت کے لیے ایک تحویل دار مستقل طور پر متعین کیا جائے، تاکہ اس کو مسجدوں، سرائے، شکستہ پلوں کی تعمیر، تالابوں اور کنوؤں کے بنوانے میں یعنی ان کاموں میں جن کو شریعت نے ایسے مال کا مصرف قرار دیا ہے، خرچ کرے۔

4۔ شراب وغیرہ یعنی وہ تمام مسکرات جو شرعاً ممنوع ہیں، نہ بنائی جائیں، نہ بیچی جائیں۔ میں خود اگرچہ شراب پیتا ہوں اور اٹھارہ سال کی عمر سے اس وقت تک کہ میری عمر اڑتیس سال ہے، کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ اوائل اول میں شراب خوری کا حریص تھا۔ کبھی کبھی دو آتشہ شراب کے بیش پیالے پی جایا کرتا تھا۔ جب اس نے رفتہ رفتہ میرے اعضا اور قویٰ پر اثر ڈالنا شروع کیا تو میں اس کے کم کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ سات سال کے عرصے میں پندرہ پیالے کی بجائے، پانچ چھ پیالے کر دیئے جو مختلف اوقات میں پیا کرتا تھا۔ اس کے بعد صرف رات کا وقت مقرر کیا اور اب میں مجبوراً صرف کھانا ہضم کرنے کے لیے پیتا ہوں۔

5۔ کسی کے مکان کو نزول نہ بنائیں (عموماً قاعدہ تھا کہ لشکر یا سرکاری حکام سفر میں باشندگان آبادی کے مکانات خالی کرا کر ان میں قیام کیا کرتے تھے۔ اسی کو نزول کہا جاتا تھا جس کی ممانعت کر دی گئی)

6۔ کوئی شخص کسی سزا میں کسی مجرم کے ناک، کان نہ کاٹے اور میں بھی اپنے خدا کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ کسی کو اس سزا سے معیوب نہ کروں گا۔

7۔ کوئی جاگیردار رعایا کی زمین لے کر خود کاشت نہ بنائے۔

8۔ شاہی جاگیردار کا کوئی حاکم یا کوئی جاگیردار کسی باشندے کے ہاں سرکاری اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے۔

9۔ شہروں میں ہسپتال بنائے جائیں اور جو کچھ ان کے مصارف ہوں، شاہی جاگیر سے ادا کیے جائیں۔

10۔ اپنے والد بزرگوار کے طریق کے بموجب میں بھی حکم کرتا ہوں کہ میری پیدائش کے دن یعنی 18 ربیع الاول کو اور ہفتے میں دو دن یعنی جمعرات کو جو میرے جلوس کا دن ہے اور اتوار کو جو میرے والد بزرگوار کی پیدائش کا دن ہے، کوئی جانور ذبح نہ کیا جائے۔ والد بزرگوار اتوار کے دن کی تعظیم کیا کرتے تھے کیونکہ یہ دن ''حضرت نیر اعظم'' یعنی سورج کی طرف منسوب ہے۔ نیز اسی دن کو وہ ابتدائے آفرینش کا دن سمجھتے تھے۔

11۔ والد بزرگوار کے زمانے میں جن جن کے جو منصب، عہدے، وظیفے مقرر تھے وہ بدستور باقی رکھے جائیں۔ اور ممالک محروسہ کے اماموں کے متعلقین کے مدد معاش، ان فرامین کے بموجب جو ان کے

پاس باقی ہیں، بدستور باقی رکھے جائیں۔

12۔ تمام مجرم جو عرصے سے قید خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، رہا کردیے جائیں۔

جہانگیر کے ان بارہ احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رعایا کا کس قدر خیر خواہ تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا کافی احترام تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ''نیازمندانِ درگاہِ الٰہی'' لکھتا تھا۔ جلوس کے پہلے سال بھی پنڈتوں سے مناظرہ کیا۔ جہانگیر کے چند عالمانہ سوالات پیش کرنے کے بعد جب وہ لایعنی عذر کرنے لگے اور لاجواب ہو گئے تو جہانگیر نے کہا ''یہ مورتیاں معبودِ حقیقی کی جانب کس طرح وسیلہ بن سکتی ہیں؟''

نئے سکوں پر کلمۂ شہادت نقش کرانا مذہب پسندی کی کافی دلیل ہے۔ شب جمعہ میں علماء و صلحاء سے مصاحبت رکھتا تھا۔ عبادت میں رات گزارتا۔ اس وقت شراب قطعاً نہ چھوتا۔ اکبر آفتاب کے ناموں کی تسبیح پڑھا کرتا تھا۔ مگر جہانگیر نے علماء سے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حُسنیٰ لکھوائے اور ان کا ورد رکھا کرتا تھا۔

اکبر نے دربار میں جماعت نماز ممنوع کردی تھی اور صفیں بھی خارج کرادی تھیں، مگر جہانگیر نے ہرنوں کی کھالوں کی جانماز یں بنوا کر دیوانِ خاص اور دیوانِ عام میں ڈلوادیں تاکہ ان پر نماز پڑھا کریں۔

اکبر نے ہندوؤں کے عقیدے کے بموجب خنزیر کی تعظیم شروع کرادی تھی، مگر جہانگیر جب اجمیر شریف گیا تو وہاں ایک مورتی نظر سے گزری جو سنگ سیاہ سے تراشی گئی تھی۔ گردن سے اوپر خنزیر کی شکل اور نیچے آدمی کی شکل۔ اور عقیدۂ ناقص ہنود کا یہ کہ (معاذ اللہ) حکیم علیم نے کسی وقت کسی مصلحت سے اس صورت میں جلوہ فرمایا تھا۔ میں نے حکم دیا کہ اس کریہہ صورت کو توڑ کر تالاب میں ڈال دیں''۔

اکبر برہمنوں کے ہاتھوں اپنی پیشانی پر قشقہ لگواتا تھا، مگر جہانگیر نے ''گروارجن'' کو اس بنا پر سزا دی کہ اس نے سلطان خسرو (پسر جہانگیر) کے ڈیرے میں آکر مصنوعی بزرگی کے گھمنڈ میں قشقہ لگایا تھا۔

سال پنجم جلوس کے واقعات میں جہانگیر ''توزک'' میں لکھتا ہے: ''معلوم ہوا کہ کوکب پسر قمر خان نے ایک سنیاسی سے آشنائی پیدا کرلی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنیاسی کی باتیں جو سراسر کفر اور زندقہ تھیں، وہ کوکب کی دل میں جگہ کر گئیں۔ کوکب نے اپنے چچازاد بھائی عبدالطیف اور شریف کو بھی اس ضلالت اور گمراہی میں اپنا شریک بنالیا ہے۔ جب یہ بات ہمیں معلوم ہوئی، ان کو حضور میں طلب کیا گیا۔ معمولی سی دھمکی میں انہوں نے اپنے وہ حیا سوز واقعات ذکر کردیے جن کے بیان کرنے سے بھی طبیعت شرماتی ہے۔ ان کی تادیب وتنبیہ ضروری سمجھا۔ کوکب شریف کو جیل خانہ میں بھیج دیا۔ اور عبدالطیف کے سو کوڑے اپنے سامنے لگوائے۔ یہ خاص تنبیہ حفظ شریعت کے لیے کی گئی۔ تاکہ دوسرے جاہل اس قسم کی باتوں کی ہوس نہ کریں''۔

کشمیر جاتے ہوئے معلوم ہوا کہ راجور محل کے اطراف میں نومسلموں میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی زندہ قبر میں دفن کردیتے ہیں۔ غریب آدمی کے ہاں لڑکی ہوتی ہے تو وہ اس کو مار ڈالتا ہے۔ نیز ہندوؤں کو لڑکیاں دیتے ہیں۔ جہانگیر لکھتا ہے: ''لڑکیاں لینا تو بہت بہتر ہے، لیکن دینا نعوذ باللہ۔ فرمان صادر ہوا آئندہ ان کاموں کے پاس بھی نہ جائیں۔ اور جو شخص اس قسم کی بدعتوں کا مرتکب ہوا، اس کو سخت سزا دی جائے''۔

جلوس کے سولہویں سال جہانگیر قلعہ کانگڑہ کی سیر کو گیا تو ''حکم دیا کہ قاضی اور میر عدل اور دوسرے علمائے اسلام ہم رکاب رہ کر جملہ شعائر اسلام اور شرائط دین محمدی کو قلعہ مذکور میں ادا کریں۔ چنانچہ ایزد سبحان کی توفیق سے اذان، خطبہ، ذبح گاؤ وغیرہ جن سے یہ قلعہ ابتدائے تعمیر سے آج تک نا آشنا تھا، خود اپنے سامنے ان پر عمل کرایا۔ خداوند عالم کی اس بہت بڑی بخشش پر، جس کی توفیق کسی بادشاہ کو نہ ہوئی تھی اور بڑے بڑے بادشاہ اس سے عاجز رہے تھے، شکر کی نفلیں پڑھیں اور حکم کیا کہ قلعہ کے اندر ایک بہت بڑی مسجد بنوادیں''۔

عوام کی خیر خواہی، اخلاق اور دینِ اسلام کے سلسلے میں جہانگیر میں ایک طرف یہ خوبیاں تھیں، دوسری طرف مذہبی امور میں اس کا ایک برعکس رخ بھی تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے جہانگیر کے اس برعکس مذہبی رخ ہی کو پھیرنے اور اعتدال کی راہ پر لانے میں دعوت وعزیمت کا حق ادا کیا۔

جہانگیر کے مذہب کا دوسرا رُخ

جہانگیر کے مذہبی رجحانات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

جہانگیر اکبر کا بیٹا بھی تھا اور مرید بھی۔ اکبر کے "دین الٰہی" کے خیالات جہانگیر کی فطرت میں داخل تھے جو بے اختیار موقع بہ موقع رونما ہو جاتے تھے۔ وہ سورج کو ہمیشہ "حضرت نیر اعظم" کہتا تھا اور ہمیشہ اس کے لیے عقیدت آمیز الفاظ استعمال کرتا تھا۔ وہ نجومیوں کا معتقد تھا اور بڑے بڑے کام ان کے مشورے اور تشخیص کے مطابق سعید ساعت میں شروع کرتا تھا۔ اس نے بارہ برجوں کے مطابق بارہ سکے بنوائے، جن کی ایک جانب میں ایک ایک برج کی تصویر کندہ تھی۔ وہ ستاروں کو اگرچہ موثر حقیقی نہیں مانتا، مگر موثر ضرور مانتا ہے اور ان کو نور الٰہی کا مظہر قرار دیتا ہے اور اسی لیے ان کی تعظیم ضروری سمجھتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے۔

مذہب میں عقل پرستی

مذہب میں خودرائی بغاوت ہے، مگر اپنے باپ اکبر کی طرح جہانگیر بھی بغاوت کا عادی ہے۔ اگرچہ یہ بغاوت اس سے بہت کم سرزد ہوتی ہے۔ باپ کی طرح وہ بھی مرید کرتا ہے اور اس کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ کسی مذہب کی دشمنی سے اپنے وقت کو گندہ مت کرو۔ تمام مذہب والوں کے ساتھ صلح کل کا طریقہ ملحوظ رکھو۔ کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے مت مارو، مگر جنگ اور شکار میں۔ ستارے جو نورِ الٰہی کے مظہر ہیں، ان کی تعظیم ہر ستارے کے درجے کے بموجب کرو، اور تمام واقعات اور حالات میں موثر حقیقی اللہ تعالیٰ کو جانو۔ بلکہ ہمیشہ ہر خلوت و جلوت میں، تنہائی میں اور مجمع میں اسی کے دھیان میں رہو، اور کوشش کرو کہ کوئی لمحہ اور لحظہ اس کے خیال اور دھیان سے خالی نہ ہو۔

اس صلح کل کا اثر یہ تھا کہ جس طرح وہ مسلمان فقراء سے عقیدت سے ملتا تھا، ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے بھی عقیدت سے ملتا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ آگ کے متعلق اس کا عقیدہ تھا کہ "آگ خدا کا نور ہے"۔ یہی عقیدہ تھا جس کی بنا پر اکبر شمع پرستی کیا کرتا تھا۔ دسہرہ، دیوالی وغیرہ ہندو تہواروں کے وقت جشن ہوتا تھا۔ ہندو برہمن کلائی پر راکھی بھی باندھ دیا کرتے تھے۔ سیاست یہ تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مشترک بادشاہوں کو دونوں قوموں کے مذہبی جذبات کا مظہر بننا چاہیے۔

اکبر تمام سال میں صرف تین مہینے گوشت کھاتا تھا۔ جہانگیر اتنا مرتاض تو نہیں تھا، البتہ اپنے والد کی پیروی میں ہفتہ میں دو روز ذبح کی ممانعت ضرور کر دیتا تھا۔ شراب نوشی اچھی نہیں، مگر جس قدر مفید ہو اس میں مضائقہ بھی نہیں، حتیٰ کہ 10 جلوس کے واقعات میں جہانگیر لکھتا ہے:

"25 ماہ آذر روز جمعہ کو شہزادہ خرم شاہجہان کا جشنِ وزن ہوا (دستور تھا کہ سالانہ وزن کیا جاتا تھا اور اس

تقریب میں شاندار جشن ہوتا تھا، پھر وہ سونا فقراء کو تقسیم کر دیا جاتا تھا)۔ اس کی عمر چوبیس سال ہو چکی ہے۔ شادیاں ہو چکی ہیں۔ صاحب فرزند ہو گیا ہے، مگر اب تک خود کو شراب نوشی سے آلودہ نہیں کیا تھا۔ آج میں نے اس سے کہا، بابا، صاحب فرزند ہو گیا ہے۔ بادشاہوں اور بادشاہ زادوں نے شراب پی ہے۔ آج تیرے جشن وزن کا دن ہے۔ میں تجھ کو شراب پلاتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے ایام میں اور اسی طرح بڑی بڑی تقریبات کے موقعوں پر شراب پی لیا کرو۔ البتہ طریقۂ اعتدال ضرور ملحوظ رکھو، کیونکہ اتنی شراب پینی جو عقل کو زائل کر دے، عقلاء نے جائز قرار نہیں دی ہے۔ شراب نوشی سے نفع اور فائدہ پیش نظر رہنا چاہیے۔ بوعلی سینا جو عقلاء اور اطباء کے طبقے میں بہت وقعت رکھتا ہے، اس نے یہ رباعی کہی ہے:

مے دشمن مست و دوست ہوشیار است
اندک تریاق و بیش زہر مار است
در بسیارش مضرت اندک نیست
در اندک او منفعت بسیار است

یعنی زیادہ پینے سے مضرت ہے، تھوڑی پینے سے کوئی نقصان نہیں، بلکہ بہت زیادہ مفید ہے۔ عقل کا زعم ملاحظہ ہو کہ شیخ بوعلی سینا کے سامنے اللہ تعالیٰ کے احکام منسوخ ہیں۔

جہانگیری مذہبیت کا سرچشمہ

نواب سید فرید، قلیچ خان، لالہ بیگ وغیرہ جو جہانگیر کے رفیق اور معتمد خاص تھے، حضرت مجدد کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ انہی حضرات کی کوششوں سے جہانگیر کے مذہبی رجحانات میں تبدیلی پیدا ہوئی، مگر اس سے پہلے جہانگیر کا ماحول کیا تھا، اس کی کسی قدر تفصیل ملاحظہ ہو۔

شیخ سلیم چشتی صاحب کرامات برگزیدہ بزرگ تھے۔ ان کے اہل و عیال میں مذہبی جذبات تو ضرور ہونے چاہئیں، لیکن یہ لازمی نہیں کہ یہ مذہبی جذبات توہمات اور خلاف شرع رسوم و عادات سے بھی پاک صاف ہوں۔ شمس العلماء ذکا اللہ کا خیال تو یہ ہے کہ "اس دایہ کی صحبت نے اور ان حالات نے جو اس کے گرد لڑکپن میں تھے، جہانگیر کو خود پرست اور توہمات میں مبتلا کر دیا اور دنیا سے بے خبر رکھا"۔

اکبر اور جہانگیر نے بزرگانِ چشت کو دیکھا تھا اور وہ ان کے ہی معتقد تھے۔ بالخصوص حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے متعلق اعتقاد تھا۔ اکبر اپنے بیٹے جہانگیر کی ولادت کے شکریے میں آگرہ سے اجمیر شریف تک پاپیادہ گیا تھا۔ جہانگیر سے اس قدر ایثار تو نہ ہو سکا البتہ آٹھ جلوس میں جب وہ اجمیر شریف گیا تو جب قلعہ اور حضرت خواجہ کے روضے کی عمارتیں نظر آنے لگیں تو تقریباً ایک کوس کی راہ پاپیادہ طے کی۔ راستے کے دونوں طرف فقراء کھڑے ہوئے تھے، جن پر روپے کی بارش کی جا رہی تھی۔ دوسرے روز شہر کے تمام چھوٹے بڑوں کو مدعو کیا اور ہر ایک کو انعام دیا۔ پھر مزار مقدس کے لنگر کے لیے ایک دیگ، جو آگرے میں بنوائی تھی، اسے نصب کرایا اور اس میں کھانا پکوایا۔

9 جلوس میں اجمیر شریف میں قیام تھا۔ اتفاقاً بخار ہو گیا۔ مرض میں تخفیف نہ ہوئی تو حضرت خواجہ کے مزار پر

حاضر ہو کر منت مانی کہ جب صحت کاملہ حاصل ہو جائے گی تو " جیسا کہ باطن میں حضرت خواجہ کا حلقہ بگوش اور معتقد ہوں اور ان کی توجہ کو اپنے وجود کا سبب جانتا ہوں، ظاہر میں بھی اپنے کانوں میں سوراخ کر کے ان کے حلقہ بگوشوں کے جرگے میں داخل ہو جاؤں گا"۔

چنانچہ صحت یاب ہونے پر جہانگیر نے اپنے کانوں میں سوراخ کر کے ہر کان میں آب دار مروارید کا ایک دانہ ڈال لیا۔ جب مخلصان ہوا خواہ نے یہ دیکھا تو جو لوگ یہاں موجود تھے، انہوں نے نیز ان تمام نے جو سرحدی مقامات پر تھے، اپنے اپنے کانوں میں بڑے بڑے سوراخ کرا لئے۔ رفتہ رفتہ تمام ہی لشکریوں اور دوسرے لوگوں نے کان چھدوا دیئے۔

یہ ہے خدائے قادر و قہار کی قدرت۔ جو لوگ عقل و دانش کے پندار میں مبتلا ہوں، ان سے وہ کام کرائے جاتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ ان کا مذاق اڑائے۔ شریعت نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ مگر یہ پندارِ عقل بکریوں اور ریچھوں کی طرح اس کے کان خود اس کے ہاتھ سے چھدواتا ہے۔ اسی طرح شیخ علاؤ الدین، شیخ بایزید، اور شیخ کبیر سے بھی جہانگیر کو بہت محبت تھی، جس کے نتیجے میں خلاف شرع توہمات اور کرامات کا ماحول اختیار کرنا پڑا۔

نور جہاں کا جادو

ان سب مقربین کے تعلقات اور جذبات سے بالا وہ تعلق تھا، جو جہانگیر کی زندگی میں سب سے زیادہ دلچسپ اور دلفریب ہے اور جس کی بناء پر جہانگیر تمام سلاطین مغلیہ میں ایک انوکھا اور نرالا امتیاز رکھتا ہے۔ یہ نور جہاں کا عشق ہے، جس نے آزاد بادشاہ کو عہد طفولیت ہی میں گرفتار کر لیا تھا۔ جہانگیر بھی کہتا تھا کہ نور جہاں میری مالک ہے، میرے عدل و انصاف کی مالک نہیں۔ مگر جب دل کے جذبات اور دماغ کے تخیلات پر بھی اپنا قبضہ نہ ہو تو عدل و انصاف کی پاسداری صرف رسمی اور ضابطے کی چیز ہے۔ خوش قسمتی سے نور جہاں قابل باپ کی بیٹی اور مدبر بھائی کی بہن تھی۔ اور پھر عشق کا دائرہ بھی صرف ایک مرکز میں سمٹ آیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے بخشی معتمد خان (مصنف اقبال نامۂ جہانگیر) کا بیان ہے: "رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ بادشاہت کا صرف نام رہ گیا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے، میں نے سلطنت نور جہاں کو بخش دی۔ ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہیے"۔

نور جہاں اگرچہ سنجیدہ، شریف طبع، قابل اور دانش مند عورت تھی۔ اس کے رحم و کرم اور دست فیض سے ہزاروں بے کس اور نادار عورتیں فیض یاب ہوئیں۔ سینکڑوں نادار لڑکیوں کے نکاح اور جہیز وغیرہ کا انتظام اس کے خزانۂ خاص سے ہوا کرتا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے انہی اوصاف نے جہانگیر کی گرویدگی و بندگی کی حد تک پہنچا دیا تھا، لیکن وہ بسا اوقات اپنی ذاتی منشا کو پورا کرنے کے لیے تباہ کن فتنہ بھی کھڑا کر دیا کرتی تھی۔

نور جہاں کا مذہب

نور جہاں شیعہ تھی۔ خواجہ محمد شریف کی پوتی تھی جو شاہ ایران "طہماسپ صفوی" کا وزیر تھا۔ ایران شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اس زمانے میں خصوصیت کے ساتھ شیعہ سنی جذبات پورے اشتعال پر تھے، کیونکہ یہی زمانہ تھا جس میں آئے دن ترکوں سے جنگ رہتی تھی۔ خطبے میں خلفائے راشدین کا تذکرہ وقت کا سب سے بڑا اختلافی مسئلہ تھا۔

ایران تو در کنار ہندوستان میں بھی جنوبی ہند کے عادل شاہی اور دیگر شیعہ سلاطین اس سلسلے سے بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے۔اسی زمانے میں ایران میں سُنّیوں کو جبراً شیعہ کیا گیا۔

بابر بادشاہ (بانی سلطنت مغلیہ) کی وصیت اگرچہ تھی کہ شاہان مغلیہ کو اس اختلاف سے بالا رہ کر ہندوستان کی بسنے والی تمام قوموں کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیے، اور بدن کے مختلف عناصر کی طرح ان کو آپس میں ملا جلا رکھنا چاہیے، مگر کیا اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ سلطنت ایران کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان پر شاہان ایران کا سیاسی تسلط رہے، تاکہ افغانوں کی طرف سے بے فکر ہو کر ترکوں کے ساتھ اطمینان سے جنگ میں مشغول رہ سکیں۔

بابر کا بیٹا ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران پہنچا تو شاہ ایران طہماسپ اس شرط پر مدد دینے کے لیے تیار ہوا کہ وہ شیعہ مذہب اختیار کر لے۔ چنانچہ ہمایوں نے شیعہ مذہب اختیار کرلیا۔ چنانچہ نور جہاں جیسی فرزانہ عورت ہندوستان کی ملکہ ہو اور شاہ ہندوستان کے دل و دماغ پر قابو حاصل کئے ہوئے ہو، یہ سلطنت ایران کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ اس قسم کی ڈپلومیسی بڑے بڑے مقاصد میں وہ کامیابی پیدا کر دیتی ہے، جو لاکھوں نفوس کی قربانیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

سلطنت مغلیہ میں فوجی قانون عموماً بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ مگر دیوانی، فوجداری یا مذہبی حقوق کے عام معاملات عدالتوں میں طے پاتے تھے جن کے جج قاضی صاحبان ہوتے تھے۔ اب غور فرمائیے۔ محکمہ عدلیہ پر تسلط اور قبضہ کتنا بڑا اور کتنا اہم مقصد ہے، لیکن نور جہاں کی ڈپلومیسی یا شیعہ اقتدار کا نتیجہ تھا کہ نور اللہ شوستری کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنا دیا گیا۔ نور اللہ شوستری شیعوں کے نزدیک ''شہید ثالث'' ہے، مگر سُنّیوں کو ان سے اس درجہ نفرت تھی جتنی ایک متعصب شیعہ سے ہونی چاہیے، جو کسی خاص پالیسی کے تحت قاضی القضاۃ بنا دیا گیا ہو۔

اکبر و جہانگیر کے حالات اس قدر تفصیل سے اس لیے بیان کئے گئے ہیں تاکہ ان دونوں کے ہم عصر حضرت مجدد الف ثانی کے مندرجہ ذیل ارشاد کی تاریخی تصدیق قارئین کرام ملاحظہ فرماسکیں۔ وہ اپنے مکتوب (حالاتِ نقشبند) میں لکھتے ہیں:

''فرزند! یہ وہ وقت ہے کہ پہلی امتوں میں اس جیسے پُرظلمت وقت میں کوئی اولوالعزم نبی مبعوث ہوتا تھا اور نئی شریعت کی بنیاد رکھتا تھا۔ مگر یہ امت خیر الامم ہے اور اس کے نبی خاتم الرسل ﷺ ہیں۔ اس امت کے علماء کو انبیائے بنی اسرائیل کا مرتبہ دیا گیا ہے اور انبیائے کرام کے بجائے ان علماء کے وجود کو ہی کافی سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا ہر سو سال کے ختم پر اس امت کے علماء میں سے ایک مجدد مقرر کیا جاتا ہے جو شریعت مصطفویہ کا احیاء کرتا ہے۔ بالخصوص ایک ہزار سال کے بعد، جو سابقہ امتوں میں کسی عظیم الشان رسول کی بعثت کا زمانہ ہوتا تھا اور صرف نبی کے درجے پر بھی اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔ امت محمدیہ میں ایک ایسے جلیل الشان عالم کی ضرورت ہے جو اولوالعزم نبی کے قائم مقام ہو سکے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ: مختصر حیات نامہ

پچھلے ابواب میں آپ نے بادشاہ اکبر کی کہانی سنی۔ اس کے دین الٰہی کی تصویر دیکھی۔ جہانگیر کی مجذوبانہ مذہبیت سامنے آئی۔ جہانگیر کے رجحانات وجذبات پر اکبری ماحول اور ملکہ نور جہاں کی طلسم کاریوں کے دھبے بھی ملاحظہ کیے۔ اب حضرت مجددؒ کی پاکیزہ زندگی اور قرآن وسُنّت رسولؐ کے مقدس سانچوں میں ڈھلتے ہوئے آپ کے خیالات وارشادات کی بھی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے۔

مختصر حیات نامہ

ابوالبرکات، بدرالدین، شیخ احمد نقش بندی سرہندی، امام ربانی، مجدد الف ثانی، مخدوم شیخ عبدالواحد کے صاحبزادے تھے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید اور خود بھی ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ تاریخ ولادت 14 شوال 971ھ/ 1564ء۔ سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور چند ہی سال میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ پھر سیالکوٹ تشریف لے گئے اور مولانا کمال کشمیری کے سامنے، جو علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے بعد استاد تھے، زانوے تلمذتہ کیا۔ حدیث، فقہ وتفسیر کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کا مطالعہ بھی جاری رہا۔

سترہ سال کی عمر میں آپ علوم ظاہری سے فارغ ہو کر والد ماجد سے سلسلۂ چشتیہ میں نسبت بھی حاصل کر چکے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو پھر سرہند آکر درس وتدریس کا آغاز کیا، لیکن طلب علم کا شوق انہیں پھر کشاں کشاں رہتاس اور جون پور لے گیا۔ آپ آگرہ (اکبر آباد) بھی تشریف لے گئے اور درس وتدریس کے سلسلے میں چند سال آگرہ میں قیام کیا۔ وہاں آپ کے حلقۂ درس نے بہت جلد اتنی شہرت پالی کہ ابوالفضل اور فیضی جیسے اپنے زمانے کے مشہور اور خود پسند ماہرین فلسفہ ومنطق بھی آپ کی زیارت کے مشتاق ہوئے۔ یہ دونوں بھائی اکبری فتنے ''دینِ الٰہی'' کے ہیرو تھے۔

ابوالفضل فلسفے اور منطق کا عاشق تھا۔ ایک مرتبہ فلاسفہ کی تعریف وتحسین اس طرح کی کہ علمائے دین کی توہین ہوتی تھی۔ مجدد صاحب سے برداشت نہ ہوسکا اور فرمایا: ''امام غزالی بھی ابتدا میں بڑے منطقی اور فلسفی تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے ''المنقذ من الضلال'' میں تحریر کیا ہے کہ حکماء اور اطباء کے جملہ علوم انبیائے کرام کی تعلیمات سے سرقہ کئے گئے ہیں''۔

جواب میں سنجیدہ علمی تردید کی بجائے ابوالفضل برہم ہوگیا اور اس نے امام غزالی کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ حضرت مجدد ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور فرمایا ''اگر اہل علم کی صحبت کا ذوق رکھتے ہو تو علماء کی توہین سے

زبان روکو"۔ مجدد صاحب اس وقت تو چلے آئے، مگر بعد میں ابوالفضل نے معذرت کی اور سلسلۂ ملاقات پھر جاری ہو گیا۔

یہی زمانہ تھا جب فیضی اپنی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" لکھ رہا تھا۔ مشہور ہے کہ اس تفسیر میں حضرت مجدد کی امداد بھی شامل تھی۔ انہی دنوں کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ عید کے چاند میں اختلاف ہو رہا تھا۔ شرعی ثبوت سے پہلے ہی اکبر نے عید کا اعلان کر کے لوگوں کے روزے تڑوا دیئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مجدد صاحب اسی روز ابوالفضل سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ ابوالفضل کو معلوم ہوا کہ حضرت روزے سے ہیں۔ اس نے وجہ دریافت کی۔ مجدد صاحب نے فرمایا: "چاند کے متعلق اب تک شرعی شہادت مہیا نہیں ہوئی ہے"۔

ابوالفضل نے کہا: "بادشاہ نے خود چاند دیکھا ہے"۔

مجدد صاحب نے بے ساختہ فرمایا: "بادشاہ بے دین است۔ اعتبارے ندارد" (بادشاہ بے دین ہے۔ اس کا اعتبار نہیں)

ابوالفضل خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ پھر بھی اس نے پانی کا پیالہ اٹھا کر آپ کے منہ سے لگا دیا، لیکن آپ نے ہاتھ جھٹک دیا اور اسی وقت غصے میں قیام گاہ پر تشریف لے آئے اور کہلا بھیجا کہ اہل علم سے ملاقات کے لیے احترام شرط ہے۔ ابوالفضل کو ندامت ہوئی اور عذر و معذرت کے بعد سلسلۂ ملاقات جاری ہو گیا۔

غرضیکہ قیام آگرہ کے دوران آپ کو ان تمام سرچشموں کا علم ہو گیا جن سے اکبری فتنے کی نہریں نکل رہی تھیں۔ آپ کو نہایت قریب سے ان حالات کے مشاہدے اور ان خیالات و نظریات اور ان سیاسی و معاشرتی عوامل سے واقفیت پیدا کرنے کا موقع ملا جن کا تعلق اکبر کے عہد اور بالخصوص اس کے ذاتی حلقے سے ہے۔ قیام آگرہ ہی کے دوران میں آپ کے والد ماجد نے آپ کو سرہند طلب کیا۔ آپ واپس تشریف لائے تو آپ کی شادی شیخ سلطان رئیس تھانیسر کی صاحبزادی سے کر دی گئی۔ شادی کے بعد آپ نے حویلی اور ایک مسجد تعمیر کی اور سرہند ہی میں مقیم ہو گئے۔

اس اثناء میں آپ طریقۂ چشتیہ کے علاوہ، جس کی تعلیم آپ نے اپنے والد ماجد سے پائی تھی، طریقۂ سہروردیہ اور طریقۂ قادریہ میں بھی داخل ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود اطمینان کلی سے محروم تھے، مگر پھر 1008ھ / 1599ء میں (اکبر کا عہد حکومت جاری ہے) آپ سفر حج کی غرض سے دہلی پہنچے تو آپ کے دوستوں حسن کاشمیری نے آپ سے حضرت خواجہ باقی اللہ نقش بندی کے کمالات کا ذکر کیا۔ حضرت مجدد کا اشتیاق بڑھا تو وہ انہیں حضرت خواجہ کی خدمت میں لے گئے۔

خواجہ محمد باقی باللہ کا اثر

اکبری عہد میں علماء و صلحاء کی کمی نہ تھی۔ اس عہد کے مؤرخین نے ان کی جو طویل فہرستیں دی ہیں، ان سے خیال ہوتا ہے کہ اس دور کو علم اور تصوف کا عہد زریں سمجھنا چاہیے، لیکن بقول شیخ محمد اکرام (بحوالہ "رود کوثر") عام طور پر ان بزرگوں نے عہد اکبری کی مذہبی بوالعجبیوں کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر کوشش نہ کی۔ ان میں سے جو غالی وحدت الوجودی خیالات کے تھے (مثلاً شیخ امان پانی پتی کے قبیلہ دار)، وہ تو اکبر کی مذہبی اختراعوں میں اس کے شریک کار ہو گئے۔ جو شیخ عبدالحق محدث کی طرح ان اختراعوں سے متنفر تھے، وہ دربار سے کنارہ کش رہے اور گوشۂ تنہائی میں

اللہ اللہ یا درس و تدریس کرنے لگے۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور کو آپس کی منافستوں اور دوسری کمزوریوں نے بے اثر کر دیا تھا۔ جون پور کے ملا یزدی اور پنجاب کے علماء اکبر کی تعزیری کوششوں کا شکار ہو گئے۔ اکبری فتنے کا سدِ باب اور حالات کی اصلاح کسی سے نہ ہو سکی۔ دربار اکبری کے مذہبی رجحانات کے خلاف مستحکم محاذ خواجہ باقی باللہ کابلی نے قائم کیا، جنہوں نے حصول فیض اور ارشاد و ہدایت کے لیے ایک زمانہ ہندوستان میں گزارا تھا، لیکن وہ پھر ماوراءالنہر گئے اور نقشبندیہ سلسلے میں منسلک ہونے کے بعد عہد اکبری کے آخر میں دوبارہ ہندوستان آئے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان واپس آتے وقت استخارہ کیا۔ استخارے سے معلوم ہوا کہ ایک خوبصورت طوطی جو بہت میٹھی باتیں کرتا ہے، ان کے ہاتھ میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالتے ہیں اور وہ اپنے منقار سے ان کے منہ میں شکر دے رہا ہے۔ حضرت خواجہ نے اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ املنکی سے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ طوطی ہندوستان کا جانور ہے۔ ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص تیار ہوگا جس سے ایک عالم منور ہو جائے گا اور تم کو بھی اس سے حصہ ملے گا"۔ (سیّد ابوالحسن علی ندوی)

خواجہ باقی اللہ اور حضرت مجدد کی ملاقاتوں کا حال مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی یوں بیان کرتے ہیں:

"حضرت مجدد کی تعلیم و تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو اس دور کے صالح ترین لوگ تھے۔ گو اپنے گردوپیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، مگر کم از کم اپنے ایمان اور عمل کو بچائے ہوئے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا دوسروں کی اصلاح بھی کر رہے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کو سب سے زیادہ فیض حضرت باقی اللہ سے پہنچا تھا جو اپنے وقت کے ایک بڑے صالح بزرگ تھے۔ مگر خود شیخ کی ذاتی صلاحیتوں کا حال یہ تھا کہ جب حضرت موصوف کے ساتھ راہ و رسم کی ابتدا ہوئی تھی، اسی وقت انہوں نے شیخ کے متعلق اپنے یہ خیالات ایک دوست کو لکھ کر بھیجے تھے" حال ہی میں سرہند سے ایک شخص شیخ احمد نامی آیا ہے۔ نہایت ذی علم ہے۔ بڑی عملی طاقت رکھتا ہے۔ چند روز فقیر کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوئی۔ اس دوران میں اس کے حالات کا جو مشاہدہ ہوا ہے، اس کی بنا پر توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ایک چراغ ہوگا جو دنیا کو روشن کر دے گا"۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ ہندوستان کے گوشہ میں بہت سے حق پرست علماء اور سچے صوفیہ بھی اس وقت موجود تھے، مگر ان سب کے درمیان وہ اکیلا شخص تھا جو وقت کے فتنوں کی اصلاح اور شریعتِ محمدیؐ کی حمایت کے لیے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلے میں یک و تنہا احیائے دین کی جدوجہد کی"۔

خواجہ باقی اللہ کو دوبارہ ہندوستان آنے کے بعد چار پانچ سال سے زیادہ کام کرنا نصیب نہ ہوا۔ ان کا طریق کار وقت کے تقاضوں کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔ عام طور پر ہمارے اہل اللہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ رہے۔ چشتی، سہروردی، قادری سلسلوں کی تمام روایات گوشہ تنہائی میں یادِ خدا کرنے کی ہیں لیکن اس وقت دربار شاہی سے، بدعت و جدیدیت کی ہریں آرہی تھیں، جن سے بعض درباریوں کا دین اور طور طریقے بگڑ گئے تھے، بلکہ عوام پر بھی ان کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ اہل اللہ اور ارباب بینش دربارِ شاہی اور اربابِ اقتدار سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ان سے ربط وضبط پیدا کریں اور ان خرابیوں کی اصلاح کریں جو اکبر

کی مذہبی اور معاشرتی بدعتوں نے پیدا کردی تھیں۔ چنانچہ حضرت باقی اللہ کی روحانی پاکیزگی اور سربلندی سے انہوں نے اکبر کے ارکان سلطنت مثلاً شیخ فرید، قلیچ خان، صدر جہاں، اور علماء و مشائخ مثلاً حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث کو مسخر کیا، اور ملک میں اسلامی روحانیت کی ایک ایسی زبردست لہر دوڑادی اور اکبر کی براہ راست مخالف کئے بغیر ایک نئی دینی زندگی کا آغاز کیا کہ اس فضا میں اکبری رجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہوگیا۔

حضرت مجدد نے روانگی سفر کی اجازت مانگی تو حضرت خواجہ نے فرمایا ''ابھی آئے ہو۔ چند روز فقراء کی خدمت میں بھی رہو''۔ دہلی کے مزید چند روزہ قیام نے آپ کو حضرت خواجہ کے حالات وخصائل کے مطالعے کا مزید موقع دے دیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ بے اطمینانی، جس سے دل میں خلش رہا کرتی تھی، اطمینان سے بدل گئی۔ ادھر حضرت خواجہ باقی اللہ پر بھی آپ کے جذب وشوق اور صدق وصفا کے ساتھ ساتھ اتباع شریعت اور حمیت دینی کا بڑا اثر تھا۔ پھر جب آپ نے باقاعدہ حضرت خواجہ کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان کے حکم کے مطابق سرہند واپس تشریف لے گئے اور اس سلسلہ رشد وہدایت کی ابتدا کی جو برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کی حیات ملی کے لیے ایک بڑے فیصلہ کن اور دوررس انقلاب کا باعث ہوا۔ اس دوران میں آپ حضرت خواجہ باقی اللہ کی دعوت پر ایک مرتبہ پھر دہلی تشریف لے گئے اور چند مہینے ان کی صحبت میں بسر کئے۔ ظاہر ہے، اس زمانے میں انہوں نے اپنے مرشد سے بالخصوص اکتساب فیض کیا ہوگا، لیکن اس کے بعد پھر آپ کا ان سے ملنا ثابت نہیں، حتیٰ کہ حضرت خواجہ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت مجدد اس وقت لاہور میں تھے، جہاں حضرت خواجہ ہی کی ہدایت پر آپ تشریف لے گئے تھے۔ مرشد کی وفات کا حال سن کر آپ دہلی پہنچے۔ مزار پر حاضری دی اور سرہند واپس آگئے۔

اب آپ نے اصلاح احوال کا طریقہ وہی اختیار کیا جو ان کے مرشد خواجہ باقی اللہ نے اختیار کیا تھا، یعنی بہت بڑے صوفی اور عالم ہونے کے باوجود وہ ارباب اقتدار سے الگ تھلگ نہ رہے، بلکہ اپنا اصلاحی پروگرام اور طریق عمل تین متوازی شعبوں میں جاری کیا:

(ا) غیر سرکاری سنجیدہ (دانشور) طبقے کی اصلاح

(ب) ارکان سلطنت (افسر شاہی) کی اصلاح

(ج) بادشاہ کی اصلاح

مجدد الف ثانیؒ کا اصلاحی پروگرام

اس وقت مذہبی نقطۂ نظر سے، نیز مسلم حکومت کے بقاء و تحفظ کے پیش نظر اصلاح و دعوۃ کے معنی صرف یہ تھے کہ عامۃ المسلمین، ارا کین سلطنت اور خود سلاطین طے کر لیں کہ انفرادی طور پر اتباع سُنّت اور اجتماعی طور پر ترویج شریعت، ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی تمام اجتماعی اور انفرادی جدو جہد کا محور ہے۔

حضرت مجدد نے جب اس عظیم الشان مقصد کے لیے جدو جہد شروع کی تو کامیابی ان کے ہم رکاب تھی۔ غیر سرکاری سنجیدہ طبقے کی اصلاح اور ارا کین سلطنت کی اصلاح، اس عظیم الشان مقصد کی پہلی اور دوسری کڑی تھی۔

غیر سرکاری سنجیدہ طبقے کی ہم نوائی اور تنظیم میں کامیابی کا اندازہ حضرت مجدد کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد شیخ فرید کے نام تحریر ہوا ہے۔ شیخ فرید ایک اہم اور ممتاز رکن سلطنت تھے۔ اکبر کے عہد میں میر بخشی تھے۔ جہانگیر نے ان کو خلعت، شمشیر مرصع، دوات و قلم مرصع مرحمت فرما کر اسی خدمت پر بحال رکھا۔

حضرت مجدد نے شیخ فرید کو لکھا: ''آج کہ دولتِ اسلام کے مانع زوال اور بادشاہ اسلام کے جلوس کی بشارت خواص و عوام کے کانوں تک پہنچی، اہل اسلام نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ بادشاہ کے مدد معاون ہوں، اور ترویج اشاعت اور تقویت ملّت کے لیے رہنمائی کریں۔ یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے میسر ہو خواہ ہاتھ سے۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواص و عوام کی بے شمار جماعت آپ کے ساتھ ہے جو انقلاب یا اصلاح حکومت کے لیے بے چین ہے۔ آپ جنگ و جدال کا فتنہ دبا کر چاہ رہے ہیں کہ ارکان دولت اور مشیران خصوصی کے ذریعے سے یہ مرحلہ طے ہو جائے''۔

مکتوبات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار کے جتنے ممتاز رکن سُنّی تھے، حضرت مجدد نے سب کو اپنا حلقہ بگوش کر لیا تھا۔ چنانچہ خان خاناں، خان جہاں، خانِ اعظم، خواجہ جہاں، مرزا داراب قلیچ خان، نواب سیّد فرید صاحب وغیرہ کے نام مکتوبات میں موجود ہیں۔ یہ تمام حضرات دربار جہانگیر کے عمائدین ہیں۔

عبدالرحیم خان خانان:

یہ اکبر بادشاہ کے مشہور اتالیق بیرم خان کے خلف رشید تھے۔ 72 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ سندھ اور گجرات وغیرہ کو فتح کیا۔ بیرم خاں اگرچہ امامیہ تھے لیکن خان خاناں سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ وہ عہد اکبری سے اتنا اقتدار یافتہ تھا کہ گویا آدھی سلطنت کا مالک تھا۔ ایک مرتبہ جہانگیر ان سے سخت خفا ہو گیا اور خان خاناں کو بھی اپنے حالات سے مجبور ہو کر دربار میں حاضر ہونا پڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جہانگیر فوراً خان خاناں کو قتل کرا دے گا۔ خان خاناں کو موت کی بجائے خلعت ملا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک فقیر بے نوا نے شوکت و حشمت کی اونچی

چوٹیوں پر رہنے والوں کو کس طرح شکار کیا۔ جہانگیر اور خان خاناں دونوں حضرت کے زیر اثر تھے۔

میر بخشی شیخ فرید:

ان کا تعارف پہلے ہو چکا ہے۔ حضرت مجدد شیخ فرید کو تحریر فرماتے ہیں: "عالم کے اعتبار سے بادشاہ کی وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے۔ لہٰذا اصلاح بادشاہ اصلاح عالم ہے، اور فسادِ بادشاہ فسادِ عالم۔ آپ خود واقف ہیں کہ قرن ماضی (عہد اکبری) میں مسلمانوں پر کیا گزری۔ کفار کھلم کھلا، دلیری اور جرأت کے ساتھ دار السلام (ہندوستان) میں احکام کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام پر عمل کرنے سے عاجز تھے۔ اگر عمل کرتے تھے تو قتل کر دیئے جاتے تھے۔ کتنی بڑی مصیبت تھی کہ محبوبِ ربّ العالمین کے ماننے والے ذلیل ہوں، اور آپ ﷺ کے منکرین کی عزت ہو۔ مسلمان زخمی دلوں سے اسلام کی تعزیت کر رہے ہوں، اور مخالفین و معاندین مذاق اڑا کر جراحت ہائے مسلم پر نمک پاشی کرتے ہوں۔

"شرعی مسائل کی تفصیل و توضیح اور کتاب و سنت و اجماع کے بموجب عقائد کلامیہ کا اظہار حکومت کی سب سے مقدم امداد ہے تاکہ کوئی بدعتی یا گمراہ بیچ میں کود کر بادشاہ کو راستے سے نہ بہکا دے اور معاملہ نہ بگڑ جائے۔ اس قسم کی امداد ان علمائے حق کا مخصوص حصہ ہے جن کا نصب العین آخرت ہو۔ وہ علمائے سُو، جن کا مطمعِ نظر دنیائے دنی ہے، ان کی صحبت سُمِ قاتل ہے اور ان کا فساد متعدی۔

"قرن ماضی (عہد اکبری) میں جو بلا آئی، وہ علما کی اسی جماعت کی نحوست کے سبب سے آئی۔ یہی لوگ بادشاہوں کو راستے سے بھٹکاتے ہیں۔ انہی کی بدولت اسلام میں بہتر فرقے ہوئے۔ غیر عالم اگر گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی دوسروں کو تباہ نہیں کرتی، البتہ اس زمانے کے اکثر صوفی نما جاہل بھی یہی شان رکھتے ہیں کہ ان کی خرابی دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

"اگر کوئی شخص ہر قسم کی امداد کی طاقت رکھنے کے باوجود کوتاہی کرتا ہے، وہ کارخانہ اسلام میں رخنہ ڈالتا ہے۔ لامحالہ اللہ کی طرف سے معتوب ہوگا۔ اسی بنا پر یہ بے بضاعت بھی چاہتا ہے کہ دولتِ اسلام کے معاونین کے جرگے میں اپنے آپ کو ڈال دے، اور جہاں تک ممکن ہو، ہاتھ پاؤں مارے۔ **من کثر سواد قوم فهو منهم** (جو کسی جماعت کے حلقے میں اضافہ کرے، وہ اسی میں شمار ہوتا ہے)۔ جب حضرت یوسف کی فروخت کا اعلان ہوا تھا تو ایک بڑھیا بھی تھوڑا سا سوت لے کر پہنچ گئی تھی، تاکہ خریدارانِ یوسفؑ کے زمرے میں داخل ہو جائے۔ اس کا کل سرمایہ یہی تھا۔ میں بھی اپنی مثال ایسی ہی سمجھتا ہوں۔

"جناب والا جب کہ پورے طور پر بادشاہ سے تقرب رکھتے ہیں، اور بادشاہ کی ہر قسم کی امداد کر سکتے ہیں تو توقع ہے کہ خلوت و جلوت میں ہر طرح سے ترویج شریعت کی پوری کوشش کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کو بے بسی سے نجات دلائیں گے"۔ (مکتوبات 47: جلد اول)

اس مکتوب سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مجدد کے نزدیک ارکین سلطنت کی اصلاح بادشاہ کی اصلاح سے مقدم تھی، کیونکہ فساد کی اصل جڑ یہی لوگ تھے۔ ایک اور مکتوب نمبر 193 میں شیخ فرید کو تحریر فرماتے ہیں:

''یوں تو جس زمانے اور جس شخص سے بھی ترویج شریعت اور تقویتِ ملت کی خدمت انجام پائے بہتر ہے۔لیکن اسلام کی بے بسی کے موجودہ دور میں آپ جیسے جواں مردانِ اہل بیت (نواب صاحب سیّد ہیں) کے لیے ترویج دین اور تائید ملت زیب دیتا ہے اور آپ جیسوں ہی کا مخصوص کام ہے، کیونکہ یہ دولت آپ ہی کے خاندانِ مقدس کی خانہ زاد ہے۔آپ ہی کے طفیل سے دوسروں نے یہ دولت حاصل کی ہے۔اسی جلیل الشان خدمت کی انجام دہی رسول کریم ﷺ کی حقیقی اور سچی وراثت ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:'' آج وہ زمانہ ہے کہ اگر امرونہی کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دو گے تو تباہ ہو جاؤ گے،لیکن اس کے بعد وہ زمانہ آئے گا کہ دس میں سے ایک کو بھی انجام دے لیں گے تو نجات پا جائیں گے''۔

اسی مکتوب کے آخر میں فرماتے ہیں:'' اب اہل اسلام کے بادشاہ کی توجہ اہل کفر کی جانب نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ رسومات کفر کی قباحت پوری طرح بادشاہ کے ذہن نشین کرادیں،اور اگر ضرورت سمجھیں تو کسی عالم کو بلالیں۔شرعی احکام کی تبلیغ ودعوت کے لیے کرامات کا اظہار ضروری نہیں۔اگر افہام وتفہیم اور ارشاد وتبلیغ کے سلسلے میں کوئی جماعت تکلیف بھی برداشت کرلے تو اس کی عین سعادت ہے۔کیا انبیاء نے تکالیف برداشت نہیں کیں۔آنحضور ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ ما اوذی نبی مثل ما اوذیت (جس قدر تکلیف مجھ کو دی گئی کسی نبی کو نہیں دی گئی)''(مکتوب 192،193: جلد اول)

مفتی صدر جہاں:

یہ وہی بزرگ ہیں جن کو اکبر نے وفات کے وقت خاص طور پر کلمۂ شہادت پڑھوانے کے لیے بلوایا تھا،اور پھر اس بنا پر کہ یہ سیّد تھے اور اکبر کے عہد میں مدتوں منصب صدارت افتا پر فائز رہے تھے، جہانگیر نے بدستور اس منصب پر فائز رکھا اور ان کے اختیارات میں مزید توسیع کردی اور پھر مذہبی احترام کی بنا پر ان کو سجدۂ شاہی بجالانے سے بھی مستثنیٰ کردیا تھا۔حضرت مجدد صاحب ان کو تحریر فرماتے ہیں:''مشہور ہے الناس علی دین ملوکہم (لوگ اپنے بادشاہوں کے ڈھنگ پر ہوا کرتے ہیں) لہٰذا عوام کی اصلاح کے لیے سلاطین کی اصلاح ضروری ہے۔موجودہ حکومت میں اسلام سے پہلے جیسی ضد اور نفرت نہیں پائی جاتی۔لہٰذا ائمہ اسلام،صدورِعظام اور علماء کرام پر لازم ہے کہ اپنی تمام ہمت شریعت محمدی کو رائج کرنے میں صرف کر کے شروع ہی میں اسلام کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کر دیں اور اس میں ہرگز ہرگز تاخیر نہ کریں۔غریبوں کے دل اس تاخیر کے باعث مضطرب ہیں۔قرن سابق (عہد اکبری) کا تصور دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔مبادا،اس کی تلافی نہ ہو سکے تو دین سے یہ اجنبیت اور طویل ہو جائے گی۔ اگر بادشاہانِ گرامی ترویج شریعت پر متوجہ نہ ہوں اور ان کے مقربین بھی خود کو معاف اور ذمہ داری سے سبکدوش سمجھیں اور حیات چندروزہ کو عزیز جانیں،تو لامحالہ فقراء اسلام کے لیے بہت دشواری ہو جائے گی''۔

(مکتوب 194: جلد اول)

خان اعظم:

اکبر کا دودھ شریک بھائی تھا۔امرائے اکبری میں سے تھا۔عہد جہانگیری میں بھی حکومت کا عظیم الشان رکن

ہے۔ان کو حضرت مجدد فرماتے ہیں: ''حدیث نبویؐ ہے کہ ''اسلام اجنبی تھا جب اس کا آغاز ہوا،عنقریب پھر اجنبی ہو جائے گا''۔ لہٰذا ان کو مبارک باد جو اسلام کو سنبھالنے کی وجہ سے سب کی نگاہوں میں غیر مانوس اور اجنبی ہو جاتے ہیں۔اسلام کی غربت اور بے بسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کفار کھلم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں۔ بے تحاشا احکام کفر جاری کرتے ہیں اور کوچہ و بازار میں اہل کفر کی تعریف وتوصیف کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کو احکام اسلام کے اجراء کی ممانعت ہے اور شرعی احکام کی بجا آوری میں مطعون اور مذموم ہیں۔

''آج کل آپ کا وجود شریف غنیمت ہے۔ہم لوگ جو اس معرکے میں ضعیف وشکست خوردہ ہیں،ہم صرف آپ ہی کو جانتے ہیں۔خداوند عالم آپ کی مدد فرمائے۔رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:''ایمان کامل اسی وقت ہوگا کہ لوگ مجنون کہنے لگیں۔'' وہ مبارک جنون آپ کے وجود باوجود میں نظر آتا ہے۔ملتمس یہ ہے کہ جب کہ اس خاندان بزرگ (نقشبندیہ) کے اکابر اور بزرگوں کے ساتھ محبت رکھنے کے سبب سے خداوند عالم نے آپ کو اثر و رسوخ عطا فرمایا ہے،اور ہم عصروں اور دوستوں کی نظر میں مذہب کی تعظیم وتکریم آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہے،تو کوشش کیجئے کہ اہل کفر کے وہ احکام،جنہوں نے اہل اسلام میں بدشوقی اور مذہب سے بے التفاتی پیدا کردی ہے،وہ اگر سب منسوخ نہ ہوں تو کم از کم اکثر تو منسوخ ہو جائیں اور ان منکرات اور ناحقوں سے اہل اسلام محفوظ رہ جائیں۔سابق سلطنت میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دین مصطفوی کے ساتھ ضد اور عناد ہے۔اس سلطنت میں بظاہر وہ ضد اور عناد نہیں ہے۔اگر یہ تو وہ مسئلے سے ناواقف ہونے کے سبب سے ہے۔بہر حال یہ خطرہ ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ عناد اور ضد پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے وہی دشواری پھر پیدا ہو جائے۔(مکتوب 65: جلد اول)

خان جہاں حسین قلی خان:

بیرم خان کے بھانجے ہیں۔اکبری عہد میں پنج ہزاری منصب رکھتے تھے۔عہد جہانگیری میں سلطنت کے مقتدر رکن ہیں۔حضرت مجدد نے ان کو بھی اپنی دعوت وتبلیغ کے لیے مقرر فرمایا ہے۔حضرت مجدد ان کو تحریر فرماتے ہیں:''دنیائے فانی کی لذتیں اور نعمتیں خوشگوار ہوتی ہیں،اگر ان کے ضمن میں تقاضائے شریعت پر عمل بھی ہو۔ورنہ یہ لذتیں اور نعمتیں شکر میں ملے ہوئے زہر کی طرح ہیں۔جس سے نادان کو دھوکا دیا جاتا ہے۔دنیاوی لذتوں کے سم قاتل کی اصلاح اگر حکیم مطلق جل شانہٗ کے تریاق سے کرلی جائے یعنی شرعی احکام کی تلخی اور شیرینی سے ان کی تلافی کی جائے تو اس تھوڑی سی ترمیم سے جو سراسر آسان ہے اور آسانی ہی پر مبنی ملک ابدی حاصل ہو جاتا ہے۔بہر حال عقل دُور اندیش سے کام لینا چاہیے۔بچوں کی طرح بادام اور اخروٹ کے لالچ میں شکار نہ ہونا چاہیے۔

(مکتوب 54 جلد سوم)

مکتوب 133،جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں:''اس زمانے میں جو قیامت سے قُرب اور نبوت سے بُعد کا زمانہ ہے۔کچھ صاحب علموں نے حرص وطمع کی نحوست سے،جس کا اصل منشا حب باطن ہے،بادشاہوں کا تقرب حاصل کرلیا ہے۔ان کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔دین متین میں شکوک وشبہات پیدا کر دیئے ہیں اور سادہ لوحوں کو راہ سے ہٹا دیا ہے۔ایسا عظیم الشان بادشاہ جب کہ تمہاری باتوں کو دل سے سنتا ہے اور ان کو قبول کرتا ہے تو کتنی

بڑی دولت ہے کہ صریحاً اشارتاً حسب موقع کلمۂ حق جو اہل سُنّت والجماعت کے عقائد کے مطابق ہو، گوش گزار کرتے رہو، بلکہ ہمیشہ منتظر رہو اور جب بھی موقع ملے، اسلام کی کوئی خوبی اور کفر و کافری کی خرابی ذہن نشین کر دو۔"

لالہ بیگ:

دربار جہانگیری کے امیر ہیں۔ ان کو تحریر ہے: "تقریباً ایک قرن گزر گیا۔ اسلام کی غربت و بے بسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کفار اب اس پر بھی قناعت نہیں کرتے کہ بلادِ اسلام میں کھلم کھلا احکام کفر جاری کریں۔ بلکہ خواہش یہ ہے کہ احکام اسلام مکمل طور پر زائل ہو جائیں اور اسلام و اسلامیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ ابتداہی میں بادشاہت میں اگر اسلامیت نے رواج پا لیا اور مسلمانوں نے اعتبار پیدا کر لیا تو فبہا، ورنہ اگر کچھ توقف ہوا تو مسلمانوں کے لیے کام بہت دشوار ہو جائے گا۔ الغیاث، الغیاث، ثم الغیاث، الغیاث۔ دیکھنا ہے کہ کون سا صاحب نصیب اس سعادت کے لیے مستعد ہوتا ہے اور کون سا شاہباز اس دولت کو حاصل کرتا ہے"۔

(مکتوب 81: جلد اول)

یہ اور دوسرے امرا ہفت ہزاری، تمیں ہزاری اور پنج ہزاری ہیں، وزراء، گورنر اور بڑے بڑے جرنیل ہیں۔ حکومت اکبری و جہانگیری کے تمام سُنّی ارکان حضرت مجددؒ کی تبلیغی و اصلاحی تحریک کے اراکین ہیں۔ گویا ایک مستحکم و مضبوط نظام ہے جس میں اہل سُنّت والجماعت تعلقہ دار اور حکومت کے اکثر و بیشتر منصب دار منسلک ہیں، اور اس نظام کا سررشتہ حضرت مجدد صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ آپ موقع بہ موقع اس نظام کو حرکت دیتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں کم و بیش پانچ سو حضرات کے نام 651 مکاتیب ہیں جو تین جلدوں کے تقریباً ایک ہزار صفحات میں درج ہیں۔ "مکتوبات" کے طرز خطاب سے معلوم ہوتا ہے، یہ پانچ سو حضرات ہندوستان کے مختلف گوشوں کے سنجیدہ اہل علم و دانش اور ذی اثر حضرات ہیں جو اپنی اور نوع انسان کی اصلاح میں مشغول و منہمک ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مجدد صاحب نے جہانگیر پر اپنی دعوت و تبلیغ کا اثر کیونکر ڈالا؟ کیا انہوں نے اسے بھی اپنے اصلاحی پروگرام کے تحت زیر اثر لیا یا اس کے خلاف بغاوت کی؟

حضرت مجدد کی گرفتاری اور سزا

مولانا سیّد محمد میاں صاحب نے اپنی تصنیف "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں حضرت مجدد کی کامیابی کے بارے میں ایک جملہ خوب لکھا ہے۔ جس نے پڑھا، فراموش نہ کر سکا۔ لکھتے ہیں: "حضرت مجدد کی یہ جوڑ توڑ جس کو قرآن پاک کی زبان میں "کید" کہا جا سکتا ہے، بلاشبہ کامیاب رہی۔ ان کا اشارہ ہے اس قرآنی آیت کی طرف: "انهم يكيدون كيدا واكيد كيدا (وہ لوگ اسلام کے خلاف جوڑ توڑ کرتے رہتے ہیں اور میں (اللہ) بھی جوڑ توڑ کرتا ہوں"۔

لیکن ان کی کامیابی بعض شخصیات اور جماعتوں کو ہرگز گوارا نہ تھی، مثلاً:

1۔ ملکہ نور جہاں کو، جس کے سامنے تاج وتخت کے وارث کا سوال بھی سامنے آ گیا تھا۔ نور جہاں اپنے داماد شہریار کو جہانگیر کے بعد تخت شاہی پر جاگزیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے برمقابل اسلام پسندی اور سُنّی مسلک ہونے کی وجہ سے حضرت مجدد اور ان کے پورے گروپ کو شاہجہاں سے وابستہ کر رکھا تھا۔

2۔ روافض کی تردید سے متعلق حضرت مجدد کی جرأت مندانہ جدوجہد نے انہیں اور ان کے احباب کو نور جہاں کی نگاہ میں مقہور ومعتوب کر دیا تھا۔

3۔ سلسلہ نقشبندیہ کی ترغیب وتحریص، اِتباع سُنّت پر خصوصی تاکید، سماع، غنا، رقص وسرور کی مخالفت نے صوفیانہ سلسلوں بالخصوص چشتیہ کو برافروختہ کر دیا تھا۔ جس نے سماع وغنا کو جزو قرار دے رکھا تھا۔

4۔ جہانگیر کی حکومت کا دایاں بازو، جن میں ذی اثر امراء کے علاوہ مقتدر حکام بالا بھی شامل تھے، حضرت مجدد کو شکست دینے پر تُل گئے۔

5۔ اس وقت تک حضرت مجدد کے شہرۂ آفاق ''مکتوبات'' کی پہلی اور دوسری جلد مرتب ہو چکی تھی، جن میں ان روحانی مقامات سلوک کا بیان بھی ہے، جن کے سمجھنے کے لیے متصوفانہ صلاحیت واستعداد کی ضرورت ہے۔ مخالفین کو مقامات مجددی کے سمجھنے کی توفیق تو کیا ہوتی، ہاں معاندانہ موشگافیوں کے ذریعے سے حضرت کے برخلاف سازش کرنے کا موقع بڑی ہوشیاری سے نکال لیا۔ کوئی صاحب تھے حسن خان افغان، کابل کے رہنے والے، وہ حضرت مجدد سے بیعت ہوئے۔ پھر حضرت کے کسی خادم سے ان کو آزردگی پیدا ہوگئی۔ طبیعت میں کجی تھی، ناراضگی کسی خادم سے تھی، مگر وہ خود حضرت مجدد سے آزردہ ہوکر ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوگئے۔ حکومت کے دائیں بازو کی تحریص بھی اسے حاصل ہوگئی۔ اس نے حضرت مجدد کے مکتوبات میں تحریف کی۔ کفر وزندیق کی عبارتوں کا اضافہ کر کے بیس نقلیں تیار کیں اور ہندوستان وافغانستان کے مشہور علماء ومشائخ کے پاس وہ نقلیں ارسال کیں اور فتوے طلب کئے۔ حتیٰ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اس فتنے میں مبتلا ہو گئے اور حضرت مجدد کی تردید میں مضامین اور رسالے تحریر کیے۔

6۔ وحدت الوجود کا مسئلہ جو صوفیا کے نزدیک عرصے سے اہم اور بنیادی چلا آ رہا تھا، حضرت مجدد نے اس کی تردید یا تصحیح کر کے شریعت کے مطابق دوسری حقیقت ''وحدت الشہود'' واضح کی۔ وجودی صوفیاء کہا کرتے تھے ''ہمہ اوست'' حضرت مجدد نے اصلاح کی ''ہمہ از وست'' صوفیاء کہتے تھے ''فنا فی اللہ'' حضرت مجدد نے کہا، نہیں حقیقت یوں ہے: ''بقا باللہ''

قابل اعتراض مکتوب

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت مجدد گرفتار کر لئے گئے۔ پہلا سبب ان کا مکتوب 11، جلد اول بن گیا۔ یہ مکتوب حضرت نے اپنے شیخ خواجہ باقی باللہ کے نام تحریر فرمایا تھا، اور اس میں انہوں نے اپنے روحانی عروج کا ذکر کیا تھا۔ مخالفین کو زیادہ اعتراض ذیل کی عبارت پر تھا۔ (ترجمہ)

''دوسری عرض یہ ہے کہ اس مقام کے مشاہدے کے وقت اور بہت سے مقام ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے،توجہ کرنے کے بعد جب اس پہلے مقام پر اوپرے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذی النورینؓ عثمان غنی کا مقام ہے اور مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی،جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل وارشاد کے مقام ہیں اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظمؓ کا مقام ہے اور دوسرے خلفاء کا بھی وہاں عبور ہوا ہے اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبرؓ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا اور دوسرے خلفاء کا بھی ایک مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام سے بلند کوئی مقام سمجھ میں نہیں آیا تھا، البتہ مقام نبوت بے شک بلند و بالا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام کے برابر ایک دوسرا نہایت ہی نفیس اور بہت نورانی مقام نظر آیا، جس سے بہتر مقام کوئی نہیں دیکھا گیا تھا۔ مقامِ صدیقی سے وہ صرف اس قدر بلند تھا، جیسا کہ صدر مقام زمین سے کسی قدر بلند ہوا کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مقام محبوبیت ہے۔ یہ مقام رنگین تھا اور منقش۔ اس مقام کا عکس پڑنے سے بندہ بھی خود کو رنگین اور منقش پا رہا تھا۔ پھر رنگینی اور نقش و نگار کی اس کیفیت کے باوجود خود کو لطیف محسوس کرنے لگا اور ہوا یا ابر کے ٹکڑے کی طرح اپنے آپ کو آفاق میں منتشر محسوس کرنے لگا اور اسی حالت میں کنارے پر جالگا۔ حضرت خواجہ نقشبند مقام صدیقؓ میں رہے اور میں اپنے آپ کو اس کے برابر کے مقام میں مذکورہ کیفیت کے ساتھ دیکھتا رہا''۔

حضرت مجدد کے مخالفین نے موقع غنیمت جانا اور حضرت مجدد کا یہ مکتوب جہانگیر کے سامنے پیش کر دیا، اور بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ سرہند کا شیخ احمد خود کو حضرت صدیق اکبرؓ سے بہتر اور بالاتر جانتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا مقام حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مقام سے بلند ہے۔ جہانگیر بہت رنجیدہ ہوا اور اپنے پاس طلب کیا۔

جہانگیر کے روبرو اور انعام و اکرام:

بادشاہ نے حضرت مجدد سے استفسار کیا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ حضرت مجدد نے جواب دیا:''جس طرح اہل سنت کے نزدیک وہ شخص سُنّی نہیں جو حضرت علیؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل قرار دے۔ صوفیہ کے نزدیک وہ شخص صوفی نہیں جو خود کو کتے سے بہتر جانے۔ جو خبیث ترین مخلوق ہے، چہ جائیکہ وہ خود کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھے۔۔۔۔ جو کچھ مکتوب میں تحریر ہوا ہے، مقاماتِ سلوک کے سیر و عروج کا ذکر ہے جو صوفیہ پیرو دستگیر کی توجہ سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ صوفیا کا یہ عروج ایسے مقامات پر تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے۔ آپ کے دربار شاہی میں امراء رات دن حاضر رہتے ہیں اور اگر کسی وقت کسی ضرورت یا مصلحت سے سپاہی کو طلب کرتے۔ بادشاہ اس کو ہم

کلامی کا شرف بخشے تو یہ محض عارضی ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی عارضی قرب کی وجہ سے سپاہی کا درجہ مقرب سلطانی سے بلند نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح ہم لوگوں کا عروج ایک وقتی کیف ہوتا ہے۔ اس کیف کے ختم ہو جانے پر سرہند کا وہی پرانا جھونپڑا اپنا مقام ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو پہچانتے ہوئے اس بلند و بالا مقام صدیقیت سے، مالک جنی صدیق اکبرؓ سے افضل ہونے کا تصور بھی ناممکن ہے۔۔۔ علاوہ ازیں اسی مکتوب میں، میں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس مقام کے عکس سے میں نے خود کو رنگین پایا۔ نور آفتاب اور اس کے منور ہونے کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ آفتاب، آفتاب ہی ہے۔ زمین پر اس کی روشنی پڑ جاتی ہے تو روشن ہو جاتی ہے۔ مگر کیا زمین آفتاب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے؟''

ان دلائل سے حضرت مجدد نے جہانگیر کو مطمئن کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے سزا دینے کی بجائے اعزاز و اکرام سے واپس کیا۔

حضرت مجدد دوسری بار قید

مخالفین کے لیے یہ شکست ناقابلِ برداشت تھی۔ اب انہوں نے دوسری چال چلی۔ بادشاہ سے کہا کہ شیخ احمد نے ہزاروں جاں نثار مرید اپنے گرد جمع کر لیے ہیں۔ خطرہ ہے کہ ملک میں کوئی فتنہ کھڑا کر دے۔ وہ ایک متکبر اور مغرور شخص ہے۔ اس کی نیت کی خرابی کی تصدیق اس بات سے ہو سکتی ہے کہ سجدۂ تعظیمی، جو بادشاہ جہاں پناہ کے لیے جائز مانا جاتا ہے، وہ اس کا منکر ہے۔ اس سے پہلے بھی بادشاہ کی تکریم و تعظیم سے انکار کیا، اور آپ جب چاہیں آئندہ بھی امتحان فرما لیجیے۔ وہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بھی سر نہیں جھکائے گا۔

بادشاہ جہانگیر کے لیے یہ سیاسی خطرہ مذہبی خطرے سے زیادہ تشویش ناک تھا۔ چنانچہ دوبارہ حضرت مجدد کو طلب کیا گیا۔ دربار شاہی میں حضرت مجدد کے بعض دیگر مکاتیب کی عبارتیں، جو ان کوتاہ فہموں کی عقل و فہم سے بالا تھیں، توڑ مروڑ کر پیش کی گئیں۔ کچھ علماء کے فتوے بادشاہ کی نظر سے گزارے، جن میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے تردیدی مضامین بھی تھے۔

جب حضرت مجدد دوسری مرتبہ دربار شاہی میں پہنچے تو درباری ادب آموزوں نے شاہانہ آداب بجا لانے کی ہدایت کی۔ جب تخت بوسی اور سجدۂ تعظیمی کی فرمائش کی گئی تو حضرت نے سختی سے انکار کر دیا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ بادشاہ نے پھر بھی ''تحمل'' سے کام لیا اور قید خانے میں بھیج دیا۔ شہزادہ خرم شاہجہان کو حضرت سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ اس نے اپنے خاص معتمد افضل خاں کو حضرت مجدد کی خدمت میں بھیجا اور فقہ کی کتابیں ان کے ساتھ کر دیں اور عرض کیا کہ جب کہ علماء نے سجدۂ تعظیمی کو جائز قرار دیا ہے۔ اگر جناب والا، بادشاہ سے ملاقات کے تحت سجدہ کر لیں تو میں ذمہ دار ہوں کہ جناب کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

مگر حضرت مجدد نے فرمایا: ''جان بچانے کے لیے یہ بھی جائز ہے، مگر اصل دین یہ ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔'' جہانگیر نے قید و بند پر بس نہیں کی بلکہ حضرت مجدد کا گھر بار بھی لوٹنے کا حکم دیا۔ عام مؤرخین مقدمے اور گرفتاری کی یہ روداد پیش کرتے ہیں۔ مگر وہ سیاسی ڈپلومیسی بھی ملاحظہ فرمایئے، جس پر جہانگیر کاربند ہے۔ ''توزک

جہانگیری'' کے متعلق عبارت کا ترجمہ: ''انہی ایام میں 14 جلوس مطابق جمادی الآخر 1028ھ میں عرض پیش کی گئی کہ شیخ احمد نامی ایک مکار نے سرہند میں مکر وفریب کا جال بچھا کر بہت سے بے معنی ظاہر پرستوں کو شکار کر کے اپنے مریدوں میں سے ایک ایک کو جو دکان آرائی، معرفت فروشی اور مردم فریبی میں دوسروں کے مقابلے میں بہت پختہ ہیں، ہر شہر اور قصبے میں بھیج رکھا ہے اور اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام کچھ چکنی چپڑی باتیں لکھ کر ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ''مکتوبات'' رکھا ہے اور اس مہملات کی متنازعہ کتاب میں بہت سے بیکار مقدمات لکھے ہیں جو کفر وزندیقہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ حضرت فاروقؓ کے مقام سے گزر کر حضرت صدیق اکبرؓ کے مقام پر عبور رہوا۔۔۔۔ پھر لکھا ہے کہ مقام صدیقی سے گزر کر مقام محبوبیت پر واصل ہوا اور ایک دوسرا مقام مشاہدے میں آیا، نہایت رنگین اور منور۔۔۔۔ استغفر اللہ، مطلب یہ ہے کہ مقام خلفاء سے گزر کر ایک بلند مرتبے پر پہنچا اور بہت سی دوسری گستاخیاں بھی کی ہیں جن کا درج کرنا طول رکھتا ہے اور ادب سے دور ہے۔ اسی بناء پر میں نے حکم کیا کہ ''درگاہِ عدالت آئین'' میں حاضر کریں۔ حسب الحکم وہ حاضر خدمت ہوا اور جو کچھ دریافت کیا، اس کا معقول جواب نہ دے سکا۔ عقل ودانش کے فقدان کے باوجود ظاہر ہوا کہ مغرور ہے اور خود پسند بھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی حالت کی اصلاح صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ چند روز زندان میں محبوس رہے، تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور اس کے دماغ کی آشفتگی کسی قدر سکون پذیر ہو اور قوم کی شورش بھی دب جائے۔ مجبوراً انی رائے سنگدھن کے حوالے ہوا کہ قلعہ گوالیار میں قید رکھیں''۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی قید خانے میں دعوت وتبلیغ

حضرت مجدد کو قلعہ گوالیار کے جس قید خانے میں قید کیا گیا، وہاں کئی ہزار غیر مسلم بھی، چوری بدکاری اور ڈاکہ زنی وغیرہ کے جرائم میں ملوث ہونے کی وجہ سے قید وبند کے مصائب جھیل رہے تھے۔ حضرت نے قید کی زحمت کو بھی رحمتِ خداوندی سمجھا اور وہاں بھی تبلیغ شروع کر دی۔ انہوں نے اسے رحمت خداوندی کیوں اور کیونکر سمجھا، اس کا ثبوت بھی ہمیں ان کے ''مکتوبات'' سے ملتا ہے۔ ایک مکتوب میں اپنے فرزند خواجہ محمد معصومؒ کو لکھتے ہیں:

''فرزندانِ گرامی! یہ آزمائش کا وقت اگرچہ تلخ اور بے مزا ہے، لیکن اگر توفیق ہو تو بہت غنیمت ہے۔ آج کل جب کہ آپ کو فرصت میسّر ہے، خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے کام میں مشغول رہو۔ فرصت کا ایک لمحہ اور ایک لحظہ بھی بے کار مت ضائع کرو۔ تین چیزیں ہیں، ان میں سے کسی ایک کا وِرد ہر وقت رکھو۔ تلاوت قرآن مجید کرتے رہو۔ طویل قرأت کے ساتھ نماز ادا کرو یا کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی تکرار کرتے رہو۔ اس کلمے کے ساتھ حق تعالیٰ کے سوا تمام جھوٹے خداؤں اور اپنے نفس کی خواہشات کی نفی کرنی چاہیے، اور تمام مرادوں اور مقصودوں کو دفع کرنا چاہیے، کیونکہ اپنی مراد کا طلب کرنا اپنی الوہیت کا دعویٰ کرنا ہے، بلکہ سینے میں کسی مراد کی گنجائش نہ ہے اور تخیلہ بھی میں کوئی ہوس باقی نہ رہے تاکہ بندگی کی حقیقت حاصل ہو۔ اپنی مراد کو طلب کرنا گویا اپنے مولا کی مراد کو دفع کرنا اور اپنے مالک کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ اس امر میں اپنے مولا کی نفی اور اپنے مولیٰ بننے کا اثبات ہے۔ اس امر کی برائی اچھی

طرح معلوم کرے اپنی اوہیت کے دعوے کی نفی کروتا کہ تمام ہوا و ہوس سے کامل طور پر پاک ہو جاؤ، اور طلب مولا کے ساتھ تمہاری کوئی مراد نہ رہے۔ یہ مطلب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بلا ابتلا کے زمانے میں بڑی آسانی سے میسر ہو جاتا ہے اور اس زمانے سے سوا ہوا و ہوس سدِ سکندری ہے۔ گوشے میں بیٹھ کر اس کام میں مشغول رہو کہ اب فرصت غنیمت ہے۔ فتنے کے زمانے میں تھوڑے کام کو بہت اجر کے عوض قبول کرو۔

خدا خیریت رکھے، ملاقات ہو یا نہ ہو، ہماری نصیحت یہی ہے کہ اپنی مراد یا ہوس باقی نہ رہے۔ جو کچھ ہو، رضاء الٰہی اور ارادۂ خداوندی ہو۔ حتیٰ کہ میری رہائی جو آج کل تمہارا بہت بڑا مقصود بنا ہوا ہے، وہ بھی مقصود و مراد نہ رہے، اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ مودہ تقدیر، اس کے ارادے اور اسی کی مرضی پر پوری طرح راضی ہو جاؤ۔

اپنی والدہ کو بھی یہ مضمون پوری طرح سمجھا دو۔ اس زندگی کے باقی حالات اس قابل ہی نہیں کہ معرضِ تحریر میں آئیں، کیونکہ وہ ختم ہونے والے ہیں۔ چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ پڑھنے کی رغبت دیتے رہو، جہاں تک ہو سکے، اہلِ حقوق کو میری طرف سے راضی رکھو۔ حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابوں کا غم بہت معمولی بات ہے (جہانگیر نے یہ تمام چیزیں ضبط کر لی تھیں)۔ اگر ہم مرجاتے، تب بھی جاتی رہتیں۔ اب زندگی میں جاتی رہیں، کوئی فکر نہیں۔ اولیاء اللہ ان چیزوں کو خود چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ اب شکر ادا کرو کہ خدا نے اپنے اختیار سے ان چیزوں کو چھڑا دیا۔

جہاں بیٹھے ہو، اسی کو وطن سمجھو۔ چند روزہ زندگی جس جگہ بھی گزر رہے، یادِ خدا میں گزرنی چاہیے۔ دنیا کا معاملہ آسان ہے۔ آخرت کی طرف متوجہ ہو۔ اپنی والدہ کو بھی تسلی دیتے رہو اور آخرت کی طرف رغبت دلاتے رہو۔ اگر حق تعالیٰ چاہے گا، تو پس میں ہماری سب کی ملاقات ہو جائے گی، ورنہ حکمِ خدا پر راضی رہو اور دعا کرو کہ دارالسلام (جنت) میں سب ایک جگہ ہوں اور ملاقاتِ دنیا کی تلافی کریں"۔ (مکتوب 2: جلد سوم)

حضرت مجدد نے اپنے فرزندوں کے علاوہ خانِ خاناں، صدر جہاں اور خان جہاں اور دوسرے (حکام بالا) عقیدت مندوں کو جو خطوط قلعہ گوالیار کی قید کے دوران میں لکھے، وہ "مکتوباتِ ربانی" کی جلد سوم "معرفت الحقائق" میں شامل ہیں۔

قید سے رہائی

حکومت کی خفیہ ایجنسی کے پرچہ نویس حضرت مجدد کی ہر بات اور ہر سرگرمی کو بادشاہ تک پہنچا دیا کرتے تھے۔ اب جہانگیر یقیناً حیران ہوا ہوگا کہ جس شخص کو شیاد، مکار، مغرور، خود پسند، کافر اور مرتد بنا کر قید خانہ میں محبوس کیا گیا، خود اس کی خفیہ ایجنسی والے اسے پیکرِ صدق و صفا، مجسمۂ اخلاق اور اسلامی کمالات کی جیتی جاگتی تصویر قرار دے رہے ہیں۔

جس کی قوتِ ایمانی نے جیل خانے میں پہنچ کر ڈاکوؤں، چوروں اور بدمعاشوں کو بھی اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔ وہ صرف ایک سال کے عرصے میں حلقہ بگوشِ اسلام اور راست بازی کے حریص نظر آنے لگے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ دو سال کے بعد بادشاہ اپنے فعل سے نادم ہوا۔ اپنے سامنے طلب کر کے رہا کر دیا۔ خلعت اور ایک ہزار روپے خرچ عنایت کر کے اجازت دی کہ وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں۔ آپ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔

جہانگیر کا یہ کہنا کہ ''وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں'' بقول پروفیسر محمد فرمان (مصنف ''حیات مجدد'') جھوٹ اور ڈپلومیسی کا اظہار ہے۔ اس نے حضرت مجدد کو آخر وقت تک نظر بند رکھا۔ انہیں نقل و حرکت کی آزادی نہ تھی۔ حضرت لشکر سے جب جاتے تھے تو رخصت لے کر جاتے تھے۔ اس نظر بندی میں زیادہ دخل نور جہاں کی سیاست کو تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ حضرت مجدد کو آزاد اور مطلق العنان کرنے میں شاہجہان کو قوت پہنچے گی۔

حضرت مجدد نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ اس طرح آپ کو سارے لشکر میں، بلکہ ساری مملکت میں جہاں جہاں لشکر جاتا، تلقین و ہدایت اور دعوت اسلام کا موقع ملتا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران میں بادشاہ کے قریب رہنے اور اسے تلقین کرنے کا بھی موقع ملتا۔ بادشاہ سے اکثر مجلس رہتی۔ ایک ایسی ہی مجلس کا حال اپنے مکتوب میں یوں بیان کرتے ہیں: ''عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے دینی امور اور اسلامی امور میں ذرا بھی سستی اور غفلت دخل نہیں پاتی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ خاص کر آج ماہِ رمضان کی سترہویں رات کو انبیائے کرام کی بعثت، اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل ﷺ کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین کی پیروی، اور تراویح کی سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سنتا رہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا اور اقطاب و اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر ظاہر نہ ہوا۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید کوئی اللہ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز ہوگا''۔

اس کے بعد حضرت نے اپنے فرزندوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اب یہ پورا گھرانہ پورے انہماک سے تلقین و تبلیغ میں مشغول ہو گیا۔ چنانچہ خواجہ حسام الدین کو تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں کے فقراء کے حالات تعریف و حمد کے مستحق ہیں کہ عین بلا میں عافیت ہے اور پریشان خاطری کے موقع پر اطمینان اور دل جمعی حاصل ہے۔ جو فرزند اور دوست کہ ہمراہ ہیں ان کے اوقات بھی یادِ خدا میں دل جمعی کے ساتھ گزرتے ہیں اور ان کے حالات روبہ ترقی ہیں۔ لشکر کی زیادتی ان کے حق میں ایک خانقاہ بن گئی ہے کہ سپاہیوں کی رنگ برنگی کے اندر بھی سکون اور وقار ان کا حصہ ہے اور متفرق قسم کی پابندیوں اور گرفتاریوں کے دوران میں یہ لوگ صرف ایک مقصود کے گرفتار اور پابند ہیں۔ نہ کسی کو ان سے کام اور نہ ان پر کسی کا احسان۔ اس کے باوجود اعتماد اور اعتبار سب ہے۔ حبس و قید کی دولت میں گرفتار ہیں۔ عجیب گرفتاری ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک جو کے عوض میں بھی رہائی نہیں خرید سکتے اور عجیب قید ہے کہ اس کے

مقابلے میں ۔ ۔ئی کی قیمت ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں''۔(مکتوب 72: جلد سوم)

فرزند وطن واپس چلے گئے مگر حضرت مجدد، کچھ بادشاہ کی سیاست گری کی وجہ سے، کچھ اپنے مقصود کی لگن میں، ابھی لشکری حراست میں ہیں۔ ایک مکتوب میں اپنے فرزندانِ گرامی کو تحریر فرماتے ہیں: ''لشکر میں اس طرح بے اختیار و بے بس رہنے کو بہت غنیمت جانتا ہوں۔ اس جگہ وہ میسر ہے جو دوسری جگہ میسر نہیں آ سکتا۔ اس جگہ کے علوم و معارف اور احوال و مقامات کچھ اور ہی ہیں۔ ایک رکاوٹ جو بادشاہ کی جانب سے، میں اسی کو اللہ تعالیٰ کی انتہائی رضا مندی کا دریچہ تصور کرتا ہوں اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ عجیب کاروبار ہے۔ فرزندانِ عزیز دل میں کڑھ رہے ہیں اور اس جدائی سے بے چین ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا شوق ان کے شوق سے بڑھا ہوا ہے۔ اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے زیادہ محبت ہو، کیونکہ اولاد شاخیں ہیں اور شاخیں جڑوں کی زیادہ محتاج ہوا کرتی ہیں، مگر مقررہ اصول یہی ہے کہ باپ کو اولاد سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ اسلاف سے یہی چلا آ رہا ہے اور یہی تجربہ ہے''۔(مکتوب 78: جلد سوم)

کچھ عرصے بعد حضرت مجدد کو سرہند جانے کی مکمل اجازت ہوگئی۔ مگر بادشاہ کو اسلام کی طرف مائل رکھنا آپ کا نصب العین تھا اور اس لیے یہاں سے بھی بادشاہ کو خط لکھتے رہے۔

وفات حسرت آیات

وفات سے چند ماہ قبل آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنی عمر تریسٹھ سال کی معلوم ہوتی ہے۔ گویا سنّت رسول ﷺ کی اتباع کا شوق درجۂ فنا تک پہنچ چکا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری شعبان میں حسب معمول پندرھویں شب کو عبادت کے لیے خلوت خانے میں تشریف لے گئے اور زوجہ نے فرمایا، معلوم نہیں آج کس کس کا نام دفترِ ہستی سے کاٹا گیا ہوگا۔ یہ سن کر حضرت مجدد نے فرمایا، تم تو شک کہہ رہی ہو، کیا حال ہوگا اس شخص کا، جس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو کہ اس کا نام دفترِ ہستی سے محو کیا گیا۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد و ہدایت کا سب کام فرزندوں کے سپرد کر دیا اور اپنا تمام وقت قرآن مجید کی تلاوت اور اذکار و اشغال طریقت میں صرف فرمانے لگے۔ نماز کے سوا خلوت سے باہر تشریف نہ لاتے تھے۔ نفل روزوں اور صدقات و خیرات کی بھی اس زمانے میں بہت کثرت ہوگئی۔

وسط ذی الحجہ میں حضرت کو دمے کی بیماری لاحق ہوئی۔ تب محرقہ شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا۔ ان کی زوجہ ان کی تیمارداری پر پوری عقیدت و محبت سے لگی ہوئی تھیں۔ محترمہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں اور آپ کے دکھ سکھ میں شریک رہنے کی وجہ سے احیائی و تجدیدی تحریکوں کی تاریخ میں ایک خاموش، مگر بلند رتبے پر فائز ہیں۔ وہ بڑی عبادت گزار، متدین اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ بلکہ آپ دونوں کے درمیان غیر معمولی محبت کا رشتہ تھا۔

زوجہ کی انتہائی محبت کا احساس کرتے ہوئے آخری بیماری کی حالت میں بیوی کو وصیت فرمائی: ''میرا کفن اپنے مہر کی رقم سے بنانا''۔ گویا حضرت مجدد نے خواجہ اجمیری چشتی کی درگاہ سے لائی ہوئی چادر پر اپنی زوجہ کے ذاتی بنوائے ہوئے کفن کو ترجیح دی۔ جب حضرت مجدد جہانگیر کے ہمراہ اجمیر گئے تھے تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی

کے خادمانِ درگاہ نے ان کے مزار کا قبر پوش، جو ہر سال اتارا جاتا ہے، اور فقط خواص کے لیے وقف تھا، آپ کو پیش کیا۔ آپ نے ادب سے قبول کیا اور اپنے کفن کے لیے محفوظ رکھ لیا۔ لیکن وفات سے چند روز قبل ذوبہ کی چادر کو ترجیح دے کر اپنی شخصی اور انسانی محبت کا والہانہ اظہار کیا۔

28 صفر 1034ھ کی رات کو حسبِ معمول تہجد کی نماز کے لیے اٹھے اور بڑے اطمینان سے وضو کر کے نماز پڑھی اور خدام سے کہا، تم لوگوں نے تیمارداری میں بہت تکلیف اٹھائی۔ آج تمہاری یہ تکلیف ختم ہو جائے گی۔ اخیر وقت میں اسم "اللہ" کا بہت غلبہ تھا۔ اللہ اللہ کا ذکر کرتے کرتے روحِ مبارک رفیق اعلیٰ سے مل گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ سانحہ 10 دسمبر 1624ء کو ہوا۔

بعض نکتہ چیں اصحاب فکر ونظر نے یہ سوال اٹھایا کہ جب اکبر و جہانگیر کی پوری بیورو کریسی حضرت مجدد کے زیر اثر آ گئی تھی، شاہی لشکر میں ان کا اچھا خاصا رسوخ قائم ہو گیا تھا، اور ملک، بلکہ بیرون ملک بھی ان کے عقیدت مندوں کی کثیر تعداد ان کے ایک اشارے پر مر مٹنے کے لیے تیار تھی، تو انہوں نے بغاوت کیوں نہیں کی؟

بغاوت کیوں نہ کی؟

مولانا سید محمد میاں نے اپنی تصنیف "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں اس سوال کا جواب دیا ہے، جس کا لب لباب یہ ہے۔ نص حدیث کے بموجب مسلمان بادشاہ سے بغاوت صرف اسی وقت جائز ہے، جب واضح طور پر اس سے کفر کا ارتکاب ہوا ہو۔ کسی شخص کے کفر کا فیصلہ اسی وقت کیا جائے گا جب کہ اس کو مسلمان قرار دینے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ بہت ممکن ہے، اکبر کے عہد میں حضرت مجدد کی تحریک نے اتنی قوت حاصل نہ کی ہو کہ اکبر جیسے خرانٹ شہنشاہ کی چالیس سالہ شہنشاہیت کا مقابلہ کر سکے، حالانکہ اعلانِ جہاد کے لیے اتنی قوت کا ہونا ضروری ہے کہ بظاہر اسباب کامیابی کی توقع کی جا سکے، اور کیا تعجب ہے، حضرت مجدد صاحب کی تحریک نے اکبر تک اپنا اثر پہنچایا ہو اور یہ قول اگرچہ مشہور نہیں، مگر ممکن ہے صحیح ہو کہ اکبر نے وفات سے کچھ پہلے توبہ کر لی تھی۔

لیکن بظاہر حضرت مجدد اکبر کو فاسق مسلمان قرار دیتے ہیں جو مفاد پرستوں کے ہجوم میں گھر گیا ہے، چنانچہ آپ اکبر سے زیادہ علماء سُو اور مفاد پرستوں کی مذمت کرتے ہیں، اور اس کی اصلاح کے لیے افسر شاہی (بیورو کریسی) کی اصلاح کو مقدم گردانتے ہیں۔ پھر جو شخص اپنے لیے حکومت کا خواہاں نہ ہو، بلکہ حکومت کی اصلاح اس کا نصب العین ہو، وہ بغاوت سے پیدا ہونے والی خوں ریزی کو صرف اسی وقت ضروری سمجھے گا، جب اس کے بغیر اور کوئی چارہ باقی نہ رہے۔

اس زمانے میں مسلمان بادشاہوں اور امراء کی خانہ جنگی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ حضرت مجدد جہاد بالسیف اور کھلی بغاوت کا اعلان کرتے تو ان کے ہم خیال درباری مقربین یہی خیال کرتے کہ اقتدار کے حصول کے لیے ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اکبر اپنے پچاس سالہ عہد میں ہندوؤں کے حوصلے اتنے بڑھا چکا تھا کہ اصلاحی اور تجدیدی جدوجہد میں خود مسلمانوں کے زوال ہی کا خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ حکومت اور اقتدار میں شیعہ امراء بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس وقت مدبرانہ اور عاقلانہ لائحہ عمل اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بادشاہ کے وہ مقربین اور امراء جو اصلاح کی

آواز پر کان دھر سکتے تھے، اس آواز کو ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتار دیا جائے کہ وہ سراسر اصلاح بن جائیں۔

ہندو مت کی جارحانہ احیائیت

اس وقت (آج کی طرح) ہندوؤں میں احیائے مذہب کی تحریک زوروں پر تھی اور پورے ملک میں اس کے جو مظاہر ہو رہے تھے، ان سے باغیرت مسلمانوں کے دل مجروح ہوتے تھے۔ حضرت کو ان واقعات کا بڑا قلق تھا اور ان کے دل میں انتقام اور غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس میں نہ صرف متشدد و متعصب ہندو جارحیت کو، بلکہ حضرت مجدد کی اپنی حساس اور پر جوش طبیعت کو بھی دخل تھا۔

حضرت مجدد سے پہلے ہندوستان میں بزرگانِ اہل طریقت نے غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدت کی تلقین نہیں کی۔ مسلمان بادشاہوں کا ملکی، انتظامی اور فوجی مصلحتوں کی بنا پر ان کے ساتھ خواہ کیسا بھی سلوک رہا ہو اور علماء و فقہاء نے ان کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے دیے ہوں، لیکن صوفیائے کرام نے ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار نہیں کیا۔ خواجہ چشتی اجمیری کو ہندو راجا پرتھوی راج نے کیسی کیسی تکلیفیں دیں۔ انہوں نے اس کے حق میں بد دعا بھی کی، لیکن عام ہندوؤں کے خلاف جوش اور غصے کا اظہار ان کے ارشادات میں نہیں ملتا، بلکہ خواجہ کے عقیدت مندوں میں ہندو بھی شامل تھے۔ حضرت خواجہ کے علاوہ جن دوسرے صوفی بزرگوں نے ہندوستان میں اشاعت اسلام کی، ان کے حالات اور ارشادات بھی کسی غصے کے جذبے سے عاری ہیں۔

حضرت مجدد کا نقطۂ نظر بہت مختلف تھا۔ ان کے "مکاتیب" میں غیر مسلموں کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کثرت سے ہوا ہے اور انہیں ذلیل کرنے کی جا بجا تلقین ہے۔ اس نئے نقطۂ نظر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت مجدد کا وہ زمانہ تھا جب ان کے سامنے مسلمان بادشاہ کی حکومت تھی، لیکن مسلمان احکام اسلامی جاری و نافذ کرنے سے عاجز تھے۔ اپنے خطوط میں حضرت مجدد بار بار شیخ فرید کو ہندوؤں کو اپنی مجلس میں جگہ نہ دینے، اور اگر وہ آئیں تو ذلیل رکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے۔ جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا، اس نے اہل اسلام کو خوار کیا۔ ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں، بلکہ اپنی مجلس میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور کرنا چاہیے۔ اور اگر دنیاوی غرض ان کے متعلق ہو، جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہو، تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق مد نظر رکھ کر بقدر ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے اور کمالِ اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں"۔

ہندو مذہب کی احیائی تحریک دارالسلطنت اور بڑے اسلامی شہروں مثلاً لاہور سے دور اور بالخصوص ہندوؤں کے مقدس مقامات کے گرد و نواح میں بڑی خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ عہدِ اکبری میں متھرا کے ایک برہمن نے مسجد کی اینٹ پتھر کو ایک مندر میں جس طرح استعمال کیا اور مسلمانوں کی مزاحمت پر رسول کریم ﷺ کی شان میں

گستاخی کی۔ اس واقعے کا بیان تاریخ میں اس لیے آجاتا ہے کہ اس برہمن کو سزائے قتل دینے پر اکبر کے دربار میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ہندوؤں کی سینہ زوری کے اور بھی کئی واقعات اطراف ملک میں ہو رہے تھے، لیکن درباری مؤرخین یا تو ان سے باخبر نہ تھے یا انہیں کتاب میں درج کرنا اپنے ممدوح بادشاہوں کی شان کے منافی سمجھتے تھے۔ حضرت مجدد کے ''مکتوبات'' میں ان کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ''کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو گرا کر وہاں اپنے معبود مندر تعمیر کر رہے ہیں۔ **چنانچہ تھانیسر میں حوض کرکھیت (کوروکشیتر) کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اسے گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا ہے''۔** (دفتر دوم: مکتوب 92)

اسی خط میں وہ آگے چل کر مسلمانوں کی مشکلات کی مزید مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''نیز کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا بجا لا رہے ہیں، اور مسلمان اکثر اسلامی احکام کے جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ بڑی کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں کوئی مسلمان اس دن روٹی نہ پکائے اور نہ بیچے۔ اور ماہِ مبارک رمضان میں برملا نان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں، مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث کوئی روک نہیں سکتا۔ ہائے افسوس! بادشاہ وقت ہم میں سے ہو، اور پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ و خراب حال ہو''۔

حضرت مجدد کے اپنے شہر سرہند کا وقوع ایسا تھا کہ اس کے ایک طرف ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھانیسر تھا۔ دوسری طرف گووندوال، جہاں ان دنوں سکھ رہنما گورو ارجن کا قیام تھا اور سکھ قوم کی نئی تعظیم ہو رہی تھی۔ تیسری طرف پرانا تیرتھ نگرکوٹ تھا۔ یہ سب علاقے ہندو سکھ احیائیت کے مرکز تھے۔ بیچ میں سرہند تھا، اس لیے حضرت مجدد کو ہندوؤں کی جارحانہ سرگرمیوں سے واقف ہونے کے تمام سامان میسر تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی جارحانہ احیائیت کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ ان کوششوں کے بھی خلاف تھے، جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان کرتے تھے۔ ''مکتوبات'' کے دفتر اول میں ایک خط ایک ہندو ہردے رام کے نام ہے جس نے حضرت مجدد کے نام دو خطوں میں فقراء و صوفیاء سے محبت کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں۔ حضرت کو اس طرز فکر و استدلال میں خطرہ نظر آتا تھا۔ انہوں نے ایک پرزور خط میں مکتوب نگار کے نقطۂ نظر کی تردید کی اور لکھا: ''رام اور رحمان کو ایک جاننا بڑی بے وقوفی ہے۔ خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا۔ اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا''۔

حضرت مجدد نے ہندو مسلم مسئلے کا ایک حل بھی پیش کیا۔ باہمی امن و امان کی خاطر اور ہندوستان کے خاص حالات کے لیے زیادہ سے زیادہ وہ جس بات کو گوارا کر سکتے تھے، وہ یہ تھی: ''مسلمان اپنے دین پر اور کفار اپنے دین پر رہیں۔ آیت کریمہ لکم دینکم ولی دین کا مطلب یہی ہے''۔ یعنی امتزاج یا اتحاد نہیں، بلکہ رواداری اور پرامن بقائے باہمی۔ تاریخ نے ان کے نقطۂ نظر کی تائید کی۔ ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ انگریزی عہد میں اختلافات اور بڑھ گئے اور برصغیر کو پاکستان اور بھارت میں تقسیم کرنا پڑا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا زمانہ

مجدد الف ثانیؒ کی وفات (1624ء) کے ٹھیک اسی سال بعد حکیم الامت شاہ ولی اللہ 1703ء میں پیدا ہوئے۔ دونوں میں قدر مشترک تھی۔ دونوں مصلح و مجدد تھے۔ لیکن حضرت مجدد کے زمانے کے سیاسی حالات شاہ صاحب کے زمانے کے سیاسی حالات سے مختلف تھے، اس لیے اصلاح و تجدید میں دونوں کی کوششیں مختلف نہج پر ہیں۔ حضرت مجدد کے وقت میں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار و غلبہ حاصل تھا اور مسلمانوں کی سلطنت عروج پر تھی، اس لیے انہیں سیاسی اعتبار سے تحریک دینے اور ابھارنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ شاہی دربار اور امراء میں غیر اسلامی شعائر بے حد مقبول تھے۔ بلکہ اکبر کے دور میں ایک نئے دین کی بنیاد رکھ دی گئی تھی، اس لیے حضرت مجدد کو اپنی بیشتر توجہ دربار شاہی اور امراء کی اصلاح پر مرکوز کرنی پڑی۔ شاہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کا زوال بڑی تیزی سے گزر رہا تھا، اسلام دشمن قوتیں نہایت تیزی سے ابھر رہی تھیں۔ مرہٹے، سکھ، جاٹ اندر سے اور پرتگیز اور انگریز باہر سے مغلیہ سلطنت میں دراڑیں ڈال رہے تھے، لیکن سب سے زیادہ نقصان خود مغل بادشاہ اپنی بجی جمائی سلطنت کو اور مسلمانانِ ہند کی قوت و حمیت کو پہنچا رہے تھے۔

جب شاہ صاحب پیدا ہوئے تو حضرت مجدد کی برپا کی ہوئی تحریک کے سیاسی ثمرات زائل ہو چکے تھے۔ جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کی ولادت کے چار سال بعد عالمگیر کا انتقال ہوا۔ عالمگیر کے بعد اس کے عظیم اور پُر جلال تخت پر اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنہوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر سے اسلام کی حمایت، حفاظت، تجدید و احیائے دین اور اجرائے سُنّت کی جو ''غلطی'' ہوئی تھی، وہ اس کی تلافی کریں گے اور عالمگیر سے جو ''گناہ'' سرزد ہوا تھا، مسلسل اس کا کفارہ ادا کرتے رہیں گے۔ چنانچہ یہ مغل سلطنت ہی نہیں بلکہ ملّت اسلامیہ کی بھی بدقسمتی تھی کہ اس کے تخت پر یکے بعد دیگرے نااہل اور کمزور حکمران آتے رہے، اور تاریخ کی یہ بوالعجبی تھی کہ اورنگ زیب کا پہلا ہی جانشین (بہادر شاہ اول) اپنے عظیم باپ کی بالکل ضد تھا۔

شاہ ولی اللہ کے عہد (1703ء۔1762ء) میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات (1707ء) کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ اختصار کے ساتھ ان بادشاہوں کے تعارف سے اندازہ ہو جائے گا کہ شاہ صاحب کو جن سیاسی حالات کا سامنا کرنا پڑا، ان کی کیفیت کیا تھی:

1۔ بہادر شاہ اول (1707ء۔1712ء): عالمگیر کے پانچ بیٹوں میں سے دو بیٹے تو اس کی زندگی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ شہزادہ معظم نے اپنے دو بھائیوں اعظم اور کام بخش کو قتل کر کے تخت حاصل کر لیا اور بہادر شاہ اول (شاہ عالم اول) کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ تخت نشینی کے وقت

بہادر شاہ کی عمر 63 سال تھی۔ اس میں زوال پذیر سلطنت کو مستحکم بنانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس نے امور ملکی سے یکسر تغافل برتنا شروع کر دیا، اس لیے لوگ اسے "شاہ بے خبر" کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے۔ بہادر شاہ اول کے پانچ سالہ دور حکومت میں بندہ بیراگی سکھوں کا رہنما تھا۔ اس نے پنجاب میں زبردست تباہی پھیلا رکھی تھی۔ اس کی قیادت میں سکھوں اور لٹیروں نے مسلمانوں پر قیامت ڈھا دی۔ انہوں نے سرہند پر قبضہ کر کے تمام مساجد کو شہید کرنے کے ساتھ تمام مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو نہایت وحشیانہ طور پر ذبح کر ڈالا۔ بہادر شاہ بذاتِ خود ایک لشکر لے کر مقابلے میں آیا اور سکھوں کو شکست دی۔ بندہ بیراگی بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا اور بہادر شاہ اپنے دامن میں یہ واحد نیکی سمیٹ کر 1712ء میں فوت ہوا۔

2۔ جہاندار شاہ (1712ء۔1713ء): یہ اپنے باپ کے چار بیٹوں میں سب سے زیادہ نالائق اور بد کردار تھا۔ بہادر شاہ کے وزیر ذوالفقار خان کے تعاون سے اپنے تین بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت آبرو باختہ حکمران تھا۔ ایک طوائف لال کنور نامی سے تعلقات تھے۔ اکثر اس کے مکان پر پہنچ جاتا۔ بعض اوقات اسے بدمستی کے عالم میں دیکھ کر لال کنور کے بھائی بادشاہ کے بال پکڑ کر رخساروں پر طمانچے مارتے تھے۔ جہاندار شاہ نے صرف گیارہ ماہ حکومت کر کے شاہی خزانہ خالی کر دیا۔ فرخ سیر کے حکم پر اسے اور اس کے مربی ذوالفقار خان کو قتل کر دیا گیا۔

3۔ فرخ سیر (1713ء۔1719ء): وہ بہادر شاہ اول کا پوتا تھا۔ جہاندار شاہ کے قتل کے بعد تیس سال کی عمر میں دو سیّد بھائیوں کے تعاون سے تخت نشین ہوا۔ ان میں سے ایک سیّد حسین علی بہار کا صوبیدار اور دوسرا سیّد عطا اللہ الٰہ آباد کا صوبیدار تھا۔ یہ دونوں "بادشاہ گر" کہلاتے تھے۔ فرخ سیر نے سیّد برادران سے نجات حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر سیّد برادران نے تنگ آ کر اس کے محل کا محاصرہ کرایا اور محل میں گھس کر فرخ سیر کو خوب مارا۔ قید کیا، کئی روز تک بھوکا پیاسا رکھ کر اندھا کرنے کے بعد فروری 1719ء میں ہلاک کر دیا۔

4۔ نیکو سیر: سیّد بھائیوں نے اسے بادشاہ بنایا، لیکن تین ماہ کے بعد ہی برطرف کر دیا۔

5۔ رفیع الدرجات: اب سیّد بھائیوں نے احمق اور بیمار شہزادے رفیع الدرجات کو بادشاہ بنایا اور چار ماہ کے بعد اسے بھی معزول کر دیا۔

6۔ رفیع الدولہ: یہ بھی دق کا مریض تھا۔ سیّد بھائیوں نے اسے بھی تخت پر بٹھایا۔ یہ صرف تین ماہ تک بادشاہ رہا اور 17 ستمبر 1719ء کو فوت ہو گیا۔

7۔ محمد شاہ رنگیلا (1719ء۔1748ء): دونوں سیّد بھائی شہزادہ روشن اختر کو تخت نشینی پر آمادہ کرنے کی غرض سے محل میں پہنچے تو اس کی ماں نے عاجزی سے کہا: "میری بیوگی پر رحم کرو اور اس یتیم کی بجائے کسی دوسرے شخص کو بادشاہ بنا دو"۔ سیّد بھائیوں نے شہزادے کی یتیمی پر رحم نہ کھاتے ہوئے اسے محمد شاہ کے لقب سے سرفراز کر کے تخت پر بٹھا دیا۔ محمد شاہ نے اپنی والدہ کی فراست اور حکمتِ عملی سے سیّد بھائیوں کا

خاتمہ کر دیا، لیکن اس کے بعد تعیش میں ایسا غرق ہوا کہ تاریخ میں ''محمد شاہ رنگیلا'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے دربار میں ہمہ وقت سینکڑوں عورتیں محو رقص رہتی تھیں۔ محمد شاہ کی غفلت اور عیش پرستی کے نتیجے میں کئی صوبے خود مختار ہو گئے اور 1739ء میں نادر شاہ نے حملہ کر کے اور دارالسلطنت دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اور اہل شہر کا قتل عام کر کے مغلیہ سلطنت کے رہے سہے وقار کا بھی خاتمہ کر دیا۔ نادر شاہ کی لوٹ مار اور قتل عام کے ایک عینی شاہد شاہ ولی اللہ بھی تھے۔ اس وقت وہ سولہ سال کے بالغ نظر اور حساس طبع لڑکے تھے۔

8۔ احمد شاہ (1748ء۔1754ء): 1747ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا۔ اگلے برس 1748ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا اکلوتا فرزند احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے رنگیلے باپ سے بھی زیادہ رنگیلا تھا۔ وہ ایک ایک مہینے تک مسلسل اپنے عشرت کدے سے باہر نہ نکلتا تھا اور ہمہ وقت حرم کی دل نوازیوں میں مشغول رہتا تھا۔ بالآخر بعض امراء نے اسے اندھا اور معزول کر کے قتل کر دیا۔

9۔ عالمگیر ثانی (1754ء۔1759ء): امراء نے اب جہاندار شاہ کے بیٹے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔ عالمگیر ثانی بہت نیک طینت بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پر دوسری بار حملہ کیا۔ 1759ء میں عالمگیر ثانی کو سازش کر کے قتل کر دیا گیا۔

10۔ محی السنہ کام بخش: چند ماہ حکمرانی کر کے فوت ہو گیا۔

11۔ شاہ عالم ثانی (1759ء۔1806ء): عالمگیر ثانی کے قتل کے وقت اس کا بیٹا شہزادہ علی گوہر پٹنہ میں مقیم تھا۔ اس نے پٹنہ ہی میں شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اودھ کے حاکم شجاع الدولہ کو اپنا وزیر بنایا۔ اس کے عہد میں 1761ء میں (شاہ ولی اللہ کی وفات سے ایک سال پہلے، اور انہی کی ترغیب و تحریک پر) احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر اپنا آخری حملہ کیا اور یہاں سے واپسی پر اس نے شاہ عالم کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ 1764ء میں بکسر کے مقام پر شاہ عالم کی فوجوں کو انگریزوں نے شکست دی اور اس نے بنگال و بہار کی دیوانی انگریزوں کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد اس نے خود کو مرہٹوں کی پناہ میں دے دیا اور الٰہ آباد اور کڑہ کے اضلاع ان کے حوالے کر دیئے۔ بادشاہ پورے دس برس کے بعد 1771ء میں الٰہ آباد سے دہلی آیا۔ وقت گزر چکا تھا، اس لیے وہ احمد شاہ ابدالی کی عظیم الشان فتح اور مرہٹوں کی شکست سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ وہ یہاں آ کر نئے فتنوں امراء کے جوڑ توڑ، روہیلوں کی نئی طاقت اور سکھوں کے حملوں سے دوچار ہوا۔ بالآخر 1788ء میں غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ شاہی محل لوٹا۔ شہزادیوں کو کوڑے لگوائے اور مغل شہنشاہ کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال لیں۔ اگلے سال سندھیا نے غلام قادر کو بڑے دردناک طریقے پر قتل کیا اور شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا۔ نو لاکھ روپے سالانہ اس کے اخراجات کے لیے مقرر کیا۔ متعدد لڑائیوں کے بعد 1803ء میں لارڈ لیک انگریز فوج کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ مرہٹوں کو نکال دیا اور بادشاہ کی پنشن ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دی۔ شاہ عالم 45 برس تخت نشین اور 18 سال نابینا رہ کر 1806ء میں راہی ملک بقا ہوا۔

عالم اسلام کی حالت :

یہ تھی شاہ ولی اللہ کی ساٹھ سالہ زندگی کے دوران ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حالت۔ شاہ صاحب کی زندگی میں سلطنت عثمانیہ کا بھی لگ بھگ یہی حال تھا۔ 60 برسوں میں سلطنت عثمانیہ میں پانچ سلاطین آئے اور گئے، لیکن اہم مدت یعنی شاہ صاحب کے آخری پانچ سال مصطفیٰ ثالث کے عہد میں گزرے۔ ان کے زمانے میں سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ چھڑی۔ سلطنت عثمانیہ کو اس جنگ میں شکست ہوئی، جس میں روس کا کوئی کارنامہ نہ تھا۔ شاہ صاحب کا عہد شباب تھا کہ سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں (پرنٹنگ پریس) کا رواج ہوا اور پہلا مطبع قسطنطنیہ میں قائم ہوا۔ اسی عہد میں نجد و حجاز میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک نے فروغ پایا۔

شاہ صاحب نے جب حجاز کا سفر کیا اور حرمین شریفین میں طویل قیام فرمایا تو اس وقت سلطان محمود اول کی سلطنت وخلافت کا زمانہ تھا۔ اس وقت حجاز میں سلطنت عثمانیہ کے نائب امیر مجاز (جو شریف مکہ کہلاتے تھے) محمد بن عبداللہ والیٔ حجاز ان کا زمانہ خانہ جنگیوں اور امارت کے لیے خاندانی کشمکش کا زمانہ تھا۔ بدامنی، بدوؤں کی غارت گری اور بدانتظامی کی شکایت عام تھی۔ شاہ صاحب نے ان غیر اطمینان بخش حالات کو اپنی چشم بصیرت سے دیکھا بھی ہوگا اور دینی حمیت سے معمور قلب سے محسوس بھی کیا ہوگا۔

ایران میں صفوی خاندان کی سلطنت پر دو صدیاں گزر چکی تھیں اور قانون قدرت کے مطابق اس پر زوال کا وہ دور آ گیا تھا جو فلسفی اور مورخ ابن خلدون کے بقول "آنے کے بعد جانے کا نام نہیں لیتا"۔ اس حالت کو دیکھ کر ہمسایہ ملک افغانستان نے فائدہ اٹھایا اور اپنے حوصلہ مند حکمران محمود خان غلزئی کی قیادت میں ایران پر حملہ کیا اور اصفہان کو فتح کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی روس کے فرماں روا پیٹر اعظم نے ایران کے شمالی اضلاع پر قبضہ کر لیا۔ دولت صفویہ زوال سے دوچار تھی، سارے ملک میں انتشار اور بحران کی حالت تھی۔ نادر شاہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی عسکری طاقت کی تنظیم کی۔ افغانوں کو ایران سے بے دخل کیا۔ روسیوں کے ساتھ آبرومندانہ صلح کی۔ 1737ء میں خاندان صفویہ کا خاتمہ ہو گیا۔ نادر شاہ اس وقت ایران کا واحد تاجدار تھا۔

افغانستان کا ایک حصہ اٹھارہویں صدی سے پیشتر ایران کے ماتحت تھا، دوسرا حصہ ہندوستان کے تحت اور تیسرے حصے پر بخارا کے خوانین حکمران تھے۔ 1706ء میں قندھار آزاد اور خود مختار ہو گیا۔ 1737ء میں نادر شاہ نے افغانوں کو قندھار کی حکومت سے بے دخل کیا اور افغانستان اور شمالی مغربی ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ کے قتل پر اس کے ایک معتمد احمد شاہ نے افغان صوبوں کی عنان حکومت سنبھال لی۔ وہ ابدالی قبیلے کی دُرانی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے دُرانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کی وفات پر افغان سلطنت مشرقی ایران، پورے افغانستان، مکمل بلوچستان اور مشرقی سمت میں کشمیر اور پنجاب پر مشتمل تھی۔ وہ حقیقتاً اٹھارویں صدی کی عبقری شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے محمود غزنوی کی طرح ہندوستان (پاکستان) کو اپنی ترک تازیوں کا میدان بنایا۔ وہ 23 اکتوبر 1772ء کو قندھار میں فوت ہوا۔

شاہ ولی اللہ کی پوری زندگی اور ان کی ولی اللہی تحریک سلطنت عثمانیہ، نادر شاہ ایرانی، احمد شاہ ابدالی اور نجد وحجاز کے مصلح عبدالوہاب کی وہابی تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا حیات نامہ

شاہ صاحب کی ولادت، اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل، چہار شنبہ کے دن 4 شوال 1114 ہجری (10 فروری 1703ء) کو طلوع آفتاب کے وقت، اپنے ننیہال قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ ولادت کے وقت آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کی عمر ساٹھ سال تھی۔ والدہ کا اسم گرامی فخر النساء تھا۔

ابتدائی تعلیم:

شاہ صاحب کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کئے گئے۔ سات سال کی عمر میں سُنت ابراہیمی ادا ہوئی اور ختنہ ہوا۔ اسی عمر سے نماز کی عادت ڈال دی گئی اور والدین کے ساتھ تہجد میں شریک ہونے لگے۔ سات سال کی عمر ہی میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت ہوئی اور فارسی اور عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں اور کافیہ ختم کی۔ چودہ سال کی عمر میں ''بیضاوی'' کا ایک حصہ پڑھا۔ پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے فراغت کی۔ پندرہ سال کی عمر ہی میں والد صاحب سے مشکوٰۃ کا درس لیا۔ صحیح بخاری، شمائل ترمذی، تفسیر مدارک و بیضاوی، فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ، منطق میں شرح شمسیہ، علم الکلام میں شرح عقائد، سلوک میں عوارف اور رسائل نقشبندیہ، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح اور دیگر کتب ان کے نصاب میں شامل تھیں۔ خود فرماتے ہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانے میں مضامین عالیہ ذہن میں آتے تھے، جن میں برابر ترقی محسوس ہوتی تھی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد بارہ سال تک دینی کتب اور عقلی علوم کی کتابیں پڑھنے پڑھانے کی پابندی کی اور ہر علم میں غور وخوض کا موقع ملا۔

ابتدائی تربیت:

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی شفقت میرے حال پر ایسی تھی کہ کم ہی کسی باپ کی بیٹے پر، کسی استاد کی شاگرد پر اور کسی شیخ کی مرید پر ہوگی۔ ان کے والد کی تربیت کا انداز بھی بڑا حکیمانہ تھا۔ ایک روز شاہ صاحب بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک باغ کی سیر کو چلے گئے۔ جب واپس آئے تو والد صاحب نے پوچھا، ولی اللہ! تم نے آج دن رات میں ایسا کام کیا جو باقی رہے؟ آج کے دن کا حاصل کیا ہے؟ ہم نے اس عرصے میں اتنا درود پڑھا۔ شاہ صاحب یہ سن کر بہت نادم ہوئے اور اس دن کے بعد سے ان کا دل باغات کی سیر و تفریح سے بالکل اچاٹ ہوگیا۔

ان کے والد بیٹے کو طفولیت ہی میں آداب مجلس، تہذیب اور شائستگی کی باتیں بہت سکھاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جو لوگ معظم و مکرم ہوں، ان سے ہمیشہ سلام میں سبقت کرو، ان سے ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آؤ، ان کی

خیریت واحوال دریافت کرو۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ بعض لوگ کسی خاص پوشاک یا عادت کے پابند ہو جاتے ہیں۔ کوئی خاص تکیہ کلام اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض کھانوں سے اس قدر متنفر ہو جاتے ہیں کہ ان کی چڑ بن جاتی ہے۔ان سب چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔شاہ صاحب کی عمر سترہ سال کی تھی کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے رحلت کی۔ آپ نے مرضِ موت میں بیٹے کو بیعت وارشاد کی اجازت دی اور بار بار فرمایا''یدہ کیدی'' (اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے)

شادی:

شاہ صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی کہ آپ کی شادی آپ کے ماموں شیخ عبید اللہ صدیقی چشتی کی صاحبزادی سے کردی۔ان کی زوجہ سے آپ کے بڑے فرزند شیخ محمد پیدا ہوئے،جنہوں نے آپ ہی سے تعلیم پائی۔شاہ صاحب کی وفات (1762ء) کے بعد قصبہ بڑھانہ منتقل ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔شاہ صاحب کا دوسرا عقد پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد سیّد ثناءاللہ پانی پتی کی صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوا جو سونی پت کے رہنے والے تھے اور سیّد ناصر الدین شہید سونی پتی کی اولاد میں تھے۔ان زوجہ سے آپ کے چاروں نامور فرزند (حضرت شاہ عبدالعزیز،شاہ رفیع الدین،شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی) پیدا ہوئے جو ہندوستان میں دینِ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ''ارکان اربعہ'' ہیں۔ایک صاحبزادی امۃ العزیز بھی پیدا ہوئیں۔ان کا عقد مولوی محمد فائق ابن مولانا محمد عاشق پھلتی سے ہوا۔وہ صاحب اولاد تھیں۔ان کا سلسلہ جاری رہا۔

سفر حرمین:

شاہ صاحب نے دومرتبہ فریضہ حج ادا کیا،اور حدیث شریف جسے آپ نے مولانا محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھا تھا،اس کی سند شیخ ابوطاہر مدنی سے لی۔شیخ ابوطاہر آپ کے فہم کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معانی کی۔شاہ صاحب کی علمی،فکری اور دعوتی وتجدیدی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور قیام ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔حجاز کے اس طویل قیام میں جو ایک سال سے زیادہ رہا،ان کی ذہنی و علمی صلاحیت نے ارتقاء کی وہ منازل طے کیں جو بظاہر ہندوستان میں ممکن نہ تھیں اور اس کے لیے حرمین جیسی مرکزی وعالمی جگہ ہی درکار تھی۔

اسی زمانے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ منورہ میں بطور طالب علم وارد تھے۔شاہ صاحب کی عمر اس وقت تیس سال کی تھی۔یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی،لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ کئی ایسے بزرگ ہوں گے،جنہیں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے دونوں بڑے رہنما جانتے ہوں گے اور دونوں کے بعض اساتذہ رہنما جانتے ہوں گے اور دونوں کے بعض اساتذہ مشترک ہوں۔قیام مکّہ معظمہ کے زمانے میں شاہ صاحب نے ایک خواب دیکھا،جس کے دوران میں خود رسول کریم ﷺ نے آپ کو یہ بشارت دی''جو تمہارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ اُمّتِ مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعے کی جائے''۔

ہندوستان کو واپسی:

استاد کو الوداع کہہ کر شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور 9 جولائی 1732ء کو اپنے وطن مالوف دہلی میں وارد ہوئے، لیکن اس وقت وطن اور اسلامی حکومت پر زوال و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سے دشمن، اور ان سے بدتر دوست نما دشمنوں کا ہجوم تھا۔ مرہٹے، سکھ، جاٹ، سادات، بارہہ، نادر شاہ، اہل ہندوستان اور مخلوقاتِ الٰہی کے لیے ایک قہرِ عظیم بنے ہوئے تھے۔ ان حالات کے مشاہدے سے شاہ صاحب کے دل پر جو گزر رہی ہوگی، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان علماء و مشائخ کے اس طبقے کا ہم خیال نہ تھا جو عالمانہ یا صوفیانہ مشاغل میں اس طرح مستغرق ہو جاتے ہیں کہ دنیوی ماحول ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس خاندان کو علم و عرفان کی قوی کشش کے باوجود، سیاسی واقعات اور حالاتِ حاضرہ سے بڑا لگاؤ رہا ہے اور وہ قوم کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہے ہیں۔

خلافت ظاہری و باطنی:

شاہ صاحب کو مادی اور دنیاوی چیزوں کی اہمیت کا احساس بھی تھا اور ساتھ ہی مذہبی اور دینی کاموں کی فضیلت کے بھی قدردان تھے۔ اس بات کو انہوں نے اپنی تصنیف ''فیوض الحرمین'' میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کا کام جاری رکھنے والوں کے لیے دو راستے ہیں۔ خلافتِ ظاہری اور خلافتِ باطنی اور دونوں اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری ہیں۔

لکھتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کی زندگی امتِ مرحومہ کے لیے نیک نمونہ ہے۔ مثلاً خلافت ظاہری والوں کے جو جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت، اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات اور محصول مال گزاری وغیرہ کی وصولی، ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم، مقدمات کے فیصلوں، یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام، راستوں، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لیے مقرر ہیں۔ مسلمانوں میں جو ان مشاغل اور خدمات میں مصروف ہیں، ان کو میں خلافت ظاہری والوں کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

> ''جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قانون اسلامی، قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں، وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے، خواہ وہ مناظر و مباحثہ کی راہ سے، جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے یا وعظ و پند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطیب، جس خدمت کو انجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں، جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے، اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں، حج کراتے ہیں اور جو احسان (دوامِ حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں ان کو ہم ''خلفاءِ باطنی'' کے نام سے

شاہ صاحب نے خود کو رسول کریم ﷺ کی خلافت باطنی کے لیے وقف رکھا۔ خلافتِ ظاہری کے لیے جو لوگ زیادہ موزوں ہوئے، وہ ان کی ہمت افزائی کرتے اور قوم کی مادی و دنیاوی مشکلات کبھی ان کی نظر سے اوجھل نہ ہوئیں۔ لیکن ان کا اپنا راستہ دوسرا تھا۔ انہوں نے نہ صرف قرآن مجید کا فارسی ترجمہ اور درس و تالیف کتب حدیث سے قرآن و سُنّت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا اور علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم و تدوین سے ہمارے لیے ایک بیش بہا علمی خزینہ مستقل یادگار چھوڑا، بلکہ اختلافی معاملات میں ایک ایسا معتدل راستہ اختیار کر کے، جس پر صوفی اور مُلاّ، شیعہ اور سُنّی، حنفی اور حنبلی، معتزلہ اور اشاعرہ، وحدت الوجودی اور وحدت الشہودی (وجودی اور مجددی) متفق ہو سکیں، اسلامی ہندوستان کو ایک ایسا دینی اور علمی نظام عطا کیا جو اس ملک میں قومی شعار کی حیثیت حاصل کر سکتا تھا اور جس کے مروّج و مقبول ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک متفق علیہ مذہبی نظام کی بنیادوں پر ایک قوم کی تعمیر ہو سکی اور جدید اسلامی ہندوستان کا آغاز ہوا۔

مولانا شبلی نعمانی ''تاریخ علم الکلام'' میں لکھتے ہیں: ''ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد، بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہو گا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے''۔

قرآن مجید کا ترجمہ:

آپ کا سب سے اہم اور بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی، لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان و بوستان سعدی اور شاہنامہ فردوسی تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے ناواقف رہتے۔ پرانے علماء اور خواص میں سے اگر کسی نے قرآن مجید پڑھا تو ناظرہ، یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اس کی روح و تعلیمات سے فیض یاب ہوئے بغیر۔ اکبر بادشاہ کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتگیزی مبلغین میں مباحثے ہوئے اور انہوں نے کلام مجید کے بعض حصوں پر اعتراض لکھے تو اس وقت پتا چلا کہ مسلمان واقعی عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے قرآن مجید سے نابلد تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ جب علماء کو اس کا پتا چلا تو تلواریں سونت کر آ گئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے دہلی سے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح سمجھے بغیر پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ یہ مسلمان کا دستور العمل ہے۔ اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ ہموار ہو گئی۔

تصانیف:

قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے علاوہ حدیث، اصول فقہ، اجتہاد و تقلید، تصوف، کلام، تاریخ، سیرت، اسرارِ شریعت، اصلاح معاشرت وغیرہ کے موضوعات پر بے اندازہ فکری و تصنیفی کام کیا۔ یہاں خاص خاص تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

1۔ فوز الکبیر اصول تفسیر میں مختصر لیکن پر مغز رسالہ، یہ فارسی زبان میں ہے۔

2۔ حجۃ اللہ البالغہ (عربی): فقہ، اسرارِ شریعت اور تصوف کے علاوہ احادیث کے ایک اہم ذخیرے کی علمی و عقلی تشریح ہے۔ فقہ و حدیث، عقائد و عبادات، معاملات و مناکحات، حکمت و سیاست، اخلاق و معاشرت اور تمدن معیشت کے مباحث بھی شامل کتاب ہیں۔ عرب ملکوں کے علاوہ اس کے متعدد اردو ترجمے بھی چھپ چکے ہیں۔

3۔ شرح تراجم امام بخاری (عربی) امام بخاری نے صحیح بخاری میں احادیث پر جو عنوان قائم کیے ہیں، ان کا حل اور دیگر فوائد بھی۔

4۔ الاربعین (عربی) حضرت علیؓ سے ایک سند سے مروی چالیس احادیث، متعدد اردو ترجمے طبع ہو چکے ہیں۔

5۔ ازالۃ الخفا: (فارسی) خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات پر مبسوط کتاب ضمناً اسلام کے اصول عمرانی ونظریۂ سیاست پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

6۔ فیوض الحرمین: (عربی) زمانۂ قیام حجاز کے مشاہدات و تجربات، نیز علم الکلام اور تصانیف کے مباحث پر مشتمل ہے۔

7۔ الخیر الکثیر: (عربی) فلسفہ، طبقات، تصوف اور حکمت الاشراق کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس میں معرفت ذات، اسمائے الٰہی کی حقیقت، وحی کی حقیقت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ چار عظیم فرزند اور سینکڑوں تصانیف اور ہزاروں عقیدت مند سوگوار چھوڑ کر شاہ ولی اللہ 10 اگست 1762ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔

شاہ ولی اللہؒ کے چند قدر شناس

اب یہ زیادہ مناسب معلوم ہوا کہ ذرا ٹھہر کر مجتہدین اور مجددین کی محفل میں شاہ صاحب کا مقام و مرتبہ متعین کر لیا جائے، اور اس کے لیے مشاہیر واکابر سے رجوع کرنے سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہاں چند اصحاب الرائے کے تاثرات و خیالات جمع کئے جا رہے ہیں:

مولانا ابوالکلام آزاد

(حضرت مجدد الف ثانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد مولانا آزاد لکھتے ہیں): ''پھر بارھویں صدی

ہجری کا ایک عظیم ترین ظہور علوم و معارف دیکھو۔ زمین بنجر ہو چلی تھی۔ پھر بھی کھیتوں کی سبزی اور پھولوں کی لالی سے کوئی گوشہ بالکل خالی نہ تھا۔ تیرہویں صدی کے تمام کاروبارِ علم و طریقت کے اکابر و اساتذہ اسی صدی میں برآوردہ ہوئے۔ بعض بڑے بڑے سلاسل درس و تدریس کی بنیادیں اسی میں استوار ہوئیں، جیسے خاندان مشہور فرنگی محل، اور ہندوستان سے باہر بلادِ عربیہ و عثمانیہ میں اکثر مشاہیر علم و ارشاد، جیسے ابراہیم کورانی، محمد بن احمد سفارینی نجدی، سیّد عبدالقادر کوکبانی (یمن)، شیخ عمر فاسی (تیونس)، شیخ سالم بصری (مکہ معظمہ)، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، شیخ عبدالخالق زبیدی (یمن)، علامہ فلانی، صاحب ''ایقاظ'' (سوڈان)، شیخ محمد حیات سندھی مدنی وغیرہم کہ شاہراہِ عام سے اپنی راہ الگ رکھتے تھے اور حقیقت مستورہ کے شناسا وحق آگاہ تھے۔ بایں ہمہ معلوم ہے کہ جو دورۂ آخر کے ''فاتح'' اور سلطان عصر ہونے کا مقام تھا، اور قطبیت وقت کا، وہ صرف حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ کے لیے تھا۔ اور لوگ بھی بیکار نہ رہے، کام کرتے رہے، مگر جو کام یہاں انجام پایا، وہ صرف یہیں کے لیے تھا۔ (تذکرہ صفحہ 268)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

(امت مسلمہ کے مختلف طبقات کو اصلاح و انقلاب کی دعوت کے ضمن میں شاہ صاحب کے امتیاز خصوصی کا تعین کرنے کی خاطر امام غزالی اور علامہ ابن جوزی کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے بعد مولانا ندوی یوں بیان کرتے ہیں): ''ان دو شہرۂ آفاق داعیان دین کے بعد ہمیں اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، انہوں نے سلاطین اسلام، امراء و ارکان دولت، فوجی سپاہیوں، اہل صنعت و حرفت، مشائخ کی اولاد (پیرزادوں) غلط کار علماء، متقشف اور خوردہ گیر واعظوں اور تارک الدنیا و عزلت گزیں زاہدوں کو علیحدہ علیحدہ خطاب کیا ہے۔ ان کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھی ہے، اور ان کی اصلی بیماریوں اور خود فریبیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان سب کے علاوہ امت اسلامیہ سے عمومی اور جامع خطاب فرمایا ہے، اور ان کے امراض کی تشخیص کی ہے اور ان کا علاج بتایا ہے۔ ان خصوصی خطابات میں شاہ صاحب کے دل کا درد، اسلامی حمیت کا جوش، دعوت کا جذبہ اور زورِ قلم اس نقطۂ عروج پر ہے، جس کی مثال سابق الذکر مصلحین اور ان کی مذکورہ بالا کتابوں میں ملنی مشکل ہے''۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد پنجم صفحہ 325)

مولانا مناظر احسن گیلانی

''میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب ہندوستان میں ہوش سنبھالا تو ان تک یورپ کے مخفی ذہنی تسلط اور آئندہ اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا علم کس راہ سے پہنچا، لیکن اپنی پوری زندگی جس جدوجہد میں شاہ صاحب نے صرف کی، اس کے ایک بڑے حصے کا تعلق ان ہی پیدا ہونے والے خطرات کے انسداد سے معلوم ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ ایک مسلک وضع کر کے پا لینے میں کامیاب ہوئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فقہ بھی بچ گئی۔ تصوف بھی تباہی سے محفوظ رہا۔ قدیم کلام کی بنیاد پر ایک ایسے جدید علم کلام کی بنیاد تصوف اور تصوف کے ساتھ علم کلام کی ایسی معتدل آمیزش ہوئی۔ یہ کہ اس کی بدولت مسلمانوں کا تصوف بھی زندہ ہے اور ان کے کلامی نظریات کی بھی زیادہ واضح شکلوں میں زندہ رہنے کی ضمانت پیدا

ہوگئی، اور اسی کے ساتھ پچھلے زمانے میں دین کے اصلی سرچشموں سے علمائے اسلام کو جو بُعد پیدا ہو گیا تھا اور یہ فطری بات ہے کہ نتائج وثمرات کی مشغولیت عموماً اصول سے دوری کا سبب بن جاتی ہے، لیکن شاہ ولی اللہ نے ایک ایسا محتاط اور متوازن قدم اٹھایا کہ نتائج وثمرات کی مشغولیت میں کسی قسم کی افسردگی بھی پیدا نہیں ہوئی اور اسلام کے اساسی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کے ساتھ اہل علم کے تعلقات نئے سرے سے تر و تازہ ہو گئے۔ تقلید جامد کا وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا جو تقلید کی کہنگی سے عموماً قائم ہو جاتا ہے اور آزادیٔ رائے کے ساتھ تحقیقی تقلید کا ایک ایسا رنگ ان کے اور ان کے تلامذہ کے درس وتالیف نے پیدا کیا کہ ہر چیز اپنے اپنے طبعی مقام پر آ کر ٹھہر گئی (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، صفحہ 26)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

''حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب (1703ء۔1763ء) پیدا ہوئے۔ ایک طرف ان کے زمانے اور ماحول کو، اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے، کہ اس دور میں اس نظر، ان خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا۔ اس تاریک زمانے میں نشوونما پا کر ایک آزاد خیال مفکر ومبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانے اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ ومجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے، اور ایسا لٹریچر بھی چھوڑ جاتا ہے، جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، موادِ تحقیق اور نتائج مستخرجہ، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، حتیٰ کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں، جس کے گرد وپیش عیاشی، نفس پرستی، قتل وغارت، جبر وظلم اور بدامنی وطوائف الملوکی کا طوفان برپا تھا۔

شاہ صاحب تاریخ انسانی کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک صاف، سیدھی شاہراہ بناتے ہیں، اور ذہن کی دنیا میں حالات موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی اور تعمیرِ نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریب فاسد وتعمیر صالح کے لیے ایک تحریک اٹھتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی تحریک اٹھاتے ہوئے اور بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لیے میدان میں نکل آتے ہوں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے لیڈروں کا اصلی کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تنقید سے صدہا برس کی جمی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں۔ اذہان میں نئی روشنی پیدا کرتے ہیں۔ زندگی کے بگڑے ہوئے، مگر پختہ بنے ہوئے سانچے وعالم ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے سے اصلی پائیدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں''۔ (تجدید واحیائے دین۔ صفحہ 89)

ڈاکٹر اسرار احمد

''بارہویں صدی ہجری میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ساتھ ساتھ شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی

کی شخصیت بھی نظر آتی ہے، اور انہیں اس بناء پر شہرت بھی زیادہ حاصل ہوئی کہ ان کی تائید اور تعاون سے آل سعود نے نجد میں ایک مضبوط حکومت قائم کی جس کا حیطۂ اقتدار جزیرہ نمائے عرب میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، تا آنکہ حجاز مقدس بھی ان کے زیر تسلط آ گیا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ کار تجدید کی وسعت اور گہرائی دونوں کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلوی کا پلڑا ان کے مقابلے میں بہت بھاری ہے، اس لیے کہ اگر شیخ محمد ابن عبدالوہاب نے مشرکانہ اوہام کا ازالہ اور بدعات و رسومات کا قلع قمع تو خوب کیا، اور دین کو اس کے ظاہر پہلوؤں کے اعتبار سے یقیناً جملہ آلائشوں سے پاک کر کے بالکل ''خالص'' کر دیا، لیکن چونکہ انہیں منطق اور فلسفے سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی، لہٰذا دین حق کے حکمت و معرفت کے غامض اور عمیق پہلو خود ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے۔

''ان کے مقابلے میں شاہ ولی اللہ نہایت جامع شخصیت کے حامل تھے۔ چنانچہ تفسیر و حدیث اور اصول و فقہ کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب، منطق و فلسفہ اور تصوف و سلوک میں بھی درکِ کامل رکھتے تھے، اور راقم الحروف اپنے اس احساس کے بیان میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ قرونِ اولیٰ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیت کبریٰ کی حامل کوئی اور شخصیت نظر نہیں آتی۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ شاہ صاحب کو جدید عمرانیات کا موجد اول قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے ضمن میں انہوں نے علامہ ابن خلدون کے برعکس، جنہوں نے سیاست اور حکومت کے معاملات و مسائل کو زیادہ پیش نظر رکھا تھا، عہد حاضر کے تقاضوں کی مناسبت سے اصل توجہ ''فلسفۂ ارتفاقات'' کے عنوان کے تحت معاشیات و اقتصادیات پر مرتکز کی ہے۔ بہر حال کم از کم ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کے نزدیک اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے مجدد اور دورِ جدید کے فاتح (افتتاح کرنے والے) حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں''۔ (استحکام پاکستان۔ صفحہ 153)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

''شاہ ولی اللہ ایک قاموسی علمیت کے آدمی تھے۔ وہ ان علماء میں نہیں تھے، جو انسانی علم کی مختلف شاخوں کو اپنے دماغ کے مختلف خانوں میں رکھتے ہیں اور نہ اس اعتبار سے ان کی علمیت محض فضیلت مآبی تھی۔ وہ اس کے خلاف تھے کہ علمی عظمت کے لوگ اپنے آپ کو اپنے مدرسوں اور خانقاہوں کے گنبدوں میں بند رکھیں۔ ان کا خیال تھا کہ علم کو ملت کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے پیچھے بہت سی بیش بہا کتابیں چھوڑی ہیں، مگر ان کی اس دلی تمنا نے، کہ وہ اپنی قوم کو اس تباہی سے بچائیں جو سر پر منڈلا رہی تھی، ان کتابوں کے مرتبے کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا، اسے ملت اسلامیہ کے معاملات میں ان کی جذبات و عملی مشغولیت اور اسے تباہی سے بچانے کے لیے ان کی دلی تمنا سے صحت و معقولیت حاصل ہوئی۔ دنیا نے ان جیسے بہت علماء پیدا نہیں کئے ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی عظمت کا اعتراف ان کے معاصرین نے کر لیا تھا اور ان کے اس دعوے پر کہ وہ اس صدی کے مجدد تھے، کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ انہیں تمام محاذوں پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ برعظیم میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے خلاف بہت زیادہ قوتیں کارفرما تھیں۔ مرہٹوں کو 1761ء میں پانی پت کے میدان میں جو شکست ہوئی، اس نے برعظیم کی تاریخ میں مسلم طاقت کی نشاۃ ثانیہ کا ایک نیا باب نہیں کھولا اور نہ ہندوستان میں

اسلام کے فرقوں اور ان کے ضمنی فرقوں کے درمیان افتراق کی آواز خاموش ہوئی، مگر انہیں ایک ایسی مشعل جلانے میں نمایاں کامیابی ہوئی، جس نے ان بہت سے لوگوں کی راہ کو روشن کیا جو ان کے بعد آئے اور جنہوں نے ملت اسلامیہ کے دینی عقائد اور نظریاتی وجود کو قائم رکھنے کے لیے کام کیا، اور یہ کامیابی ان قلعوں سے زیادہ پائیدار ثابت ہوئی، جو سیاست کی بھربھری اور تغیر پذیریت سے تعمیر کیے جاسکتے تھے"۔ (علماء میدان سیاست میں۔ صفحہ 148)

شیخ محمد اکرام

"شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا، جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں، اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورت حالات کا افسوس ہوتا ہوگا، لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے، اسے اپنا دائرہ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رَو کو روکیں، لیکن جس کے لیے وہ موزوں تھے، اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرمﷺ کی خلافت باطنیہ)، اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں، اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی، تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی اختلافات مٹانا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن جائیں اور آنے والی مصیبتوں کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔ شاہ صاحب نے قرآن، حدیث، فقہ، تصوف میں سال ہا سال کی محنت کے بعد ایک دستور العمل مرتب کر دیا، جس سے اختلافات کی گنجائش تھوڑی ہے اور جس پر آج ہندوستان کے سمجھنے والے اور سوچنے والے علماء، صوفیاء، فقہاء اور عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد متفق ہے۔ (رود کوثر۔ صفحہ 585)

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تنقیدی تحریک

مولانا عبید اللہ سندھی اپنے مرشد شاہ ولی اللہ کی تحریک کو سمجھنے سمجھانے کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں، یعنی اصلاحی تحریک اور سیاسی تحریک۔ اسی بات کو مولانا مودودی اپنے پیرایے میں شاہ صاحب کے مجموعی تجدیدی کارنامے کو دو بڑے عنوانات پر تقسیم کرتے ہیں، ایک ان کا تنقیدی کام اور دوسرے ان کا تعمیری کام۔

تنقید سے مراد یہ ہے کہ اپنے حال کے تمام احوال و ظروف کا نہ صرف تنقیدی تجزیہ، بلکہ برملا اظہار اور عالمانہ ابلاغ بھی کیا۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی نے شاہ صاحب کی باریک بینی اور امتیازی خصوصیت کا ذکر یوں کیا ہے:

تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کا فرق

"شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جس کی نظر تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین کے اصولی فرق تک پہنچی ہے اور جس

نے تاریخ مسلمین کے نقطۂ نظر سے نقد وتبصرہ کرے، یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان بہت سی صدیوں میں اسلام قبول کرنے والی اقوام کے درمیان فی الواقع اسلام کا کیا حال رہا ہے۔ یہ ایک ایسا نازک مضمون ہے جس کی پیچیدگیوں میں پہلے بھی لوگ الجھے رہے ہیں اور اب تک الجھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کے بعد کوئی ایسا صاحب نظر نہ اٹھا جس کے ذہن میں حقیقی تاریخ اسلام کا، تاریخ مسلمین سے الگ کوئی واضح تصور ہو۔ شاہ صاحب کے کلام میں مختلف مقامات پر اس کے متعلق ارشادات موجود ہیں، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ایک دور کی خصوصیات اور ایک ایک زمانے کے فتنوں کو بیان کرتے ہوئے، آنحضرت ﷺ کی ان پیشین گوئیوں کو بھی نقل کرتے گئے ہیں، جن میں ان حالات کی طرف صریح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس تبصرے میں قریب قریب ان تمام جاہلی آمیزشوں کی نشاندہی ہوگئی ہے جو مسلمانوں کے عقائد، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست میں ہوتی رہیں''۔

پھر شاہ صاحب نے ان تمام خرابیوں کے ہجوم میں کھوج لگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان میں بنیادی خرابیاں کون سی ہیں جن سے باقی تمام خرابیاں جنم لیتی ہیں، اور آخرکار دو بنیادی خرابیوں پر انگلی رکھ دی ہے

1۔ سیاسی اقتدار کا خلافت سے بادشاہت کی طرف منتقل ہونا۔

2۔ روحِ اجتہاد کا مردہ ہو جانا اور تقلید جامد کا دماغوں پر مسلط ہو جانا۔

خلافت سے بادشاہت کی طرف

خلافت اور بادشاہت کے اصولی فرق کو جس قدر وضاحت، قطعیت اور صحت کے ساتھ شاہ صاحب نے بیان کیا اور جس طرح احادیثِ نبویؐ سے اس کی تشریح کی ہے، اس کی مثال ان سے پہلے کے کسی مصنف کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اسی طرح سیاسی اقتدار کے خلافت سے بادشاہت کی طرف منتقل ہو جانے سے جو برے نتائج رونما ہوئے، اس کی صراحت بھی جس خوبی اور عمدگی سے انہوں نے پیش کی، وہ پچھلے مصنفین کے ہاں مفقود ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ارکانِ اسلام کی اقامت میں فتورِ عظیم پیدا ہو گیا ہے۔۔۔۔ حضرت عثمانؓ کے بعد کسی فرماں روا نے حج قائم نہیں کیا، بلکہ اپنے نائب ہی مقرر کر کے بھیجتے رہے، حالانکہ اقامت حج خلافت کے لوازم میں ہے۔ جس طرح تخت پر بیٹھنا، تاج پہننا اور گزشتہ بادشاہوں کی شہ نشین میں بیٹھنا قیصر و کسریٰ کے لیے علامتِ بادشاہی تھا، اسی طرح حج خود اپنی امارات میں قائم کرنا اسلام میں علامتِ خلافت ہے''۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''پہلے وعظ اور فتویٰ دونوں خلیفہ کی رائے پر موقوف تھے۔ خلیفہ کے بغیر نہ وعظ کہا جا سکتا تھا اور نہ کوئی فتویٰ دینے کا مجاز تھا، مگر بادشاہت کے آجانے سے وعظ اور فتویٰ دونوں اس نگرانی سے آزاد ہو گئے، بلکہ بعد میں تو فتویٰ دینے کے لیے جماعتِ صالحین کے مشورے کی قید بھی نہ رہی''۔

مزید فرماتے ہیں: ''ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کی مانند ہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اسی تغیر کے دامن میں پیدا ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں آگے چل کر خدا تعالیٰ کیا دکھانا چاہتا ہے''۔

روحِ اجتہاد کا مردہ ہو جانا

رہی دوسری بنیادی خامی، یعنی روح اجتہاد کا مردہ ہو جانا اور تقلید جامد کا دماغوں پر مسلّط ہو جانا، تو شاہ صاحب نے قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اس پر اظہار افسوس کیا ہے۔ ''ازالۃ الخفا'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دولت شام (اموی سلطنت) کے خاتمے تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا، بلکہ سب اپنے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقے پر شرعی دلائل سے استنباط کرتے تھے۔ دولتِ عراق (عباسی سلطنت) کے زمانے میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معین کیا اور یہ کیفیت ہوگئی کہ جب تک اپنے مذہب کے بڑوں کی نص نہ پاتے، کتاب وسلطنت کی دلیل پر فیصلہ نہ کرتے۔ اس طرح وہ اختلافات، جو تاویل کتاب وسُنّت کے تقاضوں سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے، مستقل بنیادوں پر جم کر رہ گئے۔ پھر جب دولت عرب کا خاتمہ ہوگیا یعنی ترکی کی اقتدار (خلافت عثمانیہ) کا زمانہ آیا اور لوگ مختلف ممالک میں منتشر ہوئے، تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے فقہی مذہب سے یاد کیا تھا، اسی کو اصل بنا لیا''۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''ہمارے زمانے کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں۔ اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے۔ اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کا کاروبار ہی دوسرا ہے۔ یہ بے چارے ان امور کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے''۔

ماضی کی تاریخ پر تنقید کرنے کی شاہ صاحب اپنے زمانہ حال کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک ایک کو نام بنام پکار کر اس کے نقائص بیان کرتے ہیں۔

سلاطین سے خطاب

''اے بادشاہو! تمام تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو، جب تک مسلم مشرک سے جدا نہ ہو جائے۔ پھر جب کفر واسلام کے درمیان ایسا کھلا، نمایاں امتیاز پیدا ہو جائے، تب تمہیں چاہیے کہ ہر تین دن یا چار دن کے سفر کی منزلوں پر اپنا ایک ایک حاکم مقرر کرو۔ ایسا حاکم جو عدل وانصاف کا مجسمہ ہو، قوی ہو، جو ظالم سے مظلوم کا حق وصول کر سکتا ہو۔۔۔ اے بادشاہو! جب تم یہ کر لو گے تو تم لوگوں کی تمدنی اور عائلی زندگی کی طرف توجہ کرو۔ ان کے باہمی معاملات کو سلجھاؤ، اور ایسا کر دو کہ پھر کوئی معاملہ ایسا نہ ہونے پائے جو شرعی قوانین کے مطابق نہ ہو۔ اس کے بعد لوگ امن وامان کی صحیح مسرت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں''۔

امراء اور ارکان دولت سے خطاب

اے امیرو! کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا۔ تم دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے ہوئے ہو اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائیں۔ علانیہ شرابیں پیتے ہو اور اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے۔ زنا کاری، شراب خوری اور قمار بازی کے اڈے برسر عام بن گئے اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں چھ سو سال سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی۔ جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو، اسے چھوڑ دیتے ہو۔ تمہاری

ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ قسم قسم کے لذیذ کھانے پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے؟ خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لیے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانے کا انقلاب ہے، کیونکہ تم اکثر بولتے ہو کہ اللہ قادر ہے۔ وہ جو چاہے سو کرے، یعنی زمانے کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے"۔

فوجی سپاہیوں سے خطاب

"اے فوجیو اور عسکریو! تم کو اللہ نے جہاد کے لیے اعلائے کلمہ حق کے لیے، شرک و اہل شرک کا زور توڑنے کے لیے فوجی بنایا تھا۔ اس کو چھوڑ کر تم نے گھڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنالیا۔ اب جہاد کی نیت اور مقصد سے تمہارے دل خالی ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کرتے ہو۔ بھنگ اور شراب پیتے ہو، ڈاڑھیاں منڈاتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، بندگانِ خدا پر ظلم ڈھاتے ہو، اور تمہیں کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کمارہے ہو یا حلال کی۔ خدا کی قسم تمہیں ایک روز دنیا سے جانا ہے، پھر اللہ تمہیں بتائے گا کہ کیا کرکے آئے ہو۔

اہل صنعت وحرفت سے خطاب

اے صنعت کارو! تم میں سے امانت و دیانت رخصت ہوگئی ہے۔ اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو۔ تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو۔ تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹونکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ تم میں سے جو کوئی شخص خوشحال ہو جاتا ہے، وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لیے کافی نہیں ہوتی اور اہل وعیال کی حق تلفی کرنے پڑتی ہے یا پھر وہ شراب نوشی اور کرائے کی عورتوں میں اپنی معاش اور آخرت دونوں کو ضائع کرتا ہے"۔

مشائخ اور پیرزادوں سے خطاب

"اے وہ لوگو! جو کسی حق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں۔ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقے پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقے کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ پر اتارا تھا۔ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے۔ اپنی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اور اپنے آپ کو ہادی و مہدی سمجھتا ہے، حالانکہ وہ خود بھٹکا ہوا اور دوسروں کو بھٹکانے والا ہے۔ ہم ہرگز ان لوگوں سے راضی نہیں جو دنیا کے فوائد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے ہیں، یا اس لیے علم حاصل کرتے ہیں کہ دنیوی اغراض حاصل کریں یا لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی اطاعت ان سے کراتے ہیں۔ یہ سب راہزن ہیں، دجال ہیں، کذاب ہیں۔ خود بھی دھوکے میں ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکا دے رہے ہیں"۔

غلط کار علماء سے خطاب

اے بد عقلو! انہوں نے اپنا نام "علماء" رکھ چھوڑا ہے۔ تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو ومعانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے یا پھر وہ سُنّت ہے جو رسول ﷺ سے ثابت ہو۔ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی ﷺ کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا، اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ بہانہ یہ پیش کرتا ہے کہ صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے متعلق فیصلہ تو کاملین و ماہرین کا کام ہے اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی۔ پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ جو انہوں نے اسے ترک کر دیا۔۔۔۔ جان رکھو، یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی ﷺ پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو۔

واعظوں، زاہدوں اور خانقاہ نشینوں سے خطاب

"اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے۔ ہر بری بھلی بات، ہر رطب و یابس تمہارا ایمان ہے۔ تم لوگوں کو جعلی اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا وعظ سناتے ہو۔ اللہ کی مخلوق پر تم نے زندگی تنگ کر چھوڑی ہے، حالانکہ تم فراخی کے لیے مامور تھے نہ کہ تنگی کے لیے۔ تم ایسے لوگوں کی باتیں دلیل میں پیش کرتے ہو جو بے چارے مغلوب الحال تھے اور عشق و محبت میں حواس بھی کھو بیٹھے تھے، حالانکہ اہل عشق کی باتیں وہیں کی وہیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ہیں نہ کہ ان کا چرچا کیا جاتا ہے۔ تم نے شک کو اپنے لیے گوارا کر لیا ہے اور اس کا نام احتیاط رکھ چھوڑا ہے۔

اُمّتِ مسلمہ سے خطاب

"اے ابنِ آدم! تمہارے اخلاق سو چکے ہیں۔ تم پر ناجائز حرص وطمع کا ہوکا سوار ہو گیا ہے۔ تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لیے خوشگوار بنالیا ہے اور حلال تمہارے لیے بدمزا ہو چکا ہے۔ پھر قسم اللہ کی، اللہ نے ہرگز کسی کو اس کے بس سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ چاہیے کہ اپنے مصارف اور وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اسی قدر خرچ کرو، جس کی تم میں سکت ہو۔ یاد رکھو، ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔ اللہ اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے اس کی دی ہوئی آسانیوں سے نفع اٹھائیں۔ اے ابنِ آدم! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو، اس میں وہ آرام کرے۔ اتنا پانی جس سے وہ سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے گزر بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اس کی شرم گاہ کی حفاظت کر سکتی ہو اور اس کے رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو، تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔

آخر میں شاہ صاحب نتیجہ نکالتے ہیں: "رسول کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ تم بھی آخر کار اپنے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کرلو گے، اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے، وہاں تم بھی رکھو گے، حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔ صحابہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ پہلی امتوں سے آپ ﷺ کی مراد

یہود و نصاریٰ ہیں۔ فرمایا اور کون؟'' اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے۔

''سچ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے۔ لوگوں نے یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام الٰہی میں تحریف کرتے ہیں اور نبی ﷺ کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گناہ گار میرے لیے۔ سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیا کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنّت سے مطابقت نہیں رکھتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرع کی انہیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہا کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ نہیں۔ رہے عقلاء اور شعراء، اصحاب ثروت اور عوام، تو ان کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے''۔

ماضی اور حال کے تنقیدی جائزے کے بعد مجدد اور مصلح کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ موجودہ حالت کو جس حالت میں بدلنا مطلوب ہے، اس پر وہ اپنی نظر جمائیں۔

شاہ ولی اللہ کی تجدیدی تحریک

شاہ صاحب کی تجدیدی تحریک کی وسعت اور تنوع کے بارے میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

''شاہ صاحب اللہ تعالیٰ نے امت کی تجدید و اصلاح، دین کے صحیح فہم کے احیاء، علوم نبوت کی نشر و اشاعت اور اپنے عہد و ملت کے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا، اس کا دائرہ ایسا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے، جس کی مثال معاصر ہی نہیں، دورِ ماضی کے علماء و مصنفین میں بھی کم نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ (توفیق اور تقدیرِ الٰہی کے ماسوا) اس عہد کے حالات کا تقاضا بھی ہوسکتا ہے، جو شاہ صاحب کے حصے میں آیا ہے، اور وہ جامعیت، علوئے ہمت اور مخصوص تعلیم و تربیت بھی جو شاہ صاحب کے خصائص میں سے ہے، اس سب کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب نے علم و عمل کے اتنے میدانوں میں تجدیدی و اصلاحی کارنامہ انجام دیا کہ ان کے سوانح نگار کے لیے ان کا احاطہ اور ان سب کا تفصیلی جائزہ لینا دشوار ہے۔ ہم ان کو اگر علیحدہ علیحدہ بیان کریں تو ان کے حسب ذیل عنوانات ہوں گے:۔

1۔ اصلاح عقائد اور دعوت الی القرآن۔

2۔ حدیث و سُنّت کی اشاعت و ترویج، اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی۔

3۔ شریعت اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصد حدیث و سُنّت کی نقاب کشائی۔

4۔ اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافتِ راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات اور رد رفض۔

5۔ سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دورِ زوال و انتصار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار۔

6۔ امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کی اصلاح و انقلاب کی دعوت۔

7۔ علمائے راسخین اور مردانِ کار کی تعلیم و تربیت، جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

مولانا محترم نے اس سات عنوانات کے بیان میں ساڑھے چار سو صفحات کی ایک کتاب تالیف ومرتب کی جو ان کی مشہور "تاریخ دعوتِ وعزیمت" کے حصہ پنجم پر محیط ہے، جب کہ ہماری اس زیر تالیف "تاریخ" کا احوال یہ ہے کہ ہمارے قلم پر ہمہ وقت امیر محترم کوڑے برساتے رہتے ہیں کہ یہ سلسلہ مختصر کرو، مزید مختصر کرو۔ بعض اوقات تو بالکل زبان بندی کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے اسلامیان عالم کے جذبوں اور امنگوں شکستہ ارادوں اور نا آسودہ عزائم، ماضی کے حقائق کو مستقبل کے خوابوں سے ملانے کی سلسلہ در سلسلہ داستان کو، کوئی کہاں تک مختصر، مزید مختصر کرتا چلا جائے، جب کہ عصرِ حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ سب مصنفین اپنے اپنے قلم کھول لیں اور اپنے مدفون خزینوں اور فکرِ آثار کی کھدائی کر کے امت مسلمہ کی خدمت میں پیش کرنے کا فریضہ انجام دیں۔

شاہ صاحب کی جامع تحریک کے عنوانات، ہم یوں قائم کریں گے:

1۔ شاہ صاحب کی تجدیدی تحریک

2۔ شاہ صاحب کی سیاسی تحریک

3۔ شاہ صاحب کی معاشی تحریک

تعمیر، اصلاح اور تجدید کے سلسلے میں ان کے خاص خاص کاموں کی تفصیل یہ ہے:۔

1۔ فقہ میں معتدل مسلک:

شاہ صاحب فقہ میں نہایت معتدل ومتوازن مسلک پیش کرتے ہیں، جس میں کسی ایک مسلک کی جانبداری اور دوسرے مسلکوں پر نکتہ چینی نہیں پائی جاتی۔ ایک محقق کی طرح انہوں نے تمام فقہی مسالک کے اصول اور طریق استنباط کا مطالعہ کیا ہے اور بالکل آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ کسی مسلک کی کسی مسئلے میں تائید کی تو اس بناء پر کی کہ دلیل اس کے حق میں پائی۔ نہ کہ اس بناء پر کہ وہ اس مسلک کی وکالت کا عہد کر چکے ہیں، اور جس سے اختلاف کیا تو اس بنا پر کیا کہ دلیل اس کے خلاف پائی نہ اس بنا پر کہ انہیں اس سے عناد ہے۔ اسی وجہ سے کہیں وہ حنفی نظر آتے ہیں، کہیں شافعی، کہیں مالکی اور کہیں حنبلی۔ انہوں نے ان لوگوں سے بھی اختلاف کیا ہے جو ایک مسلک کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں اور قسم کھا لیتے ہیں کہ تمام مسائل میں اسی کی تقلید کریں گے اور اسی طرح وہ لوگوں سے بھی سخت اختلاف کرتے ہیں جنہوں نے ائمہ مذہب میں سے کسی کی مخالفت کا عہد کر لیا ہے۔ ان دونوں کے بین بین وہ ایک ایسے معتدل راستے پر چلتے ہیں جس میں ہر غیر متعصب طالب حق کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ ان کا رسالہ "انصاف" اس مسلک کا آئینہ ہے۔ یہی رنگ ان کی تصنیف "مصطفیٰ" اور ان کی دوسری کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

وہ "تفہیمات" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی انہی دونوں کے پائے جاتے ہیں اور تصنیفات بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں۔ فقہاء، محدثین، مفسرین، متکلمین اور صوفیا زیادہ تر مذہب شافعی کے پیرو ہیں، اور حکومتیں اور عوام زیادہ تر مذہب حنفی کے پیرو ہیں۔ اس وقت جو امر حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک

مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ ان دونوں کے مسائل کو حدیثِ نبوی ﷺ کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے جو کچھ ان کے موافق ہو، وہ باقی رکھا جائے، اور جس کی کوئی اصل نہ ملے، اسے ساقط کر دیا جائے۔ پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو وہ اس لائق ہیں کہ انہیں دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور اگر ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کئے جائیں، اور دونوں پر عمل کرنے کو صحیح قرار دیا جائے، یا تو ان کی حیثیت ایسی ہوگی جیسی قرآن میں اختلاف قرأت کی حیثیت ہے، یا رخصت اور عزیمت کا فرق ہوگا، یا کسی مخمصے سے نکلنے کے دو راستوں کی سی نوعیت ہوگی جیسے تعداد کفارات یا دو برابر کے مباح طریقوں کا سا حال ہوگا۔ ان چار پہلوؤں کے باہر کوئی پہلو انشاء اللہ تعالیٰ نہ پایا جائے گا۔"

2۔ تحقیق و اجتہاد کا راستہ:

توازن و اعتدال کا یہ مسلک اختیار کرنے سے فائدہ یہ ہے کہ تعصب اور تنگ نظری اور تقلید جامد اور طویل بحث و مباحثے میں تضیع اوقات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ تحقیق و اجتہاد کا راستہ کھلتا ہے چنانچہ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اور قریب قریب ان کی تمام کتابوں میں ایسی عبارتیں موجود ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح تحقیق و اجتہاد پر اکسایا گیا ہے۔

یہی نہیں کہ شاہ صاحب نے اجتہاد پر محض زور ہی دیا ہو، بلکہ انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ اجتہاد کے اصول و قواعد اور اس کی شرائط کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کی تصانیف میں اجتہاد کے مسئلے پر کہیں اشارات اور کہیں مفصل تقریریں موجود ہیں۔ نیز اپنی کتابوں میں جہاں بھی انہوں نے کسی مسئلے پر گفتگو کی ہے، ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت سے کی ہے۔ گویا کہ ان کی کتابوں کے مطالعے سے آدمی کو نہ صرف اجتہاد کے اصول معلوم ہو سکتے ہیں، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی تربیت بھی ملتی ہے۔

3۔ پورے اسلامی نظام کی تدوین:

مذکورہ بالا دو کام تو ایسے ہیں جو شاہ صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے کئے ہیں، مگر جو کام ان سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا، وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیشروؤں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ائمہ گزرے ہیں، جن کے کام دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظامِ حیات کا مکمل تصور رکھتے تھے، اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں، جن سے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے، لیکن بقول مولانا مودودی: "ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہ ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں۔"

ان کی کتابوں میں "حجۃ اللہ البالغہ" اور "البدور البازغہ" دونوں کا موضوع یہی ہے۔ پہلی کتاب زیادہ مفصل ہے اور دوسری زیادہ فلسفیانہ۔ ان کتابوں میں شاہ صاحب نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتداء کی ہے اور تاریخ میں

پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفۂ اسلام کو مدوّن کرنے کی بنیاد ڈال رہا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان فلسفے کے میدان میں جو کچھ سمجھتے اور کہتے رہے، اس کو محض نادانی سے لوگوں نے "فلسفۂ اسلام" کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفۂ اسلام نہیں، فلسفۂ مسلمین سے ہے جس کا سلسلہ یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے۔ فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے، اس کی داغ بیل سب سے پہلے شاہ صاحب ہی نے ڈالی ہے، اگرچہ اصلاحات وہی قدیم فلسفہ، علم الکلام یا تصوف کی زبان سے لی ہیں، اور غیر شعوری طور پر بہت سے خیالات بھی وہیں سے لے لیے ہیں، جیسا کہ اول اول ہر نئی راہ نکالنے کے لیے طبعاً ناگزیر ہے، مگر پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی یہ ایک بڑی زبردست کوشش ہے، خصوصاً ایسے شدید زوال وانحطاط کے دور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل حیرت انگیز ہے۔

اس وقت مسلمانوں میں جو فلسفہ رائج تھا، وہ اسلام کے عملی اخلاقی، فکری اور اعتقادی نظام سے کوئی ربط و تعلق نہ رکھتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا رواج جتنا جتنا بڑھا، اسی قدر مسلمانوں کی زندگی بگڑتی چلی گئی۔ عقیدہ بھی کمزور ہوا، اخلاق بھی بگڑے اور قوائے عمل بھی سرد ہو گئے۔ ذہن میں منتشر و متصادم خیالات کی کشمکش کا یہ طبعی نتیجہ ہے، اور یہی اثرات موجودہ مغربی فلسفے کے رواج پر بھی رونما ہو رہا ہے، کیونکہ وہ بھی کسی طرح نظام اسلامی کی فکری اساس نہیں بن سکتا۔

شاہ صاحب اپنے فلسفے میں کائنات اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا تصور قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے اخلاقی، معاشرتی و تمدنی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہو، یا دوسرے الفاظ میں جس کو اگر شجرِ اسلام کی جڑ قرار دیا جائے تو جڑ میں اور اس درخت میں جو اس سے پھوٹا، عقلاً کوئی فطری مغائرت محسوس نہ کی جا سکتی ہو۔

اخلاقی نظام پر وہ ایک اجتماعی فلسفے کی عمارت اٹھاتے ہیں، جس کے لیے انہوں نے "ارتفاقات" کا عنوان تجویز کیا ہے، اور اس سلسلے میں شہریت، آداب، معاشرت، سیاست، معیشت، عدالت، محصولات، ملکی نظم و نسق اور عسکری تنظیم وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ "ارتفاق" سے شاہ صاحب کی مراد افراد کا ایک دوسرے سے تعاون، اشتراک عمل اور معتدل و متوازن شہری زندگی کے قیام کے لیے "تدبیر نافعہ" ہیں۔ اس طرح شاہ صاحب نے انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی و آخری دونوں زندگیوں سے بحث کی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ تکوینی نظام انبیائے کرام کے لائے ہوئے تشریعی نظام کے نہ صرف مطابق ہونا چاہیے، بلکہ اس کے لیے ممد و معاون اور ان کے مقاصد کا خادم بن کر رہنا چاہیے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ معاشیات کا اخلاقیات سے گہرا رابطہ ثابت کیا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ ربط جب ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے، جس کا اثر مذہب و اخلاق، پرسکون انفرادی زندگی، پرامن اجتماعی زندگی، انسانوں کے باہمی روابط اور تمدن و تہذیب سب پر پڑتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانوں کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی مجبوری سے ان کو اقتصادی تنگی اور غربت و افلاس پر مجبور کر دیا جائے، اس وقت انسان گدھے اور بیل کی طرح سے روٹی حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہنے لگتے ہیں، اور ہر طرح کی سعادتوں اور ترقیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کی معاشی تحریک

اٹھارویں صدی وہ انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز صدی تھی جس میں مغل ملوکیت کا آفتاب ڈھلتے ڈھلتے غروب کے قریب پہنچ رہا تھا اور یورپی ملوکیت کی صبح کاذب ہندوستان کے مشرق میں صبح صادق بنتی جا رہی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی شہنشاہانہ عظمت سے اس صدی کا آغاز ہوا اور خاتمہ اس فدائے ملک وملت کی شہادت پر ہوا جس کو دنیا سلطان ٹیپو کے نام سے پہچانتی ہے، جس کے خونِ شہادت میں لتھڑے ہوئے جنازے کو دیکھ کر انگریز فاتح کی زبان بے ساختہ پکار اٹھی تھی: "آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

مرکزی حکومت کے ارکان میں باہمی کشمکش، صوبائی گورنروں کی خود مختاری، مرہٹوں، روہیلوں، جاٹوں اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی بے مہار طاقت، ان طاقتوں کے تصادم سے ہندوستان کا چپہ چپہ میدان کارزار بنا۔ یار باران کے سیلاب دارالحکومت دہلی تک پہنچے اور تین سو سالہ شہنشاہیت کے احترام و وقار کو پامال کیا۔ ان جنگجو طاقتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے باہر کی طاقتوں سے بھی ساز باز کی۔ ایک گروپ نے نادر شاہ کو بلایا تو دوسرے گروپ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی۔ نوعیت میں کسی قدر فرق رہا، مگر وطن اور اہلِ وطن کو نقصان پہنچانے میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھتے رہے۔

یہ حال ان طاقتوں کا تھا جن کا مرکز ہندوستان، ایران اور افغانستان تھا، جو دارالحکومت دہلی سے قریب کا تعلق رکھنے والی تھیں۔ باقی رہی یورپ کی سفید فام طاقتیں (انگریز، فرانسیسی، پرتگیز، ولندیزی) جو ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں قدم جما چکی تھیں، وہ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کی حریف ہوگئی تھیں، مگر ہندوستان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانے میں سب شریک تھیں۔ بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داروں نے تمام یورپی ساتھیوں سے آگے بڑھ کر اس خانہ جنگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جو ایک بیدار مغز، چست و چالاک حریف ایسے موقع سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے بنگال میں اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔ انتہا یہ کہ ایک طرف ابدالی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کا خاتمہ کر رہی تھیں تو دوسری طرف بنگال میں انگریز فوج نواب سراج الدولہ کو موت کے گھاٹ اتار کر، انگریز سامراج کا پرچم لہرا رہی تھی۔

مرض کی تشخیص

یہ تمام تباہ کن ڈرامے شاہ ولی اللہ کی زندگی میں ان کی چشمِ بینا کے سامنے ہو رہے تھے۔ ایک طرف آپ کے قلبِ حساس میں وطن کی بربادی کا درد تھا۔ دوسری طرف آپ کا مغز بیدار مرض کی تشخیص اور فکرِ علاج میں مشغول تھا۔ اسی اضطراب اور بے چینی میں آپ نے اصلاحی تحریک شروع کی، جس کی شدت سے مخالفت کی گئی، یہاں تک

کہ ایک مرتبہ مسجد فتح پوری سے نکلتے ہوئے آپ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔ اسی فکرمندی میں آپ نے حجاز شریف کا سفر اختیار کیا۔ وہاں دو سال قیام کر کے روحانی اور علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ بڑا کام یہ کیا کہ یورپ اور ایشیاء کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔ خلافتِ عثمانیہ کو اگرچہ معاشرتی خرابیوں کا گھن لگ چکا تھا، مگر پھر بھی وہ اس زمانے میں ایشیا کی سب سے بڑی حکومت تھی۔ تمام مشرقِ وسطیٰ پر اس کے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ بحرِ عرب میں عدن تک اس کا قبضہ تھا اور یورپ اور افریقہ کے بھی بہت سے حصے اس کے زیرِ اقتدار تھے۔ ان تمام ممالک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ نے گہرے غور و فکر اور اعلیٰ تدبر سے فیصلہ کیا کہ جتنی بھی معاشرتی اور اقتصادی برائیاں اس وقت موجود ہیں، ان کا اصل سبب ملوکیت اور بادشاہت ہے۔

انقلاب: واحد علاج

شاہ صاحب کے ضمیر نے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ ان تباہیوں اور بربادیوں کا واحد علاج ''فک کل نظام'' ہے، یعنی ایسا مکمل اور ہمہ گیر انقلاب جو سماج کے مروجہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام کے پورے ڈھانچے کو یکسر بدل ڈالے، کیونکہ اس وقت کا پورا کا پورا نظام ہی بادشاہت و ملوکیت کا پروردہ ہے اور وہ امراض جو شہنشاہیت کے ساتھ لازم ہوتے ہیں، پورے نظام کے ایک ایک شعبے میں سرایت کر چکے ہیں۔ پس کوئی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پورے سماج کے ڈھانچے کو منہدم کر کے اس کی جگہ نظام نو تعمیر کیا جائے۔ یہی ہے ''فک کل نظام'' پورے نظام کا انہدام۔

شاہ صاحب فوجی انقلاب کے حامی تھے، مگر وہ فوجی جو ''جہاد'' کے اصول پر ہو، یعنی جس کا نصب العین سب سے بہتر و برتر ہو، اور جس کا ہر ایک مجاہد ذاتی اغراض سے اس حد تک بلند ہو کہ خود اپنی شخصیت کو بھی فنا کر چکا ہو، یہاں تک کہ فنا کو بقا اور نصب العین کے لیے قربان ہو جانے کو ابدی زندگی تصور کرے۔ شاہ صاحب کی اصلاح میں اس کا نام ''للّٰہیت'' ہے۔ ایسا انقلاب پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعے نہیں ہو سکتا، بلکہ ان رضا کاروں کے ذریعے ہو سکتا ہے، جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو، جو نصب العین کو سمجھیں اور اصلاح و تبدیلی کے نظریات پر پہلے اپنے آپ کو ہموار کریں۔ اس کے بعد ان نظریات کو کامیاب بنانے کے لیے قربان ہو جانا اپنی زندگی کا مشن بنا لیں۔

معاشی انقلاب: واحد نسخہ

ابھی انقلاب فرانس (1789ء) نصف صدی کے بعد آنے والا تھا، اور اشتراکیت کے معلم اول کارل مارکس اور اس کے دست راست ناطقہ اینجلز کی پیدائش میں پوری ایک صدی باقی تھی، اور یورپ میں صنعتی انقلاب کے آنے میں ابھی تقریباً چالیس سال کا فاصلہ تھا، کہ مسلم انڈیا کے ایک بہادر مفکر اور بیدار مغز مصلح و مجدد نے ہندوستان کے تمام سماجی و سیاسی امراض کا نسخۂ کیمیا ''معاشی انقلاب'' کی صورت میں لکھ دیا، جس کے خاص خاص اصول مولانا سید محمد میاں نے اپنی تصنیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں اس ترتیب سے گنوائے ہیں:

1۔ دولت کی اصل بنیاد ''محنت'' ہے۔ مزدور اور کاشتکار اصل اکتسابی قوت ہیں۔ باہمی تعاون شہریت (Citizenship) کی روحِ رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے محنت نہ کرے، ملک

کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

2۔ جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے فی الفور ختم کئے جائیں، جن کے ہوتے ہوئے تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ ان اڈوں کی موجودگی میں قومی دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سٹ آتی ہے۔

3۔ مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک وقوم کے لیے دماغی کام کریں، وہ دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوشحالی ملک وقوم کی ترقی اور خوشحالی ہے۔ جو نظام محنت کش قوتوں کو دبائے وہ ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں، ایسے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔

4۔ جو سماجی نظام محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، قابلِ اعتبار نہیں، جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔

5۔ ضرورت مند مجبور مزدور کی خاموش رضامندی قابلِ اعتبار نہیں، جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔

6۔ جو پیداوار اور آمدنی امداد باہمی اور تعاون کے اصول پر نہ ہو، وہ خلاف قانون ہے۔

7۔ کام کے اوقات محدود کئے جائیں۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اپنی روحانی اور اخلاقی اصلاح کرسکیں، اور ان کے اندر اپنے مستقبل کے متعلق غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

8۔ باہمی تعلقات کا بہت بڑا ذریعہ تجارت اور کاروبار ہے۔ لہذا اس کو تعاون ہی کے اصول پر جاری رہنا چاہیے، پس جس طرح تاجروں اور کاروباری حضرات کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی یا غلط قسم کی مقابلہ بازی سے تعاون اور امداد باہمی کی روح کو نقصان پہنچائیں اسی طرح حکومت کے لیے بھی مناسب نہیں کہ طرح طرح کے بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ اور ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے اور رخنہ اندازی کرے۔

9۔ وہ تجارت یا کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں منحصر کردے، ملک وقوم کے لیے تباہ کن ہے۔

10۔ ایسا سیاسی وسماجی نظام، جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش وعشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد اوپر سے نیچے تک ختم کرکے عوام کے مصائب دور کئے جائیں اور ان کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع دیا جائے۔

11۔ زمین کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ اور ظاہری نظام کے لحاظ سے ”ریاست“ (State) ہے۔ ملک کے باشندوں کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقِ انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

12۔ تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالک الملک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے، نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

13۔ ریاست کے سربراہ (صدرِ مملکت) کی حیثیت وہ ہے، جو کسی وقف کے متولی کی۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اپنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندے کی طرح زندگی گزار سکے۔

14۔ روٹی، کپڑا اور مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر سکے، بلحاظ مذہب و نسل و زبان، ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

15۔ کسی طرح مذہب، نسل، رنگ یا زبان کے کسی فرق و تفاوت کے بغیر، عام باشندگان کے معاملات میں یکسانیت و مساوات کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس کی حفاظت، حقِ ملکیت میں آزادی، حقِ اظہار میں آزادی، حقوقِ شہریت میں یکسانیت و برابری ملک کے ہر باشندے کا بنیادی حق ہے۔

16۔ اپنی تہذیب، ثقافت اور زبان کو زندہ رکھنا ہر فرقے کا بنیادی حق ہے۔

17۔ بین الاقوامی تحفظات و حقوق کے حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ خود مختار علاقے بنائے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار ہوں گی۔ ہر ایک اکائی میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ اپنی جیسی دوسری اکائیوں کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک) میں منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہو۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ کوئی مخصوص مذہب یا تہذیب کسی اکائی پر لاد سکے، البتہ اس کا یہ فرض ضرور ہوگا کہ کسی قوم یا کائی یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم کے مذہب یا تہذیب پر حملہ کر سکے۔

18۔ مذہب کے امور و معاملات میں مندرجہ ذیل چار بنیادی باتوں کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے:۔

(الف) دین اور سچائی کی بنیاد ایک ہے۔ اس کے پیش کرنے والے تمام انبیائے کرام ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

(ب) دین اور سچائی کے داعی ہر ملک اور ہر قوم میں گزرے ہیں۔ ان سب کا احترام ضروری ہے۔

(ج) دین اور سچائی کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً یکساں اور تسلیم شدہ ہیں، مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں، البتہ عملی اظہار کی صورتوں میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔

(د) ساری مہذب دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشا و مقصد ایک ہے، مثلاً ہر مذہب اور ہر فرقے میں جنسی انارکی ونا پسند اور اخلاقی جرم قرار دیا جاتا ہے۔ جنسی تعلقات کے لیے مرد اور عورت میں ایک معاشرتی معاہدہ، ہر مذہب اور ہر فرقے میں ضروری ہے، البتہ معاہدے کی صورتیں مختلف ہیں۔ اسی طرح ہر مذہب اور ہر فرقے میں اپنے مردے کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے او جھل کیا جائے یا جلا کر۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی وسیع اور ہمہ گیر انقلابی اصلاحی و تجدیدی تحریک کے شعبۂ معاشیات میں ان اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے خدمت انجام دی۔ ان کی عظیم الشان تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا ایک ایک فرق

اور خصوصاً ''ارتفاقات'' سے متعلق ابواب کا ایک ایک صیغہ شاہ صاحب کے معاشی افکار و نظریات کی پوری تشریح کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ نے ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہ صرف نظریات وضع کیے، بلکہ عملی پروگرام بھی دنیا کے سامنے رکھا۔ رضا کاروں کی تربیت کے لیے، مراکز قائم کیے، مگر آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس خدمت کی تکمیل آپ کے فرزندوں، بالخصوص شاہ عبدالعزیز کے سپرد ہوئی۔

شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک

ڈاکٹر محمود حسین لکھتے ہیں ''ہندوستان کی اٹھارویں صدی، شاہ ولی اللہ کی صدی ہے''۔

شاہ ولی اللہ نہ تو صرف مصلح ومجدد تھے اور نہ صرف سیاسی مفکر و رہنما۔ دنیا میں مسلمانوں کے چند ہی مفکر ایسے ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنے عہد کے حالات و کوائف کے اسباب و علل کا پورا جائزہ لے کر اپنی فکر کی روشنی میں سیاست اور حکومت کے نظریات سے بحث کی ہے، اور نہ صرف بحث کی ہے بلکہ سیاست میں قائدانہ عملی کردار ادا کیا ہے۔ اسلامی افکار و نظریات کی تشکیل جدید کے جو سیاسی مفکرین پیدا ہوئے ہیں، ان میں ابن رشد، امام رازی، ابن تیمیہ اور امام غزالی کا نام سرفہرست ہے اور بقول مولانا شبلی نعمانی ''شاہ ولی اللہ کا اسم گرامی بھی اس فہرست میں نمایاں مقام پر شامل ہے''۔

شاہ صاحب کو ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے سنبھل جانے کی کوئی امید نہ تھی، البتہ وہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کو اس وقت تک کے لیے روک دینا چاہتے تھے، جب تک اندرونی عمرانی حالات کے تحت کوئی متبادل انتظام نہ ہو جائے۔ ان کے نزدیک سیاسی تحریک کی کامیابی کے لیے یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے گردوپیش کے حالات درست ہو جائیں۔ اس وقت مغل بادشاہ سازشوں میں جکڑا ہوا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنے سیاسی تدبر سے بادشاہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔ پھر انہوں نے امراء کو مخاطب کر کے توجہ دلائی، مگر کسی سنجیدہ مشورے کو سننے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔

پہلی امید: نظام الملک آصف جاہ

اس کے بعد وہ مایوس ہو کر نظام الملک آصف جاہ کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ اعلیٰ مغل حکام میں وہی ایک ایسا شخص تھا جو بلند اصولوں کا دلدادہ تھا اور جس میں کردار کی اتنی قوت بھی تھی کہ وہ چاروں طرف کے انحطاط اور کوتاہ اندیشی سے بالاتر ہو کر کچھ سوچتا، مگر یہ کار آزمودہ منتظم دارالحکومت دہلی سے کوچ کر کے دکن چلا گیا۔ اس پر شاہ ولی اللہ کی پُر درد استدعا کا کوئی اثر نہ ہوا، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ ایک تجربہ کار مدبر اور منتظم ہونے کی حیثیت سے عالم و فاضل فلسفی کے مقابلے میں اس امر کو بہ طریق احسن جانتا تھا کہ دہلی کا دربار اب اصلاح کے مرحلے سے گزر چکا ہے اور اسے کم سے کم دکن ہی کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نظام الملک کو دہلی کے حالات سے اس قدر نفرت ہوئی کہ وہ بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، مگر شاہ ولی اللہ نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔

دوسری امید۔ نجیب الدولہ روہیلہ

ہندوستان کی سیاست میں واحد عنصر (یعنی خود مسلم انڈیا کے اندر) جس سے کچھ امید ہو سکتی تھی، روہیلوں کا تھا، جنہیں نادر شاہ افشار نے اُن کے کوہستانی وطن سے نکال دیا تھا اور وہ ایک تازہ دم فوج کی طرح برعظیم میں داخل ہوئے تھے۔ لفظ روہیلہ ''روہ'' سے بنا ہے جو اس کوہستانی علاقے کا نام تھا جو پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع ہے۔ یہ بہادر کوہستانی باشندے صدیوں سے برعظیم کے فرماں رواؤں کی ملازمت کرتے چلے آئے تھے اور انہوں نے ترکوں سے اقتدار چھین کر خود اپنی سلطنت (روہیل کھنڈ) بھی قائم کر لی تھی۔ ان کی خوبیاں یہ تھیں کہ وہ بہادر جنگجو تھے اور اپنی قوت اور سادہ عادات کو انہوں نے ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک دہلی کی بدعنوانیوں اور بداخلاقیوں سے داغ دار نہیں ہوئے تھے۔ وہ پکے باکردار مسلمان تھے اور طبقاتی امتیازات نے ان کی معاشرت کی جڑوں کو کھوکھلا نہیں کیا تھا۔ وہ مغلوں کی طرح زوال پذیر، درماندہ او راز کار رفتہ نہیں تھے۔ ان کی یہ خوبیاں انہیں مسلمانوں کی آئندہ قیادت کے لیے دوسروں سے ممتاز بناتی تھیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے دہلی میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو بحال کرنے کے لیے روہیلوں کو استعمال کرنے کا خیال کیا۔

مگر شاہ ولی اللہ روہیلوں کی شدید کوتاہیوں اور کمزوریوں سے بے خبر نہ تھے۔ ان کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ وہ اتنے زبردست کام کو سرانجام نہیں دے سکتے تھے اور ان کے وسائل بھی ناکافی تھے۔ وہ اتنے زیادہ آزاد، خود رائے اور ضد کے پکے تھے کہ بعض اوقات متحدہ عمل ان کے لیے ممکن نہ رہتا تھا۔ راسخ الاعتقادی کا جو عقیدہ ان کے ذہن میں رچ گیا تھا، اس سے معمولی انحراف بھی ان کے نزدیک بدعت تھا۔ اپنے خیالات، عقائد میں اس درجہ پختگی ہی کی وجہ سے شیعوں کی نئی ریاست ''اودھ'' کے ساتھ ان کی مخاصمت پیدا ہوگئی، جس کا آخری انجام یہ ہوا کہ روہیلوں کی اپنی سیاست اور قوت تباہ و برباد ہوگئی۔ (یہ الگ بات ہے کہ انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے روہیل کھنڈ کی فتح کے لیے اودھ کو برطانوی فوجیں مدد کے لیے دیں اور اس طرح دو مسلم قوتوں کی روایتی دشمنی کا فیصلہ اودھ کے حق میں کرا دیا)۔

شاہ ولی اللہ روہیلوں کی ان کوتاہیوں سے بے خبر نہیں تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کے لیے روہیلوں کی طرف امید بھری نگاہ کرنے کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ حالات کے مطابق روہیلے ہی واحد وسیلہ تھا۔ شاہ صاحب کے اعلیٰ سیاسی تدبر کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے روہیلوں کی طاقت کو مسلم انڈیا کے لیے مفید طلب بنانے کے لیے ایک اور ترکیب سوچی۔ کیوں نہ روہیلہ طاقت کو بیرونی افغان طاقت کے ساتھ مشترک و متحد کر کے، ایک نیا عسکری اتحاد قائم کیا جائے؟ اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ سلطنت مغلیہ کو تقویت پہنچانے کے لیے بیرونی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ غیر مسلموں سے امداد طلب کرنے کے نتائج شاہ صاحب دیکھ چکے تھے۔ واحد مسلم طاقت جو کچھ مدد دے سکتی تھی وہ افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی قائم کردہ نئی ریاست تھی۔

ہندوستان کے تاریخ دان جناب خلیق نظامی نے ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' جمع و مرتب کر کے شائع کئے ہیں۔ ان ''مکتوبات'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب ایک طرف تو روہیلوں کے سردار نجیب الدولہ سے خط و کتابت کررہے تھے اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کو اپنے خطوط سے نجیب الدولہ کی طرف مائل کرنے کی

کوشش کر رہے تھے۔ نجیب معمولی سپاہی کی حیثیت سے آغاز کر کے بڑھتے بڑھتے اقتدار تک پہنچے تھے۔ وہ 1743ء میں روہیل کھنڈ آیا اور ایک سردار کی ملازمت میں پیادہ سپاہی کی حیثیت سے داخل ہو گیا، مگر اپنی قابلیت اور کارکردگی کے باعث اس نے مسلسل ترقی کی یہاں تک کہ عمدہ جنگ کو دبانے کے لیے جب نجیب نے مغل بادشاہ احمد شاہ کا ساتھ دیا تو پنج ہزاری کا اعلیٰ منصب اور نجیب الدولہ کا خطاب پایا۔ اس کے بعد جب عالمگیر دوم بادشاہ ہوا تو اس کا انحصار مرہٹوں کی امداد پر تھا، اور یہ بات نجیب الدولہ کو بہت ناگوار گزری۔ نجیب پر شاہ ولی اللہ کے دینی خیالات کا اثر پڑ چکا تھا۔ وہ شاہ صاحب کا بہت احترام کرتا تھا۔ ان سے اس کی مخلصانہ خط و کتابت ہوتی تھی اور ان کے مشورے کو وہ ہمیشہ قبول کرتا تھا۔ شاہ ولی اللہ کی یہ توقع کہ نجیب ایک ایماندار مسلمان ثابت ہو گا اور مسلمانوں کو مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے جس ذلت و خواری میں مبتلا کر دیا تھا وہ انہیں نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا نیز وہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے گا حق بجانب ثابت ہوئی۔

آخری امید: احمد شاہ ابدالی

مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے:

''شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت کا اس امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے وقت کی دو عظیم شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا''۔

شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی سے بھی خط و کتابت کی جس میں مسلمانانِ ہند کے مصائب بیان کیے اور ان موذیوں کے پنجے سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو فرائض ابدالی پر ایک مسلمان فرماں روا کی حیثیت سے عائد ہوتے تھے، ان کی طرف توجہ دلائی۔ اس زمانے میں رانا جی سندھیا پنجاب پر قبضہ کر کے سابا جی سندھیا کو پنجاب کا گورنر مقرر کر چکا تھا اور اب رانا جی سندھیا خود روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ شاہ صاحب نے تمام حالات کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا: ''دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے آگرہ کے آخر تک اور میوات کی حدود سے فیروز آباد و شکوہ آباد تک سورج مل قابض ہو گیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان اور نماز جاری کر سکے۔۔۔۔ بادشاہ کے نوکر جو ایک لاکھ سے زائد تھے، ان میں پیادہ اور سوار بھی تھے، اہل منصب اور جاگیردار بھی۔ بادشاہوں کی غفلت سے نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ جاگیردار اپنی جاگیروں پر عمل دخل نہیں پاتے۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کا باعث بے عملی ہے۔ جب شاہی خزانہ نہیں رہا، نقدی بھی موقوف ہو گئی تو آخر وہ سب ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسہ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت میں بجز نام کے کچھ باقی نہ رہا۔ جب ملازمین شاہ کا یہ برا حال ہے تو دیگر اشخاص کے حال کو جو وظیفہ خوار یا سوداگر یا اہل صنعت ہیں، قیاس کر لینا چاہیے کہ کس حد تک خراب ہو گیا ہو گا۔ طرح طرح کے مظالم اور بے روزگاری میں یہ لوگ گرفتار ہیں۔ اس وقت جو عمل دخل دربار بادشاہی میں باقی ہے وہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے، کوئی متصدی و کارکن سوائے ان کے اور کوئی نہیں۔ ہر قسم کی دولت و ثروت ان کے گھروں میں جمع ہے۔ افلاس کی مصیبت مسلمانوں پر چھا رہی ہے۔ بات طویل ہو گئی اور اختصار کی حد سے باہر نکل گئی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبے کی نوعیت یہی ہے جو معروض بیان میں آئی

اور مسلمانوں کا ضعف اس حد تک پہنچ گیا ہے جو لکھا گیا۔۔۔۔''اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو۔ مخالفین کے لشکر کو شکست دیتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے آنجناب کے اور کوئی نہیں۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرض ہے۔ ہندوستان کا قصد، مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعیف مسلمانوں کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرانا۔''

اسی مکتوب میں آگے چل کر شاہ صاحب نے اس امر کا بھی اشارہ کر دیا ہے کہ نادر شاہ آیا اور دہلی لوٹ کر چلتا بنا۔ ایسا بھی نہیں چاہئے، بلکہ فرض عین سمجھ کر ظلم سے رہائی دلانے آنا چاہیے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو کہ وہ مسلمانوں کو زیروزبر کر گیا، اور مرہٹہ اور جاٹ کو سالم و غانم چھوڑ کر چلتا بنا۔ نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔ سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی۔''

سرجادو ناتھ سرکار نے لکھا: ''نادر شاہ کے حملے نے سلطنت دہلی کا مرکز تباہ کر دیا۔ ہندوستان میں بعض نئی طاقتوں کا عروج بھی اسی وجہ سے ہوا۔ دہلی کی سلطنت اتنی کمزور ہوگئی کہ نئی طاقتوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔'' پروفیسر ہری رام گپتا لکھتے ہیں کہ ''دراصل سکھوں نے نادر شاہ کے حملے ہی سے فائدہ اٹھایا اور پنجاب میں دہشت گردی اور لوٹ مار شروع کر دی۔''

1757ء میں جنگ پلاسی ہوئی۔ نواب سراج الدولہ کو اپنوں ہی کی غداری سے شکست ہوئی اور بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ دو سال بعد 1759ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا اور وہاں اقتدار قائم کرنے کے بعد تھانیسر کے مقام پر رانا جی سندھیا نے شکست کھائی اور میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ پیشوا نے سداشیو اراؤ بھاؤ کو جس نے نظام دکن کو حال ہی میں شکست دی تھی، ابدالی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ بھاؤ نے 3 اگست 1760ء کو صبح کے وقت دہلی پر قبضہ کر لیا اور 29 اکتوبر کو ایک بڑا لشکر لے کر پانی پت کے میدان میں پہنچ گیا۔

یکم نومبر 1760ء کو احمد شاہ ابدالی پانی پت پہنچا۔ یہاں ڈھائی مہینے تک افغانوں اور مرہٹوں کی جنگ جاری رہی۔ مرہٹوں نے اپنی تمام فوجی طاقت اس محاذ پر لگا دی۔ آخر 14 جنوری 1761ء کو مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ لیکن سلطنت مغلیہ تو خود بے جان تھی۔ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھانے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ وہ ایک بے روح جسم کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ جنگ پلاسی کے فاتحین (انگریزوں) نے اٹھایا۔

نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کی قابلیت اور عظمت سے انکار ممکن نہیں، لیکن مسلمانانِ ہند کو مغربی استعمار کی غلامی سے بچانا ان دونوں کی قسمت میں نہیں تھا۔ شاہ ولی اللہ کا عقیدہ بھی دوسرے مسلم مفکروں اور مصلحین کی طرح اسلام کی ہمہ گیر نوعیت پر تھا۔ وہ ایک طرف عمرانیات، سیاسیات اور معاشیات کے اصولوں، اور دوسری طرف اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے درمیان حد فاصل نہیں کھینچتے تھے۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ اسلام کے اخلاقی پس منظر کے بغیر عمرانیات، معاشیات اور سیاسیات کے ذریعے انسانی زندگی کا بلند ترین نصب العین حاصل کرنا ممکن ہے۔ ان کی نظر میں ایک اچھے اور مفید معاشرے کا حصول اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں پر زور دیئے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی شاہ ولی اللہ کی تحریک اور ان کے افکار کے بارے میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں ''وہ اس کی

امید ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی زندگی میں مسلم قوم کی صحت بحال ہو جائے گی۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا بندوبست کرنا ضروری ہے کہ ان کی وفات کے بعد برعظیم کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا لائحہ عمل جاری رہ سکے۔ یہ کام اتنا وسیع تھا کہ وہ تنہا اس کو سرانجام نہیں دے سکتے تھے، اس لیے انہوں نے ایسے علماء کی ایک جماعت کو تربیت دی جو ان کے نظریات سے بخوبی واقف تھے اور ان ہی کے بلند اصولوں سے متاثر و فیض یاب تھے۔ پانی پت میں مسلمانوں کو جو شاندار فتح حاصل ہوئی، وہ بھی مغلوں کے ڈگمگاتے ہوئے تخت کو سہارا دے کر قائم نہ رہ سکی۔ ایسی کمزور بنیادوں پر امیدوں کی عمارت تعمیر کرنا سراسر حماقت ہوئی۔ اس کے علاوہ برعظیم میں سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے برطانیہ کے ظہور نے سیاست کا نقشہ بدل دیا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے چار سال بعد برطانیہ نے مغل سلطنت سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کو زبردستی چھین لیا۔ اس ''عطیہ شاہی'' کے 38 سال بعد 1803 میں مغل بادشاہ خوشی خوشی برطانیہ کا وظیفہ خوار ہو گیا۔ کوئی قانونی حیلہ طرازی اس حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کر سکتی تھی کہ برعظیم میں برطانیہ ایک بالا دست قوت بن چکا ہے اور کوئی ایسی ریاست یا فرماں روا باقی نہیں رہا تھا جو اس کی بالادستی کو دعوتِ مقابلہ دے سکے۔ مسلم سلطنت و طاقت اس طرح ساقط و جامد ہوئی تھی کہ اس کے احیاء و تجدید کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نئی مغربی استعماری طاقت نے سلطنت مغلیہ کی جگہ لے لی تھی اور کوئی مسلم ریاست دنیا میں ایک باج گزار سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اب بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو افغان بادشاہت کی حقیقی حالت کو پوری طرح سمجھے بغیر، یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔ شاہ ولی اللہ کے تربیت یافتہ فرزند، علماء اور کارکن اس قسم کی امیدوں سے دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ انہیں یقین کامل تھا کہ صرف مسلم قوم انحطاط پذیر، پست ہمت، حیران و پریشان اور غیر منظم تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس کے مذہب (اسلام) کے ذریعے، جسے وہ پوری طرح سمجھتی تھی، اور معاشرتی سالمیت و وحدت کے فلسفے کی مدد سے، جو مذہب اسلام پر مبنی تھا، اس میں ایک نئی روح نشاۃ ثانیہ کا ایک نیا جذبہ پیدا کیا جا سکتا تھا؟''

شاہ ولی اللہؒ کی جماعت

شاہ ولی اللہ کی خدمات کا باب ختم کرتے وقت ہم ہی نہیں، ہمارے بزرگ بھی ان کا موازنہ مجدد الف ثانی کی خدمات سے کرتے آئے ہیں۔ بعض نے لکھا کہ شیخ احمد مجدد تھے اور شاہ ولی اللہ مصلح۔ صاحب ''رودِ کوثر'' شیخ محمد اکرم کا موقف یہی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان کے ہم خیال مصنفین کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہ بھی مجدد تھے۔ لکھتے ہیں: ''گیارہویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ احمد سرہندی، بارہویں صدی کے شاہ ولی اللہ، تیرہویں صدی کے سیّد احمد شہید اور چودہویں صدی کے حضرت شیخ الہند'' ہمارے نزدیک مجدد اور مصلح کی بحث فنی اور استدلالی نوعیت کی ہے، ورنہ مجدد اور مصلح ایک ہی رتبے کے لوگ ہیں، اور تجدید کے ساتھ لفظ اصلاح مرکب ہو کر ایک ترکیب وضع ہو گئی ہے: ''تجدد و اصلاح دین''

جماعتوں کا موازنہ

البتہ مجددا ور مصلحین کا موازنہ اس نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنے نصب العین کو اپنے بعد کے زمانے تک پھیلانے کے لیے انہوں نے اپنے پیروکاروں کی کیسی جماعت تیار کی، اور ان کی تربیت کا کیا اہتمام کیا، اور کیا ان کی جماعت ان کی تجدیدی و اصلاحی کاموں کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو سکی۔ حضرت مجدد کی جماعت کے بارے میں شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں: ''سرہند سے بے شک، ایک تحریک اٹھی تھی، جس نے کئی مخلص اور سمجھدار ہستیوں کو متاثر کیا، لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی، اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور عداوت پر تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا، اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی، اس کا راستہ واقعات نے بند کر دیا۔ مشائخیت روحانیت پر غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قیومیت کے سراب میں گم ہو گئی۔ جب حضرت مجدد کے فرزند خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو ان کے وارثوں میں سے ایک نام نہاد قیومیت کا دعوے دار تھا۔ سبھی آپس میں لڑ رہے ہیں کہ قیوم میں ہوں اور دنیا میرے سر پر قائم ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب عالمگیر کے پاس ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کے لیے بھیجا تھا، لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے، اس کا بیان ایک معتقد کی زبان سے سنئے۔ ''روضۃ القیومیہ، رکن دوم'' میں یوں لکھا ہے:

''حضرت شیخ صاحب کے لیے سرہند میں دیبا کا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید سے ٹکا ہوا نصب ہوتا، جس کی چوبوں پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ اس خیمے کے اندر ایک جڑاؤ کرسی رکھی جاتی، جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرداگرد نقیب اور چوب دار ہاتھوں میں سنہری اور روپہلی عصا لیے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ شہزادے اور امراء حاضر خدمت ہو کر کھڑے رہتے۔ جب تک حکم نہ ہوتا، نہ بیٹھتے۔''

اس کے برعکس شاہ ولی اللہ جماعت کے بارے میں ''رود کوثر'' میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے، جس سے انکار کی مجال نہیں کہ ''شاہ ولی اللہ کی اولاد نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا جو انیسویں صدی کی مذہبی کشمکش میں ہمارا سب سے بڑا ڈھال رہا ہے۔ یہ اس خاندان ہی کا فیض تھا کہ جب ہندوستان میں اسلام پر عیسائی مشنریوں اور مادہ پرستوں کے حملے ہوئے تو لوگ مذہب اسلام سے واقف تھے۔ اس میں دلچسپی لیتے تھے اور مخالفوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فرنگی محل اور اضلاع پورب کی دوسری درسگاہوں سے فقہ اور منطق کا جو سیلاب آ رہا تھا، وہ اس مذہبی کشمکش میں مفید نہ تھا، اس کے لیے روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت تھی، جو فقہ اور منطق سے نہیں، بلکہ قرآن اور حدیث سے حاصل ہوتی تھی، اور انہیں اس خاندان نے جس طرح عام کیا، اس پر تاریخ گواہ ہے۔ اس خاندان نے جس طرح قوم میں نئی روح پھونک دی تھی اس کا اندازہ سیّد احمد شہید رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے ہوتا ہے۔ مغلوں کی وسیع سلطنت جاتی رہی، لیکن ان راحت طلبوں نے کروٹ نہ لی۔ مرہٹے، روہیلے، انگریز جو کوئی بھی آیا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن ولی اللہ تحریک کا اثر تھا کہ لوگ اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور، بالا کوٹ کی پہاڑیوں میں پروانہ وار اپنی جان پر کھیلتے تھے۔ یہ کوشش ناکام رہی، لیکن کیا ان لوگوں کے ایثار، مذہبی غیرت اور اخلاقی جرأت میں کوئی شک ہے۔

سواد قمار عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا

جماعت کے زعماء

تاریخ کی بہت بڑی کوتاہی ہے کہ اس جماعت کے تمام ارکان کی فہرست محفوظ نہیں رہ سکی۔ البتہ آپ کی تصانیف میں چند ایسے رفقاء کے نام ملتے ہیں، جن کی تحریک وتائید اور جن کے مشورے پر یہ کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ان کا مختصر تعارف یہ ہے:۔

مولانا محمد عاشق:

یہ قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر کے رہنے والے، شاہ صاحب کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ابتداء سے شاہ صاحب کے شریک اور ساتھی رہے۔ سفرِ حجاز میں بھی آپ کے ساتھ تھے۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزند اور جانشین (شاہ عبدالعزیز) کی تربیت آپ ہی نے کی۔

مولانا نور اللہ:

ساکن بڈھانہ (ضلع میرٹھ) شاہ صاحب کے شاگرد، آپ ہی کی فرمائش پر شاہ صاحب کی مشہور تصنیف ''تفہیمات الٰہیہ'' مرتب ہوئی۔ آپ شاہ عبدالعزیز کے استاد بھی ہیں اور خسر بھی۔ آپ کے صاحبزادے مولانا ہبۃ اللہ اور پوتے مولانا عبدالحیی ہیں۔ مولانا عبدالحیی سیّد احمد شہید کے ساتھ میدانِ جہاد میں تھے۔ صوبہ سرحد میں شہادت پائی۔

مولانا محمد امین کشمیری:

شاہ صاحب کے مخلص رفیق، شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کی جماعت کی تربیت میں مشغول رہے۔

شاہ ابو سعید:

ساکن رائے بریلی، آپ رائے بریلی کے مشہور بزرگ شاہ علم اللہ کے پوتے تھے۔ آپ ہی کے نواسے سیّد احمد شہید تھے، جنہوں نے انگریزی استعمار کے خلاف رائے عامہ کی تنظیم کی۔ سلطان ٹیپو شہید کا خاندان آپ سے اور آپ کے صاحبزادے شاہ ابو اللیث سے بیعت تھا۔

شاہ عبدالعزیز:

شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے۔ 1746ء میں پیدا ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ نے ساٹھ سال تک درس دیا اور علم حدیث کا فیض ملک میں عام کیا۔ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلۂ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ آپ درس وتدریس اور رشد وہدایت میں اس قدر مشغول رہے کہ تصنیف وتالیف کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں اور اسلامی علوم تک محدود نہ تھیں۔ آپ خود فرماتے تھے کہ جو علوم میں نے مطالعہ کئے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی

ہیں، ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ آپ کی سب سے اہم کتاب ''تحفہ اثنا عشریہ'' ہے۔ شاہ عبدالعزیز کی اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ فقط تین بیٹیاں تھیں۔ ان کی وفات 79 سال کی عمر میں 17 جولائی 1823ء کو ہوئی۔

شاہ رفیع الدینؒ:

شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند 1749ء میں پیدا ہوئے۔ جب آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز ضعیف الامری، کثرتِ امراض اور ضعف کی وجہ سے دماغی محنت اور تعلیم وتدریس کے متحمل نہ ہو سکے تو زیادہ تر یہ کام شاہ رفیع الدین ہی نے انجام دیئے۔ آپ کا سب سے اہم کام قرآن مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبول ہے۔ آخر عمر تک آپ خدمت دین میں منہمک رہے۔ ستر برس کی عمر میں 1817ء میں انتقال کیا۔

شاہ عبدالقادر:

شاہ ولی اللہ کے تیسرے فرزند 1753ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں پائی اور فقہ وحدیث وتفسیر میں نام پیدا کیا۔ تحصیل علم سے فراغت پاکر اکبرآبادی مسجد کے حجرے میں تمام عمر بسر کردی۔ گوشہ نشینی پسند خاطر تھی۔ قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ یا ''موضح القرآن'' آپ سے یادگار ہے۔ آپ نے 1815ء میں 63 سال کی عمر میں وفات پائی۔

شاہ عبدالغنی:

شاہ ولی اللہ کے چوتھے فرزند، ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن اگر وہ باقی بھائیوں کی طرح مشہور نہیں ہوئے تو ان کی کمی ان کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہید نے پوری کردی، جنہوں نے شاہ عبدالعزیز سے شاہ ولی اللہ کا علم وفضل سیکھ کر جمہور میں عام کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

تربیت یافتہ علماء

شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز کی تربیت گاہ سے تربیت پاکر ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب بنے، ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند قابلِ ذکر نام یہ ہیں:

تینوں بھائی، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی، مولانا شاہ محمد اسحاق (شاہ عبدالعزیز کے نواسے) مولانا شاہ محمد یعقوب (شاہ عبدالعزیز کے نواسے) مولانا عبدالحیی (شاہ عبدالعزیز کے داماد)۔ شاہ محمد اسماعیل (شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے) سیّد احمد شہید (جن کا ذکر آگے آئے گا) مولانا رشید الدین دہلوی، مفتی صدر الدین دہلوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، شاہ غلام علی دہلوی، مولانا مخصوص اللہ (شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے) مولانا کریم اللہ دہلوی، مولانا محبوب علی دہلوی، مولانا عبدالخالق دہلوی، مولانا حسن علی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی، وغیرہ۔

تربیت کے طریقے

تربیت کے تین طریقے تھے۔

1۔درس وتدریس:

جس کا حلقہ اتنا وسیع ہوا کہ پورے ہندوستان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں رہا، جس کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ شاہ عبدالعزیز سے نہ ہو۔ان کے والد محترم شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں، جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم ڈال گئے تھے، طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔مدرسہ اسی مقام پر تھا جہاں اب شاہ ولی اللہ اور ان کی اولاد کی قبریں ہیں جو مہندیوں کے نام سے مشہور ہے۔جب شاہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ پورے ہندوستان سے آنے لگے اور مدرسہ رحیمیہ ان کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگا تو محمد شاہ بادشاہ نے ایک عالیشان مکان مدرسے کو دیا۔تب پرانا مدرسہ غیر آباد ہو گیا اور نئے مدرسے نے یونیورسٹی کی حیثیت حاصل کر لی۔ 1857ء تک یہ اپنی حالت پر قائم رہا، مگر اس ہنگامے میں یہ شاندار مدرسہ لٹ گیا۔اس کے کڑی تختے تک اتار لیے گئے اور زمین ضبط ہو گئی۔اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب یہاں پورا محلہ آباد ہے، جو اب تک مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے۔

2۔روحانی تربیت:

جس کے لیے صوفیا کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے، اور اس کا سب سے زیادہ ضروری اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ جو کچھ بتایا جاتا ہے، عملی طور پر اس کا عادی بنایا جائے۔خود غرضی، نفس پرستی، اقتدار پسندی جیسی صفات سے دل پاک کیا جائے۔صبر وضبط، جفاکشی، محبت وشفقت اور ہر ایک مادی غرض سے بالا ہو کر مخلوقِ خدا کی خدمت اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

3۔عام اجتماعات:

پبلک جلسوں اور عام اجتماعات میں تقریریں، شاہ عبدالعزیز کا مقررہ پروگرام تھا کہ ہفتے میں دو مرتبہ عام اجتماع میں تقریر ضرور کیا کرتے تھے۔دہلی اور بیرون دہلی کے لوگ ان اجتماعات میں شریک ہوتے۔پروگرام کی پابندی یہاں تک تھی کہ مرض الموت میں بھی، جب تک بولنے کی طاقت رہی، اس تقریر کے پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔

جماعت کے تربیتی مراکز

علمی اور عملی تربیت کا سب سے بڑا مرکز دہلی تھا جس کو شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے زندہ رکھا۔دوسرا مرکز رائے بریلی کا وہ مشہور دائرہ تھا جو "تکیہ شاہ علم اللہ" کے نام سے مشہور تھا۔یہی مرکز ہے جس سے سلطان ٹیپو شہید کا روحانی تعلق تھا۔انگریزی اقتدار واستعمار کے خلاف جب دہلی کے مرکز سے جہادِ حریت کا فتویٰ صادر ہوا تو رائے بریلی کے اسی مرکز سے انقلاب کی وہ مشہور تحریک (رشید احمد شہید) اٹھی جس کو "وہابی تحریک" کے نام سے بدنام کیا گیا۔اس مرکز میں کام کرنے والے نسبی لحاظ سے شاہ علم اللہ سے وابستہ تھے، لیکن علمی اور عملی لحاظ سے شاہ ولی اللہ کی تربیت گاہ سے فیض یافتہ تھے۔علاوہ ازیں مولانا عبیداللہ سندھی نے دو مراکز کا اور پتا دیا ہے۔مدرسہ نجیب آباد (جو نواب نجیب اللہ نے قائم کیا تھا) اور مدرسہ ملا محمد معین ٹھٹھہ سندھ۔ایک اور مرکز کی نشاندہی مولانا
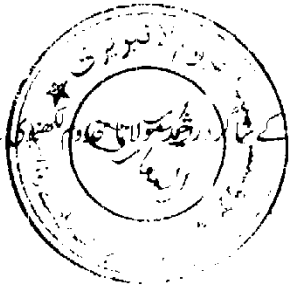
سید محمد میاں نے کی ہے۔ یہ اودھ کا دارالحکومت لکھنؤ تھا جہاں شاہ ولی اللہ کے شاگرد [illegible] لکھنؤ نے تقریباً نصف صدی تک چشمہ فیض جاری رکھا۔

سیاسی تحریک کی قیادت

شاہ ولی اللہ کے پیروکار اپنے استاد کی طرح یہ یقین رکھتے تھے کہ احیاء وتجدید اصلاح کے لیے صرف درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور دینی کاموں پر توجہ مرکوز رکھنا ہی کافی نہیں، سیاسی معاملات بھی ایسی نہج پر آ گئے تھے جو عامۃ المسلمین کے لیے تشویش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورت حال میں وہ سیاست سے کیونکر بیگانہ رہ سکتے تھے۔ اس وقت مسلم حکومت ختم ہو چکی تھی، مگر مسلمانوں کے دماغ میں اب بھی الجھن موجود تھی، کیونکہ مغل بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کے قانونی ڈھکوسلے کو اب بھی برقرار رکھا گیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے غیر مبہم الفاظ میں یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ بادشاہ قطعاً مجبور ہے۔ حقیقی طاقت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، جنہوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر بعض علاقوں میں براہ راست اپنا نظم ونسق قائم کرنے سے احتراز کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی ذہنی الجھن کو دور کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ برِاعظم اب دارالسلام، یعنی وہ ملک جہاں اسلام کے برسر اقتدار یا کم سے کم آزاد سمجھا جا سکے نہیں رہا۔ اس واقعے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انگریزوں نے مخصوص اسلامی شعائر میں مداخلت نہیں کی ہے۔ مسلمان اب دار الحرب میں ہیں یعنی ایک ایسے علاقے میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جس پر اقتدار سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اس فتوے میں یہ بات مضمر تھی کہ اس قسم کے علاقوں کے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مسلم اقتدار کی بحالی کے لیے جدوجہد کریں۔ ایک اور فتوے میں شاہ عبدالعزیز نے انگریزی یا کسی اور زبان کو سیکھنا یا کسی شعبہ علم کو حاصل کرنا جائز قرار دیا، بشرطیکہ اس کا مفید اور جائز استعمال مقصود ہو۔ لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ اس علم کو انگریزوں کے دلوں میں جگہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے یا کسی ذلیل یا ناجائز قسم کی ملازمت تلاش کی جائے تو اس کا حصول جائز نہیں ہے۔ انگریزوں کی ملازمت صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ مفوضہ فرائض معاشرے کے لیے مفید ہوں، مثلاً چوروں اور ڈاکوؤں کا انسداد کرنا یا اسلامی شریعت کو بیان کرنا اور نافذ کرنا، لیکن اگر ملازمت کے بعد کوئی ذلت آمیز رویہ اختیار کرنا ضروری ہو، جس سے ایک مسلمان کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہو یا انگریزوں کے ساتھ ناجائز سرگرمیوں میں تعاون ضروری ہو تو ایسی ملازمت ممنوع ہے۔ مسلمانوں کو ہلاک کرنے یا مسلم اعمال کی نشرواشاعت کے لیے انگریزوں سے تعاون کرنا ایک ایسا گناہ کبیرہ ہے جو تقریباً ارتداد کے مترادف ہے۔

صرف فتوؤں ہی سے مقصد برآوری نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کسی اور عملی اقدام کی بھی ضرورت تھی۔ مگر اس قسم کی سیاسی سرگرمی صرف عوام کی حمایت ہی سے ممکن تھی۔ مسلم حکمران انگریزوں کے اس قدر مطیع تھے کہ ان سے فائدے کی امید رکھنا عبث تھا۔ اگر سیاسی انقلابی تحریک کو مقبول عام بننا تھا تو اس کی تنظیم اور منصوبہ بندی بڑی احتیاط کے ساتھ ہونی چاہیے اور اسے معتمد اور لائق رہنماؤں کی قیادت میں چلنا چاہیے تھا۔ بڑی توجہ کے ساتھ زمین ہموار کرنے، لوگوں کو حمایت کے لیے تیار کرنے، روپیہ اور رضاکاروں کی فراہمی کے لیے جگہ جگہ مرکز قائم کرنے اور ممکن الحصول مقاصد معین کرنے کی ضرورت تھی، اور اس کام کی تکمیل کے بعد تحریک کو علانیہ شروع کرنا تھا۔

اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع سست اور محدود تھے۔ فاصلے طویل تھے اور نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع انتہائی محدود تھے۔ تاہم شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کار نے آہستہ آہستہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ان مشکلات پر قابو پالیا۔ ان کی موقع شناسی اور ان کے طریقہ ہائے کار اپنی محتاط روش کے لیے قابل تعریف ہیں، کیونکہ انہوں نے مداخلت کا کوئی بہانہ انگریزوں کے ہاتھ نہیں آنے دیا۔ اگر تحریک کو آگے چل کر ایک مسلح بغاوت کی شکل اختیار کرنی تھی تو اس مقصد کے لیے ایک فوجی قائد کو تلاش کرنا یا تربیت دینا ضروری تھا۔ وہ ایک ایسا آدمی ہونا چاہیے جو روحانی اوصاف سے متصف ہو، ایماندار، مخلص اور بہادر ہو، اور اسلام اور اس تحریک کے اعلیٰ مقصد سے والہانہ شیفتگی رکھتا ہو۔ مسلم امراء کے زوال پذیر پسماندگان اس قسم کا قائد پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا ظہور کسی ایسے طبقے سے ہونا تھا جو ماحول کے عام سماجی امراض سے اب بھی مامون و محفوظ ہو۔

حسنی سیدوں کا ایک خاندان لکھنؤ سے 49 میل کے فاصلے پر رائے بریلی میں آباد تھا۔ شاہ ولی اللہ کے خاندان سے ان لوگوں کی رشتہ داری تھی۔ اس خاندان کے ایک فرزند سیّد احمد کے لیے ازل سے یہ سعادت مقدر تھی کہ وہ تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کرے۔ کیسا کردار؟ اس کی وضاحت کے لیے آئندہ سے ایک نیا باب کھلے گا۔

سیّد احمد شہید کے پہلے پچّیس سال

شاہ عبدالعزیز عصر کی نماز سے فارغ ہوکر، مسجد کے قریب ہی اپنے تکیے پر تشریف لائے تو ان کے خاص مقرب بھی ہمراہ ہو لیے۔ ایک صاحب نے کہا ''یہ لڑکا آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہے''۔ شاہ صاحب نے دیکھا، بیس اکیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ مسیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مونچھوں میں بجائے تبسم کے تکبر تھا۔ وہ نوجوان قریب آیا اور سادگی سے بولا ''السلام علیکم''۔

شاہ صاحب نے سلام کا یہ مسنون طریقہ پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا تھا۔ بہت خوش ہوئے۔ اس وقت پورے ہندوستان سے سلام مسنون کا رواج ختم ہو چکا تھا، حتیٰ کہ شاہ صاحب کے خاندان میں بھی اس کی رسم نہ تھی اور جب وہ سلام کرتے تھے تو کہتے تھے ''عبدالعزیز سلام عرض کرتا ہے''۔ ''عبدالقادر سلام عرض کرتا ہے'' ''رفیع الدین سلام عرض کرتا ہے''۔ عام لوگوں میں ''آداب عرض'' کہنے کا رواج پختہ ہو چکا تھا۔

شاہ صاحب نے مسرت آمیز قربت کے احساس سے نوجوان سے مصافحہ کیا اور اپنے پاس بٹھایا۔ دریافت کیا ''کہاں سے تشریف لائے؟''

نوجوان نے کہا ''رائے بریلی سے''۔

''کس خاندان سے ہیں''

''وہاں کے قطبی سادات میں شمار ہے''۔

فرمایا: ''سیّد ابوسعید صاحب، سیّد نعمان صاحب سے واقف ہیں؟''

نوجوان نے کہا ''جی ہاں، ابوسعید صاحب، میرے نانا اور نعمان صاحب میرے حقیقی چچا ہیں''۔

"تو گویا محمد عرفان کے فرزند ہو۔ اسم گرامی کیا ہے؟"

نوجوان نے کہا "احمد"۔

شاہ صاحب نے ٹکڑا لگایا "احمد علی؟"

"جی نہیں، احمد علی میرے بھانجے ہیں۔ میں صرف احمد ہوں"۔

شاہ صاحب نے چشم تصور سے پورے اہل خاندان کو چلتا پھرتا دیکھ لیا، شاہ ابوسعید ان کے والد شاہ ولی اللہ کے خلیفہ تھے۔ شاہ عبدالعزیز سے مکاتیب رہتی تھی۔ مولانا سیّد نعمان شاہ ولی اللہ سے بیعت تھے اور ان کی وفات تک حاضر باش رہ کر روزانہ ملاقات اور شاہ صاحب کی خصوصی توجہ و شفقت سے محظوظ ہوتے رہے۔ مولانا نعمان شاہ صاحب کے ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ پنج وقتہ نمازوں کے رفیق، ہمدم و ہم ساز۔ اس کے بھائی محمد عرفان جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کی پہلی شادی شاہ ابوسعید کے بھائی سیّد محمد معین کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ البتہ ایک بیٹی پیدا ہوئی جن کے بطن سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ سیّد محمد علی، احمد علی، سیّد حمید الدین، سیّد عبدالرحمٰن۔

شاہ عبدالعزیز یہاں تک تو اس خاندان کے ہر فرد سے واقف تھے، لیکن نئی نسل کے نوعمر بچوں نے اپنے اجداد کی میراث سے کہاں تک استفادہ کیا تھا، اس سے کما حقہ، واقف نہ تھے، اس لیے ان کا یہ پوچھنا بالکل برحق اور بروقت تھا "آپ کی تحصیلات کیا ہیں؟"

"احمد نے بے تکلفانہ جواب دیا "نماز کے لیے دو چار سورتیں رٹ لی ہیں، اور بس۔ اپنا تو سارا وقت کھیل کود میں گزرا"۔

یہ بات نوجوان نے غلط نہیں کہی تھی۔ جب اس کی عمر چار سال، چار ماہ، چار دن کی ہوئی تو شرفاء کے دستور کے مطابق مسجد میں ناظرہ کے لیے بٹھایا گیا۔ لیکن اس کی طبیعت خاندان کے دوسرے لڑکوں اور اپنے ہم عصروں کے برخلاف تعلیم کی طرف راغب نہیں تھی۔ پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ بالکل نہیں تھی۔ تین سال مکتب میں گزر گئے، لیکن اساتذہ کی توجہ و شفقت اور بزرگوں کی تاکید و فہمائش کے باوجود صرف دو چار سورتیں رٹ لی تھیں جو نماز ادا کرنے کے کام آ جاتی تھیں۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ابراہیم اور اسحاق اس کو سخت تاکید کرتے رہتے تھے کہ پڑھا کرو۔ چنانچہ کئی مرتبہ اس سلسلے میں بھائیوں کے درمیان چخ چخ بھی ہوئی۔ آخر اس کے والد سیّد محمد عرفان نے دونوں بیٹوں کو سمجھایا کہ اس کو خدا پر چھوڑ دو۔ خدا اس کے حق میں جو بہتر سمجھے گا، کرے گا۔ ہماری تاکید کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

احمد کو تعلیم، کتابوں اور پڑھنے پڑھانے سے دلچسپی کیوں نہیں تھی؟ اس لیے کہ وہ جسمانی کھیلوں کا بہت شوقین تھا۔ خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا شیدائی تھا۔ کبڈی بڑے شوق سے کھیلتا۔ لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعہ پر حملہ کرتا اور فتح کرتا یا شکست کھاتا۔ عادت یہ تھی کہ سورج نکلنے کے گھنٹوں بعد تک کسرت اور کشتی میں مشغول رہتا۔ اس کا چھوٹا بھانجا عبدالرحمٰن اس کے بدن پر مٹی ملتا، یہاں تک کہ خشک ہو کر جھڑ

جاتی۔ پیروں پر بھانجے کو کھڑا کر کے پانچ سو ڈنڑ لگاتا۔ پھر کچھ ٹھہر کر پانچ سو اور۔ بیس اور تیس سیر کے مدر ہلاتا تھا۔ ان میں تعداد کا خیال نہیں تھا، بلکہ وقت کا اندازہ تھا، مثلاً دو گھنٹے، تین گھنٹے، چار گھنٹے۔ ورزش گاہ میں پتھر کا ایک ستون تھا۔ چار ہاتھ لمبا اور بہت بھاری۔ نیچے سے موٹا، اوپر سے پتلا۔ ہر زور آور اسے اٹھانے کی مشق کرتا تھا۔ کوئی اسے زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیتا تھا۔ کوئی زانو تک، کوئی کمر تک لے آتا تھا۔ ایک روز چاندنی میں احمد دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہاں سے گزرا تو کہنے لگا، اسے اٹھانا چاہیے۔ یہ کہہ کر کرتہ اتارا، کندھے پر رکھا اور ستون کے قریب جھک کر اسے اپنے کندھے پر رکھ لیا اور پندرہ بیس قدم چل کر اس کو زمین پر اس زور سے پٹکا کہ ایک ہاتھ کے قریب زمین کھد گئی۔ دوسرے روز لوگ آئے اور اس کو اپنی جگہ سے اتنی دور گڑھے میں پڑا دیکھا تو کہنے لگے کہ کون دیو تھا جس نے اتنی دور لا کر ڈال دیا۔ احمد کو تیرنے اور پانی میں ٹھہرنے کی بڑی مشق تھی۔ سخت بہاؤ میں بہاؤ کے خلاف تیرتا تھا۔ بہاؤ کے موافق تیرنے کو اپنی توہین خیال کرتا تھا۔

خدمت خلق کا جذبہ

احمد گیارہ بارہ سال کی عمر کو پہنچا تو خدمت خلق کا ایسا جذبہ اور ذوق پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ اور خدا پرست انگشت بدنداں رہ گئے۔ ضعیفوں، اپاہجوں اور بیواؤں کے گھروں پر دونوں وقت جاتا ان کا حال پوچھتا اور کہتا ''اگر لکڑی، پانی، آگ وغیرہ کی ضرورت ہو تو لے آؤں؟'' سب اہل محلہ احمد ہی کے بزرگوں کے مرید اور خادم تھے، کہتے ''میاں کیوں گناہ گار کرتے ہو؟ ہم تو آپ کے اور آپ کے باپ دادا کے غلام ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ آپ سے کام لیں؟'' احمد ان کی خدمت گزاری کی فضیلت و اہمیت اپنے معصوم طفلانہ انداز میں اس طرح سناتا کہ وہ خاموش ہو کر رہ جاتے۔ غرضیکہ احمد اصرار کر کے ان کی ضرورتیں معلوم کر کے پوری کرتا، بازار سے ان کے لیے سودا لاتا، مٹی لاد کر اور پانی بھر کر لاتا اور اپنے بڑوں کی دعا میں لیتا، اور اس کام سے کبھی نہ تھکتا، بلکہ ہمیشہ تیار اور آمادہ رہتا۔ رشتہ داروں اور ہمسایوں کے گھروں میں جا کر دیکھتا کہ برتنوں میں پانی ہے یا نہیں۔ جلانے کے لیے لکڑی ہے یا نہیں۔ پانی نہ ہوتا تو بالٹیاں لا لا کر اپنے ہاتھ سے بھرتا۔ لکڑی نہ ہوتی تو جنگل جا کر خود کاٹتا۔ چادر میں لکڑیوں کا گٹھ باندھ کر سر پر رکھتا اور گھروں میں پہنچا دیتا۔ اس کے بعض بڑے بھائی بند اور رشتہ دار اس بات پر چیں بجبیں ہوتے، اسے سخت سست بھی کہتے، مگر احمد اس کی پروا نہ کرتا اور لوگوں کی خدمت کیے جاتا۔

جہاد کا جذبہ اور شوق

اللہ نے احمد کو والدہ بھی ایسی دی تھیں، جنہوں نے اپنے بچے کے دل میں خدمت، ایثار اور جہاد کا جذبہ بچپن ہی میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ایک مرتبہ رائے بریلی میں ہندو مسلم فسادات بھڑک اٹھے۔ احمد نے گھر سے نکل کر مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہا، لیکن دایہ نے کسی طرح جانے نہ دیا۔ والدہ محترمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ احمد بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ ماں سلام پھیریں تو جانے کی اجازت طلب کریں۔ والدہ نے جب سلام پھیرا تو دایہ نے کہا ''بی بی! تمہیں احمد سے محبت ضرور ہے، مگر میری طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ دین کی حفاظت کا مسئلہ تھا۔ یہ روکنے کا موقع نہ تھا۔ جاؤ بھیا، اللہ کے نام لے کر جاؤ، مگر خبردار پیٹھ نہ پھیرنا، ورنہ تمہاری صورت نہ دیکھوں گی، اور اگر ہندو تنہا جانے

کے لیے راستہ مانگیں اور کہیں کہ ہم کو جانے دیجیے تو راستہ دے دینا''۔ جب احمد ان گلیوں میں پہنچا جہاں فسادات کا ہنگامہ تھا اور ہندوؤں نے کہنا شروع کیا ''ہم کو راستہ دو، ہم چلے جائیں۔ ہمیں آپ سے کچھ مطلب نہیں۔ آپ کا بھی ہم سے کچھ جھگڑا نہیں''۔ جیسے ہی احمد نے یہ سنا، آگے بڑھ کر مسلمان بھائیوں سے کہا ''ان کو جانے دو اور کچھ روک ٹوک نہ کرو، اسی میں خیر ہے''۔

نوکری کی تلاش میں

ماں بیوہ تھیں۔ والد کو فوت ہوئے سات آٹھ برس ہو گئے تھے۔ احمد خود بھی اب گھبرو جوان ہو گیا تھا۔ اب گھریلو حالات اور عمر کا تقاضا تھا کہ احمد اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کرے۔ اور عملی زندگی میں قدم رکھے اور روزگار اور معاش کی فکر کرے۔ چنانچہ 1803ء میں اپنے سات عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوا۔ بڑا بھانجا محمد علی بھی ہمراہ تھا (جس نے بعد میں ''مخزن احمدی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس سفر کا احوال بھی لکھا تھا) لکھنؤ رائے بریلی سے 49 میل کے فاصلے پر ہے۔ سواری کے لیے ساتوں کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، لیکن جب احمد کی باری آتی تو وہ سوار نہ ہوتا، بلکہ حیلے بہانے یا منت سماجت کر کے دوسروں کو اپنی باری دے دیتا۔ ہر ایک کے سر پر اس کا اپنا سامان بھی تھا۔ جب آدھی منزل طے ہو گئی تو سب ہمراہی تھک گئے اور کسی مزدور کی جستجو ہوئی۔ لیکن مزدور نہ مل سکا۔ احمد نے اپنے ساتھیوں سے بڑی عاجزی سے کہا ''اس خاکسار کی ایک عرض ہے''۔ احباب نے پوچھا کیا؟ ''اگر آپ سب اسے قبول کرنے کا وعدہ فرمائیں تو عرض کروں گا''۔ دوست مطلب نہیں سمجھے اور کہا ''بڑی خوشی سے''۔ احمد نے کہا ''نہیں، پختہ وعدہ کیجیے''۔ جب سب نے پختہ وعدہ کر لیا تو کہا ''سارا سامان ایک کمبل میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دیجیے۔ میں ان شاء اللہ لکھنؤ تک پہنچا دوں گا۔ دوست چونکہ زبان دے چکے تھے، مجبور ہو کر انہوں نے ایسا ہی کیا اور احمد ایسا خوش ہوا جیسے کوئی بڑی دولت مل گئی ہو۔ یوں دونوں ماموں بھانجے اور باقی پانچ عزیز ہنستے بولتے لکھنؤ پہنچ گئے۔

لکھنؤ اس زمانے میں سخت اقتصادی پریشانی کے عالم میں تھا۔ انگریزوں نے نواب شجاع الدولہ سے اودھ کی سلطنت کا ایک نہایت شاداب اور زرخیز علاقہ قبضہ میں لیا تھا، جس کی وجہ سے نواب کی سالانہ آمدنی نصف رہ گئی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر ساتوں دوست روزگار کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگے، مگر روزگار عنقا تھا۔ دن بھر دوڑ دھوپ کرتے، مگر بے کار۔ خرچ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ رہے تھے۔ کوئی جو کاتب تھے، وہ ایک جزو کسی کتاب ''کریما'' یا ''مقیماں'' وغیرہ کی کتابت کر کے شام کو فروخت کرتا۔ کوئی بازار سے تھوڑا سا کپڑا خرید کر اس کی ٹوپیاں سی کر بیچتا اور کھانے کا انتظام کرتا۔ خود احمد ایک امیر کے ہاں کہ خود اس امیر کی حالت اچھی نہ تھی، لیکن سادات سے نہایت عقیدت رکھتا تھا، مہمان تھا۔ امیر کے ہاں سے دو وقتہ اچھا کھانا آتا۔ احمد یہ کھانا اپنے عزیزوں کے سامنے رکھ دیتا اور خود ان کی دال روٹی پر گزر کرتا۔

ایسی حالت میں پانچ چھ ماہ گزر گئے۔ ایک روز والی لکھنؤ شکار کی غرض سے پہاڑوں کی طرف روانہ ہوا، اور وہ امیر بھی جن کے ہاں احمد مہمان تھا، ہم رکاب ہوئے۔ احمد بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ ہو گیا۔ تین مہینے اس سفر میں

گزر گئے۔ سخت سردی کا موسم اور میدانوں اور پہاڑوں کا سفر، سخت مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ احمد راستے بھر اپنے دوستوں کو سمجھاتا رہا: ''عزیز ایسی دنیا پر خاک ڈالو، اور میرے ساتھ دہلی چلو۔ وہاں میرے نانا اور میرے چچا کے مشفق شاہ عبدالعزیز کا وجود غنیمت سمجھو'' لیکن ساتھی احمد کے اس نئے جال میں آنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اس کے دام میں پھنس کر لکھنؤ آ کر مزا چکھ لیا تھا۔ چنانچہ سات دوستوں میں سے چھ نے تو رائے بریلی کا رخ کیا، اور احمد دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز کی مسجد میں جا کر حاضر خدمت ہوا۔

شاہ عبدالعزیز کھلنڈرے، بے خوف، بے باک، دہقان قسم کے اکھڑ نوجوان کے پورے خاندان سے واقف تھے، جو دراصل ان کے اپنے خاندان کی روحانی شاخ تھے، اس لیے شاہ صاحب نے اٹھ کر دوبارہ مصافحہ کیا۔ گلے سے لگایا اور پوچھا ''کس غرض کے لیے اس طویل سفر کی تکلیف برداشت کی؟''

احمد نے جواب دیا'' آپ کی ذات مبارک کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی طلب کے لیے یہاں پہنچا ہوں''۔

شاہ صاحب نے فرمایا'' اگر اللہ کا فضل شامل حال ہے تو اپنے دوھیال، ننھیال کی میراث تم کو مل جائے گی''۔

پھر شاہ صاحب نے ایک ملازم کی طرف اشارہ فرمایا'' سیّد صاحب کو بھائی مولوی عبدالقادر صاحب کے یہاں پہنچا دو اور آپ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر کہنا کہ اس عزیز مہمان کی قدر کریں اور ان کی خدمت میں کوتاہی نہ کریں۔ ان کا مفصل حال ملاقات کے وقت بیان کروں گا''۔

اب وہ صرف احمد نہ رہے، شاہ عبدالعزیز کے لفظوں میں'' سیّد احمد'' ہو گئے۔ چنانچہ سیّد احمد شاہ عبدالقادر خلف شاہ ولی اللہ کی خدمت میں اکبر آبادی مسجد میں رہنے لگے۔ چند دنوں کے بعد ایک شب جمعہ کو آپ عبدالعزیز سے بیعت ہو گئے اور شاہ صاحب نے تینوں سلاسل یعنی چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ میں آپ کو داخل فرمایا۔

سیّد احمد نے اگرچہ درسیات کی تکمیل نہیں کی، لیکن آپ کو دینی علوم سے ضروری واقفیت ہو گئی۔ مسجد شاہ عبدالعزیز میں آپ ہر وقت علماء، مفسرین، محدثین اور فقہاء کی صحبت میں رہتے تھے، جہاں ہر وقت علم کا چرچا رہتا تھا۔ یہاں کا گھر بھی مدرسہ تھا اور یہاں کی تفریح بھی درس تھی۔ یہاں کی ہوا بھی علم پرور تھی اور پانی بھی علم خیز تھا۔ شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر اور مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل، شاہ محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب ایسے عظام دین کی صحبت سے فیضان حاصل کیا۔

شاہ ولی اللہ کے دو چھوٹے فرزند شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی چند برس پہلے رحلت کر چکے تھے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز سے روحانی تربیت اور تزکیۂ نفس کی تعلیم پائی اور قرآن مجید دوسرے فرزند شاہ عبدالقادر کی توجہ خاص سے سبقاً سبقاً پڑھا۔

دہلی کی اس روح پرور عالمانہ فضا میں رہتے تھے قلب صیقل، ضمیر روشن اور عزائم بلند ہو گئے تھے۔ اچانک ایک روز رائے بریلی اور اپنا گھر اور اپنی والدہ اور اپنے اہل خاندان بہت یاد آئے۔ اپنے مرشد شاہ عبدالعزیز اور استاد محترم شاہ عبدالقادر کی اجازت اور دعاؤں کے ساتھ رائے بریلی کے لیے روانہ ہوئے۔

جہادی تحریک کی ضرورت

سیّد احمد دہلی میں شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں دو سال تک باطنی فیوض و برکات کی دولت سے مالا مال ہو کر اپنے شہر رائے بریلی تشریف لائے۔ وہاں آپ اچانک پہنچے تھے اور اپنے محلے کی مسجد میں اجنبی مسافروں کی طرح جا کر بیٹھ گئے۔ آپ دو سال پہلے جب گھر سے نکلے تھے اس وقت داڑھی مونچھ بھی نہیں نکلی تھی۔ صرف آثار ہویدا تھے۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اب تشریف لائے تو گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ لوگوں نے پہچانا نہیں اور سمجھے شاید کوئی مسافر یا درویش ہے۔ سب سے پہلے میاں عبدالقادر خان نے پہچانا اور گھر میں خبر کی۔ گھر والے آئے اور ایک نئے اور تبدیل شدہ احمد کو جو پہلے کھلنڈرا تھا اور اب انتہائی سنجیدہ اور پرسکوت تھا، زبردستی ہاتھ پکڑ کر گھر لے گئے۔

کچھ عرصہ بعد گھر والوں نے سیّد محمد روشن کی صاحبزادی بی بی زہرہ سے اس کی شادی کر دی۔ نسبت تو بہت پہلے سے تھی لیکن لڑکی والوں نے لڑکے کے نئے رنگ ڈھنگ، وضع قطع اور عزائم دیکھے تو نکاح کرنے سے تامل کیا۔ رشتہ داروں نے انہیں سمجھایا، بجھایا کہ لڑکا شریف ہے، نیک ہے، اونچے سادات خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ٹھیک ہے، خلوت پسند زیادہ ہے، کمانے کا شوق بھی نہیں ہے۔ بے روزگار ہے، شادی ہو جائے گی اور بوجھ پڑے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بالآخر لڑکی والے رضامند ہو گئے۔ 1224ھ (1810ء) میں آپ کی بڑی صاحبزادی بی بی سارہ پیدا ہوئی۔

دہلی کا دوسرا سفر

دو سال بعد احمد دہلی تشریف لے گئے۔ یہ دہلی کا دوسرا سفر تھا۔ ان کے مرشد و رہنما شاہ عبدالعزیز مزید ضعیف ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے زمانے میں شاہ ولی اللہ کے دور جیسی طوائف الملوکی ختم ہو گئی تھی۔ اس وقت تک یورپی (انگریز، فرانسیسی، پرتگیزی) اقوام کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ اب شاہ ولی اللہ کے عہد کی طرح باہر کی ہنگامی مدد بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس کے باوصف شاہ عبدالعزیز کو، جو ہندوستان میں اسلام کے غلبے اور دینی حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہو، سب سے پہلے اس امر کا جائزہ لینا ضروری تھا کہ اس ملک میں کہاں ایسی ''آزاد فوجی طاقت'' پائی جاتی ہے، جو صحیح رہنمائی کے بعد اس عظیم مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

اس زمانے میں سارے ملک میں پانچ قابلِ ذکر طاقتیں تھیں:

(۱) ایک بیدار مغز اور نو خیز طاقت انگریز، جن کا ستارۂ اقبال ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے روز بروز بلند ہوتا جا رہا تھا۔

(۲) دکن میں نظام۔

(۳) شمالی وسط ہند میں اودھ کی سلطنت، لیکن دکن اور اودھ کی دونوں طاقتیں انگریزوں کی بالادستی بلکہ سرپرستی قبول کر چکی تھیں، اور اب ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے لیے ان سے امید رکھنا فضول تھا۔

(۴) مرہٹے جو وسط ہند اور دکن میں اپنی کئی ریاستیں قائم کیے ہوئے تھے، لیکن ان کی آپس میں سخت رقابت اور خانہ جنگی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ان کے چار سردار دولت راؤ سندھیا، جسونت راؤ ہلکر، باجی راؤ پیشوا، رگھوجی بھونسلہ اقتدار اعلیٰ کے لیے کشمکش کر رہے تھے۔

نواب امیر خان کی ملازمت

(۵) ایک پانچویں طاقت تھی جو تازہ تازہ ابھر رہی تھی۔ یہ روہیل کھنڈ کے افغانوں کی طاقت تھی۔ جن کی قیادت سنبھل (ضلع مراد آباد) کا ایک حوصلہ مند افغان زادہ امیر خان کر رہا تھا۔ امیر خان کے ساتھ روہیل کھنڈ اور شمالی ہند کے بہادر اور حوصلہ مند پٹھانوں اور سپاہ پیشہ نوجوانوں کی ایک طاقتور جمعیت رہتی تھی، جس کو مرہٹہ سردار اور راجپوت والیانِ ریاست ہمیشہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے تھے اور جس کی شمولیت فتح وشکست کے لیے اکثر فیصلہ کن ثابت ہوا کرتی تھی۔ اس عسکری جمعیت میں ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر، مسلم نوجوانوں کا گرم اور تازہ خون، ہندوستان کی فاتح طاقت کا بچا کچھا سرمایہ اور وقت کے بہت سے شاہین وشاہباز تھے۔

امیر خان کا تعلق سالارزئی پٹھانوں کے خاندان سے تھا جو علاقہ بنیر (سوات) میں بود و باش رکھتا تھا۔ امیر خان کے دادا طالع خان مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں سوات سے اٹھ کر ہندوستان آئے اور سنبھل میں سکونت اختیار کی۔ اس کے فرزند محمد حیات خان، امیر خان کے والد ہیں۔ امیر خان کو ابتدا سے سپہ گری کا شوق تھا۔ پڑھنے لکھنے سے (سیّد احمد کی طرح) مناسبت نہ تھی۔ قسمت آزمائی اور کشور کشائی کے لیے سنبھل سے نکل پڑے۔ راستے میں سپاہی پیشہ اور روزگار کے طالب آدمی شامل ہوتے رہے۔ اس کی جمعیت اور طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اسی ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے شامل ہو گئے اور اب وہ باقاعدہ "لشکر" کہلانے لگا۔ امیر خان کی عسکری لیاقت اور فوجی اہمیت کی شہرت اتنی دور دور پہنچی کہ شاہ شجاع نے اسے کابل اور نصیر خان نے اسے بلوچستان طلب کیا۔ ایسی صورت حال میں شاہ عبدالعزیز کی نظر میں یہ پانچویں ابھرتی ہوئی طاقت، امیر خان کی طاقت ہی اس قابل تھی کہ کسی مؤثر تحریک کو عملی انقلاب کی راہ پر سرگرم کرنے کے لیے اس سے مدد کی درخواست کی جا سکتی۔ چنانچہ شاہ صاحب نے امیر خان سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کیا جو خاصا عرصہ جاری رہا۔

اب جو سیّد احمد رائے بریلی سے دوبارہ ان کی خدمت میں دہلی آئے تو شاہ صاحب نے سیّد کی طرف ضرور اس نگاہ سے دیکھا ہوگا کہ یہ شخص درویشانہ طبیعت اور صوفیانہ تربیت کے باوجود کسرتی شوق اور جہادی عزائم رکھتا ہے۔ اور ضرور یہ خیال آیا ہوگا کہ اسے امیر خان کے لشکر میں شامل ہونا چاہیے۔ شاہ صاحب محض عالم دین نہ تھے، اپنے وقت کے اگر سیاست داں نہ سہی، سیاسی رہنما ضرور تھے۔ وہ یہ خوب جانتے تھے کہ انگریزوں کے برسر اقتدار آنے سے ہندوستان کے سیاسی حالات میں جو پرآشوب تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ نئی منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہیں۔

اب کسی بیرونی طاقت کی مداخلت یا برعظیم کے کسی مسلم حکمران کی کوشش سے کوئی کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ دہلی کا تخت محض ایک تو ہینی نکتہ بن کر رہ گیا تھا۔ مسلمان یہ جان گئے تھے کہ ان کا سیاسی اقتدار رخصت ہو چکا ہے، مگر وہ قانونی اور آئینی حیثیت کے مطابق ابھی تک الجھے ہوئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے آئینی الجھنوں کے تارِ عنکبوت کو ہٹانے کے لیے ایک فتویٰ جاری کیا جو ہندوستان کو اس وقت کی سیاسی صورت حال میں اہم موثر ثابت ہوا۔ فتویٰ یہ تھا کہ ہندوستان اب دارالسلام نہیں رہا، یعنی وہ ملک جہاں دین اسلام کو اقتدار اعلیٰ اور سیاسی طاقت حاصل ہو، نہیں رہا۔ اس فتوے میں یہ بھی تھا کہ بادشاہ انتہائی بے بس ہے اور حقیقی طاقت برطانیہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر بعض علاقے نظم ونسق کے مقصد سے انگریزوں نے دیسی ہاتھوں میں چھوڑ دیے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انگریزوں نے اسی کو اپنے سیاسی مفادات اور مصلحتوں کے مطابق خیال کیا۔ وہ مسلمانوں کی مذہبی رسوم اور عبادات کی ادائیگی میں اس لیے مداخلت نہیں کرتے کہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے، لیکن اگر وہ چاہیں تو ایسا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان اب ''دارالحرب'' بن گیا ہے، یعنی وہ ملک جہاں اسلام آزاد نہیں ہے۔

اس فتوے کا ایک قانونی پہلو یہ تھا کہ ہندوستان کے سابق مرتبہ دارالسلام کو بحال کرنے کے لیے ہر قسم کی جدوجہد ہر مسلمان پر فرض ہے۔ مسلمانوں کو باطل عقائد اور غیر اسلامی اعمال کی اشاعت میں انگریزوں کے ساتھ کسی طرح کا تعاون نہیں کرنا چاہیے اور انگریزوں کو مسلمانوں کی زندگیاں تباہ کرنے یا مسلم اقتدار کو مزید زیروزبر کرنے میں کسی قسم کی مدد دینا ایک گناہ کبیرہ ہے۔ انگریزوں کی زبان سیکھنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کا علم جائز اور مفید مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اسی طرح مسلمان ان کی ملازمت کر سکتے تھے بشرطیکہ انہیں جائز اور مفید مقاصد کے لیے ملازم رکھا جائے مثلاً جرائم کا سدّ باب، اسلامی قانون کی تشریح اور اس کا اطلاق و نفاذ، افادہ علم کی عمارتوں کی تعمیر و مرمت، الغرض کوئی بھی کام جو عوام کے مفادات کی تکمیل کرتا ہو۔

جہادی تحریک کی ضرورت

تاہم محض فتووں سے ایسی تحریک پیدا نہیں ہو سکتی تھی جسے شروع کرنا اور منظم کرنا ضروری ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے دہلی میں ایک مرکز قائم کیا، جس نے پہلے پہل ان کے بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے گہرے تعاون سے کام کیا۔ رفیع الدین اپنی دانشمندی اور صلابت فکر کے لیے اور عبدالقادر اپنی علمی اور متصوفانہ کمالات کے لیے مشہور تھے۔ خود شاہ عبدالعزیز میں یہ تمام اوصاف جمع تھے۔ شاہ رفیع الدین نے قرآن کا ترجمہ آسان اردو میں کیا چونکہ ان کا ترجمہ لفظی تھا اس لیے شاہ عبدالقادر نے اس کا ایک اور بامحاورہ ترجمہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز کے داماد شاہ عبدالحی نے قرآنی الفاظ کی ایک سبک فرہنگ تیار کی جو مبتدیوں کو زیادہ آسانی کے ساتھ قرآن کی تفہیم میں مدد دیتی تھی۔ یہ سب کچھ انہوں نے مل جل کر اپنے والد شاہ ولی اللہ کے اس مشن کی تکمیل کے لئے کیا کہ مسلم معاشرے کے کم تعلیم یافتہ طبقوں میں تعلیمات قرآنی کو مقبول بنایا جائے۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ تمام شہروں اور بڑے قصبوں میں مراکز قائم کئے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان مریدوں، شاگردوں اور وابستہ اہل علم کا حلقہ بنتا اور پھیلتا چلا گیا۔ (یہی سب لوگ بعد میں شاہ صاحب کی تحریک اور بعد میں خطوط لکھنے پر سید احمد کے جہاد میں مبلغ اور معاون بنے۔ تحریک کے لیے چندہ انہی لوگوں

کے ذریعے جمع ہوا۔ بھرتی ہوئی۔ لشکر بنا اور انہی مرکزوں سے مسلسل امداد پہنچتی رہی۔)

شاہ عبدالعزیز اپنے ہمہ جہتی سیاسی تجزیے میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلح جدوجہد (تنظیم جہادی تحریک) ضروری تھی، کیونکہ کسی بھی حکومت کو محض آرزومندی یا وسیع پیمانے پر سیاسی بے چینی سے اپنی زندگی چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک سیاسی بے چینی کو سرگرم مسلح بغاوت کی شکل نہ دی جائے، اس وقت تک یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ لوگوں کو بہت وسیع پیمانے پر حمایت کے لیے آمادہ کیا جائے اور ایک اچھا ''فوجی قائد'' تلاش کیا جائے۔ قائد نہ صرف اچھا جنگجو، بلکہ بے عیب کردار کا مالک اور ایسا آدمی ہونا چاہیے جو عوام النّاس کی عموماً اور ان لوگوں کی خصوصی وفاداری کا مستحق ہو، جو کارزارِ جنگ میں اس کے رفقائے کار بننے والے ہوں۔ اس زمانہ میں جب کہ تصوف کا رواج زوروں پر تھا یہ انتہائی لازم تھا کہ ایک روحانی اور متصوفانہ عظمت کے شخص کو منتخب کیا جائے، جس میں عسکریت اور روحِ جہاد بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔

نواب امیر خان کی ملازمت

یقیناً شاہ عبدالعزیز نے سوچا ہوگا کہ ایسا شخص، ایسا قائد سیّد احمد ہی ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف سید احمد کے اندر بھی اقامت جہاد کی ایک فطری اُمنگ تھی۔ چنانچہ استاد اور شاگرد دونوں کی نگاہِ انتخاب کا نتیجہ نکلا کہ سید احمد کے دہلی میں قیام کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ انہوں نے امیر خان کی ملازمت کا فیصلہ کر لیا۔ سیّد صاحب کے اس شوق سفر کا حال ان کے بھانجے مولوی سیّد محمد نے اپنی کتاب ''مخزنِ احمدی'' میں یوں بیان کیا ہے:

> ''خدا کے توکّل اور اس کی حفاظت پر اعتماد کرتے ہوئے اطمینانِ قلب کے ساتھ آپ تن تنہا، شاداں و فرحاں جیسے کوئی باغ کی سیر یا کسی دوست کے گھر جاتا ہے۔ شہر دہلی سے روانہ ہوئے اور ایسی منزلیں اور مرحلے طے کرتے ہوئے کہ ہر مرحلہ رستم و اسفندیار کے ہفت خوان سے کم نہ تھا۔ آپ نے لشکر کو اپنے شرفِ قدوم سے مشرف فرمایا''۔

ابتدا میں اہل لشکر ان سے ناواقف تھے۔ صرف اتنا جانتے تھے کہ ایک شریف النفس، مردِ صالح اور پابند نمازی ان کے ساتھ شریک ہو گیا ہے۔ لیکن جلد ہی ان کی عبادت و ریاضت، پاک نفسی، زہد و توکّل کا چرچا ہو گیا اور اس امر کا بھی کہ ان کی دعا میں تاثیر ہے۔ لوگوں نے جب ان کی بزرگی اور مقبولیت کے واقعات بچشم خود دیکھے تو بہت سے لوگ ان پر اعتماد بلکہ عقیدت رکھنے لگے۔ بعض واقعات کو دنیا داری یا ایسی چیزوں پر محمول کرتے جن کا اس زمانے میں عام رواج تھا۔ سیّد صاحب کا تذکرہ ہوتا تو وہ بے تکلفی سے اس کی حقیقت بیان کر دیتے۔

مثلاً نواب امیر خان کے دوروں کے سبب اکثر لشکر کے سپاہیوں پر کھانے، دانے کی تنگی کی تکلیف ہوتی تھی، مگر سیّد صاحب اور ان کے قریبی ساتھیوں میں فراغت اور فراخی رہتی تھی۔ چنانچہ بعض نادان لوگ ان میں یہ گمان کرتے تھے کہ نواب پوشیدہ طور پر ان کو کچھ رقم الگ سے بھیجتے ہیں یا ان کو کیمیا آتی ہے یا دست غیب ہے کہ ان کی تنگی وہ وضاحت کر دیتے کہ ان تینوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں۔ میرا پروردگار محض اپنے فضل و کرم سے روزی پہنچاتا ہے اور جو روز نواب کی طرف سے کچھ عنایت ہوتا ہے، سب کو معلوم ہے کہ میں اسی وقت لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔

شاہ عبدالقادرؒ کا حجرہ!

نواب امیر خان کا لشکر ایک ایک وقت میں چالیس چالیس، پچاس پچاس ہزار مسلمان سپاہیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ گویا سیّد صاحب کے لیے اصلاح و تبلیغ کا میدان کھلا تھا۔ آپ اپنی ذاتی ریاضت و عبادت اور سپاہیانہ تربیت و مشقت کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی اصلاح وارشاد میں بھی مشغول رہتے تھے۔ سپاہی لوگ عموماً ناخواندہ، دین سے ناواقف اور علمی ماحول سے دور ہوتے ہیں۔ چونکہ سید صاحب کی اپنی زندگی سپاہیانہ تھی اور وہ لشکر میں سب سے گھلے ملے رہتے تھے، اس لیے ان کی اصلاح و تربیت کے بہترین مواقع حاصل تھے۔ سپاہی لوگ آپ کو درویش اور صوفی سمجھ کر اپنی مختلف پریشانیوں اور ضرورتوں میں آپ کے پاس آتے آپ ان کی دل جوئی کرتے۔ ممکن ہوتا تو کاربر آری بھی کرتے اور صحیح عقائد کی تعلیم بھی کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کرتے۔ دینی فرائض کی پابندی کا اقرار لیتے اور بدعتوں اور برائیوں سے بچنے کا وعدہ کراتے۔

سیّد صاحب نے کم از کم چھ سال نواب امیر خان کی رفاقت اور ان کے لشکر میں گزارے۔ یہ فوجی زندگی سخت ریاضت، مشقت، جفاکشی اور بلند ہمتی کا تقاضا کرتی تھی۔ اودے پور، جودھ پور، بھرت پور، بیکانیر، اجمیر اور ان کے درمیان کے سینکڑوں قصبوں اور مقامات ہمیشہ اس لشکر کی زد میں رہتے تھے۔ کبھی یہ لشکر مالوے میں ہے، کبھی راجپوتانہ میں، کبھی مارواڑ میں ہے، اور کبھی میواڑ میں، بے آب و گیاہ صحرا، گھنے جنگل، ریتلے میدان غنیم کے علاقے، حریف کے قلعے، غرض جنگ کے ہر نشیب و فراز اور ہر گرم و سرد سے گزرنا پڑتا۔ بیماری، فاقہ، تنگی، فتح کی امید، شکست کا خطرہ، کبھی سپاہیوں کی کثرت، کبھی قلت سب سے سابقہ تھا۔ سیّد صاحب ان تمام حالات میں لشکر کے شریک حال رہے۔ آپ نواب صاحب کے مشیر بھی تھے اور نازک موقعوں پر نواب کو صحیح مشورہ دیتے۔ اہل حاجت کی سفارش کرتے۔ نواب صاحب صرف ریاضت و عبادت، دعائے خیر و برکت اور وعظ و نصیحت پر اکتفانہ فرماتے جنگ میں اگلے مورچوں میں شریک ہوتے، فوج کا حوصلہ بڑھاتے اور قائدین کو جنگ کی تدابیر بتاتے اور کمانڈروں کے ساتھ جنگی چالوں کے صلاح مشورے میں شریک رہتے۔

نواب امیر خان کی انگریزوں سے مصالحت

نواب امیر خان بعض مرہٹہ سرداروں اور راجپوت روسا کے حلیف اور رفیق رہے۔ وہ انگریزوں کے حریف اور ان سے برسر جنگ رہے۔ انگریز جنرل لیک نے نواب کے پاس پیغام بھیجا کہ جتنا روپیہ درکار ہو، لے لیجیے اور اس تاخت و تاراج سے باز آئیے تو نواب صاحب نے جواب دیا کہ ”ہمارا عزم ہے کہ تمام ہندوستان پر حکمرانی کریں۔ آپ سے روپیہ کیوں لیں۔ نواب صاحب انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے یہاں تک آمادہ تھے کہ رنجیت

سنگھ سے مدد حاصل کرنے کے لیے امرتسر پہنچ گئے۔ خیال یہ تھا کہ رنجیت سنگھ سے سازش کر کے انگریزوں پر حملے کریں۔ اگر سکھ ساتھ نہ دیں تو کابل کے بادشاہ شجاع سے ملاقات کر کے انگریزوں کے خلاف منصوبہ سازی کریں۔ جب مرہٹہ سردار ہلکر نے انگریزوں سے مصالحت کے لیے ابتدائی بات چیت کر لی تو اس نے نواب امیر خان سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ رنجیت سنگھ اور دوسرے ہندوستانی سرداروں میں ہمت نہیں کہ ہماری امداد کریں۔ کابل سے شاہ شجاع کی فوجی امداد یہاں لانا کیسا، ہمارے پاس تو کابل تک پہنچنے کا خرچہ نہیں ہے۔ ایسی صورتِ حال میں آپ کا کیا مشورہ ہے۔ نواب صاحب نے جواب دیا:

''رنجیت سنگھ اور دوسروں میں ہمت نہیں، نہ سہی۔ میں کابل جاتا ہوں۔ ہر حالت میں شاہ شجاع کو کمک پر لاتا ہوں۔ ہمارے پاس دس پندرہ لاکھ کے جواہر ہیں۔ یہ شاہ کو دوں گا۔ باقی دہلی لکھنؤ سے وصول کر کے دینے کا اقرار کروں گا۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالوں گا۔ مہاراج ہلکر نے پوچھا ''اور اگر شاہ نہ آئے تو؟'' نواب میر نے کہا کچھ پروا نہیں۔ اٹک کے پار جا کر اپنے ہم وطن، ہم قوم پٹھانوں کو جمع کروں گا۔ لاکھوں یوسف زئی قبائل کو ساتھ لے کر لوٹوں گا''۔

لیکن رفتہ رفتہ انگریز برسرِ جنگ طاقتوں اور ریاستوں کو ایک ایک کر کے توڑتے رہے۔ مرہٹہ سردار سندھیا نے ایک ریاست لے کر چپ سادھ لی۔ راجاؤں کے معاہدے کے بعد پنڈاریوں کا دائرہ بھی تنگ ہو گیا۔ انگریزوں نے (اور بعد میں انگریز مصنفین نے) بڑی چالاکی کے ساتھ نواب امیر خان کو پنڈارہ مشہور کر دیا۔ پنڈارے جنوبی ہند کی ایک غیر منظم اور جنگجو طاقت تھی، جو ہندوستان کی مرہٹہ گردی کے دور میں پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر لیا اور حالات سے فائدہ اٹھایا۔ ان کا تعلق نواب سے صرف اتنا تھا کہ نواب نے بعض موقعوں پر ان کے بعض سرداروں کو پناہ دی تھی اور ان کو اپنی حمایت میں لے لیا تھا اور وہ کبھی کبھی نواب کا ساتھ دے دیا کرتے تھے۔ سندھیا کے بعد 6 جنوری 1818ء کو نواب کے خاص رفیق و حلیف مہاراجہ ہلکر نے بھی انگریزوں سے مصالحت کر لی اور نواب تن تنہا رہ گئے۔ خفیہ ملاقاتوں اور مذاکرات کے نتیجے میں 9 نومبر 1817ء کو نواب کے وکیل نے انگریزوں سے مصالحت کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ 15 نومبر کو گورنر جنرل نے اس معاہدے کی تصدیق کر دی۔ اس طرح نواب امیر کی تین سالہ فوجی سرگرمیاں ختم ہو کر ریاست ٹونک کی بنیاد پڑ گئی۔ جو انگریزوں کی چالاکی اور نواب کی سادہ لوحی سے راجپوتانے اور مالوے کے چند متفرق علاقوں پر مشتمل تھی جو مہاراجہ ہلکر نے نواب کے سپرد کر رکھے تھے۔ نواب امیر خان کا لشکر جو ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر تھا، اور جو پورے ملک کی طاقت کا سرمایہ تھا، منتشر کر دیا گیا۔ صرف اتنے آدمی رکھے گئے جو ریاست کے نظم و نسق کے لیے ضروری سمجھے گئے۔ توپ خانہ اور دوسرا ساز و سامان انگریزوں نے معاہدے کی شرط کے مطابق خرید لیا۔ نواب نے عہد کیا کہ وہ کسی علاقے پر حملہ نہیں کریں گے بلکہ پنڈاروں کی سرکوبی میں انگریزوں کی مدد کریں گے۔

سیّد صاحب کی لشکر سے جدائی

صلح کی کارروائی صیغۂ راز میں ہوئی۔ لوگوں کو اس بات چیت کا علم اس وقت ہوا جب آخری مسودہ نواب

صاحب کے پاس پہنچ گیا۔نواب کے رفقاء اور مشیروں میں سے اکثر کی رائے تھی کہ صلح کر لی جائے لیکن سیّد صاحب صلح کے مخالف تھے۔ آپ نے آخر تک نواب کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور اس کے نتائج و خطرات سے آگاہ کیا۔لیکن نواب اپنے ان حالات میں بالکل مجبور اور بے بس پاتے تھے۔ وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اس قدر متاثر و مسحور تھے کہ وہ چھوٹی سی ریاست کے گوشۂ عافیت کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔سیّد صاحب کے نزدیک مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی۔نواب کو انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا، جن کے استعمار کی زد میں سارا ہندوستان اور بالآخر سارا عالم اسلام تھا۔ سیّد صاحب کے نزدیک یہ ہندوستان کی آخری آزاد اور جنگجو طاقت تھی جس کو اس آسانی کے ساتھ سپر انداز اور مقابلے سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے تھا۔مگر ان کو جلد معلوم ہو گیا کہ نواب صاحب کی قوت مقابلہ جواب دے چکی ہے اور صلح کے سب مراحل طے ہو چکے ہیں۔ جب انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب کوئی گفتگو کارگر نہیں ہو سکتی اور مصالحت ایک طے شدہ امر ہے تو آپ نے لشکر سے علیحدگی اور دہلی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا لشکر میں آپ کی رفاقت و شرکت کی شرط یہی تھی کہ نواب امیر خان ایک آزاد طاقت کی حیثیت سے باقی رہیں، اور اصل مقصد یہ تھا کہ آپ جلد یا بدیر اس آزاد طاقت کو صحیح رخ پر لگائیں اور اس سے اسلامی اقتدار کے قیام اور انگریزوں کو نکالنے کی مہم میں کام لیں۔

ایک روز سیّد صاحب نے نواب امیر خان سے کہا ”اچھا اگر آپ انگریزوں سے ملتے ہیں تو میں رخصت ہوتا ہوں“۔

نواب صاحب نے بہت سمجھایا مگر آپ نہ مانے۔دل برداشتہ ہو کر چند آدمی ہمراہ لے کر جے پور چلے گئے۔ چند روز کے بعد واپس آئے اور نواب صاحب کو پھر سمجھایا ”ابھی کچھ نہیں گیا۔اختیار باقی ہے۔آپ کی فہمائش کو آیا ہوں۔اگر میرا کہنا مانیے تو ان سے لڑیئے اور ہرگز نہ ملیئے۔ان سے ملنے کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔یہ انگریز لوگ بڑے دغا باز اور مکار ہیں۔کچھ آپ کے واسطے تنخواہ یا جاگیر وغیرہ مقرر کر کے کہیں بٹھا دیں گے کہ روٹیاں کھایا کیجیے۔پھر یہ بات ہاتھ سے جاتی رہے گی“۔

صلح کا معاہدہ ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر سیّد صاحب لشکر میں تشریف لائے۔جس سے کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور نواب صاحب سے ملاقات کی۔نواب صاحب بہت آب دیدہ ہوا اور کہا ”حضرت جو کچھ تقدیر میں تھا وہی ہوا، حکم الٰہی سے چارہ نہیں۔ اب آپ دہلی کو جاتے ہیں تو صاحبزادہ محمد وزیر خان (ولی عہد) کو اپنے ہمراہ لیتے جائیے“۔سیّد صاحب نے قبول کیا اور ایک خط شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں دہلی روانہ کیا۔لکھا تھا، یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی کو عنقریب حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا ہے۔نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے ہیں۔اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں“۔

شاہ عبدالعزیز کا خواب

سیّد صاحب کا یہ خط جس میں نواب امیر خان کے دستبردار ہونے لشکر سے اپنی علیحدگی اور عنقریب حاضر ہونے کی اطلاع تھی، جب شاہ عبدالعزیز کو ملا تو وہ یقیناً سیّد صاحب کے سپاہیانہ کمالات، پرانے صوفیانہ اور خانقاہی سلسلے

کے چشم و چراغ، نہایت متقی اور متدین اور صدق وصفا کے پیکر کی عاجلانہ آمد کی پریشان کن اطلاع سے تفکر میں پڑ گئے ہوں گے۔ انہیں چشم تصور میں اپنے اس مرید اور شاگرد کے اندر ایک عظیم مجاہد کی صورت نظر آئی ہوگی جو تعلیم و تربیت اور ارادات مندی کے زمانہ میں بھی ہمیشہ ہتھیار لگا کر بیٹھا کرتے تھے اور اب تو وہ چھ سات سال سے امیر خان کے لشکر میں مجاہدانہ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ سوار کی حیثیت سے بھرتی ہوئے۔ بعد میں لشکر میں امامت بھی کی۔ جس کی وجہ سے لشکر میں مذہبی رہنما کا معزز مقام انہیں حاصل ہو گیا۔ لشکر کے سپاہیوں، خصوصاً پٹھانوں اور نواب امیر خان پر ان کا خاصا اثر تھا۔ یقیناً اس پر آشوب اور مایوس کن ماحول میں شاہ صاحب انتہائی فکرمند اور کئی تعمیری منصوبوں میں مشغول ہوں گے۔

اسی نفسیاتی کیفیت میں سیّد صاحب کے دہلی پہنچنے سے ایک ہفتہ قبل، شاہ عبدالعزیز نے خواب دیکھا کہ آنحضرت ﷺ جامع مسجد دہلی میں تشریف رکھتے ہیں اور لوگ دور دور سے جوق در جوق زیارت کے لیے آرہے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے سب سے پہلے شاہ صاحب کو شرفِ باریابی عطا فرمایا اور عصائے مبارک دے کر فرمایا کہ یہ عصا لے کر مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو آنا چاہے، اسے اندر آکر اپنا حال بیان کرنے دو۔ اور ہر آنے والے کو میری اجازت سے اندر بھیجو۔ شاہ صاحب نے اس کی تعمیل کی اور ہزارہا بندگانِ خدا نے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی۔

صبح اٹھ کر شاہ صاحب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے پاس تشریف لے گئے اور خواب کی تعبیر چاہی۔ شاہ غلام علی نے فرمایا ''سبحان اللہ، یوسف وقت مجھ سے تعبیر پوچھتا ہے۔ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے، یا آپ کے کسی مرید کے، ذریعے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت و فیض کا سلسلہ جاری ہوگا''۔ شاہ عبدالعزیز نے فرمایا کہ میرے خیال میں بھی یہی تعبیر آئی تھی۔ جب سیّد صاحب دہلی پہنچے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ جس سلسلۂ ہدایت کے آغاز کی بشارت خواب میں دی گئی ہے وہ ان شاءاللہ سیّد صاحب ہی کے ذریعے عمل میں آئے گی۔

ایک ہفتے کے بعد سیّد صاحب دہلی پہنچے۔ صاحبزادہ محمد وزیر خان (ولی عہد ریاست ٹونک) تو قاضی کے حوض پر بلند بیگ خان کی حویلی میں اترے اور سیّد صاحب نے اجمیری دروازے کی سرائے میں قیام فرمایا۔ رات کو وہیں رہے۔ صبح کو غسل کر کے اور کپڑے بدل کر آپ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پچیس روپے نذر دیئے۔ شاہ صاحب نے آپ سے نواب امیر خان کے لشکر کا حال اور صلح نامے کی تفصیلات دریافت کیں۔ اپنے خواب کا تذکرہ کیا۔ پھر سیّد صاحب کے قیام کے لیے مسجد اکبر آبادی تجویز کی۔ سیّد صاحب مسجد میں داخل ہوئے، جہاں چند سال پہلے وہ قیام پذیر رہ چکے تھے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور جس حجرے میں شاہ عبدالقادر رہا کرتے تھے تشریف لے گئے۔ شاہ صاحب کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

یہ وہی حجرہ ہے جہاں شاہ صاحب نے علم سے فراغت پا کر تمام عمر بسر کی تھی۔ گوشہ نشینی پسند خاطر تھی۔ اسی حجرے کی خلوت میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کا بامحاورہ اردو ترجمہ کیا تھا جو بعد میں ''موضح القرآن'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ سیّد صاحب نے اس تاریخی حجرے میں اپنا سامان رکھوایا۔ پھر مسجد کے صحن میں آکر بیٹھے اور لوگ ملاقات کے لیے آنے لگے۔

سیّد صاحبؒ کے تبلیغی دوروں کے نتائج

حضرت شاہ عبدالعزیز نے جو خواب دیکھا تھا اور اس کی جو تعبیر شاہ غلام علی نے بیان کی تھی، وہ سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ سید احمد نے دہلی تشریف لا کر جو اصلاحی تحریک شروع کر کے کارنامہ عظیم انجام دیا، اس کے اثرات و نتائج سے اسلامیان ہند و پاک آج تک مستفیض ہو رہے ہیں۔ اس تحریک کے نتیجے میں مشرق میں دہلی سے لے کر بہار و بنگال تک اور مغرب میں یوپی، پنجاب، کشمیر، سندھ، صوبہ سرحد اور افغانستان تک لاکھوں مسلمان حقیقی مسلمان بن گئے۔

عقیدت مندوں کا ازدحام

نواب امیر خان کے لشکر سے واپس دہلی تشریف لانے کے بعد سیّد صاحب کی پاکیزگی، صفائی قلب اور روحانیت کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ بڑے بڑے علماء جن کی حیثیت اس وقت قطب اور ابدال سے کم نہ تھی، سیّد صاحب کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے۔ شاہ محمد اسماعیل، مولانا عبدالحیی (شاہ ولی اللہ کے بھائی شاہ اہل اللہ کے فرزند) مولانا یوسف (شاہ اہل کے نواسے) اور شاہ ولی اللہ کے خاندان کے بہت سے افراد بیعت کر کے سیّد صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ شہر دہلی کے بہت سے لوگ بیعت ہوئے۔ آپ نے شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحیی کو درس و وعظ کی ہدایت کی۔ ان دونوں بزرگوں کی زبان میں بلا کی تاثیر تھی اور بلاشبہ دونوں علم و فضل کے بحر ذخار تھے۔ چنانچہ ان کے مواعظ حسنہ نے لوگوں کے قلوب میں حیرت انگیز تغیر پیدا کر دیا۔

دہلی کے دوران قیام مختلف شہروں سے دعوت نامے موصول ہوئے جن میں اکابر، علماء اور امراء نے سیّد صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے ہاں تشریف لا کر اپنی زبان فیض ترجمان سے فسق و فجور کی طرف مائل افراد کی اصلاح فرمائیں۔ یہ ایک زبردست اصلاحی تحریک تھی جو سیّد صاحب کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے غیب سے رونما ہوئی تھی۔ آپ نے دعوت ناموں کو قبول کیا اور اپنے چند مریدوں کو ہمراہ لے کر اصلاح خلق کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ آپ نے یہ تبلیغی اور اصلاحی دورہ محرم 1818ء میں شروع کیا۔ دہلی سے سہارنپور، میرٹھ، سردھنہ، مظفر گڑھ، دیوبند، گنگوہ، نانوتہ اور انبیٹھے سے ہوتے ہوئے آپ پھر سہارن پور آئے اور یہاں چند روز قیام کے بعد دہلی واپس تشریف لے آئے۔

چند روز بعد سیّد صاحب کے بڑے بھائی مولانا سیّد محمد اسحاق آپ سے ملاقات کے لیے دہلی تشریف لائے اور آٹھ برس کے بعد دو بچھڑے ہوئے بھائی ملے۔ مولانا نے فرمایا کہ "مجھے نواب امیر خان کے لشکر سے تمہاری دہلی

واپسی کا علم ہوا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو، تم کہیں دور چلے جاؤ اور ملاقات ہونی دشوار ہو۔ اس خیال سے میری طبیعت کو قرار نہ ہوا اور ادھر روانہ ہوا۔ سب اہل وطن تمہیں یاد کرتے ہیں"۔ سیّد صاحب نے بھائی کو اطمینان دلایا کہ انشاءاللہ جلد رائے بریلی آؤں گا۔

چنانچہ کچھ عرصے کے بعد آپ دہلی سے بریلی روانہ ہوئے۔ غازی آباد تک پہنچے تھے کہ بڑے بھائی سیّد محمد اسحاق کے انتقال کی خبر سنی۔ سخت مغموم ہوئے۔ مگر صبر وضبط سے کام لیا اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین فرمائی۔ اس سفر میں آپ ہاپوڑ، گڑھ مکتسر، امروہہ، مراد آباد، رام پور بریلی اور شاہ جہاں پور سے گزرے اور 70 افراد کے قافلے کے ساتھ رائے بریلی میں داخل ہوئے۔

ان سب مقامات پر آپ نے قیام فرمایا اور وعظ وتبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر شہر میں وہاں کے علماء، مشائخ، امراء ورؤسا اور بعض فوجی سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہ تھا، جہاں آپ کی تشریف آوری سے عجب رونق اور چہل پہل نہ ہوگئی ہو۔ بعض مقامات پر لوگوں کے جم غفیر آپ کے استقبال کے لیے آبادی سے کئی میل باہر آئے ہوئے تھے۔ دیہات کے لوگ بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر سیّد صاحب کی زیارت کرنے اور ان کی زبان مبارک سے کلمات رشد وہدایت سننے کے لیے آئے۔ بڑے بڑے رؤسا اپنے متوسلین سمیت آپ سے بیعت ہوئے۔ اکثر وبیشتر مقامات پر خواتین کی کثیر تعداد نے آپ کی بیعت کی۔ اس طویل دورے میں آپ نے ہر جگہ شرک و بدعت کے خلاف نہایت مؤثر تقریریں کیں۔ جن لوگوں سے بیعت لی ان سے فسق وفجور سے بچنے، دیانت اور امانت کی زندگی گزارنے، مشرکانہ رسوم ترک کرنے اور روزے نماز کی پابندی کرنے کا عہد لیا۔ اس طرح سیّد صاحب کی کوشش سے لاکھوں افراد جن میں عوام، سیاسی پیشہ، تاجر، اہل حرفہ، امراء ورؤسا، خواتین، غرض ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، سچے اور حقیقی مسلمان بن گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے غیر مسلم بھی سیّد صاحب کی اثر انگیز تقریریں سن کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

ایک انقلابی قدم

اب تک سیّد صاحب کے عقیدت مند اپنا بیشتر وقت عبادت الٰہی اور ذکر وفکر میں گزارتے تھے، رائے بریلی پہنچ کر آپ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ اپنا زیادہ وقت فنون جنگ سیکھنے اور ان کی مشق کرنے میں صرف کیا کرو۔ یہ گویا پہلا کھلا اعلان تھا اس کارنامہ عظیم کی تیاری کو جو آپ کو مستقبل میں انجام دینا تھا۔ سیّد صاحب کی یہ ہدایت اور حکم بعض لوگوں کے لیے بڑا غیر متوقع تھا اور وہ لوگ جو سال ہا سال سے مراقبوں اور ذکر وفکر کے عادی ہو چکے تھے ان کے لیے یک دم تلوار اور بندوق لے کر جنگی فنون کی مشق کرنے میدان میں نکل آنا آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں انہوں نے اس معاملے میں کچھ سرگرمی نہ دکھائی۔ مولانا غلام رسول مہر اپنی تصنیف "سیّد احمد شہید" میں لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالرحیم کاندھلوی کے ذریعے یہ معاملہ سیّد صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:

> "ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہمیں درپیش ہے۔ اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے، یعنی جہاد فی سبیل اللہ، اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس واسطے وہ

کام یعنی مسلوک اس جہاد کے تابع ہے اگر کوئی تمام دن روزے رکھے، تمام رات زہد و ریاضت میں بسر کرے، یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آ جائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو رنجک اٹھائے، تا کہ مقابلہ کفار میں بندوق لگائے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبے کو ہرگز نہ پہنچے گا۔"

سیّد صاحب کی اس تقریر کا نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ ان کے دوسرے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں نے سیّد صاحب کے مقصد و منشا سے آگاہ ہونے کے بعد مراقبہ اور ہر وقت ذکر و فکر کا شغل ترک کر کے جسمانی ورزش، تیراندازی اور بندوق زنی کی مشق شروع کر دی اور چند ہی روز میں صوفیا کا یہ گروہ مجاہدوں کے چاق چوبند دستے میں تبدیل ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز سیّد صاحب نے اپنے ایک مرید سے فرمایا:

"وہ کام (سلوک) اس وقت کا ہے جب اس کام (جہاد) سے فارغ البالی ہو، اور اب جو پندرہ، سولہ روز سے دوسرے انواع کی ترقی نماز یا مراقبہ میں زیادہ معلوم ہوتی ہے، وہ اس کاروبار کے طفیل ہے۔ کوئی جہاد کی نیت سے تیراندازی کرتا ہے، کوئی بندوق لگاتا ہے، کوئی پھری گتکا کھیلتا ہے، کوئی ڈنٹر پیلتا ہے۔ اگر ہم اس وقت اس (سلوک) کی تعلیم کریں تو ہمارے یہ بھائی لوگ کام سے جاتے رہیں۔"

فوجی چھاؤنی میں تبلیغی دورہ

سیّد صاحب رائے بریلی میں دو سال سے کچھ زیادہ مقیم رہے۔ دوران قیام آپ نے اپنے دوسرے تبلیغی اور اصلاحی دورے کا منصوبہ بنایا اور 170 عقیدت مندوں کے قافلے کے ساتھ الہ آباد، بنارس، کان پور اور سلطان پور کا دورہ کیا اور پھر رائے بریلی واپس تشریف لے آئے۔ کچھ عرصے بعد لکھنؤ کے دورے پر روانہ ہوئے۔ لکھنؤ اودھ کا دارالسلطنت، علماء، فقہا اور امراء و شرفاء کا مرکز تھا۔ لکھنؤ میں سیّد صاحب کے بزرگوں کے بے شمار عقیدت مند موجود تھے۔ قندھاریوں کی چھاؤنی میں اور رسالہ داروں کی چھاؤنی میں بہت سے لوگ آپ کے خاندانی مرید اور معتقد تھے۔ عبدالباقی خان قندھاری اور نواب فقیر محمد خان (جوش ملیح آبادی کے دادا پیر) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں سیّد صاحب کا پر جوش استقبال ہوا۔ بڑے بڑے علماء اور امراء نے آپ کے اعزاز میں ضیافتیں دیں۔ نماز جمعہ کے علاوہ بھی بڑے بڑے اجتماعات ہوئے جن میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ایک بار جمعہ کے اجتماع میں چار ہزار آدمی شریک ہوئے۔ ان اجتماعات سے سیّد صاحب کے علاوہ آپ کے مریدانِ خاص مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل نے بھی خطاب کیا۔ متعدد عالم لوگوں نے سیّد صاحب سے مختلف مسائل کے بارے میں سوالات کئے۔ آپ نے ان کے کافی و شافی جوابات دیئے۔ شیعہ و سُنّی دونوں آپ کے تاثیر وعظ کی محفلوں میں جوش و خروش سے شریک ہوئے۔ تقریباً ہر روز بیعت کرنے والوں کا ازدحام ہوتا۔ سُنّی اور شیعہ دونوں بیعت کرتے۔

سیّد صاحب کی لکھنؤ تشریف آوری سے اودھ کے لشکریوں میں بھی انقلاب آ گیا۔ سیّد صاحب کے بعض عقیدت مند رسالہ داروں کے زیر اثر اور پھر سیّد صاحب کی زیارت اور پر تاثیر گفتگو سے متاثر ہو کر سینکڑوں فوجیوں نے

آپ کی بیعت کی۔ چنانچہ ایک رسالہ دار کی درخواست، پر سیّد صاحب لکھنؤ چھاؤنی میں تشریف لے گئے اور تین چار سو سواروں اور افسروں نے آپ کی بیعت کی۔

مسلم معاشرے کا احوال

جناب پیام شاہجہان پوری اپنی تصنیف ''شہادت گاہ بالاکوٹ'' میں اس وقت کے مسلم معاشرے کا احوال یوں بیان کرتے ہیں، سیّد صاحب کے ان تبلیغی دوروں کے بڑے حوصلہ افزاء نتائج نکلے۔ ان دوروں کا اصل مقصد مخلوق خدا کی اصلاح تھا۔ خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلانا تھا جو اس سے بہت دور جا پڑے تھے۔ اس دور میں مسلم معاشرے کا نقشہ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ عوام سے۔ لے کر امراء اور شاہان وقت سب فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ زناکاری، شراب خوری، بددیانتی اور بے ایمانی رگ و پے میں رچ بس گئی تھی۔ حرام و حلال میں امتیاز ختم ہو گیا تھا۔ سرکاری ملازمین عوام پر بے دریغ ظلم کرتے تھے۔ کھلے بندوں لوٹ مار کرتے اور عوام کا مال غصب کر لیتے تھے۔ سید صاحب نے اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو ان خرابیوں کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے مضر اثرات سے متنبہ کیا۔ اسلام کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کی اور انہیں اخلاق و نفس کی اصلاح پر آمادہ کیا۔ سیّد صاحب کی نورانی صورت، اعلیٰ کردار، پاکیزہ اخلاق، مؤثر اور دل نشین انداز بیان، اسلام کے لیے سچی لگن اور لہجے کا خلوص ان سب باتوں نے لوگوں کے قلوب پر غیر معمولی اثر کیا۔ نتیجہ یہ نکلا سینکڑوں فاسق و فاجر بداعمالیوں سے تائب ہو گئے۔ کتنی ہی طوائفوں نے اپنے شرمناک پیشے سے توبہ کر لی اور سیّد صاحب کے ذریعے نیک دل مسلمانوں کے حبالۂ عقد میں آ کر پاکیزہ زندگی گزارنے لگیں۔ ہزاروں مسلمان جو محض نام کے مسلمان تھے، کام کے مسلمان بن گئے۔ بیسیوں چور اور ڈاکو آپ کی تلقین و ہدایت سے، ان افعال بد سے تائب، ہو کر آپ کی بیعت میں داخل ہوئے اور حلال کی روزی کمانے لگے۔ جن لوگوں نے کبھی مسجد کا منہ نہ دیکھا تھا، نہایت پابندی سے نماز با جماعت ادا کرنے لگے۔ ہزاروں گھروں سے شرک و بدعت اور رسومات بد کے بت نکال دیے گئے اور مسلمانوں کے گھر سچی اسلامی زندگی پیش کرنے لگے۔

خواتین کی اصلاح و تربیت

''سیّد صاحب نے اپنے ان دوروں میں خواتین سے خاص طور پر یہ عہد لیا کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نرے ولی اور روایتی پیر نہ تھے، بلکہ معاشرتی خرابیوں کے اسباب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان برائیوں کا سوتا کہاں سے پھوٹتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سوتے کو بند کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ وہ جانتے تھے کہ گھر اور خاندان کے معاملات کا دار و مدار خواتین پر ہوتا ہے۔ اگر ان کی روش اور خیالات درست ہوں تو گھر اور خاندان کی ساری فضا درست رہتی ہے۔ یہ حکیم فرزانہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ خواتین میں اثر پذیری کا مادہ مردوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ضعیف الاعتقاد بھی زیادہ ہوتی ہیں اور رسوم و رواج کے بندھنوں میں تیزی سے جکڑ جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مرد نہایت قوی ارادہ رکھنے کے باوجود خواتین کے اثر میں آ جاتے ہیں۔ مردوں کی اسی فطری کمزوری کے پیش نظر سیّد صاحب نے خواتین کی اصلاح و تربیت اور مشرکانہ رسوم سے پاک کرنے کے لیے، انہوں نے خواتین سے یہ عہد لیا کہ وہ شرک و بدعت اور رسوم بد

سے اجتناب کریں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین نے مردوں سے وہ مطالبات کرنا ترک کر دیئے جن کی بناء پر ایک طرف روپیہ کا اسراف ہوتا تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کا گھر مشرکوں کا گھر معلوم ہوتا تھا۔ غرض سیّد صاحب کے ان دوروں کی وجہ سے مسلم معاشرے کا نقشہ بالکل بدل گیا اور ایسے صاحب کردار، نیک اخلاق اور پاکیزہ کردار لوگوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جن کے دلوں میں اسلام کا درد تھا اور جو سارے معاشرے کو اپنے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔

تلوار، بندوق یا پستول

اپنے تبلیغی دوروں میں سیّد صاحب جہاں بھی تشریف لے گئے اور جس مجلس وعظ میں شریک ہوئے انہوں نے ایک بات کا ہمیشہ اہتمام کیا۔ وہ یہ کہ تلوار، بندوق یا پستول میں سے کوئی نہ کوئی ہتھیار ہاتھ میں ہوتا یا کمرے میں آویزاں ہوتا تھا۔ بعض علماء نے اس پر اعتراض بھی کیا کہ یہ شان اہل اللہ کی نہیں ہوتی۔ دراصل اس طرح سیّد صاحب اپنے طرز عمل سے عام مسلمانوں، علماء، صوفیاء اور پیروں کو خانقاہی زندگی سے نکال کر عملی اور مجاہدانہ زندگی کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کا نمونہ دیکھ کر آسائش و تعیش کی زندگی ترک کر دیں اور جو لوگ ہتھیار باندھتے ہوئے شرماتے ہیں وہ وقت کے اس سب سے بڑے مصلح اور مجدد کی تقلید میں ہتھیار باندھنا اور انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ دراصل اس طرح سیّد صاحب لوگوں کو اس بلند نصب العین کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے جو ان کے پیش نظر تھا۔ اور جن کے حصول کے لیے، انہیں مصائب و شدائد کی خاردار اور دشوار گزار وادیوں میں سے گزر کر شہادت کے منصب پر فائز ہونا تھا۔

سیّد احمد شہیدؒ کا سیاسی ماحول

شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تین بڑی طاقتیں مرہٹہ، جاٹ اور سکھ مرکزی سلطنت مغلیہ کے خلاف باغیانہ سر اٹھا رہی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک اور افغان سردار نواب نجیب الدولہ کی مساعی سے احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا اور 26 / اپریل 1761ء کو پانی پت کے میدان میں پانچ لاکھ مرہٹوں کو ایسی شکست فاش دی کہ وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ مرہٹوں کی طاقت پاش پاش ہو جانے سے جاٹوں میں بھی دم خم نہ رہا، جنہوں نے دہلی سے آگرہ تک تخت تباہی مچا رکھی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے والے بھی مسلمان سردار ہی تھے جو اپنے مسلمان حریفوں کو شکست دینے کے لیے جاٹوں کو استعمال کرتے تھے۔

سکھوں کی تباہ کاریاں

مرہٹوں اور جاٹوں کی غارت گری کی داستانیں بلاشبہ بڑی روح فرسا اور دل گداز ہیں، مگر اس علاقے میں جسے آج پاکستان کہتے ہیں، ایک ایسی قوم نے بھی جنم لیا جس کی تباہ کاریاں مرہٹوں اور جاٹوں دونوں سے سبقت لے گئیں۔ یہ غارت گر قوم سکھ تھی۔ ابتدا میں سکھ ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس مذہب کے بانی

گورونا نک صاحب ایک نیک دل اور توحید پرست صوفی تھے۔ انسانیت کی تبلیغ اور صلح وآشتی ان کا مسلک تھا، مگر بعد کے گورو صاحبان خصوصاً گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو نیم فوجی گروہ بنا دیا۔ انہوں نے کرپان رکھنا ہر سکھ کے لیے لازم قرار دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایسی سفاکی کا مظاہرہ کیا کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مظالم بھی ہیچ نظر آنے لگے۔ مولانا ذکاء اللہ دہلوی اپنی تالیف ''تاریخ ہندوستان'' میں لکھتے ہیں:

''سکھوں نے مال لوٹا۔ مردوں کو قتل کیا۔ شریف کے اہل وعیال کو قیدی کیا۔ تین چار روز تک (سرہند میں) ایسی بے دردی سے ظلم کیا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کیا جو بچہ زندہ نکلا اسے زمین پر پٹک کر تلوار کی نوک سے مردہ کیا۔ عمارتوں کو نذر آتش کیا۔ فقیر وغنی کو ہم صورت بنایا۔ جہاں مسجد، مقبرے اور مزار دیکھے، ان کو توڑا، ڈھایا، اکھیڑا۔ مزاروں میں سے مردوں کی ہڈیوں کو نکالا اور مردوں کی لاشوں سے وحشیانہ سلوک کیا۔''

مرہٹوں اور جاٹوں کی بغاوت فرو ہو جانے کے بعد سکھوں کی طاقت بھی کمزور پڑ گئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے فرزند بہادر شاہ اول نے لشکر جرار کے ساتھ کئی خون ریز جنگوں کے بعد سکھوں کو منتشر کر دیا۔

ابدالی کے ہاتھوں سکھوں کی گوشمالی

بظاہر سکھوں کی طاقت ختم ہوگئی اور اگر دہلی کی حکومت مستحکم ہوتی اور صوبوں کے گورنر سرکشی نہ کرتے تو یقیناً سکھوں کو دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی مگر مرکز کی کمزوری، مسلمان سرداروں کی کشمکش اور خانہ جنگی نے سکھوں کو پھر منظم ہونے اور پنجاب میں غارت گری کا بازار گرم کرنے کا موقع دیا۔ اب انہوں نے مختلف گروہوں کی صورت میں، جنہیں ''مسلین'' کہتے تھے، قتل وخوں ریزی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ ان ''مسلوں'' کے سرداروں نے پنجاب کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ ان مسلوں (یا مثلوں) کی تعداد بارہ تھی۔ ہر مسل کا ایک سردار ہوتا تھا جو جتھہ دار کہلاتا تھا۔ ان مسلوں اور جتھہ داروں نے سارے پنجاب میں لوٹ مار اور آتش زنی سے قیامت برپا کر دی تھی کہ ان کی سرکوبی کے لیے احمد شاہ ابدالی کو پھر پنجاب آنا پڑا۔ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی یہ پہاڑوں میں جا چھپے۔ البتہ آلا سنگھ نے دو لاکھ فوج کے ساتھ لدھیانہ کے قریب ''گھوڑا گھارا'' کے مقام پر احمد شاہ ابدالی سے مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں بیس ہزار سکھ قتل ہوئے۔ زخمیوں کا کوئی شمار نہیں۔ سکھوں میں یہ جنگ ''گلھو گھاڑا'' (بہت خون خرابہ) کے نام سے مشہور ہوئی۔

احمد شاہ ابدالی کے واپس جانے کے بعد کئی سال سکھوں پر سکوت طاری رہا، لیکن بعض سکھ مسین پھر سرکشی پر آمادہ ہوگئے۔ اس مرتبہ انہوں نے لاہور پر یورش کر دی اور تین سکھ سرداروں، گوجر سنگھ، سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ خود ان سکھ سرداروں میں خوں ریز جنگیں ہوئیں۔ اس طرح لاہور بری طرح برباد ہوا۔ ایک شہر پر بیک وقت تین حاکموں کی حکومت تھی۔ آخر میں انہوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ لاہور کا مشہور علاقہ قلعہ گوجر سنگھ اس کی یاد دلاتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات (1772ء) کے بعد تو پنجاب میں کوئی سکھوں کی راہ میں رکاوٹ نہ رہا۔ سارے پنجاب کے مسلمان ان کی یورش اور غارت گری سے بلبلا اٹھے۔ احمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ

قندھار کا بادشاہ بنا۔ اس نے 1793ء تک حکومت کر کے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زماں شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ سکھوں کی گوشمالی کے لیے کئی بار پنجاب آیا۔ آخری بار 1798ء میں لاہور آیا تو اسے خبر ملی کہ اس کے اپنے بھائی شاہ محمود نے قندھار میں اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اسے یک دم واپس جانا پڑا۔

رنجیت سنگھ کی منظم غارت گری

واپسی پر شاہ زمان اس قدر جلدی میں تھا کہ سیلاب کی وجہ سے وہ اپنی کچھ توپیں دریائے جہلم کے کنارے چھوڑ گیا۔ گوجرانوالہ کی ایک سکھ مسل ''سکر چک'' کے جتھ دار رنجیت سنگھ نے بارہ میں سے آٹھ توپیں نکلوا کر کابل بھجوا دیں۔ شاہ زمان نے اس خدمت پر خوش ہو کر اسے لاہور پر حکومت کرنے کا اجازت نامہ بھیج دیا۔ رنجیت سنگھ نے پہلے مختلف سکھ جتھہ داروں کو مغلوب کیا جو ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے۔ ان سب کو مغلوب کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ ان دنوں لاہور پر تین سکھ سرداروں کی حکومت تھی۔ لاہور شہر تین حصوں میں منقسم تھا اور لاہور کے مسلمان ان تینوں کے مظالم سے سخت پریشان تھے۔ جب یہ حالات قصور کے مسلمان حاکم کو معلوم ہوئے تو اس نے لاہور میں فوج کشی کرنے اور ان سکھ سرداروں کی گوشمالی کرنے کا ارادہ کیا، مگر اسی اثناء میں لاہور کے چند سرکردہ لوگوں نے جن میں مہر محکم الدین اور میاں عاشق محمد جیسے مسلمان پیش پیش تھے۔ نواب قصور کی بجائے رنجیت سنگھ کی ماتحتی کو ترجیح دی اور اسے لاہور آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ گوجرانوالہ سے لشکر لے کر آ پہنچا اور نواں کوٹ کے مسلمان رئیس مہر محکم الدین کی امداد سے 6 جولائی 1799ء کو لاہور میں داخل ہو گیا۔

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور اس نے قصور، اکال گڑھ، گجرات، امرتسر، جھنگ، اوچ شریف، سیالکوٹ، شیخوپورہ، ہریانہ، خوشاب، ساہیوال، جموں، کانگڑہ، وزیر آباد، اٹک، ملتان، پشاور، کشمیر اور ہزارہ تک کے دور دراز علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

ان علاقوں میں رنجیت سنگھ کی سکھ فوج نے مسلمانوں پر جو مظالم توڑے، تاریخ کے صفحات ان کی لرزہ خیز تفاصیل سے بھرے پڑے ہیں۔ جو علاقے مکمل طور پر رنجیت سنگھ کے قبضے میں نہیں آتے تھے ان سے نذرانے وصول کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ نذرانے نہایت ظلم اور تشدد سے وصول کیے جاتے تھے۔ رنجیت سنگھ اگرچہ سکھ تھا لیکن اس کا رجحان ہندومت کی طرف تھا۔ وہ ہندوؤں کے متبرک مقامات پر حاضری دیتا اور نذریں پیش کرتا۔ جب رنجیت سنگھ کشمیر کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا تو پہلے دسہرہ کے موقع پر جوالا جی (ضلع کانگڑہ) کے مندر میں حاضری دی اور نیاز گزاری۔ ہندومت سے رنجیت سنگھ کی اس عقیدت نے اسے سکھوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا بھی ہیرو بنا دیا اور آج تک ہندو اس کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت میں گئوکشی کو ممنوع اور قانوناً جرم قرار دے دیا۔ اذان بند کر دی گئی۔ مساجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسجدوں میں سؤر ذبح کیے جانے لگے۔ قرآن حکیم کی بے حرمتی کو عام رواج بنا لیا گیا۔ رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھ جتھہ داروں کے گماشتے معمولی معمولی باتوں پر مسلمانوں کو گرفتار کرتے۔ ان پر مقدمے چلاتے۔ ان کے گھر بار ضبط کرتے اور انہیں شہر سے نکال دیتے۔ ہزاروں مسلمان عورتیں کو سکھوں نے جبراً اپنے گھروں میں ڈال لیا۔ مسلمانوں سے بیگار لینا سکھوں کا معمول بن گیا،

مسلمانوں کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہوگئی۔

شاہ اسماعیلؒ کی رپورٹ

سیّد احمد اوران کے رفقاء کو جب پنجاب، سرحد اور کشمیر کے مسلمانوں پر سکھوں کے انسانیت سوز مظالم کی خبریں ملیں تو شاہ اسماعیل بچشم خود ان واقعات کی تصدیق کرنے کے لیے سپاہیانہ بھیس میں پنجاب آئے اور یہاں نہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ دہلی جا کر اپنے مرشد سیّد احمد کی خدمت میں بیان کیا۔

شاہ اسماعیل کے مطابق مسلمانوں کی دس فی صد مسجدیں سکھوں کے قبضے میں تھیں اور ان مسجدوں میں گھوڑے بندھتے تھے یا سکھوں کے دفتر تھے۔ حکم دے دیا گیا تھا کہ کوئی شخص اذان بلند آواز سے نہ کہے بلکہ ایسی خاموشی سے کہے کہ اس کا دوسرا باز وبمشکل سن سکے۔ بقرعید کی قربانی کے قوانین بھی بہت سخت تھے۔ بعض اضلاع میں جاہل سکھ مسلمانوں کو بکرا ذبح کرتے وقت مجبور کرتے تھے کہ بجائے اللہ اکبر کے ''واہ گرو'' کہو اور انہیں اپنی جان کے خوف سے کہنا پڑتا تھا۔ حکومت میں چھوٹے بڑے عہدے ملنا تو درکنار، غضب یہ تھا کہ کوئی مسلمان مسجد کے اندر کھول کر نماز نہ پڑھ سکتا تھا اور اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا تو اسے کوئی بھی سکھ کسی قسم کا مزا چکھانے کا حق رکھتا تھا۔ اسلام کی دینی اور متبرک کتابیں نذرِ آتش کر دینا ایک معمولی بات تھی۔ مسلمانوں کے بعض خاندان سکھ گردی سے تنگ آ کر ہندوستان کے انگریزی مقبوضات میں چلے گئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے خاص محل میں کئی مسلمان عورتیں تھیں۔ بعض مسمانوں نے بیان کیا کہ ''ہماری عزت کتے سے بھی بدتر ہے۔ ہمارے مذہبی ارکان وعبادات میں کھلم کھلا دست اندازی کی جاتی ہے اور ہمارے مقبروں اور مسجدوں میں سکھ ''ناجائز'' افعال اور بداعمالیاں کرتے ہیں۔ ہماری مسجدوں کو سکھوں نے زناکاری اور شراب نوشی کے اڈے بنالئے ہیں۔ یہاں شب وروز اپنے مویشی باندھے رکھتے ہیں۔ سرعام اسلام اور پیغمبر اسلام کو توہین آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ عام طور پر مسلمانوں کو ''موسلا'' کہتے ہیں۔ مسلمانوں کی صورت دیکھتے ہی ایک غلیظ فقرہ ضرور کہہ دیا جاتا ہے۔ ''سور دا بچہ'' (سؤر کا بچہ)

شاہ اسماعیل نے اپنی رپورٹ میں مزید لکھا:

''مسجد میں نمازیوں پر غلاظت پھینکی جاتی ہے۔ بہت سی مسجدیں ویران، غیر آباد اور ٹوٹی ہوئی ہیں۔ ان میں سؤر اور کتے بندھے ہوئے ہیں۔ ہر سکھ کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ اگر اسے دوسری جگہ سونے کو نہ ملے تو وہ جس مسجد میں چاہے چلا آوے۔ مُلّا کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دے۔ اور آپ وہاں شب باشی کرے۔ وہاں سؤر کا گوشت کھانے اور شراب چڑھانے کی آزادی ہے۔ وہ مسجد میں پیشاب پاخانہ کرسکتا ہے۔ قرآن کی بے حرمتی کرنے اور جلا ڈالنے کے واقعات عام ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جہاں ہر شہر میں آٹھ دس قرآن روزانہ نہ جلائے جاتے ہوں۔''

ایک غیور مسلمان نے شاہ اسماعیل سے اپنے علاقے کے مسلمانوں کی بربادی اور سکھوں کی سفاکی داستان بیان کرتے ہوئے، بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا ''ہمیں اس کی کچھ پروانہیں کہ ہمارے نابالغ بچوں اور بیمار مردوں اور عورتوں کو سکھوں نے کس بے رحمی سے قتل کیا اور زندہ آگ میں جلا دیا، بلکہ اگر خیال ہے تو یہ کہ انہوں نے ہمارے مقبروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ہماری مسجدوں میں سؤر ذبح کئے اور جو کچھ ان سے ہوسکا، دین اسلام کی توہین

کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ اور اب تک وہ اسی سرگرمی سے اسلام اور مسلمانوں کی توہین کئے جاتے ہیں۔ سکھ بے محابا ہر مسلمان کے مکان پر چلے جاتے ہیں۔ انہیں اختیار ہے، جو چاہیں اٹھالیں۔ اگر کھانا پکتا ہو تو اس پر سؤر کی ہڈی ڈال کر ناپاک کر لیں۔''

شاہ اسماعیل لکھتے ہیں ''سکھوں کا دستور ہے کہ ہولے کر کے کھاتے ہیں۔ دہلی میں ہولے سوکھے بوٹوں (چنوں) کو گھ س پھوس کی آگ میں مع شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں، مگر سکھوں میں انہیں ہولے نہیں کہتے۔ وہ ایک بڑے فولادی پنجرے میں چیل، کوے، کبوتر، تیتر، مینائیں، طوطے، غرض مختلف قسم کے جانور بند کر کے پنجرے کو کسی درخت پر لٹکا دیتے ہیں اور پھڑ پھڑا کے، بھن کر کوئلہ ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں صاف کر کے بےنا خدا ترس کھاتے ہیں۔ اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے ہولے کئے جاتے ہیں اور یوں تڑپا کے انہیں مارا جاتا ہے۔''

سیّد احمد کو ایسی ظالم و سفاک قوم ہی سے نہ نمٹنا تھا، ان کے ساتھ ایک دوسری قوم بھی تھی جو سات سمندر پار سے پاک و ہند میں براجمان ہو گئی تھی۔ سیّد صاحب کی نگاہ دوربین اس نئی قوم پر بھی تھی۔ یہ تھی انگریزوں کی قوم جو اس وقت کے سیاسی ماحول پر پوری طاقت سے پھیل رہی تھی اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم کو روکنا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا سکھوں کے مظالم کو۔ فیصلہ سیّد صاحب کو کرنا تھا۔

سیّد احمد شہیدؒ کے زمانے میں

مغربی سامراج کا تسلط

سیّد احمد شہید کے زمانے میں سلطنت مغلیہ کے دارالحکومت دہلی کے مغرب میں پورا پنجاب اور پشاور تک، سکھ گردی کا راج تھا۔ دہلی کے باقی اطراف میں مغربی سامراج کا ہزار پایہ عفریت اپنے پنجے گاڑ رہا تھا۔ جن لوگوں نے تاریخ پاک و ہند کا مطالعہ کر رکھا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ مغربی سامراج نے اس خطے میں کیونکر پاؤں پھیلائے۔ یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ چار صدیوں کی سامراجی توسیعات کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

پندرہویں صدی کی آخری چوتھائی اور سولہویں صدی کا بیشتر حصہ تاریخ انسانی میں ایجادات اور دریافتوں کا زمانہ کہلاتا ہے۔ 1492ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ 1498ء میں واسکوڈے گاما نے راس اُمید کے گرد چکّر لگایا جس سے ہندوستان اور انڈونیشیا تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ ایشیا کے بحری راستوں کی دریافت سے تجارت کے علاوہ بعض ملکوں کے اندرونی سیاسی حالات پر بھی بڑا اثر پڑا۔ خاص طور پر ہندوستان تو اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ مغل بادشاہ اگرچہ بڑے بہادر سپاہی اور آزمودہ کار جرنیل تھے، لیکن وہ جہاز ران نہیں تھے، بلکہ انہیں کبھی اس بات کا خیال ہی نہ آیا تھا کہ ساحل کی حفاظت کا بندوبست کرنا بڑا ضروری ہے۔ ساتویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی یعنی یورپی جہاز رانوں کے آنے تک بحر ہند میں عرب جہاز رانوں کا سکّہ چلتا رہا تھا۔ اور وینس اور جنیوا کے تاجر عربوں ہی سے ہندوستان کا مالِ تجارت خریدتے تھے۔

پرتگیز:

یورپ کے جہاز رانوں میں سب سے پہلے پرتگیزی ہندوستان کے مغربی ساحل پر آئے۔ الفانسوالبوکرک 1503ء میں ہندوستان کے ساحل پر اترا اور پرتگال کے بادشاہ کی امداد سے پانچ سال کی مدت میں پرتگیزوں نے اپنی طاقت اتنی بڑھالی کہ ہندوستان کے سب چھوٹے بڑے فرماں روا ان سے چھوٹے نظر آنے لگے۔

ولندیز:

پرتگیزوں نے ہندوستان کی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ ان کی دیکھا دیکھی یورپ کی دوسری قوموں نے بھی اس طرف توجہ کی۔ 1602ء میں (اکبر بادشاہ کے عہد میں) ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی۔ انڈونیشیا، ملائیشیا اور سری لنکا سے انہوں نے پرتگیزوں کو بے دخل کر دیا۔ اب ولندیزیوں نے تجارت کے خیال سے ہندوستان کی طرف توجہ کی اور گجرات، بنگال، بہار اور اڑیسہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں اور کارخانے قائم کر لیے۔ اکبر نے اپنے ''دین الٰہی'' کی خاطر مغربیوں کی بہت قدر کی۔ اپنی مذہبی بحثوں میں شرکت کے لیے پادریوں کو بھی دعوت دی اور اندرونِ ملک عیسائیت کی تبلیغ کی بھی اجازت دی۔

انگریز:

برطانیہ میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آئی۔ 1608ء میں اس کمپنی کے جہازوں نے پہلی مرتبہ ہندوستان کا رخ کیا۔ 1612ء میں دو برطانوی جہازوں نے پرتگیزوں کو شکست دے کر بمبئی کے قریب سورت پر قبضہ کر لیا اور کچھ عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے احمد آباد، برہان پور، اجمیر اور آگرہ میں اپنی کوٹھیاں قائم کر لیں۔ برطانیہ کے سفیر سر طامس رو نے شہنشاہ جہانگیر سے اپنی قوم کے لیے خاص تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ 1640ء میں کمپنی نے مدراس کے شہر اور بندرگاہ کی بنیاد ڈالی۔ 1661ء میں بمبئی کی بندرگاہ پرتگال کے بادشاہ نے شاہ انگلستان کو اپنی بیٹی کے جہیز میں دے دی اور بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دی۔

فرانسیسی:

سب سے آخر میں فرانسیسی میدان میں آئے۔ 1664ء میں وزیر خزانہ کے ایما سے شاہ فرانس نے ''فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی داغ بیل ڈالی۔ 1668ء میں اس کمپنی نے سورت میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کر لی۔ 1669ء میں انہوں نے مسولی پٹم میں ایک کارخانہ کھولا۔ 1674ء میں بنگال کے حاکم شائستہ خان کی فیاضی سے انہیں بنگال کے ساحل پر کچھ زمین ہاتھ آ گئی، جہاں 1690ء میں چندر نگر کی بستی آباد ہوئی اور تجارتی کوٹھی قائم کی گئی۔ 1697ء میں انہوں نے پانڈی چری پر قبضہ کر لیا۔

جنگ پلاسی 1757ء

اب چاروں مغربی کمپنیوں میں زیادہ سے زیادہ تجارت اور سیاسی اقتدار کے لیے باہمی کشمکش ہوئی۔ مغلیہ سلطنت کی مرکزی حکومت تو پہلے ہی روبہ زوال تھی۔ چھوٹی موٹی ریاستوں کے حکمرانوں، راجاؤں اور نوابوں نے

اپنے اپنے مفادکی خاطر کسی نہ کسی مغربی طاقت کا ساتھ دیا۔ انگریز زیادہ شاطر تھے اور زیادہ بڑے سرمایہ دار تھے، اس لیے انہوں نے اپنے یورپی حریفوں کو کچھ تو جوڑ توڑ اور کچھ اپنی قوت بازو سے مقابلے سے باہر کر دیا، اور اب ان میں سے کوئی حریف میدان میں نہ رہا تو جو علاقے قبضے میں آ چکے تھے، وہاں اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کا خیال آیا۔ بنگال میں انہیں بہت سے حقوق حاصل تھے اور انہوں نے کئی تجارتی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں۔ اس لیے سب سے پہلے اسی علاقے پر قبضہ جمانے کی فکر ہوئی۔ اس صوبے کا حاکم علی وردی خان 1740ء میں قریب قریب بالکل خود مختار ہو چکا تھا۔ اس نے 1756ء میں وفات پائی اور اس کا نواسا سراج الدولہ اس کی جگہ بنگال کا نواب ہوا۔ اس نے انگریزوں کو بنگال میں مزید قلعے بنانے اور مورچہ بندیاں کرنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا اور جب انگریزوں نے اس کے احکام کی تعمیل سے انکار کیا تو سراج الدولہ نے پہلے قاسم بازار کے برطانوی کارخانے پر قبضہ کیا، پھر کلکتہ پر چڑھ دوڑا اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

جب انگریزوں کے سپہ سالار کلائیو نے دیکھا کہ نواب کو اپنی طاقت وقوت سے مرعوب کرنا یا میدانِ جنگ میں اس پر فتح پانا مشکل ہے تو اس نے سیاسی چالوں سے کام نکالنا چاہا۔ نواب کا سپہ سالار جعفر بنگال کے بڑے بااثر سرداروں میں سے تھا۔ وہ سراج الدولہ کا قرابت دار بھی تھا، کیونکہ علی وردی خان کی بہن اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ کلائیو نے اس سے مل کر سراج الدولہ کے خلاف سازش کی۔ نواب کی فوج پلاسی کے میدان میں خندقیں کھودے پڑی تھی۔ یہیں 22 جون 1757ء کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا پڑا۔ میر جعفر بھی اپنی فوج لیے موجود تھا، لیکن اس نے نواب کا ساتھ نہ دیا بلکہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ نتیجہ یہ کہ سراج الدولہ شکست کھا کر بھاگا، لیکن پکڑا گیا۔ میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر ڈالا۔ اب انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کی گدی پر بٹھایا اور اس کے صلے میں نئے نواب کی طرف سے ایک بہت بڑی رقم ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیش کی گئی۔ جنگ پلاسی کی وجہ سے انگریزوں کو بنگال میں بڑا عروج نصیب ہوا۔ اس جنگ نے انگریزوں کے لیے ہندوستان کے دروازے کھول دیئے۔

انگریزوں نے مالِ تجارت کے علاوہ ایک انوکھی قسم کی تجارت شروع کی۔ یہ تجارت نوابوں، ان کی گدیوں اور تختوں کی تھی۔ کمپنی نے ایک نواب کو اتارا، دوسرے کو بٹھایا اور اس طرح سے خوب روپیہ کمایا۔ جب کمپنی نے محمد علی کو کرناٹک میں اور میر جعفر کو بنگال میں تخت دلایا تو اس سے زبردست آمدنی ہوئی۔ اس کے بعد کمپنی کو اس سے سود مند دھندا اور کوئی نظر نہ آیا اور اسے اس کی لت پڑ گئی۔ وہ سال ہا سال اس کاروبار میں مصروف رہی۔ پہلے میر جعفر کو تخت پر بٹھانے کے لیے رقم وصول کی گئی۔ پھر اس کو ہٹا کر میر قاسم کو تخت پر بٹھایا گیا تو اس سے مزید روپیہ حاصل ہوا، اور پھر میر قاسم کو دھتا بتا کر دوبارہ جعفر سے سودا طے کر لیا۔ اس کے بعد نجم الدولہ سے کاروبار کیا۔ غرضیکہ اس اتھل پتھل سے کمپنی نے تقریباً پانچ کروڑ روپیہ کمایا۔ اس کی تفصیل خاصی دلچسپ ہے:

☆ 1757ء میں میر جعفر کی تخت نشینی پر

(3 کروڑ 6 لاکھ 10 ہزار 500 روپے)

☆ 1760ء میں میر قاسم کی تخت نشینی پر

(26لاکھ 27ہزار 690روپے)

☆1762ء میں میر جعفر کی دوبارہ تخت نشینی پر

(ایک کروڑ 41لاکھ 84ہزار 990روپے)

☆1765ء میں نجم الدولہ کی تخت نشینی پر

(19لاکھ 76ہزار 900روپے)

کل میزان: 4 کروڑ 94لاکھ 330روپے

(اس قسم کے طریقوں سے 1771ء تک، جو رقم کمپنی اور اس کے ملازمین کے پاس پہنچی، اس کا میزان ساڑھے 29 کروڑ روپے ہوتا ہے۔ اس میں فوجی اخراجات، تاوان، نذرانے شامل نہیں ہیں)

بکسر کا معرکہ

میر جعفر کو ہٹا کر انگریزوں نے اس کی جگہ اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا نواب مقرر کیا۔ اس نے بردوان، مدنا پور اور چٹا گانگ کے ضلعے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔ لیکن تھوڑے دنوں ہی میں اسے بنگال کے انتظامی معاملات میں انگریزوں کا دخل ناگوار معلوم ہونے لگا۔ کمپنی کو جو تجارتی مراعات حاصل تھیں، میر قاسم نے وہ منسوخ کر دیں۔ اس پر انگریز بھڑک اٹھے اور فوج لے کر اس پر حملہ کر دیا۔ میر قاسم نے شکست کھائی اور بھاگ کر اودھ چلا گیا۔ انگریزوں نے میر جعفر کو دوبارہ بنگال کا حاکم مقرر کر دیا۔ اب نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ نے میر قاسم کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ ان دنوں شاہ عالم ثانی بھی شجاع الدولہ کے ہاں موجود تھا۔ اس نے بھی میر قاسم کے سر پر دست شفقت رکھا۔ نواب نے بادشاہ کو ساتھ لے کر انگریزوں پر چڑھائی کی، لیکن 1764ء میں بکسر کے مقام پر شکست کھائی۔ پلاسی کی لڑائی میں جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی، وہ بکسر کے معرکے نے پوری کر دی۔ یعنی بنگال اور بہار میں مکمل طور پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ شاہ عالم ثانی انگریزوں کی پناہ میں آ گیا۔ میر قاسم نے شمال مغرب کا رخ کیا اور بالآخر گمنامی کی حالت میں وفات پائی۔ نواب اودھ نے بڑا اقتدار حاصل کر لیا تھا، لیکن بکسر کے معرکے نے اس کا زور بھی توڑ دیا۔

دیوانی کی سند

شاہ عالم ثانی انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ کلائیو نے موقع پا کر اس سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند حاصل کر لی یعنی بادشاہ نے 26لاکھ سالانہ کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی کو ان علاقوں سے مال گزاری وصول کرنے کا حق عطا کر دیا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ سند کیا ہاتھ آئی، کمپنی نے ملک گیری کے راستے کا پہلا بڑا مرحلہ طے کر لیا اور اسے ایک آئینی حیثیت حاصل ہو گئی۔ گویا بنگال، بہار اور اڑیسہ میں دو حکومتیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ایک تو بادشاہ کی حکومت تھی جو نظم و نسق کی ذمہ دار تھی، دوسری کمپنی کی جو مال گزاری وصول کرتی تھی۔

دفاع کی ذمہ داری

اگلے سال 1765ء میں کلائیو نے ایک اور قدم بڑھایا۔ یعنی نواب بنگال سے بات چیت کر کے اس علاقے کے دفاع کا انتظام بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور جگہ جگہ کمپنی کی فوج مقرر کر دی گئی۔ کمپنی کو دیوانی کی سند پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی، دفاع کا انتظام ہاتھ آنے سے اس سرزمین میں انگریزوں کے اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ انگریزوں اور نواب شجاع الدولہ کے مابین بھی ایسی قسم کا دفاعی معاہدہ ہوا جس کی رو سے کڑا، الٰہ آباد، چنار، بنارس اور غازی پور پر شجاع الدولہ کی حکومت تسلیم کر لی گئی۔ اس کے عوض شجاع الدولہ نے پندرہ لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کیا۔ کمپنی نے اودھ کی حدود سلطنت کا دفاع اپنے ذمے لے لیا۔ دفاعی اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ نواب اودھ نے لیا۔

اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولزلے نے یہاں کے حکمرانوں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے رسوائے زمانہ معاہدے ''سب سڈی ایری سسٹم'' میں ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو جکڑ لیا۔ یہ حکمران انگریزوں سے مشورہ کیے بغیر نہ کسی سے صلح کر سکتے تھے نہ جنگ۔ کسی مغربی ملک کا کوئی باشندہ اپنی فوج یا دربار میں ملازم نہ رکھتے تھے۔ ہر حکمران کو ریاست کی حفاظت کے لیے انگریزی فوج رکھنی پڑتی تھی، جس کے اخراجات کے لیے انہیں اپنی ریاست کا ایک علاقہ انگریزوں کو دینا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ریاستوں کے حکمرانوں کی آزادی ختم ہوگئی اور وہ انگریزوں کے دست نگر بن گئے۔

گویا پاک و ہند کے حکمرانوں کی خود غرضی اور نالائقی کی بدولت سیّد احمد شہید کے زمانے تک آتے آتے بنگال، بہار، اڑیسہ، یوپی، مدراس، حیدر آباد اور ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقے انگریزوں کے زیرِ اقتدار آ چکے تھے۔ شمال مغربی حصے میں سکھوں کی اور سیّد احمد کے وقت میں راجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ گویا ظاہر ہے کہ سیّد احمد کے دائیں ہاتھ انگریزوں کی طاقت تھی اور بائیں ہاتھ سکھوں کی طاقت۔ انہیں فیصلہ یہ کرنا تھا کہ پہلے کس سے پنجہ آزمائی کی جائے!

انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحریکیں

یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اہل ہند، بالخصوص مسلمانانِ ہند نے کھلے دل سے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی ہو اور برطانوی استعمار کے خلاف مزاحمتی تحریکیں اور بغاوتیں نہ کی ہوں۔ چھوٹی موٹی مضطربانہ اور باغیانہ تحریکیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ بعض بڑی تحریکیں ایسی ہیں جن کو مؤرخین نے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا ہے، مثلاً حافظ رحمت خان روہیلہ کی تحریک اگر کامیاب ہو جاتی تو بہت ممکن تھا کہ یہ حکومت سلطنت مغلیہ کی جگہ لے لیتی۔ 17 اپریل 1774ء کو اس نے بڑی شجاعت کے ساتھ انگریزوں اور (غدار) نواب اودھ کی متحدہ فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہادت پائی۔ ٹھیک پچیس سال کے بعد ٹیپو سلطان کی عظیم الشان مزاحمتی تحریک اور اس کے نقطۂ عروج پر سلطان کی شہادت (4 مئی 1799ء) اور جنوبی ہند پر انگریزوں کا قبضہ مسلم ہندوستان کے لیے ایک سانحہ عظیم تھا۔ اس دور میں صرف وہی ایک ایسا شخص تھا جس میں یہ قابلیت تھی کہ انگریزوں پر غلبہ حاصل کر کے، مسلمانوں کو پھر

عظمت واقتدار کے مقام پر استحکام کے ساتھ قائم کر دیتا۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے حافظ رحمت خان کی طرح اس کا بھی ساتھ نہ دیا۔

اب دیکھنا ہے کہ ہمارے ہیرو سیّد احمد کیا فیصلہ کرتے ہیں! وہ بیک وقت انگریزوں اور سکھوں پر جہادی تحریک لائیں گے یا پہلے انگریزوں پر اور پھر سکھوں پر یا پہلے سکھوں پر اور پھر انگریزوں پر؟ ان کا فیصلہ آنے تک ہم ذرا بنگال تک ہو آئیں جہاں ان کے ایک اہم عصر اور ہم خیال حاجی شریعت اللہ نے ''فرائضی تحریک'' شروع کر رکھی ہے۔ یہ ایک اصلاحی تحریک ہے جس کے پردے میں انگریزوں کے خلاف مزاحمتی تحریک کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

بنگال میں فرائضی تحریک

بجا طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے قصے میں یہ اچانک ہم بنگال کی طرف کیوں چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیّد صاحب کی تحریک جہاد کا بنگالی مسلمانوں سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کا تھوڑا بہت بیان ''تحریک جہاد'' کے مؤرخین نے داستان کے اختتام پر، سرسری انداز میں کیا ہے۔ تحریک جہاد کی ایک ہم عصر اصلاحی، اسلامی تحریک بنگال میں جاری تھی جس کے روح رواں حاجی شریعت اللہ تھے۔ حاجی صاحب سیّد احمد سے چھ سال بڑے تھے۔ حاجی صاحب جنگ پلاسی کے 23 سال بعد 1780ء میں اور سیّد صاحب 1786ء میں پیدا ہوئے۔ تحریک جہاد کے مؤرخین مولانا غلام رسول مہر اور مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اور دوسروں نے سیّد احمد اور ان کے رفقاء کار کے کارنامے بڑے ذوق وشوق اور بڑی تحقیق وکاوش سے مرتب کئے ہیں، لیکن ان کی توجہ زیادہ تر تحریک جہاد پر رہی ہے، لیکن جیسا کہ شیخ محمد اکرام صاحب نے ''موج کوثر'' میں اپنا خیال ظاہر کیا ''سید صاحب اور ان کے جانشینوں کا سب سے اہم اور نتیجہ خیز کام بنگال میں احیائے اسلام اور اس وسیع مملکت کا برصغیر کے اصل اسلامی مرکزوں سے دوبارہ رشتہ جوڑنا تھا''۔ شیخ صاحب کی بات آگے بڑھاتے ہوئے ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ حاجی صاحب کی فرائضی تحریک نے نہ صرف یہ کہ سیّد صاحب کی تحریک جہاد کے لیے زمین ہموار کی تھی، بلکہ ہزارہا بنگالی مجاہدین بھی فراہم کئے تھے جو صوبہ سرحد میں جا کر رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔''

حاجی شریعت اللہ

حاجی صاحب اس قدر خود فراموش تھے کہ ان کی زندگی کے متعلق معلومات انتہائی کم اور محدود ہیں۔ وہ ضلع فرید پور کے ایک گاؤں بندر کھولہ میں غیر معروف والدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ 18 سال کی عمر میں حج کو روانہ ہوئے۔ سنجیدہ ذہن کے آدمی تھے، اس لیے انہوں نے مکہ معظمہ پہنچ جانے کا فائدہ اس طرح اٹھایا کہ اپنے آپ کو دینی تعلیمات حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے سفر حج پر جانے سے پہلے بنگال کے کسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے روانہ ہوئے ہوں تو ان کے ذہن میں دو مقاصد ہوں: فریضۂ حج ادا کرنا اور زیادہ اعلیٰ سطح کی تعلیم حاصل کرنا۔ یہ سب قیاس آرائی ہے۔ پوری طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ بنگال سے غیر

حاضری کے بیس طویل سال انہوں نے کیسے گزارے۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب وہ مکہ میں تھے تو مشہور عالم شیخ طاہر السنبل المکی کے قدموں میں بیٹھے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ جب وہ مکہ سے واپس اپنے گاؤں آرہے تھے تو ان کو راستے میں ڈاکوؤں نے آن گھیرا۔ ان کا تمام مال اسباب اور کتابیں چھین لیں۔ حاجی شریعت اللہ نے جب پوری زندگی کا اثاثہ لٹتے دیکھا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خود بھی ڈاکوؤں کے اس گروہ میں شامل ہو جائیں گے اور پھر ڈاکوؤں کے اس گروہ میں نہ صرف شامل ہوئے، بلکہ انہوں نے کئی ایک ڈکیتیوں میں شرکت بھی کی۔ لیکن اس دوران میں انہوں نے اپنی سادگی، پاکیزگی، نماز، روزے کی پابندی اور سچائی و جرأت کے اوصاف سے ان ڈاکوؤں کو شدید طور پر متاثر کیا۔ یہاں تک کہ ڈاکوؤں نے نہ صرف اپنے اس پیشے سے توبہ کر لی، بلکہ وہ سب سے پہلے حاجی صاحب کی تعلیمات کے فروغ پر کمربستہ ہوئے۔ وہ حاجی صاحب کی اصلاحی تحریک کے اولین کارکن ثابت ہوئے۔

اس کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ اس وقت تک وہ ایک عالم، متقی، زاہد اور مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ عربی پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنے گاؤں ہی کے لوگوں کو درس دینا شروع کیا۔ اس وقت بنگال کے دیہات اور شہروں میں جو فضا تھی، اس میں ہندوانہ رسوم کا بہت گہرا اثر تھا۔ اسلامی عقائد اور ہندوانہ عقائد اتنے خلط ملط ہو چکے تھے کہ ان میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ حاجی صاحب نے سب سے پہلے مسلمانوں کو "صحیح مسلمان" بننے کی تلقین کی۔ ان کا اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا سب سے مقدم ٹھہرایا اور بتایا کہ ان کی تباہی و بربادی کی سب سے بڑی وجہ اسلام سے روگردانی ہے۔

بنگالی مسلمانوں کی حالت پہلے ہی بہت زیادہ ابتر تھی، لیکن جب زمیندار نے جو کہ ہندو تھا، ہندو تہواروں کے لیے ٹیکس عائد کر دیے تو ان کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ ایسی صورت حال میں جب مسلمان کاشت کار کو یہ کہا گیا کہ وہ ہندوانہ رسم و رواج ترک کر دے اور اللہ واحد کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے، تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے، نماز روزے کی پابندی کرے تو ظاہر ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ مسلمانوں میں ظلم کے خلاف لڑنے کی خواہش، جرأت، بہادری، دلیری اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ وہ تو تقریباً ایک صدی سے کسی ایسے پیغام کے منتظر تھے۔

دو اسلام

شروع میں حاجی شریعت اللہ نے خاموشی سے اپنے گاؤں اور اس کے ملحقہ علاقوں میں اپنی تعلیمات کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانہ میں انہیں مخالفت بھی برداشت کرنا پڑی۔ وہ اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات اور سماجی مساوات کے مبلغ تھے، لیکن دوسری طرف صدیوں کی روایات اور ہندوانہ رسم و رواج، جو لوگوں کی نس نس میں رچ گئے تھے، ان کو ترک کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، جب کہ یہ صرف رسم و رواج ہی نہ رہے تھے، بلکہ ان جاہل مسلمانوں کے نزدیک یہی اسلام تھا۔ اب جب حاجی صاحب نے اسلامی تعلیمات کا چرچا شروع کیا تو ظاہر ہے، دو اسلام بن گئے۔ ایک وہ اسلام جو صدیوں سے ہندوؤں کے میل جول اور ان سے غلط، گمراہ کن اور مہلک رسوم و عبادات سے آلودہ ہو چکا تھا۔ بنگالی مسلمانوں میں یہی اسلام مقبول تھا۔ یہی ان کی روح اور زندگی تھا۔ دوسرا اسلام وہ جو حقیقی تھا

اوران تمام آلائشوں سے پاک تھا۔ اب ایک نئی راہ، خواہ وہ کتنی ہی مفید، دنیا سدھار اور عاقبت سنوار کیوں نہ ہو، ان کے لیے آسانی سے قابل قبول نہیں تھی۔ دونوں رجحانات میں تصادم شروع ہوا۔ مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ پرانے اسلام کے نام لیوا، ہندو زمیندار اور انگریز حاجی شریعت اللہ کی تعلیمات کی مخالفت کرنے لگے۔ لیکن ان کی تعلیمات نے بھی ایک عوامی تحریک کی سی صورت اختیار کر لی اور ان کے پیروؤں اور معتقدین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

فرائضی تحریک

حاجی شریعت اللہ کی تحریک ''فرائضی تحریک'' کے نام سے موسوم ہوئی، کیونکہ اس تحریک کا سارا زور فرائض کی ادائیگی پر تھا۔ گناہوں اور پچھلی زندگی سے توبہ ان کی نئی زندگی کی بنیاد ٹھہری۔ اس تحریک کے نام لیواؤں کو بنگلہ زبان میں ''توبار'' کہا جانے لگا۔ توبار کا لفظ توبہ سے نکلا ہے۔ توبہ کرنے والے کو توبار کہا جاتا ہے۔ اس مذہبی تحریک کی مقبولیت کے بعد اس میں خود بخود سیاسی اور سماجی مقاصد بھی شامل ہو گئے۔ حاجی صاحب نے شاہ عبدالعزیز کے فتوے کی پیروی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہندوستان، چونکہ ''دارالحرب'' ہے، یہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی غیر ملکی انگریز حکومت قائم ہے جو یہاں کے لوگوں پر شدید مظالم کر رہی ہے، اس لیے ایسے ملک میں مسلمانوں کے لیے عیدین اور جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اس فریضے کے ترک کرنے سے مخالفت کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یقیناً حاجی صاحب کا مقصد ان دینی فرائض کے ترک کرنے سے مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا، کیونکہ جس ملک میں ایک مسلمان عید اور جمعہ کی نماز ادا نہ کر سکے، اس ملک میں رہنا عبث ہے۔ اس لیے یا تو وہ ہجرت کرے یا پھر دارالحرب کو دارالسلام بنانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دے۔

حاجی صاحب سے اختلاف کی وجوہ اور بھی تھیں۔ ان میں ان کا اور ان کے پیروؤں کا اسلامی اصولوں پر شدت سے اصرار بھی تھا۔ مثال کے طور پر حاجی صاحب محرم میں تعزیے نکالنے کو بدعت قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تعزیوں کا نکالنا ہی معیوب اور گناہ نہیں تھا، بلکہ ان کو دیکھنے والے بھی گناہ گار متصور ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیری مریدی کو سختی سے ممنوع ٹھہرایا اور کسی کو پیر پکارنا بھی معیوب قرار دے دیا گیا تھا۔ جس شخص سے تعلیم حاصل کی جاتی، اسے پیر کی بجائے استاد کے لقب سے یاد کیا جاتا۔ تعلیم حاصل کرنے والا مرید نہیں، بلکہ شاگرد کہلاتا۔

خود حاجی صاحب کے درس و تدریس کے حلقے میں امیر و غریب کی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کے مطابق مساوات، اخوت اور انسانی احترام پر زور دیا۔ اس سے کاشتکاروں اور نچلے طبقے کے محنت کش مسلمانوں میں جرأت پیدا ہوئی۔ اس سے زمینداروں اور رئیسوں کو شکایات پیدا ہونا لازم تھا۔ ٹیکسوں کی ادائیگی سے بھی گریز ہونے لگا۔ زمیندار کے گھر کے کام کاج کے لیے کسانوں کی بہو بیٹیاں جایا کرتی تھیں، یہ سلسلہ بھی اب بند ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی انگریز افسر بھی زمینداروں کی سی پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف زمینداروں اور انگریزوں کی مخالفت، دوسری طرف پرانے خیال کے مسلمانوں کی مزاحمت نے بنگالی مسلمانوں کو باقاعدہ دو گروہوں میں منقسم کر دیا۔ دنگے فساد ہونے لگے۔ نقصِ امن عامہ کے تحت ان کے پیروکاروں کو گرفتار کیا جانے لگا۔

جرمانے اور قید کی سزا دی جانے لگی۔ خود حاجی صاحب کے خلاف بھی کارروائی ہوئی۔ ان کی سرگرمیاں پولیس کی کڑی نگرانی کا محور بن گئیں۔ زبردست مخالفت کی وجہ سے حاجی صاحب نے ڈھاکہ کے گاؤں نیاباری سے سکونت ترک کردی اور اپنے آبائی گاؤں میں منتقل ہو گئے۔ یہاں ان کی فرائضی تحریک نے بہت تیزی سے ترقی کی۔

حاجی صاحب نے نہایت تدبر اور ہوشیاری سے کام لیا۔ ان کی فرائضی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف مؤرخوں نے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کی تحریک آزادی اور احیائے اسلام کے پہلے پیغامبر اور راہنما حاجی شریعت اللہ ہیں۔ کئی ایک حاجی صاحب کو صرف ایک مصلح دین سمجھتے ہیں، وہ بھی ایسا مصلح جس کا اثر ورسوخ صرف ایک خطے تک محدود رہا۔ یہ گروہ کسی قسم کی سیاسی اور سماجی رہنمائی کا سہرا ان کے سر باندھنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ گروہ بنگال میں احیائے اسلام کی اولین تحریک کی نیک نامی بھی سیّد احمد شہید ہی کو دیتا ہے۔

شیخ محمد اکرام (صاحب "موجِ کوثر") کی رائے یہ ہے کہ اس تحریک نے نہ صرف ہندووانہ رسوم کا خاتمہ کرکے بنگالی مسلمانوں کو ایک نیا وقار اور عزتِ نفس عطا کی، بلکہ ان کے گہرے روحانی تعلقات شمالی ہند کے مسلمانوں سے استوار کیے اور برصغیر کے تمام مسلمانوں میں ایک روحانی ہم آہنگی پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سیّد احمد صاحب کے جانشینوں نے سرحد پر جہاد جاری رکھا تو بنگالی مسلمان اس میں پیش پیش تھے، اور جب بیسویں صدی کے وسط میں پاکستان کا مطمحِ عمل قوم کے سامنے رکھا گیا تو ہزاروں میل کے بعد کے باوجود بنگال اور پنجاب کے مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حاجی شریعت اللہ کی اصلاحی تحریک نے مسلمانوں میں جو ولولہ اور جوش پیدا کیا اور پوری فضا میں جو گرمیٔ عمل پیدا ہوئی، اسی نے سیّد احمد شہید جیسے قائد کے لیے زمین ہموار کی جو بالآخر ایک نئے تاریخی دور پر منتج ہوئی، تو یہ بہت حد تک درست ہوگا۔ ان کی فرائضی تحریک ہی کا نتیجہ تھا کہ سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد کو امداد ملی، اور پورے پچاس برس تک بنگالی مسلمان کاشتکار اپنے ہل اور کھیت چھوڑ کر، سر سے کفن باندھے جہاد کی خاطر سرحد پار جاتے رہے۔

حاجی شریعت اللہ کی وفات 1840ء میں ہوئی۔ ان کی وفات پر ان کی چلائی ہوئی تحریک کی قیادت ان کے بیٹے حاجی محسن میاں نے سنبھالی۔ ان کو پیار سے "دودھو میاں" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دودھو میاں نے اپنے والد کی تحریک کو باقاعدہ تنظیم، فعال اور سرگرم سیاسی طاقت اور سماجی تبدیلیوں کی محرک بنایا۔

فرائضی تحریک کا نعرۂ حق

''زمین اللہ کی ہے''

دنیائے اسلام میں سے جس ملک میں، جب کبھی تجدید و احیائے دین کی تحریک چلی، اس میں اس ملک کے مسلمانوں کی سیاسی آزادی اور معاشی مفادات کے عوامل از خود شامل ہوتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ متعلقہ ملک کے مقامی حالات و کوائف کے تحت کبھی سیاسی آزادی کا رنگ غالب آ جاتا تھا، کبھی تحریک میں جذبۂ جہاد کا غلبہ ہو جانے سے وہ تحریک جہادی بن جاتی تھی اور کبھی معاشی حقوق و مفادات باقی عوامل پر ترجیح اختیار کر لیتے تھے۔ بنگالی مسلمانوں کی فرائضی تحریک میں بھی اپنے بانی حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد اصلاح کا رنگ کسی قدر پھیکا پڑ گیا اور ہندو زمینداروں اور انگریز افسروں کی سرمایہ دارانہ ملی بھگت کے خلاف معاشی مسائل کا رنگ زیادہ چڑھ گیا۔

حاجی شریعت اللہ کی وفات، سیّد احمد بریلوی کی شہادت 1831ء کے نو سال بعد 1840ء میں ہوئی۔ ان کی وفات پر فرائضی تحریک کی قیادت ان کے لڑکے، حاجی محسن میاں نے سنبھالی۔ ان کا شرعی نام میاں محسن تھا لیکن لوگ پیار سے انہیں ''دودھو میاں'' کہتے تھے۔ والد کی رحلت کے وقت ان کی عمر 21 برس تھی۔ شروع جوانی میں اتنی بڑی تحریک کی قیادت سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا، لیکن انہوں نے جس کمال اور خوبی سے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، اس نے انہیں اپنے عظیم والد سے زیادہ مقبول و عظیم بنایا۔ یہ ان ہی کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ جو تحریک صرف چند اضلاع میں محدود تھی اس نے پورے بنگال کو اپنے احاطۂ اثر میں لے لیا۔

فارسی کی جگہ انگریزی

جس وقت دودھو میاں نے تحریک کی قیادت سنبھالی اس وقت بنگال کی زرعی اور معاشی حالت زبردست بحران کا شکار تھی۔ سیاسی طور پر بھی یہی کیفیت تھی۔ حاجی شریعت اللہ نے جس وقت تحریک کا آغاز کیا تھا اس وقت ظلم و ستم کی داستانیں عام نہیں ہوئی تھیں اور انگریزی استعمار پوری طرح مستحکم بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن 1840ء میں تو بحران نے شدت اختیار کر لی تھی اور انسانی زندگی کو سیاسی اور معاشی دونوں پہلوؤں سے مضطرب و پریشان کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں فارسی زبان کو دفتری زبان کی حیثیت سے ''دیس نکالا'' ملا تھا۔ (یہ 1837ء کا واقعہ ہے) ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1806ء میں بادشاہ دہلی سے معاہدہ کیا تھا کہ دفتری اور عدالتی زبان فارسی ہی رہے گی مگر 1837ء میں اس معاہدے کو نظر انداز کر کے فارسی کی بجائے انگریزی کو عدالتی اور دفتری زبان بنا دیا گیا۔ اس تبدیلی سے مسلمانوں پر جو چوٹ پڑی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کے اس ایک فیصلے نے مسلمانانِ ہند کو یک دم قعرِ مذلت میں گرا دیا۔ بنگال میں زمینداری اور فوجی و سرکاری نوکریاں پہلے ہی مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکی تھیں اور غربت نے ان کے گھروں میں گھر کر لیا تھا۔ اس وقت پڑھے لکھے مسلمانوں پر یہ حملہ ناقابل

برداشت تھا۔ اس تبدیلی کے بارے میں مس میو اپنی مشہور کتاب ''مدر انڈیا'' میں لکھتی ہے:

''ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے ہم اب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ عدالتی زبان کی تبدیلی تھی۔ فارسی کی جگہ انگریزی رائج کر دی گئی۔ ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کے لیے یہ لازمی امر تھا۔ بظاہر یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتائج بھی معمولی نظر آتے تھے، لیکن مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاج کیا اور فی الواقع یہ ان کے لیے سخت تباہ کن تبدیلی تھی''۔

مسلمانوں کے خلاف یہ انگریزوں کا سیاسی اقدام تھا، لیکن اس کے معاشی نتائج یہ برآمد ہوئے کہ مسلمان دو وقت کی ''روٹی'' کے محتاج ہو گئے۔ فارسی ان کی صرف دنیاوی ہی نہیں، بلکہ عربی کے ساتھ ساتھ ایک حد تک دینی زبان بھی بن چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ فارسی سے اس بدسلوکی نے معاش کے ساتھ ساتھ ایک جذباتی مسئلہ بھی پیدا کر دیا۔

سیاسی، معاشی اور جذباتی اضطراب کی یہ فضا دودھو میاں کو میسر آئی تھی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ زرعی بحران جو انیسویں صدی سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا، وہ کہیں زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ مسلمان کاشتکار اس زرعی بحران کے باعث بالکل تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ ان کی زندگی میں مایوسی اور ناامیدی نے گھر کر لیا تھا۔ ایسے عالم میں فرائضی تحریک نے انہیں جھنجھوڑا اور ان کی زندگی میں نئی امید اور نئی امنگ پیدا ہو گئی۔

ایک ایک چٹکی چاول

دودھو میاں نے ایسی صورت حال میں نہایت ہوشیاری اور ذہانت سے فائدہ اٹھایا اور تحریک کو اس انداز سے منظم کیا کہ اس نے پورے مسلم بنگال کو ہلا ڈالا۔ عام طور پر مؤرخ اور اس دور کے انگریز حاکم تسلیم کرتے ہیں کہ دودھو میاں بذاتِ خود کوئی زیادہ پائے کے مذہبی عالم نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے تحریک کو جن بنیادوں پر استوار کیا، اس سے ان کے مذہبی شغف سے زیادہ سیاسی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تحریک بنیادی طور پر مفلوک الحال کاشتکاروں کی تحریک تھی۔ دودھو میاں نے غالباً شعوری طور پر کاشت کاروں کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے روز مرہ کے عام حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کا اعلان کیا۔ لیکن زمینداروں کی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرنے سے پہلے انہوں نے فرائضی تحریک کو باقاعدہ منظم اور پائیدار بنیادوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے والد کی تعلیمات سے قدرے انحراف کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ''پیر'' کہلانا شروع کیا۔ اس تحریک کے تمام ماننے والے دودھو میاں کے ''مرید'' کہلانے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ رہنما اور مریدوں میں ایک رشتہ قائم ہو جس میں مذہبی شیفتگی کا عنصر بھی شامل ہو جائے۔ دودھو میاں نے اپنی تحریک کو منظم کرنے کے لیے بعض اور بھی اہم اقدامات کیے۔ چنانچہ بنگال کے تمام علاقوں کو جہاں فرائضیوں کا اثر و رسوخ تھا، مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر حصے کی نگرانی کے لیے ایک ''خلیفہ'' مقرر کیا گیا۔ خلیفہ پیر کا نائب ہوتا تھا۔ اس کے ذمے اپنے حلقے کے مریدوں کے تمام مسائل کی نگرانی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے کیا گیا کہ مرکزی بیت المال کے لیے ہر مرید اپنی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ دے۔ اس طرح ہر خلیفہ وصولی کرتا اور پیر کے پاس پہنچاتا۔ پیر اس میں سے مقامی ضروریات کے لیے

کچھ حصہ اسے دے دیتا۔ یہ حصہ نقدی کی صورت میں نہیں، بلکہ جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا۔ ہر مرید اور مریدنی ایک ایک چٹکی چاول روزانہ ایک برتن میں ڈالتی جاتی اور جب پیر کے نائب خلیفہ کے آدمی آتے، یہ چاول ان کو پیش کر دیا جاتا۔ ہر روز ایک چٹکی چاول الگ کرنے سے مرید، پیر اور تحریک کے درمیان جذباتی رشتے اور تعلق کا اعادہ ہوتا رہتا۔

مقدمات کی بھرمار

مسلمان کاشتکاروں کی اس وحدت اور تنظیم نے جہاں ان میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کی، وہاں انگریز افسر اور ہندو زمیندار بھی زیادہ ظلم وستم اور صف آرائی پر اتر آئے۔ ہر گاؤں اور پرگنے میں فرائضیوں کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ یہ تحریک ایک آگ تھی جو ہر گاؤں میں سلگ رہی تھی۔ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک کسان تحریک بن گئی۔ اس تحریک کی مقبولیت کو روکنے کے لیے ایک طرف ہندو زمینداروں اور ان کے انگریز ساتھیوں نے پولیس کا سہارا لیا اور اس کے ذریعے تحریک کے رہنماؤں کے خلاف مقدمات درج کرائے، دوسری طرف دیہات میں غنڈوں کو اس تحریک کے خلاف منظم کرنا شروع کیا۔

1838ء میں دودھومیاں کے خلاف لوگوں میں اشتعال پھیلانے اور لوٹ مار کے لیے اکسانے کے الزام میں ایک مقدمہ قائم کیا گیا۔ 1841ء میں ان کے خلاف قتل کے الزام میں ایک مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ نے انہیں سیشن سپرد کر دیا۔ 1844ء میں قفل شکنی اور بلا اجازت کسی کے مکان میں مداخلت کے الزام میں مقدمہ دائر ہوا۔ انگریز تاجروں اور ہندو زمینداروں نے تقریباً 800 آدمیوں کی مدد سے دودھومیاں کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ ان کی املاک کو نقصان پہنچایا، کئی مکانوں کو آگ لگا دی، مال واسباب لوٹا اور ان کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا۔ لیکن ان تمام مقدمات میں زمینداروں اور پولیس کو زبردست، ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ ان مقدمات میں کوئی بھی مقامی کاشتکار شہادت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا، جس کے بغیر الزام ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔

زمین اللہ کی ہے

یہی وہ زمانہ تھا جب دودھومیاں نے نیا نعرہ ''الارض للہ'' وضع کیا۔ انہوں نے کہا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور اس پر انفرادی ملکیت اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، اس لیے اراضی کی کاشت کے عوض زمیندار کو ٹیکس (بٹائی) دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صرف حکومت کو کچھ واجبات دینے ضروری ہیں تاکہ وہ انتظامات کا اہتمام کر سکے۔ زمین دار کو زمین کے کسی حصے پر اپنی ملکیت جتانے کا اختیار نہیں ہے۔

اس بالکل نئے نعرے نے ایک بالکل نئی صورت حال پیدا کر دی۔ مسلمان کسانوں کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن ہو گئے۔ دودھومیاں نے ہندو ساہوکار کے قرضوں اور اس کے سود در سود کے خلاف بھی آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے گاؤں میں وسیع پیمانے پر لنگر بھی جاری کیا تھا، جہاں ہر آنے والے کو کھانا اور رہائش مہیا کی جاتی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس ویمپیئر نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا: ''دودھومیاں نے کم از کم 80 ہزار سرگرم کارکن اپنے گرد جمع کر لیے ہیں اور اس وقت عام اثر یہی ہے کہ اس تحریک کا مقصد انگریز حکمرانوں کو بنگال سے

نکالنا اور مسلمانوں کی حکومت کو بحال کرنا ہے''۔

انگریز کے کارخانے پر دھاوا

1846ء میں دودھومیاں نے انگریز تاجر کے نیل کے کارخانے پر دھاوا بول دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ کارخانہ پنچور میں واقع تھا۔ اس کا مالک ڈنلوپ نامی انگریز تھا۔ اس کا منیجر ایک ہندو تھا۔ اس دھاوے میں کارخانے کو نذر آتش کر دیا گیا اور ہندو منیجر کو قتل کر دیا گیا۔ اس پر دودھومیاں اور ان کے 62 ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ ان کے خلاف کافی دن تک مقدمہ چلتا رہا اور ماتحت عدالت نے انہیں سزائیں دیں، لیکن بالآخر بڑی عدالت نے انہیں رہا کر دیا۔

دودھومیاں کے اثر و رسوخ اور تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں پر دودھومیاں کا اطلاع کنندہ نہ ہو۔ یہ اپنی خفیہ رپورٹ متواتر اور تسلسل سے اپنے پیر کو بھیجتا رہتا۔ اس طرح انہیں انگریزی حکومت سے بھی پہلے تمام علاقوں کے حالات کا علم ہو جاتا۔ اسی طرح دودھومیاں کے خفیہ ہدایت نامے اور احکام ہر علاقے میں بروقت پہنچتے رہتے۔ یہ خطوط ''احمد نامہ'' کہلاتے اور ان کے نیچے لکھا ہوتا ''احمد نام، نامعلوم''، لیکن یہ خط مقدس صحیفے کی طرح پڑھے جاتے اور ان پر سختی سے عمل کیا جاتا۔

پچاس ہزار دودھومیاں

ویمپئیر وہ انگریز افسر تھا جس نے دودھومیاں کی نظر بندی اور اس تحریک پر پابندیوں کے متعلق سفارش کی۔ یہ اس وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ حکومت نے اس کی سفارش کو تسلیم نہ کیا۔ زمینداروں نے حکومت کے اعلیٰ افسروں کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ 1857ء میں دودھومیاں نے انگریز مجسٹریٹ کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ''میرے نام جو سمن جاری ہوں گے، ان کی تعمیل صرف دودھومیاں نہیں کرے گا، بلکہ پچاس ہزار دودھومیاں اس آواز پر لبیک کہیں گے''۔

حکومت نے اس دھمکی کو محسوس کیا اور جب 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو دودھومیاں کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے گئے۔ پہلے انہیں علی پور جیل میں رکھا گیا۔ بعد میں انہیں فرید پور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں سے وہ بیماری کی حالت میں 1859ء میں رہا ہوئے۔ 1862ء میں یہ ہنگامہ پرور شخصیت اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ان کا مزار آج بھی ڈھاکہ کی ایک گلی میں موجود ہے۔

ان کی عمر تقریباً 43 سال کی ہوگی جب وہ اپنی زندگی ہار بیٹھے۔ انہوں نے تقریباً بیس برس کی عمر میں فرائضی تحریک کی قیادت سنبھالی اور پھر بیس برس وہ ہنگامے بپا کیے، تحریک کو ایسا منظم کیا اور اپنے نام لیواؤں میں وہ خود اعتمادی پیدا کی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی آزادی اور سماجی انصاف تحریک میں ان کا جو حصہ ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہر بار یہی سوال اٹھایا جاتا ہے کہ وہ انگریز کے مخالف تھے یا نہیں؟ آیا وہ انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کوئی تحریک منظم کر رہے تھے یا صرف ہندو زمینداروں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا ان کا مقصد تھا؟

بالکل یہی سوال اس داستان کے ہیرو سید احمد شہید کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے کہ وہ انگریز کے مخالف تھے یا

دوست؟ اس داستان در داستان کے تسلسل میں جہاں موقع آئے گا اس سوال کا بھی جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی؟

تیطو میاں کی تحریک

حاجی شریعت اللہ، حاجی محمد محسن، مولوی کرامت علی جون پوری، مولوی عنایت علی عظیم آبادی، میاں نثار علی، مولوی امام الدین، صوفی محمد چاٹگامی کے علاوہ اور متعدد اہل ہمت ہیں، جنہوں نے اس احیائی اور اصلاحی تحریک میں حصہ لیا اور بنگال کا نقشہ بدل دیا۔ ڈاکٹر وائز نے بنگالی مسلمانوں کے متعلق اپنی انگریزی کتاب میں لکھا ہے:
''انیسویں صدی کے اوائل میں احیائے اسلام کی تحریک جدید ہندوستان کی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ چند غیر معروف انسانوں نے جو بیج بویا، وہ ایک تناور درخت ہو گیا جو اس وقت سارے بنگال سابقہ مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش پر چھایا ہوا ہے۔

حاجی شریعت اللہ اور ان کے صاحبزادے دودھو میاں کی فرائضی تحریک کے علاوہ دوسری اہم تحریک جس نے سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے پہلو بہ پہلو بنگال کے مسلمانوں کو متحرک کیا، ان میں جوش اور ولولہ پیدا کیا، وہ تیطو میاں کی تحریک تھی۔ یہی تحریک تھی جس کے خلاف، انگریز مؤرخوں نے زبردست غیض و غضب کا اظہار کیا۔ اس تحریک میں بھی مذہبی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اقتصادی اصلاحات کا عنصر شامل تھا۔

اس تحریک کے بانی نثار علی تھے جن کو بنگال میں تیطو میاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بچپن اور جوانی کے متعلق نہایت دلچسپ داستانیں مشہور ہیں۔ یہ بارہ ست ضلع کے ایک گاؤں نرکل دریا میں پیدا ہوئے۔ والد معمولی کاشتکار تھے۔ نثار علی کی شادی اسی علاقے کے ایک متمول زمیندار امیر علی کی لڑکی سے ہوئی۔ نثار علی کی جوانی کوئی زیادہ بے داغ نہ تھی۔ ان کی جوانی کا زمانہ کلکتے کے اوباشوں اور لفنگوں میں گزرا تھا۔ کلکتے ہی میں انہوں نے ڈنڈے بازی سیکھی (اس زمانے میں ایک فن تھا) اس کے علاوہ لٹھ بازوں کے گروہ میں شریک ہو گئے۔ ان لٹھ بازوں کی خدمات سے بنگال کے زمیندار فائدہ اٹھایا کرتے تھے کبھی وہ ان لٹھ بازوں سے اپنی کاشت کاروں کو پٹواتے، کبھی مقابل کے زمیندار پر حملے کراتے۔ غرضیکہ ان لٹھ بازوں کی روزی کا انحصار زمینداروں پر تھا۔ نثار علی کو اس لٹھ بازی کے سلسلے میں ایک بار جیل بھی جانا پڑا۔ اس زمانے میں انہوں نے نادیا کے ایک زمیندار کی ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ ان کا کام نادیا کے اس ہندو زمیندار کا مالیہ وصول کرنا ہوتا تھا۔ اس ملازمت کے دوران میں کاشت کاروں کے علاوہ ایک گروہ پر حملے کے الزام میں نثار علی کو جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔

سیّد احمد شہید سے تیطو میاں کی ملاقات

جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ دہلی کے شاہی خاندان کے ایک فرد کے ہاں ملازم ہو گئے اور اسی کے ہمراہ حج کے لیے چلے گئے۔ ان کے حج پر جانے کا زمانہ وہی ہے، جس میں سیّد احمد شہید حج کے لیے مکہ معظمہ میں موجود تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مکے میں قیام کے دوران میں نثار علی کی ملاقات سیّد صاحب سے ہوئی۔ وہ ان کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سیّد احمد شہید سے نثار علی کے تعلق کے بارے میں ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

> ''رہا ہونے کے بعد وہ حج کی غرض سے مکّہ معظمہ روانہ ہو گیا۔ اس مقدس شہر میں اس کی ملاقات سیّد احمد صاحب سے ہوئی اور وہ ہندوستان میں ان کے اصولوں اور تعلیمات کے زبردست مبلغ کی حیثیت سے واپس آیا۔ اس نے ضلع کلکتہ کے شمال اور مشرق کی اطراف کا دورہ کیا۔ بہت سے آدمیوں کو اپنا مرید بنا لیا اور خفیہ طور پر کافروں کے خلاف جہاد کی تیاریاں کرنے لگا۔''

حج کے دوران میں میاں نثار علی کی سیّد احمد شہید سے ملاقات کے واقعے کو راج شاہی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مسٹر ملک نے اپنی کتاب میں یوں بیان کیا ہے: ''نثار علی کی ملاقات حج کے موقع پر سیّد احمد سے ہوئی جو کہ نثار علی سے ایک سال پہلے حج کے لیے پہنچے ہوئے تھے، اور یہاں وہ سیّد صاحب کا مرید ہو گیا۔ نثار علی نے حج سے واپسی پر حیدر پور میں رہائش اختیار کر لی۔ حیدر پور اس کے آبائی گاؤں کے بالکل نزدیک تھا۔ 1827ء کے قریب (سیّد احمد کی شہادت سے چار سال پہلے) اس نے مذہبی عالم اور مصلح کی حیثیت سے یہاں پر تبلیغ کا آغاز کر دیا اور اس کو اس مقصد کے لیے دہلی سے وظیفہ بھی موصول ہوتا تھا۔''

تیطو میاں پر سیّد صاحب کا اثر

تیطو میاں (نثار علی) نے جس تحریک کا آغاز 1827ء میں حیدر پور سے کیا، اس پر سیّد احمد شہید کا کتنا اثر تھا؟ ولیم ہنٹر کی تحریریں، ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں مطبوعہ مضامین، مالیے کے کاغذات اور مالیے کی تحقیقی کتب، یہ تمام کی تمام دستاویزات اس بات پر متفق ہیں کہ تیطو میاں کی تحریک کی اصل محرک سیّد احمد کی تعلیمات تھیں۔ ادھر بنگال میں حیدر پور میں تیطو میاں اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے تھے، ادھر سیّد احمد اپنے تمام مریدانِ باصفا کو لے کر سرحد پار ہجرت کے ارادے باندھ رہے تھے، جہاں ان کو جہاد کرنا تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمان سیّد احمد کے قافلے میں شریک ہونے یا جو ہجرت نہیں کر سکتے تھے، وہ ان کے دیدار کے لیے کشاں کشاں پہنچ رہے تھے۔ تیطو میاں کی تحریک بنگال کے مخصوص حالات کے تحت حاجی شریعت اللہ اور دودھو میاں کی فرائضی تحریک کی مانند مذہبی اصلاح کے مقصد سے شروع ہوئی جس کو بعد میں کاشتکاروں کی زبوں حالی نے کسان تحریک بنا دیا۔

تیطو میاں کی تعلیمات

اس تحریک کا آغاز بھی ہندوانہ رسوم کی مخالفت اور نماز، روزے کی پابندی پر اصرار سے ہوا۔ مزید برآں تیطو میاں نے مزاروں پر جانے، وہاں نذر و نیاز دینے، حاجات مانگنے اور اس طرح شرک و بدعت کا ارتکاب کرنے کے خلاف بڑی شدومد سے آواز اٹھائی۔ انہوں نے ہندوانہ طرز کے لباس کی بھی مخالفت کی، اور داڑھی بڑھانے، مونچھیں صاف کرنے اور سیدھی دھوتی باندھنے کی تلقین کی۔

تیطو میاں نے اپنے پیروؤں پر اپنی تعلیمات کو عملاً منوانے کی اتنی شدید پابندی عائد کی کہ ان کو ہم مسلک

پیروؤں کے سوا دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے سے روک دیا، کیونکہ وہ پورے اور صحیح مسلمان نہ سمجھے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک جو پورا مسلمان نہ ہو، اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا جائز نہیں تھا۔ اس قسم کی سختی اور شدت نے کچھ لوگوں کو تیطو میاں سے دور بھی کیا، لیکن عام مسلمانوں میں لگن بھی پیدا کر دی اور اس علاقے کے لوگ کثیر تعداد میں ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ اس مقبولیت نے مزاروں پر جانے والے اور ہندو رسم و رواج کو اپنائے رکھنے والے مسلمانوں کو خاصا آگ بگولا کر دیا اور بالکل فرائضی تحریک کی طرح اس تحریک کی بھی مخالفت شروع ہو گئی۔ متعدد مسلمان کاشتکاروں نے تیطو میاں کے پیروؤں کی شکایات ہندو زمینداروں کے سامنے شروع کر دیں۔

یہی معاملہ حاجی شریعت اللہ کے ساتھ پیش آیا اور انجام دودھو میاں کو دیکھنا پڑا۔ مختلف دیہات کے مسلم کاشت کاروں کے درمیان جھگڑے شروع ہوئے تو زمینداروں نے جو عام طور پر ہندو تھے، مداخلت شروع کر دی۔ انہوں نے اس نئے ''مذہب'' کا قلع قمع کرنے کا ذمہ لیا۔ متعدد مقامات پر انہوں نے ''نئے مذہب'' کے پیروؤں پر ٹیکس عائد کرنے کا اعلان کیا۔ ایک زمیندار کرشنا رائے نے تیطو میاں کے پیروؤں پر پانچ روپے فی کس ٹیکس عائد کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی تارا کونیا کے ایک زمیندار رام نرائن نے بھی ان نئے مذہب کے ماننے والے پر ٹیکس عائد کر دیا۔ یہ سلسلہ چل نکلا اور متعدد علاقوں میں تیطو میاں کے حامیوں کو اس ٹیکس کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ غرض یہ سلسلہ شروع ہوا کہ تحریک کو کچل دیا جائے۔ چنانچہ جہاں جہاں تحریک کے کارکن ان زمینداروں کے دست نگر تھے یا ان کے یہاں کام کرتے تھے، انہیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے تنگ کیا جانے لگا اور ان تمام کارستانیوں اور حکمرانیوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ ان کاشتکاروں کو مرعوب کیا جائے، انہیں ڈرا دھمکا کر پہلے کی طرح غلامانہ ذہنیت پر واپس لایا جائے اور نئے جرأت مندانہ مسلک کے اپنانے سے باز رکھا جائے لیکن ہوا اس کے بالکل الٹ۔

تشدد کا نتیجہ

تشدد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کاشتکار اپنے مسلک پر ڈٹ گئے۔ ان میں پختگی آ گئی، کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو، اس مسلک میں ان کے لیے بھلائی ہے، جبھی تو زمیندار ان کے خلاف ہو گیا ہے۔ وہ اس مسلک سے ڈرتا ہے۔ گویا زمیندار کی مخالفت و نفرت اور تشدد و سخت گیری نے انہیں اپنے مسلک کی محبت و شیفتگی، اطاعت اور یقین عطا کر دیا۔

دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے کے لیے زمینداروں نے بھی دوسرے ہی طریقوں کا استعمال شروع کیا۔ چنانچہ اس کے بعد مقدمات، حملوں اور باقاعدہ جھڑپوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان جھڑپوں نے بعض اوقات باقاعدہ جنگوں کی صورت اختیار کر لی۔ بنگال میں مسلمانوں کی مختلف تحریکوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی حکومت کو جس قدر پریشان رکھا، اس کا اندازہ ولیم ہنٹر کے ''تاثرات'' سے لگایا جا سکتا ہے۔

ولیم ہنٹر کا دعویٰ ہے کہ تیطو میاں کی تحریک ''براہ راست'' سید احمد کی تحریک سے منسلک تھی، اس لیے وہ کاشتکاروں کے حقوق و مفادات کی حفاظت کی جدوجہد کو ایک مخصوص رنگ میں دیکھتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کو پرانی سازش کے نام سے موسوم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بہت مدت تک مجاہدین سرحد کی اس حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ایک راز بنا رہا۔ ہندوستانی حکومت نے، جو ہم سے پہلے پنجاب پر حکمران تھی (یعنی سکھ) اسے تین مرتبہ منتشر کیا اور تین دفعہ انگریزی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے لیکن اس کے باوجود یہ ابھی تک زندہ ہیں اور دین دار مسلمان ان کے معجزانہ طور پر زندہ رہنے ہی کو ان کے آخر کار غالب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وقت ہم اس سرحدی نو آبادی (صوبہ سرحد) کو مغربی (انگریز) طاقت کے بل بوتے پر تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس وقت ہماری مسلمان رعایا کے متعصب عوام ان کو لاتعداد آدمیوں اور روپوں سے مدد دے کر ان چنگاریوں کو گویا ہوا دیتے ہیں، جنہیں ہم نے خاک سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ مگر ان کی بجھی ہوئی راکھ سے ایک دفعہ پھر شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔''

ولیم ہنٹر ہی سے آگے سنئے:

''1821ء تا 1824ء انگریزی حکام نے سیّد احمد کی تبلیغی سرگرمیوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے جانثار مریدوں کی ہمراہی میں متعدد صوبوں کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا۔ ایک باقاعدہ گدی قائم کی۔ مذہبی ٹیکس نافذ کیا اور ایک متبادل حکومت قائم کر لی۔ لیکن اس پورے دور میں ہمارے افسر اپنے اردگرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر رہے اور صرف مالیہ جمع کرنے، انصاف کی عدالتیں قائم کرنے اور فوجیوں کو پریڈ کرانے میں مصروف رہے۔ 1831ء (سیّد احمد کا سال شہادت) میں یہ تمام اہل کار اور افسر اپنی بے خبری سے بری طرح جھنجھوڑے گئے۔ کلکتے میں سیّد صاحب کے مریدوں میں ایک پیشہ ور پہلوان اور لڑاکا آدمی بھی تھا، جس کا نام تیطو میاں تھا۔ اس نے اپنی زندگی ایک باعزت کاشتکار کے لڑکے کی حیثیت سے شروع کی تھی اور ایک چھوٹے سے زمیندار کی لڑکی سے شادی کر کے اپنی حیثیت کو اور بھی بلند کر لیا تھا، مگر اس کی پرجوش فطرت نے ان فوائد کو پرے پھینک دیا۔ کچھ مدت تک یہ شخص کلکتے میں ڈنڈے بازی کے معیوب طریقے سے روزی کماتا رہا اور اس کے بعد لٹھ باز گروہ میں شامل ہو گیا، جن سے بنگال کے زمیندار اپنے خاندانی جھگڑوں اور زمین کی حدود کے تنازعات کا فیصلہ کراتے تھے۔ اس پیشے کی وجہ سے آخر کار اسے جیل جانا پڑا۔''

ولیم ہنٹر اور دوسرے انگریز تذکرہ نگار تیطو میاں کی تحریک کے متعلق فرائضی تحریک سے کہیں زیادہ غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جس قدر شدت اور جذبہ تیطو میاں کی تحریک میں موجود تھا، وہ اس وقت کی دوسری تحریکوں میں موجود نہ تھا اور جس شاندار طریقے سے مسلمانوں کی اس تحریک نے ہندو زمینداروں اور انگریز پولیس کے مقابلے کی مزاحمت کی، اس وقت تک دوسری تحریکوں نے نہیں کی، اس لیے تیطو میاں کی تحریک

نفرت اور مخالفت کے اظہار میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

بنگال کے مسلمانوں کی ان احیائی تحریکوں کا تعارف کرانے کے بعد ہم پھر دہلی اور یوپی کی طرف چلتے ہیں جہاں سیّد احمد اپنی جہاد تحریک کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ تیطو میاں اور ان کی تحریک کا کیا انجام ہوا؟ اس کے بارے میں ہم سیّد احمد کی تحریک کے بعد گفتگو کریں گے، کیونکہ تیطو میاں کی تحریک اور اس کے اثرات کافی عرصے تک قائم رہے۔

مسلمانانِ ہند کی پہلی عوامی تحریک

بنگال کے مسلمان جب اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شدید دورِ اضطراب سے گزر رہے تھے، اور دینی عقائد و شعائر کی اصلاح و تجدید کے ساتھ ساتھ ہندو زمینداروں اور بنیوں کے مظالم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے شدائد کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو رہے تھے، تو اس وقت شمالی ہندوستان میں بھی مسلم تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ یہ تحریکیں بھی اصلاح و تجدید کے نام ہی سے شروع ہو رہی تھیں اور جیسے جیسے مسلمانوں میں محرومیاں بڑھتی گئیں، اضطراب پھیلتا گیا۔ معاشرتی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ہی ان تحریکوں میں پختگی آتی گئی، مزاحمت سخت ہوتی گئی۔ اس کی محبوبیت اور مقبولیت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ ہندوستان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک مسلمانوں کے مختلف طبقات، چھوٹے بڑے، مرد و زن سب ان تحریکوں سے نہ صرف متاثر ہونے لگے، بلکہ ان میں جوق در جوق شریک ہونے لگے۔

تحریک در تحریک اثرات کا سلسلہ

بنگال ہو یا بہار، مدراس ہو یا دکن، مہاراشٹر ہو یا گجرات، یوپی ہو یا سی پی، پنجاب ہو یا سرحد، کونسا علاقہ تھا جو اس تحریک سے کسی نہ کسی حد تک متاثر نہ ہوا ہو۔ سیّد احمد کی تحریک جہاد اور بنگالی مسلمانوں کی اصلاحی تحریک ہم خیال ہونے کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے اثر لے رہی تھیں اور ہم عصر ہونے کی وجہ سے بھی۔ حاجی شریعت اللہ کی تعلیمات ہوں یا دودھو میاں کی منظم فرائضی تحریک، یا پھر تیطو میاں کی عظیم الشان مزاحمتی تحریک، ان سب کا دور وہی دور ہے جب شمالی پنجاب اور صوبہ سرحد میں مجاہدین اپنی بستیاں آباد کر رہے تھے اور وہاں احیائے اسلام اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جہاد کر رہے تھے۔ اب تحریکوں کی اثر خیزی کا سلسلہ شروع ہوا تو بنگال کے مسلم کاشتکار، جنہیں مختلف تحریکوں نے متاثر کیا تھا، سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد سے متاثر ہونے لگے اور کسان شالی دھان کے کھیتوں کو چھوڑ کر بندوقیں اور تمنچے ہاتھ میں تھامے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے منھ نہ کی پہاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ جوش جہاد اور سرفروشانہ بے خودی ان میں کس طرح پیدا ہوئی؟ ایسا کیوں؟ مسلمانانِ ہند کی یہ پہلی ملک گیر تحریک عمل کیسے منظم ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب از حد ضروری ہے۔ جیسے جیسے ان سوالوں کا جواب حاصل ہوگا۔ ان تحریکوں میں گہری مماثلت اور مشترکہ بنیادوں کا پتہ چلے گا۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ان کے طریق کار میں

یکسانیت نظر آتی ہے، کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے اندر جتنی بھی تحریکیں اٹھیں اور جن تحریکوں نے آگے چل کر ہنگامے بپا کیے، ان سب کی ابتدا مسلمانوں میں عقائد و شعائر اسلام کی اصلاح و تجدید ہی سے ہوئی۔ حاجی شریعت اللہ اور تیطو میاں نے شاہ ولی اللہ کی تحریک سے اثر لیا۔ سیّد احمد تو اس تحریک کی آغوش میں پلے تھے۔ ان بزرگوں کی چلائی ہوئی تحریکوں کی بنیاد عقائد کی اصلاح ہی پر تھی۔ ان کا اصرار اسی بات پر تھا کہ خدا کی توحید دل و جان سے تسلیم کیا جائے شرک، بدعات اور مشرکانہ رسوم ترک کی جائیں اور روزمرہ زندگی میں جو غیر اسلامی اور ہندووانہ رسوم اور رواج راہ پا گئے ہیں، انہیں ترک کر دیا جائے۔ سیّد احمد شہید کی تحریک بھی ان ہی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ اس تحریک نے اپنے نام لیواؤں کو بدعات ترک کرنے، غیر اللہ کی عبادت سے توبہ کرنے، شرک اور ہندووانہ رسوم سے دستبردار ہونے کی ہدایت کی اور اسلام کی بتائی ہوئی سادہ زندگی بسر کرنے پر اصرار کیا اور بتایا کہ اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کیوں ضروری ہو جاتا ہے۔

جہاد کیوں ضروری ہو جاتا ہے؟

سیّد احمد شہید نے اپنے اردگرد جو مذہبی، سیاسی اور معاشی حالات پائے، ان میں انہیں ایک مخصوص راہ عمل منتخب کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ جہاد کا راستہ تھا۔ سیّد صاحب نے اپنی تحریک کے لیے جہاد ہی کا راستہ کیوں اختیار کیا؟ اس کا جواب اس تحریک کے مداح مؤرخ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''سیّد صاحب کی پیدائش سے پہلے ہی اس سرزمین میں مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مغلیہ حکومت کے کھنڈروں پر جن مسلمانوں نے نئی فرماں روائیوں کی بنیاد رکھی تھی، وہ بھی یا تو مٹ چکی تھیں یا ضعف و اضمحلال کے آخری درجے پر پہنچ چکی تھیں۔ غیر مسلموں کے اقتدار کا سیل بے کراں ہر سمت بڑھتا چلا جا رہا تھا اور مسلمانوں کی کوئی سلطنت ایسی نہ تھی جس کی روحِ حیات میں بالیدگی کی کوئی جھلک نمایاں ہوتی۔ مسلمان دینِ حق کے بتائے ہوئے صراط مستقیم سے دور جا پڑے تھے۔ عقائد و اعمال کی تمام خرابیاں ان پر مسلط تھیں۔ امراء و رؤسا کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کی خود غرضانہ کامرانیوں اور عیش پسندیوں کے لیے ضروری وسائل فراہم ہوتے جائیں۔ ان مشاغل کے انجام سے وہ بے پرواہ تھے۔ عوام میں سے بیشتر کی حالت ایسی تھی، گویا بجلی گری اور وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہوں یا خوفناک زلزلہ آیا اور وہ دہشت کے مارے بت بن کر رہ گئے ہوں۔ جنہیں کچھ احساس تھا، انہیں حرماں نصیبی کے تدارک کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ مستقبل کی تاریکی کو تقدیر کا اٹل فیصلہ مان کر اس انتظار میں معطل بیٹھ گئے تھے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ اپنے وقت پر ہو کر رہے گا۔ جب سفینہ بھنور میں گھر جائے، اس کے بادبان پھٹ جائیں، لنگر ٹوٹ جائے، ناخدا ناپید ہو تو اہل سفینہ کے لیے بظاہر بچاؤ کی کون سی امید باقی رہ جاتی ہے؟ مسلمانوں پر یاس و ناامیدی کی یہی کیفیت طاری تھی۔

''سیّد صاحب سے پہلے جتنے مجاہد پیدا ہوئے، ان میں سے، جنہوں نے اس دورِ زوال کی تاریکی کو روشنی سے بدلنے کی زبردست کوششیں کیں، وہ حیدر علی اور ان کے فرزند ٹیپو سلطان ہی تھے، لیکن مخالف اسباب اس افراط سے فراہم ہو گئے تھے کہ ان مجاہدوں کی کوششیں کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ آنے والی نسلوں کے

لیے عزم وہمت اور ایثار وقربانی کی دو عظیم شمعیں روشن ہوئیں۔"

تین راستے

سیّد احمد کے سامنے مختلف راستوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں:

"یاس وناامیدی کی اس تیرگی میں سیّد صاحب نے ہوش کی آنکھ کھولی، توان کے سامنے عمل کے تین راستے تھے:

1۔ حق کو چھوڑ کر باطل سے رشتہ جوڑ لیا جائے۔

2۔ حق کو چھوڑا نہ جائے اور اس سلسلے میں جو مصیبتیں پیش آئیں، انہیں صبر واستقامت سے برداشت کیا جائے۔

3۔ باطل کا مقابلہ مردانہ وار کر کے ایسی صورتِ حالت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کہ حق کے لیے غلبۂ عام کی فضا آراستہ ہو جائے۔

پہلا راستہ زندگی نہیں، موت کا راستہ تھا۔ دوسرے کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ آہستہ آہستہ، سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دے دی جائے۔ صرف تیسرا راستہ غیرت وحمیّت اور ہمّت وعزیمت کا راستہ تھا۔ سیّد صاحب کو خدا نے غیرت وعزیمت کی دولت بہ درجۂ وافر عطا کی تھی۔ انہوں نے آخری راستے ہی کو اپنے لیے زیبا سمجھا، اسی کو اختیار کیا۔ یہی ان کے وعظ وتلقین کا دفور تھا اور اسی کو ان کی دعوت وتبلیغ کا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

"سیّد صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی تمام تر مصیبتوں کی علت العلل یہ تھی کہ وہ اسلام کے صراط مستقیم سے منحرف ہو چکے تھے۔ ان میں خدا کے دین کی سربلندی کے لیے کوئی تڑپ اور کوئی بے تابی باقی نہ رہی تھی۔ وہ روحِ جہاد سے خالی ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیّد صاحب نے سیاسی عظمت وبرتری کو اپنا نصب العین نہ بنایا، صرف تجدید واحیائے اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی۔ وہ مدعیانِ اسلام کو سچے مسلمان بنانا چاہتے تھے اور ان میں خدمت دین اور تکمیل مقاصد اسلام کی سچی لُو لگانے کے خواہاں تھے۔

"دورِ اوّل میں مسلمانوں کو جو عالمگیر برتری حاصل ہوئی تھی، وہ صرف خدمت دین کا ایک ثمرہ تھی۔ جن چیزوں کو ہم آج کل اسباب قوت سمجھنے کے عادی ہیں، ان میں سے کون سی چیز دورِ اوّل کے مسلمانوں کو حاصل تھی، لیکن اسلامیت کے لیے جذبۂ جہاد نے ان میں استحکام واستقامت کی وہ روح پیدا کر دی تھی کہ قوت جابرانہ کی مالک پرشکوہ سلطنتیں اسباب حرب وضرب کی ہولناک فراوانیوں کے ساتھ مسلمانوں سے ٹکرائیں اور مٹی کے کھلونوں کے طرح یوں ریزہ ریزہ ہو گئیں کہ زمانے کو ان کے ٹکڑوں کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ سیّد صاحب اسی عہد سعودکی برکات زندہ کرنا چاہتے تھے۔ تجدید واحیائے اسلامیت کا یہ مقام رفیع بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوا ہے اور اس کے لئے بے باکانہ قربانیاں بہت کم خوش بختوں کے حصے میں آئیں۔"

مسلمانانِ ہند کی پہلی عوامی تحریک

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے عوامی تحریک انیسویں صدی کے پہلے وسط میں

ابھری اور پہلی دفعہ عوام ہندوستان کی سیاست میں براہ راست دخیل ہوئے۔ یہ تحریک سیّد احمد کی تحریک ہی تھی۔ یہی وہ تحریک تھی جو شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے فکری پرچم تلے منظم ہوئی۔ جب سیّد احمد اور امیر محمد خان، والئی ٹونک کے لشکر سے قطع تعلق کر کے دہلی آئے تو اسی زمانے میں شاہ عبدالعزیز کو رسول کریم ﷺ خواب میں نظر آتے ہیں اور ان کو عصا ہاتھ میں تھماتے ہیں۔ (اس بشارت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) یہ دراصل تحریک کے نئے پروگرام کا اعلان تھا۔ اعلان یہ تھا کہ اب عوام کو منظم کیا جائے۔ عوام ہی کی تنظیم کی بنیاد پر ایک عوامی فوج منظم کی جائے اور وہ فوج وہی کام کرے جس کی توقع احمد شاہ ابدالی سے لے کر امیر محمد خان کی فوجوں سے کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں 1818ء کے بعد سے ایک زبردست عوامی تحریک نے جنم لیا۔ یہ ایسی تحریک تھی، جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو متاثر اور متحرک کیا۔ اس تحریک کے ابتدائی خدوخال، عقائد کی درستی، رسوم کی اصلاح اور پوری زندگی کو خدا اور رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنے کی راہوں میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے ہوں تو سب سے پہلے ان رکاوٹوں کو دور کرنا فرض ہو جاتا ہے اور یہی رکاوٹیں تھیں جنہوں نے اس ملک کو دارالحرب بنا دیا تھا، اور شاہ عبدالعزیز اپنے فتوے کے ذریعے اس کا اعلان کر چکے تھے۔

عوامی تحریک کی تنظیم

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سیّد احمد نواب امیر خان، والئی ٹونک کے لشکر سے الگ ہو کر سیدھے دہلی پہنچے اور یہاں اجمیری دروازے سے باہر ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔ دوسرے دن اپنے مرشد شاہ عبدالعزیز سے ملنے کے لیے گئے۔ ان کی خدمت میں ایک مرید کی حیثیت سے 25 روپے بطور نذرانہ بھی پیش کئے۔ اس موقع پر شاہ صاحب نے اپنے مرید کو حکم دیا کہ وہ سرائے کی سکونت ترک کر کے مسجد اکبر آبادی میں قیام کریں۔ چنانچہ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحیی، حافظ قطب الدین، شاہ محمد یعقوب، مولوی یوسف پھلتی اور کئی دوسرے مقرر سیّد احمد اور ان کے ساتھیوں کا سامان لینے کے لیے سرائے گئے۔ سیّد احمد نے جب مسجد اکبر آبادی میں قیام کا قصد کیا تو ان کے لیے اور ان کے ساتھیوں کے لیے پانچ حجرے خالی کرائے گئے۔ سیّد احمد کے اسی قیام کے دوران بیعت و طریقت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب یہ بات قرائن سے واضح ہے کہ اسی دوران میں شاہ عبدالعزیز اور ان کے رفقاء نے اس تحریک کے لیے نئے پروگرام اور نئے طریق کار کا تعین کیا اور یہ بیعت و طریقت کا سلسلہ اسی نئے طریق کار ہی کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی تو اس سلسلے کو باقاعدہ تحریک کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''دراصل بات یہ تھی کہ امام عبدالعزیز کے آخری عہد میں ہندوستان کی اسلامی سیاست میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بعد کام کرنے کے لیے اپنے لوگوں میں کسی میں امامت کی صلاحیت نہ دیکھی کہ کس کو آمر بنایا جائے۔ اس لیے دو بورڈ بنائے گئے۔ عسکری امور کے لیے سیّد احمد شہید مشیر مقرر ہوئے۔ چنانچہ امام عبدالعزیز نے اپنی تمام جماعت کو حکم دیا کہ جس معاملے میں سیّد احمد، مولانا عبدالحیی اور شاہ اسماعیل تینوں جمع ہو جائیں، اس کو امام عبدالعزیز کا حکم سمجھنا چاہیے۔ تنظیمی امور کے لیے آپ نے مولانا محمد اسحاق کو امیر اور ان کے بھائی مولانا محمد یعقوب کو ان کا مشیر مقرر کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے ہر معاملے میں

مولانا محمد اسحاق کو اپنے ساتھ رکھ کر لوگوں کو سمجھا دیا کہ ان کا حکم میرا حکم ہے۔ امام عبدالعزیز کا یہ نکتہ امام ولی اللہ کے اصول پر ٹھیک اترتا ہے۔ یہ طریق کار جس پر چل کر امام عبدالعزیز نے اس طویل عرصے میں بتدریج حزب ولی اللہی کی تنظیم کی۔ چنانچہ جب یہ تمہیدی مراحل طے ہو گئے تھے تو 1231ھ میں پہلی دفعہ سیّد احمد اور ان کے بورڈ کے ارکان مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسماعیل کو ملک میں بیعت لینے کی غرض سے بھیجا۔ 1236ھ (1820ء) میں یہ بورڈ دوسری دفعہ جہاد کی بیعت لینے کے لیے نکلا۔ اس کے بعد ان کو سارے قافلے سمیت حج پر جانے کا حکم ملا، تاکہ انہیں اپنی قوت کی مزید تنظیم کا تجربہ حاصل ہو سکے۔''

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے انداز میں جو توجیہہ کی ہے، وہ بہت حد تک درست ہے۔ اس لیے ان کے رفقاء نے ملک کے اندر مسلمانوں میں ایک عوامی تنظیم وجود میں لانے کی ان تھک کوشش کی اور بالکل اسی انداز میں قریہ قریہ اور شہر شہر گھومے، جیسے سیاسی جماعتوں کے کارکن اور زعماء گھومتے ہیں، ہر مسجد میں اور ہر چوک میں جلسہ کرتے ہیں۔ اس طرح پونے دوصدی ان علماء نے مسلمانوں کو متحرک کیا اور ان کے اضطراب اور بے چینی کو جہاد کی صورت میں بدلنے کی کوشش کی۔

سیّدؒ کا مرید شاہ

اس تحریک کی طرف عوام کو متوجہ کرنے والا سب سے پہلا کارنامہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحی کی سیّد احمد کے ہاتھ پر بیعت تھا۔ شاہ اسماعیل شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ ان کے والد شاہ عبدالغنی شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ شاہ اسماعیل کا سال پیدائش 1778ء ہے۔ اس طرح سے یہ اپنے مرشد سیّد احمد سے بھی عمر میں سات، آٹھ برس بڑے ہیں۔ علم میں تو خیر ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

جسمانی ورزشیں:

شاہ اسماعیل کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ انہوں نے اپنی آنے والی مجاہدانہ زندگی کے واسطے عالم شباب ہی میں تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ علم اور بہادری میں ابتدا ہی سے یکتا تسلیم کیے جاتے تھے۔ چنانچہ خود شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے: ''ہر تعریف اس خدا کے پاک کے لیے ہے، جس نے بڑھاپے کے عالم میں بھی اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔''

شاہ صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب آپ نے مختلف علوم میں مہارت حاصل کر لی تو ورزش اور جفاکشی کی طرف متوجہ ہوئے۔ پٹا اور گتکا (بنوٹ) کی مشق کے لیے مرزا رحمت اللہ بیگ کی شاگردی اختیار کی اور یہ وہی صاحب تھے جن کی شاگردی میں آنے کے لیے مغلیہ خاندان کے شہزادے منتیں مانا کرتے تھے۔ اسی طرح گھڑ سواری آپ نے میاں رحیم بخش چابک سوار سے سیکھی۔ یہ اپنے دور کے مانے ہوئے چابک سوار تھے، جو اپنے شاگرد سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے حلقے میں شامل ہو گئے اور ان ہی کی جلو میں سرحد پار پہنچ کر جام شہادت نوش

کیا۔ شاہ صاحب نے اپنے مکان کے قریب باقاعدہ اکھاڑہ قائم کیا اور دن رات لنگر لنگوٹ کس کر، کسرت کرنے میں مصروف رہے۔ دریائے جمنا میں پیراکی کا سلسلہ شروع کیا تو مہینوں یہ مشغلہ جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری کر چکے تھے۔ چنانچہ طلبہ کو ہدایت تھی کہ وہ کتابیں لے کر جمنا پر پہنچا کریں۔ شاگرد کتابیں لے کر جمنا کے کنارے پہنچ جاتے۔ استاد تیرتا ہوا آتا۔ سبق دیتا اور پھر پانی میں گم ہو جاتا۔ وہ سانس پر کنٹرول کی مشق کے لیے دہلی سے آگرے تک تیرتے ہوئے جاتے۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی مشق شروع کر دی۔ مئی اور جون کی جھلسا دینے والی دھوپ اور گرمی میں مسجد فتح پوری کے صحن میں ننگے پاؤں کئی کئی گھنٹے چلنے کی مشق کرتے۔ پھر نشانہ باندھنا اور بندوق چلانا شروع کی تو اس میں کمال حاصل کیا۔ خود ہی کہا کرتے تھے: ''ناممکن ہے کہ جانور میرے سامنے آئے اور پھر زندہ بچ نکلے''۔ ایک مرتبہ کسی دوست نے کہا کہ اگر اس کو موت ہی نہ آئی ہو تو آپ کیسے مار ڈالیں گے، تو بولے ''اگر اس کی موت نہ آئی ہوگی تو میرے سامنے آئے گا ہی نہیں''۔

علمی مرتبہ:

شاہ صاحب کی علمی بصیرت کے مختلف واقعات مشہور ہیں۔ کون سا علمی حلقہ ایسا تھا یا ہے جو ان کے علمی تبحر کا معترف نہ ہو۔ آپ کے وعظ میں عام باشندوں کے ساتھ خود اہل علم بہت بڑی تعداد میں شریک ہوتے۔ ''سوانح احمدی'' میں درج ہے کہ ایک مرتبہ ایک رکوع تلاوت کی۔ مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خان اور مفتی صدر الدین آزردہ بھی اس وعظ میں شریک تھے۔ اس رکوع کی تفسیر میں ایسے عجیب وغریب نکات بیان فرمائے کہ سب ششدر رہ گئے اور دوبارہ سننے کے متمنی ہوئے، لیکن جب دوسری دفعہ شاہ صاحب نے اسی رکوع کی تفسیر بیان کی تو اس میں کئی ایسے نکات بیان فرمائے گئے جو پہلے سے بھی زیادہ عجیب تھے۔

اسی طرح ایک دن کا واقعہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کوئی فتویٰ تحریر کر رہے تھے۔ اسی دوران اٹھ کر کسی کام سے اندر جانے کی ضرورت پیش آ گئی اور یوں ہی فتویٰ لکھتے لکھتے چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ اتنے میں شاہ اسماعیل وہاں پہنچے۔ انہوں نے فتوے پر نگاہ ڈالی اور اس کی بعض فروگزاشتوں کی اصلاح کر دی۔ شاہ صاحب جب باہر آئے تو انہوں نے فتوے میں اصلاح وترمیم دیکھی۔ بہت مسرور ہوئے اور فرمایا ''الحمد للہ ابھی ہمارے خاندان میں علم باقی ہے۔''

شاہ صاحب نے سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے بہت پہلے رسوم اور بدعات کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا، اس لیے کہ اس وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کی زندگی میں توہم پرستی اتنی زیادہ گھر کر گئی تھی کہ اس نے انسانی خوداعتمادی تک کو مجروح کر رکھا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنی پوری توجہ ان بدعات اور جہالت پر مبنی رسوم کے خاتمے کے لیے جدوجہد پر مرکوز کیے رکھی۔ سیّد صاحب کے ساتھ جب تحریک میں شریک ہوئے تو اس کی بنیاد بھی انہی بدعات کے خاتمے پر رکھی۔ مدتوں ان کے وعظ دہلی میں ایک متنازعہ مسئلہ بنے رہے۔ کچھ تھے جو ان کے وعظوں میں جان چھڑکتے اور کچھ تھے جو شاہ صاحب کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ یہی زمانہ ہے جس میں آپ کی مولانا فضل الحق خیر آبادی سے ٹھن گئی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کی مخالفت:

اس پہلی تحریک کے اکثر قائدین فن خطابت کے میدان کے شہسوار تھے۔سیّد احمد اور اسماعیل شہید دونوں کی خطابت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔شاہ صاحب کی خطابت کی دھاک ان کے پہلے وعظ ہی نے بٹھادی تھی۔ یہ جمعۃ الوداع کے موقع پر دہلی کی جامع مسجد میں کیا گیا تھا۔پہلے ہی وعظ میں انہوں نے دہلی کے مسلمانوں کی طرز زندگی پر کھلم کھلا حملے کا اعلان کر دیا،اور قرآن کی یہ آیت پڑھی (ترجمہ)''تیرے رب کی قسم! وہ مومن کہلانے کے مستحق نہیں،جب تک آپ اپنے تمام تنازعات میں آپ کو ثالث نہ مان لیں،پھر آپ جو کچھ فیصلہ فرمائیں،اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں،اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔''

یہ اصول تھا جس پر شاہ صاحب نے اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھی اور''جو بھی فعل اور تعلیم شرعی نصوص سے ثابت نہیں ہوتی،وہ درست نہیں ہے'' کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کو پرکھا اور بتایا کہ وہ کس طرح غیر اسلامی طریقے اختیار کیے ہوئے ہیں۔بہرحال حسن خطابت سے ایک ایک دل کو جھنجھوڑا۔اس میں شیفتگی اور وارفتگی کی آگ بھڑکادی اور یہی وہ آگ تھی جو ان وارفتگان کو کشاں کشاں ان کے وعظوں میں لے جاتی۔اب دہلی کی زبان پر ان کے جملوں کا رنگ چڑھنے لگا۔ان کے منہ میں شاہ اسماعیل کی زبان بولنے لگی۔عوام کا ہجوم ان کا شیدائی ہو گیا۔ لیکن وہ لوگ جن کی زندگیوں کا دارو مدار ان بدعات اور رسوم قبیحہ پر تھا،وہ ان وعظوں کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ان کو اسماعیل کیسے پسند آ سکتا تھا۔یہی نہیں بلکہ وہ عمائدین جو اپنی نام نہاد مقبولیت کے سہارے قرب سلطانی حاصل کرتے تھے،اسماعیل ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگے۔اسی فضا میں مولانا فضل حق خیر آبادی سے بھی ان کی ٹھن گئی مولانا خیر بادی فلسفہ اور منطق کے ماہر تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جو ریزیڈنٹ مغل بادشاہ کے دربار میں مقرر تھا،اس کے سررشتہ دار تھے۔ریزیڈنٹ بجا طور پر مولانا خیر آبادی کا بہت قائل تھا،کیونکہ علمیت میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا اور خود بادشاہ آپ کو بہت عزیز رکھتا تھا،احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔مولانا اپنے فارغ وقت میں سلسلۂ درس وتدریس بھی جاری رکھتے اور طلبہ کو منطق اور فلسفہ پڑھاتے تھے۔لیکن ان کی شاہ اسماعیل سے کیونکر ٹھن گئی اس قضیے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مولانا محمد میاں دہلوی اپنی تحقیقی تصنیف''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں لکھتے ہیں:

''بدقسمتی سے اس جماعت نے،جس کے ذاتی مفادات اور لوٹ کھسوٹ پر شاہ اسماعیل کے وعظوں اور تقریروں کا تباہ کن اثر پڑا،مولانا فضل حق خیر آبادی کا سہارا ڈھونڈا اور ان کو اپنا نام بنالیا۔مولانا فضل صاحب نے خود پسند اور بدخو نملط مولویوں کی طرح اول تو طلبہ کو لکھا پڑھا کر مولانا اسماعیل کے درس میں بھیجنا شروع کر دیا۔مگر جب اس کا اثر الٹا پڑا اور طلبہ جو خود بھی سخن فہمی کا سلیقہ رکھتے تھے،مولانا فضل حق سے جدا ہو کر شاہ اسماعیل کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے لگے تو مولانا نے خود شاہ اسماعیل کے وعظ،ان کے عقائد اور ان کی تحریروں پر حملے شروع کر دیئے اور وہ مسائل جن کا تذکرہ بھی عوام میں شرعاً جائز نہیں،مولانا فضل حق کی منطقی موشگافیوں سے عام مسلمانوں کے جنگ وجدل کا موضوع بن گئے۔مولانا فضل حق کے ان عام حملوں اور نکتہ چینیوں سے بھی شاہ اسماعیل کی مقبولیت

کے سیلاب کے آگے بند نہ باندھا جا سکا اور وہ نکتہ چینی کے خس و خاشاک کو بہاتا ہوا برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس پر باشندگانِ دہلی کے پندرہ سو دستخطوں سے ایک محضر نامہ مرتب کیا گیا۔ اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقرر کردہ ریذیڈنٹ کی بارگاہ میں بھیجا گیا۔ اس محضر نامے میں کہا گیا تھا کہ شاہ اسماعیل کے وعظ اور خطبے "نقص امن" کا باعث بن سکتے ہیں اور مسلمانوں کے ایک کثیر حلقے کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ امنِ عامہ کے نام پر زبان بندی کے احکام جاری ہو گئے اور وعظ و نصیحت پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن اس پابندی نے دہلی میں ہیجان بپا کر دیا اور لوگوں میں غم و غصہ پھیلنے لگا۔ چنانچہ خود شاہ صاحب نے ریذیڈنٹ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں اس پابندی کے خلاف احتجاج کیا گیا اور اس میں بتایا گیا کہ کس طرح وعظ سے نہیں بلکہ وعظ پر اس طرح کی پابندی سے نقصِ امن کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مراسلے میں شاہ صاحب نے اس پابندی کے خلاف کئی وجوہ قلم بند کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریذیڈنٹ نے پابندی کے احکام واپس لے لیے، لیکن پابندی کی منسوخی کے احکام سر رشتہ دار مولانا فضل حق خیر آبادی نے دبا لیے۔ جب شاہ صاحب کو اپنے مرسلے کا کوئی جواب موصول نہ ہوا، تو وہ خود ریذیڈنٹ سے ملے اور گفتگو کی۔ ریذیڈنٹ کو جب معلوم ہوا کہ پابندی کی منسوخی کے احکام دبا لئے گئے ہیں اور سر رشتہ دار نے ان تک پہنچائے ہی نہیں تو سر رشتہ دار کو تین دن کے لیے معطل کر دیا گیا۔ بالآخر چالیس روز کی پابندی کے بعد وعظوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا"۔

عوامی مقامات پر وعظ:

شاہ اسماعیل نے اپنے وعظ محض محراب و منبر ہی تک محدود نہ رکھے بلکہ گلی کوچوں، میلوں ٹھیلوں اور بازاروں میں پہنچ جاتے، وہاں لوگوں کو پند و نصیحت کرتے۔ جامع مسجد کی سیڑھیاں جہاں روزانہ بازار لگتا تھا، وہاں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ یہ سیڑھیاں تو مرکزی دارالارشاد کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں، اسی دارالارشاد کا ایک واقعہ ہے کہ شاہ اسماعیل انہی سیڑھیوں پر کھڑے وعظ کر رہے تھے کہ ایک ہیجڑے کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ وعظ سننے کے لیے رک گیا۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگی تھی۔ بانہوں میں چوڑیاں، پاؤں میں جھانجر اور سرخ جوڑا زیب تن کیا ہوا تھا۔ شاہ صاحب نے جب اسے دیکھا تو اسے خطاب کر کے وعظ کہنا شروع کر دیا۔ اس ہیجڑے کا یہ عالم ہوا کہ اس نے وہیں کھڑے کھڑے چوڑیاں توڑ ڈالیں، زیور اتار پھینکے اور ہاتھوں سے مہندی کی لالی مٹانے کے لیے ایک زور سے سیڑھیوں پر ہاتھ رگڑے کہ ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔ جب وعظ ختم ہوا تو توبہ کی اور شاہ اسماعیل کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ یہی ہیجڑا جہاد میں شاہ شہید کے ہمراہ گیا اور شہید ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدرسۂ رحیمیہ کے دروازے پر آپ کھڑے تھے کہ سامنے سے چند ہوش ربا مہ وشیں کھلے منہ، بناؤ سنگھار کیے، بہلیوں میں بیٹھی گزریں۔ معلوم ہوا کہ یہ مسلمان کسبیاں ہیں جو کسی رنڈی کے ہاں کسی رقص کی تقریب میں جا رہی ہیں۔ اس پر شاہ صاحب نے کہا کہ جب یہ مسلمان ہیں تو ہماری بہنیں ہیں۔ کیا خدا ہم سے نہیں پوچھے گا کہ اس قدر مسلمان عورتیں بدکاری اور زنا کاری میں گرفتار تھیں اور تم نے ان کو نصیحت نہ کی؟ اس واسطے اب تو میں ان کے مکان پر جا کر نصیحت کروں گا۔ دوستوں نے منع کیا کہ وہ وضع داری کے خلاف ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے رات کو فقیرانہ لباس پہنا اور چل پڑے۔ دروازے پر پہنچ کر

آواز دی ''اواللہ والیو! اواللہ والیو! خادمہ دوڑی ہوئی آئی، تم کون ہو؟ فرمایا، فقیر ہے، صدا سنائے گا اور تماشا دکھائے گا۔ وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ آپ نے مالکہ کو دریافت کیا کہ کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ بالا خانے پر مہمانوں کے ساتھ جشنِ نوروز منا رہی ہے۔ آپ وہیں تشریف لے گئے۔ اگرچہ لباس فقیرانہ تھا لیکن دلّی کا کون سا فرد تھا جو شاہ اسماعیل کو نہ پہچانتا ہو؟ جب رنڈیوں نے شاہ صاحب کو اپنے ہاں دیکھا تو ششدر رہ گئیں۔ ان کو مسند پیش کی اور آپ زمین پر بیٹھ گئیں۔ شاہ صاحب نے ان کو نصیحت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے توبہ کر لی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے:

تحریک کی کامیابی کے لیے مبلغ ہونا اور اپنے مسلک کے لیے جنون کی حد تک لگن کا اظہار بنیادی شرطیں ہیں۔ ان پر سیّد احمد جیسا پیر اور شاہ اسماعیل جیسا مرید دونوں ہی پورے اترتے ہیں۔ لیکن جو سعادت اس مرید کو حاصل ہوئی، وہ بہت کم مریدوں کو حاصل ہوئی ہے۔ بعض دفعہ تو خود مرشد اس مرید کی شہرت کے غبار میں گم ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے ''تذکرہ'' میں جس شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں شاہ صاحب کا ذکر کیا ہے، اس کی ایک جھلک دیدنی ہے:

''تجدید و تدوین، دعوت و اصلاح اُمت کے جو بھید کہ پرانی دہلی کے کھنڈروں اور فیروز شاہ کے کوٹلے کے حجروں میں دفن کر دیئے گئے تھے، اب اس سلطانِ وقت و سکندرِ عزم کی بدولت شاہجہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی، وہ اب سرِ بازار کی جا رہی اور ہو رہی تھیں۔ اور خونِ شہادت کے چھینٹے حرف و حکایت کو نقوش دیوار بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے:

آخر کو لائیں گے کوئی آفت، فغاں سے ہم
حجّت تمام کرتے ہیں، آج آسماں سے ہم

کیا اس وقت ہندوستان علم و فضل سے خالی ہو گیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہو گئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے! خود اس خاندانِ عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذہ علم و عمل موجود تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم و عمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضان علم کام نہ کر رہا ہوں۔ بایں ہمہ، یہ کیا معاملہ ہے کہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی۔ سب اور کاموں میں رہ گئے یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا، لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔

سیّد احمدؒ اور شاہ اسماعیلؒ کا اسلوبِ کار

1818ء سے لے کر اعلانِ جہاد تک تقریباً آٹھ سال کا عرصہ سیّد احمد اور ان کے رفقاء نے دعوت و تبلیغ اور تحریک و تنظیم میں گزارا، لیکن یہ اس کے باوجود یہ عرصہ دو قابلِ ذکر ادوار پر مشتمل ہے۔

ایک دور 1818ء سے لے کر 1823ء تک کا ہے اور یہ حج پر جانے سے پہلے کا دور ہے۔ اس میں پوری توجہ عقائد کی اصلاح کی طرف مرکوز رہی ہے۔ پورا عرصہ ملک گیر دوروں کے لیے سفر میں گزرا، جگہ جگہ جلسوں کا انعقاد، تنظیم او ربیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ تنظیم کا یہ دور ہماری سیاسی زندگی میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ مجلس احرار ہو یا جمعیت العلمائے ہند، یا کوئی اور جماعت، جس میں علماء اور مولوی شریک رہے ہیں، ان کا اسلوب کار یہی رہا ہے اور تو اور وہ سیاسی زعماء بھی، جو عالم دین نہ تھے، انہوں نے اپنی تحریکوں کے لیے یہی اسلوب اپنایا اور اس سے آگے ایک قدم نہ اٹھایا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اسلوب کوئی شعوری طور پر اپنایا گیا تھا، بلکہ یہ ہماری زندگی کی ایک روایت بن گیا تھا کہ پیر او رعالم اپنے مریدوں کو لے کر قریہ قریہ، گاؤں گاؤں گھومتا ہے۔ وہاں اپنے مریدوں کے ہاں ٹھہرتا ہے، جلسے کرتا ہے۔ انفرادی طور پر بھی توجہ دیتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی اپنا پیغام سناتا ہے۔ اس گاؤں یا قصبے کے وہ لوگ جو پیر، مرشد یا عالم کی شخصیت اور تعلیمات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور ان میں عمل کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، وہ آگے بڑھ کر بیعت کر لیتے ہیں۔ یہ بیعت اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ بیعت کرنے والے نے اپنے مرشد کا مسلک قبول کر لیا ہے اور جزئیات کی حد تک اس مسلک کی پیروی کرے گا۔ بعد میں جب سیاسی بیداری آئی اور مقاصد سیاسی قرار پائے" تو بیعت نے جماعتوں کی رکنیت کے فارم کی شکل اختیار کر لی، لیکن مسلمانوں میں حقیقتاً بہت دنوں تک جماعتی رکنیت بھی اس بیعت اور دعوت و تبلیغ کے پرانے اسلوب پر قائم رہی، ہماری سیاسی تحریکوں کے اسلوب اور کردار کے بارے میں آج تک کسی نے پوری دل جمعی کے ساتھ تجزیہ ہی نہیں کیا، حالانکہ یہ تجزیہ بذاتِ خود بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز ثابت ہو سکتا ہے۔

سیّد احمد اور شاہ اسماعیل کا اسلوبِ کار

سیّد احمد اور شاہ اسماعیل نے جب تحریک کا آغاز کیا تو ان کے پیش نظر ایک دینی تحریک کا احیاء تھا۔ ان کا مقصد سیاسی اقتدار کا حصول نہ تھا، بلکہ اصلی مقصد دین کا احیاء تھا، لیکن سیاسی اقتدار دین کے لیے اہم ذریعہ تھا اور شاہ ولی اللہ کے فکر نے انہیں یہی سکھایا تھا کہ خود دین کے اصولوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسی پائیدار حکومت قائم ہو جو ان اصولوں پر عمل درآمد کے ذریعے انسانوں کے اضطراب اور بے چینی کا ازالہ کر سکے، اسی لیے اس تحریک کی پہلی منزل عوام میں عقائد کی اصلاح کرنا تھا۔ عقائد کی اصلاح کے لیے اپنی زندگیوں کو ان عقائد کا عملی نمونہ بنانا تھا، تاکہ یہ جذبہ عمل پیدا کر دے۔ صرف قائدین کی زندگیاں ہی خود ایک پیغام مجسم ہوں، ایک مثال روشن ہوں، ایک نشان متحرک ہوں جس کی پیروی کی جا سکے، بالکل اسی طرح جس طرح اسلام کے ابتدائی دنوں میں رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ فقط اسی مشعل نے دنیا کے اکثر خطوں کو منور کیا اور اسلام کا پرچم گاڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے رہنماؤں نے اگر اپنے مریدوں سے یہ کہا کہ اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جائے تو وہ دوسری شادی کر لے اور (ہندوؤں کی طرح) بیوگی کی زندگی بسر نہ کرے، تو سب سے

پہلے اس تعلیم کو اپنے اوپر لازم کیا اور خود اس کا نمونہ پیش کیا۔ اس قسم کے اقدام ان تمام تحریکوں کے بنیادی ہوتے ہیں جو دینی ہوں اور جن کے قائدین نے سیاسی تبدیلیوں کا دعویٰ نہیں، بلکہ معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہو۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جو حالات تھے اس وقت تمام سیاسی تبدیلیوں کے باوجود کوئی ایسی عوامی تحریک جنم نہیں لے سکتی تھی جس کا انحصار اور بنیاد دینی اصلاح پر نہ ہو اور جو مذہبی تحریک نہ کہلائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ پہلی سیاسی تحریک تھی۔ دینی تحریکوں کا سلسلہ صرف مسلمانوں ہی میں شروع نہیں ہوا، بلکہ خود ہندوؤں میں بھی سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی نہیں، بلکہ مذہبی تحریکیں ہی ابھریں۔ ان ہی کے ذریعے سیاسی شعور بیدار ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں مذہبی دعوت وتبلیغ کے لیے ذاتی کردار اور نجی زندگی کی مثالیں اہم قرار پاتی ہیں۔

نجی زندگی کی مثالیں

یہی ضرورت تھی جس کے تحت سیّد احمد نے خود اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کیا اور اس طرح مسلمانوں میں نکاح بیوگان کی مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں: ''سیّد صاحب نے احیائے سُنّت کے جو ممتاز کارنامے انجام دیئے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے گھر سے نکاح بیوگان کا آغاز کیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ میل جول میں جو معیوب اور سراسر غیر شرعی رسمیں اختیار کر لی تھیں، ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ کسی خاتون کا شوہر فوت ہو جاتا ہے تو ضرورت کے باوجود دوسرا نکاح نہ کرتی، بلکہ ایسے نکاح کو نجابت اور شرافت کے منافی سمجھا جاتا۔ خصوصاً اونچے گھرانوں میں تو اس کا تصور بھی موجب ننگ تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے تک مسلمانوں میں یہ بری رسم نہ تھی۔ خود اکبر نے بیرم خان کی بیوہ سلمہ سلطان بیگم سے نکاح کیا جو بادشاہ کی عم زاد بہن تھی۔ سلمہ سلطان بیگم زندگی کی آخری سانس تک شاہی محل کی ممتاز ترین ہستی سمجھی جاتی رہیں۔ جہانگیر نے نور جہاں سے بیوگی کی حالت ہی میں شادی کی تھی۔ اس وقت نور جہاں کی عمر کم وبیش چونتیس برس تھی''۔

یہ بری رسم مسلمانوں میں بعد میں رواج پائی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جو ہندو اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، وہ اپنی پوری رسموں پر بھی قائم رہے اور ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان خاندانوں میں بھی یہ رسم جڑ پکڑ گئی جو ظہور اسلام کے وقت سے چلے آتے تھے۔

سیّد صاحب کے منجھلے بھائی سیّد محمد اسحاق کی بیوہ جوان تھیں۔ ان کا صرف ایک بچہ تھا جس کی عمر بمشکل چھ سات برس ہوگی۔ سید صاحب نکاح بیوگان کا اجراء چاہتے تھے۔ احیائے سُنّت اور تجدید شیوۂ اسلامیت کے سلسلے میں وعظ وتبلیغ سے بڑھ کر فائدہ عملی اقدام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس بنا پر خود ہی اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی زمانے کی ایک روایت ہے کہ سیّد احمد نے ایک خواب دیکھا جس میں ایک بوجھل اور بہت وزنی لکڑیوں کا گٹھا زمین پر پڑا ہے اور ایک ہجوم ہے جو اس کو اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن کوئی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس موقع پر آپ کی بھاوج بھی موجود ہیں۔ سیّد احمد نے ان کو اپنے ساتھ گٹھے کو اٹھانے کے لیے راضی کر لیا اور سیّد احمد اور سیّد اسحاق دونوں مل کر اس گٹھے کو اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس خواب کے بعد آپ نے اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کا ارادہ پختہ کر لیا۔

بیوہ بھاوج سے شادی

اس شادی کے سلسلے میں سیّد احمد کو اپنے خاندان والوں اور خود اپنی بھاوج کو قائل کرنا پڑا، اور دعوت وتبلیغ کا سلسلہ خود اپنے خاندان سے شروع ہوا۔ اپنے گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے اپنی بھاوج کو نکاح ثانی کے لیے مجبور کیا۔ وہ اس کے لیے راضی نہ تھیں، لیکن جب انہیں احیائے سُنّت کی دلیل دی گئی تو وہ تیار ہوئیں۔ لیکن سیّد صاحب سے وعدہ لے لیا کہ وہ آئندہ ان کی اجازت کے بغیر کسی اور عورت کو نکاح میں نہ لائیں گے۔ چنانچہ سیّد صاحب نے یہ وعدہ کیا اور پوری زندگی اس پر کاربند رہے۔ جہاد کے دوران جب تیسرا نکاح کرنا چاہا تو اس وقت تک نکاح نہیں پڑھا گیا، جب تک کہ ان سے تحریری اجازت حاصل نہیں کر لی۔

سیّد صاحب نے اپنی اس نکاح کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی اور خود اپنی نئی بیوی سیدہ ولیہ سے کہا کہ وہ اپنے نکاح کی شیرینی خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کریں اور اعلان کریں کہ یہ ان کے دوسرے نکاح کی مٹھائی ہے، تا کہ عام عورتوں میں نکاح ثانی کے سلسلے میں جو نفرت کا جذبہ موجود ہے، وہ دور ہو جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سیّد احمد کے ایماء پر شاہ اسماعیل نے تمام مریدوں کو خطوط لکھے جن میں اس نکاح کی اطلاع دی گئی۔ اس طرح ان علاقوں میں یہ نکاح بیوگان کی مہم چل نکلی۔ اسی سلسلے میں خود شاہ اسماعیل نے بھی ایک مثال قائم کی۔ یہ ان کی بڑی بہن رقیہ کی طرف سے پیش کی گئی۔ شاہ اسماعیل کی بہن کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی۔ ان کو بیوہ ہوئے بھی خاصا وقت گزر چکا تھا۔ وہ سن یاس کو پہنچ چکی تھیں۔ نکاح ثانی کی کوئی حاجت بھی نہ رہی تھی، لیکن شاہ صاحب نے صرف مثال قائم کرنے کے لیے بڑی بہن کو نکاح ثانی پر راضی کر لیا اور مولانا عبدالحی کے ساتھ ان کا نکاح ثانی پڑھوایا گیا۔

اصلاحِ عقائد میں شمشیرِ برہنہ

تحریکوں کے لیے جس جنون کی ضرورت ہوتی ہے، اس تحریک کے قائدین میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ بدعات اور پیر پرستی کے خلاف ہندوستان میں غالباً پہلی تحریک تھی جس نے عوام میں جا کر ان بدعات کو ختم کرنے اور ان کے خلاف فضا پیدا کرنے کی ابتدا کی اور اس سلسلے میں بادشاہ ہو یا فقیر، کوئی بھی ان قائدین کی تبلیغ سے محروم نہیں رہا۔ اس ضمن میں ایک نہایت ہی اہم روایت موجود ہے کہ جامع مسجد دہلی کے شمال مشرقی گوشے میں ایک حجرہ مقفل رہتا تھا۔ اس میں کچھ تبرکات رکھے ہوئے تھے۔

یہ اکبر شاہ ثانی کا دورِ حکومت تھا۔ یہ وہی اکبر شاہ ثانی تھا جس کی حکومت کا حدود اربعہ قلعہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ تھا۔ یہ تبرکات ایک مقررہ دن اور مقررہ وقت پر بادشاہ کے پاس دربار میں لے جائے جاتے۔ بادشاہ اپنی توفیق کے مطابق نذر پیش کرتا اور مجاور بادشاہ کو سلام کر کے تبرکات کو واپس حجرے میں لے آتے اور حجرے کو مقفل کر دیا جاتا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ شاہ اسماعیل اس موقع پر جامع مسجد میں وعظ کر رہے تھے کہ تبرکات حجرے میں سے نکالے گئے اور اکثر لوگ ان کے احترام میں سروقد ہو گئے، لیکن شاہ اسماعیل بدستور منبر پر بیٹھے رہے۔ مجاوروں اور کچھ لوگوں نے اس حرکت کو بے ادبی پر محمول کیا اور شاہ صاحب پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ کچھ جنونی تو ان پر حملے کے لیے آگے بڑھنے لگے، لیکن شاہ اسماعیل کے حامیوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ مجاوروں نے یہ واقعہ ہو بہو بادشاہ

سے بیان کیا اور خوب کان بھرے۔ بادشاہ اور اس کا خاندان شاہ ولی اللہ کا عقیدت مند تھا، لیکن اس کو بھی اس بے ادبی کا سخت رنج ہوا۔ اس نے شاہ اسمٰعیل کو دربار میں طلب کر لیا۔

شاہ صاحب دربار میں پہنچے اور اس واقعے کی جواب طلبی میں نہ صرف اس واقعے کی صحت کو تسلیم کیا بلکہ کہا کہ میں نے اس موقع پر یہ بھی کہا تھا کہ یہ تبرکات مصنوعی ہیں۔ بادشاہ اس پر طیش میں آ گیا اور کہنے لگا کہ یہ تو تعجب کی بات ہے کہ آج ان تبرکات کو مصنوعی بتایا جا رہا ہے۔ شاہ اسماعیل نے اس پر جو جواب دیا، وہ یہ تھا کہ ان کے مصنوعی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ یہ تبرکات سال میں دو دفعہ بادشاہ کی زیارت کو آتے ہیں، لیکن بادشاہ ان کی زیارت کے لیے کبھی نہیں گیا۔ اس پر بادشاہ لاجواب ہو گیا۔ شاہ صاحب نے اسی پر بس نہ کیا، بلکہ بادشاہ سے کہا کہ کسی شخص کو حکم دیا جائے کہ وہ قرآن شریف اور حدیث کی کتاب لائے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ شاہ صاحب نے قرآن اور حدیث شریف دونوں کو ہاتھ میں لے کر واپس کر دیا اور کہنے لگے، کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ قرآن شریف کتاب اللہ ہے اور بخاری شریف کلام رسول اللہ ہے، جس کو اُمت نے قرآن پاک کے بعد تمام کتابوں میں صحیح تر تسلیم کیا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ان دونوں کے احترام میں کوئی کھڑا نہیں ہوتا اور یہ تبرکات جن کے متعلق کوئی سند نہیں، اس قدر احترام کے لائق ہوئے۔ یہ صرف بعض لوگوں کا خیال ہے۔ ان کے متعلق اتنے احترام کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بادشاہ یہ سب باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اسی موقع پر شاہ اسماعیل نے بادشاہ کی توجہ ان کی کلائیوں میں پڑے ہوئے سونے کے کڑوں کی طرف بھی دلائی اور کہا کہ اسلام نے مردوں پر سونا پہننا حرام کیا ہے۔ بادشاہ نے اسی وقت یہ کڑے اتار دیے۔ اسی طرح پاس بیٹھے ہوئے شہزادے کو بھی داڑھی رکھنے کی تلقین کی۔

جہاد سے پہلے حج

نکاح بیوگان، قبر پرستی کی مخالفت اور دوسری بدعتوں کے خلاف مسلسل مہم، یہ اس تحریک کے بنیادی اصول تھے اور انہی کی تلقین سے یہ عام مسلمانوں میں ایک نئی زندگی کے آغاز کے خواب دیکھ رہے تھے۔ سید احمد اور ان کے رفقاء نے تقریباً پانچ برس تک ہندوستان کے مختلف گوشوں میں انہی بنیادوں پر وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رکھا اور صرف وعظ و نصیحت ہی تک یہ سلسلہ جاری نہ رہا، بلکہ اس تحریک کو الگ صورت دینے کے لیے تصوف کا ایک نیا طریق، جو اس تحریک سے مخصوص تھا، شروع کیا۔ یہ "طریق محمدیہ" تھا جو غالباً خاص طور پر دوسرے طریقوں سے الگ کیا گیا اور تحریک جہاد کی تنظیمی ڈھانچے کے لیے اپنایا گیا، ورنہ الگ سے کوئی اپنا طریق مخصوص کرنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا، کیونکہ اس وقت ہندوستان میں تین طریق رائج تھے، قادری، نقش بندی اور چشتی۔ مجدد الف ثانی کا سلسلہ جو ایک خاص اہمیت کا حامل تھا، اگرچہ مجددیہ کہلاتا تھا، مگر وہ بھی سلسلہ نقشبندیہ ہی کا ایک حصہ مانا جاتا ہے، لیکن سیّد احمد نے بیعت کا سلسلہ شروع کیا تو آپ ان تینوں سلسلوں اور طریقوں کے علاوہ ایک چوتھے طریق میں بیعت لیتے تھے اور اس کو وہ خود "طریق محمدیہ" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس طریق خاص کے متعلق ایک بار سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا: "یہ طریق محمدیہ خدا کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ زندگی کا ہر کام صرف رضائے الٰہی

کے لیے کیا جائے۔ انسان رزق حلال حاصل کرے، اس سے خود استفادہ کرے اور اپنے اہل و عیال کو وہی رزق حلال کھلائے۔ تہجد پڑھے، نماز فجر بھی اوّل وقت ادا کرے۔ اسی طرح تمام احکام الٰہی اور سب سے بڑے حکم یعنی جہاد کی تعمیل کرے۔ غرض چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے ہر مرحلے پر خدا کی خوشنودی پیش نظر رہے۔ اب کسی بستی میں جب ایک شخص اس طریقِ محمدیہ میں شامل ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ اس نے ایک ایسی زندگی اپنانے کا اعلان کیا ہے جو باقی آبادی سے مختلف ہوگی، اور کسی تحریک کی رکنیت کا مطلب بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو دوسروں سے الگ کر کے ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کو دعوت دیتا ہے کہ دیکھو میں نے یہ زندگی اپنائی ہے، اس میں تمہارے لیے بھی دعوت ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریقِ محمدیہ دراصل ایک تحریک اور ایک جماعت کے ڈھانچے کا نام تھا اور یہ ڈھانچا بعد میں بہ طریقِ احسن استعمال ہوا۔

جہاد سے پہلے حج کیوں؟

بدعات کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے پانچ برس کا عرصہ لگ گیا، لیکن اس پوری مدت میں ساتھ ساتھ ایک باقاعدہ تنظیم کا ڈھانچہ بھی تیار ہو گیا، اور کسی ایک لمحے کے لیے بھی جہاد کے متعلق سست روی سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ اصل مقصد "جہاد" کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ ہر دعوت اور ہر جلسے میں اپنے مقاصد کی اشاعت کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ لیکن اس کے باوجود جہاد اور ہجرت سے بھی پہلے آپ نے حج کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے متعلق مولانا غلام رسول مہر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ فیصلہ آنا فانا اور اچانک ہوا۔ لکھتے ہیں:

"سید صاحب نے نواب امیر خان (آف ٹونک) سے الگ ہو کر جہاد کے لیے جس مستقل تنظیم کا فیصلہ کیا تھا، وہ اس حد تک پوری ہو چکی تھی کہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے ایک آزاد مقام پر جا بیٹھیں۔ اس طرح اصل کام بھی شروع کر دیتے اور تنظیم کو ساتھ ساتھ پورے اہتمام سے چلاتے۔ چنانچہ لکھنؤ میں مراجعت کے تھوڑے دنوں بعد آپ نے اپنے رفقائے خاص یعنی شاہ اسماعیل شہید، مولانا عبدالحیی اور بعض دوسرے اصحاب کو رائے بریلی سے رخصت فرما دیا تھا کہ اپنے خانہ خانگی معاملات کے انتظامات سے پوری فراغت حاصل کر لیں، تاکہ اطمینان اور دل جمعی سے جہاد میں مشغول ہو سکیں، اہل و عیال یا جائیدادوں کی کوئی الجھن ان کی یکسوئی اور لگن میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ راہِ ہجرت میں قدم اٹھانے کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا۔ صرف انتظار یہ تھا کہ جن اصحاب کو ساتھ جانا ہے، وہ فارغ ہو کر پہنچ جائیں۔ اسی اثنا میں اچانک آپ نے حج کا ارادہ فرما لیا۔"

چنانچہ اس ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز نماز اشراق کے بعد آپ مسجد تکیہ رائے بریلی کی چھت پر چلے گئے۔ وہاں سے آواز دی کہ سب لوگ چھت پر آ جائیں۔ تمام مرید، عقیدت مند، جو اس وقت مسجد کے صحن میں موجود تھے، تعمیل کرتے ہوئے چھت پر چلے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب مسجد کی چھت کی منڈیر پر جو گھٹنوں تک اونچی تھی، دونوں ہاتھ ٹیکے کھڑے ہیں اور ندی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ پھر ارادت مندوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ہم حج کے لیے چلیں گے۔ اس پر سب عقیدت مندوں اور مریدوں کو حیرانی ہوئی اور انہوں نے دریافت کیا کہ آپ نے تو ہجرت کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جواب دیا کہ اب اللہ کی مرضی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے۔

تبدیلیٔ عزم کا پس منظر

اس عزم میں تبدیلی کی کیا وجہ تھی؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا موقف یہ ہے کہ اس ضمن میں شاہ عبدالعزیز کی ہدایت اور رہنمائی کارفرما تھی اور انہوں نے اس تحریک کو بین الاقوامی روابط کے قیام اور اس میں وسعت نظر لانے کے لیے طے کیا تھا کہ پہلے حج کیا جائے اور پوری جماعت کے ساتھ کیا جائے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ اس تبدیلی میں بھی وہی جذبہ کارفرما تھا جو عام بدعات کے خلاف مہم میں تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ یکایک ارادہ کیوں بدلا؟ کیوں ضروری سمجھا کہ اقدام جہاد سے پہلے حج کریں؟ کیا جذبہ ادائے فرض اس سلسلے میں محرک بنا تھا؟ یہ جذبہ بجائے خود کتنا ہی قابلِ قدر ہو، لیکن جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سیّد صاحب کے مالی وسائل اس قابل نہ تھے، اور آپ نے حج کے لیے صلائے عام کی جو شرط لگائی تھی، اسے تو اس شرط سے قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی، پھر وہ کس وجہ سے اس طرف متوجہ ہو گئے؟ میرے نزدیک اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ علمائے ہند کے ایک گروہ نے بحری سفر میں (پرتگیزی اور فرنگی قزاقوں کے ہاتھوں) اندیشۂ ہلاکت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔ سیّد صاحب لکھنؤ میں تھے، جب اس قسم کا فتویٰ ان کے سامنے پیش ہوا تھا۔ شاہ اسماعیل نے اسے سختی سے رد کرتے ہوئے حج کو فرض قرار دیا تھا۔''

عبداللہ ملک صاحب بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں: ''چنانچہ ایک شخص منشی خیرالدین نے اس اصل فتویٰ اور اس کے رد کو شاہ عبدالعزیز کے پاس بھیجا۔ غالباً اسی واقعے سے مولانا سندھی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس غلط رجحان کو ختم کرنے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے سیّد احمد اور ان کی جماعت کو حج کے لیے ہدایت کی ہوگی اور اس سفر مبارک میں دوسرے فوائد بھی دیکھے ہوں گے جو تحریک کے اصل مقاصد کے لیے بھی مفید ہو سکتے ہوں گے۔ اسی لیے مولانا مہر نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ مسئلہ سیّد صاحب کے پیشِ نظر ہوگا۔ وہ سوچتے رہے ہوں گے کہ اس فتنے کے سدِ باب کے لیے مؤثر ترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔ شریعت کی بناء پر اس کا رد کس طرح کیا جا سکتا تھا، لیکن اتنا کافی بھی نہ تھا۔ دینی حمیت کا چراغ بجھ رہا تھا۔ استعدادِ عمل نحیف ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں بہانہ ساز طبیعتوں کے لیے غلط اور بے سروپا توہمات بھی ادائے فرض سے کنارہ کشی کی بہت بڑی دستاویز بن سکتے تھے۔ غور و فکر کے بعد سیّد صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ خود حج کریں اور مسلمانوں کے صلائے عام دیں کہ جس کا جی چاہے تیار ہو جائے، خواہ اس کے پاس خرچ ہو یا نہ ہو۔ میں اپنی ذمہ داری پر سب کو حرمین شریفین پہنچاؤں گا اور اللہ کے فضل و کرم سے حج کرا کے واپس لاؤں گا۔''

تحریکوں کی کامیابی کے اصول

تحریکوں کو مقبول اور محبوب بنانے کے لیے بعض اقدام گو بظاہر بہت ہی معمولی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے نتائج بہت دُور رس ہوتے ہیں۔ یہی حال سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد کے بعد اقدام کا تھا۔ حج کے لیے یہ صلائے عام مسلمانوں میں ایک عوامی تحریک کو مقبول و محبوب بنانے کے لیے بہت بڑی ضمانت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس اقدام نے

تحریک کی مقبولیت میں یکدم کئی گنا اضافہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور غلط رجحان، جو جڑ پکڑ رہا تھا، اس کے خلاف بھی عملی جدوجہد کا آغاز ہو گیا، کیونکہ حج پر جانے کے بارے میں بعض علماء کی جانب سے جو فتوے جاری کیے گئے، ان میں سب سے زیادہ زور زندگی کے خطرے کے پیشِ نظر اس فرض کو ساقط کرنے پر دیا گیا تھا۔ اب ادھر سید صاحب کی پوری تحریک کی کامیابی کا دارومدار اس عزم پر تھا کہ مسلمانوں کو موت کا خوف نہ رہے اور وہ اللہ کی راہ میں بغیر کسی جھجک کے اپنی جان کی بازی لگانے پر تُل جائیں، ان میں سے موت کا خوف اٹھ جائے، کیونکہ جہاں سمندر، پرتگیزی اور فرنگی بحری قزاقوں کا خوف جگہ پکڑ لے اور حج جیسے فریضے سے جان چھڑائی جائے، وہاں جہاد کی کامیابی کا کیا امکان رہ جاتا!

سید احمد نے دور دراز کے مریدوں ہی کو اپنے ساتھ چلنے پر نہیں ابھارا، بلکہ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بھی ہم سفر ہونے کے لیے کہا۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ اس اثنا میں سیّد صاحب نے اقربا کو دعوتِ عام دے دی، خواہ وہ تکیہ میں رہتے تھے یا قطعے میں، نصیر آباد میں رہتے تھے یا جائس میں، بلکہ رائے بریلی کے پٹھانوں اور عام مسلمانوں سے بھی کہا کہ جس جس کا جی چاہے تیار ہو جائے، خرچ کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی۔ زیادہ تر اقربا ابتدا میں کچھ متشوش اور متامل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ علماء نے تو بحری سفر پرامن نہ ہونے کی بنا پر اہل ثروت پر بھی حج فرض ہونے سے انکار کر دیا ہے، اپنے آپ کے پاس تو ایک دن کا بھی خرچ موجود نہیں۔ پھر کیوں عزیزوں کو خراب اور پریشان کرنے کے درپے ہیں؟ لیکن سیّد صاحب سب سے کہتے تھے کہ ساری تنگی رائے بریلی میں ٹھہرے رہنے تک ہے۔ یہاں سے نکلیں گے تو دیکھ لینا، خدائے قدیر کس طرح ہر ضرورت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ میں ہر شخص کو پہلے حرمین شریف پہنچواؤں گا اور خود سب سے آخر میں جاؤں گا۔

تحریکوں کے مادی وسائل

تحریکوں کو مالی اعانت کے لیے ایک نہ ایک طریقے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ سیّد احمد نے بھی مالی اعانت پر انحصار کیا، لیکن یہ نہیں کہا کہ پہلے مالی اعانت حاصل ہو جائے، اس کے بعد تحریک کا کام شروع ہو۔ دراصل جب بھی کوئی تحریک عوام کی خواہشات، ان کے اضطراب اور ان مطالبات اور تقاضوں کے لیے منظم ہوتی ہے تو پھر عوام و خواص اس کی مالی اعانت بھی کرتے ہیں۔ یہی حال اس وقت اس تحریک کا ہوا۔ سیّد صاحب نے جس وقت یہ کہا کہ رائے بریلی سے باہر نکلنے کی دیر ہے، یہ سب تنگی دور ہو جائے گی تو ان کو عوام میں اپنی تحریک کی مقبولیت کا احساس تھا۔ ان کو یقین تھا کہ لوگ خود بخود اس تحریک کی امداد کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے اور بذاتِ خود اتنی بڑی جماعت کا اجتماعی طور پر اہل و عیال کے ساتھ حج پر روانہ ہونا بہت بڑا اقدام تھا۔ یہ اقدام ارد گرد کے تمام علاقوں میں اس تحریک کی تشہیر کا باعث ہو گا۔ جس سے ان کی ہمدردیاں حاصل ہوں گی اور ہوا بھی یہی کہ یہ قافلہ جس وقت رائے بریلی سے چلا تو چاروں طرف بے سرو سامانی تھی۔ بعض گوشوں میں یاس و نا امیدی بھی تھی اور چہ مگوئیاں بھی تھیں۔ ایک کہتا کہ میرے پاس صرف تین منزل کا خرچہ ہے۔ دوسرا کہتا کہ میرے پاس تو اس کا ایک حصہ بھی نہیں ہے۔ خدا جانے مجھ پر کیا گزرے گی۔ تیسرا کہتا، میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ مساکین کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، وہ منزل مقصود

پر کیسے پہنچے گے اور انہیں قوت لا یموت کیسے ملے گی؟

لیکن سیّد صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ اس بے سروسامانی میں بھی اپنے قافلے کو ہدایات دے رہے تھے کہ کسی سے سوال نہ کرو، تقویٰ کو شعار بناؤ، پختہ ارادہ کرلو کہ مزدوری کریں گے، جو کچھ ملے گا، اس میں سے آدھا کھانے کے مصرف میں لائیں گے۔ آدھا زادِراہ کے لیے بچائیں گے۔ میں اپنے حج کو اپنے ہمراہیوں کے حج پر مقدم نہ کروں گا۔ اگر زادِراہ کم ہوگا تو آگے کی جانب تھوڑے تھوڑے ساتھی بھیجتا جاؤں گا۔ جب سارے ساتھی چلے جائیں گے، تب خود جاؤں گا، لیکن رب العالمین سے پوری امید ہے کہ سب کے لیے سامانِ سفر بخوبی درست ہو جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس پورے سفر میں یہی ہوا۔ جیسے جیسے لوگوں کو پتا چلتا کہ سیّد احمد کا قافلہ پہنچ رہا ہے وہ پہلے ہی سے استقبال کے لیے جمع ہو جاتے۔ اس پورے قافلے کو اپنے ہاں ٹھہراتے، ان کو کھانا کھلاتے، نذر پیش کرتے، جس سے سفر کی کفالت ہو جاتی۔ غرضیکہ یہ قافلہ حج کے لیے چلا، لیکن راستے بھر اس نے تحریک جہاد کے لیے جتنی فضا پیدا کی، وہ غالباً پانچ برس میں نہیں ہوئی تھی۔ سیّد صاحب اور ان کے رفقاء ہر پڑاؤ پر اپنا تبلیغی کام بھی جاری رکھتے، لیکن اس پوری تحریک کا منشور خود پہلے ہی پڑاؤ پر سیّد احمد نے اپنے ایک وعظ میں بیان کیا۔

جہاد کا اعلان نامہ

سیّد احمد نے اس پوری تحریک کا منشور خود پہلے ہی پڑاؤ پر اپنے ایک وعظ میں بیان کیا، جو مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب میں سیّد احمد ہی کے الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ تحریک کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے سیّد صاحب نے فرمایا:

سیّد صاحب کا پہلا وعظ

''بھائیو! اگر آپ اپنے گھر بار چھوڑ کر اس نیت سے حج اور عمرے کے لیے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو، تو یہ لازم ہے کہ آپس میں ایسا اتفاق اور تعلق رکھیں جیسے ایک ماں باپ کے بیٹے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی راحت کو اپنی راحت اور ہر ایک کے رنج کو اپنا رنج سمجھیں۔ ہم ایک دوسرے کے کاروبار میں بلا تکرار حامی و مددگار ہیں۔ ایک دوسرے کی خدمت کو ننگ و عار نہ جانیں، بلکہ عزت و افتخار سمجھیں۔ یہی کام اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے ہیں اور جب ایسے اخلاق آپ میں ہوں گے تو غیر لوگوں کو بھی شوق ہوگا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں شامل ہونا چاہیے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے فضل پر کامل بھروسہ کریں۔ کسی مخلوق سے کسی چیز کی آرزو نہ رکھیں۔ رازق مطلق اور حاجت روائے برحق وہی پروردگار عالم ہے۔ بے حکم اس کے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ دیکھو تو جس وقت بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون اسے روزی پہنچاتا ہے؟ وہی بچے کو آسانی سے باہر لاتا ہے اور اس سے پہلے ماں کی چھاتیوں میں (دودھ) اس کی روزی تیار رکھتا ہے۔ پھر اسی کی تعلیم سے بچہ دودھ پیتا ہے۔ جتنا چاہتا ہے، پی لیتا ہے۔ باقی دودھ مکھی، بال اور گردوغبار سے بالکل محفوظ ماں کی چھاتیوں میں جمع رہتا ہے کہ بچہ جب چاہے، تازہ

تازہ بچے۔ یہ اسی پروردگار کی روزی رسانی ہے جو کچھ مدت بعد دودھ چھڑا کر اسے دوسری غذا کی تعلیم فرماتا ہے۔ اسی طرح پرورش یافتہ بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوتا ہے۔ جو روزی کسی کی تقدیر میں لکھی ہے، وہ بہرصورت بے شک وشبہ اسے پہنچے گا۔"

اللہ پر بھروسہ:

اپنے اس وعظ کو جاری رکھتے ہوئے، اہل قافلہ کو مخاطب کر کے کہا: "خود اپنی حالت پر نظر ڈالیے۔ ایک معمولی آدمی ہم لوگوں کو کھانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ چاہے جھوٹ ہی کہہ جائے، لیکن اس پر اعتماد کر کے ہم اپنے گھر کھانا پکانے کی ممانعت کر دیتے ہیں۔ اگر غازی الدین حیدر والی لکھنؤ وعدہ کرے کہ میرا فلاں امیر بیت اللہ شریف کو جاتا ہے، اس کے ہمراہ جو شخص جائے گا، اس کے زادِ راہ کا انتظام میرے ذمے ہوگا تو ہزاروں آدمی خوشی بخوشی جانے پر تیار ہو جائیں گے، وعدہ خلافی کا شک وشبہ اپنے دل میں نہ لائیں گے۔ مجھ سے شہنشاہ عالم، قادر برحق، رازقِ مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ اس سفر میں میرے ساتھ ہوں گے، ان کے کھانے اور کپڑے کے متعلق تو کچھ اندیشہ نہ کر، سب میرے مہمان ہیں اور شہنشاہ کا وعدہ سچا ہے۔ وعدہ خلافی کا خفیف سا بھی احتمال نہیں۔ پھر میں کیوں مہیج جانوں اور کس بات کا اندیشہ کروں؟ وہ آپ سب بھائیوں کی پرورش کر رہا ہے۔ سو حاصل کلام یہ ہے کہ جن بھائیوں کو یہ سب باتیں منظور ہوں، وہ میرے کہنے کو سچ جانتے ہوں تو میرے ساتھ چلیں، میں رنج و راحت میں ان کا شریک اور میری یہ باتیں اپنی عورتوں کو بھی سمجھا دیں اور کہہ دیں کہ اگر انہیں یہ منظور نہیں تو ابھی مکان نزدیک ہے۔ وہ تکلیف سفر موقوف کریں۔ سفر میں ہر طرح کی تکلیف اور مصیبت پیش آتی ہے اور راحت بھی ہوتی ہے۔ یہ باتیں اس غرض سے کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ پھر کوئی بھائی کسی بات کا گلہ شکوہ زبان پر نہ لائے۔ مجھے عنایات الٰہی سے قوی امید ہے کہ اس سفر باظفر میں اللہ تعالیٰ میرے، ہاتھوں لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا۔ ہزاروں لوگ جو شرک و بدعت اور فسق و فجور کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعائر اسلام سے مطلق نا آشنا ہیں، وہ پکے موحد اور متقی بن جائیں گے۔"

تحریک کے منشور کا تجزیہ:

سیّد صاحب کا یہ پہلا وعظ تھا جو انہوں نے اس قافلے کے روبرو کیا، جس کو لے کر وہ حج کو روانہ ہوئے تھے۔ یہ وعظ تحریک کے منشور کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اس کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔ سیّد صاحب نے اس خوف اور غلط رجحان کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدام ضروری سمجھا۔ ادھر شاہ عبدالعزیز نے اس غلط رجحان کی بڑی شد ومد سے مخالفت کی اور کہا کہ جن لوگوں نے فریضۂ حج کو ساقط قرار دیا ہے، ان کے سامنے فتوٰی کی دو چار مشہور کتابوں کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ان کتابوں کی سند ہرگز معتبر نہیں، اور جن معتبر کتابوں پر دین کا مدار ہے۔ ان سے یہ لوگ بہرہ ور نہیں۔ ان کے بیان کردہ حالات کی سند درجۂ اعتبار سے ساقط ہے اور ان کے لگائے ہوئے حکموں پر عمل پیرا ہونا سراسر گمراہی کا موجب ہے۔ جن حضرات نے آج فرضیت حج کے اسقاط کا فتوٰی دے دیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل نماز روزے کی معافی کا بھی حکم نہ لکھ دیں گے اور زکوٰۃ ان کے نزدیک بدرجۂ اولیٰ ساقط ہوگی"۔ شاہ عبدالعزیز

نے اس سلسلے میں مزید وضاحت کی اور فرمایا کہ اگرچہ جہاز بعض اوقات ڈوب بھی جاتا ہے لیکن چونکہ بالآخر سلامت منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے، اس لیے گاہ گاہ کی غرقابی کو اس فریضے کے خلاف دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

یہ پس منظر تھا جس کے تحت سیّد احمد اور شاہ اسماعیل اور دوسرے رفقائے کار نے فریضۂ حج کو لازمی قرار دیا اور اس فریضے کو اجتماعی طور پر سرانجام دینے میں بھی یہی راز پوشیدہ تھا کہ:

1۔ عوام میں بعض علماء کے پھیلائے ہوئے غلط رجحان کے خلاف مہم شروع کی۔

2۔ جان کے خطرے کو جو اہمیت دی جا رہی ہے، وہ ختم ہو اور عملی طور پر لوگ یہ محسوس کریں کہ جان دینے والا اور لینے والا اللہ ہے۔

3۔ یہ کہ اجتماعی طور پر حج سے تحریک کے نام لیواؤں میں یگانگت اور اخوت کے باہمی رشتے زیادہ مضبوط ہوں گے اور آگے چل کر تحریک کو مقبول بنانے میں زیادہ مدد و معاون ثابت ہوں گے۔

سیّد احمد اور ان کے رفقائے کار نے حج پر جانے کے سلسلے میں اپنی اس مہم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ مختلف عقیدت مندوں، مریدوں اور دوستوں کو پیغام بھیجے گئے۔ ان کو حج کے لیے تیار کیا گیا۔ ایک خط تمام مریدوں کے نام سیّد احمد نے لکھوایا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

''ہم واسطے ادائے حج بیت اللہ جاتے ہیں۔ جن جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو، انہیں اپنے ہمراہ لائیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہر ایک پر واضح کر دیں کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے نہ خزانہ، محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے جاتے ہیں۔ اس کی ذات پاک سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل سے ہماری مراد پوری کرے گا اور جہاں کہیں راستے میں واسطے حاجت ضروری کے خرچ نہ ہوگا، وہاں ٹھہر کر لوگ محنت مزدوری کریں گے۔ جب بخوبی خرچ جمع ہو جائے گا، تب وہاں سے آگے کو روانہ ہوں گے۔ عورتیں اور ضعیف مرد جو مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، ڈیروں کی نگرانی پر رہیں گے اور اس کے خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک ہوں گے۔''

حج کے لیے ادائیگی:

سیّد احمد 30 جولائی 1821ء کو ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ سیّد احمد نے کلکتہ ہو کر جانے کا طویل تر راستہ منتخب کیا، جس کے شاید دو اسباب تھے۔ اس گروہ میں عورتیں بھی تھیں اور ان کے لیے بمبئی سے جانے کی نسبت دریائی سفر زیادہ آسان تھا۔ علاوہ ازیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا بنیادی کام دہلی اور کلکتہ کے درمیانی علاقے میں زیادہ کامیاب ہوا تھا، جو اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ اس راستے میں ہر جگہ جہاں یہ جماعت گئی، اس کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا۔ جب انہوں نے آغاز سفر کیا ہے تو وہ بالکل قلاش تھے، مگر ان کے عقیدت مندوں نے اس قدر فیاضی کے ساتھ ان کی مدد کی کہ انہوں نے حجاز جانے اور وہاں سے واپس آنے کے لیے خاصے آرام سے سفر کیا اور وہاں بغیر کسی محتاجی کے رہے۔

اعلانِ جہاد:

سیّد صاحب 29 اپریل 1824ء کو حج سے واپسی پر رائے بریلی پہنچے۔ حج سے واپسی کے بعد سیّد صاحب

اوران کے رفقائے کار نے اپنی پوری توجہ تنظیم جہاد پر مرکوز کر دی۔ اب اس سے پہلے بھی یہ لوگ قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں گھوم پھر کر بدعت کے خلاف اور صحیح مسلمان بننے کے حق میں تحریک چلا رہے تھے۔ وہ تلقین کرتے تھے، بیعت لیتے تھے اور ان کو اپنے نظام میں شامل کرتے تھے، ان مریدوں اور معتقدین کی پوری زندگیوں، بود و باش کے طریقوں، ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے اور لین دین تک کو اس جماعت نے متاثر کیا اور یہ ایک فعال جماعت کے افراد کی حیثیت سے مسلمانوں کی ہر آبادی میں ممیز ہو گئے۔ یہ تمام اقدام اپنی جمعیت کو بڑھانے، اثر و رسوخ پھیلانے اور مسلمانوں میں حرکت پیدا کرنے کے لیے ضروری قرار پائے تھے۔ جب ان میں معتدبہ کامیابی حاصل ہوئی اور یہ یقین ہو گیا کہ ایک خاصی جمعیت اس جماعت کے مقصد کے خصوصی رنگ میں رنگی جا چکی ہے، تو پھر دوسرا قدم اٹھایا گیا۔ یہ حج کے لیے باجماعت جانے کا قدم تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام میں اسلام کے بتائے ہوئے تمام فرائض سے دلچسپی پیدا کی جائے اور ان فرائض کی ادائیگی میں تمام تکالیف برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے، اور سب سے بڑھ کر تنظیم کا ڈھانچا باقاعدہ منظم و قائم کیا جائے۔ باجماعت حج سے یہ کام بہت ہی احسن طریقے سے سرانجام پاتے تھے۔ تمام مراحل طے کرنے کے بعد ان قائدین کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اچھی خاصی جمعیت پیدا کر سکتے اور اس کو جہاد کے لیے میدان کارزار میں اتار سکتے ہیں۔ چنانچہ حج سے واپسی پر سیّد احمد نے تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال تک اپنی پوری توجہ اپنے طریق کار کی آخری کڑی پر مرکوز رکھی۔ اپنے تمام بااثر حلقہ بگوش افراد کو مختلف اطراف میں اس مقصد کے لیے بھیجا گیا تا کہ وہ مسلمانوں کو ہجرت اور جہاد کے لیے تیار کریں۔ بالآخر جنوری 1826ء میں سیّد احمد اور ان کے رفقاء نے پوری جماعت کے ساتھ اپنے گھروں کو خیر باد کہا اور ایک نئے مسکن کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے وہ جہاد کرنے کا اعلان کر سکیں۔ چلنے سے پہلے اور اس ہجرت کی تیاری کے دوران میں تمام پیروؤں اور معتقدین کو باقاعدہ ایک اطلاع نامہ بھیجا گیا۔ یہ اطلاع نامہ 1863ء میں قائم ہونے والے مقدمات میں پیش کیا گیا۔ اسی اعلان نامے کی بنیاد پر وہابی مقدمات سازش کی بلند عمارت قائم ہوئی تھی۔

جہاد کا اعلان نامہ:

سیّد احمد کے اعلان نامے کا خلاصہ یہ ہے: ''سکھ قوم عرصے سے لاہور اور دوسری جگہوں پر قابض ہے اور ان کے ظلم کی کوئی حد نہیں رہی۔ انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو بلاقصور شہید کیا ہے اور ہزاروں کو ذلیل کیا ہے۔ مسجدوں میں نماز کے لیے اذان دینے کی اجازت نہیں اور ذبیحہ گاؤ کی قطعی ممانعت ہے۔ جب ان کا ذلت آمیز ظلم و ستم ناقابل برداشت ہو گیا تو حضرت سیّد احمد ایدہ اللہ بنصرہ نے خالصۃً حفاظت دین کے لیے کئی مسلمانوں کو کابل اور پشاور کی طرف لے جا کر مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا اور ان کو جرأت دلا کر آمادہ عمل کیا۔ الحمد للہ کی ان کی دعوت پر کئی ہزار مسلمان راہ خدا میں لڑنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور سکھ کفار کے خلاف 21 دسمبر 1826ء کو جہاد شروع ہو گا''۔

حملے کے لیے سکھ قلمرو کو منتخب کرنے کی معقول وجوہ نظر آتی ہیں۔ سکھ حکومت انتہائی ظالم تھی اور مسلمان تقریباً ایک ناقابل برداشت استبداد کے نیچے دبے ہوئے کراہ رہے تھے۔ علاوہ ازیں، اگرچہ رنجیت سنگھ نے ایک مؤثر اور بڑی فوج بنائی تھی، مگر اس کی حکومت اس قدر حفاظت کے ساتھ قائم نہیں تھی جیسی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں

انگریزوں کی تھی۔ سکھ اپنی قلمرو کو پٹھانوں کے علاقوں میں وسعت دے رہے تھے اور آبادی میں [illegible] خوف اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ پٹھان اچھے جنگ آزما تھے اور معقولیت کے ساتھ یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ [illegible] احمد [illegible] تعاون کریں گے۔ اگرچہ اس سے سپلائی لائن میں بڑی دشواری پیدا ہوتی تھی، تاہم برطانوی علاقے میں [illegible] جگہ [illegible] صدر مقام بنا کر وہاں سے جنگ شروع کرنا یا جاری رکھنا انتہائی غیر دانش مندانہ فعل ہوتا۔ رنجیت سنگھ انگریزوں کا ایک اتحادی تھا اور وہ کبھی اس کی اجازت نہ دیتے کہ برطانوی علاقے میں سے گزر کر پٹھان علاقوں میں [illegible] راہ راست پہنچنا ممکن نہیں تھا، اس لیے سید احمد کو گوالیر، راجپوتانہ، سندھ، بلوچستان، قندھار، غزنی اور کابل میں سے گزر کر [illegible] طویل چکردار راستہ منتخب کرنا پڑا۔ بہاولپور کا حکمران اور سندھ کے میر سکھوں سے خائف تھے اور اس تحریک [illegible] حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال یہ جماعت پشاور ہو کر نوشہرہ پہنچی اور 29 دسمبر 1826ء کو وہاں اپنا صدر مقام قائم [illegible] یا۔

میدانِ کارزار اور شہادت

سیّد صاحب چارسدہ میں تھے کہ رنجیت سنگھ، حاکم پنجاب کو آپ کے عزم جہاد کی اطلاع ہوئی اور [illegible] ن کے حکم سے سکھ فوج کا مشہور جرنیل بدھ سنگھ دس ہزار لشکر کے ہمراہ منزلیں مارتا اکوڑہ کے قریب پہنچ کر خیمہ [illegible] ان [illegible] کیا۔ ادھر اکوڑہ کا رئیس اور خٹک قبیلے کا سردار امیر خان سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی بیعت [illegible] اور [illegible] ش کیا کہ بدھ سنگھ علاقہ سمہ میں جدال و قتال کی غرض سے آیا ہے اور دریائے لنڈہ کے اس پار خیمہ زن ہے۔ [illegible] ی [illegible] ائے میں قبل اس سے کہ وہ پیش قدمی کرے، لشکرِ اسلام کو دریائے لنڈہ عبور کر کے اس کی پیش قدمی روک [illegible] ینا چاہیے۔ سیّد صاحب نے سردار امیر خان کی رائے پسند کی اور چارسدہ سے روانہ ہو کر خویشگی پہنچے۔ وہاں [illegible] عرصہ [illegible] یام کر کے نوشہرہ روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بدھ سنگھ اکوڑہ میں داخل ہو گیا ہے اور آپ کے لشکر [illegible] ملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

بدھ سنگھ کے نام سیّد صاحب کا خط

چارسدہ کے دوران قیام جب سیّد صاحب کو پہلی بار سردار بدھ سنگھ کی آمد کی خبر ملی تو آپ [illegible] اتمام حجت کے طور پر اسے ایک خط لکھا جس میں اس کے سامنے چند شرائط رکھیں:

1۔ یا تو تم اسلام قبول کر لو۔ اس وقت ہمارے برابر ہو جاؤ گے اور ہم بجائے جنگ وجدال کے [illegible] طرح سے تمہاری اعانت کریں گے۔ جبراً کسی کو اسلام میں داخل کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اگر بخوشی تم کو [illegible] سلام منظور نہ ہو تو۔

2۔ دوسری شرط ہے کہ تم اپنے دین و مذہب پر قائم رہ کر ہماری اطاعت کر کے جزیہ [illegible] نا قبول کرو۔ اس حالت میں بھی جب تک مطیع رہو گے، ہم تمہارے جان و مال کی حفاظت اپنی جان [illegible] مال کی مانند کریں گے۔

3۔ اور اگر یہ دونوں مذکورہ بالا امور تم کو منظور نہ ہوں تو پھر جنگ کے واسطے تیار ہو جاؤ اور یہ بھی یاد رکھو کہ ہم اس وقت تعداد میں تھوڑے ہیں، مگر یاغستان اور سارا ہندوستان اللہ کی راہ میں جان دینے کو تیار ہے اور ہم لوگ شہادت کو ایسا دوست رکھتے ہیں جیسے تم شراب کو۔

جنگ اکوڑہ

سیّد صاحب کی اس تنبیہ کا سردار بدھ سنگھ پر کوئی اثر نہ ہوا، کیونکہ وہ طاقت کے نشے میں چور تھا۔ بہر حال نوشہرہ پہنچ کر سیّد صاحب نے اہل الرائے اصحاب کے مشورے سے ہر جماعت میں سے چاق و چوبند اور بہادر افراد کو منتخب کر کے ایک لشکر مرتب فرمایا جو نو سو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اللہ بخش جمعدار کو اس کا کمانڈر مقرر کیا اور اپنی دستار اس کے سر پر بندھوائی۔ نصب شب کے بعد یہ لشکر دریائے لُنڈہ عبور کر کے سکھوں کی لشکر گاہ پر جا پڑا۔ سکھوں نے اپنی لشکر گاہ کو خاردار تاروں سے محفوظ کر لیا تھا، مگر یہ حفاظتی انتظامات کچھ کام نہ آئے اور مجاہدین نعرۂ تکبیر بلند کر کے سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ لشکر گاہ کے محافظ سنتری نے فائر کیا اور گولی شیخ باقر علی عظیم آبادی کو لگی۔ وہ زخم کھا کر گر گئے اور شہید ہو گئے۔ سلسلۂ جہاد کی اس پہلی جنگ کے یہ پہلے شہید تھے۔ نعرۂ تکبیر کا شور سن کر سپاہی تلواریں سونت سونت کر مقابلے پر آ گئے مجاہدوں نے خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ ایک شیر دل جماعت نے اس بے جگری سے یورش کی کہ سکھوں کے توپچی گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور توپ خانہ مجاہدوں کے قبضے میں آ گیا۔ جنگ کا یہ نقشہ دیکھ کر سردار بدھ سنگھ میدان سے بھاگ نکلا اور موضع اکوڑہ میں جا کر دم لیا۔ اس کے بھاگتے ہی ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور جس سکھ کا جدھر منہ اٹھا، بھاگ نکلا۔ اس اثناء میں مقامی لوگوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس خوف سے کہ کہیں ان سے اس مال غنیمت میں سے حصہ نہ طلب کیا جائے، وہ مال لے لے کر بھاگنے لگے۔ ان کی اس بھاگم بھاگ سے مجاہدین کے لشکر کی ترتیب متاثر ہوئی۔ اسی دوران میں سردار بدھ سنگھ نے اکوڑہ پہنچ کر نقارہ بجوانا شروع کر دیا۔ نقارے کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے سکھ واپس آنے لگے۔ اس طرح سکھ دوبارہ منظم ہو گئے اور انہوں نے مجاہدین پر بندوقوں کی باڑھیں مارنا شروع کیں۔ اس حملے میں صف اول کے کچھ مجاہد شہید ہو گئے۔ سردار بدھ سنگھ پر مجاہدین کی شجاعت اور پامردی کا ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ اکوڑہ میں بھی نہ ٹھہرا، بلکہ تین میل اور پیچھے آ کر شیدو نامی گاؤں میں جا اترا۔ اس کے ساتھ ہی سکھ بھی میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے اور شیدو میں جا کر اپنی از سرِ نو تنظیم شروع کی۔

اکوڑے کی کامیابی نے مسلمانوں کے دل میں امید کا چراغ روشن کر دیا۔ علماء و خوانین سرحد کے عظیم الشان اجتماع میں 11 جنوری 1827ء کو بمقام ھنڈ سیّد صاحب کے ہاتھ پر امامت جہاد کی بیعت ہوئی۔ پشاور کے درانی سرداروں یار محمد خان، سلطان محمد خان وغیرہ نے بھی بیعت کی اور معیت کی حامی بھری۔ سیّد صاحب کی کوشش سے شیدو میں سکھوں سے لڑنے کے لیے کم و بیش ایک لاکھ مجاہد جمع ہو گئے۔ سکھوں نے خفیہ خفیہ تہدید آمیز پیغامات بھجوا کر یار محمد خان کو ساتھ ملا لیا۔ اس نے جنگ سے ایک رات پہلے سیّد صاحب کو زہر دلوا دیا۔ لڑائی میں سکھوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تو خفیہ قرارداد کے مطابق یار محمد اور اس کے بھائی شکست شکست کا شور مچاتے ہوئے میدان سے بھاگ نکلے۔ اس طرح غازیوں کی فتح شکست سے بدل گئی۔

شیدو میں اچانک جو بھگدڑ مچ گئی تھی، وہ آنکھیں کھول دینے والی تھی اور اس سے پہلے بھی یہ سمجھا جا چکا تھا کہ فوج کے بعض طبقوں میں نظم وضبط کا فقدان دوسروں کی شجاعت کو غیر موثر بنا دیتا تھا۔ مجاہدین کی فوج ہندوستانیوں، قندھاریوں اور قبائلیوں پر مشتمل تھی۔ ان میں آخری دو طبقے غارت گری اور لوٹ مار سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح سنجیدگی سے لڑنے والے دشمن کا سامنا کرتے ہوئے نقصان میں رہتے تھے اور مال غنیمت میں اپنے مناسب حصے سے بھی محروم ہو جاتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح کا نظم وضبط نافذ کرنے کے لیے ایک قوت حاکمہ (اتھارٹی) پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ بہت سے سیاسی عالم تھے، اس لیے ایک قانونی اور دینی اساس مہیا کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ فروری 1829ء میں سیّد صاحب نے اڑھائی ہزار علماء وخوانین کو مرکز پنجتار میں جمع کر کے نظام شریعت کے اجراء کی بیعت لی۔ مدعا یہ تھا کہ علاقہ سرحد میں شرعی نظام قائم ہو جائے اور خاص وعام اس مقدس نظام کے ماتحت متحد ہو کر ایک جماعت بن جائیں، جسے وہ سب دنیا اور آخرت کی فلاح کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔

ہُنڈ کا رئیس خادے خان سکھوں سے مل گیا اور انہیں پنجتار پر چڑھا لایا، لیکن سکھ فوج کے سالار کو لڑائی کی ہمت نہ پڑی۔ سیّد صاحب نے پہلے ہنڈ کو مسخر کیا، پھر زیدہ کی جنگ میں درانیوں کے بھاری لشکر کو شکست دی جس میں یار محمد مارا گیا۔ مشرقی سمت میں امب پر قبضہ کر لیا۔ نیز مایار (نزد مردان) میں سلطان محمد اور اس کے بھائیوں کے لشکر پر کاری ضرب لگا کر مردان اور پشاور کو فتح کر لیا۔ سلطان محمد نے صلح کی درخواست کی۔ سیّد صاحب نے شرعی نظام کے اجراء اور جہاد میں امداد کے وعدے کی بنا پر پشاور اسے دے دیا۔ یوں پشاور سے اٹک اور اٹک سے امب تک پورا علاقہ سرحد ایک نظام کے ماتحت متحد ہو گیا اور سیّد صاحب بااطمینان پنجاب پر اقدام کی تیاری کرنے لگے۔

سکھوں پر اس قدر رعب چھا گیا کہ وہ بشرط مصالحت اٹک کا پورا علاقہ سیّد صاحب کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ آپ نے یہ پیشکش اس بناء پر قبول نہ کی کہ حقیقی مقصود خود کوئی علاقہ یا جاگیر لینا نہ تھا، بلکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بحالی اور نظام شرعی کا اجراء تھا۔ 1830ء کی سردیوں میں سلطان محمد درانی نے نقض عہد اور خفیہ سازش سے ان ڈیڑھ سو غازیوں کو بحالت بے خبری شہید کرا دیا، جو مختلف دیہات میں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ غازی سیّد صاحب کے ارشاد کے مطابق ہندوستان کی اسلامیات کا ''خلاصہ'' اور ''لب لباب'' تھے۔ وہی غازی زندہ بچے جو امب اور پنجتار میں تھے یا بروقت اطلاع مل جانے پر محفوظ جگہوں میں پہنچ گئے تھے۔ ناچار سیّد صاحب نے درانی سرداروں، نیز بعض دوسرے خوانین کے پیہم نقضِ عہد اور خلل اندازی سے متاثر ہو کر اپنا چار سالہ مرکز چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور کشمیر کا قصد کیا، جہاں کے مسلمانوں کی طرف سے بارہا دعوت آ چکی تھی۔ ہزارہ، مظفر آباد وغیرہ کے خوانین، جن کے علاقے کشمیر کے راستے پر واقع تھے، ساتھ دینے کے لیے ہمہ تن تیار تھے چنانچہ آپ دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے دریائے اباسین کو عبور کر کے راج دواری (بالائی ہزارہ) میں وارد ہوئے اور غازی بھوگڑ منگ، گونش اور بالاکوٹ میں مرکز قائم کرتے ہوئے مظفر آباد (کشمیر) تک پہنچ گئے۔ معاون خوانین کو سکھوں کی دست برد سے بچانے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ ضروری سمجھی گئی۔ اس غرض سے کچھ عرصے کے لئے بالاکوٹ (تحصیل مانسہرہ) میں مقیم ہو گئے۔

اس زمانے میں رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ دس ہزار جنگجوؤں کے ساتھ مانسہرہ اور مظفر آباد کے درمیان چکر لگا رہا تھا۔ وہ اچانک سکھ فوجوں کی بڑی تعداد کو پہاڑی پگ ڈنڈیوں سے گزارتے ہوئے، لمبا چکر کاٹ کر مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا، جو قصبہ بالا کوٹ کے عین سامنے جانب مغرب واقع ہے۔ 24 ذی قعد 1246ھ/ 6 مئی 1831ء کو بروز جمعہ چاشت کے وقت بالا کوٹ اور مٹی کوٹ کے درمیانی میدان میں خون ریز لڑائی شروع ہوئی، جو تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ سکھوں کی تعداد غازیوں سے کئی گناہ زیادہ تھی۔ بہت سے سکھ مارے گئے۔ تقریباً تین سو غازیوں نے جام شہادت نوش کیا، ان میں خود سیّد صاحب اور مولانا اسماعیل بھی شامل تھے۔ بقیہ غازی یہ سن کر میدان سے چلے گئے کہ سیّد صاحب کو گوجر اٹھا کر پاس کے پہاڑوں میں چلے گئے ہیں۔ شہادت کا علم بعد میں ہوا۔

یوں وہ پیکر عزیمت ضلع ہزارہ کے شمال مشرقی گوشے میں ابدی آسودگی سے ہم آغوش ہوا جس نے کامل بے سروسامانی کے باوجود ہندوستان کو اغیار کے تسلط سے پاک کر کے احیائے دین اور اسلامیات کے رنگ میں رنگنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مسلمانوں میں سچی اسلامی زندگی کی بے پناہ تڑپ پیدا کر دی اور اپنی تربیت میں ایک ایسی جماعت تیار کی، جس کی مثالیں ابتدائی دور کے مسلمانوں کے بعد بہت کم ملتی ہیں۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مقالہ نگار کے الفاظ ہیں ''کوئی ملک پیش نہیں کیا جا سکتا جہاں زمانہ قریب میں ایسا صاحب کمال پیدا ہوا ہو۔ سیّد صاحب اور ان کے رفیقوں سے خلق خدا کو جو فیوض حاصل ہوئے، ان کا عشر عشیر بھی ہندوستان کے دوسرے مشائخ و علماء پیش نہیں کر سکتے۔''

سکھوں نے سیّد صاحب کی لاش تلاش کرائی تو سر تن سے الگ تھا۔ دونوں کو ملا کر اعزاز کے ساتھ دفن کرا دیا۔ دوسرے یا تیسرے دن نہنگ سکھوں نے لاش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی۔ سر اور تن پھر الگ الگ ہو گئے۔ موضع تن تہبہ (گڑھی حبیب اللہ سے تین میل جانب شمال میں دریائے کنہار کے مشرقی کنارے) کے کسانوں نے دریا سے نکال کر غیر معروف مقام پر دفن کر دیا۔ اب وہ سیّد صاحب کی ایک قبر بتائی جاتی ہے، جو غیر مستند ہے۔ سر بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ پہنچ گیا۔ وہاں کے خان نے اسے نکلوا کر دریا کے کنارے ہی دفن کرا دیا۔ یہ قبر مانسہرہ سے مظفر آباد جاتے ہوئے پل سے گزرتے ہی بائیں ہاتھ آتی ہے۔ 1948ء تک یہ قبر بہت چھوٹی تھی۔ بعد میں اسے بڑھا کر ایک تصویر شیر سنگھ نے کسی ماہر مصور سے بنوا کر اپنے باپ رنجیت سنگھ کے پاس لاہور بھیج دی تھی، اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

﴿ولا تحسبن الذين ..... يرزقون﴾

(آل عمران:169)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے، ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا، بلکہ اللہ کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے''۔

تحریک جہاد کا اصل مقصد

سوال یہ ہے کہ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا اصل مقصد کیا تھا جو بالآخر ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام قرار پایا؟ اس کے بارے میں جو طریق کار اختیار کیا گیا، وہ کس حد تک ہندوستان کے لیے مجموعی طور پر اور مسلمانوں کے لیے خصوصی طور پر سودمند ثابت ہوا؟ اس تحریک کی کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر کس حد تک اس نے برصغیر کی سیاست کو متاثر کیا؟ اس کے نتائج کیا ہوئے؟ یہ تحریک صرف سکھوں کے خلاف تھی یا پورے برصغیر کو بیرونی تسلط سے آزاد کرانا چاہتی تھی اور آزاد کرانے کے بعد کس قسم کی حکومت مطلوب تھی؟ یہ اور اس قسم کے کئی سوالات سامنے آتے ہیں۔ ان کے جوابات کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آیا یہ تحریک آگے لے جانے والی تھی، اس سماج کو ترقی، خوشحالی اور نئی منزل کی طرف لے جانے والی تھی یا پیچھے لے جانے والی۔ یا پھر یہ ایک خاص مذہبی ابال تھا جس کے پیچھے کوئی منضبط فلسفہ اور جذبہ کام نہ کر رہا تھا؟

ان سوالات کے جوابات پالینے کے مختلف عوامل کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ برطانوی مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کی آراء کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اس وقت کے سیاسی اور معاشی محرکات پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی۔ پھر ذرا حمایت اور مخالفت کے جذبات کو بھی چند لمحات کے لیے الگ رکھنا ہوگا، کیونکہ اس وقت سیّد احمد کی ذات اور ان کی تحریک کے گرد ایک گروہ نے تقدس سے بڑھ کر مہدیت تک کا ناقابل تسخیر حصار قائم کر رکھا ہے۔ دوسری طرف ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ جو سیّد احمد کی تحریک ہی کا مخالف نہیں بلکہ ان کے مذہبی عقائد کا بھی شدید مخالف ہے۔ جب تحریکوں سے نگاہیں ہٹ کر مذہبی عقائد میں الجھیں تو بحث اور تحقیق کے نتائج واضح نہیں ہو پائیں گے، کیونکہ تحریکوں کے تجزیے کے لیے عقائد کے پیچھے جو عوامل ہوتے ہیں، ان پر نگاہ رکھنے اور اس وقت کے مخصوص حالات کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔

جہاد کی خصوصیات

سب سے پہلے تو یہ بات بذاتِ خود اہم ہے کہ یہ تحریک جہاد تھی۔ مسلمانوں کے نزدیک جہاد ایک مذہبی فریضہ ہے اور اس کے پیچھے ایک مخصوص نظریہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ عام لشکر کشی نہیں ہوتی، نہ ہی کسی بادشاہ کی چڑھائی اور حملے کا نام ہے، بلکہ ایک خاص نوعیت کی جنگ کا نام جہاد رکھا جاتا ہے۔ مولانا مہر نے اس سلسلے میں تفصیلاً اپنا موقف پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''جہاد جہد سے ہے جس کے معنی ہیں محنت، مشقت اور کسی کام کے لیے سخت تکلیف برداشت کر لینے پر ہمہ تن آمادگی۔ اصطلاح شریعت میں جہاد کی تعریف یہ ہے: ''دشمن کے حملے کی روک تھام کے لیے اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ ظاہراً و باطناً نکلنا۔ ظاہر ہے کہ

دشمن لشکر لے کر چڑھ آیا تو شمشیر بکف ہو کر اس کی مدافعت میں لگ جانا اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لینا جب تک ہر خطرہ اور ہر خدشہ بالکل محو نہ ہو جائے۔ اس کارِ حق میں جان بھی دینی پڑے تو اس کے لیے بے پروا یا نہ تیار ہوا جائے۔ باطل کو مٹانے اور حق کو سربلند کرنے میں شب و روز لگے رہنا۔ باطناً یہ کہ اپنے نفس کو تمام شیطانی قوتوں کی فسوں سازیوں اور معصیت و عدوان کی زیاں کاریوں سے بچا کر رکھنا۔ جماعت کی طرف سے جو سعی ہوتی ہے، سچائی کی سربلندی کے لیے جو قربانیاں کی جاتی ہیں، صداقت کی خاطر جو صعوبتیں اور اذیتیں برداشت کی جاتی ہیں، وہ سب جہاد ہیں۔ ظلمت زار باطل میں جن سرفروشوں نے حق کے نعرے لگائے، قیدیں کاٹیں، جائیدادیں ضبط کرائیں، گولیاں کھائیں، پھانسیاں پائیں، گھربار ترک کیے، عزیزوں اور اقرباء کی دائمی مفارقت گوارا کی، وہ سب مجاہد تھے۔"

جہاد کے لیے عوامی حمایت

یہ سب درست ہے، لیکن سیّد احمد اور اس کے رفقاء کی تحریک جہاد کی ایک اور خصوصیت تھی اور وہی غالباً سب سے اہم تھی۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے عوام میں اس جہاد کے لیے دعوت و تبلیغ کی مہم چلائی۔ اس کو مقبول بنانے کے لیے انفرادی جاں فشانی سے کام کیا۔ ہزاروں انسانوں کو بالآخر اس جہاد کے لیے حرکت میں لایا گیا۔ انہیں برضا و رغبت اپنے گھروں کو خیر باد کہنے پر تیار کیا اور ایک ایسے خطے میں جا کر لڑنے کے لیے ان کے اندر ولولہ اور جوش پیدا کیا جو خطہ نہ ان کی طبیعتوں کو راس تھا، نہ وہاں کے رسم و رواج سے وہ آگاہ تھے اور نہ جغرافیے ہی سے شناسا۔ لیکن اب سب ناواقفیتوں کے باوجود یہ لوگ کشاں کشاں اس دیار میں پہنچ گئے۔

اب تک ہندوستان کے برصغیر میں لشکر کشی صرف بادشاہوں اور سپہ سالاروں کا حکم تھا اور لشکر کشی میں شریک ہونے والا لشکر میں پیشے کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ اس کی روٹی اور روزگار کا انحصار اس لشکر کشی پر ہوتا تھا۔ اس میں کوئی ولولہ اور جوش نہ ہوتا تھا، سوائے اس جوش و ولولے کے جو میدان جنگ میں وقتی طور پر اپنی جان بچانے اور دشمن کی جان لینے کے بارے میں پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن سیّد احمد نے جو لشکر تیار کیا وہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جن کا پیشہ سپہ گری نہ تھا، جو اپنی روٹی روزگار کے لیے نہ آئے تھے، بلکہ اس کو خیر باد کہہ آئے تھے۔ ان کو جبراً نہ لایا گیا، بلکہ وہ اپنی رضا و رغبت سے آئے تھے۔ اس قسم کی رضا و رغبت پیدا کرنے کے لیے ایک فکر چاہیے جو لوگوں کو اپنی جان دینے پر ابھار سکے۔ وہ فکر اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ جہاں تک سیّد احمد کی تحریک کا تعلق ہے، اس کی پشت پر اسلامی فکر ہی تھا۔ اور اگر اسے ایک خاص وقت میں خاص طریقے سے پیش کیا جائے تو زیادہ اثر ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے فکر میں سب سے بڑی خوبی ہی یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی فکر کی روشنی میں اپنے زمانے کے مخصوص مسائل، کئی دکھوں اور کئی بے چینیوں کی نشاندہی کی تھی۔ روایت یہ ہے کہ سیّد احمد میں وہ فکری بلندی نہ تھی اور نہ ہی انہوں نے اپنے دور کے مسائل کی خصوصی طور پر نشاندہی کی۔

لیکن ایک ایسے دور میں جب کہ مایوسیاں چاروں طرف چھا رہی ہوں، اضطراب اور بے چینی کا دور دورہ ہو، تو فقط اتنی بات سے تشفی دی جا سکتی تھی کہ اسلامی حکومت میں اپنے دکھوں کا مداوا دیکھتا ہے اور زمیندار اپنی فارغ البالی کے زمانے کو واپس آتا دیکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اگر کسی دوسری تحریک نے مسائل کے حل اور آئندہ کے نقشے کی تفصیلات اور اس دور کے مخصوص مسائل کی نشاندہی کی ہوتی تو وہ عوام کو سید احمد کی تحریک سے بھی کہیں زیادہ متاثر کرتی اور اس کا دائرہ عمل کہیں زیادہ وسیع ہوتا۔

سیّد احمد کے مقاصد جہاد

جب اپنے زمانے کے مخصوص مسائل کے حل کی نشاندہی نہ ہو سکتی ہو، جب مختلف اطراف سے بڑھتی ہوئی دشمنیوں کی پوری ماہیت کا بھی اندازہ نہ لگ رہا ہو تو اس وقت ایک عمومی نعرہ خاصا کارگر رہتا ہے اور یہ ابہام ہی ان تحریکوں کی بنیاد بن جاتا ہے۔ گرمی جہاد اور جوش جذبات میں تو یہ ابہام خاصا کام دے جاتا ہے، لیکن جیسے ہی دھارا تھمنے لگتا ہے تو اس وقت خود یہ ابہام اور عمومی نعرے بھی کھلنے لگتے ہیں اور پریشانی کا موجب بنتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اکثر تحریکیں اسی ابہام سے دھارے پر بہتی رہتی ہیں اور عمومی نعروں کے سہارے ہی پروان چڑھتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ سیّد احمد نے بھی عمومی نعرۂ احیائے دین کو خود بلند کیا۔ لیکن احیائے دین عملی طور پر لوگوں کی زندگیوں کو کس سمت ڈھالے گا، اس کے متعلق انہوں نے کوئی اشارہ نہ کیا۔ ان ہی عملی پہلوؤں پر نگاہ نہ رکھنے اور زمانے کے مخصوص تقاضوں کو اپنا نہ سکنے کی وجہ سے تحریک کامیاب نہ ہوئی۔ لیکن جہاں تک عمومی نعروں کی بنیاد پر جوش اور ولولے پیدا کرنے کا سوال ہے، اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ خود ان کی زندگی اس احیائے دین کا نمونہ تھی اور یہ نمونہ مسلمانوں کو متاثر کرتا تھا۔ ان کی سادگی، ان کا زہد و تقویٰ، یہ سب لوگوں کے لیے بلا کسی طمع کشش رکھتے تھے۔ بقول مولانا مہر:

> ''ان سے پہلے جتنے آدمی معمولی حیثیت سے اٹھ کر لاؤ لشکر کے مالک بنے تھے وہ ملک یا ریاستیں سنبھال کر بیٹھ گئے تھے، ایک قریبی مثال نواب امیر خان مرحوم کی تھی، جن کے ساتھ سیّد صاحب سات آٹھ برس گزار چکے تھے اور مرحوم کا قدم بھی طلبِ جاہ و چشم سے آگے نہ بڑھ سکا۔''

ان مثالوں کی بنا پر مختلف قلوب میں یہ وسوسہ پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کہ سیّد صاحب بھی ملک و ریاست کے طلب گار ہیں۔ اس زمانے میں للّٰہیت اس حد تک کمیاب تھی کہ عام لوگ اس کا صحیح تصور بھی نہ کر سکتے تھے، جس طرح پرانے زمانے میں نہیں کر سکتے تھے۔ فکر و نظر کا پیمانہ ایسا بن گیا تھا کہ کسی شخص کی کوئی سرگرمی اور کوئی جدوجہد اغراض سے پاک نہ سمجھی جاتی تھی۔ پھر سب لوگ جانتے تھے کہ سیّد احمد، امیر احمد خان کے رفیق رہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ امیر خان ٹونک کا مالک بن کر بیٹھ گیا۔ اکثر نے یہی سمجھا ہوگا کہ سیّد صاحب بھی اپنے لیے ایک جداگانہ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کا اپنا مطمحِ نظر واضح کرنے کی بار بار ضرورت پیش آتی رہی۔ اس امر کی واضح شہادتیں خود سیّد صاحب کے وعظوں اور ان کے رفقائے کار کی تحریروں اور مکاتیب میں موجود ہیں۔ چنانچہ سیّد

احمد نے شاہ بخارا کے نام جو مکتوب لکھوایا اس میں آپ اپنا مطمح نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو تمام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ و مقاتلہ کی کوشش اس وقت تک جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس لے لئے جائیں، ورنہ مسلمان گنہگار ہوں گے، ان کے اعمال بارگاہ باری تعالیٰ میں مقبول نہ ہوں گے اور خود قرب حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔''

اس طرح ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ جب نصرت دین کا دور شروع ہو جائے گا اور اقتدار کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانے پر جا بیٹھے گا۔''

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''اگر اسلامی ممالک آزاد ہو جائیں، ریاست و سیاست اور قضا و عدالت میں شرعی قوانین کو مدار عمل بنا لیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ خود مالک سلطنت بننے کی بجائے مجھے یہ پسند ہے کہ تمام اقطاع میں عادل فرماں رواؤں کی حکمرانی کا سلسلہ جاری ہو جائے۔''

ایک اور جگہ یوں رقم طراز ہیں:

''تمام عبادتوں کی بنیاد، تمام طاعتوں کی اصل اور تمام جاودانی راحتوں کا مدار یہ ہے کہ خالق برتر کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار ہو جائے۔ استواری کا نشان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت، عزیز داری کے تمام رشتوں پر برتری حاصل کر لے۔''

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ پتا کیوں کر چلے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت واقعی تمام رشتوں پر برتر ہو گئی ہے؟ فرماتے ہیں:

''اس محبت کی سب سے بڑی امتحان گاہ میدان جہاد ہے۔ جہاں کسی بندۂ خدا کے لیے اہل و عیال کے ترک، اخوان و اوطان سے علیحدگی اور جان و مال کی قربانی کئے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔''

اب اس جہاد کی بنیاد یہ فکر اور یہ عمومی نعرے بنے۔ انہی نعروں نے اس تحریک جہاد کو پہلے ادوار کی لشکرکشی سے ممیز کیا اور اسے عوام کے جذبات کا مظہر بننے کا ایک موقع ملا۔ اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی؟ یہ سوال توجہ طلب ہے کہ اس تحریک نے دور دراز رہنے والے بنگالی مسلمانوں کو کس حد تک متاثر کیا۔

تحریک جہاد کا تنقیدی جائزہ

سید احمد اور ان کے رفقاء جب حج کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت بھی ان کو اپنی آخری منزل یعنی تحریک جہاد کا علم تھا کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس ''دار الحرب'' میں مزید توقف نہیں کیا جا سکتا۔ حج کے لیے سفر کے دوران میں جب سید احمد اور ان کے رفقاء کو بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے زبردست جوش و ولولے کا اظہار کیا، تو اس سے ان کے ارادوں میں مزید پختگی آ گئی اور حج کے دوران میں بھی یہ عزم ان کے سامنے رہا۔ انہوں نے عقبہ کے مقام پر اپنے ساتھیوں سے جہاد کی بیعت لی۔ جب آپ واپس آئے تو پھر بھی یہی مقصد سامنے تھا۔

سیّد احمد جب ہندوستان واپس لوٹے تو برصغیر میں انگریزوں کا تسلط قریب قریب مکمل ہو چکا تھا۔ صرف پنجاب، سرحد اور سندھ ان کے تسلط سے باہر تھا لیکن عالت ان صوبوں کی بھی بہتر نہ تھی۔ یہی وہ حالت تھی جس نے شاہ عبدالعزیز کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس تحریک کی تنظیم کے لیے سیّد احمد کو آگے بڑھائیں اور یہ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا ہراول دستہ بنیں۔ اس زمانے کا سیاسی نقشہ شدید طور پر مایوس کن تھا۔ برطانوی تسلط صرف فوجی طور پر ہی مکمل نہیں ہو چکا تھا، بلکہ پورے نظم و نسق کو برطانوی حکومت نے سنبھال لیا تھا۔ نظم و نسق کا پرانا ڈھانچا ٹوٹ رہا تھا اور اب اس ڈھانچے میں ہندوستانی اور مسلمان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک ایک کر کے ہندوستانیوں کو ان کے عہدوں سے ہٹایا اور ملازمتوں سے الگ کیا جا رہا تھا۔ یہ محرومی کس قدر بھیانک تھی، اس کا اندازہ خود انگریزوں نے کچھ دنوں بعد کیا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس محرومی نے سب سے زیادہ مسلمان آبادی کو متاثر کیا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا اہل علم طبقہ اب تک ملازمتوں سے وابستہ رہا تھا اور ملکی حکومت کی انتظامیہ کا واحد ستون مسلمانوں کا یہ اہل علم طبقہ ہی تھا۔ اب اس طبقے کی محرومی نے زبردست اضطراب پیدا کر دیا۔ زمینداری نظام کی اتھل پتھل اس سے پہلے ہی مسلمانوں کو متاثر کر چکی تھی۔ اب اس نئی افتاد نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اسی لیے یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ سید احمد کی تحریک کو اس اہل علم طبقے اور پرانے متمول خاندان کی بھی خاصی تائید و حمایت حاصل ہوئی۔

اس زمانے کے متعلق لارڈ ولزلی نے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اپنی رپورٹ بھیجتے ہوئے لکھا تھا:

''ہندوستان میں ہمارے تسلط کے اصول و قواعد اور آئین میں سب سے بڑی خامی اور کوتاہی یہی ہے کہ ہم نے کوئی قدم اس سمت نہیں اٹھایا جس سے ہم اپنی رعایا کا دل موہ سکیں، نہ ہی ہم نے اس کے جذبۂ بے وفائی کو قابو میں کرنے کی کوئی سبیل کی ہے۔ کیونکہ کل تک جو حکومت چلا رہے تھے، ان کو ہم نے ہر قسم کے اختیار و اقتدار سے محروم کر دیا ہے، ان کی عزت خاک میں ملا دی ہے اور ان کو روپے پیسے کا محتاج کر دیا ہے۔ اس کے بدلے میں ان کو کچھ نہیں دیا گیا جس سے ان کی ان محرومیوں کی تلافی ہو سکے۔''

ولزلی نے یہ رپورٹ 1799ء میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کو بھیجی تھی، اس سے واضح ہے کہ یہ عمل کتنا پہلے شروع ہو چکا تھا اور اضطراب اور بے چینی کس طرح مسلم معاشرے کا ایک جزو لاینفک بنتی جا رہی تھی۔ اس اضطراب اور بے چینی کا احساس تحریک جہاد کا قائدین کو خود بھی تھا اور تجدید و احیائے دین کا مطمح نظر اسی اضطراب اور بے چینی کے ازالے کے لیے بھی تھا۔

تجزیہ، سیّد احمد کی زبانی:

سیّد احمد کوئی بڑے صاحب تصنیف نہ تھے، صرف ان کی ایک ہی تصنیف بتائی جاتی ہے، وہ ''صراط مستقیم'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سیّد صاحب کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ سیّد اسماعیل نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں:

''جس طرح بارش سے نباتات اور حیوانات اور انسانوں کو بکثرت فوائد پہنچتے ہیں، اسی طرح جہاد سے عام خلائق کو نفع پہنچتا ہے۔ ایک نفع تو وہ ہے جو اہل ایمان، فرمانبردار اور نیکوں اور سرکشوں اور فاسقوں اور منافقوں کو یکساں پہنچتا ہے بلکہ جن و انس، حیوانات و نباتات بھی اس میں یکساں شریک ہوتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ بعض خاص خاص جماعتوں اور بعض خاص خاص اشخاص کو ایک طرح کا نفع حاصل ہوتا ہے اور دوسری جماعتوں اور دوسرے اشخاص کو دوسری طرح کا۔ عمومی نفع کی تفصیل یہ ہے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ اہل حکومت کے انصاف، اہل معاملات کی دیانتداری، اہل دولت کی سخاوت و فیاضی اور عام لوگوں کی نیک نیتی سے آسمانی برکتیں نازل ہوتی ہیں، وقت پر بارشیں ہوتی ہیں، پیداوار کی بہتات رہتی ہے، فصلیں اچھی ہوتی ہیں، تجارت کا فروغ ہوتا ہے، سامان تجارت کا چلن اچھا ہوتا ہے، بلائیں ٹلتی ہیں، مالوں میں ترقی اور نمو ہوتا ہے، اہل ہنر اور ارباب کمال بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ دین حق کی قوت و شوکت دیندار سلاطین کے عروج اور اطراف ممالک میں ان کی حکومت کی ترقی ملت حقہ کے عساکر و افواج کی قوت اور احکام شرعیہ کی اشاعت و عمومیت سے بدرجہا زیادہ نتائج و برکات ظاہر ہوتی ہیں۔ آسمانی برکتوں کے نزول کے سلسلے میں روم اور ترکی سے ہندوستان کا مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ بلکہ موجودہ ہندوستان جس کا بڑا حصہ ''دارالحرب'' بن چکا ہے، اس کا مقابلہ دو سو، تین سو برس پہلے کے ہندوستان سے کرو، آسمانی برکتوں کا کیا حال تھا اور اولیائے عظام اور علمائے کرام کی کتنی بڑی تعداد پائی جاتی تھی۔''

سیّد احمد نے ''صراط مستقیم'' میں جہاد کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اوپر جو اقتباس دیا گیا ہے اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ سیّد احمد کو اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب کا بھی پورا پورا علم اور احساس تھا۔ جب وہ جہاد کے فوائد گنواتے ہوئے انصاف کے حصول میں آسانیوں تجارت میں ترقی اور پیداوار کی بہتات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ عامۃ الناس کو یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ اس وقت جو یہ تمام تکالیف ہیں، وہ جہاد کے بعد دور ہو جائیں گی، یعنی ایک ایسی حکومت قائم ہوگی اور ایک ایسا طبقہ مقتدر ہوگا جو عوام کی تمام پریشانیوں کو دور کرنے کے قابل ہوگا۔ اپنی اس کتاب میں سیّد احمد نے اہل علم اور دینی طبقوں سے بھی اپیل کی ہے اور ان کو بھی جہاد میں شرکت کرنے کے فوائد سے آگاہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بہت ہی اہم ہے۔ جس طرح اس تحریک کے بانی اور فکری استاد شاہ ولی اللہ نے

پنے وقت کے مسائل پر لکھتے ہوئے ایک ایک طبقے کو الگ الگ خطاب کیا تھا اور اس کی خرابیاں گنوائی تھیں، بالکل اسی انداز میں ان کی تیسری پشت میں مختلف طبقات کو خطاب کر کے یہ کہا گیا کہ جہاد کرو، اس سے یہ تمام روگ دور ہو جائیں گے، مصائب کے تمام بادل چھٹ جائیں گے۔ چنانچہ سیّد احمد فرماتے ہیں:

''جہاں تک خصوصی فوائد کا تعلق ہے، جہاد میں شہدائے مومنین، مسلمان مجاہدین، صاحب اقتدار سلاطین اور میدانِ کارزار کے جواں مردوں کو جو فوائد پہنچتے ہیں، ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان کے علاوہ اربابِ وطن کو تھوڑے تھوڑے وقت میں بڑی بڑی ترقیاں حاصل ہوتی ہیں اور معمولی ریاضتوں سے تحریک ولایت اور مناصب وجاہت پر فائزہ ہوتے ہیں، علوم حقہ کی عام اشاعت ہوتی ہے۔ معلمین وطلباء کی کثرت ہوتی ہے۔ علماء احتساب و قضا اور اجتہاد و افتاء کے عہدوں پر فائز اور امامت باطنی کے منصب سے سرفراز ہوتے ہیں یعنی دین حق کی طرف کھلی ہوئی عمومی دعوت اور عقائد حق اور احکام شریعت کی اشاعت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کی نیابت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ عام اہل اصلاح بھی اس کے برکات سے محروم نہیں رہتے۔ نیکوکاری اور خداترسی کا شوق ترقی کر جاتا ہے۔ اس لیے نیکوکار انسانوں کو اعزاز ہوتا ہے۔ بداخلاق تاجر انسانوں کی تذلیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ مستحسن اور شرعی باتوں کا فروغ ہوتا ہے، مذموم اور ممنوع امور کا عام زوال ہوتا ہے، مسلمان سلاطین کی اطاعت اور علمائے کرام کی عزت اور اولیائے عظام کی عقیدت اور مسلمانوں کے سواد اعظم میں شمولیت کی برکت سے ان کی طاعات کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔''

عوامی فوائد کیا حاصل ہوں گے:

عام مسلمانوں کے فوائد کے بارے میں کہتے ہیں:

''عام مسلمان بھی جہاد سے پیدا ہونے والی برکتوں سے محروم نہیں رہتے۔ معاملات کی درستی، نیت اور اطاعت کی طرف عام رغبت اور شوق دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دین کے انوار ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے خاص الطاف وعنایات کا زمانہ ہوتا ہے۔ شرعی رسوم و عادات کا ایسا چرچا ہوتا ہے اور ایسا رواج شروع ہوتا ہے کہ لوگ خود بخود ان کے پابند ہو جاتے ہیں۔ آسمانی برکتوں کے نزول، سلاطین کے انصاف اور اہل سخاوت کی فیاضی کی وجہ سے فارغ البالی اور خوشحالی عام ہوتی ہے اور قوانین شرعیہ کی پابندی کی وجہ سے دنیوی و اخروی امور و معاملات درست اور باقاعدہ ہو جاتے ہیں۔ اور تو اور فساق اور فجار بھی اس کی برکت سے محروم نہیں رہتے۔ ملت حقہ کے انوار بنی آدم کے قلب میں اس طرح جاری وساری ہو جاتے ہیں اور ملت حقہ کی شہرت کی وجہ سے مذموم افعال کی قباحت عوام کے دماغوں میں اس طرح راسخ اور جاگزیں ہو جاتی ہے اور منکرات و بدعات کی قباحت ایسی مشہور و مسلم ہوتی ہے کہ حدود و تعزیزات کے خوف یا ہم چشموں اور ہمسروں کے طعن و ملامت کے اندیشے اور بدنامی کے خطرے سے فساق و فجار منکرات اور بدعات کے اظہار سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اہل نفاق بھی اس کی برکات سے محروم نہیں رہتے، وہ قتل کے خوف سے یا اہل ایمان کے دبدبے اور غلبے اور سرکشوں کی ذلت و نکبت کو دیکھ کر ظاہری طور پر دین ختم پر قائم رہتے ہیں اور کھلے ہوئے کافروں کے زمرے میں

شامل نہیں ہوتے۔ نیز دین کی روشنی پھیل جانے اور آسمانی برکتوں کے نزول اور مسلمانوں کی عظمت وشوکت دیکھ کر اولیائے عظام اور علمائے کرام کے ساتھ اختلاط اور رہنے سہنے کی وجہ سے اور ان کے انوار کا ان کے قلوب پر عکس اور ان کے مواعظ کا ان کے دلوں پر اثر پڑنے سے اس کی بھی امید کی جاتی ہے، کہ دین کا نور ان کے دلوں کی گہرائی میں اتر جائے گا۔''

ذمیوں کی حالت:

ایک عام اضطراب اور ایک ایسا اضطراب جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کے نام لیوا بھی پھنسے ہوں، ایک ایسی بے چینی جس کا ہندو اور مسلمان دونوں شکار ہوں، ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس اضطراب اور بے چینی کا علاج جب کیا جائے تو خواہ وہ ایک مذہب کے نام لیوا ہی کیوں نہ ہوں، ان کو دوسرے مذاہب والوں کو ہر حال میں تشفی ضرور دینی ہوگی کہ اگر ہم کامیاب ہو جائیں گے تو اس سے تمہارے اضطراب، بے چینی اور دکھوں کا بھی مداوا ہو جائے گا۔ اس تشفی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عملی طور پر نہ بھی ہو لیکن ان ہمدردیوں سے دوسروں کی کوششوں اور جہاد کو تائید ہو جاتا ہے اور وہ دشمن کے ساتھ ملنے سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی صورت حال کے تحت سیّد احمد نے ذمی کافروں کو بھی کو خطاب کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خطاب سے یہ ذمی کافر مطمئن نہ ہوں یا وہ اس صورت حال ہی کو جواب قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں لیکن اس سے ایک امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس تحریک جہاد کے قائدین کی نگاہوں سے یہ پہلو اوجھل نہیں تھا۔ سیّد احمد ذمی کافروں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ذمی کافر بھی جو مسلمانوں کی رعیت بن کر رہیں اور جزیہ دیں، اس جہاد کی برکات سے محروم نہیں رہتے۔ آسمانی برکتوں، تجارت کے فروغ، بادشاہوں کے انصاف، راہزنوں سے امن واطمینان کی وجہ سے وہ اسلامی ممالک میں فارغ البال اور خوش حال رہتے ہیں۔ اہل حق کے ساتھ رہنے سہنے اور شہری زندگی گزارنے اور ان کی رسوم و عادات کے رواج وشہرت کی وجہ سے معاشی اور انفرادی امور و معاملات کی درستی اور باقاعدگی دیکھ دیکھ کر وہ متاثر ہوتے ہیں اور اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ ان کے دل میں دین حق کا میلان ہو جائے گا۔''

''قصہ مختصر یہ ہے کہ اہل ایمان پر جہاد کا وجوب اور قیامت تک اس کو قائم رکھنے کے حکم کا زمانہ شروع میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو بارش کے نازل کرنے اور نہروں کے جاری کرنے کی حیثیت کا زمانہ تکوین میں ہے۔ باقی چند ایسے اشخاص کی ہلاکت جو اپنی استعداد کھو چکے ہیں، مثلاً ایسے مسلمان جو جہاد کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اپنی باطنی خرابی، حسد اور کفر سے محبت کی بنا پر مجاہدین کی مخالفت اختیار کرتے ہیں اور ہلاکت ابدی میں اپنے آپ کو مبتلا کرتے ہیں اور بدترین منافقین کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں، تو ان لوگوں کو ہلاکت و بربادی جہاد کے عمومی منافع میں مخل نہیں، اس لیے کہ یہی بارش ہے جس کا نفع عام انسانوں کے حق میں بدیہی ہے، گو بعض آدمی عمارتوں کے انہدام یا سیلاب اور نہروں کی طغیانی سے تلف ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود بارش کی برکت اور نفع میں کلام نہیں۔''

سیّد احمد کا جہاد کے بارے میں جو موقف ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں اضطراب اور بے چینی کس درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے سیّد احمد کو جلد سے جلد اس تحریک کے احیاء پر مجبور کیا۔ جج

سے جب واپس آئے تو بریلی میں قیام کیا۔ اس قیام اور ہجرت کرنے کے درمیان ایک سال دس ماہ کا عرصہ لگا۔ اس عرصے میں پوری توجہ اس جہاد کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرنے میں لگی اور ساتھ ساتھ اپنے آبائی شہر میں مساجد اور مرمت طلب مکانوں کی تعمیر میں منہمک رہے۔ دراصل ایک سال دس ماہ کا یہ عرصہ سیّد صاحب کی زندگی میں بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں ایک طرف روزمرہ کی زندگی وہی عبادت وریاضت، وہی نوافل، وہی دعوت وتبلیغ اور وہی رشد وہدایت کا سلسلہ تھا، لیکن دوسری طرف ایک نئی زندگی لیے کر اپنے رفقاء کو بھی تیار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں سید صاحب خود بہت زیادہ جفاکش اور جسمانی محنت سے وابستہ رہے۔ اس سے تمام ساتھیوں اور عقیدت مندوں میں بھی اس سپاہیانہ اور محنت ومشقت کی زندگی سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا ہونی شروع ہوگئی۔

بالآخر سیّد احمد اپنے تمام رفقاء کو لے کر 17 جنوری 1826ء کی ایک صبح اپنے آبائی وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ صبح بھی عام صبحوں جیسی تھی۔ اس صبح کو سورج اسی طرح نکلا تھا۔ اس دن بھی عام دنوں کی طرح مؤذن نے اذان دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آج مؤذن کی اذان میں تاثر مختلف تھا، پیغام کی شدت مختلف تھی۔ اس لیے کہ اس صبح کو رائے بریلی کا رہنے والا یہ عالم باعمل اپنے رفقاء کو لے کر ایک ایسی سمت جا رہا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ ایک ایسی منزل کا مسافر بننے کا اس نے اعلان کیا تھا جس منزل کا کوئی خاتمہ نہ تھا۔ سیّد احمد اور ان کے رفقاء نے ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر پہنچنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بذاتِ خود اتنا کٹھن اور جان لیوا تھا کہ اس پر چلنا اور اس کو طے کرنا بھی ایک عظیم جہاد تھا۔

سرحد ہی کا انتخاب کیوں؟

اس کا ذکر خود سیّد صاحب کی زبانی سنیئے:

''میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے کر جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کوس میں ملک ہندوستان واقع ہوا ہے، کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں جہاد کرو، جو کچھ مال، خزانہ، اسلحہ وغیرہ درکار ہو ہم دیں گے۔ مگر مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاد سنّت کے موافق چاہیے، بلوہ کرنا منظور نہیں۔ تمہارے ملک کے ولایتی بھائی بھی حاضر تھے۔ انہوں نے کہا ہمارا ملک اس کے واسطے بہت خوب ہے۔ اگر وہاں چل کر کسی ملک میں قیام اختیار کریں تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان ومال سے آپ کے شریک ہو جائیں گے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والئی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو حد درجہ تنگ کر رکھا تھا۔ طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرتا ہے۔ جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں، مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتیاں تباہ کر دیتے ہیں، مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں، بلکہ عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں لے جا کر بیچ ڈالتے ہیں۔ پنجاب میں وہ مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں۔ گؤ کشی کا تو کیا ذکر، جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی ہے، اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ یہ سن کر میرے خیال میں آیا

کہ یہ سچ کہتے ہیں کہ یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں اور ان کے ظلم وستم سے مسلمانوں کو چھڑائیں۔“

یہ تقریر سیّد احمد نے ریاست سوات کی سرحد پر واقع گاؤں پنجتارے میں سرحد کے خوانین اور ان کی تحریک میں شریک مجاہدین کے روبرو کی تھی۔ اس تقریر کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں سیّد احمد نے اپنی زبان سے صوبہ سرحد آنے کی وجوہات بیان کر دی ہیں اور انہی وجوہات کی روشنی میں یہ طے کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اس علاقے کو جہاد کے لیے کیوں منتخب کیا۔ اب اس علاقے کے انتخاب اور سب سے پہلے سکھوں سے جہاد کے اعلان نے سیّد احمد کی تحریک جہاد کو بہت دنوں تک متنازعہ فیہ مسئلہ بنائے رکھا اور ایک حد تک اب بھی ہے۔

پرانی تحریکوں پر کام کی ابتدا خود بعض تحریکوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس تحریک جہاد پر زیادہ کام آج سے ستر، اسّی برس پہلے شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی اپنی سیاسی جدوجہد ایک نئے موڑ میں داخل ہو رہی تھی اور اس میں انگریزی پڑھا لکھا طبقہ قیادت سنبھال رہا تھا اور علماء کا طبقہ پیچھے ہٹ رہا تھا، تو اس وقت سیّد احمد کی تحریک کو کھنگالا گیا اور نوجوانوں کے سامنے اس تحریک کو سب سے پہلے انگریز کی مخالف اور سامراج دشمن تحریک کے طور پر پیش کیا گیا اور علماء کی تحریک آزادی کو اس تحریک کا حصہ ظاہر کیا گیا۔ یہ باتیں بہت حد تک درست تھیں۔ تاریخی لحاظ سے ان میں کوئی الجھاؤ نہ تھا لیکن جب کسی تحریک کو ایک خاص وقت میں کھنگالا جاتا ہے اور اسے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس تحریک کے انہی پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے جن کی اس زمانے میں ضرورت ہوتی ہے اور اس کو مقبول بنانے اور ان کے ارد گرد عظیم روایات کا تانا بانا بننے کے کام آتی ہیں۔ اس لیے جب 1930ء کے بعد ان تحریکوں پر تحقیقی کام شروع ہوا، اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم برطانوی سامراج کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر سکیں اور ان طبقوں پر لعن طعن کے ڈونگرے برسا سکیں جو برطانوی سامراج کی براہ راست یا بالواسطہ حمایت میں مصروف تھے اور جو علماء برطانوی استبداد کے خلاف سینہ سپر تھے، ان کو اور ان کی تحریک کو اس تحریک جہاد کا صحیح وارث ثابت کیا جائے۔ ویسے وہ بہت حد تک اس تحریک کے وارث بھی تھے اور اس تحریک میں ایک تسلسل بھی رہا ہے۔

صوبہ سرحد کا انتخاب:

اس تحریک کے ان تمام پہلوؤں پر اور اب تک متعدد علماء اور مؤرخ اتنا کام کر چکے ہیں کہ اب ان سے نتائج اخذ کرنا اور ان پر حکم لگانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسی تحریکوں کے سلسلے میں جو مشکل درپیش رہی ہے، وہ ہے اس کا تقدس۔ عام طور پر ایسی تحریکوں کی داستان بیان کرنے والے یا تو معتقدین کی صف میں کھڑے ہوئے ہیں اور یا پھر مخالفین کی صف میں۔ دونوں طرح سے تحریک کے مثبت اور منفی پہلو بہ یک وقت اجاگر نہیں ہو پاتے۔ سیّد احمد اور ان کے رفقاء نے ہجرت اور جہاد کے لیے سرحد کا علاقہ جن مقاصد کے لیے منتخب کیا، ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک ایک نئے دور میں

مؤرخین کا ایک گروہ ہے جو اس بات پر مصر ہے کہ سرحد کا علاقہ صرف اس لیے منتخب کیا گیا کہ ان کو سکھوں سے لڑنا مقصود تھا اور انگریزوں کے خلاف جہاد اس تحریک کے مقاصد میں سرے سے شامل ہی نہ تھا۔ لیکن اب ایسے مؤرخوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا کیونکہ مولانا غلام رسول مہر، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد میاں دہلوی اور تو اور خود مغربی مورخوں نے اس توجیہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل مؤرخین کا یہ گروہ جو اس تحریک جہاد کو صرف سکھوں کی مخالف تحریک ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہا تھا، وہ اصل میں انگریزوں کے غیظ و غضب کو ہلکا کرنے کے لیے یہ توجیہ کر رہا تھا۔

برطانوی مؤرخوں کی رائے:

سیّد احمد کی تحریک جہاد کے بارے میں سب سے پہلے اگر کسی مغربی مورخ نے قلم اٹھایا ہے۔ اور اس کو انگریز دشمن تحریک تسلیم کیا ہے، تو وہ ولیم ہنٹر ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان'' میں اس تحریک پر کافی شرح و بسط کے ساتھ رائے زنی کی ہے۔ گو بہت سے مصنف اس کتاب پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن ولیم ہنٹر کے اپنے مخصوص معتقدات سے قطع نظر، اس نے اس تحریک کے بعض بہت ہی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اہم تفصیلات سے یہ ثابت کیا ہے کہ سیّد احمدؒ کی ''تحریک جہاد'' جو برطانوی حکومت کے خلاف بھی تھی۔ ولیم ہنٹر اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات ہی میں لکھتا ہے:

''میں ان واقعات کا، جن کی وجہ سے ہماری سرحد پر باغیوں کی نو آبادی قائم ہوئی اور ان خوفناک نقصانات میں سے بعض کو بھی، جو اس کی وجہ سے سلطنت برطانیہ کو برداشت کرنا پڑے، قارئین کے سامنے مجملاً بیان کروں گا۔ دوسرے باب میں باغیوں کی اس تنظیم کا ذکر کروں گا جس کے ذریعے سے باغی کیمپ نے ہماری سلطنت کے اندرونی اضلاع سے آدمی اور روپیہ مسلسل طور پر حاصل کیا۔ پھر میں ان شرعی مباحث کی تفصیل بیان کروں گا جن کی بنا پر تشویش ناک حالات رونما ہوئے۔ یہ وہ مباحث تھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عام طبقہ کس پر جوش طریقے پر اور باغی پیشواؤں کی زہر آلود تعلیم سے متاثر ہو رہا ہے اور اس طرح مسلمانوں کا ایک طبقہ جو تعداد میں بہت ہی کم ہے، فرض جہاد سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے شریعت مقدسہ میں عجیب و غریب تاویلیں پیش کر رہا ہے۔ لیکن اگر میں اسی پر بس کر دوں تو سمجھ لیں کہ میں نے پوری بات بیان نہیں کی۔ مسلمانانِ ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے تھے۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور ان تمام تبدیلیوں کو، جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی

سے حصہ لیے بانے اپنے لیے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ چوتھے باب میں مسلمانوں کی ان شکایات کو جو انہیں انگریزی عہد حکومت میں پیدا ہوئیں، معلوم کروں اور ان کی واقعی شکایات کو بیان کروں۔

ولیم ہنٹر اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے:

''سرحدی باغی کیمپ کے بانی مبانی سیّد احمد تھے۔ وہ ان بے باک اور باہمت نوجوانوں میں سے تھے جو نصف صدی قبل پنڈاری قوت کے استیصال کے لیے تمام ہندوستان میں بکھر گئے تھے۔ سیّد احمد نے اپنی زندگی اس مشہور لٹیرے (امیر خان والی ٹونک کی طرف اشارہ ہے) کی فوج میں ایک سوار کی حیثیت سے شروع کی تھی، جس نے مالوے کے افیون پیدا کرنے والے دیہات کو تاخت و تاراج کیا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی قوت نے جس سختی کے ساتھ اپنے مسلمان ہمسایوں کو دبائے رکھا، اس سے مسلمان لٹیروں کا کام بہت ہی خطرناک اور غیر منفعت بخش ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراجہ مذکور کے ہندوانہ مذہبی تعصبی نے شمالی ہندوستان کے جوش و خروش کو اور بھی بھڑکا دیا۔ سیّد احمد نے نہایت دانش مندی سے اپنے آپ کو زمانے کے مطابق بدل دیا۔''

غرضیکہ ولیم ہنٹر نے اسی انداز سے تحریک جہاد کی داستان بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس تحریک کا مقصد برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا بھی تھا۔ یہ کتاب 1873ء میں شائع ہوئی تھی جو برصغیر میں بڑے کرب کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ ہراساں اور خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ لیکن اس تحریک سے متعلق مسلمان اب بھی ہندوستان کے اندر اپنی تحریک کو کسی نہ کسی طرح سے زندہ رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف بھی دارو گیر کا سلسلہ جاری تھا، مقدمات قائم ہو رہے تھے، ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمان علماء اور صاحب ثروت لوگوں کو پابند سلاسل کیا جا رہا تھا، سزائیں دی جا رہی تھیں۔ اس ماحول میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جہاد کے مسلک کو خیر باد کہہ رہا تھا۔ وہ برطانوی حکومت کو ایک مسلمہ حقیقت تسلیم کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ وہ مسلمانوں کی سیاست کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اسی طرز فکر کا حامی تھا۔ اسی گروہ نے برطانوی حکام کے غیظ و غضب کو کم کرنے کی کوشش کی اور سکھوں کے خلاف پہلو کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا۔ اس میں ایک طرف تو یہ گروہ تھا، دوسری طرف وہ گروہ بھی تھا۔ جو ان مقدمات سازش میں ماخوذ تھا اور اس کے بدلے میں چاہتا تھا کہ اب حکام کا غیظ و غضب ان کی طرف اور زیادہ شدت کے ساتھ مبذول نہ ہو۔ چنانچہ ان ہی دو گروہوں نے اس تحریک کے متعلق توجیہات پیش کیں اور سچ یہ ہے کہ بہت دنوں تک یہی توجیہات رواج پا گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے دنوں میں ان توجیہات کی بنا پر ان تحریکوں کو اہمیت دینی ہی چھوڑ دی گئی۔

سر سیّد احمد خان اور مولانا جعفر تھانیسری کی توجیہ:

تحریک جہاد کے متعلق سب سے پہلے جس مورخ نے مختلف توجیہ کی، وہ سر سیّد احمد خان تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کے بارے میں انگریزوں کے غم و غصہ کو کم کرنے کے لیے جو مختلف تاویلات کی ہیں، ان کے متعلق مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سیّد احمد خان مرحوم نے سیّد صا[illegible] کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' [illegible] تھی سر سیّد نے اس کی تہمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلۂ مضامین پایونیئر (Pioneer) میں چھپوایا [illegible] جو [illegible] میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ ان جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ سیّد احمد صرف سکھوں کے خلاف [illegible]نا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہار برأت کر دیا تھا۔ سر سیّد سے زیادہ اس سلسلے میں جس شخص نے [illegible] توجیہات کی ہیں، وہ مولانا محمد جعفر تھانیسری ہیں۔ مولانا محمد جعفر نے سیّد احمد کی سوانح بھی لکھی ہے۔ اس میں اسی موقف کو [illegible]ر بار پیش کیا کہ سیّد احمد صرف سکھوں سے لڑنا اور جہاد کرنا چاہتے تھے، انگریزوں سے جہاد ان کے مقاصد [illegible] شامل ہی نہ تھا۔ مولانا جعفر نے اس سلسلے میں کئی ایک بیانات بھی سید احمد اور شاہ اسماعیل سے منسوب کر کے اپنی [illegible]ب [illegible] درج کئے ہیں۔ اب چونکہ مولانا محمد جعفر اس تحریک سے متعلق رہے ہیں اور انہوں نے اسی بنا پر قید [illegible] کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں، اس لیے لوگوں نے ان کی باتوں پر یقین کر لیا اور اس طرح سے ایک تحریک کا [illegible] کردار یا جاندار کردار لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ چنانچہ مولانا جعفر نے اپنی کتاب ''تواریخ عجیبہ'' میں [illegible] بیان شاہ اسماعیل سے منسوب کیا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب سیّد احمد شہید حج پر جا رہے تھے تو کلکتہ میں [illegible] روز شاہ اسماعیل شہید نے وعظ کہتے ہوئے جہاد کا ذکر کیا۔ ایک شخص نے بر سر مجلس پوچھا کہ سرکار انگریزی کے خلاف جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ تو شاہ اسماعیل نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''ایسی بے ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔ اس وقت پنجاب کے سکھوں کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان [illegible] جہاد کیا جائے۔''

مولانا جعفر ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب سیّد احمد سکھوں کے خلاف جہاد کو تشریف لے جا رہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہو؟ انگریز جو اس ملک پر [illegible] ہیں دین اسلام سے منکر ہیں، گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک اور مددگار ہو جائیں گے۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے ہیں اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ ہمارے غلبے کے بعد ان مستوجب جہاد حرکات سے باز آ جائیں گے تو ہم کو ان سے بھی لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو عبادات لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے ہیں اور ترویج مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع اور مزاحم نہیں ہوتے بلکہ ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا اصل کام اشاعت توحید الٰہی ہے اور احیائے سُنّت ہے جو ہم بلا روک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں؟''

مولانا جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب میں سیّد احمد شہید کے نام سے بیان منسوب کیا [illegible] انہوں نے اس پوری تحریک کے کردار کو کس قدر ملوث کر چھوڑا ہے۔ اب اس بیان کے پیچھے کتنی سچائی تھی یا وقت کے [illegible] مصالح تھے، جن

کی وجہ سے سرسیّد احمد خان اور مولانا جعفر اور دوسرے گروہوں کو شدومد سے یہ کہنا پڑا کہ سیّد احمد انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

تحریکوں کی ظاہری شکل وصورت کیسی ہی ہو، ان کے نعرے کچھ ہی ہوں، ان کے مقاصد کا اظہار کیسی ہی زبان میں ہو، لیکن تحریکوں کے تجزیئے کی بنیاد ظاہری شکل وصورت، نعرے اور مقاصد کے علاوہ بعض دوسرے عوامل بھی بنتے ہیں۔ اس لیے عام طور پر اس تحریک جہاد کو صحیح صورت حال میں نہیں پرکھا جاتا۔ اس کی ظاہری شکل وصورت خالصتاً ایک دینی تحریک کی تھی، اس کے مقاصد ایک مذہبی فریضے کی حدود تک محدود تھے۔ اس کے نعرے ایک مخصوص ملت کے لیے تھے، لیکن اس کے باوجود اس کے اثرات پورے برصغیر پر پڑے اور اس تحریک نے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کو بھی ایک دوسرے رنگ میں متاثر کیا۔ باقی اس تحریک کے نتائج مسلمانوں، ہندوؤں اور اس وقت کے ہندوستان کے لیے سودمند ثابت ہوئے یا مضرت رساں؟ اس کے متعلق بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس تحریک کے نئے طریق کار کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما تھے۔ اس تحریک کا تجزیہ دو بنیادوں پر کیا جاتا ہے: ایک بنیاد تو ان مؤرخوں اور تجزیہ نگاروں کی ہے جو سیّد احمد کی تحریک کو ایک آزادانہ اور خودمختار دینی تحریک تصور کرتے ہیں۔ یہ تجزیہ نگار اور مؤرخ سیّد احمد کی ذات میں ایک امام اور بعض وقت مہدی تک کو دیکھتے ہیں جو اس دینی فریضے کی ادائیگی کے لیے مامور کیے گئے۔ لیکن جو تجزیہ نگار ان کو مہدی کا رتبہ نہیں بھی دیتے، وہ بھی اس تحریک کو ایک خودمختار اور آزاد تحریک تسلیم کرتے ہیں اور اس کے پیچھے خالصتاً دینی جذبے کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک مکتب خیال بھی موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ایک آزاد اور خودمختار تحریک نہ تھی بلکہ ایک مسلسل تحریک کا حصہ تھی۔ یہ درست ہے کہ سیّد احمد نے جب اس تحریک کی قیادت سنبھالی تو حالات ایک موڑ پر پہنچ چکے تھے اور نئے طریق کار اپنانے کی شدید ضرورت تھی۔ سیّد احمد کی عظمت یہی ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر انہوں نے ایک نیا طریق کار اپنایا۔ اس فکری تحریک کو مقاصد کے حصول کے لیے ایک باقاعدہ تنظیم کی شکل دی، حصول مقاصد کے لیے ہتھیار استعمال کرنے اور جہاد کا اعلان فرمایا۔

مختلف طریقِ کار

شاہ ولی اللہ نے جو اس فکری تحریک کے امام تصور کیے جاتے ہیں، عملی طور پر اس فکر کی بنیاد پر کوئی تحریک منظم نہیں کی تھی۔ وہ صرف درس وتصنیف پر قانع رہے اور عملی طور پر حالات سدھارنے کے لیے کسی صاحب شمشیر کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کو صورت حال سے آگاہ کرکے یہ توقع کرتے رہے کہ شاید کسی صاحب شمشیر کی شمشیر صورت حال کو تبدیل کرنے کا موجب بنے اور وہی شمشیر سیاسی وسماجی انقلاب اور تبدیلیوں کی بنیاد رکھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے شاہ ولی اللہ نے اپنا زورِ قلم استعمال کیا۔ کبھی احمد شاہ ابدالی کی توجہ اس افراتفری کی جانب مبذول کرائی تو کبھی نجیب الدولہ اور آصف الدولہ کی شخصیتوں پر تکیہ کیا، اور ان کی نوک شمشیر سے امیدیں وابستہ کیں۔ تحریک کا یہ انداز ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز تک جاری رہا۔ امیر محمد خان پر تکیہ اسی طریق کار ہی کا حصہ تھا لیکن جب کوئی صاحب شمشیر ایسا دکھائی نہیں دیتا تھا جس پر تکیہ کیا جا سکے اور جس کی شمشیر اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں امیدوں کے

چراغ روشن کر سکے۔ اس لیے نئے طریق کار اپنانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ طریق کار براہ راست عوام کو منظم کرنے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کا موجب بنا۔

اب عام مسلمانوں کو شمشیر و سناں پر تکیہ کرنا پڑا اور فیصلہ انھی کے سپرد ہوا۔ لیکن ایسے مسلمان جو ایک صدی سے سیاسی تنزل اور اقتدار کی محرومی کی وجہ سے پریشان خاطر تھے، ان کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے ایک مسلسل مہم کی ضرورت تھی۔ یہ بھی ضروری تھا کہ سیاسی تنزل نے ان مسلمانوں میں جو اخلاقی اور ذہنی گراوٹ پیدا کر دی ہے، پہلے اس کو دور کیا جائے اور ان میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسا اخلاق اور دینی حمیت پیدا کی جائے، عقائد کی پختگی اور دینی حمیت کی بنیاد پر ان کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح جہاد اور فتح کفار پر ابھارا جا سکے گا۔

سرحد کیوں مرکز جہاد بنایا گیا؟

یہ مقاصد تھے جن کے لیے پہلے عقائد کی درستی پر زور دیا جاتا رہا۔ چنانچہ 1816ء کے بعد تحریک کا جو طریق کار طے ہوا، اس کے تحت دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس پر زور تھا۔ ان کے ذریعے عقائد کی اصلاح کی جاتی رہی، مریدوں کے حلقے بنائے جاتے رہے، معتقدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ خطبوں، وعظوں اور جلسوں پر زور دیا جاتا رہا۔ ان سب اقدام کا مطلب ایک ہی تھا کہ عقائد کی اصلاح ہو اور ان میں اتنا جذبہ پیدا ہو جائے کہ یہ خود بہ خود میدان جہاد میں قدم رکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کریں۔ چنانچہ حج یا جماعتیں ان ہی مقاصد کی کڑی ٹھہریں تاکہ تنظیمی اخوت اور بھائی چارے میں اضافہ ہو اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے اور کندھے سے کندھا ملا کر صعوبتیں برداشت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

مسلح انقلاب کی ضرورت

تقریباً دس برس تک یہ تحریک رائے عامہ کو منظم کرنے اور مسلمان عوام کو ابھارنے میں مصروف رہی، بدعات کے خلاف مہم چلتی رہی، عقائد کی اصلاح پر زور دیا جاتا رہا اور خالص اسلام اپنانے پر پوری توجہ صرف کی جاتی رہی۔ جب ان دس برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اب یہ تحریک مسلمانوں میں اتنی مقبول ہوگئی ہے کہ ان کو عملی طور پر میدان جہاد میں اتارا جا سکتا ہے تو پھر جہاد کا نعرہ بلند کیا گیا۔ لیکن جہاد کا مرکز کون سا ہو؟ اور کس کے خلاف جہاد کیا جائے؟ یہ دو سوال خاصے اہم تھے۔ سب سے پہلا سوال جس پر دوسرے سوال کے جواب کا انحصار ہے، وہ یہ ہے کہ جہاد کا مرکز کون سا ہو؟

یہ سوال خود سید احمد اور ان کے رفقاء کے سامنے تھا۔ انہوں نے اپنے گردوپیش دیکھا ہوگا، اور اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچے ہوں گے۔ یہ فیصلہ سرحد کے حق میں نکلا۔ سید احمد نے جس وقت اپنے گردوپیش نگاہ ڈالی تو ان کو چاروں طرف برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط نظر آیا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں کئی ایک

اصحاب شمشیر نے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ ان میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے جانباز بھی تھے، ان میں دینی جذبے سے سرشار بھی تھے۔ غرضیکہ ایک طاقت بھی اس تجارتی کمپنی کی آمد کے سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکی، کسی میدان میں ان کی توپوں اور اسلحے نے شکست دی تو کسی میں ان کی ذہانت، ان کی ریشہ دوانیاں اور ان کا جوڑ توڑ کا ملکہ کامیاب رہا۔ اس لیے ہندوستان کے اندر کسی آزاد ریاست کا مرکز قائم کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اس بارے میں سیّد احمد کے ایک بہت ہی اہم سوانح نگار مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

''سیّد صاحب کی نگاہ کے سامنے ان لوگوں کا انجام تھا جنہوں نے ہندوستان کے کسی حصے کو اپنی تحریک اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بہت جلد ان کے گرد سازشوں، مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا، جس میں وہ جکڑتے چلے گئے اور ان کے ہاتھ پاؤں بندھ کر رہ گئے۔ انگریزوں کی زیرک اور پُرفن حکومت ہر حوصلہ مند قائد اور اپنے ہر مخالف کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی کہ اس کی جنگی کارروائیوں اور آزادانہ سرگرمیوں کا میدان تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا اور اسے بہت جلد محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایک قفل میں محبوس ہے اور بالکل بے بال و پر اور بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہے۔ نواب امیر خاں کا سارا معاملہ سیّد صاحب کی نظر کے سامنے تھا کہ انگریزوں کے جوڑ توڑ سے وہ کس طرح اکیلا رہ گیا، کس طرح انگریزوں نے اس کے مختلف سرداروں کو اس سے توڑ لیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ اپنے آپ کو مصالحت اور معاہدے پر مجبور سمجھنے لگا۔ اس سے پہلے ہندوستان کے دورِ آخر کے سب سے بڑے صاحب عزم امیر ٹیپو سلطان کو انہوں نے کس طرح سب سے کاٹ لیا تھا اور کس طرح اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ آخر اس جوانمرد نے تنہا سرخ روئی حاصل کی۔ یہ سیّد صاحب کی بہت بڑی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے ہندوستان کے اندر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا جس کے لیے بہت جلد ایک ایسا جزیرہ بن جانے کے قوی امکانات تھے جس کے چاروں طرف مخالفتوں اور سازشوں کا ایک ایسا سمندر پھیلا ہوا ہوتا جس سے ہو کر کہیں سے کمک یا مدد ملنے کی توقع نہ تھی۔''

سرحد کیوں مرکز جہاد بنا؟

تحریکوں کے اجرا کے لیے تاریخی تسلسل اور ماضی کے واقعات کو سامنے رکھنا از بس ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح تحریکوں کے لیے عوام کی خواہشات، تمناؤں، ان کی ضرورتوں، مجبوریوں اور محرومیوں کی نگاہ رکھے بغیر تحریکیں پنپ نہیں سکتیں، اسی طرح ماضی کے واقعات اور تاریخ کے کوائف بھی ان تحریکوں کی کامیابی کے لیے مشعل راہ بنتے ہیں۔ سیّد احمد اور ان کے رفقاء کا مرکز جہاد کے تلاش میں ہندوستان کی تاریخ نے بھی بڑی مدد کی ہے اور یہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہندوستان پر کوئی بھی حملہ آور ایسا نہیں جو خیبر سے نہ آیا ہو۔ اس میں صرف دو مثالیں ایسی ہیں، ایک محمد بن قاسم اور دوسری برطانیہ کی جو اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں بحری راستے سے آئی تھیں، ان کی پشت پر کوئی فوری فوجی امداد کا سامان نہ تھا۔ اس لیے ہندوستان پر قبضے کے لیے ضروری تھا کہ سرحد پر ایک آزاد مرکز قائم ہو جس کو پیچھے سے کمک پہنچتی رہے کیونکہ اسی ایک راستے سے تمام وہ طاقتیں ہندوستان میں داخل ہوئیں جنہوں نے صدیوں یہاں حکومت کی۔ یہ ماضی کے تجربات تھے جن سے سیّد احمد اور ان کے رفقاء نے استفادہ کیا۔

ماضی کی ان روایات کے علاوہ گردوپیش کے حالات نے بھی سرحد ہی کو مرکز بنانے کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ حالات یہ تھے کہ پنجاب اور سرحد پر سکھ قابض تھے۔ ان کے خلاف ایک حد تک نفرت موجود تھی، کیونکہ سکھ پنجاب اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو پائیدار سلطنت دینے میں ناکام رہے تھے اور مسلسل لوٹ مار اور قتل و غارت نے پنجاب اور سرحد میں زبردست بے چینی اور اضطراب پیدا کر رکھا تھا۔ سیّد احمد اور ان کے رفقاء نے خیال کیا کہ ایک طرف یہ اضطراب اور بے چینی موجود ہے، دوسری طرف سرحد کا پورا علاقہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ سرحد کے ساتھ کی تمام ریاستیں مسلمانوں کی ریاستیں ہیں۔ ان کو بھی اس مقدس جنگ کے لیے اکسایا جا سکے گا۔ اس طرح ایک خاصا بڑا علاقہ جو پنجاب، سرحد اور افغانستان پر مشتمل ہوگا، اس پر اسلامی حکومت قائم کر کے دہلی کی طرف قدم بڑھایا جا سکے گا۔ یہ تدابیر تھیں اور یہ طریق کار تھا جس نے سیّد احمد اور ان کے رفقاء کو اپنے وطن سے دور ایک بالکل مختلف خطے میں قیام کرنے اور اس کو مرکز جہاد بنانے پر آمادہ کیا۔ اس طریق کار اور ان تدابیر کے متعلق خود سیّد احمد کے بعض مکتوب شاہد ہیں۔ مثال کے طور پر شاہزادہ کامران کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا تا کہ اس کو کفر و شرک سے پاک کیا جائے۔ اس لیے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے، نہ کہ ملک خراسان میں سکونت اختیار کرنا۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقصود ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنا تھی، سرحد سے یلغار کرنا ایک طریق کار تھا اور چونکہ اس راستے میں سب سے پہلے سکھ مملکت آتی تھی، اس لیے ان سے جنگ لازمی ہوگئی۔ اس سرحد کے انتخاب میں ایک اور عنصر نے بھی خاصا اہم پارٹ ادا کیا ہوگا، اور وہ تھے سیّد احمد کے وطن کے افغان، جن میں سے کئی ایک ان کے اس لشکر میں بھی شامل تھے۔ چنانچہ سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد دی ہوگی کہ افغانوں کی جوانمردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و تہور کی ہندوستان میں بڑی شہرت تھی۔ جو افغانی ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک عرصے سے سکونت پذیر تھے، وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔ اودھ کی نوج انہی پٹھان افسروں کی ماتحتی میں تھی۔ نواب فقیر محمد خاں آفریدی، عبدالباقی خاں قندھاری، یہ سب افغانی الاصل اور سرحدی پٹھان تھے۔ خود نواب امیر محمد خان اور اس کے اکثر سردار اور رفقائے کار افغانی تھے۔ روہیل کھنڈ، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اور دینی حمیت کا ایک بڑا مخزن تھا اور وقتاً فوقتاً مرکز دہلی کو بھی تازہ خون اور نئی طاقت عطا کرتا رہا تھا، افغانوں سے آباد تھا۔ خود رائے بریلی میں جو سیّد صاحب کا وطن ہے، میاں آباد کا محلہ پٹھانوں کا تھا۔ سیّد صاحب ان کی مردانگی اور جوانمردی سے خوب واقف تھے۔ ان میں سے کثیر التعداد لوگ سیّد صاحب سے ارادت و بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور آپ کی رفاقت کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ ان سب کے تعلقات اور رشتہ داریاں افغانستان اور سرحد کے افغانی قبائل میں تھیں۔ انہوں نے بھی سیّد صاحب کو اپنے وطن یعنی افغانستان و سرحد کو اپنی دعوت جہاد کا مرکز بنانے کا مشورہ دیا ہوگا۔ اپنے اعزہ اور اہل تعلق کی مدد کی امید دلائی ہوگی۔ ان سب چیزوں نے

آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ اس افغانی آزاد علاقے کو اپنی مجاہدانہ دعوت وتحریک کا مرکز بنائیں۔ جس سے آپ کو اپنے مقصد کے سب بہترین سپاہی اور جنگ جو جنگ آزما رفیق بہت بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں۔''

سکھوں کے خلاف جہاد یا اسلامی حکومت کا قیام؟

اب سرحد و مرکز جہاد بنانے کے سلسلے میں جو دلائل دیے گئے ہیں، اور اس میں وہ مؤرخ بھی شامل ہیں جو سیّد صاحب سے بے پناہ عقیدت اور شیفتگی رکھتے ہیں، ان کی بھی نہادتیں درج کی گئی ہیں۔ ان سے ایک بات قدر مشترک کے طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اس جہاد کا مقصد فقط سکھوں کے خلاف جنگ نہ تھا، بلکہ اس برصغیر پر اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اب اس راستے میں سکھ آئے، ان سے جنگ کرنا پڑی۔ اگر ان کی جگہ مرہٹے ہوتے تو ان کے خلاف جنگ ہوتی۔ اس لیے صرف یہ بات کہنی کہ سکھوں کے مظالم حد سے گزر گئے تھے۔ اس لیے ان مظالم نے سیّد احمد اور ان کے رفقاء کو ان کے خلاف جہاد پر مجبور کیا، حقائق سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اس تحریک جہاد کو صرف سکھ دشمن تحریک کے طور پر پیش کرنا سراسر غلط ہے۔ ایک ایسی تحریک تھی، جو مسلمانوں کے لیے ان طبقوں کی نمائندگی کرتی تھی جو مسلمان بادشاہت سے منسلک تھے اور اس اقتدار کے ہٹ جانے سے اپنی عزت اور اپنے وقار خوشحالی اور تو اور اپنی زمینداریوں سے محروم ہو گئے تھے۔ اس لحاظ سے اس تحریک کا ایک غیر شعوری مقصد یہ بھی قرار پایا تھا کہ بہے ہوئے پانی کو واپس لایا جائے، رو بہ زوال طبقے کو پھر بام عروج پر پہنچایا جائے۔ مغل سلطنت کا جو سورج ڈھل چکا ہے اس کو دوبارہ اپنی پوری تاب ناکیوں کے ساتھ طلوع ہونے میں مدد دی جائے۔ یہ مقاصد کتنے سہانے، کتنے دل سوہ لینے والے تھے، کتنی بے پناہ کشش یہ اپنے اندر پنہاں رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ تحریک ناکام ہوئی اس لیے کہ گزرے ہوئے زمانے کو واپس لانے والی تحریکیں شاذ ہی کامیاب ہوتی ہیں کیونکہ جو پانی بہہ جاتا ہے اس کو کون واپس لا سکتا ہے؟ جو طبقہ اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے وہ دوبارہ معاشرے کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ وہ معاشرے کو ترقی سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ نئے اور پرانے کی جنگ میں پرانا نظام اپنی تمام گزشتہ و رفتہ دلکشیوں کے باوجود نئے نظام کے ہاتھوں ہٹ جاتا ہے۔ اس شکست پر کتنا بھی ماتم کیا جائے، لیکن پرانے کو بہر حال مٹنا ہوتا ہے۔ جو گل گیا ہے اسے بہر حال سڑنا ہے۔ جو بوڑھا ہو گیا اسے بہر حال زیر زمین دفن ہونا ہے۔ ہندوستان میں بھی مغل بادشاہت کا نظام اپنی تمام دل کشیوں کے باوجود فرسودہ ہو چکا تھا، گل چکا تھا، وہ لوگوں کو خوشحالی دینے سے قاصر تھا۔ اب وہ صرف محمد شاہ رنگیلا ہی پیدا کر سکتا تھا۔ اب اس نظام کو احمد شاہ ابدالی کی تلوار یا نجیب الدولہ کی جرأت، بہادری یا پھر امیر محمد خان کی جولانی مطبع کوئی بھی سہارا نہیں دے سکتی تھی۔ اسی طرح سے سید احمد اور شاہ اسماعیل کا زہد وتقویٰ، جرأت و بہادری اور خطابت و علمیت بھی اس نظام کے احیا کے لیے گارے اور چونے کا کام نہیں دے سکتی تھی، کیونکہ حالات بدل چکے تھے۔ ایک ایسی طاقت ہندوستان پر قابض ہو چکی تھی جس نے معیشت اور نظم و نسق میں زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس انقلاب سے جو حالات پیدا ہوئے اس نے مسلمانوں کے ایک حصے اور دوسری اقوام کو اس تحریک کی تائید سے باز رکھا۔

انیسویں صدی کے پہلے وسط میں جب یہ تحریک جہاد شروع ہوئی تو اس وقت شمالی ہند میں مقابلتاً منظم طاقت

صرف رنجیت سنگھ کی تھی ورنہ پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اس لیے جب تحریک جہاد کی ابتدا ہی اکیلی اس طاقت سے ہو جو اس برصغیر میں دیسی راج کی مظہر رہ گئی ہو تو لامحالہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ کہیں یہ انگریز کی بھی خواہش تو نہ تھی کہ وہ ایسے حالات پیدا کر دے کہ یہ مجاہدین اسی منظم طاقت کے خلاف جہاد شروع کر دیں اور وہ اتنی کمزور ہو جائے کہ انگریزوں کے لیے اس پر چڑھ دوڑنا آسان ہو جائے۔ ایک صدی سے اس قسم کے خدشات اور وسوسوں کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

اس تحریک کے گرد اس قسم کا تانا بانا بُنا گیا ہے کہ اس میں سے تحریک کے متعلق اصل حقائق کو منظر عام پر لانا خاصا مشکل کام ہو گیا ہے۔ اس تحریک پر پچھلے پچیس، تیس برس میں بے پناہ کام ہوا ہے۔ لیکن یہ کام مختلف اہل علم اور اہل دانش نے سال ہا سال کی تحقیق و جستجو کے بعد کیا ہے۔ تحریکوں کے ایک ایک خدوخال پر عرق ریزی کی ہے لیکن اس کے باوجود تقدیس کے ترازو میں تولا ہے یا پھر اپنے وقت کی سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر ان تحریکوں کو اُچھالا گیا ہے یا پھر ایک گروہ نے ان تحریکوں کے دینی عقائد سے اختلاف کی بنا پر ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ غرضیکہ چاروں طرف سے ان تحریکوں پر مختلف قسم کی یورشیں ہوئی ہیں، جن کی وجہ سے ان کی اچھائیاں اور برائیاں نمایاں نہیں ہو پاتیں۔

سیّد احمد شہید کی سیاسی فراست

تحریکیں زبردست اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، وہ تاریخ کو آگے بڑھانے میں ممد ہوتی ہیں۔ انسانی ذہنوں کی جلا کا باعث ہوتی ہیں، ان میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔ لیکن یہ تحریکیں رجعت پسند بھی ہو سکتی ہیں۔ سماج کو مجموعی طور پر آگے لے جانے کی بجائے پیچھے بھی لے جا سکتی ہیں، انسانی ذہنوں کو جلا دینے کی بجائے پراگندہ بھی کر سکتی ہیں۔ اس لیے تحریکوں کو کھنگالتے وقت ان تمام نتائج کو سامنے رکھنا پڑتا ہے اور یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھا جائے کہ کوئی تحریک کس حد تک سود مند تھی اور کس حد تک نقصان دہ، کس حد تک ترقی کی راہ پر ڈالنے والی تھی اور کس حد تک پسماندگی کی طرف لے جانے والی تھی، یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے اور عام طور پر قاری کو اس تجزیئے سے متفق کرانا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ عام قاری کا ذہن یک رُخا ہوتا ہے۔ اسے اگر کوئی تحریک پسند آ جائے تو پھر اس کے نقائص کی طرف اس کو متوجہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے جس کسی تحریک میں شریک ہونے والے انسان کی بہادری، جوانمردی، جرأت اور دلیری کے قصے بیان ہو رہے ہوں تو اس کے دل میں یہ کہیں کہ ان تمام خصوصیات کے باوجود اس تحریک میں فلاں فلاں نقائص بھی تھے اور مجموعی طور پر یہ تحریک سود مند ثابت نہیں ہوئی بلکہ مضرت رساں تھی، سماج کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے جانے کی غیر شعوری کوشش تھی، تو عام قاری حیران ہو کر منہ تکنے لگے گا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک تحریک جس کی قیادت بے پناہ بہادر انسان کر رہے ہوں غلط ٹھہرے، لیکن بہادری کے باوجود تحریکیں غلط ٹھہرتی ہیں اور ہر تحریک کے اچھے برے پہلو ہوتے ہیں۔ جس تحریک کے اچھے پہلوؤں کی تعداد زیادہ ہو اور برے پہلوؤں کی کم، وہ مجموعی طور پر ترقی پسند، آگے بڑھنے والی یا انقلابی تحریک کہلائے

گی اور اس کی اچھائیوں میں اس کی برائیاں بھی دب جائیں گی، لیکن تجزیہ نگار کی نگاہ کو یہ دونوں پہلو سامنے رکھنے ہوں گے اور یہی تاریخ نویسی کا حق اور تاریخ نویس کا اولین فرض ہوتا ہے۔

اس تحریک جہاد کو بھی انہی اصولوں کی بنا پر جانچنا چاہیے اور اس میں شریک ہونے والے عظیم انسانوں کی تمام عظمتوں کے باوجود دیکھنا چاہیے کہ یہ تحریک کس حد تک اس برصغیر کے مسلمانوں کے لیے سودمند ہوئی، اس لیے اس کو کسی حد تک ترقی کرنے میں مدد دی، نئے حالات سے دوچار ہونے میں کتنی رہنمائی کی اور یہ رہنمائی درست تھی یا نہیں؟ یہی سوال ہیں جن کے متعلق تمام مواد موجود ہوتے ہوئے بھی ابھی تک تشنۂ جوابات ہیں۔

اسلامی حکومت کا قیام

جہاں تک اس تحریک کے اس پہلو کا تعلق ہے کہ یہ سکھوں کے خلاف تھی یا نہیں، اس کا پہلے صفحات میں جواب دیا جا چکا ہے۔ لیکن ایک بات اور واضح ہو جانی چاہیے کہ یہ تحریک ان حالات میں ایک خالصتاً دینی تحریک کے طور پر شروع ہوئی جس کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ جس وقت اس تحریک کو خالص دینی کہا جاتا ہے تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کی منزل سیاسی اقتدار نہ تھی، یا کم از کم اس تحریک کا دعویٰ یہ تھا کہ سیاسی اقتدار مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود بالذات اسلامی حکومت ہے اور اس کے قیام کے لیے سیاسی اقتدار ایک ذریعہ ہے، اس لیے اس تحریک کو ان محدود طریقوں سے جانچنا غلط ہوگا کہ یہ سکھوں کے خلاف تھی یا انگریزوں کے۔ اس تحریک کے حامیوں میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک وہ گروہ ہے جو اس برصغیر میں ہندو مسلم مشترکہ جدوجہد کے ذریعے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف نبرد آزما تھا اور اس میں زیادہ تر تعداد علماء کی تھی، اس گروہ کی قیادت بھی انہی کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کو اپنے مؤقف کی حمایت میں پیش کیا اور اسے خالصتاً انگریز دشمن تحریک کے طور پر پیش کیا۔ دوسرا گروہ جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا داعی تھا، وہ ہندو سے زیادہ اشتراک کا حامی نہ تھا۔ اس نے اس تحریک میں سکھوں کے مخالف رنگ کو زیادہ ابھارا اور اس رجحان کے ڈانڈے تو سرسید سے جا ملتے ہیں، کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنے وقت کی سیاسی ضرورتوں کے تحت اس تحریک کو سکھ مخالف ثابت کرنے کے لیے پوری کوشش کی۔ تحریک کے بنیادی اصولوں کے متعلق تو خود اس کے قائدین کے اقوال اور تحریریں موجود ہیں، ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ سکھ، مرہٹے اور انگریز دشمنی کی تخصیص نہ تھی۔ یہ بالکل ایک الگ سوال ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے وسط میں یہ نعرہ اور یہ منزل درست تھی یا نہیں؟ مسلمانوں اور اس برصغیر کے عام لوگوں کے مسائل کے حل میں یہ نعرہ اور یہ منزل مد ہوتی تھی یا نہیں؟ لیکن اس وقت تو یہ طے کرنا ہے کہ اس تحریک کے بنیادی اصول کیا تھے؟ کیا یہ سکھ کے مخالف تھی یا انگریز کے؟ یا پھر فقط اسلامی حکومت کا قیام ہی اس کا واحد مقصد تھا''

مکتوبات

سید احمد کے مکتوبات سے، جو ان کے مختلف سوانح نگاروں نے مرتب کئے ہیں، یہی پتا چلتا ہے کہ اس تحریک کا بنیادی اصول اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ چنانچہ سید احمد اپنے مکتوبات میں جو شاہ بخارا کے نام لکھا گیا تھا، رقم طراز ہیں:

''جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ اور مقاتلہ کی کوشش اس وقت تک جاری رکھیں، جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس لے لیے جائیں، ورنہ مسلمان گنہگار رہوں گے۔ ان کے اعمال بارگاہ باری تعالیٰ میں مقبول نہ ہوں گے اور وہ خود قرب حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔''

اس اصول کی بنا پر یہ طے ہو جاتا ہے کہ اس راستے میں جو بھی رکاوٹ آئے گی، وہی دشمنی ٹھہرے گی اس لیے ان کے خلاف جہاد قرار پائے گا۔ اب اس راستے میں سب سے پہلی رکاوٹ سکھ ہوئے، ان کے خلاف جہاد کا اعلان ہو گیا۔ لیکن یہ جہاد کا اعلان کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ فقط سکھوں کے خلاف تھا اور انگریزوں کے خلاف نہیں تھا یا ان انگریزوں کے لیے کوئی رحم کا گوشہ موجود تھا۔ چنانچہ شاہ بخارا کے نام سے اسی مکتوب میں آگے چل کر لکھتے ہیں؟

''نصاریٰ اور مشرکین ہندوستان کے بلاد پر دریائے سندھ سے ساحل بحر تک قابض ہو گئے ہیں۔ یہ اتنا بڑا ملک ہے کہ انسان اگر پیدل چلے تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں چھ مہینے لگ جائیں۔ انہوں نے (نصاریٰ و مشرکین نے) خدا کے دین کو ختم کرنے کے لیے تشکیک و تزویر کا جال پھیلایا ہے اور ان تمام خطوں کو ظلم و کفر کی تیرگی سے بھر دیا ہے۔''

سیاسی فراست

سید احمد، شاہ اسماعیل اور دوسرے اکابرین کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس وقت کی سیاسی صورتحال سے کسی حد تک ہی نہیں بلکہ پوری طرح آگاہ تھے، اور اس سیاسی صورتحال کو بدلنے کے لیے بے تاب تھے، لیکن ان حالات کو بدلنے کے لیے ان کے پاس جو اسلوب تھا وہی دین تھا۔ اس وقت ان کو تحریکوں کے نئے اسلوب کا علم ہی نہ تھا، اور نہ ہی ملک میں تحریکوں کے نئے اسلوب پروان چڑھے تھے کیونکہ وہ طبقہ بھی اتنا جاندار نہ تھا جو مسلمانوں میں تحریکوں کے لیے نئے اسلوب رائج کرتا، نئے خیالات اور نئے سائنسی علوم کی توسیع کا مبلغ بنتا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود انہی اکابر سے متاثر ہونے والے سرسید نے نصف صدی اور ربع صدی بعد اس نئے طبقے اور اس کی کئی ضروریات کی نشاندہی کی، تحریک کے لیے اسلوب سے روشناس کرایا، نیا طریقہ ایجاد کیا اور بدلتے ہوئے حالات میں نئے طریقے اختیار کیے۔

بہرحال سید احمد اور ان کے رفقاء نے انگریزی تسلط کو بھانپ لیا تھا اور اس خطرے سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ اسی انگریزی تسلط کے متعلق شاہ اسماعیل اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جو فرنگی ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ بے حد تجربہ کار، ہوشیار اور حیلہ باز اور مکار ہیں۔ اگر اہل خراسان (افغانستان) پر چڑھائی کر دیں تو سہولت سے ان کے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ پھر ان کی حکومت کی حدیں آپ کی حکومت سے مل جائیں گی۔ دارالحرب اور

دارالاسلام کی اطراف متحد ہو جائیں گی۔"

اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے ایک عوامی تحریک وجود میں لائی گئی ہے۔جس طرح تمام تحریکوں کے مختلف ادوار ہوتے ہیں، اسی طرح اس تحریک کے بھی مختلف ادوار تھے، پہلا دور سکھوں کے خلاف نہیں بلکہ دہلی تک اسلامی حکومت کا قیام تھا تا کہ اس کے بعد اتنی طاقت مہیا ہو جائے کہ انگریز سے ٹکر لی جا سکے۔یہی وجہ ہے کہ سیّد احمد اور شاہ اسماعیل نے بار بار اس تحریک کے عوامی کردار پر زور دیا ہے اور اپنے تئیں سلطنت کے داعی کے طور پر پیش نہیں کیا تا کہ ان کی تحریک میں سلطنت کے داعی بھی شامل ہو سکیں اور انہیں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہو۔اس لئے وہ بار بار دہراتے ہیں کہ انہیں سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہے۔

حب اللہ

سید احمد اپنے مختلف مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اسی کے لیے وہ اپنی جان تک ہارنے کے لیے تیار ہیں۔چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہم محض رضائے الٰہی کے آرزو مند ہیں۔ہم اپنی آنکھوں اور کانوں کو غیر اللہ کی طرف سے بند کر چکے ہیں اور دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں۔ہم نے محض اللہ کے لیے علم جہاد بلند کیا ہے، ہم مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست، حکومت و سیاست کی طلب و آرزو سے آگے نکل گئے ہیں۔خدا کے سوا ہمارا کوئی مطلب نہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ ہم عاجز و خاکسار، ذرۂ بے مقدار ہیں لیکن بلاشک محبت الٰہی سے سرشار اور غیر خدا کی محبت سے بالکل دستبردار ہیں۔یہ سب کچھ محض اللہ کے لیے ہے۔اس جذبۂ الٰہیہ میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے کا شائبہ بھی نہیں۔اگرچہ یہ بات فقیر کے اکثر واقفانِ حال پر ظاہر ہے لیکن مزید تاکید کے لیے پھر نئے سرے سے کہتا ہوں کہ میں خدائے علام الغیوب کو گواہ بناتا ہوں کہ کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو جذبۂ جہاد حقیر کے دل میں موجزن ہے، اس میں رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ الحق کے مقصد کے سوا، عزت و جاہ و جلال، مال و دولت، شہرت و ناموری، امارت و سلطنت، برادران و معاصرین پر فضیلت و بزرگی یا کسی اور چیز کا فاسد خیال ہرگز دل میں نہیں ہے اور ہم جو بات کہہ رہے ہیں، اللہ اس کا گواہ ہے۔

مسلمانوں کی زبوں حالی

ان ہی مکتوبات میں اس برصغیر کے مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ کفار اور سرکشوں سے ہر زمانے اور ہر مقام میں جنگ کرنا لازم ہے۔لیکن خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں کہ ان کفر و طغیان کی سرکشی حد سے گزر چکی ہے۔مظلوموں کی آہ و فریاد کا غلغلہ بلند ہے، شعائر اسلام کی توہین ان کے ہاتھوں صاف نظر آ رہی ہے۔اس بنا پر اب اقامت رکن دین، یعنی اہل شرک سے جہاد عامۃ المسلمین کے ذمہ کہیں مستحسن اور واجب ہو گیا ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''چند سال سے ہندوستان کی سلطنت وحکومت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائی اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے۔ کفر و شرک کی رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے اور شعائر اسلام اٹھ گئے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا، دل میں غیرت ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش وخروش ہے۔''

سیّد احمد نے انگریزوں کے تسلط کے متعلق بھی مختلف مکتوبات میں اظہار خیال کیا ہے۔ ایک مکتوب والی چترال کو لکھا، اس میں واضح طور پر انگریزوں کے متعلق اپنے خیالات قلم بند کیے ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں:

''جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے، دنیا جہاں کے تاجر اور سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے اہل حکومت، کی حکومت اور ان کی عزت وحرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت وسیاست کے مردمیدان تھے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لیے مجبوراً چند غریب اور بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے ہیں۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں، محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اٹھے ہیں، مال و دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں۔''

یہ مکتوبات بار بار اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ سلطنت حاصل کرنے کا مقصد اس تحریک کی بنیاد نہیں ہے بلکہ یہ تحریک صرف اس لیے شروع کی گئی ہے تاکہ محرومین اقتدار کو اقتدار دلایا جائے۔ کیونکہ اب وہ اپنے اندر چونکہ لڑنے کی سکت نہیں رکھتے اس لیے تحریک جہاد کا پرچم ان ''فقیروں'' نے بلند کیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کا ایک مکتوب موجود ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

''ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور انہوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی ہے، کسی کو ان سے مقابلے کی تاب نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ چونکہ بڑے بڑے اہل حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں، اس لیے چند کمزور اور بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے۔''

یہ موقف کہ جہاد کرنے کا فرض ایک الگ جماعت پر ٹھہرا ہے اور حکومت کرنے کا فرض ایک دوسری جماعت اور ایک دوسرے گروہ پر عائد ہوا، یہ اس دور کا ایک بہت بڑا تضاد تھا اور یہ تضاد مسلمانوں کی سیاست میں گزشتہ ایک صدی یا ڈیڑھ صدی سے چلا آ رہا تھا اور کسی نہ کسی رنگ میں یہ تضاد آج بھی موجود ہے۔ اس تضاد نے بہت حد تک ہماری سیاست کو الجھایا ہے۔

تحریک جہاد کا اصل مقصد

برصغیر ہندوستان میں اب تک سیاست اور سیادت کا معاملہ صاحب شمشیر تک محدود رہا تھا۔ اس سلسلے میں ابھی عالم دین کے ہاتھ نہ تو سیاست اور سیادت آئی تھی اور نہ اس نے براہ راست اس کے حصول کے لیے کوئی عملی قدم

اٹھایا تھا۔ یہ عمل پہلی بار انیسویں صدی میں شروع ہوا اور اس عمل نے حقیقتاً ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں زبردست ردعمل پیدا کیا۔ یہاں دینی عقائد اور اصولوں کی بنیاد پر حکم لگانا مقصود نہیں، صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا مقصود ہے کہ براہِ راست علماء اور آئمہ دین نے ہندوستان میں اپنے ہاتھ میں شمشیر و سنان سنبھالنے کا تجربہ انیسویں صدی ہی میں کیا ہے۔ اس سے پہلے بادشاہ کی سیادت تسلیم ہوتی رہی ہے۔ اسی کے ذریعے احکام شریعت کے نفاذ پر زور دیا جاتا رہا ہے اور اس طرح سے زندگی قریب قریب دو خانوں میں بٹ گئی تھی، ایک خانہ عملی سیاست اور سلطنت کا اور دوسرا درس و تدریس اور رشد و ہدایت کا۔ یہ درست ہے کہ صاحب رشد و ہدایت اور درس و تدریس ہمیشہ صاحب سلطنت اور اس کے عمال پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، لیکن انہوں نے خود آگے بڑھ کر سلطنتوں کے قیام کے لیے جہاد نہیں کیا تھا۔ اب یہ تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا اور اس تحریک کے اکابرین کو خود بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ تجربہ نیا ہے اور لوگوں کو اس تجربے سے مانوس کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سیّد احمد بار بار اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کا کام صرف احیائے دین ہے، قیام سلطنت نہیں ہے اور سلطنت کا بار اٹھانا ان کے بس میں نہیں ہے۔

عوامی تحریکوں کی کامیابی کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہوتی ہے کہ عامۃ الناس تک تحریک کے صحیح اور اصل مقاصد پہنچائے ہی نہ جائیں بلکہ ان کو ان کی سچائی اور درستی کا پوری طرح یقین دلایا جائے۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ بار بار اس بات کو دہرایا جائے کہ یہ تمام جدوجہد عظیم اصولوں اور ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لیے کی جارہی ہے۔ اس میں ذاتی غرض شامل نہیں ہے۔ یہ کام سیّد احمد اور ان کے رفقائے کار شاہ اسماعیل نے اپنے مکتوبات اور وعظوں سے مسلسل کیا ہے اور بار بار لوگوں کو ذہن نشین کرایا ہے کہ وہ جو جدوجہد کر رہے ہیں، اس کا مقصد سلطنت کا حصول نہیں ہے بلکہ اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ اسی لیے مولانا مہر لکھتے ہیں:

> ''سیّد احمد سے پہلے جتنے آدمی معمولی حیثیت سے اٹھ کر لشکر کے مالک بنے تھے، وہ ملک یا ریاستیں سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ ایک قریبی مثال نواب امیر خاں مرحوم کی تھی جس کے ساتھ سیّد صاحب سات آٹھ برس گزار چکے تھے۔ ان مثالوں کی بنا پر مختلف قلوب میں یہ وسوسہ پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کہ سیّد صاحب بھی ملک و ریاست کے طلب گار ہیں۔ اس زمانے میں للّٰہیت اس درجہ کم یاب تھی کہ عام لوگ اس کا صحیح تصور بھی نہ کر سکتے تھے، جس طرح ہمارے زمانے میں نہیں کر سکتے۔ فکر و نظر کا پیمانہ ایسا بن گیا تھا کہ کسی شخص کی کوئی سرگرمی اور کوئی جدوجہد ذاتی اغراض کے لوث سے پاک نہ سمجھی جا سکتی تھی۔ پھر سب لوگ جانتے تھے کہ سیّد صاحب امیر خاں کے رفیق تھے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ امیر خاں ٹونک کا مالک بن کر بیٹھ گیا تھا۔ اکثر نے یہی سمجھا ہوگا کہ سیّد صاحب بھی اپنے لیے ایک الگ جداگانہ ریاست پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ کو اپنا مطمع نظر بار بار واضح کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی اور یہ مضمون آپ کے مکاتیب میں بیسیوں مرتبہ دہرایا گیا۔''

سیاست اور سیادت کی بنیاد

اس تحریک کے اکابرین کے مکتوبات اور تحریروں میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں اس تحریک کے وہ خط و خال نمایاں ہوتے ہیں جو اسے اس سے پہلے کی لشکر کشیوں اور جنگوں میں ممیز کرتے ہیں۔ دراصل یہ پہلی تحریک تھی جو براہ راست سلطنت کے لیے جدوجہد نہیں کر رہی تھی بلکہ ایک فضا اور ایک ماحول تیار کرنے کی خواہاں تھی اور اسی کے بل پر اس نے عوام کو منظم کر کے ہتھیار سنبھالنے کی طرف بلایا۔ چنانچہ جب جہاد شروع ہو گیا تو شب خون کی اجازت دے دی جس کے نتیجے میں سکھ فوج کو خاصا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس موقع پر سکھ فوج کے قائد، سردار بدھ سنگھ نے سیّد احمد کے نام ایک مکتوب بھیجا اس میں انہوں نے اپنے موقف کی تفصیلی طور پر وضاحت کی ہے اور دراصل یہی موقف تھا جو غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی تحریکوں کی روایت بن گیا ہے۔ سردار بدھ سنگھ لکھتے ہیں:

> ''شرافت، منزلت، سیادت و مرتبت فضیلت پناہ، عبادت انتباہ، زبدۃ الفضلا العظام سیّد احمد صاحب سلمہ۔ واضح ہو کہ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد اور اتنے دور دراز ملک سے آکر آپ نے لڑائی کی طرح ڈالی اور لباس شہادت کو اپنے اوپر آراستہ کیا ہے تو لازم تھا کہ جنگ و مقابلہ میدان میں نکل کر ہو۔ طمع نفسانی سے شہر حضرو کے غربا اور بیوپاریوں پر شب خون در چھاپہ مارنا ذلت ہمیشہ کی بدنامی کی بات ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کے ہمراہی جس طرح شیشے کو پتھر سے مارا جائے، اسی طرح معدوم ہو گئے۔ اب بھی آپ اصل سیّد اور بڑے سردار ہیں تو باہر نکل کر صاف صاف مقابلہ کیجئے، چھپ کر لڑنے سے دنیا اور دین کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، اور اگر فرار اختیار کریں گے تو دونوں جہان کے نفع سے خالی ہاتھ جائیں گے۔''

اس مکتوب کے جواب میں خود سیّد احمد نے جو مکتوب روانہ کیا، وہ دراصل بنیادی اصولوں اور تحریک کے خصوصی موقف کا حامل ہے۔ سیّد احمد اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

سیّد احمد کا مکتوب

> ''امیر المومنین سیّد احمد کی طرف سے سپہ سالار جنود و عساکر، مالک خزائن و دفائن، جامع ریاست و سیاست، بادئ امارت و ایالت، صاحب شمشیر جنگ، عظمت نشان، سردار بدھ سنگھ (اللہ اس کو سیدھے راستے کی ہدایت دے اور اس پر توفیق کی بارش کرے) واضح ہو: آپ کا گرامی نامہ جو اظہار مراتب شجاعت و شہامت کے دعاوی پر مشتمل ہے، پہنچا اور اس کے مضمون سے آگاہی ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی اور معرکہ پیرائی سے جو مقصود ہے، آپ نے اچھی طرح نہیں سمجھا اور اسی لیے آپ نے اس قسم کا خط لکھا۔ اب کان لگا کر سنئے اور سمجھئے کہ اہل حکومت اور ریاست سے لڑائی جھگڑا چند اغراض سے ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کا مقصد مال اور ریاست کا حصول ہوتا ہے، بعض کو محض اپنی شجاعت اور دلیری دکھانی ہوتی ہے اور بعض آدمیوں کا مقصد شہادت کا مرتبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے

میرا مقصد ہی دوسرا ہے، یعنی فقط اپنے مولا کے حکم کی بجا آوری جو مالک مطلق اور بادشاہ حق ہے۔ اس نے دینِ محمد ﷺ کی نصرت واعانت کے بارے میں جو حکم دیا ہے، محض اس کی تعمیل مقصود ہے۔ خدائے عزوجل اس بات کا گواہ ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی سے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصود نہیں اور اس میں کوئی نفسانی غرض ہرگز شامل نہیں، بلکہ نفسانی غرض کے حصول کی آرزو نہ کبھی زبان پر آتی ہے، نہ کبھی دل میں گزرتی ہے۔ دین محمدی ﷺ کی نصرت کرنے میں جو کوشش بھی ممکن ہوگی، بجا لاؤں گا اور جو تدبیر بھی مفید ہوگی، عمل میں لاؤں گا۔ اور ان شاء اللہ زندگی کے آخری سانس تک اسی کوشش میں مشغول رہوں گا، اسی رستے پر چلتا رہوں گا اور جب تک دم میں دم ہے، اسی کا دم بھرتا رہوں گا۔ جب تک پاؤں ہیں، اس وقت تک یہی راستہ ہے اور جب تک سر ہے، یہی سودا ہے، خواہ مفلس ہوں، خواہ دولت مند، خواہ منصب سلطنت سے سرفراز ہوں، خواہ کسی کی رعیت ہوں، خواہ بزدلی کا الزام دیں، خواہ بہادری کی تعریف سنوں، خواہ میدان جہاد سے زندہ واپس آؤں، خواہ شہادت سے سرخرو ہوں۔ ہاں اگر میں دیکھوں کہ میرے مولا کی خوشی اسی میں ہے کہ میدان جنگ میں تنہا رہ کر آؤں تو خدا کی قسم سو جان سے سینہ سپر ہوں گا اور لشکر کے نرغے میں بے کھٹکے گھس جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ مجھے نہ اپنی شجاعت کا اظہار مقصود ہے، نہ ریاست کا حصول۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر سربرآوردہ حکام اور عالی مرتبت سرداروں میں کوئی شخص دین محمدی قبول کرے تو میں اس کی مردانگی کو سو زبان سے اظہار واعتراف کروں گا اور ہزار جان سے اس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا اور اس کی حکومت کی ترقی کے لیے بے حد کوشش کروں گا۔ اس بات کو فوراً امتحان کر سکتے ہیں اور اگر اس کے خلاف ہو تو مجھے الزام دیجئے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو بھی اس معاملے میں مجھے ہرگز قابل ملامت اور قابل الزام نہ پائیں گے کیونکہ جب آپ نے حاکم کے احکام کی تعمیل میں جو آپ جیسا ایک انسان بلکہ آپ کی برادری کا ایک فرد ہے، کوئی عذر اور حیلہ نہیں کر سکتے تو میں احکم الحاکمین کے حکم کی تعمیل میں، جو زمین و آسمان کے تمام افراد انسانی اور ساری کائنات کا خالق ہے، کیا عذر کر سکتا ہوں؟" والسلام"

سلطنت اور سیاست کی علیحدگی

تحریکوں کے اجراء کا یہ انداز سب سے پہلے اسی تحریک سے ہوا۔ یعنی قائد کے لیے، یہ لازم ٹھہرا کہ وہ ذاتی مفادات کے لیے کوشاں نہ ہو اور بار بار اس بات کا اعادہ کرے کہ وہ خود اپنے لیے جدوجہد نہیں کر رہا۔ بلکہ پہلے دور میں رضائے الٰہی مقصود ٹھہری اور بعد میں ملک کی آزادی مقصود قرار پائی لیکن اصرار اس بات پر ہی رہا کہ قائد خود جدوجہد کی رہنمائی کرے۔ اس سے پہلے تحریکوں کا اجراء نہیں ہوا تھا بلکہ لشکر کشیاں ہوتی تھیں۔ اور لشکر کشی کرنے والا اپنے لیے جدوجہد کرتا تھا، اور اس کا مقصد سلطنت کا حصول ہوتا تھا۔ اس کے حامی اور لشکر کے شرکاء کے اس پوری

جدوجہد سے ذاتی مفادات وابستہ ہوتے تھے۔ لیکن یہ پہلی تحریک تھی جس میں ایک نظریئے کی بنیاد پر رائے عامہ کو پہلے منظم کیا گیا اور پھر عامۃ الناس کو متحرک کر کے جہاد کے لیے تیار کیا گیا۔ جہاں یہ مجاہدین ایک نفع و ملی مقصد کے لیے سربکف میدان میں آئے تھے، وہاں ان کو اپنے قائد پر بھی پورا پورا اعتماد اور یقین تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس قائد کو ان مقاصد کا مظہر تصور کیا گیا۔ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود پائی گئیں جو ایسی تحریک کے قائدین میں ہونی چاہئیں۔ دراصل قائد کی خصوصیات کا جو تصور اس زمانے میں پیش ہوا وہ اس زمانے میں دینی تحریک کی ضروریات کے مطابق تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانے کے بدلنے کے باوجود مجموعی طور پر مسلمان عوام کی روح میں قائد کی جو صلاحیتیں رچ گئیں، وہ اسی گئے گزرے زمانے کی تھیں جو حقیقتاً اب گزر چکا تھا۔ اس زمانے میں بھی ان مسائل پر بحثیں ہوئیں لیکن آج ان بحثوں پر نگاہ رکھی جائے تو خاصے اہم نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

اس دور میں جہاد کے لیے جن امور کی ضرورت تھی، ان پر بھی خاصی لے دے ہوتی رہی اور مختلف قسم کے اعتراضات ہوتے تھے، اور ان کا جواب سیّد احمد کے سوانح نگاروں نے اپنی حدود میں رہ کر دیا ہے۔ کیونکہ اس وقت جہاد کا اعلان ہوا تو یہ بھی بہ ظاہر ان ہی عقائد کی تکمیل ہی کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ جب اس جہاد کے متعلق مختلف نظریات سامنے آئے تو وہ بھی انہی بنیادوں پر حل کیے گئے تھے، اس لیے ان چیزوں پر کسی دوسرے نقطۂ نظر سے ابھی تک سوچا ہی نہیں گیا حالانکہ جب جہاد کا نعرہ بلند ہوا تھا تو اس کے پیچھے بھی زمانے کے تقاضے کارفرما تھے اور قائدین و اکابرین نے ان تقاضوں کو محسوس کیا تھا اور دین کے ذریعے ان تقاضوں اور اس دور کے مسائل کے حل کرنے کے لیے راہ دکھائی تھی۔ جو ان سے مختلف نظریات رکھتے تھے اور جو جہاد کے مخالف تھے، ان کو بھی دین کی حدود کے اندر ہی رہ کر اپنا موقف پیش کرنا لازمی تھا۔ اس لیے کہ اس دور میں لوگ ایک ہی زبان، ایک ہی اسلوب، یعنی نظریہ سمجھتے تھے اور وہ دین کی زبان تھی، دین کا نظریہ تھا اور دین ہی کا اسلوب تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس دائرے اور حدود کے اندر رہ کر ہی مختلف نظریات اور راستوں کو پیش کیا جاتا۔ حالانکہ بنیادی طور پر بحثیں اور نظریات انہی عقائد سے متعلق تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان بحثوں اور ان مختلف نظریات کو اپنے عقائد اور مذہب کی روشنی ہی میں نہیں بلکہ زمانے کے حالات کے مطابق بھی جانچا جائے کیونکہ اسی ایک صورت سے اس امر کا تجزیہ ہو سکے گا کہ ان مختلف نظریات کے پیچھے کون کون سے مختلف محرکات کام کر رہے تھے۔

اس تحریک کی ناکامی کی مکمل داستان کے متعلق بھی مختلف نظریات ہیں۔ اس داستان میں رنگ بھی مختلف طریقے سے بھرے گئے ہیں۔ اگر اس تحریک کو خالصتاً دینی عقائد کے حصار میں محصور کر کے دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی ناکامی کی وجوہات بھی مذہبی اور دینی حدود میں محدود ہوں گی۔ اگر اس تحریک کو ذرا وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پھر اس عظیم جدوجہد کی ناکامی کے متعلق بھی تفصیلی جستجو کرنا ہوگی کیونکہ یہ تو بہت واضح اور آسان جواب ہوتا ہے کہ فوجیں آمنے سامنے تھیں، ایک فوج ہار گئی اور ایک جیت گئی اور بس قصہ ختم ہو گیا۔ یا ایک فوج میں سے کچھ سپاہیوں نے غداری کر دی، اس وجہ سے فوج پسپا ہو گئی۔ یہ تمام وجوہات اپنی جگہ پر اہم ہوں تو ہوں لیکن تحریکوں کے سلسلے میں یہ وجوہات فیصلہ کن نہیں ہوا کرتیں۔

تحریک جہاد کے عقائد ونظریات

یہ درست ہے کہ تحریکوں پر جب تشدد ہوتا ہے، جب دشمن کی یلغار اس قدر تند و تیز ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہوتا ہے تو تحریکیں دب ضرور جایا کرتی ہیں۔ وہ پیچھے بھی ہٹ جاتی ہیں، اس مخصوص موقع پر شکست بھی تسلیم کر لیتی ہیں، لیکن یہ کہنا کہ فلاں تحریک ناکام ہوگئی، اس کے معانی بہت وسیع ہوتے ہیں۔ اس ناکامی کا تجزیہ بھی اپنے اندر بے پناہ وسعتیں لیے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ کسی تحریک کی ناکامی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک مجموعی طور پر معاشرے کے لیے قابل قبول نہ تھی اور وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں اتنی سکت نہ رکھتی تھی کہ وہ پورے معاشرے کو منظم اور متحد کر کے دشمن کو شکست دے سکتی۔ اس لیے اب ضروری ہو جاتا ہے کہ پوری توجہ اس طرف مبذول کی جائے کہ وہ حالات اور وجوہات کیا تھیں جو اس بات کی وضاحت کر سکیں کہ یہ تحریک پورے معاشرے کو متحد و منظم کیوں نہ کر سکی اور اس کے مقابلے میں دشمن کیوں کامیاب ہوگیا۔ کیونکہ اگر کوئی تحریک معاشرے کو متحد و منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اپنے عوام کو قائل کر لیتی ہے، اس کا موقف، نظریہ اور مسلک عوام کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو پھر یہ کہنا درست ہے کہ اگر دشمن کسی وجہ سے مثلاً بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے اس تحریک کو شکست دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اس کے باوجود یہ تحریک قائم و دائم رہتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد وہ اس سے بھی زیادہ زوردار طاقت کے ساتھ ابھرتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ تحریک اپنی منزل کو جا ملتی ہے۔ اس تحریک کی ناکامی پر اس مطمح نظر سے اس وسعت سے نگاہ ڈالنے کا یہ مطلب نہیں کہ میدانِ جنگ کے داؤ پیچ یا لشکروں کا تناسب یا اپنے علاقے کی آبادی کے تعاون و عدم تعاون کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے اور ناکامیوں اور شکستوں کی وجوہات میں ان کا کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ یہ تمام چیزیں بہت ہی اہم ہیں۔ اس تحریک کے سلسلے میں ان سب وجوہات اور کوائف کو بیان ہونا چاہیے۔ ان تفصیلات کے تین پہلو ہیں: اولاً تو خود اس تحریک کے نظریات اور عقائد، دوم ان نظریات اور عقائد کے علاوہ بھی مسلمانوں کے اندر اس وقت کوئی اور رجحانات و نظریات موجود تھے۔ ان کے اثرات کیا تھے اور وہ کس حد تک اس تحریک کے مقابلے میں کسی دوسرے طریق کار کی ترجمانی کرتے تھے؟ تیسرے، برصغیر کے غیر مسلموں میں کون سی تحریکیں اٹھ رہی تھیں؟ یہ تحریکیں کیا طریق کار استعمال کر رہی تھیں؟ اور سب سے آخر میں اس پہلو پر روشنی پڑنی چاہیے کہ برصغیر میں آیا کوئی ایسا رجحان، ایسی تحریک، ایسا ادارہ موجود تھا جو پورے ملک کو متحد اور منظم کر سکے؟ ان مختلف پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو سے اس تحریک کی ناکامی کے اسباب ڈھونڈے جا سکیں گے۔

عقائد ونظریات

اس پہلو پر خاصی روشنی ڈالی جا چکی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس تحریک کے عقائد و

نظریات نے مسلمانوں کے ایک طبقے کو خاصا متاثر کیا اور یہ طبقہ محرومین کا وہ طبقہ تھا جو مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے باعث اقتدار سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف طاقتوں کی مڈ بھیڑ اور لوٹ مار نے بھی ایک گونہ اضطراب اور پریشانی بہم پہنچا دی تھی۔ تیسرے، سب سے زیادہ متاثر علاقے بنگال اور بہار تھے۔ یہاں کے عام مسلمان کاشت کار اور پارچہ باف کی زندگی ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندو زمیندار کے غیر شعوری اتحاد نے درہم برہم کر دی تھی۔ ان میں زبردست اضطراب اور بے چینی نے وہاں فرائضی اور تیطو میاں کی تحریکوں کو جنم دیا تھا۔ چنانچہ جب ہندوستان کی سرحد پر جہاد کا نعرہ بلند ہوا تو جس اضطراب اور بے چینی کی تشفی فرائضی تحریک سے نہ ہو سکی تھی، اس کی تشفی کے لیے یہ کاشت کار اور پارچہ باف ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے جہاد کے لیے سرحد پر جانے کے لیے تیار رہتے تھے اور یہ سلسلہ سیّد احمد کے زمانے میں مقابلۃً کم رہا لیکن ان کی شہادت کے بیس پچیس برس بعد تک یہ سلسلہ کہیں زیادہ شدت سے جاری ہو گیا۔ اس لیے کہ سب سے زیادہ متاثر علاقہ بنگال اور بہار ہی تھا اور یہی وہ خطہ تھا جہاں کی اقتصادی زندگی چوپٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ دینی تحریکوں کے پیچھے اقتصادی اور معاشی وجوہات کام نہیں کرتیں، بالکل غلط ہے۔ تحریکوں کا ظاہری ڈھانچہ خواہ کسی قسم کا ہو، اس کا فلسفہ کتنا ہی الٰہیاتی ہو، اس کے پیچھے یہ تمام عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دینی عقائد اور نظریات کو دین کی حدود ہی میں محدود کر کے نہ دیکھا جائے۔ یہ درست ہے کہ تحریکوں کے اکابرین جب اپنے عقائد اور نظریات کی تبلیغ کرتے ہیں تو ان کے متاسد دینی تعلیمات کی اساس ہوتے ہیں۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ ایک مخصوص دور میں بعض مخصوص پہلوؤں کے بارے میں دینی تعلیمات پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی کو دین کا سب سے اہم رکن قرار دے کر اجاگر کیا جاتا ہے۔ اب مثال کے طور پر خود سیّد احمد کی تحریک ہی کو لیجئے، ایک وقت میں اس تحریک کا پورا اصرار عقائد کی درستی پر تھا اور وہ بھی ایسے عقائد جو توحید کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے، اس لیے کہ جب تک توہم پرستی، قبر پرستی، پیروں فقیروں سے اعتقاد بے جا زائل نہیں ہوتا، اس وقت تک لوگوں میں خود اعتمادی اور اللہ پر بھروسا اور اس کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا اور اس کو جب تک صحیح معنوں میں نادر مطلق نہ یقین کر لیا جائے، اس وقت تک تمام دوسرے قادروں سے بغاوت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ عقائد و نظریات تحریک کے ابتدائی دور میں دیکھنے میں آتے ہیں لیکن اس کے بعد دوسرا دور جہاد کا ہوتا ہے اور تلوار اٹھانے کے لئے تعلق عوام کو تیار کیا جاتا ہے اور تمام دین کی وسعتیں اس مقصد پر سمٹ جاتی ہیں اور اس جہاد میں کامیابی کے لیے تمام طریقے اور ہر قسم کے وعظ اور تدریس سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ قائد تحریک کو ایک ریفارمر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ اسی صورت میں وہ لوگوں میں نظم وضبط پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسی جہاد کے دوران میں سیّد احمد کی امامت کو تسلیم کیا گیا۔ یہ تمام مراحل دینی حدود میں تھے، لیکن وقت کی ضرورتوں کے تحت ہی ان پر اصرار ہوا اور اس سلسلے میں اگر شاہ اسماعیل کی معرکۃ الآراء کتاب ''منصب امامت'' کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح امامت سے مقصد ایک پوری تحریک کی قیادت ہے، اور اس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ مقصد ایک پوری تحریک کی قیادت

ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا خاکہ کافی دنوں پہلے شاہ ولی اللہ کے خاندان کے ذہنوں میں مرتب ہو چکا تھا۔ اسی کی روشنی میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا کام ہورہا تھا۔

دعوت وتبلیغ

سید احمد کی تحریک میں شاہ اسماعیل کا درجہ بہت بلند ہے اور بعض صورتوں میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس تحریک کے داؤ پیچ متعین کرنے میں ان کو اوّلیت حاصل ہے اور اس مقصد کے لیے ان کی تصانیف کا درجہ بہت بلند ہے۔ کیونکہ ان سے اس تحریک کے طریق کار کے بارے میں خاصا اہم مواد ملتا ہے۔ اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''منصب امامت'' میں لکھتے ہیں:

''حق جل علی اپنی حکمت کاملہ سے ان مقبولان بارگاہ کو مختلف مزاج لوگوں کی تربیت کا سلیقہ اور فصیح کلام اور بیان بلیغ کی قدرت، مقدمہ ہدایت، تقریر، اظہار مافی الضمیر کے باب میں عطا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے داؤد علیہ السلام کے حق میں فرمایا کہ ہم نے اس کو حکمت اور فصل خطابت عطا فرمائے۔ حکمت سے مراد یہی تربیت کا سلیقہ ہے اور فصل خطابت کے معنی بیان بلیغ ہے اور حضرت نبی ﷺ کو ارشاد فرمایا ہے کہ ان نفسوں سے بلاغت سے بات کرو۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ ہادیان مبعوث کی دعوت اور طرح کی ہوتی ہے اور دانش مندان فنون کی تعلیم دوسری طرح کی۔ اس کے درمیان تمیز کرنا دو طرح پر ہے:

اول یہ کہ ان کی دعوت کا کلام محاورات اہل عرف پر جاری ہوتا ہے جو کہ اپنے معاملات اور مکالمات میں اس کو استعمال کرتے ہیں اور دانایان علم کلام اور مصنفین کتب کی اصطلاحات پر جاری نہیں ہوتا کہ اپنی تحریر و تقریر کو اس کی بنا پر کریں۔ بہت سے محاورات ہیں جو حقیقت اور اصلیت کی نسبت مشہور محاورات میں زیادہ تر رائج ہوتے ہیں اور بہت سی قیود اتفاقی ہیں، نہ کہ احترازی اور بہت سے تکرار ہیں جو محض تقریر و تاکید کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ مضمون جدیدہ کے فائدے کے لیے۔ اور بہت سے مضمون ہیں کہ ان کے جزو سے بھی معانی نکل آتے ہیں اور ان میں سے کسی قدر قرائن حالیہ کے محتاج ہوتے ہیں اور بہت سے کلمات ہیں جو اپنی اصلیت سے نکل کر اور غلط العوام ہو کر خاص و عام کی زبان پر رائج ہو جاتے ہیں اور اسی رائج طریقے سے کلام کرنا فصیح معلوم ہوتا ہے اور اصلی قانون غیر فصیح ہو جاتے ہیں۔ الحاصل ان کے کلام دعوت کو تقریر و خطاب سے جاننا چاہیے کہ اس تصنیف کا قانون سمجھا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تربیت قوم کے باب میں ان کا حال مہربان باپ کی طرح یا دانش مند استاد کی طرح ہوتا ہے جو اپنی تربیت کی نظر سے بیٹے کے حال کی طرف توجہ کر دیتے ہیں۔ جب کوئی غیر مناسب بات اس سے ظاہر ہو جائے تو اس سے بہت دانس، ادب یا سختی، مشورہ یا اصلاح سے یا طبیعت و مزاج کے رنگ سے یا کنایہ و اشارہ سے یہ مناسب حال اشعار کی شعر خوانی سے یا بیان مثالی سے بیان دے کر یا کبھی گزشتہ عبرت ناک قصے سنا کر، غرض جس طرح سے ممکن ہو اسے مناسب بات سے آگاہ کر دیتے ہیں اور اس طرح سے جب اسے عمل مستحسن کرتے دیکھتے ہیں لیکن اس طریقے سے اسے ناواقف پاتے ہیں تو اس کو اس کی ادائیگی کے طریقوں سے خبردار کر دیتے ہیں یا اس طرح بتاتے ہیں کہ اس کے روبرو اس فعل کو احسن طور پر ادا کرتے ہیں تاکہ اسے دیکھ کر اس کے اصول سے آگاہ ہو

جائے۔غرض ان کے کلام کی اقسام فضیلت کا ایک جزو ہوتی ہیں۔پس ان سے دعوت تو اسی طریقے سے ظاہر ہوتی ہے لیکن درسگاہوں کے معلموں کی طرح نہیں ہوتی جو تدریس علم کے لیے ایک وقت مقرر کر دیتے ہیں اور اسی خاص وقت پر بیٹھ کر ابواب احکام کی تعلیم کے باب میں طہارت یا صلوٰۃ و زکوٰۃ کے مسائل کا دورہ کرتے ہیں۔اور اس قسم کے مسائل کو اسی مجلس میں خواہ فرضی ہو یا واقعی، مسلسل طور پر شمار کرتے ہیں۔یہ طریقہ دانش مندوں کا ہے، تربیت کنندوں کی روش نہیں ہے۔ان کی دعوت کا فائدہ ان کے فیض صحبت سے مربوط اور ان کے کلام کا کامل نفع ان کی بہت سی خدمت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔کتاب کے نکات اور تکلفات کے بیان سے متنفر ہوتے ہیں۔امی ہونے کی شان ان پر غالب ہوتی ہے اور تعمق و تکلف سے دور، سادگی پسند اور بے تکلف ہوتے ہیں۔"

دعوت کے دو طریقے

جاننا چاہیے کہ دعوت کے دو طریقے ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں سے یہ دعوت انہی دو طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

اول: بیان حکمت۔دوم: کلام موعظت

بیان حکمت

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ رب العزت اپنی خاص رحمت سے ان کو قوت بیان اس طرح عنایت فرما دیتے ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کے مقاصد کو دلائل و براہین، تمثیلات و تشبیہات سے اس طرح روشن کرتے ہیں کہ ان کا مدعا سامعین کی نظر میں یہاں تک ظاہر ہو جاتا ہے کہ معقول معانی محسوس صورت میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور اس کی صورت ہو بہو سامعین کے صفحۂ خیال پر منقش ہو جاتی ہے۔حتیٰ کہ ہر سامع کو صدق دل سے ان کی گواہی ظاہر ہوتی ہے اور ہر سلیم الوجود کے دل کو ان کے صدق سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ہر صاحب عقل کی عقل انہیں پسند کرتی ہے اور ہر صاحب خیال کا خیال ان کی طرف پرواز کرتا ہے۔اگرچہ بہت سے سامعین اپنی ہٹ دھرمی سے انہیں منظور نہیں کرتے اور تعصب کے سبب سے اپنی زبان سے ان کا اقرار نہیں کرتے لیکن دل میں وہ بھی جانتے ہیں کہ حق انہی کی طرف ہے اور تکبر و تجبر خود اپنے آپ میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "انہوں نے اس کا انکار کیا جو ہم نے ان کو کہا مگر ان کے دلوں کو یقین تھا کہ ظلم اور تکبر سے انکار کیا۔"

کلام موعظت

کلام موعظت کا بیان یہ ہے کہ اکثر اوقات غافلوں کی بیداری، جاہلوں کی آگاہی اور پست طبقوں کی بلند ہمتی کے لیے شوق آمیز اور وجد انگیز کلام، محبت الٰہی کا بیان، وسعتِ رحمت اور شدت غضب کا ذکر یا ان معاملات راز و نیاز کا بیان جو اللہ عزوجل اور اس کے بندوں کے درمیان ہو، سلف و خلف کی زمانے کی گردش، سکھ اور دکھ کے معاملات کی تفصیلات اور برزخ و قیامت اور دوزخ و بہشت کے احوال یا ان کی مانند ایسے حالات سناتے ہیں جس سے سامعین کے دل میں امنگ اور جوش پیدا ہو اور دل کی قساوت دور ہو کر رقت قلبی حاصل ہو۔اگرچہ ایسے کلمات ہر زمانے میں واعظوں کی زبان سے صادر ہوتے ہیں، لیکن واعظوں کا مقصد اس حد تک ہوتا ہے کہ

رقت، جگر گداز نعرے، وجد و اضطراب اور پیچ و تاب کی حالت حاضرین مجلس سے ظاہر ہو اور انبیاء علیہم السلام کا مقصد یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندگان خدا کو احکام رب العزت میں مقام اطاعت اور فرمانبرداری کے وسیلے کا رسوخ پیدا ہو، تاکہ ان کے تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کا باعث ہو۔ اسے موعظت حسنہ کہتے ہیں۔

سیّد احمد کی جماعت

''خادی خان ایک حد تک رقیبانہ جذبات کے ماتحت سیّد صاحب سے برگشتہ تھا، یعنی اسے یہ منظور نہ تھا کہ سیّد صاحب ''خان زیدہ'' کو اس سے بہتر سمجھیں اور اسے یہ بھی منظور نہ تھا کہ سیّد صاحب ہند کو چھوڑ کر پنجتار کو مرکز بنائیں، اور اس طرح خادی خان کی بجائے فتح خان کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جائے۔'' (سوانح سیّد احمد شہید، از مہر)

بلاشبہ یہ باتیں بہت ہی معمولی اور دنیاداروں کی باتیں ہیں اور سیّد صاحب دنیادار نہیں، دین دار تھے۔ لیکن ان معمولی باتوں کے دوررس نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سیّد صاحب کسی کو اپنے کردار کی وجہ سے جتنا محبوب سمجھتے، انہیں حق حاصل تھا لیکن اس کی محبوبیت کو وجہ نزاع بننے کی مہلت نہ دینی چاہیے تھی یا اگر ایک مضبوط طاقت اپنے مخالف یا حریف کے پاس ان کے قیام کو برداشت نہ کر سکتی تھی، تو یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا کہ اسے بہ طریق احسن طے نہ کر لیا جاتا، جس کو دونوں فریق پسند کرتے اور دونوں شریک تحریک رہ سکتے۔ اس معمولی سے مسئلے پر بروقت غور نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جو خادی خان تحریک کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا، وہ مخالفت پر اتر آیا اور لڑتے لڑتے مارا گیا۔

تمام احترام کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کہ جب بھی نظام ملکی ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں لگا کہ جو احکام شریعت اسلامیہ کو کتابوں کے اوراق ہی پر دیکھنے کے عادی تھے اور سیاست وقت یا بہ الفاظ دیگر سوچ بچار یا طریقہ نفاذ احکام پر کبھی غور نہ کر سکے، ان کے ہاتھوں نظام ملک کبھی سنور نہ سکا، الٹا خراب ہوتا گیا۔ کسی سے یہ کہہ دینا کہ ''تشریف لے جائیے'' یا ''میری آنکھوں سے دور ہو جائیے'' کے مطالب میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن دونوں کے نفاذ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہر حکم کے نفاذ کے لیے تدبر و تدبیر کی ضرورت پیش آتی ہے اور سیّد صاحب کے رفقاء میں اس کی کمی تھی۔ مثال کے طور پر جب ایک قائد تحریک نے حکم دے دیا کہ اہل رسوم کی نماز جنازہ بھی جائز نہیں اور کسی صاحب علم یا جاہل نے اختلاف کیا اور غلط یا درست جواباً کسی کتاب کا حوالہ بھی دے دیا تو اس کا علاج یہ نہ ہونا چاہیے تھا کہ اسے اس وقت تک گھونسے مارے جاتے کہ جس وقت تک وہ دوبارہ کلمہ پڑھ کر اپنے تائب ہونے کا اعلان نہ کر دیتا۔ اثر و رسوخ حاصل ہونے کے بعد پھر جب قاضی یا محاسب وغیرہ مقرر کئے گئے تو وہ بھی وہی لوگ تھے جنہیں عملاً اپنے فرائض کی ادائیگی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ان کا اخلاص، ان کی نیت، ان کی دین داری سب مسلم، لیکن عدم تجربہ کاری نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ جو لوگ سکھوں اور بارک زئیوں کے مظالم سے تنگ آ کر اس تحریک میں شامل ہو چکے تھے، وہ خود ہی اپنے حکام کے مظالم سے تنگ آ کر مخالفت پر اتر آئے۔ بری رسومات کو رد کرنا لازمی اور ضروری تھا لیکن اس کے لیے ایسے ذرائع کی تلاش بھی ایسی ہی ضروری تھی کہ جس سے اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ اس کی

ترغیب دوسرے طریقوں سے بھی دی جاسکتی تھی، نہ کہ بہ یک جنبش اب حکم دے دیا کہ اسقاط جائز نہیں یا اتنے دن کے اندر تم اپنی لڑکی کے نکاح یا رخصتی کا بندوبست کردو۔

خادی خان جنگ میں مارا گیا تو اس کے مال و اسباب اور اہل و عیال پر قبضہ ہوا۔ خادی خان کتنا ہی بڑا مجرم یا گردن زدنی کیوں نہ قرار دیا جائے، اس کے بچوں اور مستورات کو قید و بند میں رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اور پھر اگر اس مسئلے پر قدرے عمیق نگاہ سے غور کرلیا جاتا تو یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی کہ خادی خان کی اہلیہ کے قریبی رشتہ دار سیّد صاحب کے لشکر میں شامل اور تحریک کے لیے باعث تقویت تھے۔ لیکن علماء کی ضد آڑے آرہی تھی، مستورات اور بچوں کو قید رکھنے میں فخر محسوس کیا جارہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طاقت ور شریک کار مقرب خان زیدہ اس معاملے کو برداشت نہ کرسکا۔ اس نے پھر بھی تحمل سے کام لیا، مقابلے پر نہ اترا اور روپوش ہوگیا۔ تو قطع نظر ان خدمات کے، جو وہ ادا کرچکا تھا یا کرسکتا تھا، اور اس امر سے چشم پوشی کرتے ہوئے کہ وہ اپنی بہن کو قید و بند میں دیکھنا برداشت نہ کرسکتا تھا، اور جنگ یا مخالفت کی بجائے اس نے منظر عام سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا، ان علمائے کرام نے اسے مفرور قرار دے دیا۔ اگر قدرے تدبر سے کام لیا جاتا، قیدیوں کو رہائی دی جاتی، زوجۂ خادی خان کو اس کے بھائی کے حوالے کردیا جاتا تو ظاہر ہے کہ نہ تو مقرب خان زیدہ کو روپوش ہونے کی ضرورت پیش آتی، نہ اس کا بھائی سلطان محمود خان باہر امداد کے لیے پہنچتا اور بہت ممکن تھا کہ اس کے بعد کے واقعات اس شکل میں وقوع پذیر نہ ہوتے جن کا ذکر کیا جاچکا ہے۔

ان سب حالات سے بارک زئیوں نے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے لوہے کو لوہے سے کاٹا۔ جب دیکھا کہ مجاہدین کی ہر حرکت کی پشت پر شریعت اسلامیہ اور علمائے کرام کھڑے نظر آتے ہیں تو انہوں نے بھی اسی حربے کو استعمال کیا۔ ہندوستانی علماء سے فتویٰ منگا کر جماعت مجاہدین کو شریعت اسلامیہ کا مخالف، نفس پرست، انگریز کا جاسوس وغیرہ ظاہر کرنے لگے۔ وہ لوگ جو پہلے ہی مجاہدین کے نظام جدید سے تنگ آچکے تھے، ان فتوؤں کی آڑ لے کر مخالفت پر اتر آئے اور ہوسکتا ہے کہ کئی ایسے بھی ہوں گے جو ان فتوؤں پر ایمان لے آئے ہوں۔ حالات کچھ ہی ہوں، اس سے انکار مشکل ہے کہ علماء کے نام ہی سے مخالفت کو تقویت ملی جس کے نتیجے میں مجاہدین کا قتل عام ہوا، سیّد صاحب کو ناکامی ہوئی اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جاری شدہ مسلمانوں کی ایک بہترین تحریک موت کے گھاٹ اتار دی گئی جو تدبر اور دوررس نگاہوں کے میسر آجانے پر کامیاب و کامران ہوسکتی تھی۔

اللہ بخش یوسفی صاحب نے ناکامی کی جو وجوہات بیان کی ہیں، وہ بنیادی طور پر درست اور صحیح ہیں۔ یہی وجوہات ہیں جنہوں نے سیّد احمد شہید کی تحریک ہی کو نہیں بلکہ اس کے بعد کے آنے والے علماء کی تحریکوں کو بھی تمام قربانیوں کے باوجود ناکام بنایا۔

ان ناکامیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حالات اور فضا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان علماء نے اپنے آپ کو تبدیل کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں اور طبقوں کا تعاون حاصل کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے اس برصغیر کے بسنے والے مختلف طبقات کے لوگوں کو سمجھنے سے انکار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اور ان کے تقدس کے باوجود زمانہ ان کے اوپر سے گزر گیا۔

سیّد احمد شہید کی اصلاحی کوششوں کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے، کہ یہ کوشش صرف آپ کی ذات تک محدود نہ تھیں، بلکہ آپ کو نظم و انتظام کا بھی بڑا ملکہ تھا اور آپ ایسا نظام قائم کر گئے، جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل آپ کی شہادت کے بعد بھی ہوتی رہی۔ آپ کی ذات ایک سرچشمہ، فیض تھی، جس سے ہزاروں ندیاں جاری ہوئیں اور جن سے ملک کی کشتِ ایمان اب بھی سیراب ہو رہی ہے۔ مؤرخین نے آپ کے خلفاء اور ارادتمین جماعت کی بڑی طویل فہرست دی ہے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے بطور تبرک فقط چند طلبہ کے نام درج کیے ہیں، جن کی تعداد چھیاسٹھ ہے۔ ان ناموں میں سے اہم ترین یہ ہیں:

1۔ مولوی عبدالحی صاحب داماد شاہ عبدالعزیز صاحب۔

2۔ مولوی محمد اسماعیل شہید۔ صاحب ''تقویت الایمان''

3۔ مولوی عبدالغنی صاحب برادر خورد شاہ عبدالعزیز۔

4۔ مولوی محمد علی صاحب، رام پوری۔ پہلے حیدر آباد اور پھر مدراس بھیجے گئے، جہاں انہیں بڑی کامیابی ہوئی۔

5۔ مولوی ولایت علی صاحب عظیم آبادی۔

6۔ مفتی الٰہی بخش صاحب مترجم ''مثنوی مولانا روم''

7۔ مولوی عبداللہ غزنوی،۔ جنہوں نے امرتسر اور پنجاب کے دوسرے حصوں میں ارشاد و ہدایت کا کام کیا اور جن کے بعد ان کے خاندان نے اس کام کو جاری رکھا۔

8۔ شاہ نور محمد جھنجھانوی، جن کے مرید اور خلیفۂ خاص مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند کے استاد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تھے۔

9۔ مولوی سیّد اولاد حسین قنوجی، جن کے فرزند ارجمند نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے اسلامی مسائل پر سو سے زیادہ کتابیں لکھیں اور انیسویں صدی کے آخیر میں علوم اسلامی کی بڑی اشاعت کی۔

10۔ مولوی کرامت علی جون پوری، جنہوں نے بنگال میں اشاعتِ اسلام اور اصلاح رسوم کے سلسلے میں عظیم الشان کام سرانجام دیا۔

11۔ مولوی نصیر الدین دہلوی، جنہوں نے دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں بیٹھ کر واقعہ بالاکوٹ کے بعد کے حالات و واقعات پر غور کیا اور تحریک جہاد کو جاری رکھا۔ 1840ء میں بمقام ٹھانہ وفات پائی۔

ان سب بزرگوں کی اولادیں اور ان کے مریدوں کی اولادیں دنیا میں جہاں بھی ہیں، آج تک سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد اپنے اپنے انداز میں اسی جوش و جذبے سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور جو چراغ سیّد صاحب نے ولی اللٰہی تحریک کے چراغ سے روشن کیا تھا، وہ آج تک جگمگا رہا ہے۔

سن ستاون کا پس منظر

واسکوڈی گاما کا سمندری بیڑا 21 مئی 1498ء کو جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر لنگر انداز ہوا۔ برعظیم پاک و ہند میں یہ ابتدا تھی مغرب اور مغربیت کی یلغار کی۔ ان کے بعد انگریز اور فرانسیسی جہازران بحر ہند میں آن دھمکے۔ ان کی باہمی کشمکش ہوئی، جس میں انگریز غالب آئے اور وہ آہستہ آہستہ برعظیم پر قابض ہوتے گئے اور بالآخر 1857ء میں ان کا اس وسیع و عریض ملک پر قبضہ ہو گیا۔

پرتگیزی یورپ کی پہلی قوم تھی، جس کے جہازران افریقہ کا چکر لگا کر بحیرۂ عرب اور بحر ہند میں پہلے پہل پہنچے تھے۔ اس سے پہلے یورپ ان سمندری راستوں سے بالکل ناواقف تھا۔ یورپ والوں کو مشرق کی چیزیں بحیرۂ قلزم کے راستے مصر سے ہوتی ہوئی بحیرۂ روم کی بندرگاہوں کے ذریعے پہنچتی تھی، اور تجارت تمام کی تمام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ مصر کے ساحل سے لے کر انڈونیشیا اور چین کی بندرگاہوں تک مسلمان جہازرانوں کی ریل پیل رہتی تھی، اور ان اطراف میں کوئی بندرگاہ ایسی نہ تھی جہاں مسلمان تاجروں کی بڑی بڑی کوٹھیاں نہ ہوں۔ زیادہ تر سمندری بیڑے مسلمانوں ہی کے تھے۔ ملاح اور امیر البحر بھی مسلمان ہوتے اور تجارت کا تمام کاروبار بھی ان کا تھا۔ الغرض جب پندرھویں صدی کے آخر میں پرتگیزی جہازران مشرق میں پہنچے تو یہاں کے سمندروں پر مسلمانوں کا پورا قبضہ تھا اور مشرق کی تجارت بھی تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔

دراصل پرتگیزی ایک مذہبی جنون لے کر مشرق کی طرف بڑھے تھے۔ یہ مذہبی جنون تھا اسلام کو ختم کرنے کا۔ اسپین اور پرتگال سے مسلمانوں کو نکالنے اور لاکھوں کی تعداد میں ان کو بے دریغ قتل کرنے سے ان "صلیبی مجاہدوں" کے انتقام کی پیاس نہ بجھی تھی۔ وہ دل میں پوری دنیا سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کا عزم لے کر نکلے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو مشرق کی تجارت سے محروم کر کے انہیں بھوکا مارا جائے اور اس طرح اسلام کو دنیا سے ختم کر دیا جائے۔ پروفیسر محمد سرور مرحوم لکھتے ہیں: "یورپ کے سات صلیبی گروہ تھے جو 1097ء کے بعد دو سو سال تک اسلامی مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر ہوتے رہے، اور یہ اہل یورپ کا آٹھواں صلیبی حملہ تھا، جس کا آغاز پندرھویں صدی کے آخر میں ہوا اور جس کی تکمیل 1857ء میں کی گئی۔ یورپ کے حکمرانوں نے اس کے لیے پوری اجازت دی، اور پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ اس کی ابتدا کی گئی۔"

پرتگیزی حملہ آوروں نے بحرِ ہند میں آنے جانے والے جہازوں کو بے دریغ لوٹنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر بھی تاخت و تاراج کی۔ ان کی حملہ آوری اور جارحیت کا سب سے بڑا اور اصل نشانہ مسلمان ہوتے۔ چنانچہ جب ایک پرتگیزی امیر البحر البوقرق نے گوا کی بندرگاہ فتح کی تو اس نے پرتگال

کے بادشاہ کو فتح کی خوشخبری سناتے ہوئے لکھا: ''گوا میں جو بھی مسلمان نظر آیا، میں نے اسے تہ تیغ کیا اور جہاں تک بھی ہو سکا، میں نے کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا۔ وہ جب ہم سے بچ کر مسجدوں میں جمع ہو گئے تو ہم نے ان مسجدوں کو آگ لگا دی۔''

راجہ کالی کٹ کی مزاحمت

پرتگیزیوں کی ان دراز دستیوں کے خلاف آخر کالی کٹ کا راجہ حرکت میں آیا۔ اس کا امیر البحر قاسم نامی ایک مسلمان تھا۔ وہاں کا ایک بہت بڑا تاجر فواد غیر مسلم تھا۔ راجہ نے اس سے بہت سے جہاز لیے اور ایک متحدہ قوت کے ساتھ پرتگیزیوں کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ لیکن بدقسمتی سے کالی کٹ کا بیڑا سمندر میں دور تک جا کر پرتگالی بیڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے پرتگیزی جہاز سمندر میں بدستور دندناتے رہے۔ مجبوراً راجہ کو مصر کے مسلمان فرماں رواسے مدد مانگنی پڑی۔ مصر کا بحری بیڑا پرتگیزیوں کے مقابلے کے لیے بحرِ ہند میں آیا اور ایک دو مہمات میں اس نے پرتگیزی بیڑے کو شکست بھی دی، لیکن پرتگیزوں کو پیچھے سے برابر کمک پہنچ رہی تھی، اور ادھر گجرات کے مسلمان حاکم کا گورنر حملہ آوروں سے مل گیا، جس سے دل برداشتہ ہو کر مصری امیر البحر 1509ء میں واپس چلا گیا اور بحرِ ہند پرتگالی حملہ آوروں کے لیے بالکل صاف ہو گیا۔

اب پرتگیزیوں کے حوصلے اور بڑھے اور انہوں نے گوا کو مستقل طور پر اپنا بحری اڈہ بنا لیا اور یہاں سے انہوں نے انڈونیشیا اور سنگاپور کی طرف ترکتازیاں شروع کر دیں۔ پرتگیزی امیر البحر البوقرق خود ایک بیڑے کے ساتھ 1511ء میں ملاکا میں لنگر انداز ہوا اور جاتے ہی بندرگاہ میں جو بھی عرب اور گجراتی مسلمان تاجروں کے جہاز تھے، انہیں جلا دیا، لیکن چینیوں اور دوسرے غیر مسلموں کے جہازوں کو اس نے نہیں چھوا۔ اس کے بعد جب اس نے ملاکا کے سلطان پر حملہ کیا تو اپنے ساتھیوں کو یوں جوش و خروش دلایا۔ اس نے انہیں کہا: ''ہم اس ملک سے مسلمانوں کو نکال کر اور محمد ﷺ کے فرقے کی آگ کو اس طرح بجھا کر کہ پھر دوبارہ وہاں نہ کبھی نہ بھڑک سکے، اپنے خداوند یسوع مسیح کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے ملاکا کی گرم مسالوں کی تجارت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لیا تو مکہ اور قاہرہ دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔''

ملاکا کے سلطان نے شروع میں تو حملہ آوروں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن بعد میں اسے پسپا ہونا پڑا۔ پرتگیزیوں نے جزیرے پر قبضہ کر کے وہاں کے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا اور جو بچے انہیں غلام بنا کر فروخت کر دیا، لیکن وہاں جو چینی، ہندو اور بری تھے، انہیں کچھ نہیں کہا۔ ملاکا کے شہروں اور قصبوں کو خوب لوٹا اور جو کچھ ہاتھ آیا، اپنے ساتھ لے گئے۔

ترکی کے سلطان اعظم کی مزاحمت

اسی زمانے میں ترکی کے سلطان اعظم نے پرتگیزی حملہ آوروں کے خلاف بحرِ ہند میں اپنا بیڑا بھیجا، لیکن وہ بھی زیادہ کامیاب نہ رہا، اور اسے بے نیل و مرام واپس جانا پڑا۔ بات یہ تھی کہ پرتگیزیوں کو سمندر کے راستے برابر مدد آتی رہتی تھی اور ترکی بیڑے کے لیے بحیرۂ روم سے کمک پہنچنا ناممکن تھا، اس لیے ترکی حکمران اپنی تمام شوکت و

جلالت کے باوجود پرتگیزیوں کو بحر ہند سے نکال سکے اور وہ مزید ساٹھ سال تک اس سمندر کے مالک بنے رہے۔ ترکی بیڑا 1538ء میں بحرِ ہند سے ناکام لوٹا۔ اس کے بعد اقوام مغرب کے بیڑوں کے لیے بحر ہند، بحیرۂ قلزم، خلیج فارس اوران سے آگے آبنائے سنگاپور اور بحرالکاہل کھلے پڑے تھے اوران سمندروں میں ان کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔

دنیائے اسلام پر مغرب کی یہ یلغار ایک مذہبی جنون کے تحت عمل میں آئی تھی اوراس کے پیش نظر بنیادی طور پر اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی تھی۔ گواس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ سے مشرق کے گرم مصالحہ جات اور دیگر اشیاء کی تجارت کو بھی چھیننا تھا۔ گویا اس یلغار کا محرک مذہب وتجارت دونوں کا ملا جلا جذبہ تھا اور جیسا کہ پرتگیزی امیرالبحر البوقرق نے ملاکا پر حملہ کرتے وقت کہا تھا کہ "اگر ہم نے مسلمانوں سے گرم مسالوں کی تجارت چھین لی تو مکہ وقاہرہ تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔ ان کے اصل عزائم میں مذہب اور تجارت دونوں شامل تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں پر زد پڑتی تھی تو لامحالہ اس کا اثر ان پر اوران کے مذہب پر بھی پڑتا تھا۔ چنانچہ ویسے ہی ہوا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے مشرق ومغرب کی اس تجارت کا جانا تھا کہ ان کا زوال شروع ہو گیا۔ صرف معاشی وسیاسی زوال ہی نہیں، بلکہ سماجی فکری اور علمی زوال بھی، اوران کے مقابلے میں مغرب نے ابھرنا شروع کر دیا۔

انگریزوں کی آمد

پرتگیزیوں کے بعد جب ولندیزی مشرقی سمندروں میں پہنچے توان میں مذہبی جنون قدرے کم اور تجارت کا جذبہ قدرے زیادہ تھا۔ فرانسیسی اور انگریز بھی زیادہ تر تجارت ہی کے شوق میں بحر ہند کی طرف بڑھے تھے، لیکن اسلام سے نفرت اور عیسائیت کی ترویج کا جذبہ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ انگریزوں کو پہلے پہل مسالوں کی تجارت نے اپنی طرف کھینچا تھا، لیکن بعد میں وہ برعظیم پاک وہند سے کپڑا اور دوسری اشیاء بہت بڑی مقدار میں یورپ برآمد کرنے لگے، چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے 1612ء میں سورت میں اپنی پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ 1615ء میں شاہ انگلستان جمیز کا ایک سفیر سرتھامس کرو بادشاہ جہانگیر کے دربار میں پہنچا۔ 1665ء میں انہیں بمبئی مل گیا، اور 1690ء میں دریائے ہگلی کے کنارے پر مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں انگریزوں نے اپنا تجارتی مرکز قائم کیا جو آگے چل کر کلکتہ کے نام سے مشہور ہوا۔

شروع شروع میں انگریزوں کی تمام سرگرمیاں تجارت تک محدود رہیں اور تجارت سے انہوں نے خوب دولت کمائی۔ اس زمانے میں برعظیم کی ٹکسٹائل انڈسٹری پوری دنیا میں پہلے نمبر پر تھی۔ یہاں کے بنے ہوئے کپڑے کی یورپ اور بالخصوص برطانیہ میں بہت مانگ تھی، اور یہ تجارت زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تک ہندوستان کی سیاست میں انگریزوں کا بالکل کوئی عمل دخل نہ تھا، اور وہ اس معاملے میں بے حد محتاط بھی تھے، کیونکہ ایک مرتبہ بنگال میں ایک انگریز افسر تجارت نے مغل حکومت کے خلاف بدتمیزی کی تھی، جس کی سزا انگریزوں کو بہت سخت ملی اور انہیں بڑی مشکلوں سے بہت منت سماجت کے بعد معافی دی گئی۔ چنانچہ جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ انہیں آئندہ ٹھیک طرح رہنے کا یقین بھی دلانا پڑتا تھا۔ یہ واقعہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ کا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد

عالمگیر کا انتقال 1707ء میں ہوا۔ اس کے انتقال کے ساتھ برعظیم میں انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف صوبیدار مرکز سے آزاد ہونے لگے اور دوسری طرف خود صوبیداروں میں آپس میں تخت نشینی کے لیے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں مرہٹے، راجپوت اور جاٹ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ملک میں افراتفری مچا دی۔ اس خلفشار میں اگر کچھ کمی رہ گئی تھی تو وہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی، جنہوں نے دہلی کی مرکزی حکومت کا رہا سہا وقار اور رعب ختم کر دیا۔

انگریز طالع آزماؤں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہ ملک کی سیاست میں دخل دینے لگے۔ سیاست میں انہیں تجارت سے کہیں زیادہ نفع نظر آیا اور رفتہ رفتہ انہیں اس کی چاٹ پڑ گئی۔ حصہ وصول کرتے اور روپے کے ساتھ ساتھ زمین کا ایک علاقہ بھی اس سے ہتھیا لیتے، حالانکہ کچھ عرصہ ہی پہلے 1700ء کا ایک واقعہ ہے کہ جب ایک مغل گورنر انگریزوں کے تجارتی مرکز مدراس پہنچا تو وہاں کے انگریز کمانڈر نے اسے بڑے تحفے تحائف دے کر ٹالا۔ اس کے بعد سال کے سال مغل نواب کا مدراس جانا ایک معمول ہو گیا۔ اسی طرح بنگال میں جو انگریز تھے، وہ وہاں کے مغل گورنر کو نہایت عاجزانہ اور مودبانہ زبان میں خط لکھا کرتے تھے، اور ہمیشہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ لیکن جیسے ہی ملک میں طوائف الملوکی پھیلی، انگریزوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ ملک گیری کی مہم بھی شروع کر دی۔ اس کا سب سے پہلا موقع انہیں مدراس میں ملا۔ ارکاٹ کے نواب کی وفات پر اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کے مسئلے پر جھگڑا ہوا۔ انگریزوں نے ایک بیٹے کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد بالکل یہی صورت حال حیدر آباد میں پیدا ہوئی اور انہوں نے ایک بیٹے کی سرپرستی کی۔ بعد ازاں یہی کھیل بنگال میں کھیلا گیا، جس کے نتیجے کے طور پر پلاسی کی جنگ ہوئی اور یوں انگریزوں کے قدم بنگال میں جم گئے۔

پلاسی کی جنگ (1757ء) کے بعد نام کو تو میر جعفر بنگال کا نواب رہا، لیکن اصل اختیارات ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے ہاتھ میں آ گئے، اور کمپنی نے یہ اختیارات بہت بری طرح استعمال کیے۔ کمپنی حکمرانی اور سیاست کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتی تھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے تجارت کے پردے میں باقاعدہ لوٹ مار شروع کر دی۔ انگریز سوداگر جس مال پر ہاتھ رکھ دیتے، اس کو دوسرا خریدار آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا، اور یہ لوگ اس مال کو من مانی قیمت پر خرید لیتے، اور اپنا مال نکالنا ہوتا تو جب تک اس کی نکاسی نہ ہو جاتی، دوسرے سوداگر دکان بند رکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

غرضیکہ 1757ء کے بعد انگریزوں نے مسلم بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا، نجی تجارت کے ذریعے بھی اور مال گزاری اور دیوانی کے نئے بندوبست کے ذریعے بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک نواب کی جگہ دوسرے نواب کو گدی پر فائز کر کے بھی۔ چنانچہ میکالے کے بقول: ''دولت کے دریا یہیں سے انگلستان کی طرف بہہ چلے جاتے تھے۔''

اس کے علاوہ انگریزوں نے زمینوں کی نیلامی بھی شروع کر دی۔ چنانچہ جو بھی بڑھ کر بولی بولتا، زمین اس کے حوالے کر دی جاتی، اور وہ مزارعوں سے جتنی چاہتا، مال گزاری وصول کرتا۔ مال گزاری کی وصولی میں طرح طرح

کی سختیاں کی جاتیں اور جانوروں کے ریوڑوں کی طرح باڑوں میں قید میں رکھ کر آخری کوڑی تک ان سے نکلوائی جاتی۔ اور اگر اس طرح مطالبہ پورا نہ ہوتا تو ان کے ڈھور ڈنگر اور گھر کا سامان نیلام کر دیا جاتا۔ گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی جاتی۔ جب کسان ان مظالم سے تنگ آ کر بھاگتے تو فوجوں کا گھیرا ڈال کر انہیں واپس کیا جاتا۔

تجارت اور زمینداری کے علاوہ ملک کی صنعت وحرفت بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی دست برد سے نہ بچی۔ برطانوی ٹکسٹائل انڈسٹری کو ہندوستان سے درآمدہ کپڑے کے مقابلے میں بچانے کے لیے ایسی تدابیر اختیار کی گئیں کہ ہندوستان کی یہ صنعت تباہ ہو جائے۔ بنگال میں ریشمی کپڑا تیار کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ دکن کی چھینٹ اور سوتی کپڑے کی صنعت زبردستی روک دی گئی۔ جولاہوں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ کمپنی کی اجازت کے بغیر کوئی کپڑا نہ بنیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ملک جو ایک زمانے میں یورپ اور برطانیہ کو کپڑا برآمد کیا کرتا تھا، اب وہ وہاں کا کپڑا اپنے ہاں درآمد کرنے پر مجبور ہو گیا۔

سن ستاون میں عام اقتصادی حالت

مغل سلطنت روز بروز کمزور ہو رہی تھی، صوبوں کے نواب آپس میں لڑ لڑ کر کمپنی بہادر (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے لیے راستہ صاف کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ 1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے بنگال میں ہر طرف سے تباہی مچی ہوئی تھی۔ جنوبی ہند میں بھی انگریز آہستہ آہستہ مسلط ہوتے جا رہے تھے۔ غرضیکہ برعظیم پاک و ہند کا پرانا نظام بتدریج ٹوٹ رہا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا تجارتی ''سرمایہ دارانہ'' نظام لے رہا تھا۔ بے شک اس نظام کا کرتا دھرتا انگریز تھا، لیکن اسے ایک نئے ملکی طبقے سے بڑی تقویت مل رہی تھی اور یہ طبقہ تھا، نو دولتیے ہندو بنیوں اور مارواڑیوں کا۔

نو دولتیے ہندو بنیے اور مارواڑی:

مشہور ہندوستانی ڈپلومیٹ اور مصنف۔ پانیکار اپنی کتاب میں اس نئے طبقے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''یورپی اقوام کے تجارتی مرکزوں کے قیام کی وجہ سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر ایک طاقتور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ وجود میں آیا، جس کے اجنبی تاجروں کے ساتھ گہرے روابط تھے اور وہ ان کے ساتھ تجارتی لین دین سے خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ مثال کے طور پر شروع ہی میں سورت میں اس طبقے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ 1662ء میں اس طبقے کے بعض افراد نے وہاں کے مغل گورنر سے کمپنی کے حق میں سفارش کی تھی۔ اسی طرح مدراس میں موپلے اور مولیار خاندان کے ہندو تاجر بڑے بااثر ہو گئے تھے۔''

مارواڑیوں کے بارے میں پانیکار لکھتا ہے: ''اٹھارویں صدی کے دوران میں جب یوپی اور بہار کا سامانِ تجارت بنگال کے ذریعے باہر جانے لگا تو شمالی ہند کے تجارت پیشہ لوگ مرشد آباد اور کلکتہ کا رخ کرنے لگے اور بنگال میں مارواڑی لکھ پتیوں کا زور بہت بڑھ گیا۔ بے شک نواب اور سپہ سالار کبھی کبھی ان سے جو بن پڑتا تھا، نچوڑ لیا کرتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں صوبوں کی معاشی زندگی کا اقتدار زوال پذیر مغل نوابوں کے ہاتھ

سے نکل کر ان ہندو تاجروں کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا اور گو نواب اپنے درباروں میں ان کو اکثر ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتے تھے لیکن خزانے کی کنجیاں انہی کے پاس ہوتی تھیں۔"

بنیوں اور نئے سرمایہ داروں کا یہ طبقہ ہندو تھا۔ انگریز حاکموں اور تاجروں سے اس طبقے کی خوب چھنتی تھی اور مسلمانوں کی حکومتوں سے اس طبقے کو موروثی نفرت تھی۔ اس نئے طبقے کی آمد سے ہندوستان کی ہیئت اجتماعی میں ایک بہت بڑا تغیر آیا۔ پرانا نظام دم توڑنے لگا اور انگریز اور بنیئے کا مخلوط نظام برسر کار آنے لگا۔ پانیکار کے الفاظ میں "اب تک ہندوستان کی معیشت زرعی تھی اور قومی صنعت تمام تر مقامی ضرورتوں کے لیے ہوتی تھی۔ اس معیشت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زمینداروں اور فوجیوں کا، جنہیں جاگیریں دی جاتی تھیں، زور ہوتا، لیکن دو صدیوں تک یورپی تاجروں کے ذریعے جو بیرونی تجارت ہوتی رہی، تو اس سے ایک طبقہ بطور ایک درمیانی کڑی کے وجود میں آ گیا۔ بنگال میں اس طبقے کو غیر معمولی قوت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے لیڈر جگت سیٹھ کی ایک دفعہ نواب سراج الدولہ نے برسر عام توہین کی تھی، جس کا انتقام اس نے نواب سے بری طرح لیا۔"

پلاسی کی جنگ (1757ء) دراصل انگریزوں نے نہیں جگت سیٹھ نے جیتی تھی۔ اس نے نواب سراج الدولہ کے مخالفوں کا کمپنی سے معاملہ کرایا، اور اسکے سپہ سالاروں کو توڑا۔ انگریز کمپنی اور ہندو بنیئے کی پہلی ملی بھگت تھی، جس نے نئے نظام کو تقویت بخشی۔ چنانچہ مسلمان نواب اور جاگیردار ایک ایک کر کے ختم ہوئے اور اقتدار انگریز کے ظل ہمایونی کے تحت ہندوؤں کے زردار طبقوں کی طرف آہستہ آہستہ ہوتا گیا۔"

صنعت وحرفت کی بربادی:

ہندوستان کی صنعت وحرفت اور دولت کے افسانے دنیا بھر میں مشہور تھے اور بیرونی ممالک کے لالچی تاجروں اور سیاحوں کو یہ دلفریب داستانیں یہاں کھینچ کر لاتی تھیں، مگر "سفید درندوں" نے کالے مارواڑیوں اور بنیوں کی مدد سے اس سونے کی چڑیا کو نہ صرف بے جان کیا، بلکہ ہڈیاں اور گوشت بھی نوچ لیا۔ چنانچہ یا تو یہ حال تھا کہ بقول مصنف تیمڈن "انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا، اس لیے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے آدھی قیمت پر انگلستان پہنچ جاتا ہے اور دونوں سے بہتر بھی ہوتا ہے۔" اور یہ عالم ہو گیا کہ "اعداد وشمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1793ء میں 32 لاکھ 45 ہزار 745 پونڈ کا کپڑا ہندوستان سے انگلستان پہنچا اور یہ مقدار گھٹتے گھٹتے 1849ء میں بالآخر صرف 36 ہزار 151 پونڈ رہ گئی۔" (بحوالہ محمد شفیع "1857ء")

صنعت وحرفت کی تباہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں کاریگر، صناع اور دستکاری دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ عوام کی غربت، بے روزگاری اور پریشان حالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور یہ حالت ہو گئی کہ بقول سرسید "کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو نہیں پوچھتا۔"

بہار اور بنگال کی دیوانی ملنے کے بعد کمپنی نے تمام تجارت پر قبضہ کر لیا اور اپنے فرانسیسی اور دیگر یورپی حریفوں کو نکال باہر کیا۔ اب تجارت اور کاروبار پر انگریزوں کا مکمل تسلط تھا۔ چنانچہ 1765ء میں گورنر جنرل کے فیصلے کے

مطابق اعلان ہوا کہ ''فیصلہ کیا گیا ہے کہ انگریز تاجروں کی ایک سوسائٹی کو تمام تر حقوق نمک، چھالیہ اور تمباکو کی تجارت کے دے دیئے جائیں اور کوئی دوسرا شخص جو آنریبل کمپنی کے تابع (یعنی رعایا) ہو، مجاز نہیں کہ اس تجارت میں حصہ لے سکے۔''

عام لوگوں کو حکماً مجبور کیا گیا کہ وہ اناج وغیرہ اسی قیمت پر خرید و فروخت کریں، جس پر ان کے انگریز حکمران ان کو مجبور کریں۔ اگر وہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تو کوڑوں کی سزا، قید، جرمانے اور دیگر مظالم سہنے پڑتے تھے۔ تاجروں نے عاجز ہو کر لندن میں فریاد بھیجی، مگر بیکار تھا۔ 1857ء تک تجارت بالکل تباہ ہوئی اور اس تجارتی حریف کا گلا گھونٹ دیا جس سے انگریز کسی طرح بھی مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔''

زراعت کی تباہی

کاشتکار اور کسان بے کار اور بے روزگار ہوتے چلے گئے۔ پہلے بادشاہ اور اس کے حکام کاشتکاروں کے ساتھ رعایت کرتے تھے اور فراخ دلی سے پیش آتے تھے، مگر انگریز راج شروع ہوتے ہی کسانوں کی حالت خراب ہونے لگی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ گورنر جنرل کارنوالس کے ''بندوبست دوامی'' نے حالات اور بھی بدتر کر دیئے۔ باری علیگ اپنی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' میں لکھتے ہیں ''کارنوالس نے انگلستان کی وزارت کی مدد سے ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضات میں اضافہ کیا۔ اہل ہند کو آرہ کشوں اور آب برداروں (سقوں) میں تبدیل کر دیا۔ آئینی اصلاحات کی شکل میں فتنہ و فساد کا بیج بویا اور بندوبست دوامی رائج کر کے کسانوں کو بالکل تباہ کر دیا۔

مغل بادشاہت کے زمانے میں سالانہ زرعی پیداوار کا صرف ایک حصہ بطور لگان وصول کیا جاتا تھا۔ زمین پر کاشتکاروں اور کسانوں کا حق تھا اور شاہی و سرکاری ملکیت تصور نہ ہوتی تھی، مگر کمپنی کے عہد میں زمین کو حکومت کی ملکیت مانا گیا اور سالانہ لگان جو پہلے فصل پر موقوف تھا، اب مقررہ مقدار میں زمین کے رقبے سے ٹیکس کی صورت میں لگایا گیا، جس میں فصل کی بہتری یا خرابی کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا اور نہ اس سے کوئی سروکار تھا کہ زمین کا کتنا حصہ کاشت کیا گیا ہے۔ اکثر حالتوں میں یہ ٹیکس انفرادی تھا جو یا تو براہِ راست کاشتکار سے وصول کیا جاتا تھا اور یا زمینداروں پر حکومت کی جانب سے واجب تھا۔ زمین پر اس براہ راست ٹیکس نے دیہات کی مالی حالت تباہ کر کے رکھ دی۔

'بندوبست دوامی'' کی رو سے ہزار ہا جائیدادیں لگان ادا نہ ہونے پر قرق اور فروخت کر دی گئیں اور جس نے زیادہ بولی لگائی، اس کے حوالے ہو گئیں۔ چنانچہ زمین کے پرانے مالک جو گاؤں ہی کے باشندے ہوتے اور کاشتکار زیادہ تر انہی کی ذات برادری بلکہ اکثر ان کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ وہ اپنی زمین سے محبت کرتے تھے، مگر نئے مالکان کے جذبات کاروباری تھے۔ وہ زمین کی پروا نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف اپنی رقم پر منافع حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

سو سال تک اس مسلسل لوٹ کھسوٹ نے نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ 1857ء میں اودھ کا جوڈیشنل کمشنر ایم آر گبنس بغاوت کے زمانے میں لکھتا ہے ''میں نے کہیں بھی اس قدر غریبی اور مفلسی نہیں دیکھی جتنی کہ اودھ میں نظر آتی ہے۔''

جاگیرداری اور تعلقہ داری کا خاتمہ تو ہوا ہی تھا۔ مگر جاگیریں اور اراضی اس بے ڈھنگے پن سے ضبط و نیلام کی گئیں کہ تمام ملک کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا۔ سرسید لکھتے ہیں: ''اراضیات کی بے ضبطی نے جس قدر رعایائے ہندوستان کو ناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا، اس سے زیادہ کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ سچ فرمایا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ڈلنگٹن نے کہ ضبط کرنا معافیات کا، ہندوستان سے دشمنی پیدا کرنی اور ان کو محتاج کر دینا ہے۔''

مشہور انگریز مؤرخ اور ماہر معاشیات جان کے (John Kaye) لکھتا ہے: ''زمینوں کا نیلام کیا گیا اور ایسی بے ترتیبی سے ہوا کہ تمام الٹ پلٹ ہو گیا۔ پھر قانون 1821ء جاری ہوا جس سے اور صدہا قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ غلط طرز حکومت کے خراب نتائج کبھی اس قدر ہولناک ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ کبھی کسی غارت گر اور مجہول حکومت کی خرابیوں نے اس قدر پریشان حالی پیدا نہیں کی تھی۔''

ایسٹ انڈیا کمپنی 1594ء-1857ء

یہ انگلستان کی مشہور تجارتی کمپنی تھی، جس نے رفتہ رفتہ برعظیم پاک و ہند کے مختلف علاقوں پر ناجائز قبضہ کر کے برعظیم وایک برطانوی نو آبادی بنانے کی راہ ہموار کی۔ یہ کمپنی لندن کے چند تاجروں نے مل کر 22 ستمبر 1599ء کو قائم کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔ اس وقت ہندوستان میں اکبر بادشاہ (متوفی 1605ء) کی حکومت تھی۔ 31 دسمبر 1599ء کو ملکہ الزبتھ اول کی جانب سے سرکاری اجازت نامہ مل گیا۔ ابتداء میں کمپنی کی توجہ زیادہ تر ملایا کی طرف تھی، مگر 1608ء میں کیپٹن ہاکنز نے جہانگیر بادشاہ سے سورت میں تجارتی کوٹھی (دفتر) قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور یوں برعظیم میں انگریزوں کے قدم جمنے شروع ہوئے۔

ابتدا میں انگریز تاجروں کو اپنے حریف پرتگالی تاجروں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جب 1612ء میں انگریزوں نے سورت کے مقام پر پرتگالیوں کو شکست دے دی تو مغل بادشاہ کو انگریزوں کی قوت کا احساس ہوا اور اس نے مغل دربار میں ایک برطانوی سفیر مقرر کرنے کی اجازت دے دی۔ پہلا انگریز سفیر سر ٹامس رو تھا جو شاہ انگلستان کی طرف سے 1615ء میں جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے بڑی حکمت اور دانش مندی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے تجارتی مراعات حاصل کیں اور سورت کے علاوہ مسولی پٹم، مدراس، بالا سور اور کئی دیگر مقامات پر تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس اثناء میں ولندیزی نے انگریزوں کو جزائر مشرق الہند (ملایا، انڈونیشیا وغیرہ) سے نکال باہر کیا اور یوں ہندوستان انگریزوں کی توجہ خاص اور بڑا مرکز بن گیا۔

1644ء میں مغل شہزادی جہاں آراء بیگم کا کامیاب علاج کرانے پر انگریز ڈاکٹر باٹن نے انعام کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں بلا محصول تجارت اور تجارتی دفاتر قائم کرنے کی اجازت طلب کی۔ یہ اجازت فوراً مل گئی اور یوں بنگال میں انگریزوں کی متعدد تجارتی کوٹھیاں قائم ہو گئیں۔ 1662ء میں پرتگال کے بادشاہ نے شہر بمبئی جو ان کے قبضے میں تھا، شاہ انگلستان جارج کو اس کی شادی کے موقع پر ملکہ کیتھرائن کے جہیز میں پیش کیا اور یوں شہر بھی انگریزوں کے تسلط میں آ گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو نامساعد حالات کا سامنا

کرنا پڑا۔ تاہم انگریزوں نے جلد ہی سیاسی مصالحت سے کام لے کر کلکتہ کے مقام پر ایک کارخانہ قائم کیا۔ پھر اس کی قلعہ بندی کر کے اس کا نام "فورٹ ولیم" رکھا۔ اس شہر نے جو بعد میں کلکتہ کے نام سے موسوم ہوا، بہت جلد ترقی کی اور برعظیم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر مقام بن گیا۔

رفتہ رفتہ کمپنی نے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی قدم جمانے شروع کیے اور انہیں فتح کرنا شروع کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سے انگریزوں کو سازگار موقع اور ماحول مل گیا۔ یوں بنگال، میسور، اودھ، تنجور، سورت، کرناٹک، پنجاب اور سندھ انگریزوں کے تسلط میں آ گیا۔ 1857ء میں مسلمانانِ ہند نے ہندوؤں کے تعاون سے اس غاصبانہ تسلط کے خلاف ایک بھرپور جنگ لڑی جو تاریخ میں "جنگ آزادی" کے نام سے موسوم ہوئی، لیکن جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ اقتدار نے "غدر" کہا۔ اس جنگِ آزادی میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں برعظیم براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ تسلط آ گیا اور 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ کمپنی کے عہد میں برطانیہ نے اپنے گورنر جنرلوں کی وساطت سے حکومت کی، جن کے نام اور وقت کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔	لارڈ کلائیو، گورنر (1757ء۔1765ء)	۲۔	وارن ہیسٹنگز (1772ء۔1785ء)
۳۔	لارڈ کارنوالس (1786ء۔1793ء)	۴۔	لارڈ ولزلی (1798ء۔1805ء)
۵۔	جارج بارلو (1805ء۔1807ء)	۶۔	لارڈ منٹو (1807ء۔1813ء)
۷۔	لارڈ ہیسٹنگز (1813ء۔1823ء)	۸۔	لارڈ ایمرسٹ (1823ء۔1828ء)
۹۔	ولیم بینٹنک (1828ء۔1835ء)	۱۰۔	لارڈ آکلینڈ (1836ء۔1842ء)
۱۱۔	لارڈ ایلن بورو (1842ء۔1844ء)	۱۲۔	لارڈ ہارڈنگ (1844ء۔1848ء)
۱۳۔	لارڈ ڈلہوزی (1848ء۔1856ء)	۱۴۔	لارڈ کیننگ (1856ء۔1857ء)

(لارڈ کیننگ آخری گورنر جنرل اور پہلا وائسرائے تھا)

مغل دربار کے اندرونی حالات

اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی برکتوں سے نہ صرف تمام جاگیردار، تعلقہ دار، انعام دار اور معافی دار فقط "نادار" بنا دیئے گئے، بلکہ عام لوگ بھی بے سہارا ہو کر دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ پہلے کاشتکار اور کسان خوشحال تھے۔ گاؤں میں پنچایت مقرر تھی، جس کے ذریعے دیہات کے باشندے اپنے آپس کے جھگڑے بغیر کسی عدالتی دوڑ دھوپ اور الجھن کے خود ہی فیصلہ کر لیا کرتے تھے، مگر ملک پر انگریزوں کا راج مسلّط ہونے پر پنچایتی نظام ختم ہو گیا۔

یہاں ذمہ دار انگریز مؤرخوں کے بیانات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ "پہلی جنگ آزادی" یا غدر یا بغاوت جو بھی اسے نام دیا جائے، اس وقت کے عام اقتصادی حالت کا نقشہ پوری طرح ذہن میں آسکے۔

☆ "ہم (انگریز) ہندوستانی صنعت و حرفت کو تباہ کر چکے ہیں۔ کیا تم اہل ہند کو دوبارہ خوشحال کرنے کے

لیے انگلستان کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہو؟ ہندوستان یا انگلستان دونوں میں سے کسی ایک کی صنعت وحرفت قربان کرنا دوسرے کی ترقی کے لیے لازمی ہے"۔ (برکل ہرسٹ)

☆ ہندوستان جس طرح زرعی ملک ہے، اسی طرح صنعتی بھی ہے۔ اس کی مصنوعات نہایت کامیاب رہتی ہیں اور کوئی قوم بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب ہندوستان کو صرف زرعی ملک بنا دینا سخت ناانصافی اور ظلم ہے۔ (مارٹن)

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی اس اقتصادی بدحالی کے ذمہ دار صرف انگریز تھے یا اس میں مغل دربار کا بھی کچھ حصہ ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عوام کی اقتصادی بدحالی میں مغل دربار کا حصہ انگریزوں کے برابر ہی نہیں، بلکہ بہت زیادہ ہے۔ اصل اور بنیادی ذمہ داری بہرحال مغل بادشاہوں کے رویے، کردار اور حکمت عملی پر عائد ہوتی ہے۔ مغل خاندان کے بادشاہ جو دہلی کے تخت پر شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد متمکن ہوئے، اپنی رنگ رلیوں اور غفلت کی بدولت کمزور اور تباہ ہوتے چلے گئے اور اس طرح خود بخود انگریزی سامراج کے لیے راستہ ہموار ہوتا گیا۔ ہوا یہ کہ اورنگ زیب کی وفات (مارچ 1707ء) کے بعد جانشین میں جنگ ہوئی جس میں معظم شاہ کامیاب ہوا اور بہادر شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا، اگلے ہی سال اس کو پھر اپنے بھائیوں سے دکن میں لڑنا پڑا اور صرف چھ سال ہی حکومت کی تھی کہ انتقال ہو گیا، اس کا بیٹا عظیم الشان ہر طرح سلطنت کی اہلیت رکھتا تھا مگر تخت نشینی کے لیے پھر ایک خون ریز جنگ ہوئی جس میں جہاں دار شاہ تخت کے لئے زندہ بچا جو نہایت عیاش اور نالائق تھا۔ دن رات طوائفوں اور ذلیل مصاحبوں کے ساتھ دادِ عیش دیتا تھا۔ اس نے کمین اور بدذات لوگوں کو معزز عہدے دیئے اور اپنے خاندان کے تمام شہزادوں کو قتل کرا دیا، یہیں سے سلطنت کے نظام میں ابتری شروع ہوئی اور جہاں دار شاہ کو عیاشیوں کی سزا دینے کے لیے قدرت نے عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کو بھیجا جس نے جہاں دار کو ذلت آمیز شکست دی اور وہ اپنی داشتہ طوائف لال کنور کے ساتھ زنانہ بھیس بدل کر دہلی کو بھاگ گیا لیکن بعد میں قتل کرا دیا گیا۔ فرخ سیر نے بھی ظلم وستم میں کسر نہ چھوڑی اور مغل شہزادوں کو قتل اور اندھا کیا۔ اس بربریت سے سلطنت کے کاموں میں رخنے پڑے اور شرفا میں خوف وہراس پھیل گیا۔" یہاں تک کہ جو دربار میں جاتا اسے واپس آنے کی امید نہ ہوتی تھی۔"، مگر یہ غرور اس طرح خاک میں ملا کہ فرخ سیر کو بارہہ کے سیدوں نے جن کا اس زمانے میں عروج واقتدار بڑھ گیا تھا، پہلے تو اندھا کیا اور پھر نہایت تکلیف دے کر قتل کرا دیا۔ (فروری 1719ء) اب مغل تاج وتخت ان سیدوں کے ہاتھ میں کھلونا تھا کیونکہ کوئی بھی اس عظیم الشان سلطنت کا والی نہ رہا تھا۔

"کٹھ پتلیاں"

چند مغل شہزادے زنانہ محلات میں نظر بند تھے جنہیں عورتوں کی صحبت نے کاہل مزاج اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ یہی شہزادے سیدوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن سکتے تھے۔ چنانچہ ان "پنجروں" میں سے ایک بیس سالہ مدقوق شہزادہ (رفیع الدرجات) نکالا گیا اور تخت کی زینت بنا دیا گیا چند ماہ بعد جب یہ شہزادہ مر گیا تو دوسرا نکال کر بٹھا دیا گیا۔ یہ

حضرت (رفیع الدولہ) جو شہنشاہ ہند بنائے جا رہے تھے بہ مشکل پندرہ برس کے تھے مگر بیگمیں سر پر آنکھ رکھتے تھے، جب محل سے باہر نکالے گئے تو سب کی صورت دیکھ کر سہمے جاتے اور اپنی اماں جان سے لپٹ کر رو تے تھے کہ "اماں جان مجھ کو کہاں بھیجتی ہو میں نہیں جاؤں گا۔" توپوں کی آواز نے تو شہنشاہ ہند کا حال پتلا کیا ہے تھا، نیکو سیر سے ایک جنگ کا سماں اور لاشیں دیکھ کر بالکل ہی بے جان ہو گئے تو سیدوں نے ایک اور مقید شہزادے روشن اختر کو بٹھایا جو محمد شاہ رنگیلا کے نام سے مشہور ہے۔

محمد شاہ رنگیلا

محمد شاہ کے عہد میں سیدوں کا تو خاتمہ ہو گیا مگر سلطنت کو گھن لگ چکا تھا، مرہٹوں نے حملے شروع کر دیئے۔ امن و امکان مفقود ہو گیا، محمد شاہ رنگیلے کی عیاشیاں تو مشہور ہیں، ان سے بھلا سلطنت کیا ہوتی، رہی سہی کسر نادر شاہ کے حملے (1739ء) نے پوری کر دی جس نے دہلی میں ہولناک قتل عام کرایا اور جاتے وقت تخت طاؤس کے علاوہ کروڑوں روپے کے بیش قیمت ہیرے جواہرات (جن کی قیمت کا اندازہ بیس کروڑ سے زائد کیا جاتا ہے) لے گیا اور ساتھ ہی خزانے میں بھی جھاڑو دے دی۔ جہاں سے تیس کروڑ روپیہ اس کے ہاتھ لگا۔ تخت طاؤس سات کروڑ روپے کا تھا۔ اس پر بھی ان رنگیلے شاہ کی عیاشیاں بدستور تھیں اور وہ تین تین سو کسبیاں ننگی اپنے سامنے نچاتے تھے، باورچی خانے کا خرچ تین کروڑ روپے ماہوار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی مالی حالت نہایت خراب ہو گئی، ملازموں کی کئی کئی مہینے تنخواہیں نہ دی جا سکیں۔ ادھر تخریبی عناصر نے سر اٹھایا اور مرہٹوں، روہیلوں، سکھوں اور افغانوں سب ہی نے اس موقع پر فائدہ اٹھا کر ملک کا امن و امان غارت کرنا شروع کر دیا۔ مرکز کو کمزور پا کر صوبوں نے خود مختاری کے اعلانات شروع کر دیئے۔ رنگیلے کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا، مگر پانچ چھ سال بعد ہی کمانڈر ان چیف صاحب (غازی الدین) نے بادشاہ اور ملکہ کی آنکھیں نکال لیں اور پھر معظم بہادر شاہ کے پوتے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا۔

عالمگیر ثانی

مغل شہزادے "ہمہ خانہ آفتاب" کا مصداق تھے جب سے جہاں دار شاہ نے لال کنور کو ملکہ بنا کر ڈوموں کو عہدے دیئے، اس وقت سے مغل خاندان کا رنگ بگڑتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ ان عالمگیر صاحب کو جو لقب تو اورنگ زیب جیسے شاہ ذی جاہ کا اختیار کیے ہوئے تھے مگر کردار میں موجودہ زمانے کے کسی تانگے والے سے بھی بدتر تھے۔ یہ حال تھا کہ ایک پھل بیچنے والی کنجڑن پر مر مٹے اور اس کو ملکہ بنا کر چھوڑا۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ اس کو بھی لال کنور کا خطاب ملا اور شہنشاہ ہند اس کے زانو پر سر رکھ کر دین و دنیا سے بے خبر ہو گئے، انجام یہ ہوا کہ آصف جاہ کے بیٹے غازی الدین نے ان حضرت کو بھی ذبح کر ڈالا (1759ء)۔ اسی زمانے میں مرہٹوں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو گئے جس نے 1761ء میں پانی پت کے میدان میں ایک خون ریز جنگ کر کے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کافی کمزور کر دیا۔ مگر اس طرح ان کو شکست دے کر واپس لوٹ گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید یہ بدنصیب ملک برطانوی درندوں کی "چراگاہ" بننے سے بچ جاتا کیونکہ مرہٹوں کی کمزوری اور پسپائی

سے مغل تو فائدہ اٹھانے کے قابل ہی نہ تھے البتہ انگریزی سامراج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے نے ملک کی حالت اور خراب کر دی۔ وہ اپنے ساتھ کروڑوں روپے کے جواہرات لے گیا، یہاں تک کہ دیوانِ عام کی نقرئی چھت تک گلا کر اتار لی گئی اور موتی مسجد (لال قلعہ) میں جو درِ آب دار کا گچھا لگا ہوا تھا، اتار لیا گیا۔ پھر اس نے اپنی اور اپنے بیٹے کی شادی مغل خاندان میں کر کے لاکھوں روپے کا جہیز وصول کیا۔

شاہ عالم

عالمگیر ثانی کا جانشین شاہ عالم ہوا جو اپنے کو پہلے ہی انگریزوں کی پناہ میں دے چکا تھا، کہاں جاتا ہے کہ وہ اسی کنجڑن کے بطن سے تھا جو عالمگیر ثانی کی چہیتی ملکہ بنی تھی اور اس کا کردار بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ پرورش آپ کی اس طرح ہوئی تھی کہ چھ سہیلیوں کے جھرمٹ میں رہتے تھے، جب غازی الدین نے قلعے کو گھیر لیا تو الہ آباد کی طرف بھگا دیئے گئے جہاں ہر وقت اپنی سہیلیوں کو یاد کر کے روتے اور شاعری کرتے تھے۔ جنگ بکسر میں انگریزوں کے خلاف صف آراء ہوئے مگر وہ دست و بازوان کے پاس کہاں تھے جو تلوار پکڑتے ہیں۔ لہٰذا اپنے آپ کو انگریزوں کی پناہ میں دے دیا اور پھر ان کو اس سرپرستی کا انعام بھی عطا فرمایا یعنی کھانے کی میزوں پر بیٹھ کر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی فقط 26 لاکھ مال گزاری کے عوض بخش دی۔ مؤرخ مارش مین لکھتا ہے: ''لارڈ کلائیو کے خیمے میں دو کھانے کی میزیں برابر کر کے رکھ دی گئیں اور ان کے اوپر ایک کرسی رکھ دی گئی جس پر زردوزی کی پوشش پڑی ہوئی تھی۔ شہنشاہ اس پر بیٹھے اور ایک ایسی مملکت، جس میں ڈھائی کروڑ نفوس کی آبادی تھی اور تین کروڑ سالانہ کی آمدنی تھی، کلائیو کے حوالے کر دی گئی۔''

ایک جنبش قلم سے، اتنے کم وقفے میں ان سفید درندوں کے آگے ڈال دیئے جو ایک گدھے کی خرید و فروخت کے لیے بھی ناکافی تھا (1765ء)۔ اس زمانے میں مرہٹے پھر زور پکڑ گئے اور دہلی پر بھی ان کا اقتدار قائم ہو گیا چنانچہ 1771ء میں انہوں نے شاہ عالم کو تخت نشین کیا مگر وہ عیش و عشرت میں اپنے باپ دادا سے بھی بازی لیے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلام قادر روہیلے نے قلعے میں گھس کر شاہی خاندان کی عورتوں تک کو ذلیل کیا اور لوٹا۔ پھر شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ اس کا حد سے زیادہ ظلم و جور دیکھ کر چند راجپوت برداشت نہ کر سکے اور تلوار سونت کر کہا: ''اپنا ہاتھ روک لے ورنہ تیری بھی آنکھیں نکال لیں گے۔'' تب کہیں وہ باز آیا مگر جب مرہٹہ سردار مادھو جی سندھیا کو بادشاہ کی اس بے عزتی کی خبر ملی تو اس کو سخت غصہ آیا اور مرہٹوں نے غلام قادر کو بکرے کی طرح ذبح کر کے اس کا سر شاہ عالم کے پاس بھیجا۔ چنانچہ شاہ عالم نے ایک فارسی قصیدے میں مادھو جی کو ''فرزند جگر'' کہا ہے:

''مادھو جی سندھیا فرزند جگر بند من است
ہست مصروف تلافی ستم گاری ما''

آنکھیں نکلنے کے بعد ''شہنشاہ ہند'' کی خواہشات نفسانی کی آگ بجائے کم ہونے کے اور تیز ہوگئی چنانچہ خواجہ سراؤں کو حکم ہوا کہ ''اگر کوئی خوبصورت لڑکی نظر آئے تو ہمارے نکاح کی ترکیب لڑاؤ'' ادھر تو بادشاہ کی نفس پرستی کا یہ عالم تھا، دوسری طرف مرہٹوں نے لال قلعے کے تمام قیمتی زروجواہر اپنے قبضے میں کر لیے اور مکمل اختیار ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے عوام مل کر شہنشاہوں کی بڑی عزت کرتے اور اسی کو بادشاہ مانتے تھے چنانچہ مارش مین اقرار کرتا ہے کہ

> ''شہنشاہِ دہلی اگر اس وقت اپنی خودمختاری اور اپنی آنکھوں سے محروم تھا پھر بھی اس کو ہندو مسلمان یکساں سرچشمۂ عزوشان سمجھتے تھے اور شاہی مہر سے جو پروانہ منصب داری کا اس زمانے میں بھی عطا ہوتا تھا اس کو دکن کے دور دراز صوبوں میں بھی اتنی ہی قدر ہوتی تھی جتنی اورنگ زیب کے زمانے میں۔''

انگریزوں اور مرہٹوں کی خون ریز جنگیں شروع ہو گئیں مگر یہاں بھی عیاری کے آگے بہادری نہ چلی، مرہٹوں کے یورپین افسروں نے انگریزوں کے کہنے میں آ کر دغا کی اور ان کو شکست ہوگئی (1804ء)۔ تو اب شاہ عالم جو پہلے ہی انگریزوں سے ساز باز کر رہا تھا انگریزوں کی ماتحتی میں آ گیا اور اس کی پنشن مقرر ہوئی۔ اس کی حکومت مشہور مثل ''حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم'' کا مصداق تھی بلکہ ''تا قلعہ'' ہو کر رہ گئی تھی۔ 1806ء میں شاہ عالم کا انتقال ہو گیا۔

اکبر بادشاہ

ایسٹ انڈیا کمپنی اب پوری طور پر ہندوستان کو غصب کر چکی تھی مگر ابھی تک چونکہ وہ ہندوستانی بادشاہوں کی آڑ لے کر حکمرانی کر رہی تھی۔ اس لیے عوام کو غلامی کے اس جوئے کا احساس نہ ہو سکا جو آہستہ آہستہ ان کی گردن میں ڈالا جا چکا تھا۔ انگریزوں نے اب حکومت و سلطنت کے گھمنڈ میں آ کر بادشاہ سے نہایت ذلیل برتاؤ شروع کر دیا تھا۔ خزانہ خالی تھا ملک کی مالی و اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ خصوصاً مسلمانوں میں تمام مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں موجود تھیں، انگریز سیاہ و سفید کا مالک تھا اور ملک کی دولت انگلینڈ کی طرف چلی جا رہی تھی مگر منحوس دور میں اور اسی بدنصیب سرزمین پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت اسماعیل شہیدؒ جیسے پاک باطن بھی موجود تھے جو اس حالت کو بدلنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

بہادر شاہ ظفر

مغلوں کی آخری ''کٹھ پتلی'' بادشاہ بہادر شاہ 1837ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ بھی اپنے سابقہ تخت نشینوں کی طرح بے دست و پا تھا۔ انگریزوں نے اب اور بھی ذلت آمیز برتاؤ شروع کر دیا تھا۔ بادشاہ کی نظر بند کر دی گئی۔ جھک کر سلام کرنے میں شان گھٹتی نظر آئی۔ بادشاہ کا ''فدوی خاص'' بننا گوارا نہ ہوا، یہاں تک کہ یہ اعلان کیا گیا کہ مغل خاندان کو بہادر شاہ کے بعد لال قلعے سے نکال دیا جائے گا اور ''شاہ'' کا لقب بھی ختم ہو جائے گا۔ شاہ عالم نے ایک شعر میں کس حسرت سے کہا ہے:

"آفتاب فلکِ رفعت و شاہی بودیم
برد در شام آہ سیہ کاریٔ ما"

(ترجمہ): ہم شان و شوکت کے آسمان پر سورج کی طرح تھے، مگر آہ! ہماری سیاہ کاریوں نے ہمیں برباد کر ڈالا اور شام زوال تک پہنچا دیا۔

چنانچہ 1857ء میں یہ "شام زوال" آ پہنچی اور سلطنت مغلیہ کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اگر بہادر شاہ کے اندر عالمگیر اور شاہ جہاں جیسی صفات کا شائبہ بھی ہوتا تو شاید تاریخ اپنا رخ بدل دیتی۔

"اسبابِ بغاوتِ ہند"

سر سید نے انگریزوں کے خلاف "بغاوت ہند" کا جائزہ پیش کیا تھا۔ ذیل میں اسباب کا خلاصہ سر سید کے الفاظ میں ہی پیش کیا جاتا ہے۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم کو بتانا چاہیے کہ سرکشی کے کیا معنی ہیں۔ جان لو کہ اپنی گورنمنٹ کا مقابلہ کرنا یا مخالفوں کی مدد کرنا اور ان کے شریک ہونا یا مخالفانہ ارادے سے حکم کا نہ ماننا اور نہ بجا لانا یا رعیت کا نڈر ہو کر آپس میں لڑنا یا نڈر ہو کر گورنمنٹ کے حقوق اور حدود کو توڑنا یا اپنی گورنمنٹ کی محبت اور خیر خواہی دل میں نہ رکھنا اور مصیبت کے وقت طرف داری نہ کرنا سرکشی ہے۔ اس نازک وقت میں جو 1857ء میں گزرا، ان میں سے کوئی قسم بھی سرکشی ایسی نہیں ہے جو نہ ہوئی ہو۔ 1857ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کی شتابی میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی۔

جس قدر اسباب سرکشی کے جمع ہو گئے، اگر غور کر کے سب کو احاطہ میں لایا جائے تو پانچ اصول مبنی ہوتے ہیں:

1۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

2۔ جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریق حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

3۔ ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

4۔ ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

5۔ بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔

اب ہم ان پانچوں اسباب کی تفصیل جدا جدا بیان کرتے ہیں:

(سبب اول) غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا:

اس مقام پر جتنی باتیں ہم بیان کرتے ہیں ان سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت ہماری گورنمنٹ میں یہ باتیں تھیں بلکہ یہ مطلب کہ لوگوں نے یوں غلط سمجھا اور سرکشی کا سبب ہو گیا۔ اگر ہندوستانی آدمی بھی لے جس لیٹو کونسل میں مداخلت رکھتے تو یہ غلط فہمی واقع نہ ہوتی۔

کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو اور کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔

مشنری سکول بہت جاری ہوئے اور اس میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ یہ سرکار کی طرف سے ہیں۔ بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام معتمدان سکولوں میں جاتے تھے۔ اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں کا لیا جاتا تھا۔ اور طالب علموں سے جو کہ کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا کہ تمہارا خدا کون۔ تمہارا نجات دلانے والا کون اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے۔ اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔ اب سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

دیہاتی مکتبوں اور لڑکیوں کے سکولوں کے اجراء کے علاوہ بڑے کالجوں میں طریقہ تعلیم تبدیل کیا گیا۔ اسی زمانے میں بعض اضلاع میں تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کارن سب کے دل پر تھا کہ سرکاری ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اس کی تدبیر میں ہے۔

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً 1857ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی۔ ریلوے سڑک پر سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی۔ مذہب بھی ایک چاہئے، اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پاؤں کے تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرشتان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو، سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیات گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرشتان ہو گئے۔ ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہل کاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ سارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے ہمارے پاس تو نہیں آئی۔ لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آ جائے گی۔ کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو۔ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں، چنانچہ انہوں نے کر دیا اور اس کے مٹانے کو کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے۔

(سبب دوم) جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریق حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھی:

لے جس لیۓ کونسل سے بھی امور مذہبی میں مداخلت ہوئی۔ ایکٹ 21-1850ء صاف مذہبی قواعد پر خلل انداز تھا۔ پھر اس ایکٹ سے ایک یہ بدگمانی لوگوں کوتھی کہ یہ ایکٹ خاص واسطے ترغیب عیسائی مذہب قبول کرنے کے جاری ہوا ہے۔ ایکٹ نمبر 15-1856ء درباب بیوہ ہنود کے رسوم مذہبی میں خلل ڈالتا تھا۔ گواس میں بڑی بڑی بحثیں ہوئیں مگر ہندو لوگ جو مذہب سے زیادہ پابند رسم ورواج کے ہیں، اس ایکٹ کونہایت ناپسند کرتے تھے بلکہ باعث اپنی ہتک عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے اور یوں بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہندو کی بیوائیں خودمختار ہوجائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں۔

قوانین ضبطی اراضیات لاخراج جس کا آخر قانون نمبر 2-1819ء ہے، حکومت ہندوستان کونہایت مضر تھا۔ ضبطی اراضیات نے جس قدر رعایائے ہندوستان کوناراض اور بدخواہ ہماری گورنمنٹ کا کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ اور کسی چیز نے نہیں کیا۔ سچ فرمایا تھا لارڈ منرو اور ڈیوک آف ولنگٹن صاحب بہادر نے کہ ضبط کرنا معافیات کا ہندوستانیوں سے دشمنی پیدا کرنی اوران کومحتاج کر دیتا ہے۔

بندوبست مال گزاری جو ہماری گورنمنٹ نے کیا نہایت قابل تعریف ہے مگر اگلے بندوبستوں کی نسبت سنگین ہے۔ اگلی عملداریوں میں بطور خام تحصیل مال گزاری لی جاتی تھی۔ شیر شاہ نے ایک تہائی پیداوار کا حصہ گورنمنٹ مقرر کیا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ اس طریقہ میں بہت مشکلیں تھیں اور گورنمنٹ کا نقصان بھی تھا مگر کاشتکار سب آباد رہتے تھے کسی کوٹوٹا دینا نہ پڑتا تھا۔

اسٹامپ کا جاری ہونا بالکل ایک ولایتی پیداوار ملک کا قاعدہ ہے جہاں زمین کی آمدنی گویا کہ نہیں لی جاتی۔ ہندوستان میں اس کا جاری کرنا اور پھر رفتہ رفتہ اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا جانا جس کی انتہا اب قانون نمبر 10-1829ء ہے۔ بلاشبہ خلاف طباع اہل ہند کی بہ نظر حالات مفلسی اہل ہند مناسب تھا۔ ہندوستان کی رعایا جو دن بدن مفلس ہوتی جاتی ہے وہ ہرگز اس زیرباری اٹھانے کے لائق نہیں۔ سب عقلاء اس محصول کو ناپسند کر گئے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ دستاویزات پر محصول لگانا جتنا قابل جرم الزام اور بے وجہ محض ہے اس سے زیادہ برا وہ محصول ہے جو کاغذات پر انصاف کرنے کے لیے لیا جاتا ہے۔

(سبب سوم) یعنی ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات سے:

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو رعایا کے حالات اور اطوار اور جو جو دکھ ان کو تھے ان کو اطلاع نہ تھی اور اطلاع نہ ہونے کا کیا سبب تھا کیونکہ حالات اور اطوار کی اطلاع اختلاط اور ارتباط اور باہم آمدورفت بے تکلفانہ سے ہوتی ہے اور یہ بات جب ہوتی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم میں مل جل کر، محبت اور اخلاص پیدا کر کے بطور ہم

وطنوں کے وطن اختیار کرے جیسا کہ مسلمان غیر مذہب اور غیر ملک کے رہنے والوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کر کے، پیدا کیا اور غیر ملکیوں سے برادرانہ رادورسم پیدا کی۔

مفلسی اور تنگی معاش ہندوستان کی رعایا کو ہماری گورنمنٹ کی حکومت میں کیوں نہ ہوتی۔ سب سے بڑی معاش رعایا نے ہندوستان کی نوکری تھی اور یہ ایک پیشہ گنا جاتا تھا۔ اگرچہ ہر قوم کے لوگ روزگار نہ ہونے کے شاکی تھے مگر یہ شکایت سب سے زیادہ مسلمانوں کو تھی۔ غور کرنا چاہیے کہ ہندو جو اصلی باشندے اس ملک کے ہیں زمانہ سلف میں ان سے کوئی شخص نوکری پیشہ نہ تھا بلکہ سب لوگ ملکی کاروبار میں مصروف تھے۔ برہمن کو روزگار سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ بین برن جو کہلاتے ہیں وہ ہمیشہ بیوپار اور مہاجنی میں مصروف تھے۔ چھتری جو اس ملک کے کسی زمانہ میں حاکم تھے، پرانی تاریخوں سے ثابت ہے کہ وہ بھی نوکری پیشہ نہ تھے بلکہ زمین سے علاقہ رکھتے تھے۔ سپاہ ان کی ملازم نہ تھی بلکہ بطور بھائی بند کے وقت پر جمع ہو کر لشکر آراستہ ہوتا تھا جیسا کہ کچھ تھوڑا سا نمونہ روس کی مملکت میں پایا جاتا ہے۔ البتہ قوم کایت اس ملک میں قدیم سے نوکری پیشہ دکھلائی دیتے ہیں۔ مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں۔ اگلے بادشاہوں کے ساتھ بوسیلہ روزگار ہندوستان میں آئے اور یہاں توطن اختیار کیا۔ اس سبب کے سب روزگار پیشہ تھے اور کمی باشندوں کے تھی۔ روزگار سے ان کو زیادہ تر شکایت بہ نسبت اصلی باشندوں کے تھی۔ عزت دار سپاہ کا روزگار جو یہاں کی جاہل رعایت کے مزاج سے زیادہ تر مناسبت رکھتا ہے، ہماری گورنمنٹ میں بہت کم تھا۔ اس سبب سے رعایا کو حد سے زیادہ قلت روزگار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزارہا آدمی نوکری کو جمع ہو گئے اور جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جا گرے۔

ملحد گرسنہ درخانہ خالی برخواں

عقل باور نہ کند کہ از رمضاں اندیشد

بہت سے آدمی صرف آنہ ڈیڑھ آنہ یومیہ پر نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدم بعوض یومیہ کے سیر ڈیڑھ سیر اناج پاتے تھے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی رعایا جیسی نوکری کی خواہشمند تھی ویسی ہی مفلسی اور ناداری سے محتاج اور تنگ تھی۔

(سبب چہارم) یعنی ترک ہونا ان امور کا جو ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجا لانا ہماری گورنمنٹ پر واجب اور لازم تھا:

جو مراتب کہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں گو وہ ہمارے بعض حکام کے ناگوار طبع ہوں مگر ہم کو سچ لکھنا اور دل کھول کر کہنا اس مقام پر بہت ضروری ہے۔ یہ وہ بات ہم کہتے کہ جس سے جنگلی وحشی جانور دام میں آتے ہیں درندے رام ہوتے ہیں۔ انسان کی تو کیا حقیقت ہے کہ لارڈ بیکن ایسیز کافی نہیں کہ ہم اس مقام پر دوستی اور محبت اور ربط و اتحاد کے فائدے بیان کریں۔ یہ بھی ایک قاعدہ محبت کا جبلت انسانی بلکہ حیوانی میں بھی قدرتی پیدا کیا گیا ہے کہ اعلیٰ کی طرف سے ادنیٰ کی طرف محبت چلتی ہے۔ باپ کی محبت اپنے بیٹے کی طرف پہلے اس سے شروع ہوتی ہے کہ بیٹے کو باپ سے ہے۔ اسی طرح مرد کی محبت اپنی عورت کی طرف عورت کی محبت سے جو مرد کی طرف سے مقدم ہے۔

اسی بناء پر یہ بات ہے کہ ادنیٰ جو اعلیٰ سے محبت شروع کرے وہ خوشامد گنی جاتی ہے، نہ کہ محبت۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری گورنمنٹ کو اول چاہیے تھا کہ رعایا کے ساتھ محبت اور اتحاد کرنے میں تقدم کرتی، پھر محبت کا یہ قاعدہ جو ہزار ہا تجربہ سے حاصل ہوا ہے کہ خواہ مخواہ محبت دوسرے کے دل میں اثر کرتی اور رعایا اس سے زیادہ گورنمنٹ کی محبت بلکہ فریفتہ ہو جاتی۔

عشق آں خانماں خرابے ہست

کہ ترا آورد بخانۂ ما

مگر افسوس کہ ہماری گورنمنٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اگر ہماری گورنمنٹ دعویٰ کرے کہ یہ بات غلط ہے، ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ محبت کی اور نیکی کا بدلہ بدی پائی تو اس کا انصاف ہم خود گورنمنٹ کے سپرد کریں گے۔ اگر یہ بات یوں ہی ہوتی تو رعایا کو بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کی محبت ہوتی۔ محبت ایک دل کی چیز ہے جو کہنے سے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ ظاہر میں بھی اگرچہ اس کے آثار پائے جاتے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ نہ وہ بیان ہو سکتی ہے اور نہ نشانی دی جا سکتی ہے۔ مگر دل اس کو خوب جانتا ہے بلکہ اس کے ہاتھ میں ایسی تچی ترازو ہے کہ وہ کمی بیشی کو بھی پہچانتا ہے۔ ہماری گورنمنٹ نے اپنے آپ کو آج تک گورنمنٹ سے ایسا الگ اور ان میل رکھا ہے جیسے آگ اور سوکھی گھاس۔ ہماری گورنمنٹ اور ہندوستانی پتھر کے دو ٹکڑے ہیں، سفید و کالے کہ الگ الگ پہچانے جاتے ہیں اور پھر ان دونوں میں ایک فاصلہ ہے کہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے حالانکہ ہماری گورنمنٹ کو ہندوستان کی رعایا کے ساتھ ہونا چاہیے جیسے ابریکا پتھر کہ باوجود دو رنگ کے ایک ہوتا ہے۔ سفید رنگ میں سیاہ خال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور سیاہی میں سفیدی عجیب بہار دکھلاتی ہے۔ اب غور کرو کہ ہمارے حکام اور ہندوستان کا خون ایک نہ تھا، مذہب ایک نہ تھا، رسم و رواج ایک نہ تھا، دلی رضامندی رعایا کو نہ تھی، آپس میں محبت اور اتحاد نہ تھا۔ پھر کس بات پر ہمارے حکام ہندوستان سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے؟

(سبب پنجم) بد انتظامی اور بے اہتمامی فوج کی:

ہماری گورنمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابل اعتراض تھا۔ فوج انگلشیہ کی کمی ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی۔ جب کہ نادر شاہ نے خراسان پر فتح پائی اور ایران اور افغانستان دو مختلف ملک اس کے قبضے میں آئے، اور اس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں۔ ایک ایرانی قزلباش، دوسرے افغانی۔ جب ایرانی فوج کچھ عدول حکمی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج اس کے دبانے کو موجود تھی اور جب افغانی فوج سرتابی کرتی تو قزلباش اس کے تدارک کو موجود ہوتی۔ ہماری گورنمنٹ نے یہ کام ہندوستان میں نہیں کیا۔

اگر ہندو اور مسلمان دو قوموں کی پلٹن اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی اور تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کا کارتوس کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا۔

فوج انگلشیہ کے کم ہونے سے رعایا کو بھی جو کچھ خوف تھا وہ صرف ہندوستانی ہی فوج کا تھا۔ علاوہ اس کے

ہندوستانی فوج کو بھی بے انتہا غرور تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتے تھے۔ فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ تمام ہندوستان کی فتوحات صرف اپنی تلوار کے زور سے جانتے تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ برما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر دیا ہے۔ علی الخصوص پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

ایسے وقت میں جب کہ فوج کا یہ حال تھا اور ان کے سر غرور و تکبر سے بھرے ہوئے تھے اور دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے۔ خواہ مخواہ سرکار کو ماننا پڑے گا، ان کو نئے کارتوس دیئے گئے جس میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا۔ انہوں نے اس کے کاٹنے سے انکار کیا۔ جب بارک پور کی پلٹن اس جرم میں موقوف ہوگئی اور حکم سنایا گیا تو تمام فوج نہایت رنجیدہ ہوئی۔ بلاشبہ بعد واقع بارک پور آپس میں فوجوں کی خط و کتابت ہوئی، پیغام آئے کہ کوئی کارتوس نہ کاٹے۔ اب تک تمام فوج کے دل میں ناراضی اور غصہ تو ہے مگر میری رائے میں ابھی تک کچھ فساد کا ارادہ نہیں۔

دفعتاً تقدیر سے کم بخت مئی 1857ء کی آ گئی۔ میرٹھ میں سپاہ کو بہت سخت سزا دی گئی، جس کو ہر ایک عقل مند بہت برا اور ناپسند جانتا تھا۔ اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گزرا بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنے تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اس کے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر رو تے تھے۔ وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اس کے صلہ میں جو ان کو انعام ملتا تھا دیکھتے تھے اور علاوہ اس کے ان کا بے انتہا غرور جو ان کے سر میں تھا اور جس کے سبب وہ اپنے تئیں ایک بہت بڑا سمجھتے تھے ان کو زیادہ رنج دیتا تھا۔ پھر سب فوج مقیم میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ یا ہم کو کارتوس کاٹنا پڑے گا یا یہی دن نصیب ہوگا۔ اسی رنج اور غصہ کی حالت میں 10 مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کی نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ اس فوج کو کیا چارہ رہا تھا اس حرکت کے بعد بجز اس کے کہ جہاں تک ہو سکے مفسدے پورے کرے۔

جہاں جہاں فوج میں یہ خبر پہنچی تمام فوج زیادہ تر رنجیدہ ہوئی۔ میرٹھ کی فوج سے جو حرکت ہوئی تھی اس سے تمام ہندوستانی فوج نے یقین جان لیا تھا کہ اب سرکار کو ہندوستانی فوج کا اعتبار نہ رہا۔ سرکار وقت پا کر سب کو سزا دے گی اور اس سبب سے تمام فوج کو اپنے افسروں کے فعل اور قول کا اعتبار اور اعتماد نہ تھا۔ سب آپس میں کہتے تھے کہ اس وقت تو یہ ایسی باتیں ہیں جب وقت نکل جائے گا تو یہ سب آنکھیں بدل لیں گے۔ میں بہت معتبر بات کہتا ہوں کہ دل میں جو فوج باغی جمع تھی اس میں سے ہزاروں آدمیوں کی اس بے حرکت اور بے فائدہ بغاوت کا رنج تھا۔ وہ روتے اور کہتے تھے کہ ہماری قسمت نے یہ کام ہم سے کروایا۔ پھر بہت افسوس سے کہتے تھے کہ اگر ہم نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ایک نہ ایک دن سرکار ہم کو تباہ کر دیتی۔ ہندوستانی رعایا جانتی تھی کہ سرکار کے پاس جو کچھ ہے وہ ہندوستانی فوج ہے جب تمام فوج کا بگڑنا مشہور ہو گیا، سب نے سر اٹھایا۔ عملداری کا ڈر دلوں سے جاتا رہا اور سب جگہ فساد برپا ہو گیا۔ اب ہماری رائے کو پنجاب کے حالات پر تولو۔ پنجاب کے مسلمان بہت ستم رسیدہ تھے۔ سکھوں کے ہاتھ سے سرکاری عملداری سے ان کا چنداں نقصان نہ ہوا تھا۔ سرکار نے پنجاب میں ابتدائے عملداری میں بہت تشدد کیا تھا اور اب دن بدن رفاہ کرتی جاتی تھی۔ برخلاف ہندوستان کے یہاں معاملہ برعکس تھا۔ ابتدائے عملداری میں تمام

ملک کے ہتھیار لیے گئے ۔ کسی کو قابو فساد نہ رہا تھا۔ اگر چہ وہ تمول سکھوں کو جو پہلے تھا نہ رہا تھا مگر ان کا کمایا ہوا روپیہ جو ان کے پاس جمع تھا، ابھی خرچ نہ ہو چکا تھا اور وہ مفلسی جو ہندوستان میں تھی وہاں ابھی نہیں آئی تھی ۔اس کے سوا تین سبب اور بہت قوی تھے جو پنجاب نہ بگڑا۔

اول یہ کہ فوج انگلشیہ وہاں موجود تھی۔

دوم یہ کہ وہاں کے حکام کی ہوشیاری سے دفعتاً بے خبری میں ہندوستانی فوج کے ہتھیار لیے گئے ۔ یہ سبب طغیانی اور کثرت سے واقع ہونے دریاؤں اور بند ہو جانے والے گھاٹوں کے ہندوستانی فوج بے قابو ہوگئی، فوج کا فساد برپا نہ ہو سکا۔

سوم یہ کہ تمام سکھ اور پنجابی اور پٹھان جن سے احتمال فساد تھا سرکار میں نوکر ہو گئے اور لوٹ کا لالچ اس پر مزید تھا۔ جو بات رعایائے ہندوستان اور نوکری پیشہ کو باغیوں کے ہاں بمشکل اور بذلت حاصل ہوئی تھی وہ اہل پنجاب کو سرکار کے ہاں عزت و بلا دقت نصیب تھی۔

پراسرار روٹیاں

اور

کنول کا پھول

ناقابل برداشت حد تک خراب معاشی، سماجی اور سیاسی حالات نے ارباب فکر ونظر کو یہ سوچنے پر بالآخر مجبور کر دیا کہ انگریزی سامراج کا بڑھتا ہوا سیلاب جو مغل شہنشاہیت اور دوسری خودمختار ریاستوں کی عظمت و وقار کو سوکھی جھاڑیوں کی طرح بہاتا چلا جارہا تھا، اب ہر قیمت پر روکنا پڑے گا۔ ملک خاموش تھا، فضا میں سناٹا تھا، مگر یہ خاموشی اور یہ سناٹا بڑا برداشت ناک اور پرفریب معلوم ہوتا تھا۔ عوام انگریز کے ظلم وستم سے تنگ آچکے تھے۔ امراء اور جاگیردار ناراض تھے ۔فوج ناخوش تھی ۔ یہ سب کچھ تھا، مگر انگریزی قہرمانی اور گھمنڈ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہ حالات تھے کہ آنے والے طوفان کی گرج سنائی دینے لگی۔ ملک کے مختلف حصوں میں سازشیں ہونے لگیں۔ بغاوت کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

مثلاً 1857ء کی پہلی سہ ماہی میں پراسرار چپاتیاں تقسیم ہونے لگیں۔ گندم اور جو کے آٹے کی یہ چپاتیاں جو اندازاً دو تولہ وزنی اور انسانی ہتھیلی کے برابر تھیں، شمالی ہند کے تقریباً تمام دیہات میں نہایت تیزی سے تقسیم ہوئیں۔ لیکن جنوری، فروری 1857ء میں یوپی اور سی پی میں بھی پائی گئیں۔ بہار اور جھانسی میں بھی پائی گئیں۔ اندازہ ہے کہ سب سے پہلے جنوبی یا وسطی حصوں میں کہیں سے شروع ہوئیں۔ 19 فروری 1857ء کو گوڑگاؤں کے کلکٹر نے رپورٹ بھیجی کہ یہ چپاتیاں وہاں کے دیہات میں تقسیم کی جارہی ہیں۔ ان کے روکنے کے لیے احکام جاری ہوئے اور دہلی کے مجسٹریٹ نے بھی تقسیم بند کرانے کی کوشش کی، مگر اس وقت تک یہ پنجاب میں پہنچ چکی تھیں اور تمام

دیہات میں پھیل گئی تھیں۔ پہاڑ گنج (دہلی) کے تھانیدار معین الدین نے بھی اپنے روزنامچے میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ان کے بھائی نے جو بدر پور کا تھانیدار تھا، اطلاع دی کہ یہاں چپاتیاں اور بکرے کے گوشت کی بوٹیاں تقسیم کی جارہی ہیں۔وہ متھرا اور علی گڑھ بھی گیا۔ یہاں بھی چپاتیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ان کی تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ گاؤں کا چوکیدار دوسرے گاؤں کے چوکیدار کو چپاتی دے جاتا اور یہ ہدایت کرتا کہ اس قسم کی پانچ روٹیاں پکا کر آس پاس کے دیہات میں اسی ہدایت کے ساتھ تقسیم کر دے۔اندازہ ہے کہ جنوری سے شروع ہو کر مارچ تک یہ چپاتیاں تمام شمالی ہند میں بارک پور (میرٹھ) سے انبالے تک، اور دہلی سے ساگر اور نربدا تک کے ضلعوں میں پہنچ چکی تھیں۔ان چپاتیوں کی تقسیم سے عوام میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی اور مختلف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ فوج میں بھی یہ روٹیاں تقسیم ہوئیں۔''ایام غدر'' میں ایک فرانسیسی عورت کا بیان نقل ہوا ہے۔وہ لکھتی ہے:

''جب یہ کلچہ دست بدست ایک سپاہی سے دوسرے سپاہی کو ملتا ہے تو اس پر نظر پڑتے ہی سپاہی کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔غیظ وغضب کے آثار چہرے سے ہویدا ہونے لگتے ہیں، اگر چہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے، مگر دل ہی دل میں انگریزوں پر پیچ وتاب کھاتے ہیں۔''

چپاتیوں کی اس پراسرار گردش کو اول اول انگریز حکام نے مطلق اہمیت نہ دی اور جب وہ ان کی طرف تمام پر متوجہ ہوئے تو یہ تمام ملک میں پھیل چکی تھیں۔انگریز مورخوں نے اس لیے اہمیت دی کہ وہ 1857ء کی بغاوت کو چند سرکش سپاہیوں اور ناخوش جاگیرداروں کی فتنہ پردازی ثابت کرنا چاہتے تھے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ چپاتیاں اس خفیہ اور منظم گروہ کی ایجاد تھیں جو ملک میں خاموشی سے اپنا کام کر رہا تھا اور یہ ہندوستان کے کروڑوں جاہل اور غریب عوام کو ہوشیار کرنے کا ایک طریقہ تھا کہ وہ جنگ آزادی کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ گویا مسلمانوں اور ہندوؤں کی جانب سے انگریزوں کے خلاف آزادی کا مشترکہ اعلان تھا۔

مولانا احمد اللہ شاہ:

صحیح طور پر پتا نہیں چل سکا کہ یہ چپاتیاں کہاں سے شروع ہوئیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا احمد اللہ شاہ نے یہ چپاتیاں اپنے دوران سفر میں شروع کیں۔فریزران کے بارے میں لکھتا ہے:''ایک عالم فاضل فیض آبادی مولوی نے دہلی، میرٹھ، کلکتہ اور پٹنہ کا سفر کیا۔وہ بغاوت پھیلا رہا تھا اور ہمہ گیر سازش کے پوشیدہ جال نہایت ہوشیاری سے بُن رہا تھا۔'' مولانا احمد اللہ شاہ نے تمام ملک خصوصاً شمالی ہند میں جگہ جگہ خود جا کر تحریر وتقریر کے ذریعے بغاوت کی انقلابی تحریک کو منظم کیا اور لوگوں کو جنگ آزادی پر آمادہ کیا۔شاہ صاحب دہلی بھی آئے،مگر یہاں عجب رنگ تھا۔مغل شہزادے عیش وعشرت میں مست، امراء عیاش اور عوام مدہوش تھے۔آپ نے ذی شعور اور ذی اثر اس طبقے کو نہایت خفیہ طور پر اس کی طرف متوجہ کیا۔مفتی صدرالدین آزردہ کے مشورے سے آگرہ گئے اور انہی کے ذریعے سے جان پہچان پیدا کی۔ڈاکٹر وزیر خان اور مولانا فیض احمد بدایونی بھی شریک کار ہو گئے اور کافی لوگ آپ کے معتقد ہو گئے۔مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی اس سلسلے میں دہلی آئے تھے۔اسی طرح ایک اور مولوی صاحب جن کا تذکرہ خواجہ حسن نظامی نے ''بیگمات کے آنسو'' میں کیا ہے، یہ تصدیق کرنے دہلی آئے تھے کہ نئے کارتوسوں کے متعلق افواہیں کس حد تک

درست ہیں۔ ان کے جذبۂ صادق کا اندازہ لگائیے۔ وہ ایک شخص یوسف سے کہتے ہیں: ''ہم صرف ثبوت چاہتے ہیں، تاکہ ہمارا انتقام اللہ کے نزدیک جائز ہو جائے۔'' تصدیق کرنے کے بعد یہ مولوی صاحب میرٹھ چلے گئے جہاں سے بغاوت کا پہلا پتھر برساتھا۔

خفیہ تحریک

1854ء میں جب نانا صاحب کے وکیل عظیم اللہ خان انگلستان گئے تو وہاں ناکامی کے بعد انہوں نے انقلاب کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس مقصد کے تحت وہ مختلف ممالک میں گھومے۔ یورپ کا دورہ کیا۔ ترکی کے دارالحکومت گئے۔ قسطنطنیہ کے عمر پاشا کو خطوط لکھے اور روس میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ یہ خفیہ تحریک سب سے زیادہ دہلی میں جڑ پکڑ رہی تھی اور مغل شہزادے اس کام میں مصروف تھے۔ لال قلعہ میں باتیں ہوتی تھیں کہ عنقریب فوجیں بغاوت کریں گی اور عوام ان سے مل کر فرنگی راج کا جواء اتار پھینکیں گے۔ مائیں اپنے بچوں سے دعائیں کراتی تھیں کہ فرنگی جڑ بنیاد سے غارت ہو جائے۔ مسجدوں اور مندروں میں بھی دعائیں ہوتی تھیں۔ اگست 1855ء میں انگریزوں نے ایک خط پکڑا جو امیر کابل کے نام تھا۔ یہ خط لکھنؤ سے لکھا گیا تھا اور ان سے بغاوت کے لیے امداد کی امید ظاہر کی گئی تھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خفیہ جماعتیں کافی عرصہ پہلے سے سرگرم عمل تھیں۔

اودھ کو جبری طور پر ختم کرنے کے بعد انگریزوں نے واجد علی شاہ اور ان کے ہمراہی کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ وہاں ان کے وزیر علی نقی خان ان تمام خطرناک اور خفیہ انقلابی تحریک میں ہمہ تن مصروف تھے اور بنگالی فوج کو اکسا رہے تھے۔ بااثر علماء نے جہاد کی اہمیت پر زور دیا۔ گاؤں اور شہروں میں دورے کئے۔ تقریریں کیں۔ رضاکاروں نے گھر گھر جا کر چندہ کیا۔ ہزاروں، فقیر، پنڈت، سادھو اور سنیاسی ملک کے گوشے میں بغاوت کے بیج بونے کے لیے پھیل گئے۔

مولانا احمد اللہ شاہ نے ملک گیر دورے کرنا شروع کئے۔ وہ ہزاروں کے مجمع میں بہ بانگ دہل تقریر کرتے اور بتاتے تھے کہ وطن اور مذہب کو بچانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، انگریزوں کا خاتمہ۔ انہوں نے لکھنؤ اور آگرہ کے عوام میں جہاد کی آگ بھڑکا دی۔ عظیم آباد (پٹنہ) انقلابی سرگرمیوں کا گڑھ بن چکا تھا۔ وہاں سید احمد شہید کے معتقد اور کارکن سرگرمی اور مستعدی سے سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے اور ہزاروں روپیہ اور آدمی بھرتی کر کے اپنے جہادی مرکز یعنی صوبہ سرحد کی طرف روانہ کئے جا رہے تھے۔ ان کے قائد سید احمد کو شہید ہوئے ابھی 25 سال گزرے تھے اور ان کے مجاہدین کے سینوں میں انتقام کا جذبہ کھول رہا تھا۔ حیدرآباد دکن میں خفیہ جلسے شروع ہو گئے تھے۔ لکھنؤ بھی بغاوت کی خفیہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔

کنول کا پھول:

بنگالی سپاہ کی چھاؤنی میں کنول کا ایک سرخ پھول ایک سے دوسرے سپاہی تک پہنچایا گیا، جسے ایک شخص لے کر وہاں گیا تھا۔ جب یہ پھول باری باری ہر سپاہی کے پاس پہنچ چکا تو واپس اسی شخص کے پاس آ گیا اور وہ اسے لے کر دوسری رجمنٹ میں چلا گیا۔ بنگال کی کوئی چھاؤنی اور فوجی کیمپ ایسا نہ تھا جہاں یہ پھول نہ پہنچا ہو۔

پہلے یہ پھول رجمنٹ کے ہندوستانی افسر کے پاس پہنچتا تھا اور وہ اسے اپنے قریبی سپاہی کو دے دیتا تھا۔ اسی طرح پوری رجمنٹ میں گردش کرتا ہوا اگلی رجمنٹ میں جا پہنچتا۔ مورخ ساورکر نے اپنی انگریزی تصنیف ''تذکرۂ غدر'' میں لکھا ہے: ''کنول کے اس سرخ پھول کی گردش نے، جو بظاہر نہایت معمولی چیز تھی اور انگریزوں کو بظاہر مذاق معلوم ہوتا ہوگا، تمام سپاہیوں کو ایک پراسرار پیغام دیا اور یہ پیغام ان کو متحد کرتا چلا گیا۔''

انقلاب کی مقررہ تاریخ:

اب ضرورت صرف یہ تھی کہ اس خفیہ تحریک سے وابستہ مختلف انقلابی جماعتوں کو ایک دوسرے سے منسلک و مربوط کر دیا جائے۔ چنانچہ رابطہ اور اتحاد پیدا کرنے کے مقصد سے معتبر پیامبر روانہ کئے گئے۔ خفیہ زبان میں خفیہ خطوط لکھے گئے اور جب کچھ عرصے کے بعد ان کو انگریزوں نے پکڑنا چاہا تو ایک ایسی زبان میں لکھے گئے جو مخصوص اشارات میں مشتمل تھی اور نقطوں اور ہندسوں سے لکھی جاتی تھی اور تمام موقعوں پر استعمال کی جاتی تھی۔

چربی والے کارتوسوں کے واقعے کے بعد دو ماہ تک نواب اودھ کے نام سے پنجاب، دانا پور، میرٹھ اور انبالہ وغیرہ کی رجمنٹوں کو بارک پور سے خطوط بھیجے گئے۔ مارچ 1857ء میں نانا صاحب، ان کے بھائی بالا صاحب اور عظیم اللہ خان نے مختلف مقامات کا دورہ کیا، تاکہ انقلابی تحریکوں کو تیز کیا جائے اور متحدہ بغاوت کی تاریخ مقرر ہو سکے۔ انہوں نے پہلے دہلی کی طرف رخ کیا۔ حالات کا جائزہ لیا اور انبالے روانہ ہو گئے۔ 8 اپریل کو بغاوت کے بعد یہ رہنما لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کے لوگوں میں ان کی آمد سے جوش و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اسی دن ایک مشتعل ہجوم نے چیف کمشنر ہنری لارنس کی بگھی کو گھیر لیا اور اس پر کیچڑ اور پتھر برسائے۔

ملک میں مختلف جگہوں پر ڈراموں، ناٹکوں اور گیتوں کے ذریعے بھی عوام کو غلامی کا احساس دلایا گیا۔ پردہ نشین عورتوں میں انقلاب کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے خانہ بدوش لڑکیاں گھروں میں بھیجی گئیں۔ ان تحریکی سرگرمیوں میں بہت اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری عہدے دار بھی شریک تھے۔ مثلاً میرٹھ کے جن ججوں نے کارتوسوں کے انکار پر سپاہ کو سزا کا فیصلہ سنایا، وہ تمام انقلابی تحریک سے وابستہ تھے اور یہی جج بغاوت کی اسکیم بنا رہے تھے۔ اسی طرح بریلی میں خان بہادر خان جو جوڈیشنل آفیسر تھے، انقلابی جماعت کے روح رواں تھے۔ اس خفیہ جماعت کی طرف سے متفقہ طور پر 31 مئی 1857ء کو اچانک بغاوت برپا کرنے کی اسکیم بنالی گئی تھی۔ مسٹر ولسن، جسے بعد میں اس تحقیقات کا انچارج مقرر کیا گیا تھا، اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

''تمام ملک میں بیک وقت بغاوت برپا کرنے کے لیے 31 مئی کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ ہر رجمنٹ میں ایک تین ممبروں کی کمیٹی تھی اور یہی کمیٹی بغاوت کے بارے میں تمام کام انجام دیتی تھی۔ تمام اہم معاملات اور اسکیمیں تیار کرتی، خط و کتابت کرتی تھی۔ سب نے متفقہ طور پر 31 مئی کا دن مقرر کیا جو کہ اتوار کا دن تھا۔ چونکہ اتوار کو انگریز افسروں کی زیادہ تعداد گرجا گھروں میں موجود ملتی، جہاں ان کا قتل عام کیا جانا طے پایا تھا۔''

انگریز اور ان کی سامراجی طاقت کے خلاف نفرت و انتقام کا جذبہ بغاوت کے لیے پک کر تیار ہو گیا تھا۔ یہ آتش فشاں اپنا لاوا اگلنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اس کے لیے تاریخ بھی مقرر ہو گئی تھی: 31 مئی 1857ء۔

دس مئی کو طوفان کی آمد

جب عیسائی پادریوں کے جبر و تشدد سے کام نہ بنا تو ہندوستانی فوجیوں کا مذہب خراب کرنے کے لیے نئے کارتوس ایجاد ہوئے جن میں مسلمانوں کے لیے سؤر اور ہندوؤں کے لیے گائے کی چربی استعمال کی گئی۔ ان کو دانتوں سے کاٹنے کا حکم تھا۔ سپاہیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ان کارتوسوں کو کاٹیں اور گوروں کے سامنے کاٹیں۔ آج تک انگریز مؤرخین دنیا کی آنکھوں میں یہ دھول جھونکتے چلے آ رہے ہیں کہ کارتوسوں میں چربی کی افواہ غلط تھی اور یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی، مگر حقیقت زیادہ دیر پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انگریزی فوج کے کمانڈر ان چیف اینسن (Anson) نے گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو اپنی رپورٹ میں لکھا:

> ''کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً حیرت نہ ہوئی۔ میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے یقیناً سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو کچل دیا گیا ہے۔''

چربی کی سپلائی کے ٹھیکے دار نے اسی زمانے میں اپنے معاہدے میں صاف الفاظ میں یہ بات ظاہر کی تھی۔ معاہدہ یہ تھا کہ کارتوس چربی سے چکنے کیے جائیں گے اور گائے کی چربی دو پنس فی پونڈ کے حساب سے خریدی جائے گی۔ جب یہ اسکیم لوگوں پر ظاہر ہونے لگی تو حکومت نے فوراً یہ احکام جاری کیے کہ آئندہ گائے اور سؤر کی چربی استعمال نہ کی جائے۔ ان احکامات سے اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو یہی کہ اب تک یہ چربی استعمال ہوتی رہی ہے۔ ایک انگریز افسر فورسٹ نے سرکاری دستاویزیں شائع کیں، ان سے یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہوگئی کہ کارتوس میں استعمال کی جانے والی چکنائی دراصل گائے اور سؤر کی چربی ملا کر استعمال کی جاتی تھی۔ رابرٹس کہتا ہے:

> ''مسٹر فورسٹ کی حالیہ تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ کارتوس چکنانے کے لیے جو مکسچر استعمال کیا گیا وہ واقعی قابل اعتراض اشیاء یعنی گائے اور سور کی چربی سے بنایا گیا تھا اور اس سے سپاہیوں کے مذہب کی حیرت انگیز طور پر توہین ہوتی تھی۔ ان کارتوسوں کے بنانے میں مذہبی تعصب سے کام لیا گیا تھا'' (حوالہ ساورکر، صفحہ 431)

راز کھلتا ہے

یہ کارتوس 1857ء کے ابتدائی ایام ہی میں رائج ہو گئے تھے اور ڈم ڈم میں ان کی تیاری کا کارخانہ قائم ہوا۔ ایک دن اس کارخانے کا ملازم ایک برہمن سپاہی سے ملا۔ پانی پینے کو مانگا، جس پر برہمن سپاہی نے اس کی ذات پوچھی، کارخانے کے ملازم نے کہا: ''ذات کیا پوچھتے ہو، کچھ دن بعد تمہاری ذات بھی نہ رہے گی کیونکہ اب نئے

کارتوس کاٹنا پڑیں گے جن میں گائے اور سور کی چربی استعمال ہو رہی ہے۔'' یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور سپاہ نے طے کر لیا کہ وہ یہ کارتوس استعمال کر کے اپنا مذہب خراب نہ کریں گے، چنانچہ جنوری 1857ء ہی میں تربیت گاہ کے سپاہیوں نے انہیں استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

کارتوس نہیں لیں گے

26 فروری کو برہام پور کی رجمنٹ 19 نے کارتوس لینے میں پس و پیش کیا اور اپنا شبہ ظاہر کیا۔ پھر ایک عرضی کلکتہ ڈویژن کے میجر جنرل کو بھیجی جس میں اپنے ان خیالات کا عاجزانہ اظہار کیا۔ مگر انگریز افسروں کے دماغ غرور و نخوت سے بھرپور تھے، انہوں نے حکم دیا کہ کارتوس نہ کاٹو گے تو سخت سزا دی جائے گی۔ 19 رجمنٹ نے (جس کو اودھ کے وزیر علی نقی خاں کے آدمیوں نے تمام حالات بتا کر انقلابی بنا دیا تھا) صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ نہ صرف یہ کہ کارتوس استعمال نہیں کرے گی بلکہ ضرورت پڑی تو اپنی تلواریں بھی بے نیام کر دے گی۔ انگریز افسر اس غیر متوقع اعلان پر خوف زدہ ہو کر خاموش ہو گئے، اور یہ اعلانات کرنے لگے کہ اب کارتوس کاٹنے نہیں پڑیں گے اور بجائے چربی کے گھی استعمال کیا جائے گا مگر اندر ہی اندر سپاہیوں کو اس انکار کی سزا دینے کے لیے تیاریاں ہونے لگیں۔ برما سے ایک انگریز رجمنٹ بلائی گئی اور اب 19 رجمنٹ کو سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ 31 مارچ کو وہ بارک پور پہنچی۔ 27 کو سزا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان کے ہتھیار چھین لیے گئے اور برطرفی کا حکم ہوا۔ مگر بارک پور کی غیرت مند رجمنٹ کے لیے یہ برداشت کرنا ناممکن تھا کہ ان کے ہم وطن اس طرح ذلیل کیے جائیں۔

منگل پانڈے کی سرفروشی

بارک پور رجمنٹ کے ایک بہادر سپاہی منگل پانڈے کے دل میں جوش انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ کھولتا ہوا خون بے قابو ہو کر ابل پڑا۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر زور ڈالا کہ بغاوت آج ہی شروع کر دی جائے مگر جب انقلابی جماعت کے لیڈر اور سپاہی مقررہ وقت سے پہلے بغاوت پر تیار نہ ہوئے تو وہ جذبات سے بے تابو ہو کر خود ہی تلوار اور بندوق سنبھال کر میدان میں آیا۔ اٹھو بھائیو۔ اٹھو۔ اس نے پکار کر کہا۔ ''دیش کی آزادی کے لیے آگے بڑھو اور دغاباز دشمن پر حملہ کرو۔! سارجنٹ میجر نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ مگر کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوا اور منگل پانڈے کی ایک ہی گولی نے میجر کا خاتمہ کر دیا۔ یہ سن کر لیفٹیننٹ آیا، منگل پانڈے کی گولی اس کے گھوڑے کو لگی اور وہ مع گھوڑے کے نیچے آ رہا۔ پانڈے اپنی بندوق دوبارہ بھر ہی رہا تھا کہ لیفٹیننٹ نے اٹھ کر پستول اس کی طرف کر کے فائر کیا مگر نشانہ چوک گیا۔ منگل نے پھرتی سے تلوار کھینچ لی۔ لیفٹیننٹ نے بھی تلوار نکالی مگر منگل کی تلوار اس کا خاتمہ کر چکی تھی اور ایک گورا افسر منگل پانڈے پر حملہ کرنے بڑھا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے اپنی بندوق کی نالی سے اس کے سر کے پرخچے اڑا دیئے۔ شور بلند ہوا۔

''منگل پانڈے کو ہاتھ نہ لگاؤ۔''

فوراً ہی کرنل ڈیکر آیا۔ ''گرفتار کر لو، اس خبیث باغی کو۔!''

''ہم اس مقدس برہمن کا بال بھی بیکا نہیں کریں گے۔'' سپاہیوں کا خون بھی کھولنے لگا تھا۔ کرنل ڈیکر خاموش

ہوکر جنرل کے پاس چلا گیا۔ پانڈے خون آلود تلوار اور بندوق لیے برابر چلا رہا تھا۔

''اٹھو بھائیو۔ اٹھو! دیش کی آزادی کے لیے۔ دین کی حفاظت کے لیے۔!

کچھ دیر بعد جنرل ہیرسی چند گوروں کے ساتھ آیا، جب سپاہی اس کے حکم سے بھی گرفتار کرنے کے لیے نہ بڑھے تو وہ خود آگے بڑھا اور گارڈ والوں اور جمع دار کو ساتھ لے کر آنے کا حکم دیا۔ مگر کوئی ہلا بھی نہیں۔ جب جنرل نے تیسری بار حکم جاری کیا تو حکم دیا تب وہ اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مگر منگل پانڈے نے ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بندوق کا رخ اپنی طرف کر لیا۔ موت بہتر تھی دشمن کے ناپاک ہاتھوں میں جانے کے مقابلے میں۔ اس کا زخمی جسم زمین پر گر پڑا۔ انگریز افسران بہادری اور بے خوفی کی یہ حیرت انگیز مثال دیکھ کر حیران رہ گئے۔ منگل پانڈے پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس پر زور ڈالا گیا کہ وہ خفیہ انقلابی جماعت کے راز اور سازش کرنے والوں کے نام بتلا دے، مگر اس بہادر نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اسے مقتول انگریزی افسروں سے کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی۔ پھانسی کا حکم ہوا۔ مگر پورے بارک پور میں ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی اسے پھانسی دینے کے لیے نہ مل سکا۔ مجبوراً کلکتے سے چار جلاد بلائے گئے اور 8 اپریل 1857ء کی صبح کو اس کو سپاہیوں کے سامنے لا کر پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے تختے پر بھی اس بہادر نے یہی کہا کہ وہ خفیہ جماعت کے لیڈروں کے نام ہرگز نہ بتائے گا۔

نئے کارتوسوں کی خبریں اب پنجاب تک جا پہنچی تھیں کیونکہ بارک پور کے سپاہی تمام ملک کی رجمنٹوں سے خفیہ خط و کتابت کر رہے تھے اور ان کو ہدایت کر رہے تھے کہ وہ نئے کارتوس لے کر اپنا مذہب خراب نہ کریں۔ افواہ تھی کہ لارڈ کیننگ یہ عہد کر کے آیا ہے تمام ہندوستان کو تین سال میں عیسائی بنا دے گا۔ ماہِ مارچ میں یہ افواہ بھی تیزی سے گشت کر رہی تھی کہ سرکاری حکم سے گائے اور سؤر کی ہڈیاں پیس کر آٹے میں ملا دی گئی ہیں اور وہ فروخت کیا جا رہا ہے۔ یہ خیال اس وجہ سے اور بھی پختہ ہو گیا کہ اس آٹے کا بھاؤ پہلے سے کافی سستا تھا۔

جذبۂ بغاوت

19 رجمنٹ کے سپاہی بھی جذبۂ بغاوت سے سرشار تھے۔ چنانچہ ان کو بھی 34 رجمنٹ کے باغیوں کی طرح ہتھیار چھین کر برخاست کر دیا گیا۔ جب انگریز افسروں نے ان سے کہا کہ وہ اپنی وردی وغیرہ واپس کر دیں اور ٹوپیاں جو کہ وہ اپنے پاس سے خریدا کرتے تھے، رہنے دیں کیونکہ یہ ان ہی کی ملکیت ہیں تو پر جوش سپاہیوں نے نہ صرف یہ وردیاں اتار اتار کر پھینک دیں، بلکہ تمام ٹوپیاں بھی حقارت سے ہوا میں اچھال دی گئیں اور ان کو پاؤں سے روند ڈالا گیا۔ اس دوران میں ملک کے مختلف حصوں میں آگ لگنے کی وارداتیں بھی ہونے لگیں۔ 16 اپریل کو انبالے میں ہسپتال اور پھر شراب کا گودام جل کر راکھ ہو گیا۔ اس کے بعد چند روز کے اندر اندر متعدد عمارتیں نذر آتش ہو گئیں۔ یہاں انگریز کمانڈر ان چیف انسن رہتا تھا مگر باوجود کوشش کے بھی آگ لگانے والوں کا پتہ نہ چل سکا۔ مجبور ہو کر کمانڈر ان چیف نے گورنر جنرل کیننگ کو توجہ دلائی اور آخر اپریل میں پھر لکھا کہ ہم ابھی تک مجرموں کا پتا لگانے میں ناکام ہیں۔ اپریل کے آخر تک ملک کے دوسرے شہروں، دہلی، لکھنؤ، میرٹھ وغیرہ میں بھی سرکاری عمارتیں نذر آتش ہونے لگیں۔ انبالے کی طرح لکھنؤ کے تمام سپاہیوں نے بھی یکم مئی 1857ء کو کارتوس کاٹنے سے انکار کر دیا۔

ان کے چہروں پر ترش روئی کے آثار تھے تاہم وہ بالکل پرسکون تھے۔ آخر کار انگریز افسروں کے سمجھانے بجھانے سے وہ کارتوس کاٹنے پر تیار ہوگئے۔ مگر انگریز بریگیڈیر پر بھوت سوار تھا۔ سپاہی بغاوت کریں یا نہ کریں، وہ "انگریزی نادر شاہی" دکھانا ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ آٹھ بجے وہ پریڈ پر بلائے گئے ان کو چاروں طرف سے مسلح گورے فوج نے آ کر گھیر لیا اور ان کے سامنے توپ خانہ نصب ہوا۔ ان پر گولہ باری کے لیے مہتابیں روشن کی گئیں۔ یہ دیکھ کر ان میں سے زیادہ تر سپاہی جان بچانے کے لیے بھاگے تو "بہادر" گوروں نے ان کا پیچھا کیا۔

(حوالہ محاربہ عظیم، مصنف کنہیا لال)

اچانک اور قبل از وقت

انقلابی لیڈروں اور کارکنوں نے متحدہ بغاوت کی اسکیم بنائی تھی اور اس کے لیے 31 مئی 1857ء کی شام مقرر کی تھی مگر میرٹھ میں تاریخ مقررہ سے پہلے ہی 10 مئی کو بغاوت پھوٹ پڑی اور اس طرح تمام بنی بنائی اسکیم ملیامیٹ ہو کر رہ گئی۔

23 اپریل سے میرٹھ میں آگ لگنے کی وارداتیں شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ 23 کو آمتھ کے خیمے اور اسپتال میں آگ لگی اور 24 کو ہندوستانی سپاہ نے نئے کارتوس لینے سے انکار کیا۔ مگر ان کے اس عاجزانہ اعتراض نے انگریز افسران کو چراغ پا کر دیا۔ 6 مئی کو وہ پھر جمع کیے گئے، گورا فوج مسلح ہو کر کھڑی ہوئی، توپ خانہ جمایا گیا اور حکم صادر ہوا کہ "کارتوس کاٹنا پڑیں گے" ہندوستانی افسروں نے معذرت کی سرکار معاف فرما دیں مگر پھر وہی حکم صادر ہوا۔ پھر عاجزانہ انکار تھا۔ حکم پھر دیا گیا، سپاہی کارتوس چھونے کو بھی تیار نہ تھے۔ لہٰذا ہتھیار لے لیے گئے گھوڑوں سے اتار دیا گیا۔ نوے میں سے پچاسی ہندوستانی فوجی افسران جو کارتوس چھونے سے انکاری تھے، چھاؤنی بھیج دیے گئے اور کورٹ مارشل شروع ہوا۔ اس دوران میں روزانہ رات کو سرکاری دفتروں اور فوجی عمارتوں میں آگ لگنے کی وارداتیں 9 مئی تک ہوتی رہیں۔ فوجیوں میں روز مشورے بھی ہوتے تھے۔ صدر بازار کے عوام بھی ان کے شریک تھے۔

9 مئی فیصلے کا دن تھا۔ چنانچہ اس دن صبح کو "ملزموں" کو پریڈ پر لایا گیا، تمام ہندوستانی فوج جمع کی گئی۔ فیصلہ جو بلند آواز میں سنایا گیا، یہ تھا کہ دس دس سال قید سخت۔ اور اس کے بعد ان 85 افسروں کی، جو پنی فوج کی ناک سمجھے جاتے تھے وردیاں پیچھے سے پھاڑ دی گئیں، فوجی سنگینوں کے پہرے میں اور تمام سپاہیوں کے سامنے نہایت حقارت سے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال دی گئیں اور ان کے فوجی نشانات چھین لیے گئے۔ اس طرح ذلیل کر کے ان کو جیل بھیجا گیا۔

ہندوستانی سپاہی چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے اور پیچ و تاب کھاتے رہے۔ کر بھی کیا سکتے تھے۔ گورا فوج کی سنگینیں گھیرے ہوئے تھیں اور توپ خانہ سامنے۔ مگر جب وہ اپنے گھروں پر پہنچے تو عورتوں کا جذبہ غیرت ابل پڑا۔

> "تم مرد ہو؟ تم سے تو ہم عورتیں اچھی۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ تمہارے سامنے تمہارے افسران کو ہتھکڑیاں پڑیں اور تم کھڑے دیکھا کیے۔ تم سے کچھ نہ ہو سکا!! لو یہ چوڑیاں پہن لو اور

ہتھیار نہیں دو۔ ہم افسران کو چھڑائیں گی۔'' (مارش مین، ''داستان غدر'')

کون تھا جس کا ضمیر طعن و تشنیع کے یہ تیر کھا کر بیدار نہ ہوتا۔ کون تھا جس کا خون صنف نازک کے یہ جملے سن کر نہ کھولتا۔ ماؤں نے اپنے بیٹوں کو، دلہنوں نے اپنے شوہروں کو اور بہنوں نے بھائیوں کو انگریز فوج سے لڑنے پر آمادہ کیا۔ حتیٰ کہ صدر بازار کی طوائفوں نے ان فوجیوں کو غیرت دلائی جو شام کو تفریح کی غرض سے جاتے تھے۔'' (''باغی میرٹھ'' صفحہ 25)

تمام رات سپاہیوں میں خفیہ مشورے ہوئے اور فوراً بغاوت کا پروگرام بنایا گیا۔ رجمنٹ 20 کا اصرار تھا کہ انگریزوں کا قتل عام، مگر باقی سپاہی اس کے حق میں نہ تھے، رات انہی بحثوں میں بیت گئی۔ دہلی کو آدمی روانہ کر دیئے گئے کہ ہم 11 مئی کو پہنچیں گے، اگلے دن 10 مئی کو اتوار تھا۔ افواہ تھی کہ اب باقی سپاہیوں کا بھی یہی حشر ہوگا۔ شہر میں اشتہارات بھی چسپاں ہوئے۔

دس مئی

دس مئی کی صبح آ گئی۔ انگریز اطمینان سے اتوار منا رہے تھے۔ شام کو گرجوں کی گھنٹیاں بجیں، تمام افسر اور دیگر انگریز جمع ہوئے۔ اگر ہندوستانی سپاہی اس وقت گرجے پر حملہ آور ہوتے تو افسران کی بوٹیاں بھی ہاتھ نہ آتیں مگر انقلابی سپاہیوں کا یہ مقصد نہ تھا۔ اس لیے وہ جیل کی طرف گئے اور اپنے 85 افسران کو آزاد کرا لیا۔ یہاں بھی وہ جیل کے افسران سے کچھ نہ بولے، نہ ستایا، نہ ہاتھ اٹھایا۔

گرجا کی عبادت ختم ہوئی اور گورا فوج پریڈ پر جمع ہونے لگی۔ انقلابی سپاہیوں نے یہ دیکھ کر کہ گورا فوج ان کے مقابلے کی تیاری کر رہی ہے۔ اپنی چھاؤنی میں آگ لگا دی۔ کرنل فنس جو ابھی تک غرور و نخوت سے سرشار تھا، یہ ہنگامہ دیکھ کر سپاہیوں کے پاس آیا اور نہایت پر غرور انداز میں دھمکیاں دینے لگا۔ سپاہیوں نے کہا: ''ہمارے سامنے سے چلے جاؤ۔'' مگر کرنل فنس طاقت و حکومت کے نشے میں چور تھا۔ چنانچہ اور بھی پر غرور لہجے میں دھمکانے لگا۔ رجمنٹ 20 تو پہلے ہی قتل عام کی حامی تھی، اسی رجمنٹ کے ایک سپاہی کی گولی نے فنس کا گھمنڈ خاک میں ملا دیا۔

پہلی جنگ آزادی کا آخری معرکہ

اب تو ہر طرف سے یہی آواز آتی تھی کہ ''مارو فرنگی کو'' چنانچہ فرنگی کو چن چن کر مارا گیا، شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شہری و دیہاتی عوام بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے ہتھیار لے کر ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ انگریزوں کے مکانات راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ گورا فوج نے انقلابیوں پر گولہ باری کی، رات بھر مقابلہ ہوتا رہا، باغی سپاہی اور شہر کی عوام جوش و غصے سے بے قابو ہو چکے تھے۔ صرف ایک آواز تھی جو ان کے کھولتے ہوئے خون کی ترجمانی کر رہی تھی۔

''مارو فرنگی کو''۔۔۔ دہلی اور میرٹھ کے درمیان ٹیلی گراف کے تار کاٹ دیئے گئے۔ ریلوے لائنوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ تقریباً تمام انگریزی افسر مع غرور کے خاک میں ملا دیئے گئے۔

میرٹھ کے عوام تو یہاں انگریز سے سوسالہ انتقام لیتے رہے اور باغی فوج اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق رات ہی میں دہلی کی طرف مارچ کرنے لگی۔ وہ مختلف راستوں سے روانہ ہوئے اور ایک طے شدہ مقام پر مل گئے تاکہ انگریزی فوجیں مقابلہ نہ کر سکیں۔ ان کی مختلف پیدل و سوار ٹولیاں یکے بعد دیگرے دہلی کی طرف روانہ ہونے لگیں۔ اب چاندنی رات میں انقلابی سپاہی پوری آن بان کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

دو ہزار ہتھیار بند ہندوستانی سوار میرٹھ سے چل کر 11 مئی 1857ء کو صبح آٹھ بجے دہلی پہنچ گئے۔ دہلی میں کمپنی کی فوج کا انگریز افسر کرنل ریلے خبر پاتے ہی 54 نمبر کی ہندوستانی پلٹن کو جمع کر کے باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ آمنا سامنا ہوتے ہی جس وقت میرٹھ کے سواروں نے ''انگریز حکومت غارت ہو'' شہنشاہ بہادر شاہ کی فتح ہو'' کے نعرے بلند کئے تو دلی کے سپاہی بجائے حملہ کے آگے بڑھ کر اپنے میرٹھ کے بھائیوں کے ساتھ گلے ملنے لگے۔ کرنل ریلے گھبرا گیا اور فوراً وہیں پر مار ڈالا گیا۔ دلی کی فوج کے سب انگریز افسر مار ڈالے گئے۔ دونوں مل کر کشمیری دروازے سے دلی میں داخل ہوئیں۔ تمام انگریزوں کے بنگلے جلا دیئے گئے۔ اتنے میں میرٹھ کی پیدل فوج اور توپ خانہ بھی دلی پہنچ گیا۔ میرٹھ کے توپ خانے نے لال قلعہ میں داخل ہوتے ہی شہنشاہ بہادر شاہ کے نام پر 21 توپوں کی سلامی دی۔ فوج کے ہندوستانی افسروں نے شہنشاہ بہادر شاہ کو جا کر سلام کیا اور میرٹھ کا سب حال کہہ سنایا۔ ان افسروں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ میٹ کاف لکھتا ہے کہ شہنشاہ نے ان سے کہا کہ ''میرے پاس کوئی خزانہ نہیں، میں آپ لوگوں کو تنخواہ کہاں سے دوں گا؟'' سپاہیوں نے جواب دیا ''ہم لوگ ہندوستان بھر کے انگریزی خزانے لا لا کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔'' بوڑھے شہنشاہ نے جنگ آزادی کی راہنمائی منظور کر لی اور سارا قلعہ ''شہنشاہ زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ دلی کے ہزاروں شہری انقلابیوں کے ساتھ مل گئے۔ جو انگریز جہاں ملا، اسے وہیں ختم کر دیا گیا۔

دہلی میں گولا بارود کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جب انگریز فوجی افسروں نے دیکھا کہ اسے بچانا مشکل ہے تو انہوں نے اس ذخیرے میں آگ لگا دی۔ جس سے ایک ہزار توپوں کی ایک ساتھ چلنے کی آواز آئی۔ ساری دہلی کے مکان ہل گئے۔ آگ لگانے والے انگریز اسی آگ کے اندر جل کر خاک ہو گئے۔ اور اسی کے ساتھ 25 ہندوستانی اور آس پاس کی گلیوں میں رہنے والے 300 شہری ٹکڑے ہو کر اڑ گئے۔ 16 مئی 1857ء کو مسلمانوں کے دور اقتدار کے برصغیر کا دارالحکومت دہلی پوری طرح کمپنی کے ہاتھوں سے آزاد ہو گیا اور بہادر شاہ ظفر پھر سے دلی کا عملی شہنشاہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ باقی ہندوستان پر اس کا بہت اثر پڑا۔ نانا صاحب اور انقلاب کے دوسرے رہنماؤں نے بہادر شاہ ہی کے نام پر تمام ہندوستان کے راجاؤں، سپاہیوں اور رعایا کو انگریزوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی۔ بہادر شاہ کا جھنڈا ہی اس وقت ہندوستان بھر کے انقلابیوں کا جھنڈا تھا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میرٹھ، دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ان دنوں ایک ایک انگریز کو چن چن کر مارا گیا۔ مگر ایک بھی انگریز عورت کی توہین انقلابیوں کی طرف سے نہیں کی گئی۔ اس کے ثبوت میں ہم صرف کمپنی کی خفیہ پولیس کے بڑے افسر آنریبل سر ولیم میور کے سی۔ ایس آئی کا بیان نیچے دیتے ہیں۔ وہ لکھتا

ہے کہ: ''چاہے اور کتنا ہی ظلم اور خون خرابہ کیوں نہ ہوا ہو۔ جو قصے انگریز عورتوں کی بے عزتی کے پھیل گئے تھے وہ سب جہاں تک میں نے دیکھا اور تحقیقات کی، بالکل بے بنیاد تھے۔''

میرٹھ اور دہلی کی طرح شمالی ہندوستان کی قریب قریب ہر چھاؤنی میں جنگ آزادی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پنجاب کے انگریز عہدے داروں نے بڑی مستعدی اور دور اندیشی سے ہندوستانی فوجیوں کے ہتھیار لے لیے اور اس میں انہیں سکھوں کی تازہ بھرتی کی ہوئی فوج سے بہت مدد ملی۔ سکھوں نے اور پنجاب اور سرحد کے بعض پہاڑی قبائل نے اس جنگ آزادی میں آخر تک انگریزوں کا ساتھ دیا۔ خصوصاً پنجاب کے سکھ سرداروں نے اسی جاں فشانی سے وفاداری کا حق ادا کیا کہ معلوم ہوتا تھا انگریزوں نے چند سال پہلے جو ہزاروں سکھ جوان مار کر ان کی حکومت چھینی تھی، وہ کوئی بہت بڑا احسان تھا۔

بنگال اور نربدا کے جنوب یعنی دکن کے علاقوں میں کوئی قابل ذکر ہنگامہ نہیں ہوا، لیکن مالوہ اور بندھیل کھنڈ اس آگ کے اثرات سے محفوظ نہ رہے۔ بلکہ ان علاقوں میں بہت دن تک اس کے شرارے بھڑکتے رہے اور یہاں امن وامان کے قائم ہونے میں سب سے زیادہ عرصہ لگا۔ اس طوالت کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ان تھوڑی سی انگریزی یا دیسی فوجوں کو، جو وفادار تھیں، سب سے پہلے شمالی ہند کے باغیوں سے جنگ کرنی پڑی، جن کے دہلی، لکھنؤ اور کانپور میں تین بڑے جنگی مرکز بن گئے تھے۔ دہلی میں باغی سپاہیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اس شہر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن بادشاہ کی عمر 80 سال سے متجاوز تھی ایسے ضعیف العمر آدمی سے نظم ونسق کو چلانے اور باغی فوجوں کے مختلف دستوں میں ربط وترتیب پیدا کرنے کی کیا توقع ہوسکتی تھی جب کہ شروع ہی سے اس عضو معطل کی طرح کٹھ پتلی فرماں روا بنے رہنے کی وجہ سے اسے ایسے کاموں کا تجربہ ہی حاصل نہ ہوسکا تھا۔ اس کے ایک پرجوش فرزند مرزا مغل نے بطور سپہ سالار کام کرنا شروع کیا تھا، مگر وہ بھی شہر اور بیرون شہر کوئی انتظام قائم نہ کر سکا۔ ڈیڑھ دو مہینے کی سخت بدنظمی اور افراتفری کے بعد بریلی کی ایک فوج دہلی پہنچی جس کی تعداد چودہ ہزار کے قریب تھی۔ اس میں صرف کمپنی کے باغی سپاہی نہیں تھے بلکہ بہت سے تازہ مجاہدین بھی بھرتی کیے گئے تھے۔ اس فوج کا سپہ سالار بخت خاں روہیلہ تھا۔ جسے تمام افواج آزادی کا سپہ سالار اعظم تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بخت خاں کمپنی کی ملازمت میں ایک معمولی افسر رہ چکا تھا۔ اور اس حیثیت سے فن سپہ گری کے متعلق اسے کوئی پیشہ ورانہ علم حاصل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس انگریزی فوج کا بڑی قابلیت کے ساتھ مقابلہ کیا جس نے دہلی کا محاصرہ کر لیا تھا اور جو سامان حرب اور تربیت نیز پیشہ ورانہ لیاقت میں ہر طرح برتری رکھتی تھی، ہر اعتبار سے برتر انگریز فوج کے مقابلے میں باغیوں کی فوج کئی لحاظ سے کمزور تھی۔

خاص شہر دہلی میں صدہا اشخاص مفت میں انگریزوں کے لیے جاسوسی کی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور ان کی حکومت قائم کرا دینے کے لیے بے قرار معلوم ہوتے تھے۔ اس قسم کے حالات میں دہلی والوں کا زیادہ عرصے تک انگریزوں کے مقابلے میں جمے رہنا دشوار تھا اور دہلی کے انگریزوں کے ہاتھوں فتح ہوتے ہی باغیوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔

جنگ آزادی کے سب سے بڑے معرکے اودھ میں ہوئے جہاں باغیوں نے کچھ عرصے کے محاصرے کے بعد کانپور اور لکھنؤ دونوں شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اور لکھنؤ کی گورا فوج اور انگریز عہدیدار بچ کر نکل گئے لیکن کانپور کے انگریزوں کو محاصرے کی سخت تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ کانپور میں باغیوں کی سربراہی دھوندو پت عرف نانا صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ جولائی 1857ء میں انگریزی فوج نے کانپور فتح کرلیا تھا لیکن نومبر میں اسے گوالیار کی تازہ دم باغی افواج کے ہاتھوں شکست کھا کر شہر چھوڑنا پڑا۔ اس شہر پر انگریزوں کا حتمی قبضہ دسمبر کے آخر میں ہوا۔ پھر تین ماہ کی جنگ و کشمکش کے بعد مارچ 1857ء میں لکھنؤ پر بھی انگریز قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نانا صاحب اور اس کے بعض ساتھی بچ کر نیپال کی طرف نکل گئے لیکن اودھ میں باغیوں کی بڑی فوج باقی نہیں رہی تھی۔ جب بریلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو روہیل کھنڈ بھی دوبارہ ان کی گرفت میں آگیا۔ اور 1857ء کے اختتام تک اس طرف کا تمام علاقہ انگریز پھر سے فتح کر چکے تھے۔

سب سے آخر میں انگریزوں کو مالوے اور بندھیل کھنڈ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی اور یہاں ان کے مشہور سپہ سالار سرہیوروز نے پہلے اندور، دھار، ساگر وغیرہ مقامات پر باغی سپاہیوں کو شکست دی اور آخر میں جھانسی پر یلغار کی، جہاں کی بیوہ رانی لکشمی بائی نے اپنی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے بڑی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ رانی کے پاس تقریباً بیس ہزار سپاہی جمع ہو گئے تھے اور نانا صاحب اس کا مؤید و مددگار تھا اور سب سے بڑی کمک ان فوجیوں سے پہنچ رہی تھی۔ جنہوں نے کالپی کو اپنا جنگی مرکز بنالیا تھا۔ ان فوجیوں میں سب سے بڑی تعداد گوالیار کے باغی سپاہیوں کی تھی جہاں اس زمانے میں ریاست کی فوجیں برطرف کر کے ایک ''امدادی فوج'' انگریز افسروں کی ماتحتی میں متعین کردی گئی تھی، لیکن سپاہی جنگ آزادی شروع ہونے پر انگریز افسر کی اطاعت سے انحراف کرتے ہوئے باغی ہو گئے تھے۔ ریاست اودھ کی فوج کے بہت سے برطرف شدہ سپاہی بھی ان سے آملے تھے۔ آخر میں خود نانا صاحب کا مشہور سپاہی فوجی سردار تانتیا توپی اسی لشکر میں چلا آیا تھا۔ اور کالپی کے مرکزی مقام سے شمالی مالوہ، اودھ اور بندھیل کھنڈ میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ کو تقویت پہنچا رہا تھا۔

اپریل 1858ء میں سرہیوز نے جھانسی پر حملہ کیا۔ تانتیا توپی، رانی کی مدد کے لیے آیا تھا مگر اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ رانی کو بھی شہر چھوڑ کر کالپی کی طرف ہٹنا پڑا اور انگریز سپہ سالار نے جھانسی کی تسخیر کے بعد کالپی پر پیش قدمی کی۔ اس شہر کے قریب پہنچتے پہنچتے انگریز فوج سے باغیوں کی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ مگر ہر جگہ انہیں شکست ہوئی۔ پھر کالپی سے منتشر ہوکر وہ گوالیار کے قریب جمع ہوئے اور اس شہر پر قابض ہو گئے۔ جس میں بہت توپیں اور جنگی سازوسامان موجود تھا۔ سرہیوروز اپنے خیال میں کالپی کی لڑائی میں جنگ کا خاتمہ کر چکا تھا لیکن باغیوں کے گوالیار میں جمع ہونے کا سن کر ادھر بڑھا جہاں انگریزوں اور باغیوں کے درمیان ایک خون ریز جنگ ہوئی جس میں باغی ہار گئے۔ جھانسی کی رانی مردانہ وار لڑتی ہوئی ماری گئی (جون 1858ء) تانتیا توپی بھاگ گیا مگر زندہ گرفتار ہوا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ جنگ آزادی کے سلسلے کی یہ آخری لڑائی تھی۔ اس کے بعد باغی سپاہی کسی جگہ بڑی تعداد میں جمع نہ ہو سکے۔ اور آہستہ آہستہ آئندہ سال کے شروع تک یہ جنگ بالکل ختم ہوگئی۔ گجرات، راجپوتانہ، بنگال، اڑیسہ اور

جنوبی ہند کے علاقوں میں کوئی قابل ذکر لڑائی نہ ہوئی۔ ریاست حیدر آباد اور نیپال سے خود انگریزوں کی مدد کے لیے فوجی دستے بھیجے گئے اور سکھوں نے عام طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا حالانکہ چند ہی سال پہلے کمپنی نے ان کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو کچھ جنگ یا ہنگامہ ہوا وہ برصغیر کے وسطی اور شمالی علاقوں میں ہوا۔ اور ان علاقوں میں نہ صرف فوجوں نے بغاوت کی بلکہ جابجا عوام نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اور چند ماہ تک کمپنی کی حکومت کا سارا تسلط اور انتظام درہم برہم کر ڈالا۔ ہر مقام کی جنگ کی تفصیلات لکھی جائیں تو پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اور اس موضوع پر بڑی ضخیم کتابیں لکھی بھی گئیں ہیں۔ اس جنگ کو شروع کرنے کے لیے اہل برصغیر نے بڑی عمدہ منصوبہ بندی کی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ یہ منصوبہ بندی بڑی لاجواب تھی اگر اس کے مطابق جنگ شروع ہو سکتی تو اس کی کامیابی کے 99 فیصد امکانات تھے لیکن بعض ایسے واقعات رونما ہوئے کہ طے شدہ طریق کار کے مطابق کام نہ کیا جا سکا جس کا نتیجہ جنگ آزادی کی ناکامی اور اہل پاک و ہند کے دردناک مصائب کی شکل میں رونما ہوا۔

جہاد کے لیے علمائے کرام کا فتویٰ

1857ء کے غدر یا جنگ آزادی کے اسباب کا تجزیہ سرسید احمد خان نے اپنے مشہور کتابچے "اسباب بغاوتِ ہند" میں کیا تھا، جس کا خلاصہ پیش کیا جا چکا ہے۔ معروف تاریخ دان باری علیگ نے اپنی تصنیف "کمپنی کی حکومت" میں اس ہنگامے کے اسباب اقتصادی عوام اور پیداواری عناصر پر انگریزی اجارہ داری اور بٹتی ہوئی جاگیر شاہی (جو محنت کی خون پسینے کی روزی کمانے سے کتراتی ہے) کے ردعمل میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ سرسیّد کے سیاسی اور باری علیگ کے معاشی تجزیئے اپنی اپنی جگہ درست، لیکن مولانا سیّد محمد میاں کا مذہبی تجزیہ بھی بہت درست ہے۔ وہ اپنی تالیف "علمائے ہند کا شاندار ماضی" میں رقم طراز ہیں:

> "یہ ہنگامہ اضطراب تھا، دین و ایمان کے ماننے والوں، دھرم اور مذہب کے پابند پاک نفوس اور پاک وطن خدا پرستوں کے پاک جذبات و احساسات کا۔"

ممکن ہے کہ بعض جاگیرداروں اور نوابوں نے اس "ہنگامے" میں اس لیے حصہ لیا ہو کہ انہیں انگریزوں کے ہاتھوں اپنی جاگیریں اور علاقے چھینے کا رنج تھا، لیکن تحریک آزادی کے عام کارکنوں اور علمائے کرام کا مقصد صرف ایک تھا، حق کی آواز بلند کرنا اور حق کا ساتھ دینا۔ یہاں ہم صرف ان علمائے کرام کا ذکر کر رہے ہیں، جنھوں نے حق و باطل کی اس جنگ میں حق کا ساتھ دیا۔ ان علماء کا ذکر مطلوب نہیں، جنہوں نے یہ قرار دیا کہ انگریزوں کے خلاف لڑنا جہاد نہیں، بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ چونکہ جہاد کے لیے ضروری وسائل اور مکمل تیاری نہیں، اس لیے جہاد کے لیے نکلنا جائز نہیں۔ ایسے علماء سے جہادی علماء نے کہا تھا کہ کیا ہمارے وسائل، اصحابِ بدر سے بھی گئے گزرے ہیں جو سر بہ کفن کفار کے مقابلے پر آ گئے تھے، لیکن اکثر علماء نے پھر بھی اپنی رائے پر اصرار کیا اور جہاد کو غیر ضروری اور نامناسب قرار دیا۔

علمائے کرام کے درمیان ہم آہنگی اور اتفاق رائے نہ ہونے سے قوم میں ذہنی انتشار پھیلا اور جہاد کے

مقاصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ تاہم بعض باہمت علماء نے تمام مشکلات اور کٹھن حالات کے با جود شاہراہ حق پر چلتے ہوئے جہاد کے فتوے پر دستخط کئے، جس کا صاف مطلب تھا، پھانسی یا عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا۔ ایک فتویٰ بہت پہلے شاہ عبدالعزیز نے بھی جاری فرمایا تھا، جس میں ہندوستان کو غلبۂ نصاریٰ کے سبب دارالحرب قرار دیا گیا تھا۔ شاہ صاحب کے فتوے کی روشنی میں سیّد احمد بریلوی نے ہجرت اور جہاد کا راستہ اختیار کیا تھا، تاہم شاہ عبدالعزیز کے فتوے میں صراحت کے ساتھ جہاد کا کوئی ذکر نہ تھا۔

مئی 1857ء میں جب میرٹھ سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا شعلہ بھڑکا اور دہلی آزادی کی جدوجہد کا مرکزی محاذ قرار پایا تو علمائے کرام کو بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی و دینی رہنمائی کے لیے آگے آنا پڑا۔ ایک نقطۂ نظر جسے سرسیّد احمد خان اور بعض علماء نے پیش کیا، یہ تھا:

''انگریز حاکم وقت ہے۔ مسلمان اس کی پناہ میں ہیں (مستامن ہیں)۔ پس اطاعت واجب ہے اور غدر حرام۔''

تاہم مسلمان عوام میں اس خیال کو پذیرائی حاصل نہیں ہوئی اور عام طور پر اس نقطۂ نظر کو رد کر دیا گیا۔ دوسری طرف جو فتویٰ جہاد کے حق میں دیا گیا، اسے خیبر سے لے کر کلکتہ تک مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور جگہ جگہ اس کی نقلیں ہاتھ سے لکھ کر تقسیم کی گئیں۔ اس فتوے کے متعلق سرسیّد کی رائے یہ تھی:

''دہلی میں جو فتویٰ جہاد کا چھپا ہے، وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے، مگر میں نے تحقیق سے سنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔''

ایک طرف سرسیّد (حالات کے تقاضوں کے تحت شکست خوردہ اور زوال آمادہ مسلمانوں کو فاتح انگریزوں کے عتاب سے بچانے کے خیال سے) اس فتوے کو بے اصل اور بے بنیاد کہتے ہیں، دوسری طرف ساتھ ہی وہ کہتے ہیں کہ بھلا علمائے کرام کس طرح بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے کو شرعاً قبول کر سکتے ہیں، جب کہ یہی علماء بادشاہ کو بہت برا اور بدعتی سمجھتے ہیں۔ درحقیقت علماء نے جو فتویٰ دیا تھا وہ جہاد کا فتویٰ تھا، صرف انگریزوں کے خلاف۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی مقتدر حیثیت بے شک برائے نام تھی، لیکن بہرحال مغلیہ سلطنت اگر قائم رہتی تو غیر ملکی سامراج کے تسلط کے مقابلے میں ہزار درجے قابل قبول ہوتی۔ اصل فتویٰ جو تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ تھا:

سوال: ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟''

جواب: علمائے کرام کی طرف سے جو جواب دیا گیا، وہ یہ تھا: ''درصورت مرقومہ، فرض عین ہے۔ اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے واس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت/ مقابلہ اور لڑائی ہے، بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے، اور مہیا اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے، تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و احوال کے لوگوں پر جو دور ہیں، باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ

باہر ہو جائیں مقابلے سے، یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جاوے گا، اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو گا، اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض عین ہو جائے گا بشرطیکہ ان کی طاقت کرے"۔

فتوے کے اثرات

یہ ایک مختصر سا فتوی تھا، لیکن اس کے اثرات بہت طویل تھے۔ اس فتوے پر 33 علمائے کرام نے اپنی ذاتی مہروں کے ساتھ دستخط کیے تھے۔ یہ علماء کی فہرست میں مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے اپنے وقت کے مشہور علماء شامل تھے۔ یوں بھی اس زمانے میں دہلی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی بہترین صلاحیت جمع ہو گئی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ علماء نے جہاد کے فتوے پر دستخط کیے تھے، بلکہ اکثریت نے انگریزوں کے خلاف عملی جہاد میں حصہ لے کر امام ابن تیمیہؒ کی روایات کو تازہ کیا۔ خصوصیت سے مفتی صدر الدین آزردہ (جو بلند پایہ شاعر بھی تھے) اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی نے جہاد بالسیف کیا۔ مولوی رحمت اللہ کے خلاف انگریزوں کو اس بات کا بھی غصہ تھا کہ وہ مناظروں میں فنڈر جیسے بڑے عیسائی پادریوں کو پچھاڑنے کی شہرت رکھتے تھے اور عقیدہ تثلیث کے رد میں عقلی دلائل پیش کیا کرتے تھے۔ جب دہلی میں بغاوت شروع ہوئی تو مولانا رحمت اللہ دہلی آئے، تاکہ وہاں جہاد میں حصہ لیں، لیکن انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جنرل بخت خان اور مغل شہزادوں کے درمیان باہمی کشاکش کی وجہ سے جہاد کا مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔ انگریزوں نے اپنی فتح کے بعد ایک "ہٹ لسٹ" تیار کی جس میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا نام سب سے اوپر لکھا تھا، لیکن مولانا ان کے ہاتھ نہ آسکے اور حجاز چلے گئے۔ تاہم انگریزوں نے ان کی لاکھوں کی جائیداد ضبط کر کے ان کے خاندان کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دیا۔

مفتی صدر الدین آزردہ البتہ گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا، بڑی مشکل سے رہائی ہوئی، مگر جائیداد ضبط ہو گئی۔ بڑی مشکل سے آدھی جائیداد واگزاشت ہوئی، لیکن کتب خانہ واپس نہ ہوا جہاد کے دوران میں مفتی صاحب کی ایک آنکھ زخمی ہو جانے سے بیکار ہو گئی تھی۔

فتوے پر دستخط کرنے والے علماء میں سے اکثر اس وقت شہید ہو گئے جب 14 ستمبر 1857ء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے نیچے نمازیوں اور فاتح انگریزی فوج کے درمیان معرکہ ہوا۔ انگریزی فوج کی کمان سر تھامس مٹکاف کر رہا تھا۔ خواجہ حسن نظامیہ اپنی تالیف "دلی کی جان کنی" میں لکھتے ہیں: "جامع مسجد میں اس وقت ہزار ہا مسلمان نماز کے لیے جمع تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ انگریز مسجد کو بارود سے اڑانا چاہتے ہیں۔ ان سب کے پاس تلواریں تھیں۔ بندوقیں نہ تھیں، ان کا ایک آدمی مکمبر پر چڑھا اور اس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا: "تمہارے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے۔ جس کو مرنا ہو، وہ میرے ساتھ شمالی دروازے کی طرف آئے، اور جس کو جان پیاری ہو، وہ جنوبی دروازے کی طرف چلا جائے کہ ادھر دشمن کی فوج نہیں ہے۔ یہ تقریر سن کر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ان میں سے ایک بھی جنوبی دروازے کی طرف نہیں گیا۔ ان سب نے تلواریں میان سے کھینچ لیں۔ سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر شمالی دروازے کی طرف بڑھا۔ مٹکاف کی فوج نے بندوقوں کی ایک باڑھ

ماری، جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے۔ مسجد کی سیڑھیاں ان کی لاشوں سے بھر گئیں، مگر مسلمان تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر اس پھرتی سے آگے بڑھے کہ مڈکاف کو دوسرے گروپ کو مارنے کی مہلت نہ ملی اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی۔''

سقوط دہلی کے خوں چکاں واقعات کے چشم دید گواہ راقم الدولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں: ''غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر گلیوں کے بازار میں پہنچا تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا، جیسے لکڑیوں کی ایک ٹال لگی ہوئی ہے، اور وہ موقع ہے، جہاں چار ماہ پہلے مجھے ایک مست درویش مجذوب نے بتایا تھا کہ یہاں کشت و خون ہوگا۔ وہاں سے آگے بڑھا تو لاشیں پڑی نظر آئیں۔ (حوالہ: داستانِ غدر)

بعض مصنفین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں اہم ترین کردار ایک خاص مکتب فکر کے علماء کا تھا۔ اس سلسلے میں ''وہابی مجاہدین'' کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق سیّد احمد شہید کی جماعت مجاہدین کی باقیات سے تھا۔ بعض مؤرخین نے اس تحریک کے پس پردہ دار العلوم دیو بند کے اکابر اور بانی بزرگوں (مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور ان کے پیرو مرشد حاجی امداد اللہ مکی) کی کاوشوں کو دریافت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق و باطل کی اس جنگ میں کسی خاص مکتب فکر کا کوئی اجارہ نہ تھا۔ جن علماء نے مذکورہ بالا فتوے پر دستخط نہ کئے تھے، انہوں نے براہِ راست جہاد بالسیف سے نہ سہی، لیکن انہوں نے اپنے جذبۂ حریت کا اظہار کسی اور ذریعے اور طریقے سے کیا۔

جس وقت 1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا، اس وقت سیّد احمد شہید کے تربیت یافتہ مجاہدین کے مختلف چھوٹے چھوٹے گروہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سرگرم عمل تھے۔ تحریک آزادی کا سب سے بڑا مجاہد اور سپہ سالار جنرل بخت خان جماعت وہابیہ سے منسلک تھا۔ جب انگریزوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بے اعتمادی اور عدم موافقت، زرخرید مخبروں کی غداری اور جدید اسلحے کے زور پر دہلی پر قبضہ کر لیا تو اسی جنرل بخت خان نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو دہلی سے باہر چلے جانے اور انگریزوں کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا مشورہ دیا تھا، لیکن بادشاہ نے مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ جیسے غداروں کے کہنے سننے پر یہ مخلصانہ مشورہ نہ مانا اور اپنا سارا خاندان تباہ و برباد کرالیا۔

اہل حدیث علماء میں سے مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولوی سرفراز علی اور مولوی نذیر حسین کا نام جہاد کے فتوے پر دستخط کرنے والوں کی فہرست میں بھی شامل ہے۔ ان میں سے بیشتر حضرات کو انگریز سرکار کے خلاف بغاوت کے ''جرم'' میں سنگین سزائیں دی گئیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ، 1857ء کی جنگ حریت میں حصہ لینے والوں میں تمام مکاتیب فکر کے زعماء اور افراد شامل تھے، ان میں شیعہ بھی تھے اور سُنّی بھی تھے۔ اہل سُنّت میں وہ علماء بھی تھے اور جو ولی اللہی روایات کے امین تھے، یعنی اکابر دیوبند اور وہ بھی عرب میں ''وہابیت'' کی تحریک سے متاثر تھے اور انگریز انہیں ''وہابی'' کہتے تھے۔ علاوہ ازیں شاہ اسماعیل شہید کے بدعات و رسوم کے خلاف سخت موقف سے اتفاق نہ کرنے والے علماء بھی تھے، جن کی ترجمانی بعد میں مولانا احمد رضا خان بریلوی نے کی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانانِ ہند کے زبردست امتحان میں کلمۂ حق کہنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان سب کے تذکرے کے لیے تو الگ دفتر کھولنے کی ضرورت ہے۔

آئندہ صفحات میں مولوی محمد جعفر تھانیسری، مولانا فضل حق خیر آبادی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے حالات اور قربانیوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری

مولوی محمد جعفر تھانیسری سیّد احمد شہید کی تحریک کے خاص رکن تھے انہوں نے تحریک مجاہدین کے سلسلے میں جانی و مالی قربانیاں پیش کیں۔ معرکہ امبیلا کے بعد 1864ء میں بغاوت اور سازش کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا، جائیداد ضبط اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، مگر انہوں نے فرنگی استبداد کے خلاف استقامت کا مظاہرہ کیا اور ابتلاو آزمائش میں پورے اترے۔

ابتدائی حالات

مولوی محمد جعفر تھانیسری (ضلع انبالہ) کے باشندے تھے۔ والد کا نام میاں جیون تھا۔ آرائیں قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ تقریباً 1832ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہوئی، جلد ہی والد کا انتقال ہو گیا۔

تعلیم

محمد جعفر نہایت ذہین وذکی تھے۔ جب تعلیم کی طرف میلان ہوا تو نہایت ذوق وشوق اور کوشش وسعی کا مظاہرہ کیا۔ مولوی جعفر کی تعلیم کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں، مگر اندازہ ہے کہ مروجہ فارسی تعلیم سے جلدی فراغ حاصل کر لیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ عربی کی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی ہو، عام طور پر ہم عصر لوگوں نے ان کو منشی محمد جعفر لکھا ہے۔ اس سے خیال ہوا کہ عربی تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہوئی ہوگی۔

مولوی جعفر کی تعلیم اس نہج پر ہوئی کہ خواص ادویہ سے بھی مناسبت ہو گئی چنانچہ جب بعد میں انبالہ جیل میں بیمار ہوئے اور انگریزی دواؤں سے فائدہ نہ ہوا تو ڈاکٹر کے کہنے سے اپنے لیے مربہ سیب، مربہ بہی، شربت انار، شربت بنفشہ، نیلوفر اور ورق نقرہ وغیرہ وغیرہ عمدہ عمدہ مزید اور مفرح دوائیاں تجویز کیں اور ان دواؤں سے خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

مولوی محمد جعفر کو قرآن وحدیث سے خاص شغف تھا۔ تین سیپارے حفظ یاد تھے۔ حدیثیں تو سینکڑوں یاد

تھیں، تہجد کی نماز کے بچپن سے عادی تھے۔ بچپن سے نماز تہجد کے عادی ہونے میں ان کے والدین کی مذہبی زندگی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ مولوی محمد جعفر کی والدہ نہایت راسخ العقیدہ خاتون اور سنّت کی پابند تھیں۔ جس زمانے (1864ء) میں مولوی صاحب قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے، ان بزرگ خاتون کو سانپ نے کاٹ کھایا، لوگوں نے سانپ کے علاج کے لیے مشرکانہ رسوم تجویز کیں تو انہوں نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا: "میرے گھر سے شرک و بدعد مدت سے اٹھ گیا ہے اب میں اپنے بیٹے کی غیر حاضری میں اپنے گھر میں شرک نہ ہونے دوں گی۔ ایسی بے ایمانی کی حیات سے موت افضل ہے۔"

مئی 1864ء میں اس دین دار خاتون کا انتقال ہو گیا۔

عرائض نویسی

مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی محمد جعفر نے 1856ء میں مقامی عدالتوں میں عرائض نویسی شروع کر دی اور تھوڑی ہی مدت میں قانون دانی میں ایسا کمال حاصل کر لیا کہ تمام عرائض نویس اور وکلاء عدالتی قوانین اور ضوابط کے متعلق ان سے مشورے لینے لگے۔ یہاں تک کہ مولوی محمد جعفر کی دور دور شہرت ہو گئی اور قرب و جوار کے بعض زمینداروں نے ان کو اپنا قانونی مشیر مقرر کر لیا۔ مولوی محمد جعفر کی قانون دانی اور مہارت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مقدمۂ انبالہ میں کوئی وکیل پیروی کے لیے مقرر نہیں کیا بلکہ خود ہی جواب دہی کی، جرح و بحث میں اس قدر مہارت تھی کہ جب انہوں نے گواہوں سے سوالات کیے تو وہ جوابات سے تنگ آ گئے۔

مولوی محمد جعفر کے والد میاں جیون کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا، وہ ایک مرفہ الحال شخص تھے۔ مولوی محمد جعفر کا جب 1856ء میں نکاح ہوا تو انہوں نے اپنے حصہ کی کل جائیداد مہر کے عوض میں اپنی بیوی کے نام لکھ دی۔ مولوی محمد جعفر نے عرائض نویسی اور قانون دانی کے ذریعہ بھی کافی دولت اور شہرت حاصل کی۔ زمینداری اور جائیداد پیدا کی۔ تھانیسر سے ایک میل کے فاصلے پر ان کی زمینداری تھی۔ مولوی محمد جعفر اپنی مالی حالت پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں: "میں ہزاروں روپے کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ پر قابض تھا۔ بیسیوں آدمی میری رعیت رہتے تھے، ایسے بڑے شہر کا نمبردار گھوڑے اور گاڑیوں میں سوار پھرتا تھا۔ ہر کام کے میرے گھر میں نوکر چاکر رہتے تھے۔" مولوی صاحب کی شادی پانی پت میں ہوئی تھی۔ گرفتاری کے وقت دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا محمد صادق ان کی اسیری میں فوت ہو گیا۔

تحریک مجاہدین سے تعلق

مولوی محمد جعفر علمائے صادق پور کی تحریک کے خاص رکن تھے، مولوی عنایت علی کے سرحد ہجرت (1265ھ بمطابق 1849ء) کرنے کے بعد جب جماعت کا نظام مولوی یحییٰ علی کے سپرد ہوا تو مولوی محمد جعفر ان کی زیر ہدایت اپنے "فرائض" انجام دینے لگے۔ بلکہ ہنٹر کی رائے ہے کہ مولوی یحییٰ علی کی تعلیم و تحریک ہی سے وہ تحریک جہاد میں شریک ہوئے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھتا ہے "جعفر بہت

دور دراز تک پھیلی ہوئی وہابی سازش میں شریک ہو گیا۔ اس کے خفیہ فرائض نے اس کے نفرت انگیز پیشے کو بھی مقدس بنا دیا کیونکہ وہ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ میں نے اس کام کو ایک خاص آدمی کے حکم کے مطابق اور ایک خفیہ مقصد کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ خاص شخص پٹنہ کا مولوی یحییٰ علی ہندوستان میں وہابیوں کا پیشوا تھا کہ مہابن کی وہابی نو آبادی کو رنگروٹ اور اسلحہ بہم پہنچائے جائیں جو اس وقت اعلانیہ حکومت سے برسرِ پیکار تھے۔"

بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ مولوی محمد جعفر 1850ء سے قبل اس تحریک میں ذمہ دارانہ طور پر شریک ہو چکے تھے اور اس کے عواقب و نتائج کا بھی ان کو کسی قدر اندازہ تھا اسی لیے انہوں نے اپنے نکاح کے دن ہی اپنے حصے کی جائیداد حفظ ما تقدم کے طور پر اپنی بیوی کے مہر میں لکھ دی تھی۔

1857ء میں جنگ آزادی میں مولوی عنایت علی نے نہایت عزم و ارادہ کے ساتھ مردانہ وار حصہ لیا۔ مجاہدین کی قیادت کی اور انگریزی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کیں، جس کے نتیجے میں نوشہرہ اور مردان کے فوجیوں میں کچھ شورش و بغاوت ہوئی اور نارنجی کی جنگ کا واقعہ پیش آیا۔ ہنٹر کا بیان ہے کہ 1857ء کے ہنگامے میں مولوی محمد جعفر اپنے چند معتمد ہمراہیوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف (مولوی عنایت علی کے پاس) گئے۔ اور نہایت قابلیت کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا۔ لیکن جب دہلی میں ستمبر 1887ء باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں تو محمد جعفر تھانیسر واپس آ گئے۔

مولوی محمد جعفر تحریک جہاد کے رکن عظیم اور ایک بڑے راز دار تھے۔ ان کا اصطلاحی نام "پیرو خاں" یا "پیرو خلیفہ" تھا۔ سرحد کو روپیہ اور مجاہدین ان کے ذریعے جاتے تھے۔ پیامبر اور مجاہدین ان کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ رازدارانہ خط و کتابت ان کے ذریعے ہوتی تھی، حقیقت یہ ہے کہ سرحد اور صادق پور کے مرکزوں کے درمیان تھانیسر بھی ایک خاص مرکز تھا۔ مولوی محمد جعفر اکابر صادق پور کے معتمد علیہ اور ان کے راز ہائے سربستہ کے امین و محافظ تھے۔ شمس العلماء میاں نذیر حسین دہلوی وفات (1903ء) سے بڑے تعلقات تھے چنانچہ جب 1865ء میں میاں نذیر حسین راولپنڈی میں نظر بند ہوئے تھے ان کے کاغذات میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کے بھی تین خط نکلے۔

گرفتاری و مقدمہ

ایک سپاہی غزن خان نے مخبری کی تو حکومت کو یہ یقین ہو گیا کہ سرحد پر مجاہدین کے پاس رقم اور آدمی مولوی محمد جعفر کے ذریعہ سے بھیجے جاتے ہیں۔ 12 دسمبر 1863ء کو ان کی خانہ تلاشی ہوئی مولوی محمد جعفر فرار ہو گئے۔ ان کی گرفتاری کے لیے دس ہزار روپے کا اشتہار جاری ہوا۔ آخر علی گڑھ سے گرفتار کر کے انبالہ لائے گئے۔ مقدمہ چلایا گیا۔ 2 مئی 1864ء کو مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط ہوئی اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ مولوی محمد جعفر نے کسی قسم کی پریشانی اور رنج کا اظہار نہیں کیا، بلکہ نہایت خوش اور مطمئن رہے۔ مقدمے میں مولوی محمد جعفر نے نہایت استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا۔ مولوی محمد جعفر کو لالچ بھی دیا گیا اور زدوکوب سے بھی واسطہ پڑا مگر ایمان کی لذت سے سرشار ہر قدم پر ثابت قدم رہے۔ جج نے مولوی محمد جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے فیصلہ ان الفاظ میں سنایا: "تم بہت عقل مند ذی علم اور قانون داں اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو، تم نے اپنی

ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعے سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلۃً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی، اس واسطے تم کو پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

اور آخر میں یہ کلمہ بھی کہا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔

مولوی محمد جعفر نے مردانہ وار جواب دیا: ''جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے۔ آپ کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔''

مولوی محمد جعفر کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئی اور چند روز کے بعد جج اپنی موت مر گیا۔

چیف کورٹ میں اپیل کی گئی۔ 19 دسمبر 1864ء کو اپیل کا فیصلہ سنا دیا گیا، پھانسی حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل ہوگئی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ان جہاد و حریت کے نقیبوں کو مسلسل شدائد و مصائب کا شکار کیا جائے۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ان کو خراج عقیدت اس طرح پیش کرتا ہے: ''جعفر علی عرضی نویس اور یحییٰ علی رئیس المسلمین نے اپنی وفاداری کا کہیں جھوٹا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کیں۔ وہ بڑے باصول اور مخلص انسان تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا جس کو ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا، لہٰذا اب جب کہ انہوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی ہے، تاریخ ان کے اس انجام کو پرُرحم جذبات کے ساتھ یاد کرے گی۔''

ستمبر 1864ء سے فروری 1865ء تک مولوی محمد جعفر انبالہ جیل میں رہے۔ 22 فروری 1865ء کو لاہور جیل روانہ ہوئے۔ آخر کار اکتوبر 1865ء کو انڈیمان روانگی ہوئی۔ لاہور سے ملتان، سکھر، ٹھٹھہ اور کوٹری سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ ایک ہفتہ کراچی جیل میں رہے، پھر بذریعہ بادبانی جہاز بمبئی روانہ ہو گئے۔ وہاں تھانہ جیل میں ایک ماہ رہے۔ 8 دسمبر 1865ء کو وہاں سے بھی روانگی ہوگئی۔ 11 جنوری 1866ء کو مولوی محمد جعفر نے سرزمین انڈیمان پر قدم رکھا اور زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

جزیرۂ انڈیمان کی زندگی:

مولوی محمد جعفر کے جہاز سے اترتے ہی اس تحریک کے ایک ممتاز رہنما مولانا احمد اللہ شاہ اور ان کے ساتھیوں نے استقبال کیا۔ مولانا احمد اللہ (1881ء) چھ ماہ پہلے انڈیمان پہنچ چکے تھے۔ مولوی محمد جعفر مولانا احمد اللہ کے ہمراہ منشی غلام نبی محرر کے مکان پر پہنچے۔ وہاں مولوی محمد جعفر کی بیڑیاں کاٹی گئیں اور عمدہ لباس پہنایا گیا۔ منشی اکبر زماں، اکبر آبادی کی کوشش سے چیف کمشنر کے دفتر میں ''محرر سیکشن ور'' یا ''نائب میر منشی'' مقرر ہو گئے۔ تنخواہ کے علاوہ رہنے کو مکان اور خدمت کو ایک غلام ملا۔ کسی قسم کی کوئی پابندی نہ رہی جہاں چاہیں آئیں، جہاں چاہیں جائیں۔

جب مولوی محمد جعفر انڈیمان پہنچے، اس وقت ان کی عمر 27 سال تھی، عین عالم شباب تھا۔ پہلے اپنے اہل و عیال کو وطن سے بلانے کی کوشش کی جب اس میں ناکام رہے تو انہوں نے وہیں ایک کشمیری خاتون سے نکاح کر لیا۔ 30 اپریل 1868ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ بیوی نہایت دیندار اور متبع سُنّت تھیں، مولوی یحییٰ علی کی مریدہ تھیں،

مولوی محمد جعفر نے الہ آباد کی ایک برہمن زادی سے شادی کی۔ مولوی صاحب نے پہلے اس کو اسلام کی دعوت پیش کی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔ 15 اپریل 1870ء کو نکاح ہوا۔ اس بیوی سے دس اولادیں ہوئیں جن میں آٹھ زندہ تھیں اور یہی مولوی محمد جعفر کے ہمراہ ہندوستان آئیں۔

مولوی محمد جعفر نے ملازمت کے ساتھ تجارت بھی کرنی چاہی مگر اس میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ تین سو روپے کا مال دہلی سے منگوایا۔ جو دو سال میں ان کے پاس پہنچا اس میں ڈیڑھ سو روپے کا خسارہ ہوا۔ دوسری مرتبہ ان کی ہنڈی بنگالیوں نے پکڑوا دی کیونکہ ملازم سرکار کو تجارت کی اجازت نہ تھی۔ مولوی محمد جعفر نے اپنے سابقہ تعلقات و روابط کی بنا پر شمس العلماء مولوی نذیر حسین دہلوی سے خط و کتابت جاری رکھی۔ مختلف اوقات میں کتابیں منگوائیں، مذہبی فتوے اور مسئلے پوچھے۔ تجارت کے سلسلے میں دہلی سے جو چیزیں منگائی گئی تھیں وہ مولوی نذیر حسین ہی کے ذریعے سے منگائی تھیں اور ان کو لکھا تھا کہ یہ تمام سامان خرید کر کلکتہ میں مولوی احمد علی کے پاس بھیج دیا جائے۔ مولوی نذیر حسین دہلوی سے ایک فتوی پوچھا گیا کہ ایک عورت، جس کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی ہے اس کی رہائی کی کوئی امید نہیں ہے اور وطن میں اس کا شوہر زندہ ہے تو ایسی صورت میں انڈیمان میں اس عورت کا نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ اس زمانے میں جزیرۂ انڈیمان میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مولوی محمد جعفر نے اپنے مکتوب مورخہ 29 اپریل 1967ء (موصولہ دہلی اگست 1867ء) کے ذریعے مولوی رحمت اللہ کیرانوی (ف 1308ھ 1890ء) کی ایک کتاب ''رد نصاریٰ'' منگوائی۔

مولوی محمد جعفر انڈیمان کا تمام زمانۂ اسیری ملازمت میں گزرا۔ پہلے جزیرۂ پریسوٹرنس میں رہے۔ جنوری 1868ء میں ہدو جزیرہ کو تبادلہ ہوا اور وہاں اسٹیشن محرر مقرر ہوئے۔ فروری 1870ء میں لارڈ میو کا قتل ہوا تو مولوی محمد جعفر کو صدر جزیرہ روس بلا لیا گیا۔ جون 1876ء میں جزیرۂ ابرڈین کو بحیثیت میر منشی تبادلہ ہو گیا اور غالباً وہیں آخر وقت تک رہے۔ مولوی صاحب نہایت محنت اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے۔ تمام حکام ان پر اعتماد کرتے تھے۔ میجر پرتھرو لکھتا ہے۔

> ''میں فروری 1869ء سے محمد جعفر کو جانتا ہوں۔ اس وقت سے آج تک جہاں کہیں مجھ کو موقع اس کے چال چلن کے دریافت کرنے کا ملا ہے میں نے اس کو ایک بے نظیر اور لاثانی آدمی پایا ہے۔ یہ شخص بڑا علم دوست اور نہایت جفاکش آدمی ہے پورٹ بلیر میں اس نے علم انگریزی بھی سیکھ لیا ہے کہ اس کو نہایت عمدگی سے پڑھتا، لکھتا اور بولتا ہے۔ اور بہت سے موقعوں میں جہاں جہاں یہ سرکاری کچہری میں رہا ہے نہایت کارآمد سرکار رہا ہے۔۔۔۔
> اور جب کسی کام کے واسطے اس کو حکم ملا ہے تو ہمیشہ نہایت خوشی سے اس نے اس کو انجام دیا ہے، اور کیسا ہی کسی قدر کام ہو، میں ہمیشہ اس کو اس کے کرنے میں کمربستہ تیار پاتا ہوں۔''

مولوی محمد جعفر کے اعمال نامے میں صرف چار قابل اعتراض واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے جو درج ذیل ہیں:

1۔ 12 جنوری 1867ء کو ایک گمنام درخواست سپرنٹنڈنٹ (جزیرہ) کو بھیجی جس میں جھوٹ اور بے نام کن اطلاع تھی اس کے نتیجہ میں سپرنٹنڈنٹ کے دفتر سے برخاست ہوئے اور بطور سزا تیسرے درجے کے ملازمین میں تبدیل ہو گئے۔

2۔ 4 جنوری 1868ء کو جھوٹی شکایت کرنے پر پانچ روپے جرمانہ ہوا۔

3۔ 9 جون 1875ء کو ایک یورپین سپاہی کے کپڑے خریدے جس پر ان کو تنبیہ ہوئی۔

4۔ 19 اگست 1882ء کو سپرنٹنڈنٹ کے جاری کردہ کسی قانون کی تعمیل نہیں کی جس کی بنا پر وہ حکم عدولی کے جرم میں نامزد کیے گئے۔

انڈیمان میں بحیثیت قیدی کے مولوی محمد جعفر کا نمبر (11450) تھا۔

مولوی محمد جعفر نے ایک شخص رام سروپ سے انگریزی پڑھی اور ایک سال کے عرصے میں اس زبان میں لکھنے پڑھنے اور بولنے میں خاصی مہارت حاصل کر لی مولوی محمد جعفر فرصت کے اوقات میں فارسی، اردو، ناگری زبانیں انگریزوں وغیرہ کو سکھایا کرتے تھے، اس لیے انگریزوں سے باہمی ربط وضبط رکھنے اور ترجمہ و مشق کی وجہ سے انگریزی کی استعداد خاصی پختہ ہو گئی، یہاں تک کہ وہ انگریزی میں عرضی اور اپیل بھی لکھنے لگے اور اس سے ان کو کافی مالی منفعت بھی ہوئی۔ جزائر انڈیمان میں ان کے سوا کوئی دوسرا مسلمان انگریزی خواں نہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مقدمات میں بڑی مدد کی، یہاں تک کہ بعض کی پھانسیاں منسوخ ہوئیں غرض انگریزی جاننے کی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کی بڑی گراں قدر خدمات سرانجام دیں، انگریزی زبان کی اہمیت کے متعلق محمد جعفر لکھتے ہیں:

> ''جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے بخوبی ماہر نہیں اور بے انگریزی سیکھے پکا دنیا دار اور طرار نہیں ہو سکتا اور نہ سوائے اس زبان کے آج کل کوئی آلہ زر کمانے کا ہے۔''

انڈیمان کی نو آبادی میں مختلف اقوام، ممالک اور مذاہب کے لوگ تھے، اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ ان میں اکثریت ہندوستان کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام استعمال کی زبان اور دفتری زبان ہندوستانی (اردو) قرار پائی مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں:

> ''جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو اپنی اپنی زبان میں بات چیت کرتے ہیں مگر بازار اور کچہریوں کی زبان یہاں ہندوستانی ہے، اس واسطے ہر آدمی کو خواہ وہ کسی ملک کا ہو۔ ہندوستانی زبان سیکھنا ضروری پڑتا ہے بلکہ بے سیکھے تھوڑے روز کے بعد ہر آدمی خود بخود ہندوستانی بولنے لگتا ہے کیونکہ جب تک کوئی آدمی ہندوستانی نہ بولے اس کا گزارا نہیں ہو سکتا۔''

رہائی:

مولوی محمد جعفر نے رہائی کے لیے بہت کوشش کی مگر بے سود۔ 15 اگست 1883ء کو مولوی عبدالرحیم صادق پوری (1922ء) کی بیوی مسماۃ جمیلہ نے اپنے شوہر کی رہائی کی درخواست دی جس کے نتیجہ میں ''وہابی کیس'' کے

جملہ ملزمان کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس وقت ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ رپن تھے۔ جن کا تعلق لبرل جماعت سے تھا، ان کی حکومت نے "وہابی کیس" کے جملہ ملزمان کی رہائی منظور کر لی، چنانچہ 30 دسمبر 1881ء کو ان کی رہائی کی اطلاع مولوی محمد جعفر کی بیوی کو پانی پت میں مل گئی۔

22 جنوری 1883ء کو رہائی کا حکم محمد جعفر کو انڈیمان میں ملا۔ مگر ان کی بیوی کو بھی عمر قید کی سزا ہوئی تھی اور ابھی صرف 14 سال گزرے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی رہائی کی درخواست دی، یکم مئی 1883ء کو ان کی بیوی کی رہائی کا حکم بھی آ گیا۔ اتفاق سے ان کو اس وقت چھ ماہ کا حمل تھا، لہذا چھ ماہ مزید ٹھہرنا پڑا اس دوران میں محمد جعفر نے اپنا تمام اسباب فروخت کیا اور مکان کو وقف کر کے مسجد بنانی چاہی جس کی ڈپٹی کمشنر نے اجازت نہیں دی۔

9 نومبر 1883ء کو سترہ سال دس ماہ بعد انڈیمان سے ایک بیوی آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپیہ نقد لے کر ہندوستان روانہ ہوئے۔ 13 نومبر 1883ء بمطابق 14 محرم 1301ھ کو کلکتہ پہنچے اور مولوی عبدالرحیم کے بھائی مولوی عبدالرؤف کے پاس چیناپاڑے میں دو روز ٹھہرے۔ 20 نومبر 1883ء کو رات کے نو بجے انبالہ چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچے۔ تقریباً اٹھارہ سال کے بعد اس مرد مجاہد کو سرزمین وطن دیکھنی نصیب ہوئی۔

انبالہ میں سکونت و انتقال:

مولوی محمد جعفر بازار انبالہ کیمپ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگے۔ اس زمانہ میں مولوی جعفر کے ایک شاگرد کپتان ٹمپل کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھا۔ کپتان ٹمپل نے ان کی بڑی مدد کی۔ اپنی ضمانت پر حکومت کی عائد کردہ پابندیاں ختم کرائیں۔ بیس روپے ماہانہ اپنی طرف سے مقرر کر دیئے۔ دوسرے انگریزوں کو پڑھانے سے تیس روپے مل جاتے تھے۔ اپریل 1886ء میں کپتان ٹمپل کا تبادلہ ہو گیا تو مولوی جعفر پر پولیس کی نگرانی ہو گئی لیکن فروری 1888ء میں خود بخود حکومت نے یہ پابندیاں محمد جعفر کے اوپر سے ختم کر دیں۔ انبالہ میں مولوی محمد حسین بٹالوی 1338ھ نے محمد جعفر تھانیسری سے ملاقات کی مگر ساتھ ہی ساتھ اپنی عدم واقفیت کا بھی ذکر کر دیا۔

مولوی تھانیسری کافی مطمئن تھے۔ پھر مولوی محمد جعفر تھانیسری نواب عظمت علی خان رئیس کرنال (26 دسمبر 1908ء) کے یہاں مختار عام ہو گئے تھے۔

1905ء میں انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے مولوی محمد اسماعیل وکیل انبالہ 1947ء کے فسادات میں غیر مسلموں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

تصانیف

مولوی محمد جعفر کو تصنیف و تالیف سے خاص شغف تھا کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں کالا پانی (تواریخ عجیب) اور سوانح احمدی کافی مشہور ہیں۔

تاریخ پورٹ بلیر (تاریخ عجیب)

اس کتاب کا تاریخی نام "تاریخ عجیب" ہے۔ یہ کتاب اپریل 1879ء میں مکمل ہوئی۔ دراصل یہ کتاب دو

حصوں پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلا حصہ تو جزائر انڈیمان و پورٹ بلیر کے حالات و واقعات سے متعلق ہے اور دوسرے حصہ میں ان جزائر انڈیمان میں بتیس مشہور زبانوں کے روزمرہ کی ضروریات کے چھوٹے چھوٹے جملے اور اسماء ''خالق باری'' کے طرز پر اردو جملوں کے ساتھ لکھے ہیں یہ کتاب 8/20×26 کے 228 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے سبب تالیف کے متعلق مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں:

''مدت دراز سے بہت سے صاحب لوگوں کی مجھ سے زبان اردو، ناگری اور فارسی سیکھتے تھے، یہ فرمائش تھی کہ اردو مروجہ پورٹ بلیر میں کوئی ایک کتاب تصنیف کی جائے کہ جس سے یہاں کے لوگوں کو اردو سیکھنے میں مدد ملے اور اس کے سوائے اور بہت سے لوگوں کی مدت سے یہ تمنا تھی کہ ایک کتاب تاریخ پورٹ بلیر جس میں یہاں کی آبادی اور اوضاع و اطوار و بندوبست و قانون و زبان مختلفہ پورٹ بلیر و حال جنگلی جزائر ہذا کا مفصل درج ہو۔ تصنیف کر کے غیر جانبدار ہند کے لوگوں کو بھی یہاں کے عجائبات سے آگاہ کیا جائے سوان دونوں غرضوں سے رفع ہو جانے کے واسطے اس خاکسار محمد جعفر میر منشی سدرن ڈسٹرکٹ نے یہ تمام کتاب تحریر کر کے اس کا تاریخی نام تاریخ عجیب رکھ دیا۔

سوانح احمدی:

یہ کتاب سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے اکابر خلفاء کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے، سیّد صاحب کے حالات پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو اس قدر تفصیل سے لکھی گئی اور اس موضوع پر دوسری کتابوں کے لیے بنیادی مواد ثابت ہوئی۔ سوانح احمدی پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سیّد صاحب کی پیدائش، ایام طفولیت، تعلیم و تربیت، فیوض باطنی اور سفر حج کا ذکر ہے یعنی 1200ھ سے 1240ھ تک کے حالات آگئے ہیں۔ دوسرے باب میں ان کی تعلیمات کا بیان ہے۔ یہ باب گویا صراط مستقیم کا لب لباب ہے تیسرا باب 1241ھ سے 24 ذی قعدہ 1246ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کی سپاہیانہ زندگی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا حال ہے اور ان تمام معرکوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ جو سکھوں وغیرہ سے پیش آئے، چوتھے باب میں نامور خلفاء کی فہرست اور ان کے ضروری حالات درج ہیں پانچویں باب میں سیّد شہید کے وہ مکاتیب ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً روساء و خوانین وغیرہ کو لکھے تھے۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی کہ مؤلف نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اول تا آخر سکھوں کے خلاف تھی انگریزوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور سیّد احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے سرگرم ارکان کو انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرخاش نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر جماعت کے خاص راز دار تھے۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹایا، ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے محروم ہوئے، بیوی بچے چھٹے، عزت و دولت سے محروم ہوئے۔ زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگلوں اور پہاڑوں (جزائر انڈیمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ جب کالے پانی سے رہا ہو کر آئے تو پولیس کی

پابندیوں اور تنگ دامانیوں سے بھی واسطہ پڑا ان حالات اور مصائب و آلام کا یہ ردعمل ہوا کہ انہوں نے اس موقع پر مصلحت کے قلم سے نقش و نگار بھرنے کی کوشش کی ہے ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں اور ظاہر ہے۔

کالا پانی:

حقیقت میں یہ کتاب تاریخ پورٹ بلیر کا دوسرا حصہ یا تتمہ ہے جب 1884ء میں مولوی محمد جعفر انڈیمان سے واپس آئے تو احباب واعزہ نے اس طویل زمانہ اسیری کے حالات پوچھنے شروع کئے مولوی صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں اپنی گرفتاری، مقدمے، قید، سفر انڈیمان، انڈیمان کی زندگی اور رہائی کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ٹمپل پریس انبالہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد صوفی کمپنی پنڈی بہاؤالدین نے آخر سے کچھ حصہ حذف کر کے کئی ایڈیشن شائع کئے۔ قیام پاکستان کے بعد ناشرین لاہور نے شائع کی تھی۔

مولانا فضل حق خیرآبادیؒ

ایک فاضل و کامل جو درس و تدریس میں یکتاء روزگار ہے تو شعر و سخن کا استاد فن کار، محاضرہ اور مذاکرہ کے وقت میر مجلس ہے تو بساط شطرنج پر رونق محفل۔ اور کبھی ایک ہی وقت میں مدرس و معلم بھی ہے، اور استاد شطرنج بھی۔ تذکرہ علماء ہند کے مصنف رحمان علی خان صاحب 1264ء میں (جب کہ علامہ موصوف لکھنؤ میں قیام فرما تھے) ملاقات کے لیے حاضر خدمت ہوئے تو حیران رہ گئے کہ

> در بین حقہ کشی و شطرنج بازی تلمیذے را سبق ''الافق المبین'' مے داد و مطالب کتب را با حسن بیانی دلنشین مے نمود۔

شانِ جامعیت کی یہ ندرت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اگر ایک وقت مولانا اسماعیل شہیدؒ کے مد مقابل تھے تو دوسرے وقت اسی رہ پر گامزن۔ ایک وقت اگر انگریز کے وفادار اور انگریزی محکمہ کے سررشتہ دار تھے تو دوسرے وقت جہاد حریت کے علمبردار، اور کٹہرہ عدالت میں ایک سیاسی ملزم کی حیثیت سے حاضر۔ ایک طرف زندگی کا ہر ایک دور ناز و نعم، عزت و عظمت سے ہم کنار ہے تو اسی زندگی کا ایک دور پابند سلاسل اور دیار غربت میں وحشت بداماں۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

مولانا فضل حق صاحب 1212ھ (1797ء) میں اپنے آبائی وطن خیرآباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد مولانا فضل امام صاحب دہلی میں صدر الصدور تھے۔ مولانا فضل حق کی تعلیم و تربیت، آپ کے ہی زیر سایہ دہلی میں ہوئی۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بارگاہ فیض پناہ سے علم حدیث کی خوشہ چینی کی۔ تیرہ سال کی عمر میں تمام عقلی و نقلی علوم کی تکمیل کر لی۔ چار ماہ اور چند روز میں قرآن مجید

حفظ کیا۔

والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بار پڑا۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہو گئے۔

سلطنت مغلیہ کا چراغ سحری اگرچہ بے نور ہوتا جا رہا تھا مگر علم وفن کے کتنے گوہر شب تاب تھے جن کے دم سے اس زمانہ کی دلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ خاندان ولی اللہ کے جانشین مولانا شاہ اسحاق صاحب شاہ عبدالغنی صاحب، حضرت شاہ ابوسعید صاحب مجددی، حضرت شاہ غلام علی صاحب اوران ارباب فضل وکمال کے علاوہ بڑے بڑے کہنہ مشق اساتذہ شعر وسخن مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خان علوی، حکیم مومن خان مومن، مفتی صدر الدین خانزادہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خان منیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا خان عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، میر حسن تسکین اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا اسی دہلی میں تھا۔ مولانا فضل حق صاحب جیسا باکمال، ان سب کا قدر دان تھا اور یہ سب علامہ کے قدر شناس۔

اسی زمانہ کا ولی عہد ''ابوظفر بہادر شاہ'' خود بھی شعر وسخن کا شاہ تھا اور اہل علم کی قدر دانی میں بھی شاہانہ شان رکھتا تھا۔ علامہ سے اس کو یہاں تک تعلق خاطر تھا کہ جب علامہ دہلی کی ملازمت ترک کر کے جھجھر جانے لگے اور وداعی ملاقات کے لیے ولی عہد کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو بہادر شاہ نے اپنا خاص دوشالہ آپ کو اوڑھایا اور آبدیدہ ہو کر کہا:

> ''آپ فرما رہے ہیں کہ میں رخصت ہوتا ہوں۔ میں بھی مجبور ہوں، قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مگر خدائے علیم خوب جانتا ہے کہ سینکڑوں جر ثقیل کام میں لائے جائیں، تب نہیں لفظ وداع دل سے زبان تک آ سکتا ہے۔''

دہلی سے جھجھر وغیرہ

بے شک ارباب فقر اور اصحاب توکل علماء اور مشائخ کی ایک جماعت تھی جنھوں نے کمپنی کی ملازمت تو کیا مسلمان بادشاہوں کی بھی ملازمت پسند نہیں کی۔ علامہ فضل حق کا مسلک دوسرا تھا۔ آپ نے ملازمت کی مگر اس طرح کہ آپ کی نازک مزاجی نے عزت نفس، خودداری، اور وقار علم کے دامن کو کبھی میلا نہیں ہونے دیا۔ بظاہر یہی سبب تھا کہ کہیں آپ کا قیام مستقل نہیں رہا۔

ریزیڈنٹ دہلی کے یہاں جب تک سررشتہ دار رہے، عزت کے ساتھ رہے اور جب آبگینۂ عزت میں بال آنے لگا تو نہ صرف ملازمت ترک کی بلکہ دہلی کی بود وباش بھی ترک کر دی۔

علامہ کی قابلیت مشہور تھی۔ قدر دانوں سے دنیا خالی نہیں تھی۔ نواب فیض محمد خاں والی جھجھر نے موقع غنیمت جانا اور فوراً مبلغ پانچ سو روپیہ ماہانہ کی پیشکش کر دی۔ علامہ نے اس کو منظور کیا اور جھجھر تشریف لے گئے۔ ایک عرصہ تک جھجھر رہے۔ پھر مہاراجہ الور نے بلا لیا۔ الور سے آپ سہارن پور گئے۔ بعد ازاں آٹھ برس رامپور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں پہلے صدر الصدور بنائے گئے۔ جب ایک نئی کچہری ''حضور تحصیل'' کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔

مولانا امیر علی کی شہادت

مولانا لکھنؤ میں قیام فرما تھے کہ ہنومان گڑھی کے فساد، شاہ غلام حسین صاحب اور ان کے 269 رفقاء کی شہادت پھر مولانا امیر علی صاحب کی دعوت جہاد اور چھ سو مجاہدین کے ساتھ توپ دم کئے جانے کا خوں چکاں اور دل فگار حادثہ پیش آیا۔ مولانا اس عرصہ میں حکومت کی ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اور بقول مولانا عبدالشاہد خاں صاحب شروانی مصنف ''باغی ہندوستان'':

''جب مولانا امیر علی شاہ صاحب کو سمجھانے کے لیے علماء اور امراء کو بھیجا گیا تو علامہ نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب براری کی بناء پر گفتگو میں حصہ لیا۔''

یہ گفتگو ناکام ہوئی۔ مولانا امیر علی شاہ نے اپنے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ بالآخر اپنے رفقاء کے ساتھ بڑے مزے سے جام شہادت نوش کیا۔ لیکن تعجب نہ کرنا چاہیے اگر اس عجیب و غریب حادثہ سے مولانا جیسے ذکی اور ذہین و فہیم نے یہ اثر لیا کہ آپ انگریزوں کی ڈپلومیسی سے متنفر ہو کر انقلاب کی تمنا کرنے لگے کیونکہ اگر بالفرض یہ صحیح نہ ہو کہ اس پورے ہنگامہ قتل و خون اور شعبدۂ جور و جفا کے آلات و ذرائع کو پس پردہ حرکت دینے والا انگریز تھا تو اس بات کے تسلیم کرنے میں تو تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان واقعات اور حوادث سے انگریز نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پس منظر

تقریباً پوری ایک صدی ہو چکی تھی جب سے انگریزوں کی خفیہ تدبیریں شاہان اودھ کو کمزور سے کمزور تر کرنے میں مصروف تھیں اور اب ایک آخری فیصلہ کی تیاری ہو رہی تھی کہ واجد علی شاہ کو معزول اور پورے اودھ پر بلا شرکت غیرے مکمل قبضہ کر لیا جائے۔ باشندگان اودھ کے لیے اس جرعہ تلخ کو خوشگوار اسی صورت سے بنایا جا سکتا تھا کہ ہندو اور مسلمان تمام ہی باشندے واجد علی شاہ اور اس کی حکومت سے متنفر اور برافروختہ ہو جائیں۔ اس موقع پر انگریز کا یہ مقصد بہت آسانی سے پورا ہو رہا تھا۔ کیونکہ پردۂ سیمیں پر واجد علی کی شاہ کی موت تھی۔ چنانچہ ہندو اور مسلمانوں نے اسی کو ملعون اور مردود قرار دیا۔ مگر بات کی تہہ کو پہنچنے والے تو اس وقت بھی اس تماشہ کو حیرت سے دیکھ کر اس کے مضمرات کا مطالعہ کر رہے ہوں گے کہ:

''ہنومان گڑھی کے حادثہ کے وقت انگریز افسر موجود تھے مگر ایسے بے بس والا چار یا ایسے بھولے کہ بیراگیوں نے مسجد میں گھس کر 269 مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا اور ان بے چاروں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے باتیں ہی کرتے رہے۔''

قیصر التواریخ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے اپنے ایک خاص دوست کے چشم دید بیان (جو اس وقت وہاں موجود تھا) لکھے ہیں:

''اس عرصہ میں باران رحمت نازل ہوئی۔ ایک ساعت تک جدال و قتال موقوف رہی۔ اسی وقت ایک کبڑیا ہمراہی غلام حسین کے واسطے جو دو دن سے بے آب و دانہ تھے، کھانا لایا۔ کپتان ... صاحب اور جان ہرسی نے اپنے سپاہیوں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ تم کمریں کھول کر

بہت اطمینان سے جامع مسجد میں بیٹھو، باہر نہ نکلو۔ کوئی تم سے فساد نہ کرسکے گا۔ وہ کمریں کھول کر کھانا کھانے لگے۔ اب زبانی مرزا علی اعلیٰ کے ہے (جو مؤلف کتاب سے وقت روانگی کربلا کہ اس شب خاص کربلا میں میرے پاس رہے تھے) بیان کرتے تھے کہ دونوں انگریز دور میں خود اور مرزا نثار حسین مع اپنی سپاہ اور توپ وہاں سے ہٹ کر بڑی دور درخت کھرنی کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ ایک ساعت نہ گزری کہ بیراگی ہزاروں شور کیے نعرہ مارتے آکر مسجد کو گھیر لیا اور جب علی شاہ فقیر کے کوٹھے سے چڑھ کر غلام حسین کے ہمراہیوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیا اور مسجد میں آکر 269 آدمیوں کو ذبح کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔''

لیکن اسی انگریز ذات کا افسر کپتان بارلو، مولانا امیر علی شاہ کے مقابلہ میں اتنا چاق و چوبند ہے کہ نماز ظہر ختم ہونے کا بھی انتظار گوارا نہیں کیا۔ خاص نماز کے وقت گولوں کی زد پر رکھ کر ان کمزور نہتوں کے پرخچے اڑا دیئے اور جو باقی بچے، ان کو بعد میں گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ اور لطف یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ واجد علی شاہ کی حکومت کے نام پر، جو ابھی تک مولانا امیر علی کے معاملہ میں علماء سے فتوے ہی لکھوا رہا تھا۔ کیا انگریز افسروں کے اس تغافل اور اس چستی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہندو مسلمانوں میں منافرت پیدا ہو۔ واجد علی شاہ بدنام ہو اور انگریز کا بول بالا ہو۔

چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس روز مولانا امیر علی شاہ صاحب اودھ میں شہید کئے گئے، اسی روز حکومت اودھ سے واجد علی شاہ کی معزولی کا فیصلہ لندن کی پارلیمنٹ میں صادر کیا گیا۔

بہرحال یہ واقعہ بھی ایک زیرک اور فہیم کے لیے سبق آموز تھا۔ چنانچہ مولانا سید احمد شاہ صاحب نے اس سے یہی سبق لیا تھا کہ باعث فتنہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ مجبور و مقہور واجد علی شاہ، بلکہ اس فتنہ و فساد کے بیج کار پرداز ان کمپنی نے بوئے ہیں۔ وقت کا سب سے ضروری مطالبہ یہ ہے کہ ان بیج بونے والوں کو وطن سے نکالا جائے۔

اس حادثہ کے بعد ہی مولانا سید احمد اللہ شاہ صاحب آگرہ سے لکھنؤ پہنچے۔ مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات کی۔

اس کے مولانا فضل حق وہ نہیں تھے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہ اب داعی انقلاب تھے۔ لکھنؤ کو خیرباد کہا اور الور پہنچ کر نئی بساط بچھائی۔ خود مولانا فضل حق صاحب نے بھی "الشورۃ الہندیہ" میں اپنے اس فکری تبدیلی کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے اسباب میں اگرچہ اس واقعہ کا نام نہیں لیا لیکن جو سبب بیان کئے ہیں ان کے دلائل و شواہد اسی قسم کے واقعات ہو سکتے ہیں مثلاً سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ کی کوشش ہے کہ تمام مذہب بدل کر صرف ایک مذہب نصرانیت و عیسائیت باقی رکھا جائے۔ دوسرا سبب یہ کہ جملہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے وہ ہندوستانیوں کے خورد و نوش کو بھی اپنے قبضہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں سے ان کے مذہبی مراسم مثلاً ختنہ وغیرہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ہنگامہ 1857ء

1857ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو مولانا الور میں تھے۔ وہ علماء مجاہدین جو ایک عرصہ پہلے سے اپنا نصب العین

استخلاص وطن بنا چکے تھے، ابتداء میں وہ بھی متامل رہے کیونکہ یہ ہنگامہ ان کے کسی پروگرام کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کی ابتداء فوجوں کی بددلی سے ہوئی تھی اور پھر اگرچہ دہلی پر انقلابی فوجوں نے قبضہ کر کے بہادر شاہ کو بادشاہ بنا دیا تھا، مگر ان کارروائیوں میں کوئی ایسا ضبط نہیں تھا جو نظرِ شریعت میں قابل اعتماد ہو۔

جب 2 جولائی کو جنرل بخت خاں نے ایک لشکر جرار کے ساتھ دہلی پہنچ کر نظم و ضبط قائم کر دیا تو ان اصحاب الرائے علماء کو بھی اطمینان ہوا۔ اب ایک فتوی بھی مرتب کیا گیا اور بقول منشی ذکاء اللہ خان صاحب مساجد کے ممبروں پر بھی تذکرہ جہاد ہونے لگا۔

غالباً اسی کشمکش و پیچ کے سبب سے مولانا فضل حق بھی اگست سے پہلے دہلی نہیں پہنچ سکے۔ جب فتوی کی اشاعت ہوئی، تب مولانا نے بھی دہلی کا قصد فرمایا۔ خود مولانا اپنی خود نوشت سوانح قید و بند، "الثورۃ الہندیہ" میں تحریر فرماتے ہیں

> "(دہلی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا) کہ کچھ دیہات و قصبات اور شہروں سے بہادر مسلمانوں کی جماعت جدال و قتال اور غزوہ و جہاد کے لیے اٹھی۔ اس سے پہلے وہ خدا ترس تارک دنیا علماء سے ائمہ اجتہاد کے فتاوٰی کی روشنی میں وجوب جہاد کا فتوی حاصل کر چکی تھی۔

دہلی میں حضرت مولانا فضل حقؒ کی مصروفیتوں کے متعلق معلومات کا ذخیرہ صرف یہی ہے۔ اس کے ماسوا قیاس ہے۔ جس کا دامن بہت وسیع ہے۔

دہلی سے روانگی

19 ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوا۔ مولانا اور ان کے اہل و عیال پانچ روز تک کسی مکان میں بھوکے پیاسے بند رہے۔ پھر رات کی تاریکی میں اہل و عیال ساتھ لے کر نکلے اور پاپیادہ سفر کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے بھیکن پور ضلع علی گڑھ پہنچے۔ یہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی) کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل پر ہے، دریا کے پار اتر دیا پھر کچھ مدت چھپے رہے۔

گرفتاری

جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہو گیا تو مولانا بھی اس پر بھروسہ کر کے اپنے وطن خیر آباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں

> "مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کی قسم پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں خصوصاً جب کہ وہ بے دین جزا و سزا آخرت کا بھی قائل نہ ہو۔"

چند روز اطمینان سے گھر پر رہے۔ پھر دو آدمیوں نے آپ کی مخبری کر دی۔ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا۔ عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی اور تمام مال و اسباب حتیٰ کہ کتابیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ حسب ضابطہ کچھ عرصہ

ہندوستان کے جیل خانہ میں رہے۔ جہاں خود مولانا کے ارشاد کے مطابق:

''ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان واسلام پر مضبوطی سے قائم رہے اوران کا شمار علماء اعلام میں ہوتا تھا۔''

جیل کی اذیتوں کا خاکہ

مولانا نے اپنی تصنیف ''الشورۃ الہندیہ'' میں ہندوستان کے جیل خانوں، انڈیمان اور وہاں کے مصائب و تکالیف کو تفصیل سے بیان کیا ہے چند اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل ہے:

مکر وتلبیس سے جب نصاری نے مجھے قید کرلیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ، اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہیں چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرمجوش دوست تو کیا ملتا، گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت وتوہین سے کام لیا گیا۔

جزیرۂ انڈیمان

پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا۔ جس کی آب وہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گزار، پیچ در پیچ جنہیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج ومرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور ان سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت، بیماری، عام دوا ناپید اور مشکل۔ خارش اور قوبا (ایک بیماری) کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور تم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام ہلاکت کی علت تام ہے، اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت کہ مرض کچھ دوا کچھ۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل، نہ کفن، نہ دفن اور نہ نماز جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی، اور اگر

جہاں خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔
میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور قوبا میں مبتلا ہو جانا
مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن
جاتا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مولانا کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا صرف ایک لنگی اور کمبل کا کرتہ۔ کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے۔ مگر کچھ دنوں بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر تھا۔ صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب مولانا کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی اور کتابوں کے حوالے بھی درج کر دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم و فضل کا احساس ہوا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کر دی۔

علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لفٹنٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی سفارش کی تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی رہائی کا حکم ہو گیا۔ لیکن عجیب و غریب اور نہایت تکلیف دہ اور دل خراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانہ رہائی حاصل کر کے انڈیمان پہنچے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدھام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل 12 صفر 1278ھ مطابق 20 اگست 1861ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت وہاں شریک دفن ہوئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

انیسویں صدی عیسوی جن ممتاز ترین اور عظیم المرتبت شخصیتوں پر فخر کر سکتی ہے، ان سے ایک مایہ ناز اور عہد آفرین شخصیت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ہے۔ یہ زمانہ مسلمانانِ ہندو پاک کی قومی و اجتماعی زندگی کا نہایت پر آشوب دور تھا۔ انگریز رفتہ رفتہ پورے برعظیم پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے آخری معرکے میں چھ سو سالہ مغل حکومت کا خاتم ہو گیا۔ حاجی امداد اللہ بھی اس جنگ کے بڑے مجاہد تھے۔

ملک کے برگزیدہ، مقتدر اور درویش صفت بزرگوں میں حضرت حاجی صاحب نمایاں ترین شخصیت ہیں۔ 1783ء (1233ھ) میں پیدا ہوئے، ماہر استادوں کی نگرانی میں علوم کی تکمیل کی، کچھ دن سید احمد شہید کی تحریک سے متعلق رہے اور اس کے بعد آپ مکہ معظمہ پہنچے جہاں شاہ محمد اسحاق سے مشورے کے بعد واپس آئے۔ 1846ء میں شاہ اسحاق کا انتقال ہو گیا تو آپ جانشین بنائے گئے۔ ہندوستان میں یہ بڑی افراتفری کا دور تھا۔ ملک میں انگریزی ملوکیت کا سیلاب بڑھتا چلا آ رہا تھا مگر حاجی صاحب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دورے کیے اور عوام کو بتایا کہ دشمنانِ وطن کے خلاف بغاوت کا وقت آ گیا ہے۔ ان کی سحر انگیز تقریروں نے عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں آزادی اور بغاوت کی آگ لگا دی، ان کی مؤثر شخصیت نے تحریک کو تقویت پہنچائی اور جب تحریک شروع ہوئی تو آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ہمراہ شاملی (ضلع مظفر گڑھ) میں جہاد کیا۔ لیکن ناکامی پر آپ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں سے حضرت مولانا محمد قاسم اور دوسرے شاگردوں کو ہدایات بھیجتے رہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے تقریباً ڈیڑھ سال انبالہ نگری، پنجلاسہ وغیرہ، ضلع مظفر۔۔۔ ، ۔۔۔پور اور ضلع انبالہ کے دیہات میں گزارا۔ 1276ھ میں ہجرت کی۔ تبت سے روانہ ہوئے۔ سندھ کے راستے سے کراچی پہنچے اور بحری جہاز سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس سفر میں چند عجیب وغریب واقعات قابل تذکرہ ہیں جن کو حضرت حاجی صاحب کے تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ مثلاً

(1) پنجلاسہ ضلع انبالہ کے رئیس راؤ عبداللہ خان تھے۔ حکام رس، سرکار کے وفادار اور حضرت حاجی صاحب کے ارادت مند۔ پنجلاسہ پہنچ کر حضرت حاجی صاحب نے ان کے یہاں قیام کیا۔ حاجی صاحب جیسے باغی کو اپنے یہاں ٹھہرانا، تباہی اور بربادی کو دعوت دینا تھا۔ مگر راؤ صاحب کا اخلاص ہر ایک خطرہ سے بے نیاز تھا۔

قدرت کی عجائب نوازی ملاحظہ ہو کہ اس قیام کے دوران میں راؤ صاحب کا اخلاص آزمائش کی کسوٹی پر کسا گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ مخبروں نے مخبری کر دی اور صبح کے وقت جیسے ہی افق مشرق سے آفتاب نے ۔۔۔ نکالا، مجسٹریٹ

ضلع دوش لے کر راؤ صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔

حاجی صاحب نے بر سبیل احتیاط ایک ویران کوٹھڑی میں قیام فرمایا تھا جو گھوڑوں کی اصطبل کے پاس تھی۔ مخبر نے ایسی صحیح مخبری کی کہ اس کوٹھڑی تک کا پتہ بتادیا تھا۔ یہ اشراق کا وقت تھا اور حسب معمولی حاجی صاحب نماز اشراق میں مشغول تھے۔ راؤ صاحب کے لیے یہ بہت ہی نازک گھڑی تھی۔ مگر توفیق خداوندی نے حوصلہ مند راؤ صاحب کی مدد فرمائی۔ راؤ صاحب آگے بڑھے۔ گرم جوشی سے کلکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

''تشریف لائیے۔ اس وقت صبح صبح کیسے تشریف آوری ہوئی''۔ راؤ صاحب نے فرمایا۔ سخن پرور مجسٹریٹ نے کہا سنا ہے آپ کے اصطبل میں کوئی گھوڑا بہت عمدہ ہے، صاحب اسے دیکھنے آئے ہیں۔

بہت بہتر ہے۔ تشریف لائیے۔ اصطبل حاضر ہے۔ گھوڑے ملاحظہ فرمائیے۔

راؤ صاحب مجسٹریٹ بہادر کو اصطبل میں لے گئے۔ گھوڑے دکھائے۔ مجسٹریٹ بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نظر ڈالتا تھا، حیران تھا کہ راؤ صاحب پر خوف و ہراس یا گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں۔ وہ دل دل میں خیال کر رہا تھا کہ شاید مخبر نے جھوٹی خبر دی۔

اصطبل میں گھومتے ہوئے اس ویران کوٹھڑی کے دروازہ پر پہنچ گیا، جہاں حاجی صاحب قیام فرما تھے اور یہ کہتے ہوئے کہ کیا اس میں گھوڑوں کی گھاس بھری جاتی ہے، کواڑ کھلوا دیئے۔

کوٹھڑی میں چوکی پر جانماز بچھی ہوئی ہے، لوٹا چوکی کے کنارہ پر اور وضو کے پانی سے نیچے کی زمین تر ہے مگر نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔

کلکٹر صاحب نے کوٹھری کے کونہ کونہ پر نظر ڈالی۔ کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ تو پھر راؤ صاحب ہی سے دریافت کیا کہ یہ چوکی کیسی ہے؟

راؤ صاحب: میں یہاں نماز پڑھا کرتا ہوں۔

کلکٹر صاحب: اصطبل کے کنارہ، ویران اور بوسیدہ کوٹھری میں نماز پڑھنے کا کیا مطلب؟ نماز کے لیے تو مسجد ہوتی ہے۔

راؤ صاحب: ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ فرض نماز تو مسجد میں جماعت کے ساتھ کھلم کھلا سب کے سامنے ادا کریں لیکن نفلیں چھپ کر کسی پوشیدہ جگہ میں پڑھیں۔ اس لیے اشراق وغیرہ کی نفلیں میں یہاں پڑھا کرتا ہوں۔

اب کلکٹر صاحب خاموش تھے۔ رخصت ہوئے اور راؤ صاحب سے معذرت کی کوئی گھوڑا ہماری مرضی کا نہیں نکلا۔ افسوس آپ کو تکلیف بھی دی اور ہمارا کام بھی نہیں ہوا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

راؤ صاحب اس بلا کو رخصت کر کے سب سے پہلے اسی کوٹھری میں پہنچے دیکھا، حاجی صاحب چوکی پر تشریف فرما ہیں۔

(2) گڑھی پختہ جو اب ضلع مظفر نگر میں ہے اور اس زمانہ میں غالباً سہارن پور کے ضلع میں تھی، حضرت حاجی

صاحب یہاں تشریف لے گئے اور موضع کے رئیس کے یہاں قدم فرمایا۔ مخبروں نے خبر کر دی۔ مجسٹریٹ نے پولیس کپتان کو فوراً حکم لکھ دیا۔

اس علاقہ کے تھانہ دار خواجہ احمد حسین صاحب سہارن پوری تھے۔ ایس پی تھانہ میں پہنچا۔ کلکٹر کے حکم کا صرف اوپر کا حصہ جس میں تلاشی کا آرڈر تھا، دکھا دیا۔ مگر باقی حصہ جس میں ملزم اور موضع وغیرہ کا نام تھا نہیں دکھایا کہ شاید مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی صورت سے اس دوش کو ناکام کر دیں، اور پہلے ہی خبر بھیج کر حاجی صاحب کو اپنی جگہ سے غائب کرا دیں۔ بہرحال کپتان صاحب تھانیدار کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ جب گڑھی پہنچنے کے قریب پہنچے تب خواجہ صاحب کو اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب کی گرفتاری کے لیے یہ دوڑ جا رہی ہے۔ خواجہ صاحب کو معلوم تھا کہ حاجی صاحب کس کے یہاں قیام فرما ہیں۔ خواجہ صاحب نے گاؤں کے باہر سے ہی چلانا شروع کر دیا اور اس زمیندار کا نام لے لے کر دھونس جمانے لگے۔ نمک حرام تو کہاں ہے، باہر آ، آج تجھے سمجھنا ہے، تو سرکار کے باغیوں کو اپنے یہاں ٹھہراتا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ خواجہ صاحب کی آواز بلند تھی۔ رات کے سناٹے میں خواجہ صاحب کی آواز پورے گاؤں میں گونج گئی۔ زمیندار نے خواجہ صاحب کی آواز پہچان لی۔ اس نے فوراً حاجی صاحب کو ایسی جگہ پہنچا دیا کہ حاجی صاحب ہاتھ نہ لگ سکے اور دوش ناکام واپس ہوئی۔

بہرحال جہاں جہاں حاجی صاحب پہنچتے رہے پولیس آپ کا تعاقب کرتی رہی۔ مگر "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

اسی طرح ایک اور گاؤں کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت پولیس فورس بالکل بے خبری میں اس مکان پر پہنچ گئی، جہاں حضرت قیام فرماتے تھے۔ اسی کھلے ہوئے مردانہ مکان میں جہاں حضرت حاجی صاحب تشریف فرماتے تھے آپ کو لٹا کر آپ پر رضائی ڈال دی گئی۔

پولیس کو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ حاجی صاحب اس کھلے ہوئے مردانہ مکان میں ہوں گے۔ وہ پہلے زنانہ مکان کی طرف بڑھی۔ زمیندار بھی اس لے ساتھ مکان کے اندر گئے اور یہاں چیختے چلاتے اور باہر کے آدمیوں کے ڈانٹتے ہوئے کہہ گئے کہ اس بڈھے کو کھیت پر ڈال آؤ، اس نے کھانس کھانس کر بلغم سے سارا مکان گندا کر دیا ہے۔

پولیس اپنے دھیان میں مست تھی۔ چودھری صاحب کی اس زبان کو نہ سمجھ سکی اور باہر کے آدمیوں نے حاجی صاحب کی چارپائی ایسی جگہ پہنچا دی جہاں پولیس نہ پہنچ سکی۔

دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست

مکہ معظمہ میں قیام اور وفات

مختصر یہ کہ غیبی امداد اور خداوندی تحفظات کے زیر سایہ آپ حجاز مقدس پہنچے۔ وہاں پہنچ کر زہد و تقویٰ، ریاضت و مجاہدہ اور توکل علی اللہ کی وہ مثال قائم کی جس نے عہد صحابہؓ کی یاد تازہ کر دی۔ نہ صرف عجم بلکہ عرب نے بھی آپ کے سامنے گردن عقیدت خم کی۔ آج دنیائے اسلام کا ہر ذی علم آپ کو شیخ العرب والعجم کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ ان عزائم اور بلند حوصلوں کے مقابلہ پر آپ تذکرہ نویسوں کے اس بیان سے سبق لیجئے کہ آپ خلقۃً

ضعیف ونحیف اور خفیف اللحم (دبلے پتلے) تھے۔ سچ ہے اللہ تعالیٰ جس کو روحانی قوت سے نوازے۔ اس کو جسمانی قوت کی کیا ضرورت۔

12 جمادی الاخری 1317ھ مطابق 1899ء بروز چہار شنبہ بوقت صبح واصل بحق ہوئے اور مکہ معظمہ میں دفن کئے گئے۔ رحمہ اللہ ورضی اللہ۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی

مولانا رحمت اللہ کا وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا۔ اس لیے کیرانوی مشہور ہوئے۔ والد کا نام مولوی نجیب اللہ، اجداد کا اصل وطن پانی پت تھا، جہاں ان کی خاصی جائیداد بھی تھی۔ یہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ ان کے جد اعلیٰ کا نام شیخ عبدالرحمٰن عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ مولانا کے اخلاف میں سے ایک صاحب مولانا محمد عارف الاسلام، مخدوم جلال الدین کبیرالاولیا کو اپنے اجداد میں شمار کرتے ہیں۔

مولانا کی تاریخ پیدائش 1233ھ (1818ء) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ پھر دہلی چلے گئے۔ جو اس زمانے میں علم وفضل کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں بے شمار درس گاہیں تھیں۔
مولوی محمد حیات کی درس گاہ میں شامل رہے جو لال قلعے کے پاس تھی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دہلی میں لکھنو جا کر مفتی سعد اللہ سے تکمیل علوم کی۔ مولانا کے والد میرٹھ میں میر منشی تھے۔ پھر ہندو راؤ مرہٹہ کے دیوان رہے۔

عیسائیت کی تبلیغ:

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو ہر ملک سے عیسائی مبلغ ہندوستان پہنچ گئے اور انہوں نے جگہ جگہ مشن قائم کر دیے۔ مقصود یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو جلد سے جلد عیسائی بنا لیا جائے۔ تاکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں۔ اس غرض سے چھاپے خانے قائم کر لیے گئے تھے جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے متعلق ضروری کتابیں بہ کثرت چھپ چھپ کر نشر کی جاتی تھیں۔ اور ان کی قیمت بہت کم تھی، اخبار اور رسالے بھی نکلنے لگے تھے۔ لطف یہ کہ کتابیں مختلف حصص ملک کی مروجہ زبانوں میں چھاپی جاتی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔
دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام پر اعتراضات بھی کئے جاتے تھے اور مناظرے بھی ہوتے تھے۔

پادری فنڈر:

1854ء میں یورپ سے ''فنڈر'' نامی ایک پادری آیا، جسے عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور وہ اکثر اسلامی کتابیں بالواسطہ یعنی ترجموں کے ذریعے سے نہیں بلکہ بلاواسطہ پڑھ چکا تھا۔ ہمارے عام علماء بیچارے سادہ سے لوگ تھے۔ تورات، زبور اور انجیل یا عیسائیت کی دوسری کتابوں سے چنداں آگاہی نہ تھی اور نہ ہی عیسائیوں کے اعتراضات سے واقفیت تھی۔ اس لیے وہ مناظروں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے اور فنڈر کے متعلق مشہور ہو چکا تھا

کہ کوئی اس کے اعتراضات کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے دوست ڈاکٹر وزیر خان نے عیسائیت کے متعلق ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔ پھر عیسائیت کی تردید اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں غیر معمولی کمال بہم پہنچا لیا۔

فنڈر نے مناظرے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر وزیر خان نے مولانا رحمت اللہ کو کیرانہ سے بلایا وہ دراصل فنڈر کو ایک مرتبہ ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ پھر اس کے لیے کہیں ٹھہرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

مناظرہ:

11 رجب 1272ھ (9 اپریل 1854ء) کو آگرہ میں مناظرے کا انتظام ہوا۔ چونکہ یہ بڑے معرکے کا مناظرہ تھا اس لیے ہندوستان کے اکثر حصوں کے علماء، امراء اور عام لوگ آگرہ پہنچے۔ بڑے بڑے انگریز افسر بھی شریک مجلس ہوئے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ۔ مسلمانوں کی طرف سے مناظر اول مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں۔ مولانا فیض احمد بدایونی بھی اس مناظرے میں مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان کے معاون تھے۔ موضوع مناظرہ یہ تھا: ''مسلمان اثبات رسالت ﷺ اور محفوظیت قرآن کے دلائل دیں نیز تثلیث کا ابطال کریں اور ثبوت دیں کہ انجیل و تورات میں تحریف ہوئی ہے۔ عیسائیوں کا موقف اس کی ضد تھا۔

مفتی انتظام اللہ کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں:

> پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، انجیل و توریت کی تحریف کا تھا۔ بحث و تمحیص کے بعد سب کے سامنے پادری فنڈر کو اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں (انجیل و تورات) محرف ہو چکی ہیں لیکن صرف مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو خود مشکوک مان رہا ہے، اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ الغرض شکست فاش کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے اٹھنا پڑا اور آگرہ سے چلتا بنا۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا نے انجیل و تورات کے کثیر تعداد نسخے کھول کر رکھ دیئے تھے۔ اور ہر نسخے کی عبارتیں پڑھ پڑھ کر اختلاف کے ثبوت دیتے جاتے تھے۔ اس کیفیت پر سب حیران رہ گئے، پھر فنڈر اور مولانا میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ خط و کتابت امین الدین ہندی نے چھاپ دی تھی۔ مناظرہ کی روداد سید عبداللہ اکبر آبادی نے شائع کی۔ غرض ہندوستان میں پادری فنڈر اور دوسرے پادریوں کو ناکام بنانے والے مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں ہی تھے۔ پھر یہ ذوق عام ہوا۔ سینکڑوں، ہزاروں مسلمانوں نے عیسائیت کی کتابوں سے پوری واقفیت حاصل کر لی اور عیسائیوں اور دوسرے مبلغوں سے مناظرے کرنے لگے۔

جنگ آزادی:

مئی 1857ء میں میرٹھ میں ہنگامہ بپا ہوتے ہی مظفر نگر میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مختلف

قصبوں میں آزادی کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ مثلاً تھانہ بھون، کیرانہ، شاملی، بڑھانہ وغیرہ۔ مولانا رحمت اللہ نواح کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار تھے۔

مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چوہدری عظیم الدین کر رہے تھے۔ لیکن تمام احکام مولانا رحمت اللہ ہی سے حاصل کیے جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا، جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے۔ پھر اعلان ہوتا ملک خدا کا، حکم مولوی رحمت اللہ کا۔'' اس کے بعد جو کچھ بتانا ہوتا بتا دیا جاتا۔

انگریزوں کی آمد:

قریباً چار مہینے تک یہ سلسلہ اطمینان سے جاری رہا۔ پھر انگریز فوج کیرانہ پہنچی۔ محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپیں لگا دی گئیں اور مختلف گھرانوں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ چونکہ مولانا کی قیادت کا علم انگریزوں کو ہو چکا تھا۔ اس لیے انہیں کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ مولانا کو پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اپنے خاص رفیقوں کو لے کر پاس کے ایک گاؤں پنجیٹھ میں پہنچ چکے تھے، جب کیرانہ میں مولانا نہ ملے تو کسی مخبر نے پنجیٹھ کے بارے میں اطلاع دے دی کہ وہاں تلاش کرنا چاہیے چنانچہ انگریز فوج نے ادھر کا رخ کر لیا۔

مولانا کا بچاؤ:

انگریز فوج ابھی راستے ہی میں تھی کہ پنجیٹھ کے نمبردار نے مولانا کا والہانہ لباس اتروا دیا۔ گھس کھدوں یا کسانوں کا لباس پہنایا، کھرپا ہاتھ میں دیا اور کھیت میں گھاس کھودنے کے لیے بٹھا دیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں جس کھیت میں گھاس کھود رہا تھا۔ انگریزی فوج اس کے ساتھ کی پگ ڈنڈی سے گزری بلکہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم کو لگ رہی تھیں۔

پنجیٹھ پہنچ کر ایک ایک گھر کی تلاشی ہوئی اور مولانا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ غالباً اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں نہ رہیں گے۔ تاہم کیرانہ سے باہر جانا سہل نہ تھا۔ اس لیے کہ ہر طرف دور دور تک انگریزوں کی عملداری تھی اور کہیں بھی وہ گرفتار ہو سکتے تھے۔

مولوی ذکاءاللہ دہلی کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ باہر سے جو پلٹنیں ہتھیاروں کے بغیر آتی تھیں، انہیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے: مولوی رحمت اللہ تو وہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی صورت کیا ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلے گئے۔

مولانا نہ مل سکے تو انگریزوں نے انہیں مفرور قرار دیا اور گرفتاری کے لیے گراں قدر انعام کا اعلان کر دیا۔ اب مولانا کے لیے بچ نکلنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ بایں ہمہ انہوں نے کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے ''مصلح الدین'' نام اختیار کیا۔ خدا جانے کن غیر معروف راستوں اور کن بنجر علاقوں میں سے مشقتیں اٹھاتے ہوئے گزرے اور سورت پہنچے۔ وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہ ستمبر 1857ء میں

کیرانہ سے نکلے تھے۔ معلوم نہیں انہیں حجاز پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔

جائیداد کی ضبطی:

ادھر حکومت نے جائیداد کی ضبطی کا اعلان کر دیا۔ اس بارے میں مخبری کرنے والے شخص کا نام کمال الدین تھا۔ 30 جنوری 1864ء کو مولانا کی ضبط شدہ قصباتی جائیداد نیلام ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ سرائے کھجور، سرائے چوڑھے، سرائے شیخ فضل الٰہی، سرائے قصاباں، سرائے لوہ آباد، سرائے مایاں۔

ان کی قیمت لاکھوں روپے تھی لیکن یہ سب ایک ہزار چار سو بیس میں نیلام کر دی گئیں۔ زرعی زمینیں ان کے علاوہ تھیں۔

پادری فنڈر سے ایک اور مناظرہ:

پادری فنڈر کو مولانا رحمت اللہ ہندوستان سے بھگا چکے تھے۔ 1284ھ (1867ء) میں وہ قسطنطنیہ پہنچا تو مولانا کو سلطان کے حکم سے مناظرے کے لیے بلایا گیا۔ فنڈر نے وہاں بھی شکست فاش کھائی۔ مولانا قسطنطنیہ سے مکہ معظمہ واپس آ گئے تو مدرسہ صولتیہ کے نام سے ایک دینی درس گاہ قائم کر دی جو خدا کے فضل سے اب تک کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور مکہ معظمہ کی مشہور درسگاہ ہے۔ سلطان نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر مولانا نے اپنے حقیقی بھتیجے مولانا بدر السلام کو اپنے پاس بلا لیا اور تعلیم و ترتیب دے کر سلطان کے خاص ملازموں میں شامل کرا دیا۔

مولانا آخری دنوں میں مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ وہیں 24 رمضان 1308ھ (2 مئی 1891ء) کو وصال ہوا اور مدینہ منورہ کی خاک پاک کے دامن میں آسودگی پائی۔ عمر چوہتر یا پچھتر سال کی تھی۔

مولانا صاحب نے پادری فنڈر کو مناظر میں بائبل میں تحریف کے حوالے سے جو دلائل دیئے تھے۔ وہ کتابی صورت میں چار جلدوں میں ''بائبل سے قرآن تک'' کے عنوان سے عام دستیاب ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

کیسی کیسی مجاہد خیز اور علم پرور بستیاں تھیں جو زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں آباد ہو گئی تھیں۔ کاندھلہ، بڈھانہ، پھلت، تھانہ بھون، جھنجھانہ، دیوبند، رام پور، سہارن پور، کیرانہ، گنگوہ۔ اب ایسی ہی ایک بستی نانوتہ کے فرزند جمیل کی علمی اور مجاہدانہ زندگی کے حالات بیان کرنا مقصود ہے۔

مولانا محمد قاسم دارالعلوم دیوبند کے بانی، انیسویں صدی عیسوی کے مشہور مجاہد، متکلم، معلم اور مناظر و مصنف تھے۔ وہ شعبان 1248ھ 1832ء میں نانوتہ (ضلع سہارن پور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ اسد علی مولانا مملوک علی کے ہم درس تھے اور انہوں نے شاہنامہ فردوسی تک فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شیخ اسد علی کو کھیتی باڑی سے شغف تھا۔ با اخلاق، صاحب مروت، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی اور پرہیزگار تھے۔

مولانا محمد قاسم بچپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز طبع، حوصلہ مند، جفاکش، بہادر اور چست و چالاک واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے وطن کے ایک مکتب میں ابتدائی تعلیم کے علاوہ قرآن مجید اور کچھ فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں نانوتہ سے مولانا مہتاب علی کے مکتب میں دیوبند بھیج دیے گئے۔ جہاں انہوں نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے وطن نانوتہ چلے آئے۔ حُسنِ اتفاق سے مولانا مملوک علی، جو دلی عربی کالج میں علوم شرقیہ کے مدرس اور مولانا محمد قاسم کے رشتے دار تھے اس زمانے میں اپنے وطن آئے ہوئے تھے، وہ دہلی جاتے ہوئے مولانا قاسم کو بھی ساتھ لیتے گئے۔

مولانا قاسم نے آٹھ سال تک مولانا مملوک علی سے کالج کے فارغ اوقات میں ان کے گھر پر تعلیم پائی اور ایک سال دلی کالج میں علم ریاضی کی تحصیل میں گزارا۔ علم حدیث کے لیے وہ شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو اپنے زمانے کے باکمال محدث تھے اور جن کا سلسلۂ سند حدیث شاہ محمد اسحاق کے واسطے سے شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔ اس زمانے میں مفتی صدرالدین آزردہ دہلی کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی کی روح رواں تھے۔ مولانا محمد قاسم نے ان سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے حاجی امداداللہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور عمر بھر ان کی محبت و عقیدت سے سرشار رہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا محمد قاسم سے ایک سال بعد دہلی آئے تھے۔ دونوں نے مولانا مملوک علی اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے ایک ساتھ تعلیم پائی۔ دونوں حاجی امداداللہ سے بیعت ہوئے اور ساری عمر یک جاں و دو قالب بنے رہے۔

مولانا قاسم طالب علمی سے فراغت کے بعد مولانا احمد علی سہارنپوری کے مطبع احمدی، دہلی میں کتابوں کی تصحیح کی خدمت انجام دینے لگے۔ (1269ھ 1852ء)۔ اس زمانے میں مولانا احمد علی بخاری شریف کی تصحیح اور تحشیہ

میں مصروف تھے۔ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے کہ انہوں نے سارا کام مولانا محمد قاسم کے سپرد کر دیا۔ مولانا نے حاشیہ اس قابلیت سے لکھا کہ دیکھنے والے انہیں خراج تحسین دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مسلمانانِ ہند کے فخر کے لیے یہ امر کافی ہے کہ صحیح بخاری کو پہلی دفعہ انہوں نے نہایت صحت وصفائی کے ساتھ چھاپ کر شائع کیا۔ کتاب کے آخر میں مفتی صدرالدین آزردہ کی ایک تقریظ میں ہے۔ 1853ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ اس زمانے میں جنگ کریمیا جاری تھی، جس میں ترک اور روسی نبرد آزما تھے۔ مسلمانانِ ہند شب و روز ترکوں کی نصرت و فتح مندی کے لیے دعا گو رہتے تھے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے اپنی اہلیہ کے تمام زیورات سلطانی چندے میں دے دیئے۔ 1856ء اور 1857ء میں وہ کبھی نانوتہ اور کبھی دیوبند میں مقیم رہے اور اسی زمانے میں 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوگئی تھی۔

مئی 1857ء میں میرٹھ چھاؤنی سے ہندوستانی فوجوں نے علم حریت بلند کیا اور سارا شمالی ہندوستان یکدم ہنگامے کی لپیٹ میں آ گیا اور ملک کا امن و امان تہہ و بالا ہو گیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کی آمد (2 جولائی 1857ء) پر علماء کے مشورے سے جہاد کا اعلان ہوا اور اسی کی تحریک پر علمائے عصر نے جامع مسجد دہلی میں جمع ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ مرتب کیا، جس پر مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی محمد نذیر حسین اور مشہور مناظر اسلام، مولوی رحمت اللہ کیرانوی کے دستخط تھے۔ موخر الذکر حاجی امداد اللہؒ کے نمائندے تھے۔ اس فتوے کا بہت اچھا اثر ہوا اور انقلاب کی اہمیت نوائے جہاد کے باعث مسلمانوں میں بڑھ گئی۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اور شہزادوں میں بھی حاجی امداد اللہ کا وقار اور احترام تھا اور محل کی بیگمات میں بھی ان کی بزرگی کا چرچا تھا۔ محمد قاسم نے نواب شیر علی خان، رئیس مراد آباد کی معرفت بہادر شاہ کو آزادی وطن کی جنگ پر آمادہ کیا اور عرض کیا کہ بادشاہ اپنی طاقت استعمال کر کے دہلی کو انگریزوں سے پاک کرنے کی کوشش کریں اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں گے تو دہلی کا آزاد ہو جانا ممکن ہے۔

اس تحریک آزادی میں تھانہ بھون (ضلع مظفر گڑھ) سے انگریزوں کا عمل دخل جاتا رہا تو شہر کے باشندوں نے حاجی امداد اللہ کو اپنا امام بنا لیا اور مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی ان کے مشیر قرار پائے۔ حاجی صاحب نے دیوانی و فوجداری مقدمات شرعی فیصلہ کے مطابق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصلے بھی فرمائے۔ جہاد کے لیے رضاکار بھرتی کیے گئے۔ مجاہدین کے حوصلے بڑھے تو انہوں نے شاملی کی تحصیل کو، جو قلعے کی طرح مستحکم تھی، حملہ کر کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس یلغار میں مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی بھی شامل تھے۔ محصورین میں سے ایک سو تیرہ آدمی مارے گئے اور مجاہدین اس فتح کے بعد تھانہ بھون لوٹ آئے۔ شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے حد مشتعل کر دیا تھا۔ اس اثناء میں 14 ستمبر 1857ء کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ انگریزوں نے کلکٹر مظفر نگر مسٹر ایڈورڈز کو حکم دیا کہ وہ تھانہ بھون پر یلغار کر کے شہر پر تسلط بحال کر دے۔ اس نے کچھ پیدل سکھ فوج اور کچھ گورکھے اور دو توپوں کے ساتھ تھانہ بھون پر حملہ کیا۔ مجاہدین نے پہلے تین حملے تو پسپا کر دیئے، لیکن چوتھے حملے کو روک نہ سکے اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جنگ میں حافظ محمد ضامن شہید نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ تھانہ بھون پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔ اس معرکے میں مولانا محمد قاسمؒ کے بھی سر

میں گولی لگی تھی لیکن وہ ہر طرح محفوظ رہے۔

جہاد آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے داروگیر کی مہم شروع کر دی۔ بغاوت کے الزام میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسمؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ حاجی امداد چھپتے چھپاتے انبالہ پہنچے اور وہاں سے لدھیانہ، فیروز پور اور بہاولپور ہوتے ہوئے کراچی پہنچ کر مکہ معظمہ چل دیئے اور بقیہ عمر وہیں گزاری۔ مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہوئے اور جیل میں ڈال دیے گئے، لیکن چھ ماہ بعد رہا کر دیئے گئے۔ مولانا محمد قاسمؒ ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہے۔ اگلے برس 1858ء میں ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ لیکن مولانا محمد قاسمؒ عمر بھر سرکار برطانیہ کی نظروں میں مشتبہ اور ناپسندیدہ رہے۔ 15 جمادی الاولیٰ 1377ھ 29 نومبر 1860ء کو وہ براستہ پنجاب وسندھ حج کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں جہاز پر ہی قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا۔ ہر روز جتنا حفظ کرتے تھے، رات کو نماز تراویح میں اتنا ہی سنا دیتے تھے۔ زیارت حرمین شریفین کے بعد براہ بمبئی دسمبر 1861ء میں اپنے وطن واپس آئے۔

حج سے واپسی پر انہوں نے منشی امتیاز علی کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کا کام شروع کر دیا۔ منشی امتیاز علی اپنے زمانے کے باکمال خوشنویس تھے۔ انہوں نے خط نسخ اور خط نستعلیق میں کتابت کی اصلاح بہادر شاہ ظفر سے لی تھی۔ میرٹھ میں مولانا کا قیام 1868 -1869ء تک رہا۔ فارغ اوقات میں وہ طلبہ کو صحیح مسلم اور مولانا روم کی مثنوی معنوی کا بھی درس دیا کرتے تھے۔ ان کے قیام میرٹھ کا اہم کارنامہ حمائل شریف کی تصحیح ہے۔ یہ حمائل، جو 1286ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپ کر شائع ہوئی تھی، آج بھی صحت اور صفائی کے لحاظ سے ایک عمدہ نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند:

دہلی کی تباہی کے بعد بعض اکابر دیوبند کو یہ خیال آیا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی واحد صورت ایک عربی مدرسے کا قیام ہے، چنانچہ ان بزرگوں کی سعی سے 15 محرم الحرام 1283ھ/ 30 مئی 1867ء کو دیوبند کی ایک مسجد میں مدرسہ عربیہ دیوبند کا، جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کہلایا، قیام عمل میں آیا۔ بعد ازاں یہ مدرسہ جامع مسجد میں منتقل ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم، جو اس وقت میرٹھ میں مقیم تھے۔ ارباب مدرسہ کے مشوروں میں برابر شریک رہے اور کبھی کبھی دیوبند آ کر مدرسے کے امور میں ان کی برابر رہنمائی اور نگرانی بھی کرتے رہے۔ جب جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی تو مولانا محمد قاسم نے تحریک کی کہ اب مدرسے کے لیے مستقل عمارت ہونی چاہیے، چنانچہ مدرسے کی عمارت کا سنگ بنیاد 1292ھ/ 1876ء میں رکھا گیا۔ اس تقریب میں مولانا قاسم نانوتویؒ کے علاوہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد مظہر شامل تھے۔ چونکہ مدرسے کی تعمیر کے محرک و مؤسس مولانا محمد قاسم ہی تھے اس لیے وہی مہتمم قرار پائے اور وہ آخری دم تک مدرسے کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہے۔ یہ درسگاہ پانچ برس میں بن کر تیار ہوئی۔

مدرسے کے کاموں کی نگرانی کے علاوہ مولانا محمد قاسم نے نکاح بیوگان اور لڑکیوں کے لیے وراثت میں حصہ

دا نے کی تبلیغ بھی جاری رکھی، جس کا قبل ازیں سید احمد شہید نے کامیاب آغاز کیا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی کر کے مسلمانوں کے سامنے عملی مثال پیش کر دی۔ غمی وشادی کی فضول رسموں کی اصلاح کی اور ان بدعت کے خلاف قلمی ولسانی جہاد جاری رکھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے سرسیّد کو ان کی حدیث وعقائد کی آزادروی پر فہمائش اور اصلاحی خطوط لکھے اور ان کے بعض شبہات واعتراضات کا جواب دیا، جس کا ذکر تصفیہ العقائد میں موجود ہے۔ اس کے باوجود مولانا اور سرسیّد احمد کے تعلقات نہایت خوشگوار اور مخلصانہ رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مداح اور مرتبہ شناس تھے۔ مولانا نے دوسرا حج 1870ء میں اور تیسرا حج 1876ء میں کیا۔ ان دونوں سفروں میں وہ اپنے پیرومرشد حاجی امداداللہ اور استاذالحدیث شاہ عبدالغنی مجددیؒ کی زیارت سے شادکام ہوئے۔

مولانا محمد قاسمؒ کے زمانے میں بعض لوگوں اسلام پر اعتراض وطعن کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔ ان میں عیسائی پادری اور آریہ سماجی پیش پیش تھے۔ ان کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت کے لیے مولانا محمد قاسم بھی میدان میں نکل آئے۔ 1872ء میں ان کا مباحثہ پادری عمادالدین اور پادری تاراچند سے دہلی میں ہوا اور وہ کامیاب رہے۔ 1876ء میں چاند پور (ضلع شاہجہان پور) کے ایک کبیر پنتھی تعلقہ دار نے تحقیق مذہب کے لیے ہندو پنڈتوں، عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں کو جمع کیا کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کریں۔ اس نے اس میلے کا نام ''میلۂ خداشناسی'' رکھا۔ اس جلسے میں پنڈت نند سرسوتی اور مولانا محمد قاسمؒ بھی مدعو تھے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے ابطال تثلیث وشرک اور اثبات توحید میں ایسی مدلل تقریریں کیں کہ دوست ودشمن سب مان گئے اور عیسائی پادریوں نے اعتراف شکست کر لیا۔ اگلے سال پھر جلسہ ہوا۔ اس دفعہ پنڈت دیانند سرسوتی نے اسلام پر اعتراضات کئے، جن کا شافی جواب مولانا محمد قاسم نے دیا۔ اس کے بعد پنڈت دیانند نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی مہم شروع کر دی۔ 1878ء میں اس نے رڑکی (ضلع سہارنپور) پہنچ کر اسلام پر کچھ اعتراضات مشتہر کئے۔ اہل رڑکی نے مولانا محمد قاسم کو دعوت دی کہ وہ رڑکی آ کر پنڈت دیانند کی یاوہ گوئی کا جواب دیں، لیکن وہ خود الٹے سیدھے بہانے کر کے رڑکی سے بھاگ نکلا اور میرٹھ پہنچ گیا۔ مولانا بھی گفتگو کے لیے میرٹھ گئے، لیکن دیانند کو ان کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے راہ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

تیسرے حج سے واپس ہوتے ہوئے مولانا محمد قاسم کو بخار، کھانسی اور سانس کی تکلیف شروع ہوئی تھی، مگر اس حالت میں بھی وہ دارالعلوم دیوبند کے فروغ وترقی اور عیسائیوں اور آریاؤں سے مناظروں میں برابر حصہ لیتے رہے اور طلبہ کو بھی پڑھاتے رہے۔ یونانی طبیبوں نے ہر قسم کا علاج کیا، ڈاکٹروں نے ہر طرح سے تدبیر کی، لیکن مرض رفع نہ ہوا۔ آخر انہوں نے 4 جمادی الاولیٰ 1297ھ/ 15 اپریل 1880ء کو بعد نماز ظہر وفات پائی اور دارالعلوم دیوبند میں دفن ہوئے۔ اسی طرح ان کی زندگی، جو طویل سیاسی، علمی اور تبلیغی جدوجہد سے عبارت تھی، اختتام کو پہنچی۔ ''بائے خزانہ خوبی'' تاریخ وفات ہے۔ ان کے متعلق سرسیّد نے لکھا ہے: ''مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی، دینداری اور ورع وانکسار سے ثابت کر دیا تھا کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مانند اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید

معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھے۔'' مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثال تھے، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت شخص تھے۔

مولانا محمد قاسمؒ سے سینکڑوں طلبہ نے استفادہ کیا تھا۔ ان میں ممتاز ترین مولانا فخرالحسن گنگوہی (مصنف التعلیق المحمود علی سنن ابی داؤد)، مولانا احمد حسن امروہوی اور (شیخ الہند) مولانا محمود حسن [رک باں] ہیں، جن کے تلامذہ در تلامذہ نے علوم اسلامیہ کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

مولانا صاحب کی تصانیف

۱۔ حاشیہ صحیح البخاری۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ اختصار کے باوجود بہت سی شروح پر فوقیت رکھتا ہے اور گزشتہ سوا سو برس میں متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے۔

۲۔ تقریر دلپذیر: اسلام کے اصول کلیہ پر جامع و مانع تقریر۔

۳۔ تحذیر الناس عن انکار اثر ابن عباس: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ایک روایت کی عقلی و نقلی تشریح اور زمینوں کے سات ہونے اور حضور ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا بیان ہے۔

۴۔ آب حیات: آنحضرت ﷺ کی حیات برزخی کا بیان۔

۵۔ انتصار الاسلام: آریہ سماجیوں کے مقابلے میں اسلامی اصول کا فلسفہ۔

۶۔ تصفیۃ العقائد: سرسیّد احمد خان سے خط و کتابت اور ان کے شبہات کا جواب۔ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

۷۔ حجۃ الاسلام: عیسائیوں کے مقابلے میں اسلامی اصولوں کی وضاحت۔

۸۔ قبلہ نما: پنڈت دیانند نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا کہ وہ کعبے کی طرف منہ کر کے کیوں نماز پڑھتے ہیں، اس کا شافی جواب۔

۹۔ تحفۂ لحمیہ: آریوں کے شبہات کا جواب۔

۱۰۔ مباحثہ شاہجہان پور: آریوں سے مناظرے کی روداد۔

۱۱۔ جمال قاسمی: مکتوبات۔

۱۲۔ توثیق الکلام: مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر بحث۔

۱۳۔ اجوبہ اربعین: تحذیر الناس پر علمائے رام پور کے اعتراضات کا جواب۔

۱۴۔ ہدایۃ الشیعہ: عقائد پر مفصل بحث۔

مولانا محمد قاسم کی سب سے بڑی علمی اور زندہ و جاوید یادگار دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مدرسہ دارالعلوم دیوبند [رک بہ دیوبندی] کے اصل بانی نہ تھے، لیکن مدرسے کو ایک شاندار دارالعلوم بنانے کا خیال آپ کا تھا۔ جن قابل عزت بزرگوں نے اس مدرسے کو شروع کیا، شاید ان کا منتہائے مقصود ایک مکتب سے زیادہ نہ تھا جو جامع مسجد کی سہ دری میں بھی جاری رہ سکتا تھا، لیکن مولانا نے شروع ہی سے اپنا تخیل بلند تر رکھا اور

مدرسے کی علمی وفکری بنیادیں اس قدر وسیع اور بلند رکھیں کہ اس پر دارالعلوم کی شاندار عمارت تعمیر ہو سکی)۔ اس کے علاوہ انہوں نے مرادآباد میں مدرسہ قاسم العلوم، امروھہ میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ، جامع مسجد، گلاؤٹھی (بلند شہر) اور نگینہ (ضلع بجنور) میں بھی مدارس قائم کیے، جو اب تک دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس کے فضلاء نے جو چین سے سواحل افریقہ اور ترکستان سے لے کر سری لنکا تک پھیلے ہوئے ہیں، مسلمانوں کے قومی تشخص کے برقرار رکھنے اور علوم اسلامیہ کے تحفظ واشاعت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارباب دیوبند اور فضلائے دیوبند انگریزوں کے جاہ وجلال سے کبھی مرعوب نہ ہو سکے اور نہ انہوں نے برطانوی استعمار سے سمجھوتے کی کوشش کی، بلکہ تحریک دارالعلوم درحقیقت برطانوی استعمار کے خلاف ہمیشہ سرگرم عمل رہی۔ وہ خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے۔ انہوں نے صدق ودیانت، تقوی ودینداری، امت محمدیہ سے ہمدردی وخیر خواہی اور راہ حق میں سرفروشی وجانبازی کی جو روشن مثالیں پیش کی ہیں وہ ممالک اسلامیہ کے علماء اور فضلا کے لیے قابل رشک ہیں۔

گزشتہ ڈیڑھ سو سے زائد برس میں انہوں نے علوم اسلامیہ، ان کی تعلیم وتدریس اور ان کی نشر واشاعت کے لیے سرگرم اور قابل قدر کوششیں کی ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

سن ستاون کی جنگ آزادی کے ایک اور مجاہد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں جن کا نام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ آتا ہے۔

وہ مشہور محدث مولانا ہدایت احمد انصاری گنگوہی کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش 1829ء میں قصبہ گنگوہ (ضلع سہارن پور) میں شیخ المشائخ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خانقاہ کے متصل مکان میں ہوئی۔ ان کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک اور دادی کی طرف سے گیارہویں پشت میں قطب عالم شیخ عبدالقادر گنگوہی سے مل جاتا ہے۔

ان کے والد مولانا ہدایت احمد ایک جید عالم تھے اور طریقت میں حضرت شاہ غلام علی مجددی نقشبندی دہلوی سے توسل وتعلق رکھتے تھے۔ 1837ء میں مولانا ہدایت احمد کا گورکھ پور میں انتقال ہوگیا۔ اس وقت رشید احمد کی عمر سات سال کی تھی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ان کے دادا نے ان کی تربیت کی۔ ان کی والدہ ایک راسخ العقیدہ، دین دار، پرہیز گار خاتون تھیں۔ بچپن ہی سے رشید احمد میں نیکی اور عظمت کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت خوش الحان تھے۔ انہوں نے فارسی کرنال میں اپنے منجھلے ماموں مولوی محمد تقی سے پڑھی جو فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کا شوق ہوا۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں محمد بخش رام پوری سے پڑھیں۔ ان ابتدائی کتابوں سے فراغت کے بعد انہی کی ترغیب سے علوم درسیہ کی تکمیل کے لیے سترہ سال کی عمر میں دہلی گئے اور وہاں مولوی قاضی احمد الدین جہلمی کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد مولانا مملوک علی نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو اس وقت دہلی کالج (اجمیری دروازہ، دہلی) کے مدرس اول تھے۔ ایک سال پہلے مولانا مملوک علی کے ہمراہ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی دہلی آگئے تھے۔ احمد خان (سرسید) بھی دہلی کالج ہی میں مولانا مملوک کے شاگرد تھے۔ گویا یہ تینوں بڑی شخصیات ہم سبق ہوگئے اور آپس میں ایسا تعلق پیدا ہوگیا جب سرسید نے علی گڑھ سکول اور مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد نے دیوبند مکتب الگ الگ نظریات کے تحت قائم کیا، تب بھی محبت کا رشتہ قائم رہا۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد رشید میں تو ایسا تعلق پیدا ہوا کہ آخری وقت تک ہر جدوجہد میں رفیق رہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس وانتظام میں بھی باہمی تعاون رہا۔ انہوں نے مفتی صدر الدین سے بھی اکتساب علم کیا اور حدیث شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی۔ درسیات سے فارغ ہوکر انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔

تحصیل علم کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہ سے تھانہ بھون آئے اور مولانا شیخ محمد تھانوی سے بیعت ہوئے۔ انہوں نے کچھ عرصہ وہیں رہ کر اپنے مرشد کی رہنمائی میں تمام منازل سلوک طے کیں اور چاروں سلسلوں کی اجازت و

جنگ آزادی کی شکست کے اسباب

اب تک ایسے علمائے دین کے حالات وکوائف پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، جنہوں نے دین اسلام کی خدمت کے ساتھ ساتھ 1857ء کی جنگ میں میدان کارزار میں انگریزوں کے خلاف حریت وآزادی کے معرکۂ خونین میں مجاہدین کے پہلو بہ پہلو تلوار اٹھائی، گرفتار ہوئے، قید وبند کی مصیبتیں اٹھائیں۔ سخت جسمانی و ذہنی اذیتیں برداشت کیں۔ لمبی قیدیں کاٹیں یا جلاوطن کئے گئے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری، مولانا فضل حق خیرآبادی، حاجی امداداللہ مہاجر مکی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے حالات او رقربانیوں کا تذکرہ ہو چکا ہے، ان کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جن کے مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ ہونا چاہیے، جن میں مولوی احمداللہ مدراسی، مولوی عبدالقادر لدھیانوی، مولوی فیض بدایونی، مولوی سرفراز علی، جن کو امام المجاہدین کہا جاتا ہے، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، احمد خان کھرل اور حضرت محل وغیرہم شامل ہیں، اس جنگ میں، جسے انگریز بغاوت یا غدر کہتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف جنگ یا بغاوت کرنے کے لیے مسلمانوں کو صرف یہ ایک سبب کافی تھا کہ انگریزوں نے بدعہدی، سازش اور فریب سے ہندوستان پر قبضہ کیا اور ان کو حکومت، آزادی اور اختیار سے محروم کر دیا۔ اپنی چھنی ہوئی آزادی اور خودمختاری واپس لینے کے لیے، اگر کوئی قوم ایسی مسلط طاقت کے خلاف بغاوت کرے تو یہ قابل عذر و معذرت نہیں، بلکہ قابل فخر ہے۔ اس کے علاوہ، مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف یہ شکایات بھی تھیں کہ اس نے ان کو معاشی حیثیت سے تباہ کر دیا، تعلیم کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ اپنے مزاج اور پسند کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہو گیا اور مذہب کے معاملے میں اس نے مداخلتیں کیں اور یہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ اگر ذرائع اور وسائل مہیا ہوتے تو وہ انگریزوں سے جنگ ضرور کرتے، مگر وہ مہیا نہ تھے۔

ہندو اس وجہ سے ناراض تھے کہ ان کی ریاستوں پر قبضہ کرنے کے لیے، ان ہندو والیانِ ریاست کو، جن کے اولاد نرینہ نہ ہو، اس حق سے محروم کرنے کی پالیسی اختیار کی، جو ان کو از روئے ہندو مذہب حاصل تھا کہ کسی کو متبنیٰ کر لیں اور ریاست کا وارث قرار دیں۔ 1848ء میں لارڈ ڈلہوزی نے راجہ ستارا اور 1854ء میں راجہ ناگپور اور رانی جھانسی کے خلاف کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو یہ لکھا کہ ان کو متبنیٰ کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور ان کی ریاستوں کا الحاق کیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوؤں کی سات چھوٹی ریاستوں پر، 1857ء کے ہنگامے سے پہلے، قبضہ کر چکی تھیں۔ قبضہ کرنے کے اس منصوبے کو ڈلہوزی کا ''اصول الحاق'' کہا جاتا ہے۔

اصول حق کی زد میں ریاست جھانسی بھی آ گئی۔ یہاں بھی فوج اور عوام نے بغاوت کر کے انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے جنگ کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ رانی بہت دلیر خاتون تھی۔ انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور قلعہ میں پناہ لی۔ رانی نے انہیں بحفاظت ایک مقام محفوظ کے لیے روانہ کیا لیکن قلعے سے کچھ دور جھوکن باغ کے مقام پر انقلابیوں نے تمام انگریزوں کو قتل کر دیا۔ سر ہف روز کی کمان میں انگریز فوج نے جھانسی کا محاصرہ کر لیا اور دس دن تک شدید جنگ ہوتی رہی۔ لکشمی بائی کے توپ خانے کا افسر غلام غوث خان بہت طاقتور اور دلیر انسان تھا۔ اس کی زندگی میں انگریز قلعے پر قابض نہ ہو سکے۔ قلعہ کے اندر سپاہیوں کی قلت کی وجہ سے غلام غوث خان نے تن تنہا ''بھوانی شنکر'' نامی نہایت وزنی توپ کا چھکڑا (گاڑی) قلعہ کے شمالی برج تک پہنچا کر انگریزوں کے شدید حملے کو ناکام بنا دیا تھا۔

جنگ کے آٹھویں دن غوث خان گولہ لگ جانے سے ہلاک ہو گیا۔ رانی قلعے میں اس بہادر کی تدفین کے بعد جھانسی چھوڑنے پر آمادہ ہوئی کیونکہ جھانسی کی ملحقہ ریاست اورچھا کے راجہ اور چند دوسرے غداروں کی وجہ سے قلعے کے بڑے دروازے پر انگریز قابض ہو گئے۔ تانتیا ٹوپے جو جھانسی آنا چاہتا تھا اسے راستے میں شکست ہوئی۔ لکشمی بائی ایک خفیہ راستے سے قلعے سے باہر نکل گئی اور شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

رانی اور تانتیا ٹوپے نے کالپی کے مقام پر انگریزوں کو گھیر کر ہنگامۂ کارزار گرم کیا اور قریب تھا کہ انگریز ہتھیار ڈال دیں لیکن فوری طور پر کمک پہنچنے سے جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ رانی اور تانتیا ٹوپے گوالیار کی جانب بھاگ گئے اور شیو پوری کے مقام پر رانی کا پھر انگریزوں سے مقابلہ ہوا اور اس نے بڑی بے جگری سے تیغ زنی کرتے ہوئے شدید زخم کھائے اور زندہ گرفتار ہو کر ہر قسم کی تذلیل سے بچنے کے لیے گھانس کے انبار (گنجی) میں گھس کر آگ لگا کر جان دی۔ تانتیا ٹوپے کو ایک وطن فروش غدار مان سنگھ نے گرفتار کرا دیا اور انگریزوں نے اسے پھانسی دے دی۔

بنگال اور دیگر مقامات:

بنگال کے متعدد شہروں میں جنگ آزادی لڑی گئی۔ ڈھاکہ اور چٹا گانگ وغیرہ جنگ وانقلاب کے مرکز بن گئے تھے۔ کنول کے پھول کو علامت انقلاب کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تھا۔ انقلابی کنول کے پھول فوجی بارکوں اور عوامی اجتماع کے مقامات پر لے جاتے تھے اور جو اشخاص انہیں چھو لیتے تھے وہ اسی وقت جنگ میں شریک ہو جاتے تھے۔ پنجاب اور سرحد کے کئی شہروں میں جنگ آزادی کی لہریں پہنچ گئی تھیں لیکن اول تو اس زمانے میں پنجابی فوج صرف سکھوں پر مشتمل تھی، دوسرے تھوڑے بہت مسلمان سپاہیوں کو ہر شہر میں غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان صوبوں میں کوئی فوجی یا سیاسی قائد ایسا نہ تھا جو عوامی قیادت کے فرائض انجام دیتا۔ چنانچہ پنجاب، سرحد اور سندھ سے تھوڑے بہت سپاہی دہلی پہنچ کر جنگ آزادی میں شریک ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان صوبوں میں کوئی شورش برپا نہیں ہوئی۔

ناکامی کے اسباب:

1۔ جنگ آزادی صرف شمالی برصغیر تک محدود رہی۔ اس تحریک کی قیادت بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ میں دے دی

ئی تھی جو بالطبع جنگجو نہ تھا۔ نیز معمر ہونے کی وجہ سے اس کی قوت عمل میں ضعف نمودار ہو چکا تھا۔ فوجی قیادت شہزادہ مرزا مغل کو سونپ دی گئی تھی۔ جس نے اپنی ناتجربہ کاری اور خودسری کی وجہ سے جنرل بخت خان اور شہزادہ فیروز شاہ جیسے قائدین جنگ کے منصوبوں اور تجویزوں سے ہر قدم پر اختلاف کیا۔ دہلی کی شکست کا جنگ کے تمام ضمنی مراکز پر بہت برا اثر پڑا اور لوگ شکست سے پہلے ہی نفسیاتی طور پر شکست و ہزیمت پر آمادہ ہو گئے۔

2۔ جنگ آزادی کا اچانک آغاز ہوا تھا اور قائد بہادر شاہ ظفر کو 11 مئی 1857ء سے قبل اس امر کے کسی امکان کا اندازہ نہ تھا کہ اس کے کمزور شانوں پر برصغیر کی سب سے فیصلہ کن جنگ کا بار پڑنے والا ہے۔ ایسی صورت میں بہادر شاہ نے جس ذاتی ہمت اور شخصی استقامت کا ثبوت دیا وہی بہت کافی تھا۔ کیونکہ خزانہ خالی ہونے نیز رسل و رسائل اور مواصلاتی خطوط قائم کئے بغیر چند ماہ بھی جنگ جاری نہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ حکیم احسن اللہ اور الٰہی بخش جیسے نمک حرام اور با اثر لوگ اس کے معتمد بنے ہوئے تھے۔ اگر کسی عنوان سے دہلی میں جہاد انقلاب کامیاب ہو جاتا تو آج برصغیر کی تاریخ یکسر مختلف ہوتی۔

3۔ برصغیر کے لوگ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اخلاقی انحطاط کا شکار ہو گئے تھے۔ ہندوؤں میں تو سکندر اعظم کے زمانے سے غدار پیدا ہو رہے تھے لیکن اس دور کے مسلمانوں میں بھی غداروں، بے ایمانوں، اور وطن فروشوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے ہر جگہ اس نوع کے ننگ دیں اور ننگ وطن ہندو مسلم غداروں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔

4۔ گورکھوں اور سکھوں کے تعاون نے انگریزوں کی یقینی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ انگریزوں نے جنگ آزادی سے صرف چند سال قبل سکھوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے انہیں ذلت خیز شکست دی تھی۔ لیکن انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سکھوں کی وحشیانہ نفرت کے پیش نظر انہیں مسلمانوں سے تشفی بخش طور پر انتقام لینے کا موقع دینے کا وعدہ کیا۔ لہٰذا سکھ اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے حقیقی دشمنوں کے طرفدار ہو گئے۔

5۔ آزادی کے لیے تلوار اٹھانے والوں کو مضبوط اور مستعد قیادت میسر نہ آ سکی اس کے علاوہ ان کی مساعی اور کوششوں میں کوئی ربط قائم نہ ہو سکا اس کے برعکس انگریز فوج کے سپاہی اعلیٰ عسکری تربیت کے حامل تھے اور انہیں آزمودہ کار جرنیلوں کی قیادت میسر تھی۔ اگر مضبوط قیادت کی وجہ سے مختلف مقامات کے انقلابیوں کے مابین رابطہ اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تو 46 ہزار انگریز پچاس ہزار گورکھوں اور سکھوں کی مدد سے ہندوستان کے کروڑوں عوام اور ایک لاکھ سے زیادہ انقلابیوں پر غالب نہ آ سکتے تھے۔

نتائج:

جنگ آزادی کی ناکامی مسلم انڈیا کی تاریخ کا بہت بڑا سانحہ تھی، اس کے نتیجے میں سارا ملک تاج برطانیہ کے ماتحت ہو گیا اور کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جنگ میں سات ہزار انگریز اور پانچ لاکھ ہندوستانی ہلاک ہوئے۔

انگریز فوجیوں اور سکھوں کی بربریت سے جتنے افراد موت کے گھاٹ اتر گئے اور ان کی تعداد کا کوئی تخمینہ یا اندازہ نہیں لگایا گیا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی عظمت و عروج کی تمام علامتوں کو ختم کرنے کے لیے جو وحشیانہ طریقے اختیار کئے ان کا تفصیلی ذکر خارج از بحث ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اپنی ذاتی نفرت اور انگریزوں کے ایما پر دہلی کے تمام خوبصورت مسلمانوں کو چن چن کر ہلاک کر دیا تاکہ مسلمانوں میں حسن صورت کا تفوق بھی باقی نہ رہے۔ تمام کتب خانے جلا دیئے گئے اور بے شمار اہل علم و فضل کو محض اس بنا پر تہ تیغ کر دیا گیا کہ کہیں وہ آگے چل کر فکری قیادت اور انگریزوں کی غلامی کے خلاف عوامی رہنمائی کا آغاز نہ کر دیں دہلی کی تمام تر آبادی کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ انگریز حکومت نے مدفون خزانوں کے حصول کی خاطر بے شمار عمارتیں کھدوا دیں۔ دہلی کے امراء کے تمام باغات اور محلات کھدوا کر ہل چلوا دیا گیا۔ لال قلعے کی بہت سی خوبصورت تعمیرات منہدم کر کے فوجی بارکیں بنا دی گئیں، اس کے علاوہ تمام قدیمی عمارات کے انہدام کی تجویز زیر بحث لائی گئی جسے محض اخراجات، یعنی مزدوروں کی اجرت وغیرہ کے پیش نظر روبہ عمل نہیں لایا گیا۔ مساجد کی انتہائی بے حرمتی کی گئی۔ بمبئی کے گورنر الفنسٹن کے لفظوں میں انگریزوں کی درندگی کے مقابلے میں تیمور اور نادر شاہ کے حملے تماشہ بن کر رہ گئے۔

انگریز حکومت کو کمپنی کی غلط اور ظالمانہ حکمت عملی کا احساس تھا اس کے علاوہ سرسید نے بھی ان کے ارکان کی غلطیوں کی نشان دہی کی چنانچہ ملکہ وکٹوریہ کے نومبر 1858ء کے فرمان میں ڈلہوزی کے اصول الحاق کا خاتمہ کر کے والیانِ ریاست کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ حکومت میں ہندوستانی نمائندگی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

تحریک خدّام کعبہ

برعظیم پاک و ہند میں احیائے اسلام کی چنگاری پہلی بار حضرت مجدد الف ثانیؒ کے قلب میں روشن ہوئی۔ پھر شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزند کے سینے اس تمنا کے نور سے فروزاں ہوئے۔ ولی اللہی تحریک سے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک مجاہدین نے جنم لیا جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہے۔ تحریک مجاہدین کی شمع نے بجھتے بجھتے بھی 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف وہ کارنامے سرانجام دیئے کہ ان کی ناکامیابی میں اک ذرا سی آنچ باقی رہ گئی۔ ان ستاون میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گُل ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے ایران میں صفوی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب خلافتِ عثمانیہ کی باری تھی۔ انیسویں صدی کے آتے آتے مغربی استعمار۔۔۔ فرانس، برطانیہ۔ سپین۔ ہالینڈ۔ اٹلی۔ روس۔ پوری دنیائے اسلام پر مسلط و قابض ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے مذہب، تہذیب و ثقافت تو رہے ایک طرف، ان کے جغرافیے کا ایک ایک انچ مغرب کا غلام بن چکا تھا۔ اب تک ایسی تحریکوں کا ذکر تھا جو بنیادی طور پر قومی تھیں۔ اب ایک ایسی تحریک کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جو بنیادی طور پر ملّی تھی، تمام ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے تھی۔ خلافت عثمانیہ کا مسئلہ صرف ترک قوم کا نہ تھا، بلکہ تمام عالم اسلام کا مسئلہ تھا۔ خلافت عثمانیہ کے زوال اور مغربیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے سخت مضطرب تھے، جس طرح آج پورا عالم

اسلام امریکہ، برطانیہ کی سازشوں سے سخت بے چین ہے۔ آیئے ہم پہلے خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ خامی دراصل اپنے گھر ہی میں تھی۔

خلافت عثمانیہ کا آخری دور

مغربی استعمار کی سازشوں کے نتیجے میں 1913ء تک جتنے مقبوضات خلافت عثمانیہ کے اقتدار و انتظام سے نکل چکے تھے۔ اس کا آغاز تقریباً اس وقت سے ہو چکا تھا جب برعظیم پاک و ہند میں سن ستاون کی جنگ سے بچے کھچے مجاہدین یہ جنگ بھی ہار کر ستارہے تھے۔ سربیا اور ڈینیوب کی دو یورپی ریاستوں نے جو 1861ء میں متحد ہو کر ایک ریاست بن گئی تھی، 1866ء میں ترکی سے پوری خود مختاری حاصل کر لی۔ 1878ء میں معاہدہ برمن کی شرائط کے تحت بوسنیا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا یا ہنگری کی یورپی مملکت کی امانت میں دے دیا گیا اور مسلمانوں کی سخت جنگ کی باوجود 20 اکتوبر 1879ء کو آسٹریا کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ اسی معاہدے کے تحت سربیا مونٹے نیگرو اور رومانیہ بھی خلافت عثمانیہ کے قبضے سے نکل گئے۔ قفقاز کی سرحد پر قارص اور باطوم کے اقتدار سے عثمانیہ کو ہاتھ دھونے پڑے۔ قبرص کا نظم و نسق انگریزوں نے سنبھال لیا۔ 1882ء میں مصر نے بھی ہاتھ اٹھا لئے اور چار سو سال تک خلافتِ عثمانیہ کے زیر انتظام رہ کر برطانیہ کی آغوش حفاظت میں چلا گیا۔ 1897ء میں ترکوں اور یونانیوں کی جنگ کے نتیجے میں یونان کو توسیع نصیب ہوئی۔ اگلے برس 1898ء میں کریٹ (اقریطش) بھی خود مختار ہو گیا۔ 3 اکتوبر 1911ء کو بلغاریہ نے بھی ترکی سے آزاد ہونے کا اعلان کر دیا۔ دو روز بعد 5 اکتوبر کو اٹلی نے طرابلس (لیبیا) میں اپنی فوجیں اتار دیں، اور اگرچہ ان کے خلاف سخت مزاحمت کی گئی لیکن عہد نامہ لوزان کے تحت 1912ء میں اٹلی کے قبضے کو تسلیم کرنا پڑا۔

1912ء اور 1913ء کی جنگ بلقان میں یورپی ترک کے مقبوضات صرف مشرقی تھریس تک محدود ہو کر رہ گئے اور اس کے ایک حصے پر یونان نے قبضہ جما لیا۔ ایشیائی ترکی کی مغربی بندرگاہ سمرنا بھی یونان کے قبضے میں چلی گئی۔ نجد و حجاز کو خلافت عثمانیہ کے انتظام سے نکالنے کا کام بھی اس وقت تک شروع ہو چکا تھا اور خلافتِ عثمانیہ سے شریف مکہ حسین کی بغاوت کے نتیجے میں نہ صرف حجاز بلکہ فلسطین بھی (انگریزوں نے) عرب ریاست کے حدود اور عمل داری میں دینے کا وعدہ کر لیا تھا، لیکن خلافتِ عثمانیہ کے اقتدار سے آزادی حاصل ہو جانے کے بعد برطانیہ نے فلسطین کو اپنے زیر انتظام رکھا، اور جس منصوبے پر کام کیا گیا، وہ فلسطین کی یہودی ریاست کے قیام پر منتج ہوا اب "عظیم تر اسرائیل" کے منصوبے کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ شام اور عراق کے عوام کو خلافتِ عثمانیہ سے الگ ہونے کے لیے بھڑکایا گیا اور حصولِ آزادی کی جدوجہد میں مدد دینے کا وعدہ کیا گیا، اور صرف وعدہ ہی نہیں، بلکہ انہیں ترکی سے الگ ہونے میں فوجی مدد بھی دی۔ فرانس اور برطانیہ نے مشترکہ فوجی کارروائی فلسطین اور شام میں کی۔ برطانیہ نے فوجی دستے عراق اور الجزائر میں بھیجے۔ آخر کار انہیں کامیابی ہوئی اور یہ تمام علاقے عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔

عالم اسلام کے اس وقت کے انتہائی تیزی سے بدلتے ہوئے بلکہ گرتے ہوئے سیاسی حالات کو دیکھ کر

اسلامیانِ ہند سخت پریشان اور مغموم تھے۔ ان کے ملی جذبات ومحسوسات سے اس دور کا ادب بہت متاثر ہوا، اور نہ صرف سنجیدہ اور فکرانگیز سیاسی مضامین کے ذریعے، بلکہ افسانوں، ڈراموں اور منظومات کے ذریعے بھی مسلمانانِ ہند کے جذبات واحساسات کا اظہار ہوا۔ ہر مسلمان شاعر اور ادیب نے ان جذبات کے فروغ واشاعت میں حصہ لیا۔ خصوصاً علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان نے ایسی ملک گیر شہرت پائی کہ ان کا بے نظیر اور دردانگیز کلام جو ترکوں کی حمایت میں تھا، ہر تعلیم یافتہ اور اخبار بیں کی زبان پر چڑھ گیا۔

امت مسلمہ کے ان حالات نے مسلمانانِ ہند کو سخت مضطرب کر دیا، لیکن مزید پریشان کن اور ندوہ ناک واقعات اور برطانوی سامراج کے وہ عزائم تھے جن کا مظاہرہ شروع ہو چکا تھا۔ مسلمانانِ عالم استعمار کی ان سازشوں اور عزائم کے ہونے والے نتائج سے خوف زدہ تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں خدشات تھے اور گزشتہ وقعات ان خدشات کی تائید کر رہے تھے اور اگرچہ بعض واقعات کے پختہ اور ظاہر ہونے میں آئندہ کئی برس لگ گئے، لیکن مسلمانوں کے خدشات درست ثابت ہوئے۔

جنگ عظیم اول کے اختتام (1918ء) تک وہ کئی علاقے بھی، جو جنگ کے آغاز تک خلافتِ عثمانیہ میں شامل تھے، اس کی عمل داری سے نکل کر برطانیہ یا فرانس کے تسلط میں چلے گئے۔ شام جو پہلے خلافتِ عثمانیہ کا ایک حصہ تھا، 1918ء میں فرانس کے زیر انتداب چلا گیا۔ عراق کو ترکی کے جسم سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ خلافتِ عثمانیہ کی جغرافیائی حدود میں ایک چھوٹے سے خطے لبنان کے نقش کو ابھارا گیا۔ یمن عثمانیہ کا ایک حصہ تھا، لیکن جنگ کے خاتمے پر برطانیہ نے اسے زیر اثر لے لیا۔ اس زمانے میں شرق اردن کی ایک چھوٹی سی ریاست برطانیہ کے زیر سایہ قائم کر دی گئی۔ فلسطین کا علاقہ ترکوں سے چھین کر اس پر برطانیہ قابض ہو گیا۔ بعد میں جو اسرائیلی حکومت قائم کی گئی، اس کا وعدہ جنگ عظیم اول کے آغاز ہی میں کر لیا گیا تھا۔

انجمن خدّامِ کعبہ

یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے اگرچہ 1913ء تک پوری طرح ظاہر نہیں ہو گئے تھے، بلکہ 1920ء اور اس کے بعد تک بتدریج ظہور پذیر ہوتے رہے، لیکن ان کی بنیاد 1913ء سے پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ ان واقعات کے ظہور ونشو ونما کا پس منظر صبح وشام آفتاب کے طلوع وغروب کے نظارے کی طرح سامنے تھا اور زمانے کی چال اور حالات کی رفتار کو اربابِ بصیرت اور اکابر ملت نے محسوس کر لیا تھا۔ بعض نئے واقعات نے مسلمانوں کے جذبات کو سخت مجروح کیا۔ اس زمانے کے ایک خاص واقعے کی طرف مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی محلی نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> ”اٹلی کے طرابلس الغرب پر حملے کے بعد ہندی دردمندانِ اسلام کو اس لیے بھی خانۂ کعبہ کی حفاظت کی زیادہ فکر پیدا ہو گئی تھی کہ اٹلی کے بادشاہ عمانویل نے ایک موقع پر یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبے سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔“

امریکہ کے صدر بش نے عراق پر فوجی حملے کے وقت اپنے اعلان میں لفظ ”کروسیڈ“ استعمال کیا تھا، جس کے باعث عراق کی جنگ ایک خاص ملی مسئلہ بن گئی۔

اٹلی کے بادشاہ کے اس بیان نے اسلامیان ہند کو خاص طور پر مضطرب کر دیا اور ملت کے چند اصحاب بصیرت اور بہی خواہوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب مرکز اسلام کی عزت و حرمت کی حفاظت کے لیے ترکی کی اسلامی حکمت پر انحصار نہیں کیا جاسکتا، اور اگر اب ترکی اس قابل نہیں رہا کہ وہ حرم اسلام کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکے اور دشمنانِ اسلام کے حملوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے سرزمین حجاز مقدس کو محفوظ رکھ سکے تو مسلمانانِ ہند کو خود آگے بڑھ کر یہ کرنا چاہیے۔

چنانچہ خدام کعبہ کے نام سے ایک ملی تحریک کے آغاز، ایک نئی اسلامی جماعت کے قیام اور ناموس کعبہ کی حفاظت اور خدمت کی راہ میں جان و مال کے ایثار سے دریغ نہ کرنے کا عزم و اعلان اور عہد و پیماں ہمارے اکابر ملت کے اسی احساس کا نتیجہ تھا۔

انجمن کی تشکیل و قیام

اسی احساس و اضطراب کے تحت ایک انجمن قائم کی گئی، جس کا نام تھا: ''انجمن خدام کعبہ'' مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے خادم الخدام اور مولانا محمد علی کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی اس کے معتمد عمومی تھے۔ اس کا صدر دفتر دہلی میں تھا۔ انجمن کی تاریخ تاسیس 6 مئی 1913ء ہے۔ اسی روز انجمن کے قواعد وضوابط منظور ہوئے۔ انجمن کے خواب اور تصور نے عملی شکل اختیار کی۔ سب سے پہلے مولانا عبدالباری کو اس تحریک کے آغاز اور ایک انجمن کے قیام کا خیال آیا تھا۔ انہوں نے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی سے مل کر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولانا عبدالباری سے علی برادران کی پہلی ملاقات 31 دسمبر 1912ء کو ہوئی۔ اس ملاقات کا چشم دید احوال مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی محلی نے اپنے ایک مضمون ''خادم کعبہ مولانا شوکت علی'' میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

1912ء کا ایک ٹھنڈا دن تھا کہ حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کی نشست گاہ میں ایک جوان کو دیکھا۔ بھاری بھرکم، لمبا قد، متاثر کرنے والا بشرہ، پیشانی درخشاں، آنکھیں چمکدار، سر پر بالوں دار ٹوپی، داڑھی بالکل صاف، مونچھیں بڑی جن کی نوکیں اوپر کو بلند، قیمتی سوٹ اور اعلیٰ درجے کا بوٹ پہنے ہوئے، نہایت چست چوڑی دار پاجامہ، رفتار تیز، ہاتھ میں سگار، چہرے پر عجیب دلکشی اور علی گڑھی انداز سے زبان پر ''السلام علیکم'' یہ تھے مسٹر شوکت علی، بی اے (علیگ) ۔۔۔۔۔ اس کے بعد لکھنؤ کے مختلف اجتماعات میں ان سے ملاقاتیں ہوتیں اور اس زمانے کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے دستور کے خلاف انہیں سلام وکلام میں ہمیشہ پیش قدمی ہی کرتے پایا۔ اس کے بعد خدام کعبہ کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا اور وہ اس کے جنرل سیکرٹری مقرر ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار لکھنؤ آئے اور حضرت مولانا عبدالباری کے ہاں مہمان ہوئے۔''

6 مئی 1913ء کو انجمن کی تشکیل و قیام کے بعد 10 مئی 1913ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ایک مضمون روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی میں شائع ہوا، جس سے عوام اور حکومت کو معلوم ہوا کہ ''انجمن خدام کعبہ'' کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی ہے اور ایک تحریک کا آغاز ہوا ہے۔ اس کے بعد 16 مئی کو ''انجمن'' کا دستور شائع ہوا جس میں ''انجمن'' کے اغراض ومقاصد اور لائحہ عمل تفصیل سے درج تھے۔

خدّام کعبہ کا نصب العین

اب ہم ''انجمن خدام کعبہ'' کے دستور اساسی کی روشنی میں انجمن کے قیام کے پس منظر، غرض وغایت اور نصب العین کا جائزہ لیں گے۔ انجمن کے قیام کے پس منظر کی وضاحت اور نام کی صراحت دستور العمل کی دفعہ نمبر 1 میں کی گئی ہے۔ ''ضرورت انجمن'' کے زیر عنوان الفاظ یہ ہیں:

1۔ چونکہ ہمیں خانہ کعبہ کی عزت وحرمت برقرار رکھنے کے بارے میں پہلے جو اطمینان حاصل تھا، وہ اب باقی نہیں رہا ہے، اس لیے حرم کعبہ کی حرمت برقرار رکھنے کے واسطے اہل اسلام کی ایک خاص انجمن قائم کی جاتی ہے جس کا نام ''انجمن خدام کعبہ'' ہوگا۔

اس سے قدرے تفصیل کے ساتھ دستور العمل کی تمہید میں انجمن کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

الفاظ یہ ہیں:

''آج تک دنیائے اسلام اس اولین اور اہم ترین فرض کی ادائیگی سے زیادہ تر اس لیے غافل رہی ہے کہ ابتدائے اسلام نہ صرف عرب بلکہ اس کے قریب کے ایشیائی ممالک بلکہ افریقہ اور یورپ کے ایک حصے میں مسلمان فاتح ہو کر پہنچے، اور حاکم ہو کر رہے اور اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہمارے ترکی بھائیوں نے، جو ایشیاء چھوڑ کر، خود یورپ کے ایک حصے پر حکمران تھے، خدمت کعبہ کافی اہتمام کے ساتھ اپنے ذمے لے رکھی تھی اور اب بھی سلطان المعظم، حرم پاک کی جاروب کشی کو باعث یمن وسعادت خیال فرماتے ہیں، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ برسوں کے پے در پے صدموں سے اس قابل نہیں رہی ہے کہ پہلی سی قوت واستحکام کے ساتھ حرم کعبہ کی حفاظت کر سکے تو ہماری غیرت اسلامی ومحبت دینی اس امر کی مقتضی ہے کہ ہم اپنے پس پشت ڈالے ہوئے فرض کو محسوس کریں اور اپنے آپ کو قولاً وفعلاً خدام کعبہ میں شامل کریں۔''

لیکن انجمن کے قیام کا یہ پس منظر بھی بہت محدود اور مختصر لفظوں میں بیان ہوا ہے۔ بلاشبہ اہل علم اور اصحاب نظر وبصیرت کے لیے یہ اشارے کافی ہیں، لیکن مناسب ہوگا کہ اس وقت کے حالات پر زیادہ گہری نظر ڈالی جائے اور ''انجمن'' کے قیام کا تاریخی اور وسیع پس منظر دیکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہفتہ وار ''کامریڈ'' دہلی کے اس اداریئے کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا جو انجمن کے تعارف میں 7 جون 1913ء کے شمارے میں لکھا گیا تھا۔ اغلب ہے کہ یہ مقالہ مولانا محمد علی جوہر کے قلم سے ہو، کہ وہ ''کامریڈ'' کا ناشر بھی تھے، مدیر اعلیٰ بھی تھے اور انجمن خدام کعبہ کے بانی ارکان اور پہلے حلف اٹھانے والوں میں سے تھے۔

''کامریڈ'' کا یہ اداریہ دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انجمن کے اغراض ومقاصد کی تفصیل وتشریح کے

ساتھ ان غلط فہمیوں و شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مختصر سی مدت میں یعنی ایک ماہ کے اندر اندر، انجمن کے بارے میں پیدا ہو گئے تھے اور اس کے قیام کو کسی سیاسی غرض کے تابع سمجھا جانے لگا تھا۔ اداریئے کے آخر میں مقالہ نگار مسلمانوں کو مخاطب کر کے ایک اہم دینی فرض کی طرف انہیں توجہ دلاتا ہے۔

ان سطروں میں بھی انجمن کے بانیان محترم کے سچے دینی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''مسلمانانِ ہند کے لیے ہم صرف چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مقامات مقدسہ کی حفاظت، آپ سب پر بھی اتنی ہی فرض ہے جتنی کہ ترکوں پر، اور یہ بھی کہ یہ وقت کا سب سے اہم فریضہ ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہے کہ ترکی اس وقت اتنا طاقتور نہیں ہے جتنا کہ صدیوں سے کعبے کے نگہبان کی حیثیت سے رہا ہے اور اب اتنا کمزور ہو گیا ہے جتنا کہ وہ اس وقت سے، جب اس نے ایا صوفیہ پر سبز ہلالی پرچم لہرایا تھا، آج تک کبھی نہیں رہا۔ اس کے علاوہ اسے اپنی سرزمین کی حفاظت بھی کرنا ہے، جس کی اسے اس وقت شدید ضرورت ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اپنے مقامات مقدسہ کی طرف سے جتنی تشویش مسلمانوں کو 1912ء میں تھی، 1913ء میں اس سے زیادہ ہی ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے متحد ہو جانے سے پہلے اگر مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کا کوئی واقعہ پیش آ گیا تو خاموش تماشائی بنے رہنے اور زبانی افسوس کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکو گے۔

''یہ سچ ہے کہ خدا خود اپنے گھر کا محافظ ہے، لیکن یہ بات بھی ہے کہ حفاظت کا یہ کام اپنی مخلوق کے ذریعے لیتا ہے۔ مثلاً جب اصحاب فیل نے مکہ پر چڑھائی کی تھی تو اللہ نے اپنے ہاتھوں سے انہیں فنا نہیں کیا تھا، بلکہ چڑیوں کو غول در غول بھیجا، جنہوں نے کنکریاں برسائیں اور اس طرح اللہ نے حملہ آوروں کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ اب بھی اگر دشمن توپ، بندوق اور دیگر اسلحے کی مدد سے مقامات مقدسہ پر حملہ کرے گا تو کیا وہ دشمن کی چالوں کو ناکامیاب نہیں کر دے گا؟ اب خواہ وہ چڑیوں کے ذریعے کنکریوں سے ہو یا ایک منظم اور دشمنوں ہی کی طرح کے ہتھیاروں سے مسلح قوم کے ذریعے ان کی چالوں کو ناکام بنائے۔ اب یہ اعزاز خواہ چڑیوں کو ملے، خواہ تمہیں اور ہمیں یہ سوال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔''

اغراض و مقاصد

اغراض و مقاصد کی سرخی کے نیچے دستور العمل کی دفعہ 2 میں انجمن کے قیام کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اس انجمن کی اصل غرض حرم محترم کی حرمت کا برقرار رکھنا اور دنیا کے سب سے پہلے مرکز توحید یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کیے ہوئے خانہ خدا کی ہر قسم کی خدمت بجا لانا اور اس کو غیر مسلم ہاتھوں سے محفوظ رکھنا ہے۔''

اس کے بعد دفعہ 3 کے ذیل میں ان چار تدابیر کا ذکر ہے جن کے ذریعے انجمن کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کا بندوبست کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا:

(الف) جاں نثاران کعبہ اور حامیان توحید کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو حرم محترم پر اپنی جان و مال کو قربان کرنے کو بصدقِ دل سے آمادہ ہو۔

(ب) تبلیغ اسلام کو، جو سچی خدمت کعبہ ہے، باقاعدہ جاری کرنا اور اقطاع ارض میں جہاں ضرورت ہو اور مناسب معلوم ہو، داعیانِ اسلام کو کلمۂ توحید کی اشاعت و ترقی کے لیے روانہ کرنا۔

(ج) جا بجا ابتدائی اسلامی مدارس اور یتیم خانے قائم کرنا۔

(د) بیت اللہ شریف اور مسلمانوں کے تعلقات کو بڑھانا اور خانہ کعبہ کی آمد و رفت کے ذرائع و وسائل کو روز بروز زیادہ وسیع و آسان کرنا۔

انجمن کے اراکین

دستور العمل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں تو اراکین انجمن کا عنوان نظر آتا ہے۔ اس کے نیچے سات دفعات (4 تا 10) میں اراکین کی مختلف شرائط و قواعد، ان کے حلف و شناخت اور نشانات، لباس کی تفصیل اس طرح ملتی ہے:

دفعہ 4: کُل کلمہ گو اور تمام اہل قبلہ مرد ہوں یا عورت، انجمن کے رکن ہو سکتے ہیں اور وہ خادم کعبہ کہلائیں گے۔

دفعہ 5: ہر خادم کعبہ کو داخلے کے وقت نہایت خلوص کے ساتھ دو مسلمانوں کے روبرو الفاظ ذیل میں قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر حلف کرنا ہوگا:

> ''میں فلاں ابن فلاں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمام معاصی سے توبہ کر کے اور کلمۂ شہادت اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ کو پڑھ کر، اور قبلہ رو کھڑے ہو کر صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اس قبلہ (قبلے کی طرف انگلی اٹھا کر) کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے دلی جوش سے کوشش کروں گا اور خانۂ کعبہ پر غیر مسلم حملے کے وقت جان و مال سے دریغ نہ کروں گا، اور انجمن خدام کعبہ کے احکام اور قواعد کی پوری پابندی کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ''

دفعہ 6: خُدام کعبہ میں سے ان خُدام کو، جو اپنی زندگی اس انجمن کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے، وہ ''شیدائیانِ کعبہ'' کہلائیں گے، حسب ذیل الفاظ میں حلف کرنا ہوگا:

> ''میں فلاں ابن فلاں خدا کو حاضر و ناظر جان کر، قبلہ رو ہو کر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی حرم محترم کے لیے خدا کی نذر کر دی۔ اس وقت سے میری زندگی صرف خدمتِ کعبہ اور حرمت کعبہ کو برقرار رکھنے کے لیے وقف ہے، اور انجمن خدام کعبہ میرے لیے سب سے زیادہ ضروری اور اہم ترین فرائض ہوں گے۔ ان احکام کو بلا عذر و بلا تاخیر بجالانے کے لیے میں دل و جان سے حاضر ہوں۔ جہاں اور جس زمین میں بھیجا جائے گا، فوراً بلا تاخیر روانہ ہو جاؤں گا۔ کوئی مشکل مجھے مانع نہ ہوگی۔ اس اقرار و عہد و پیمان کے ساتھ میں دو بارہ اپنے دین کی، اپنے خدا کی، اپنے قرآن کی، اپنے رسول ﷺ کی اور اپنی عزت و حُرمت کی قسم کھا کے ''شیدائیان کعبہ'' کی جماعت میں شامل ہوتا ہوں۔''

دفعہ 7: جائز ہے کہ بعض حضرات ایک مقررہ زمانے ہی کے لیے "شیدائیان کعبہ" کے گروہ میں شامل ہو کر مذکورہ بالا حلف کے ذریعے سے "شیدائیان کعبہ" کی ذمہ داریوں کو اپنے ذمے لیں۔

دفعہ 8: شیدائیان کعبہ اور ان کے اہل و عیال کے مصارف زندگی و بود و باش حسب ضرورت انجمن خدام کعبہ کے ذمے ہوں گے اور اس طرح ان کی خدمات مفوضہ کے تمام مصارف کو انجمن مذکور ادا کرے گی۔

دفعہ 9: یہ حقوق ان شیدائیوں کو، جو کسی محدود مدت کے لیے شیدائیوں کی جماعت میں شامل ہوں، اس زمانے تک حاصل رہیں گے جب تک ان کا شمار "شیدائیان کعبہ" میں ہو۔

دفعہ 10: جملہ خدام کے لیے لازم ہے کہ ایک زرد ہلالی نشان، جس میں سیاہ حرفوں میں "خدام کعبہ" کے الفاظ کڑھے ہوں، اپنے لباس میں سینے کے مقام پر لگائیں اور جب انجمن کے کسی جلسے میں شریک ہوں یا جس وقت انجمن کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہوں، نشان مذکور کو ضرور لگائے ہوئے ہوں مگر "شیدائیان کعبہ" کا فرض ہوگا کہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایک سبز رنگ کا لباس پہنے ہوئے نظر آئیں، جس پر مذکورہ نشان کے علاوہ "شیدائیان کعبہ" کا نشان بھی ہوگا۔ خاص جلسوں کے موقعوں پر بطور لباس کے سبز عبا ہوگی، جس پر دونوں نشان لگے ہوں گے۔

انجمن کا نظام

اس کے بعد دستور العمل کی مزید 18 دفعات میں (دفعہ 11 تا 28) انجمن کے نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ "انجمن" کے تمام نظم و نسق کا ذمہ دار ایک مرکزی ادارہ ہوگا جو "انجمن اصلیہ خدام کعبہ" کہلائے گی۔ پورے ملک اور صوبوں اور ریاستوں کی انجمن قائم ہوگی۔ اس مرکزی ادارے کے ماتحت ہوگی۔ صوبوں اور ریاستوں کی انجمن ہائے خدام کعبہ اپنے صوبوں اور ریاستوں کے ناموں سے منسوب ہوں گی۔ اضلاع کی انجمن صوبہ و ریاست کی "انجمن عالیہ خدام کعبہ" کے ماتحت ہوں گی۔ اور "انجمن خدام کعبہ ضلع فلاں" کے نام سے متعارف ہوں گی۔ اسی طرح اضلاع کے ماتحت قصبوں اور حلقوں میں "انجمن ہائے خدام کعبہ" قائم ہوں گی اور اپنے قصبے، گاؤں اور حلقے کے نام سے پکاری جائیں گی۔

ہر ادنیٰ انجمن اپنے سے اعلیٰ انجمن کے ماتحت ہوگی۔ "انجمن اصلیہ خدام کعبہ" ایک خود مختار ادارہ ہوگی، اور ہر انجمن اس کے فیصلوں اور احکام کی پابند ہوگی۔

"انجمن خدام کعبہ" کا قیام عمل میں آتے ہی یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا تھا کہ انجمن اصلیہ میں کن صوبوں، علاقوں اور ریاستوں کے وکلاء (نمائندے) ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

(الف) برطانوی ہندوستان میں: مشرقی بنگال، مغربی بنگال، بہار و اڑیسہ، اودھ، راجپوتانہ و وسط ہند، برما۔

(ب) مسلم ریاستوں میں: حیدر آباد دکن، بھوپال، رام پور، جوناگڑھ، بہاول پور، خیر پور سندھ، ٹونک۔

(ج) دیگر ریاستیں: کشمیر، میسور۔

انجمن اصلیہ کے اراکین

دستور عمل کے آخر میں انجمن اصلیہ کے اراکین کی حیثیت سے چھ صاحبوں کے نام ہیں۔ ان میں ایک

صدر خادم الخدام، دو ان کے معتمدین اور تین ارکان ہیں:

1۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی لکھنؤ، خادم الخدام

2۔ حکیم عبدالولی صاحب، لکھنؤ

3۔ ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب، بیرسٹر لکھنؤ

4۔ مسٹر محمد علی صاحب، ایڈیٹر کامریڈ ہمدرد، دہلی

5۔ مسٹر مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر لکھنؤ (معتمد)

6۔ مسٹر شوکت علی صاحب، بی اے، رام پور (معتمد)

''انجمن'' کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی سرکاری حلقوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے اور اس کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا شوکت علی نے جتنی بھی کوششیں کیں، وہ ان شبہات کے لیے مزید تقویت کا موجب ثابت ہوئیں۔ برطانوی حکومت نے ''انجمن خدام کعبہ'' پر جو شکوک قائم کئے، اور یہ شکوک پیدا ہونے کیا اسباب تھے۔

انگریزی حکومت کے شکوک وشبہات

برطانوی حکومت یوں بھی مسلمانانِ ہند کی ہر مذہبی، سماجی اور تعلیمی انجمن کے قیام کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ ''انجمن خدام کعبہ'' کے تو دستور العمل کی پہلی دفعہ ہی میں اس کے شکوک وشبہات کے لیے کافی سروسامان موجود تھا۔ دستور میں کہا گیا تھا:

''چونکہ ہمیں خانۂ کعبہ کی حرمت وعزت برقرار رہنے کے بارے میں پہلے جو اطمینان حاصل تھا، وہ اب باقی نہیں رہا ہے، اس لیے خانۂ کعبہ کی حرمت برقرار رکھنے کے واسطے اہل اسلام کی ایک ''خاص انجمن'' قائم کی جاتی ہے۔''

دستور کی دفعہ 2 میں کہا گیا تھا: ''اس انجمن کی اصلی غرض حرم محترم کی، ہر قسم کی خدمات بجا لانا اور اس کو غیر مسلم ہاتھوں سے محفوظ رکھنا ہے۔''

دفعہ 3 میں یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے پہلی تدبیر یہ بتائی گئی: ''جاں نثارانِ کعبہ اور حامیانِ توحید کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو حرم محترم پر اپنی جان ومال کے قربان کرنے کو صدقِ دل سے آمادہ ہو۔''

انجمن کے دستور ہی میں نہ صرف برطانوی ہند میں بلکہ کشمیر ومیسور، تمام مسلم ریاستوں اور پڑوس کی برطانوی کالونی یعنی برما، حتیٰ کہ غیر مسلم ریاستوں تک میں، جہاں جہاں ''انجمن اصلیہ خدام کعبہ'' مناسب خیال کرے، انجمن کی اعلیٰ وادنیٰ شاخوں اور تنظیموں کا جال پھیلا دینے اور اسلامی جماعتی زندگی اور بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر دینے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا۔

برطانوی حکومت کے شکوک وشبہات کو مزید تقویت دینے کے لیے دستور میں شامل حلف بھی تھا، جس میں ہر رکن سے یہ حلف لیا جاتا تھا کہ وہ خانۂ کعبہ پر غیر مسلم حملے کے وقت جان ومال کے ایثار سے دریغ نہ کرے گا اور انجمن

کے احکام کو بلا عذر و تاخیر بجا لائے گا۔

یہ تمام امور حکومت کے حلقوں میں شکوک پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انجمن کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔ اس کا اندازہ ارباب انجمن کو بھی تھا، اس لیے خادم الخدام مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا جو مضمون اس کے قیام و اعلان کے صرف چار یوم کے بعد شائع ہوا تھا، اس میں دانستہ کوشش کی گئی ہے کہ حکومت کے ارکان اسے سیاسی انقلابی انجمن خیال نہ فرمائیں۔ لیکن یہ غلط فہمی دور تو کیا ہوتی، مولانا صاحب کے اس مضمون نے بھی شکوک وشبہات میں مزید اضافہ کر دیا۔ پھر جوں جوں اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی، شکوک بڑھتے ہی گئے۔ مولانا مرحوم نے صراحت سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ ایک خالص مذہبی و دینی انجمن ہے، اور سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لیکن برطانوی حکومت مولانا عبدالباری کے اس بیان سے مطمئن نہ ہوئی۔

اسی طرح مولانا شوکت علی نے یوپی کے سیکرٹری کے نام جو 14 نومبر 1915ء کو خط لکھا، وہ بھی حکومت کو چوکنا اور خبردار کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مولانا صاحب اپنے خط میں انجمن کے قیام کی خاص وجہ یہ لکھتے ہیں:

''خدمتِ کعبہ ہر مسلمان مرد و عورت و بچہ پر فرض ہے، اور مسلمان کو، اگر وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے تو خادم کعبہ ہونا چاہیے۔ ہماری انجمن صرف اسی وجہ سے قائم کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو خدا کے ایک ایسے حکم پر عمل کرنے میں ان کی مدد کرے جسے انہوں نے فروگزاشت کر دیا تھا، خاص کر حال میں جب کہ خادم الحرمین الشریفین، خلیفۃ الرسول امیر المؤمنین سلطان المعظم ترکی خلداللہ ملکہ وسلطنتہ، ایسے کمزور ہو گئے ہیں کہ مقدمات مقدسہ کی حرمت غیر مسلم سلطنتوں کے خلاف قائم رکھنا ایک مشکوک امر باعتبار ان کی طاقت کے تمام دنیا کے مسلمان خیال کرنے لگے ہیں۔''

حکومت کے خاص وفاداروں کے بارے میں مولانا صاحب اپنے اس خط میں لکھتے ہیں: ''مجھ کو یہ تحریر کرنے کی ضرورت تھی کہ سرکار کی دس کروڑ مسلمان رعایا کس قدر خوش ہوئی تھی، اس اعلان سے جو اوائل جنگ میں شائع کیا گیا تھا کہ اسلام کے مقامات مقدسہ کی حرمت برقرار رکھی جائے گی۔ یہ فعل نہایت مدبرانہ تھا اور تمام وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عرب پاک کو سلطنت انگلشیہ میں ملا لینا چاہیے اور اس طور پر گورنمنٹ کو دھوکا دے کر اپنی زبانی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے ہیں، اس سلطنت کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور اس قابل ہیں کہ پھانسی دے کر سب سے اونچے درخت پر لٹکا دیئے جائیں۔''

اسی خط کا یہ فقرہ بھی قابل لحاظ ہے: ''وہ خدام کعبہ جو واقعی ایک بہت بڑی مذہبی تحریک ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسلام کو زندہ کرنے میں مدد کرے گی۔''

یہ ناممکن تھا کہ ان صراحتوں کے بعد بھی حکومت ''انجمن خدام کعبہ'' کے بارے میں حُسنِ ظن میں مبتلا رہتی۔ 1914ء کے اواخر میں جنگ چھڑنے کی وجہ سے حجاج کرام کی بحفاظت واپسی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر ''انجمن'' نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو 9 نومبر 1914ء کو مولانا شوکت علی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضور والا نے وائسرائے کا دوسرا اعلان ملاحظہ فرمایا ہوگا، جس میں جرمن قوم کی جھوٹی تردید کی گئی ہے کہ برطانیہ نے جدہ پر گولہ باری کی۔ اس قسم کی افواہیں اس وقت اڑیں گی اور مخلوق میں سخت بے چینی کا باعث ہوں گی۔ اس کا علاج یہی ہے کہ حجاج وہاں ٹھہرنا شروع ہوں اور سچے طور پر انکار کر دیں گے۔ مسلمان ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ کسی وجہ سے بھی، ایک منٹ کے لیے جدہ یا عرب مقدس سے خادم الحرمین الشریفین کے علاوہ کسی دوسرے کا تعلق ہو۔ بدرجہا بہتر ہے کہ حجاج وہاں ٹھہر کر مریں۔ اس لیے اب سب کی رائے کا وقت آ گیا ہے کہ حضور ''انجمن خدام کعبہ'' کی طرف سے وائسرائے بہادر سے حجاج کی واپسی کی نسبت ان سے دریافت کریں کہ آپ نے کیا سوچا ہے۔ انگریزی جہاز وہاں نہیں جا سکتے اور وہاں کے جہاز یہاں نہیں آئیں گے۔ امریکا، اٹلی، سویڈن وغیرہ کے جہاز ان کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ حضور اجازت دیں کہ ہم اس کا انتظام خود کر لیں۔''

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نہ تو انجمن کو حکومت پر اعتماد تھا اور نہ حکومت انجمن کے متعدد ارباب انجمن کے عزائم کی طرف سے مطمئن تھی، لیکن چونکہ اس وقت کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ انجمن حکومت کے خلاف کوئی تحریک شروع کرے یا حکومت انجمن کے خلاف کوئی کارروائی کرے، اس لیے ایک سرد جنگ تھی جو حکومت اور انجمن کے مابین جاری تھی۔ اس کا اندازہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے مارچ 1915ء کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے حکومت برطانیہ (لندن) کو ہندوستان کے حالاتِ حاضرہ سے مطلع کرنے کے لیے لکھا تھا۔ اس خط میں اتحاد اسلامی کی تحریک اور انجمن خدام کعبہ کی کوششوں کے بارے میں صاف لکھا ہے:

''ترکی کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کے باعث ہندوستان کی پان اسلامک پارٹی قدرتی طور پر مضطرب ہے، اور ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اب وہ پنجاب کے سکھ شورش پسندوں کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انجمن خدام کعبہ (جسے مولانا شوکت علی نے قائم کیا تھا) کے صدر نے اس تحریک کی بھی مخالفت کی ہے، جس کا مقصد جنگ میں برطانوی حکومت کی حمایت میں فتوی کا اجراء تھا۔''

جون 1916ء میں حجاز میں شریف مکہ حسین کی ترکوں کے خلاف بغاوت کے بعد مولانا عبدالباری نے ''انجمن خدام کعبہ'' کے صدر کی حیثیت سے وائسرائے کے نام ایک تار میں مسلمانانِ ہند اور اپنی جانب سے شدید غم و غصہ کا اظہار کیا تھا۔ چونکہ یہ حقیقت ظاہر و معلوم تھی کہ شریف مکہ کو ترکی کی حکومت کے مقابلے میں انگریزوں کی حمایت حاصل تھی، اس لیے انگریزی حکومت نے مولانا کے غم و غصے کو اپنے ہی خلاف سمجھا۔ مولانا نے اس تار میں کہا تھا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو قتل و غارت گری کے میدان میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ رسول اکرم ﷺ کے روضۂ اقدس پر یہ غاصبانہ قبضہ مسلمانوں کے لیے دل آزاری ہی کا باعث نہیں، بلکہ وہ اس کے ذمہ داروں کو ہمیشہ اسلام کے دشمنوں کے طور پر یاد رکھیں گے۔

اس شک کی بناء مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو، جو تحریک اتحاد اسلامی اور انجمن خدام کعبہ کے بڑے رہنماؤں میں تھے مئی 1915ء میں نظر بند کر دیا گیا۔ حکومت کی بدگمانیوں کی کیفیت کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ اس کے علم میں آیا کہ مولانا شوکت علی جھنڈ واڑہ کی مسجد میں نماز پڑھاتے اور خطبہ جمعہ دیتے ہیں، تو ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ نماز وخطبہ میں کیا پڑھتے ہیں؟ مولانا شوکت علی نے اپنے 15 فروری 1917ء کے خط میں مولانا عبدالباری کو لکھا:

''اب مجھ سے دوبارہ دریافت کیا گیا ہے کہ میں نے نماز میں کیا پڑھا تھا۔ اس کے جواب میں، میں نے پورا خطبہ بھیج دیا، اور اس میں اس حصے کا ترجمہ بھی بھیج دیا، جس کا تعلق حضور سلطان المعظم خلیفۃ الرسول خادم الحرمین الشریفین سے تھا، تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان کس طرح سے اپنے خلیفہ کے لیے دعا مانگنے کے عادی ہیں۔ یہ کتاب خطبوں کی میری ملکیت نہ تھی، بلکہ مسجد کی ملکیت کی تھی اور تقریباً تیس برس ہوئے کہ طبع ہوئی تھی۔ میں نے جو نماز میں قرآن پاک تلاوت کیا تھا، وہ بھی مع ترجمہ کے لکھ دیا۔ دعا میں نے پڑھی، جو برسوں سے پڑھتا ہوں اور اسلام کی ترقی اور اس کے دشمنوں کی تباہی، کفر کا دنیا سے غائب ہونا، مسلمانوں کو قوتِ ایمانی کا نصیب ہونا، دین کی راہ میں ہر ایک کو توفیق ہو، تاکہ وہ جان، مال، وقت، قابلیت سب کچھ خوشی سے صرف کرے۔ حضور سلطان المعظم خلیفۃ الرسول کے لیے دعا کہ خدا ان کی مدد فرمائے اور ان کے مرتبے میں ترقی کرے۔ عساکر مسلمین کے لیے دعا، وہ دعا جو ہمیشہ مانگتا رہتا ہوں۔''

لیکن حکومت ان کے کسی بیان سے مطمئن نہیں ہوئی، اور اب تک مولانا شوکت علی یونیورسٹی (علی گڑھ) کے معاملات پر یا انجمن خدام کعبہ کے کاموں کے بارے میں کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے، اور بیانات و مراسلات کا اجراء و اشاعت، دفتر کے تنظیمی امور، چندے کی وصول یابی اور دیگر امور کے بارے میں وہ مولانا عبدالباری اور دوسرے سر کردہ حضرات کے نام تحریر کرتے رہتے تھے، اب حکومت نے انہیں اس سے بھی روک دیا۔ 30 مارچ 1916ء کو مولانا شوکت علی مولانا عبدالباری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''خط وکتابت کے بارے میں یہ قطعی فیصلہ نہیں ہوا کہ کون سی خط وکتابت خانگی تھی۔ علی گڑھ وغیرہ کے معاملات پر اجازت ہے، مگر مسلم یونیورسٹی کی نسبت نہیں۔ ''خدام کعبہ'' پر خط وکتابت میں نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کو یہ حضرات پولیٹیکل کہتے ہیں۔ میں نے عرض کر دیا تھا کہ نفسِ خدمت کعبہ سے تو میں کسی وقت بھی بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ رہا انتظامی امور میں مشورہ دینا تو اس میں اپنی دوری کی وجہ سے ویسے بھی مجبور تھا اور بفضل تعالیٰ اس کے خواہاں بہت موجود ہیں۔ ہم نے خود ہی اختتام جنگ اپنے کاروبار کو کم کر دیا ہے، مگر اس مقدس اور قابل قدر کام کو پولیٹیکل ٹھہرانا، ایک نہایت تعجب انگیز امر تھا۔ کل کو نادان لوگ فقط غیر واقفیت کی بنا

پر قرآن کو پولیٹیکل کہہ دیں گے۔

مرض بڑھتا گیا۔۔۔۔۔

''انجمن'' کے رہنماؤں نے اگرچہ بظاہر یہی کہا کہ یہ ایک مذہبی و دینی انجمن ہے اور اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، کوئی مسلمانوں میں نظم واتحاد کی کوشش، انہیں بیدار کرنے، انہیں بہترین مسلمان بنانے اور اسلام کو پھر سے زندہ کر دینے کی تحریک، نیز ملک وقوم کی خدمت کی مشق وتربیت، ترکی اور عربوں کی ہر قسم کی امداد، انگریزوں کے حلیف شریف مکہ حسین کے خلاف شدید نفرت کا اظہار اور حجاز مقدس میں فتنہ وفساد کے اصل بانیوں اور ذمہ داروں کو دشمنانِ اسلام کے طور پر یاد رکھنے کی دھمکی اور ایک خاص مکتبۂ فکر کے علماء ومشائخ کے ایک ایسے فتوے کی مخالفت، جس سے جنگ عظیم میں حکومت برطانیہ کو تقویت پہنچنے کی امید تھی۔۔۔۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں، جن کی وجہ سے ''انجمن خدام کعبہ'' کو ایک مذہبی و دینی انجمن سے ''کچھ زیادہ'' ثابت ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے سیاسی ''نصب العین'' کے بارے میں حکومت کو جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی، وہ کبھی دور نہیں ہوئی۔ ایک بڑے انگریز افسر سر ولیم بارٹن کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ''انجمن خدام کعبہ'' کو فقط ایک سیاسی انجمن ہی نہیں سمجھا، بلکہ اسے ایک خفیہ تنظیم اور اس کے ارکان کو انقلاب پسند سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''انڈیاز نارتھ ویسٹ فرنٹیر'' میں لکھتا ہے:

> ''مسلم ہندوستان میں ہمیشہ مذہبی جذبات کارفرما رہے ہیں۔ وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف برابر نفرت کا اظہار کرتے ہوئے، دوبارہ اسلامی حکومت قائم ہونے کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ ان جذبات کو خفیہ انجمنیں مثلاً خدام کعبہ، دارالعلوم دیوبند وغیرہ ہوا دیتی رہتی ہیں۔''

انجمن خدام کعبہ کے بارے میں ولیم بارٹن کے ان جملوں سے حکومت برطانیہ کے اندازِ فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مصنف کا ذاتی نقطۂ نظر ہے، اس لیے اسے کلیۃً حکومت کی رائے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس، سی آر کلیولینڈ کے ایک نوٹ (مورخہ 20 مارچ 1914ء) سے، جو اس نے اپنے نائب کی رپورٹ پر لکھا تھا، حکومت کے نقطۂ نظر کا علم بخوبی ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''اس انجمن کے بارے میں بہت سے لائق مبصرین کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل کرے گی۔ اس انجمن کے حقیقی اغراض کے بارے میں شکوک پائے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا تجسس ہے کہ آیا یہ انجمن کی، حکومت کی قوت اور استحکام کا باعث ہوگی یا اس کے ضعف کا سروسامان کرے گی؟ اور یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد میں استحکام پیدا کرے گی یا اس کی کمزوری کا سبب بھی ثابت ہو سکتی ہے اور بالآخر یہ کہ یہ انجمن دیوبندی اور بعض دیگر مسلمانوں کی طرح مجرمانہ سیاسی پروپیگنڈے میں ملوث ہو جائے گی اور اس کی حوصلہ افزائی کرے گی یا حوصلہ شکنی کرے گی؟ یہ سوالات

ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ انجمن ایک مضبوط ہتھیار کی حیثیت سے کام کرے گی۔ اس کے موجودہ لیڈر اولاً تو اپنے ذاتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور ثانیاً ان کے سامنے اپنا وہ زاویہ نگاہ ہے کہ جو وہ سیاسی و مذہبی معاملات میں رکھتے ہیں۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ وہ اس امر سے بے پروا ہیں کہ وہ جن عزائم کے حصول کے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ملک اور عوام کے مختلف طبقوں کو ایک ہیجان میں مبتلا کر دیں گے اور خطرات میں گھسیٹ لیں گے۔ اس لیے میں اس انجمن کو خطرناک تصور کرتا ہوں اور میرے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ اس کے منتظمین اس کو پُر خطر نہیں بنانا چاہتے۔ یہ جارحیت پسند ہے نہ کہ امن پسند۔ ہندوستانی عوام اور حکومت کا اس کی جارحیت پسندی کا ناگوار احساس ضرور کرے گی۔ انجمن کے جوشیلے افراد کے نزدیک یہ قابل جواز انتقال کا ایک حربہ ہے۔ بلاشبہ انجمن مختلف مرحلوں سے گزرے گی۔ فی الحال اس کے لیڈر حکومت کے سامنے بھیڑ کی کھال میں آنا چاہتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنا اصل روپ نہیں چھپا سکتے۔ بہرکیف اس انجمن پر صوبائی اور امپیریل سی آئی ڈی کی نظر رہنی چاہیے۔''

20 فروری 1914ء کی خفیہ رپورٹ میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان میں مولانا محمد علی کا نام سب سے پہلے ہے۔ پھر مولانا شوکت علی کا ذکر ہے کہ وہ علی گڑھ میں ''انجمن'' کا رسوخ بڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ مشیر حسین قدوائی، حکیم عبدالولی آف لکھنؤ، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ کا ذکر ہے۔

سلسلۂ دارو گیر:

انجمن خدام کعبہ کی حیثیت ونوعیت اور اس کے عزائم کے بارے میں شکوک وشبہات اور اس کے ارباب و کارکنان کی سرگرمیوں نے ان کی گرفتاری، قید و بند اور نظر بندی کا سامان پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی گرفتاری ونظر بندی کا اصل سبب ''انجمن'' ہی تھا۔ انجمن کے خدام اور شیدائیوں کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا۔ بیشتر کارکن اپنی جماعت کے رہنماؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دفتر کے کاغذات، مسلیں، خطوط، ارکان کے نام پتوں اور کوائف کے رجسٹر اٹھا کر پولیس کے حوالے کر دیئے۔ رہنماؤں کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی تو دفتر پر قبضہ کر لیا اور ارباب انجمن کو اس سے بے تعلق کر دیا۔ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ارکان انجمن کو ان کے ضلعوں اور قصبوں میں دھونس، سختی، تشدد اور لالچ کے ذریعے سے اس طرح خاموش کر دیا گیا کہ پھر کوئی آواز ملک کے کسی گوشے سے نہ اٹھ سکی۔ اقبال شیدائی لکھتے ہیں:

''پورے ملک میں ۹ شیدائیان کعبہ تھے اور جب جنگ شروع ہوئی تو ۸ شیدائیوں نے استعفیٰ دے دیا۔ صرف میں نے استعفیٰ نہیں دیا۔''

اقبال شیدائی نے ''انقلابی کی سرگذشت'' میں یہ حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ انہیں اس تحریک سے جدا کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے تھے۔ ان کے خاندان کے افراد سے ملاقات کے باا ثر اصحاب سے، حکومت کے ضلعی حکام سے ان پر دباؤ ڈلوایا گیا۔ خود اقبال شیدائی کے بھائی کو دھمکی دی گئی کہ اگر انہوں نے اقبال کو اس کی سرگرمیوں سے باز نہ رکھا تو انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔ خود انہیں روشن مستقبل کا لالچ دیا گیا اور تحریک سے الگ نہ ہونے کی صورت میں انہیں شدائد و مصائب سے ڈرایا گیا، لیکن جب ان پر ان باتوں کا اثر نہ ہوا تو انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ مئی 1915ء میں علی برادران کو نظر بند کیا گیا تھا۔ اُس وقت میں تحریک کے سب سے فعال اور سرگرم شیدائی محمد اقبال شیدائی کو نظر بند کیا گیا تھا، اور صرف اس ایک شیدائی کی نظر بندی کی بدولت پنجاب اور خصوصاً صوبہ سرحد میں یہ تحریک پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ بیشتر کارکن ابتلاء و آزمائش اور شدائد و مشکلات کے تصور سے داعیۂ خدمت سے دستبردار ہو گئے اور خدمتِ کعبہ کے عہد اور میثاق کو توڑ دیا۔ صوبہ سرحد کی حالت کے بارے میں اللہ بخش یوسفی نے اپنی کتاب ''سرحد اور جدوجہد آزادی'' میں لکھا ہے:

> ''بہر حال جب جنگ عظیم اول کے بادل فضا میں منڈلانے لگے تو حکومت نے صوبہ سرحد میں اس انجمن کی طرف توجہ دی اور پہلا عتاب حکیم محمد امین پر گرا، جو پشاور کے مشہور حکیم محمد عبداللہ کے فرزند اور بازار پل پختہ میں منیاری کی دکان کرتے تھے۔ انہیں انجمن خدام کعبہ کے پشاور میں خزانچی ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ان سے اراکین کی تعداد، جمع شدہ رقم اور اس سلسلے کی دوسری معلومات حاصل کرنے کے لیے ان پر رعب ڈالا جاتا رہا، اور جب علی برادران نظر بند ہوئے تو خود بخود یہ انجمن بھی ختم ہوگئی اور حکیم صاحب بھی آزمائش سے بچ نکلے۔''

تنظیم اسلامی کا پیغام
نظام خلافت کا قیام

سن ستاون کی جنگِ آزادی کے اثرات

1857ء کی جنگ آزادی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک بغاوت کی نہ تھی جسے فرو کر دیا گیا اور معاملہ ختم ہوا۔ بقول مولانا غلام رسول مہر ''یہ ایک عوامی اور ہمہ گیر تحریک تھی اور اس میں نہ صرف فوج نے بلکہ عوام کے تمام طبقوں نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا''۔ 1860ء تک جنگ چھوٹے بڑے شہروں کی گلیوں اور کوچوں میں ختم ہو چکی تھی، لیکن اس نے ہندوستان کے کروڑوں عوام، بالخصوص مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر گہرے اثرات قائم کیے۔

جنگ کا پہلا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ مسلمانوں نے اس جنگ میں بہت سرگرمی دکھائی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، حتیٰ کہ جنوبی ہند میں جہاں وہ بہت کم تعداد میں ہیں، 1857ء اور 1859ء کے درمیان انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی بہت سی سازشیں پکڑی گئیں۔ انگریز سپاہیوں کے بیانات اس قسم سے بھرے پڑے ہیں کہ ''اگر ہندوؤں کا گاؤں ہوتا تو ہم اس میں جانے سے نہ ڈرتے تھے، لیکن مسلمانوں

کے دیہات میں جانے سے ہمیں خوف آتا تھا۔ ہندو انگریزوں سے ہمدردی کے جذبات کا اظہار کرتے تھے لیکن مسلمان اپنے خونیں اور انتقامی جذبات کو نہیں چھپاتے تھے۔"

جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں اور ہندوؤں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ یہ صرف ہندوؤں کی یا صرف مسلمانوں کی بغاوت نہ تھی بلکہ مشترکہ جنگ تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان چند تاریخی اور نظریاتی وجوہ کی بنا پر ہندوؤں کی نسبت انگریزوں کے سخت اور شدید مخالف تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو شاہ ولی اللہ کے فلسفے اور سیّد احمد شہید کی جہادی تحریک کے زیر اثر تھے اور انگریزی حکومت کے تحت ہندوستان کو "دارالحرب" سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک بیرونی حکمرانوں کے خلاف جہاد ایک قومی ضرورت ہی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا۔ اسی وجہ سے حکومت برطانیہ نرم مزاج ہندوؤں کی نسبت تندمزاج مسلمانوں سے زیادہ ڈرتی تھی۔ اسی لیے مسلمانوں کو بہت بری طرح ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مسلمانوں کے بہت سے سربرآوردہ رہنماؤں مثلاً جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر اور فرخ آباد کے نوابوں کو پھانسی دے دی گئی یا جلاوطن کر دیا گیا۔ 18 نومبر 1857ء کو دہلی میں فجر کے وقت چوبیس شہزادوں کو پھانسی دی گئی۔ بادشاہ کے دو بہنوئی تھے، دو داماد تھے اور باقی بھانجے اور بھتیجے تھے۔ مسلمانوں کا ایک ایک گھرانہ خاص طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ مثلاً جنرل نیل کی میجر رینالڈ کو یہ ہدایت تھی: "فتح پور میں جس جس شخص نے بغاوت کی ہے، اس کو کچل دیا جائے۔ پٹھانوں کے مکانوں کو مکینوں سمیت تباہ کر دیا جائے۔"

مسلمانوں کی جائیدادیں بڑے پیمانے پر ضبط کی گئیں۔ دہلی پر دوبارہ قبضے کے چند ماہ بعد ہی ہندوؤں کو تو واپس آنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن مسلمانوں کو اس قسم کی اجازت نہیں دی گئی۔ دہلی ڈویژن میں ہر مسلمان پر اس کی جائیداد کے چوتھائی حصے کی قیمت کے برابر جرمانہ کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں پر جو جرمانہ کیا گیا، وہ دس فی صد تھا۔

انگریزوں کے غصے اور انتقام کا ہدف خاص طور پر مسلمان تھے۔ کیپٹن رابرٹ نے لکھا: "ان بدمعاش مسلمانوں کو مزا چکھاؤ۔ ان کو بتادو کہ خدا کے فضل سے انگریز ہمیشہ ہندوستان کے مالک رہیں گے۔"

مسلمانوں کے مصائب بے پناہ تھے۔ بے خطا اور خطاوار دونوں ہی انگریزوں کے انتقامی جذبے کا شکار ہوئے حتیٰ کہ سرسیّد جیسے پکے وفادار کے اہل خاندان کو بھی مصیبتوں اور موت کی شکل میں بہت بڑی قربانی ادا کرنی پڑی۔ اس زمانے کے مسلمانوں کے خوف وہراس کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو غالب کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مسلمانوں نے ہر مرحلے اور ہر قدم پر انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انہیں شکست ہوئی، لیکن انہوں نے شکست کو تسلیم نہیں کیا اور بہت عرصے تک صلح اور مفاہمت پر آمادہ نہ ہوئے اور مختلف شکلوں میں اس جدوجہد کو جاری رکھا۔ انہوں نے انگریزی تعلیم کو رد کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں وہ اپنے ہم وطن ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے۔ ہندو مغربی خیالات کو تیزی سے اپنا رہے تھے۔ مفاہمانہ طرزِ عمل سے اپنے آپ کو نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال رہے تھے، لیکن مسلمان ان سب چیزوں سے الگ تھلگ، اپنے عقائد و روایات میں مگن تھے۔

مسلمانوں کی تحریک احیائے علوم، جو ''دلی کالج'' کی شکل میں ابھر رہی تھی، جنگ آزادی کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ ''کلکتہ ریویو'' (شمارہ جنوری تا جون 1858ء) کے مدیر نے اپنی رپورٹ میں لکھا: ''پانچ برس ہوئے، میں دہلی گیا تھا۔ وہاں مسلم پریس کی زبردست سرگرمیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا''۔ لیکن دہلی کی غارت گری اور تباہی سے ان علمی سرگرمیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور اسلامی تہذیب کا گلشن مرجھا کر رہ گیا۔

اس کے برعکس شہر کلکتہ، جو ہندوؤں کی تحریک احیائے علوم کا مرکز تھا، جنگ آزادی کی تمام مصیبتوں سے محفوظ رہا، اور ہندوؤں کی یہ تحریک کمزور ہونے کی بجائے زیادہ طاقتور ہو گئی۔ اس طرح دونوں قوموں کے درمیان جو پہلے ہی جداگانہ تشخص رکھتی تھیں، اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی رہی، جس کی بناء پر ہندوستان اور اس کی آبادی کو حقیقی وحدت کی شکل میں استوار کرنا مشکل ہو گیا۔

جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ختم ہو گئی۔ برطانیہ میں کمپنی کے خلاف اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی اور یہ مطالبہ شدت پکڑ گیا کہ کمپنی سے ہندوستان کی حکومت چھین لی جائے۔ 1853ء کے چارٹر میں یہ کہا گیا تھا کہ حکومت ہند تاج برطانیہ کی طرف سے بطور امانت کمپنی کے پاس رہے گی۔ اب نئے بیان کے تحت حکومت کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس امانت کو کمپنی سے واپس لے لے۔ لارڈ پامرسٹن نے پارلیمنٹ میں اس مقصد کے لیے ایک بل پیش کیا جو کمپنی کی شدید مخالفت کے باوجود پاس ہو گیا۔ اس کی رُو سے ہندوستان کی حکومت ملکہ وکٹوریہ نے خود سنبھال لی اور کام چلانے کے لیے وائسرائے مقرر کیا جانے لگا۔ حکومت ہند کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک الگ وزیر سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (وزیر ہند) مقرر کیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے پندرہ آدمیوں کی ایک ''انڈیا کونسل'' مقرر کی گئی۔ وزیر ہند اور انڈیا کونسل ہندوستان کے تمام امور و معاملات پر کنٹرول کے ذمہ دار تھے۔ انہیں تنخواہ بھی ہندوستان ہی کے خزانے سے ملتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے ''قیصرۂ ہند'' کا لقب اختیار کر لیا۔

جنگ آزادی کے بعد حکومت برطانیہ کے اعصاب پر یہ خیال طاری ہو گیا کہ ایسے زبردست اقدامات کئے جائیں کہ ہندوستان میں ''غدر'' جیسے واقعات دوبارہ پیدا نہ ہوں۔ اس مقصد کے تحت فوج کو از سر نو منظم کیا گیا۔ آرمی کمیشن نے 1879ء کی رپورٹ میں لکھا: ''غدر نے ہمیں جو سبق سکھائے ہیں، ان سے دو اصول اخذ کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں برطانوی فوجیں بہت بڑی تعداد میں تعینات کی جائیں دوسرے یہ کہ توپ خانہ صرف ہماری فوج کے ہاتھ میں رہے اور ہندوستانیوں کو اس کے قریب بھی پھٹکنے نہ دیا جائے۔

ہندوستان میں برطانوی راج کی مضبوطی، استحکام اور حفاظت کے لیے صرف فوج کی تنظیم نو کافی نہ تھی۔ حکومت کی بنیادوں کو مضبوط بنانا ضروری تھا۔ حکومت کی بنیادیں تھیں وہ راجے مہاراجے، جاگیردار، زمیندار، جنہوں نے دورانِ جنگ انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے اعلان 1858ء میں صاف لفظوں میں اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں حکومت کی ''بنیادوں'' کو مضبوط کیا جائے گا۔ بنیادوں کو مضبوط کرنے کا مقصد ہندوستان کے معاشرے میں سیاسی اور سماجی رجعت پسندانہ عناصر کی مدد ہی سے پورا ہو سکتا تھا۔

جنگ آزادی کا پانسہ انگریزوں کے حق میں بدلنے میں راجوں نے بہت شاندار خدمات انجام دی تھیں۔

وائسرائے لارڈ کیننگ نے انہیں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا: "یہ لوگ اس زبردست طوفان کو روکنے والے ہیں جس کی صرف ایک لہر ہم کو بہا کر لے گئی ہوتی"۔ اب ان وفادار راجوں اور جاگیرداروں کو اپنی حفاظت کے لیے ایک فصیل اور ڈھال کے طور پر برقرار رکھنا، حکومت برطانیہ کی خاص پالیسی رہی۔ صرف راجوں مہاراجوں پر ہی نہیں، بلکہ زمینداروں پر حکومت کی خاص نظر عنایت تھی۔ حکومت ہند نے وزیر ہند کو 1859ء میں لکھا: "ہندوستان میں زمینداروں، نوابوں اور امراء کی حکومت جہاں کہیں بھی ہے، وہ ہمارے لیے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی وفاداری حاصل کرنے کے لیے ہم ہر چیز قربان کر سکتے ہیں۔" چنانچہ اس پالیسی کے تحت اودھ کے دوتہائی تعلقہ دار، جن کی بڑائی لارڈ کیننگ نے ان الفاظ میں کی تھی: "یہ لوگ تو خاندانی لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، نہ اپنے کسی اچھے کام کی وجہ سے"۔ اب "صوبے کے سماجی آئین کے ضروری حصے" قرار دے کر دوبارہ آباد کئے گئے، حالانکہ جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف حصہ لینے کے باعث انہیں دربدر کر دیا گیا تھا۔ اب ان کی جائیدادیں اور زمینیں واپس کر دی گئیں اور 1856ء میں مغلیہ دربار کے پانے والے القابات وخطابات سے زیادہ ان کو نوازا گیا۔ انہیں صرف از سرِ نو آباد ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی زمینداری اور جاگیرداری میں وسعت پیدا کی گئی۔ ان کو خوش اور خوش حال رکھنے کے لیے کسانوں اور کاشت کاروں کے حقوق سلب کئے گئے۔ خاص طور پر پنجاب کے وفادار زمینداروں کو مزید زمینیں عطا کی گئیں۔ صرف ایک ڈویژن میں 46 ہزار مزارعین جو سرکاری کاغذات میں "قابض مزارع" کی حیثیت سے درج تھے، انہیں بیک جنبش قلم بے دخل کر دیا گیا۔ سی پی میں مال گزاری کا ایسا طریقہ رائج کیا گیا جس سے زمینداروں کو فائدہ اور کسانوں کو نقصان ہوا۔

جنگ آزادی کی وجہ سے ہندوستانی عوام کی وفاداری قابل اعتماد نہ رہی تھی۔ اس لیے حکومت برطانیہ نے افسر شاہی (بیوروکریسی) کے ذریعے حکومت کرنے کا منصوبہ بنایا۔ افسروں کو وسیع بلکہ آمرانہ اختیارات دیئے گئے۔ ان کی سماجی حیثیت اتنی بلند کی گئی کہ عوام ان سے دور اور خائف رہنے لگے۔ افسر شاہی طبقے کو ابھار کر باغی عناصر کی رہی سہی قوت کو کچل دیا گیا۔ افسر شاہی ملک میں سیاست دانوں سے بھی زیادہ بااثر طاقت بن گئی۔ جو حصول آزادی تک عوام کی زندگی پر مسلط رہی (بلکہ آزادی کے بعد اس کا اثر اور عمل دخل بھی زیادہ ہو گیا)

انگریزوں کا خیال تھا کہ جنگ آزادی کا اصل سبب یہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کو نکال کر اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس لینا چاہتے تھے اور چونکہ بہادر شاہ ظفر کو اس تحریک کا سربراہ بنا دیا گیا تھا، اس لیے انگریزوں کے اس شعبے کو تقویت پہنچی اور انگریزی حکومت جو شروع دن سے مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتی تھی، مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے کچل دینے پر تل گئی۔ شاہی خاندان کے افراد قتل کر دیئے گئے۔ شہزادوں کو پھانسی دی گئی۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا۔ فتح دہلی کے وقت وفادار مسلمانوں کے گھر میں خاص نشان لگا کر باقی سب مسلمانوں کا خون مباح قرار دیا گیا اور ان کا مال لوٹ لینا جائز قرار دیا گیا۔ چنانچہ بقول مولانا مہر: "سکھ فوجی اور انگریز سپاہی شکاری کتوں کی طرح مسلمانوں پر پل پڑے۔ ممتاز اور سربرآوردہ مسلمانوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر کھلے میدان میں لے جایا گیا۔ جہاں انہیں گولی سے اڑا دیا گیا اور مسلمانوں کی سیاسی ومعاشی طاقت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے

سرکاری پالیسی بنائی گئی۔"

برعظیم کی ہندو آبادی صدیوں سے اطاعت کی عادی چلی آتی تھی، اس لیے زوال آمادہ مسلمانوں کی بجائے برسر اقتدار انگریزوں کی اطاعت میں کوئی حرج نہ تھا۔ چنانچہ جنگ آزادی کے ختم ہوتے ہی انہوں نے من حیث القوم انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔ انگریزوں نے بھی مسلمانوں کے مقابلے میں انہیں ابھارنے کی کوشش کی اور سرکاری پالیسی کے طور پر مسلمانوں کو کچلنے اور ہندوؤں کو ابھارنے کا منصوبہ بنایا۔ انگریزوں کی یہ پالیسی ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات میں شدت کرنے میں مؤثر ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کو محسوس ہونے لگا کہ ان کے حقوق و مفادات نظر انداز کیے جاتے ہیں اور ان پر ہندو اکثریت مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کا یہ احساس پختہ ہوتا گیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے اس احساس کو ختم کرنے کی بجائے مزید ابھارنے کی پالیسی اختیار کی، جس کے نتیجے میں جداگانہ تشخص کا احساس بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا۔

تحریک ریشمی رومال

انیسویں صدی سے پہلے برعظیم پاک و ہند میں جتنی سیاسی تحریکیں چلیں، ان کا مقصد حصول آزادی نہیں تھا، بلکہ اصلاح حکومت کے ذریعے نفاذ شریعت تھا، کیونکہ پاک و ہند کی سیاسی نوعیت اور معاشرتی ماحول بدل گیا تھا۔ 1803ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کے اکثر و بیشتر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مدراس، بنگال، میسور، دکن، بمبئی، روہیل کھنڈ اور یوپی کے صوبوں پر کمپنی کی بلاشرکت غیرے حکومت قائم ہو چکی تھی۔ کمپنی کے کارندوں نے مرکزی حکومت سے ملکی انتظامات کا پروانہ جابرانہ طریق پر لکھوا کر یہ اعلان کرا دیا کہ "خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا"۔ اس لیے حکومت دہلی اور اسی طرح صوبہ سندھ کی حکومت تو کمپنی کے سامنے بے چارو بے بس ہو چکی تھی۔ باقی صوبہ سرحد، کشمیر اور پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حکومت تھی جو انگریز کمپنی کی معاون و مددگار تھی اور کمپنی کے ساتھ ان کے زوردار اور پختہ تحریری و زبانی معاہدے تھے۔

دریں صورت احوال شاہ ولی اللہ اور ان کے چشم و چراغ اور تیرہویں صدی کے مجدد اعظم حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے تلامذہ مریدین اور رفقائے کار کی جماعت نے ملکی اور بین الاقوامی حالات پر غور و خوض کرنے کے بعد آزادیٔ ہند کی ملک گیر تحریک کا آغاز کیا، جس کی تہ میں ظاہر ہے کہ تجدید و احیاء اسلام کا جذبہ ہی موجزن تھا۔ اس تحریک کا نقشہ اس طرح تیار کیا گیا کہ ہندوستان میں رہ کر مقابلہ کرنا ناممکن تھا، لہٰذا محاذ جنگ شمالی مغربی صوبہ سرحد کو بنایا گیا اور اندرونِ ہند سے مالی اور فوجی سلسلے کی ترسیل براستہ سندھ، کوئٹہ، بلوچستان متعین کی گئی۔ شاہ عبدالعزیز نے صرف ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور اپنے رفقاء کو ملک کے اطراف و اکناف میں تبلیغ جہاد پر مامور کیا ہی تھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ پھر آپ کے جانشین آپ کے تلمیذ خلیفہ سید احمد شہید مقرر ہوئے اور انہوں نے اس تحریک کو بہ احسن وجوہ صوبہ سرحد میں چھ سال تک چلایا۔ آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ سکھوں کی حکومت کا روڑا راستے سے ہٹا کر پورے ہندوستان سے ظالم حکومت کو نکال کر ملک کو آزاد کیا جائے، لیکن ہماری

شومئی قسمت سے اور مسلمانوں کی غداری اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مکاری اور عیاری سے 1831ء میں بالا کوٹ کے مقام پر یہ تحریک سکھ سردار شیر سنگھ کے ہاتھوں سے اپنے عروج کے بعد ختم ہوگئی۔ سیّد احمد شہیدؒ امیر جماعت اور ان کے دست راست اور وزیر ومشیر مولانا محمد اسماعیلؒ اور دوسرے رفقاء کار نے جہاد حریت لڑ کر نہ صرف آزادیٔ ہند ہندوستان میں تجدید اسلام کی خاطر جام شہادت نوش فرمایا۔ اب جتنی بھی لڑائیاں غیر ملکی آقاؤں اور ان کے حواریوں سے لڑی جاتی تھیں، ان کے دو مقاصد یعنی آزادیٔ ہند اور تجدید اسلام الگ الگ نہیں تھے، بلکہ یہ ایک ہی مقصد کی دو شاخیں اور لڑیاں تھیں۔ آزادیٔ ہند میں تجدید اسلام کا رنگ اور تجدید اسلام میں آزادیٔ ہند کا پہلو خود بخود شامل تھا۔

وادیٔ بالاکوٹ میں عشق واخلاص سے مردانِ حر نے جو خون بہایا وہ آزادی ہند کے پردے میں تجدید واحیاء اسلام کی خاطر تھا، لیکن حق وصداقت پر مبنی تحریکیں قوتِ قاہرہ وجابرہ کے مقابلے میں دب جایا کرتی ہیں یا پس منظر میں چلی جایا کرتی ہیں، ختم نہیں ہوا کرتیں۔ اسی طرح سیّد احمد شہید کی تحریک بھی وقتی طور پر دب گئی تھی، مگر آج تک ایک دن کے لیے بھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کی دبی ہوئی چنگاریاں ہندوستان کے چپے چپے میں بکھری ہوئی، دہک رہی تھیں۔ پچیس سال کے بعد دوبارہ سلگ اٹھیں اور راہنمایانِ تحریک نے اپنے خون سے جو بیج بویا تھا وہ 1857ء میں برگ وبار لایا۔ یہ درحقیقت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور سیّد احمد شہید ہی کی چلائی ہوئی تحریکوں کا تسلسل تھا۔ یہ تمام تحریکیں اور آئندہ تحریکیں بھی (جن کا ذکر آگے چل کر اپنے اپنے مقام ومحل پر آئے گا) ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں۔ ان تمام تحریکوں کا نقطۂ عروج ''تحریک پاکستان'' تھا، جس کے نتیجے میں پاکستان کا حصول وقیام ممکن ہوا۔

ستاون کی تحریک نئی روشنی میں

1857ء کی تحریک آزادی کو انگریزوں نے غدر اور بغاوت کے نام سے مشہور کیا، اس لیے 1947ء تک برطانیہ کے عہد میں صحیح واقعات کا لکھنا یا اسے آزادی کی جنگ کہنا ایک بہت بڑا اور ناقابل تعزیر جرم تھا۔ برطانیہ اور یورپ کے مؤرخین نے جو لکھ دیا ہے، اس پر حرف تنقید لکھنے کی بھی اجازت نہ تھی، اس لیے یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہے کہ 1857ء کا جہاد حریت دنیائے تاریخ میں اب تک تہ بہ تہ پردوں میں مستور ہے۔ حصولِ آزادی کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے، لیکن اب تک ہمارے مصنفین ومؤرخین کا قلم پوری طرح پرانی پابندیوں سے آزاد نہیں ہوا ہے۔ جو کچھ چیزیں برآمد ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر ہندوستان کے مصنفین کی کتابوں سے ظاہر ہوئی ہیں، لیکن ان سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ بہائے ہوئے خون میں اسلام کے موتی چنیں گے وہ تو احیائے ہندومت کی تحریک کو ابھارنے کے لیے زیادہ بہتر یہ نقشہ پیش کرتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف یہ بغاوت دراصل ہندوؤں نے کی تھی اور مسلمانوں نے اپنے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت بچانے کی خاطر ہندوؤں کا ساتھ دیا تھا۔

اردو میں (اور انگریزی میں بھی) حصول آزادی کے بعد جو نئی کتابیں نئی سوچ اور تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی ہیں ان سے بہت سے حقائق کی اصلیت پر سے پردہ ہٹا ہے اور واقعات کو نئی آزادانہ روشنی میں دیکھا جانے لگا ہے، مگر سن ستاون کی تحریک کا ایک پہلو اب تک منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ تب کسی مورخ نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ وہ یہ کہ اتنی منظم اور ہمہ گیر انقلابی تحریک کہ راس کماری سے درۂ خیبر تک تمام شہروں، قصبات اور دیہات کو اپنی لپیٹ میں

لے لے۔کوئی شہراور قصبہ اور کوئی گاؤں اور دیہات اس سے باہر نہ رہا ہو۔ پھر سول میں بغاوت، عوام میں بغاوت، فوجوں میں بغاوت، یہاں تک انگریزوں کے وفاداروں اور ازلی خوشامدیوں میں بھی بغاوت کے آثار، پھر راز داری، سراغ رسانی اور پیغام رسانی کا منصوبہ اتنا منظم کہ برطانیہ کے کراماً کاتبین کی نگاہوں سے اوجھل ہر شخص اور ہر فرد تک اپنا پیغام پہنچایا جا رہا ہو۔ آخر وہ چپاتیوں کا معاملہ کیا تھا جو یو پی سے شروع ہو کر پنجاب، سرحد، سندھ اور دکن و بنگال تک پہنچ گیا۔

پھر ہاتھی سوار اور ایک بوڑھے کی داستان آپ نے تاریخ میں پڑھی ہوگی، اور وہ سبز پوش مسلمان بڑھیا جو ہندوستان کے کونے کونے میں نوجوانوں کو ابھارتی اور خود میدانِ جہاد میں مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی اور دہلی میگزین کا وہ ملازم سپاہی جو بقول ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ہندوستان کی ہر چھاؤنی میں اپنا پیغام پہنچاتا رہا، لیکن سی آئی ڈی کو خبر تک نہ ہوئی اور پھر وہ قلمی اشتہارات کا سلسلہ جو دہلی کے در و دیواروں پر چسپاں ہوتے رہے۔ کیا انگریزوں کی سی آئی ڈی اس کی تہ تک پہنچی کہ اس کے پیچھے کون سا ہاتھ کام کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر وہ اشتہارات جو شاہ ایران کی جانب سے ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچایا جاتا ہے۔ کیا انگریزی سی آئی ڈی نے یہ معلوم کیا کہ اس کے پس منظر میں کون سے حقائق پوشیدہ تھے۔

سب سے زیادہ الجھن اور عقدہ، جو آج تک نہیں کھلا، یہ مسئلہ ہے کہ ہندو مسلم جو مذہب، معاشرت، تمدن، ثقافت، روایات، غرضیکہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے مقابل و متصادم ہیں، وہ اس تحریک میں نہ صرف کہ پبلک میں یک جان اور دو قالب ہو جاتے ہیں، بلکہ فوجوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بھائی بن جاتے ہیں اور یکجا مل کر کھانا کھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہندو گائے کا گوشت کھا کر اس پر نازاں ہیں اور مسلمان ہندوؤں کے ہولی دیوالی کے تہواروں میں شریک ہو کر خوشیاں مناتے ہیں، حالانکہ فوجوں میں باہر کا کوئی لیڈر اور قائد جا کر تبلیغ نہیں کر سکتا، بلکہ انگریزی نظام میں تو فوجوں کی دنیا ہی دوسری ہوتی ہے۔ پھر ان کو اس طرح منظم اور متحد کس نے کیا۔ انگریزی سی آئی ڈی کے لیے یہ مسئلہ اب تک معمہ بنا ہوا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات اور واضح دلائل ہیں اس بات پر کہ ستاون کی تحریک کے پیچھے کوئی مدبّر ترین دماغ تھا جو اس کو چلا رہا تھا۔ آخر وہ کون سا ہاتھ تھا، وہ کون سا دماغ تھا جو اس تحریک کا بانی، محرک اور ناظم تھا۔

یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس پر آج تک کسی مؤرخ کا تجزیہ کم از کم ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ ہماری ناچیز رائے میں ستاون کی تحریک کے محرک، قائد اور رہنما بھی وہ علمائے دین تھے جو شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ تھے۔ آپ غور فرمائیے کہ صوبہ الہ آباد کے گورنر مولانا ولایت علی صاحب اور صوبہ بریلی کے گورنر مولانا امام فضل حق صاحب اور اسی طرح گورنر پٹنہ مولانا یحییٰ علی صاحب اور وزیر اعظم مولانا احمد اللہ صاحب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پورے ہندوستان کے وائسرائے بخت بہادر صاحب، یہ علماء نہ تھے تو اور کون تھے؟ اور پھر تحریک کی کامیابی کے وقت یہ اتنے بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر بے وقوف تو نہ تھا جو اپنی سات سالہ تحقیق کے بعد یہ رپورٹ لکھتا ہے کہ "ان سب تحریکوں کے کرتا دھرتا اور بانی مبانی سب مولوی تھے۔ اور اب بھی اگر تم

ان کا قلع قمع نہ کرو گے تو ہمیشہ ہندوستان میں سازشوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔"

غرضیکہ یہ شاہ ولی اللہ خاندان کے چشم و چراغ اور پسماندگان علماء ہی تھے جنہوں نے 1831ء کے واقعات شہادت کے بعد 1857ء کی تحریک بھی انتہائی زور و طاقت سے چلائی۔ لیکن بدقسمتی سے اب کے بھی سکھوں اور مسلمان روساء پنجاب کی غداری سے دشمنوں کی نگاہ میں ختم ہوگئی اور درحقیقت دب گئی، جس میں ہندوستان کے شرفاء اور معزز خاندانوں کا خاتمہ ہوگیا۔ رذیل اور نچلے طبقے کے کمینہ لوگوں کو مال دولت اور اقتدار کا مالک بنا دیا گیا اور نو دولتیئے جاہلوں کا ویسا ہی طبقہ اوپر آ گیا، جیسا قیام پاکستان کے بعد اوپر اٹھ آیا ہے۔ سر تھامس کی کتاب "تذکرہ رؤسائے پنجاب" اور جناب عقیل عباس جعفری کی تالیف "پنجاب کے وڈیرے اور جاگیردار" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج جو لوگ ہماری قسمت کے مالک ہیں اور اقتدار پر قابض ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے سن ستاون کی عوامی انقلابی تحریک میں ملک وملت سے غداری کر کے اپنی جاگیروں، زمینداریوں اور ریاستوں کی بنیاد مجاہدین اور شہیدوں کے پاکیزہ خون پر رکھی تھی۔

یہاں سن ستاون کی تحریک کا اجمالی ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ہم علماء کی ایک اور زبردست تحریک "ریشمی رومال" کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ یہ تحریک بھی اسلامیان ہند کی سابقہ "کامیاب بھی، ناکام بھی" تحریکوں کی نہایت اہم کڑی ہے۔ لیکن اس کا براہ راست تذکرہ شروع کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ستاون کی تحریک کی ناکامی کے فوراً بعد انگریزوں نے جن بہیمانہ طریقوں سے مسلمانانِ ہند پر ظلم و ستم ڈھائے اور انہیں کچلنے کے لیے وہی طور طریقے اختیار کیے جو عیسائیوں نے سپین میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لیے اختیار کئے تھے، ان کا اختصار کے ساتھ بطور یاد دہانی ذکر کیا جائے۔

مسلمانانِ ہند وانگریزوں کے خاص مظالم

سن ستاون کی ناکام تحریک کے بعد انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیچھے ہٹا کر، براہ راست اقتدار حکومت برطانیہ کو دے دیا۔ پھر لوٹ کھسوٹ، ظلم و تشدد، بربریت و وحشت کا وہ مظاہرہ کیا کہ فرعون اور نمرود بھی شرما جائیں۔ مسلمانوں کو ہر لحاظ سے مفلس، تنگ دست اور مفلوک الحال بنانے کی پوری پوری منصوبہ بندی اور کوشش کی گئی۔ بڑے بڑے ذی حیثیت اور معزز خاندان جو کل تک لعل و جواہر سے کھیلتے تھے، وہ نان شبینہ کے محتاج اور دردر کے بھکاری ہو گئے تھے۔ انگریز فوجیوں نے تو گھر گھر میں داخل ہو کر لوٹ کھسوٹ کی اور مسلمان خواتین کی بے آبروئی کی، مرزا غالب کے بقول: "صرف دہلی شہر کو آٹھ دن متواتر سکھ اور گورے فوجی لوٹتے رہے" لیکن کیا صرف دہلی شہر کو لوٹا گیا؟ نہیں۔ بلکہ ہندوستان کے ہر شہر میں یہی سلسلہ جاری رہا۔ بمبئی، لکھنؤ، کان پور، الہ آباد، آگرہ، میرٹھ، پانی پت، گڑگاؤں، ہریانہ، سیالکوٹ اور پشاور تک انگریز فوجی اوباشوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ لوٹ مار کریں۔ پھر ملک میں کاشت کاروں اور کسانوں پر لگان اور ٹیکس کی وہ بھرمار کی گئی کہ مسلمان غریب سے غریب تر ہو گئے۔ تجارت میں ملکی و ولایتی امتیاز برت کر تاجروں کے کاروبار کو ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان کے وہ صنعت کار جو دنیا بھر میں اپنی صنعت کاری اور مصنوعات میں مشہور تھے۔ ان کے کاروبار کو طرح طرح کی مکاری اور فریب کاری سے

ختم کر دیا گیا۔ غرضیکہ ایک طرف پورے ہندوستان کو دیوالیہ بنا دیا گیا اور دوسری طرف ملک میں خوں ریزی اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ ان تہذیب کے ٹھیکے داروں نے ہندوستان میں مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم کا مظاہرہ کیا کہ انسانیت انگشت بدنداں رہ گئی۔ ان مظالم کی داستان ابھی رقم ہونے کی منتظر ہے۔

تہذیب وتمدن اور اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے ننگ انسانیت، وحشت اور درندگی کے ایسے ایسے نمونے دنیا کو دکھائے کہ چشم فلک نے بھی کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ عدل و انصاف پر ٹیکس لگائے گئے۔ کسی ذی عزت ہندوستانی کی جان و مال اور عزت و آبرو تک محفوظ نہ رہی۔ ہندوستانیوں کے مذہب پر ڈاکے ڈالے جانے لگے۔ سکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں میں عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ بازاروں کے بڑے بڑے چوکوں میں عیسائیت کی صداقت کے بورڈ آویزاں کئے گئے۔ یورپ سے پادری منگوا کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا دیئے گئے۔ مناظروں کے چیلنج کئے گئے۔ پادری اور انگریز افسر باقاعدہ جلسے منعقد کرتے اور ان میں مسلمانوں کے مذہب پر اعتراضات کئے جاتے اور ان کے رہنماؤں کا تمسخر اڑا دیا جاتا۔ خصوصاً مسلمانوں کے خلاف ایک منظم تحریک شروع کی گئی۔ کوئی شخص ڈاڑھی والا نظر آتا تو اسے مولوی سمجھ کر گولی سے اڑا دیا جاتا تھا۔ اس کا مولوی ہونا ہی اس کے مجرم ہونے کے لیئے کافی ثبوت تھا۔ کوئی دینی اسلامی مدرسہ جاری نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے کہ (آج کی طرح) دینی اسلامی مدارس کو بغاوت اور دہشت گردی کا اڈہ سمجھا جاتا تھا۔ دہلی کی اسلامیہ یونیورسٹی، جو ''مدرسہ رحیمیہ'' کے نام سے مشہور تھی اور جس کے سرپرست شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور اس کے بعد شاہ عبدالغنی تھے، اسلامیانِ ہند کی یہی واحد یونیورسٹی تھی، جس نے بڑے بڑے علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسے جید افراد پیدا کئے تھے، اس یونیورسٹی کی عمارت کو توپوں سے اڑا دیا گیا اور زمین ایک ہندو لالہ رام کشن داس کے ہاتھوں فروخت کی گئی، جہاں اگست 1947ء یعنی تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے وقت تک ''کوچہ لالہ رام کشن داس'' کا بورڈ آویزاں تھا (اب معلوم نہیں کہ وہاں کیا صورت حال ہے!) مسجد اکبری جہاں شاہ عبدالقادر نے بیٹھ کر چالیس برس مسلسل درسِ قرآن دیا تھا اور جہاں بیٹھ کر انہوں نے قرآن مجید کا اردو میں پہلا ترجمہ کیا تھا، اس تاریخی مسجد کو انگریزوں نے اس جرم کی پاداش میں منہدم کر دیا کہ یہاں سے قرآن مجید، سنّت نبویؐ اور احیائے اسلام کا جذبہ رکھنے والے علماء پیدا ہوئے۔ پھر صرف منہدم کرنے پر ہی اکتفا نہ کی گئی بلکہ اس کی جگہ ایک کباب قائم کی گئی جو سنا ہے آج تک موجود ہے اور جہاں آج بھی شراب و کباب کا دور دورہ ہے۔ پھر ملک میں سی آئی ڈی کا ایسا جال بچھایا گیا کہ کوئی آزادی ہند کا نام تو کیا لیتا، بلکہ آزادی کے لیے دعا کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی شخص یہ دعا کرتے ہوئے پکڑا جاتا کہ اے اللہ، تو ان ظالموں سے مظلوموں کو نجات دے تو اس کو باغی سمجھ کر گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ قصبہ دیوبند کے ایک بزرگ کی داستان تاریخوں میں آج تک محفوظ ہے کہ وہ تہجد کی نمازوں میں جب مظلوموں کی نجات اور ظالموں کے زوال کے لیے دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تھے تو پہلے مکان کی چھت پر چڑھ کر چاروں کونوں میں دیکھ لیتے تھے کہ کوئی سی آئی ڈی کا آدمی تو چھپا ہوا نہیں۔ پھر واپس گھر آ کر دعا مانگتے تھے۔

ایسے خوفناک اور غیر انسانی ماحول میں ممکن نہ تھا کہ خفیہ طور پر ہی سہی، سی آئی ڈی کا جواب بطور ردعمل سی آئی

ڈی سے نہ دی جاتی۔ چنانچہ 1914ء میں ''تحریک ریشمی رومال'' چپکے چپکے استوار ہوئی۔ یہی ہمارے سلسلے کی تحریک کا موضوع بحث ہے۔اس بحث کو ہم آسان افہام وتفہیم کے لیے تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔

پہلے حصے میں تحریک ریشمی رومال یا ریشمی خط کے اسباب وعلل اور محرکات وعوامل سے بحث کریں گے۔

دوسرے حصے میں تحریک کے اندرونی اور خفیہ حالات قدرے تفصیل سے بیان کریں گے، ''تفصیل'' سے اس لیے کہ اس تحریک کے بارے میں لوگوں کو بہت کم معلومات حاصل ہیں اور جب تک مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے ان معلومات کا ذخیرہ جمع نہ کیا تھا، فاضلوں اور مورخوں کو بھی ان کا علم نہ تھا۔اس ضمن میں بانیانِ تحریک مولانا محمود الحسن اور مولانا عبیداللہ سندھی اور مجاہدین تحریک کے حالات کا بھی تذکرہ ہوگا۔

تیسرے حصے میں ذکر آئے گا کہ مسلمانانِ ہند کی یہ تحریک بھی کن اسباب ووجوہ سے ناکام ہوئی۔ظاہر ہے کہ اس ضمن میں ملک وملت کے غداروں کے نام بھی آئیں گے۔

اسباب تحریک ریشمی رومال

1857ء کے بعد جہاں انگریزوں کی وحشت و بربریت عروج پر پہنچی، وہیں مسلمانوں کی بے کسی اور مظلومیت نے دردمند علماء کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ''غدر'' کے ہولناک واقعات سے وہ پہلے ہی آزردہ اور غمگین تھے۔علماء میں سے بعض تو انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ان کے جذبات مشتعل ہونے کا ایک نمایاں سبب یہ بھی تھا کہ شاہ ولی اللہ کے ''مدرسہ رحیمیہ'' کی عمارت، توپوں سے اڑادی گئی تھی، حالانکہ اس مدرسے کی دینی وملی اہمیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ یہ شاہ عبدالعزیزؒ کی تحریک آزادی کا مرکز رہی۔اس مدرسے سے نواب وزیرالدولہ والی ٹونک، مفتی محمد بن احمد ٹونکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانی دارالعلوم دیوبند) مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے اہل علم تعلیم پا کر نکلے۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ صرف مسلمانوں ہی کو ظلم کا نشانہ بنایا جائے اور انہیں اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ وہ پھر کبھی ابھر سکیں۔حکومت برطانیہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ حکومت کے خلاف مستحکم اور مؤثر جدوجہد میں ہمیشہ مسلمان ہی پیش پیش رہے ہیں، اور آئندہ بھی مسلمان ہی پیش قدمی کریں گے۔حال ہی میں جو عظیم الشان تحریک سیّد احمد شہید نے چلائی تھی، وہ سراسر مسلمانوں ہی کی تحریک تھی اور اس کے سرخیل رہنما جید اور بہادر علماء تھے، جنہوں نے مسلمانانِ ہند میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دی تھی، لہٰذا ان میں سے بیشتر رہنماؤں پر جھوٹے مقدمے چلائے گئے اور انہیں پھانسیاں دی گئیں۔ایسے مشاہیر میں مولانا فیض الحسن بدایونی، شاہ عبدالقادر دہلوی، قاضی فضل اللہ دہلوی، مولوی وزیر خان اکبرآبادی، سیّد مبارک شاہ رام پوری اور مولوی ولایت علی شاہ الٰہ آبادی نمایاں اور لائق ذکر ہیں۔حکومت برطانیہ نے ان سب کے لیے پھانسی کے احکام صادر کیے، مگر انہوں نے اف تک نہ کی اور مسلمانانِ ہند کی آزادی کے لیے سب پھانسی پر چڑھ کر جاں بحق ہو گئے۔مولانا فضل حق خیرآبادی کو جہاد کے فتوے کی سزا میں کالے پانی کی سزا دی گئی۔ وہیں مولانا کا انتقال ہوا۔

ہندوستان میں خیر آبادی مکتبۂ فکر اپنے زمانے میں بہت معروف ہوا۔ اس سلسلۂ فکر نے برِ عظیم کے گوشے گوشے میں گہرا اثر قائم کیا تھا۔ مسلمانوں کی ایک معقول اکثریت اس کی مقلد بنی۔ اس لیے مولانا بھی ''امام'' فضل حق خیر آبادی کہلاتے ہیں۔ عدالت مولانا پر جرم ثابت نہیں کر سکی تھی۔ جس مخبر کو بھری عدالت میں مولانا کے خلاف پیش کیا گیا، اس نے مولانا کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا، لیکن خود مولانا نے نہایت جرأت کے ساتھ اقرار کیا اور اپنے فیصلے اور فتوے کا دوبارہ اعلان کیا۔

ایڈورڈ تھامس نے گواہی دی کہ صرف دہلی شہر میں پانچ سو علماء تختہ دار پر لٹکائے گئے۔ مولانا حاجی امداد اللہ کے قریبی ساتھی مولانا رمضان بھی اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ البتہ حاجی امداد اللہ اور شاہ عبدالغنی خفیہ طریقے سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی گرفتاری کے لیے بھی کئی وارنٹ جاری ہوئے، مگر وہ روپوش ہو گئے تھے۔ بعد میں بعض سفارشوں کی وجہ سے یہ وارنٹ کالعدم قرار دیئے گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ چھ مہینے گرفتار رہنے کے بعد رہا ہوئے۔ اس زمانے میں یہ دونوں حضرات جوان اور کم عمر تھے۔ پھر یہ کہ ان کی سرگرمیاں زیادہ نمایاں نہ تھیں، لہٰذا یہ لوگ کڑی سزاؤں کے مستحق نہیں ٹھہرائے گئے۔

اسلامی ممالک پر زبردست یورش

علماء سے نمٹنے کے بعد انگریزوں نے یکے بعد دیگرے مسلمان حریت پسندوں، مجاہدوں اور مسلم ریاستوں کا قلع قمع کرنے کا کام شروع کیا۔ 1895ء میں انہوں نے ریاست چترال پر حملہ کیا اور اس پر اپنا قبضہ جمایا۔ 1885ء میں کابل پر حملہ کیا اور اس کے بعد وہ سرحدی مجاہدین پر مسلسل یلغار کرتے رہے۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ میں مسلمان حکومتوں کو آپس میں لڑا کر اور گھناؤنی سازشیں کر کے تمام علاقے زیر اقتدار لے آئے۔ پھر نہر سویز پر ان کا قبضہ ہوا۔ انگریزوں نے 1882ء میں اسکندریہ میں بمباری کی۔ بعد میں مصر اور سوڈان فتح کر کے اسے اپنا ایک صوبہ بنا لیا۔ 1904ء میں انگریزوں نے اپنی عیاری سے ترکی کے خفیہ طور پر حصے بخرے کیے اور جلد ہی اسے اپنی عمل داری میں لے آئے۔ 1907ء میں ایران کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران کی تقسیم کی گئی۔ شمالی ایران روس کو ملا۔ جنوبی ایران پر انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ 1912ء میں سروبیا، مونٹی نیگرو، یونان اور بلغاریہ نے روس کے اشارے پر آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا۔ پھر سب نے مل کر بلقان پر حملہ کیا جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ یہی وہ جنگ بلقان ہے جس میں ہندوستان کی ساری تحریکوں نے مالی اور اخلاقی طور پر بلقان کی مدد کی، ورنہ اس سے پہلے ہندوستان کسی سیاسی تحریک میں کھل کر حصہ لینے کے قابل نہ تھا۔ اسی امداد کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کا ایک وفد ترکی گیا اور اس طرح دوسرے مسلم ملکوں سے مسلمانانِ ہند کے تعلقات قائم ہوئے۔ اسی زمانے میں علمائے ہند کی نظر میں ترکی (خلافت عثمانیہ) کی طرف اٹھیں۔ کیونکہ سلطنت صفوی اور سلطنت مغلیہ کا صفایا ہو چکا تھا۔ صرف ایک سلطنت عثمانیہ مسلمانوں کی آخری امید باقی رہ گئی تھی اور وہ بھی سسک رہی تھی۔

اس سے پہلے 1908ء میں ترکی میں انقلاب رونما ہوا۔ انور پاشا کی قیادت میں ترک فوجیوں نے ایک

تنظیم بنائی جس کا نام ''اتحاد المسلمین'' تھا۔ اس تنظیم کا اولین مقصد یہ تھا کہ ملک میں بادشاہت اور ملوکیت کے نظام کے باعث جو بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی ہے، اسے جمہوری نظام قائم کر کے دور کیا جائے اور مسلمانوں کا خلیفہ، جو یورپی ملکوں کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، اس کے اختیارات محدود کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اس تنظیم نے 1908ء میں اصلاحات کے پروگرام کا اعلان کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تنظیم حکومت پر قابض ہوگئی۔ بادشاہ کے اختیارات محدود کر کے نظام حکومت اپنے قبضے میں لے لیا۔ انور پاشا اپنی قائدانہ صلاحیت اور شہرت کے باعث مسلمانِ ہند کا بھی ہیرو ہوگیا۔ اب ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی امیدوں کا مرکز انور پاشا کی ذات بن گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان کے حریت پسند علماء نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی اور پھر تجدید و احیائے اسلام کی ایک بڑی تحریک چلانے کا عزم کیا۔ اس تحریک کو بعد میں ''ریشمی رومال'' کی تحریک کہا گیا۔ اس کے اصل بانی دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن تھے۔ ان کی تحریک کئی اہم منصوبوں پر مشتمل تھی، جن کا یہاں اختصار کے ساتھ خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جب تک مولانا حسین احمد مدنی کی تالیف ''تحریک ریشمی رومال'' (مرتبہ: مولانا عبدالرحمٰن) شائع نہیں ہوئی تھی، اس تحریک کے بارے میں لوگوں کو بہت کم واقفیت تھی۔ یہ مضمون بھی دراصل اسی کتاب سے ماخوذ و ملخص ہے۔

پہلا منصوبہ: اقوام عالم کی اخلاقی امداد کا حصول

اقوام عالم سے اخلاقی امداد حاصل کرنے اور انہیں ہندوستان کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے شیخ الہند نے پانچ سفارتیں ترتیب دیں، جو حقیقت میں مشنری طریقہ کار سے مشابہ تھیں۔ یہ سفارتیں چین، جاپان، برما، فرانس اور برما جیسے بڑے ملکوں کو بھیجی گئیں۔ چین اور برما بھیجے جانے والے سفارتی مشن کے سربراہ مولانا مقبول الرحمٰن تھے۔ وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے ساتھ انگریزی ترجمان کی حیثیت سے شوکت علی کو مامور کیا۔ جن کا تعلق بنگال سے تھا۔ پانچ ارکان پر مشتمل ایک سفارت پروفیسر برکت اللہ بھوپالی کی قیادت میں جاپان بھیجی گئی۔ یہ صاحب انگریزی میں ایم اے تھے۔ انگریزی کے علاوہ جاپانی، ترکی اور جرمن زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ چودھری رحمت علی (پنجاب) کی قیادت میں ایک سفارت فرانس بھیجی گئی۔ ان کے ہمراہ بطور مددگار رام چندر کو مقرر کیا گیا۔ چھ آدمیوں کا سفارتی مشن ہردیال کی سرکردگی میں امریکا بھیجا گیا۔ بعد میں پروفیسر برکت علی اور چودھری رحمت علی بھی فرانس سے امریکا پہنچ گئے۔

دوسرا منصوبہ: جاسوسی اور جنگی نقشوں کی تیاری

یہ منصوبہ درحقیقت دشمن کی جاسوسی اور سراغ رسانی سے متعلق تھا۔ ان کے فوجیوں میں اپنے جاسوس مقرر کرنا اور جنگی نقشے تیار کرنا اس کا مقصد تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اگر باہر سے کوئی فوج ہندوستان پر حملہ کرے تو جنگی تیاری نقشے کے مطابق ہو جو پہلے سے بنا ہوا ہو۔ اس کام کے لیے عبیداللہ سندھی کا انتخاب کیا گیا۔ ان کی مدد کے لیے نوجوان اور مستعد شیخ محمد ابراہیم مامور ہوئے جو بمبئی کے رہنے والے تھے اور گریجوایٹ تھے۔ انگریزی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا۔

مولانا سندھی نے سات سال میں یہ کام مکمل کیا۔ دوسرا کام تھا دشمن کے ارادوں اور پالیسیوں کی سراغ رسانی۔ اس کے سربراہ ڈاکٹر انصاری تھے۔ اس کے علاوہ شیخ الہند نے کئی آدمی سی آئی ڈی (خفیہ پولیس) اور فوج میں بھرتی کرائے تھے جو اچھی خاصی ترقی کر کے "بظاہر" انگریز کے معتمد بن گئے تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے کے معیار کے حوالے سے ایک صاحب کا بیان موجود ہے کہ پنجاب سے ہم کل 80 آدمی امیدوار تھے۔ لیکن مولانا عبید اللہ سندھی کی سربراہی میں تین ماہ کا تربیتی کورس پورا کرنے کے بعد جب امتحان ہوا تو 80 میں سے صرف 19 آدمی اس کام کے اہل قرار پائے۔ باقی نااہل تصور کیے گئے۔ انہیں آسان کام پر لگا دیا گیا۔

امتحان میں کامیاب ہونے والے ان صاحب کا بیان ہے: تربیتی کورس مکمل ہونے کے بعد ہم دیوبند سے دہلی بھی گئے تھے۔ وہاں پر گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں بنگال کے ایک نوجوان رام کشن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح ایک تربیتی کورس چاٹگام میں پاس کر کے آیا تھا۔ بعد میں جب ہم برطانوی فوج میں ملازم ہو گئے تو ایک دفعہ برما میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی بٹالین برما سے واپس کراچی آ رہی تھی۔ اس وقت تحریک ناکام ہو چکی تھی۔ ہم نے آپس میں مل کر اپنی ناکامی پر چند آنسو بہائے اور جدا ہو گئے۔ یہ صاحب پھر کبھی نہیں ملے۔ غرض ہم دہلی سے واپس آ کر فوج میں بھرتی ہو گئے اور اپنا کام شروع کیا۔ لیکن ہم صرف اتنے کامیاب ہوئے کہ بعض سنجیدہ فوجیوں کو جذبۂ حب الوطنی سے متاثر کر سکے اور سرحد میں جب حاجی صاحب ترنگ زئی نے انگریز سے جنگ شروع کی تو بعض اہم معاملات کی خفیہ اطلاع انہیں پہنچاتے رہے۔ جس سے ان کو زبردست فائدہ پہنچا۔ جب ہم صوبہ سرحد سے چلے گئے تو انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ جنگ کے اختتام پر بڑی مشکل سے فوج سے اپنا نام خارج کروایا"۔

تحریک کی منصوبہ بندی

یہ انقلابی تحریک چلانے سے پہلے باقاعدہ منظم منصوبہ بندی کی گئی تھی اور اس مقصد کے لیے آٹھ منصوبے بنائے گئے تھے۔ دو منصوبوں کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اول یہ کہ اقوام عالم کی اخلاقی امداد حاصل کی جائے اور اس مقصد کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے پانچ سفارتیں، چین، جاپان، برما، فرانس اور امریکا کی طرف روانہ کیں۔ دوم یہ کہ دشمن کی جاسوسی اور سراغ رسانی کی جائے اور اس مقصد کے تحت جنگی نقشے تیار کرائے گئے۔

تیسرا منصوبہ: عارضی حکومت کا اجمالی خاکہ

اس منصوبے کے تحت عارضی حکومت کا اجمالی خاکہ تیار کرایا گیا جس کے مطابق مناصب اور عہدوں کا تعین کیا گیا۔ ہر انقلابی جماعت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ انقلاب سے پہلے ہی مناصب و اختیارات کی تقسیم رہنماؤں اور کارکنوں کے درمیان طے کر لی جائے، ورنہ تو ہر کارکن کے دل میں اپنے ساتھیوں کے متعلق شکوک و شبہات رہیں گے، جس سے کارکردگی کے جذبات میں سرد مہری پیدا ہو جائے گی اور قوت عمل سست اور منتشر ہو جائے گی۔

پھر بسا اوقات رضا کار کارکن اپنی طاقت کو بجائے دشمن کے، اپنے ہی ساتھیوں کی کش مکش اور اکھاڑ پچھاڑ میں ضائع کر بیٹھتے ہیں، اور یہ ضیاع بدگمانی اور شک کی وجہ سے لازمی ہوتا ہے اور دشمن اس سے فائدہ اٹھانے اور انقلابی جماعت کے اندر دراڑیں پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

بعض دفعہ اس بدگمانی کی بناء پر بعض کارکن دشمن سے مل جاتے ہیں۔ اس سے تحریک کو زبردست نقصان پہنچتا ہے جس کی تلافی ناممکن ہو جاتی ہے۔ تحریک کی کامیابی کی صورت میں اختلافات کے پیدا ہونے کا زبردست خطرہ رہتا ہے (جیسا کہ افغانستان میں روسی فوج کی شکست کے بعد افغانستان رہنماؤں کی آپس میں چپقلش کی صورت میں ہوا) اور یہ اختلاف خاص طور پر انقلاب کے فوراً بعد پیدا ہوتے ہیں تو انقلابی جماعت کا شیرازہ حکومت کے قیام واستحکام سے پہلے ہی بکھر جاتا ہے اور اس کی کامیابی ناکامی اور فتح شکست میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ انقلاب ہوا اور انقلابی کامیاب بھی ہو گئے، لیکن انقلاب کے فوراً بعد پھر دشمن کامیاب ہو گیا اور انقلابی شکست کھا کر نیست و نابود ہو گئے۔

چنانچہ زیر تبصرہ تحریک کے قائدین کو بھی ان سب باتوں کی اہمیت کا احساس تھا، اور یہاں تو اس منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت اور بھی زیادہ تھی، کیونکہ یہاں مخاطب دشمن صرف انگریز ہی نہ تھا، بلکہ یہاں ہندو مسلم اختلافات اور باہمی کش مکش پہلے سے موجود تھی۔ اس صورت میں اگر پہلے سے مناصب اور عہدوں کا تعین نہ ہوتا تو نقصانات کا احتمال زیادہ ہوتا۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ذاتی ڈائری اور بیانات میں ہندو مسلم اختلافی ذہنیت اور

خصوصاً مہندر پرتاب وغیرہ کے حوالہ سے بار بار تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ پیش بندی اور منصوبہ بندی کے باوجود جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو خدانخواستہ اگر مناصب کا تعین عمل میں نہ آیا ہوتا تو ناکامی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی۔

بہر حال عارضی حکومت میں مناصب اور عہدوں کی تقسیم کا نقشہ یہ تھا کہ اعلیٰ اختیارات کی حامل حکومت ہوگی، جس کے تحت تمام نظم ونسق قائم و بحال رکھا جائے گا اور پورے اختیارات صرف مرکز کو حاصل ہوں گے۔ اس میں ایک مسلمان اور دو ہندو رکن ہوں گے۔ مسلمان رکن شیخ الہند محمود حسن تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی تحقیق کے باوجود ہندو ارکان کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ سی آئی ڈی کے کاغذات سے صرف گاندھی جی کے نام کا پتہ چلتا ہے۔ اس کونسل کے تحت ایک صدر (مہندر پرتاب) اور ایک وزیر اعظم (مولانا برکت اللہ) اور وزیر مملکت (مولانا عبید اللہ سندھی) اور باقی ان کے ماتحت کابینہ ہوگی۔ فوجی مناصب میں ایک کمانڈر ان چیف (شیخ الہند) اور بارہ جنرل ہوں گے۔ اور باقی میجر اور کرنل وغیرہ کے مختلف عہدے ان کے ماتحت ہوں گے۔ ان کی پوری تفصیل "رولٹ رپورٹ" اور سی آئی ڈی کے خفیہ کاغذات میں درج ہے۔

چوتھا منصوبہ: اندرونِ ملک بغاوت کے مراکز کا قیام

اس منصوبے کے تحت اندرونِ ملک بغاوت کرانا تھا، جس میں (1) رضا کاروں کی بھرتی (2) عوام میں جذبۂ انقلاب کی خفیہ تبلیغ اور (3) سنجیدہ دماغوں کو بغاوت کے وقت نظم ونسق سنبھالنے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک ہیڈ کوارٹر اور آٹھ شاخیں قائم کی گئیں، جن کی تفصیل یہ ہے کہ ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھا، جس میں مولانا شیخ الہند، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، گاندھی جی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، راجندر پرشاد وغیرہ حضرات کام کرتے تھے۔ ان کی ہدایات پر ملک کے اندر اور باہر ہر کام انجام پذیر ہوتا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کے ماتحت آٹھ شاخیں یہ تھیں:

1۔ راندیر (سورت، گجرات اور بمبئی) کا مرکز۔ یہاں مولانا ابراہیم، کاوی احمد بزرگ، بنوں پٹیل وغیرہ کام کرتے تھے۔ مولانا ابراہیم امیر تھے۔

2۔ پانی پت کا مرکز۔ یہاں مولانا احمد اللہ کی سرپرستی میں یوپی کے اضلاع میں کام کیا جاتا تھا۔ مولانا احمد اللہ اس مرکز کے امیر تھے اور انہوں نے آخر انگریز سے معافی مانگی تھی۔

3۔ لاہور کا مرکز۔ یہاں مولانا محمد احمد چکوالی امیر تھے۔ انہوں نے بھی انگریز سے معافی مانگی تھی۔

4۔ دین پور، ریاست بہاول پور کا مرکز۔ یہاں مولانا ابوالسراج غلام محمد سجادہ نشین امیر تھے۔ تین سال جیل میں رہے اور انگریز کی سختیوں کے باوجود اپنے عہد پر قائم رہے۔

5۔ امروٹ (سندھ) یہ سندھ اور بلوچستان کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا تاج محمد سجادہ نشین امروٹ امیر تھے۔ چار سال قید رہے اور مضبوط رہے۔

6۔ کراچی۔ یہ شہر کراچی، قلات اور لس بیلہ وغیرہ کا مرکز تھا۔ یہاں کے امیر مولانا محمد صادق تھے۔ لس بیلہ میں بغاوت کرائی۔ لڑائی ہوئی اور آخر آپ نے انگریز کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔ انجام کار گرفتار ہوئے۔

ایک سال قید، تین سال ملک بدر رہے، لیکن اپنے عہد پر مضبوط رہے۔

7۔ اتمان زئی۔ یہ صوبہ سرحد کا مرکز تھا۔ اس کے امیر عبدالغفار خان تھے۔ انہوں نے زبردست کام کیا۔ گرفتار ہو کر کئی سال قید رہے اور مضبوط رہے۔

8۔ ترنگ زئی۔ آزاد قبائل کا مرکز تھا۔ مولانا فضل واحد یہاں کے امیر تھے جو علاقے کے مشہور پیر تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی مراکز تھے جن کا علم نہیں ہو سکا، لیکن انگریزوں کی کارروائی سے اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی طرح بنگال اور آسام میں بھی، جہاں شیخ الہند کے لاکھوں مرید تھے، اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ خود بنگال کے کئی رہنما بیرونی مراکز میں کام کرتے رہے تھے اور یہاں سے مالی امداد بھی کارکنوں کو ملتی رہی۔

پانچواں منصوبہ: بیرونِ ملک امدادی مراکز کا قیام

اس منصوبے کے تحت بیرون ملک میں امدادی مراکز قائم کیے گئے۔ یہاں رضا کاروں کی بھرتی، مالی امداد اور اسلحے کی فراہمی کا کام ہوتا تھا۔ یہ غلط ہے کہ ہیڈ کوارٹر مدینہ منورہ میں تھا، جیسا کہ ''رولٹ رپورٹ'' میں ہے۔ ان کو غلط رپورٹ دی گئی۔ درحقیقت ہیڈ کوارٹر کابل میں تھا، جہاں پہلے مہندر پرتاب اور پھر مولانا عبید اللہ سندھی اور مہندر پرتاب دونوں امیر تھے اور کام کرتے رہے۔ اس شعبے کی پانچ شاخیں تھیں۔

(1) مدینہ منورہ، جہاں مولانا حسن احمد اور پھر خلیل احمد صاحب کام کرتے رہے۔ (2) انقرہ (3) قسطنطنیہ (4) استنبول (5) برلن۔ ان مقامات میں مختلف حضرات کام کرتے رہے۔ خصوصاً برلن میں ہر دیال نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ انہی کی کوششوں سے جرمنی اور ترکی کا معاہدہ اتحادِ عمل میں آیا اور جرمنی کی حکومت ہندوستانیوں کی مدد کے لیے آمادہ ہوئی کہ ہندوستان پر حملہ کر کے آزاد کرانے کے بعد واپس ہو جائے گی۔

کابل کے ہیڈ کوارٹر کو تو اتنی کامیابی ہوئی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ والئی افغانستان حبیب اللہ خان جب افغانستان کے رؤساء و امراء سے مشاورت کے لیے جرگہ بلاتا ہے کہ انگریزوں سے لڑا جائے یا نہیں، تو سوائے امیر حبیب اللہ خان اور ان کے بیٹے عنایت اللہ خان کے، باقی تمام جرگے کے ارکان، سب امرائے قبائل، خود حبیب اللہ خان کے فرزند، امان اللہ خان اور نصر اللہ خان اس رائے پر متفق تھے کہ انگریزوں سے لڑائی کی جائے اور ضرور کی جائے۔ چنانچہ امیر حبیب اللہ خان حیران رہ جاتا ہے اور اپنے شاہی صوابدیدی اختیارات استعمال کر کے کھلی جنگ سے ہٹ کر ایک نرم رائے اختیار کرنے پر جرگے کو مجبور کر دیتا ہے۔ درحقیقت افغانستان میں انگریزوں کے خلاف رائے عامہ استوار کرنے میں ان بزرگوں کی جدوجہد کا نتیجہ تھا جو کئی سال سے کابل کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرتے رہے تھے۔ اور جب مولانا سندھی افغانستان میں پاسپورٹ کے بغیر داخل ہوتے ہیں تو قندھار ہی میں ان کا استقبال افغانستان کا کمانڈر ان چیف نادر خان کرتا ہے اور آپ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے۔

''ریشمی خط'' کے پکڑے جانے اور تحریک کے ناکام ہو جانے کے بعد جب کابل ہیڈ کوارٹر کے قائدین کو گرفتار کر لیا جاتا ہے تو اس وقت ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان در پردہ انگریز سے ملا ہوا ہے۔ تب یہ

لوئی نظر بندی کی حالت میں امیر کے روڑے کو راستے سے ہٹانے کے لیے ایک تحریک افغان افسروں کے اندر چلاتے ہیں، جس کے نتیجے میں امیر حبیب اللہ خان کو قتل کر کے حکومت پر امان اللہ خان کا قبضہ کرایا جاتا ہے جو برسر اقتدار آتے ہی ان لوگوں کو رہا کر کے اپنا مقرب بناتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنا مشیر خاص بناتا ہے اور پھر ان کے مشورے سے انگریزی حکومت پر حملہ کر کے 23 اگست 1919ء کو افغانستان کو انگریز سے نجات دلا کر آزادی کا اعلان کرتا ہے۔

چھٹا منصوبہ: دوسری حکومتوں کو ترکی کا حمایتی بنانا

اس منصوبے میں دوسری حکومتوں کو ترکی (خلافت عثمانیہ) کا حمایتی بنانے کا پروگرام طے کیا گیا۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے (مقدمۂ کراچی کے دوران میں) کراچی کی ایک نجی محفل میں مولانا حسین احمد مدنی سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ امریکا کو بھی ترکی کا حمایتی بنایا جائے، لیکن شیخ الہند محمود حسن نے اس رائے سے مکمل اختلاف کیا۔ ان کی ذاتی رائے یہ تھی کہ امریکا ہر حال میں برطانیہ کا ساتھ دے گا اور بعد میں پہلی جنگ عظیم میں امریکا کی شرکت سے یہی ہوا۔ اس اعتبار سے ان کی یہ رائے بڑی صائب ثابت ہوئی۔

اصل کام جو اس منصوبے کے تحت طے ہوا تھا، وہ تھا جرمنی اور روس کو ترکی کا مددگار بنانا۔ چنانچہ برلن میں راجہ مہندر پرتاب نے مسلسل تین سال رہ کر اس کام کو سرانجام دیا۔ ہردیال اور مولانا برکت اللہ صاحب بھی ان کی امداد کرتے رہے اور آخر 'جرمنی ترکی اتحاد' عمل میں آیا۔ یہ مشن بے حد کامیاب رہا اور کیپٹن ہنٹس جو جرمن حکومت میں اثر رسوخ رکھتا تھا، اس نے اس اتحاد میں ہندوستانی مشن کی بڑی مدد کی اور آخر خود بہ نفس نفیس ہندوستان پر حملے کی تیاری کے سلسلے میں کابل آیا اور یہاں بڑے خلوص سے کام کیا۔

جرمن حکومت کی جانب سے مطمئن ہو کر اب اسی مشن کو روسی اتحاد کے لیے احکام دیے گئے۔ راجہ مہندر پرتاب برلن سے کابل آئے اور یہاں سے یہ کام شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان سے مولانا سندھی بھی کابل پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں کے مشورے سے روس کو مشن بھیجے گئے۔ پہلا مشن ڈاکٹر مرزا محمد علی اور متھرا سنگھ کی قیادت میں بھیجا گیا۔ یہ لوگ زار روس سے نہ مل سکے اور زار الٹا ان کے خلاف ہو گیا۔ ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ مگر یہ تاشقند کے گورنر کو اپنا ہم نوا بنا چکے تھے اور اسی کی کوشش سے یہ لوگ گرفتاری سے بھی بچ گئے اور بالآخر اسی کی مداخلت سے ان لوگوں نے نصب العین میں بھی کامیابی حاصل کی۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں کہ یہ مشن بے کار ثابت ہوا اور روسی اور انگریزی اتحاد میں خاصا رکاوٹ ثابت ہوا، جس کی تلافی کے لیے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔

ایک دوسرا مشن زار روس سے ملنے میں کامیاب ہوا۔ اس مشن نے ایک خط ''سونے کی پتری'' پر کندہ کر کے اسے دیا۔ اس خط میں مشن کے مقصد کا ذکر ہے۔ جب زار اور انگریزوں کے درمیان دوستی قائم ہوئی تو زار نے یہ سونے کی پتری انگریز کے حوالے کر دی، اس کا مفصل ذکر ''رولٹ رپورٹ'' میں درج ہے۔

مختصر یہ کہ روس میں زیادہ کامیابی نہ ہو سکی، البتہ جرمنی اور ترکی کا دوستی کا معاہدہ انہی لوگوں کی کوششوں سے طے پایا۔

گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات

ساتواں منصوبہ: حملہ کرنے کے راستوں کا تعین

اس منصوبے میں حملہ اور فوجوں کے حملے کے راستوں کا تعین اور ان کا تحفظ مقصود تھا۔ حملہ تو ترکی کی فوجوں نے کرنا تھا۔ راستے میں ایران اور افغانستان پڑتے تھے۔ ایران تو حکومتِ برطانیہ کے زیر اثر اور اس کا دست راست اور ترکی کا مخالف تھا۔ لہٰذا ایران سے تو راستہ دینے کی توقع نہ تھی۔ اس لیے تحریک کے قائدین نے ایران سے کوئی روابط ہی قائم نہیں کئے۔ البتہ افغانستان کے غیور پٹھان انگریز کے دشمن اور بدخواہ تھے۔ گو مجبوراً افغان حکومت انگریز کے زیر اثر تھی اور افغانستان انگریزی حکومت کی ایک ریاست تصور ہوتا تھا، لیکن بایں ہمہ دل سے کوئی بھی انگریز کا خیر خواہ نہ تھا۔ یہاں کامیابی کی امید تھی، اس لیے یہاں کام کیا گیا اور واقعی کامیابی ہوئی۔

والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کمزور دل کا انسان تھا، اس لیے وہ تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ملک جنگ کا مرکز بن جائے۔ چنانچہ اس فیصلے کے لیے اپنے سول اور فوجی افسروں اور قبائلی سرداروں کا ایک جرگہ بلایا۔ پھر اس کے سامنے یہ رائے رکھی تو سب افسر اور قبائل کے امراء اور اس کے بیٹے امان اللہ خان و نصر اللہ خان جنگ پر آمادہ تھے، اور سب کی یہ رائے تھی کہ ہمیں ترکی کے ساتھ مل کر لڑنا چاہیے اور خطے کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانی چاہیے۔ صرف ایک امیر حبیب اللہ خان اور اس کا بیٹا عنایت اللہ خان بعض وجوہ کی بناء پر جنگ کے خلاف تھے، لیکن قومی دباؤ کے تحت امیر حبیب اللہ خان نے ایک درمیانی راہ نکالی کہ بعض پہاڑی قبائل کے علاقوں سے ترکی فوج گزر کر ہندوستان پر حملہ کرے اور ان پہاڑی راستوں کا بھی تعین کر دیا۔ ہم انگریز سے کہیں گے کہ یہ قبائل باغی ہو گئے ہیں اور اب ہم مجبور ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ سرکاری فوج تو کوئی حصہ نہ لے، البتہ رعایا کو اختیار ہے کہ از خود رضاکارانہ طور پر جانی اور مالی خدمات انجام دیں۔ مقصد یہ تھا کہ اگر عین موقع پر انگریز کا پلّہ بھاری نظر آیا تو اس کے ساتھ ہو کر ترکی فوج کو روک دیں گے، اور اگر ترکی کا غلبہ نظر آیا تو اس کے ساتھ ہو کر انگریز سے باغی ہو جائیں گے۔ یہ دورُخی پالیسی ان کی کمزوری کا نتیجہ تھی۔

انقلابی لیڈروں کو امان اللہ اور نصر اللہ خان نے تسلی دی کہ حکومت کا نظم و نسق ہمارے ہاتھ میں ہے، لہٰذا اتنی اجازت کو کافی سمجھیں اور جب ترکی فوج یہاں پہنچ جائے گی تو رعایا اور فوج کے دباؤ سے ہم امیر کو انگریز کے خلاف آمادۂ بغاوت کر لیں گے، ورنہ یہ روڑا راستے سے ہٹا دیا جائے گا، آپ اطمینان سے اپنا کام جاری رکھیں۔ چنانچہ یہ مرحلہ اس طرح کامیاب ہوا اور طے پایا کہ ترکی فوج کابل کے راستے سے قبائلیوں کو اپنے ساتھ ملا کر چار محاذوں

سے حملہ کر دے:

1۔ قلات ومکران کے قبائل ترکی فوج کی قیادت میں کراچی پر حملہ کریں۔

2۔ کوئٹہ کے محاذ پر غزنی وقندھار کے قبائل ترکی فوج کی قیادت میں حملہ کریں۔

3۔ پشاور کے محاذ پر درہ خیبر کے مہمند ومسعودی قبائل کو ساتھ لے کر ترکی فوج حملہ کرے۔

4۔ اوگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل کو ساتھ لے کر ترکی فوج حملہ آور ہو۔

ادھر ہر محاذ پر ایک انقلابی لیڈر پہلے سے کام کر رہا تھا۔

قلات کے محاذ پر مولانا محمد صادق کواچوی، کوئٹہ کے محاذ پر حافظ تاج محمود سندھی، جو کہ پیر پگاڑو کے سلسلے کے قائد تھے، درۂ خیبر کے محاذ پر حاجی ترنگ زئی شریف والے، اوگی کے محاذ پر مولانا محمد اسحاق۔ اگر ۔ دس ساتھ دیتا تو نیپالی قبائل کی معیت میں نیپال کے محاذ سے حملہ کیا جاتا۔ نیپال میں پنڈت لوی پہلے سے کام کر رہے تھے۔

آٹھواں منصوبہ: ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت کا منصوبہ

اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ فوج جب مقامی مسلح آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کرے، اسی وقت ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت شروع ہو جائے۔ بیرونی حملہ اور اندرونی بغاوت دونوں بیک وقت عمل میں آئیں۔ ایسا نہ ہو کہ تقدیم وتاخیر ہو جائے اور دشمن کی طاقت فرداً فرداً ہر ایک مخالف کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے، جیسا کہ انقلاب 1857ء میں ہوا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے حضرت شیخ الہند نے انور شاہ (ترکی) سے آخری خط میں لکھوا دیا تھا کہ باقی معاہدات ہندوستانی انقلابیوں سے بذریعہ محمود الحسن آفندی طے ہو چکے ہیں۔ صرف افغان حکومت سے معاہدے کی یہ آخری تحریر ہے۔ اگر افغان حکومت ہمیں راستہ دینے پر راضی ہو جائے تو افغانستان کے حملے کی تاریخ کا تعین کر کے ہمیں اطلاع دیں تاکہ ہم اسی تاریخ کو حملے کا انتظام کریں، اور حملے سے صرف دس دن پہلے ہماری فوج افغانستان پہنچ جائے گی۔

بو اپسی خفیہ ''ریشمی خط'' کے ذریعے سے افغان حکومت سے معاہدہ کر کے افغانستان کے ہیڈ کوارٹر نے 19 فروری 1917ء کی تاریخ کا تعین لکھ دیا تھا۔ یہ ریشمی خط شیخ الہند کو مدینہ میں ملنا تھا اور اس کے مطابق ترکی حکومت سے بات چیت کو آخری شکل دے کر ایک ماہ پہلے یکم جنوری 1917ء کو کابل ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دینی تھی اور پھر کابل کے ہیڈ کوارٹر نے ہندوستان کے ہیڈ کوارٹر دہلی کو یکم فروری 1917ء تک حملے کی تاریخ سے مطلع کرنا تھا۔ اس کے بعد 9 فروری کو ترکی فوجوں نے افغانستان پہنچنا تھا، اور پھر 19 فروری کو حملہ کر دینا تھا۔ اور اسی تاریخ کو ہندوستان کے ہر محاذ نے اپنے اپنے علاقوں میں علم بغاوت بلند کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ الہندؒ ابتدا میں مدینہ منورہ ٹھہر گئے۔ ان کا ارادہ یہی تھا کہ ترکی حکومت سے آخری بات چیت اور مقررہ تاریخ پر حملے کا قطعی فیصلہ کر کے افغانستان جائیں گے۔

بعد میں جب کابل ہیڈ کوارٹر کے ''صاف جواب'' ملنے سے مایوس ہو گئے کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے، مجھے جلد از جلد کابل پہنچنا چاہیے، لیکن اب حالات دگرگوں ہو چکے تھے اور حادثہ پیش آ چکا تھا، یعنی ''ریشمی خط'' پکڑا جا

چکا تھا اور انگریز نے افغانستان کے سب راستے بند کر دیئے تھے۔ اب وہاں پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ چنانچہ مجبوراً وہاں حجاز ہی میں رہنا پڑا، اور وہاں سے ہی گرفتار کیے گئے۔ تقدیر تدبیر پر غالب آئی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے ''ریشمی خط'' پکڑ لینے کے بعد ہندوستان کے انقلابی لیڈروں کو بھی 19 فروری سے پہلے ہی گرفتار کروایا۔ اس کے باوجود 19 فروری کو سرحدوں پر بھی، اور اندرونِ ملک بھی زبردست انتظامات کیے، تاکہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے، لیکن اب تو حادثہ پیش آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ''رولٹ رپورٹ'' میں ان انتظامات کے متعلق اجمالی اشارے درج ہیں کہ حکومت نے بروقت احتیاطی تدابیر اختیار کیں، جن کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ یہ تفصیلات سی آئی ڈی کے خفیہ کاغذات میں بھی درج ہیں۔ ان کا کچھ ذکر ان بیانات میں بھی ہے جو کہ مصر میں انگریز فوجی عدالت نے حضرت شیخ الہند کو پڑھ کر سنائے۔

منصوبوں پر طائرانہ نظر

مذکورہ منصوبوں کا مقصد تھا، ہندوستان کی آزادی۔ اس کے لیے ایک مرکزی جماعت بنائی گئی، جس کے امیر و سربراہ حضرت شیخ الہندؒ تھے اور اس کا مرکز پہلے دیوبند، پھر دہلی تھا۔ اس جماعت کا نام پہلے ثمرۃ التربیۃ اور پھر جمعیۃ الانصار تھا۔ اس مرکزی جماعت نے ایک انقلاب برپا کرنے کا ارادہ کیا کہ اندرونِ ملک بغاوت کرائی جائے اور بیرونِ ملک شمال مغربی سرحد پر قبائل سے کسی طاقتور حکومت کی مرکزی طاقت سے حملہ کرایا جائے۔ چنانچہ ترکی کے صدر انور پاشا سے معاہدہ ہوا کہ وہ افغانستان کے راستے سے فوجیں گزار کر، قبائل کو ساتھ ملا کر ہندوستان پر حملہ کریں۔ اس کے لیے افغان حکومت کو رضامند کرنا تھا اور وہاں ایک ہیڈ کوارٹر قائم کر کے اس کو رضامند کر لیا گیا یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت افغانستان اور ترکی کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اس وقت کا جغرافیہ جنگ اور تھا، اور اب تو ''نائن الیون'' کے واقعے کے بعد امریکا اور برطانیہ نے مل کر پوری دنیائے اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

بہرحال ہندوستان کی آزادی کو مقصد بنا کر جو منصوبے بنائے گئے، ان کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ تاہم ایک بار پھر ان کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے، تاکہ اصل ''تحریک ریشمی رومال'' کے سمجھنے میں مدد ملے:

1۔ اندرونِ ملک ہندو مسلم اتحاد کرایا گیا، اور دونوں قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے آمادۂ بغاوت کیا گیا۔

2۔ قدیم تعلیم یافتہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ گریجویٹ حضرات کو یکجا کر کے آمادۂ بغاوت کیا گیا۔

3۔ بین الاقوامی دنیا کو یعنی جاپان، چین، برما، انڈونیشیا، فرانس اور امریکا کو اپنا ہمنوا بنایا گیا۔

4۔ دشمن پر حملہ کرنے کے بعد نقشۂ جنگ تیار کیا گیا اور انگریزی سی آئی ڈی اور فوجوں میں اپنے نوجوان بھیجے گئے۔

5۔ انقلاب کے بعد کے لیے عبوری حکومت کا خاکہ بنایا گیا جس میں ہندو مسلم دونوں کو مساوی حقوق دیے گئے۔

6۔ اندرونِ ملک خفیہ مراکز قائم کیے گئے، جہاں بغاوت کے لیے نوجوان طاقت کو تیار و مستعد کیا گیا۔

7۔ بیرونِ ملک یعنی کابل، انقرہ، استنبول، قسطنطنیہ اور برلن میں رضا کاروں کی بھرتی کے لیے مرکز کھولے گئے۔

8۔ ترکی حکومت کا مددگار جرمنی کو بنایا گیا۔ روس کو ترکی کا معاون بنانے کی کوشش کی گئی۔

9۔ حملے کے لیے قلات، کوئٹہ، درۂ خیبر اور اوگی مقرر کیے گئے اور افغان حکومت سے راستے کی اجازت لی گئی۔

10۔ حملہ و بغاوت کے لیے 19 فروری 1917ء کی تاریخ حضرت شیخ الہندؒ نے انور پاشا اور جمال پاشا کے مشورے سے مقرر کی۔

منصوبوں پر عمل درآمد کی صورت

1905ء سے 1914ء تک متواتر 9 سال ان منصوبوں پر عمل ہوتا رہا۔ جب یہ منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو اچانک پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ انقلابیوں کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ چنانچہ انقلابی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے بجائے دہلی کے، دیوبند میں مجلس مشاورت منعقد کرکے فیصلہ کیا کہ اب حالات کا تقاضا ہے کہ جلد از جلد انقلاب برپا کیا جائے۔ اس کے لیے تاریخ 19 فروری مقرر کی، لیکن اس کی توثیق ترکی حکومت کو کرنی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ یہ عبوری تاریخ رہے اور اگر ترکی حکومت اس کی منظوری دے دے تو یہی تاریخ پختہ ہو جائے گی، ورنہ جو تاریخ ترکی حکومت نے مقرر کی، وہ پختہ سمجھی جائے گی۔ اس فیصلے کی اطلاع اندرونِ ملک برانچوں کو کردی گئی کہ اس تاریخ کے لیے تیاری کریں، لیکن پختہ یقین کے لیے اطلاع ثانی کا انتظار کریں۔

یہ فیصلہ دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر ہوا تھا۔ اس کے مطابق اب ایک اہم کام سر انجام دینا تھا۔ وہ یہ کہ ان تک انقلابی پارٹی اور ترکی حکومت کے درمیان نمائندوں کی وساطت سے زبانی معاہدے ہوئے تھے۔ براہ راست اور بالمشافہ بات نہیں ہوئی تھی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ انقلابی حکومت کے صدر (یعنی شیخ الہندؒ) اور ترکی حکومت کے صدر بالمشافہ بات چیت کرکے معاہدے کو آخری شکل دیں۔ معاہدہ یہ تھا کہ ترکی حکومت کی فوجیں ہندوستان کو فتح کرکے انقلابی حکومت کے حوالے کردیں گی اور خود واپس چلی جائیں گی۔ اور اس کے عوض اگر ترکی حکومت کو برطانیہ کے خلاف رضا کاروں اور مالی امداد کی ضرورت ہوئی تو انقلابی حکومت ان کی ہر طرح سے مدد کرے گی۔ نیز یہ حملہ کس تاریخ کو، کیونکر، اور کہاں سے ہوگا۔

چنانچہ مرکزی مجلس شوریٰ نے اس مضمون کا معاہدہ تحریر کرکے اور ارکانِ مجلس سے دستخط کرا کر حضرت شیخ الہندؒ کے حوالے کیا اور آپ کو خود ترکی جا کر صدر جمہوریہ ترکی انور پاشا سے بات چیت کرنا اور اس معاہدے کی منظوری لینا تھی۔ چنانچہ آپ اپنی جائیداد بطور شرعی قانونِ وراثت تقسیم کرکے، حج کے ارادے سے روانہ ہوگئے۔ اس وقت حجاز وغیرہ میں ترکی کی حکومت تھی، اس لیے ارادہ یہ تھا کہ حج کے بہانے سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور وہاں پہنچنے کے بعد انور پاشا سے ملاقات کرکے تاریخ اور معاہدے کی منظوری لے کر واپس اسی راستے سے کابل آ جاؤں گا اور پھر وہاں سے آخری کام کیا جائے گا۔ شیخ الہند کا جانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ اب تک ترکی اور افغان معاہدے میں بھی قطعی و حتمی فیصلہ باقی تھا۔ خیال یہ تھا کہ انور پاشا سے تحریری معاہدہ لے کر، کابل میں لا کر افغان حکومت سے منظور کرا کے بواپسی منظوری کی اطلاع حکومت ترکی کو دی جائے گی۔ غرضیکہ آپ

کے سامنے یہ تین کام تھے:

(1) انقلابی پارٹی اور ترکی کی حکومت کا معاہدہ۔

(2) افغانستان اور ترکی حکومت کا یقینی معاہدہ۔

(3) انقلاب برپا کرنے کی تاریخ کا تعین۔

ان تین مقاصد کے پیش نظر آپ حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ پہنچے۔ حکومت برطانیہ کا ارادہ تھا کہ آپ کو دہلی میں گرفتار کرلیا جائے، لیکن دہلی میں ہجوم اتنا ہوگیا کہ گرفتاری خلافِ مصلحت سمجھی گئی۔ پھر بمبئی میں گرفتاری کا ارادہ کیا، لیکن چونکہ حکومت کی سی آئی ڈی سے ڈاکٹر انصاری کے روابط تھے، اس لیے آپ نے اہل کاروں سے خفیہ مل کر، گرفتاری کے حکم کا تار جو گورنر جنرل کی طرف سے گورنر بمبئی کو روانہ کیا گیا، ہوم سیکرٹری کے دفتر میں رکوا کر لیٹ کردا دیا۔ جب تار بمبئی پہنچا تو آپ جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ پھر عدن کے گورنر کو گرفتاری کا حکم اس وقت ملا جب آپ حکومت برطانیہ کے قبضے سے نکل چکے تھے۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر شیخ الہند نے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی۔ غالب پاشا اس انقلابی تحریک سے پہلے ہی واقف تھا۔ آپ نے اپنا تعارف کرایا اور مقصد ظاہر کیا کہ میں انور پاشا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ الہندؒ کی تلاش

غالب پاشا نے پہلے تو یہ کہا کہ ان معاہدوں کی منظوری میں دے دیتا ہوں۔ آپ لے کر واپس چلے جائیں، انور پاشا سے ملنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ انور پاشا کی جنگی کمیٹی کا میں سیکرٹری ہوں۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے اصرار پر اس نے گورنر مدینہ کو لکھ دیا کہ یہ ہندوستان کی انقلابی پارٹی کے صدر ہیں، میں نے تحقیقات کرالی ہے، اس لیے ان کو انور پاشا سے ملانے کا انتظام کر دیں، تاکہ یہ دمشق یا قسطنطنیہ جا کر ان سے ملاقات کرلیں۔ شیخ الہندؒ نے یہاں ایک اور کام کرنا بھی ضروری سمجھا۔ وہ یہ کہ غالب پاشا سے ترغیب جہاد کا ایک مضمون لکھوالیا، تاکہ افغانستان کے قبائل اور ہندوستان میں چھپوا کر اسے شائع کیا جائے۔

غالب پاشا سے ایک دوسرا خط افغان حکومت کے نام لکھوایا۔ اس دوسرے خط میں ان پرانے معاہدوں کی توثیق تھی اور افغان حکومت کو لکھا تھا کہ محمود الحسن آفندی (یعنی شیخ الہندؒ) تمہارے پاس بہت جلد آ رہے ہیں۔ یہ جو بات کریں، ہماری حکومت کی جانب سے اس کی تائید سمجھیں اور اس معاہدے کو ترک حکومت کا معاہدہ سمجھیں۔ اس خط میں وہی پرانا معاہدہ لوٹایا گیا تھا کہ ہم افغان حکومت کے مقبوضات میں کوئی دخل نہ دیں گے، اور اگر ہماری وجہ سے کوئی طاقت افغان حکومت کے خلاف ہوئی تو ہم اس کے خلاف افغان حکومت کی ہر طرح مدد کریں گے۔

درحقیقت یہی معاہدہ پہلے بھی نمائندوں یعنی مہندر پرتاب وغیرہ کے ذریعے ہوا تھا، اور یہی اب غالب پاشا نے لکھ دیا اور یہی بعد میں شیخ الہندؒ کے ذریعے انور پاشا نے لکھ دیا تھا، لیکن انگریز کو غالب پاشا کا یہ عہد نامہ نہیں مل سکا۔ ان کو صرف وہ خط ملا تھا جو عوام کی طرف سے ترغیب جہاد کے لیے تھا اور اسی کا نام انگریزی سرکاری ریکارڈ میں ''غالب

نامہ'' ہے۔ غالب پاشا بعد میں گرفتار ہو گیا تھا۔ حکومت برطانیہ کا جنگی قیدی بھی رہا ہے۔ اس وقت بھی اس نے صرف اس دوسرے خط کا اقرار کیا تھا۔ پہلا خط یعنی معاہدے والا، اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہوا۔ غرضیکہ یہ دو خط علیحدہ علیحدہ تھے۔

غالب نامے کی ترسیل

''غالب نامہ'' لے کر مولانا محمد میاں انصاری حج کے بعد واپس ہندوستان کو لوٹے۔ وہ حضرت قاسم نانوتویؒ کے نواسے تھے۔ اس خط کو لے کر افغانستان گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور آخر وہیں انتقال کیا اور دفن ہوئے۔ آپ ''غالب نامہ'' لے کر ہندوستان پہنچے۔ یہاں سی آئی ڈی نے ان کا پیچھا کیا۔ مولانا نے اپنا نام بدل کر محمد منصور رکھ لیا اور حلیہ بھی بدل کر یاغستان (آزاد قبائل) میں پہنچ گئے۔ یہ خط یعنی غالب نامہ ایک لکڑی کی چھڑی میں بند کر کے لایا گیا تھا۔

ہندوستان میں غالب نامہ کی اشاعت نہ ہو سکی، جیسا کہ پروگرام تھا، لیکن آزاد قبائل میں اس کی اشاعت ہو گئی۔ رولٹ کمیٹی کو اس کی کچھ کاپیاں آزاد قبائل کے علاقے ہی سے دستیاب ہوئی تھیں۔ پھر مولانا انصاری غالب نامہ لے کر افغانستان چلے گئے اور وہاں بھی اس کی اشاعت کا کام کیا، لیکن اب چونکہ ریشمی خط پکڑا جا چکا تھا، اس لیے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

باقی رہا دوسرا خط۔ یہ عہد نامہ افغان حکومت کو بعد از وقت ملا، جب ریشمی خط کا راز فاش ہو چکا تھا، اس لیے مولانا انصاری افغانستان بہت دیر سے پہنچے۔ البتہ اس عہد نامے سے افغانستان کے انقلاب پسند عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی، اور امان اللہ جو اس انقلابی پارٹی کے سرخیل تھے، انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے امیر حبیب اللہ خان کو قتل کرایا اور خود حکومت پر قابض ہو گئے اور سخت جنگ لڑ کر افغانستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرا لیا۔ درحقیقت اس خط میں کچھ ایسی تدبیریں بھی درج تھیں جن سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور کامیاب ہوئے۔

دو معاہدوں کا نام ''انور نامہ''

اس کے بعد شیخ الہندؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں گورنر مدینہ سے ملاقات کی اور اس نے آپ کو شام بھیجنے کے انتظامات کرنے کا وعدہ کیا۔ ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ گورنر نے کہا کہ انور پاشا اور جمال پاشا زیارت نبوی ﷺ کے ارادے سے یہاں آ رہے ہیں، ان سے یہیں آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ مقررہ تاریخ پر یہ دونوں حضرات مدینہ منورہ تشریف لائے۔ عام ملاقات کے علاوہ شیخ الہندؒ نے خصوصی خفیہ ملاقات کی۔ انور پاشا اور جمال پاشا دوسرے روز واپس چلے گئے اور دونوں معاہدوں کے کاغذات ساتھ لے گئے کہ وہاں سے دستخط کر کے واپس ارسال ہوں گے۔ چنانچہ ایک ماہ کے بعد گورنر مدینہ نے شیخ الہند کو بلا بھیجا۔ دونوں دستخط شدہ معاہدے آپ کو دیئے۔ ایک معاہدہ تو ترکی حکومت اور ہندوستان کی حکومت وقت کے درمیان تھا جو انقلابی پارٹی نے عارضی طور پر قائم کی تھی۔ اسے ''انقلابی ترکی معاہدہ'' کہا گیا۔ دوسرا معاہدہ افغان حکومت اور ترکی حکومت کے درمیان تھا۔ اسی معاہدے میں انقلاب کی تاریخ کا تعین بھی تھا۔ یعنی 19 فروری 1917ء۔ اسے ''افغان ترکی معاہدہ'' کہا گیا۔

غرضیکہ یہ دو معاہدے دو خطوط کی صورت میں علیحدہ علیحدہ تھے، اور دونوں کا مجموعی نام ''انور نامہ'' تھا۔ ان دونوں معاہدوں کی تفصیل یہ ہے:

(1) انقلابی ترکی معاہدہ: اس کا تعلق خود شیخ الہندؒ ہندوستان اور انقلابی پارٹی سے تھا؟ اس لیے وہ تو اپنے پاس رکھا جو نہ لیا گرفتاری کے وقت بیکار سمجھ کر، اور اس خیال سے کہ حکومت برطانیہ کی رازوں سے آگاہ ہو جائے گی، ضائع کر دیا۔

(2) افغان ترکی معاہدہ: یہ معاہدہ شیخ الہندؒ نے مدینہ منورہ سے مولانا حسن خاں جہاں پوری کو دے کر ہندوستان روانہ کیا کہ فلاں فلاں حضرات کے ذریعے سے افغانستان پہنچا جائے۔ اس میں ترکی حکومت نے اپنی جانب سے معاہدے کو آخری شکل دے دی تھی اور انقلاب خیزی کی پوری جزئیات لکھ دی تھیں، اب صرف افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع واپس شیخ الہندؒ کے ذریعے ترکی حکومت کو پہنچنی تھی۔ اس کے بعد ترکی حکومت کو حملہ کر دینا تھا۔ البتہ شیخ الہندؒ نے افغانستان اور ہندوستان کے قائدین تحریک کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ کام میں کہیں زیادہ پیش قدمی و تیزی نہ ہو جائے جو خون خرابے اور نقصان کا باعث ہو، اس لیے تمہیں اپنی ماتحت شاخوں کو بھی یہ ہدایت دینی ہے کہ جب افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع ترکی حکومت کو پہنچ جائے اور میں اس کی اطلاع کابل اور دہلی کے مرکزوں کو دوں اور پھر یہ دونوں مرکز اپنی اپنی شاخوں کو مطلع کریں کہ کام پورا ہو گیا ہے، اس لیے تم تاریخ مذکورہ پر قدم اٹھاؤ اور بغاوت اور حملہ شروع کر دو، تو تب عملی اقدام کرنا ورنہ جب تک میری اطلاع تمہاری مرکزوں کو نہ ملے اور نہ شاخوں و تمہاری اطلاع ملے، تو سمجھو کہ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔ پھر کوئی قدم نہ اٹھانا اور انتظار کرنا۔

خلاصہ یہ کہ افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع شیخ الہندؒ کے ذریعے سے ترکی حکومت کو پہنچنا تھی، اور پھر حضرت شیخ نے آخری اقدام کا حکم دینا تھا، اس لیے کہ اس ساری تحریک کا مرکزی نقطہ حضرت شیخ کی ذات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ریشمی خط پکڑا جاتا ہے تو اگر کسی شاخ کو اس کی اطلاع نہیں ہوتی اور انگریزی دسترس سے بھی وہ بچ جاتی ہے، تب بھی وہ تاریخ مذکور پر کوئی اقدام نہیں کرتی، اس لیے کہ ہر شخص آخری اقدام کے حکم کا منتظر تھا۔ جب یہ حکم نہیں ملا تو ہر شخص سمجھ گیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے اور اسی لیے آخری اقدام کا حکم نہیں ملا۔

غرضیکہ یہ خط لے کر مولانا ہادی حسن صاحب ہندوستان پہنچتے ہیں۔ یہ خط صندوق کے تختے کے درمیان بند کیا گیا تھا، اس طرح کہ باہر سے دیکھنے والے کو محسوس نہ ہو کہ دو تختیاں ملا کر ایک بنائی گئی ہیں۔ یہ صندوق شیخ الہندؒ نے ایک کاریگر سے ساگوان کی لکڑی کا تیار کرایا تھا۔ ایک جانب کے تختے کو دو پتلی تختیوں سے اس طرح ملایا گیا کہ ایک ہی تختہ معلوم ہو اور پھر اس میں کچھ کپڑے وغیرہ رکھ کر مولوی ہادی حسن کے سپرد کیا گیا تھا۔

مولانا ہادی حسن بمبئی پہنچتے ہیں۔ شیخ الہندؒ نے پہلے سے بمبئی کے ایک رکن کو کسی ذریعہ سے اطلاع بھیج دی تھی کہ مولانا ہادی حسن اس طرح آ رہے ہیں اور جہاز سے اترتے ہی ان کی سخت تلاشی ہو گی۔ لہٰذا جہاز سے وہ امانت لے کر وہاں پہنچا دی جائے جہاں اسے پہنچانا مقصود ہے۔ ادھر مولانا ہادی حسن کو بھی یہ ساری ترکیب بتا دی تھی کہ تم صندوق ان کے حوالے کر کے آگے پہنچانے کا مقام بتا دینا اور تاکید کر دینا کہ یہ صندوق ہرگز اپنے پاس نہ رکھیں،

ورنہ پولیس کو اطلاع مل جائے گی اور یہ شبہ ضرور ہوگا کہ یہ شخص جہاز پر کیوں گیا تھا اور کس سے ملا تھا۔ یہ باتیں بے حد خطرناک ہیں اور سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

شیخ الہندؒ کی تلاش

مولانا ہادی حسن کو پوری طرح سمجھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ جہاز پر ہی یہ صاحب مولانا ہادی حسن سے ملتے ہیں اور آپ ان کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ فوری طور پر یہ صندوق مظفر نگر میں محمد نبی کے پتے پر پارسل کر دیں۔ شیخ الہند نے محمد نبی کو الگ سے اطلاع کر دی تھی کہ صندوق میں فلاں تختے کے اندر کاغذات ہیں۔ نکال کر فلاں مقام پر پہنچا دینا۔ چنانچہ وہ بمبئی والے صاحب حسب ہدایت جہاز پر سے صندوق اپنے قبضہ میں لے کر، عام مسافروں میں مل کر قلیوں سے اٹھوا کر صندوق باہر لے آتے ہیں۔ کسی کو ان پر شبہ ہی نہیں ہوتا اور باہر آ کر سیدھے اس کو مظفر نگر چلتا کر دیتے ہیں۔ ادھر سی آئی ڈی کو اطلاع یہ ملی تھی کہ شیخ الہند خود اس جہاز سے تشریف لا رہے ہیں۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ شیخ الہندؒ مولانا ہادی حسن کو روانہ کرنے کے لیے جدّہ آئے تھے۔ انہیں بندرگاہ پر دیکھ کر انگریز جاسوسوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ اس جہاز سے بمبئی جا رہے ہیں اور یہی غلط رپورٹ بمبئی سے سی آئی ڈی کو بذریعہ تار بھجوا دی گئی۔ چنانچہ جہاز پر سی آئی ڈی والے شیخ الہند کو تلاش کرتے رہے۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے تو ان کے ساتھیوں کو حراست میں لے لیا، جن میں مولانا ہادی حسن بھی تھے۔ سخت تلاشی لی گئی، مگر کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی۔ اس کے بعد مولانا ہادی حسن کو نینی تال لے جا کر قید کر دیا گیا۔ پوچھ گچھ ہوئی، لیکن آپ مضبوط قدم رہے۔

ادھر مظفر نگر میں حاجی محمد نبی کو شیخ الہندؒ کی ہدایات مل چکی تھیں، ان پر عمل کیا۔ صندوق کے تختے سے یہ خط نکال کر حاجی نور الحسن کو دیا۔ انہوں نے حاجی مرزا احمد سے فوٹو اتروا کر ان کو تحریک کے مراکز میں پہنچایا، لیکن اس کے بعد وہ مراکز ان سے چنداں فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اسی اثنا میں ریشمی خط پکڑا گیا اور یہ فوٹو وغیرہ جلا دیے گئے۔ ان تینوں حضرات کے ہاں پولیس کے چھاپے پڑے مگر ناکام رہے۔ حاجی محمد نبی کے ہاں جب چھاپہ مارا گیا تو انہوں نے بھی یہ خط ایک واسکٹ کی جیب میں ڈال کر اس کو صحن میں ایک کھونٹی پر لٹکا دیا اور کسی کو شبہ بھی نہ گزرا۔ حاجی نور الحسن کے ہاں اسی روز چھاپہ مارا گیا، مگر خط تو ابھی پہنچا ہی نہیں تھا بعد میں پہنچا۔ احمد مرزا فوٹو گرافر کے مکان پر دو مرتبہ چھاپہ مارا گیا۔ پہلی مرتبہ تو خط پہنچا ہی نہیں تھا اور دوسری مرتبہ ایک کرسی کے نیچے ایک تھالی میں پڑا رہا۔

امیر حبیب اللہ خان کا جرگہ

یاد رہے کہ انور پاشا کے خط دو تھے۔ ایک خط میں قوم سے اپیل کی گئی تھی کہ حضرت شیخ الہند کا ساتھ دیں۔ درحقیقت یہی خط فوٹو اتروا کر تحریک کے مرکزوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ دوسرا خط افغان حکومت کے نام تھا، جس میں معاہدے کا ذکر تھا۔ وہ خط حاجی نبی محمد کے پاس محفوظ رہا۔ مولانا ہادی حسن نے رہائی کے بعد اس خط کو خود افغانستان پہنچایا اور مقررہ جگہ پر پہنچانے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ آپ نے قریباً دو ماہ میں یہ دشوار گزار سفر طے کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے لکھتے ہیں: ''یہ غلط ہے کہ افغانستان سے ایک نوجوان خوشی محمد یہاں ہندوستان آیا اور مولانا ہادی حسن سے خط لے گیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود مولانا ہادی حسن فوراً اپنا حلیہ بدل

کراور اپنا نام مظفر ا... رکھ کر افغانستان تشریف لے گئے تھے۔"

یہ خط کابل پہنچا تو وہاں کے انقلابی پارٹی کے رہنماؤں نے حکومت کو دے کر جواب کا مطالعہ کیا۔ امیر حبیب اللہ خان اپنی مزوری کے باعث انگریز سے لڑنا نہیں چاہتا تھا اور اب کسی طرح جان بچا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مشورے کے لیے فوجی افسروں، سول عہدے داروں اور قبائل کے سرداروں کو جمع کیا اور اس جرگے کے سامنے رائے رکھی۔ اس جرگے میں مولانا عبیداللہ سندھی انقلابیوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ حبیب اللہ خان یہ دیکھ کر سخت حیران و پریشان ہوا کہ سارا جرگہ جنگ کے لیے آمادہ اور مشتعل ہے، بلکہ اس کے دو بیٹے امان اللہ خان اور نصر اللہ خان بھی اس تحریک میں پیش پیش ہیں۔ اس نے اپنے طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سب کچھ ہندوستانی لیڈروں کا کیا دھرا ہے۔ آخر حبیب اللہ خان نے اپنے شاہی اختیارات کا سہارا لے کر، ایک درمیانی راہ نکالی کہ ترکی فوجیں بعض سرحدی علاقوں سے خفیہ طور پر گزر کر ہندوستان جائیں اور ہم انگریز کے سامنے مجبوری کا اظہار کر دیں گے کہ قبائلی باغی ہو کر، ہمارے قابو سے باہر ہو چکے ہیں۔ اندرونِ افغانستان کا کوئی آدمی اپنے طور سے جتھے میں حصہ لینا چاہے تو آزاد ہے، لیکن حکومت بحیثیت حکومت غیر جانب دار رہے گی۔ انقلابی لیڈروں نے اسی کو غنیمت سمجھا اور افغان حکومت سے اس کا معاہدہ کر لیا جو نائب السلطنت نصر اللہ خاں نے لکھا، اور مولانا سندھی کے مشورے کے مطابق اپنی نگرانی میں محفوظ کر لیا۔ مولانا سندھی نے یہ انتظام کیا کہ اس معاہدے کی ساری عبارت مع تاریخ حملہ (19 فروری 1917ء) ایک کپڑے پر لکھوائی۔ یہی "ریشمی رومال" ہے۔ جس کی کہانی یہاں سلسلہ در سلسلہ چل رہی ہے۔

اصل ریشمی رومال

مولانا عبیداللہ سندھی اور نصر اللہ خان نے مل کر ایک ماہر کاریگر سے ایک ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں "معاہدہ" کی پوری عبارت اور تاریخ حملہ (19 فروری 1917ء) کی منظوری کی عبارت بھی بُن دی گئی تھی۔ یہ عبارت عربی میں تھی اور افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان اور اس کے تینوں بیٹوں (یعنی امان اللہ خان، نصر اللہ خان اور عنایت اللہ خان) کے دستخط بُننے میں آ گئے تھے۔ پھر اس رومال کے اوپر ان چاروں کے دستخط زرد رنگ کی سیاہی سے کرا دیے گئے۔ یہ ریشمی رومال زرد رنگ کا تھا جس کی لمبائی ایک گز تھی اور عرض بھی اتنا ہی تھا۔

ایک رکن تحریک تھے جو پیغام رسانی کے کام پر مامور تھے۔ افغانستان اور ہندوستان میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ہندوستان کا کپڑا افغانستان لے جاتے اور افغانستان کا کپڑا ہندوستان لاتے۔ اسی طرح ان کا کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا اور ساتھ ہی تحریک کی پیغام رسانی کا کام بھی اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ وہ شیخ الہندؒ سے بیعت تھے اور آپ کی اس تحریک کے معتمد علیہ رکن بھی تھے۔ یہ نومسلم نوجوان تھے۔ انگریزی میں ایم اے تھے۔ معاملہ فہم اور زیرک شخص تھے۔ ان کا اسلامی نام شیخ عبدالحق تھا۔ یہ بنارس کے ایک ہندو رئیس کے بیٹے تھے۔ اسلام کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ ریشمی رومال شیخ عبدالحق کے حوالے کیا گیا۔ یہ حسب ہدایت رومال لے کر پشاور پہنچے۔ رومال ان کے کاروباری پارچہ جات میں تہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے اسی قسم کے رومال پانچ درجن خرید لیے تھے

اور انہی میں خفیہ رومال بھی رکھوالیا تھا۔اس لیے سرحد پر کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو حیدر آباد سندھ جا کر شیخ عبدالرحیم کو دے دیں اور شیخ عبدالرحیم کو مولانا ہادی حسن پہلے پروگرام دے چکے تھے کہ یہ رومال لے کر حج کو جائیں اور وہاں شیخ الہندؒ کے حوالے کر دیں۔اور اگر شیخ عبدالحق کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو یہ رومال پشاور میں تحریک کے رکن خان بہادر حق نواز کو دے دیں۔

چنانچہ شیخ عبدالحق کا پہلے تو یہی ارادہ تھا کہ خود حیدر آباد سندھ جائیں گے اور یہ امانت منزل مقصود تک پہنچا دیں گے،مگر پشاور اور سرحد پر اس دفعہ اتنی پوچھ گچھ اور تلاشی ہوئی کہ آپ کو خطرہ محسوس ہوا اور آپ نے ارادہ بدل دیا اور ریشمی رومال پشاور ہی میں حق نواز کے حوالے کر کے ہدایات دے دیں۔حق نواز کو یہ امانت رات کو نو بجے ملتی ہے۔آپ اسے سحری کے وقت چار بجے روانہ کر دیتے ہیں اور آپ کے اعتمادی آدمی نے یہ ریاست بہاول پور میں دین پور کے سجادہ نشین خواجہ غلام محمد کو دینی تھی۔وہ بخیر و عافیت ریشمی رومال کی امانت خواجہ صاحب کو پہنچا دیتا ہے۔ادھر پشاور میں فجر کی نماز سے پہلے ہی حق نواز خان کے مکان پر فوج کا چھاپہ پڑتا ہے۔لیکن وہ چیز تو اب نکل چکی تھی۔خان صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور زبردست پوچھ گچھ ہوئی۔لیکن خان صاحب مضبوط رہے اور فوج والے جو کچھ پوچھتے رہے آپ انکار کرتے رہے۔ایک ماہ کے بعد آپ کو رہا کر دیا گیا۔ادھر دین پور میں امانت پشاور سے صبح چل کر دوسرے دن صبح تقریباً دس بجے پہنچتی ہے۔جنگ کا زمانہ تھا۔خواجہ صاحب نے بھی ایک معتمد آدمی کے ہاتھ دو گھنٹے کے بعد بارہ بجے سندھ روانہ کر دی۔یہ امانت تو خواجہ صاحب نے سندھ روانہ کر دی شام کے چار بجے ان کے پاس فوج پہنچ گئی۔مکان کا محاصرہ کر کے تلاشی شروع ہوئی جس کا سلسلہ رات کے دس بجے تک رہا۔مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔پھر خواجہ صاحب کو پہلے بہاول پور،پھر فیروز پور لے جا کر زبردست پوچھ گچھ ہوئی۔آپ نے کچھ نہ بتایا تو انہیں حوالات میں ڈال دیا۔چار ماہ بعد رہائی ہوئی۔

"ریشمی رومال" کی امانت دوسرے دن ظہر کے وقت شیخ عبدالرحیم صاحب کو ملتی ہے۔وہ عشاء کو ریشمی رومال کو اپنے ایک کپڑے میں رکھ رہے تھے کہ حلیہ بدل کر ابھی گھر سے روپوش ہو جاتا ہوں۔انہوں نے حلیہ بدل لیا تھا۔اب صرف ریشمی رومال کو اپنے ایک فقیرانہ رومال میں چھپانا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنا فقیرانہ رومال نکالا ہوا تھا۔ہاتھ میں سوئی دھاگہ لیے اس کو سی رہے تھے کہ اچانک فوج دیواروں کو پھاند کر اندر آ گئی۔انہوں نے ریشمی رومال پر قبضہ کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اتنے میں شیخ صاحب بھی دیواریں پھاند کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ایسے فرار ہوئے کہ آج تک پتا نہیں چلا۔آپ اچاریہ کرپلانی کے حقیقی بھائی تھے۔مولانا عبیداللہ سندھی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اسلامی نام شیخ عبدالرحیم رکھا۔غالباً آپ اس لیے روپوش ہوئے کہ حکومت کے تشدد سے گھبرا کر میں تحریک کے راز نہ بتا دوں،جس سے کہ میرے بزرگوں کو تکلیف ہو۔کہتے ہیں کہ آپ روپوشی کی حالت میں روس چلے گئے۔بعض کا خیال ہے کہ ہندوستان ہی میں فقیری کی حالت میں رہے اور آخر میں ہند میں انتقال کر گئے۔لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب اور قوم کی خاطر بڑی قربانی دی۔

غرضیکہ یوں ریشمی رومال حکومت کو مل گیا اور اس کے ذریعے سے راز ہائے سربستہ معلوم کر لیے گئے۔اس

سے پہلے بھی تحریک کی رپورٹ سی آئی ڈی حکومت کو دیتی رہی تھی، مگر ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اب جب کہ حکومت کو پکا ثبوت مل گیا تو سی آئی ڈی کی پچھلی سب رپورٹوں پر یقین ہو گیا۔ اب رہی یہ بات کہ ریشمی رومال کی رپورٹ حکومت کو کس نے پہنچائی۔ مولانا سندھی سندھی کو کسی نے غلط بتایا ہے کہ حق نواز خان نے یہ خبر حکومت کو دی یا یہ کہ رومال ہی ان کے حوالے کر دیا، اس لیے کہ ریشمی رومال حکومت کو یقیناً سندھ سے ملا ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ حق نواز نے جا کر حکومت کو یہ معاملہ بتا دیا تھا۔ یہ محض قیاسات ہیں، ورنہ حق نواز خان بڑے مضبوط دل گردے کے مالک تھے پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ اگر حق نواز خان نے دین پور (ریاست بہاول پور) کا پتا دیا تھا تو پہلے حق نواز خان کی خبر کس نے دی کہ رات کو انہیں خط ملتا اور صبح سویرے ہی ان پر چھاپہ پڑتا ہے؟ مزید برآں، شیخ عبدالحق کی سرحد اور پشاور میں تلاشی کیوں لی جاتی ہے اور پوچھ گچھ کی جاتی ہے؟ یہ باتیں کس نے بتائیں؟ حقیقت یہ ہے کہ سب خبریں اور ان کے مقامات کے پتے اور ریشمی رومال کی پوری تفصیل امیر حبیب اللہ خان اور اس کے بیٹے عنایت اللہ خان نے انگریز کو بتا دی تھیں اور بذریعہ لاسلکی یہ سب خبریں ہندوستان پہنچائی جا چکی تھیں۔ امیر حبیب اللہ خان کے یہی کارنامے تھے جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئے اور عنایت اللہ خان کے بھی ولی عہدی کے سب خواب پریشان ہو گئے۔

ریشمی رومال کے بعد

جب سی آئی ڈی کی سب اطلاعات کی تصدیق ہو گئی اور ریشمی رومال کی عبارت سے حکومت برطانیہ کو انقلابیوں کے ارادوں اور ترکی حکومت کی پالیسی کی قطعی تصدیق ہو گئی تو اس نے مناسب اقدامات کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ حبیب اللہ خان تو جاسوسی کر کے انگریزی کی زد سے بچ گیا، صرف اتنا ہوا کہ انگریز کے کہنے پر کابل میں سب انقلابیوں اور ان کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا، حتیٰ کہ حبیب اللہ خان قتل ہوتا ہے اور امان اللہ خان تخت پر قابض ہوتا ہے تو پھر یہ لوگ رہا ہوتے ہیں۔ ادھر ہندوستان میں حکومت نے پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کر دیا، اور ہر مشتبہ آدمی کو گرفتار کر لیا گیا اور بہت سے لوگوں کو نظر بند کر دیا اور ہر اس مقام پر فوج بھیج دی، جہاں بغاوت اور گڑبڑ کا خطرہ تھا۔ مزید برآں شمال مغربی سرحد پر بہت زیادہ فوج بھیج دی اور دوسرے حفاظتی انتظامات بھی اختیار کیے گئے۔ ادھر ترکی کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کر دیا اور ترکی کی ہر سرحد پر جنگ شروع ہو گئی۔ ایران میں فوجیں داخل کر کے افغانستان اور ترکی کے درمیانی رابطے کو ختم کر دیا۔ ترکی کے خلاف عربوں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور اس کام کے لیے شریف مکہ کو آلۂ کار بنایا اور اس نے غداری کر کے ترکی حکومت سے بغاوت کر دی اور عربوں کو "عرب قومیت پرستی" کے پُرفریب نعرے سے متاثر کر کے ترکی کو پورے مشرق وسطیٰ سے نکال دیا۔

اور عربوں نے ترکوں پر وہ مظالم کیے کہ خدا کی پناہ۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور عربی علماء سے ترکی کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرائے اور دنیا میں یہ پروپیگنڈا کرایا کہ نعوذ باللہ ترک مسلمان نہیں رہے۔ ان کی خلافت ختم ہو گئی ہے اور ان کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔ چنانچہ ہندوستان و عرب کے علماء نے دل کھول کر کفر کے فتوے دیے۔ پھر انہیں فتووں کو اپنے مخالف علماء کو کچلنے کے لیے بہانہ بنایا کہ جو عالم ترکی کے

خلاف کفر کا فتوی نہ دے، اس کو قید یا نظر بند کر دیا جاتا اور ان کو مختلف طریقوں سے تنگ کیا جاتا۔ چنانچہ شیخ الہند کی گرفتاری کا بہانہ پہلے ہی بنایا گیا تھا۔ اگر چہ بعد میں مصر کی عدالتی کارروائی سے پتا چل گیا کہ یہ گرفتاری درحقیقت اس انقلابی تحریک کا نتیجہ ہے۔ فتوی تو ویسے ان کی گرفتاری کے لیے بہانہ تھا، اس لیے کہ حکومت برطانیہ تحریک کے رازوں سے لوگوں کو مطلع نہیں ہونے دیتی تھی، مبادا کوئی اشتعال پیدا نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فتوے کا بہانہ بنا کر شریف مکہ کو گرفتاری کا حکم دیا۔ خلاصہ یہ کہ حکومت برطانیہ نے تحریک کو کچلنے کے لیے جو انتظامات کیے وہ یہ تھے:

1۔ افغانستان میں تحریک کے لیڈروں کی گرفتاری

2۔ ہندوستان میں تحریک کے کارکنوں کی گرفتاری اور نظر بندی

3۔ سرحد اور دوسرے اہم مقامات پر فوج کا اجتماع

4۔ ایران میں فوجیں داخل کرنا

5۔ ترکی پر حملہ

6۔ ترکی کے خلاف عربوں کی بغاوت

7۔ ترکی کے لیے کفر کا فتوی

یہ مجموعی سات انتظامات تھے۔ باقی رہے تحریک والے، سو ان میں سے بہت سے تو گرفتار ہو گئے، جو باقی بچے، ان میں زیادہ وہی تھے جو اندرونِ ملک رہتے تھے اور وہ از خود کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑی اور خاموش رہے۔ اور جو سرحدوں پر رہتے تھے اور کچھ کر سکتے تھے انہوں نے کام کیا۔ چنانچہ ''اوگی'' کے مقام پر بھی قبائلیوں نے حملہ کیا اور تین سال تک متواتر لڑتے رہے۔ اسی طرح حاجی صاحب ترنگ زئی بھی لڑے اور قبائل کو اکٹھا کر کے تین سال مقابلہ کرتے رہے۔ اسی طرح قلات اور لس بیلہ کے قبائل نے بھی لڑائی لڑی اور پورے دو سال لڑتے رہے۔ پس ان تین مقامات پر تو چونکہ لڑ سکتے تھے، اس لیے خوب لڑے، باقی ہندوستان کے لوگ کچھ نہ کر سکتے تھے اور نہ کچھ کیا۔ اس لیے کہ وہ مجبور تھے، البتہ افغانستان والوں نے اندر رہ کر بھی خوب کام کیا۔ انہوں نے اندر سے تحریک چلائی اور آزاد خیال لوگوں کو امان اللہ خان کے ساتھ ملنے کا حکم دیا اور رہا ہونے پر اس نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس صورت حال میں اب ہندوستان کا فتح کرنا تو ممکن نہیں تھا، اس لیے وہاٹ تک قبضہ کر لینے کے بعد انگریز نے ان کی آزادی وخود مختاری کو تسلیم کر لیا اور انہوں نے ان کا یہ مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا اور پہلی مقررہ سرحدوں پر راضی نامہ ہو گیا۔ گویا جنگ کے نتیجے میں افغانستان کو صرف آزادی ملی۔ یہ بھی غنیمت تھی، اس لیے اسی پر اکتفا کر لیا گیا۔ شیخ الہند کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کر کے فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے مالٹا میں جنگی قیدی کر کے بھیجا گیا۔ جنگ کے خاتمے تک آپ کو وہیں رکھا گیا۔ جنگ ختم ہونے پر آپ کو رہا کر دیا گیا اور آپ واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ تحریک خلافت میں کچھ عرصہ کام کر کے انتقال فرمایا۔

خلاصہ یہ کہ تحریک والے انقلابی بھی کچھ گرفتار ہوئے۔ کچھ گھروں میں مجبوراً خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ افغانستان میں گرفتار ہوئے۔ پھر رہا بھی ہوئے اور بعض ایسے بھی تھے جو دوسرے ملکوں میں تھے۔ وہ وہاں ہی

رہے۔ صوبہ سرحد کے قبائل نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ بعض ملک سے باہر ہی گرفتار ہوئے اور گرفتار رہے، جیسے شیخ الہند۔ بعضوں نے ایسی کمزوری دکھائی کہ انگریز کو سارے واقعات اور راز بتائے۔ یوں ریشمی رومال کی تحریک ناکام ہو کر ختم ہوئی۔

ریشمی رومال کی تحریک کیوں ناکام ہوئی؟ اس تحریک کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟

تحریک کی ناکامی کے مجرم

''تحریک ریشمی رومال'' کے بانی حضرت شیخ الہند بہت زیادہ حُسنِ اعتماد رکھتے تھے اور بعض ایسے افراد کو اپنا مشیر کار بنایا ہوا تھا جو کہ خفیہ طور پر انگریز کے جاسوس تھے اور ظاہری طور پر حضرت شیخ کے معتقد اور فدائی بنے ہوئے تھے۔ حضرت شیخ خود فرمایا کرتے تھے کہ ''من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم، کہ بامن کرد آنچہ آشنا کرد''۔ انگریز کے یہ جاسوس ہی تحریک کی ناکامی کا سبب بنے۔ درحقیقت جو لوگ حضرت شیخ کے ساتھ تھے اور انگریز کی سی آئی ڈی کے تنخواہ دار تھے۔ ان کی زندگیاں ہی ان کے کرتوتوں کی شاہد ہیں۔ ان کے کردار اور زندگی کے حالات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ پکے غدار تھے۔

(1) شیخ الہند کی خصوصی مجلس کے ایک رکن تھے۔ ان کے بارے میں لوگوں نے حضرت شیخ کو آگاہ بھی کیا، لیکن حضرت کی خوش اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ آخر زندگی تک ان کو ساتھ رکھا، بلکہ اپنی ایک عزیزہ سے ان کا عقد بھی کرا دیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے بھی ان کی صفائی بیان کی ہے، لیکن ان کی زندگی اور حالات بتاتے ہیں کہ وہ یقیناً جاسوس تھے۔ ان کا وطن پشاور ہے۔ یہ کاکا صاحب کی درگاہ کے متولیوں کے خاندان سے ہیں۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ تحریک میں پہلے دیوبند، پھر مالٹا میں حضرت کے ساتھ رہے اور پھر آخر رہائی کے بعد بھی ساتھ ہی رہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صاحب جاسوس تھے۔

(2) مصر کی عدالتی کارروائی سے پتا چلتا ہے کہ دیوبند اور دہلی کے ان خصوصی اور خفیہ مجلسوں کے پورے حالات انگریز کو معلوم ہوتے ہیں، جن میں یہی حضرات شریک ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، گاندھی جی، موتی لال نہرو، مہندر پرتاب، برکت اللہ، ہردیال، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا ہادی حسن، مولانا محمد میاں انصاری اور مولانا عزیز گل۔ اب ان حضرات میں سے تو کسی پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات نے اپنی زندگیاں انگریز کی مخالفت میں خرچ کر دیں اور مصائب و آلام برداشت کیے۔

(3) حضرت شیخ جب مالٹا سے واپس بمبئی پہنچتے ہیں تو جہاز پر ہی آپ کو ایک سی آئی ڈی کا مولوی ملتا ہے اور ایسی باتیں بتاتا ہے جو مالٹا کے قید خانے میں ان تین حضرات کے مابین ہوئیں، یعنی شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل، کیونکہ مولانا وحید الزمان چوتھے قیدی پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ ان تین حضرات کی باتیں انگریز تک پہنچانے والا ان تین حضرات میں سے کوئی ایک ضرور ہے۔ وہ کون ہے؟

(4) ان مولوی صاحب کی معاشرتی زندگی ایک دولت مند کی سی رہی ہے۔ خورد و نوش اور دوسرے لوازمات

زندگی امیرانہ رہے، اور بظاہر آمدنی بھی اتنی زیادہ نہیں رہی جس سے امیرانہ زندگی بسر کی جائے۔ یقیناً کوئی خفیہ ذریعۂ آمدنی رہا۔

(5) امیر احمد خان نامی ایک صاحب تھے جو اٹک کے رہنے والے تھے۔ دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ انگریز نے ان کو خرید لیا۔ تین سال ہندوستان میں جاسوسی کا کام کیا۔ پھر انگلینڈ میں سراغ رسانی کا امتحان دیا، اور دوسرے ممالک میں انگریز کی جاسوسی کا کام کرتے رہے۔ جرمنی، روس، جاپان میں کام کیا۔ آخر ترکی میں متعین ہوئے تو خیالات میں تبدیلی آئی۔ انگریز سے باغی ہو کر مستعفی ہو گئے۔ انگریز نے ہندوستان میں داخلہ بند کر دیا۔ آپ جاپان چلے گئے۔ وہاں ایک اخبار نکالا۔ اس دوران میں سوبھاش چندر بوس جاپان گئے۔ ان سے شناسائی ہو گئی۔ انہوں نے واپس آ کر ان کے لیے کوشش کی تو ان کو ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی۔ چند عرصہ سوشلسٹ پارٹی میں کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو انگریز حکومت نے ان کو اپنے گاؤں میں پولیس کی نگرانی میں پابند کر دیا۔ پھر گرفتار کر کے لاہور چھاؤنی لائے اور یہاں سے لاپتہ کر دیا۔ پھر عرصے بعد وارثوں کے شور مچانے پر اعلان کر دیا کہ وہ پولیس کی نگرانی میں جہلم کے قریب چلتی گاڑی سے کود کر فرار ہو گیا۔ خدا معلوم، کہاں گئے۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں کہ "ان سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتلایا کہ جب ہندوستان میں جاسوسی کا کام کرتا تھا تو اس زمانے میں دیوبند سے وابستہ بہت سے مولوی یہ کام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ میں خود ایک مولوی صاحب کے ذریعے اس کام میں تھا۔ انہوں نے اس مولوی کا نام بھی بتایا۔ وہ عیدگاہ دیوبند کے خطیب تھے۔ یہ بھی بتلایا کہ ایک مولوی صاحب جو پشتو بولتے تھے اور میرے ساتھ پشتو میں بات کرتے تھے۔ پہلے تو مجھے ان کا علم نہ تھا، لیکن جب میں اس کام پر مقرر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی یہی کام کرتے تھے، اور ان کے ذمے اہم کام ہوتے تھے۔ ان کا نام بھی انہوں نے بتلایا۔ یہ صاحب کاکاخیلی تھے۔ جب میں انگلینڈ گیا تو ان کے دو خط بھی میرے نام گئے۔

(6) ایک اور انگریز کا جاسوس دیوبندی مولوی صاحب خطیب عیدگاہ دیوبند ہیں۔ یہ مولوی صاحب اگرچہ مرکزی مجلس انتظامیہ کے رکن تو نہ تھے، لیکن تحریک کے کئی شعبوں سے وابستہ تھے۔ اس لیے یہ کافی کام کر سکتے تھے۔ امیر احمد خان کا بیان ہے کہ میں ویسے تو اپنی رپورٹ دہلی میں پہنچاتا تھا، مگر گرمیوں میں شملہ جانا پڑتا تھا تو میں راستے میں انبالہ میں مولوی صاحب کے پاس ٹھہرا کرتا تھا، کیونکہ مولوی صاحب مذکورہ انبالہ میں چھاؤنی کی جامع مسجد کے خطیب تھے۔ بعض دفعہ مولوی صاحب بھی میرے ساتھ جاتے تھے اور شملہ جا کر علیحدہ ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ہمیں ایک دوسرے کو بھی اپنی باتیں بتلانا اور پہچان کرانا منع تھا۔ وہ اپنی رپورٹ علیحدہ پیش کرتے تھے اور ہم علیحدہ۔ انہیں میری رپورٹ کا علم ہوتا تھا نہ مجھے ان کی رپورٹ کا۔

(7) چکوالی مولوی صاحب چکوال کے رہنے والے تھے اور لاہور میں محاذ تحریک کے نمائندہ تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا بیان ہے کہ جاسوس کے طور پر تحریک میں شریک تھے۔ حقیقت بھی یہی نظر آتی ہے اس لیے کہ ان کو حکومت لوگوں کو دکھانے کو (جھوٹ موٹ) گرفتار کرتی ہے اور پھر جلد ہی رہا کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ جاسوس نہ ہوتے تو تحریک کے فعال کارکن تھے، نہ معلوم کتنے سال جیل میں رہتے۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی ایک سادہ لوح

بزرگ تھے۔ ان کو حکومت گرفتار کرتی ہے۔ وہ سختی اور تشدد کے باوجود تحریک کے متعلق کوئی بات بھی نہیں بتاتے، مگر ایک دن یہی چکوالی مولوی صاحب جیل میں تنہائی میں ان کے پاس بیٹھتے ہیں اور دیوار کے پیچھے سے سی آئی ڈی اور فوجی افسروں کو بٹھاتے ہیں اور ان کے فرداً فرداً ایک ایک بات کا اقرار کراتے ہیں کہ دیکھیے، ہم نے وہ معاملہ اس طرح کیا تھا اور فلاں اسکیم اس طرح بنائی تھی۔ جب مولانا احمد اللہ سب باتوں کا اقرار کر چکتے ہیں تو افسر سامنے آ جاتے ہیں۔ درمیان میں صرف ایک پردہ تھا۔ فوجی افسروں نے وہ پردہ اٹھا کر مولانا احمد اللہ سے کہا کہ آپ تو ان باتوں کے منکر تھے اور لاعلمی ظاہر کرتے تھے۔ اب بے چارے مولانا احمد اللہ بری طرح پھنس چکے تھے، معافی مانگ کر ہمیشہ کے لیے سیاسیات سے علیحدہ ہو گئے اور آخر تک علیحدہ رہے۔

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کوئی مجبور آدمی اس طرح دوسروں کو گرفتار کر سکتا ہے؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ خود مولانا صاحب خود اپنی مجبوری کی وجہ سے اپنے جرم کا اقرار کرتے اور معافی مانگتے۔ مگر ایک دوسرے آدمی سے اس طرح اقرار کرانا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولوی صاحب ان واقعات کی رپورٹ پیش کرنے کے بعد اس کی تصدیق اس طرح ایک دوسرے رکن تحریک سے کرانا چاہتے تھے کہ میں نے جو رپورٹ حکومت کو دی ہے، وہ ٹھیک ہے، اور اس کے ثبوت میں یہ ساری کارروائی عمل میں لائی گئی، ورنہ ایک مجرم کو تو اپنے معاملات سے تعلق ہوتا ہے، نہ کہ دوسرے لوگوں کے جرائم کی شہادتیں بھی۔ بہرحال چکوالی مولوی صاحب کی صاحب زادی مولانا احمد علی لاہوری کے عقد میں تھیں۔ گویا وہ مولانا احمد علی صاحب کے خسر تھے۔

(8) انہی لوگوں میں سے ایک قندھاری مولوی صاحب بھی تھے۔ آپ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ شیخ الہند کی تحریک کے رکن بن کر قبائل میں جا کر تبلیغ جہاد کا کام کرتے رہے، لیکن تعجب ہے کہ جب ریشمی خط پکڑا جاتا ہے اور راز فاش ہوتا ہے تو انگریز دباؤ ڈال کر امیر حبیب اللہ خان سے کابل کے سب انقلابیوں کو گرفتار کراتا ہے تو قندھاری مولوی صاحب نہ صرف یہ کہ گرفتار ہی نہیں کیے جاتے، بلکہ مشیر امور خارجہ مقرر کیا جاتا ہے۔ حبیب اللہ خان اس وقت انگریز کی مرضی ومنشا کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ان مولوی صاحب کو تو ایک ایسا عہدہ دیا گیا جو کہ انگریز اور افغان حکومت کے درمیان رابطے کا درجہ رکھتا تھا۔ چنانچہ ان سے یہی کام لیا جاتا تھا کہ افغان حکومت نے کوئی بات انگریز حکومت سے منوانی ہوتی تو ان قندھاری مولوی صاحب کی وساطت کے بغیر منظور نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح انگریز کو جو بات افغان حکومت سے منظور کرانی ہوتی تو قندھاری مولوی کو واسطہ بنایا جاتا۔

(9) مولانا چاند پوری کا نام بھی انگریز کے جاسوسوں میں شامل ہے۔ مولانا سندھی کا کہنا ہے کہ مولانا نے پہلے تو وہاں حجاز میں کچھ ایسی حرکتیں کیں، کہ جن کا مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت حضرت شیخ الہند سے بدظن ہو کر ان کو گرفتار کر لے۔ چنانچہ جدہ سے کچھ ایسے مشکوک خطوط حضرت شیخ کی خدمت میں لکھ کر بھیجے کہ اگر غالب پاشا مداخلت نہ کرتا تو شاید مدینہ کی حکومت آپ کو گرفتار کر لیتی۔ وہاں تو یہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوئے۔ یہاں کا معاملہ سارا پہلے بھی انگریزوں کو پہنچاتے رہتے تھے اور اب بھی پوری رپورٹ حجاز کی تحریک کی پیش کی، اس لیے کہ ان کے ساتھ ہی مولوی محمد میاں جب خط لکڑی کی چھڑی میں لے کر آتے ہیں تو بمبئی گورنمنٹ کو کوئی خبر نہ تھی۔ لیکن ان

مولوی صاحب کے پہنچتے ہی دیو بند اور نانوتہ میں ان لوگوں کے گھروں میں چھاپے پڑتے ہیں، جن کا علم حضرت شیخ کے سوا صرف ان دونوں کا تھا۔ اس کا اور کسی کو پتہ ہی نہ تھا۔ (یہ مولانا سندھی کا بیان ہے)۔

(10) دوسری قسم ان کمزور لوگوں کی ہے جو انگریز سے ڈر کر حالات بتاتے رہے۔ ان میں حبیب اللہ خان والی افغانستان اول نمبر پر آتے ہیں، کیونکہ اتنے بڑے آدمی سے توقع نہ تھی، لیکن وہ انگریز کے ڈر سے کچھ انگریز کو بتا دیتے تھے۔ دوسرے عنایت اللہ خان ابن حبیب اللہ خان ہے جس کو انگریز نے ولی عہدی کا لالچ دے کر اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ درحقیقت ولی عہد سردار نصر اللہ خان تھا، لیکن وہ انقلابیوں سے مل گیا تھا، اس لیے انگریز نے مدینہ منورہ سے ایک صاحب کو پیر بنا کر افغانستان بھیجا۔ اس نے وہاں جا کر خوب پیری مریدی چمکائی اور عنایت اللہ خان کو اپنا مرید بنا لیا اور اس کو یہ خواب سنایا کہ مجھے خواب میں رسول کریم ﷺ کی زیارت ہوئی ہے، اور انہوں نے فرمایا ہے کہ انگریز سے جنگ میں مسلمانوں کو نقصان ہوگا، لہٰذا انگریز سے جنگ نہ کرنی چاہیے اور حبیب اللہ خان کے بعد اس کا بیٹا عنایت اللہ خان امیر ہوگا۔ لوگ خواہ مخواہ نصر اللہ کا نام لیتے ہیں۔ یہ خواب سنا کر عنایت اللہ کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور اس طرح اس کو انقلابیوں سے الگ کیا اور ولی عہد کا لالچ دیا۔ اس کے بعد عنایت اللہ انگریز کا دست بن گیا اور افغانستان میں جو جو منصوبے تیار ہوتے ان کی اطلاع انگریز کو کرتا رہتا۔ اس کا یہ پیر وہاں ''ملا چہار باغ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس لیے حبیب اللہ خان نے جب انگریز کے اشارے پر انقلابیوں کو گرفتار کیا تو امان اللہ خان نے جو کہ ان انقلابیوں سے ملا ہوا تھا، اپنے والد حبیب اللہ خان کو قتل کرا کے خود تختِ حکومت پر قابض ہو گیا اور انقلابی لیڈروں کو رہا کر کے اپنا مقرب بنا لیا، اور انگریز پر حملہ کر کے افغانستان کو آزاد کرایا۔

(11) جو کالج میں پڑھنے والے نوجوان افغانستان ہجرت کر گئے تھے۔ ان میں سے چند گرفتار ہوئے اور ہندوستان لائے گئے۔ ان میں میاں عبدالباری بھی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ان سے حکومت نے معافی کا وعدہ کر کے سب کچھ معلوم کر لیا۔ خصوصاً ان کے رشتہ دار سر محمد شفیع تھے۔ ان کے دباؤ اور لالچ میں آ کر یہ غریب ناتجربہ کار طلبہ سب کچھ بتا کر رہا ہو گئے۔

(12) مولوی محمد علی قصوری بڑے سرگرم کارکن تھے، لیکن گرفتاری کے بعد کمزوری دکھائی اور سب راز بتا کر رہا ہو گئے۔

(13) مولوی عبدالقادر قصوری نے بھی معافی مانگی اور تحریک کی راز کی باتیں بتا کر جان چھڑائی اور سیاسیات سے دست کش ہو گئے۔

(14) قاضی مسعود شیخ الہند کے داماد تھے، اور ناتجربہ کار نوجوان۔ ڈاکٹر انصاری نے ان کو حج کے موقع پر حج کے بہانے ایک ہزار روپیہ شیخ الہند کے لیے دے کر بھیجا۔ شیخ نے واپسی کے وقت ان کو اپنا عزیز جان سمجھ کر بعض اہم امور بتلا دیے۔ جن کے متعلق ان کو زبانی ہدایات دیں کہ ہندوستان مراکز میں پہنچا دیں۔ ہندوستان پہنچتے ہی قاضی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر دو پولیس افسر مقرر ہوئے جو تجربہ کار اور شاطر زمانہ تھے۔ انہوں نے سب کچھ معلوم کر لیا اور دو ماہ کے بعد چھوڑ دیا۔

غرضیکہ اسی طرح کے کمزور قسم کے لوگ اور پہلی قسم کے غدار تحریک کی ناکامی کا ذریعہ بنے۔ ورنہ جو لوگ راسخ العقیدہ تھے، انھوں نے مصائب برداشت کیے، لیکن تحریک کا راز کسی کو نہ بتلایا، جیسے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، مولانا عبدالرحیم لائل پوری، مولانا ہادی حسن وغیرہ۔ ان لوگوں نے دورانِ جنگ میں قید و بند کی تکالیف برداشت کیں، لیکن تحریک کا راز نہ اگلا۔

تحریک کی ناکامی کے سلسلے میں تمام مذکورہ اشخاص کے ناموں کی تحقیق علمی لحاظ سے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی نے کی ہے اور اپنی ''ذاتی ڈائری'' میں قلم بند کی ہے۔

''تحریک خلافت''

پس منظر

پہلی جنگ عظیم (1914ء۔1919ء) میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ جنگ کے دوران ہی میں مسلمانانِ ہند یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی تو ترکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا، لیکن برطانیہ بار بار یہ یقین دلاتا رہا کہ ''ہم اس لیے نہیں لڑ رہے کہ ترکی کو اس کے دارالسلطنت یا ایشیائے کوچک اور تھریس کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں۔'' امریکا کے صدر ولسن نے بھی اپنے مشہور چودہ نکات میں اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ ترکی کے اصل علاقوں پر خلافتِ عثمانیہ کا اقتدار قائم رہے گا۔

خلافت کیا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہندوستان کے مسلمان ترکوں کے بارے میں اس قدر پریشان اور مضطرب کیوں تھے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں خلافت کا کیا مقام تھا، یعنی مسلمانانِ ہند کا خلافت عثمانیہ سے کیا تعلق تھا؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خلافت کیا ہے؟

خلافت کے مسئلے کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسلام کے سیاسی نظام کے چند بنیادی اصول اور اس ضمن میں مسلمانوں کے فرائض کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ ان امور کی طرف مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تصنیف ''مسئلہ خلافت'' میں کماحقہ توجہ دلائی ہے۔ یہاں اسی کتاب کے حوالے سے چند ضروری اور بنیادی نکات پیش کیے جاتے ہیں۔ جن کا خلاصہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری نے تیار کیا ہے:

1۔ اسلام کا شرعی قانون یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان، صاحب حکومت و مملکت ہے، جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے

اجراء ونفاذ کی پوری مقدرت اور دشمن کے مقابلے کے لیے پوری طاقت رکھتا ہو۔

2۔ اس کی اطاعت واعانت ہر مسلمان پر فرض ہے اور مثل اطاعت خدا اور رسول ﷺ کے ہے، تا وقتیکہ اس سے کفر بواح (صریح) ظاہر نہ ہو۔ جو مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا، وہ مسلمانوں کی جماعت سے باہر ہو گیا۔ جس مسلمان نے اس کے مقابلے میں لڑائی کی یا لڑنے والوں کی مدد کی، اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں تلوار کھینچی۔ وہ اسلام سے باہر ہو گیا۔ خواہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور خود کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہو۔

3۔ ایک خلیفہ کی حکومت اگر مضبوطی سے جم چکی ہے اور پھر کوئی مسلمان اس کی اطاعت سے باہر ہوا اور اس کے مقابلے میں اپنی حکومت کا دعویٰ کیا تو وہ باغی ہے، اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

4۔ صدیوں سے خلافت اسلامیہ کا منصب سلاطین عثمانیہ (ترکی) کو حاصل ہے اور از روئے شرع تمام امت مسلمہ کے خلیفہ وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت واعانت دنیا کے تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو مسلمان ان کی اطاعت سے باہر ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا، اور اسلام کے جگہ کفر مول لے لیا۔ جس نے ان کے مقابلے میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا، اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کی۔

5۔ صرف خلیفۂ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے۔ جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ ہو، تو کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلم فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے یا ان کی مدد کرے۔ اگر کرے گا تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، بحکم نص قرآنی ''من یقتل مومنا متعمدا فجزاء جہنم خالدا فیہا'' وبمطابق حدیث نبویؐ ''من حمل علینا السلاح فلیس منا''۔

6۔ جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں یا حملے کا قصد کریں یا ان کی آزادی وخود مختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے ان کی مدد کرنا، اور حملہ کرنے والوں سے لڑنا فرض ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ حملہ آور زیادہ طاقتور ہوں اور ان کے مقابلے کی کافی طاقت ان مسلمانوں اور وہاں کی حکومت میں نہ ہو۔ اس صورت میں جہاد کی فرضیت علی الکفایہ نہ ہوگی، بلکہ مثل نماز روزہ کے فرض عین ہوگی۔

7۔ اگر خلیفۂ اسلام کو دشمنوں کا ایسا طاقتور گروہ گھیر لے کہ ان کا مقابلہ کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو اور تمام مسلمانانِ عالم کی فوری امداد ونصرت کے بغیر اسلامی ممالک کی حفاظت نہ ہو سکے، تو اس صورت میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا بیک وقت فرض ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اس کی مدد کریں اور اس کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں۔

8۔ اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۂ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور

بغداد بھی شامل ہے۔ پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس علاقے پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفۂ وقت کے مقبوضات سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہیے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی، یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا۔ پس اس حالت میں تمام مسلمانانِ عالم کا اولین فرض ہوگا کہ اس قبضے کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں۔

9۔ اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین اس کے وقار و احترام کی خاطر لاکھوں مسلمان اپنی جانوں کی قربانیاں اور یورپ کی آٹھ صلیبی جنگوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ بیت المقدس کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضے میں نہ جانے دیں۔ اور اگر یہ ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی کا فرض نہ ہوگا بلکہ بیک وقت تمام مسلمانانِ عالم کا۔

10۔ اس صورت میں جو شرعی فرض مسلمانانِ عالم پر عائد ہوگا، اس میں پہلی چیز ''ترک'' ہے، اور دوسری چیز ''اختیار''۔ ترک سے مقصود یہ ہے کہ تمام ایسے تعلقات ترک کرنے ہوں گے جن میں حکومت برطانیہ کی اعانت و موالات ہو۔ ''اختیار'' سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام وسائل و ذرائع اختیار کیے جائیں جن کے ذریعے فریضۂ دفاع انجام پا سکے۔

مسلمانانِ ہند کا تعلق بیرونی اسلامی ممالک سے

ہندوستان میں اسلام باہر سے آیا۔ سب سے پہلے عربوں نے آ کر اپنی حکومت قائم کی اور یوں ایک منظم اور باقاعدہ دستوری سلطنت پہلی مرتبہ ہندوستان میں قائم ہوئی۔ عربوں کی انصاف پروری، اور عدل گستری کی مثالیں تاریخ میں دی جاتی ہیں، لیکن عربوں کی سلطنت، سندھ اور اطراف سندھ تک محدود رہی۔ عربوں کے بعد ترک آئے۔ محمود غزنوی ترک تھا۔ اس نے یہاں ترکوں کا سلسلہ قائم کیا۔ پھر وسط ایشیا کے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ صوفیا اور اولیاء کی آمد نے سمرقند و بخارا سے لے کر ترکستان، تاجکستان اور روم تک کے علاقوں سے ہندوستان کو ملا دیا۔ نظام الدین اولیاء کے مرید امیر خسرو ترک نژاد تھے۔ اولین ترکوں کی یادگار میں قطب مینار، مسجد قوت الاسلام دہلی میں اور ڈھائی دن کا جھونپڑا اجمیر شریف میں بہترین یادگار ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا بانی بابر ترک تھا۔ مغلیہ سلطنت نے بھی شریعت اور اسلامی قوانین کو جاری رکھا، لیکن رفتہ رفتہ ہندوؤں کو حکومت میں شریک کرنے اور ان سے فوجی امداد لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے نظم و نسق میں خرابی اور بدنظمی پیدا ہوگئی۔ اسلامی قوانین نافذ کرنے والے ادارے عدم توجہی کا شکار ہونے لگے۔ جس زمانے میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت قائم تھی، ترکی اور مشرق وسطیٰ اور عربستان میں خلافت عثمانیہ کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت تصور کیا جاتا۔ شریعت اور فقہ کے اعتبار سے یہ دونوں یکساں اہمیت کے حامل تھے۔ دونوں جگہ فقۂ حنفی کے مطابق فیصلے ہوتے۔ مغلوں کا تعلق عربوں کی بہ نسبت ترکوں اور ایرانیوں سے زیادہ قریبی اور براہ راست تھا۔ ادبی، ثقافتی، علمی اور صنعتی لحاظ سے ان کے درمیان خاصا

تعلق پایا جاتا تھا۔ مغل ہندوستان میں اسلامی مساوات کا کوئی مستقل آئین اور قانون رائج نہ کر سکے۔ مغلوں نے کچھ اپنا قانون جاری کیا، کچھ نظام شریعت باقی رکھا، مگر زیادہ تر قوانین پرانے ہی رہنے دیے۔ یہاں اتنے مختلف مذہب، رنگ اور نسل کے امتیازات تھے کہ ایک قانون پورے ہندوستان میں نافذ نہ ہوسکتا تھا۔ اس لیے خلافت عثمانیہ کے مقابلے میں مغلیہ سلطنت کا قانون تیسرے درجے کا تھا۔

جرأت مند سپاہی، فوجی افسر، کلیدی عہدوں کے افسر، عمائدین، وزراء، مشیر وغیرہ وہی اچھے اور معیاری شمار کیے جاتے ہیں جو عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان سے وارد ہوتے۔ یہ لوگ ہندوستان کی سرزمین میں قدم جمانے کے بعد اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بلوا کر یہاں ملازمت دلاتے۔ اسی طرح بیرونی اسلامی ممالک سے قابل اور اہل لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے راجپوتوں نے بھی مغل سلطنت میں ملازمت کی، لیکن وہ اپنے راجا اور سردار کے تحت بھرتی ہوتے اور انہی کی نگرانی میں کام کرتے۔ ان کی ملازمت براہ راست نہیں تھی، لہٰذا ان میں کبھی نظم وضبط قائم نہ ہوسکا، نہ ان کی صحیح تربیت ہوئی۔

دولت عثمانیہ کی طرح سلطنت مغلیہ میں بھی تبلیغ اسلام کا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ اس دور میں غیر مسلموں کو اسلام میں داخل ہونے کی کبھی ترغیب نہ دی گئی۔ مغلوں نے اسلام کی خاطر کوئی خدمات انجام نہیں دیں۔ انہوں نے اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لیے مناسب اقدامات کیے نہ اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کوئی کام کیا۔ مغلوں میں ایک بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ جانشینی کے لیے ان کے پاس کوئی مستقل اور مضبوط قانون نہ تھا۔ چنانچہ مغلیہ سلطنت ہمیشہ جانشینی کے تنازعے میں خانہ جنگی کا شکار رہتی تھی۔

1517ء سے دولت عثمانیہ خلافت کا مرکز تھا۔ سلطان ترکی خلیفۃ المسلمین اور محافظ حرمین شریفین تھا۔ اس لیے دولت عثمانیہ کا مسلمانوں کے دینی مرکز ''حجاز مقدس'' سے گہرا تعلق تھا۔ وہ حجاز مقدس سے جغرافیائی طور پر اس قدر قریب تھے کہ انہیں ترکی اور عرب میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس سلطنت مغلیہ کا حجاز مقدس سے کوئی مستقل رشتہ استوار نہ تھا۔ انفرادی طور پر سلاطین کی طرف سے تحفے تحائف بھیج دیے جاتے تھے اور آخیر زمانے میں یہ آمد و رفت بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ حج کے دینی فریضے کے خلاف بعض ملاؤں نے تاویلات کا سہارا لے کر یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ سمندر میں قزاقوں کے خوف سے اگر حج نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

اٹھارویں صدی میں ہندوستان میں ترکی، تاجکستان، ایران و توران سے قسمت آزما، ہنرمند اور جرار و کرار، اہل و قابل لوگوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ جہاد، ملک کشائی اور نئی بستیاں آباد ہونا بند ہوگئی تھیں۔ ہندوستان کے اندر بھی عمائدین کی دلچسپی محلات کی رنگینیوں اور باہمی اقتدار کی کشمکش سے وابستہ ہوکر رہ گئی تھی۔ عیش پسندی، خانہ جنگی اور باہمی کشمکش نے مغلیہ سلطنت کو تباہ کردیا تھا۔

حجاز مقدس سے مسلمانان ہند کا گہرا اور قریبی تعلق شاہ ولی اللہ نے پیدا کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو مرہٹوں، جاٹوں اور ہندوؤں کی دست برد سے بچانے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے بلایا۔ مسلمانوں کی اخلاقی، علمی، معاشی، سیاسی اور مذہبی پس ماندگی کو دور کرنے کی تدبیریں کیں اور انہیں عالمگیر برادری کا حصہ ہونے کا

احساس دلایا۔ ان کے فرزند شاہ عبدالعزیزؒ ان کے خاندان اوران کے مرید سیّد احمد شہید نے اس تحریک کو آگے بڑھا کر اسے ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی بے بسی، کمزوری، بد حالی اور پستی کو دور کرنے کے لیے حجاز مقدس، مقاماتِ مقدسہ اور اسلامی ممالک کی طرف تمناؤں کے ساتھ رجوع کرنے لگے۔ حجاز سے جو روحانی رشتہ تھا وہ زوال اور پستی کی وجہ سے اور پختہ اور گہرا ہو گیا۔

1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد آزادی کی تڑپ رکھنے والے علماء اور بعض رہنماؤں نے حجاز کو اپنا مرکز بنا کر اپنی تحریک آزادی کو زندہ رکھا۔ خلافت عثمانیہ اور حجاز مقدس کی سرزمین ہی ان کی سلامتی کی ضامن ثابت ہوئی۔ مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید گنگوہی کا مامن و مرکز حجاز ہی رہا۔ تحریک ریشمی رومال (جس کا تذکرہ ہو چکا ہے) کے تمام کارکن شیخ الہند کے رہنمائی میں شروع ہی سے اسلامی ممالک اور بالخصوص دولت عثمانیہ سے رشتہ جوڑے ہوئے تھے، اس لیے تحریک ریشمی رومال کی طرح تحریک خلافت کا رشتہ اور سہارا بھی خلافت عثمانیہ سے تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا مرکز حجاز اور ان کا گہرا تعلق اسلامی ممالک سے کس حد تک تھا، اس کا اندازہ ہجرت کے ان فتوؤں سے ہوتا ہے جو شاہ عبدالعزیز سے لے کر تحریک خلافت تک جاری ہوتے رہے۔

مسلمانانِ ہند اور عیسائی ممالک

1877ء میں جب روس اور ترکستان میں جنگ چھڑی تو ہندوستانی مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر ترکوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ جلسے کیے گئے، جلوس نکالے گئے۔ انگریزوں کے مرکز کلکتہ کی مسجدوں میں اجتماعی دعاؤں کا اہتمام کیا گیا۔ بیمار اور زخمی ترکوں کے لیے چندے جمع کیے گئے۔ بہت سے مسلمان نوجوانوں نے ترک بھائیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں لڑنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے بعد بھی ترکوں کی عیسائی ملکوں سے جتنی بھی جنگیں ہوئیں، مثلاً 1897ء میں ترکوں کی یونان سے جنگ ہوئی، 1911ء میں اٹلی سے جنگ ہوئی اور 1912ء میں بلقان کی جنگ ہوئی۔ ان سب لڑائیوں میں ہندوستانی مسلمانوں نے ترکوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کی بے حد ہمت شکنی کی اور ترکوں سے ان کے رابطے قائم نہیں ہونے دیئے۔ پھر بھی ایک طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ترکی بھیجنے پر انگریزوں کی حکومت مجبور ہو گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ عیسائی طاقتیں مسلمانوں کی دشمن ہیں اور وہ اسلام کی قوت کو پارہ پارہ کر دینا چاہتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنا اقتدار کھول دینے کے بعد انگریزوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں بے شمار مصیبتیں اٹھائیں۔ ان مصیبتوں نے انہیں اسلامی ممالک کے بالعموم اور حجاز مقدس اور دولت عثمانیہ سے بالخصوص تعلق استوار کرنے پر مجبور کیا۔ برطانوی سامراج کے متعلق مسلمانوں کا طرز عمل دراصل اس کے مظالم کا ردعمل تھا۔ ادھر اس زمانے میں ہندوستان کے اندر انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی سیاست بھی مسلمانوں کے خلاف خفیہ طور پر جاری و ساری تھی۔

ہندوؤں اور انگریزوں کے متعصّبانہ رویّے

اس زمانے میں ہندو اور انگریز کی سیاست کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ امت مسلمہ کی جانب بالعموم اور اسلامیانِ ہند کی جانب بالخصوص ان کے فکر و عمل میں تعصب رچا ہوا تھا۔

ویدانت کا احیاء

ہندوؤں میں تو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی امنگ میں ہندومت اور برہمنیت کے احیاء کی قدیم آرزو بڑی شدت سے پیدا ہو گئی تھی۔ ''ہم عصر ہندوستان'' کے مصنف کے ایم پانیکر لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ویدانیت کے احیاء نے قومی سطح پر مذہبی تحریک کا پرجوش جذبہ پیدا کیا۔ اسی دور میں اروبند گھوش نے ویدانت کا تصور عام کرنے کے بھگوت گیتا پر زوردار مضامین لکھے اور بعد میں انہیں کتابی شکل دی۔ لہٰذا ویدانت ہندوؤں کے عام مذہبی خیالات و تصورات میں اور یوں ان کے طرز عمل میں سما گئی''۔

انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں پادریوں کی مدد سے سنسکرت کالج اور پاٹ شالے کھول کر اور دوسرے پوشیدہ ذرائع کے ہندو مذہب کے احیاء میں بڑی مدد دی، تاکہ مسلمانوں سے ان کا کسی طرح بھی اتفاق نہ ہو سکے، لیکن ہندوؤں کے اکثریت میں ہونے اور برطانوی حکومت میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے ان میں رفتہ رفتہ خود مختار حکومت کا جذبہ بھی بیدار ہونے لگا، جو آخر کار خود حکومت برطانیہ کے لیے خطرہ بننے والا تھا اور اس خطرے کو انگریزی حکومت نے محسوس کر لیا تھا۔ سری نواس شاستری اپنی تصنیف ''انڈین پولیٹکس اور فلاسفی'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہم میں جو قومیت کا جذبہ بیدار ہوا، وہ اب گورنمنٹ کے لیے خطرہ بن گیا۔ یہ صرف انگریزی تعلیم کی برکت سے ہوا۔ ہم کسی جھجک کے بغیر حکومت برطانیہ اور انگریز قوم کے بے حد شکر گزار اور ممنونِ احسان ہیں کہ ان کے پادریوں اور حاکموں نے ہماری قومیت کو ابھارا اور ہماری سیاسی سربلندی اور کامیابی کے لیے کھل کر مدد کی اور ہمیں آگے بڑھایا۔ اگرچہ تحریک بڑے نشیب و فراز سے گزری ہے، لیکن انسانی تاریخ میں ہندوؤں کے لیے انگریزوں کی یہ ہمدردانہ کوشش بے نظیر ہے''۔

ہندو اب ہندو حکومت، ہندو تہذیب اور ہندو ثقافت کے خواب دیکھنے لگے۔ اس مقصد کے لیے وہ ہتھیار اٹھانے اور طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ اربند گھوش بنگالی نے اعلان کیا کہ ''ہندو قومیت صرف کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے، بلکہ اسے خدا نے بنایا ہے۔ قتل و غارت بھی ویسا ہی آفاقی اور عالمگیر اصول ہے جیسا محبت اور اتحاد ہے''۔ اس نے اپنے مضامین میں بار بار اس نکتے پر زور دیا کہ ہم ہندوستان میں ہندو مذہب، ہندو تہذیب

اور ہندو فلسفے ہی تجدید چاہتے ہیں، لہٰذا ان تینوں چیزوں کا مجموعی نام ہم نے برہمنی تہذیب رکھا ہے۔

قومی آزادی کے پردے میں برہمنی تہذیب کو ہر قیمت پر اور ہر ذریعے سے حاصل کرنے کے لیے انتہا پسندی سے کام لیا گیا، یہاں تک کہ انہوں نے ہتھیار اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ کام اس زمانے میں اکیلے نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ برہمیت کو دل میں بٹھا کر انہوں نے مسلمانوں کو ساتھ ملایا۔ انہیں قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی مشن کے لیے ٹھوس اور نتیجہ خیز اقدام کرنا محال نظر آیا، لہٰذا انڈین نیشنل کانگریس نے بدیسی مال کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ خاص طور پر سودیشی کپڑے کی تحریک کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا۔ یہ علاقے بیرونی تجارت اور درآمدات کے مرکز تھے۔ صنعت و تجارت کے لحاظ سے ان علاقوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور ان علاقوں میں ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی، اس لیے یہ تحریک درحقیقت ہندوؤں کی صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے چلائی گئی۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے مسلمانوں کو آلہ کار بنایا، اور مسلمانوں کو محسوس تک نہ ہونے دیا کہ انہیں آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔

انگریزوں کی عیاری اور خفیہ سیاست

ہندوؤں کی طرح انگریزوں کی سرکاری پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو پنپنے نہ دیا جائے اور انہیں سیاسی، معاشرتی، معاشی غرض ہر پہلو سے، ہر شعبے میں دبانے اور کچلنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جائے۔ ہندی مسلمانوں سے بڑھ کر وہ تو (آج کے امریکا کی طرح) پوری دنیا کی سیاست اور خصوصاً اسلامی ممالک پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ اصل مقصد پورے عالم اسلام پر تسلط تھا، جس میں ہندوستان میں بسنے والے مسلمان بھی شامل تھے۔ وہ ہندی مسلمانوں کی قوت کیسے برداشت کرتے! چنانچہ مسلمانوں کا ہر مطالبہ نامنظور کر دیا جاتا۔ انہوں نے بنگال کو تقسیم کر کے مشرقی بنگال میں مسلم صوبہ قائم کیا تھا تو مسلمانوں کی قوت بڑھانے کے لیے نہیں، بلکہ ہندوؤں کا زور کم کرنے کے لیے قائم کیا تھا۔ لیکن جب احساس ہوا کہ مشرقی بنگال کا صوبہ دراصل مسلم بنگال بن گیا ہے تو انہوں نے مسلمانوں کا زور ختم کرنے کے لیے اسے ختم کر دیا۔ متحدہ بنگال میں پھر ہندوؤں کی طاقت بڑھ گئی تو اسے کم کرنے کی غرض سے اپنا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کا مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم کر لیا، بلکہ فنڈ فراہم کرنے کا حکم بھی جاری کر دیا، لیکن جب انہیں محسوس ہوا کہ مسلمانوں کی طاقت اور اتحاد میں مسلم یونیورسٹی کے قیام سے اضافہ ہوگا، تو انہوں نے کوئی سبب بتائے بغیر اپنا سابقہ حکم اچانک منسوخ کر دیا۔ 1911ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی قائم کرنے کا وعدہ کیا، لیکن یہ وعدہ آئندہ دس سال تک پورا نہ کیا۔

مسجد مچھلی بازار کا واقعہ

یہ واقعہ بھی انگریز کی شرانگیزی اور متعصبانہ رویے کا ایک کرشمہ ہے، لیکن اس واقعے سے مسلمانوں کو ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان میں سیاسی بیداری کی لہر اور اتحاد کا خیال پیدا ہوا۔ اسی بہانے سے مولانا محمد علی جوہر ایک وفد لے کر لندن گئے۔ لندن میں انہیں اسلامی ممالک اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ یورپ کے رویے اور انگریز دشمنی پر مبنی سیاسی چالوں اور مکاریوں سے آگہی ہوئی۔ انہیں اسلامی ممالک کے سرکردہ عمائدین سے براہ راست ملنے کا بھی

موقع ملا۔ جب مولانا محمد علی جوہر واپس ہندوستان آئے تو انہیں مسلمانانِ عالم اور اسلامیان ہند کے چاروں طرف امنڈنے والے طوفان کا صحیح اندازہ ہوا اور وہ کوئی ٹھوس، مثبت اور نتیجہ خیز عملی قدم اٹھانے کے لیے مضطرب ہو گئے۔

مچھلی بازار کان پور میں ہے۔ اس بازار میں ایک مسجد سڑک کے کنارے اس طرح بنی ہوئی تھی کہ اس کا ایک کونا آگے نکل آنے کی وجہ سے سڑک میں خم آ گیا تھا۔ میونسپل کمیٹی نے مسجد کے اس حصے کو توڑنے کے لیے متولی سے چپ چاپ اجازت لے لی۔ جب مسلمانوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے احتجاج کیا کہ وقف کی جائیداد میں ایک آدمی اجازت نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں نے گورنر یو پی سے سخت احتجاج کیا۔ مولانا محمد علی نے اپنے رسالے ''کامریڈ'' میں اور مولانا ظفر علی خان نے ''زمیندار'' میں مضامین لکھے۔ اس ضمن میں متعدد احتجاجی جلسے ہوئے۔ جلوس بھی نکالے گئے۔ یہ معاملہ حکومتی سطح پر ابھی زیر غور تھا کہ پولیس نے آ کر پوری مسجد ہی منہدم کر دی۔ یہ واقعہ 3 جولائی 1910ء کا ہے۔ مسلمان ایک ماہ تک دادرسی کی کوشش کرتے رہے، مگر حکومت خاموش تماشائی بنی رہی۔ 3 اگست کو کچھ نوجوانوں نے سروں سے کفن باندھے اور مسجد از سر نو تعمیر کرنے لگے۔ وہاں کان پور کے مسلمان جمع ہو گئے۔ پھر ایک انگریز پولیس افسر بھاری جمعیت لے کر آیا اور کسی قسم کی وارننگ دیئے بغیر، اچانک مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اندھا دھند گولیاں چلتی رہیں اور مسلمان شہید اور زخمی ہوتے رہے۔ تقریباً چھ سو کارتوس استعمال ہوئے۔ گھڑ سواروں نے برچھیوں سے نہتے مسلمانوں پر حملے کیے۔ لاشوں کے انبار لگ گئے اور سارا ہندوستان ماتم کدہ بن گیا۔

1910ء کے مسلم ادب اور صحافت کا جائزہ لیں تو اسلامیان ہند کی دل سوزی، مایوسی اور غمگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقدمے چلے، چندے ہوئے۔ ہر شہر، قصبے اور دیہات میں مسلمانوں نے اس المناک واقعے پر ہر رنگ میں احتجاج کیا۔ مگر حکومت اب مسلمانوں کی جانب پہلے سے بھی زیادہ سرد مہر اور ظالم ہو گئی۔ اس وقت کے مسلمان اکابرین مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، مولانا مظہر الحق، مولانا ظفر علی خان، مہاراجہ محمود آباد اور علامہ اقبال سب نے اپنے اپنے انداز میں حق ادا کیا۔ مسلمانوں نے بہت غور و فکر کے بعد اپنے نمائندہ عمائدین کا ایک وفد انگلستان بھیجا۔ یہ وفد مولانا محمد علی جوہر اور سروزیر حسن پر مشتمل تھا۔ حکومت برطانیہ نے وفد سے مذاکرات کے بعد اپنے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو ہدایت کی کہ مسلمانوں کا احتجاج جائز ہے۔ چنانچہ مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی۔

تمام حالات و واقعات میں ہندوؤں اور انگریزوں کے متعصبانہ رویوں اور مظالم کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان محض اس لیے باقی رہ گئے کہ ان کا عالم اسلام اور امت سے گہرا تعلق تھا۔ مکے مدینے سے اور خلافت کے اصول و مسلک سے، اپنے مرکز سے ان کا رشتہ استوار تھا اور وہ ایک مضبوط عالم گیر برادری سے منسلک تھے۔ ان کے دین کی بنیاد انسانی اخوت و مساوات پر تھی۔ رنگ و نسل، قبائلیت اور قومیت کی بنیاد پر عصبیت کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔ جب مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد اور اس کے تدریجی ارتقاء پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بقا کا راز اپنے دین کے ساتھ قلبی و روحانی وابستگی، اپنے غنی سے گہرا تعلق اور اپنے مرکز سے بہر قیمت منسلک رہنے میں مضمر تھا۔ اہل مغرب اور اہل کلیسا، ہندوؤں اور یہودیوں کی نظر

میں اگر ان کا کوئی ... یب اور مد مقابل تھا تو مسلمان اور صرف مسلمان تھا (اور اب تک ہے!)

ہندی مسلمانوں نے ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ عالم اسلام، حجاز اور خلافت سے اپنی وابستگی ہر حال میں قائم رکھی۔ ان کے سامنے وحدت اُمہ کا تصور ہمیشہ سب سے اہم رہا۔ اس کی خاطر وہ قومی مقاصد اور مقامی ... حول کو قربان کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی وطنی اور قومی جدوجہد پر اسلام اور عالم اسلام کو قربان کر دیتے، تو امہ کی عالمی قوت کمزور یا ختم ہونے کے بعد خود وہ بھی اپنے ملک میں ختم کر دیئے جاتے یا ہندوؤں میں ان کے مذہب و معاشرت میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت اور اپنا تشخص کھو بیٹھتے۔

1907ء کے دوران میں اسلامی ممالک کے اندر جو واقعات رونما ہوئے، وہ مسلمانانِ ہند کے جذبات کو انگیخت کرنے کے لیے کافی تھے۔ روس اور برطانیہ نے باہم سازش کر کے ایران کو تقسیم کیا اور اپنی ایک الگ لابی قائم کر لی۔ ان کا یہ گٹھ جوڑ زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکا آئندہ سال 1908ء میں قوم پرستوں نے انقلاب برپا کر کے قاچار بادشاہت کا خاتمہ کر کے روس اور برطانیہ دونوں کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔

ترکانِ احرار

1909ء میں نوجوان "ترجمان احرار" نے سلطان عبدالمجید کو معزول کر کے سلطنت عثمانیہ میں اصلاحات اور ترقی کے منصوبے بنائے۔ ترکوں کی بیداری کی اس تازہ لہر اور نئی حکمت عملی کو ختم کرنا اب یورپ کی سامراجی طاقتوں کا نصب العین ٹھہرا۔ انہوں نے مل جل کر 1911ء میں اٹلی سے طرابلس پر حملہ کرا دیا، حالانکہ حال ہی میں اٹلی کا ترکی سے دوستی اور امن کا معاہدہ ہوا تھا، لیکن ابھی معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ انگریزوں نے ترکی پر حملہ کر دیا اور مصر کی طرف سے ترکوں کا راستہ روک دیا تا کہ وہ طرابلس کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ طرابلس میں سنوسی اخوان اور ترکانِ احرار نے مل کر مقابلہ کیا اور اٹلی کو زک اٹھانا پڑی۔

1912ء میں ترکی پر بلقانی ریاستوں سے حملہ کرا دیا گیا۔ انہوں نے ترکی کے اہم شہر ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ یونان کے بادشاہ نے اسے صلیبی جہاد قرار دیا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم ایسکوئتھ اور وزیر خارجہ ایڈورڈ گرے نے فاتحین کو مبارک باد دی۔ بلقان کے محاذ پر سخت خون ریز جنگ کے بعد انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ سب کے دل اسی طرف لگے رہتے اور کسی کو اپنی خبر نہ ہوتی تھی۔ مرکز محسوس، ہلال احمر کا وفد، انجمن خدام کعبہ کا قیام، تحریک ہجرت، خلافت کی بقا سب ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کا دینی مرکز مکہ و مدینہ اور سیاسی قوت کا مرکز خلافت دولت عثمانیہ تھا۔ یورپی استعمار نے امہ مسلمہ کے ان دونوں مرکزوں کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تا کہ مسلم ملکوں اور ریاستوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہ تمام عالم اسلام کی اقتصادیات اور تجارت پر قابض ہو جائیں۔

اگر مغربی استعمار کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مسلمانوں کی آپس کی چپقلش، رقابت، علمی مائیگی، سائنسی پسماندگی، اقتصادی بد حالی، انتظامی کمزوری اور سیاسی تنزل کا ایک بہت بڑا سبب ہیں امہ مسلمہ کے خلاف مغربی مفکروں، دانشوروں اور مستشرقین کے اسلام کے خلاف تعصب اور ان کے سیاسی قائدین کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک

وسیع جال دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے، جس کی گرہیں کھولنے کی بجائے مسلم ممالک اوران کے قائدین اپنی بے عقلی اور بے علمی سے خود ہی زیادہ مضبوط کرتے رہے ہیں۔

گاندھی جی کا رویّہ

امت مسلمہ کے مفاد کے نقطۂ نظر سے مسلمانانِ ہند کو جو ملّی مسائل درپیش تھے، ان کی بنا پر انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور کانگریس کے نعرے ''ہندو مسلم اتحاد'' کی خاطر ایسی ناروا باتیں بھی تسلیم کرلیں جو امن کے زمانے میں قبول نہیں کی جاسکتی تھیں، مثلاً ذبیحہ گاؤ پر پابندی۔ انگریزوں کو ہندستان سے نکال باہر کرنے کے مشترکہ نصب العین کے تحت بے مثال ''ہندو مسلم اتحاد'' ہوا، لیکن ''ہندو مسلم اتحاد'' کا پرچم لے کر ہندوؤں کے جو لیڈر آگے آئے، وہ اس مقصد سے مخلص نہیں تھے۔ بغل میں چھری، منہ میں رام رام ان کا وطیرہ تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے آنکھیں بند کرکے ان کی پیروی کی۔ ابتدا میں تو ان لیڈروں نے اپنا اصل رنگ نہیں دکھایا، اس لیے بڑے بڑے مسلمان بھی ان کی بگلا بھگتی سے فریب کھا گئے۔ بعد میں ہندو لیڈروں کے دلوں کا کھوٹ رنگ لایا اور یہ ہم آہنگی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ''ہندو مسلم اتحاد'' کا نعرہ لگانے والے، ایسے متعصب بد منافق لیڈروں میں پنڈت مدن موہن مالویہ، کرم چند موہن داس گاندھی اور سوامی شردھانند تھے۔

پنڈت مالویہ کی پوری زندگی کا مشن تین باتوں پر تھا:

1۔ اردو زبان کا خاتمہ اور اس کی جگہ ہندی کا اجراء۔

2۔ ذبیحہ گاؤ بند کرانا، کیونکہ گائے ہندوؤں کا مقدس جانور ہے۔

3۔ برہمن راج کا احیاء۔

گاندھی جی پہلی دو باتوں میں تو پنڈت جی سے متفق تھے، لیکن تیسری بات میں وہ فراخ دل نہ تھے۔ وہ برہمنیت کی بجائے ہندو راج چاہتے تھے۔ ہندو راج کے لیے مسلمانوں کا تعاون ضروری تھا، لیکن جب کبھی مسلمانوں سے اتحاد کرنے اور ان کا غیر مشروط تعاون حاصل کرنے کے ضمن میں گفتگو ہوئی تو مسلمانوں کی نمائندگی کا سوال قدرتی طور پر پیدا ہوا جو کبھی منصفانہ طور پر طے نہ ہوسکا۔ یہ مسئلہ بھی محمد علی جناح کی کوششوں سے حل ہوا۔ انہوں نے 1916ء میں لکھنؤ میں ایک متفقہ فارمولا تمام ہندو مسلم سے منظور کرالیا اور اس طرح ''ہندو مسلم اتحاد'' کے نظریاتی اتحاد نے ایک عملی شکل اختیار کی۔ اگرچہ اس اتفاق و اتحاد کے بعد بھی ہندو مسلم فسادات ہوئے، لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں اور ہندوؤں کا میلان یک جہتی کی طرف تھا۔ پھر رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجی تحریک (جنوری 1919ء) اور جلیانوالہ باغ (اپریل 1919ء) امرتسر میں انگریز کی اندھا دھند فائرنگ نے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم کردیا۔ تحریک خلافت میں، یعنی احیائے خلافت کے لیے مسلمانوں کے لیڈر گاندھی جی بن گئے تھے۔ اس لیے یہاں ان کے رویّے کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گاندھی جی کی پرورش اور تربیت شروع دن سے کٹر ہندو مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کے دل میں

انگریزوں سے خلاف میاں اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ کدورت بھری ہوئی تھی۔ مہاراشٹر کے ہندو، بنیئے اور تجارت پیشہ لوگ قومیت کے جذبے سے سرشار تھے، لیکن مسلمانوں اور انگریزوں کے مقابلے میں انتہائی احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ مہاراشٹر میں گاؤکشی بند کرانے کا جذبہ شدید تھا، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوؤں میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ مسلمانوں کی جسمانی طاقت کا سبب گوشت خوری ہے، جب کہ سبزی خور بزدل، کمزور اور غبی ہوتے ہیں۔

گاندھی جی نے اپنی خود نوشت سوانح میں اقرار کیا ہے کہ ان کے بڑے بھائی اور ایک دوست نے مسلسل کئی روز تک مثالیں دے کر یقین دلایا کہ ان کے بعض اساتذہ اور طلبہ بھی گوشت کھاتے ہیں، تاکہ قوی اور بہادر ہو جائیں، کیونکہ گوشت کھانے والے قوی اور بہادر ہوتے ہیں۔ گاندھی جی لکھتے ہیں ''میں نے طاقت اور جرأت مند بننے کے لالچ میں گوشت کھانا شروع کیا۔ میں بے حد ڈرپوک اور انتہائی بزدل تھا۔ سایے سے بھی ڈرتا تھا۔ ایک گجراتی شاعر نرمد کا یہ شعر ہم سکول کے لڑکوں کی زبان زد تھا: ''طاقتور انگریز کو دیکھو، وہ بونے ہندو پر حکومت کرتا ہے، اس لیے کہ وہ گوشت کھاتا ہے۔ وہ لمبا تڑنگا ہے، اس لیے کہ وہ گوشت کھاتا ہے''۔ میں بھی مسحور ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اگر سب ہندوستانی گوشت کھانے لگیں تو انگریز مرعوب اور مغلوب ہو جائیں گے''۔ ظاہر ہے کہ ''سب ہندوستانی'' سے مراد صرف ہندو ہیں، ورنہ مسلمان تو پیدائشی گوشت خور تھے۔ یہی ''سب ہندوستانی'' کی ترکیب گاندھی جی کی سیاست کی جان ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان اور ہندو مترادف ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر، مسلمانوں کو کبھی ہندوستانی نژاد سمجھا ہی نہیں۔

گاندھی جی مزید لکھتے ہیں: ''میں نے چھپ کر دوستوں کے ساتھ گوشت کھانا شروع کیا۔ میرے والدین کٹر قسم کے ہندو تھے۔ وہ پابندی سے روزانہ مندر جاتے، باقاعدگی سے پوجا پاٹ کرتے۔ ہمارے خاندان کا مندر الگ تھا۔ گجرات میں گوشت خوری کے خلاف سخت نفرت اور حقارت تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں یہ نفرت عام تھی میں گوشت لذت کی خاطر نہیں کھاتا تھا، بلکہ طاقتور اور بہادر بننے کے لیے۔ میں نے ''خفیہ'' کا بندوبست کر کے اپنے طور پر یوں سمجھ لیا کہ والدین سے اس کام کو چھپانا ''سچائی'' کے خلاف نہیں ہے''۔

ایک ورا قتباس: ''اسٹیٹ ہاؤس میں گوشت کی شاندار ضیافتوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن یہ ضیافتیں بہت مہنگی پڑتی تھیں۔ چوری چھپے گوشت کھانے کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی رقموں کی چوری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ لیکن مسلسل خفیہ طور پر گوشت کھانا اور جھوٹ بولنا، اور روپیہ چرانا مجھے برا معلوم ہوا۔ میں نے سوچا، جب والدین نہیں ہوں گے اور میں خود مختار ہو جاؤں گا تو علانیہ گوشت کھاؤں گا''۔

گاندھی جی نے ''منوسمرتی'' کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ ہندومت کی مقدس قانونی کتاب ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''منوسمرتی'' سے اہنسا کا سبق نہیں ملتا، بلکہ یہ قانون گوشت کھانے کی ترغیب دیتا ہے، اسی لیے سانپ اور دوسرے جانوروں کو مارنا بالکل درست ہے''۔

انہوں نے انگریزوں کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک چلائی۔ 1916ء میں اس تحریک کے تحت چمپارن (صوبہ بہار) میں ستیہ گرہ (بائیکاٹ) کرائی۔ کسانوں میں بیداری پیدا کی اور تحفظ گاؤ کی ترغیب بھی اس تحریک میں

شامل کر لی۔ اس کے بعد کھیدا (ضلع گجرات) میں پہلی جنگ عظیم کے دوران ستیہ گرہ کی تحریک چلائی لیکن نا کامی ہوئی۔ جب دیکھا کہ لوگ تھک گئے ہیں تو ستیہ گرہ ختم کرنا چاہی۔ لیکن کیونکر ختم کی جائے۔ اپنی عزت کا سوال تھا۔ اپنی "خودنوشت" میں لکھتے ہیں: "میں ستیہ گرہ ختم کرنے کا کوئی معقول طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ قدرت نے ایک بہانہ پیدا کر دیا"۔ (یعنی تحریک خلافت)

مزید لکھتے ہیں: "اس وقت جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ وائسرائے نے جنگ کانفرنس بلائی۔ سب لیڈروں کو دہلی بلایا۔ میں دہلی چلا گیا۔ علی برادران کو اس کانفرنس سے علیحدہ رکھا گیا۔ وہ دونوں اس وقت جیل میں تھے۔ میں اب تک ان سے صرف ایک دفعہ ملا تھا۔ اگرچہ میں ان کی شہرت سن چکا تھا۔ میں حکیم اجمل خان سے بھی اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ میں صرف مسٹر شعیب قریشی اور مسٹر خواجہ سے مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ کے موقع پر ملا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے بھی واقفیت تھی۔ میں مسلمان لیڈروں کی دوستی کا خواہشمند تھا۔ میں مسلمانوں کے مخلص محب وطن رہنماؤں سے مل کر ان کے دماغ کو سمجھنا چاہتا تھا، اس لیے مجھے ان سے میل جول کے لیے کسی دباؤ کی ضرورت نہ تھی"۔ (ان سطور میں گاندھی جی نے درحقیقت اپنے خلاف اس الزام کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ تحریک خلافت کے وقت گاندھی جی انگریز وائسرائے کے اشارے پر مسلمانوں کے ساتھ ہوئے تھے)۔

"بہت پہلے افریقہ ہی میں میں نے یہ پختہ خیال قائم کر لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں حقیقی دوستی کبھی نہیں ہو سکتی۔ جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران میرے تجربات نے یہ یقین بھی راسخ کر دیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کے وقت میرے عدم تشدد (اہنسا) کی آزمائش ہوگی، اور اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اہنسا کے نظریے اور تجربے کو وسیع کرنا ہوگا۔ میرا یقین اب بھی برقرار ہے۔ تاہم افریقہ سے آنے کے بعد میں نے علی برادران سے تعلق پیدا کرنا ضروری سمجھا"۔

اب دیکھئے گاندھی جی نے منوسمرتی کے مطالعے سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ گوشت کھانا جائز ہے۔ جھوٹ بولنا، مکر کرنا یا اپنا عقیدہ چھپانا کوئی غیر اخلاقی بات نہیں۔ ان کا یہ پرانا یقین برقرار تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں حقیقی دوستی کبھی نہیں ہو سکتی، اس کے باوجود انہوں نے سیاسی مصلحت کے تحت علی برادران سے تعلق پیدا کرنا ضروری سمجھا، اور وہ بھی صرف اس مقصد سے کہ مسلم رہنماؤں کے "دماغ" کا مطالعہ کر سکیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "علی برادران جیل میں تھے۔ میں نے ان کی رہائی کے لیے حکومت سے خط و کتابت کی۔ انہی ایام میں میں نے ان سے نظریہ خلافت کا مطالعہ کیا۔ مجھے نظریہ خلافت کا صحیح ہونے سے کوئی سروکار نہ تھا، البتہ یہ ہے کہ اس میں شرکت اخلاق کے منافی نہیں تھی"۔

یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی ان مظالم سے بے تعلق رہے جو عالم اسلام پر انگریز سامراج نے توڑے۔ بلکہ حقائق و شواہد سے اب ثابت ہو چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے اتحادی تھے اور مسلمانان عالم کے خلاف انگریزوں کی تمام خفیہ سازشوں سے باخبر تھے۔ وہ بڑے بھولپن سے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم نہ پانے، نوکریاں چھوڑنے اور انہیں انگریزوں کے خلاف جوش دلانے میں مشغول رہے۔ انہوں نے ہندی مسلمانوں سے ہندوؤں کے تمام مطالبات

منوانے کی کوشش کی۔ جب علی برادران جیل میں تھے اور دوسرے مسلمان رہنما قید و بند کی صعوبتوں سے گزر رہے تھے تو گاندھی جی نے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کرانے کی مہم شروع کی۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے گاؤں گاؤں پھرے اور اپنی صحت تک بگاڑ لی۔ اہنسا کے تمام اصول بالائے طاق رکھ دیئے۔ اسی طرح انہوں نے ہندوؤں کو کھلم کھلا ہتھیار رکھنے اور اٹھانے کی اجازت دی۔

گاندھی جی کی اصل اور حقیقی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں کو خودمختار حکومت کے لیے تیار کیا جائے اور ان پر تھوڑا بہت انگریزوں کا اقتدار بھی قائم رہے۔ گاندھی جی حصول آزادی (1947ء) تک مکمل آزادی کے خواہشمند نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پرستاروں کو انگریزوں کی مدد پر آمادہ کیا، ان کو فوج میں بھرتی کرایا اور اس کے صلے میں حکومت برطانیہ سے ہندوؤں کو مدد دینے کی اپیل کی۔

گاندھی جی ستیہ گرہ، بائیکاٹ، ہڑتال اور نیشنل کانگریس کے رہنما رہے تھے۔ اس زمانے میں جلیانوالہ باغ کے سانحے کی وجہ سے لوگوں میں سخت اشتعال تھا۔ امرتسر، لاہور، احمد آباد اور بمبئی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ احمد آباد میں ایک افسر قتل کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ فوراً بند کر دی اور لیڈری چھوڑ کر خاموشی سے بمبئی جا کر ایک اخبار کے ایڈیٹر بن کر بیٹھ گئے۔

فروری 1919ء میں رولٹ ایکٹ شائع ہوا۔ پورے ہندوستان میں اس ایکٹ کے خلاف احتجاج ہوا۔ دہلی میں لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کرنے کا فیصلہ ہوا۔ شردھانند نے گاندھی جی کو مدعو کیا۔ دعوت نامے پر شردھانند، حکیم اجمل خان اور آصف علی کے دستخط تھے۔ گاندھی جی یہ دعوت نامہ پا کر بہت خوش ہوئے۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں "میں کانفرنس میں گیا۔ یہاں اچھا خاصا مجمع تھا۔ میں نے گئو رکھشا (گائے کے تحفظ) کے بارے میں شردھانند جی سے گفتگو کی (کہ کانفرنس میں کیا پالیسی اختیار کی جائے)۔ انہوں نے میرے استدلال کو پسند کیا اور کانفرنس میں یہ سوال اٹھانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ میں نے اپنے طور پر پہلے حکیم اجمل سے مشورہ کیا۔ پھر کانفرنس کے سامنے۔ میں نے کہا: "اگر خلافت کا معاملہ سچا ہے اور یقیناً سچا ہے اور حکومت برطانیہ نے سخت ناانصافی کی ہے تو ہندو بھی مسلمانوں کی حق تلفی کا مداوا کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے پر مجبور ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر گئو رکھشا کا سوال اٹھانا یا مسلمانوں پر اس کی شرط لگانا ہندوؤں کے لیے فی الحال مناسب نہیں"۔

گاندھی جی نے بساطِ سیاست پر اپنی خفیہ چالیں چل کر مسلمانوں کو اس طرح گھیرے میں لے لیا کہ وہ اتنی صاف اور واضح چال و نہ سمجھ سکے۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی نے سودیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی۔ مولانا حسرت موہانی نے کہا کہ صرف سودیشی کپڑے ہی کا کیوں، تمام انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ تو سودیشی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک پہلے سے چلا رہے تھے جس کے ذریعے انہوں نے مسلمان جولاہوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا، اور انگریزی سودیشی کپڑے کی درآمد اور خریداری ہندو تاجروں کے ذریعے ہونے لگی تھی۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کیئے جاتے رہے تھے۔ انگریزوں کا اس سودے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ گاندھی جی ایسا کوئی کام نہیں کرتے تھے جس سے انگریزوں کا نقصان ہو اور برطانیہ کی صنعت و حرفت پر زد پڑے۔

مولانا حسرت موہانی عمر بھر ان کی دوغلی اور منافقانہ سیاست کی مذمت کرتے رہے۔

اسی کانفرنس میں انگریزوں سے ''عدم تعاون'' کی تجویز منظور ہوئی۔ اس تجویز کے بارے میں گاندھی جی لکھتے ہیں: ''اس کانفرنس میں مسلمانوں نے ایک اہم تجویز منظور کی۔ یہ کہ اگر برطانیہ نے خلافت کے معاملے میں بدعہدی کی تو ہم حکومت سے تعاون نہیں کریں گے۔ ایک ماہ پہلے ہی میں نے امرتسر میں عدم تعاون کی تجویز کی مخالفت کی تھی، یہاں اس کانفرنس میں، میں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ برطانیہ بدعہدی نہیں کرے گا''۔

ایک ماہ پہلے اس تجویز کی کیوں مخالفت کی تھی، اس کی وجہ نہیں بتائی اور اب چونکہ انگریز پر یقین تھا کہ بدعہدی نہیں کرے گا، اس لیے اتفاق کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ماہ پہلے جلسے میں گاندھی جی کو معلوم تھا کہ کانگریس ہندوؤں کی ہے، اس لیے عدم تعاون اور بائیکاٹ کا بوجھ ہندوؤں کو اٹھانا پڑتا۔ چنانچہ اس تجویز کو منظور نہیں ہونے دیا اور اب خلافت سے متعلق اس کانفرنس میں صرف ایک ماہ بعد ہی مسلمان عدم تعاون کی تجویز منظور کر رہے تھے تو اسے منظور کرلیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا نتیجہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑتا اور ہوا بھی یہی۔ مسلمانوں نے سرکاری ملازمتوں سے استعفے دیئے، انگریزی تعلیم ترک کی، خطابات واپس کئے، تجارت چھوڑی، جیلوں میں گئے اور زندگی کے ہر شعبے میں نقصان اٹھایا۔

پہلی جنگِ عظیم اور خلافت عثمانیہ

اٹلی اور ترکی کے درمیان کوئی وجہ مخاصمت نہ تھی۔ طرابلس الغرب کی تمام آبادی مسلمان تھی اور نسلاً عرب اور ترک تھوڑے سے اطالوی بھی تھے، ان کو دولت عثمانیہ سے کوئی شکایت نہ تھی۔ 2 دسمبر 1910ء کو اٹلی کے وزیر خارجہ نے اطالوی پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ ہم ترکی سلطنت کی سالمیت چاہتے ہیں اور یہ کہ طرابلس ترکی سلطنت کا حصہ رہے۔ مگر کسی ظاہری وجہ اور ترکوں کی طرف سے کسی اشتعال کے بغیر، اٹلی نے ستمبر 1911ء میں اعلان کر دیا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرے گا۔ اٹلی کو اس پر جلن تھی اس لیے کہ فرانس تیونس پر قابض تھا۔ افریقہ کے ساحل کے قریب ہونے کی بنا پر وہ تیونس کو اپنا حق سمجھتا تھا۔

فرانس نے اپنے خلاف اطالویوں کی یہ شکایت رفع کرنے کے لیے خفیہ طور پر، یہ رضامندی دے دی کہ اٹلی طرابلس پر قبضہ کرلے۔ برطانیہ نے باضابطہ اٹلی کا یہ اقدام منظور نہیں کیا، لیکن اس اہم مسئلے پر اس نے سکوت اختیار کر کے در پردہ اٹلی کی حوصلہ افزائی کی اور پھر یہ مدد بھی دی کہ مصر کی غیر جانب داری کا اعلان کر کے ترکوں کو مصر کے راستے طرابلس الغرب (لیبیا) میں فوجیں بھیجنے سے روک دیا۔ برطانیہ کو اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ مصر اس وقت دولت عثمانیہ کا ملک تھا۔

انور بے کی قیادت میں ترک مقامی عربوں کی تنظیم کر کے، بڑی بہادری سے طرابلس کی مدافعت کر رہے تھے مگر 1912ء کے آغاز میں یونان کے مشہور فتنہ پرداز وزیراعظم موسیو وینی زیلوس (Venizelos) کی کوشش اور تدبیر سے، ترکوں کے خلاف یونان، بلغاریہ اور سرویا کا اتحاد قائم ہوگیا اور پھر اس اتحاد میں مانٹی نیگرو بھی شامل

ہوا۔ سلطنت عثمانیہ کی مسیحی اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے بہانے سے، جو یورپ کی عیسائی سلطنتوں کا عرصہ دراز سے معمول رہا تھا، ان سب نے مل کر سلطنت عثمانیہ کو جنگ کا الٹی میٹم دے دیا۔ ترکوں نے یہ دیکھ کر دو محاذوں پر ایک ساتھ جنگ دشوار ہے، فوراً اٹلی سے امن معاہدہ کر لیا اور طرابلس سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامند ہو گئے۔ اس طرح عملاً انہوں نے طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ اس کے جواب میں اٹلی نے جزائر بحیرۂ ایجین سے اپنی فوجیں ہٹانا منظور کیا، مگر اس نے یہ وعدہ ایفا نہ کیا۔

بلقان میں جنگ شروع ہو گئی۔ ترکوں کو محض اس وجہ سے مسلسل شکستیں ہوئیں کہ ان کی افواج میں کثرت سے مقامی عیسائی آبادی کے لوگ تھے، جن کو حملہ آوروں کے ساتھ مذہبی ہمدردی تھی۔ دشمن کے خفیف سے دباؤ سے یہ عیسائی سپاہی بھاگنے لگتے تھے اور اپنے گھروں میں جا کر دم لیتے تھے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ ترکوں کی فوج کی تنظیم اچھی نہ تھی۔ ترکوں کا دستوری انقلاب 1908ء میں ہوا تھا اور نوجوان ترکوں کو یورپی ممالک کی دراندازیوں کی وجہ سے توجہ سے ملکی انتظامات میں وہ تمام اصلاحات نافذ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا جو دستور کے تحت ضروری تھیں۔ سب سے بدتر بات یہ تھی کہ بڑے بڑے ترک افسروں اور عمال حکومت میں اب بھی بہت سے ایسے تھے جو یورپی ملکوں کی سازشوں میں شریک تھے۔ ان سے رشوتیں لیتے تھے اور اپنے ملک، قوم کو نقصان پہنچاتے تھے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کا بڑا سخت نقصان ہوا۔ وہ تو آخر میں مفتوحہ علاقے کی تقسیم پر خود ہی بلقانی ریاستوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور کچھ اس وجہ سے جنگ میں ترکوں نے ادرنہ، دیموتیکا اور قرق کلیسا دوبارہ فتح کر لیے ورنہ اس وقت یورپ میں ان کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔

ان حالات میں 1914ء کی عالمگیر جنگ شروع ہوئی۔ برطانیہ کی یہ شرارتیں کہ ترکی نے جو کروزر برطانیہ سے خریدے تھے اور ان کی قیمت ادا کر دی تھی وہ اس نے ضبط کر لیے، ترکوں کی فوج کو مصر کے راستے طرابلس نہیں جانے دیا، طرابلس پر اٹلی کے حملے کو تحسین آمیز سکوت کے ساتھ پسند کیا، فرانس کی یہ حمایت کہ اپنے تیونس کے قبضے کے خلاف ان کی معاندانہ سوزش رفع کرنے کے لیے اس نے طرابلس پر اٹلی کے ملنے کی تائید کی، روس صدیوں سے بازنطینی روایات و سلطنت کی وراثت کا دعوے دار تھا، اور قسطنطنیہ پر قبضے کا طالب، لہٰذا ترکوں کے لیے کوئی صورت نہ تھی کہ وہ پہلی جنگ عظیم میں انگلستان اور فرانس کے حلیف بنتے۔ اس وقت ان کے لیے غیر جانبدار رہنا بھی ممکن نہ تھا۔ نہایت انحطاط و زوال کے باوجود یورپ کی سیاست میں سلطنت عثمانیہ کا عمل دخل اتنا ضرور تھا کہ ہر فریق اس سے فائدہ اٹھاتا۔ چونکہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جرمنی کا طرز عمل ترکوں کے خلاف نہیں تھا، فتح ادرنہ پر قیصر جرمنی نے سلطان محمد خامس کے نام تہنیت کا تار بھیجا تھا، بلقان میں ترکی فوج کی کمزوریاں ظاہر ہونے پر جب حکومت ترکی نے فوج کی تنظیم درست کرنے کا اہتمام کیا تو حکومت جرمنی نے اس میں ان کے ساتھ تعاون کیا اور اس کے لیے جنرل فان در غولتز کو ترکیہ بھیج دیا۔ اس طرح ترک، جرمنی کے حلیف بن کر جنگ عظیم میں شریک ہو گئے۔

ترکوں کے اس اعلان کے ساتھ ہی برطانیہ نے اپنی سیادت میں مصر کی خود مختاری کا اعلان کیا اور جزیرۂ قبرص کا اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کر لیا۔

1908ء سے 1914ء تک ترکوں کے قبضے سے بہت سے علاقے نکل چکے تھے، مقدونیہ، اپی رس، البانیہ اور تھریس کا بڑا حصہ، بحیرۂ ایجین میں کریٹ، قبرص اور کئی دوسرے جزائر۔ بلغاریہ، بوسنیا، ہرزی گووینا کی بادشاہت یورپ میں اور مصر و طرابلس کی بادشاہت افریقہ میں۔ یہ اتنے عظیم نقصانات تھے کہ ان کے نصف یا چوتھائی سے ایک ایک سلطنت بن سکتی تھی۔

جس وقت ترکی جنگ عظیم میں شریک ہوا، ہندوستان کے مسلمان بے قرار و مضطرب ہو گئے۔ اس سے پہلے ترکی کے قبضے سے ایک ایک ملک کا نکل جانا ان کے دلوں پر ایک ایک زخم چھوڑ گیا تھا۔ اب نئے اندیشے پیدا ہوئے۔ جزیرۃ العرب، مقامات مقدسہ، خلافت، اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو دنیا میں مسلمانوں کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا۔ ترکی اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی واحد آزاد سلطنت تھی اور خلافت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ امید قائم تھی کہ کسی وقت امت مسلمہ کے لیے مرکزیت اور وحدت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ وطن کے ساتھ ویسی ہی محبت کے باوجود جو سب کو ہوتی ہے، مسلمانوں کا مزاج ہمیشہ عالمگیر اور آفاقی رہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں اور زبان سے اعلان کیے بغیر ہر مسلمان اپنے کو اس عالمگیر قوم کا جزو سمجھتا ہے اور عالمی امور سے اس کو گہری دلچسپی ہے۔

برطانیہ کو معلوم تھا کہ مسلمانانِ ہند ترکی کے لیے نہایت فکرمند اور مضطرب ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں سے جنگ میں برطانیہ کو مدد بھی لینی تھی۔ لائڈ جارج وزیراعظم برطانیہ نے اعلان کیا: ''اور نہ ہم اس لیے جنگ کر رہے ہیں کہ ترکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کی زرخیز اور مشہور سرزمین سے محروم کر دیں، جس کی آبادی اکثریت کے ساتھ ترکی النسل ہے۔'' مسلمانوں کا دعویٰ یہ تھا کہ پورا جزیرۃ العرب، جس میں عراق، حجاز، شام، فلسطین شامل ہیں، اور تمام مقدمات مقدسہ واقع ہیں، براہ راست خلیفۃ المسلمین کی سیادت میں رہنا چاہیے۔

جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے تمام حلیفوں کو شکست ہوئی۔ ہنگامی صلح نامہ پر دستخط ہوئے۔ اس ہنگامی معاہدۂ صلح میں ترکی کے لیے یہ شرائط تھیں:

(1) اپنی تمام افواج برخاست کرے گا۔

(2) ترکی کے جنگی جہاز فاتحین ضبط کریں گے۔

(3) ملک کی ریلوے کی نگرانی اور ان پر تصرف کا حق اتحادیوں کا ہوگا۔

(4) ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدوں کے تعین کے علاوہ اندرونِ ملک کا انتظام ترکیہ ہی کے اختیار میں رہے گا۔

مسلمانانِ ہند پر اثر

دنیا میں جہاں کہیں مسلمان تھے، ترکیہ کی اس مصیبت کو عالم اسلامی کی مصیبت سمجھ رہے تھے اور نہایت پریشان اور سراسیمہ تھے، لیکن سب سے زیادہ ہندوستان کے مسلمان۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے انگریزوں کی محکومی میں مبتلا تھے، اس لیے اس سے واقف تھے کہ محکومی کے مصائب و نقصانات کیا ہیں۔ برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے انہوں نے اس جنگ میں اس کی پوری مدد کی تھی اور اسلامی تعلیمات کے خلاف مسلمان ترکوں

اور خلیفہ کے مقابلے میں وہ اس کی طرف سے لڑے تھے، اور اب یہ خواب شیریں خواب پریشان ثابت ہو رہا تھا کہ کبھی مسلمان متحد ہو کر خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں دنیائے اسلام کو یورپ کے تسلط سے آزاد کرائیں گے۔

کیا کسی نے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں پان اسلامزم (اتحاد اسلامی) کا پروپیگنڈا کیا تھا؟ کیا کسی نے ان کو یہ اونچی سیاست سجھائی تھی کہ خلافت کے خاتمے کے بعد اسلام کی مرکزیت ختم ہو جائے گی اور مسلمان عالمی امور میں کسی متحدہ اقدام عمل کے قابل نہ رہیں گے؟ نہیں۔ مسلمانوں کے پاس نہ اخبارات تھے، نہ انجمن تھی، نہ رہنما تھے۔ 1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی تھی اور ابھی عوام تک نہیں پہنچی تھی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی، دونوں بھائی 1911ء سے سامنے آئے تھے اور 1914ء سے نظر بند تھے۔ دو دو تین تین ورق کے چند اردو اخبارات نکل رہے تھے جن پر زمانہ جنگ میں یہ پابندی عائد تھی کہ ان مسائل پر کچھ نہ لکھیں، جو جنگ سے متعلق ہوں۔ ان کی استطاعت سے یہ باہر تھا کہ ترکوں کی اور خلافت کی حمایت میں دنیا کے مسلمانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو مضطرب و بے قرار کر دیں۔ کُل مومن اخوۃ، قرآن کا یہ سبق مسلمانوں کی فکر پر چھایا ہوا تھا۔ یہ ان کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیے۔ جس اسلامی فکر کے تقاضے سے محمد علی، شوکت علی اور حسرت موہانی اپنی جانوں پر کھیلنے کے لیے آمادہ ہوئے، وہی ہر عام مسلمان کے دل میں کام کر رہی تھی۔

محمد علی اور شوکت علی ابھی نظر بند ہی تھے کہ ہنگامی صلح نامہ کا اعلان ہوا۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر ظالمانہ فوجی قبضہ کیا۔ فاتح فوج کے لوگوں کو نجی سکونتی مکانات تک پر تصرف حاصل ہو گیا۔ موصل پر انگریزوں نے جارحانہ اقدام کیا۔ اس پر ہندوستان میں جا بجا احتجاجی جلسے ہوئے، جن میں قابل ذکر جلسے یہ ہیں:

مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن کے زیر صدارت (17 جنوری 1919ء)

لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے زیر صدارت (26 جنوری 1919ء)

آل انڈیا مسلم کانفرنس، لکھنؤ سر ابراہیم ہارون جعفر کے زیر صدارت (22 ستمبر 1919ء)

دہلی میں فضل الحق کی صدارت میں (22 نومبر 1919ء)

لکھنؤ کی مسلم کانفرنس میں اس خیال پر گفتگو ہوئی کہ خلافت، حرمین شریفین اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے لیے کوئی مستقل انتظام ہونا چاہیے۔ بمبئی کے نمائندوں نے یہ اطلاع دی کہ بمبئی کے سیٹھوں نے بمبئی میں "مجلس خلافت" کے نام سے کوئی انجمن قائم کی ہے۔ اس کو آل انڈیا انجمن قرار دے دیا جائے، بالآخر یہ طے ہوا کہ یہ "آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی" قائم کی جائے، جس کا مرکز بمبئی میں ہو۔ کانفرنس میں اس مفہوم کی قرارداد منظور ہوئی اور خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ سیٹھ چھوٹانی خلافت کمیٹی کے صدر اور حاجی صدیق کھتری سیکرٹری منتخب ہوئے۔ نظر بندی سے رہائی کے بعد صدیق کھتری کی جگہ مولانا شوکت علی سیکرٹری ہو گئے۔

خلافت کانفرنس کا پہلا جلسہ

لکھنؤ پیکٹ (1916ء) کے بعد اگرچہ ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے، لیکن مسلمانوں اور ہندوؤں کا مجموعی رجحان میل ملاپ اور یگانگت ہی کی طرف تھا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف عوامی احتجاج اور جلیانوالہ باغ، امرتسر کی

فائرنگ نے ان دونوں قوموں کواور زیادہ قریب کر دیا تھا۔اظہارِخلوص کے معاملے میں مسلمان بہت پرجوش واقع ہوئے ہیں۔سوامی شردھانند کوانہوں نے محض اس کے انعام میں جامع مسجد دہلی کے مکبر پر کھڑا کرکے تقریر کرائی تھی کہ اس نے ستیہ گرہ کے جلوس میں انگریز فوجیوں کی رائفلوں کے سامنے اپنا سینہ پیش کیا تھا۔ہندو اس سے بہت خوش تھے کہ رولٹ ایکٹ کے عوامی احتجاج میں،اس کے باوجود کہ اس کے لیڈر مسٹر گاندھی ہیں،مسلمان پورا ساتھ دے رہے ہیں،جن لوگوں نے ستیہ گرہ کے معاہدے پرابتدا میں دستخط کئے تھے،ان میں یہ مسلمان بھی تھے مولانا ابوالکلام آزاد،حکیم اجمل خان،عباس طیب جی،مسٹر عمر سوبانی،ڈاکٹر انصاری،مولانا حسرت موہانی،مسٹر یعقوب حسن،چودھری خلیق الزمان۔اس طرح مسلمان اور ہندو خاصے قریب آگئے تھے۔

خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس 24 نومبر 1919ء کو دہلی میں فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔اس اجلاس میں بہت سے ہندو شریک ہوئے۔بڑے لیڈروں میں مسٹر گاندھی،پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالوی بھی تھے۔مسٹر فضل الحق نے اپنے خطبۂ صدارت میں دوبارہ اسی پر زور دیا کہ خلافت کے مسئلے میں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کی حمایت حاصل کی جائے۔کانفرنس کی قراردادوں میں مشہد مقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ میں اتحادی افواج کی چیرہ دستیوں اور مظالم پر احتجاج کیا گیا۔مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ جشن صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے کریں۔اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ مسلمانوں کی منشاء کے خلاف ہوتو ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔مسٹر گاندھی نے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ بائیکاٹ صحیح حل نہیں ہے۔مولانا حسرت موہانی نے بائیکاٹ پراصرار کیا اور کہا کہ ہم ستیہ گرہ نہیں ہیں۔بائیکاٹ کی قرارداد دوسرے روز منظور ہوگئی۔

بعد میں خلافت کانفرنس کا ایک خاص اجلاس منعقد ہوا،جس کی صدارت مسٹر گاندھی نے کی۔اس اجلاس کے لیے مسٹر آصف علی نے دعوت نامہ جاری کیا۔انہوں نے دعوت نامے میں یہ لکھ دیا کہ مسئلہ خلافت کے ساتھ ترک گاؤ کشی کا مسئلہ بھی طے کرلیا جائے گا۔یہ سوامی شردھانند کو جامع مسجد مکبر پر لے جانے سے بھی زیادہ بری حرکت تھی۔مسٹر گاندھی سمجھدار آدمی تھے۔وہ جانتے تھے کہ گائے کے ذبیحہ کے ترک کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔کانفرنس کے دعوت نامے میں لکھ دیا اور وہ حل ہوگیا۔انہوں نے ہوشیاری کے ساتھ اس سے ہندوؤں کی عالی حوصلگی کے مظاہرے کا کام لیا۔انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:

''ہم ہندو اپنی روایات پر اعتماد کرکے،اس کو عزت کی بات نہیں سمجھتے کہ ایک مذہبی معاملے میں اپنی ہمدردیاں پیش کرنے کے عوض کوئی چیز لیں۔اگر یہاں کوئی ایسے ہندو ہیں جو اپنے دل میں یہ خیال لے کر آئے ہیں تو ان کو چاہیے کہ اس کو دل سے نکال دیں''۔

خلافت کانفرنس

دسمبر 1919ء میں مسلم لیگ اور نیشنل کانگریس کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس، اور جمعیۃ العلمائے ہند کا پہلا جلسہ ہوا۔ ٹھیک انہی دنوں میں چیمسفورڈ اصلاحات منظور ہوئیں اور اس تقریب میں سیاسی نظر بند رہا کیے گئے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت، بیتول جیل سے نکل کر، سیدھے امرتسر پہنچے۔ ہندو اور مسلمان لیڈروں کے درمیان، دوسرے مسائل کے ساتھ، خلافت کے مسئلے پر گفتگو ہوئی۔

خلافت کانفرنس کے اجلاس میں سلطان ترکیہ کے ساتھ بہ حیثیت ''خلیفۃ المسلمین'' اظہار عقیدت کیا گیا۔ یہ قرار پایا کہ 5 جنوری 1920ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لیے، ایک وفد انگلستان بھیجا جائے، مولانا محمد علی اس کے قائد ہوں۔ ''خلافت فنڈ'' قائم کیا جائے اور اس کے لیے دس لاکھ روپیہ جمع ہو۔

اس وفد کے انگلستان جانے سے قبل ایک دوسرا وفد 19 جنوری 1920ء کو وائسرائے سے ملا، جس کے ارکان یہ حضرات تھے: گاندھی جی، سیٹھ چھوٹانی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، سید حسین، ایڈیٹر ''انڈیپنڈنٹ'' (الٰہ آباد) مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید ظہور احمد سیکرٹری مسلم لیگ، مولانا فاخر الٰہ آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی، آغا محمد اشرف قزلباش، راجہ صاحب محمود آباد، پنڈت موتی لال نہرو اور محمد علی جناح۔ وفد کے قائد ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر جناح وقت پر نہ پہنچ سکے۔ مگر دونوں نے تار کے ذریعے اپنا اتفاق رائے ظاہر کیا۔

وائسرائے سے وفد کا مطالبہ

وفد کا خطاب محمد علی نے لکھا تھا۔ اس میں سلطنت ترکیہ کی سالمیت اور خلیفہ کی حیثیت سے سلطان ترکیہ کی حاکمیت برقرار رکھنے کی ضرورت پر اصرار کیا گیا اور یہ جتایا گیا کہ یہ اسلام کا عین تقاضا ہے کہ دینی اور دنیاوی حیثیت سے خلافت کا وجود مسلسل قائم رہے۔

وفد کے خطاب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''اگر حکومت برطانیہ نے اپنے تمام وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کیے تو اس کو ایسا دھچکا لگے گا کہ بڑے سے بڑے زرخیز علاقے اور عظیم ترین سیاسی منافع سے اس کی تلافی نہ ہو سکے گی اور پھر اخلاقی، فکری بربادی اس وجہ سے اس کو اور بھی زیادہ گراں گزرے گی کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو حضور والا نے پیش، وائسرائے نے ترکیہ سے جنگ شروع ہونے پر کیا تھا''۔

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس

وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔ اس پر مسلمان لیڈروں نے ایک بیان شائع کیا، جس میں کہا گیا ہے کہ اگر معاہدۂ صلح کی شرائط مسلمانوں کے مذہب اور جذبات کے خلاف ہوئیں تو حکومت برطانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اس کا تحمل نہ کر سکے گی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ جزیرۃ العرب ان حدود کے ساتھ جو اسلامی روایات کی رُو سے معین ہیں، اور اسلام کے بعض مقدس مقامات خلیفہ کے اختیار اور انتظام میں رہنے چاہئیں اور وہ تمام وعدے پورے کئے جائیں جو مسلمانوں سے وزیر اعظم برطانیہ نے کئے ہیں۔

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس فروری 1920ء میں بمقام بمبئی منعقد ہوا تاکہ مجوزہ وفد و نیابت کا اختیار دے کر رخصت کرے۔ بمبئی کے جلسۂ خلافت میں وفد پر اظہارِ اعتماد کی قرارداد منظور ہوئی۔ ایک نہایت اہم اور مفصل بیان شائع کیا گیا، جس میں مسلمانانِ ہند کے مطالبات ضابطے کے ساتھ معین کئے گئے اور مندرجہ ذیل الفاظ میں حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا گیا:

> ''اس مطالبے میں اگر کوئی کمی کی گئی تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کے عمیق ترین مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے گا، بلکہ ان اعلانات اور مواعید کی بھی بدیہی بے حرمتی اور خلاف ورزی ہوگی جو اتحادی اور ان کے حلیف ممالک کے نمائندے سیاسی رہنماؤں نے اس وقت کئے تھے جب وہ مسلمان قوم اور مسلمان فوجیوں کی تائید حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ مطالبہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہے، بلکہ ملک کی پوری ہندو آبادی اس میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ اگر غلط فیصلہ کیا گیا تو نتائج اچھے نہ ہوں گے''۔

وزیر اعظم برطانیہ کا مایوس کن جواب

فرانس، امریکا اور انگلستان کے اخبارات ترکوں کے خلاف بہت سخت لکھ رہے تھے۔ ان کا تقاضا تھا کہ مشرق کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا جائے۔ انگلستان اور امریکا کے بااثر سیاسی حلقے اس پر مصر تھے کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے نکالا جائے اور ترکی کے ٹکڑے کر کے اس کو چوتھے درجے کی چھوٹی سی ریاست بنا دیا جائے اور یہ تقاضے بھی ان اخبارات اور سیاسی حلقوں نے اپنے دل سے پیدا نہیں کئے تھے، بلکہ اتحادیوں کے ساتھ فیصلوں کی تائید میں تھے۔ انگلستان، فرانس اور روس 1915ء میں اس معاہدے پر دستخط کر چکے تھے کہ درہ دانیال اور باسفورس روس کو دیئے جائیں گے۔ قسطنطنیہ اتحادیوں کے تجارتی جہازوں کے لیے آزاد بندرگاہ ہوگا اور مقاماتِ مقدسہ ترکوں سے لے کر آزاد عرب ریاست کے حوالے کئے جائیں گے۔ اسی بنیاد پر شریف حسین (مکّہ کے گورنر) اور اتحادیوں کے درمیان معاملہ ہوا، اور یہ معاملہ ترکوں کے جنگ میں شریک ہونے سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ اس معاہدے کا موضوع قسطنطنیہ تھا۔ اتحادیوں کی بڑی خواہش تھی کہ اٹلی ان کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو۔ اٹلی کو لالچ دینے کے لیے 1915ء میں ''لندن پیکٹ'' کیا گیا، جس میں وعدہ تھا کہ عدلیہ اٹلی کو ملے گا۔ پھر سینٹ جین ڈی موریین نے معاہدے میں ایشیائے کوچک اور سمرنا بھی اٹلی کے لیے مخصوص کر دیئے گئے۔ مئی 1916ء میں روس، انگلستان،

فرانس اور اٹلی کے درمیان "سائکس پیکٹ" ہوا۔ اس کا مقصد عرب ممالک پر یورپی تسلط تھا۔ لہٰذا یہ عربوں کے ساتھ بدعہدی تھی۔ اس معاہدے کو عربوں سے مخفی رکھا گیا۔ ان سب معاہدات کی موجودگی میں مسلمانانِ ہند کی یہ توقع عبث تھی کہ برطانیہ ان کی خواہشات اور تمناؤں کا لحاظ کرے گا، مگر اسی برطانیہ نے مسلمانانِ ہند سے بھی تو وعدے کیے تھے۔ اس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ ہندوستانی رائے عامہ کا پورا دباؤ ڈالیں۔ برطانیہ کو بہرحال کسی نہ کسی کے ساتھ بدعہدی اور وعدہ شکنی کرنی ہے۔

خلافت کانفرنس کے وفد کی روانگی

امرتسر کے اجلاس کے فیصلے کے مطابق اوائل مارچ 1920ء میں خلافت کا وفد انگلستان روانہ ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین، ایڈیٹر اخبار "انڈی پنڈنٹ" الٰہ آباد، حسن محمد حیات اور مولانا محمد علی جوہر ہندوستان سے گئے۔ مولوی ابوالقاسم، شیخ منیر حسین قدوائی، محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی جو پہلے سے انگلستان میں تھے، وہیں وفد میں شریک ہو گئے۔ حسن محمد حیات وفد کے سیکرٹری تھے۔

وزیر ہند کی طرف سے مسٹر فشر نے وفد سے ملاقات کی۔ اس کے بعد وفد وزیراعظم مسٹر لائڈ جارج سے ملا۔ مولانا محمد علی نے بڑی متانت اور بے باکی سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ لیکن جب نفرت و عداوت سے دل کج ہو گیا ہو، اور عداوت کی چربی آنکھوں پر چھائی ہوئی ہو تو حق، انصاف اور معقولیت سب کے لیے دل اور چہرے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ لائڈ جارج نے کہا:

> "ترکوں کے ساتھ ان سے مختلف اصولوں پر معاملہ نہیں کیا جا سکتا، جو مسیحی ملکوں کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ ترکیہ کو ترکی سرزمین پر دنیوی اختیار برتنے کی اجازت ہوگی، مگر وہ علاقے اس کے قبضے میں نہیں چھوڑے جائیں گے جو ترکی نہیں ہیں"۔

وزیراعظم برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کے مطالبات منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ انکار برطانیہ کے وعدوں اور اعلانوں کے ایفا سے صاف انکار تھا۔ مسلمانانِ ہند کی نظر میں برطانیہ کی کوئی وقعت نہ رہی۔ خلافت کمیٹی نے اعلان کیا کہ 19 مارچ 1920ء کو ہندوستان میں لائڈ جارج کے جواب پر "یومِ سیاہ" منایا جائے۔ مسلمان روزہ رکھیں، دعائیں کریں اور عام ہڑتال کریں۔

مولانا شوکت علی نے 19 مارچ کے جلسوں کے لیے ایک قرارداد شائع کی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر صلح کی شرائط قابل قبول نہ ہوئیں تو مسلمان اس پر مجبور ہوں گے کہ تاج برطانیہ سے اپنا رشتۂ وفاداری منقطع کر لیں۔ اس کے جواب میں حکومت ہند کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا کہ 19 مارچ کے جلسوں اور تقریبات میں کوئی سرکاری ملازم شریک نہ ہو۔ امرتسر میں خلافت کانفرنس اور کانگریس کے اجلاسوں کے موقع پر یہ طے ہو چکا تھا کہ اگر مشترکہ تحریک چلانے کی نوبت آئی تو مسٹر گاندھی اس کی قیادت کریں گے۔ وزیراعظم برطانیہ لائڈ جارج کے مایوس کن جواب کے بعد گاندھی جی نے یہ اعلان کیا کہ اگر ترکیہ کو ایسی شرائط پر صلح کرنے کے لیے مجبور کیا گیا جو مسلمانانِ ہند کے جذبات کے مطابق نہ ہوئیں، تو میں عدم تعاون کی تحریک چلاؤں گا۔ 10 مارچ کو گاندھی جی نے ایک منشور میں

عدم تعاون کے متعلق اپنے منصوبے ظاہر کیے جو ذیل میں درج ہیں:

''اب اس کے متعلق ایک بات کہنی ہے کہ اگر مطالبات پورے نہ ہوئے تو کیا کیا جائے۔ جنگ وحشیانہ طریقہ ہے، وہ کھلی ہوئی ہو یا مخفی۔ اس کو خیال سے دور کرنا چاہیے۔ خواہ اس وجہ سے کہ وہ نا قابلِ عمل ہے۔ اگر میں ہر ایک کو یہ سمجھا سکوں کہ جنگ ہمیشہ بری چیز ہے تو ہم تمام جائز مقاصد بہت جلد حاصل کر لیں گے۔ وہ فرد ہو یا قوم، تشدد ترک کر کے اس میں جو طاقت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ایسی ہوتی ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر آج تشدد کے خلاف میرا استدلال خالص ضرورت کی بنا پر ہے، اس لیے بالکل بے کار ہے۔ لہٰذا جو ایک واحد علاج ہمارے لیے باقی رہ گیا ہے، وہ عدم تعاون ہے۔ یہ بالکل صاف علاج ہے کیونکہ اگر یہ تشدد سے بالکل پاک ہو تو نہایت موثر ہے۔ جب تعاون تنزل اور ذلت کا باعث ہو یا کسی کے عزیز ترین مذہبی جذبات مجروح ہوں، تو عدم تعاون فرض ہو جاتا ہے۔ انگلستان ہم سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ اس کی طرف سے ان حلقوں کے غیر منصفانہ غصب اور قبضے وہم عاجزی کے ساتھ قبول کر لیں گے، جو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہیں۔ اس لیے ہم اوپر سے بھی شروع کر سکتے ہیں اور نیچے سے بھی۔ جو عزت یا تنخواہ کے مناصب پر فائز ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ ترک کر دیں۔ جو حکومت کے ماتحت ادنیٰ ملازمتیں کر رہے ہیں ان کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ افراد کی نجی ملازمت پر عدم تعاون بطور علاج قبول نہ کریں، میں ذات برادری سے خارج کرنے کی دھمکی منظور نہیں کر سکتا۔ عوامی احساس اور بے اطمینانی کی اصلی آزمائش یہ ہے کہ لوگ خوشی سے عدم تعاون کریں۔ سپاہیوں کو یہ مشورہ کہ وہ خدمت سے انکار کر دیں، قبل از وقت ہے، یہ آخری تدبیر ہے، پہلی نہیں۔ ہم یہ تدبیر اختیار کرنے کے حق دار اس وقت ہوں گے جب وائسرائے، وزیر ہند وزیر اعظم ہمیں چھوڑ دیں گے۔ علاوہ ازیں عدم تعاون کرنے میں ہر قدم پر بڑی احتیاط سے غور و فکر کرنا چاہیے۔ ہم کو آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہے، تاکہ سخت سے سخت اشتعال کی حالت میں بھی ہم اپنے نفس پر قابو رکھ سکیں۔''

معاہدہ سیورے

خلافت کا وفد وزیر اعظم سے ملاقات کرنے کے بعد انگلستان کے سیاسی رہنماؤں سے ملا۔ اس نے جلسے کیے۔ وفد کے قائد کی حیثیت سے مولانا محمد علی جوہر نے، ایک تقریر پیرس (فرانس) میں کی اور کئی تقریریں انگلستان میں۔ اس طرح وفد خلافت نے اتحادیوں کو اور تمام یورپی اقوام کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مطالبات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا اور ایسے دلائل کے ساتھ کہ اگر فیصلے میں انصاف کا دخل ہوتا اور مسلمانانِ ہند کا دعویٰ اور مطالبہ مانا جاتا، مگر ایک جنگ میدان میں ہوئی تھی اور دوسری صلح کانفرنس میں ہو رہی تھی۔ دونوں جگہ زبردستی کی فتح تھی۔ اس لیے وفد کو ناکامی ہوئی۔

وفد ابھی انگلستان ہی میں تھا کہ اتحادیوں کے نمائندے بمقام سان رومیو (پیرس) میں جمع ہوئے اور انہوں نے ترکیہ کے لیے معاہدے کی شرائط مرتب کیں۔ اس کا نام "معاہدہ سیورے" مشہور ہے۔ وہ شرائط یہ تھیں:

1۔ سلطان اتحادیوں کی حمایت و تائید کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔

2۔ اتحادیوں کو یہ حق ہوگا کہ آبناؤں پر قبضہ کر لیں، اور یہ بھی کہ ایشیائی ترکیہ کے کسی حصے پر قابض ہو جائیں۔

3۔ آرمینیا کی ایک نئی ریاست قائم کی جائے گی جس میں مندرجہ ذیل صوبے شامل ہوں گے: مشرقی اناطولیہ، ارض روم، وان بتلس، ترابزون، ارزنجان۔ اس ریاست کی حدود ریاست ہائے متحدہ امریکا کی مدد سے قائم کی جائیں گی۔

4۔ ترکیہ عرب کے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دست بردار ہوگا۔

5۔ شام کی علم برداری فرانس کو، عراق اور اردن کی برطانیہ کو دی جائے گی۔ عدلیہ اٹلی کو، سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کو۔

اس متعصبانہ ذلیل اور منتقمانہ صلح نامے کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں نے نفرت اور غصے کا اظہار کیا، حتیٰ کہ اس سلطانِ ترکیہ کی حکومت بھی احتجاج کیے بغیر نہ رہی، جو اتحادیوں کی توپوں اور بندوقوں کے حصار میں لاچاری اور مجبوری کے ساتھ ترکی اور اسلامی روایات کو بدنام کر رہا تھا۔ اس حکومت نے احتجاج کیا، مگر وہ پھر برطانیہ اور دوسری یورپی طاقتوں کے دباؤ سے 10 اگست 1920ء کو "معاہدہ سیورے" پر دستخط کے لیے مجبور ہوئی۔

خلافت کمیٹی کے قیام کا پس منظر

ہندوستان میں خلافت کی تحریک سے قطع ہو کر، آیئے خود ترکی کے اندر جو سیاسی کایا پلٹ ہو رہی تھی، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں۔

جس طرح عراق پر چڑھائی کے وقت امریکی صدر بش نے "صلیبی جنگ" کا نعرہ لگایا تھا، اسی طرح پہلی جنگ عظیم، اتحادیوں نے ترکوں کے خلاف صلیبی جوش و جذبے کے تحت کی تھی۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد جنرل لارڈ ایلن بی (Allenby) کے لیے انعام کی تجویز پیش کرتے وقت وزیر اعظم برطانیہ لائیڈ جارج نے ایک پرجوش عیسائی مجاہد کی طرح اس فتح کو آخری صلیبی جنگ اور سب جنگوں سے زیادہ فاتحانہ کہا تھا۔ عارضی صلح کے بعد پہلی مرتبہ فرانسیسی افواج 8 فروری 1920ء کو قسطنطنیہ میں داخل ہوئیں اور ان کے کمانڈر نے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر فاتحانہ جلوس کے ساتھ قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر گشت کیا۔ غدار عیسائی آبادی نے خوشی میں تالیاں بجائیں اور ترکوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ محمد فاتح بھی جب قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخل ہوا تھا (29 مئی 1454ء) تو سفید ہی گھوڑے پر سوار تھا۔ فرانسیسی کمانڈر نے اتحادیوں کی اس فتح کو محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ کے انتقام کی حیثیت سے نمایاں کرنے کے لیے اس موقع پر اپنی سواری کے لیے سفید گھوڑا ضروری سمجھا۔

اس اندوہ ناک منظر کو دیکھنے والوں میں خود مصطفیٰ کمال بھی تھے۔ ان کے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر وہ اس کو صبر کے حوالے کر کے ایسے چپ ہو گئے کہ ان کے سکوت پر سب کو حیرت تھی۔

دوسری مرتبہ اتحادی فوجیں 16 مارچ کو قسطنطنیہ میں اتریں، اور یہ برطانیہ کی فوجیں تھیں، انگریز سپاہی لوگوں کے گھروں میں گھس گئے۔ ان کو سپاہیوں نے مارا پیٹا اور ذلیل کیا۔ مارشل لاء نافذ کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ قوم پرور ترکوں کو جو کوئی پناہ دے گا، اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ سیاسی لیڈر رؤف بے کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں بھیج دیا، جہاں "انجمن اتحاد و ترقی" کے ارکان پہلے سے قید تھے۔ اتحادیوں نے سلطان ترکی سے ایک عدالت قائم کرائی جس نے فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم وغیرہ کو، جن کی کل تعداد سات تھی، سزائے موت کا حکم دیا۔ شیخ الاسلام سے فتویٰ جاری کرایا کہ جو شخص ان سات آدمیوں میں سے کسی کو قتل کرے گا، وہ جنت کا حق دار ہو گا۔

سیاسی نظریات اور ملکی پالیسی کے معاملے میں مصطفیٰ کمال اور غازی انور بے کے درمیان اس قدر اختلاف تھا کہ اس نے ذاتی دشمنی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ "انجمن اتحاد و ترقی" کے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل سے بھی مصطفیٰ کمال پاشا کو اختلاف تھا، اس لیے قسطنطنیہ میں جو ترک فوج متعین تھی، اس میں مصطفیٰ کمال پاشا کرنل کے عہدے پر مامور تھے اور کوئی خاص خدمت ان کے سپرد نہ تھی۔ مگر یہ ایک انتہا پسند قوم پرور کی حیثیت سے بہت مشہور تھے۔ سلطان ان کو خطرناک سمجھتا تھا۔ اتحادی افسروں کے مشورے یا ہدایت پر مصطفیٰ کمال پاشا کو تیسری فوج کا انسپکٹر جنرل مقرر کر کے، سمسون بھیج دیا گیا اور 19 مئی 1919ء کو انہوں نے اس عہدے کا چارج لے لیا۔ اس تبدیلی سے مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھ پاؤں کھل گئے۔

پیرس کانفرنس کی شرائط کے مطابق سمرنا یونانیوں کو دے دیا گیا۔ 15 مئی 1919ء کو یونانیوں کی ایک ڈویژن فوج اتحادیوں کے نہایت طاقتور بیڑے کی مدد سے سمرنا میں اتری۔ مقامی یونانی عیسائیوں نے جو صدیوں ترکوں کی حفاظت میں رہ چکے تھے، بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا اور یونانی سپاہیوں نے بڑے اہتمام سے مسلمان ترکوں کی آبادی کا قتل عام کیا۔ یونانیوں کے اس ظلم سے تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا اور دنیائے اسلام میں کہرام مچا۔ جب یونانی سمرنا میں مضبوطی سے جم گئے تو پھر ان کے اندرونِ ملک میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کا قتل عام اور عمارتوں کو مسمار کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس مصیبت میں صرف ایک شخص یورک علی اپنی قوم کی بے بسی دیکھ کر، اس کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ یورک علی دورانِ جنگ میں ڈاکو اور رہزن تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ محسن قوم سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اپنے لوگوں کی ٹولیاں بنائیں اور یونانیوں سے گوریلا جنگ لڑنے لگا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جون 1920ء میں اس نے پچاس آدمیوں کو ساتھ لے کر، دریائے میندریس عبور کیا اور یونانیوں کی ایک پوری فوج کا صفایا کر دیا۔ مگر ترکوں کو یونانیوں کے مقابلے میں ایک پوری جنگ درپیش تھی، اور اس کے لیے ایسا لیڈر چاہیے تھا جو دورِ حاضر کی جنگ کے تقاضوں سے واقف ہو اور بہادری میں، فکر میں، رائے میں، تخلیق وسائل میں امتیازی صلاحیتیں رکھتا ہو۔ وہ مصطفیٰ کمال نکلا اور عزم و ہمت کے ساتھ قیادت کی باگیں اپنے طاقتور ہاتھوں میں مضبوط تھام لیں۔ 26 جون 1916ء کو اس نے مندرجہ ذیل گشتی پیغام تمام قابل اعتبار فوجی اور

سول افسروں کو بھیجی:

"ہمارے وطن کی سالمیت اور قومی استقلال خطرے میں ہیں۔ مرکزی حکومت اس قابل نہیں ہے کہ اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ ایک ایسی قومی جمعیت قائم ہونی چاہیے جو تمام بیرونی اثرات سے آزاد ہو، تاکہ اپنے حقوق کے لیے قوم کی آواز تمام دنیا کے کانوں تک پہنچا سکے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیواس میں عنقریب قومی کانگریس کا اجلاس منعقد کیا جائے، جس میں ہر صوبے کے نمائندے شریک ہوں، اور جب ضرورت ہو تو وہ اس طرح سفر کریں کہ ان کو کوئی پہچان نہ سکے"۔

اس کی خبر پاتے ہی وزارتِ جنگ نے مصطفیٰ کمال کو ان کے عہدے سے برخاست کر دیا اور تمام افسروں کو احکام بھیج دیے کہ مصطفیٰ کمال کے احکام کی ہرگز تعمیل نہ کریں، مگر فوجی افسروں نے وزارت جنگ کے احکام کی قطعی پروانہ کی اور مصطفیٰ کمال کو اپنا لیڈر مانتے رہے۔ ارض روم میں ایک کانگریس منعقد ہوئی۔ مصطفیٰ کمال اس کے صدر منتخب ہوئے۔ سیواس کانگریس نے، جو اسی سال ستمبر میں منعقد ہوئی، اس کے فیصلوں کی تصدیق کی۔ اس کانگریس میں مصطفیٰ کمال کی سیاسی ذہانت کا مظاہرہ ہوا اور بحیثیت صدر وہ اس کی تمام کارروائی پر چھائے رہے۔ سیواس کانگریس کے فیصلوں کا خلاصہ یہ تھا کہ ترکیہ کے کسی بھی حصے پر حملہ ہو، اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اگر ملک کے سیاسی استحکام و مفاد کے لیے نقصان دہ ہوں تو وہ تمام مراعات جو اقلیتوں کو دی گئی ہیں، واپس لی جائیں۔ قوم کے مستقبل کے فیصلے کرنے کے لیے نیشنل اسمبلی منعقد کی جائے۔

کانگریس نے مرکزی حکومت کو اپنا یہ قطعی اور آخری مطالبہ بھیجا کہ وزیر اعظم داماد فرید پاشا کی حکومت استعفیٰ دے۔ جب اس مطالبے کی تعمیل نہ ہوئی تو مصطفیٰ کمال نے بذریعہ تار ایک اور تنبیہ کی۔ جب اس تنبیہ کی میعاد بھی ختم ہوگئی تو مرکز سے تار اور ڈاک کے تمام رشتے منقطع کر دیے گئے اور سلطان کی حکومت کی طرف سے جو دفتری پیغامات آتے تھے انہیں تار گھر قبول نہیں کرتے تھے۔ 2 اکتوبر کو داماد فرید پاشا نے استعفیٰ دے دیا اور بجائے ان کے علی رضا پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے الیکشن کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے نیو چیف (امیر البحر) کو مصطفیٰ کمال کے پاس بھیجا۔ تین روز بحث و گفتگو کے بعد چار اہم اصولوں پر اتفاق رائے ہوا:

1۔ ترکی کی ملی سالمیت برقرار رکھی جائے گی۔

2۔ حکومت قومی نظام کو تسلیم کرے گی۔

3۔ صلح کانفرنس کے لیے وہ نمائندے مقرر کیے جائیں گے جن کو نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ منظور کرے۔

4۔ نئے ایوان وکلاء کے اجلاس قسطنطنیہ میں نہ ہوں گے۔

اس دوران میں مصطفیٰ کمال نے قوم کا اعتماد حاصل کر لیا اور عارضی حکومت کے صدر کی حیثیت سے اختیار بھی۔ یہ دیکھ کر، اتحادیوں نے قومی تحریک و نظام کو تباہ کرنے کے لیے سلطان کے ساتھ سازش کی اور خلافت کے اثرات کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ ترکی کے مشہور جنرل کاظم قرا بکر پاشا کو سلطان سے حکم بھجوایا کہ مصطفیٰ

کمال پاشا کو گرفتار کر کے، عارضی حکومت کو توڑ دیں، مگر جنرل کاظم پاشا خود مصطفیٰ کمال کی گفتگو سے متاثر ہو کر تحریک میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ پھر اتحادیوں نے سلطان کی وساطت سے کردوں سے بغاوت کرائی اور ان کو مصطفیٰ کمال کے خلاف حملہ کرنے کے لیے ابھارا۔ اس سے ترکوں کے قومی جوش میں اور زیادہ قوت اور شدت پیدا ہوئی۔ قسطنطنیہ میں جو برطانوی فوجی افسر تھے، انہوں نے ایوان وکلاء کے قوم پرور ارکان کی خود آرائی سے تنگ آ کر، یہ حماقت کی کہ ان کی گرفتاری کے لیے احکام جاری کر دیئے، اور جو گرفتار ہوئے ان کو مالٹا بھیج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ارکان ایوان گرفتاری سے بچ کر انقرہ چلے گئے اور ان سے وہاں قومی مجلس کبیر (گرینڈ نیشنل اسمبلی) کی تشکیل ہو گئی۔ اس کے مسلسل اور مستقل اجلاس ہونے لگے اور نئی دولت ترکیہ کا دستور وضع کرنے کے لیے اس نے خود بخود دستور ساز اسمبلی کی حیثیت اختیار کر لی۔ مصطفیٰ کمال اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے اور یہ طے پایا کہ وہ حکومت کے سربراہ ہوں گے۔ ارکانِ حکومت کا انتخاب اسمبلی کے ذمے رکھا گیا۔ قانون وضع کرنے کے اختیارات اور انتظامیہ کے اختیارات اسمبلی کو تفویض ہوئے جو اس طرح عارضی انقلابی مجلس بن گئی۔ سلطنت اور خلافت کے مسئلے کا تصفیہ اس وقت کے لیے ملتوی کیا گیا کہ ملک بیرونی طاقتوں کے قبضے سے آزاد ہو۔ مجلس ملی کبیر کے تمام ارکان نے قومی میثاق پر دستخط کیے اور یہ عہد کیا کہ قومی آزادی حاصل کر کے رہیں گے۔

مجلس کبیر نے بنیادی نظام کا عارضی آئین 10 جنوری 1921ء کو منظور کیا، جس کی اہم دفعات حسب ذیل ہیں:

1۔ حاکمیت عوام کے لیے ہے۔

2۔ عاملانہ اختیارات اور دستوری اختیارات مجلس ملی میں مرکوز ہیں جو قوم کی واحد نمائندہ مجلس ہے۔

3۔ نئی دولت ترکیہ کی حکومت مجلس ملی کبیر کی حکومت کہلائے گی۔

4۔ صدر کا انتخاب مجلس کرے گی اور صدر کو اختیار ہو گا کہ مجلس کی طرف سے دستخط کرے۔

5۔ مجلس کی میعاد دو سال ہو گی، جو اشد ضرورت کے زمانے میں ایک سال کے لیے اور بڑھائی جا سکے گی۔

6۔ قانون کا نفاذ، قوانین کی ترمیم و تنسیخ، جنگ کا اعلان اور معاہدات صلح کی توثیق صرف مجلس ملی کا حق ہو گا۔

یہ سب کچھ ہوا، مگر دریں اثنا دشمن سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد اناطولیہ اور تھریس میں داخل ہو گئے تھے۔ ترکی قوم کی لاچاری کے ساتھ ان کے مظالم برداشت کر رہی تھی۔ عصمت انونو اور فوزی پاشا نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کر کے باقاعدہ فوج کی تنظیم شروع کی۔ یہ عظیم اقدام تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ مصطفیٰ کمال پاشا نے فرانس، اٹلی اور روس سے گفت وشنید شروع کر دی اور اس طرح برطانیہ اکیلا رہ گیا۔ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کو جو امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا وہ فرانس کو ناگوار تھا۔ درخصوصیت سے وزیر اعظم برطانیہ لائیڈ جارج کی ان سیاسی پالیسیوں پر اس کو بڑا غصہ تھا جو یورپ میں انہوں نے جرمنی کے خلاف اختیار کی تھیں۔ اٹلی کو یہ پسند نہیں تھا کہ سمرنا میں یونان کا غلبہ ہو۔ روس اور مغربی یورپ کے درمیان اقتصادی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور اب اتحادی روس میں بالشویک انقلاب کے خلاف جنگ کی سازشوں میں شریک تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اناطولیہ میں کچھ مراعات دے کر فرانس کو سائی لیشیا سے فوجیں ہٹانے پر رضامند کر لیا۔ ہر بگی

کی نو آبادیات میں ترکوں نے اٹلی کو اقتصادی مراعات دیں اور اس کے لیے بعض مناد منظور کیے۔ اس کے عوض اٹلی نے عدلیہ اور جنوبی مغربی اناطولیہ سے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ روس اور ترکیہ کے درمیان ماسکو میں مارچ 1920ء میں معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کی رو سے روس نے قارص اور اردھان کے علاقے ترکوں کو واپس کیے اور ترکوں کی قومی فوج کے لیے اسلحہ اور سامانِ جنگ دینے کا وعدہ کیا۔ اس سے مصطفیٰ کمال کا وقار بہت بڑھ گیا اور عملاً ان کی حکومت بین الاقوامی طور پر تسلیم ہوگئی۔

خلافت کمیٹی کا قیام

ترکی کے اندرونی حالات کے اس پس منظر میں ہندوستان میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور اس کا نظام پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں خلافت کمیٹی موجود نہ تھی۔ بڑے شہروں میں، چھوٹے شہروں میں، قصبات میں اور دیہات میں۔ بلاشبہ اپنی تنظیم کی وسعت اور ڈسپلن کے اعتبار سے اس وقت خلافت کمیٹی ہندوستان میں بے نظیر تھی، اور اس معاملے میں بڑی سے بڑی سیاسی جماعت بھی اس کی ہمسر نہ تھی۔ نیشنل کانگریس بڑی عظیم اور قدیم رہی ہو، لیکن عوامی پذیرائی اور ہمہ گیری میں خلافت کمیٹی کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ عوامی پیمانے پر تنظیم میں کانگریس کو سب سے بڑی مدد خلافت کمیٹی ہی سے ملی اور ہر قسم کی مدد۔ خلافت کی حفاظت کا کام کرنے کے لیے مسلمانوں میں سے آدمی فوج در فوج نکلے۔ کوئی گھر ایسا نہیں رہا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی خلافت کا رکن نہ ہو۔ جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے جذبات و خیالات میں سب خلافتی تھے۔ خلافت کے فنڈ میں ہر جیب سے روپیہ آتا تھا، سرکاری ملازم کی، زمیندار کی، خطاب یافتہ کی، تاجر کی، کاشتکار کی، مزدور کی، سرمایہ دار کی، ہر مسلمان کی جیب۔

بے شک مسلمانوں میں بعض ایسے بھی تھے جو تحریک خلافت کے مخالف تھے مگر اصول یا اعتقاد کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی مجبوریوں اور مصالح کی بنا پر۔ تحریک خلافت کی تائید وحمایت میں رائے عامہ اس قدر طاقتور اور پرزور تھی کہ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جلسوں میں یا اخبارات میں اس کی مخالفت کرے۔ البتہ اس کی مثالیں بہت تھیں کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، مگر چھپ کر خلافت کمیٹی کو چندہ بھی بھیجتے ہیں اور اس سے معذرت بھی کرتے کہ مجبوریاں اور لاچاریاں ہیں، ان کی وجہ سے کھل کر سامنے نہیں آ سکتے۔

خلافت کے رضا کار، خلافت کے کارکن، خلافت کے لیڈر دکھاوے کے نہیں تھے، خودغرض نہیں تھے، ذاتی مفاد اور اغراض کے بندے نہیں تھے۔ اپنے جوش، کوشش، جدوجہد اور اعتقاد و عقائد کے اعتبار سے بالکل مجاہد تھے۔ اگر اس وقت دنیا ان کو میدان جنگ میں لے جاتا تو وہ مسلمانوں کی قدیم مجاہدانہ روایات زندہ کر دیتے۔ یہ جوش و جذبہ ان مسلمانوں میں کیسے پیدا ہوگیا، جن کو سرسیّد نے بڑی احتیاط کے ساتھ سیاست سے الگ رکھا تھا، جن کی تمام سرگرمیاں محض تعلیم تک محدود کر دی تھیں اور یہ کہا تھا: ''یاد رکھو، گورنمنٹ تم پر نہایت سخت نظر رکھے گی، کیونکہ تم بڑے مفسد، بڑے بہادر، بڑے سپاہی اور بڑے لڑنے والے ہو''۔

اسی فقرے سے ظاہر ہے کہ یہ محض عارضی پرہیز تھا جو سرسیّد نے اپنی قوم کے لیے اس غرض سے تجویز کیا تھا

کہ اس کے وہ زخم مندمل ہو جائیں جو 1857ء کے ہنگامے میں لگے تھے، ورنہ مسلمانانِ ہند کی قسمت بدلنا نہ سرسید کے پیشِ نظر تھا اور نہ یہ اس کے بس کی بات تھی۔

خلافت کانفرنس اور نیشنل کانگریس کا اشتراک

زمانہ بدلا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ (1911ء)، الحاقی یونیورسٹی کا چارٹر دینے سے حکومت کا انکار، مسجد کان پور کے معاملے میں انصاف پر برطانوی وقار کو ترجیح۔ انگریزوں کی ان نامعقول حرکتوں نے مسلمانوں کو ان سے پہلے ہی متنفر کر دیا تھا۔ اس کے بعد طرابلس اور بلقان میں ترکوں کے دشمنوں کے ساتھ سازشیں، پھر جنگ کے دوران مسلمانوں سے وعدے اور اختتام جنگ پر ان سے انحراف اور بالآخر ترکوں کا قتل عام کرنے کے لیے برطانیہ ہی کے بحری بیڑے کا یونانیوں کو سمرنا کے ساحل تک اپنی حفاظت میں لے کر آنا۔ قتل عام کی خبریں تمام دنیا کی طرح ہندوستان میں بھی شائع ہوئیں۔ مسلمانوں میں جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لیے یہ بہت تھا۔ اس پر خلافتی لیڈروں کی تقریریں، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا احمد سعید دہلوی، فاخر الٰہ آبادی، ہر ایک مولوی اور مولانا، ان کی زبانیں شعلے بھڑکا رہی تھیں اور انگارے برسا رہی تھیں۔ ایسے شعلہ بیان خطیب جو ''خلافت کانفرنس'' کے پلیٹ فارم پر آئے۔ پھر کبھی نہیں دیکھے گئے۔

ان ہی میں مولانا حسرت موہانی بھی تھے، جن کو آورد اور اہتمام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اختصار، سادگی ہر کام میں پسند، اس لیے ان کو خطیبوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاتا۔ مگر تقریر ایسی مدلل اور سیاسی نکات سے آراستہ کرتے تھے کہ اس کا ایک ایک فقرہ عوام سے زیادہ لیڈروں کے لیے بصیرت افروز ہوتا تھا۔ ایک اور شاعر جو کہتا ہی رہتا تھا اور کرتا کچھ نہ تھا، مگر ایسا کہتا تھا کہ خود اسی کے استعارے کے مطابق اس سے کبوتر اور فاختہ کے سینے میں شیر و شاہین کا دل پیدا ہوتا تھا۔ جنگ طرابلس کے آغاز کے ساتھ اس نے رجز خوانی شروع کی اور تمام عمر جاری رکھی۔ علامہ اقبال نے ایسی خوبی اور رعنائی سے اسلامی تصورات اور تمنائیں پیش کیں کہ وہ مسلمان جن میں زندگی کی صلاحیت باقی تھی، ہوش میں آ گئے اور بیدار ہو گئے۔ اس وقت سے قیام پاکستان تک مسلمانوں کی جتنی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان میں فکر اور جوش اور ولولے کا ضرور دخل رہا جو اقبال کی شاعری سے پیدا ہوا تھا۔

خلافت کمیٹی کا فیصلہ

''معاہدہ سیورے'' ہندوستان میں 14 مئی 1920ء کو شائع ہوا۔ اس معاہدے کی شرائط ایسی سخت اور بری تھیں کہ وائسرائے ہند کو بھی یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان پر مسلمانانِ ہند سے ہمدردی اور ان کو صبر و تحمل کی تلقین کریں۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کے نام ایک خصوصی پیغام شائع کرایا۔ یہ پیغام مسلمانانِ ہند کے زخموں پر نمک ثابت ہوا۔ 28 مئی کو بمبئی میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ اس میں گاندھی جی کے مجوزہ عدم تعاون کے پروگرام پر غور و بحث کے بعد قرار پایا کہ مسلمانوں کے مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ عدم تعاون ہے۔

30 مئی ۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور ترکی سے معاہدۂ صلح پر غور کرنے کے لیے بنارس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا۔ بڑی طویل بحث کے بعد اس میں یہ طے ہوا کہ عدم تعاون کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے نیشنل کانگریس کا خاص اجلاس طلب کیا جائے۔ کانگریس کے بعض مقتدر رہنماؤں کو اپنا قدیم آئینی طرز عمل ترک کرنے میں بڑا پس و پیش تھا۔

اس موقع پر گاندھی جی نے یہ طے کیا کہ عدم تعاون کا مسئلہ، جو ابھی تک محض خلافت سے متعلق تھا، ''ہندو آل پارٹیز کانفرنس'' میں پیش کیا جائے۔ یہ کانفرنس 2 جون کو الٰہ آباد میں منعقد ہوئی۔ اس نے باضابطہ عدم تعاون کی تجویز منظور کی اور اس غرض کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی کہ عدم تعاون کا لائحہ عمل مرتب کر کے تمام ملک میں اس کی اشاعت کرے۔ یہ کمیٹی مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھی: گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، حاجی احمد صدیق کھتری۔

تحریک خلافت کی تائید میں تقریریں کرنے پر مولانا محمد فاخرالہ آبادی اور مولانا سید احمد دہلوی کو سزائیں ہوئی تھیں اور لالہ امیر چند پشاوری نظر بند کئے گئے تھے۔ جلسے میں ان کے لیے مبارک باد کی قرارداد منظور کی۔ گاندھی جی نے اس اجلاس کے بعد وائسرائے کو خط لکھا جس میں اپنے تحریک عدم تعاون جاری کرنے کے عزم سے آگاہ کیا۔

18 جولائی کو ''خلافت کمیٹی'' کے زیر اہتمام لکھنؤ میں عدم تعاون کے لیے ایک عظیم جلسہ ہوا۔ گویا مسلمانوں کی تحریک خلافت ہندوؤں کی ''تحریک عدم تعاون'' کا جز بن گئی۔

ہجرت کی تحریک

مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا اور کسی نہ کسی صورت میں حکومت کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہتے تھے۔ جولائی 1920ء میں انہوں نے ہجرت کی تحریک شروع کر دی، اور سندھ میں اس کا بڑا زور تھا۔ کچا گڑھی (صوبہ سرحد) میں مہاجرین اور فوج کے درمیان سخت تصادم ہوا، جس سے مسلمانوں کا جوش اور بڑھا۔ تقریباً اٹھارہ ہزار آدمی، اپنا مال و متاع اور جائیدادیں فروخت کر کے افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے تھے، مگر افغانستان نے جلد ہی اپنی سرحد میں مہاجرین کا داخلہ بند کر دیا اور جان و مال کے زبردست نقصان کے ساتھ یہ تحریک ختم ہو گئی۔ بقول جناب سید حسن ریاض: ''اچھا ہوا، کہ ختم ہو گئی۔ بس یہی ایک اقدام تھا جو مسلمانوں نے بغیر سوچے سمجھے کیا''۔

خلافت کمیٹی نومبر 1919ء ہی میں یہ طے کر چکی تھی کہ گاندھی جی کے مشورے کے مطابق حکومت سے تعاون ترک کیا جائے۔ پھر متواتر اس نے اس فیصلے کی توثیق کی، کلکتے کے اجلاس میں، دوسرے مقامات پر اور بالآخر 17 اپریل 1920ء کو ''آل انڈیا خلافت کانفرنس'' کے اجلاس منعقدہ مدراس میں۔ اس معاملے میں مسلمانوں کو کوئی پس و پیش نہیں تھا۔ خلافت کمیٹی نے یکم اگست 1920ء کو تمام ملک میں ہڑتال کرائی اور گاندھی جی کو تحریک کا لیڈر قرار دیا۔ گاندھی جی نے اپنے تمام تمغے حکومت کو واپس کیے اور باضابطہ عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔ اس وقت سے گاندھی جی اور علی برادران نے ملک کا دورہ شروع کیا۔ اس دورے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے بڑھتے ہوئے جوش و جذبہ میں ضبط و نظم پیدا کیا جائے۔

نیشنل کانگریس اور عدم تعاون

کانگریس کا وہ خاص اجلاس جس کے متعلق بنارس میں طے ہوا تھا کہ طلب کیا جائے، 4 ستمبر 1920ء کو کلکتے میں منعقد ہوا۔ مسٹر سی آر داس سرکاری کونسلوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کے خلاف تھے، مگر پھر بھی سبجکٹس کمیٹی میں، سات رایوں کی اکثریت سے، گاندھی جی کی قرارداد منظور ہوگئی اور کھلے اجلاس میں، بہت بڑی اکثریت سے کانگریس کی اس نہایت اہم قرارداد میں خلافت کے مسئلے پر حکومت برطانیہ کی بدعہدیوں اور وعدہ خلافیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ قرار دیا گیا کہ ہر غیر مسلم ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ ہر جائز طریقے پر اس سعی میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرے جو مذہبی مصیبت ان کے سر پر آ گئی ہے، وہ دور ہو جائے۔ اس کے بعد یہ شکایت کی گئی کہ جن سرکاری عہدے داروں نے پنجاب میں مظالم کئے، اور ان کو بری کر دیا گیا۔ دار العلوم اور دارالامراء (برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوان) نے اپنی روش سے یہ ثابت کیا کہ ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے اور وائسرائے کا تازہ اعلان اس کا ثبوت ہے کہ خلافت اور پنجاب کے معاملے میں ان کو قطعی کوئی ندامت نہیں ہے۔ اس پر کانگریس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ جب تک ان مظالم کا مداوا نہیں کیا جائے گا، ہندوستان میں امن و سکون نہیں ہو سکتا، اور آئندہ مظالم کو روکنے اور قومی وقار و مفاد کا واحد اور موثر تقاضا یہ ہے کہ سوراج قائم ہو۔ قرارداد کا بقیہ حصہ عدم تعاون کے لائحہ عمل کی تفصیلات پر مشتمل تھا۔

کلکتے میں اگرچہ عدم تعاون کی قرارداد منظور ہوئی، مگر کانگریس میں ابھی خاصا عنصر تھا، جس کو یہ تحریک پسند نہ تھی۔ ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس (دسمبر 1920ء) منعقد ہوا۔ یہ اجلاس بڑا اہم تھا۔ جتنے لوگ اس اجلاس میں شریک ہوئے، اس سے قبل کبھی نہیں ہوئے تھے۔ تمام ارکان وفود کی تعداد چودہ ہزار 584 تھی جس میں ایک ہزار پچاس مسلمان تھے۔ 169 خواتین تھیں۔ کانگریس کے بڑے پرانے لیڈر روجے راگھوا چاریہ، جن کی علمی عظمت کی بڑی شہرت تھی، اس اجلاس کے صدر تھے۔ اس کانگریس کے فیصلوں پر اگر تمام دنیا کی نہیں تو ہندوستان و برطانیہ کی نظر ضرور تھی۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی کے چند سرکردہ لیڈر اس اجلاس میں شرکت کے لیے انگلستان سے آئے تھے۔

سی آر داس جو تحریک عدم تعاون کے خلاف تھے، کمر بستہ ہو کر آئے کہ کلکتہ کے فیصلے کو الٹ دیں گے۔ ان کے ساتھ 450 نمائندے تھے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر نے یہ کمال کیا کہ سی آر داس کی رائے بدل دی اور اس حد تک کہ کھلے اجلاس میں عدم تعاون کی قرارداد سی آر داس ہی نے پیش کی۔ مسٹر بپن چندر پال، پنڈت مدن موہن مالوی، کھاپرڈے اور محمد علی جناح عدم تعاون کے خلاف تھے۔ جناح صاحب نے قرارداد کی مخالفت میں بڑی پرزور اور مدلل تقریر کی کہ اجلاس پر سناٹا چھا گیا۔ گاندھی جی نے جناح صاحب کے دلائل کا جواب دینے کے لیے مولانا محمد علی کو دعوت دی۔ مولانا محمد علی نے بڑی بلند آہنگ تقریر کی۔ اپنے اپنے رنگ میں یہ دونوں ہم نام ہندوستان کے عظیم مقرر تھے۔ مگر تقریر اور استدلال کی وجہ سے نہیں، اس وقت ملک کا ماحول اور اجلاس کا مزاج عدم تعاون کی تائید میں تھا، اس لیے دلائل پر جذبات غالب آ گئے۔ محمد علی جناح اجلاس کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکے اور اسی وقت سے ان کے اور کانگریس کے درمیان مفارقت ہوگئی۔

اس اجلاس میں کانگریس کا عقیدہ اس حد تک بدلا گیا کہ "برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کے تعلق" کے قرارداد احتجاج میں "آئینی طریقوں" کی پابندی اس سے خارج کردی گئی۔ مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی اسی ہفتے کے اندر ناگپور میں ہوئے۔ خلافت کانفرنس کے صدر مولانا عبدالماجد بدایونی تھے۔ عدم تعاون کے متعلق خلافت کانفرنس کو کچھ نہیں کہنا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کو قبول کرچکی تھی اور عملاً اس کی تعمیل میں مصروف تھی۔ البتہ اس کی قوت میں اب بہت اضافہ ہوگیا۔ صرف گاندھی جی بہ حیثیت لیڈر نہیں، بلکہ پوری کانگریس اور اس کے ساتھ ہندو قوم، خلافت کمیٹی کی حلیف بن کر، میدان میں آگئی۔

خلافت کانفرنس اور نیشنل کانگریس کا اشتراک

خلافت کانفرنس اور نیشنل کانگریس کے اشتراک سے عدم تعاون کی تحریک زلزلے اور طوفان کی طرح چلی۔ "الیکشن میں ووٹ نہ دو" اس اپیل کا ایسا اثر ہوا کہ بیلٹ بکس خالی پڑے رہے اور پولنگ بوتھ ویران۔ جن جن خلافتی اور کانگریسی امیدواروں نے اپنی الیکشن مہم پر ہزاروں روپیہ خرچ کردیا تھا، انہوں نے اپنے نام واپس لے لیے۔ عدالتوں اور کالجوں کے بائیکاٹ میں اگرچہ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، تاہم لوگوں کے دلوں سے انگریزی عدالتوں کا وقار جاتا رہا۔ بہت سے وکیلوں اور بیرسٹروں نے پیشہ ترک کردیا اور تحریک میں شریک ہوگئے۔ بہت سے طلبہ نے تعلیم ترک کردی اور قومی تحریک میں رضاکارانہ کام کرنے لگے۔ صرف ایک شہر کلکتہ میں تین ہزار طلبہ نے (جنوری 1921ء) اپنے کالج چھوڑے، اور ان کے لیے وہاں نیشنل کالج قائم کیا گیا۔ ایسے ہی قومی کالج دوسرے مقامات پر بھی قائم ہوئے۔ جیل جانے اور گولی کھانے میں مسلمانوں کا قدم ہندوؤں سے بہت آگے تھا۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریک عدم تعاون کی تمام قوت مسلمانوں کے طبعی جوش و جذبے سے تھی۔

ناگپور اجلاس کی قرارداد میں کانگریس نے "خلافت" کے ساتھ "سوراج" کو بھی عدم تعاون کے مقاصد میں داخل کرلیا اور خلافت کانفرنس کا پروگرام بالکل ایک تھا، مگر ترکوں اور یونانیوں کی جنگ کے معاملے میں خلافت کمیٹی اس میں یہ اضافہ کرتی تھی۔ سمرنا کے مظلومین کے لیے چندہ کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے بائیکاٹ کے پروگرام کے مطابق ولایتی کپڑے جلائے جاتے تھے۔ مسلمان اپنے ولایتی کپڑے مظلومین سمرنا کو بھیجتے تھے۔

وہ جنگیں جو اناطولیہ، سمرنا اور تھریس میں ہورہی تھیں، مسلمانان ہند کو اپنے گھروں کے صحن میں محسوس ہوتی تھیں اور ان کے اچھے اور برے نتائج سے وہ جذباتی طور پر اتنے ہی متاثر ہوتے تھے، جتنے خود ترک ہوں گے، مگر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستانی مسلمان میدان جنگ میں ترکوں کے دوش بدوش تو نہیں لڑ سکتے تھے، البتہ ترکوں کی فتح کے لیے دعائیں کرتے، اور ان کی حمایت کی پاداش میں گولیاں کھاتے اور جیلوں میں جاتے تھے۔ ہر معرکے سے پہلے ہندوستان کی مسجدوں اور میدانوں میں لاکھوں مسلمان دعا کے لیے جمع ہوتے تھے، جس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے اور ان عظیم اجتماعات میں پرزور قراردادیں پاس کرکے اور پرجوش تقریریں کرکے اتحادیوں پر، اور خصوصاً برطانیہ پر اخلاقی دباؤ ڈالتے تھے کہ "معاہدہ سیورے" تبدیل کریں اور یونانیوں کی طرف داری بند۔ جولائی 1921ء میں عسکی شہر پر ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی۔ پھر افیوم قرا حصار پر۔ اس کے بعد

تقریباً ایک سال میدان جنگ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

ہندوستان کی بے اسلحہ جنگ کا منظر مختلف تھا۔ سکولوں، عدالتوں اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے علاوہ سب سے زیادہ اہم، اور برطانیہ کے لیے وحشت ناک، پرنس آف ویلز کی آمد کے سلسلے میں جو تقریبات ہونے والی تھیں، ان کا بائیکاٹ تھا۔ حکومت برطانیہ نے تحریک عدم تعاون کا زور دیکھ کر نئی اصلاحی کونسلوں کے افتتاح کی رسم ڈیوک آف کناٹ کے ذمے کر دی جو شاہ انگلستان کے چچا تھے۔ بہر حال تقریبات اور مراسم ان کی آمد پر بھی ہونی تھیں۔ خلافت کانفرنس نے ہندوستانیوں کو ہدایت کی کہ ان سب کا بائیکاٹ کریں اور وہ کیا گیا۔

جلیانوالہ باغ، امرتسر میں مظالم ڈھانے والے جنرل ڈائر کو اگرچہ برخاست کر دیا گیا تھا، اس کی وجہ سے وہ پنشن سے محروم ہو گیا تھا۔ مگر انگریز عورتوں نے اس کو اپنی جان اور آبرو کا محافظ قرار دے کر، ہندوستان میں بیس ہزار پونڈ کی رقم چندے سے جمع کی اور اپنی طرف سے بطور ہدیہ اس کو پیش کیا۔ مزید برآں ہندوستان اور انگلستان میں عوامی تقریب کے ساتھ جنرل ڈائر کو تلوار پیش کی گئی اور اس طرح اس کو ہیرو قرار دیا گیا۔ کرنل جانسن کو بھی، جس نے جنرل ڈائر ہی کی طرح پنجاب میں مظالم کئے تھے۔ برخاست کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ہندوستان میں کوئی پرائیویٹ تجارتی ملازمت دے کر خوش اور مطمئن کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیوک آف کناٹ کی نرم و شیریں گفتگو سے اگر کوئی اچھا اثر مرتب ہونے والا تھا بھی، تو وہ ضائع ہو گیا۔

علی برادران کی گرفتاری

ناگپور میں خلافت کانفرنس نے بعض نہایت اہم قرار دادیں منظور کی تھیں۔ حکومت برطانیہ یونانیوں کی نہایت طرف دار تھی اور اب یونانی ترکوں کے مقابلے میں جگہ جگہ شکست کھا رہے تھے۔ خلافت کانفرنس نے یہ قرار داد منظور کی کہ مسلم ممالک میں ہندوستانی فوجیں نہ بھیجی جائیں۔ سندھ اور صوبہ سرحد میں تحریک خلافت کو دبانے کے لیے حکومت سخت تشدد کر رہی تھی۔ اس کے خلاف اظہار مذمت کیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ تحریک خلافت کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کیا جائے اور یہ کہ رضا کاروں کے جیش بھرتی کیے جائیں۔

ناگپور کے سالانہ اجلاس سے چھ ماہ بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ 28 تا 30 جولائی بمبئی میں ہوا۔ اس میں ولایتی کپڑے کے ان تاجروں سے جو کپڑا درآمد کرتے تھے، اپیل کی گئی کہ غیر ممالک سے کپڑا منگانا بالکل بند کر دیں اور ولایتی کپڑے کے جو ذخائر ان کے پاس ہیں، انہیں ہندوستان سے باہر فروخت کرنے کی کوشش کریں۔

دوسری نہایت اہم قرار داد یہ تھی کہ ہر شہری کا یہ فطری حق ہے کہ اس بات پر اظہار رائے کرے کہ سرکاری ملازمین کے لیے یہ مناسب ہے یا نہیں کہ وہ سول یا فوجی ملازمت ترک کریں، اور یہ کہ ہر شہری کا یہ فطری حق ہے کہ ہر سپاہی یا عام شہری سے برملا یہ اپیل کرے کہ وہ ایسی حکومت سے اپنا تعلق منقطع کرے، جس نے ہندوستانی آبادی کی عظیم اکثریت کی تائید اور اس کا اعتماد کھو دیا ہے۔

شراب نوشی کے خلاف بھی پروپیگنڈا جاری تھا اور اس کے ساتھ احتجاجی مظاہرے بھی۔ حکومت نے احتجاجی

مظاہروں کو روکا اور بعض مقامات پر ہنگامہ وفساد کی نوبت آئی۔حکومت کی طرف سے بڑا اشتعال دیا گیا اور لوگوں نے بڑے صبر وضبط سے کام لیا، پھر بھی کہیں کہیں لوگوں سے کچھ زیادتی ہوگئی۔اسی بہانے سے حکومت نے جبر وتشدد شروع کردیا،خصوصاً یوپی بہت ہی سخت اور وسیع پیمانے پر۔کئی مقامات پر فائرنگ کی نوبت آئی اور لوگ زخمی ہوئے۔بہت سے پہلے ہی جیل میں تھے اور انہوں نے اپنے مقدمات کی پیروی نہیں کی تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے استبداد کا مقابلہ کرنے کے لیے لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ سول نافرمانی کی جائے،لیکن کانگریس نے (فی الحال) اسے ملتوی رکھا۔

علی برادران کی معافی کا افسانہ

اپریل 1921ء میں لارڈ چمسفورڈ گئے اور ان کی جگہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند ہوکر آ گئے۔یہ بڑے تیز اور ہوشیار آدمی تھے۔ڈپلومیسی یا چکمہ دینے کے فن میں ماہر۔پنڈت مدن موہن مالوی نے گاندھی جی سے لارڈ ریڈنگ کی ملاقات کا انتظام کیا۔لارڈ ریڈنگ نے بڑی ہوشیاری اور ڈپلومیسی سے گاندھی جی کو یہ باور کرایا کہ ان کا اور ان کے طریق کار کا ان کے دل میں بڑا احترام ہے اور عدم تشدد کے معاملے میں وہ ان کو مخلص سمجھتے ہیں۔انہوں نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ وہ عدم تعاون کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں گے۔مگر باتوں باتوں میں انہوں نے گاندھی جی سے یہ بھی کہہ دیا کہ علی برادران کی بعض تقریریں ایسی ہوئی ہیں جن سے ''تحریک عدم تعاون'' سے متعلق گاندھی جی کے خیالات ونظریات کا بطلان ہوتا ہے۔علی برادران کی بعض تقریریں دکھا کر وائسرائے نے یہ کہا کہ ان کو ایسے معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ گویا یہ تشدد کے لیے لطیف اور نازک اشارہ ہیں۔گاندھی جی نے یہ قبول کرلیا کہ ہاں ان تقریروں کو غلط معنی پہنائے جاسکتے ہیں اور گاندھی جی نے علی برادران کو لکھا کہ آپ وائسرائے کی اس غلط فہمی کی تردید کردیں۔علی برادران نے گاندھی جی کے کہنے سے یہ اعلان کردیا کہ ہمارا یہ ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ تشدد کے لیے لوگوں کو اشتعال دلائیں۔

چالاک وائسرائے نے فوراً علی برادران کے اس بیان پر اظہار اطمینان کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ انہوں نے ان تقریروں پر علی برادران کے خلاف مقدمہ چلانے کا یہ خیال ترک کردیا ہے۔اس اعلان کے ساتھ ہی اینگلو انڈین اخبارات نے وائسرائے کی فتح کے شادیانے بجانے شروع کردیئے۔علی برادران کے نام فوراً مولانا حسرت موہانی کا تار پہنچا،جس کا مضمون یہ تھا:

> ''اگر مسٹر گاندھی نے تم کو اس کی اطلاع دی تھی کہ وائسرائے تمہارے خلاف مقدمہ چلانے والے ہیں اور ایسا بیان دینے پر ارادہ ترک کردیں گے تو تم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں کہ تم نے یہ بیان دیا، اور اگر وائسرائے نے مسٹر گاندھی سے یہ کہا تھا اور انہوں نے تم کو اس کی اطلاع نہیں دی تو ان سے زیادہ بے ایمان کوئی نہیں''۔

واقعی وائسرائے نے ملاقات کے دوران میں ان تقریروں کی بناء پر مقدمہ چلانے کا قطعی ذکر نہیں کیا تھا۔خود گاندھی جی نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا۔حکومت کی طرف سے نہایت سخت پروپیگنڈے کے باوجود کہ علی

برادران کے اس بیان کو ''معافی نامہ'' قرار دیا جائے، مسلمانوں کے دل میں علی برادران کے خلاف کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوئی، اور نہ ان کی وقعت و تکریم کم ہوئی۔ البتہ یہ سب کو نظر آ گیا کہ گاندھی جی نے لارڈ ریڈنگ کی ڈپلومیسی سے دھوکا کھایا۔ لارڈ ریڈنگ عوام کی نظر میں علی برادران کو بے وقعت کر کے تحریک عدم تعاون کے ساتھ ساتھ تحریک خلافت کی بھی جان نکالنا چاہتے تھے۔

علی برادران کی گرفتاری

انگریزوں کو احتجاج تو کسی کا بھی پسند نہ تھا، لیکن خلافت کمیٹی اور اس میں بھی علی برادران کی سرگرمیوں سے وہ بہت بے زار تھے۔ حکومت کا رعب اور خوف بالخصوص مسلمانوں کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا تھا اور ان کی مجاہدانہ فطرت میدان کا مطالبہ کر رہی تھی۔ 8 جولائی 1921ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر صدر تھے۔ جتنی جرأت اور شجاعت ان کی طبیعت میں تھی، وہ سب انہوں نے اپنی اس تقریر میں بھر دی۔ خوب صاف صاف باتیں کیں، مگر پھر بھی اس میں تشدد کے لیے اشتعال نہیں دلایا گیا تھا، پانچ سو علماء کا فتویٰ کانفرنس میں پڑھا گیا۔ مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر کے ساتھ اس کی تائید کی۔ خود مولانا محمد علی نے ایک قرارداد پیش کی۔ اس میں مسلمانوں کے مطالبات کے اعادے کے بعد یہ کہا تھا کہ:

> آج سے فوج میں نوکری کرنا یا رنگروٹوں کی بھرتی میں مدد دینا ہر مومن مسلمان کے لیے حرام ہے اور یہ بھی کہ اگر حکومت برطانیہ نے حکومت انقرہ سے جنگ کی تو مسلمانانِ ہند سول نافرمانی کریں گے۔ مکمل آزادی قائم کریں گے اور احمد آباد کے اجلاس کانگریس میں ہندوستانی جمہوریت کا جھنڈا بلند کریں گے۔

مولانا محمد علی کی اس قرارداد کی تائید میں مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد اور مولانا نثار احمد کانپوری نے بھی تقریریں کیں۔ حکومت نے مولانا محمد علی کی اس تقریر کو مقدمہ چلانے کے لیے منتخب کیا۔ مولانا محمد علی سیاسی دورے پر تھے اور آسام سے مدراس جا رہے تھے۔ ان کو ایک اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا۔ یہ ستمبر 1921ء کی بارہ تاریخ تھی۔ حکومت نے چوبیس گھنٹے تک گرفتاری کی خبر کو دبائے رکھا۔ تمام ملکوں میں سیاسی تاروں کا سلسلہ بند رہا۔ کئی روز مولانا کو حوالات میں رکھا گیا۔ پھر ایک روز رہائی کا حکم سنا کر فوراً دوبارہ گرفتار کیا گیا اور کراچی پہنچا دیا گیا۔ مولانا شوکت علی بمبئی میں گرفتار ہوئے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، جگت گرو شری شنکر اچاریہ آف سرداپیٹ، مولانا نثار احمد کانپوری، پیر غلام مجدد اور مولانا حسین احمد مدنی سب مختلف مقامات سے گرفتار ہو کر کراچی آئے۔

گاندھی جی نے مولانا محمد علی کی خبر ترچنا پلی میں سنی۔ انہوں نے اسی روز مولانا کی کراچی والی تقریر ایک جلسۂ عام میں پڑھی اور تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ جلسوں میں خلافت کانفرنس کراچی کی قرارداد کا اعادہ کریں۔ مولانا محمد علی کی تقریر جگہ جگہ علی الاعلان پڑھی گئی اور قرارداد ہزار ہا پلیٹ فارموں سے دہرایا گیا۔ نیشنل کانگریس کی مجلس عاملہ نے 5 اکتوبر کو بمبئی سے مندرجہ ذیل بیان شائع کیا:

> ''یہ قومی وقار اور قومی مفاد کے خلاف ہے کہ کوئی ہندوستانی کسی حیثیت سے ایسی گورنمنٹ کی

ملازمت میں رہے، جس نے فوجی سپاہیوں کو اور پولیس کو قوم کی جائز تمناؤں کے پامال کرنے میں اس طرح استحصال کیا ہو، جس طرح رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے دوران میں کیا گیا، اور جس نے مصریوں، ترکیوں، عربوں اور دوسری اقوام کی قومی سپرٹ کے کچلنے کے لیے ہمارے سپاہیوں سے کام لیا''۔

کراچی کا مقدمہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں عظیم مقدمہ ہے۔ جیوری کے سامنے مولانا محمد علی نے مسلسل دو روز تقریر کی۔ یہ فصاحت و بلاغت اور دلائل و براہان سے پُر بڑی عظیم اور یادگار تقریر تھی۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انہوں نے مسلم سپاہ کو حکومت کی اطاعت سے ورغلانے کے لیے سازش کی۔ جیوری میں ایک یورپین اور دو عیسائی تھے۔ تینوں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ یہ جرم مولانا محمد علی اور ان کے رفقا پر ثابت نہیں ہوا۔ البتہ دوسری دفعات کے تحت دو سال کی قید با مشقت کی سزا سب کو دی گئی۔ جس وقت مولانا محمد علی کی وہ تقریر شائع ہوئی جو انہوں نے جیوری کے سامنے کی تھی، تراط کے خطاب کے بعد یہ دوسرا خطاب ہے۔

سول نافرمانی کی تحریک

خلافت کمیٹی اپنے ناگپور کے اجلاس ہی میں رضا کاروں کی بھرتی کا فیصلہ کر چکی تھی اور وہ بھرتی ہو رہے تھے اور حکومت ان کے متعلق یہ کہتی تھی: ''وہ فوجی طریق کے ہیں۔ قواعد پریڈ کرتے ہیں۔ جمعیت و تربیت کے ساتھ مارچ کرتے ہیں اور وردیاں پہنتے ہیں''۔ کانگریس کے بھی رضا کار تھے، مگر وہ یونہی بھگت قسم کے، تیرتھوں میں، میلے ٹھیلوں میں اور گنگا اشنان پر ہندوؤں کی خدمت کانفرنسوں اور جلسوں میں انتظام ان کا کام تھا۔ پرنس آف ویلز کی آمد (نومبر 1921ء) کی آمد کے ساتھ رضا کاروں کی بھرتی اور تنظیم و تربیت نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ خلافت اور کانگریس کے رضا کاروں نے باہم مل کر ہڑتالیں کرائیں اور ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کے پروگرام کی تعمیل کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔ 5 نومبر کو کانگریس کمیٹی نے اپنے دہلی کے اجلاس میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ سول نافرمانی کریں اور سول نافرمانی کرنے والوں کے لیے اس نے اعتقادی اور عملی شرائط بھی متعین کر دی تھیں۔ خلافت کانفرنس اور کانگریس کا پروگرام بالکل ملا جلا رہتا تھا۔ سول نافرمانی کے لیے دونوں جماعتوں کے رضا کار مل گئے اور ایسے جوش و ہمت سے انہوں نے سول نافرمانی کی کہ ان سے جیل خانے بھر گئے۔ چند ماہ کے اندر سول نافرمانی کے اسیروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

جب سے انگریزوں نے بجائے کلکتہ کے دہلی کو دارالحکومت بنایا تھا، یہ وائسرائے کا معمول تھا کہ دسمبر کے دو تین ہفتے کلکتے میں بسر کرتا اور وہیں بڑا دن مناتا تھا۔ پرنس آف ویلز کو بھی بڑے دن پر (25 دسمبر) کلکتے پہنچنا تھا اور وہاں اس سلسلے میں تقریبات کا اہتمام تھا۔ حکومت بنگال نے، اسی خوف سے کہ رضا کار سول نافرمانی کریں گے، ضابطہ فوجداری کی ایک ترمیم کی رُو سے رضا کاروں کی بھرتی خلاف قانون قرار دے دی۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ مسٹر سی آر داس، ان کی بیوی اور بیٹا بھی ان ہی میں تھے۔ چند روز کے اندر پنجاب اور یو پی میں بھی رضا کاروں کی بھرتی اور رضا کاروں اور رضا کاروں کے جیش خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ دفعہ 144 اور

108 کے تحت بھی بڑی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ اس میں سر تیج بہادر سپرو حکومت ہند کے مشیر قانون تھے۔ یہ ان ہی کی کارگزاریاں تھیں کہ انہوں نے تعزیرات ہند کی یہ دفعات تلاش کر کے نکالیں اور حکومت کو مشورہ دیا کہ سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف ان دفعات کو استعمال کرے۔ اس کے باوجود سر تیج بہادر سپرو ہندوؤں کی نظر میں محب وطن اور قوم پرست ہی رہے۔ بہرحال، رضا کاروں اور لیڈروں کی اتنی گرفتاریاں ہوئیں کہ جیلوں میں جگہ نہ رہی۔

سمجھوتے کی کوشش

پنڈت مدن موہن مالوی پکے کانگریسی تھے، مگر خلافت تحریک سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی، بلکہ عدم تعاون کی تحریک سے بھی اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے۔ پنڈت مالوی اور محمد علی جناح 21 دسمبر 1921ء کو وفد کی صورت میں وائسرائے سے ملے، اور دونوں فریقوں کے درمیان گفت وشنید جاری ہوگئی۔ سی آر داس جیل میں تھے اور گاندھی جی احمد آباد میں۔ اہل وفد نے دونوں سے ٹیلیفون پر گفتگو کی اور حکومت اس پر رضا مند ہوگئی کہ سول نافرمانی کے قیدی رہا کئے جائیں۔ گول میز کانفرنس منعقد ہو، اور نئی آئینی اصلاحی سکیم پر غور کرنے کے لیے اس میں کانگریس کے 22 نمائندے شریک ہوں۔ مسٹر سی آر داس، نے یہ مطالبہ کیا کہ ترمیم ضابطہ فوجداری کے تحت جتنے آدمی گرفتار ہوئے ہیں، سب رہا کئے جائیں۔ اس صورت میں علی برادران، کراچی کے قیدی، ور اس فتوے کے سلسلے میں جو لوگ گرفتار ہوئے تھے، جس پر پانچ سو علماء کے دستخط تھے، وہ سب رہا نہ ہوئے۔ گاندھی جی نے ان سب کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ کراچی کے اسیروں کی رہائی پر حکومت کسی حد تک رضا مند تھی، مگر گاندھی جی کے یہ دو مطالبے حکومت نے منظور نہیں کیے کہ فتوے کے سلسلے میں جو لوگ قید ہوئے تھے، وہ بھی رہا کئے جائیں اور احتجاج جاری رکھنے کا حق تسلیم کیا جائے۔ وائسرائے کے جواب سے گاندھی جی کو مطلع کیا گیا اور انہوں نے تار ہی پر اس کا جواب دیا۔

پرنس آف ویلز کی آمد پر کلکتہ میں ایسی مکمل ہڑتال ہوئی کہ قصابوں تک نے اپنی دکانیں بند رکھیں۔ انگریزوں کو بڑے دن پر گوشت نہ ملا اور اس پر ان کو بڑا غصہ تھا۔ تاہم ہندوستان میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ کیا گیا اور کامیاب رہا۔ یہی زمانہ کانگریس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں کا تھا۔ یہ اجلاس احمد آباد میں منعقد ہو رہے تھے۔ کانگریس کے صدر سی آر داس منتخب ہوئے وہ جیل میں تھے۔ خلافت کانفرنس کے صدر حکیم اجمل خان تھے اور مسلم لیگ کے صدر مولانا حسرت موہانی۔

تحریک خلافت اور تحریک آزادی

گاندھی جی نے اپنی تحریک عدم تعاون کو مسلمانوں کی تحریک خلافت سے وابستہ کر کے دونوں تحریکوں کو انگریزوں سے آزادی کی تحریک کا رخ دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس ضمن میں ہرگز مخلص نہیں تھے۔ اس کا ثبوت مولانا حسرت موہانی کا وہ بیان ہے جو انہوں نے ''پاکستان ناگزیر تھا'' کے مصنف سید حسن ریاض کو دیا اور سید

صاحب نے اپنی اس تصنیف میں درج کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ انہی دنوں تینوں بڑی جماعتوں یعنی نیشنل کانگریس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس بیک وقت احمد آباد میں ہو رہے تھے۔ کانگریس کے اجلاس کے صدر سی آر داس منتخب ہوئے جو اس وقت جیل میں تھے۔ خلافت کانفرنس کے صدر حکیم اجمل خان تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مولانا حسرت موہانی۔

احمد آباد میں مولانا حسرت موہانی یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ ہر جماعت میں "آزادیٔ کامل" کی قرارداد منظور کرائیں گے۔ انہوں نے خود بیان کیا کہ تمام عمر میں ہم نے اتنی محنت کبھی نہیں کی تھی، جتنی آزادی کی قرارداد کے لیے احمد آباد میں کی۔ ہم نے کانگریس کے وفود کے ہر ہر کیمپ میں جا کر تقریریں کیں اور ہر صوبے کے نمائندے ہم سے متفق تھے۔

جب گاندھی جی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت گھبرائے اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے پاس انہوں نے فریاد کی کہ اب تک جو کیا ہے، اس سب کو بھائی حسرت برباد کیے دے رہے ہیں، آپ ان کو سمجھائیے۔ گاندھی اس سے واقف تھے کہ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالباری کے والد سے بیعت تھے اور اہل طریقت سجادہ نشین کا حکم اسی طرح مانتے ہیں جس طرح پیر کا، اس لیے گاندھی جی کو یقین تھا کہ وہ مولانا عبدالباری کے حکم سے سرتابی نہ کریں گے۔

مولانا عبدالباری نے مولانا حسرت موہانی کو بلایا اور کہا: "حسرت تم یہ کیا کر رہے ہو۔ گاندھی جی کو تم سے بڑی شکایت ہے"۔

اس پر مولانا حسرت نے جواب دیا: "آپ ایک وقت مقرر کر کے گاندھی جی کو اپنے ہاں بلا لیجیے۔ میں آپ کی موجودگی میں ان سے گفتگو کروں گا۔ اگر آپ دیکھیں کہ میں حق پر ہوں تو میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ مجھے کرنے دیجیے، ورنہ گاندھی جی مجھے سمجھا دیں گے کہ میرا طرز عمل غلط ہے"۔

مولانا عبدالباری مرحوم نے گاندھی جی اور مولانا حسرت کو بلایا اور دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ مولانا حسرت نے گاندھی جی سے پوچھا: "آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا: "یہ کہ آپ کانگریس اور خلافت کانفرنس میں یہ قرارداد پاس کرانا چاہتے ہیں کہ ان دونوں جماعتوں کا نصب العین حصول آزادی ہے"۔

مولانا حسرت موہانی نے کہا: "اگر ان دونوں جماعتوں کا نصب العین آزادی نہیں، تو اور کیا ہے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا: "سوراجیہ"۔

مولانا حسرت بولے: "سوراجیہ کوئی مسلمہ سیاسی اصطلاح نہیں ہے۔ آپ جس سیاسی حالت کو چاہیں، سوراجیہ کہہ سکتے ہیں۔ آپ سوراجیہ کی یہ تعریف کر دیں کہ وہ کامل آزادی کے ہم معنی ہے، میں اس کو قبول کر لوں گا"۔

گاندھی جی نے جواب دیا: "میں سوراجیہ کی یہ تعریف نہیں کر سکتا"۔

مولانا حسرت نے پوچھا: "آپ کو آزادی کے نصب العین سے کیوں اختلاف ہے"۔

گاندھی جی نے کہا: ''ملک ابھی آزادی کے لیے تیار نہیں ہے''۔

اس پر مولانا حسرت بولے: ''جتنا ملک آج تیار ہے، ایسا کبھی نہیں ہوگا''۔

گاندھی جی نے مولانا حسرت کی بات سے اتفاق نہ کیا اور سوراجیہ پر زور دیتے رہے۔ بالآخر مولانا حسرت نے کہا: ''مہاتما جی میں جانتا ہوں کہ آپ صرف ڈومینین سٹیٹس (دولت مشترکہ کے اندر رہتے ہوئے خود مختاری) چاہتے ہیں تاکہ انگریزوں کی سنگینوں کے زور سے مسلمانوں پر حکومت کریں۔ میں مسلمانوں کو ان کے دو پاٹوں کے بیچ میں ہرگز نہ پسنے دوں گا''۔

اس پر گاندھی جی حیرت سے بولے: ''بھائی حسرت یہ بات اس سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں کہی''۔

مولانا حسرت نے جواب دیا: ''اب میں کہہ رہا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر ہم مسلمان کامل آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے تو آپ اس کی مخالفت کریں گے''۔

''ہاں بھائی حسرت، میں مخالفت کروں گا''۔ یہ کہہ کر گاندھی جی چلے گئے۔

خلافت کانفرنس کی سبجکٹس کمیٹی میں مولانا حسرت نے ''کامل آزادی'' کی قرارداد پیش کی اور منظور ہوئی۔ مگر صدر نے اسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی اجازت اس لیے نہ دی کہ خلافت کانفرنس کے قواعد وضوابط کے مطابق سبجکٹس کمیٹی میں وہ تہائی آراء کی اکثریت سے منظور نہ ہوئی تھی۔ اس قرارداد حمایت میں اگرچہ اکثریت تھی، مگر دو تہائی سے کم۔

نیشنل کانگریس کے اجلاس میں مولانا حسرت نے کانگریس کی خصوصی ''قرارداد'' کی ترمیم کے طور پر یہ قرارداد اپنی طرف سے پیش کی کہ کانگریس کا نصب العین ''کامل آزادی'' ہو۔ بہت سے نمائندوں نے اس کی تائید میں تقریریں کیں۔ گاندھی جی مولانا حسرت کی تائید میں اس قدر جوش دیکھ کر جھلا گئے اور اس کے خلاف انہوں نے بڑے سخت لہجے میں تقریر فرمائی:

> ''آپ میں سے بعض نے جیسے سبک طریقے پر اس تجویز کو لیا ہے، اس سے مجھ کو صدمہ ہوا۔ مجھ کو غم اس وجہ سے ہوا کہ اس سے غیر ذمہ داری ظاہر ہوئی۔ ذمہ دار مردوں اور عورتوں کی حیثیت سے ہم کو کلکتہ اور ناگپور کے (اجلاس کے) زمانے کی طرف واپس جانا چاہیے۔ دنیا کا وہ حصہ جو سوچتا ہے، ہم پر یہ الزام عائد کرے گا کہ ہم اس سے بھی واقف نہیں کہ حقیقت میں ہم کیا ہیں۔ ہم کو اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کو بھی سمجھنا چاہیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کامل اور ناقابل شکست اتحاد ہونا چاہیے۔ آج یہاں کون ہے جو اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دے کہ ہاں ہندو مسلم اتحاد ہندوستانی قومیت کا ناقابل شکست عنصر ہو گیا ہے۔ یہاں وہ کون ہے جو مجھے یہ بتائے کہ سکھ، عیسائی اور یہودی اور یہ اچھوت اس خیال کی مخالفت نہ کریں گے''۔

اور پھر آزادی کامل اور مولانا حسرت کی مجوزہ ترمیم کے خلاف گاندھی جی نے جو سب سے بڑی دلیل پیش کی

، وہ یہ تھی:

''ہمیں سب سے پہلے اپنی طاقت کو مجتمع کرنا چاہیے۔ ہمیں سب سے پہلے اپنی گہرائیوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔ ہمیں اس پانی میں نہیں اترنا چاہیے جس کی گہرائی سے ہم واقف نہیں ہیں اور مولانا حسرت موہانی کی ترمیم آپ کو اس گہرائی میں لئے جا رہی ہے جس کی پیمائش نہیں ہوسکتی''۔ مولانا حسرت موہانی کی مجوزہ ترمیم مسترد ہوگئی۔

مولانا حسرت موہانی نے صدر کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ صدارت پڑھا اور اس میں وہ سب کچھ کہا، جو ان کے جی میں تھا۔ کامل آزادی اور انگریزوں کے مقابے میں گوریلا جنگ۔ وہ گرفتار ہوئے اور دو الزامات کی بناء پر ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے۔ ایک ملک معظم کی حکومت کے خلاف جنگ کرنا اور دوسرا بغاوت و رشورش کی ترغیب دینا۔ پہلے الزام میں بیس سال کی اور دوسرے الزام میں تین سال کی سزائے قید با مشقت کا حکم ہوا اور وہ یرودہ جیل بھیج دیئے گئے۔ اسی جیل میں انہوں نے یہ مشہور شعر کہا تھا:

اک طرفہ تماشا ہے، حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

بی اماں کا کردار

تحریک خلافت میں علی برادران کی والدہ نے جو کردار ادا کیا، اسے فراموش کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ قوم نے ''ام الاحرار'' کے خطاب سے نوازا۔ بیٹوں نے بوا کہا۔ پوتوں اور پوتیوں نے ''بی اماں'' کہا اور پھر وہ پوری قوم کی بی اماں بن گئیں۔ ان کا اصل نام آبادی بیگم تھا۔ 1852ء میں امروہہ ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے دادا، پردادا شاہان دہلی کے دربار میں وزارت کے منصب پر فائز تھے۔ جب 1857ء کی جنگ آزادی چھڑی تو آپ پانچ سال کی تھیں۔ آپ کے خاندان کے ڈھائی سو مردوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا، بلکہ کئی سو مردوں کو دہلی میں پھانسی پر لٹکا دیا جو بہادر شاہ ظفر کی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑنے میں مصروف تھے۔ پھانسی دینے کے بعد ان کے سر کاٹ کر دہلی کے ''خونی دروازے'' پر لٹکا دیا گیا۔ آبادی بیگم کے سگے ماموں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے آپ کے والد بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور وہ اہل خانہ کے ساتھ رام پور چلے آئے۔

رام پور میں قیام کے دوران آبادی بیگم کی شادی ناگپور کے ایک غیر سیاسی خاندان کے فرد، ایک مقتدر افسر عبدالعلی خان سے ہوئی جس سے ایک بیٹی اور پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ بدقسمتی سے رام پور میں چیچک کی وبا پھیل گئی اور آپ کے شوہر 1880ء میں اس بیماری سے چل بسے اور یوں آبادی بیگم صرف 28 برس کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ بڑے بوڑھوں کے اصرار کے باوجود آپ دوسری شادی پر رضا مند نہ ہوئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا، جن میں سب سے چھوٹا محمد علی صرف دو سال کا تھا۔ ان بچوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا آپ کا سب سے بڑا خواب تھا۔ جلد ہی آپ کا بڑا بیٹا ذوالفقار علی انگریزی سکول میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ اب بی اماں نے اپنے دوسرے بیٹے شوکت علی کو اسی انگریزی سکول میں بٹھانا چاہا تو آپ کے دیور اور مالی سرپرست نے یہ

کہہ کر انکار کر دیا کہ "ہمارے خاندان میں ایک ملحد کافی ہے" لیکن بی اماں نے اس فیصلے کو سختی سے رد کر دیا۔ دوسرے ہی دن اپنا بچا کھچا زیور گروی رکھ آئیں اور شوکت علی کی تعلیم کا بندوبست کیا۔

جس زمانے میں تحریک خلافت عروج پر تھی اور بی اماں کے دو بیٹے محمد علی اور شوکت علی پورے ملک میں "علی برادران" کے نام سے شہرت حاصل کر چکے تھے تو اس وقت آپ 80 سال کی بڑھیا ہو چکی تھیں لیکن اس وقت بھی آپ کا عزم جوان تھا۔ آپ نے کئی اہم موقعوں پر اپنے گرفتار بیٹوں کی نمائندگی کی۔ مثلاً آپ نے 1913ء میں کلکتہ میں منعقدہ، آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور اپنے بیٹے محمد علی جو ہر کی نمائندگی کی جو اس وقت جیل میں تھے۔ یوں تو آپ نے برقع اتارے بغیر ہی اجلاس سے خطاب کیا، لیکن آپ پہلی مسلمان خاتون تھیں، جنہوں نے پہلی بار کسی مردانہ جلسے سے خطاب کیا۔

جس زمانے میں علی برادران جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے تو بی اماں، جو ضعیفی اور علالت کی وجہ سے بستر سے قدم بھی نہیں نکال سکتی تھیں، مردانہ وار اٹھ کھڑی ہوئیں اور دلیرانہ انداز میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور تحریک خلافت کے لیے چندہ جمع کیا۔ سفر کے دوران جب آپ کو بتایا گیا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں نے یہ قبول کر لیا ہے کہ انہوں نے ہی مسلمانوں کو بغاوت پر ابھارا ہے اور یہ کہ وہ برٹش حکومت سے معافی مانگنے پر تیار ہیں تو بی اماں نے بیٹوں کے نام فوراً خط لکھا کہ "ابھی میرے بوڑھے ہاتھوں میں اتنی سکت ضرور باقی ہے کہ تم دونوں کا گلا گھونٹ سکوں اور اگر تم نے معافی مانگی تو میں واقعی تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی"۔

اسی زمانے میں سہارن پور کے ایک گمنام شاعر منشی نور محمد نے چھ بندوں پر مشتمل ایک نظم "صدائے خاتون" تحریک کی، جس کے یہ بول پورے ہندوستان کا نعرہ بن گئے:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا، خلافت پہ دے دو
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پہ چڑھنا
جان بیٹا، خلافت پہ دے دو

ستمبر 1921ء میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور کچھ دوسرے مسلمان رہنماؤں کو حکومت نے گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا۔ اس مقدمے کی سماعت کراچی کے خالق دینا ہال میں ہوئی۔ نومبر 1921ء میں مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں کو دو دو سال قید با مشقت کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ اقبال سہارن پوری کی نظم "صدائے مظلوم" بھی عوام میں بے حد مقبول ہوئی، جس کا مطلع تھا:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

بی اماں کو لفظ "آزادی" سے کس قدر لگاؤ تھا، اس کا اندازہ آپ کے اس خطاب سے کیا جا سکتا ہے جو آپ

نے جامعہ ملیہ کے بھرے جلسہ عام سے کیا تھا۔ آپ نے کہا: ''آج میں اپنا برقع پھینک کر آپ لوگوں کے سامنے آئی ہوں، کیونکہ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے۔ میں آزادی کا وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں، جب لال قلعے سے یونین جیک اتر آئے اور اس کی جگہ مسلمانوں کا پرچم لہراتا نظر آئے جسے برٹش راج نے اتار پھینکا تھا''۔

11۔ مارچ 1924ء کو بی اماں کو اپنی پیاری پوتی آمنہ بنت محمد علی کی ناگہانی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ وہ اپنی بہو امجدی بیگم کو دلاسہ دیتے دیتے خود ہی 13 نومبر 1924ء کو، ترکی میں خلافت کے خاتمے اور ہندوستان میں تحریک خلافت کے انجام کا غم برداشت کرتے ہوئے، خالق حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔

تحریک خلافت کی ناکامی

4 فروری 1922ء کو موضع ''چورا چوری'' (ضلع گورکھ پور) میں ایک مشتعل ہجوم نے ایک تھانے کو آگ لگا دی، جس میں پانچ چھ سپاہی جل کر راکھ ہو گئے اس واقع کو آڑ بنا کر گاندھی نے سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت ایک ہی تحریک کے دو رخ تھے، اس لیے تحریک عدم تعاون کے خاتمے سے تحریک خلافت بھی بہت متاثر ہوئی۔ برٹش حکومت مسلمانوں کی تحریک خلافت کے آگے جھکنے ہی والی تھی کہ گاندھی جی نے ہندوؤں کی تحریک عدم تعاون اچانک بند کر کے گویا تحریک خلافت کو بغلی گھونسا مارا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا، کس لیے کیا، اس کی تفصیل گاندھی جی کے دست راست پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی ''خودنوشت'' میں یوں بیان کی ہے۔

پنڈت نہرو کا بیان

''گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک اچانک ختم کر دی۔ سب حیران رہ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چورا چوری گاؤں کے قریب کچھ لوگوں نے ایک پولیس چوکی کو آگ لگا دی تھی اور اس میں پانچ چھ پولیس والے جل گئے تھے، حالانکہ جب پورے ہندوستان میں عدم تعاون کی تحریک اپنے شباب پر تھی، حکومت بھی گھٹنے ٹیکنے ہی والی تھی کہ گاندھی جی نے ساری امیدیں خاک میں ملا دیں۔ ہم جیل میں سخت رنجیدہ ہوئے۔ ہمیں بہت غصہ آیا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ایک معمولی واقعے کی آڑ لے کر گاندھی جی لاکھوں آدمیوں کی زندگی سے کھیل گئے۔ ہر شخص نے ان کی اس حرکت کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ اگر ان کے نزدیک اہنسا کا یہی مطلب ہے تو پہلے انہیں ہندوستان کے تیس کروڑ انسانوں کو تربیت دینا چاہیے تھی، تاکہ ایک آدمی بھی تشدد پر مائل نہ ہو، پھر ایسے خفیہ پولیس والوں سے باز پرس کا انتظام بھی ہونا چاہیے تھا، جو لوگوں کو تشدد کی ترغیب دیتے ہیں یا ان میں شامل ہو کر خود ہی ایسے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگر اہنسا (عدم تشدد) سے یہی مراد ہے تو ایک دن بھی یہ تحریک نہیں چل سکتی۔۔۔۔۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ فروری 1922ء میں گاندھی جی نے محض چورا چوری گاؤں کے واقعے کی وجہ سے عدم تعاون کی تحریک بند نہیں کی

یہ تو ایک بہانہ تھا۔ گاندھی جی لوگوں کے احساسات سے کھیلتے ہیں اور اپنے عمل سے مخالفین اور ششدر رہ جانے والے ساتھیوں کو دلائل کا سہارا لے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ پردہ پوشی بڑی بھدی ہوتی ہے، جیسا کہ چورا چوری گاؤں کے واقعے کے بعد ہوا۔ اس تحریک کو یوں ایک دم ختم کر دینے اور میدان سے ہٹ جانے کا نتیجہ آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں نکلا۔۔۔۔۔ (مسلمان) موپلاؤں کو غیر معمولی طریقے سے کچلا گیا۔ ان کا قتل عام کیا گیا، یہاں تک کہ ریل کے بند ڈبوں میں موپلے قیدی مار ڈالے گئے اور پھر اسے غلط رنگ دے کر ان واقعات سے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام لیا گیا۔ ظاہر ہے، اگر سول نافرمانی کی تحریک ختم نہ کی جاتی تو فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہوتی نہ فرقہ وارانہ فسادات کی راہ ہموار ہوتی جس نے آگے چل کر مستقل صورت اختیار کر لی''۔

پنڈت نہرو کو گاندھی جی کے ساتھ رہنے اور کانگریس کی اندرونی سیاست کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بوڑھا جو کچھ کہتا ہے، مصلحت آمیزی سے کہتا ہے اور دانستہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور، لیکن خود پنڈت نہرو بھی اپنے تبصروں اور اعلانات میں ''مصلحت'' ہی کی وجہ سے برملا یہ نہیں کہہ سکے کہ یہ تحریک عدم تعاون کو اچانک ختم کرنے کا فیصلہ دراصل کامیاب ہوتی ہوئی تحریک خلافت کو اوندھے منہ گرانا تھا۔ یہ تمام عیاری اور ڈپلومیسی ہندو مذہب کو غالب کرنے اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے تھی

خلافت کا خاتمہ

3 مارچ 1921ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ خلافت اسلامیہ کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان میں تحریک خلافت نے خود بخود دم توڑ دیا۔ جب مختلف جیلوں سے مسلمان قید با مشقت کاٹ کر رہا ہوئے تو پورے ہندی مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں پر انتہائی پژمردگی اور پریشانی کا عالم طاری تھا۔ جن لوگوں نے اپنے کاروبار اور اپنی سرکاری ملازمتیں چھوڑی تھیں، اپنا سب کچھ خلافت فنڈ کے لیے لٹا دیا، وہ اب بے نیل و مرام لوٹ رہے تھے اور مجبوری کے سبب خلافت فنڈ سے امداد کے خواہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے اور سرگرم کارکن تہی دست ہونے کے بعد آہستہ آہستہ تحریک کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ مولانا شوکت علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

> ''جب کوئی بڑی تحریک شروع ہوئی ہے تو اس میں کچھ خراب لوگ بھی گھس آتے ہیں اور پیسے میں بھی خرد برد ہوتی ہے۔ میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب سے یہ تحریک شروع ہوئی، اس وقت سے جیل جانے کے دن تک میں نے صرف دو ہزار پانچ سو روپے خرچ کیے ہیں اور آپ جانتے ہیں اتنا چندہ تو بمبئی سے چند منٹ میں وصول کر سکتا تھا اور کر لیتا تھا۔ مجھے امید ہے کہ کانفرنس اس سلسلے میں تحقیق کرے گی اور پریشان حال مسلمانوں کی کچھ مدد کرے گی''۔

مرکزی خلافت کمیٹی کے صدر اور خزانچی سیٹھ محمد احمد چھوٹانی، وہ کروڑ پتی جس نے ہمیشہ تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور علی برادران کے ساتھ مل کر کام کیا تھا، وہ ایک ایک کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ آخری عمر میں وہ

حج کرنے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ وہ جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ دوسرے قائد مولانا محمد علی جوہر قبلۂ اول بیت المقدس میں دفن ہوئے۔

تحریک خلافت کے ایک اور رہنما مولانا ظفر علی خان نے تحریک کو پنجاب میں مقبول بنانے میں بڑا اہم کام کیا تھا۔ ان کا اخبار "زمیندار" ولولہ انگیز تحریروں اور سچے جذبات سے معمور نظمیں مسلمانوں میں انقلابی جذبہ پیدا کرتی تحیں۔ وہ ستمبر 1920ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں شمولیت کے بعد واپس آ رہے تھے تو انہیں لاہور میں گرفتار کر لیا گیا اور ایک باغیانہ تقریر کے الزام میں مقدمہ چلا کر پانچ سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ مولانا صاحب نے قید بامشقت کا زمانہ منٹگمری (ساہیوال) جیل میں گزارا۔ وہ جب جیل سے رہا ہو کر آئے تو ملک کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ شدھی اور سنگھٹن جیسی دل آزار تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ کئی شہروں میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آریہ سماجیوں نے لوگوں کے جذبات مشتعل کر دیئے تھے۔ دوسری طرف خلافت کی قبا چاک ہو چکی تھی۔ پنجاب کی خلافت کمیٹی آگے چل کر "مجلس احرار" بن گئی۔

خلافت اسلامیہ کے مفکر اعظم اور شاعر مشرق علامہ اقبال انگریزوں کی مکارانہ وعیار سیاست اور ترکی کے نامساعد حالات سے ایک حد تک باخبر تھے، اس لیے انہوں نے جذبات کی آندھی سے خود کو بچائے رکھا۔ ان کا ذہن گہرائی میں سوچنے کا عادی تھا۔ ان کی نظر ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست پر بھی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمانان ہند کس قدر کمزور ہیں اور کس طرح انگریز اور ہندو کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہے ہیں، لہٰذا وہ خلافت اسلامیہ کے حامی ہونے کے باوجود گاندھی اور مولانا محمد علی کی ہندوستانی تحریک خلافت کے ہم نوا نہ تھے۔ بلکہ مسلمان رہنما جب ایک وفد لے کر یورپ گئے اور انگریزوں سے خلافت قائم رکھنے کے لیے اصرار کیا تو علامہ اقبال نے ایک قطعہ کہا جس کا عنوان "دریوزۂ خلافت" تھا۔ ملاحظہ کیجئے:

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم، جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ، وہ بادشاہی
"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

تحریک کی ناکامی کے اثرات

تحریک خلافت پر بے شمار اعتراضات کئے گئے۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ایک غیر ملکی (بلکہ بیرونی) مسئلے میں دلچسپی لے کر مسلمانوں کی قوت اور وسائل ضائع کئے، لیکن یہ ایک بالکل لغو اور بے ہودہ اعتراض ہے، کیونکہ خلافت کوئی غیر ملکی اور بیرونی مسئلہ نہیں تھا۔ اسلام کا واضح اعلان ہے کہ اگر کسی مسلمان بھائی کو کوئی تکلیف پہنچے تو دوسرے بھائی کا فرض ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرے۔ اسلام میں

''امہ'' کا تصور اقوام، ممالک اور اوطان سے ماوراء ہے، خود ترکوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تحریروں اور تقریروں نے ہمیں غیرت دلائی کہ ہم اپنے وطن کی آزادی کی قدر کریں۔

تحریک خلافت نے مسلمانوں میں زبردست سیاسی شعور پیدا کیا۔ ہندوستانی مسلمان، جنہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد، اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ''حکومت سے وفاداری'' سے کیا تھا، اس تحریک کی بدولت اس قابل ہوئے کہ انگریزوں کی وفاداری کا طوق اپنی گردن سے اتار سکیں۔ تحریک خلافت نے مسلم ''وفاداری'' کے مفروضے کو ختم کر دیا اور برطانوی حکومت کا رعب دلوں سے محو کر دیا۔ حکومت سے عدم تعاون کر کے جیل جانا ایک قومی اعزاز قرار پایا۔

تحریک خلافت نے مسلمانوں کو سیاسی حکمت اور احتجاج کی تربیت دی۔ تحریک کے سبب پرانی ڈرائنگ روم سیاست اور انگریز حکومت کے حضور عرض داشتیں، میمورنڈم اور رزولیوشن پیش کرنے کی روایت ختم ہو گئی۔ اب درخواستوں کی جگہ ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں نے لے لی، اور تحریک نے مسلمانوں کے ''انتہا پسند'' اور ''وفادار طبقے'' کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ بظاہر مولانا محمد علی اور سر آغا خان یا سیّد امیر علی اور ڈاکٹر انصاری میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی، لیکن اگر وفادار طبقہ لندن کے اخباروں میں خلافت کے حق میں مضامین تحریر کر رہا تھا تو انتہا پسند طبقہ سیاسی احتجاجی مظاہرے کر رہا تھا، کیونکہ دونوں کے مقاصد یکساں اور مشترک تھے۔

تحریک خلافت نے مسلمانوں کو تحریک پاکستان کے لیے تیار کیا تھا۔ قائد اعظم کی آواز پر پوری مسلم قوم، جس عظیم معرکے کے لیے تیار ہوئی، وہ تحریک خلافت ہی کا نتیجہ تھا۔ تحریک پاکستان کے صف اول اور صف دوم کے تمام لیڈر تحریک خلافت کے لیڈر اور کارکن رہ چکے تھے۔ ان میں مولانا شوکت علی، نواب اسماعیل خان، مولانا حسرت موہانی، چودھری خلیق الزماں، عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا اکرم خان، سردار عبدالرب نشتر، سر عبداللہ ہارون، سیّد رؤف شاہ، مولوی اے کے فضل الحق اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

تحریک خلافت کی بدولت طلباء اور علماء نے سیاست میں حصہ لینے کی روایت قائم کی۔ علماء اپنے مدارس اور حجروں سے نکل کر میدان سیاست میں وارد ہوئے، اور آج تک سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ طلباء و علماء کے سیاست میں حصہ لینے کے جو روایت خلافت کمیٹی سے قائم ہوئی، وہ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ابھی تک جاری ہے اور تمام برعظیم پاک و ہند کے تعلیمی نظام اور ہر طالب علم کی تعلیمی زندگی پر اپنا منحوس اثر ڈال رہی ہے''۔

تحریک خلافت نے مسلمانوں میں حکومت سے آزاد قومی تعلیم کا شعور پیدا کیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی درسگاہ ''جامعہ ملیہ'' تحریک خلافت ہی کی یادگار ہے۔ جامعہ ملیہ کے علاوہ برعظیم میں جو سینکڑوں دیگر مدارس قائم ہوئے، ان میں مدرسہ اسلامیہ کلکتہ، نیشنل کالج پٹنہ اور قومی سکول دہلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تحریک عدم تعاون اور ترک موالات کے زمانے میں ابتدائی مدارس کی سطح سے جامعہ ملیہ تک 1922ء میں 1340 قومی سکول اور کالج قائم کیے گئے، جن میں اٹھانوے ہزار 182 طلبہ زیر تعلیم تھے۔ ان آزاد تعلیمی اداروں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ نے نہایت معمولی مشاہروں پر کام کر کے ایثار و قربانی کے چراغ روشن کیے۔

تحریک خلافت نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کر کے انہیں مربوط و منظم کیا۔ بمبئی کے "خلافت ہاؤس" سے جو آواز بلند ہوتی اس کی بازگشت پشاور، کلکتہ، مدراس، رنگون اور دہلی میں سنی جاتی تھی۔

"تحریک خلافت" کی بدولت ہندوستانی مسلمانوں کو "مغرب زدگی" سے نجات ملی۔ وہ لوگ جو لندن اور پیرس کے سلے ہوئے سوٹ پہننے پر فخر کرتے تھے، انہوں نے وہ سوٹ نذر آتش کر کے کھدر کے کپڑے پہن لیے۔ بڑے بڑے نوابوں نے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کو خیرباد کہہ کر اپنی مرضی سے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی۔ مولوی مظہر الحق جن کا مکان شاہی محل سے کم نہ تھا، انہوں نے "صداقت آشرم" کی کٹیا میں رہنا پسند کیا۔

سیاسی شعور ہی نہیں، بلکہ سیاسی جوش و خروش بھی مسلمانوں میں پیدا ہوا، جس نے ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مسلمان اب تک کانگریس سے الگ تھے، لیکن تحریک خلافت کے دوران انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر کے اسے ایک عوامی جماعت بنا دیا۔ بقول ڈاکٹر امید کر "کانگریس کو فی الحقیقت عظیم اور قوت ور جماعت بنانے والے ہندو نہیں، بلکہ مسلمان تھے"۔

تحریک خلافت کا ایک نتیجہ بقول نواب احمد سعید چھتاری یہ نکلا کہ انگریزوں کے دماغ سے دعویٰ خدائی بہت حد تک دور ہو گیا اور ان کے مزاج میں اعتدال پیدا ہوا۔

تحریک خلافت کا باب مکمل کرنے میں جن کتب سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

تحریک کا ایک نتیجہ بریلوی تحریک کی صورت میں نمودار ہوا جس کا آغاز 1920ء سے ہوا جب گاندھی نے عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔ اس تحریک کے بانی مولانا احمد رضا خان بریلوی ہیں جن کو ان کے عقیدت مند "اعلیٰ حضرت" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اہل سنت کے اس گروہ کو "حزب الاحناف" بھی کہا جاتا ہے یہ اگرچہ الگ فرقے کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن بعض مسائل میں دوسرے مسالک سے اختلاف کی بنا پر ان کا الگ تشخص قائم ہو گیا۔ یہ اسلاف میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خیالات سے متفق ہیں اور محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید کے بعض افکار کے خلاف ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے یہ حنفی ہیں اور بنیادی طور پر وہابی اور دیوبندی مسلک کے ردعمل کے طور پر ایک تحریک کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔

بریلوی تحریک کا آغاز "جامعہ منظر الاسلام" بریلی سے ہوا۔ جس کی بنیاد اعلیٰ حضرت نے ڈالی تھی۔ بریلی کے بعد اس تحریک کا دوسرا بڑا مرکز مراد آباد تھا۔ جہاں 1910ء میں شیخ محمد نعیم الدین مراد آبادی نے "دار العلوم نعیمیہ" کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کی۔

صحیح معنوں میں بریلوی تحریک کا آغاز 1920ء سے ہوتا ہے۔ جب گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔ اعلیٰ حضرت نے اس سے اختلاف کیا اور مسلمانوں کو اتحاد کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ ان کے معتقدین نے "جماعت رضائے مصطفیٰ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد آل

انڈیا سنی کانفرنس'' کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ جس کا دوسرا نام ''جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ'' رکھا گیا۔

1940ء میں قرارداد پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی بریلوی تحریک اپنے زوروں پر آ گئی۔ چنانچہ 1946ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا چار روزہ اجلاس (27 تا 30 اپریل) بنارس میں منعقد ہوا۔ جس میں متفقہ طور پر مطالبہ پاکستان کی حمایت کی گئی۔

سیاسی محاذ سے قطع نظر بریلوی تحریک کا تشخص بطور مسلک بھی کیا جاتا ہے۔ آزاد خیالی، فطرت پسند اور سائنٹفک طرز فکر بریلوی حضرات کے نزدیک مردود ہے۔ خصوصاً وہ ندوۃ العلماء، دیوبند اور علی گڑھ جیسی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہابی، نجدی اور دیوبندی ایک ہی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ انھیں اہل سنت سے نہیں گردانتے اور اکثر اوقات ان عقائد کے حامل افراد پر فتوی کفر بھی صادر کیا گیا ہے۔

برعظیم پاکستان و بھارت میں ان کی سینکڑوں درسگاہیں ہیں۔ جن میں سے اکثر اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے ناموں سے منسوب ہیں۔ لاہور میں جامعہ نظامیہ رضویہ جامعہ نعیمیہ اور دارالعلوم انجمن حزب الاحناف، کراچی میں دارالعلوم امجدیہ اور جامعہ تبلیغیہ، ملتان میں مدرسہ انوار العلوم، فیصل آباد میں مدرسہ مظہر الاسلام اور جامعہ رضویہ، مراد آباد (بھارت) میں جامعہ نعیمیہ اور بریلی میں مدرسہ منظر الاسلام قابل ذکر ہیں۔

بریلوی عقائد سے دیگر مسلمان اختلاف رکھتے ہیں۔ خصوصاً دیوبندی عقائد کی رو سے یہ بدعتیں ہیں اور قابل مذمت ہیں جبکہ بریلوی حضرات کے نزدیک یہ ایمان کا جزو اور عین اسلام ہیں۔ عقائد میں بریلوی تقلید کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک عقائد صرف وہی ہو سکتے ہیں، جو قدیم مجتہد نے وضع کیے تھے۔ غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے۔ مجتہد امام کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک عقائد کے لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسالک ایک ہیں۔ ان میں فرق صرف فروعی مسائل میں اختلاف سے ہے۔

بریلوی عقائد میں توحید سے مراد اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اس کے محبوب پیغمبر آخر الزماں آنحضور ﷺ کی عزت وعظمت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم بالذات ہے اس کے بتائے بغیر کسی کو ایک حرف کا علم بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا علم اس کی صفت ہے اور واجب ہے۔ وہ ہر ترکیب زمان ومکاں اور ہر عیب سے پاک ہے۔ وہ ہر چیز کا ہمیشہ سے جاننے والا ہے۔ اس کا علم واجب اور قدیم ہے۔

انبیائے کرام رب کا آئینہ ہیں۔ آواز اور زبان ان کی ہوتی ہے اور کلام رب کا ہوتا ہے۔ عام انبیاء مرد اور بشر تھے۔ جن فرشتہ، عورت وغیرہ نبی نہیں ہوتے۔ نیز نبی ہمیشہ اعلیٰ خاندان سے اور عالی نسب ہوتا ہے اور نہایت عمدہ اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ نبوت عطائے الہی ہے کوئی شخص اپنی عبادات اور اعمال سے نبوت کا درجہ نہیں پا سکتا۔

آنحضور ﷺ آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد نبوت کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا۔ آنحضور ﷺ انسانوں میں سے تھے۔ مگر مظہر نور خدا تھے۔ اس لیے آپ ﷺ کو بشر کہنا یا بھائی یا برابری کے لقب سے پکارنا حرام ہے۔ آپ ﷺ بشر ظاہر تھے اور یہ بشریت دوسروں سے مختلف تھی۔ آپ ﷺ کے جسم مبارک کا سایہ تک نہ تھا۔ آپ ﷺ کا علم

ساری خلقت سے زیادہ ہے۔ آپ ﷺ کو حقیقت روح اور متشابہات قرآن کا بھی علم عطا ہوا تھا۔ نیز آپ ﷺ کو لوح محفوظ پر لکھے ہوئے تمام واقعات کا بھی علم تھا۔ آپ ﷺ تمام مخلوق الٰہی میں بڑے عالم ہیں۔ آپ ﷺ کے کسی وصف پاک کو دنیٰ چیزوں سے تشبیہ دینا یا ان کے برابر بتانا صریح توہین ہے اور یہ کفر ہے۔ آنحضور ﷺ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ روز قیامت آپ ﷺ شفاعت کریں گے۔ نیز اس دنیا میں بھی آپ ﷺ مسلمانوں کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ آپ ﷺ سے مدد مانگنا اور یا رسول اللہ کا نعرہ لگانا جائز ہے۔

اولیائے کرام نور خدا سے دیکھتے ہیں۔ انھیں بالواسطہ انبیائے کرام سے بہت علوم غیب ملتے ہیں۔ وہ درجے میں نبوت سے کم ہوتے ہیں لیکن ان سے بھی معجزات اور کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ ان کی کرامات موت کے بعد بھی بدستور رہتی ہیں۔ وہ بھی حاضر و ناظر ہوتے ہیں اور ان سے بھی مدد مانگی جاتی ہے۔ اگرچہ حقیقی مدد خدا سے مانگی جاتی ہے لیکن اولیاء انھی کے مظہر ہیں اور مدد مانگتے ہوئے انھیں وسیلہ بنایا جاتا ہے۔

صوفیاء اور اولیاء امت کے ستون ہوتے ہیں۔ چالیس ابدال ہر وقت دنیا میں موجود ہوتے ہیں جو آفتوں کو ٹالتے رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے خلق کی حیات روزی اور تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔

بدعت دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ بدعت حسنہ کی تین اقسام جائز مستحب اور واجب ہیں۔ اسی طرح بدعت سیئہ کی دو اقسام ہیں۔ مکروہ اور حرام مثلاً فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا اور عمدہ عمدہ کھانوں میں وسعت کرنا جائز ہے۔ مسافر خانوں اور مدرسوں کا بنانا مستحب ہے۔ علم نحو کا سیکھنا اور اصول فقہ کا جمع کرنا واجب ہے اور مسجدوں کو فخریہ زینت دینا مکروہ اور جبریہ مذہب اختیار کرنا حرام ہے۔

بریلویوں کے نزدیک جائز امور میں بلند آواز سے درود شریف پڑھنا ذکر کرنا اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دینا، نیاز دینا، ان سے مدد مانگنا، ایصال ثواب کرنا بدنی اور مالی عبادات دوسرے مسلمانوں کو بخشنا، فاتحہ، تیجہ، چالیسواں وغیرہ کرنا، میت کے لیے دعا کرنا، خواہ وہ نماز جنازہ سے پہلے ہو یا تدفین کے بعد ہو، جنازے کے آگے کلمہ طیبہ یا درود شریف پڑھنا میت کے ساتھ بزرگان دین کے تبرکات غلاف کعبہ، شجرہ یا عہد نامہ رکھنا، تدفین کے بعد اذان دینا، پختہ قبر بنانا اولیاء اور مشائخ کے مزار بنانا، قبروں پر پھول چڑھانا اور چراغ جلانا، اولیاء اللہ کے نام پر جانور پالنا، عبدالنبی یا عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا، اچھے اچھے کھانوں پر ختم دلانا اور گیارھویں شریف وغیرہ کا ختم دلانا شامل ہیں۔

مستحب امور میں محفل میلاد منعقد کرنا، ولادت پاک ﷺ کی خوشی منانا، اس کے ذکر کے موقع پر خوشبو لگانا، گلاب چھڑکنا، شیرینی تقسیم کرنا، غرضیکہ خوشی کا اظہار کرنا، اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا، ان کے تبرکات لباس اور بال وغیرہ کو بوسہ دینا اور ان کی تعظیم کرنا، مؤذن کے اشہدان محمد الرسول اللہ کہنے پر سننے والوں کا دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا شامل ہیں۔

انڈونیشیا کی احیائی تحریکیں

ستر ہزار جزائر پر محیط اور 24 کروڑ نفوس سے زیادہ آبادی پر مشتمل اس عجیب و غریب ملک میں بھی برعظیم پاک و ہند کی طرح اسلامی احیائی تحریکوں کی تاریخ مغربی استعمار سے نجات پانے والی آزادی کی تحریکوں سے جڑی ہوئی ہے۔ مسلم ممالک میں مغربی استعمار کے ہر قدم آنے کا سبب ہی یہ تھا کہ مسلم بادشاہتوں اور سلطنتوں میں اسلامی احکام و شعائر سے غفلت برتنے کے باعث زوال آ چکا تھا۔ قوموں کا زوال اور ضعف ہی غیر ملکی استعمار کو مداخلت کی ترغیب دیا کرتا ہے۔ جب ولندیزی تاجر شرق الہند میں داخل ہوئے تو یہاں سماٹرا اور جاوا میں کئی مسلم سلطنتیں، بالخصوص آچے، ماترم، دمرا، پالم بانگ اور دیماک کی مسلم سلطنتیں اپنی عظمت و طاقت کے لیے بہت مشہور تھیں۔ ان سلاطین کو پرتگال اور انگریز تاجروں کی جارحیت اور چیرہ دستیوں کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اس لیے ولندیزیوں کی آمد سے وابستہ خطرات و خدشات کا اندازہ کر لینا زیادہ مشکل نہ تھا۔ اگر انڈونیشی جزائر کے حکمران متحد و متفق ہو کر ولندیزیوں کا مقابلہ کرتے اور باہمی رقابت اور عداوت سے مغلوب ہو کر ولندیزیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار نہ ہوتے تو انڈونیشیا کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی لیکن یہ حکمران اور سلاطین اتنے کج اندیش اور نااہل تھے کہ خود اپنے لیے اور اپنے ملک و قوم کے مفادات کی حفاظت کے لیے بھی متحد نہ ہو سکے۔ اس اختلاف و انتشار کی حالت میں یہ ممکن نہ تھا کہ انڈونیشی حکمران ولندیزیوں جیسی باہمت، بامقصد اور منظم قوم کا مقابلہ کر سکتے جن کے پاس طاقتور بحری بیڑہ تھا، جدید جنگی اسلحہ تھا، تربیت یافتہ فوج تھی، اور جو قومی مفاد کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرتے تھے۔ کسی ملک کے عوام اس کی بہت بڑی طاقت ہوتے ہیں، لیکن مشرق کے دوسرے ممالک کی طرح انڈونیشی عوام میں بھی نہ تو سیاسی شعور تھا اور نہ وہ ملکی اور ملی مفاد کے تصور سے آشنا تھے۔ حکومت و سلطنت میں نہ تو عوام کا کوئی حصہ تھا اور نہ ان کے مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی تھی۔

محبان وطن کا فیصلہ

انڈونیشی حکمرانوں کی نااہلی اور زبوں حالی کے باوجود انڈونیشیا ایسے افراد کے وجود سے کبھی خالی نہ تھا، جو اپنے مذہب، آزادی اور ملک و ملت کے مفاد کی حفاظت کے لیے ہر حال میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور دشمن خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نہ صرف تجارت و معیشت بلکہ حکومت و سیاست پر بھی قابض ہو گئے اور اپنے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر عیسائیت کی جبری تبلیغ بھی کرنے لگے تو محب وطن انڈونیشی حضرات نے یہ محسوس کر لیا اور ولندیزیوں کی غلامی، ظلم و تشدد اور سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے مقابلہ جوئی اور جنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ انڈونیشیا کے

مرکزی اور بڑے جزائر میں تحریکیں شروع ہوئیں جو مدت تک جاری رہیں۔

تحریک مجاہدین

اس وقت سب سے اہم مسئلہ ولندیزی فتوحات کو روکنا تھا اور ولندیزیوں کے خلاف وہی جنگ نتیجہ خیز ہو سکتی تھی، جس میں انڈونیشی عوام بھی جوش و خروش سے حصہ لیتے۔ ولندیزی اقتدار سے آزادی اور مذہب (اسلام) دونوں کو خطرات لاحق تھے اور اس سے عوام بھی متاثر تھے، اور ان خطرات کا مؤثر اور ہمہ گیر مقابلہ کرنے کے لیے انڈونیشیا میں سب سے پہلے جو تحریک نمودار ہوئی، وہ ولندیزیوں کے خلاف جہادی تحریک تھی، اور ہندوستان میں سید احمد شہید (شہادت 1831ء) کی تحریک مجاہدین کی معاصر تحریک تھی۔ اس تحریک کی قیادت ایسے لوگوں نے کی جو عوام میں بہت محبوب و محترم تھے، ان بزرگوں کے تذکرے کے بغیر یہ سلسلہ تحریر تشنہ رہے گا۔

امام بونجول (Imam Bondjol)

تحریک مجاہدین کا آغاز سماٹرا میں ہوا۔ اس کے بانی اور قائد امام بونجول تھے جو پیدے کے بہت مشہور اور باثر عالم دین تھے۔ امام بونجول 1774ء میں آچیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل میں بہت مشہور تھا اور خود انہوں نے ایک سید عالم اور فقیہ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ولندیزیوں کا بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر انہوں نے اپنے شاگردوں کی مدد سے ایک تحریک کو منظم کیا اور اس خیال کی اشاعت کرنے لگے کہ ولندیزیوں کو ملک سے نکالنے، مسلمانوں کے دینی شعائر کی حفاظت کرنے اور اسلام کا وقار بحال کرنے کے لیے جہاد لازمی ہے۔ امام بونجول نے اپنی تحریک کا مرکز ایک پہاڑی علاقے کو بنایا تھا جو اس قسم کی جہادی تحریک کے لیے بہت موزوں تھا۔ عوام کی بڑی تعداد امام بونجول کی ہم خیال بن گئی اور اس علاقے کے امراء و رؤسا بھی ان کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس طرح مجاہدین کی ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی۔

ولندیزی فوج نے اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے منگ کباؤ کے غیر مسلم حکمرانوں کی مدد سے اس علاقے میں فوجی اڈے بنانے شروع کر دیئے، لیکن امام بونجول نے ولندیزیوں کے حامی راجاؤں کو شکست دے کر، ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مجاہدین ایک بڑی ریاست کے مالک بن گئے، جس کا مستقر بونجول قرار دیا گیا، جو آگے چل کر سماٹرا کا ایک بڑا شہر بن گیا۔ اس تحریک کے حامیوں کا نعرہ یہ تھا:

"موت برحق ہے
اور مسلمان کے لیے بہترین موت
اسلام کے لیے جان دینا ہے"۔

امام بونجول نے مجاہدین کی فوج منظم کرنے کے بعد اپریل 1823ء میں ولندیزیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ یہ جنگ 1837ء تک جاری رہی۔ آخرکار امام بونجول کو شکست ہوئی اور وہ قید کر دیئے گئے، لیکن اس شکست سے یہ تحریک ختم نہ ہوئی اور امام بونجول کے ساتھیوں نے جنگ جاری رکھی۔ ولندیزیوں نے تحریک مجاہدین کو کچلنے کے لیے انتہائی ظلم و تشدد سے کام لیا۔ چنانچہ امام بونجول نے قید خانے میں مسلسل 27 سال تک شدید مصائب برداشت

گئے اور اسی قید کی حالت میں 1864ء میں وفات پائی۔ (ہندوستان آخری مغل بادشاہ کے زوال کے سات سال بعد!)

دیپونی گورو (Diponegoro)

مجاہدین کی یہ تحریک صرف سماٹرا تک محدود نہیں رہی، بلکہ جاوا میں بھی پھیل گئی۔ جاوا میں اس تحریک کے رہنما دیپونی گورو تھے، جن کا تعلق ماترم کے شاہی خاندان سے تھا اور اپنے عہد کے مشہور عالم دین اور مورخ تھے۔ وہ 1785ء میں ماترم میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش سلطان ساپوہ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی جو اسلامی شعائر کے بہت پابند تھے، اور سلطان ہی نے دیپونی گورو کے دل میں اولو العزمی اور اسلام کی خدمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ دیپونی گورو نے ولندیزیوں کا محکوم امیر بننے کی بجائے اسلام کا مبلغ اور مجاہد بننا پسند کیا اور اپنے بھائی کے حق میں تخت و تاج سے دست بردار ہو گئے۔ اب ان کا مقصد دین کی خدمت کرنا اور اپنے ملک کو ولندیزیوں کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ چنانچہ دیپونی گورو اپنے خیالات کی اشاعت کرنے لگے اور رفتہ رفتہ ایک تحریک منظم کر لی، جس کا نصب العین ''اسلام کے لیے جینا اور اسلام کے لیے مرنا'' تھا۔ اپنے اس مقصد کی اشاعت و تبلیغ کے لیے انہوں نے علماء کو ولندیزیوں کے سامراجی، مقاصد، جارحانہ پالیسی اور مغربیت کے زہریلے اثرات سے آگاہ کیا، اور اس کی وجہ سے قوم اور مذہب کو جو خطرات درپیش تھے، ان سے محفوظ رہنے کا پروگرام دیا۔

مذہب اور آزادی کے لیے جہاد کی تحریک کو منظم کرنے کے بعد دیپونی گورو نے 1825ء میں ولندیزیوں سے جنگ شروع کر دی۔ اعلانِ جہاد نے عوام میں زبردست جوش پیدا کر دیا، اور مجاہدین کا ایک زبردست لشکر تیار ہو گیا۔ اسلحے اور جنگی مہارت میں ولندیزیوں کو فوقیت حاصل تھی اور انہوں نے شدید مقابلہ کیا، لیکن وہ اپنی طاقت اور عسکری تربیت کے باوجود مجاہدین کی کثرت اور ان کے جوشِ جہاد سے خوف زدہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے سازشوں کا جال بچھا دیا، اور خاصی تعداد میں لوگوں کو دیپونی گورو سے منحرف کر دیا۔ عارضی پسپائی کے بعد مجاہدین نے پھر بڑی شدت سے حملہ کیا اور ولندیزی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ اب ولندیزیوں نے ایک طرف تو مجاہدین کے مقابلہ کے لیے بیرونی جزائر سے عیسائیوں کی بڑی فوج جمع کر لی اور دوسری طرف دیپونی گورو کے کمانڈروں میں اختلاف پیدا کر کے مجاہدین کی طاقت توڑ دی۔ 1830ء میں ولندیزیوں کی ایک سازش کامیاب ہوئی اور دھوکا دے کر انہوں نے دیپونی گورو کو قید کر لیا۔ مکاسر میں، جہاں عیسائیوں کی کافی تعداد تھی، دیپونی گورو کو جلاوطن کر دیا گیا۔ قید کی حالت میں انہوں نے 1835ء میں وفات پائی۔

تیکو عمر

امام بونجول کی وفات کے بعد سماٹرا میں تحریک مجاہدین کے رہنما محمد سامان نے پھر جنگ شروع کر دی اور یہ سلسلہ 1891ء تک جاری رہا، لیکن ولندیزیوں نے ان کو قتل کرا دیا۔ اسی زمانے میں منگ کباؤ کے آخری حکمران سی سنگا منگا راجہ، جو اسلام قبول کر کے تحریک مجاہدین میں شامل ہو گئے تھے، ولندیزیوں کے خلاف جہاد کرنے لگے، جو 1907ء تک جاری رہی، لیکن ولندیزی اس کے خلاف بھی سازش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اسی سنگا منگا کے

ایک حیف خم ان کی مدد سے ان کو ختم کر دیا۔ سماٹرا میں تحریک مجاہدین کے اس دور میں ممتاز رہنما تیکو عمر تھے۔ انہوں نے ولندیزیوں سے بیس سال تک جنگ کی۔ تیکو عمر کا تعلق آچیہ کے شاہی خاندان سے تھا۔ ان کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ مروجہ علوم کی بھی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی۔ انہوں نے فنونِ جنگ میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ جب وہ سن رشد کو پہنچے تو ولندیزیوں کی جارحانہ کارروائیاں ہر طرف جاری تھیں اور آچیہ میں مجاہدین کی تحریک کا بڑا زور تھا۔ تیکو عمر مجاہد بھی تھے اور عالم بھی۔ مجاہدین کی تحریک نے ان کو بہت متاثر کیا۔ 1874ء میں ولندیزیوں نے جب آچیہ پر حملہ کیا اور سلطنت کو شکست دی تو تیکو عمر نے مفرور فوج کو جمع کر کے ولندیزیوں کے خلاف جنگ شروع کر دی اور مغربی ساحل فتح کر لیا۔ آخر ولندیزیوں نے صلح کر لی اور تیکو عمر کو ایک فوج کا کمانڈر بنا دیا۔

جب یہ تربیت یافتہ مسلح فوج تیکو عمر کی کمان میں آ گئی تو انہوں نے ولندیزیوں کے خلاف پھر جنگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس زمانے میں تیکو محمد اور ان کی بہن نے ولندیزیوں کے خلاف جنگ میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ یہ دونوں بھائی بہن بھی تیکو عمر سے آ ملے اور پھر جنگ زیادہ شدت سے شروع ہو گئی۔ یہ جنگ چھ سال تک جاری رہی اور تیکو عمر نے کئی معرکے سر کئے، لیکن 1899ء میں ایک بڑی خوں ریز لڑائی میں وہ شہید ہو گئے۔ تیکو عمر کی شہادت کے بعد ان کی بیوہ اور تیکو محمد داؤد نے جنگ جاری رکھی۔ اس جنگ میں تیکو عمر کی بیوہ کی بہادری کے قصے سماٹرا میں بہت مشہور ہیں۔ 1905ء میں ولندیزیوں نے ان کو قید کر لیا۔ اس کے دو سال بعد تیکو داؤد کو بھی شکست دے کر قید کر لیا گیا اور آچیہ پر ولندیزیوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1907ء کی شکست کے بعد تحریک مجاہدین بھی ختم ہو گئی۔

لیکن جس طرح ہندوستان میں سیّد احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے خاتمے کے ساتھ ہی بنگال میں فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریک شروع ہوئی تھی، اسی طرح انڈونیشیا میں تحریک مجاہدین کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں نے تحریک مواخات اور تاتی تحریک شروع کر دی۔

انڈونیشیا میں ابتدائی تحریکیں

جس زمانے میں ہندوستان میں سیّد احمد شہید اور اسماعیل شہید کی قیادت میں مجاہدین نے سکھوں اور انگریزوں کی اسلام دشمنی کے خلاف جہادی تحریک برپا کر رکھی تھی، اسی زمانے میں انڈونیشیا میں ولندیزیوں کے خلاف تحریک جہاد برپا تھی۔ جہاد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اندرونی حالات میں اصلاحی تحریکیں بھی جاری تھیں، جس طرح ہندوستان میں مجاہدین کی تحریک کے پہلو بہ پہلو فرائضی تحریک اور تیتو میر کی معاشرتی و اقتصادی اصلاحات چل رہی تھیں۔

تحریکِ مواخات

ولندیزیوں کے خلاف مجاہدین کی جنگ آزمائی کے ساتھ ساتھ جاوا کے دیہات میں باہمی امداد و تعاون کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ ولندیزیوں کی لوٹ کھسوٹ نے پوری کسان آبادی کو مصائب و مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا۔

مصائب کی ہمہ گیری نے ان میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کر کے ان مشکلات کا بہتر طور پر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ باہمی امداد کے اس جذبے نے ایک بڑی مفید تحریک کی شکل اختیار کر لی جو گوتنگ رویونگ (Gotong Royong) یا تحریک مواخات کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کی اشاعت کرنے والوں نے عوام کو یہ بتلایا کہ وہ سب ولندیزیوں کے مظالم و استبداد کی وجہ سے کس طرح مصائب و مشکلات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان تکلیف دہ حالات میں یہ ضروری ہے کہ ہر گاؤں کے رہنے والے آپس میں برادرانہ تعلقات کو مستحکم کریں اور ایک دوسرے کے رفیق کار اور مددگار بنیں۔ سب لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں اور خوشی اور غم میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ اس طرح دیہی باشندوں میں باہمی امداد و اتحاد اور اخوت کے جذبے کو ترقی ہونے لگی اور یہ تحریک جاوا کے دیہات میں بڑی تیزی سے پھیل گئی۔

تحریک مواخات کے اہم اصول یہ تھے کہ ہر دیہاتی ایک دوسرے کا بھائی اور رفیق ہے۔ خوشی اور غم کا ساتھی ہے۔ کاروبار میں برابر کا شریک ہے، اور ہر آنے وقت میں کام آنے والا مددگار ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کا اصول اس تحریک میں بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ہر مشکل کام کو مل کر انجام دیتے تھے اور اس کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ کاشت کاری مل جل کر کرتے اور فصل کاٹنے کے موقع پر سب لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے اور سب مل کر کام کرتے۔ اگر کوئی قدرتی آفت اور ناگہانی مصیبت آن پڑی تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرتے۔ خود غرضی کی جگہ بے غرضی نے لے لی تھی۔ باہمی امداد کے علاوہ گاؤں کے باشندوں کے اخلاق و کردار کو بلند رکھنا بھی اس تحریک کا ایک اہم اصول تھا۔ چنانچہ ہر قسم کے جرائم کا انسداد کرنے کے لیے بھی متحدہ کوشش کی جاتی تھی، اور مجرموں، شرابیوں اور بدکاروں کو گاؤں سے نکال دیا جاتا تھا جن کو کہیں بھی پناہ نہ مل سکتی تھی۔ اس تحریک کا دیہی زندگی پر بہت اچھا اثر ہوا اور انفرادی مشکلات اور خاندانی مصائب کو اجتماعی امداد باہمی سے حل کیا جانے لگا۔

ثامنی تحریک

جاوا میں معاشرتی اصلاحی تحریک کے ساتھ ساتھ دیہات میں ایک زرعی تحریک بھی شروع ہوئی، جو کاشت کاروں سے متعلق ولندیزیوں کی تباہ کن اقتصادی پالیسی کا ردِعمل تھی۔ تحریک مواخات کی نوعیت محض اصلاحی تھی اور اس میں تصادم کا کوئی پہلو نہ تھا لیکن اس کے برعکس یہ زرعی تحریک جو "ثامنی تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی، بڑی شدت کے ساتھ ولندیزی حکومت سے متصادم ہو گئی۔

ثامن نامی ایک شخص نے 1890ء میں شمال مشرقی جاوا کے کاشت کاروں میں یہ تحریک شروع کی جو 1917ء تک جاری رہی۔ اس تحریک کے رہنماؤں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ جبری کاشت کا جو طریقہ ولندیزیوں نے نافذ کیا ہے، وہ بند کر دیا جائے اور کاشت کاروں کو اپنی زمین پر خود اپنی مرضی کے مطابق کاشت کرنے اور اس کی پیداوار فروخت کرنے کی اجازت دی جائے۔ انڈونیشی کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگا کر جو بار ڈالا گیا ہے، وہ ہلکا کیا جائے۔ ولندیزی حکومت عوام کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو مداخلت کرتی ہے، وہ بند کر دی جائے اور دیہی باشندوں کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ اپنی روایات کے مطابق اپنی معاشرتی اور اقتصادی

زندگی کو منظم کریں۔ معاشرے میں ہر شخص کی عزت و تکریم اور حقوق کا احترام بہت ضروری ہے۔ اس لیے بیگار کا طریقہ بالکل ختم کر دیا جائے۔ افراد میں معاشی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہر گاؤں کی جدوجہد اور پیداوار میں سب برابر کے شریک ہوں۔

دیہات میں ثامن تحریک بہت مقبول ہوئی اور تمام کاشت کار اس کی حمایت میں نکل آئے۔ حکومت نے اس تحریک کو اپنے خلاف بغاوت سمجھا اور 1907ء میں تحریک کے بانی ثامن اور دوسرے تمام رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ حکومت کے اس اقدام سے کاشت کاروں میں اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا اور ان میں تحریک کو زیادہ فعال اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے متحدہ جدوجہد کرنے کا عہد اور اعلان کیا۔ چنانچہ تین ہزار کسان خاندانوں نے اپنے عہد پورا کرنے کے لیے حکومت کی مزاحمت شروع کر دی۔ 1914ء میں جگہ جگہ تصادم اور فسادات ہونے لگے۔ یہ صورتِ حال مسلسل تین سال جاری رہی۔ حکومت اس تحریک کی وسعت اور شدت کے نتائج کو محسوس کرنے لگی، اور اس کو پوری طاقت سے کچل دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ 1917ء کے اواخر میں ولندیزیوں نے اپنی فوجی طاقت استعمال کر کے اس تحریک کو دبا دیا اور اس کے رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا۔ اس طرح یہ ثامنی تحریک بھی 27 سال تک جاری رہ کر ختم ہو گئی۔

شرکت گانگ اسلام

انڈونیشیا میں ایک اہم عنصر چینیوں کی کثیر تعداد میں موجودگی تھی۔ وہ مسلمان تھے نہ ولندیزیوں کی طرح عیسائی۔ وہ محض کاروباری لوگ تھے، اور ولندیزی حکومت نے مسلمانوں کا زور توڑنے کے لیے (جس طرح ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے ہندوؤں کو ابھارا تھا) چینیوں کو ہر شعبے میں آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ ان کو تجارت میں خصوصی مراعات سے نوازا۔ ٹیکسوں کی وصولی کی اجارہ داری دی۔ شہروں اور دیہات میں محاصل کی وصولی کے کارندے بنایا۔ ان اقدامات سے شرق الہند (ایسٹ انڈیا) کی معاشی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی، اور انڈونیشی مسلمانوں پر چینیوں کی گرفت روز بروز شدید تر ہوتی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کا ردعمل ہونا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ مختلف جزائر میں چینیوں کے خلاف جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ جذبات کی ہم آہنگی سے شرکت گانگ اسلام (Sherakat Dgang Islam) سے ایک منظم تحریک وجود میں آئی، جس کا مقصد اہل انڈونیشیا کو چینیوں کی معاشی گرفت سے آزاد کرانا تھا۔

اب تک چینیوں کا دائرہ عمل زیادہ تر انڈونیشیا کے ساحلی علاقوں تک محدود تھا، لیکن ولندیزیوں کی حوصلہ افزائی سے انہوں نے اندرونی علاقوں میں بھی اپنا تجارتی مال پھیلانے کی کوشش شروع کر دی۔ 1904ء میں حکومت نے مزید مراعات دیں اور اندرونی علاقوں میں داخلے پر جو پابندی تھی، وہ بھی اٹھا لی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی چین کے لوگوں نے نقل مکانی کر کے انڈونیشی جزائر کا رخ کیا اور انڈونیشیا کے اندرونی علاقوں میں بھی چینیوں کی معاشی گرفت میں آ گئے اور ان صنعتوں پر بھی چینی قابض ہونے لگے جو مدت دراز سے انڈونیشی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں۔ مسلمان غریب و نادار تھے، چینی رئیس اور سرمایہ دار۔ حکومت چینیوں کی سرپرست تھی، لہٰذا مسلمان تاجر اور

صنعت کار چینیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس نازک صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ممتاز انڈونیشی تاجر اور اسلام دوست رہنما حاجی ثمن ہدی نے 1905ء میں ایک تحریک شروع کی جو رفتہ رفتہ جڑ پکڑنے لگی۔ اس تحریک کو دیکھ کر حکومت نے چینیوں کو مزید مراعات دینے کا سلسلہ جاری کر دیا۔ چینیوں کی تجارتی (اور سماجی سرگرمیاں) بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ 1910ء میں چینی تاجر تمباکو اور سگریٹ سازی کی صنعت پر بھی قابض ہو گئے جو انڈونیشی مسلمانوں کے لیے مخصوص تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حاجی ثمن ہدی اور کئی بڑے تاجر مقابلے پر آ گئے اور 1911ء میں حاجی ثمن کی تجارتی تحریک کو سوراکارتہ میں ''شرکت گانگ اسلام'' یعنی ''انجمن تاجرانِ اسلام'' کے نام سے تاجروں کی ایک باقاعدہ تنظیم وجود میں آئی۔ یہ انجمن امداد باہمی کے اصول پر قائم کی گئی تھی۔ جاوا کے تمام چھوٹے بڑے مسلمان تاجر اس انجمن میں شامل ہو گئے۔ ''شرکت گانگ اسلام'' کا بنیادی مقصد انڈونیشی مسلمان تاجروں کے مفادات کا تحفظ تھا اور ان کو چینیوں کی گرفت سے نجات دلانا تھا۔ اس انجمن کے رہنماؤں نے چینی تاجروں اور چینی مال کا بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کو مسلمانوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ بڑی تیزی سے پھیلنے لگی۔ چینی اس تحریک سے بہت ناراض اور خوفزدہ ہو گئے، اور انہوں نے قراردادوں اور مطالبات کے ذریعے ولندیزیوں سے فوری اور عملی امداد چاہی۔ انڈونیشی مسلمانوں اور چینیوں میں کشیدگی بڑھ گئی، 1912ء میں سوراکارتا اور سورابایا میں چینیوں کے خلاف مظاہروں نے فسادات کی شکل اختیار کر لی۔ ولندیزی حکومت نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ''شرکت گانگ اسلام'' کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا۔ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح اس تحریک کو بھی طاقت کے زور پر کچل دیا گیا، لیکن اس کے بعض پرجوش اور نوجوان رہنماؤں نے چند ماہ کے بعد اسی تنظیم کی راکھ پر انڈونیشیا (شرق الہند) کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی سیاسی جماعت ''شرکت اسلام'' قائم کی، جو اس دور کی عظیم ترین اسلامی تحریک تھی، جس نے انڈونیشیا کی آزادی کی راہ ہموار کر دی۔

تعلیمی اور مذہبی تحریکیں

ولندیزیوں نے اپنے سامراجی مقاصد پورے کرنے کے لیے انڈونیشیا میں جو تعلیمی اور مذہبی پالیسی اختیار کی، مسلمانوں پر اس کا بہت برا اثر ہوا۔ سیاسی بصیرت رکھنے والے محبانِ وطن پر اس کا ردعمل اتنا شدید ہوا کہ انہوں نے اپنے مطلب اور غرض و غایت کی تعلیمی اور دینی تحریکیں شروع کر دیں۔ ولندیزی حکومت نے سیاسی جماعتوں کا قیام 1852ء کے قانون کے ذریعے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ اس لیے قومی شعور بیدار کرنے کے لیے کوئی سیاسی تحریک شروع کرنا ممکن نہ تھا، لیکن بیدار مغز انڈونیشی رہنما اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ انڈونیشی عوام اسلام کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ اگر اسلام کی حفاظت کے لیے کوئی تحریک شروع کی جائے تو تمام جزائر کے باشندے اس کی پوری حمایت کریں گے اور پورے ملک میں ایک زبردست اجتماعی تنظیم قائم ہو جائے گی۔ انڈونیشی مسلمانوں میں اپنی سیاسی تنظیم قائم ہو جائے گی۔ انڈونیشی مسلمانوں میں اپنی سیاسی تنظیم کا احساس بیدار کرنے اور ولندیزیوں کے پیدا کردہ انتشار سے، اور عیسائیت کی زبردست تبلیغ و اشاعت سے، اسلامی معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے دینی

تحریک شروع کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیمی تحریک کی ضرورت بھی رہنماؤں کو محسوس ہوتی تھی، کیونکہ تعلیمی شعور کے بغیر مذہبی تحریک کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

چنانچہ پہلے تعلیمی تحریک ہی شروع کی گئی جو ''بودی'' اور ''تومو'' کے نام سے مشہور ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی شاخیں پورے انڈونیشیا میں پھیل گئیں۔ ولندیزیوں نے انڈونیشی مسلمانوں پر تعلیم کے دروازے بند کر رکھے تھے، اور ان کی آمد سے پہلے جو دینی مدرسے قائم تھے، ان کو تالا لگوادیا تھا۔ زیادہ بدقسمتی کی بات یہ کہ انڈونیشی مسلمان عام طور پر اس قدر جاہل تھے کہ وہ اپنی تعلیمی تحریک کی اہمیت وافادیت کو پوری طرح محسوس نہ کرسکے، اور یہ تحریک صرف جاوا تک محدود رہی۔ تاہم اس تعلیمی تحریک نے (سرسید کی علی گڑھ تحریک کی طرح) ایک بڑی اور منظم جماعت کی شکل اختیار کرلی اور ملک کے باشعور طبقوں میں اس کی سرگرمیوں کو اتنی وقعت اور اہمیت دی جانے لگی کہ انڈونیشیا کی جدید قومی تحریک میں بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح)۔

انڈونیشیا کے مسلمانوں پر سب سے زیادہ شدید اور ہمہ گیر ردِّعمل ولندیزیوں کی مذہبی پالیسی کا ہوا، جس کا مقصد یہاں عیسائیت کی تبلیغ اور زیادہ سے زیادہ مقامی باشندوں کو عیسائی بنانا تھا۔ اس مذہبی پالیسی نے چند سال کے اندر ملک کا مذہبی نقشہ ہی بدل ڈالا۔ ولندیزی مسلمانوں سے خوف زدہ تھے اور اس کو اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اسی بناء پر وہ اس بات کے لیے کوشاں تھی کہ اسلام میں ہر ممکن طریقے سے انتشار پیدا کرکے اس کو کمزور کردیا جائے۔ عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کو وہ اپنی طاقت، اور مسلمانوں کے اندر دینی اختلافات پھیلانے کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی خیال سے عیسائیت کی جبری اشاعت کرنے کی قانونی اور سرکاری پالیسی اختیار کررکھی تھی۔ لیکن انڈونیشیا کے محبِّ وطن مسلم رہنماؤں کے لیے اس پالیسی کے خطرات اس قدر واضح تھے کہ ہر طبقے کے باشندے اس کو خوب محسوس کرتے تھے۔ سیاسی فہم وبصیرت رکھنے والے رہنما یہ جانتے تھے کہ انڈونیشیا کی سیاسی آزادی اور اس کے قومی اتحاد واستحکام کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اگر ولندیزی اسلام کو کمزور کردینے میں کامیاب ہوگئے تو پھر نجات اور آزادی کی تمام راہیں بند ہوجائیں گی۔

چنانچہ انہوں نے اسلام کے تحفظ کو بنیادی اہمیت دی اور ایسے عوام کو، جن میں تعلیم اور سیاسی شعور کا فقدان تھا، منظم ومتحد کرنے کے لیے دینی تحریک شروع کردی، اور ''شرکت اسلام'' کے نام سے ایک زبردست دینی تحریک نمودار ہوئی، جو انڈونیشیا کے تمام جزائر میں تیزی سے پھیل گئی۔ اس دینی تحریک نے بعدازاں سیاسی جماعت کی صورت اختیار کرلی اور دیکھتے ہی دیکھتے ولندیزی عہد کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن گئی۔

''شرکت اسلام'' نے اسلام کے تحفظ واستحکام کو اپنی ہمہ جہتی سرگرمیوں کی بنیاد قرار دے کر ولندیزیوں کی اشاعت عیسائیت کے منصوبے کو ناکام بنادیا اور عامۃ المسلمین میں سیاسی بیداری پیدا کرکے قومی جدوجہد کے اس شاندار دور کا آغاز کیا، جس کا نتیجہ ولندیزی سامراج کے خاتمے اور انڈونیشیا کی آزادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تحریک آزادی کا آغاز

انڈونیشیا میں تحریک آزادی وسیع پیمانے اور منظم طور پر بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی۔ 1905ء ایشیا کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں سال ہے۔ اسی سال بنگالی مسلمانوں کے مطالبے پر بنگال کی تقسیم ہوئی۔ اسی سال جاپان نے روس کو جنگ میں شکست دی۔ روس کی شکست سے ایک طرف تو مغرب کے سامراجی ممالک کے وقار پر بڑی کاری ضرب لگی۔ دوسری طرف ایشیا کے محکوم ممالک میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ مغربی استعمار کا طلسم ناقابل شکست نہیں ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ میں بالخصوص یہ احساس قومی تحریکات کی شکل میں ظاہر ہوا، جن کا احیائے اسلام میں بھی گہرا اور ندرتی تعلق تھا۔ انڈونیشیا میں بھی ولندیزیوں سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ بڑھنے لگا۔ یہ دور آزادی کی جدوجہد کے لیے بڑا سازگار تھا۔ ولندیزی عہد حکومت میں انڈونیشیا کے تمام جزائر ولندیزیوں کے اقتدار کے تحت انتظامی طور پر متحد ہو کر قریب تر آگئے تھے۔ اسلام کا ہمہ گیر اور مستحکم رشتہ ان میں پہلے سے موجود تھا۔ سیاسی اتحاد اور رسل ورسائل کی سہولتوں نے ان کو اور زیادہ متحد کر دیا۔ سیاسی فہم وفراست رکھنے والے لوگوں میں ایک ملک اور ایک قوم کی شکل میں متحد ہو کر جدوجہد کرنے کا خیال پیدا ہونے لگا۔ ان کے اس سیاسی شعور کو گردوپیش کے حالات نے قوی تر بنا دیا۔ انڈونیشیا کے پڑوسی ممالک میں بھی اس دور میں آزادی کی تحریک جاری تھی۔ چین جمہوری انقلاب کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ ہندوستان میں کانگریس کے زیر اثر عام سیاسی بیداری ہو چکی تھی۔ ہندی مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے والی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی۔

تحریک احیائے اسلام کا اثر

مشرقِ وسطیٰ کے مسلم ممالک میں سیّد جمال الدین افغانی نے ایک نئے انقلابی دور کا آغاز کر دیا تھا۔ ترکی، ایران اور مصر میں سامراج اور آمریت کی جڑیں کاٹی جا رہی تھیں۔ سیّد افغانی کی تحریک کے علم بردار جمہوریت، حریت اور احیاء وتجدید اسلام کا درس دے کر، ہر ملک کے مسلمانوں میں قومی اور دینی بیداری پیدا کر رہے تھے۔ انڈونیشی مسلمان بڑی تعداد میں حج اور تعلیم کے لیے مکہ معظمہ جاتے تھے۔ وہاں وہ دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے مسلمانوں سے ملتے تھے اور احیائے اسلام کی تحریکوں سے آگاہ اور متاثر ہو کر وطن واپس آتے تھے۔ پھر اپنے ملک میں ان خیالات اور نظریات کی اشاعت کرتے تھے، جن کو دوسرے ملکوں کے مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔ انڈونیشیا میں دینی درس گاہیں بڑی تعداد میں تھیں، اور ان میں تعلیم دینے کے لیے مصری استاد بلائے جاتے تھے۔ مصری استاد جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ ہوتے تھے، اور اس زمانے میں جامعہ ازہر کے استاد اور طلبہ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریکوں کے پرجوش مبلغ تھے چنانچہ ان مصری اساتذہ نے انڈونیشیا کے دینی اداروں اور مدرسوں میں بھی حریت، جمہوریت اور احیائے اسلامی کی تحریک پھیلا دی تھی۔

انڈونیشی طلبہ بھی جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مصر جاتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ نہ صرف ازہر بلکہ پورے مصر پر جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے نظریات چھائے ہوئے ہیں اور یہ لوگ سامراج اور مطلق العنانی ختم کرنے اور اسلامی تعلیمات کی اساس پر، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ایک ترقی پذیر نظام تشکیل دینے کی جدوجہد کر رہے ہیں، تو وہ اس کا گہرا اثر قبول کر لیتے تھے، اور جب انڈونیشیا واپس آتے تو اپنے وطن میں بھی اسلامی

دنیا کے نئے رجحانات کی اشاعت کرنے لگتے تھے۔اس طرح آزادی کی وہ تحریک جو مصر، ترکی، ایران، ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک میں پھیل گئی تھی، رفتہ رفتہ اس کے اثرات انڈونیشیا میں بھی پھیلنے لگے، جہاں پہلے سے تحریک جاری تھی۔

مغربی تحریکوں کے اثرات

جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی کی تحریک سے ولندیزی بہت خوفزدہ تھے اور انڈونیشیا کو اس تحریک سے محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے مغربی نظریہ قومیت کی اشاعت کرنے اور مغربی تعلیم کو ترقی دینے کی تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ انڈونیشی امراء اور رؤسا کو یہ ترغیب دی گئی کہ وہ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر یا ترکی کی بجائے ہالینڈ بھیجا کریں۔ لیکن یہ طلبہ جب ہالینڈ گئے تو یورپ کے جمہوری اور اشتراکی تصورات، سامراج کے مخالف نظریات، مغربی تصورات قومیت اور مختلف ممالک کی قومی تحریکوں سے بخوبی واقف ہو گئے۔ چنانچہ ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے ملک میں بھی ان تحریکوں کی اشاعت کریں۔ اور اہل انڈونیشیا میں قومی احساس، سیاسی شعور اور آزادی کا جذبہ پیدا کریں۔ ولندیزی سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔ ان مقاصد کے لیے انڈونیشی طلبہ نے رفتہ رفتہ ہالینڈ میں بھی قومی آزادی کی جدوجہد شروع کر دی، اور جب وطن واپس ہوئے تو قومیت اور آزادی کی اساس پر کئی تحریکیں چلانے لگے۔

انڈونیشی خود سرمایہ دار نہ تھے، لیکن ان کو سیاسی اور معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والے ولندیزی اور ان کے کارندے چینی سرمایہ دار تھے اور ان کی یہ سرمایہ داری انڈونیشی عوام کا مکمل استحصال کر رہی تھی۔ چنانچہ قدرتی طور پر تعلیم یافتہ انڈونیشی نوجوانوں میں سرمایہ داری کے خلاف شدید جذبۂ منافرت پیدا ہو گیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اشتراکیت کو ولندیزی سامراج اور سرمایہ داری کی جڑیں کاٹنے کا ایک کارگر حربہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس طرح ولندیزیوں کی تدبیریں الٹی ہو گئیں۔ اہل انڈونیشیا میں اسلامی تحریک بھی بدستور جاری رہی، لیکن اس تحریک کو کچلنے کے لیے ولندیزیوں نے جو تدبیر اختیار کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انڈونیشیا کی تحریک آزادی میں نوجوان لیڈروں کا وہ گروہ بھی نمایاں حصہ لینے لگا جو ولندیزیوں کی سیاست کاری کا جواب خود ان کے سیاسی حربوں سے دینے لگا تھا۔

ولندیزی سامراج کے خلاف جذبہ

انڈونیشیا میں ولندیزیوں کی جابرانہ پالیسی عام بے چینی کا سب سے بڑا سبب تھی۔ انڈونیشی محبانِ وطن شدت سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ ولندیزی حکومت ان کا ملک تباہ کر رہی ہے۔ یورپی سرمایہ داروں کے وسیع کاروبار، انڈونیشی مزدوروں کی معمولی اجرت، جبری کاشت کے تباہ کن نظام، افلاس زدہ کاشت کاروں کی اپنی زمینوں سے محرومی، چینی ساہوکاروں کی تباہ کاری، خارجہ تجارت پر ولندیزیوں اور داخلی تجارت پر چینیوں کی مکمل اجارہ داری، بھاری محصولات اور بیگار کی وجہ سے اہل ملک کی معاشی حالت تباہ ہو گئی ہے۔ ولندیزی حکومت کے مطلق العنانی، گورنر جنرل اور دوسرے افسروں کے لامحدود اختیارات، ریاستی حکمرانوں کی سرپرستی، نئے امراء کی خود غرضی اور سیاسی حقوق اور سرکاری ملازمتوں سے انڈونیشی عوام کی محرومی نے سیاسی ترقی کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔

ولندیزیوں اور انڈونیشیوں کے لیے الگ الگ عدالتوں کے قیام، دونوں کے لیے الگ قانون اور سزاؤں نے انصاف اور قانونی مساوات کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ولندیزیوں اور انڈونیشیوں کے درمیان معاشرتی تفریق نے اہل ملک میں احساس کمتری پیدا کر دیا ہے۔ تعلیم سے اہل ملک کی محرومی نے حالات کو بہتر بنانے کے امکانات مسدود کر دیئے ہیں، اور حکومت کی سرپرستی میں اور سیاسی مقاصد کے تحت عیسائیت کی تبلیغ نے مذہبی اختلاف و انتشار کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ولندیزی حکومت کی اس پالیسی کے تباہ کن نتائج سے انڈونیشیا کے تمام جزائر متاثر ہوئے تھے۔ اس لیے ولندیزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ بھی ہر جگہ پیدا ہو گیا تھا اور ولندیزیوں کے خلاف اس مشترکہ جذبے سے بھی آزادی کی تحریک کو ملک گیر بنانے میں بڑی مدد ملی۔

ولندیزیوں کی مذہبی پالیسی کے نتائج

انڈونیشی رہنماؤں کے نزدیک سب سے زیادہ خطرناک ولندیزیوں کی مذہبی پالیسی تھی۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی تعداد 90 فیصد سے زیادہ ہے۔ انڈونیشی رہنما خوب جانتے تھے کہ انڈونیشیا میں سیاسی بیداری اور اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے، کیونکہ اسلام ہی وہ ذریعہ ہے جو ہزار ہا میل کے رقبے میں بکھرے ہوئے سینکڑوں جزائر کے باشندوں کو متحد کر کے ان میں مرکزیت پیدا کر سکتا ہے، لیکن ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر اپنی گرفت کو مضبوط اور مستقل بنانے کے لیے عیسائیت کی تبلیغ و سرپرستی کی جو پالیسی اختیار کی ہے، وہ اسلامی رشتے کو توڑ کر دینی اور معاشرتی انتشار پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ ولندیزی اپنی مذہبی پالیسی پر بہت عرصے سے عمل کر رہے تھے اور اہل انڈونیشیا اس کے خطرناک نتائج دیکھ رہے تھے۔

چنانچہ 1901ء میں جب ہالینڈ میں برسر اقتدار کیتھولک پارٹی نے یہ اعلان کیا کہ ولندیزی حکومت انڈونیشیا میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے والوں کی پوری مدد کرے گی اور نئے عیسائیوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے گی اور انڈونیشی رہنماؤں نے دین اسلام اور وطن کے لیے شدید خطرہ محسوس کیا اور اس سے محفوظ رہنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اس سال یہ لوگ جب حج کے لیے مکہ گئے تو وہاں دوسرے ممالک کے ممتاز مسلمانوں سے مشورہ کیا اور آخر کار یہ طے ہوا کہ انڈونیشیا میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کو ہر ممکن طریقے سے روکا جائے اور ولندیزیوں کی مذہبی پالیسی سے اسلام اور مسلمانوں کو جو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اس سے انڈونیشی عوام کو آگاہ کر کے ان میں قومی اتحاد اور سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس خطرے کے انسداد کے لیے ایک موثر پروگرام بنایا گیا اور اس پر عمل ہونے لگا۔ مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں اور ہر قسم کی محفلوں میں جہاں کہیں بھی مسلمان جمع ہوتے، ان کو حکومت کی مذہبی پالیسی کے خطرات سے آگاہ کیا جاتا، اور اس کے انسداد کے لیے مسلمانوں کے متحد اور منظم ہونے کی ضرورت واضح کی جاتی۔ اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے ہر طبقے میں اسلام کی حفاظت کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس جذبے نے اتنی ترقی کر لی کہ آخر کار اسی بنیاد پر انڈونیشیا میں بڑی اہم اور ملک گیر اسلامی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ملک کی تقریباً تمام جماعتوں نے اسلامی نظام کے احیاء و تجدید کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اس نصب العین کے تحت جو سیاسی شعور پیدا ہوا، اس سے انڈونیشیا کی تاریخ میں قومی آزادی کی جدوجہد کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور آخر کار

انڈونیشی رہنما رعوام اپنے ملک کو ولندیزی سامراج سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے۔

تحریک آزادی کا تقاضا: تعلیم اور تنظیم

ولندیزیوں کے خلاف جاوا اور ساٹرا میں مجاہدین کی زبردست تحریک شروع ہوئی جو مسلمانانِ ہند کی تحریک آزادی کی مانند ایک صدی سے زیادہ جاری رہی۔ اس تحریک کی بار بار ناکامی نے محبانِ وطن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ موجودہ حالات میں محض تلوار کے زور سے ولندیزیوں کو نکالنا ممکن نہیں ہے۔ آزادی کے راستے میں حائل مشکلات اور انڈونیشیا کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ساری قوم متحد نہ ہو جائے اور عوام کے دلوں میں حصول آزادی کا جذبہ پوری طرح بیدار نہ ہو جائے اور وہ مقصد کے لیے منظم طور پر جدوجہد نہ کریں، ولندیزی قبضے سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ قوم میں اتحاد، تنظیم اور بیداری کیونکر پیدا کی جائے۔ سیاسی جدوجہد بڑی موثر تدبیر ہو سکتی تھی، لیکن انڈونیشی عوام پر حکومت نے یہ راستہ بند کر رکھا تھا۔ 1852ء کے قانون نے انڈونیشیا میں سیاسی جماعتوں کا قیام ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ولندیزی ہر اس تحریک اور ادارے کو بزور کچل دیتے تھے، جس میں سیاست کا ذرا بھی شائبہ ہوتا تھا۔ ان دشوار حالات میں بڑے غور و فکر کے بعد محبِ وطن لیڈر اس نتیجے پر پہنچے کہ عوام میں قومی اور سیاسی شعور پیدا کرنے اور اس کو ترقی دے کر ولندیزی اور سامراجی غلامی سے آزاد ہونے کا موثر ترین ذریعہ ''تعلیم اور تنظیم'' ہے۔

حاجی وحی الدین

ان محبِ وطن رہنماؤں میں سب سے ممتاز حاجی وحی الدین تھے جو جدید قومی تحریک آزادی کے پہلے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ وہ 1857ء میں ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کالج میں طب کی تعلیم حاصل کی اور اس پیشے میں بڑی کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ حاجی صاحب کے دل میں اسلام اور وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ قوم کی تباہی، جہالت اور افلاس سے وہ بہت متاثر ہوتے تھے، اور قوم کو اس پسماندگی سے نکالنے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ آخرکار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ حالات میں ملک کی سب سے بڑی ضرورت تعلیم کی اشاعت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک وسیع تعلیمی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور ولندیزی ارباب حکومت کے سامنے دیہی ترقی اور اشاعت تعلیم کی تجاویز پیش کیں، لیکن ولندیزیوں نے ان کو قبول نہ کیا۔ آخرکار انہوں نے خود یہ کام شروع کر دیا۔ معاشرتی اصلاح، معاشرتی ترقی اور تعلیم کی اشاعت کے بارے میں اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے انہوں نے ایک رسالہ ''اطلاعات'' جاری کیا اور عوام تک اپنے خیالات پہنچانے کے لیے انہوں نے 1907ء میں پورے جاوا کا دورہ کیا اور ہر قصبے اور گاؤں میں جا کر تعلیم کی اہمیت، معاشرتی اصلاح اور اقتصادی ترقی کی ضرورت واضح کی، لیکن عوام کی حالت اس قدر پست تھی کہ اس پر انہوں نے عملی توجہ نہ کی۔

راون سوتو مو

حاجی وحی الدین کی مساعی میں ان کے دست راست ڈاکٹر راون سوتو مو تھے جو آگے چل کر ایک بڑے انقلابی لیڈر ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر سوتو مو 1888ء میں ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد نے ان کی دینی تربیت اور اعلیٰ تعلیم پر خاص توجہ کی اور وہ ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے، جہاں وہ ڈاکٹر وحی الدین کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی تحریک میں نمایاں حصہ لینے لگے۔

ڈاکٹر سوتو مو ولندیزی سامراج کے بڑے مخالف تھے اور آگے چل کر انہوں نے ایک جماعت قائم کر کے ولندیزیوں کے خلاف تحریک چلائی اور قید و بند کی سختیاں بھی برداشت کیں، لیکن اپنے مقصد پر ثابت قدمی سے جمے رہے اور عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے آخر وقت تک کام کرتے رہے۔

بودی اوتو مو (Boedi Oetomo)

حاجی وحی الدین نے ڈاکٹر سوتو مو کے تعاون سے میڈیکل کالج کے طلبہ کو منظم کیا اور (20 مئی 1907ء کو (آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے ایک سال بعد) ایک جماعت ''بودی اوتو مو'' کے نام سے قائم کی، جس کو انڈونیشی عوام کی قومی بیداری کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ بودی اوتو مو (حیات عالیہ) کے قیام سے انڈونیشیا میں تحریک آزادی نے پہلی بار ایک منظم صورت اختیار کی۔ اکتوبر 1907ء میں جوگجا کارتا میں اس جماعت کی پہلی قومی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حاجی وحی الدین اس کے صدر اور ڈاکٹر سوتو مو جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ چونکہ ملک میں سیاسی جماعتوں کا قیام قانوناً ممنوع تھا، اس لیے یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ جماعت غیر سیاسی ہے اور ایک تعلیمی جماعت ہے۔ اس کا بنیادی مقصد تعلیم کا فروغ ہے (سرسیّد کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح)۔

انڈونیشیا میں اسلامی تحریک کے بانی

انجمن فروغ تعلیم ''بودی اوتو مو'' کے تاسیسی اجلاس میں ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا اور انجمن کے بنیادی مقاصد قرار دیے گئے:

1۔ جہالت دور کرنے کے لیے سارے ملک میں تعلیم کی اشاعت کرنا۔
2۔ دیہات میں تعلیم کی اشاعت کے لیے استادوں کی تربیت کرنا، انتظام کرنا اور سکولوں کے لیے عمارتیں وغیرہ فراہم کرنا۔
3۔ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دینا۔
4۔ ذہین طلبہ کو دوسرے ممالک میں اعلیٰ تعلیم دلانے کا انتظام کرنا۔
5۔ جگہ جگہ جلسے منعقد کر کے عوام میں تعلیم کی ضرورت و اہمیت کو واضح کرنا۔
6۔ اہل ملک میں قومی خدمت اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔
7۔ انڈونیشی عوام کے دل سے احساس کمتری دور کر کے ان میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کرنا۔

8۔ زراعت، صنعت اور تجارت کو فروغ دینا۔

''بودی'' اپنے اغراض و مقاصد کو لے کر تیزی سے آگے بڑھی۔ جاوا اور مادورا کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہات میں اس کی شاخیں اور مدرسے قائم ہو گئے، اور اس کے صدر وحی الدین ملک کے سب سے بڑے اور بااثر رہنما بن گئے۔

اگرچہ ''بودی اوتومو'' ملک میں پہلی تعلیمی تحریک نہ تھی اور اس سے دو سال قبل اس مقصد کے لیے ''جمعیت الخیر'' قائم ہو چکی تھی، جو تعلیم کی اشاعت اور طلبہ کو حصول تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا کام پہلے سے انجام دے رہی تھی، لیکن ''بودی'' کے مقاصد زیادہ وسیع تھے، اور وہ انجمن فروغ تعلیم کی شکل اختیار کر کے ملک میں احیائے اسلام کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی بھی چلانا چاہتی تھی۔ نیز اس جماعت کو ایک بااثر تعلیم یافتہ طبقے کی تائید و حمایت حاصل تھی اور اس کی تنظیم پورے جاوا میں پھیلی ہوئی تھی، اس لیے اس کو بہت جلد بڑی مقبولیت اور اہمیت حاصل ہو گئی۔

بودی کے سیاسی مطالبات

ابتدا میں ''بودی'' سیاست سے بالکل الگ تھلگ رہی، لیکن جب لوگوں کا رجحان سیاست کی طرف بڑھنے لگا اور غیر ملکی استعمار سے نجات کی تحریک چلی تو اس جماعت نے بھی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ اگست 1915ء میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ جنگی حالات کے مد نظر انڈونیشی عوام کی عسکری تنظیم اور پارلیمانی نظام حکومت قائم کیا جائے۔ بودی نے ملک کی اہم سیاسی جماعتوں کو ایک نصب العین پر متحد کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ وحی الدین کے بعد جو سوتومو جماعت کے صدر ہوئے تو انہوں نے بودی کو ایک سیاسی وطنی تحریک کی حیثیت سے آگے بڑھانا چاہا، لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے کیونکہ سیاسی میدان میں اس کو ''شرکت اسلام'' سے مقابلہ کرنا پڑا، جو اس دور کی سب سے بڑی اور ملک گیر تنظیم تھی۔ بودی کی تنظیم میں جاوی قومیت اور جاوی ثقافت کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی اور اس کا دائرہ عمل جاوا، مادورا اور بالی تک محدود تھا۔ اس کے برعکس شرکت اسلام ایک زبردست سیاسی تحریک تھی، جس نے تجدید و احیائے اسلام کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ انڈونیشی عوام کا رجحان اسلامی تحریک کی طرف تھا اور جب بودی تعلیمی سرگرمیوں کے دائرے کو پھلانگ کر ''شرکت اسلام'' کے مقابلے میں آئی تو اپنی تنظیم کو قائم نہ رکھ سکی اور رفتہ رفتہ اس کا اپنا وجود ختم ہو گیا۔

بودی سیاسی جماعت بن جانے کے بعد کوئی اہم اور نمایاں حیثیت حاصل نہ کر سکی۔ اس کی جدوجہد کچھ مطالبات پیش کرنے تک ہی محدود رہی۔

تحریکاتِ نسواں

انڈونیشیا میں مذہبی اور سیاسی بیداری کے ساتھ تحریکاتِ نسواں بھی ترقی کرنے لگیں۔ اسلام پسند رہنما اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پیش کرنا چاہتے تھے، اس لیے وہ تحریکاتِ نسواں اور خواتین کے ان تمام حقوق کی حمایت کرتے تھے جو اسلام نے دیئے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ فروغ تعلیم اور آزادی نسواں کے حامی بھی خواتین کے حقوق کی

تائید کر رہے تھے۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں خواتین کی انجمنیں اور تنظیمیں قائم ہونے لگیں جن کا مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں خواتین کا درجہ بلند کیا جائے اور ان کو تمام جائز حقوق دیئے جائیں۔ "جمعیت خیریہ" اور "بودی اوتو مو" تعلیم نسواں کی تائید کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ خود خواتین میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہونے لگا، اور آخر کار 1912ء میں جکارتہ میں "آزادی نسواں" (Putri Merdeka) کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی، جس کا مقصد خواتین میں تعلیم کی اشاعت، مدارس نسواں کا قیام، طالبات کی خصوصی مالی امداد اور بے جا معاشرتی قیود کا انسداد تھا۔ آگے چل کر کئی اور جماعتیں قائم ہوئیں، جن میں اسلامی تعلیمات کے مطابق عورتوں کی تعلیم و تربیت، اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنے والی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ ان میں سب سے اہم "جمعیت عائشہ" تھی جو تعلیمی ترقی اور معاشرتی اصلاح کے ایک جامع پروگرام کے تحت "جمعیت الحمدیہ" نے قائم کی تھی۔

لڑکیوں کے لیے سکول قائم کرنے کی غرض سے خصوصی کمیٹیاں بھی بنائی گئیں، جن کے زیر انتظام تحریک نسواں کی بانی کارتینی سے منسوب "کارتینی سکول" کے نام سے تمام بڑے شہروں اور قصبوں میں سکول قائم کیے گئے۔ تعلیم کے علاوہ خواتین کو امور خانہ داری کی تربیت دینے کی غرض سے بھی کئی جماعتیں قائم کی گئی تھیں، اور انہوں نے پکوان، سلائی، دایہ گیری، پرورش اطفال اور خانہ داری کی تربیت کے کئی ادارے قائم کیے۔ عورتوں کی یہ تمام جماعتیں ایک دوسرے سے تعاون کرتی تھیں اور اپنا دائرہ عمل روز بروز وسیع تر کر رہی تھیں۔

شروع شروع میں خواتین کی تمام سرگرمیاں صرف گھریلو اور معاشرتی امور تک محدود تھیں اور وہ سیاسی تحریکوں میں کوئی حصہ نہ لیتی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے قومی جدوجہد میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ خواتین کی مختلف انجمنوں کی سرگرمیوں کو زیادہ منظم اور مربوط کرنے کی غرض سے دختران انڈونیشیا کی تحریک پر دسمبر 1928ء میں جوگجاکارتا میں خواتین کی موتمر منعقد ہوئی، جس میں یہ طے پایا کہ خواتین کی تمام جماعتوں کو ایک تنظیم کے ذریعے باہم مربوط کر دیا جائے۔ چنانچہ "متحدہ انجمن خواتین انڈونیشیا" (Perikatan Perempuran Indonesia) کے نام سے ایک وفاقی تنظیم قائم کی گئی جس کا مقصد یہ بھی تھا کہ انڈونیشیا کی خواتین اپنے ملک کی سیاسی تحریک آزادی میں پورا حصہ لیں اور مرکزی تنظیم سیاسی سرگرمیوں میں ان کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ خواتین نے قومی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اور اعلان آزادی کے بعد جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو جنگی سرگرمیوں میں خواتین بھی شریک تھیں، اور ماشومی نے "جمعیت العائشہ" کے حربی دستے تیار کر کے وہ تمام فرائض ان کو تفویض کر دیئے جو اسلام کی قرون اولی کی جنگوں میں مسلمان خواتین انجام دیتی تھیں۔

جب انڈونیشیا میں "بودی اوتو مو" جماعت اپنی تعلیمی، معاشرتی و ثقافتی پروگرام کو روبہ عمل لانے میں مصروف تھی اور قومی احساس بیداری اور منظم تحریک کی شکل اختیار کرنے لگا تھا، انڈونیشی خواتین میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے، اور وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے متحد و منظم ہو رہی تھیں، تو ہالینڈ میں تعلیم پانے والے انڈونیشی نوجوان بھی یورپ کی مختلف تحریکوں سے متاثر ہو کر ایک قومی تنظیم قائم کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ یہ نوجوان سامنے آنے لگے تھے جو آگے چل کر اپنے ملک کی تحریک آزادی کے رہنما بنے۔ اسی زمانے میں انڈونیشیا کے تجارتی مراکز

میں چینی اور انڈونیشی تاجروں کی باہمی کشمکش شروع ہوئی اور انڈونیشی تاجر باہمی اتحاد کے اصول پر منظم ہو کر اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ انڈونیشی تاجروں کی یہ تنظیم ''شرکت گانگ اسلام'' تھی، جس نے 1911ء میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی اور جب ولندیزیوں نے چینی کارندوں کی مراعات برقرار رکھنے کے لیے یہ انجمن ختم کر دی تو اس کے بیت نوجوان رہنما عمر سعید نے ''شرکت اسلام'' کے نام سے احیائے اسلام اور آزادی وطن کی وہ عظیم تحریک شروع کی جو اہل انڈونیشیا کے دلی جذبات اور تمناؤں کی ترجمان تھی، اور جس نے انڈونیشیا میں سیاسی بیداری پیدا کر کے آزادی کی تحریک کو ملک گیر بنا دیا۔

اسلامی تحریک اور تحریک آزادی

انڈونیشی محبان وطن نے قومی جدوجہد کے میدان میں پہلے منظم عملی اقدام کی حیثیت سے ''بودی اوتومو'' کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا، لیکن یہ تحریک انڈونیشی عوام کے دلوں میں جگہ نہ پا سکی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ''بودی'' نے جاوی قومیت اور مقامی ثقافت کو بنیادی اہمیت دے کر اس پر بہت زور دیا، اور شدید اسلامی رجحانات رکھنے والے انڈونیشی عوام کے لیے قومیت وثقافت کے ان تصورات میں کوئی کشش نہ تھی۔ تعلیم یافتہ طبقہ یہ چاہتا تھا کہ اسلام صحیح رنگ میں قابل عمل نظام حیات کی شکل میں پیش کیا جائے اور عوام کی بھی قلبی تمنا یہی تھی کہ اسلام کا نام پھر بلند ہو جائے۔ ولندیزی دور حکومت میں تقریباً تین صدیوں تک انڈونیشی مسلمان اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح ابھرنے کا موقع نہ ملا اور اسلامی دنیا کے فکری وعقلی سرمایے میں وہ کوئی قابل قدر اضافہ نہ کر سکے، لیکن اسلام کی محبت اور وابستگی نے ان کو ایک مقصد کی طرف گامزن رکھا اور اسلام کا تشخص وتحفظ انہیں ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں خوش قسمتی سے انڈونیشیا کو چند ایسے رہنما مل گئے جو دنیائے اسلام میں ہونے والی احیائی تحریکات سے باخبر تھے۔ زمانے کے تقاضے شدت سے محسوس کرتے تھے اور اسلام کی مخالف وحریف طاقتوں کا مؤثر طور پر مقابلہ کرنے اور انڈونیشیا کے زوال پذیر اور جمود پسند مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے اسلامی نظریہ حیات کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان رہنماؤں میں سب سے ممتاز حاجی عمر سعید تھے، جن کی قیادت میں اسلامی تجدید واحیاء کے ساتھ ساتھ آزادی کی بھی تحریکوں کا ایک عظیم الشان عہد شروع ہوا۔

حاجی عمر سعید

انڈونیشیا میں تجدید واحیائے اسلام اور ولندیزی استعمار سے آزادی کی تحریک کے بانی حاجی عمر سعید چکرو آمینوتو وسطی جاوا کے شہر مادیون میں 1883ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک بہت معزز اور علم دوست خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم دینی مدرسے میں ہوئی۔ اس کے بعد ولندیزی سکولوں میں جدید تعلیم حاصل کی۔ وہ ولندیزی حکومت اور اس کی مذہبی پالیسی کے شروع ہی سے مخالف تھے۔ چنانچہ جب وہ سکول میں پڑھتے تھے تو انہوں نے ولندیزی استادوں کی بدسلوکی اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف طلبہ کی ایک تحریک منظم کی اور پھر ولندیزیوں اور چینیوں کی اجارہ داری کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد حاجی عمر سعید نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی زمانے میں حاجی حسن بدی نے ''شرکت گانگ اسلام'' کے نام سے مسلمان تاجروں کی جماعت قائم کی تھی۔ عمر سعید اس جماعت میں شامل ہو گئے اور اس کے شعبۂ نوجوانان کے صدر اور ممتاز رہنما بن گئے۔ 1912ء میں ولندیزیوں نے جب ''شرکت گانگ اسلام'' کو ناجائز قرار دیا تو اس نے ممتاز لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ چنانچہ عمر سعید بھی قید کر دیے گئے اور ولندیزیوں کے ہاتھوں انہوں نے شدید مصائب برداشت کیے۔ جنوری 1913ء میں قید سے رہا ہوتے ہی انہوں نے پہلی اسلامی موتمر منعقد کی، جس میں شرکت گانگ اسلام (تجارتی جماعت) کی بجائے ''شرکت گانگ اسلام'' (سیاسی جماعت) قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور عمر سعید اس نئی جماعت کے قائد اول بنے۔

عمر سعید اسلامی انقلاب کے داعی، بین الاسلامی اتحاد کے علم بردار اور انڈونیشیا کی آزادی کے زبردست حامی، مدبر، مفکر، شعلہ بیان، مقرر، ممتاز مصنف اور تجربہ کار صحافی تھے۔ قیادت کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے، اور پہلی اسلامی موتمر میں ان کی صدارتی تقریر ایک نئے انقلابی دور کا آغاز تھی۔ ''شرکت اسلام'' قائم کرنے کے بعد عمر سعید نے قومی کارکنوں کو سیاسی تربیت دینے کے لیے ایک ادارہ اور اقامت خانہ بھی قائم کیا۔ اس ادارے میں تاریخ اسلام، فلسفہ، تمدن و ثقافت، عمرانیات اور اسلامی نظریات کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اپنے مقاصد کی اشاعت کے لیے انہوں نے مشہور رسالہ ''اوتوسان ہندیہ'' جاری کیا، جس میں ان کے مقالے بڑے فکر انگیز اور انقلاب آفریں ہوتے تھے۔

حاجی عمر سعید جمال الدین افغانی اور مصر، ترکی اور ہندوستان کے تجدد پسند رہنماؤں سے بہت متاثر تھے۔ ان کی تصانیف میں تاریخ دین اسلام (Tarich Agama Islam) اور اسلام اور اشتراکیت (Islam and Socialism) بہت اہم ہیں۔ انہوں نے انڈونیشیا میں بین الاسلامی تحریک کو فروغ دیا اور تمام ملک میں ایسی لائبریریاں قائم کیں، جہاں اسلامی اتحاد اور ملی خدمت کا جذبہ ابھارنے والا لٹریچر فراہم کیا جاتا تھا۔ 1922ء میں انڈونیشیا کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجلاس طلب کر کے اسلامی اتحاد اور اسلامی نظام حیات کی تجدید کے لیے کام کرنے کی دعوت دی۔ 1926ء میں مکہ معظمہ میں منعقد ہونے والے ''موتمر عالم اسلامی'' سے تعاون کا فیصلہ کر کے اس میں شرکت کے لیے ایک وفد تشکیل دیا۔ مکہ سے واپس آ کر انڈونیشیا میں ''موتمر عالم اسلامی'' کی شاخ قائم کی۔

حاجی عمر سعید کی فعال قیادت نے انڈونیشیا کی سیاسی زندگی میں بھی ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سیاسی جماعتوں پر قانونی پابندیوں کے باوجود انہوں نے ''شرکتِ اسلام'' کو ایک زبردست سیاسی جماعت بنا دیا، اس کی شاخیں سارے ملک میں پھیل گئیں۔ سیاسی کارکنوں کو دعوت دی نوجوانوں میں قیادت کے اوصاف اس قدر اجاگر کر دیے کہ وہ ہالینڈ اور انڈونیشیا میں سیاسی تنظیمیں قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور آگے چل کر قومی رہنما بنے۔ نوجوان رہنماؤں کی ایک تربیت یافتہ کھیپ پیدا کرنے کے بعد 1934ء میں رحلت کر گئے۔

انڈونیشی مسلمانوں کی پہلی مؤتمر

جنوری 1913ء میں حاجی عمر سعید کے زیرِ صدارت انڈونیشی مسلمانوں کی پہلی مؤتمر (کانفرنس) سورابایا کے مقام پر منعقد ہوئی۔ مؤتمر میں فیصلہ ہوا کہ ''شرکت گانگ اسلام'' کی بجائے، جس کو ولندیزیوں نے غیر قانونی جماعت قرار دیا تھا ''شرکت اسلام'' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی جائے۔ مؤتمر نے اس جماعت کا صدر عمر سعید کو بنایا اور قانونی گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے یہ وضاحت کر دی کہ ''شرکت اسلام'' نہ تو سیاسی جماعت ہے اور نہ ولندیزیوں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے، بلکہ یہ اہل کتاب کی معاشرتی اصلاح اور ترقی کے لیے کام کرے گی۔

اس اعلان کے باوجود ''شرکتِ اسلام'' کے قیام سے انڈونیشیا میں قومی سیاسی بیداری کی تاریخ کے اہم ترین باب کا آغاز ہوا۔ اس جماعت کی کوششوں سے پورے ملک میں سیاسی بیداری اس تیز رفتاری سے پیدا ہوئی کہ ولندیزی سامراج کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں اور صرف 35 سال کی مختصر مدت میں انڈونیشیا نے مکمل آزادی حاصل کی۔

بنیادی مقاصد

''شرکتِ اسلام'' نے اپنے تاسیسی اجلاس میں مندرجہ ذیل ''بنیادی مقاصد'' پر مبنی معاشرتی اصلاح اور ترقی کا پروگرام بنایا۔

1۔ مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا۔

2۔ غیر اسلامی طرزِ معاشرت اور فرسودہ رسم و رواج کو ختم کرنا۔

3۔ اسلامی اخوت اور بین الاسلامی اتحاد کو فروغ دینا۔

4۔ اس ملک کی ذہنی اور تعلیمی ترقی کے لیے کام کرنا۔

5۔ صنعت و تجارت کو فروغ دینا۔

6۔ عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے تدابیر اختیار کرنا۔

''شرکتِ اسلام'' کے ان مقاصد میں انڈونیشی عوام کے لیے بڑی کشش تھی، جس کے باعث تھوڑی مدت میں اس نے حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کی شاخیں ہر شہر اور قصبے میں قائم ہوگئیں اور تین سال کے اندر اس کے ارکان کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہوگئی۔

ولندیزی حکومت کا خیال تھا کہ یہ جماعت سورابایا تک ہی محدود رہے گی اور قانونی پابندیاں کچھ دنوں کے بعد اس کو خود بخود ختم کر دیں گی، لیکن جب ''شرکت اسلام'' بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگی تو حکومت نے خطرہ محسوس کیا اور اس کو ختم کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ چنانچہ اس کی مرکزیت اور ملک گیر اثرات کو توڑنے کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ ''شرکت اسلام'' کی شاخیں مرکزی جماعت سے الحاق نہ کرسکیں گی۔ اس کا نتیجہ تو ضرور نکلا کہ مقامی شاخیں خود مختار اور قانونی اعتبار سے مرکز سے بالکل بے تعلق ہوگئیں، لیکن درحقیقت وہ مرکز کی قیادت کو تسلیم کرتی

رہیں تمام شاخیں مرکز کے مقاصد کو ترقی دینے میں پورا تعاون کرتی تھیں۔ حالات کے پیش نظر ''شرکت اسلام'' کی مجلس عاملہ نے یہ طے کیا کہ سرکاری ملازمین کو رکن نہ بنایا جائے اور جماعت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مرکز اور شاخیں پوری آزادی کے ساتھ کام کرتی رہیں۔ حکومت کی مخالفت اور قانونی رکاوٹ کے باوجود ''شرکت اسلام'' برابر ترقی کرتی گئی اور ایک سال میں اتنی قوت حاصل کرلی کہ سیاسی میدان میں بھی داخل ہوگئی۔ چنانچہ دوسری مؤتمر (یعنی دوسرے سالانہ اجلاس) میں یہ اعلان کردیا گیا کہ ''شرکتِ اسلام'' کے ''بنیادی مقاصد'' میں ایک مقصد یہ بھی کہ انڈونیشی عوام کو متحد کرکے غاصبوں کے مقابلے میں ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔

سالانہ ملی مؤتمر

جون 1916ء میں ''شرکت اسلام'' کا تیسرا اجلاس ہوا تو اس کو ملی مؤتمر کی حیثیت دی گئی، اور آئندہ سالانہ اجلاس ''ملی مؤتمر'' کی شکل میں ہونے لگے۔ تین سال کے دوران میں ''شرکت اسلام'' ملک گیر جماعت بن گئی۔ تمام جزیروں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں اور مختلف جزائر کے باشندے ایک تنظیم کی شکل میں متحد ہوگئے تھے۔ چنانچہ جون 1916ء میں حاجی عمر سعید کے زیرصدارت باندونگ میں ''شرکتِ اسلام'' کی پہلی ''ملی مؤتمر'' منعقد ہوئی، جس میں آٹھ ہزار مندوب شریک ہوئے اور حصول مقاصد کے لیے تمام جزائر اور مختلف علاقوں کے باشندوں کو متحد و منظم کرنے کی تدابیر منظور کی گئیں۔

اکتوبر 1917ء میں ''دوسری مؤتمر'' جکارتا میں ہوئی، جس میں پہلی مؤتمر سے بھی زیادہ وسیع اور مستحکم تنظیم کے نمائندے شامل ہوئے۔ ''شرکت اسلام'' سیاست میں داخل ہونے کے بعد یہ مطالبہ شدت سے پیش کرنے لگی تھی کہ انڈونیشیا میں جمہوری اصولوں کے مطابق ایک منتخب پارلیمنٹ قائم کی جائے جو عوام کی نمائندہ ہو۔ دوسری ملی مؤتمر میں اس نے کھل کر ولندیزی سامراج اور مطلق العنانی کے خلاف قرارداد منظور کی۔

اکتوبر 1918ء میں ''تیسری مؤتمر'' سورابایا میں منعقد ہوئی۔ عوام میں اس جماعت کی بے پناہ مقبولیت نے اس کی سیاسی طاقت وقوت میں بہت اضافہ کردیا تھا، اور وہ اس قابل ہوگئی تھی کہ نہ صرف اپنے مقصد کا بانگ دہل اعلان کرے بلکہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے ولندیزیوں کے مقابلے پر بھی تیار ہوجائے۔ چنانچہ اس مؤتمر میں ولندیزیوں کی سامراجی پالیسی کی مذمت کرکے ظلم واستبداد کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور یہ قرار دیا کہ اپنے حقوق کی حفاظت اور سامراجی مظالم کو ختم کرنے کے لیے ولندیزیوں کا مقابلہ کیا جائے۔

1919ء میں ''شرکت اسلام'' اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اس کے ارکان کی تعداد 25 لاکھ سے متجاوز تھی۔ ہر جگہ اس کی شاخیں قائم تھیں۔ عوام اس کے حامی و مددگار تھے۔ ''چوتھی مؤتمر'' بھی سورابایا کے مقام پر منعقد ہوئی، جس میں سرکاری انتظامیہ میں اصلاحات اور ملک کے حقیقی نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ کے قیام کا مطالبہ کیا گیا، اور مختلف تحریکات پر غور کرنے اور اہم مسائل کے قابل عمل حل پیش کرنے کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ اس مؤتمر نے ملک کے لیے کامل آزادی کا مطالبہ کیا اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے طاقت سے کام لینے پر بھی آمادگی کا اظہار کیا۔ آزادی کے مطالبے، عیسائی مبلغوں کی چیرہ دستیوں کے انسداد اور چینیوں کے ہاتھوں اہل ملک کے استحصال کو روکنے کے لیے

طاقت استعمال کرے کے فیصلے سے عوام میں بہت ہیجان پیدا ہوا اور انڈونیشیا کی تحریک آزادی میں جوش آنے لگا۔

کمیونسٹوں کا اخراج

''شرکتِ اسلام'' کی زبردست عوامی طاقت کو ولندیزیوں سے زیادہ خود اہلِ ملک نے نقصان پہنچایا۔ باہمی اختلافات کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کا زور ٹوٹنے لگا۔ ولندیزی دورِ حکومت کی اس عظیم قومی جماعت کو سب سے زیادہ نقصان کمیونسٹوں نے پہنچایا۔ 1917ء کے روسی انقلاب نے انڈونیشیا میں بھی کمیونسٹوں کے حوصلے بڑھا دیے تھے لیکن عوام ان کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے، کیونکہ وہ کمیونسٹوں کو مذہب کا مخالف سمجھتے تھے۔ چنانچہ روسی رہنماؤں کی ہدایت کے بموجب انڈونیشیا کے کمیونسٹ ''شرکتِ اسلام'' میں شامل ہو گئے اور مسلمانوں کی اس عظیم الشان منظم و متحد جماعت میں اختلاف و انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ پہلے تو انہوں نے بہت جوش و خروش سے کام کیا اور ''شرکتِ اسلام'' کی متعدد بڑی شاخوں کے نظم و نسق پر قابض ہو گئے اور پھر اس سے فائدہ اٹھا کر مرکز کی مخالفت کرنے لگے۔

1920ء میں کمیونسٹوں نے زبردست ہنگامہ آرائی شروع کر دی اور ''شرکتِ اسلام'' نے مزدوروں کی تمام ٹریڈ یونینوں کو متحد کر کے ان کا جو وفاق بنایا تھا، اس کو ''شرکتِ اسلام'' کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن آغوس سالم اور عبدالمعز نے جو ''شرکتِ اسلام'' کے صفِ اول کے قابل اور سرگرم رہنماؤں میں سے تھے، کمیونسٹوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیا، اور آخر کار یہ کشمکش اتنی بڑھ گئی کہ 1921ء میں ''شرکتِ اسلام'' کی ''چھٹی ملی مؤتمر'' نے یہ فیصلہ کیا کہ ''شرکتِ اسلام'' کا کوئی رکن کسی دوسری جماعت کا رکن نہیں بن سکتا۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمیونسٹ ''شرکتِ اسلام'' سے الگ ہو گئے اور عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنی جماعت کا نام ''اشتراکی شرکت اسلام'' رکھا، لیکن یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو کمیونسٹوں نے ''شرکتِ رعیت'' کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کر لی۔ کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے اور کمیونسٹوں کی گرفت سے ''شرکتِ اسلام'' کی معاون تنظیموں کو محفوظ رکھنے میں نوجوان آغوس سالم نے بہت نمایاں حصہ لیا، جو آگے چل کر انڈونیشیا کے ایک بڑے رہنما ثابت ہوئے۔

آغوس سالم

حاجی آغوس سالم 1884ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دینی مدرسے میں پائی۔ قرآن ناظرہ مکمل کیا۔ پھر ولندیزی سکول میں داخل ہوئے۔ مشہور خاتون رہنما کارتینی کو ہالینڈ میں اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے وظیفہ دیا گیا تھا، لیکن معاشرتی قیود کی وجہ سے ہالینڈ نہ جا سکیں، اس لیے یہ وظیفہ آغوس سالم کو ان کی قابلیت کی وجہ سے دیا گیا، اور وہ پوری طرح اس کے مستحق ثابت ہوئے۔ آغوس سالم بہت اچھے خطیب، پرجوش مقرر، صحافی، مصنف اور عالم تھے۔ انگریزی، فرانسیسی، ولندیزی اور عربی زبان پر ان کو پورا عبور حاصل تھا۔

آغوس سالم بھی حاجی عمر سعید کی طرح اسلام کے احیاء و تجدید کے بڑے حامی تھے اور مصر، ترکی اور ہندوستان کی احیائی تحریکوں کے قائدین کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے۔ اسی مقصد سے حاجی صاحب ''شرکتِ اسلام'' میں شامل ہوئے اور اپنی قابلیت اور محنت سے اس جماعت کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔ مرکزی مجلس عاملہ کے رکن بنے، خاص طور پر شعبۂ نوجوانان کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی قیادت

میں نوجوان طلبہ نے کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور اپنی مدلل تحریروں سے واضح کیا کہ رسول کریم ﷺ کی تعلیمات کارل مارکس اور لینن کے نظریات سے کہیں زیادہ مکمل، جامع، قابل عمل اور مبنی بر انصاف ہیں۔ حاجی صاحب نے ایک رسالہ ''فجر ایشیا'' جاری کر کے اپنے نظریات اور ''شرکت اسلام'' کے مقاصد کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔ کئی علمی جرائد ان کی زیر ادارت چھپتے تھے جن کا مقصد اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت تھا۔

حاجی عمر سعید کی وفات کے بعد ''شرکتِ اسلام'' کا شیرازہ بالکل منتشر ہو گیا، اور ہالینڈ کی حکومت سے تعاون یا عدم تعاون کے مسئلے نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ حاجی آغوس سالم بھی 1936ء میں ''شرکتِ اسلام'' سے علیحدہ ہو گئے اور 1938ء میں پے نیدار باریسان (Penjedar Barisan) کے نام سے الگ جماعت بنالی۔ حصول آزادی کے بعد وہ حکومت میں شامل ہو گئے۔ پہلے وزارتِ خارجہ کے مشیر اور بعدازاں وزیر خارجہ کے عہدوں پر فائز رہے۔ 1954ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مؤتمر اسلامی اور تحریک خلافت

نومبر 1922ء میں ''شرکتِ اسلام'' نے تمام ملک کے رہنماؤں کا ایک جلسہ طلب کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ امت مسلمہ کے اہم مسائل پر غور کر کے ان کو حل کرنے کی مناسب تجاویز پیش کی جائیں۔ اس زمانے میں خلافت کے مسئلے پر مسلمانانِ ہند کی طرح مسلمانانِ انڈونیشیا کو بھی سخت مضطرب کر دیا تھا۔ ترکی میں خلافت بحال کرنے کی تحریک وہاں بھی جاری تھی۔ اس اجتماع میں بین الاسلامی اتحاد کو حقیقی اور مستحکم بنانے اور مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کرنے کی تدبیروں پر غور کیا گیا۔ دنیائے اسلام سے عملی اور مخلصانہ دلچسپی لینے کا یہ سلسلہ ''شرکتِ اسلام'' نے برابر جاری رکھا۔ مئی 1924ء میں انڈونیشیا کے تمام جزائر کے نمائندوں پر مشتمل ''مؤتمر اسلامی'' منعقد کی گئی، تاکہ بین الاقوامی اتحاد اور خلافت اسلامیہ کے قیام کے متعلق مختلف علاقوں اور جزیروں کے نمائندوں کے خیالات بھی معلوم ہو جائیں اور پورے غور و فکر کے بعد اس بارے میں تجاویز مرتب کی جائیں۔ خلافت کا مسئلہ انڈونیشی مسلمانوں کی نظر میں مذہبی نوعیت کا تھا اور اسی لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ جب قاہرہ میں مجوزہ ''مؤتمر خلافت'' منعقد ہو تو انڈونیشی وفد اس کے متعلق کوئی ٹھوس تجویز پیش کرے۔ چنانچہ ''مؤتمر اسلامی'' نے یہ تجویز منظور کی کہ خلافت کسی فرد کی بجائے ممتاز علماء کی مجلس کو تفویض کی جائے۔

قاہرہ میں ہونے والی مؤتمر تو منعقد نہ ہو سکی، لیکن 28 اپریل 1924ء کو مکہ معظمہ میں ایک ''مؤتمر اسلامی'' طلب کی گئی۔ اس مؤتمر میں شرکت کے لیے انڈونیشیا کی نمائندگی حاجی عمر سعید، حاجی احمد وحاب اور یمانی حاجی منصور نے کی۔ اس مؤتمر میں شرکت کی وجہ سے انڈونیشی رہنماؤں کو دوسرے مسلم ممالک کے رہنماؤں سے تبادلہ خیال کا بہت اچھا موقع ملا، اور ان میں باہمی روابط پیدا ہو گئے، جس کا انڈونیشیا کی اسلامی تحریک پر بہت گہرا اثر پڑا۔ انڈونیشیا کے رہنما دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے قریب تر ہو گئے۔ بین الاسلامی اتحاد کے جذبے کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور احیائے اسلام کے نصب العین کے پیش نظر ''شرکتِ اسلام'' نے اپنا سیاسی اور قومی نصب العین یہ قرار دیا کہ

انڈونیشیا کی آزادی اسلامی نظام کے احیاء کے لیے حاصل کی جائے۔ تحریک آزادی کو تحریک اسلامی پر منحصر کر دیا گیا۔ حاجی عمر سعید اور ان کے رفقائے کار نے بڑی خوبی سے یہ واضح کر دیا کہ اہل انڈونیشیا کے تمام مصائب و مشکلات کا حل اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسلام ایک نظریۂ حیات، ایک مکمل دین، ایک زبردست معاشرتی تحریک ہے، اور اسلام ہی انڈونیشی عوام کو معاشی تباہی، سیاسی غلامی اور معاشرتی خرابیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔

جمعیۃ المحمدیہ

انڈونیشیا کی تجدیدی تحریک

1921ء میں ''شرکتِ اسلام'' کی چھٹی مؤتمر کی قرارداد منظور ہو جانے کی وجہ سے کمیونسٹ تو اس پارٹی سے نکل گئے، لیکن ان کی تخریبی کارروائیوں نے جماعت کی تنظیم واستحکام کو بہت نقصان پہنچایا۔ نومبر 1926ء میں کمیونسٹوں کی بغاوت شروع ہوئی جسے کچلنے کے لیے ولندیزیوں نے بڑی سختی اور تشدد سے کام لیا۔ حکومت کی سخت گیری نے تمام انڈونیشی تحریکات کو دہشت زدہ کر دیا۔ اس بغاوت کو بہانہ بنا کر سب جماعتیں ختم کر دی گئیں۔ ''شرکتِ اسلام'' کی سرگرمیاں بھی روک دی گئیں۔

حکومت کے تشدد کا دور ختم ہونے کے بعد جب سیاسی جماعتیں پھر سے کام کرنے لگیں تو ''شرکتِ اسلام'' کے اندر پھوٹ پڑ گئی۔ ولندیزی حکومت سے تعاون اور عدم تعاون کا مسئلہ ''شرکتِ اسلام'' کے رہنماؤں میں شدید اختلاف کا باعث بن گیا۔ انتہا پسندوں کے قائد ڈاکٹر سوکیمان تھے، جن کا خیال تھا کہ ولندیزیوں سے کسی قسم کا تعاون نہ کیا جائے اور عدم تعاون کی تحریک کو ملک گیر بنانے کے لیے کیائیوں (مولویوں) سے کام لیا جائے، جن کا دیہات میں بڑا اثر ہے۔ اس کے برعکس اعتدال پسندوں کے قائد آغوس سالم کا خیال تھا کہ ولندیزیوں سے تعاون کر کے قومی مقاصد کو آگے بڑھایا جائے۔ ان دونوں گروہوں میں اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر سوکیمان نے ''شرکتِ اسلام'' سے علیحدہ ہو کر ''پارٹی اسلام انڈونیشیا'' (پی آئی آئی) کے نام سے الگ جماعت بنالی۔ اس کے بعد ''شرکتِ اسلام'' میں باہمی اختلافات کے باعث آغوس سالم بھی اس سے علیحدہ ہو گئے اور پے نیدار باریسان (Panejedar Barisan) کے نام سے ایک نئی جماعت بنائی۔ کچھ عرصے کے بعد ''شرکتِ اسلام'' کے نائب صدر کارتو سوویریو کو جماعت سے خارج کر دیا گیا، اور انہوں نے بھی اپنی ایک الگ جماعت ''شرکتِ اسلام کیدوآ'' کے نام سے بنالی۔ اس طرح ''شرکتِ اسلام'' کا شیرازہ منتشر ہو گیا، اور اپنے دور کی یہ سب سے بڑی تنظیم ایک معمولی جماعت بن کر رہ گئی۔ لیکن اسلام سے اہل انڈونیشیا کی وابستگی میں کوئی کمی نہ ہوئی اور ''شرکتِ اسلام'' نے جو اسلامی مقاصد اپنے سامنے رکھے تھے، وہ زیادہ ترقی یافتہ شکل میں ایک عظیم تر اسلامی جماعت ''ماشومی'' کے نصب العین بنے۔

جمعیت المحمدیہ

''شرکتِ اسلام'' کوئی دینی اور مذہبی جماعت نہ تھی، بلکہ ایک اسلامی تحریک تھی جو عوام میں سیاسی بیداری اور

اسلامی شعور پیدا کرنے، آزادی حاصل کرنے اور آزاد اسلامی مملکت میں اسلامی احکام و تعلیمات کو روبہ عمل لانا چاہتی تھی۔ رفتہ رفتہ "شرکت اسلام" کی سرگرمیوں پر سیاست کا غلبہ ہو گیا۔ اس صورت حال میں بعض ممتاز رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی، مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی ترقی کے لیے "شرکت اسلام" کی ایک ذیلی تنظیم قائم کرنا بہت ضروری ہے تاکہ دین اسلام کے لیے خدمت کا موقع پیدا ہو۔ چنانچہ "شرکت" کے ایک ممتاز رہنما اور عالم دین حاجی احمد دحلان نے یہ کام انجام دیا، اور ان کی قائم کردہ تنظیم "جمعیت المحمدیہ" نے انڈونیشیا میں احیائے اسلام کے لیے قابل قدر کام کیا۔

حاجی احمد دحلان

حاجی صاحب اپنے زمانے کے بڑے عالم دین، احیائے اسلام کی تحریک کے علم بردار اور قومی انقلاب کے زعیم تھے۔ وہ 1868ء میں جکارتا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق علماء اور مبلغین کے ایک ممتاز اور دولت مند گھرانے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے دینی مدرسے میں ہوئی اور ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دینی علوم کی تکمیل کے لیے مکہ معظمہ گئے، جہاں عربی زبان، عربی ادب، قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ اور منطق میں تکمیل کی سند حاصل کی۔ مکہ معظمہ میں وہ بڑے بڑے علماء اور دنیائے اسلام کے زعماء سے متعارف ہوئے، اور ان کے اثرات قبول کیے۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی اصلاح و ترقی کے لیے کام کرنے کا جذبہ شدید ہو گیا تو حاجی دحلان نے دوسرے اسلامی ممالک کی احیائی تحریکوں اور تجدید پسند رہنماؤں کے افکار و نظریات کا غائر مطالعہ کیا اور انڈونیشیا کے مخصوص حالات و مسائل کے حل کی کچھ واضح تجاویز لے کر وطن واپس آئے۔ چنانچہ وہ ملک کی سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگے، اور اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے ایک ادارہ "مدرسہ محمدیہ" کے نام سے قائم کیا، جہاں روشن خیال اساتذہ طلبہ کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ مدرسے کو مستحکم کرنے کے بعد حاجی صاحب نے مسلمانوں کی دینی معاشرتی اور ثقافتی اصلاح و ترقی کے لیے "جمعیۃ المحمدیہ" قائم کی۔

حاجی صاحب نے دینی اصلاح، قومی بیداری اور اشاعتِ تعلیم کی غرض سے تمام ملک کا دورہ کیا۔ عوام میں تعلیم کے فروغ پر بہت زور دیا اور دین کو خرافات سے الگ کر کے اسلامی زندگی اختیار کرنے اور غیر اسلامی اثرات کو ختم کر کے اسلام پر مبنی ثقافت و معاشرت کو فروغ دینے کی ضرورت کو واضح کیا۔ انہوں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ مسلمان براہ راست قرآن مجید سے ہدایت حاصل کریں۔ وہ کورانہ تقلید کے سخت مخالف اور اجتہاد کے حامی تھے، اور انڈونیشی مسلمانوں کو غیر اسلامی عقائد، قبر پرستی، ہندو، برہمنی اور بدھی اثرات سے آزاد کر کے اسلام کی صحیح اور سچی تعلیم سے عوام کو آگاہ کرنا ایک بنیادی فرض تصور کرتے تھے۔ چنانچہ "مدارسِ محمدیہ" کے ذریعے انہوں نے انڈونیشیا میں احیائی تحریک کا جال بچھا دیا۔

احیائی تحریک کے اسباب

انڈونیشیا پر ابتدا ہی سے مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے اثرات پڑتے رہے، اور ہندو عہد حکومت میں ہندو تہذیب اور ہندو مذہب نے عوام کو اس قدر متاثر کیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اہل انڈونیشیا غیر اسلامی اثرات

سے پوری طرح نجات حاصل نہ کر سکے۔ انڈونیشیا میں اسلام کی ترویج واشاعت کرنے میں صوفیوں اور گجراتی مسلمانوں نے بہت اہم حصہ لیا ہے۔ گجراتی مسلمان تو خود بھی ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے ہندومت کے اثرات سے بالکل محفوظ نہ تھے۔ صوفیائے کرام نے، جن میں جاوا اور سماٹرا کے چند مشہور علماء اور مبلغ بھی شامل ہیں، انتہائی رواداری سے کام لیا اور بعض ایسی روایات اور رسوم ورواج سے بھی تعرض نہ کیا جو اسلامی عقائد کے خلاف تھے۔ قدیم اثرات کے تحت انڈونیشی عوام راسخ عقائد کی بجائے تصوف اور طریقت کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔ قرآنی تعلیمات کو تصوف اور طریقت سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ انڈونیشی مسلمان اسلام اور ہندومت کی بنیادی خصوصیات سے نا واقف تھے اور نہ ان میں پوری طرح فرق کر سکتے تھے، اور نہ شریعت اور رواج کے فرق کو محسوس کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ دونوں چیزیں ضروری تھیں۔ وہ اس بات پر کبھی غور نہ کرتے تھے کہ رواج شریعت کے خلاف ہے یا اس کے مطابق۔ چنانچہ وہ شریعت کو حکم اور رواج کو عادات و رسوم کہنے اور یہ تصور کرنے لگے کہ حکم وہ ہے جو اللہ کہتا ہے، اور رواج وہ ہے جو اللہ روا رکھتا ہے۔ اکثر و بیشتر صوفیاء اور علماء نے اس خیال کو تقویت دی اور اپنے مخصوص انداز میں حکم اور عادات کو آنکھ کی سفیدی اور سیاہی سے تشبیہ دینے لگے۔

با اثر طبقے کے ان خیالات اور عام رجحانات کی وجہ سے انڈونیشیا میں غیر اسلامی اثرات کی جڑیں بہت دور تک پھیل گئی تھیں، اور ولندیزیوں نے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت ان اثرات کو مزید پھیلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ولندیزی محققوں نے انڈونیشیا میں ہندو عہد کی تہذیب کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور مسلمانوں کی تہذیب کو ہندوؤں کی تہذیب سے کمتر ظاہر کیا، تاکہ لوگ قدیم ہندو تہذیب پر فخر کریں۔ ولندیزی حکومت کے علاوہ عیسائی مبلغین نے بھی انڈونیشی مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے اور غیر اسلامی اثرات کے فروغ دینے کی پوری کوشش کی اور ان کی سرگرمیوں نے بھی اسلامی معاشرت و تہذیب پر بہت برا اثر ڈالا۔ انڈونیشی مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی زندگی پر غیر اسلامی اثرات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ اس ملک میں خود اسلام خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے روشن خیال علماء اور تجدید پسند رہنماؤں نے احیائے اسلام کی تحریک شروع کی۔ جاوا میں اس تحریک کا آغاز جوگجاکارتہ میں ہوا اور سماٹرا میں مینگنگ کباؤ اس کا مرکز بنا۔ حاجی عمر سعید نے اسی مقصد سے "شرکتِ اسلام" قائم کی تھی اور جب اس جماعت کی سرگرمیوں سے دین خارج اور سیاست غالب آ گئی تو اس مقصد کے لیے "جمعیۃ المحمدیہ" قائم کی گئی۔

جمعیۃ المحمدیہ کا قیام ومقصد

حاجی احمد دحلان نے 18 نومبر 1912ء کو جوگجاکارتہ میں "جمعیۃ المحمدیہ" قائم کی۔ اس کے بنیادی مقاصد یہ قرار دیئے گئے۔

1۔ مسلمانوں کی دینی اور معاشرتی اصلاح کرنا۔

2۔ مسلمانوں کو غیر اسلامی عقائد اور کورانہ تقلید سے آزاد کرنا۔

3۔ قرآنی تعلیمات کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ موجودہ حالات ومسائل کے حل کرنے میں رہنمائی کریں۔

4۔ اسلامی اصولوں کو نظام تعلیم کی اساس بنانا اور تعلیم کی وسیع اشاعت کرنا۔

5۔ اسلامی علمی تجدید و ترقی کے ساتھ ساتھ جدید علوم و فنون کی بھی تعلیم دینا۔

6۔ اسلامی نظام حیات کی تجدید و احیاء کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق درست کرنا۔

7۔ مسلمانوں کی معاشرتی، دینی اور تعلیمی اصلاح کے لیے ادارے قائم کرنا۔

8۔ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی دینی و عصری تعلیم دینا، اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ''جمعیت'' نے تمام ملک میں بکثرت دینی مدرسے اور کتب خانے قائم کیے۔ ملایائی اور جاوی زبان میں قرآن پاک کے تراجم کی وسیع اشاعت کی۔ معاشرتی اصلاح کے ادارے، شفاخانے، یتیم خانے محتاج خانے اور دوسرے خیراتی ادارے قائم کیے۔ زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے اور ان کو مفید کاموں پر صرف کرنے کا انتظام کیا۔ خواتین کے حقوق کی حفاظت کرنے اور ان کو دینی و دنیاوی تعلیم دینے کے لیے ''جمعیت العائشیہ'' کے نام سے ایک ذیلی تنظیم بھی قائم کی گئی، جس نے بہت جلد نمایاں اہمیت حاصل کر لی۔

مدارس محمدیہ

نظام تعلیم کی اصلاح اور تعلیم کی وسیع اشاعت ''محمدیہ'' کا ایک اہم اور بنیادی مقصد تھا۔ انڈونیشیا میں دو قسم کے تعلیمی ادارے موجود تھے۔ ولندیزی سکول اور دینی مدرسے۔ سکولوں میں دینی تعلیم نہ دی جاتی تھی اور دینی مدرسے جدید علوم سے بالکل بیگانہ تھے۔

سرکاری سکولوں کے علاوہ عیسائی مشنری اداروں نے بھی جدید طرز کے سکول قائم کر لیے تھے، اور ان کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے دینی مدرسوں کے مقابلے میں عیسائیوں کے مدرسوں کو دوسو گنا زیادہ رقم بطور سرکاری امداد دی جاتی تھی۔ عیسائی مدرسوں کی سرگرمیاں زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ نظام تعلیم میں ایک بہت بڑی خرابی یہ تھی کہ سکولوں میں دینی تعلیم نہ دی جاتی تھی اور دینی مدرسوں کے تعلیم یافتہ عصری علوم و فنون سے محروم رہ جاتے تھے۔ نظام تعلیم کی اس بنیادی خرابی کو حاجی احمد دحلان نے شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کوشش کی کہ جدید طرز کے مدارس میں دینی تعلیم بھی دی جائے اور دینی مدارس میں جدید علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے۔ نیز اساتذہ کے تربیتی نصاب میں دینیات بھی شامل کر لی جائے۔ لیکن انگریزی حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا اور آخر کار احمد دحلان نے ''مدارس محمدیہ'' کے نام سے ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جہاں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم و فنون کی تعلیم اعلیٰ معیار اور جدید اصولوں کے مطابق دی جاتی تھی۔ ان مدارس کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگا اور یہ سارے ملک میں پھیل گیا۔ یہاں تک کہ چند سال کے اندر ''مدارس محمدیہ'' انڈونیشیا میں تعلیمی اداروں کا وسیع ترین نظام بن گئے اور ملک کی تعلیمی ترقی میں انہوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔

تربیتی ادارے

''مدارس محمدیہ'' میں تعلیم دینے کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ''جمعیت المحمدیہ'' نے اساتذہ کی تربیت کے لیے ''مدارس المعلمین'' اور استانیوں کی تربیت کے لیے ''مدارس المعلمات'' قائم کیے۔ ان اداروں میں تربیتی نصاب کی مدت پانچ سال تھی۔ ''مدارس محمدیہ'' میں انہی اداروں کے سند یافتہ تقرر کیے جاتے تھے۔ اشاعت میں بھی ''جمعیت'' کا ایک بنیادی مقصد تھا اور اس میں غیر اسلامی رسوم و رواج ختم کرنا بھی شامل تھے۔ اس لیے ''جمعیت'' نے دینی اصلاح و تبلیغ کا کام کرنے والوں کی تربیت کے لیے ''مدارس المبلغین'' اور ''مدارس المبلغات'' بھی قائم کیے۔ ان اداروں میں چھ سال کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والوں کو داخل کیا جاتا تھا اور دین کی اشاعت اور اصلاح معاشرت کا کام کرنے کے لیے تین سال تک تربیت دی جاتی تھی۔

اسلامی یونیورسٹی

ابتدائی، ثانوی اور تربیتی مدارس قائم کرنے کے علاوہ ''جمعیت المحمدیہ'' نے اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی، اور ''جمعیت'' کی پچیسویں کانگریس، منعقدہ 1936ء میں ایک کمیٹی مقرر کی، لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ آخر کار حصولِ آزادی کے بعد جب نئی دور کی عظیم اسلامی جماعت ''ماشومی'' قائم ہوئی تو اس نے اسلامی یونیورسٹی کے منصوبے کو عملی شکل دی اور 1946ء میں جکارتہ میں اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس کے بعد ''جمعیت'' نے مشرقی سماٹرا کے شہر پاڈانگ پنجانگ میں 1955ء میں دوسری اسلامی یونیورسٹی قائم کی۔

حصولِ آزادی کے بعد ''جمعیت المحمدیہ'' کی تعلیمی و تعمیری سرگرمیاں جاری رہیں، اور حاجی احمد دحلان کے بعد ڈاکٹر ابوحنیفہ اور حاجی امر اللہ کی رہنمائی میں یہ جماعت برابر ترقی کرتی رہی۔ آزادی کے بعد جب جدید کی عظیم اسلامی جماعت ''ماشومی'' قائم ہوئی تو ''جمعیۃ المحمدیہ'' اس سے وابستہ ہوگئی اور اس قدر ترقی کی کہ انڈونیشیا کی سب سے بڑی تعلیمی اور معاشرتی تنظیم بن گئی۔

انڈونیشیا کی دینی جماعتیں

شرکت اسلام اور جمعیۃ المحمدیہ کے بعد انڈونیشیا میں کئی دینی جماعتیں قائم ہوئیں، جن کا مقصد احیائے اسلام کے علاوہ مسلمانوں کی دینی اصلاح اور شعائر اسلامی کا تحفظ تھا۔ ان میں بعض جماعتیں کسی ایسے دینی مسئلے کی پیدا کردہ تھیں جس کو اس خاص وقت میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ جماعتیں زیادہ تر ملک کے ممتاز علمائے دین کی قائم کردہ تھیں اور علماء کے علاوہ انہیں بعض سیاسی رہنماؤں کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ اس لیے انہوں نے کافی اہمیت اختیار کر لی اور عوام میں خاصی مقبول ہوگئیں، لیکن بیشتر دینی جماعتوں کی عمر بہت مختصر تھی

نہضۃ العلماء

ان دینی جماعتوں میں سب سے اہم نہضۃ العلماء ہے۔ یہ جماعت 1926ء میں قائم کی گئی۔ اس

کے بانی شیخ الوہاب تھے۔ یہ جماعت اس لیے قائم کی گئی تھی کہ انڈونیشیا کے بیشتر علما،تجدید پسندوں کے خیالات سے اختلاف رکھتے تھے،اور شافعی فقہ کی برتری قائم رکھنے کے حامی تھے۔ یہ جماعت دراصل شافعی علماء کی جماعت تھی اور چونکہ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت شافعی ہے،اس لیے یہ جماعت بہت با اثر ہوگئی۔عوام اس کا احترام کرنے لگے۔مختلف جزائر میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں۔ یہ جماعت تعلیم کی اشاعت اور اسلام کی تبلیغ کی حد تک جمعیۃ المحمدیہ سے متفق تھی۔لیکن دینی اور معاشرتی اصلاح کے مسئلے پر دونوں میں شدید اختلاف تھا،جو بڑھتا ہی رہا۔یہاں تک کہ حصولِ آزادی کے بعد اس اختلاف نے شدید کشمکش اور عداوت کی شکل اختیار کر لی۔اپنے مقاصد کے تحت ''نہضۃ العلماء'' نے اسلامی قانون (شریعت) نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔یہ جماعت کمیونسٹوں کے الحاد کی بنا پر ان کی شدید مخالف بن گئی،لیکن آزادی کے بعد جب اس نے دین سے زیادہ سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کیا تو اس کے رہنماؤں میں تضاد خیالی پیدا ہوئی،پیروکاروں میں ذہنی انتشار پیدا ہوا،اور یوں یہ جماعت اپنے دینی مقاصد سے ہٹ کر ایک سیاسی جماعت بن گئی،اور اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں بتدریج کمی ہوتی گئی۔

جمعیت العلماء

اس جماعت کے بانی انڈونیشیا کے ایک اور ممتاز عالم دین حاجی عبدالحلیم تھے۔یہ جماعت بھی دینی مقاصد کے تحت قائم کی گئی تھی اور اس نے بھی اسلامی شعائر کا تحفظ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کو اپنا مقصد قرار دیا۔

مجلس خلافت

پہلی جنگ عظیم کے بعد مسئلہ خلافت نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو بھی مضطرب اور بے چین کر دیا،اور وہ خلافت کی بحالی کی حمایت کرنے لگے۔اس تحریک میں حاجی عمر سعید،شرکتِ اسلام اور جمعیۃ المحمدیہ کے رہنما اور انڈونیشیا کے علماء نمایاں حصہ لے رہے تھے اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے مرکزی مجلس خلافت اور دوسری جماعتوں سے مسلم رہنماؤں میں اتحاد و اتفاق کو ضروری خیال کیا گیا۔چنانچہ 1922ء میں مغربی جاوا میں ایک اور دینی تنظیم ''لجنۃ الخلافت المرکزیہ'' کے نام سے قائم ہوئی،جس کا مقصد یہ تھا کہ انڈونیشیا کے مسلم زعما کو متحد کر کے ان میں مرکزیت پیدا کی جائے،تاکہ مسلمانوں کے مفادات کا مؤثر طور پر تحفظ کیا جا سکے اور بین الاسلامی اتحاد کو ترقی دینے کی عملی تدبیریں اختیار کی جا سکیں۔

مؤتمر اسلامی شرق الہند

خلافت کے مسئلے نے انڈونیشی مسلمانوں میں بین الاسلامی اتحاد کا شدید جذبہ بیدار کر دیا تھا،اور ان کے وہ رہنما جو دنیائے اسلام کی تجدیدی تحریکوں سے بہت متاثر تھے،''شرکتِ اسلام'' کی سرکردگی میں انڈونیشیا کی تمام اسلامی تنظیموں،جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کو متحد کر کے بین الاسلامی تحریک کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔چنانچہ انہوں نے یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے عملی تجاویز مرتب کیں اور جب مکہ معظمہ میں مؤتمر اسلامی

منعقد ہوئی تو اس میں انڈونیشی وفد بھی، حاجی عمر سعید کی قیادت میں شریک ہوا اور اسلامی ممالک کے زعماء سے تبادلۂ خیال کر کے بین الاسلامی اتحاد کو تقویت دینے کی تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ یہ وفد جب انڈونیشیا واپس آیا تو ''لجنۃ الخلافت المرکزیہ'' کا نام بدل کو ''مؤتمر اسلامی شرق الہند'' رکھا گیا، اور یہ تنظیم مکہ معظمہ کی ''مؤتمر اسلامی'' کی شاخ قرار دی گئی۔ 1926ء سے 1937ء تک یہ جماعت اسی نام اور حیثیت سے کام کرتی رہی۔ اس کے بعد ''جمعیۃ المحمدیہ'' اور ''نہضۃ العلماء'' کے رہنماؤں نے اس کو ایک نئی اسلامی تنظیم کی شکل دی اور اس کا نام ''انڈونیشی مجلس اسلامی'' رکھا گیا۔

جمعیت اتحاد اسلامی

بین الاسلامی اتحاد کو فروغ دینے اور انڈونیشی مسلمانوں کے مسائل کو متحد طور پر حل کرنے کی غرض سے اسی زمانے میں ایک اور اسلامی تنظیم ''جمعیت الاتحاد الاسلامی'' کے نام سے قائم ہوئی، جس کے رہنما انڈونیشیا کے مشہور عالم دین حاجی احمد سنوسی تھے، اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ تنظیم ایک باثر جماعت بن گئی۔

ان سب جماعتوں کے مرکز جاوا میں تھے اور ان کی شاخیں دوسرے جزائر میں بھی قائم ہو گئی تھیں۔ ان کے علاوہ کئی جزیروں، بالخصوص ساٹرا، بورنیو اور سلاویسی میں بھی ایسی متعدد دینی جماعتیں قائم کی گئیں، جن کا دائرہ عمل صرف ان ہی جزائر تک محدود تھا۔ یہ سب جماعتیں اپنے اپنے انداز میں کام کرتی تھیں، اور ان کی سرگرمیوں کے مراکز الگ الگ تھے، لیکن یہ سب بڑی جماعت ''شرکتِ اسلام'' سے تعاون کرتی تھیں۔ ایک چیز ان سب جماعتوں میں مشترک تھی، یعنی اسلامی شعائر کا تحفظ، اسلامی تعلیمات کی اشاعت، اسلامی نظام حیات کی تجدید اور اسلامی قانون کا نفاذ، مقاصد کی اسی یکسانی اور وحدت نے اس دور کی اسلامی تنظیموں میں ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔

جاپانی دور میں اسلامی تحریک

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں 1942ء کے آغاز میں جاپان نے انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا اور تمام سیاسی جماعتیں ختم کر دی گئیں۔ چنانچہ ''شرکتِ اسلام'' اور ''پارٹی اسلام'' کو، جو سب سے بڑی اسلامی جماعتیں تھیں، اپنی سرگرمیاں فوراً بند کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسلامی تنظیموں میں سے صرف دو جماعتیں محمدیہ اور نہضۃ باقی رہ گئیں، کیونکہ یہ تعلیمی اور دینی جماعتیں تھیں، اور سیاست سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا، لیکن بدلے ہوئے حالات میں ان کی سرگرمیاں بھی سرد پڑ گئیں۔ یہ وقت اسلامی تحریک کے لیے بہت نازک تھا۔ سوکیمان، ابی کسنو، امر اللہ، شمس الدین، کیائی منصور اور دوسرے مسلمان رہنما یہ کوشش کرنے لگے کہ مسلمان منظم و متحد رہیں، اور خاموشی سے اپنے دینی، ملی و قومی مفاد کے تحفظ و ترقی کے لیے مناسب طریقے پر کام کرتے رہیں۔

جاپانی اپنے سیاسی اور جنگی مقاصد کے لیے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے جن میں اپنے دین اور اپنے رسول ﷺ سے وابستگی کا جذبہ بہت شدید تھا، چنانچہ حکومت اور مسلمانوں میں ربط قائم کرنے کے لیے مذہبی امور کا محکمہ قائم کیا گیا۔ علماء کی عزت افزائی کی گئی۔ دینی تربیت گاہیں قائم کر کے اسلامی احکام و تعلیمات کی اشاعت کی جانے لگی۔ اسلامی مدارس کو منظم کر کے ان کا وفاق بنایا گیا۔ اسلامی کتب خانے کھولے گئے۔ عربی اور دینیات کی

تعلیم کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اور جامعۃ الازہر کے نمونے کی ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کے منصوبے کا اعلان ہوا۔ اس طرح اسلامی تحریک پھر ترقی کرنے لگی۔

جاپانیوں نے بہت محسوس کرلیا تھا کہ وہ اسلامی تحریک کو ترقی دے کر ہی مسلم عوام کی تائید حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مئی 1942ء میں "مجلس اعلیٰ اسلام انڈونیشیا" کے نام سے ایک مرکزی وفاقی تنظیم قائم کی گئی، جس میں جاوا اور ماوورا کی 6 اسلامی تنظیموں اور اداروں نے شرکت کی، لیکن جمعیۃ المحمدیہ اور نہضۃ العلماء دونوں الگ رہیں۔ دینی عقائد کو زیادہ مستحکم بنانا، مطالب قرآن کی تشریح کرنا، عوام کی فلاح وترقی اور خوشحالی کے لیے کام کرنا، اور عظیم تر ایشیا کے جاپانی منصوبہ کی ترقی وتکمیل کے لیے مسلمانوں کی ثقافتی معاشی اور مذہبی زندگی کو بہتر بنانا اس تنظیم کے خاص مقاصد قرار دیے گئے۔

اگست 1943ء میں جاپانیوں نے انڈونیشیا کو آزادی دینے کی تیاری شروع کردی، اور اس پالیسی کے تحت "مجلس اعلیٰ اسلام" کو تحلیل کرکے اسلامی جماعتوں کی ایک وسیع تر وفاقی تنظیم "مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا" (ماشومی) کے نام سے قائم کی گئی، جس میں المحمدیہ اور نہضۃ العلماء نے بھی شرکت کی۔ ممتاز مسلمان رہنماؤں نے اس نئی تنظیم سے تعاون کیا اور تمام اسلامی جماعتیں اور ادارے اس میں شامل ہوگئے۔ انڈونیشی مسلمانوں کو دین کی اساس پر متحد ومنظم کرنا، اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی ترقی اس تنظیم کا خاص مقصد قرار دیا گیا۔ اس کے ذریعے عوام کو فوجی تربیت بھی دی جانے لگی، اور "حزب اللہ" کے نام سے مسلم نوجوانوں کی ایک عسکری تنظیم قائم کی گئی۔

اکتوبر 1944ء میں "ماشومی" نے انڈونیشی مسلمانوں کو آزادی کے لیے تیار کرنے اور اسلام کی برتری کے لیے مخالف اسلام طاقتوں سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا، اور دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو شکست کے بعد اس نے اعلان کیا کہ انڈونیشیا نے مسلم عوام اور لاکھوں مسلح مسلمان سپاہی دین اسلام کی سربلندی اور انڈونیشیا کی آزادی کے لیے جنگ کریں گے۔ چنانچہ 1945ء میں اس اعلان کے ساتھ جنگ آزادی شروع کی گئی کہ ہم انڈونیشی عوام درحقیقت اللہ کی راہ میں لڑ رہے ہیں، تاکہ جمہوریہ انڈونیشیا کی حفاظت کریں جو اسلام کے لیے قائم کیا گیا۔

نومبر 1945ء میں جب آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی، سوکیمان نے اسلام کی سربلندی اور اسلامی مملکت کے قیام کو بنیادی مقصد قرار دے کر انڈونیشیا کی عظیم ترین تنظیم "مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا" (ماشومی) کے نام سے قائم کی۔

دوسری جنگ عظیم میں 14 اگست 1945ء کو جاپان کو شکست ہوئی اور انڈونیشیا اتحادیوں کے قبضے میں چلا گیا، مگر تین روز کے بعد 17 اگست کو انڈونیشی رہنماؤں نے آزادی کا اعلان کردیا۔ انگریزوں اور ولندیزیوں سے مجاہدین آزادی کی شدید جنگ کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر سوکارنو، ڈاکٹر حتا، شہریر، ظفر الدین کی قیادت میں بالآخر تحریک آزادی کامیاب رہی اور 28 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے فریقین کو جنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ 27 دسمبر 1950ء کو انتقال اقتدار ہوا۔ سوکارنو کو صدر منتخب کیا گیا۔ محمد حتا وزیراعظم نامزد ہوئے۔ جکارتہ وفاقی دارالحکومت قرار پایا۔ 20 جولائی 1950ء کو "ماشومی" کے ایماء پر تمام جزیروں کی ریاستیں ایک متحدہ وفاقی مملکت کی

تشکیل پر رضامند ہوگئیں۔ 14 اگست کو نیا وحدانی آئین منظور ہوا۔ 15 اگست کو ایک نئی ا ی جمہوریہ انڈونیشیا وجود میں آ گئی۔ 29 ستمبر کو اسے اقوام متحدہ میں رکنیت حاصل ہوگئی۔

آزادی کے بعد اسلامی تحریک

تحریک آزادی کی کامیابی سے گریز کر کے ہم پھر تحریک احیائے اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حصول آزادی کے بعد انڈونیشی رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ نئی جمہوریہ کو مستحکم بنانے اور اس کو جمہوری اصولوں کی اساس پر ترقی دینے کے لیے سیاسی جماعتوں کا وجود بہت ضروری ہے، چنانچہ سیاسی جماعتیں بنانے کا قانون نافذ کیا گیا۔ دو مہینے کے اندر انڈونیشیا میں کئی سیاسی جماعتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں سب سے بڑی جماعت ماشومی تھی۔ ماشومی نے اسلامی نظریات و تعلیمات کی اساس پر آزاد انڈونیشی مملکت کی تعمیر و ترقی کو اپنا نصب العین بنایا۔ تمام اسلام پسند عناصر "ماشومی" کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔

محمد سوکیمان

ماشومی کے بانی اور صدر اور تجدید و احیائے اسلام کی تحریک کے قائد ڈاکٹر محمد سوکیمان 1896 میں وسطی جاوا میں پیدا ہوئے۔ سکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہالینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ طلبہ تحریک اور "شرکتِ اسلام" کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔

کمیونسٹوں اور ولندیزی سامراج کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ 1934ء میں جب "شرکت اسلام" نے ولندیزیوں سے تعاون کی پالیسی اختیار کی تو انہوں نے اس جماعت کو چھوڑ دیا، اور "پارٹی اسلام" کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی۔ اعلانِ آزادی کے بعد سوکیمان نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ رضا کاروں کی فوج تیار کی اور وسطی جاوا کو اپنا مرکز بنا کر ہر محاذ پر ولندیزیوں سے جنگ کی۔ جنگ آزادی کے کامیاب اختتام پر جب انڈونیشیا کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے ہیگ میں کانفرنس ہوئی تو سوکیمان نے اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ مختلف جزائر کی متحدہ مملکت قائم کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ 1952ء میں انڈونیشیا کے وزیر اعظم ہوئے۔

ڈاکٹر محمد سوکیمان حاجی عمر سعید کے اس نظریے کے قائل تھے کہ آزادی تحریک کو احیائے اسلام کی تحریک اور نئی آزاد مملکت کو اسلامی مملکت بنایا جائے۔ چنانچہ آزادی کی جنگ میں انہوں نے نظریاتی اختلاف کے باوجود سوکارنو سے تعاون کیا۔ وہ بین الاسلامی اتحاد کے بھی بڑے حامی تھے اور اسلامی ممالک کی وحدت کو عملاً اور حقیقی بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے احیائے اسلام کے لیے ایک بڑی سیاسی جماعت "ماشومی" قائم کرنے ہی پر اکتفا نہیں، بلکہ اسلام کے ہمہ گیر مقاصد اور زمانے کے تقاضوں کو محسوس کر کے، معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لیے مفید اور ضروری ادارے بھی قائم کیے جو ہر ملک کے مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

ماشومی

مجلس شوریٰ مُسلمی انڈونیشیا

اکتوبر 1944ء میں جب جاپانیوں نے انڈونیشیا کو مکمل آزادی دینے کا اعلان کیا تو انڈونیشی عوام کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ کوئی ایسی جماعت ہونی چاہیے جو حصول آزادی کے بعد نئی آزاد مملکت میں اسلامی نظام نافذ کر سکے۔ چنانچہ غور وفکر اور صحیح فیصلے کے بعد ڈاکٹر سوکیمان نے ممتاز مسلم رہنماؤں کی کانفرنس جکارتہ میں طلب کی۔

یہ مسلم کانفرنس 7 نومبر 1945ء کو منعقد ہوئی جس میں ملک کی ایک نمائندہ اسلامی سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس جماعت کے لیے دو نام زیر غور تھے "مجلس شوریٰ مسلمی انڈونیشیا" اور اسلامی عوامی پارٹی (Partai Rakjat Islam)۔ بحث مباحثے کے بعد "ماشومی" قائم کی گئی۔ اس کے پہلے صدر ڈاکٹر سوکیمان منتخب ہوئے۔ پارٹی کا دستور اور مرکزی، علاقائی اور مقامی تنظیم کا خاکہ مرتب کیا گیا۔ پارٹی کی اعلیٰ قیادت کے لیے مرکزی کونسل اور سیاسی امور کے لیے پارلیمانی کونسل قائم کی گئی جس کے صدر محمد ناصر بنائے گئے۔ ملک کے تمام طبقوں نے اس نئی جماعت کا خیر مقدم کیا۔ تمام سیاسی اور مذہبی رہنما، دیہات کے بااثر کیائی (مولوی)، تاجر، صنعت کار، زمیندار سب ماشومی کی حمایت کرنے لگے۔ مسلمانوں کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں (پارٹی اسلام انڈونیشیا، شرکت اسلام انڈونیشیا، پے یندار باریسان، شرکتِ اسلام کیدوآ، جمعیت المحمدیہ، نہضۃ العلماء) حتیٰ کہ غیر مسلم سیاسی جماعتیں بھی اس بڑی جماعت میں شامل ہوگئیں۔ چند مہینوں کے اندر "ماشومی" انڈونیشیا کی سب سے بڑی اور پورے ملک کی نمائندہ جماعت بن گئی۔ انڈونیشیا کے تمام جزیروں اور علاقوں میں "ماشومی" کی شاخیں قائم ہوگئیں، اور تنظیم کی وسعت اور عوامی مقبولیت کے لحاظ سے یہ بااثر اور ملک گیر جماعت بن گئی۔

تجدید پسند رہنما

جب "ماشومی" قائم ہوئی تو انڈونیشیا کی تمام اسلامی جماعتیں، تنظیمیں اور ادارے اس میں شامل ہوگئے۔ ان کے رہنماؤں میں ہر قسم کے خیالات اور نظریات رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ یہ سب جماعتیں اور ان کے قائدین ماشومی کے بنیادی مقاصد سے متفق تھے اور اسلامی مملکت کے قیام اور اسلامی نظام حیات کے تجدید واحیاء کی مکمل تائید وحمایت کرتے تھے، لیکن نئی اسلامی مملکت میں اسلام کا سیاسی ومعاشرتی نظام کیا ہوگا اور معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق کیسے اختیار کیا جائے گا؟ اس پر اختلاف تھا، اور اس اختلاف کی بنیاد پر دو گروہ وجود میں آگئے تھے:

(1) قدامت پسند یا روایت پرست

(2) تجدید پسند یا جدیدیت نواز

قدامت پسندوں میں نہضۃ العلماء اور جمعیت المحمدیہ کے رہنما شامل تھے، اور تجدید پسندوں میں ''ماشومی'' کے نوجوان، روشن خیال رہنما شامل تھے۔ جمعیت المحمدیہ سے وابستہ بعض صف اول کے رہنما بھی تجدیدی خیالات رکھتے تھے۔ یہ تجدید پسند رہنما جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ مصری کے نظریات اور دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکات سے بہت متاثر تھے اور ان کا یہ نظریہ تھا کہ اسلام بے جان عقائد کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ ایک مکمل نظریۂ حیات ہے جو ہر زمانے میں مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ موجودہ دور کے مادہ پرستانہ ماحول میں مسلمانوں کو اسلام کی سچی رہنمائی حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جب اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر تسلیم کر کے نافذ بھی کیا جائے۔ عصر حاضر کی ضرورتوں اور تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی اصولوں اور نظریوں کی تاویل و تفسیر کی جائے اور ایک ترقی پذیر اسلامی معاشرہ بنا کر مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی زندگی کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ ''ماشومی'' کے تجدید پسند رہنما بڑے جوشیلے، مخلص، باہمت اور باعمل تھے۔ ان میں محمد ناصر، ظفر الدین، محمد روم اور ابوحنیفہ زیادہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کو ڈاکٹر سوئیکان کی حمایت اور سرپرستی حاصل رہی، جو قدامت پسندوں اور تجدید پسندوں میں ربط و تعاون اور اعتدال و توازن قائم رکھتے ہیں، اور جن کا دونوں گروہ بہت احترام کرتے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احیائی تحریک میں سرگرم حصہ لینے والے ان قائدین کی ذاتی خدمات پر بھی، اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے۔

ڈاکٹر محمد ناصر

احیائی تحریک کے ممتاز رہنما اور ماشومی کے سربراہ ڈاکٹر محمد ناصر (Natsir) 1908ء میں مغربی سماٹرا میں پیدا ہوئے۔ انڈونیشیا اور ہالینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ 1932ء میں انہوں نے بندوگ میں اسلامی تربیت کا ادارہ قائم کیا۔ نوجوانوں میں تنظیم، ڈسپلن اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے ''تعلیمی کلب'' قائم کئے۔ اسلامی رسائل و جرائد میں مقالات اور اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھ کر تعلیم یافتہ طبقے کو بہت متاثر کیا۔ جاپانی قبضے کے زمانے میں ''خفیہ تحریک'' منظم کر کے ملک کی آزادی کے لیے کام کیا۔ جاپان کے اعلانِ آزادی کے بعد تحریک آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ 1945ء میں جمہوریہ کی پارلیمنٹ میں اتحاد اسلامی (Persatuan Islam) کے نام سے ایک گروپ قائم کیا جو اسلامی نظام کے حامی اور جمہوریت پسند ارکان پر مشتمل تھا۔ 1946ء میں محمد ناصر وزیر اطلاعات و نشریات ہوئے، اور 1951ء میں ''ماشومی'' کی پہلی کابینہ کے وزیر اعظم بنے۔ یہ تجدید پسند، پارلیمانی گروپ رفتہ رفتہ پوری پارٹی پر حاوی ہو گیا اور ناصر ''ماشومی'' کے صدر منتخب ہوئے۔

انڈونیشیا 28 دسمبر 1949ء کو آزاد ہوا۔ پہلے عام انتخابات 1955ء میں ہوئے تھے، جن میں چار سیاسی جماعتیں یکساں قوت کے ساتھ کامیاب ہوئی تھیں۔ ان میں دو جماعتیں ماشومی اور نہضۃ العلماء انڈونیشیا کو اسلامی مملکت بنانے کی حامی تھیں۔ نہضۃ العلماء کے اثرات جاوا میں جو ملک کا سب سے کثیر الآباد جزیرہ ہے، بہت

گھرے تھے اور ان جزیروں میں ماشومی کے اثرات تھے۔ لیکن جب 1958ء میں صدر سوکارنو کے آمرانہ طرز عمل کے خلاف سماٹرا اور دوسرے جزیروں کے فوجی کمانڈروں نے بغاوت کی تو ماشومی پارٹی باغیوں کی حمایت کے الزام میں توڑ دی گئی، اور اس کے رہنما، جن میں محمد ناصر بھی شامل تھے، جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ دراصل نظریاتی اختلاف کے باعث محمد ناصر اور سوکارنو میں کبھی ہم آہنگی قائم نہ ہو سکی۔ 1951ء میں جب محمد ناصر وزیر اعظم بنے تھے، اس وقت بھی صدر سوکارنو نے ان کی اسلام پسندی کو ناکام بنانے میں ہر ممکن حربہ اختیار کیا۔ ڈاکٹر ناصر وزارت عظمیٰ سے دست بردار ہو گئے اور انہوں نے ڈاکٹر سوکارنو کے نظریات پر کھل کر تنقید کی اور نوبت خانہ جنگی تک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر محمد ناصر اسلامی نظام کے علم بردار ہیں۔ انگریزی، ولندیزی، عربی اور انڈونیشی زبانوں کے فاضل ہیں۔ اسلامی فلسفے کے بلند پایہ عالم ہیں اور جدید علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ترکی، مصر اور ہندوستان کی اسلامی احیائی تحریکوں اور ان کے رہنماؤں کا ان پر کافی اثر ہے۔ وہ علامہ اقبال کے نظریات سے بہت متاثر ہیں۔ انہوں نے اقبال کے بعض کلام کا انگریزی سے انڈونیشی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب ''اسلامی ثقافت'' ہے۔ انہوں نے ''دیوانِ دعوت'' کے نام سے جکارتہ میں ایک تبلیغی مجلس قائم کی ہے۔ یہ ایک علمی، دینی اور اشاعتی ادارہ ہے جس کی طرف سے اسلامی لٹریچر شائع کیا جاتا ہے۔ ''شاہ فیصل فاؤنڈیشن'' نے ڈاکٹر ناصر کی اسلامی خدمات کا اعتراف 1980ء کے اوائل میں ان کو اور مولانا ابوالحسن ندوی کو مشترکہ طور پر ''شاہ فیصل ایوارڈ'' دے کر کیا۔

محمد ظفر الدین

احیائی تحریک کے رہنماؤں میں ڈاکٹر محمد ناصر کے بعد سب سے اہم شخصیت محمد ظفر الدین ہیں۔ وہ 1911ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اقتصادیات اور مالیات کے ماہر ہیں۔ محمد ناصر کے ہم خیال اور رفیق کار رہے ہیں۔ ان کی کابینہ میں مالیات اور خزانے کے وزیر رہے۔ شہریار اور ہتا کی وزارتوں میں بھی وزیر خزانہ تھے۔ جنگ آزادی میں جب ولندیزی حکومت نے سوکارنو، ہتا، محمد ناصر اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا تو ظفر الدین نے سماٹرا میں جمہوریہ کی عارضی حکومت قائم کر کے تحریک آزادی کو جاری رکھا۔ حصولِ اقتدار کے لیے قوم پرست رہنماؤں نے جب کمیونسٹوں سے اتحاد کر لیا تو ظفر الدین نے اس کی شدید مخالفت کی اور کمیونسٹوں کو حکومت سے نکالنے اور جمہوریت کو بحال کرنے کے لیے 1958ء میں سماٹرا میں جب بغاوت ہوئی اور انقلابی حکومت قائم کی گئی تو ظفر الدین اس کے وزیر اعظم بنائے گئے۔

ظفر الدین اسلام کے معاشی اصولوں کی اساس پر اسلامی نظام معیشت قائم کرنے کے حامی ہیں۔ 1948ء میں انہوں نے ایک کتاب ''ہمارا سیاسی انقلاب'' لکھی۔ اس تصنیف میں اسلامی مملکت، انقلاب کے مقاصد اور اشتراکیت کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے۔ چنانچہ انہوں نے یہ واضح کیا کہ انڈونیشیا کو مارکسی اشتراکیت کی ضرورت نہیں جو طبقاتی کشمکش پیدا کرتی اور انفرادیت کو بالکل مٹا دیتی ہے۔ اشتراکیت استعمار ہے اور صرف وہی مسلمان اس کی حمایت کر سکتے ہیں جو اسلام کے بنیادی مقاصد سے بے خبر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام ہی وہ بنیاد ہے

جس پر جدید انڈونیشی معاشرے کی تعمیر ہونی چاہیے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارا سیاسی نظام بھی مذہب پر مبنی ہو، اور ان ہی مقاصد کی تکمیل کے لیے اسلامی مملکت کا قیام ہمارا پہلا اور بنیادی مقصد ہے۔

محمد روم

"ماشومی" کے تجدید پسند رہنماؤں میں محمد روم کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ 1908ء میں وسطی جاوا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد قانون کے پروفیسر بنے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز "شرکت اسلام" میں شامل ہونے کے بعد ہوا۔ انہوں نے بہت جلد پارٹی کے نوجوان رہنماؤں میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ ہمیشہ اعتدال پسند رہے۔ جب ولندیزیوں سے تعاون اور عدم تعاون کے مسئلے پر "شرکت اسلام" میں اندرونی کشمکش شروع ہوئی تو انہوں نے آگوس سالم کا ساتھ دیا اور ان کی قائم کردہ نئی پارٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بنے۔

محمد روم نے اسلامی نظریات و تعلیمات کی اشاعت کے لیے ولندیزی زبان میں ایک رسالہ جاری کیا اور اسلامی تجارتی انجمنوں کو منظم کیا۔ حصولِ آزادی کے بعد "ماشومی" میں شامل ہو گئے۔ شہریار کی متعدد وزارتوں میں وزیر داخلہ ہوئے۔ جنگ آزادی کے دوران میں ولندیزیوں سے گفت وشنید کے لیے جو انڈونیشین وفد بنائے گئے، محمد روم نے اس کی قیادت کی۔ "معاہدہ روم بروبان" کے بعد انہوں نے سیاسی تنازعات طے کرنے میں مہارت اور اصابت رائے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کر لی۔ چنانچہ وہ ہالینڈ میں انڈونیشیا کے سفیر بنائے گئے۔ محمد ناصر کی وزارت میں وزیر خارجہ ہوئے۔ محمد روم بڑے حقیقت پسند اور روشن خیال سیاستدان ہیں اور تجدیدی تحریک کے ایک بااثر رہنما تصور کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوحنیفہ

ماشومی کے تجدید پسند رہنماؤں میں ڈاکٹر ابوحنیفہ بھی بہت ممتاز ہیں۔ جمعیت المحمدیہ کے قائد اور بڑے روشن خیال عالم ہیں۔ اسلامی علوم کے علاوہ انہوں نے یورپ میں جدید تعلیم بھی حاصل کی۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کے بعد جب "جمعیت" "ماشومی" میں شامل ہو گئی تو ابوحنیفہ نے اس جماعت میں بھی امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ حاجی احمد دحلان اور حاجی منصور کے بعد ابوحنیفہ "جمعیت" کے قائد ہوئے۔ وہ انڈونیشیا کے سب سے بڑے ماہر تعلیم سمجھے جاتے ہیں۔ وزیر اعظم ناصر کی کابینہ میں وزیر تعلیم تھے۔ ابوحنیفہ کے خیال میں مسلمان اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب وہ قرآن کو اساس بنا کر ایسا نظام حیات مرتب کریں جو ان کی اجتماعی زندگی کے عصر حاضر کے جدید تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اور سیاست، معیشت اور معاشرت ہر شعبۂ حیات میں اصلاح و ترقی کا ضامن ہو۔ چنانچہ وہ اسلامی مملکت قائم کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ اسلام اور اسلامی معاشرے کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ معاشی نظام کو منصفانہ اور معتدل بنانے کے لیے نفاذ اسلام کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ تعلیمی نظام میں جدید سائنسی علوم کو یکساں اور مناسب اہمیت دے کر اسے دینی اور ملی مقاصد کے حصول کا موثر اور مفید ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اسلامی نظام کے احیاء اور تعلیم کی تنظیم نو کے لیے ابوحنیفہ نے قابل قدر کام کیا ہے۔

ماشومی کے اہم ادارے

ماشومی نے اپنی سیاسی تنظیم کے علاوہ فلاحی کاموں کے لیے بھی ادارے قائم کیے۔ دینی، معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کا کام ''مدیہ'' کے سپرد ہوا۔ معاشی مسائل و مشکلات پر قابو پانے کے لیے جداگانہ ادارے بنائے گئے۔

حزب اللہ

نو آزاد جمہوریہ کی آزادی کی حفاظت کے لیے ولندیزیوں سے جنگ کرنا ''ماشومی'' کا ایک فوری اور بنیادی مقصد تھا۔ چنانچہ ''ماشومی'' نے دو عسکری تنظیمیں قائم کیں، حزب اللہ اور سبیل اللہ۔ حزب اللہ رضا کاروں کی فوجی تنظیم تھی، جس میں 18 سے 25 سال تک کے نوجوان داخل کئے جاتے تھے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ یہ اسلام پر پختہ ایمان رکھتے ہوں اور ذہنی و جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا ہوں۔ 1944ء میں جاپانیوں کے عہد میں بھی، ان کی سرپرستی میں ''حزب اللہ'' اور ''سبیل اللہ'' کے نام سے دو عسکری تنظیمیں قائم ہوئی تھیں، اور جاپانی فوج نے ان کی فوجی تربیت کا اہتمام کیا تھا۔ ان تنظیموں کا مقصد یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لیے فوجی خدمات سرانجام دیں اور جاپانیوں سے تعاون کر کے اپنے مذہب کی حفاظت کریں اور اپنے ملک کو مغربی سامراج سے آزاد کرائیں۔ جاپانیوں کی رخصتی اور انڈونیشیا کی مکمل آزادی کے بعد ماشومی نے ان تربیت یافتہ نوجوانوں کو از سرنو منظم کیا اور مزید نئے رضا کاروں کو تربیت دے کر حزب اللہ کے نام سے عسکری تنظیم قائم کی۔ ولندیزیوں کے خلاف جنگ میں انہوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ نئے دستے بنائے گئے جو مختلف محاذوں پر لڑتے تھے۔ ہر دستے کا ایک کمانڈر تھا اور تمام دستوں کے کمانڈر اعلیٰ ضیاء العارفین تھے جو ماشومی کے ایک بڑے پر جوش رہنما تھے۔

حزب اللہ کی یہ تنظیم ماشومی کی مجلس اعلیٰ کے تحت تھی اور اس کی ہدایات کے مطابق جنگ کرتی تھی۔ حزب اللہ کے دستے ماشومی کی اس پالیسی کے حامی تھے کہ ولندیزیوں سے مسلسل جنگ کر کے ان کو انڈونیشیا سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ ''معاہدۂ رینویل'' کے مطابق جمہوری حکومت نے جب حزب اللہ کے دستوں کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے ولندیزیوں کے حوالے کر دیں تو پانچ ہزار رضا کاروں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور ''دارالسلام'' کی تنظیم قائم کر کے ولندیزیوں سے جنگ جاری رکھی۔

سبیل اللہ

ماشومی کی قائم کردہ دوسری عسکری تنظیم ''سبیل اللہ'' محافظ دستوں (سیکورٹی گارڈز) کی تنظیم ہے اور یہ بھی مسلح رضا کاروں پر مشتمل ہے۔ ''سبیل اللہ'' کی شاخیں مختلف علاقوں میں قائم کی گئی تھیں، تاکہ ہر علاقے کی حفاظت کا الگ الگ انتظام ہو سکے۔ ''حزب اللہ'' کے رضا کار جنگی محاذوں پر لڑنے کے لیے بھیجے جاتے تھے، اور ''سبیل اللہ''

کے رضا کاروں کا فرض یہ تھا کہ ولندیزیوں کے خلاف اپنے اپنے علاقے کی حفاظت کریں۔ ''سبیل اللہ'' کے رضا کار دستے بھی فوجی تربیت یافتہ اور اچھی طرح مسلح تھے۔ ہر علاقے میں ماشومی کے تمام ارکان کے لیے محافظ دستوں میں شامل ہونا اور فوجی تربیت حاصل کرنا لازمی تھا۔ اس طرح مسلح اور تربیت یافتہ محافظ دستوں کی ایک بڑی فوج تیار ہوگئی تھی۔ ''ماشومی'' کی ان دونوں عسکری تنظیموں کے رضا کاروں نے ولندیزیوں کا شدید مقابلہ کیا، اور آخر کار ماشومی کی سرفروشانہ جدوجہد کامیاب ہوئی۔

انجمن مسلم نوجوانانِ انڈونیشیا

''ماشومی'' نے مسلم نوجوانوں کو متحد و منظم کرنے پر خاص توجہ کی۔ 1945ء کے آخر میں جکارتہ کے مسلمان نوجوانوں نے یہ تحریک شروع کی تھی کہ انڈونیشی مسلمانوں پر جو غیر اسلامی اثرات ہیں، ان کو دور کرکے جمہوریت، عدل اور مساوات کی بناء پر اس ملک میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو اسلامی تہذیب وثقافت اور طرزِ معاشرت کا قابل تقلید نمونہ ہو۔ ''ماشومی'' نے اس تحریک کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی کوششوں میں نوجوانوں کی ہر ممکن مدد کی۔ پھر اس تحریک کو وسیع اور منظم کرنے کے لیے ''انجمن مسلم نوجوانان انڈونیشیا'' Gerenkan Pemudo Islam Indonesia قائم کر دی گئی اور یہ انجمن بھی دوسری اسلامی انجمنوں کی طرح ''ماشومی'' سے وابستہ ہوگئی۔ اس انجمن نے بھی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔

اس انجمن کا ایک اہم نصب العین بین الاسلامی اتحاد ہے۔ چنانچہ 1955ء میں ''موتمر عالم اسلامی'' کے سیکرٹری جنرل انعام اللہ خان نے جب کراچی میں مسلم نوجوانوں کی عالمی کانفرنس طلب کی تو اس انجمن کا وفد بھی شریک ہوا۔ اس انجمن کے ایک ممتاز رہنما ہارسونوب، حاجی عمر سعید کے فرزند ہیں۔ وہ کراچی کانفرنس میں موتمر شباب العالم الاسلامی کے صدر منتخب کیے گئے۔ اس انجمن نے عورتوں کے لیے بھی ایک الگ شعبہ قائم کر دیا اور غیر اسلامی رسوم ورواج کو ختم کرنا، دینی عقائد درست کرنا، اخلاق وکردار کو سنوارنا، بچوں کی فطری صلاحیتوں کو ترقی دینا اور ان کی دینی ودنیاوی تعلیم اور معقول تربیت کا انتظام کرنا ''شعبہ خواتین'' کے مقاصد قرار دیئے گئے۔ اس انجمن کے دونوں شعبوں کے کل اراکین نے جنگی خدمات انجام دیں، اور پھر سیاسیات میں بھی عملی حصہ لینے لگے۔ چنانچہ پارلیمنٹ اور حکومت میں بھی ان کو نمائندگی دی گئی۔ انجمن کا مقصد اسلامی نظام کا احیاء اور تجدید ہے۔

جمعیت العائشیہ

''ماشومی'' نے اپنا ایک بنیادی مقصد یہ بھی قرار دیا ہے کہ خواتین کو بھی مردوں کے مساوی سیاسی ومعاشرتی اور معاشی حقوق دیئے جائیں اور ان کے تمام جائز حقوق ومفادات کا تحفظ کیا جائے۔ اس مقصد کے تحت خواتین کی ایک اسلامی تنظیم ''جمعیت العائشیہ'' کے نام سے قائم کی گئی جو ''جمعیت المحمدیہ'' کے شعبۂ نسواں کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ اس جمعیت کے اہم مقاصد یہ ہیں کہ مسلمان خواتین کو دینی اور دنیاوی تعلیم اور امور خانہ داری کی تربیت دی جائے، اور ان کے لیے تعلیم وتربیت کے مراکز اور امدادی ادارے قائم کیے جائیں۔ بچوں کی بہتر پرورش اس انجمن کا ایک اہم مقصد ہے، تاکہ نئی نسل اسلامی ماحول میں پرورش پائے اور اچھے اخلاق وکردار کی مالک ہو۔

انڈونیشی مسلمانوں کی زندگی میں جو غیر اسلامی اثرات سرایت کر گئے ہیں ان کو دور کرنا، جاہلانہ رسوم و رواج کو مٹانا اور طرزِ معاشرت کو اسلامی بنانا اس انجمن کا ایک بنیادی مقصد ہے۔ خواتین کی عسکری تربیت بھی جمعیت کا مقصد ہے۔ اس تنظیم نے بھی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

انجمن مسلم کاشت کارانِ انڈونیشیا

ماشومی نے کاشت کاروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ''انجمن مسلم کاشت کارانِ انڈونیشیا'' (Sarekat Toni Islam Indonesia) قائم کی، جو مرکزی اور مقامی انجمنوں کی وسیع تنظیم پر مشتمل ہے۔ ہر گاؤں کا ہر کاشتکار مقامی انجمن کا رکن ہوتا ہے۔ اس انجمن کے تمام رکن ایک بورڈ کی مجلس عاملہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ بورڈ مقررہ شرح کے مطابق زکوٰۃ وصول کرتا ہے۔ یہ بورڈ شرح مرکزی مجلس عاملہ مقرر کرتی ہے۔ تمام مقامی انجمنیں مرکزی انجمن کے فیصلوں کی پابند ہیں۔ مرکزی تنظیم نے نہری اور غیر نہری اراضی کی پیداوار، غلہ کی تجارت، دوران سال بچت کی رقم اور مواشی پر زکوٰۃ کی مختلف شرحیں مقرر کر دی ہیں، جن کے مطابق مقامی بورڈ زکوٰۃ وصول کرتا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تو وہ مدارس اور مساجد پر صرف کرتا ہے، اور بڑا حصہ مرکزی انجمن کو دیا جاتا ہے۔ مرکزی انجمن یہ سرمایہ غریب کاشت کاروں کے لیے زمین فراہم کرنے پر صرف کرتی ہے، تاکہ وہ خود زمین کے مالک ہو کر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنا سکیں۔ اس انجمن کے تحت امداد باہمی کی انجمنیں بھی بنائی گئی ہیں جو پیداوار کی فروخت زرعی آلات، کھاد اور بیج کی ارزاں قیمت پر فراہمی کا انتظام کرتی ہیں اور ضرورت مند کاشت کاروں کو معمولی شرح سود پر قرضہ دیتی ہیں۔ کاشت کاروں سے ان چیزوں کی قیمت، اور ان کو قرض دی ہوئی رقم نئی فصل تیار ہونے پر نقد یا جنس کی شکل میں وصول کی جاتی ہے۔

انجمن مسلم تاجرانِ انڈونیشیا

1947ء کے آغاز میں ''ماشومی'' نے تاجروں کی امداد، اتحاد اور تنظیم کے لیے یہ انجمن قائم کی۔ اس کے لیے بھی زکوٰۃ کا اصول اختیار کیا گیا ہے۔ مقامی انجمن بنیادی یونٹ ہے۔ تمام تاجر اس کے رکن ہوتے ہیں۔ یہ سب مقامی مجلس عاملہ کے بورڈ کا انتخاب کرتے ہیں۔ تاجروں کے لیے زکوٰۃ کی شرحیں مرکزی تنظیم مقرر کرتی ہے۔ مقامی تاجروں کا بورڈ مقررہ شرحوں کے مطابق زکوٰۃ وصول کرتا ہے، جس کا کچھ حصہ مقامی ضروریات پر صرف ہوتا ہے۔ وصول شدہ زکوٰۃ کا بڑا حصہ مرکزی انجمن کو دیا جاتا ہے۔ اس سرمایے سے مرکزی انجمن نے غریب اور چھوٹے تاجروں کی امداد کے لیے ''ترقی امت بینک'' Bank Pembangunan Ummat قائم کیا ہے، جو بہت ہی کم شرح منافع اور معمولی ضمانت پر چھوٹے تاجروں اور تجارتی کاروبار شروع کرنے کے خواہاں غریب، لیکن مستحق لوگوں کو قرض دیتا ہے۔ ملک کے مختلف جزیروں میں اس بینک کی شاخیں قائم ہیں۔ سال بہ سال زکوٰۃ کی وصول شدہ مجموعی رقم سے سرمایے کی فراہمی، اور بینک کے کاروبار میں ترقی سے، بینک کے سرمایے میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور مختلف مقامات پر اس کی نئی شاخیں قائم ہونے لگیں۔ کاشت کاروں اور تاجروں کی انجمنوں کے قیام سے چینی ساہو کاروں کا سودی کاروبار ختم ہونے لگا اور وہ کئی علاقوں میں لین دین کا سلسلہ ختم کر کے واپس چلے گئے۔

مؤتمر مسلمی انڈونیشیا

جب ولندیزیوں کے خلاف ماشومی کا عسکری جہاد کامیابی سے ختم ہوا تو اس جماعت نے اپنے گزشتہ کاموں کا جائزہ لیا اور آئندہ کے لیے وسیع لائحہ عمل بنایا۔ ماشومی نے انڈونیشیا میں احیائے اسلام کی تحریک اور تمام اسلامی جماعتوں کی مرکزی، مشترکہ اور نمائندہ تنظیم کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی جماعتوں اور اداروں کے رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دسمبر 1949ء میں جوگجکارتہ میں "مؤتمر اسلامی" منعقد کی گئی جو پندرہویں مؤتمر تھی۔ اسلامی مؤتمروں (کانفرنسوں) کے سلسلے کا آغاز "شرکت اسلام" کے رہنما حاجی عمر سعید نے کیا تھا۔ ماشومی نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ پندرھویں مؤتمر میں تمام جزائر کی اسلامی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ مؤتمر کا بنیادی فرض یہ قرار دیا گیا کہ وہ انڈونیشی مسلمانوں کے تمام طبقوں کو اسلامی اخوت کی اساس پر متحد کرے، اور ان کی اجتماعی، سیاسی اور معاشی زندگی، تعلیم و تربیت اور ثقافت کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے اور ترقی دینے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرے۔ ان مقاصد کے تحت کام کرنے کے لیے مؤتمر نے آٹھ کمیٹیاں بنائیں جو حقوق نسواں، معاشرتی و اقتصادی امور، اسلامی قانون کی تشکیل جدید، اسلامی افکار کی تدوین، تعلیم، تربیت اور ثقافت کے امور، سیاسیات، دائرہ معارف اسلامیہ، تنظیم کتب خانہ جات اور نشر و اشاعت سے متعلق تھیں۔ اس کے علاوہ مؤتمر نے یہ بھی طے کیا کہ مسلمان طلبہ، مبلغوں، معلموں، صحافیوں، تاجروں، کاشت کاروں اور مزدوروں کی جو انجمنیں ہیں، ان میں باہمی ربط پیدا کرنے کے لیے ان کی مرکزی انجمنیں قائم کی جائیں، اور یہ سب مرکزی انجمنیں ماشومی سے وابستہ ہوں۔ مسلمانوں کی تمام تنظیموں اور اداروں میں اتحاد و تعاون، باہمی روابط اور ان کو ماشومی کی مرکزی تنظیم سے وابستہ رکھنے کے لیے "مؤتمر مسلمی انڈونیشیا" قائم کی گئی اور یوں یہ مؤتمر ماشومی کا ایک بہت اہم اور مؤثر ادارہ بن گیا۔

مؤتمر عالم الاسلامی

دنیائے اسلام کے مسائل سے عملی دلچسپی لینے اور تمام مسلمانانِ عالم کو مربوط و متحد رکھنے کا کام انڈونیشیا میں حاجی عمر سعید، حاجی احمد دحلان اور ان کے رفیقوں نے شروع کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت کے مسئلے نے انڈونیشی مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا تھا، اس سے بین الاسلامی اتحاد کی تحریک کو بڑی مدد ملی۔ اس کے بعد حجاز پر نجدیوں کے قبضے سے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ امت مسلمہ کے مسائل کے حل کی تدبیریں سوچنے کے لیے 1925ء میں پہلی مؤتمر عالم الاسلامی مکہ معظمہ میں منعقد کی گئی، جس میں انڈونیشی وفد بھی شریک ہوا۔ دوسری مؤتمر 1931ء میں بیت المقدس میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد تقریباً بیس سال تک یہ سلسلہ بند رہا۔ اور جاپانی قبضے کے زمانے میں انڈونیشیا کی مؤتمر کی شاخ بند ہوگئی۔

قیام پاکستان کے بعد بین الاسلامی اتحاد کی تحریک کو پھر ترقی ہوئی اور 1949ء میں تیسری، اور 1951ء میں چوتھی مؤتمر کراچی میں منعقد ہوئی اور اس مؤتمر کو مسلمانوں کی عالمی تنظیم کی حیثیت دی گئی۔ سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین کو عالمی مؤتمر کا صدر اور ڈاکٹر محمد سوکیمان کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ مختلف اسلامی ملکوں میں مؤتمر کی

شاخیں قائم کرنے کا سلسلہ ہوا۔ چنانچہ انڈونیشیا میں بھی ماشومی کے رہنماؤں نے مؤتمر عالم اسلامی کی شاخ قائم کی، اوراس کی مزید شاخیں مختلف جزائر کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کی گئیں۔مرکزی مؤتمر عالم الاسلامی زیادہ فعال نہیں رہی، اب اس کی جگہ اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) نے لی ہے اور انڈونیشیا او آئی سی کا ایک سرگرم اور فعال رکن ہے۔

ملائیشیا کے مسلمان

''احیائے اسلام'' کی تحریک کے ساتھ ساتھ اب کچھ ذکر ملائشیا کا بھی ہو جائے۔ اب ہم انڈونیشیا سے اترنے کی بجائے، اوپر شمال میں جاتے ہیں، جہاں ملائیشیا کے جزائر واقع ہیں۔ یہ بھی ایک اہم مسلم ملک ہے، اور آج کل اسے مسلم ملکوں کے سربراہوں کی تنظیم (او آئی سی) کی سربراہی حاصل ہے۔

31 اگست 1957ء کو جب ملایا نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی تو اس وقت ملایا کی حیثیت ایک ایسے وفاق کی تھی جو گیارہ ریاستوں (جوہور، کیڈہ، کیلانتان، ملاکا، نگری سمبیلان، پہانگ، پنانگ، پیراک، پرلیس، سلنگور اور ٹرنگانو) پر مشتمل تھا۔ چھ سال بعد 1963ء میں وفاق ملایا میں سنگاپور، سارا واک اور صباح کی تین ریاستیں اور شامل ہو گئیں اور اس نئے اور عظیم تر وفاق کا نام ملائیشیا رکھا گیا۔ دو سال بعد 9 اگست 1965ء کو سنگاپور کی ریاست، جس میں چینی باشندوں کا تناسب 80 فیصد سے زیادہ ہے، وفاق سے علیحدہ ہو گئی، کیونکہ سنگاپور کے چینیوں کو ملائیشیا کی وفاقی حکومت پر ملائی یا میلے باشندوں کا غلبہ گوارا نہیں تھا۔

ملائی باشندے مسلمان ہیں، جن کی آبادی پورے ملک میں تقریباً نصف ہے۔ آبادی کا تناسب اس قدر کمزور ہے کہ ملائیشیا کو خالص اسلامی مملکت بنانے کا کام ذرا مشکل اور پیچیدہ ہے۔ غیر مسلم آبادی کی اس اکثریت کی وجہ سے ہم ملائیشیا کو مشرق بعید کا لبنان یا نائیجریا کہہ سکتے ہیں۔ اس مشکل کے باوجود اسلامی نقطۂ نظر سے ملائیشیا کا ایک امید افزا پہلو یہ ہے کہ صباح اور سارا واک کے غیر ملائی، خصوصاً غیر چینی باشندوں میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے اور ملائی باشندوں میں چینیوں کے مقابلے میں شرح پیدائش بھی زیادہ ہے۔ دینی لحاظ سے ملائی مسلمان راسخ العقیدہ اور باحمیت مسلمان ہیں۔

ملائیشیا میں مسلمانوں کی موثر اکثریت نہ ہونے کے باوجود ملائیشیا کے دستور میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔ ملائیشیا سے ہر سال تقریباً پندرہ ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں جو مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کو دیکھتے ہوئے بہت بڑی تعداد ہے۔ اس مقصد کے لیے ملائیشیا میں ''حج سکیم'' کے نام سے ایک بڑا مفید نظام قائم ہے۔ اس سے پہلے دیہات میں رہنے والے مسلمان حج کے لیے زندگی بھر کی پونجی زمین کے اندر دبا دیتے تھے یا گھر میں جمع کرتے رہتے تھے۔ یہ سرمایہ کام میں لانے کے لیے حکومت نے حج سکیم جاری کی۔ اس سکیم کے تحت جو شخص حج کے لیے جانا چاہے، وہ اپنا سرمایہ ایک ادارے کے پاس جمع کرا دیتا ہے۔ یہ ادارہ اس سرمایے کو تجارتی کمپنیوں میں لگا دیتا ہے۔ اس پر جو منافع حاصل ہوتا ہے، وہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ ملائی مسلمان چونکہ فریضۂ حج کی ادائیگی کا

بے پناہ شوق رکھتے ہیں، اس لیے وہ اپنا تمام جمع شدہ سرمایہ یا بچتیں حج سکیم میں لگا دیتے ہیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اکثر افراد اپنے منافع کی پونجی سے حج کر آتے ہیں اور ان کا اصل سرمایہ کاروبار ہی میں لگا رہتا ہے۔ سرمایہ کاری نفع یا نقصان کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور اس سکیم میں سود کو کوئی دخل نہیں۔ اس نظام سے سرمایہ بھی گردش میں رہتا ہے اور ہر سال ہزاروں ملائی اپنا دینی فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

اسلام کا ورود

ملائی باشندوں میں اسلام کیونکر پھیلا؟ ان پر اسلام کے کیا اثرات کیونکر قائم ہوئے؟ ملائیشیا میں احیائے اسلام کی تحریک کا حال معلوم کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملائیوں کے مزاج میں اسلامی ثقافت کے خصائص کیونکر داخل ہوئے۔ ملائی لوگ ابتدا میں پراچین یعنی قدیم باشندوں کی حیثیت سے ملایا کے وسطی حصے میں آباد ہوئے۔ پھر اس بڑے جزیرے کے مشرقی اور شمالی حصوں میں پھیلے ہوئے اور آبنائے میں متوطن ہو گئے خصوصاً ملاکا اور بورنیو میں بڑے بڑے دریاؤں کے ساتھ ساتھ اپنی بستیاں قائم کیں۔ یہ لوگ دور دور تک پھیلی ہوئی انڈونیشی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی بولیاں مڈغاسکر سے لے کر فلپائن تک اور ایشیا کے انتہائی جنوب سے لے کر بحرالکاہل کے دور افتادہ جزائر مائکرونیشیا اور ملے نیشیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس علاقے میں اسلام کے ورود سے قبل ایک اعلیٰ درجے کی مہذب ہندووانہ حکومت موجود تھی اور یہاں کے بحرنورد باشندے قرب و جوار اور دور دور کے علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ انہوں نے تجارت ہی کی راہ سے ملائی زبان متعدد بندرگاہوں اور جزیروں میں پہنچائی۔ یہ پوری طرح معلوم نہیں کہ کس صدی میں اسلام نے یہاں ہندو مذہب کا خاتمہ کیا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ دینِ اسلام نے اپنی آمد پر ملائی قوم کو جزیرہ نما میں آباد پایا، اور یہ کہ ملائی زبان تجارتی مقاصد اور سیاسی تعلقات کے لیے ایک مقبول زبان کی حیثیت سے استعمال ہو رہی تھی۔

ملائی مسلمانوں کی زبان

یہ اسلام ہی کی برکت تھی کہ ملائی زبان جو پہلے سنسکرت کے الفاظ سے معمور تھی، بہت ہی مخلوط قسم کی ایک باقاعدہ مدون اور بامحاورہ زبان بن گئی۔ اسلام کا سیل رواں اپنے ساتھ بہت سے تامل الفاظ اور بے شمار عربی الفاظ لایا، جن میں سے بعض کا قالب دکنی یا فارسی تھا ساتھ ہی بہت سے فارسی الفاظ تھے جن میں سے بعض ہندوستانی خصوصیات لیے ہوئے تھے۔ ان مختلف عناصر کے ملاپ سے ملائی زبان مسلمانوں کا ذریعہ اظہار قرار پائی، جس طرح شمالی ہند میں فارسی، عربی اور بھاشا زبانوں کے ملاپ سے اردو زبان وجود میں آئی۔ یہ بلاشبہ ملائی زبان پہلے ہی ایک سادہ شکل میں ہر قسم کے دیسی باشندوں، غیر ملکی تاجروں اور بعد میں آنے والے پرتگیزی اور ولندیزی کپتانوں اور سفیروں کے ساتھ میل جول کے لیے موزوں ہونے کے سبب مجمع الجزائر کے ان حصوں میں پہنچ چکی تھی جہاں آمد و رفت بکثرت ہوتی تھی۔

یہ اسلام کی شان ہے کہ اس نے ملائی زبان کو ادبی درجہ عطا کیا اور جب اس زبان میں وسیلۂ اظہار کے طور پر اپنا مقام حاصل کیا اور اس میں بے شمار عربی کتابوں کے ترجمے کر لیے گئے تو اس کی شکل و صورت نکھر آئی اور اس کے

املا کے قواعد وضوابط بھی باقاعدہ طور پر مرتب کر لیے گئے۔ ان قواعد نے اسے ادبی اور دینی مقاصد کے لیے موزوں زبان بنا دیا اور اصول دین، احکام شریعت اور ادبیات کے لیے ایک عمدہ ذریعۂ ابلاغ کی بھی صورت دے دی۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ وہ روزمرہ یا عوامی زبان جو اکثر بندرگاہوں میں سنی جاتی ہے، وہ اس ترقی یافتہ ادبی زبان سے بہت مختلف ہے، جو ملاکا میں پروان چڑھی، جہاں کبھی سلطنت کا صدر مقام اور کتب خانہ تھا۔

جب عرب اور ہندوستان کے علماء وفضلاء جزیرہ آچے میں آئے تو وہ نہ صرف دینی مسائل پر ملائی زبان میں بحث مباحثہ کرتے رہے، بلکہ انھوں نے اس زبان میں کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس کی ادبی شکل تا حال اسی طرح برقرار ہے۔ ادبی تصانیف میں وہی قدیم تراکیب استعمال کی جاتی ہیں اور عام بول چال (روزمرہ) کی زبان مختلف جزیروں کے مختلف حصوں میں مستعمل ہے۔ جزیرہ مالوکا اور بالخصوص جزیرہ امبون میں ملائی زبان کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے استعمال کیا گیا۔ لہٰذا ان جزیزوں میں اس زبان نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ ملائی زبان کی صرف ونحو (گریمر) پر عربی صرف ونحو کے خاصے اثرات ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی اسلامی اثرات کی وجہ سے اس زبان کے بنیادی اور قدیم خصائص میں کوئی نمایاں تغیر پیدا نہیں ہوا۔ البتہ اس کا مجموعی ماحول اسلامی بن گیا ہے۔ عربی زبان نے ملائی ذخیرے میں بے شمار الفاظ کا اضافہ کر کے اس کے تحریری ادب کو ایک انفرادی اسلامی ادب کی خصوصیت عطا کر دی ہے۔

ملائی زبان کا ادب

زمانہ قبل اسلام کے ادب کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ قدیم سے قدیم شکل میں اس زبان کی جو ادبی تحریر ملی ہے، وہ صرف عربی رسم الخط میں ہے۔ یہ قدیم ترین مخطوطات کیمبرج اور اوکسفرڈ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان کا زمانہ تحریر سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے اوائل کا ہے۔ سولھویں صدی کے وقائع سے پتا چلتا ہے کہ جزیرہ ملاکا کے ایک شاہی کتب خانے سے اس وقت استفادہ کیا گیا جب پرتگیزیوں نے 1511ء میں اس شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ سولھویں صدی میں تحریری ادب کی موجودگی کا یہ واحد تاریخی ثبوت ہے۔

ملائی زبان کا ادب خاص طبع زاد ہے۔ وقائع، حکایات اور نظم گوئی میں سے شاید ہی کوئی ایسی صفت ہو، جس کا ماخذ بلا واسطہ عربی زبان ہو۔ بہت سی مذہبی اور تاریخی داستانیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں، لیکن ان تمام ادبی تصانیف پر اسلامی فضا کا رنگ ہے۔ ان میں عربی الفاظ کی فراوانی ہے۔ یہ اسلامی نظریات وافکار سے بھرپور ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض دیسی مزاحیہ کہانیاں اور افسانے بھی ہیں، خصوصاً وہ جو کسی زمانے میں بہت مقبول تھے، مثلاً چوہے اور ہرن کی کہانیاں۔ مزید برآں کچھ طبع زاد داستانیں ہیں، جن پر ہندوانہ اثر غالب ہے۔ کچھ جاوا کی قدیم حکایات ہیں۔ لیکن محض یہی بات کہ یہ تمام کتابیں، قصے کہانیاں، عربی رسم الخط میں لکھی گئی ہیں اور ان میں الفاظ کی کثرت ہے، اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ یہ اسلامی ذہن کی پیداوار ہیں۔ تاریخی ونیم تاریخی تحریریں حتیٰ کہ قدیم افسانوں اور نیم رومانوی تحریریں بھی، قریب قریب پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگی جا چکی ہیں۔ ان داستانوں کی بھی کثیر تعداد ہے، جن کا تعلق غیر ملکی شہزادوں، شہزادیوں اور ان کے مہم جویانہ (یا عشقیہ) کارناموں سے ہے۔ یہ

داستانیں تمام شرق الہند کے طول وعرض میں ملائی زبان لکھنے پڑھنے والوں میں متداول ہیں۔ اکثر فسانے عربی، فارسی یا ہندوستانی زبانوں سے ترجمے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ''طوطی نامہ'' اور ''فسانۂ عجائب'' وغیرہ۔

بہت سی کتابوں کا موضوع انبیائے کرام بالخصوص آنحضرت ﷺ کی اہل بیت ازواج مطہرات اور آپ ﷺ کے صحابہؓ ہیں۔ کچھ تصانیف مثلاً امیر حمزہ کی داستان اور محمد بن حنفیہ کی داستانیں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ملائی زبان میں آج کل اسلامی موضوعات پر بہت سی نئی تصانیف وجود میں آئی ہیں اور امت مسلمہ کے حالات حاضرہ اور ان کے عروج وزوال کے اسباب پر تحقیق ومقالات بھی لکھے جارہے ہیں۔

ملائیشیا کی اسلامی تحریکیں

جزیرہ نمائے ملایا پر انگریزوں کا مکمل قبضہ 1874ء میں ''معاہدہ پنکور'' کے تحت ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے طے پایا کہ ملایا کے لیے ایک انگریز گورنر مقرر ہوگا۔ ملایا کے سلطان یا حکمران کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ہر معاملے میں انگریز گورنر سے مشورہ کرے، اس کا مشورہ تسلیم کرے اور ''مذہب وثقافت کے سوا'' تمام امور وحاملات پر اس کے مشورے کے مطابق عمل درآمد کرے۔ اس نئے انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مذہبی قسم کی بیوروکریسی وجود میں آئی جو شاہی دربار، اور بالخصوص شاہی دربار سے وابستہ مقتدر اصحاب کے ماتحت تھی۔ مذہبی قسم کی بیوروکریسی کو آپ ملائیت کہہ سکتے ہیں، جس نے اسلام کی اس کے سوا اور کوئی خدمت انجام نہیں دی کہ سلطان اور اس کے سیکولر مزاج حواریوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔ سرکاری درباری مولویوں کا ملائی عوام پر کوئی اثر رسوخ نہ تھا۔

لیکن شاہی دربار سے جو علمائے دین اور اہل دانش کام کررہے تھے، ان کے نزدیک انگریزی راج ''کفر'' تھا جو ملک میں عیسائیت پھیلانے کے لیے آیا ہے۔ علماء اپنی تقریروں اور تحریروں سے انگریزی راج کے خلاف مزاحمت بلکہ مخالفت پیدا کررہے تھے۔ انہوں نے ملائی عوام کے اسلامی تشخص کو بچانے، بلکہ مستحکم کرنے کے لیے اپنے مدرسے قائم کئے، جن کا سرکاری تعلیمی نظام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان مدرسوں کے لیے جداگانہ نصاب تیار کیا، اور ان کے انتظام کے لیے مالی وسائل چندوں سے فراہم کیے۔ برطانوی سامراج اور شمال میں سیامی توسیع پسندی کے خلاف جذبۂ جہاد کی تلقین کی گئی، لیکن مجموعی طور پر سلطان اور عوام انگریزوں کی غلامی میں عافیت خیال کرتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک نئی اصلاحی تحریک نمودار ہوئی، جس نے ملائی معاشرے کی سماجی واقتصادی پسماندگی اور مذہبی قدامت پرستی کے خلاف نہ صرف یہ کہ سخت تنقید کی، بلکہ ایک ٹھوس، قابل عمل پروگرام بھی قوم کے سامنے رکھا۔ اصلاح تحریک کا بیڑا اٹھانے والے وہ دانشور تھے، جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں مشرق وسطی میں تعلیم پائی تھی اور دوران تعلیم جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ مصری کے خیالات وافکار سے اثر قبول کیا تھا۔ اس سے ذرا پہلے وہابی تحریک کے اثرات ملایا میں پہنچ چکے تھے۔ نئی اصلاحی تحریک کے قائد شیخ طاہر جلال الدین (1869ء۔ 1957ء) تھے جو مفتی محمد عبدہ کے شاگرد تھے۔ شیخ نے ملایا اور انڈونیشیا میں اسلامی تعلیمات کے فروغ اور بدعتی رسوم کے انسداد کے لیے 1906ء میں ایک جریدہ ''الامام'' کے نام سے جاری کیا۔ اس تحریک کا

صدر مقام پہلے سنگاپور، بعد میں پنانگ منتقل ہو گیا۔ اس تحریک کے تحت جگہ جگہ دینی مدرسے قائم کیے گئے جن کا نصاب سکول سسٹم سے بالکل مختلف، بلکہ خلاف تھا۔ پرانے نصاب میں دو بنیادی اصلاحات کی گئیں۔ اول یہ کہ ضروری جدید علوم کے مضامین شامل کیے گئے، دوم اسلام کی تعلیم و تدریس کے لیے نئے اور جدید طریقے اختیار کیے گئے۔ مدرسوں کے اندر دینی تعلیم کی جدیدیت، اور مدرسوں سے باہر اخبارات و جرائد کے نئے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اصلاح پسندانہ نظریوں کی اشاعت نے ملک کے معاشرتی ماحول اور سیاسی فضا پر دور رس اثرات قائم کیے۔

سرکاری درباری مولویوں اور قدامت پسندوں کی جماعت ''دینی'' سے دینی عمل اور رسوم و اصلاح پسند ''بدعت'' کہتے تھے، لیکن پسندیدہ ''نقابلی'' نہیں تھے، بلکہ زیادہ زور ''اصول'' پر صرف کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان لوگوں کے ''خرافات و توہمات'' کو زیادہ ہدف تنقید نہیں بناتے تھے، بلکہ کی مذمت زیادہ کرتے تھے۔ قدامت پسند علما اصلاح پسندوں کو قدرے حقارت سے ''قوم مودا'' (نوجوان ٹولہ) کہہ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔ نوجوان گروپ ردعمل کے طور پر علما کو استہزائیہ انداز میں ''قوم توا'' (بڈھے کھوسٹ) کہتے تھے۔ نوجوان گروپ کسی فرقے یا مسلک پر اعتماد کرنے کی بجائے براہ راست قرآن اور سنت کو اسلام کا بنیادی سرچشمہ قرار دیتا تھا، اور قرآن و سنت کی روشنی میں عصری حالات اور تقاضوں کے مطابق اجتہاد کا قائل تھا۔ نوجوان گروپ نے مذہبی اصلاحات کے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے دو محاذ بیک وقت کھول دیے۔ ایک محاذ مسلمانوں کے ذہنی و فکری افلاس اور ان کی معاشرتی و معاشی پسماندگی دور کرنے کا تھا۔ دوسرا محاذ دیہات میں غیر ملکی، غیر مسلم آبادکاروں میں اسلام کی تبلیغ کا محاذ تھا، جس میں عیسائیت کی تبلیغ کے سیلاب کو روکنے کا اقدام بھی شامل تھا۔ اصلاح پسندوں نے سیاست میں بھی عمل دخل شروع کر دیا اور برطانوی سامراج کے خلاف تقریر و تحریر کا آغاز کر دیا۔ یوں ملائی عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں آزادی کی تحریک رفتہ رفتہ رونما ہونے لگی۔ اصلاحی تحریک اپنے مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ انگریز حکومت اس کی حریف بن گئی۔ انگریز حکومت سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اس کی مخالفت قدامت پسند علما اور سیکولر مزاج افسروں دونوں نے اپنے اپنے دلائل کے زور پر کی، لیکن بعد ازاں بیسویں صدی کے نصف میں، دوسری جنگ عظیم کے دوران، اور بعد میں، اصلاحی تحریک جب سکولوں کے فارغ التحصیل تعلیم یافتہ طبقے کی نوجوان قیادت میں آئی تو کامیاب ہو گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جاپان کی عبوری حکومت اگرچہ عوام کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی، لیکن اسلام کو اس سے کوئی گزند نہیں پہنچی۔ اصلاحی تحریک تو دب گئی، لیکن اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ آزادی کی تحریک نے تقویت حاصل کر لی۔ 1946ء میں یومنو (Umno) قائم ہوئی یعنی یونائیٹڈ ملائی نیشنل آرگنائزیشن۔ متحدہ ملائی قومی تنظیم۔ 1946ء جب جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد برطانیہ نو ریاستوں کی ایک ''یونین ملایا'' قائم کرتا ہے سنگاپور، صباح اور سارا واک کو برطانیہ کی نوآبادیوں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ملائی عوام نے ''یونین'' کی سخت مزاحمت کی، جس کے نتیجے میں 1948ء میں ''فیڈریشن آف ملایا'' بنائی جاتی ہے۔ 1957ء میں ملایا کو آزادی ملتی ہے اور وہ دولت مشترکہ کا رکن بن جاتا ہے۔ 1960ء میں برطانیہ اور ملایا ایک نئی فیڈریشن ''ملائیشیا'' کے نام سے قائم کرنے

پر اتفاق کرتے ہیں جس میں ملایا، سارا واک، صباح، برونائی اور سنگاپور کا شامل ہونا قرار پایا۔ برونائی نے آخری وقت میں فیڈریشن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ 1965ء میں سنگاپور بھی وفاق ملائیشیا سے الگ ہو گیا۔

اس پورے عرصے میں کوئی اسلامی تحریک جڑ نہ پکڑ سکی۔ جب بھی کوئی تحریک نمودار ہوتی حکومت اسے ختم کر دیتی۔ 1948ء میں "حزب المسلمین" قائم ہوئی۔ حکومت نے اسے کالعدم قرار دے دیا اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے غیر معینہ مدت کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ 1951ء میں "یومنو" کے چھوٹے سے ایک ہو کر ایک الگ "پان ملائی اسلامک پارٹی" بنائی۔ جو "پاس" کے نام سے مشہور ہے۔ اس جماعت کے منشور میں سیاست میں حصہ لینے کی شق خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سیاست میں حصہ لینے کے باعث 1955ء میں اس پارٹی کو سیاسی جماعت کی حیثیت سے رجسٹریشن مل گئی۔ اس پارٹی کی وجہ سے ملائی عوام میں "روح اسلام" سے ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا۔ "یومنو" ایک طرف حکومت برطانیہ پر آزادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھی، اور دوسری طرف ملک میں اسلام کو عوام کا اصل اور مرکزی سرچشمہ قرار دینے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ آزادی کے بعد بھی یہ تحریک جاری رہی۔

ایک اندازے کے مطابق ملائیشیا کی موجودہ آبادی دو کروڑ 32 لاکھ کے قریب ہے۔ مذہب کے لحاظ سے اوسط تقسیم یہ ہے: مسلمان 60 فیصد، چینی 30 فیصد، باقی دس فیصد میں ہندو، بدھ اور عیسائی شامل ہیں۔ از روئے آئین اسلام ملائیشیا کا سرکاری مذہب ہے۔ از روئے رواج و رسوم ملائیشیا کے تمام سلاطین اسلام کے محافظ خیال کیے جاتے ہیں۔ عوام کے عقائد و شعائر بڑی حد تک اسلامی معیار و اقدار کے مطابق ہیں، اس کے باوجود حکومتوں کی سیکولر نواز پالیسی کی وجہ سے اسلامی قوتوں کو ضعف پہنچتا رہتا ہے۔ وزیراعظم تنکو عبدالرحمن کی حکومت نے انگریزوں کی سرپرستی میں نئی مملکت کو سیکولرازم کی راہ پر لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے اسلام کے نظام سیاست و حکومت کی مخالفت کی۔ ان کے اس رویے کی شدید مزاحمت پان ملائی اسلامک پارٹی (پاس) اور دوسری اسلامی جماعتوں نے کی۔ 1969ء میں نسلی فسادات کے نتیجے میں جب تنکو عبدالرحمن کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ "نیشنل فرنٹ" کی مخلوط حکومت قائم ہوئی تو "پاس" نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد ملائیشیا کے دوسرے وزیراعظم تنکو عبدالرزاق کے عہد میں "اسلامک سنٹر" قائم ہوا، جس کا ایک شعبہ وزیراعظم کے سیکرٹریٹ میں "محکمہ اسلامی مذہبی امور" کے نام سے کام کرنے لگا۔ تنکو عبدالرزاق کی حکومت نے "پاس" کی سفارشات اور دوسری دعوۃ تحریکوں کے مطالبات پورے کرنے کی غرض سے تعلیمی، معاشرتی اور معاشی ترقی کے متعدد پروگرام بنائے۔

ستر کی دہائی میں سیکولر تعلیمی اداروں میں طلبہ کی اسلامی جماعتوں کی فعال سرگرمیوں کے نتیجے میں "دعوۃ تحریک" وجود میں آئی۔ طلبہ کی جماعتوں میں پکپیم (Pkpim) اور آبیم (Abim) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "دعوۃ تحریک" درحقیقت پاکستان اور مشرق وسطیٰ کی طلبہ تحریکوں کی تقلید میں شروع ہوئی تھی۔ عملی سیاست میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ دعوۃ تحریک نے قانون سازی میں اسلامی احکام اور اقدار کی شمولیت پر زور دیا۔ اسلام کا مفہوم محض عبادات سے بڑھ کر معاملات پر بھی منطبق کیا گیا، اور اس نکتے پر خاص زور دیا جانے لگا کہ اسلام مکمل ضابطہ

حیات ہے۔ ملک میں شریعت کے مطابق سیاسی نظام لانے کے لیے متعدد دعوتی تنظیمیں وجود میں آئیں، جن کی قیادت تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان تنظیموں نے قومی زندگی میں اسلامی قوانین واقدار کی ترویج کے لیے نہ صرف مطالبہ کیا بلکہ زندگی کی ہر سطح پر عملی اقدامات بھی کیے۔ ان اقدامات سے مذہب کی اہمیت وضرورت کا احساس شدید ہوگیا اور وسعت کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی پیدا ہوئی۔

اسلامی انقلاب کی علم بردار ''پان ملائی اسلامک پارٹی'' کے بعد دوسری بڑی تنظیم ''تحریک دعوت'' ہے۔ 1970ء تک یہ محض تبلیغی ادارہ تھا جو غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے اور نومسلموں کو اسلامی تعلیم وتربیت دینے کا کام کرتا تھا۔ لیکن 1970ء کے بعد یہ جماعت مسلمانوں کے تمام معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی معاملات میں بھرپور دلچسپی لینے لگی، اور اس کے تحت کئی ذیلی تنظیمیں زندگی کے مختلف شعبوں میں سرگرمی سے کام کرنے لگیں۔ ان میں سب سے اہم ''مسلمان نوجوانوں کی تحریک'' (مسلم یوتھ موومنٹ آف ملائیشیا) ہے، جس کے بانی انور ابراہیم تھے۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد کا تعلق بھی اس جماعت سے تھا جسے عرف عام میں ''آبیم'' (Abim) کہا جاتا ہے۔ تن حسین کی حکومت نوجوانوں کی اس تحریک کے خلاف تھی، لیکن تحریک تیزی سے پورے ملک میں مقبول ہوگئی۔ انور ابراہیم اور ڈاکٹر مہاتیر محمد سرمایہ داری نظام کے خلاف رہے اور اسلامی اقتصادی نظام کے حامی تھے۔ حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کی بڑی کوشش کی۔ بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں معاشی بحران شروع ہوا تو دعوۃ تحریک کے تحت نوجوانوں نے زبردست مظاہرے کیے اور اسلامی نظام کا مطالبہ کیا۔ کمیونسٹوں نے اس مطالبے کی مخالفت کی تو مسلم نوجوانوں نے کمیونسٹوں سے گوریلا جنگ کا آغاز کردیا۔ جنوری 1976ء میں وزیراعظم تن عبدالرزاق فوت ہوجاتے ہیں۔ ان کی جگہ حسین بن عون وزیراعظم بنتے ہیں۔ وہ کمیونسٹوں کے بھی خلاف تھے اور دعوۃ تحریک کے بھی۔ انہوں نے کمیونسٹوں کا انقلاب روکنے کے لیے سختی کی پالیسی اختیار کی، اور دوسری طرف دعوۃ تحریک کے بانی انور ابراہیم (بعد ازاں وزیراعظم) کو دو سال کے لیے نظر بند کردیا۔

1978ء میں نئے انتخابات میں حسین بن عون کی پارٹی واضح اکثریت سے جیت جاتی ہے۔ ویت نام کے پچاس ہزار مہاجرین ملائیشیا میں داخل ہوجاتے ہیں۔ ویت نامی مہاجرین کے ساتھ ساتھ فلپائن کے ہزاروں مسلمان ہجرت کرکے ملائیشیا کا رخ کرتے ہیں۔ انہی دنوں ملائیشیا کا منتخب بادشاہ سلطان یحییٰ چل بسا اور افراتفری ہوجاتا ہے۔ ان سخت اور تشویشناک حالات کے باوجود اسلامی تحریکوں کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں، جن کے نتیجے میں وزیراعظم حسین بن عون کی حکومت سے سبکدوش ہونا پڑا اور ان کی جگہ ڈاکٹر مہاتیر بن محمد 1981ء میں وزیراعظم بنتے ہیں جو مسلسل 23 سال تک حکومت کرتے رہے۔ ان کے عہد میں اسلام کے لیے خاصی پیش رفت ہوئی۔ بلاسود بینک کاری کا آغاز ہوا اور پہلا اسلامی بینک ''بینک اسلام ملائیشیا'' کے نام سے قائم ہوا۔ اسلامی دنیا کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے ملائیشیا نے اسلامی ممالک کے درمیان تعاون بڑھانے کے سلسلے میں اسلامی سربراہ کانفرنس (او آئی سی) کی سفارشات کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ملائیشیا میں احیائے اسلام کی نمایاں ترین علامت ''مسلم یوتھ موومنٹ'' ہے۔ تحریک کے اصل روح رواں

انور ابراہیم ہیں جو کئی مرتبہ سزائے قید بھگت چکے ہیں۔ انہیں حسین بن عون کی حکومت نے بھی جیل میں ڈالا۔ تبصرہ نگار دونوں کے باہمی کشمکش کو اقتدار کی آویزش قرار دیتے ہیں۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ عالمی سامراج اور امریکی اقتصادی استعمار کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ اپنے ملک کو اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے ایسے ٹھوس اقدامات کیے ہیں جو دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے بھی قابل تقلید ہیں، لیکن اسلامی نظام، اپنی روح اور اقدار کے ساتھ ہنوز تشنہ تعبیر ہے۔

تحریک پان اسلامزم

تحریک اخوان المسلمین ہو یا انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی کوئی بھی اسلامی تحریک (برائے تحفظ، تجدید و احیائے اسلام) وہ سید جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی (پان اسلامیت) کی تحریک کی خوشہ چیں ہے۔

17 ویں صدی میں اندرونی کمزوریوں کے باعث مسلم ممالک میں زوال اور یہاں مغربی سامراج کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ مغربی سامراج امت مسلمہ پر پوری طرح مسلح ہو کر پوری وحشت اور درندگی کے ساتھ، اور کہیں مکاری و عیاری کے ساتھ ٹوٹ پڑا تو مسلمانوں کا سویا ہوا احساس غیرت ایمانی جاگ اٹھا۔ تاریخ انسانیت میں اہل توحید اور علم برداران اقدار انسانیت نے ایک عجیب مثال قائم کی۔ یہ ہر ملک اور ہر علاقے میں اپنی اخلاقی اور مادی کمزوریوں کے باوجود فکری، عسکری جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ترکی، مصر، سوڈان، دیگر افریقی ممالک، سسلی، عدن، یمن، حجاز، شام، ہندوستان، ملائیشیا، انڈونیشیا تک مسلمانوں نے حملہ آوروں کے سامنے اپنے خون کے دریا حائل کر دیئے اور لاشوں کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔

مہدی تحریک، وہابی تحریک، ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی تحریک، سلطان ٹیپو کی عسکری تحریک، فرائضی تحریک، تحریک مجاہدین، تحریک خلافت، ہر ملک میں جمعیت العلماء اور نہضۃ العلماء، ہندوستان کی مجلس احرار اور خاکسار تحریک کی طرح کی، دوسرے مسلم ملکوں میں بھی تحریکوں کا ظہور۔ ان تحریکوں نے مغربی تہذیب کا منہ توڑ دیا۔ اسلام اور اسلامی تہذیب کو درپیش چیلنجوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ ان تحریکوں کی قیادت کے لیے قدرت نے ایسی عظیم شخصیتیں پیدا کیں کہ جن میں سے ہر ایک تاریخ حریت میں مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، شیخ حسن البناء شہید، شیخ بدیع الزماں نورسی، علامہ مصطفیٰ سباعی، امام بن بادیس، مہدی سوڈانی، حسن بن اسماعیل، شیخ عمر تلمسانی، سید محمد حامد ابو النصر، جسٹس عبدالقادر عودہ شہید، سید قطب شہید، سیدہ زینب الغزالی الجبلی، ڈاکٹر حسن عبداللہ ترابی، شیخ عز الدین القسام، سید مفتی امین الحسینی، سر سید احمد خان، علامہ اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی، شیخ احمد یاسین، ڈاکٹر نجم الدین اربکان، علی شریعتی، راشد الغنوشی، عالیجاہ علی عزت بیگو وچ وغیرہم۔ احیائے اسلام کی تاریخ کے آسمان پر یہ سب ستارے اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں میں جگمگاتے ہوئے صاف صاف نظر آتے ہیں، لیکن یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب جمال الدین افغانی کے آفتاب تازہ سے روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ کسی بھی ملک کی احیائی تحریک کے تذکرے سے پہلے چاہیے کہ سید افغانی اور ان

نئی تحریک اتحاد اسلامی کا ذکر ہو۔ تمام حالیہ اسلامی تحریکوں کی ماں سید افغانی کی پان اسلامزم کی تحریک ہے۔

اتحاد عالم اسلامی کے نقیب جمال الدین افغانی کی شخصیت پر ان کے ایک پرستار، مشہور صحافی اور ادیب قاضی عبدالغفار کا وہ خطبہ پیش کیا جا رہا ہے جو انہوں نے 21 فروری 1932ء کو اردو اکادمی ہند کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ یہ خطبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی کی مرتب کردہ کتاب ''جمال الدین افغانی'' سے اخذ کیا گیا ہے۔

1838ء یا 1839ء میں جب شیخ ماں کی گود میں آئے دنیائے اسلام پر مصائب و ابتلا کا شدید طوفان گزر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وسط ایشیا میں خیوا، بخارا کی آزادی روسی شہنشاہیت کی قربان گاہ پر آخری سانس لے چکی تھی۔ ایران میں انگریزوں اور روسیوں کا مشترکہ اثر قائم ہو چکا تھا۔ مصر میں انگریزوں کا عارضی انتظام مالکانہ حکومت کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ مراکش، برطانیہ اور فرانس کے باہمی سمجھوتے کی بنا پر فرانس کے زیر اثر لیا جا چکا تھا۔ سلطنت عثمانیہ میں اسلامی اقتدار کا مریض جاں بلب تھا اور اس کے سرہانے آسٹریا، جرمنی، برطانیہ، ریاست ہائے بلقان اور روس کے دشمن در آستیں اطبا جمع ہو چکے تھے۔ ایک غریب اور دور افتادہ افغانستان نسبتاً آزاد تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ جغرافیائی حیثیت سے وہ متمدن ممالک سے، یورپین تمدن سے دور تھا اور روس و انگلستان کی باہمی رقابت اس کی قومی آزادی کی ضامن تھی۔

اس عہد ابتلا میں جب ہمارے دل پست، ضعیف اور حوصلے کمزور ہو رہے تھے، عالم اسلام میں عام تاریکی کے اندر بھی کہیں کہیں روشنی کی ایک شعاع نظر افروز ہوتی رہتی تھی، جیسے دور کے بادلوں میں بجلی کی ایک چمک۔ مختلف ممالک میں خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ تباہ حال ملت اسلامی کے لیے ایک پیام امید لے کر آتا تھا اور عالم اسلام کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک چھوٹا سا دیا روشن کر جاتا ہے۔ اس زمانے میں جب شیخ نے پہلی دفعہ سورج کی روشنی دیکھی، عالم اسلام صدیوں کی گہری نیند کے بعد بیداری کی پہلی کروٹ لے رہا تھا۔ دلوں کے آتش خانے سرد تھے مگر چنگاریوں سے خالی نہ تھے۔

قسطنطنیہ میں ابوالاحرار مدحت پاشا اور ان کے معاصرین مصطفیٰ فاضل، رشید پاشا، ضیا پاشا، علی پاشا، علی سعاوی، فواد پاشا، نامق پاشا۔

ایران میں امیر نظام، ملا محمد، کاظم خراسانی جیسے قوم پرست، عہد انقلاب کے حریت پسند مجتہد اور ان کے معاصرین کے دور تک بعد اصغیر، میں انہوں نے قومی تحریک پر جان و مال فدا کر دیے۔ سید عبداللہ، سید محمد حسینی اور ایسے ہی کتنے۔ پھر مصر میں صف اول کے احرار مصطفیٰ کامل، علی پاشا، محمود پاشا فلکی۔ تونس میں شیخ محمد بیرم، خیر الدین پاشا، وسط ایشیا و ترکستان میں اسماعیل بے۔ یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر اور ایک ہی راہ کے راہرو تھے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی جمال الدین افغانی تھا، مگر شیخ کی زندگی کا امتیاز ان سب سے الگ تھا۔ اس تمام فہرست میں شیخ تنہا ایک نام ایسا ہے جو عمل کی جغرافیائی حدود سے آزاد رہا اور کبھی کسی ایک ملک کا پابند نہ تھا۔ وہ دیار مصر میں تھا۔ وہ ایران میں تھا۔ وہ ہندوستان میں تھا۔ حجاز میں تھا۔ ترکی میں تھا۔ روس میں تھا۔ فرانس میں تھا۔ اور اس کی ایک آواز تھی جو مراقش سے ترکستان تک اور لندن و پیرس سے سینٹ پیٹرزبرگ (ماسکو) تک سنی گئی۔ عہد جدید کے داعیان ملت اسلامی میں بمشکل کوئی نام اس قدر ہمہ گیر، اس قدر عام اور وسیع مل سکے گا۔ یہ امتیاز شیخ ہی کے

سے محفوظ تھا۔

ولادت، مقام ولادت اور عہد طفلی، یہ سب باتیں اس موقع پر بیان کرنے کی نہیں۔ جس شخص کا وطن تمام عالم اسلامی تھا، اس کے مقام ولادت کا سوال ہی کیا۔ جس نے مشرق کا دامن مغرب سے باندھ دیا تھا، اس کے متعلق یہ بحث قدرے دور از کار ہے۔ وہ اسعد آباد میں پیدا ہوا یا اسعد آباد میں۔ افغانی النسل تھا یا ایرانی، شیعہ تھا یا سنی۔ اس کا سلسلہ نسب اس کو بقول صاحب "تاریخ بیداری ایرانیان" بخاندان آل عبا حسین بن علی بن ابی طالب میر سائد "یا یہ سید صفدر کے بیٹے کا نسب "شیخ ترمذی" ہی سے مولف تک ختم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بحث کہ شیخ ایرانی تھے یا افغانی، خود ایرانی اور افغانی دوستوں کے درمیان مابہ النزاع ہے۔ دونوں طرف سے اپنے اپنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں اور شیخ کا یہ سوال انکار اپنے دعوے کی دلیلوں کا دریبہ بنتا ہے۔ شیخ کی شخصیت کا یہ عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ایران کہتا ہے وہ ہمارے تھے اور افغانستان کہتا ہے وہ ہمارے تھے۔

میں ذاتی طور پر یہ یقین رکھتا ہوں کہ جو آفتاب انیسویں صدی کے آخر میں تمام عالم اسلامی پر چمکا، وہ خاک افغانستان سے بلند ہوا تھا اور وہ دولت خداداد ہی کا ایک انمول الماس تھا۔ وہ چشمہ حیات جو ہندوستان و مصر و ایران، ترکی و روس، فرانس و انگلستان، خیوا اور بخارا تک بہتا چلا گیا، افغانستان ہی کی پہاڑیوں سے نکلا تھا۔ شیخ کے ابتدائی زندگی کے حالات کو کسی دوسرے موقع کے لیے چھوڑ کر میں ان کی عملی زندگی کے آغاز کار سے اس داستان کو شروع کرتا ہوں۔

شباب کا ابتدائی زمانہ (18 سال کی عمر تک بقول براؤن) اس ملک میں گزارا جہاں سیاسی دنیا صبح کو کچھ اور شام کو کچھ ہوتی تھی۔ افغانستان میں سیاسی انقلاب کی آندھیاں چل رہی تھیں اور تخت حکومت سے ایک دعوے دار اترا جاتا تھا تو اس پر دوسرا بٹھا دیا جاتا تھا۔ اپنی جوانی کے آغاز میں شیخ نے سیاست کا پہلا تجربہ خود اپنے وطن میں حاصل کیا، لیکن وہ ابھی تک ناظر تھے، عامل نہ تھے۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا کہ شیخ کی طبیعت کا جوہر عمل بروئے کار آتا۔ یہ فخر اس اجڑے دیار، اس غلاموں کے ملک کا مقسوم رہا، جس کو ہندوستان کہتے ہیں۔ سب سے پہلے شیخ کا جذبہ عمل افغانستان ہی کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد متحرک ہوا۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ کی سیاسی تربیت میں ان حالات کو بہت کچھ دخل تھا جو انہوں نے اپنے پہلے سفر ہندوستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کانوں سے سنے۔ ہندوستان کا یہ پہلا مطالعہ گویا محض سرراہ تھا، اس لیے کہ شیخ گھر سے بیت اللہ کا عزم لے کر نکلے تھے لیکن علوم جدیدہ کی تکمیل کے خیال سے تقریباً ایک سال اور کچھ ماہ ہندوستان میں فقیرانہ، مسافرانہ مقیم رہے۔ خراب آباد ہندوستان کے لیے یہ شرف کیا کم ہے کہ اس داعی اعظم کا پہلا قدم گھر سے نکل کر اس سرزمین پر رکھا گیا تھا، جس کی عظمت دیرینہ کچھ ہی عرصہ پہلے تمام تر تباہ ہو چکی تھی اور جس کے فرزند تخت حکومت سے محروم ہو کر غلامی کی زندگی بسر کرنا سیکھ رہے تھے۔ لال قلعہ میں دودمان تیموری کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ باقی رہ گیا تھا۔ شیخ نے 1856ء کا وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، جب 1857ء کا کوہ آتش فشاں، آتش فشانی کے لیے تیار ہو رہا تھا لیکن اس وقت نہ شیخ کسی کو جانتے تھے نہ شیخ کو کوئی جانتا تھا۔ وہ مسجدوں کے حجروں میں اور مدرسوں کے بوریے پر درس عبرت لے

رہے تھے۔ کیا تعجب ہے کہ اسی پہلے سفر میں انہوں نے ایک محکوم قوم کے زخموں کو دیکھ لیا ہو اور اسی تاثر نے ان کی آئندہ زندگی کی جدوجہد کا راستہ ان کو بتایا ہو۔

1857ء میں جب ہندوستان ایک خوفناک انقلاب کی کشمکش میں مبتلا تھا، شیخ افغانی بیت الحرام میں ملّت اسلامی کے مستقبل کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ ایک سال کے قریب حجاز میں مقیم رہے، لیکن ان کی زندگی کا یہ ایک سال تاریخ کے صفحات سے بہت دور ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ گہوارۂ اسلام میں انہوں نے کس طرح کسب سعادت کیا، مگر جب وہ حجاز سے واپس ہو کر پھر افغانستان آئے تو خود اپنے وطن کو شدید ترین خانہ جنگی میں مبتلا پایا۔ امیر دوست محمد خان اس وقت تخت افغانستان پر قابض تھے۔ انہوں نے شیخ کو اپنے دربار میں ایک اعلیٰ عہدے پر مقرر کیا اور اس طرح اسلامی سیاسیات اور بادشاہوں اور سلاطین کے درباروں سے مدوجزر سے شیخ کی شناسائی شروع ہوئی۔ افغانستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب خانہ جنگیوں کا غیر محدود سلسلہ افغانی سلطنت کی آزادی و عظمت کو تباہ کر چکا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی تھی اور بدنظمی۔ چھوٹے چھوٹے سردار اور خوانین چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قابض تھے اور قومی شیرازہ یکسر بکھرا ہوا تھا۔ کابل حکومت کا مرکز تھا مگر برائے نام۔ ہرات کے تمام علاقے پر امیر کے چچا زاد بھائی مسلط تھے اور کابل کی مرکزی حکومت اپنے تحفظ کے لیے ہرات کی جداگانہ ریاست کو مٹا دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب امیر دوست محمد خان فتح ہرات کا تہیہ کر کے اپنے داماد اور چچا زاد بھائی سلطان احمد پر حملہ کرنے کابل سے نکلے تو شیخ بھی ان کے ہمراہ تھے، لیکن امیر کی عمر نے وفا نہ کی اور 1864ء میں انتقال ہو گیا۔

اب مسند شاہی پر امیر شیر علی نے جلوس کیا اور غالباً اسی سال ہرات بھی فتح ہو گیا مگر امیر شیر علی کے دل میں ابھی اپنے بھائیوں کے قلع قمع کرنے کی ہوس باقی تھی۔ اس ارادے کی تکمیل میں امیر شیر علی کے وزیر محمد رفیق خان کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ بار بار امیر کو اس کام پر آمادہ کرتا تھا، اور شیخ افغانی دربار میں بیٹھے ہوئے ان تیاریوں کو دیکھ رہے تھے، لیکن امیر دوست محمد خان کے بعد ان کی آواز بے اثر ہو چکی تھی۔ بعض وقائع نگاروں کا بیان یہ ہے کہ شیخ افغانی امیر دوست محمد خان کے بعد امیر شیر علی کے دربار میں موجود تھے، اور یہی واقعہ قرین قیاس بھی ہے، اس لیے کہ سب سے پہلے خود شیخ ہی نے محمد اعظم کو امیر شیر علی کے ارادوں سے مطلع کیا تھا۔ اگر وہ اس وقت دربار میں موجود نہ ہوتے تو شیر علی کے ارادوں سے ان کا واقف ہونا بہت مشکل تھا۔ محمد اعظم، محمد اسلم، محمد امین، شیر علی کے تینوں بھائی اس سازش سے بے خبر تھے، اور جب شیخ نے ان کو اس منصوبے سے آگاہ کیا، وہ فوراً اپنے اپنے علاقوں کو بھاگ گئے، جہاں وہ سمجھتے تھے کہ شیر علی کا ہاتھ بہ آسانی ان تک نہ پہنچ سکے گا۔

شیر علی اور اس کے بھائیوں کی خانہ جنگی کی تفصیلات اس زمانے کا مورخ بیان نہیں کرتا۔ خود امیر عبدالرحمن خان نے اپنی سوانح عمری میں بہت اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، لیکن اغلب یہ ہے کہ اس خانہ جنگی کے شروع ہوتے ہی شیخ افغانی محمد اعظم کے پاس چلے گئے اور آخر تک انہی کے پاس رہے۔ چنانچہ کچھ تو بہ تقاضائے انسان مندی کہ شیخ نے شیر علی کے منصوبوں کی بروقت اطلاع محمد اعظم کو دی تھی، اور کچھ شیخ کی خداداد ذکاوت و ذہانت سے متاثر ہو کر محمد اعظم نے شیخ کو اپنا مشیر خاص اور معتمد بنا لیا۔ چنانچہ جب محمد اعظم خان اور ان کے بھتیجے عبدالرحمن نے

دارالسلطنت پر قبضہ حاصل کیا اور عبدالرحمٰن کے والد محمد افضل خان کو غزنی کی مجلس سے آزاد کر کے تخت حکومت پر بٹھایا تو دربار شاہی میں شیخ کا اثر بہت زیادہ ہو گیا۔ محمد اعظم خان کو شیخ پر اس قدر اعتبار تھا کہ کوئی اہم کام ان کے مشورے کے بغیر انجام نہ پاتا تھا۔ پھر جب افضل خان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین محمد اعظم قرار پائے۔ تو جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، شیخ کو امیر نے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ یہ شیخ کی جوانی کا زمانہ تھا، جب وہ سلطنت کے روبست پر حاوی تھے۔ ان کے لیے یہ منصب بجائے خود علوم سیاست و تدبیر کا ایک مدرسہ تھا، جہاں اس داعی حق نے اپنی آئندہ زندگی کے لیے سرمایہ علم و فضیلت و فکر و نظر حاصل کیا۔ جب اعظم خان کو شیر علی سے شکست کھا کر بھاگنا پڑا تو شیخ بدستور کابل میں مقیم رہے، مگر وہ تین ماہ سے زیادہ وہاں ٹھہر نہ سکے۔ یہ زمانہ ان کے لیے بہت نازک تھا۔ وہ محمد اعظم کے معتمد سمجھے جاتے تھے اور اس لیے شیر علی کی آنکھ میں کھٹکتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ان سے انتقام لے، مگر ایسا کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ سادات کا اثر کابل میں بہت زیادہ تھا، اور وہ ڈرتا تھا کہ شیخ کو نقصان پہنچا کر سادات کے جذبات کو مجروح نہ کر دے۔ بالآخر شیخ نے خود ہی سفر حج کی اجازت طلب کی، اور شیر علی نے اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ وہ ایران کے راستے حجاز کی طرف نہ جائیں، اس لیے کہ محمد اعظم ہنوز ایران میں موجود تھے، اور شیر علی نہ چاہتا تھا کہ شیخ ان سے ملیں۔

یہ حالات تھے، جب 1869ء میں شیخ دوبارہ ہندوستان وارد ہوئے۔

سیّد جمال الدین افغانی

لیکن ہندوستان میں اس وقت محمد اعظم کے سابق وزیر اعظم کی ذات سیاسی حیثیت رکھتی تھی اور حکومت برطانیہ نے جو ابھی 1857ء کے ہنگامہ کے بعد کچھ کچھ سنبھل رہی تھی، شیخ کے قیام کو خلاف مصلحت سمجھا۔ ایک مہینہ تک شیخ بحالت نظر بندی احکام سرکاری نگرانی میں ہندوستان میں رہے اور بالآخر برطانوی جہاز سے سویز بھیج دیئے گئے اور اس طرح اتحاد اسلام کی سخت ترین مخالف حکومت ہی نے اتحاد اسلامی کے داعی اعظم کو ان وسیع میدانوں کی طرف بھیجا جہاں شیخ کو تمام عمر برطانوی سیاست کے دشمن کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔

مصر میں اس دفعہ شیخ کا قیام صرف 40 دن رہا اور ان کا یہ مختصر زمانہ علماء اور طلبائے ازہر کی صحبتوں میں گذرا۔ اسی مختصر زمانہ میں ان کی فضیلت کا پہلا نقش فراعین کی سرزمین پر قائم ہوا۔

براؤن، شیخ محمد عبدہ کے حوالہ سے کہتا ہے کہ شیخ غالباً بخارا سے مصر آئے تھے، لیکن اس بیان کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی اور سلسلہ واقعات سے جو پیش نظر ہیں، یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان سے مصر گئے۔ اس مختصر قیام کے زمانہ میں ازہر میں شیخ نے صرف و نحو پر چند لیکچر دیئے، لیکن ابھی اسلامی ممالک میں سیاست کے صرف و نحو ان کی زبان پر نہ آیا تھا۔ ازہر ہی کا صرف و نحو ان کے سیاسی صرف و نحو کا آغاز تھا۔ وہ اگر کچھ زیادہ مصر میں ٹھہر سکتے تو اس کا موقع آتا لیکن ہندوستان کے 1857ء سے ڈری ہوئی برطانوی حکومت کو مصر میں ان کا ٹھہرنا گوارا نہ تھا اور بالآخر مصر سے بھی ان کو روانہ ہونا پڑا۔ دوران قیام مصر میں وہ ترکی قوم پرستوں کی تحریک سے آشنا ہو چکے تھے اور اپنے لیے

سلطنت عثمانیہ کا میدان انہوں نے تجویز کر لیا تھا۔ چنانچہ بقول صاحب "تاریخ بیداری ایرانیاں" پس از مسافرت حجاز وشرف بمکہ معظمہ فسخ عزیمت و مجملاً بسوئے اسلامبول حرکت نمود۔" وہ اب سفر حجاز سے زیادہ اہم اور بڑا کام کرنے والے تھے۔ جس کے لیے عثمانی قوم پرستوں نے میدان تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

1870ء میں جب شیخ قسطنطنیہ پہنچے، سلاطین و خود مختار تاجداروں کی استبدادیت کا نقش برآورد ہونے لگا اور جبر کی قوت نے حریت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ جمہوریت کے داعی، مدحت پاشا، فواد پاشا میدان عمل میں آچکے تھے۔ رشید پاشا کی تحریک پر ایک "خط ہمایونی" کا اجرا ہو گیا تھا جس میں رعایا کے خاص خاص اصولی حقوق کا اعتراف بھی کر لیا گیا تھا۔ شیخ کے ترکی جانے سے دو سال پہلے مدحت پاشا کونسل کے صدر بنائے جا چکے تھے اور بظاہر ایک جدید دستور اساسی کا نفاذ کیا جا رہا تھا۔ عین اس زمانہ میں جب کہ یہ ابتدائی اور عارضی انقلاب، ملت عثمانی کو بیدار کر رہا تھا، شیخ نے پہلی دفعہ آل عثمان کی اس سرزمین پر قدم رکھا جس کی خاک میں ان کے جسد خاکی کو چھ سال کی ایک ہنگامہ خیز زندگی کے بعد مل جانا تھا۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز بالاشبہ قسطنطنیہ ہی سے ہوا اور 22 سال بعد وہیں ختم ہوا۔

قسطنطنیہ پہنچے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ شیخ کو عالی پاشا صدر اعظم سے ملنے کا موقع ملا اور پہلی ہی ملاقات میں بقول صاحب "تاریخ بیداری ایرانیاں" بقوت جاذبہ فضیلت و بیان چناں صدر اعظم را بسوئے خود جذب نمود کہ مافوق تصور می شود۔" شیخ کی اسی قوت جاذبہ نے بہت جلد عثمانی قوم کے عامۃ الناس، وزراء، امیان، امراء و اشراف کو اپنی طرف کھینچ لیا اور انجمن معارف کی صحبتوں میں اپنی ذکاوت و ذہانت کا ایک کبھی نہ مٹنے والا نقش ثبت کر دیا۔ لیکن سیاسی عمل کے اس ابتدائی دور میں شیخ کی زندگی کا زیادہ نمایاں پہلو یہ تھا کہ انہوں نے پہلی دفعہ جبہ و عمامہ کی استبدادیت کی قوت کا احساس کیا اور ان کی پہلی ٹکر اسی جماعت سے ہوئی جس کے ذریعہ سے ان کو آئندہ مصر اور ایران میں بہت کام لینا تھا۔ انیسویں صدی کے کوتاہ نظر علماء کی قدامت پسندی کے دو ہی بڑے مندر تھے۔ ایک ایران میں اور ایک ترکی میں جہاں مجتہد اور شیخ الاسلام خدا کے اختیارات کے حصہ دار اور بادشاہ کی قوت کے سرچشمہ بنے ہوئے تھے۔ شیخ نے مذہب کا ایک وسیع فلسفہ بیان کرنا شروع کیا جو "حامیین شریعت حقہ" کے کانوں پر بہت گراں تھا۔ وہ اس بدعت کو اپنی حکومت کے خلاف بغاوت اور اپنی قوت کے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ دو چار ہی لیکچروں کے بعد شیخ الاسلام کی صحبتوں میں شیخ کے فلسفہ پر تلخ و ترش تبصرہ شروع ہونے لگا۔

اس لیے کہ شیخ الاسلام کی جماعت کو یہ دیکھنا گوارا نہ تھا کہ شیخ کا علم و فضل اس جماعت کے حلقہ بگوش کو کسی دوسری طرف کھینچ لے جائے۔ سلطان عبدالعزیز کا یہ آخری زمانہ تھا۔ خواجہ تحسین آفندی جو جامعہ قسطنطنیہ کے صدر تھے، شیخ سلمان بلخی جو باختر سے آکر قسطنطنیہ میں مقیم ہوئے تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے مرجع خلائق ہو گئے تھے اور منیف پاشا وزیر تعلیمات ان سب اشخاص کا شیخ کی جانب رجوع ہو جانا شیخ الاسلام کی استبدادیت اور مطلقیت پر ایک شدید ضرب تھی۔ آخر کار جب شیخ ایک دن مسجد فاتح سلطان محمد میں تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور "مثنوی مولانا روم" کے حسب ذیل اشعار کی تفسیر فرمائی کہ:

علم حق در علم صوفی گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود
علم صوفی حادث و حق از قدیم
ایں چساں در فہم آید اے سلیم

تو جو آگ سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی۔ شیخ نے اپنی تقریر کا ذکر ''رد علی الدہریین'' میں کیا ہے۔ حاجی یونس وہبی نے جو اس وقت قسطنطنیہ کے مشہور علماء میں سے تھے اور ان کی مجلس میں موجود تھے، شیخ کی تقریر پر اعتراضات کیے اور حسن فہمی آفندی شیخ الاسلام نے ان اعتراضات کو سلطان تک پہنچایا اور یہ سمجھایا کہ شیخ کا انداز بیان شہنشاہیت اور مطلقیت کے بہت خلاف تھا اور ایسا تھا کہ جس سے عامتہ الناس کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ بقول ''اخبار وطن'' (قسطنطنیہ) یونس آفندی نے بعد میں شیخ کے خلاف اپنی اس سازش کا اعتراف کیا ہے اور وہ اپنے اس فعل سے تائب بھی ہوا مگر شیخ الاسلام نے بالآخر شیخ کو قسطنطنیہ سے نکلوا کر چھوڑا۔ صاحب ''تاریخ بیداری ایرانیاں'' اس مجلس اور شیخ کی اس تقریر کا ذکر بہت دلچسپ الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> ''چوں روز موعود در رسید، جمعیتے بے حساب از اعیان و اشراف و علما و وزراء او سایر طبقات در دار الفنون اجتماع یافتند۔ پس سید بالائے ممبر آمد شروع بتکلم نمود۔ وخفابہ راچناں بہ فصاحت و بلاغت بہ آخرت رسانید کہ مردم را مات و مبہوت بہ آں سحر بیاں نمود۔ رؤسائے اہل علم را بعضے از آراء سید در ترویج صناعت و معارف خوش نیامد مطالب را بہ شیخ الاسلام رسانیدند۔ مشائر الیہ رانظر بلد ورت سابقہ فرصت و راہ بہانہ بدست آمدہ شنید سید را از سخن احتدعا نمود۔ و پس از باب عالی چنیں حکم صادر گردید کہ برائے اسکات فتنہ و رفع غائلہ سید چند ماہ از اسلامبول مہاجرت اختیار کند۔''

اس تقریر میں جو پہلی دفعہ شیخ اور قدامت پسند علماء کے درمیان باعث اختلاف ہوئی شیخ نے ایک مثال دی تھی کہ گویا نظام عالم ایک زندہ جسم ہے اور اس کے مختلف اعضاء اس کے پیشے اور صنعتیں ہیں۔ بادشاہ دماغ ہے، لوہار اور مستری ہاتھ ہیں، زمیندار جگر ہے وغیرہ وغیرہ اور قوم کے اس جسم میں روح یا تو پیغمبری ہے یا فلسفہ مگر پیغمبری خدا کی ودیعت ہے اور فلسفہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مخالفین نے شیخ کی گفتگو کے یہ معنی پیدا کیے تھے کہ گویا شیخ نبوت کی توہین کرتے ہیں اور اس کو فلسفہ کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں اور نہ سمجھنے والوں کو یہ بیان بمنزلہ کفر بتایا گیا۔ جیسا کہ مذہبی قدامت پسندوں کا دستور ہے۔ اس کفر کی عام تشہیر کی گئی اور جہلا میں شیخ کے خلاف سخت جوش پیدا کر دیا گیا۔ غرض کہ شیخ کی پہلی آواز دعوت نے ان کو پہلے امتحان میں ڈال دیا اور وہ قدامت پسندوں کا ایک تلخ تجربہ عبرت آموز تجربہ لے کر قسطنطنیہ سے روانہ ہوئے مگر ان کو ہدایت اور تبلیغ کا آسان راستہ مل گیا اور انہوں نے غالباً یہ سمجھ لیا کہ ان ہی علماء کی اصلاح اور ان کے مفاسد کی بیخ کنی میں ملت اسلامی کی فلاح مضمر ہے۔

براؤن کہتا ہے کہ جب شیخ پہلی دفعہ شیخ الاسلام سے ملنے گئے، تو انہوں نے دیکھا کہ مخلوق کا ایک ہجوم شیخ الاسلام کے حضور میں بحالت رکوع جمع ہے، لیکن شیخ سیدھے بڑھتے چلے گئے اور شیخ الاسلام کے پہلو میں جا بیٹھے۔ شیخ الاسلام جمال الدین کی اس جسارت کو کبھی نہ بھول سکے اور فتوی کفر کا حربہ آخر کار کچھ عرصہ کے لیے کارگر ہوا۔ شیخ باوجود ان حملوں کے ہمت نہ ہارے تھے اور انہوں نے قسطنطنیہ سے روانہ ہونے سے پہلے عالی پاشا سے تحریک کی کہ شیخ الاسلام کے اور ان کے درمیان ایک عام مجلس میں مناظرہ کرایا جائے مگر شیخ الاسلام کے عہدہ کا وقار ایک گمنام شیخ کا حریف نہ بنایا جاسکتا تھا اور بالآخر شیخ حج کا ارادہ کر کے روانہ ہوگئے، لیکن اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل میں تھے جہاں زندگی کا حج اکبر ان کو کرنا تھا۔ اسی حج اکبر کا خیال ان کو قسطنطنیہ سے پھر ایک دفعہ مصر لایا۔ 22 مارچ 1871ء کو مصر پہنچے اور آتے ہی اپنے نصب العین کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ شیخ کی زندگی کے اس دور نے ان کی شخصیت کو ایک بین الاقوامی شخصیت بنا دیا۔ اسی نقطہ سے انگلستان اور یورپ کے خلاف ان کی سیاسی زندگی شروع ہوتی ہے۔

مصر میں اس وقت یہ حال تھا کہ خدیو اسماعیل کی بداعمالیوں اور بدمستیوں نے برطانوی ''دخل'' کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں۔ خدیو کی انتہائی فضول خرچیوں نے عام رعایا اور فلاحین کو سخت قحط کی بلا میں گرفتار کر دیا تھا۔ یورپ کے ساہوکار اور حصہ دار اپنے سود اور منافع کا شدید تقاضا کر رہے تھے۔ سلطنت کا دیوالیہ نکل چکا تھا اور اسماعیل اپنے عہد کے چند آخری سال بہت بدنامی اور رسوائی کے ساتھ گذار رہا تھا۔ مصر کی آزادیوں کے خاتمہ کا وقت تھا۔ جب شیخ نے پہلی دفعہ اس سرزمین پر احیائے ملت کا علم بلند کیا، ہندوستان و افغانستان میں وہ انگریزی تدبر کا تجربہ حاصل کر چکے تھے اور اپنے تجربے کے تاثرات کو اب بلند آہنگی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کا انہوں نے عزم کر لیا تھا۔

مصر میں شیخ کے فضل و کمال نے بہت جلد ریاض پاشا وزیراعظم کو متاثر کیا اور ان ہی کے اصرار پر شیخ نے کچھ عرصہ مصر میں قیام کا ارادہ کر کے طلباء اور علمائے ازہر کی صحبتوں میں اپنا کام شروع کر دیا۔

تقریباً آٹھ سال شیخ نے دیار مصر میں اس طرح گزارے کہ وہ اہل علم و سیاست کا مرجع ہو گئے تھے۔ نہ صرف علمی حلقوں میں ان کے افکار عالیہ ادب واحترام سے سنے جاتے تھے، نہ صرف مذہبی صحبتوں میں ان کے اجتہادات واجب التعظیم تصور کیے جاتے تھے بلکہ سیاسی جماعتیں بھی اپنے مسائل کو شیخ ہی کے مصلے کی طرف لاتی تھیں، حتیٰ کہ شیخ کی شخصیت کے بڑھتے ہوئے وزن کو انگریزوں نے محسوس کیا اور وہ سمجھنے لگے کہ شیخ مصر میں انگریزی اثر کے خلاف ایک انقلاب عظیم پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ نے قوم پرستوں کی ایک منظم سیاسی انجمن قائم کر لی تھی جس میں تقریباً تین سو اہل فکر ونظر شریک ہو چکے تھے۔ اس تنظیم میں بلاشبہ انگریز اپنے منصوبوں کی خرابی مضمر پاتے تھے۔

اس انجمن کے اثرات نے ملک میں عامۃ الناس کے خیالات اور زبان کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ مصر کے بازاروں میں انگریزی ''دخل'' کے خلاف مضامین اور اشتہارات شائع نہ ہوتے ہوں۔ شیخ محمد عبدہ سعد زاغلول پاشا، عبداللہ ندیم بے، حسان بے اور ایسے کتنے ہی مصری وطن پرست شیخ کے حلقہ ارادات میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ازہر میں جو قدامت پسندی کا ایک بڑا مرکز تھا، شیخ کے خطبات کا ایک ایک لفظ ان کے احباب اور شاگرد قلم

بند کر دیتے تھے۔ "جمعیت ماسونیہ" نے جو مصر کی ایک با اثر جماعت تھی، شیخ کو اپنا صدر بنالیا۔ ملکی اخبارات نے شیخ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایک نئی آواز میں اور ایک نئے لہجہ میں آزادی کا گیت گانا شروع کیا۔ غرض کہ مصر کی قومی زندگی میں شیخ نے جس عظیم الشان انقلاب کی بنیاد رکھی، اس کے تین پہلو بہت نمایاں تھے۔

(1) اول یہ کہ انہوں نے مذہبی خیالات، عقائد اور توہمات میں اپنے اجتہادات سے تغیر پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ فلسفہ جدید کے بعض اجزاء کو اپنی تعلیمات کا جزو بنالیا اور سائنس جدیدہ کے انکشافات اور مسلمات کی کسوٹی پر مذہبی عقائد کو جانچنے لگے۔ یہ "بدعت" قدامت پسندوں کی سخت مخالفت کے باوجود قلوب پر اپنے نقوش پیدا کرنے لگی۔ درحقیقت شیخ نے پھر ایک دفعہ آزاد سیاست کا ٹوٹا ہوا رشتہ مذہب کے کارفرماؤں کے ساتھ جوڑ دیا اور مصر کی سیاست کا یہی سبق انہوں نے ایران کو پڑھایا جہاں مجتہدین کا شدید ترین قدامت پسند طبقہ ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ثابت ہوا۔ یہ فیض بڑی حد تک شیخ ہی کی ان تعلیمات کا تھا، جن کا آغاز مصر سے ہوا۔ انہوں نے علماء کی دماغی فضا بالکل بدل دی۔

(2) شیخ نے پہلی دفعہ مصر میں قوم پرست اخبار نویس پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی اور ملکی اخبارات کی آواز میں وہ قوت پیدا کر دی جو اس سے پہلے کسی اسلامی ملک کو میسر نہ تھی۔ ایران کے دور انقلاب سے پہلے اور بعد وہاں قومی اور آزاد اخبار نویسی کا جو ہنگامہ پیدا ہوا، وہ یقیناً مصری اخبار نویسی کی آواز بازگشت تھی۔

(3) شیخ کی جدوجہد کا تیسرا نمایاں پہلو یہ تھا کہ فلاحین اور غریب رعایا کے حقوق کی حمایت، شہنشاہیت کے جبر و استبداد اور غیر ملکی تسلط کے خلاف انہوں نے قومی جذبات کو اس درجہ مشتعل کر دیا کہ ان کی لگائی ہوئی چنگاری آج برسوں بعد بھی سلگ رہی ہے اور نہر سویز کا تمام پانی اور برطانوی دخل کی تمام قوت اس کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔

سیّد جمال الدین افغانی کا مذہبی اجتہاد

مصری سیاست میں شیخ کی سیاست کا بڑا واقف کار اور شیخ کا رفیق محمد عبدہ تھا جس نے اپنی تصانیف میں ان کی سوانح عمری کے لیے بہت معتبر مواد جمع کر دیا ہے۔ وہ ایک مقام پر مصر کے ان حالات کا نقشہ پیش کرتا ہے جن حالات میں شیخ نے وہاں کی سیاسیات میں ہاتھ ڈالا۔ جیسا کہ مصر کی تاریخ کے ہر پڑھنے والے کو معلوم ہوگا، مصر میں برطانوی مداخلت کے دو ہی اسباب تھے۔ اول خدیو اسماعیل کی فضول خرچیاں اور دوم ہندوستان کا تحفظ۔ اسماعیل کی فضول خرچیوں نے اسے یورپ کے ساہوکاروں کا غلام بنا دیا اور بالآخر نہر سویز کے حصص فروخت کر کے اس نے ہمیشہ کے لیے نہ صرف مصر کی آزادی کا بیع نامہ لکھ دیا بلکہ ہندوستان کی غلامی کو بھی دوامی بنا دیا۔ یہ واقعات 1875ء اور 1880ء کے درمیان پیش آئے اور یہی زمانہ مصر میں شیخ کی کوششوں کے آغاز کا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ترکی کی قوت کو میدان جنگ میں ایک سخت ترین صدمہ پہنچا کر روس نے قسطنطنیہ کے دروازے پر سلطنت عثمانی کی موت کا نقارہ بجا دیا تھا۔ یہی سلسلہ واقعات تھا جو بالآخر مصر میں برطانوی سیادت پر منتہی ہوا۔ برلن میں دول یورپ کی خفیہ کانفرنس نے ان اسلامی ممالک کی تقسیم کا مسئلہ طے کر دیا تھا۔ قبرص پر برطانیہ کا قبضہ تسلیم کیا گیا، فرانس کو تیونس پر

قبضہ کر لینے کی اجازت دی گئی۔ مصر کی مالیات پر برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ سیادت طے کی گئی۔ شام میں فرانس کے حقوق کو قائم کردیا گیا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام اسلامی ممالک کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ خدیو اسماعیل اپنے یورپی قرض خواہوں سے تنگ آکر اہل ملک کی ہمدردیوں کا متلاشی ہوا اور مصری قوم پرستوں کو خوش کرنے کے لیے اس نے آئینی اصلاحات کے وعدے بھی کر لیے، لیکن آئینی اصلاحات یورپین سیاسیت کے لیے سم قاتل ثابت ہوئیں، اس لیے دول نے یورپین ساہوکاروں کے دباؤ میں خدیو کو اس کے ارادہ سے روکا۔ بالآخر فرانس اور برطانیہ کے اثرات نے سلطان کو مجبور کر کے اسماعیل کو معزول کرادیا۔ اسماعیل نے جو کچھ وعدے شیخ کی جماعت سے لیے تھے، عارضی طور پر اسماعیل کی برطرفی کے بعد ان کا خاتمہ ہوگیا۔

شہزادہ توفیق کی بے وفائی

لیکن شیخ کی کمان میں ابھی دوسرا تیر باقی تھا اور وہ شہزادہ توفیق تھا جو خفیہ طور پر شیخ کی جماعت میں شریک تھا اور شیخ کے اصولوں کا حامی تھا، اس لیے جب اسماعیل کی برطرفی کے بعد سلطان نے توفیق کو اس منصب پر نامزد کیا تو مصری قوم پرستوں کی امیدیں پھر ہری ہوگئیں۔ شیخ اور ان کی جماعت جو بادشاہوں کی خودمختاری کو مٹانے پر تلی ہوئی تھی اور ازہر کے خلوت خانوں میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسماعیل کو اس کے جرائم کی پاداش میں قتل کردیا جائے، توفیق کی مسند نشینی پر قدرتاً خوش تھی لیکن شیخ کو بادشاہوں کے وعدوں سے ابھی کئی دفعہ دھوکے کھانے تھے۔ وہ افغانستان میں بادشاہی درباروں کے رنگ دیکھ چکے تھے۔ پھر بھی توفیق سے امید کا رشتہ جوڑے ہوئے تھے لیکن ان کو جلد معلوم ہوگیا کہ بادشاہوں کا التفات چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ وہی توفیق جو چند روز پہلے شیخ سے کسب سعادت حاصل کررہا تھا، ابھی دو ہی دن تخت حکومت پر بیٹھا ہوگا کہ اپنے تمام وعدوں کو بھول گیا اور برطانوی اثرات سے متاثر ہوکر شیخ کی جلاوطنی پر آمادہ ہوگیا۔

توفیق جو شیخ کی جماعت کا رکن تھا۔ ایک ہی مہینہ میں کچھ سے کچھ ہوگیا۔ وہ دو طرف کی آگ میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف دول یورپ کے قنصل خانے اس پر ہر قسم کا دباؤ ڈال کر اپنے سرمایہ داروں کے روپیہ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ رعایا کو آئینی حقوق نہ دیئے جائیں اور دوسری طرف توفیق کے عہد شہزادگی کے وہ اصلاح طلب احباب تھے جو اب وعدوں کے ایفا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ توفیق جانتا تھا کہ اس جماعت کے ساتھ وعدہ خلافی کس قدر خطرناک ہے۔ وہ شیخ کی جماعت میں رہ کر ان کی قوت سے واقف تھا اور کچھ عجب نہیں کہ اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ شیخ شہنشاہیت کے اس درجہ دشمن ہیں کہ جن سروں پر تاج رکھا ہو، ان کو بھی کٹوا دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ضرور جانتا ہوگا کہ بادشاہوں کی زندگی کو ختم کرا دینا شیخ کے سیاسی اصولوں کا ایک اہم جزو تھا۔ یہ راز کچھ ہی روز بعد ظاہر ہوا جب تحریک اصلاح کے اثرات مصری فوج میں نمایاں ہوئے اور فلاحین کے لیڈر احمد بے اعرابی نے توفیق کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ اعرابی نے اپنی قید کے زمانہ میں جو حالات لکھے تھے ان کا ذکر بلنٹ نے اپنی Sceret History of the Occupation of Egypt میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اعرابی شیخ کی تعلیمات سے بہت متاثر تھا اور اس واقعہ کی تصدیق کرتا ہے کہ خدیو اسماعیل کو قتل کرانے کی سازش شیخ

اور مفتی محمد عبدہ کے درمیان ہوئی تھی اور تجویز یہ تھی کہ خدیو کو قصر النیل کے پل کے قریب قتل کیا جائے اور بظاہر اسباب میں شک نہیں کہ اگر اسماعیل کو سلطان نے معزول نہ کر دیا ہوتا تو اس کا شیخ کی جماعت سے وہی حشر ہوتا جو بعد کو شاہ ایران کا ہوا۔ اس واقعہ کی مزید تصدیق مفتی عبدہ کے اس بیان سے ہوتی ہے جو بعد کو بلنٹ نے شائع کیا۔ اس بیان میں بقول بلنٹ مفتی محمد عبدہ کہتے ہیں کہ

''اسماعیل کو معزول کرنے کا مشورہ اس زمانہ میں ہو رہا تھا اور شیخ جمال الدین نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اسماعیل کو کسی دن جب وہ اپنی سواری پر قصر نیل کے پل پر آتے جاتے ہوں، قتل کر دیا جائے اور میں اس تجویز سے بالکل متفق تھا مگر یہ گفتگو ہم ہی دو کے درمیان ہو کر رہ گئی، اس لیے کہ اس وقت اس کام کا کرنے والا کوئی آدمی ہمارے پاس نہ تھا۔ اگر اس وقت ہماری ملاقات اعرابی سے ہوتی تو ہم اس کے ذریعہ اس کام کا ضرور انتظام کرتے اور بہتر صورت یہی تھی۔ اس لیے کہ اس صورت میں یورپ کی مداخلت کا موقع پیدا نہ ہوتا مگر اہل ملک کی جہالت اور کمزوری کے باعث اس وقت یہ امید نہ تھی کہ ہم جمہوریہ قائم کر سکتے ہیں''۔

اگر توفیق کے علم میں یہ چیز تھی کہ شیخ کی جماعت وعدہ فروشوں کے ساتھ کیا عمل کر سکتی ہے تو ذرا بھی تعجب نہیں کہ اس نے با اختیار ہوتے ہی سب سے پہلے شیخ ہی کو مصر سے خارج البلد کیا۔

قصہ مختصر شیخ کے سیاسی عقائد کا یہ ایک عجیب پہلو تھا جو پہلی دفعہ مصر میں بے نقاب ہوا، لیکن شیخ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں کہیں اپنے اس عقیدہ کو ظاہر نہیں کیا کہ شہنشاہیت کو فنا کرنے کے لیے بادشاہوں کا قتل بھی جائز ہے گو کہ بلنٹ اور مفتی محمد عبدہ کا بیان اور خود شہنشاہیت کے خلاف شیخ کی نفرت جوان کے اقوال و اعمال سے اکثر ظاہر ہوا کرتی ہے، خیال کو ضرور اس طرف رجوع کرتی ہے کہ شاید ان کے سیاسی عقائد کا یہ بھی ایک جزو ہو۔ پھر شاہ ایران کے قتل میں ان کی سازش، جس کی بعض شہادتیں ملتی ہیں، اس گمان کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ بہر حال اس امر سے قطع نظر کر کے وہ یہ عقیدہ رکھتے یا نہ رکھتے تھے، یہ تو ماننا پڑے گا کہ شہنشاہیت کے ساتھ ان کی دشمنی بہت شدید تھی۔

مصر میں ان کی عملی زندگی کا دوسرا پہلو جو بہت زیادہ نمایاں ہوا تھا، وہ تھا جس کی مثال ممالک اور اقوام کی تاریخ میں بہت کم ملے گی۔ یعنی ایک غیر ملک کے آدمی نے ایک اجنبی ملک کو شیخ کی طرح اپنا وطن اور ایک غیر قوم کو اپنی قوم بنا کر اس قدر کامیاب سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ یہ امتیاز شیخ ہی کو حاصل تھا کہ وہ مصری نہ تھے، مگر مصر کے حقوق کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ کامیاب داعی تھے، ترک نہ تھے مگر ترکوں کی قومی زندگی کے سب سے زیادہ طاقتور کارساز تھے، وہ ایرانی نہ تھے مگر ایران میں حقوق عامہ کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ وہ ایک جاہل افغان قوم کے فرد تھے مگر اپنی حریت کا سکہ انہوں نے مصر اور ایران و ترکی میں جاری کیا تھا۔ تاریخ عالم میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں۔

افغانی کا مذہبی اجتہاد

گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شیخ کی زندگی کا تیسرا زبردست عنصر ان کا مذہبی اجتہاد تھا۔ بلنٹ لکھتا ہے کہ

"گزشتہ دو سو برس میں بہت سے واعظ ایسے گزرے ہیں، جنہوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ اسلام کے تنزل کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں نے شریعت کی اس طرح پابندی اور دیرینہ روایات کا وہ احترام کرنا ترک کر دیا جو ابتدائے اسلام میں شعار اسلامی تھا۔ علاوہ بریں ترکی اور مصر میں ایسے مصلحین پیدا ہوئے جنہوں نے سیاسی اغراض کے لیے حکومت کا یورپین نقشہ... مگر ان مصلحین نے جو اصلاحات کیں وہ بہ جبر کی گئیں، شاہی احکام کے ذریعے سے یہ ملک کو مجبور کر کے مگر کبھی کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ ان سیاسی اصلاحات کو قرآن و حدیث کے مطابق ثابت کیا جاتا۔ گویا اس طرح سیاسی اصلاحات ہمیشہ طبقہ اعلیٰ کی طرف سے نافذ کی گئیں اور عوام کے دلوں میں ان کی جگہ پیدا نہ ہو سکی۔ جمال الدین کی ذہانت وجدت یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی ممالک کے مذہبی خیالات رکھنے والے لوگوں کی ذہنیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اس امر کی تبلیغ و تلقین کی کہ اسلام کے حالات پر نظر ثانی کی جائے اور بجائے ماضی سے لپٹے رہنے کے جدید علوم کے ساتھ پرانی ذہنیت کے بدلنے کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ قرآن حدیث سے ان کی وسیع واقفیت نے ثابت کیا کہ اگر صحیح معنی لیے جائیں اور شریعت و اصلاحات سیاسی کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسلام کے اندر نہایت وسیع تغیرات کی گنجائش موجود ہے اور مشکل سے کوئی اصلاح ایسی ہوگی جو شریعت کے خلاف ہو۔۔۔۔۔ مصر میں شیخ نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ اسلام زمان کی تمام ضروریات کا کفیل ہونے کے قابل ہے اور عہد جدید کی تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔۔۔۔ علما کے ضمیر و تخیل کو وہ ان زنجیروں سے آزاد کرنا چاہتے تھے جس میں کئی صدیوں سے وہ جکڑے ہوئے پڑے تھے اور ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلام ایک مردہ قالب نہیں ہے مگر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ مغرب میں اصلاح کی اس تحریک کا آغاز ایک ایسے شخص سے ہوا جس نے وسط ایشیا کے جمود میں پرورش پائی تھی اور پھر کس قدر تعجب ہے کہ اس اصلاحی تحریک کا آغاز اس دور دراز دارالعلوم (ازہر) میں کیا گیا"۔

غرض کہ بقول بلنٹ "مصر کی اس ذہنی اور اخلاقی تاریکی کی حالت میں جمال الدین کی تعلیمات ایک عجیب روشنی لے کر ہویدا ہوئیں"۔ اور ٹھیک اس زمانہ میں ہویدا ہوئیں جب مصر کی آزادی کا آخری سانس لیا جا رہا تھا۔

شیخ کا سب سے بڑا جانشین، دیار مصر کا مفتی اعظم شیخ محمد عبدہ تھا، جس نے شیخ کے دائرہ تلقین و تبلیغ میں آ کر بہت بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اسی طرح مصر کا ایک مشہور اخبار نویس شیخ ابراہیم اللقانی شیخ کے شاگردانِ خاص میں سے ایک تھا۔ جب شیخ کو توفیق نے خارج البلد کیا تو ان کے ساتھ آئندہ ہونے والے جانشین مفتی محمد عبدہ بھی مدرسہ کی ملازمت سے برطرف کر کے نکالے گئے۔ استاد اور شاگرد اس جلاوطنی کے بعد پھر پیرس میں اپنی تحریک کے ایک نئے

مرکز پر یکجا ہونے والے تھے۔

ایک بار پھر ہندوستان میں

مصر کو خیر باد کہہ کر شیخ نے حجاز جانے کا ارادہ کیا، لیکن پھر ایک دفعہ وہ ہندوستان آئے۔ انھوں نے ہندوستان میں اس زمانہ سے بھی بدتر زمانہ پایا جو پہلے دیکھ چکے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے کسی مؤرخ اور وقائع نگار کے ہاتھ میں قلم نہ تھا جو شیخ کے حالات لکھتا۔ حالانکہ اس دفعہ شیخ کی شہرت ان سے پہلے ہندوستان پہنچ چکی تھی۔ کیا قیامت ہے کہ ہندوستان میں شیخ کی اقامت کے متعلق جو کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، وہ تنہا انگریزی ذرائع سے۔ مصر سے جو شہرت لے کر وہ ہندوستان آئے تھے، اس کے تمام کانٹے برطانوی حکومت کی آنکھ میں چبھ گئے مگر اس کا کوئی پھول اہل ہند کی نظروں میں نہ سما سکا۔ یہ تھا قومی ادبار جو ہم پر مسلّط ہو چکا تھا۔

اس دفعہ کم وبیش دو سال شیخ ہندوستان میں رہے، لیکن ان کی زندگی کا یہ سارا زمانہ ایک بند کتاب ہے جس کی چند سال سے لوگ جستجو کر رہے ہیں مگر پتہ نہیں پاتے اور میں بھی ان ہی تہی دستانِ قسمت میں سے ایک ہوں۔

شیخ کے قیام کے متعلق ساری پونجی جو میّسر آتی ہے، وہ یہ ہے:

1- بلنٹ کے روزنامچہ کے چند ورق۔

2- بلنٹ کی ''انڈیا انڈر رپن'' کی چند سطور۔

3- رسالہ ''معلم'' حیدر آباد دکن کے چند مضامین

اور

4- ''ردِّ نیچریہ'' کے 74 صفحات۔

بس یہ کائنات ہے جو شیخ کی زندگی کے متعلق ہندوستان والوں کے پاس ہے اور وہ بھی زیادہ تر دوسروں کی دی ہوئی۔

اس دفعہ شیخ کا زیادہ قیام حیدر آباد میں رہا اور وہیں کی صحبتوں میں لوگوں نے کچھ ان کے علم وفضل کی جھلک دیکھی۔ آخر 1883ء میں جب بلنٹ نے ہندوستان کا سفر کیا تو حیدر آباد میں اس نے شیخ کا نام سیّد علی بلگرامی وغیرہ سے سنا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ سیّد علی مرحوم شیخ کی قابلیت کے بہت معترف تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ:

''شیخ اتنے زیادہ سوشلسٹ اور تیز مزاج کے تھے کہ کسی اصلاحی کام کی تکمیل نہ کر سکتے تھے''۔

سیّد علی بلگرامی کے علاوہ نواب رسول یار جنگ سے بھی شیخ کے بہت تعلقات تھے۔ بقول بلنٹ نواب رسول یار جنگ کہتے تھے کہ ''شیخ کے پایہ کا کوئی عالم ہندوستان میں نہیں''۔ ان کے علاوہ کلکتہ کے مولوی عبداللطیف سے بھی

شیخ کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ بلنٹ نے شیخ کے معتقدین کی ایک جماعت سے ہندوستان میں ملاقات کی تھی اور اپنے روز نامچہ میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "وہ سب نوجوان ہیں، طلباء اور پرجوش نوجوان، مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سب انگلستان سے دلی نفرت رکھتے ہیں۔ مذہب کے متعلق ان سب کے خیالات وسیع ہیں۔ درحقیقت وہی خیالات ہیں جو جمال الدین کے ہیں"۔

بلاشبہ انہوں نے حیدرآباد میں اسی لیے قیام کیا ہوگا کہ اس زمانہ میں وہ مقام اہل علم وفضل کا بہت بڑا مرکز تھا اور یقیناً وہاں وہ اپنے کام سے غافل نہ رہے ہوں گے مگر اب کون بتائے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ قرائن یہ ہیں کہ حیدرآباد میں وہ علانیہ اپنے سیاسی خیالات کا اظہار نہ کرتے تھے اور اگر کرتے بھی تھے تو خاص خاص احباب کی صحبتوں میں۔ البتہ علمی موضوعات پر وہ مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ رسالہ "معلم" کی اشاعت جنوری 1881ء میں ان کا ایک مضمون "تعلیم وتربیت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو میرے پاس موجود ہے۔

حکومت برطانیہ اور جمال الدین افغانی

بہرحال تقریباً دو سال اس طرح گزرے۔ جب 1882ء میں مصر کی قومی تحریک نے ایک خطرناک انقلابی تحریک اختیار کر لی اور اعرابی پاشا مطالبہ حقوق کے میدان میں نمودار ہوئے تو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی نظریں شیخ پر پڑنے لگیں، اس لیے کہ جو درخت مصر میں بارآور ہو رہا تھا، اس کا باغبان حیدرآباد میں مقیم تھا۔ طل الکبیر کے معرکہ میں اعرابی پاشا کو شکست ہوئی اور اسکندریہ پر برطانوی بیڑہ کی گولہ باری نے آخر برطانوی "دخل" کی بنیاد کو مضبوط کر دیا۔ اس زمانہ میں جب یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، شیخ کو حیدرآباد سے لا کر کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ مرزا حاجی عبدالکریم شیرازی کے مکان پر مقیم رہے۔ اعرابی کی بغاوت کے سلسلہ میں شیخ کی نظر بندی کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ 11 ستمبر 1881ء میں قصر عابدین کے سامنے جو فوجی مظاہرہ ہوا تھا، اس موقع پر اعرابی نے فخریہ کہہ دیا تھا کہ میں چاہوں تو ہندوستان میں مسلمانوں سے بغاوت کرا دوں۔ اعرابی کا یہی قول غالباً شیخ کی نظر بندی کا باعث ہوا۔ کلکتہ میں شیخ بالکل ایک سیاسی قیدی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب مصر میں برطانوی "دخل" مکمل ہو چکا تو شیخ کو ہندوستان سے روانہ ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اپنے روز نامہ میں بلنٹ ایک جگہ کہتا ہے کہ اس سے مفتی عبدہ نے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہندوستان سے پہلے شیخ امریکہ گئے اور وہاں سے یورپ آئے، لیکن کسی ذریعہ سے بھی امریکہ کے سفر کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ چند روز کے لیے وہ امریکہ چلے گئے ہوں مگر ان کی زندگی کا یہ زمانہ بالکل خاموش ہے اور یقیناً امریکہ میں ان کا قیام بہت مختصر رہا ہوگا، اس لیے کہ وسط 1883ء میں وہ پیرس آ چکے تھے۔

جریدہ العروۃ الوثقی

ہندوستان سے شیخ برطانوی حکومت کے متعلق جو تاثرات لے کر نکلے تھے، ان کا اندازہ بلنٹ کے روز نامچہ

سے ہے کہ مئی 1884ء میں ''العروۃ الوثقی'' کا پہلا نمبر شائع ہوا تھا، لیکن میرے پاس اس کا پہلا نمبر موجود ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 13 مارچ 1884ء سے اس کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ اس پرچے کے کل 18 نمبر شائع ہوئے اس طرح غالباً اکتوبر 1884ء میں وہ بند ہو گیا۔ ان 18 پرچوں کے مضامین مصر میں شائع ہو چکے تھے، لیکن اصلی پرچے بہت کم لوگوں کے پاس پائے جاتے ہیں۔ اہل ذوق شیخ کے ان پارہ ہائے جگر کو ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ پروفیسر براؤن کے پاس بھی چار پانچ اصلی پرچے موجود تھے مگر خوش قسمتی سے میں نے ''العروۃ الوثقی'' کے 10 پرچے حاصل کر لیے ہیں اور میں ان کو شیخ کے متعلق اپنی تلاش و تحقیق کا ایک قیمتی سرمایہ اور عزیز یادگار سمجھتا ہوں۔ پہلے پرچے کا افتتاحیہ گو جمال الدین یا مفتی عبدہ کا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا، تاہم اس کے چند الفاظ اس لیے نقل کرتا ہوں کہ وہ شیخ کے خیالات و عزائم کا پرتو ہیں۔

''جب کسی قوم میں ضعف و غفلت کا غلبہ ہوتا ہے تو کوئی اجنبی قوت اس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ تا آنکہ اس کا بے پناہ علم اس بے حس قوم میں ایک روح تازہ پیدا کر دیتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے کہ اسکی گئی ہوئی قوت پھر حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر اتحاد و اتفاق سے کام لیا جائے''۔

نفوس انسانی کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ پہلے تو وہ ظلم و قہرمانیت کو برداشت کرتی ہے لیکن جب یہ چیز حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو ان کا بزدل بھی شیر دل ہو جاتا ہے۔ لومڑی بھی پلنگ بن جاتی ہے اور بالآخر کوئی نہ کوئی راہ خلاصی کی نکال ہی لیتی ہے۔۔۔۔ مشرقی اقوام پر اس ظلم و ستم کی انتہا ہو چکی ہے۔ ہر مغلوب قوم پیکر غربت بنی ہوئی ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو نا گفتہ بہ ہے۔ ان کے سلاطین با عظمت تخت حکومت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے صاحب حقوق لوگ اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ ان کے باعزت لوگ ذلیل کرائے گئے ہیں۔ ان کے غنی فقیر کر دیئے گئے ہیں۔ تندرست و توانا لوگ لنگڑے لولے اور اپاہج کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے شیر نیستان چوپاؤں سے بدتر ہو گئے ہیں خصوصاً اس پانچ سال کے عرصہ میں بسلسلہ حوادث بالا مصر میں جو تخم پاشی ہوئی ہے، وہ تو خوب ہی ہے لیکن ان شاء اللہ وہ جنہوں نے یہ تخم پاشی کی ہے، پھل ایسا پائیں گے جو ان کے طرزِ عمل کی مکافات ہوگا یعنی اس نخل بے ثمر سے اگر وہ پھل پائیں گے تو وہ اندراین''۔

پھر یورپ کی طرف اشارہ کر کے لکھتا ہے کہ:

''یہ حرص ہوس کے ٹھیکیدار، یہ قومیں جہاں جاتی ہیں، دوست بن کر جاتی ہیں۔ رفاقت و محبت کے لہجے میں باتیں کرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان میں حاکمانہ اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں کسی ملک کو اغیار کی دستبرد سے بچانے، کہیں کسی ملکی حکومت کو مستحکم و قوی بنانے، کہیں بغاوت کے جراثیم پر حملہ کرنے، غرض جب کہیں جاتی ہیں تو طرز ان کا یہی ہوتا ہے مگر پھر چھا جاتی ہیں''۔

کس قدر گرم، کس قدر تلخ، کس قدر قوی وہ جذبات ہوں گے جن کے ماتحت ''العروۃ الوثقی'' کا پہلا افتتاحیہ لکھا گیا ہوگا۔ ''العروۃ الوثقی'' کے مضامین نگاروں میں ہر ملک کے قوم پرستوں کا نام آنے لگا تھا۔ منجملہ ان کے مصری قوم پرست سعد زاغلول بھی تھا جو شیخ کے معتقدین میں اور شیخ کے سیاسی متبعین میں سے تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ

''العروۃ الوثقیٰ'' کے مضامین نے نہ صرف لندن اور یورپی ممالک کے دفاتر خارجہ میں بلکہ مصر میں بھی ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ مشرق کی کوئی آواز اس وقت تک مغرب کی دراز دستیوں کے خلاف اس قوت کے ساتھ بلند نہ ہوئی تھی۔ ''العروۃ الوثقیٰ'' کی آواز نے لندن اور قاہرہ میں نیندیں حرام کر دیں اور اس کے پرچے جن کے سرورق پر ایک طرف شیخ کا نام اور دوسری طرف مفتی عبدہٗ کا نام شائع ہوتا تھا، لندن، پیرس، برلن اور مصر کے اخبارات میں نقل کیے جانے لگے۔ شیخ جنہوں نے خود بھی فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی، ان مضامین کے تراجم فرانسیسی اخبارات کے ذریعہ سے دنیا کی دوسری زبانوں میں شائع کر رہے تھے۔ فرانس کی علمی دنیا میں شیخ کی شخصیت کو ان کے علمی مقالات نے بہت بلند کر دیا۔ خصوصاً عالم فرانسوی ریناں کے ایک مقالہ کے جواب میں شیخ نے جو مضامین ''ژورنال دوبا'' اور ''ریویو سائنٹفک'' میں لکھے، انہوں نے شیخ کے تبحر کا ایک روشن نقش قائم کر دیا۔ ریناں کا موضوع یہ تھا کہ اسلام سائنس کے عمل کا مخالف ہے اور شیخ کے جوابات کے بعد ریناں نے اپنے جواب الجواب کا عنوان بھی ''اسلام اور علم'' رکھا تھا۔ یہ مضامین 1883ء میں کالمان لیوی نے تصانیف ریناں کے نام سے شائع کر دیئے تھے مگر ایک ہی سال بعد ان کا عربی ترجمہ حسن آفندی عاصم نے مصر میں شائع کیا۔ مصر سے جب شیخ نکالے گئے تھے تو خدیو توفیق نے ان کی ہزار کتابیں ضبط کر لی تھیں۔ لیکن پیرس میں پھر انہوں نے اپنا ایک ذاتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ معلوم نہیں کہ بعد میں وہ کہاں گیا۔

''العروۃ الوثقیٰ'' کو وہ مالی مشکلات کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے۔ غالباً ان کی غیور طبیعت نے غیروں سے مالی امداد کا حاصل کرنا گوارا نہ کیا۔ یہ ان کے کیرکٹر کا ایک امتیازی شان تھا۔ جب وہ مصر سے نکالے گئے اور یورپ جانے کے لیے سویز آئے تو ان کے پاس زادِ راہ بھی نہ تھا۔ ایرانی قنصل نے چاہا کہ کچھ امداد کرے، لیکن ان کا جواب ان کے کیرکٹر کی صحیح تصویر تھا۔ انہوں نے کہا ''آپ اپنا روپیہ اپنے ہی پاس رکھیں۔ مجھ سے زیادہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔ شیر جہاں جائے گا اپنی غذا ڈھونڈ لے گا''۔ اسی طرح ایک دفعہ پیرس سے لندن آئے تو وہاں بھی تنگدستی نے پریشان کیا۔ لیکن اس کو برداشت کرتے رہے اور کبھی گوارا نہ کیا کہ کسی سے امداد چاہیں۔ اسی زمانہ میں ان کے کسی دوست نے ان کے حالات کے متعلق بلنٹ کو ایک خط لکھا تھا جو مجھے 1927ء میں بلنٹ کے کاغذات میں مل گیا تھا۔ اس کی چند سطریں بہت دلچسپ ہیں۔

''میں یہ سطریں بصیغۂ راز لکھ رہا ہوں۔ یہ مطلب آپ ہی تک محدود رہے۔ جمال الدین مالی حیثیت سے بہت تنگ ہیں۔ ان کو اب لندن کی اقامت چھوڑ کر نواح لندن میں جانا پڑا ہے۔ کسی نے ان کو کچھ روپیہ دینا چاہا تھا مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اب جمال الدین کو ریلوے کے تیسرے درجہ میں سفر کرنا پڑے گا۔ ایسے عظیم الشان شخص کے لیے یہ تکلیف کس قدر افسوسناک ہے۔ اس لیے آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جمال الدین کے لیے ایک ہزار افرانک وہبی بے کے پتہ پر 30 بیڈفورڈ پیلس۔ رسل سکوائر میں بھیج دیجئے۔ ان کو معلوم نہ ہو کہ میں آپ کو روپیہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ان کو بہت غصہ آئے گا اگر یہ معلوم ہو جائے''۔

شیخ کی تمام زندگی اسی طرح گزری مگر وہ کبھی اپنی مالی مشکلات کی شکایت نہیں لائے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ

یہی مالی مشکلات تھیں جنھوں نے ''العروۃ الوثقیٰ'' کی زندگی کو اس قدر مختصر کر دیا۔ تاہم آج تک یہ حال ہے کہ شیخ کا جو کوئی نام لیتا ہے، وہ ''العروۃ الوثقیٰ'' سے بھی واقف ہے۔ شاید ہی مشرق میں کسی اخبار کو اتنی مختصر زندگی میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

افغانی اور حکومت برطانیہ

پیرس کے قیام میں شیخ کا تعلق برطانوی سیاسیات کے مد و جزر سے بہت کافی رہا اور اس کا وسیلہ زیادہ تر بلنٹ تھے۔ ان ہی کی تحریک پر چند روز کے لیے شیخ لندن گئے تھے۔ بلنٹ یہ چاہتا تھا کہ برطانوی وزارت کے بعض اراکین سے شیخ کی معاملات مصر کے متعلق گفتگو کرائیں۔ چنانچہ 1885ء میں وہ بادل ناخواستہ لندن گئے اور کچھ روز ساؤتھ واٹر میں بلنٹ کے پاس ہی مقیم رہے، لیکن یہ زمانہ گلیڈ سٹون کی پالیسی کا نصف النہار کا زمانہ تھا اور برطانوی سیاست کے ماہرین مشرقی ممالک کی آزادیوں کو ختم کر کے مشرق پر مغربی پالیسی کا پورا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ بریں شیخ کے مضامین کا لندن میں بہت چرچا ہو چکا تھا اور برطانوی مدبرین شیخ کے ارادوں کو بہت بری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ تاہم بلنٹ کی کوششوں سے شیخ نے لارڈ چرچل اور سر ڈرامنڈ ولف سے ملاقاتیں کیں۔ ولف مصر میں برطانیہ کا نمائندہ ہو کر جا رہا تھا، مگر وہ پہلے اسلامبول جانے والا تھا اور برطانوی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ شیخ اس کے ساتھ اسلامبول جائیں اور ترکی و برطانیہ کی بعض الجھنوں کے سلجھانے میں مدد دیں۔ اس کے ساتھ ان سے وعدہ کیا گیا کہ تخلیہ مصر کا سوال بھی طے کر دیا جائے گا۔

لیکن ان امور کے طے ہو جانے کے بعد یکایک ولف روانہ ہو گیا اور شیخ کا ساتھ لے جانا منسوخ کر دیا گیا۔ برطانوی سیاست کی اس اضطراری کروٹ نے شیخ کو بہت متاثر کیا اور اس کے بعد انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ برطانوی مدبرین کی میٹھی باتوں سے دھوکا نہ کھائیں گے اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ ان سے متنفر رہے۔ چنانچہ اپنی روانگی سے پہلے جو خط انہوں نے بلنٹ کو لکھا، اس میں ان کی مایوسی اور غم و غصہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے 17 جولائی 1885ء کو یہ خط تحریر کیا۔

''آپ کے کارہائے نمایاں اور مساعی جمیلہ کا ہر شخص کی زبان پر چرچا ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور تمام باتوں سے محفوظ رکھے۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ موجودہ وزارت کی حکمت عملی بھی مصر اور سوڈان کے بارے میں گزشتہ وزارت ہی کی سی ہے۔ میٹھے اور خوشگوار وعدوں سے بھوک کب جاتی ہے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مصر کا مسئلہ افغانستان کے معاملہ پر منحصر ہے اور افغانستان کا معاملہ تمام تر میرے ہاتھ میں ہے، اس لیے میں نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ آئندہ ہفتے افغانستان روانہ ہو جائیں اور میرے جانے سے ان شاء اللہ آپ کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ عنقریب میں آپ کو اپنی کارگزاریوں سے مطلع کروں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں اس وقت تک اپنے ہی تک رکھئے گا جب تک کہ ہم کسی مفید نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں''۔

اس خط سے شیخ کے ارادوں کا کافی اندازہ ہوتا ہے، گو کہ وہ اس وقت اپنے حسب منشاء براہ راست افغانستان نہ جا سکے، لیکن ان کا بجائے افغانستان کے روس کی طرف جانا بھی یہ بتا رہا تھا کہ وہ مصر کی مشکلات کو حل کرنے کے

لیے افغانستان اور روس کا متحدہ دباؤ انگلستان پر ہندوستان میں ڈلوانا چاہتے تھے اور اس طرح ایک نیا نقشہ جنگ تیار کر کے مصری قوم پرستوں کی امداد کرنا چاہتے تھے اور اس منصوبہ میں بلنٹ بھی ان کا ہم خیال تھا۔ یہ معلوم ہے کہ مسلمانانِ بلخ و بخارا سے ان کے بہت کافی تعلقات تھے۔ بہر حال وہ روس ضرور گئے، لیکن یہاں ان کی زندگی کی داستان ذرا مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس امر کا فیصلہ متضاد بیانات کی وجہ سے مشکل ہو جاتا ہے کہ پیرس سے وہ پہلے روس گئے یا ایران گئے، پھر ایران آئے، پھر دوبارہ روس گئے اور پھر ایران واپس آئے۔ میں اس معمہ سے حاضرین کو تھکانا نہیں چاہتا اور کسی دوسرے موقع پر اس الجھیڑے کو سلجھانے کی کوشش کروں گا، لیکن بہر حال سلسلہ بیان قائم رکھتا ہوں۔ روس میں انہوں نے اخبار ''ہسکوی'' کے مشہور ایڈیٹر کاتکوف سے بہت زیادہ رسم و راہ پیدا کی اور اس کے ذریعہ سے اپنی آواز کے لیے ایک راستہ پیدا کیا، لیکن کاتکوف کا اسی زمانہ میں انتقال ہو گیا اور شیخ کے منصوبوں کو یقیناً اس کے انتقال سے صدمہ پہنچا۔ تاہم وہ روس میں مقیم اور مسلمانانِ روس کی فلاح میں مساعی کرتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے روسی مسلمانوں کی ایک بڑی خدمت یہ انجام دی کہ زار کو آمادہ کر کے کلام مجید کی اشاعت کی اجازت دلوا دی جس کی اشاعت اس وقت تک روس میں ممنوع تھی۔ اسی دو برس میں شیخ کی ملاقات شاہ ایران سے ہوئی اور پھر وہ بوشہر ہوتے ہوئے ایران تشریف لے گئے اور وہاں سے پھر ایک دفعہ شاہ کا کوئی پیام لے کر روس گئے۔ رسالہ ''کاوہ'' کا ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ تین ماہ بوشہر میں مقیم رہے۔ وہاں مرزا نصر اللہ اصفہانی اور فرصت شیرازی سے بہت ارتباط رکھتے تھے۔ براؤن لکھتا ہے کہ روس میں انہوں نے شاہ ایران سے ملاقات پسند نہیں کی لیکن آخر کار میونخ میں ملاقات ہوئی اور وہیں سے شاہ ان کو بہ اصرار تہران لے گیا۔ بوشہر کا قیام اس سلسلہ بیان میں اچھی طرح چسپاں نہیں ہوتا لیکن بہ حال اس داستان کا وہ کوئی اہم حصہ نہیں ہے۔ حاصل کلام یہی ہے کہ شیخ کو شاہ نے عہدہ وزارت پیش کیا اور براؤن ان کے دوست شیخ عبدالقادر المولی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ انہوں نے شاہ کی دعوت پر بہت اظہار تعجب کیا اور شیخ نے کہا کہ ''کیونکر ممکن ہے کہ شاہ آپ کو ایسے عہدہ پر فائز کرے جب کہ یہ معلوم ہے کہ آپ سنی مذہب کی تقویت کے لیے کیا کیا کوشش کر چکے ہیں''۔ تو شیخ نے صرف اتنا ہی کہا کہ ''یہ بھی شاہ کی ایک حماقت معلوم ہوتی ہے''۔ قصہ مختصر شیخ شیراز و اصفہان ہوتے ہوئے تہران پہنچے اور حاجی محمد حسین امین المعروف کے گھر پہنچے۔

جمال الدین افغانی ایران میں

ایران میں علمی زندگی

ایران میں شیخ کی علمی زندگی کا اہم ترین زمانہ 1889ء سے شروع ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ کے مہمان ہو کر گئے تھے، لیکن ان کے افکار و عزائم شاہ کے اثرات سے بہت دور تھے وہی ایک جذبہ جو ان کو مصر اور روس لے گیا تھا یا نجد و خلیج فارس کی طرف لے گیا، وہی جذبہ ان کو ایران میں کھینچ کر لایا تھا اور کچھ ہی عرصہ بعد اس جذبے کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

شیخ کا بہت بڑا کارنامہ جو مصر و ایران میں ان کی زندگی کا نشان ہے، یہ تھا کہ جو جماعت یعنی جماعت علماء شہنشاہیت کی پرستار اور مددگار تھی، اسی سے انہوں نے شہنشاہیت اور مطلقیت کے فنا کرنے کا کام کیا۔ تاریخ اسلامی کے اس دور میں قدامت پسند علماء کا گروہ حقوق انسانیت کا حامی نہ تھا بلکہ مخالف تھا، تاہم شیخ ہی کا وہ جادو تھا جس نے اس استبداد پسند جماعت کے قلوب کو بدل دیا اور حقوق ملت کے چوروں ہی کو "آدمیت" اور انسانیت کا محافظ و پاسباں بنادیا۔ شیخ کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے بڑا معجزہ تھا۔

ناصر الدین شاہ کی زندگی کے آخری چند سال ایران کے قومی مصائب اور ایرانی شہنشاہیت کے عذاب کے بدترین چند سال تھے۔ شاہ کو یورپ کی دلچسپیوں اور عیاشیوں نے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور اس کی دولت یورپ کے بازاروں اور قہوہ خانوں میں پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ ناصر الدین شاہ کا تیسرا اور آخری سفر یورپ وہ تھا جب وہ یورپ سے اپنی شہنشاہیت کے سخت ترین دشمن کو مہمان بنا کر ساتھ لایا تھا، جس طرح فرعون کے محل میں موسیٰ لائے گئے تھے۔ ناصر الدین نہ صرف اپنا خزانہ خالی کر چکا تھا بلکہ اس کی رعایا کی جیبیں بھی خالی ہو چکی تھیں۔ اب مصر کی طرح یہاں بھی یورپ کے ساہوکار قبضہ جما رہے تھے۔ مشرق کے تاجداروں کے تاجوں کو گروی رکھنے کے لیے یورپ کا بنیا ہمیشہ تیار رہتا ہے، اس لیے کہ وہ خوب جانتا ہے کہ تاج کے ساتھ تخت بھی اس کے گھر آئے گا۔ ناصر الدین کی تنگدستی نے اس کو قرضے لینے اور یورپین سرمایہ داروں کو اپنے ملک میں ہر قسم کی مراعات دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ 1889ء میں برطانوی سرمایہ داروں کو تہران میں شاہی بینک قائم کرنے کا ٹھیکہ دے دیا گیا اور اسی کے چند روز بعد تمباکو کے اجارہ کا قصہ پیش آیا جس نے بالآخر انقلاب کے دروازے کھول دیئے۔ 20 اکتوبر 1889ء کو شاہ سفر یورپ سے واپس آئے۔ شیخ ان کے ہمراہ تھے۔ چند ہی روز بعد اہواز سے تہران تک سڑک بنانے کا ٹھیکہ ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا گیا۔ 8 مارچ 1890ء کو ایک انگریز کو تمام ایران کے تمباکو کی کاشت کا اجارہ دار بنایا گیا۔ تقریباً دس کروڑ کے سرمایہ سے اس کمپنی نے اپنا کام شروع کیا۔ اس اجارہ کے خلاف سب سے پہلے شہزادہ ملکم خاں نے جو لندن میں ایرانی سفیر تھے، احتجاج کیا اور اسی بناء پر شاہ نے ان کو سفارت کے عہدہ سے برطرف کر دیا۔ ملکم خاں کی زبردست شخصیت نے اس موقع پر اپنے تمام ذاتی اثرات کو حکومت کے خلاف نکتہ چینی میں صرف کر دیا۔ وہ اپنے عہدہ سے برطرف ہو کر لندن ہی میں مقیم رہے۔ انہوں نے اخبار "قانون" جاری کیا۔ اس اخبار نے ایرانی شہنشاہیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ شیخ کے مضامین بھی "قانون" میں شائع ہونے لگے اور تھوڑے ہی عرصہ میں راز ظاہر ہو گیا کہ شیخ ملکم خاں کی اس تحریک سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح شیخ کی زبردست آواز خط کے لفافہ میں تہران سے لندن جاتی تھی اور لندن سے "قانون" کے پردے میں تہران واپس آ کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جاتی تھی۔ شاہ ان کے اصلی رنگ سے واقف ہو چکا تھا اور وہ بھی کھل کر میدان میں آ گئے تھے۔ جاں فروشوں کی ایک جماعت ان کے حلقہ میں داخل ہو چکی تھی۔ شیخ علی قزوینی جو بعد کو قاضی مدینہ ہوئے، مرزا آقا خاں جنہوں نے بعد میں قسطنطنیہ سے اخبار "اختر" جاری کیا اور پھر تبریز میں خفیہ طور پر قتل کر دیئے گئے، شیخ احمد کرمانی، مرزا رضا کرمانی جس نے ناصر الدین شاہ کو قتل کیا اور تہران میں پھانسی پائی، مرزا محمد علی خاں اور ایسے ہی

بہت سے نام شیخ کے عقیدت مندوں کی فہرست میں تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ نام تھے جو آج بھی تاریخ انقلاب کے صفحات میں آب زر سے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش آتا ہے، حکومت کے بلند مقام اراکین شیخ کے بڑھتے ہوئے اثرات کو گوارا نہ کر سکے اور وزیراعظم امین السلطنۃ نے بہت جلد شاہ کو شیخ کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس عرصہ میں بہت سی خفیہ انجمنیں ملک میں قائم ہو چکی تھیں اور شاہ اپنے کو سخت خطرہ میں پاتا تھا۔ شیخ بھی اب امین السلطنۃ اور شاہ کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے شاہ سے اجازت چاہی کہ تہران سے باہر شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ میں اقامت اختیار کریں اور شاہ نے بھی اس خیال سے کہ یہ فتنہ خاص دارالسلطنت سے دور ہو جائے، ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن جب وہ شاہ عبدالعظیم میں جا کر بیٹھے تو وہاں بھی مشاہیر علما اور عوام ہزاروں کی تعداد میں حاضر ہونے لگے اور شیخ کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ آٹھ مہینے اسی طرح گزر گئے اور اس آٹھ مہینہ میں داعی حریّت کی آواز ایران کے ہر گوشہ میں سرایت کر گئی اور ملّت ایران کے ایک مصلح اعظم سمجھے جانے لگے۔ اسی زمانہ میں شیخ نے ایک مکتوب شاہ کو بھیجا اور دریافت کیا کہ وہ کیوں ان سے بدگمان ہیں، لیکن اس مکتوب کے جواب میں شاہ نے شاہ عبدالعظیم میں شیخ کو ان کے بستر علالت پر گرفتار کرا لیا اور وہیں سے پچاس سواروں کی نگرانی میں عثمانی سلطنت کی سرحد پر بھیج دیا۔ شیخ کے خارج البلد کیے جانے کی خبر نے تمام ملک میں آگ لگا دی اور شاہ کو اپنی موت نظر آنے لگی۔ بلاشبہ شیخ کا ایران سے جانا شاہ کی موت کا آنا تھا۔

شیخ نے ایران سے نکلتے ہی مجتہدین عراق و کربلا اور علمائے ایران کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا اور جو زمین وہ تیار کر چکے تھے، اس پر اپنا کام شروع کر دیا۔ جو خطوط شیخ نے علماء و مجتہدین کو لکھے، ان میں سے ایک کا کچھ حصہ ان اوراق میں اس لیے پیش کرتا ہوں کہ شیخ کے ان جذبات سے آپ روشناس ہو جائیں جو ایران کے متعلق ان کے قلب کو بے چین کر رہے تھے۔ سامرہ کے مجتہد اعظم حاجی مرزا حسین شیرازی لکھتے ہیں:

"میں حق کہتا ہوں۔ یہ خط شریعت اسلامی کی خاطر لکھتا ہوں۔ جہاں کہیں وہ شریعت جاری ہو اور قائم ہو۔ یہ ایک اپیل ہے جو تمام حق پسند روحوں سے کرتا ہوں جو شریعت پر ایمان رکھتی ہیں اور اس کے نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں یعنی میں اپیل کرتا ہوں علماء اسلام سے اور یہ اپیل میں تمام علماء سے کرتا ہوں حالانکہ میرے مخاطب ان میں سے ایک ہی ہیں۔۔۔۔

"خدا نے آپ کو اس اعلیٰ نیابت پر فائز کیا ہے تاکہ آپ حقیقت عظیمہ کے نمائندے ہوں اور خدا نے ملّت بیضا سے آپ کو منتخب کیا ہے کہ آپ انسانوں کی باگ ہاتھ میں لے کر شریعت اسلامی کی حفاظت و نگرانی کریں۔ اہل ایران اب ظلم و ستم کے اندر اپنے بیت الدین کو دیکھ کر بے تاب ہو گئے ہیں جو اغیار و کفار کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے اور جس پر ان اغیار و کفار کا قبضہ قائم ہو گیا ہے۔ مگر کسی لیڈر کے نہ ہونے کی وجہ سے اہل ایران پریشان ہیں، منقسم ہیں اور معطل ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں، ان کا ایمان متزلزل ہوتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان مجتہدین کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی جن کو وہ اپنا رہنما اور اسلامی مفاد کے معاملات میں اپنا لیڈر سمجھتے ہیں اور سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ تیرا ایک لفظ ان کو متحد کر دے گا اور تیری ہی حجت فیصلہ کن ہو گی۔ تیرا

ہی حکم باا ثر ہوگا اور کسی کو مجال نہ ہوگی کہ تیرے حکم پر حرف زنی کر سکے اور اگر تو چاہے تو متفرق عناصر کو اپنے ایک لفظ سے متحد کرا دے گا اور اس طرح خدا کے دشمنوں کے دل میں خوف پیدا کر دے گا اور کفار کے ظلم سے اہل ایران کو بچالے گا۔ تیرا ہی ایک لفظ اس مصیبت و ابتلا کا خاتمہ کر دے گا، جس میں اہل ایران گھرے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی کو سختیوں سے نجات دے کر راحت و آرام عطا کرے گا۔ پس دین کی حفاظت ہو جائے گی اور اس دین کے حلقہ بگوش اس کو سنبھال لیں گے اور اسلام کا مرتبہ بلند ہو جائے گا۔۔۔۔ اے امام اعظم! بلاشبہ بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے۔ اس کی سیرت خراب ہے اور اس کا دل گندہ ہے۔ وہ ملک پر حکومت کرنے اور اہل سب کے معاملات کو سدھارنے کے قابل نہیں ہے اور اس نے حکومت کی باگیں ایک بے دین، ظالم اور غاصب کے سپرد کر دی ہیں جو رسول ﷺ پر علانیہ استہزاء کرتا ہے اور شریعت حقہ کی پروا نہیں کرتا، جو امرائے شریعت کو خیال میں نہیں لاتا اور علماء پر لعنت بھیجتا ہے۔ اہل زہد و تقویٰ کو ذلیل کرتا ہے اور سادات کی تحقیر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کفار کے ملک سے واپس آنے کے بعد وہ بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ علانیہ شراب پیتا ہے اور کفار کی صحبتوں میں وقت گزارتا ہے۔ یہ ہے اس کا چلن، مگر اس کے علاوہ اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ مع اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا (اشارہ ہے معدنیات کی طرف) یہی نہیں بلکہ سڑکیں، کارواں سرائے، باغات، کھیتی سب ہی کچھ اس نے وقف کر ڈالے۔۔۔۔ تمباکو کی تمام زراعت مع زمین و عمارات کے، انگور کی فصل مع متعلقات اس نے کفار کی نذر کر دیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ بینک۔ آپ کیونکر سمجھیں گے کہ بینک کیا ہے؟ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ دشمنانِ اسلام کو گویا ساری سلطنت دے ڈالی۔۔۔۔ اب جو کچھ رہ گیا ہے اس نے روس کے سامنے پیش کر دیا تا کہ روس خاموش رہے یعنی مندب، رشت، دریائے طبرستان، سڑک انزل و خراسان مع تمام مکانات و سرائیں اور متعلقہ اراضیات مزروعہ کے، مگر روس نے ناک بھوں چڑھائی اس لیے کہ وہ تو کل خراسان، آذربائیجان چھوڑ گئے اور ماژندران کی فکر میں ہے، اسے اس ملک کو اس گنہگار کے ہاتھ سے نجات نہ دلوائے گا؟ بلاشبہ بہت جلد یہ اسلامی ملت اغیار کے زیر اقتدار ہوگی جو وہاں جس طرح چاہیں گے حکومت کریں گے۔ اگر تو نے یہ موقع جانے دیا اور اے امام! اگر یہ واقعہ تیری زندگی میں پیش آ گیا تو لاریب تو اپنا نام تاریخ کے صفحات پر روشن نہ چھوڑ جائے گا!''

اس کے بعد شیخ نے ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو ان کے رفیقوں پر اور خود ان پر کیے گئے۔ انہوں نے اپنے ایران سے نکالے جانے کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

''اب میری داستان اور جو کچھ اس ناشکر گزار ظالم نے میرے ساتھ کیا، وہ بھی سن لیجیے۔ اس مردود نے تہران کی برف سے ڈھکی ہوئی سڑکوں پر ذلت کے ساتھ میرے گھسیٹے جانے کا حکم دیا جب کہ میں خانقاہ عبدالعظیم میں پناہ گزیں تھا اور بہت بیمار تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کے ذلیل خادموں نے مجھے باوجود میری علالت کے ایک باربردار ٹٹو پر سوار کرایا اور زنجیروں سے باندھ دیا اور یہ سب اس وقت کیا گیا جب جاڑوں کا موسم تھا۔ برف کے طوفان آ رہے تھے اور بہت سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس طرح مجھے سواروں کی نگرانی میں خانقین پہنچایا گیا جہاں پہلے ہی ترک والی سے طے کر لیا گیا تھا کہ مجھے بصرہ بھیج دیا جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر مجھے آزاد چھوڑ دیا گیا تو

میں سیدھا تیرے پاس آؤں گا۔ اے امام! اور تجھے اس کے مظالم سناؤں گا اور مملکت ایران کے حالات بتاؤں گا اور تجھ سے اے حجۃ الاسلام! مدد چاہوں گا“۔

شیخ کی یہ زبردست اپیل ایک بجلی کی طرح ایرانی مجتہدین کی جماعت میں سرایت کر گئی اور ایران میں تمباکو کے اجارہ کے خلاف وہ شدید اور خوفناک آگ بھڑکی جس نے ناصر الدین شاہ کا جامہ ہستی جلا ڈالا۔ اپنے جلا وطن ہونے سے پہلے شیخ نے ایران کی سرزمین پر شہنشاہیت کے خلاف اس قدر بارود پھیلا دی تھی کہ ان کی جلا وطنی کے چند ہی روز بعد ”انقلاب“ کی آواز ایران کے کوچہ و بازار میں گونجنے لگی۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ بظاہر اسباب شیخ کی تعلیمات خود مختار بادشاہوں کی جان کی دشمن معلوم ہوتی تھیں اور یہ شبہ کچھ بے جا نہیں کہ شیخ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے شدید ترین آلاتِ حرب استعمال کرنے کو بھی جائز سمجھتے تھے۔ ان کے اس سیاسی مذہب سے کتنا ہی اختلاف کیا جائے، لیکن ان کی بے مثال قربانیوں اور ان کے اعلیٰ منتہائے خیال کے متعلق دنیا کا کوئی وطن پرست ایک حرف نہیں کہہ سکتا۔ جیسا کہ مصر کے حالات میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ ان کی سیاست کا وہی رنگ ایران میں بھی تھا۔ علماء کے حلقہ میں آگ لگا کر انہوں نے گویا ناصر الدین شاہ کی شہنشاہیت کو آگ لگا دی اور گو وہ خود اس ملک سے نکال دیئے گئے، لیکن اپنے بعد وہاں بہت سے سرفروش چھوڑ گئے جن میں سے ایک نے بالآخر ناصر الدین سے اس کے مظالم کا خوفناک بدلہ لے لیا۔ مرزا رضا کرمانی نے اپنی گرفتاری کے بعد اور پھانسی پانے سے پہلے جو بیان عدالت میں دیا، اس کی ایک معتبر نقل ہم کو براؤن کے ذریعہ سے ملی ہے۔ مرزا رضا خاں کے الفاظ اس کے جذبات اور ان جذبات سے شیخ کے تعلق کی ایک دلچسپ تصویر ہیں:

”سید جمال الدین اولاد رسول ﷺ نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ سے اس طرح ذلت کے ساتھ گھسیٹ کر نکالا گیا کہ ان کے جسم کے کپڑے تک پارہ پارہ ہو گئے۔ عقائد و خیالات سے اس ملک میں متفق ہیں، ان کی تعداد بہت ہے اور وہ ہر طبقہ کے لوگ ہیں۔ معلوم ہے کہ جب سیّد جمال الدین اس شہر میں آئے تھے تو تہران اور شاہ عبدالعظیم میں ہزار ہا آدمی ان کے خطبات اور مواعظ سنتے تھے اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے تھے، وہ خدا کے لیے تھا اور رضائے عامہ کی خاطر، ہر شخص کو ان کے خطبات سے فائدہ ہوتا تھا اور ان کے مواعظ کا ہر شخص گرویدہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے بلند خیالات کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا اور انسان جاگے اور ہوش میں آ گئے۔ اب تو ہر شخص وہی خیالات رکھتا ہے جو میرے ہیں، لیکن میں قسم کھاتا ہوں اس خدا کی جس نے سیّد جمال الدین اور تمام انسانوں کو پیدا کیا کہ سوائے میرے اور سیّد جمال الدین کے شاہ کے قتل کے ارادے کی کسی کو خبر نہ تھی۔ سیّد تو اب قسطنطنیہ میں ہیں، جو تمہارا جی چاہے کر لو“۔

ناصر الدین شاہ کو یکم مئی 1896ء کو قتل کیا گیا، یعنی شیخ کے ایران سے نکالے جانے کے بعد کے چھ سال بعد، لیکن ایران کا یہ سارا دورہ تھا جب شیخ کا ڈالا ہوا تخم بار آور ہو رہا تھا اور شیخ قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے اپنی کوششوں کے نتائج دیکھ رہے تھے۔ مرزا رضا خاں کا بیان یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاہ کے قتل میں شیخ کا اشارہ موجود ہے۔

سیّد جمال الدین افغانی کا سفر لندن سے قسطنطنیہ

ایران سے لندن

ایران سے نکل کر شیخ بصرہ پہنچے اور حاجی علی اکبر شیرازی سے جو خود ایک ایرانی مہاجر تھے، مشورہ کر کے لندن چلے گئے، جہاں ملکم خاں نے ایرانی شہنشاہیت کے خلاف بہت زیادہ زمین تیار کر لی تھی۔ غالباً لندن جانے کا اصلی باعث وہاں ملکم خاں اور بلنٹ کی موجودگی تھی۔ 1891ء میں وہ لندن پہنچ گئے اور براؤن کہتا ہے کہ اس کی ملاقات پہلی مرتبہ شیخ سے ہالینڈ پارک میں ملکم خاں ہی کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں انہوں نے چند جلسوں میں ''ایران کے خوفناک عہد'' کے عنوان سے زبردست تقریریں کیں اور اسی زمانہ میں ''ضیاء الخافقین'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے بہت سے اقتباسات بعد کو ''المنار'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ تمباکو کے خلاف علماء کا فتوی ایران میں شائع ہو چکا تھا اور اس فتوے کا یہ اثر ہوا تھا کہ خود شاہ کے محل میں شاہی قلیان کے لیے تمباکو میسر نہ آتا تھا۔ خود شاہ کو پہلی دفعہ پبلک کی آواز سے مجبور ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ کرنا پڑا اور بلاشبہ یہ شیخ کی پہلی فتح تھی۔ علاوہ بریں یہ فتح علماء کے لیے بھی تھی۔ ''ضیاالخافقین'' کے صفحات پر شیخ اپنے شدید ترین جذبات کا اظہار کر رہے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ تہران میں شیخ کی آواز کی گرج شاہ کو لرزا رہی تھی۔ کیم مارچ 1891ء کی اشاعت سے شیخ کی چند سطریں نموناً پیش کی جاتی ہیں:

''جب یہ بادشاہ، یہ زہریلا سانپ، یہ گنہگار، سلطنت ایران پر مسلّط ہوا، اس نے آہستہ آہستہ علماء کے حقوق میں دست اندازی کرنی شروع کی، ان کے رتبہ کو گرانے لگا اور ان کے اثرات کم کرنے لگا تاکہ خود مطلق العنان ہو کر حکومت کرے اور اپنے ظلم وتعدی کے دائرہ کو وسیع کر سکے۔ مگر حق باطل کے مقابلہ میں بلند ہوا اور اس نے شاہ کے ظلم کو کچل ڈالا جس طرح کہ ہر ظالم کا ظلم کچلا جاتا ہے۔ اے اسلام کے رہنماؤ! میں سچ کہتا ہوں کہ تم نے اپنے عزم واستقلال سے اسلام کے وقار کو بڑھا دیا ہے۔ غیر ملکوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ اصل طاقت تمہاری ہے جس کو وہ نہ دبا سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں مگر خطرہ سخت ہے اور حالت نازک ہے، اس لیے کہ شیطانوں سے اتحاد کر لیا ہے اور اب وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اس پر تلے ہوئے ہیں کہ اس گنہگار (شاہ) کو بہکا کر علماء کو خارج البلد کر دیا جائے''۔

یہ مضامین وہ عموماً ''سید'' یا ''حسینی سید'' کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ الفاظ کی سختی، درشتی اور تلخی میں ان کا قلم کچھ کفایت شعار نہ تھا۔ ان کے عزم اور حوصلہ کی اب یہ حالت تھی کہ ایک موقع پر انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ''ان بادشاہوں کا تخت سے اتارنا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ پاؤں سے جوتے کا اتارنا''۔

لندن سے قسطنطنیہ

تقریباً ڈیڑھ سال تک اس طرح لندن میں مشغول رہ کر وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں داخل ہوئے یعنی 1892ء میں سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت پر لندن سے قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں سلطان نے شیخ کے لیے 75 پونڈ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا اور ان کی مدارات میں بہت زیادہ توجہ کا اظہار کیا، لیکن عبدالحمید کا شیخ کو قسطنطنیہ بلانا ایک خاص پالیسی کے تحت تھا۔ عبدالحمید خاں اپنے تخت و تاج کی حفاظت کے لیے اتحاد اسلامی کا ایک قلعہ تعمیر کرنا چاہتا تھا اور خلافت اسلامی کا اشتہار دے کر وہ دنیا کی عقیدت مندی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یورپین دُوَل کی جانب سے جو خطرات اس کے گرد و پیش بڑھتے جاتے ہیں ان کا علاج صرف یہی ہے کہ اسلامی ممالک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہوں۔ چنانچہ انہی منصوبوں کے تحت اس نے شیخ کے اثرات سے کام لے کر مکہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھوادی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ شیخ کو اپنے زیر اثر رکھ کر ان کے اثرات کو جو عالم اسلامی میں مسلمہ تھے، اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں جب شیخ کے ساتھ اس کی توقعات بہت زیادہ وابستہ تھیں، عبدالحمید خاں ہر موقع پر ان کے بہت بڑے حامی و مددگار کے بھیس میں دنیا کے سامنے آتا تھا۔ جب ناصرالدین شاہ نے چاہا کہ شیخ کی آواز اس کے خلاف بند ہو تو اپنے سفیر کے ذریعہ سے بار بار دربار خلافت میں اس امر کی تحریک کی کہ شیخ کو ان کی جدوجہد سے روکا جائے۔ چنانچہ عبدالحمید خاں نے ایک دن شیخ سے کہا کہ شاہ ایران کی مخالفت اب ترک کر دو۔ اور شاہ ایران آپ سے بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ اور شیخ نے بھی سلطان کی خاطر کہہ دیا کہ ''اچھا خلیفہ وقت کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے میں شاہ ایران کو معاف کرتا ہوں''۔ لیکن تیر شیخ کے ہاتھ سے پہلے ہی نکل چکا تھا اور وہ شرارہ ایران میں گر چکا تھا جس نے ناصرالدین کی خرمن ہستی کو جلا دیا۔ تاہم اس واقعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ شیخ اور خلیفہ کے تعلقات اس وقت کیسے تھے۔ اس کے بعد جب ناصرالدین شاہ کو قتل کر دیا گیا تو حکومت ایران نے شیخ اور بعض دیگر اشخاص کو ترکی سے گرفتار کر کے لے جانا چاہا لیکن سلطان عبدالحمید خاں نے اوروں کو تو گرفتار کرا دیا، لیکن شیخ کی گرفتاری کی اجازت نہ دی۔ شیخ نے اس موقع پر خلیفہ کی حکومت سے پناہ نہیں مانگی، نہ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ غالباً وہ اس لیے مطمئن بیٹھے رہے کہ وہ سلطان عبدالحمید کے منصوبوں سے بیگانہ نہ تھے اور جانتے تھے کہ سلطان کو ابھی ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ مکہ کی ''انجمن ام القریٰ'' کو سلطان اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے اور حجاز و عراق میں شیخ کے اثرات سے کام لیا جا رہا تھا، لیکن بہت جلد سلطان عبدالحمید خاں کو شیخ کی رفاقت سے مایوس ہو جانا تھا۔ درحقیقت شیخ کا سیاسی مسلک عبدالحمید کی پالیسی کا بالکل مخالف تھا۔ عبدالحمید خاں خلافت کے نام سے عالم اسلامی کی ہمدردیاں اپنے تخت و تاج کے ساتھ وابستہ کر کے ترکی کو یورپین دُوَل کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور شیخ اول ہی سے ہر ایک تاج و تخت کے دشمن تھے۔ ان کا اتحاد اسلام بالکل دوسرے معنی رکھتا تھا اور وہ ہر جگہ شہنشاہیت اور مطلقیت کے خلاف جذبات ملی کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور ممالک اسلامی کی بیداری کو اپنے عالمگیر اتحاد اسلام کا سنگ بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک تمام اسلامی ممالک شخصی حکومتوں کے جبر و ظلم سے آزاد نہ ہوں گے۔ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی عملی ہمدردی

نہیں کر سکتے، اس لیے ان کو کوئی دلچسپی عبدالحمید خاں کی تحریک کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یورپ نے جس چیز کا نام پین اسلامزم رکھا، وہ عبدالحمید خاں کا تیار کیا ہوا ایک بھوت تھا جس نے اس وقت کی سیاسیات کے لحاظ سے بعض یورپین دول کے دفاتر خارجہ کی نیندیں حرام کر دیں مگر یورپ میں جمال الدین کے پین اسلامزم پر کوئی عمیق نظر نہیں ڈالی گئی بلکہ ان کو صرف اسلامی ممالک کا ایک فتنہ پرداز، یورپین اثرات کا دشمن اور بادشاہوں کی بادشاہت کا مخالف سمجھا گیا۔ اس کے آگے بہت کم لوگوں کی نظر گئی اور مجھے شبہ ہے کہ خود براؤن اور بلنٹ بھی شیخ کی پرواز خیال کے ساتھ کس حد تک چل سکے۔ بہر حال یورپ کی اصطلاح میں خلافت اور پین اسلامزم کا جو مفہوم سمجھا گیا تھا، شیخ اس سے بہت بلند، بہت دور اور بہت الگ جا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عبدالحمید خاں بہت جلد ان سے مایوس اور بد گمان ہو گئے اور شیخ کی زندگی کا آخری زمانہ قسطنطنیہ میں ایک گمنام قیدی کی طرح گزرا۔

''بیوک مجاہد شیخ جمال الدین افغانی'' کے عنوان سے ''اخبار وطن'' (قسطنطنیہ) میں چند سال ہوئے، شیخ کی سیرت پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ گو کہ شیخ کے سوانح نگاروں نے ان کی نظر بندی کی تفصیلات بیان نہیں کیں، لیکن اس مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ کو عبدالحمید خاں نے اس بنا پر قید کر دیا تھا کہ خلیفہ کے صیغہ جاسوسی نے اس کو یہ اطلاع دی تھی کہ شیخ سلطان کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور یہ روایت بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ عبدالحمید خاں کی سیاست کا اس زمانہ میں یہی رنگ تھا کہ وہ اپنے سایہ سے بھی ڈرتے تھے اور شیخ کے متعلق شبہات کا نہ پیدا ہونا پیدا ہونے سے زیادہ تعجب انگیز ہوتا۔ بہر حال اس زندگی کی مختصر روئداد ختم ہوتی ہے۔ میں نے شیخ کے علم و فضائل، ذاتی مشاغل، فلسفیانہ خیالات، عقائد مذہبی اور ان کی شہرت کے بہت سے ضروری پہلوؤں کے لیے ان مختصر صفحات میں گنجائش نہیں پائی۔ نہ میں اپنے سننے والوں کو بہت زیادہ تھکانا چاہتا ہوں۔ وہ چیزیں سب اپنے اپنے موقع پر بیان ہوں گی، شاید کہ شیخ کی زندگی کا کوئی نکتہ کسی حق شناس تک پہنچ جائے۔ میرے پاس ان مضامین اور ان کے خطوط کا ایک اچھا مجموعہ ہے جو بجائے خود ایک دلچسپ علمی دعوت کا سامان فراہم کرے گا، لیکن اس کے لیے دوسری فرصت درکار ہے۔

ایران میں جو جسمانی سختیاں شیخ نے برداشت کی تھیں، ان کا بہت زیادہ اثر شیخ کی صحت پر ہو چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ایران سے آنے کے بعد پھر وہ اپنی کھوئی ہوئی صحت کبھی حاصل نہ کر سکے۔ قسطنطنیہ میں وہ اکثر بیمار رہے تھے اور بالآخر دورانِ نظر بندی میں ان کو سرطان کا لاعلاج عارضہ لاحق ہوا۔ اس مرض کے سلسلہ میں تین دفعہ ان کے چہرے اور گردن پر عمل جراحی کیا گیا، لیکن اپنے رب کے پیام پر لبیک کہنے کا وقت آ چکا تھا۔

9 مارچ 1897ء کو اس مجاہد کی زندگی کا کام ختم ہو گیا اور قسطنطنیہ کی سرزمین پر اس نے اپنی آخری منزل کو پا لیا۔ اب یہ بحث دور از کار ہے کہ جمال الدین کو عبدالحمید خاں نے زہر دلوایا تھا یا نہیں۔ جتنا کام قسام ازل نے ان کے سپرد کیا تھا، وہ اس کو انجام دے گئے۔ دنیا والے اب جس قدر جی چاہے، اس پر تنقید و تبصرہ کر دیا بہا دیں، لیکن بیداری مشرق کے اس بہت بڑے بیامی کا نام اس وقت تک دنیا میں روشن رہے گا جب تک کہ دنیا آباد ہے۔ اہل نظر کے لیے یہ ایک سبق آموز داستان ہے۔

نشان ناش کے قریب ایک قبرستان میں شیخ کی قبر عرصہ تک بے نشان رہی، ان کے جنازے کے ساتھ بھی بیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھے، لیکن دنیا ان کو بھولی نہ تھی۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا کہ ہم خود اپنے ملک کے مشاہیر کو مرنے کے بعد یک ہفتہ کے اندر بھول جاتے ہیں، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ شیخ کی زندگی کا زیادہ سرمایہ مغرب میں محفوظ رہا اور عبدالحمید کے بعد ترکوں نے ان کی آخری آرام گاہ کو پھر ڈھونڈ نکالا۔ ایک امریکن کروڑ پتی نے ان کی قبر کے لیے سنگ مرمر کا ایک پتھر تیار کرا کر بھیجا تو ایک نوجوان ترک نے ایک غیر ملکی کی اس فیاضی سے متاثر ہو کر قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں لکھا کہ

''میں نے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن مسٹر کرائین نے اس بڑے مسلمان عالم کے لیے ایک نہایت شاندار سنگ مرمر کا مزار بنایا ہے۔ یہ امریکن کروڑ پتی ہے مگر اس کی تازہ ترین قدر شناسی نے نامعلوم میرے دل میں مسرت اور افسوس سے ملا جلا ہوا ایک احساس پیدا کیا۔ جمال الدین افغانی کے لیے ایک محتشم و شاندار مزار کا بنایا جانا حقیقتاً ایک ایسا اچھا کام ہے جس سے روح تسلی پاتی ہے۔ جمال الدین اپنی تمام زندگی میں دنیاوی جاہ و جلال سے بے پروا رہا اور اپنی متواضع زندگی کے شایاں اسی کو سمجھا کہ اپنی قبر کے لیے دو گز زمین سے زیادہ نہ لے۔ اس میں فراعنہ مصر کا غرور نہ تھا کہ اپنی لاش کی حفاظت کے لیے اہرام بنوائے۔ اس لحاظ سے ایک محتشم مزار کا بنایا جانا اس کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں کرتا مگر انصاف شرط ہے۔ کیا اس کی یادگار کے لیے اس قدر اہتمام بھی اس کے مداحین پر لازم نہ تھا؟ میں اس بات سے تو خوش ہوں کہ جمال الدین کا مزار اس کی ایک مادی یادگار رہوگا مگر میرے قلب کے ایک گہرے اور مغرور گوشے میں ایک خفیف ٹھیس لگتی ہے اور میرا دل سوال کرتا ہے کہ جمال الدین کے مزار کو ایک ترک، ایک افغان یا ایک ایرانی (جسے جمال الدین کے ایرانی ہونے پر بہت اصرار رہتا تھا) نے کیوں تعمیر نہ کرایا؟''

یہ تو ایک ترک کا جذبہ تھا۔ میں اپنے ہم وطنوں سے کیا کہوں، ان میں سے کتنے ہیں جو قسطنطنیہ جاتے ہیں اور وہاں کبھی جمال الدین کی قبر پر دو پھول چڑھانے کا ارادہ کرتے ہوں؟

اپنے آخری لمحوں میں جب زبان بند تھی اور چند آنسو بہانے کے لیے دوست بستر مرگ کے قریب بیٹھے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے حلقہ بنا کر کہا تھا کہ ''میں مر جاؤں گا مگر میری آنکھیں اسی طرح کھلی رہیں گی جس طرح تم دیکھتے ہو''۔

مفتی محمد عبدہٗ اور تحریک اتحاد اسلامی

مصر کے شیوخ اور اہل تصوف سیّد جمال الدین افغانی کے سخت خلاف تھے، اور قریب قریب ہر مسلم ملک کے حکمران نے سیّد کی سرگرمیوں کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ تصور کیا۔ اس کے باوجود سیّد کی تحریک پان اسلامزم کے اثرات، دنیا کے تمام مسلمان دانش وروں کی تحریروں میں آج بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ سیّد افغانی کے ایک سوانح نگار ڈاکٹر ایڈمنڈ نے کتاب میں افغانی تحریک کے اثرات کے بارے میں لکھا ہے

''اس حیرت انگیز انسان کی سرگرمیاں عملاً پوری دنیائے اسلام اور ان یورپی ممالک پر بھی حاوی رہیں، جن کی حکومتیں مسلمان اقوام کے معاملات سے سیاسی تعلق رکھتی تھیں۔ افغانستان، ایران، ترکی، مصر، ہندوستان سب ملکوں سے وقتاً فوقتاً سیّد صاحب کا قوت آموز رابطہ پیدا ہوا اور یہ سب اس ربط سے متاثر ہوئے۔ انقلاب ایران، جس کا آغاز 1891ء میں اجارہ تمباکو کے خلاف شورش سے ہوا اور آخر 5 اگست 1906ء کو قیام مشروطہ پر منتج ہوا، وہ اپنے مراحل میں سیّد صاحب ہی کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے فیض یاب ہوا تھا۔ 1908ء میں نوجوان ترکوں کی کامیاب تحریک سیّد صاحب ہی کی شورش کے ماتحت تیار ہوئی تھی، جس کو انہوں نے قیام قسطنطنیہ کے دوران میں پروان چڑھایا تھا۔ مصری قوم پرستوں کی وہ تحریک جو اپنے ابتدائی مرحلے میں ''عرابی بغاوت'' کے ناکام ہونے کی وجہ سے خاک میں مل گئی تھی۔ اس کے ابتدائی محرک سیّد صاحب ہی تھے۔ اور مصر میں جس ذہنی اور مذہبی بیداری کے علم بردار محمد عبدہٗ تھے، وہ بھی بڑی حد تک سیّد صاحب ہی کے ممنون احسان تھے۔ مائیکل نے شیخ محمد عبدہٗ کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ جہاں کہیں جاتے تھے، اپنے پیچھے بحث ونزاع کا ایک میدان چھوڑ جاتے تھے۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم ممالک میں قومی آزادی کی تمام تحریکیں اور یورپی مہم پروری کے خلاف ہنگامے جو ہم تیس برس سے مشرق کے ملکوں میں دیکھ رہے ہیں، ان سب کا ماخذ محمد عبدہٗ ہی کے پروپیگنڈے میں مضمر ہے۔''

مصر کے مفتی محمد عبدہٗ نے ترقی پسند جدیدیت کی سوچ اپنے استاد اور دوست افغانی (وفات 1896ء) ہی سے حاصل کی اور تجدید و احیاء اور اصلاح کی تحریک کو آگے بڑھانے کے عزم اور جذبے کا سرچشمہ بھی افغانی ہی کی شخصیت تھی۔ مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں عہد حاضر کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نیا شعور اور نئی حرکت پیدا کی جائے۔ ترقی پسندی اور جدید خیالی کی اس تحریک نے مصر سے باہر، دوسرے اسلامی ممالک کے تعلیم یافتہ لوگوں کو متاثر کیا۔

استاد اور شاگرد کے باہمی اختلافات

لیکن افغانی اور ان کے شاگرد کے افکار اور طرزِ عمل میں کچھ اختلاف بھی تھا۔ استاد مرتضیٰ مطہری ایرانی اپنی کتاب ''بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں'' میں رقم طراز ہیں:۔

''عبدہٗ اسلامی ممالک کی پرانی بیماریوں کی اس تشخیص سے مکمل اتفاق کرتے تھے، جو ان کے استاد نے دریافت کی تھی۔ وہ چیزیں جو عبدہٗ کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس کے استاد میں نہیں ہیں، وہ یہ ہے کہ عبدہٗ نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد وخیالات میں خلفشار اور الجھاؤ کی طرف توجہ کی جو مسلمانانِ عالم کے اندر اس وقت پیدا ہوئے جب انہوں نے جدید مغربی تہذیب کے ساتھ مراسم بڑھائے۔ جدید دنیائے اسلام کے نئے مطالبوں اور

تقاضوں پر بھی توجہ کرنا ان کی خصوصیت ہے۔ کئی صدیوں سے مسلمان زوال اور انحطاط کا شکار تھے، اور اب وہ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ بدلے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ جب عبدہٗ سیّد جمال الدین افغانی کو چھوڑ کر مصر واپس آئے تو ان کے ذہن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ''اسلام اور عصر حاضر کے تقاضوں'' کے مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے انہوں نے دو چیزوں کو بالخصوص مدنظر رکھا۔ اول یہ کہ فکری جمود اور علمائے دین کا مصنوعی اور جعلی نظریۂ عقلیت مصری معاشرے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب نہ بنے، اور مسلمانوں کی اندرونی طاقت اسلام اور خود اپنے خلاف نہ اٹھ کھڑی ہو، جیسا کہ بعض اسلامی ممالک میں ہوا ہے۔ دوم یہ کہ اسلام اور سائنس کی باہمی کشمکش اور معرکہ آرائی میں انتہا پسندی سے گریز کیا جائے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو قربان نہ کیا جائے۔

مفتی محمد عبدہٗ نے بعض ایسے مسائل اٹھائے جو سیّد جمال الدین افغانی نے نہیں اٹھائے تھے۔ مثلاً اسلام کے چاروں فقہی مذاہب میں فقہ کے مسائل، اجتہاد میں بنیادی حقوق کا خاص خیال، اور فقہ میں جدید قانونی نظام کی ایسی اپنائیت جو روزمرہ کی عملی زندگی کی ضروریات پر پورا اترے۔ عبادات اور معاملات میں حدِ فاصل قائم کرنا یا دوسرے لفظوں میں آخرت سے روحانی، دینی اور مابعد الطبیعی امور کو ایک طرف رکھنا اور دنیاوی مادی زندگی اور دنیاوی امور کو دوسری طرف رکھنا، اور یہ کہ فقیہ آخرت کے امور میں اجتہاد کا حق نہیں رکھتا، جب کہ دنیاوی امور میں رکھتا ہے۔

سیّد جمال الدین افغانی انقلاب کے قائل تھے، جب کہ مفتی عبدہٗ نے بتدریج اصلاح پر زور دیا۔ سیّد کا خیال تھا کہ اسلامی معاشرے میں اصلاح لانے کے لیے پہلے غیر ملکی استعمار اور استبداد کے خلاف جہاد کیا جائے، جب کہ مفتی عبدہٗ کا خیال تھا کہ سیاسی انقلاب کی تعلیم و عمل سے پہلے دینی تعلیم و تربیت پر توجہ دینی چاہیے۔

مفتی صاحب کے حالاتِ زندگی

محمد عبدہٗ مصری کسانوں کے متوسط الحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عبدہٗ ابن حسن خیر اللہ ترک النسل تھے، جب کہ ان کی والدہ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ تک منتہی ہوتا ہے۔ ان کا کنبہ مصر کے صوبے بحریہ کے ایک گاؤں ''محلات نصر'' میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ محمد عبدہٗ 1849ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے معمولی تعلیم کے بعد بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس کے بعد دینی تعلیم کی تحصیل کے لیے قصبہ طنطا کی احمدی مسجد میں بھیجے گئے۔ لیکن یہاں فرسودہ طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ان کا دل نہ لگا اور ڈیڑھ برس کے بعد اپنے گاؤں چلے آئے اور شادی کر لی۔

محمد عبدہٗ واپس آ کر کھیتی باڑی میں لگ گئے۔ یہاں اتفاق سے ان کی ملاقات شیخ خضر درویش سے ہوئی جو ان کے والد کے خالو تھے۔ شیخ خضر درویش نے طرابلس الغرب کا سفر کیا تھا اور سنوسی طریقے کے ایک بزرگ سیّد محمد المدنی سے علمی استفادہ کرنے کے بعد سلسلۂ شاذلیہ میں بیعت کر لی تھی۔ انہوں نے محمد عبدہٗ کو قرآن مجید کے چند اسباق بھی اپنے طریقے پر پڑھائے اور انہیں تلقین کی کہ وہ خود کو عوام سے علیحدہ نہ سمجھیں، بلکہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہیں۔ شیخ درویش کی صحبت سے محمد عبدہٗ کو مزید تعلیم کے حصول کا شوق پیدا ہوا۔

محمد عبدہٗ دوبارہ احمدی مسجد (طنطا) چلے آئے، لیکن وہ جلد ہی قاہرہ کی مشہور دینی درس گاہ جامع الازہر میں منتقل

ہو گئے۔ الازہر کے نصاب تعلیم میں زندگی کی روح مفقود تھی۔ درس میں متن کتاب کی شرح ہوتی، شرح کا حاشیہ ہوتا اور حاشیے پر تقریر ہوتی۔ طلبہ کی توجہ فقروں کی نحوی تحلیل اور لفظی بحث پر مرکوز رہتی۔ تاریخ، جغرافیہ اور سائنسی علوم کی کتابوں کا گزر نہ تھا۔ اساتذہ میں مستثنیٰ شخصیت شیخ حسن الطویل کی تھی، جو قدیم فلسفہ اور ہندسہ کی تعلیم دیتے تھے۔ شیخ حسن الطویل کی مجالس درس نے محمد عبدہ کے شوق علم میں اضافہ کیا، لیکن انہیں علمی اور فکری غذا سید جمال الدین افغانی ہی کے فیض صحبت سے ملی۔

سید افغانی کے فیض صحبت سے شیخ محمد عبدہ نے قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ پایا۔ دینی اور اجتماعی اصلاح کا شوق پیدا ہوا اور قرآن مجید کی تفسیر و تفہیم کو مقصد حیات بنالیا۔ بالآخر محمد عبدہ نے 1877ء میں الازہر سے سند عالمیت حاصل کر کے الازہر ہی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ الازہر میں منطق، فلسفہ اور توحید کی تعلیم اور گھر میں بعض طلبہ کو ابن مسکویہ کی ''تہذیب الاخلاق'' کا درس دیتے اور چند شوقین طلبہ کو ایک فرانسیسی مصنف اور وزیر Guizot کی ''تاریخ تمدن عرب'' (عربی ترجمہ) بھی پڑھاتے۔ 1878ء میں وہ دارالعلوم مصریہ میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے، تو انہوں نے ''مقدمہ ابن خلدون'' پر کئی خطبات دیے اور طلبہ کو قوموں کے عروج و زوال کے فلسفے سے آشنا کیا۔

اسی زمانے میں وہ مدرسۃ الالسنۃ میں عربی زبان کے معلم مقرر کیے گئے۔ انہوں نے طلبہ میں زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے علاوہ مضمون نگاری کی مشق بھی کرائی، تاکہ مصریوں کی نوجوان نسل عربی زبان اور اسلامی علوم کا احیاء کرے اور مصری حکومت کی بے راہ روی کی اصلاح کرے۔ وہ اپنے علمی، تعلیمی، تدریسی مشاغل میں مصروف تھے کہ اچانک خدیو مصر رفیق پاشا نے سید جمال الدین افغانی کو ملک بدر کر دیا اور محمد عبدہ کو ملازمت سے برطرف کر کے ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا۔ (ستمبر 1879ء) ان کی برطرفی کی بڑی وجہ ان کے سیاسی مقالات اور ترقی پسندانہ خیالات تھے۔

خدیو کے تخت گیر اور ظالمانہ اقدام کے وقت ترقی پسند اور لبرل وزیراعظم ریاض پاشا مصر سے باہر تھے۔ جب بعد میں وہ واپس آئے تو انہوں نے محمد عبدہ کو حکومت مصر کے سرکاری اخبار ''الوقائع المصریہ'' کے عملۂ ادارت میں شامل کرلیا اور تھوڑی مدت کے بعد وہ چیف ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ اس کے علاوہ انہیں تمام اخبارات کا سنسر آفیسر بھی مقرر کر دیا گیا۔ اب سرکاری خبروں کے علاوہ اس اخبار میں ادبی، معاشرتی اور اصلاحی مقالات شائع ہونے لگے۔ شیخ محمد عبدہ کے خیال میں مصری قوم کی اصلاح نظام تعلیم میں اصلاح و بہتری ہی سے ہو سکتی تھی۔ انہوں نے مروجہ، خلاف شرع رسوم و رواج کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان کے نقد و احتساب سے سرکاری محکمے بھی نہ بچ سکے۔ اخبار کے ذریعے ان کا سب سے بڑا کارنامہ مصریوں کے جذبۂ حب الوطنی کو بیدار کرنا اور ان میں حقوق طلبی کا داعیہ پیدا کرنا تھا۔

شیخ محمد عبدہ اپنے علمی اور اصلاحی مشاغل میں مصروف تھے کہ عرابی پاشا کی شورش نے ملک میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اس شورش کے آغاز میں محمد عبدہ اس سے الگ تھلگ تھے، لیکن جب حریت پسندوں نے نمائندہ حکومت کے قیام

کا مطالبہ پیش کر دیا اور یہ ایک انگریزوں کے مقابلے میں قومی تحریک بن گئی تو وہ اس کے حمایتی بن گئے۔ اس تحریک کا انجام ناکامی اور انگریزوں کے تسلط سے ہوا۔ اس میں شرکت کے الزام میں شیخ محمد عبدہ تین سال کے لیے ملک بدر کر دیئے گئے اور 1883ء میں وہ بیروت چلے گئے۔

محمد عبدہ سید افغانی کی خدمت میں

شیخ محمد عبدہ کو بیروت آئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ پیرس سے سید جمال الدین افغانی کا دعوت نامہ ملا۔ انہوں نے پیرس جا کر سید افغانی سے مل کر ''العروۃ الوثقی'' نکالنا شروع کیا (1884ء) اس اخبار کا مقصد صحیح دینی عقائد کی اشاعت کے علاوہ تمام مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، قرآن کے فہم کی دعوت دینا اور خلافت راشدہ کے نمونے پر اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اس اثنا میں وہ لندن بھی گئے، انگریز مدبروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے مصر اور سوڈان کے مسائل پر گفتگو کی، اور مصریوں کا نقطۂ نظر واضح کیا، لیکن گفت و شنید بے نتیجہ رہی اور شیخ محمد عبدہ خالی ہاتھ واپس لوٹے۔ آٹھ ماہ میں ''العروۃ الوثقی'' کے اٹھارہ شمارے نکلے تھے اور انگریزوں نے اخبار کا داخلہ مصر اور ہندوستان میں بند کر دیا، اس لیے اخبار بند کر پڑا۔ سید جمال الدین افغانی نے ایران کا رخ کیا اور شیخ محمد عبدہ واپس بیروت چلے گئے۔

شیخ نے قیام بیروت کا یہ زمانہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔ وہ بیروت کی دو مسجدوں میں قرآن مجید کا درس دیتے اور مدرسہ سلطانیہ میں معلمی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ انہوں نے فارغ اوقات میں ''نہج البلاغہ'' اور ''مقامات بدیع الزماں'' کی شرحیں لکھیں۔ سید افغانی کے فارسی رسالے ''رد الدھریین'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔ گھر میں بھی ان کے علمی فیضان کا چشمہ جاری رہتا، جس سے مسلمان اور عیسائی یکساں طور پر مستفید ہوتے۔ اس زمانے کے شاگردوں میں امیر شکیب ارسلان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اسلام کے دفاع میں

تقریباً ساڑھے تین سال کی جلاوطنی کے بعد متعدد بارسوخ اشخاص کی سفارش اور برطانوی ہائی کمشنر کی مداخلت سے خدیو توفیق پاشا نے شیخ محمد عبدہ کو وطن آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ 1888ء کے اواخر میں وہ واپس مصر آگئے اور انہیں ابتدائی دیوانی عدالتوں کا قاضی مقرر کیا گیا۔ جب وہ عابدین میں قاضی تھے اور ان کی عمر بھی چالیس برس سے متجاوز ہو چکی تھی تو انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ اس وقت ابتدائی عدالتوں کا نظام فرانسیسی قوانین پر مبنی تھا، لہذا فرانسیسی زبان سیکھے بغیر چارہ نہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے فرانسیسی زبان میں کافی استعداد حاصل کر لی۔ جب مشہور انگریز فلسفی اور ماہر تعلیم ہربرٹ سپنسر کی کتاب ''ایجوکیشن'' کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا تو انہوں نے اس ترجمے کو عربی زبان میں ''التعلیم'' کے نام سے منتقل کر دیا۔

شیخ محمد عبدہ کی زندگی کا بڑا مقصد مدرسۃ الازہر کی اصلاح و ترقی تھا چونکہ الازہر دنیائے اسلام کا علمی و دینی

مرکز تھا، اس لیے ان کا عقیدہ تھا کہ اگر الازہر کی اصلاح ہوگئی تو پورے عالم اسلام کی اصلاح ہو جائے گی، اس لیے ان کا خیال تھا کہ اس مدرسے کے بہتر نظام، نصاب درس میں توسیع اور بعض جدید علوم کے اضافے سے الازہر ساری دنیائے اسلام میں مرکز ہدایت بن جائے گا۔ عباس معلٰی کا زمانہ آیا تو شیخ محمد عبدہ نے الازہر کی اصلاح کا منصوبہ خدیو کی خدمت میں پیش کیا۔ چنانچہ 15 جنوری 1895ء کو ایک سرکاری فرمان کے ذریعے الازہر کے لیے انتظامی کمیٹی مقرر کر دی گئی، جس کی روح رواں خود شیخ محمد عبدہ تھے۔ اس انتظامی کمیٹی نے اساتذہ کی تنخواہوں میں معتد بہ اضافہ کرایا۔ تنخواہوں کی درجہ بندی کی۔ ہر درجے کے لیے کتابیں مقرر کی گئیں۔ طلبہ کی رہائش گاہوں میں صفائی اور روشنی کا انتظام کیا۔ نصاب تعلیم میں حساب، الجبرا، تاریخ اسلام اور سائنسی علوم شامل کیے گئے۔ ادب کی تعلیم کے لیے ''الکامل'' اور ''دیوان حماسہ'' جیسی معیاری کتابیں داخل کی گئیں اور سب سے بڑھ کر طلبہ کو روزانہ حاضری اور سالانہ امتحان میں شامل ہونے کا پابند قرار دیا۔ اس کے علاوہ الازہر میں ایک ہسپتال قائم کیا اور مدرسے کے کتب خانے کو مرتب و منظم کیا گیا۔

بطور مفتی اعظم تقرری

3 جون 1899ء کو خدیو مصر نے شیخ محمد عبدہ کو مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سے ''مفتی'' ان کے نام کا جز ہو گیا۔ انہوں نے اس عہدے کو نیا وقار اور نئی اہمیت بخشی۔ مصر کے علاوہ ساری دنیائے اسلام سے ان کی خدمت میں استفتاء آتے تھے۔ ان میں تین فتوے بہت مشہور ہیں۔ ایک میں ہندوستانی مسلمانوں کے استفسار کے جواب میں عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے غیر مسلموں سے امداد و اعانت لینا مباح قرار دیا۔ دوسرے میں مسلمانوں کے لیے یہودیوں اور عیسائیوں کا ذبیحہ حلال بتایا۔ اسی طرح ڈاک خانے کے سیونگ بنکوں کی امانتوں پر منافع وصول کرنا جائز بتایا۔

مفتی اعظم مقرر ہونے کے بعد 1899ء ہی میں محمد عبدہ قانون ساز اسمبلی کے مستقل ممبر مقرر کیے گئے۔ وہ ایک قابل پارلیمانی مقرر، مجلس مذاکرات کے ماہر اور محتاط مشیر ثابت ہوئے۔ 1900ء میں مفتی صاحب ''جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ'' کے صدر مقرر ہوئے۔ اس انجمن کے مقاصد میں امیروں کے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنا، نادار مسلمانوں کو امداد دلانا غربا کے بچوں کے لیے مدارس کا اہتمام کرنا تھا۔ اسی زمانے میں عربی زبان کی نادر اور اہم ترین کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے ''انجمن الجنۃ الاحیاء علوم العربیہ'' کے نام سے مفتی محمد عبدہ کی صدارت میں قائم کی گئی۔ ان کی مسلسل کوشش سے ابن سیدہ اندلسی کی مشہور لغت ''المخصص'' سترہ جلدوں میں شائع کی گئی۔ اس کے بعد فقہ مالکی کی جلیل القدر کتاب ''المدونہ'' کی تصحیح کا کام شروع کیا گیا اور اس کے قلمی نسخے تونس اور فارس سے منگوائے گئے اور اسے شائع کیا گیا۔

اسلام کے دفاع میں

یورپ کے فضلا اور مصر کے عیسائی اہل قلم جب کبھی اسلام پر ناروا حملے کرتے تو مفتی صاحب دین حق کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ فرانس کے وزیر خارجہ ہانوتو (Hanotawe) اور عربی مجلّہ ''الجامع'' کے عیسائی مدیر

فرح انطون نے بھی لترتیب اسلام کے عقیدۂ توحید اور مسلمانوں کی رواداری اور علم پروری کے خلاف معاندانہ مضامین لکھے تو مفتی صاحب نے ان معاندین اسلام کے نہایت مدلل اور مفصل جواب لکھے۔ بعد میں یہ جوابات ''الاسلام والنصرانیۃ مع العلم والمدنیۃ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے اور سارے مسلم ممالک کی اپنی اپنی زبانوں میں ان کے تراجم شائع ہوئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کے مذکورہ جوابات یہاں قدرے تفصیل سے پیش کیے جائیں۔

اوائل 1900ء میں ایک فرانسیسی جریدے میں موسیو ہانوتو کا ایک مضمون ''مسئلہ اسلامیہ اور اسلام'' کے عنوان سے شائع ہوا، جسے عربی اخبار ''المؤید'' نے نقل کیا۔ اس مضمون کی غرض و غایت یہ تھی کہ فرانس کی حکومت اور قوم کو اس امر سے نفرت فراہم اور جمع کرنے کی تحریک دی جائے کہ فرانسیسی نو آبادیات میں اسلامی جماعتوں اور عیسائیوں کے مابین بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ موسیو نے اپنی حکومت پر زور دیا کہ وہ مسلم ممالک اور مسلمانوں سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرے، کیونکہ اسلام اور عیسائیت میں سطح پر بہت زیادہ فرق و اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک مذہب آریہ النسل ہے، اور دوسرا سامی النسب ہے۔ مضمون نگار نے، جو وزیر خارجہ جیسے بڑے منصب پر فائز تھا، اپنے مضمون میں دو بنیادی عقائد پر روشنی ڈالی تھی:

(۱) ذات الٰہی۔۔۔۔۔۔ وجودِ باری تعالیٰ

(۲) مسئلہ جبر و اختیار۔۔۔ قضا و قدر

اس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ عقیدۂ تثلیث کی رو سے انسان، خدا اور روح القدس سے باہمی تعلق کی وجہ سے انسان بلند ترین مرتبہ و مقام تک پہنچتا ہے۔ عقیدۂ تثلیث کی رو سے انسان ذات الٰہی سے حقیقی قرب حاصل کر سکتا ہے، اس کے برخلاف، بقول موسیو ہانوتو، اسلام کے عقیدۂ توحید کی رو سے اللہ کی ذات کو بشریت کی صفات سے اس حد تک دور کر دیا گیا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا، اور یوں انسان کمزور اور پست تر ہو کر رہ گیا ہے۔

اسی طرح اس نے لکھا کہ مسیحی عقیدہ انسان کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا معترف ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے انسان میدانِ عمل میں آزادانہ گامزن ہو جاتا ہے۔ جہد و عمل کے وسیع میدان میں خود مختارانہ اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نظریۂ قضا و قدر نے مسلمانوں کو مجبورِ محض بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ تقدیر پرست ہے۔ قوتِ ارادی سے محروم اور فلسفۂ تغیر و حرکت سے ناآشنا ہے۔

مفتی محمد عبدہ نے موسیو کا یہ مضمون اخبار ''المؤید'' میں پڑھا اور اسی وقت اس کی تردید لکھ کر اخبار کو بھیج دی۔ مفتی صاحب نے موسیو ہانوتو کی تاریخی معاملات پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اہل یورپ کے پاس جو تہذیب تھی وہ آریائی مشرق سے یورپ نقل مکانی کرنے والے اپنے ہمراہ یورپ لے گئے تھے۔ موسیو نے اہل یونان کو یورپ کے معلمین کا نام دیا ہے، حالانکہ خود اہل یونان نے سامی اقوام کے میل جول سے اپنی یونانی تہذیب کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اور یورپ میں تھا ہی کیا سوائے غارت گری، خوں ریزی اور جنگ و جدل کے۔

یورپ تو تاریکی میں تھا۔ اس میں اجالا کس نے کیا؟ اسلام نے۔ یورپ میں علم وحکمت کی روشنی اسلام نے پھیلائی۔ یورپ کو اچانک عرب، ایران، روم اور یونان کے علوم وفنون کے خزانے مسلمانوں کے ذریعے بیٹھے بٹھائے مل گئے۔

قضا وقدر کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مفتی محمد عبدہ نے بتایا کہ "قرآن مجید نے چونسٹھ آیات میں کسب و اختیار اور سعی وکوشش کی اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ ابتدائی صدی میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اپنے اقوال و اعمال سے جو روش اختیار کی، وہ ہمارے اس دعوے پر برہان ہے کہ جتنا اسلام نے کسب واختیار پر زور دیا ہے دنیا کے کسی اور مذہب یا تحریک نے نہیں دیا" آگے چل کر لکھتے ہیں "لیکن مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ امت مسلمہ کا نام نہاد مشائخ اور گمراہ کن صوفیا کے ہاتھوں مصائب میں مبتلا ہونا پڑا۔ تصوف نے مسلمانوں سے اندر کاہلی، کسل مندی اور تقدیر پرستی کے رجحانات پیدا کیے۔۔۔۔ یہ نام نہاد صوفیا اور مشائخ بھی آریوں کی پیداوار تھے، جو ہمارے ہاں ایران اور ہندوستان سے پہنچے"۔

اسلام کے عقیدۂ توحید پر اظہار خیال کرتے ہوئے مفتی صاحب نے تاریخی واقعات و حقائق کی روشنی میں سادہ لوح افریقی اقوام، بدھ مت کے پیروکار اور برہمنوں کے تصور توحید، یونانی فلاسفہ اور مصری عقیدے کے نظریہ الٰہ کے مابین موازنہ کیا گیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مسلمان خدائے واحد کے عقیدے کی بناء پر ہی انسانی اوج کمال تک پہنچ گئے تھے جہاں تک عقل انسانی رسائی حاصل کر سکتی ہے۔

آپ نے ایک اور مضمون میں مجلہ "جامع" کے مسیحی مدیر کے مضمون کی تردید کی ہے، جس میں اس نے مشہور مسلمان فلسفی ابن رشد کے فلسفے پر اعتراض وارد کرتے ہوئے فلسفہ وحکمت کے سلسلے میں اسلامی اور مسیحی رواداری کا موازنہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ عیسائیت نے فلاسفہ کی کھلے دل سے خدمت کی اور ان کو بہت کم ایذائیں پہنچائیں۔ اسلام میں رواداری کی گنجائش نہیں ہے۔ بے شک یورپ میں فلسفیوں اور سائنس دانوں کو تھوڑی بہت ایذا رسانی ہوئی، اس کے باوجود وہاں عملی طور پر فلسفہ وسائنس کو فتح حاصل ہوئی۔ فلسفہ وسائنس میں ترقی کے سبب جدید یورپی تہذیب ایک بار آور درخت کی شکل میں نمودار ہوئی، لیکن آج تک اسلامی تنگ نظری اور ملائیت کی طرف سے مذہبی احتساب پر غلبہ نہ پایا جا سکا۔ مسلمان علماء تنگ نظر ہوتے ہیں اور ابن رشد درحقیقت زندیق تھا۔

اس مضمون کی تردید میں مفتی صاحب نے ثابت کیا کہ اسلام اپنے ہی فلاسفہ کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ مسلمانوں نے دوسرے مذاہب والوں، مختلف قوموں اور نسلوں کے لیے بھی اپنا سینہ کشادہ کر دیا تھا۔ اپنے اس بیان کی شہادت میں آپ نے ان غیر مسلم فلاسفہ اور سائنس دانوں کی ایک طویل فہرست پیش کی جنھوں نے اسلام کے زیر عاطفت زندگی بسر کی۔

مقالہ نگار فرح انطون نے الزام تراشی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلامی طبیعت رواداری کو برداشت نہیں کر سکتی، اس کے برخلاف مسیحیت رواداری کو جوش ونشاط کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں مفتی صاحب نے تفصیل سے بحث کی اور عیسائیت کے مزاج کو ظاہر کرنے والے تمام اصول پیش کیے۔ جن اصول کا فردا فردا اسلام کے اصول ومبادی سے موازنہ کیا اور دونوں نے ثابت کیا کہ عیسائیت نے کس طرح نہ صرف اپنے علماء وفلاسفہ کو

تکالیف پہنچائیں بلکہ دوسرے مذاہب کے علماء اور فلاسفہ کے ساتھ اپنی تنگ نظری اور استبداد پسندی کا ثبوت دیا۔

1903ء میں مفتی محمد عبدہٗ نے انگلستان کا سفر کیا۔ اوکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں دیکھیں اور وہاں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا اور مشہور برطانوی ماہر تعلیم ہربرٹ سپنسر سے ملاقات کی۔ وہ ان کی شخصیت، علم و فضل، شیریں بیانی اور صداقت شعاری سے بڑا متاثر ہوا۔ انگلستان سے واپسی پر وہ موسیو لیبان سے ملنے فرانس بھی گئے، تاکہ ان کی بلند پایہ تصنیف ''تمدن عرب'' پر ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کر سکیں، لیکن وہاں ان کی غیر حاضری کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مفتی صاحب فرانس کی سیاحت کے بعد تونس اور الجزائر سے ہوتے ہوئے مصر واپس آ گئے۔

مفتی محمد عبدہٗ اور احیائے اسلام

شیخ محمد عبدہ کی جلاوطنی ختم ہوئی تو اہل مصر نے ان کی قدر افزائی اور احترام میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ ان کی خدمات، حب وطن اور قربانیوں سے آگاہ تھے۔ وطن واپسی کے بعد مفتی عبدہٗ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انہوں نے ایک مصلح اور خادم عوام کی حیثیت میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے قاضی کے فرائض سر انجام دیئے۔ جامعہ ازہر کے نصابی اور انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں تجویز کیں اور ازہر کی انتظامی کمیٹی میں مؤثر ترین رکن کے طور پر کام کیا۔ آپ مجلس وضع قانون کے ممبر بنے۔ آپ مصر کے مفتی اعظم بھی مقرر ہوئے۔ ان کے فتووں کو مستند اور قطعی تصور کیا جاتا تھا۔ ان کے بعض فتوے یادگار، خاص طور پر وہ فتوے جن کا تعلق مصر کے مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے باہمی روابط سے تھا۔ ان کے فتووں میں وسیع المشربی کا مظاہرہ تھا لیکن اس وسیع المشربی نے قدامت پسند علماء کو محمد عبدہٗ کا دشمن بنا دیا۔ اس قسم کے بعض فتوے بہت مشہور ہیں۔ مثلاً ایک فتوے کے مطابق مسلمانوں کے لیے یہودیوں اور عیسائیوں کا ذبیحہ کھانا جائز قرار دیا ہے۔ دوسرے فتوے کی رو سے، ڈاک خانوں کے سیونگ بنکوں کی امانتوں پر سود وصول کرنا بھی جائز بتایا گیا۔ ۔ ۔ ایک تیسرے فتوے میں آپ نے مسلمانوں کے لیے یورپی لباس پہننا جائز قرار دیا۔ ان فتووں کے جواز میں سب سے بڑی دلیل یہ دی گئی تھی کہ قرآن میں ان چیزوں کا ذکر نہیں ہے۔ ان فتووں کی وجہ سے مفتی محمد عبدہٗ تمام اسلامی ممالک میں متعارف ہو گئے خصوصاً ان مسلمان حلقوں میں آپ کا احترام بڑھ گیا جن کو مغربی معاشرت سے ربط ضبط رکھنا پڑتا ہے۔ بیرونی ممالک میں طویل قیام نے مفتی صاحب کی سوچ کے اُفق کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ اور جو لوگ مفتی صاحب کے خیالات پر اعتراض کرتے تھے، ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اپنی ناواقفیت اور کم علمی کی بدولت اسلام کو زمانہ ماضی کے علماء اور ائمہ کے مدون عقائد تک محدود سمجھتے تھے۔ ''مشاہیر الشرق'' کے مطابق یہ لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ۔۔۔۔۔ یہ کس قسم کا شیخ ہے جو فرانسیسی میں باتیں کرتا ہے۔ یورپ کے ملکوں کا سفر کرتا ہے۔ فرنگیوں کی تحریروں کے ترجمے کرتا ہے۔ ان کے فلسفیوں کے اقوال نقل کرتا ہے۔ ان کے علماء سے مباحثے کرتا ہے۔ ایسے فتوے دیتا ہے جو اس سے پیشتر کسی نے نہیں دیئے''۔ چنانچہ وہ اپنے مولویوں کے کہنے پر مفتی کو کافر سمجھنے لگے۔ لارڈ کرومر کا کہنا ہے کہ ''وہ اپنے تجدد کی وجہ سے اس قدر بدنام ہوئے کہ قدامت پسند مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکتے تھے''۔ اور خود

اتنے مغرب زدہ نہ تھے کہ یورپی طریقوں کے نقالوں کو خوش کر سکتے۔ لہٰذا وہ نہ تو "کافی پکے" مسلمان تھے، نہ کافی "پکے یورپی" تھے۔ ڈاکٹر ایڈمز کی رائے کے مطابق مفتی صاحب کے ہمدرد کمزور اور بزدل تھے جب کہ ان کے مخالفین متحرک اور پرشور تھے۔ اس کے باوجود ہندوستان سے لے کر مراکش تک حکمرانوں کا طبقہ ان کے نام سے خائف تھا۔ ملک شام اور قلمرو عثمانی کے مختلف حصوں کے اخبارات کو سلطان نے حکم دے دیا تھا کہ مفتی کی موت پر کوئی اطلاع کوئی مرثیہ کوئی سوانح حیات شائع نہ کریں، کیونکہ ان کے نام کے ساتھ "اصلاحات" اور تبدیلیوں کا تذکرہ ناگزیر تھا۔

شیخ محمد عبدہ کی مقبولیت اور شہرت نے ان کے بہت سے حاسد اور دشمن بھی پیدا کر دیے تھے۔ علمائے ازہر تو شروع ہی سے ان کے حریف تھے۔ وہ ان کو معتزل اور تجدد پسند کہہ کر بدنام کیا کرتے تھے۔ جب کہ جدید تعلیم یافتہ افراد انہیں رجعت پسند عالم کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ سیاست میں اعتدال اور تدریجی عمل کے قائل تھے۔ اس زمانے میں خدیو مصر اپنی افتادہ اراضی کا انتقال اوقاف کی بہتر اراضی سے کرنا چاہتا تھا، لیکن شیخ محمد عبدہ سد راہ تھے۔ آخر دشمنوں کی ریشہ دوانیاں رنگ لا کر رہیں خدیو کا رویہ بدل گیا اور وہ تمام مجوزہ اصلاحات کی مخالفت کرنے لگا۔ بالآخر شیخ محمد عبدہ نے تنگ آ کر الازہر کی مجلس انتظامیہ سے استعفیٰ دے دیا اور الازہر کے معاملات پرانی ڈگر پر چلنے لگے۔

مفتی محمد عبدہ کے استعفیٰ کے خلاف عالم اسلام میں زبردست ردعمل ہوا۔ نواب محسن الملک نے اخبار "المنار" میں خدیو مصر کے نام ایک مکتوب شائع کر کے مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کی اور خدیو مصر کے جبر و استبداد اور علمائے ازہر کے جمود اور طور طریقوں پر شدید تنقید کی۔

مفتی محمد عبدہ یورپ جانے کے لیے اسکندریہ میں مقیم تھے کہ چند روز کی علالت کے بعد انہوں نے 11 جولائی 1905ء (8 جمادی الاول، 1323ھ) کو وفات پائی۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے حریفوں کی خفیہ سازشیں بھی ختم ہو گئیں۔ وہ ہندوستان، ترکستان اور ایران کا سفر کر کے ان ممالک کے مسلمانوں کے چشم دید احوال اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تاریخ اسلام کی تصنیف اور ایک روزنامے کے اجرا کا بھی عزم رکھتے تھے اور الازہر کی اصلاح سے مایوس ہو کر ایک جدید طرز کی جامعہ کی تاسیس بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن موت نے ان منصوبوں کی تکمیل کی مہلت نہ دی۔

برطانوی ہائی کمشنر لارڈ کرومر نے لکھا تھا کہ مفتی محمد عبدہ روشن دماغ اور بلند نظر مدبر تھے، لیکن عام خیال میں رہنے والے تھے۔ ان کی وطن پروری شبہ سے بالا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ان کے بعض منصوبوں کی ناکامی میں اس زمانے کے حالات کا بھی دخل تھا، لیکن وہ اپنے پیچھے اپنے شاگردوں اور مداحوں کی ایک جماعت چھوڑ گئے، جس نے ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کی۔ سید محمد رشید رضا نے "المنار" کے ذریعے ان کے دینی اصلاحی افکار کی روشنی ساری دنیائے اسلام میں پہنچائی۔ جامعہ الازہر کی اصلاح کی تکمیل ان کے شاگرد شیخ مصطفیٰ المراغی کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کے اصلاحی خیالات و نظریات کی ترجمانی شکیب ارسلان کرتے رہے اور سیاسی میدان سعد زغلول پاشا نے سنبھالا اور بالآخر مصر کو آزادی سے ہم کنار کیا۔

مفتی صاحب کا علم وفضل

مفتی صاحب علم وفضل اور فصاحت و بلاغت میں اپنے معاصرین پر فائق تھے۔ وہ مصر جدید کی ادبی بیداری کے بانی ہیں۔ ان کے قلم نے عربی زبان کو ادبی، اخلاقی اور سیاسی، غرض کہ متنوع موضوعات پر زندہ مضامین کے بیان کی قوت بخشی۔ ان کے پہلے علماء وخواص بھی علم بلاغت کے متنوع صحیح مفہوم سے نا آشنا تھے۔ جب وہ بیروت سے واپس آئے، تو انھوں نے الازہر کے رواق عباسی میں امام عبدالقاہر جرجانی کی کتابوں ''دلائل الاعجاز'' اور ''اسرار البلاغۃ'' کا درس دینا شروع کیا اور ان کو اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ طلبہ کو عربی زبان کے فصیح اور معیاری اسلوب بیان سے آشنا کرنے کے لیے ''نہج البلاغۃ'' اور ''مقامات بدیع الزماں ہمدانی'' کو ضروری تشریحات کے ساتھ شائع کیا۔ ان کا درس ادبی ہوتا، جس سے ذوقِ سلیم کی پرورش ہوتی اور اسلوب بیان میں سادگی اور صفائی اور اثر انگیزی پیدا ہوتی۔ ان کے درس سے ان کے شاگرد محمد رشید رضا، سعد زغلول، احمد تیمور، محمد حافظ ابراہیم، مصطفیٰ منفلوطی اور عبدالرحمان برقوقی وغیرہ نے پورا فائدہ اٹھایا اور آئندہ چل کر مصر کی ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

آپ کے اخلاق واوصاف

آپ کے ہم عصروں کے دل میں آپ کی عظیم شخصیت گھر کر گئی تھی۔ آپ کے چہرے سے رعب وجلال، آپ کی نشست و برخاست میں وقار وطمانیت کے آثار تھے۔ بڑے لوگوں کی خوشامد اور لجاجت سے بالاتر تھے۔ آپ نفاست پسند اور متواضع تھے۔ حد درجہ روادار اور شفقت کرنے والے تھے۔ آپ اپنے سے زیادتی کرنے والوں کو درگزر اور برائی سے پیش آنے والوں کو معاف کر دیتے تھے۔ جامعہ الازہر کے غریب اور نادار طلبہ پر بہت مہربان تھے۔ اکثر طلبہ کے لیے آپ کی جانب سے ماہانہ وظائف مقرر تھے۔ اپنی رائے کے اظہار میں راست بازی اور صراحت سے کام لیتے تھے۔ کوئی عملی اقدام نہ کرتے، تاوقتیکہ اس کو عقل وتدبر کی کسوٹی پر نہ جانچ لیتے۔

آپ کے اسلامی جذبہ خلوص نے آپ کے اندر فکر وعمل کی عجیب وغریب قوت وطاقت بھر دی تھی۔ اسلام کا رنگ آپ کے قلب ودماغ پر چھا گیا تھا۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ اسلام عصر حاضر کے تقاضوں سے اس وقت تک ہم آہنگ نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں عالمگیر پیمانے پر اصلاح نہ ہو۔ اسلام بلکہ مسلمانوں کے اندر ایسی اصلاح درکار ہے جو فی الحقیقت مسلمانوں کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ تک پہنچا دے۔ آپ کے نظریے کے مطابق یہ اصلاح اسلام کے قرنِ اول کی طرف رجوع کرنے میں مخفی تھی۔

اسلامی ممالک کے زوال وانحطاط کے اسباب وحالات سے پوری طرح آگاہ اور باخبر ہونے کی وجہ سے آپ رات بھر جاگا کرتے اور دنیائے اسلام کی اصلاح کے وسائل اور ذرائع پر غور وفکر کیا کرتے۔ عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کا دل حب الوطنی کے جذبات سے بھی سرشار ہوتا، اور خاص طور پر اپنے وطن مصر کے لیے موجزن ہوتا، تاکہ یہاں وطنی وقومی خلوص کی بجائے اسلامی عظمت ووقار کا پرچم لہرائے۔

مفتی صاحب اپنی تمام کوششوں میں حُسنِ انجام کی قوی توقع رکھتے تھے۔ اپنی ناکامیوں اور مشکلات میں آپ کی یہی امید غالب رہا کرتی تھی۔ قاسم امین لکھتے ہیں: ''آپ کو امت مسلمہ کی اصلاح وترقی کے لیے جو آرزو تھی،

اسے کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔ آپ کو پختہ یقین تھا ہماری زرخیز و شاداب سرزمین میں جب صالح اور پاک تخم بویا جائے گا تو وہ نشو و نما پائے گا، بارور ہوگا، اسی طرح جیسا کہ اس میں فساد کی تخم ریزی نے نشو و نما پائی اور نا خوشگوار پھل لائے، اسی لیے آپ اپنے بھرپور دونوں ہاتھوں سے صالح افکار، نیک جذبات و خیالات اور مفید تعلیمات کا وہ تمام ذخیرہ لٹاتے رہے، جن کو آپ نے اپنی زندگی میں جمع کر رکھا تھا"۔

احیائے اسلام کی امید

مفتی محمد عبدہ کا عقیدہ یہ تھا کہ امت مسلمہ جن امراض و علل میں مبتلا ہے، ان کا واحد علاج یہ ہے کہ صحیح اور اصلی اسلام کی طرف تمام اسلامی جماعتوں کو دعوت دی جائے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان بے شمار غیر مہذب رسوم و عادات کے غلام ہو چکے ہیں۔ جہالت اور گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کے احیاء وارتقا کی صرف ایک امید تھی کہ دین حنیف کے بنیادی اصول و احکام کو از سر نو زندہ کیا جائے، جس کے بغیر کوئی مسلم، "مسلمان" نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت، نشر و اشاعت اور جدید علمی تحقیقات کے ذریعے فکری بیداری کو تیز کیا جائے، تا کہ امت دوسری اقوام عالم کے مقابلے میں آ سکے۔ ان کے نزدیک اگر اسلام کی اصل روح کو سمجھ لیا جائے اور اس کی تشریح حسین پیرائے میں کی جائے تو جدید تہذیب کے رنگ روپ میں یا جدید سائنس کے ثمرات میں کوئی ایسی شے نہیں جو صحیح اسلام کے خلاف ہو۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس قسم کی اصلاحات کس طرح اور کن وسائل کے ذریعے کی جا سکتی ہیں؟ مفتی صاحب کے استاد جمال الدین افغانی سیاسی انقلابات برپا کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ بعض دوسرے مصلحین کا نظریہ تھا کہ اصلاحات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ مغربی علم، مغربی تہذیب اور مغربی تمدن کو اختیار کر لیا جائے۔ محمد عبدہ ان دونوں کے خلاف تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ واحد ذریعہ کامیابی یہ ہے کہ پہلے ہر اسلامی ملک میں اسلامی نشاۃ و تجدید کا جذبہ زندہ و بیدار کیا جائے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مقصد و مدعا، جس کے حصول کے لیے ہم سب اپنی بہترین توانائی صرف کر رہے ہیں، محض یہ ہے کہ دینی احکام و نصوص کو سمجھنے میں جو غلطی واقع ہوگئی ہے، اس کو دور کیا جائے اور عقائد کو درست کیا جائے، کیونکہ جب عقائد بدعتوں اور من گھڑت اصولوں سے پاک اور اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کا تزلزل و اضطراب سے محفوظ رہیں گے۔ افراد کے حالات درست ہوں گے، ان کی بصیرت دینی و دنیوی حقیقی علوم سے روشن اور ان کے اخلاق فطری خوبیوں سے آراستہ ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ افراد کے سنبھلنے سے جماعت اور امت بھی سنور جائے گی۔

"جب تم کسی داعی کو سنو جب وہ علم دین حاصل کرنے کی طرف دعوت دے رہا ہے، تو اس کا یہی مقصد ہے، یا کوئی مبلغ دینی تربیت پر زور دے رہا ہے تو یہی اس کی غرض و غایت ہے، یا کوئی مقرر مسلمانوں کی موجودہ برائیوں اور خرابیوں کی نشان دہی کر رہا ہے تو یہی اس کا منتہائے نظر ہے۔ غرض کہ مسلمانوں کی اصلاح کا ارادہ کرنے والوں کا

یہی طریقہ ہے۔ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، کیونکہ ان کے ادب و حکمت کے طریقوں کے لیے، جو دینی رنگ سے خالی ہیں، ایک جدید بنیاد قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے مصلحین کے پاس اپنا کوئی مواد و مسالہ نہیں اور نہ اسے کوئی کارکن یا مزدور آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتے ہیں جو اس کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔

''جب اسلام تہذیب، اخلاق اور عملی فلاح کا کفیل ہے، سعادت و خوشحالی کے تمام دروازے تمام لوگوں کے لیے کھولے ہوئے ہے، اسلام کو اپنے پیروکاروں پر کافی اعتماد ہے۔ اسلام مسلمانوں کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے، تو مسلمانوں کو اس کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسلام کے دامن سے برگشتہ ہو کر اوروں کا سہارا کس لیے ڈھونڈا جا رہا ہے؟

سیّد جمال الدین افغانی کے دستِ راست مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد خاص سیّد محمد رشید رضا

سیّد محمد رضا شامی نژاد ہیں۔ آپ کا خاندان آنحضرت ﷺ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ آپ کے سیّد کے لقب سے بھی ظاہر ہے۔ آپ 27 جمادی الاول/ 19 ستمبر 1865ء کو طرابلس الشام (لبنان) سے تین میل دور بحیرۂ روم کے ساحلی گاؤں قلمون میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے گاؤں کے مکتب میں قرآن مجید ناظرہ اور معمولی نوشت و خواند کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد الفیہ ابن مالک، صحیح مسلم اور حریری کے بعض مقامات حفظ کیے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے طرابلس کے مدرسۂ اسلامیہ میں داخل ہوئے۔

مدرسۂ اسلامیہ کے ناظم اعلیٰ شیخ حسین الجسر تھے۔ یہ شامی عالم تھے۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی ''رسالہ حمیدیہ'' جو انہوں نے سلطان عبدالحمید کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کی تھی۔ اس کتاب میں اسلام پر وارد ہونے والے تمام اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا تھا۔ رشید رضا نے ''رسالہ حمیدیہ'' کے مصنف سے عقلی اور ادبی علوم کی تحصیل کی۔ حدیث و فقہ کے لیے شیخ محمود نشابہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور عبدالغنی رافعی سے ''نیل الاوطار'' کا کچھ حصہ پڑھا۔ زمانۂ طالب علمی میں انہیں الغزالی کی ''احیائے علوم'' سے بڑی دلچسپی تھی۔ حدیث کا اعلیٰ ذوق الزبیدی کی ''شرح احیائے علوم'' کی رہنمائی میں پیدا ہوا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ عبادت و ریاضت اور دعوت و ارشاد میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے بدعات اور مولویہ سلسلے کے رقص و سرود کے خلاف آواز اٹھائی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ وہ فارغ اوقات میں بیروت کے اخبار کے لیے مضامین لکھا کرتے۔ اور کبھی کبھی دل بہلانے کے لیے شعر بھی کہا کرتے تھے۔ اس اثناء میں انہیں سیّد جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کے رسالے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے بعض شمارے مل گئے۔ ان کے مطالعے سے انہیں فکر و نظر کی نئی راہیں دکھائی دیں اور مسلمانوں کی دینی اور سیاسی بدحالی سے آگاہی

ہوئی۔ اپنی تحریروں میں انہوں نے بجا طور پر اس کا اظہار کیا اور "العروۃ الوثقی" کو امام غزالی کی "احیائے علوم" کے بعد دوسرا رہنما تسلیم کیا۔ اس سے انہیں سیّد جمال الدین افغانی سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا، لیکن ان کے انتقال کی وجہ سے سیّد رشید رضا کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اس دوران میں مفتی محمد عبدہٗ ایک دفعہ طرابلس الشام گئے تھے، جہاں رشید رضا ان سے مل کر ان کے خیالات کے گرویدہ ہو گئے۔

اب انہوں نے اپنے فکر و عمل کے لیے طرابلس الشام کا میدان تنگ پا کر مفتی محمد عبدہٗ کی خدمت میں قاہرہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور 1897ء میں قاہرہ پہنچ گئے۔

قاہرہ پہنچ کر رشید رضا دوسرے دن مفتی محمد عبدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں اپنا مرشد و مربی مان لیا۔ ان کی یہ رفاقت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ رشید رضا نے تحریک کی کہ صحیح اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک ہفتہ وار اخبار "المنار" جاری کیا جائے۔ اس کا پہلا شمارہ 17 مارچ 1898ء کو شائع ہوا۔ دوسرے سال کے آغاز میں یہ ماہانہ مجلہ بن گیا اور رشید رضا کی وفات (اگست 1925ء) تک برابر نکلتا رہا۔ رسالے کا مقصد شریعت اسلامیہ اور افکار جدیدہ میں تطبیق، اور توحید خالص اور اتباع سُنّت کی دعوت تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی صلاح و فلاح پر مضامین ہوتے تھے۔ عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور جدید سائنسی علوم کی تحصیل و ترغیب پر زور دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی معاشی و سیاسی بدحالی پر تبصرے ہوتے تھے۔

اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کی تردید اور دنیائے اسلام سے آنے والے فتووں کے جوابات دیے جاتے تھے اور سب سے بڑھ کر مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر کے اجزا بھی "المنار" میں شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ جلد ہی اسلامی دنیا کا موقر ترین علمی رسالہ شمار ہونے لگا۔ "المنار" کی اصلاحی دعوت کی بازگشت ملائیشیا، انڈونیشیا اور ہندوستان جیسے غیر عرب مسلم ممالک میں بھی سنی گئی۔ اور نواب محسن الملک، مولانا شبلی اور ان کے تلامذہ کے مضامین "المنار" کے صفحات کی زینت بننے لگے۔

جامعہ اسلامیہ

سیّد رشید رضا اتحاد عرب کے علاوہ اتحاد اسلامی کے بھی داعی اور مبلّغ تھے، اس کے لیے انہوں نے تجویز پیش کی کہ خلیفۃ المسلمین کی سرپرستی میں ایک انجمن "الجامعۃ الاسلامیہ" کے نام سے قائم کی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک کتاب، ایک شریعت اور ایک زبان کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور عثمانی سلطان کی سرپرستی میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی طرح ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ کا ایک وفاق بنایا جائے، جس کے تمام رکن ممالک اپنے اندرونی نظم و نسق میں خود مختار ہوں، لیکن مصر کے قوم پرستوں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔

جمعیت الدعوۃ والارشاد

مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک کا بنیادی اصول عربی مدارس کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح اور قدیم و جدید خیالات کی تطبیق تھا۔ انہوں نے جامعہ ازہر کے نظام تعلیم کو عصر حاضر کے جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق

مرتب کرنے کی کوشش کی لیکن علماء کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ رشید رضا جامعہ الازہر کے طریقہ تعلیم اور نصاب کے علاوہ سرکاری نظام تعلیم پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ علماء اسلام کی اچھی طرح تبلیغ کر سکتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں علوم سے بہرہ ور ہوں۔ 1908ء میں نوجوان ترکوں نے انقلاب برپا کر کے ایک نیا آئین نافذ کیا تو رشید رضا کو ایسے دارالعلوم کے قیام کا خیال دامن گیر ہوا جس میں اعلیٰ دینی تعلیم کے علاوہ جدید سائنسی علوم کی تدریس کا بھی انتظام ہو۔ اس کے لیے انہوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا اور قسطنطنیہ میں سال بھر ٹھہرے رہے، لیکن حکومت نے دارالعلوم کے قیام کے لیے ایسی شرائط عائد کر دیں جنہیں وہ قبول نہ کر سکے اور وہ دل برداشتہ ہو کر قاہرہ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہ دارالعلوم قاہرہ میں قائم کیا جائے۔ چنانچہ دارالعلوم کی رسم افتتاح 3 مارچ 1912ء کو ہوئی اور اگلے دن کلاسیں جاری کر دی گئیں۔ دارالعلوم میں عرب ممالک کے علاوہ دور دراز کے مسلم ممالک مثلاً انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان اور چین کے طلبہ بھی تعلیم پاتے تھے۔ لیکن یہ دارالعلوم زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور انگریز اور مصری حکومت کی نگاہِ عتاب اسے گھائل کر گئی۔

سید رشید رضا کی اصلاحات

رشید رضا کے نزدیک دین اسلام کی عام اندرونی اصلاح ہی پہلا محرک ہے۔ اسلام ہی وہ نصب العین اور غرض و غایت ہے جو کسی بھی طرح کی اصلاحات کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ خالص دینی پہلوؤں کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ ان کی تہذیبی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور دینی زندگی پر مشتمل ہے، اس لیے جن اصلاحات کے لیے انہوں نے عمل درآمد کیا، وہ ان تمام امور پر محیط ہیں۔

سب سے پہلی اصلاح یہ ہونی چاہیے کہ شکل و صورت اور پیمانے کو بدل دیا جائے جو مسلمانوں نے دین اسلام کے مزاج و طبیعت اور اس کی قدر و قیمت کے لیے بنا رکھا ہے۔ رشید رضا لکھتے ہیں: ''دین اسلام میں ایک روحانیت کا راز پوشیدہ ہے جو اس پر کاربند رہنے والوں کو، ان کے اخلاق و اعمال سے قطع نظر امداد و قوت بہم پہنچاتا ہے، لیکن مسلمانوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ دین کی حقیقی قدر و قیمت اس کے روحانی اسرار میں یا اس کی پوشیدہ قوتوں میں نہیں ہے، بلکہ وہ درحقیقت اس میں ہے کہ دین اسلام انسانوں کو ان قوانین قدرت سے روشناس کر کے دنیوی اور اخروی زندگی کی سعادت کا کفیل اور ضامن ہے، انہیں ان قوانین قدرت کا جاننا اور یقین و ایمان کے ساتھ ان پر کاربند ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز مسلمانوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کی تمام خوبیوں، نعمتوں اور برکات سے ان لوگوں کو محروم نہیں کرتا جو انہیں صحیح طریقوں سے تلاش کرتے ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر، یہودی ہوں یا عیسائی''۔

''لیکن جو مشائخ و صوفیا عوام الناس کے روحانی پیشوا اور رہنما بن بیٹھے ہیں، انہوں نے دین کو کھیل، مذاق اور حصول روزگار کا ذریعہ بنا ڈالا اور ذکر الٰہی کو رقص و سرود اور قوالی سے بدل دیا۔ ان کا ذکر تو بس نغمہ و ترنم، اور جھنجھاہٹ اور گنگناہٹ ہے، جس کے ساتھ کچھ نعرے بازی، ہاؤ ہو اور ڈھولک اور تالیوں کی آوازیں بلند ہوتی رہتی

ہیں۔انہوں نے چند اشعار رٹ رکھے ہیں جو موقع بے موقع ٹانکتے رہتے ہیں، یا اولیا کے عرس پر اور مولود شریف میں ختم قرآن کرا کر چند پارے انتہائی عجلت میں تلاوت کرتے ہیں اور اپنے ان زریں کارناموں سے ایسے لوگوں کے سینوں میں اس قدر جوش اور ولولہ بھر دیتے ہیں کہ کسی کو صحیح عبادات و شعائر کا خیال تک نہیں آتا۔ اسی لیے لوگوں نے دل اپنے پیروں کی طرف مافوق الفطری کرامات اور معجزے منسوب کرتے ہیں اور ہر وقت ان زندہ و مردہ ارواح سے برکات و فیوض کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے آستانے مقدس و متبرک مقام بن جاتے ہیں کہ لوگ ان کو اللہ کے پاس شفاعت و نجات کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کے جاہلانہ رویوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

رشید رضا نے اپنے رسالے ''المنار'' کے ذریعے اپنے وقت کی بدعات پر بھی خاص تنقید کی۔ اولیا پر غلط عقائد رکھنے کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، ان پر مضامین تحریر کیے۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے بزرگوں مثلاً سید عبدالقادر جیلانی وغیرہ کی طرف بعض ایسے اسماء و صفات منسوب کر دیے جو صرف اللہ واحد کے لیے مخصوص تھے۔ ان کے مقبروں پر جا کر حاجت روائی کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔

مسجدوں کی بجائے ان کے مقبروں کے آس پاس نماز پڑھنے لگے۔ مقبروں پر جا کر قربانیاں دینے لگے اور چڑھاوے نذر کرنے لگے۔ میلادوں اور عرسوں میں قسم قسم کی برائیوں اور گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ (یہ نقشہ صرف مصر کا نہیں، تمام اسلامی ملکوں کی یہی حالت ہے)

بعض بدعات و رسوم قرآن مجید کی تقدیس و تکریم کے معاملے میں حد سے تجاوز کر گئی ہیں۔ چنانچہ آیات قرآنی کو تعویذوں اور گنڈوں کا ذریعہ بنایا گیا۔ لوگوں نے بعض پتھروں میں خاص تاثیر مقرر کر کے انہیں اپنی انگوٹھیوں کی زینت بنایا، اور ضعیف الاعتقادی سے اپنے گھروں کی آرائشی اشیاء میں شامل کیا۔

رشید رضا ایک دفعہ مسجد الحسینی میں مصلیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے۔ اس مسجد کے بارے میں یہ خاص کرامت مشہور تھی کہ یہاں آنحضرت ﷺ کے نواسے حضرت حسینؓ کا سر مدفون ہے۔ رشید رضا نے مسجد میں جا کر خطبہ دیا اور کہا کہ حضرت حسینؓ کی نسبت سے مسجد کے ستونوں کو چھو کر برکت حاصل کرنے کا تصور بے سود اور بے ہودہ ہے۔ ان کے اس بیان پر انہیں مسجد سے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔

مسلمانانِ عالم کے زوال اور پستی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ دین اسلام اپنی قرن اول کی سادگی سے دور ہو گیا۔ چنانچہ مفتی محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید رضا کی بھی یہی رائے ہے کہ اسلام اپنے ابتدائی زمانے میں آسان اور سادہ دین تھا۔ عرب و عجم کے غیر مسلموں کے اس کا سیکھنا اور سمجھنا، اور اس کے اصولوں پر عمل کرنا آسان اور سہل تھا، اس لیے اسلام اتنی تیزی کے ساتھ پھیلا، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

رشید رضا کی تفسیر ''المنار''

''تفسیر المنار'' ایک نام ہے جو عام طور پر قرآن مجید کی اس تفسیر کے لیے بولا جاتا ہے جس کو مفتی محمد عبدہ نے شروع کیا تھا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید رضا نے جاری رکھا۔ اس تفسیر کو ''المنار'' کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ ہفت روزہ ''المنار'' میں قسط وار شائع ہوئی اس تحریک کا سہرا بھی رشید رضا کے سر ہے کہ انہوں نے ہی مفتی محمد عبدہ کو ایک کامل اور جامع تفسیر لکھنے پر آمادہ کیا تھا، تاکہ وہ تفسیر میں بھی وہی جذبہ اور وہی روح پھونکیں جو ''العروۃ الوثقی'' کی تحریروں میں جلوہ گر ہوئی تھی۔

آغاز کار یوں ہوا کہ جامعہ الازہر میں مفتی صاحب کے درسِ تفسیر میں رشید رضا بھی شریک ہوتے تھے۔ استاد جو کچھ بیان کرتے، رشید رضا اس کو قلم بند کر لیتے۔ پھر اس میں توسیع و تنقیح پیدا کرتے استاد کی خدمت میں پیش کرتے۔ استاد مسودے کی تصحیح و ترمیم کر دیتے۔ یہ تفسیر 1900ء میں جریدہ ''المنار'' کی تیسری جلد میں ''تفسیر محمد عبدہ'' کے نام سے شائع ہونا شروع ہوئی۔ پھر الگ الگ پارے طبع ہوئے۔ پہلے پارے کی اشاعت کے موقع پر رشید رضا نے ایک مقدمہ اپنے رسالے ''المنار'' میں شائع کیا، جس میں تفصیل کے ساتھ ان مختلف اسالیب و مناہج پر تنقید کی، جنہیں اس وقت تک مفسرین نے تفسیر قرآن میں اختیار کر رکھا تھا۔ بالخصوص صحابہ کرامؓ اور تابعین کی روایات اور باتوں پر بحث کی، جن کے حوالے مفسرین عام طور پر دیا کرتے ہیں آپ نے اپنے مقدمے میں لکھا کہ پچھلی بیشتر تفاسیر میں الفاظ اور اصلاحات کے مناقشے یا متکلمانہ طریقے صوفیانہ تاویلات اور فرقہ وارانہ اختلافات کی بوچھاڑ نظر آتی ہے۔ امام فخر الدین رازی نے سونے پر سہاگہ یہ کیا کہ اپنی تفسیر میں اپنے زمانے کے مشہور و معروف علمی نظریات و افکار کو بھی سمو دیا۔ ان کی تقلید موجودہ دور کے ایک مفسر شیخ طنطاوی جوہری نے کی ہے۔ وہ بھی جا بجا جدید علوم مثلاً فلکیات، نباتات، حیوانات پر آیاتِ قرآنی کے حوالوں سے بحث کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض جدید علوم تفہیم قرآن کے لیے ضروری ہے یا اس کی تفہیم میں مدد و معاون ہیں، لیکن رشید رضا کا خیال یہ ہے کہ ان علوم کو حدِ بعید تک استعمال کرنا، جیسا کہ بعض مفسرین نے کیا ہے، پڑھنے والوں کو اس حقیقی مقصد سے دور کر دیتا ہے، جس کے لیے قرآن نازل ہوا۔

آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ابن تیمیہ کی رائے پیش کی ہے اور اسرائیلیات کی تصدیق سے انکار کیا ہے، خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط، کیونکہ ان میں ان کے بقول: ''کعب احبار اور وہب ابن منبہ کی سند ہے، حالانکہ قدیم علمائے جرح و تعدیل نے، باوجودیکہ ان دونوں کا کذب ہمارے روبرو آشکار ہو گیا ہے، ان دونوں سے دھوکا کھایا ہے، اور ان کو عدل میں شمار کیا ہے''۔

جمعیت الدعوۃ والارشاد

مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک نے جن بنیادی باتوں کی طرف دعوت دی تھی، ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خود کو اپنے دینی بھائیوں کے درمیان تعلقات و روابط کو تقویت دینے کا عادی بنائے اور مسلمانوں کو دینی فرائض کی ادائیگی اور اس کے احکام کے اتباع کی ترغیب دے۔ اسی پر تمام کام کا دارومدار نہیں بلکہ ہر مسلمان پر یہ بھی واجب ہے کہ غیر مسلموں کے درمیان اسلام پھیلانے کی کوشش کرے، کیونکہ اسلام پوری انسانیت کے لیے اتارا گیا ہے۔

چنانچہ رشید رضا نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہٗ کی طرح اپنے تمام خطبات اور مقالات میں مسلمانوں کو اس عمل کی طرف لانے کی کوشش کی جو تمام اعمال میں بہتر ہے''۔ یہ عمل مدارس کا قیام۔ رشید رضا فرماتے ہیں کہ مدارس کا قیام مسجدوں کی تعمیر سے بہتر ہے، کیونکہ مسجد میں ایک جاہل کی نماز سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، لیکن مدارس کے قیام سے جہالت اور نادانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور دینی فرائض اور دنیوی اعمال صحیح اور حقیقی شکل میں انجام پاتے ہیں۔

بنیادی عقائد، دینی فرائض اور اسلامی آداب کے اصولوں کی تعلیم کے مقصد سے رشید رضا نے ایک انجمن ''جمعیۃ الدعوۃ والارشاد'' کے نام سے تشکیل دی، جس کا ایک اور مقصد یہ بھی تھا کہ اسلامی ممالک میں مسیحی تبلیغ کا مقابلہ کیا جائے۔ اس انجمن کے قیام کا تصور کیونکر پیدا ہوا؟ رشید رضا لکھتے ہیں: ''اس کا تصور مجھے اس وقت سے تھا جب میں طرابلس کے مدرسے میں طالب علم تھا۔ میں اس شہر کے امریکی عیسائی تبلیغی مشن کے کتب خانے میں جایا کرتا تھا اور وہاں عیسائیوں کا دینی اخبار اور ان کی کتابیں اور رسائل پڑھا کرتا تھا۔ اسی وقت سے میرا یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی بھی ایسی انجمن ہونا چاہیے، ان کا بھی ایسا ہی مشن سکول اور ایسا ہی کتب خانہ ہونا چاہیے''۔

1902ء میں جاپانی ادیان کی کانفرنس منعقد ہوئی تو رشید رضا نے جاپانیوں کو اسلام کی دعوت دینے کا عزم کیا جو پورا نہ ہو سکا، لیکن انجمن کی قیام کی ایک منزل سر ہو گئی۔ انہیں خیال آیا کہ استاد محمد عبدہٗ کا بنیادی اصول عربی مدارس کے طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کی اصلاح اور قدیم و جدید خیالات کا تطبیق تھا۔ انہوں نے جامعہ الازہر کے نظام تعلیم کو جدید ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق مرتب کرنے کی کوشش کی، لیکن تقلید پسند جامد علماء کے سامنے پیش نہ گئی۔ تاہم انہوں نے دار العلوم قاہرہ میں قائم کیا جس کی رسم افتتاح 3 مارچ 1912ء کو ہوئی اور اگلے دن کلاسیں جاری کر دی گئیں۔ دار العلوم میں عرب ممالک کے علاوہ دور دراز کے مسلم ممالک مثلاً انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان اور چین کے طلبہ بھی تعلیم پاتے تھے، لیکن یہ دار العلوم زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور انگریز اور مصری حکومت کی نگاہ عتاب اسے گھائل کر گئی۔

برصغیر پاک و ہند کا سفر

دار العلوم یا مدرسہ دار الدعوۃ والارشاد کے قیام کے سلسلے میں سیّد رشید رضا اور مولانا شبلی نعمانیؒ میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلیؒ کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ کیا اور لکھنؤ پہنچ کر 6 اپریل 1912ء کو ''ندوۃ العلماء'' کے اجلاس کی صدارت کی اور عربی زبان میں ایک نہایت ولآویز اور فصیح تقریر فرمائی، جس سے سماں بندھ گیا

(بحوالہ "حیاتِ شبلی" : سید سلیمان ندوی)

جنگ عظیم اول (1914ء۔1918ء) میں رشید رضا کی ہمدردیاں عرب احرار کے ساتھ تھیں، کیونکہ وہ تحریک تورانیت کے خلاف تھے، پھر بھی وہ انگریزوں کی نظروں میں معتوب رہے۔ "موتمر اسلامی" کا پہلا اجلاس 1912ء میں جنیوا میں ہوا تو سید رشید رضا بھی جنیوا گئے۔ اجلاس کے اختتام پر انہوں نے امیر شکیب ارسلان کی معیت میں سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی سیاحت کی اور ماہرین سیاحت سے مسلم ممالک کی سیاست پر گفتگو کی۔ 1926ء میں انہوں نے حجاز کی "موتمر اسلامی" میں شرکت کی اور مسلم ممالک کے نمائندوں کے ساتھ حجاز کے آئینی مستقبل پر بحث و تمحیص میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ زیادہ تر تصنیف و تالیف میں منہمک اور تفسیر المنار کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ رشید رضا سورۂ یوسف کی آیت 101 (رب قد اتیتنی من الملك و علمتنی من تاویل الاحادیث ج فاطر السمٰوٰت والارض قف انت ولی فی الدنیا والاخرة ج توفنی مسلما و الحقنی بالصلحین ٥) کی تفسیر لکھ کر فارغ ہوئے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ 22 اگست 1935ء کو سلطان ابن سعود سے مل کر سویز سے قاہرہ آ رہے تھے۔ موٹر کار میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

آپ کا علم و فضل

سید رشید رضا عربی کے ممتاز ادیب، انشا پرداز اور خطیب تھے۔ ان کی انشا پردازی قدیم و جدید دونوں کی بہترین خصوصیات کی حامل تھی، وہ علم الکلام اور تفسیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حدیث اور بلاغت کے امام تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے صحیح لکھا ہے کہ "المنار" کی جلدیں حقیقی معنی میں اسلامی علوم کا دائرۃ المعارف ہیں، جن سے اس عہد میں کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ان کی تفسیر "المنار" جس کے ذریعے قدرت نے اپنے اسرار و حقائق کی گرہ کشائی کا کام لیا ہے، ان کا بے مثال کارنامہ ہے۔ جس نے انہیں مشاہیر اسلام کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس طرح تاریخ اسلام، صحیح عقائد کی تبلیغ اور غیر مسلموں کے اعتراضات کی تردید اور ان کی دوسری دینی و تعلیمی خدمات ایسی ہیں کہ ان کی گرد کو اس زمانے کا کوئی عالم نہیں پہنچ سکا۔

سید رشید رضا ہندی محدثین کے علمی اور تصنیفی کارناموں کے معترف اور مرتبہ شناس تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر عصر حاضر (گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری) میں ہمارے برادر ہندوستانی علماء علم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو آج یہ علم معدوم ہو گیا ہوتا، کیونکہ بلادِ شام، مصر، عراق اور حجاز میں یہ علم دسویں صدی ہجری ہی میں زوال پذیر ہو چکا تھا۔ امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کے افکار نے بھی ان کی بدولت نئی زندگی پائی۔

مصر کے قوم پرستوں، ترکی کے ترقی پسندوں اور جامعہ الازہر کے تقلید پسندوں سے ان کی کبھی نہ بن سکی۔ "جامعۃ اسلامیہ" کے قیام کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن سعودی حکومت کے قائم ہونے پر انہیں خاصا اثر و رسوخ حاصل رہا اور سلطان ابن سعود ان کے مشوروں کی قدر کرتے رہے۔ ان کے ممتاز شاگردوں میں شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجۃ البطار قابل ذکر ہیں، جنہوں نے ایک عرصے تک شام میں دعوت و ارشاد کی مشعل فروزاں رکھی۔

آپ کی تصانیف وتالیفات

سید رشید رضا نے ہزاروں صفحات لکھے لیکن ان کی علمی زندگی کا اہم کارنامہ "تفسیر المنار" ہے جس کا ہلکا سا تعارف پیچھے ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے سورۃ العصر کی تفسیر شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تیسویں پارے کی سورتوں اور سورۃ الفاتحہ کی تفسیر طبع ہوئی۔ مفتی محمد عبدہ کے انتقال (1905ء) کے بعد اس تفسیر کا سلسلہ سید رشید رضا نے جاری رکھا۔ بارہویں یعنی آخری جلد 1354 ہجری میں شائع ہوئی۔ وہ سورۃ یوسف کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ انہوں نے یہ تفسیر زمانہ حال کی ضرورتوں اور تقاضوں کے پیش نظر لکھی ہے۔ تفسیر میں علمائے سلف کے علاوہ امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ لغوی اور نحوی مشکلات کے حل کے علاوہ اعجاز القرآن پر دلپذیر مباحث بھی ملتے ہیں تفسیر۔ تفسیر کی طوالت کے خیال سے انہوں نے اس کے اختصار کا بھی ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعض مختصر اجزا شائع ہوئے ہیں۔ رشید رضا نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہ کی تفسیر "المنار" کے سلسلے کو اسی طرح جاری رکھا، جس طرح سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی ﷺ کے سلسلے کو جاری رکھا۔

تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ تاریخ وسیرت کے موضوع پر ان کی یادگار کتاب ہے جو قاہرہ میں پہلی بار 1926ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سید رشید رضا نے سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ کے سوانح، دینی معتقدات اور سیاسی افکار کے بارے میں لکھی ہے۔

اور تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں سید افغانی اور مفتی محمد عبدہ کے مفصل حالات ہیں۔ دوسری جلد میں مفتی صاحب کے مضامین ہیں اور تیسری جلد میں ان کے بارے میں ارباب علم وفضل کے مقالات، تاثرات، تعزیتی پیغامات اور مراثی ہیں۔ کتاب میں ضمناً بہت سے دینی، ادبی اور سیاسی مباحث آ گئے ہیں۔

سیرت نبوی ﷺ پر دو مختصر کتابچے بھی ہیں جو فاضل مصنف نے محافل میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھے تھے۔ ان کی ایک اور کتاب "الوحی المحمدی" بہت مقبول ہے۔ اس کا اردو ترجمہ سید رشید رضا کے شاگرد عبدالرزاق ملیح آبادی مدیر "ہند جدید" نے کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ وحی اور نبوت کی حقیقت، آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اثبات، اعجاز قرآنی اور اس کے انقلابی تاثرات، سیاسی اور سماجی اصلاح کے ذرائع، اسلام اور نظام جنگ، اور اسلام میں حقوق نسواں پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ آخر میں متمدن اقوام کو قبول اسلام کی دعوت دی ہے۔

اسلام پر عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب میں ایک کتاب "شبہات النصاریٰ وحجج الاسلام" کے عنوان سے لکھی ہے "نداء الجنس اللطیف" میں اسلام میں حقوق نسواں، تعدد ازواج، غلامی، پردہ اور طلاق کے مسائل پر حکیمانہ گفتگو کی ہے۔

رشید رضا اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی آخری نظم "مقصورہ رشیدیہ" ہے۔ جو انہوں نے مقصورہ ابن درید کے جواب میں لکھی۔ اس میں چار سو سے زیادہ اشعار ہیں جن میں مسلمانوں کی اصلاح وترقی کے متعلق اپنے خیالات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انجیل برناباس، تفسیر ابن کثیر اور دوسری امہات کتب، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی بہت سی کتابیں اور مقالات تصحیح اور حواشی کے ساتھ شائع کیں۔

رشید رضا کا خیال تھا کہ جو لوگ اسلام کی تعلیم و تبلیغ میں مصروف ہوں، انہیں سیاست میں مشغول نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں مصر کے قوم پرست رہنماؤں کی سیاست پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ ''یہ لوگ ایک مسلمان اور عرب کو (جو دنیائے اسلام میں مرتبے کے اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے) جو ان لوگوں کے ملک کا باشندہ نہ ہو، اجنبی اور غیر ملکی سمجھتے ہیں اور اس طرح حجاز یا شام کا شریف ان کے نزدیک چین کے کسی بت پرست سے بہتر نہیں ہے۔ رشید رضا کو ترکی جدید کے ہیرو مصطفیٰ کمال پاشا کی کامیابی نے بھی سخت مایوس کیا۔ وہ مصر اور ترکی کے قوم پرستوں کے سیاسی نظریات کے سلسلے میں کسی مفاہمت پر آمادہ نہ ہوئے اور انہیں صاف صاف ملحد و زندیق قرار دیا، اس لیے کہ ان کی قوم پرستی کی بنیاد مذہب پر نہیں ہے۔

تحریک اخوان المسلمین کے بانی
شیخ حسن البناء شہید

مارچ 1928ء (ذی قعد 1347ھ) میں حسن البناء نے اپنے مکان پر حافظ عبدالمجید، احمد الحصری، فواد ابراہیم، عبدالرحمٰن حسب اللہ، اسماعیل عزاور زکی مغربی سے ملاقات کی۔ یہ چھ غیور مسلمان جذبہ عمل سے سرشار تھے اور اسلام کی سربلندی کے لیے کسی ''عملی پروگرام'' کے طالب تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے حسن البناء کو اپنا مرکز نظر بنایا اور اسلامی کام کا منصوبہ پیش کر کے ان پر رہنمائی اور قیادت کی ذمہ داری ڈال دی۔ موصوف نے پوری کشادہ دلی کے ساتھ کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے مسلسل اور ان تھک جدوجہد کریں گے۔ سوال پیدا ہوا، کس نام سے ہم اپنے کو موسوم کریں؟ انجمن، کلب، سلسلہ، یونین، ایسوسی ایشن یا کچھ اور، تاکہ ہم ایک قانونی حیثیت (رجسٹریشن) حاصل کر سکیں، جس کا جواب حسن البناء کی طرف سے یہ تھا کہ نہ یہ، نہ وہ۔ اسماء و مظاہر پر ہماری توجہ نہ ہونی چاہیے۔ ہمارے اس پہلے اجتماع کی بنیاد ایک مخصوص طرز فکر اور عملی و معنوی حقائق ہونا چاہئیں۔ ہم اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا ہم ''اخوان المسلمین'' ہیں اور یہ کافی ہے۔

اس طرح باتوں باتوں میں اچانک جو خیال آیا تھا، وہ بیسویں صدی کی، دنیائے اسلام کی سب سے بڑی احیائی تحریک کا مستقل نام ہو گیا۔ تحریک کے اندر داخل ہونے سے پہلے مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قائد اول اور بانی حسن البناء کے ذاتی حالات کی جستجو کی جائے۔

آپ کا بچپن اور ابتدائی تعلیم

حسن البناء اکتوبر 1906ء میں محمودیہ کے ایک مایہ ناز علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ محمودیہ کا قصبہ قاہرہ کے شمال مغرب میں 144 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کے والد احمد بن عبدالرحمٰن البناء (متوفی 1960ء) جامعہ الازہر کے فارغ التحصیل، عالم دین، حدیث، فقہ اور دینی علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ علم حدیث

پر پانچ کتب کے مصنف تھے۔ ان میں ایک کتاب 23 جلدوں پر مشتمل ہے۔ آپ کی متعدد کتب مثلاً "فتح الربانی فی ترتیب مسند امام احمد شیبانی، بلوغ الامانی من اسرار الفتح الربانی، منتحہ المسعود اور قصص الاسلامیہ" وغیرہ علمائے دین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ احمد البناء مفتی محمد عبدہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں مذہب، اسلامی قانون، فقہ، نحو، حدیث اور علم الکلام وغیرہ پر مشتمل کتب کا نہایت قیمتی اور نادر ذخیرہ موجود تھا، جو آپ کی اولاد خصوصاً حسن البناء کے کام آیا۔ آپ قصبے کی مسجد کے امام اور خطیب تھے۔ فارغ وقت میں گھڑی سازی کا کام کرتے تھے۔ آپ کے حلقۂ احباب میں مصطفیٰ المراغلی اور محب الدین الخطیب جیسی معتبر علمی شخصیات شامل تھیں۔

احمد البناء اپنے بیٹے حسن البناء کے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ایک عرصے تک میرے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، یہاں تک مجھے بچے کی تمنا ہونے لگی۔ تب میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ایک صالح فرزند عطا فرمائے۔ اس زمانے میں میری نظر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی جو نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ مجھے بہت ہی پیارا لگا۔ تب میں نے مزید دعا کی کہ میرا بچہ ایسا ہی نماز پڑھنے والا ہو جیسے یہ بچہ پڑھ رہا ہے اور ہر لحاظ سے بہت ہی حسن (اچھا) ہو۔ میری دعا قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بچہ عنایت فرمایا اور میں نے اس کا نام حسن رکھا، اس لیے کہ جب میری شادی ہوئی تھی تو میری والدہ نے میری بیوی کو "ام حسن" کہہ کر پکارا تھا۔ یہ بچہ جب چار سال کا ہوا تو میں نے اس کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ برابر ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ تین سیپاروں کے علاوہ باقی تمام قرآن مجید حفظ کر لیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کو دمنہور کے ابتدائی سکول "مدرسہ المعلمین" میں داخل کرا دوں۔

دمنہور محمودیہ کے جنوب مغرب میں 21 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ابتدائی سکول تو محمودیہ میں بھی تھا، لیکن دمنہور کا سکول علاقے میں زیادہ مقبول اس لیے تھا کہ اس کے پرنسپل استاد بشیر الاسوتی موسیٰ تھے۔

احمد البناء مزید لکھتے ہیں: "میں نے ایک دن حسن کو بلایا۔ وہ بڑا ہی سعید اور فرماں بردار بچہ ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم کو "مدرسۃ المعلمین" میں داخل کرا دوں، لیکن وہاں صرف ان بچوں کو داخل کرایا جاتا ہے جو حافظ قرآن ہوں، لیکن تمہارا حفظ قرآن ابھی پورا نہیں ہوا۔ بتاؤ کیا ہونا چاہیے؟ اس نے کہا، ابا جان جو آپ کی مرضی ہو۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میں نے کہا، ایک تختی لے آؤ۔ پھر میں تختی پر چند آیات لکھ کر دے دیتا تھا اور حسن یاد کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ بہت تھوڑے عرصے میں اس نے بقیہ تین پارے بھی حفظ کر لیے، اور وہ مدرسے میں داخل ہو گیا"۔

داخلے کے وقت حسن کی عمر آٹھ سال تھی۔ "مدرسۃ المعلمین" دراصل "مدرسہ ارشاد دینیہ" کے تحت پرائمری سطح کا سکول تھا۔ یہ 1905ء میں استاد محمد زہران نے قائم کیا تھا۔ استاد محمد زہران کا شمار مصر کی ممتاز شخصیات میں ہوتا تھا۔ حسن کی شخصیت اور کردار سازی کی تکمیل میں استاد زہران کی تربیت نے مرکزی کردار ادا کیا۔ ان کے علاوہ رشید رضا، فرید واحدی اور محب الدین الخطیب کی تحریروں سے بھی آپ متاثر تھے۔ "مدرسہ ارشاد" کی طالب علمی کے

دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ حسن ایک دن نہر محمودیہ کے کنارے سیر و تفریح کے لیے گیا۔ وہاں اس نے ایک بادبانی کشتی کے مستول پر آویزاں، خلافِ تہذیب، ایک ننگی عورت کا مجسمہ دیکھا۔ اس کے اندر غصے اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ علیم الفطرت بچہ فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا اور کہا کہ یہاں ایسے مجسموں کا نصب ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔ نیک دل تھانیدار بچے کی اس ایمانی غیرت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے مطالبے پر لبیک کہتا ہوا فوراً موقع پر پہنچا کشتی کے مالک کو تنبیہ کی اور مجسمہ فوراً اتارنے کا حکم دیا۔ اس طرح دس برس کا بچہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن البناء میں قیادت کی صلاحیت بچپن ہی سے ودیعت کی گئی تھی۔ چنانچہ پرائمری کے بعد مڈل کلاس میں بھی وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے تھے اور طلبہ کی قیادت کے لیے نامزد تھے۔ جس وقت مدرسے میں "انجمن اخلاق حسنہ" کی تشکیل ہوئی تو ان کے ساتھی طلبہ نے انہی کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا۔

حسن نے سکول سے باہر بھی ایک اور انجمن بنائی جس کا نام "انجمن انسداد محرمات" رکھا، جس کا میدانِ عمل اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ ہر ایسے شخص کو خط و کتابت کے ذریعے متنبہ کیا جاتا جو محرمات کا مرتکب ہوتا اور شعائر اسلامی کو ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کرتا تھا۔

ان کے والد احمد البناء نے "مدرسہ ارشاد دینیہ" کی تعلیم کے دوران اپنے بیٹے کو شیخ عبدالوہاب حصافی کی طرف رجوع کیا۔ گویا وہ تصوف کے سلسلہ حصافیہ وشاذلیہ میں بیعت ہوئے۔ حسن نے اپنے حصافی بھائیوں کے ساتھ مل کر "انجمن حصافیہ اصلاحیہ" قائم کی اور خود اس انجمن کے معتمد کے فرائض انجام دیے۔ اس انجمن کے دو بنیادی مقاصد تھے

1۔ اخلاق حسنہ اختیار کرنے اور پھیلانے کی دعوت، منکرات اور محرمات کا انسداد۔

2۔ مسیحی تبلیغی انجمنوں کا مقابلہ جو شہر میں علاج، تعلیم، کشیدہ کاری اور بچوں اور بچیوں کی امداد کے بہانے عیسائیت کا پرچار کر رہی تھیں۔

حسن البناء جب مدرسے کے آخری سال میں تھا تو قاہرہ میں دارالعلوم (قائم شدہ 1872ء) کی نئی تنظیم ہوئی۔ نئی تنظیم کے وقت نصاب میں علوم عربیہ کے علاوہ علوم جدیدہ بھی شامل کیے گئے۔ ان کے والد نے سوچا کہ حسن کو دارالعلوم میں داخل کرایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بیٹے سے مشورہ کیا تو پھر آخری رائے یہ ہوئی کہ یہ سال یہیں پورا کر لیا جائے، اور پورا سال دارالعلوم میں داخلے کے لیے پوری تیاری کی جائے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ علوم نقلیہ (یعنی حدیث، فقہ وغیرہ) میں تیاری آپ کرا دیں اور علوم عقلیہ (ریاضی، اقلیدس وغیرہ) میں خود تیاری کر لوں گا۔ اور پھر وہ قاہرہ چلے گئے۔

جب حسن قاہرہ آئے تو مدرسہ "دارالعلوم العلیا" میں داخل ہوئے جو اب دارالعلوم کالج، قاہرہ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ یہاں آتے ہی "جمعیۃ مکارم اخلاق اسلامیہ" میں شامل ہو گئے۔ اس وقت قاہرہ میں یہ تنہا ایک دینی جماعت تھی۔ حسن پابندی سے اس جمعیت کے لیکچروں اور دوسری سرگرمیوں میں شریک ہوتے رہتے، اور بعض مساجد میں ممتاز باعمل علماء کے مواعظ میں حاضری دیتے رہے۔

لیکن قاہرہ میں ان کو فسق و فجور، عام معاشی انتشار اور اسلامی اخلاق سے بیگانگی نظر آئی۔ اس سے ان کو احساس ہوا کہ صرف مساجد کی دینی تعلیم لوگوں تک عام کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ اس موقع پر ان کی تخلیقی عقلیت اور جدت طرازی ظاہر ہوئی کہ عام لوگ جو مسجدوں میں نماز کے لیے نہیں آتے، وہ وعظ و نصیحت کے لیے مسجد میں آنے والوں سے زیادہ ضرورت مند ہیں، جب کہ ان کی تعداد بھی نمازیوں سے بہت زیادہ ہے۔ یہ لوگ دین اسلام سے بالکل بے تعلق اور پند و مواعظ سے بیگانہ ہیں، لہٰذا کیوں نہ ہم خود دعوت اصلاح لے کر ان کے پاس جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے دار العلوم کے بعض ساتھیوں اور کچھ جامعہ الازہر کے دوستوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی چائے خانوں اور پبلک سوسائٹیوں، حلقوں اور انجمنوں میں جا کر دعوت پیش کی جائے۔ پہلے پہل تو احباب کو اس خیال پر بہت تعجب ہوا اور ناپسند کیا، لیکن قرار یہ پایا کہ اس کے قبول یا عدم قبول کا فیصلہ تجربے پر موقوف رکھا جائے۔ چنانچہ تجربہ کیا گیا، اور پہلے قدم ہی پر کامیاب رہا۔ اس سے آئندہ عمل کے لیے ہمت افزائی ہوئی۔ احباب کی ایک جماعت گرمیوں کی تعطیلات میں شہروں اور دیہات میں دعوت پھیلانے کے لیے تشکیل دی گئی۔ اس جماعت کی سرگرمیوں کے نتیجے میں ایک طرف تو دعوت دینے والوں کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی اور دوسری طرف عوام میں مقبولیت اور نیک نامی حاصل ہوئی۔

انہی دنوں ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے انقلاب، خلافت کے خاتمے اور دین و سلطنت میں علیحدگی کے نتیجے میں مصر میں لادینیت اور آزادی کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کی بنیاد رکھی گئی جو معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی زیر زمین ہو گئی۔ اس کا پروگرام آزادی اور جمہوریت کے سوا کچھ اور نہ تھا، اور آزادی اور جمہوریت کی دعوت اس وقت اخلاقی آوارگی اور بے حیائی کے پھیلاؤ اور نشر و اشاعت کا دوسرا نام تھا۔ روزنامے، ماہنامے اور کتابیں ایسی شائع ہونے لگیں، جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ دین کے اثر کو کمزور کیا جائے، اور مصریوں کے سینے ایمان سے یکسر خالی کر دیے جائیں، تاکہ ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کے اغراض و مقاصد کے مطابق اس کے افراد فکری و ذہنی آزادی سے بہرہ مند ہو سکیں۔

بے دینی کے اس سیلاب کا اسلامی حلقوں میں بالعموم اور حسن البنا کے دل پر بالخصوص گہرا اثر ہوا۔ حسن اپنے ملنے جلنے والوں اور علماء و شیوخ میں جہاں جہاں وہ پہنچ سکتے تھے، اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے اور اپنے دل کا درد ان کے سامنے رکھتے اور پوچھتے کہ مداوا کیا ہے؟ اس ضمن میں وہ سید رشید رضا، شیخ وجودی، شیخ محمد خضر حسین اور سید محب الدین خطیب جیسے اکابرین سے ملتے اور لادینیت کا مقابلہ کرنے کے لیے فعال، مثبت اور تعمیری تحریک چلانے پر زور دیتے۔ بالآخر ان کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور اس طرح مجلہ ''الفتح'' کا اجراء ہوا اور پھر ''جمعیۃ الشبان المسلمین'' وجود میں آئی۔ یہ جمعیت وائی ایم سی اے کے طرز پر مصر کی وسیع ترین تہذیبی، ثقافتی اور اسلامی انجمن ہے جس کی شاخیں نہ صرف مصر کے مختلف شہروں اور قصبوں، بلکہ مصر سے باہر اکثر ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں، اور وہ مصر کے متوسط اور اونچے طبقے کے افراد کو اسلام سے قریب لانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

دار العلوم کے آخری سال 1927ء میں آپ کو جو مقالہ تحریک کرنے کے لیے دیا گیا، اس کا عنوان سوالیہ تھا:

"تکمیل تعلیم کے بعد تیری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟" اس کے جواب میں حسن البناء نے جو مقالہ تحریر کیا، اس میں انہوں نے اپنے مستقبل کا نقشہ پوری صراحت کے ساتھ پیش کر دیا تھا۔

"اخوان" کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

اس طرح "اخوان المسلمین" ایک مستقل نام بن گیا۔ وہ چھ افراد جنہوں نے مارچ 1928ء میں حسن البناء کے مکان پر "اخوان" کی تشکیل کی تھی، وہ اسلامی طرز فکر اور طریقہ حیات کے حامی و حامل تھے۔ حسن البنا، اس کے بعد مسلسل "اخوان" کی دعوت دیتے رہے۔ وہ اپنی دعوت میں کسی قسم کے اعلان اور پروپیگنڈے کے بغیر، خاموشی مگر مستقل مزاجی کے ساتھ مشغول رہے۔ اس طرح انہوں نے کافی لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ان کے گہرے خلوص اور تحریک کے مقاصد سے محبت کی بدولت دعوت تیزی سے پھیلنے لگی۔ کامیابی ان کو پیہم کوشش کے لیے ابھارتی رہی۔ تحریک سے گہری وابستگی اور گرم جوشی ان کے دائرہ عمل کو وسیع تر کرنے اور پوری زندگی اس پر وقف کر دینے کے لیے آمادہ کرتی رہی۔ چنانچہ انہوں نے کوئی قصبہ اور گاؤں نہ چھوڑا۔ ہر جگہ گئے، قیام کیا۔ وہاں کے لوگوں سے مساجد میں، گھروں میں ملے، لیکن مسجد بہر حال ان کی مرکزی قیام گاہ رہی، کیونکہ مسجد ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں نمازی، مدرس اور واعظ پر کوئی معترض نہ ہوسکتا تھا۔

حسن البنا، کا طریقِ دعوت

ان کے دعوتی سفر ہفتہ وار اور سالانہ گرمیوں کی تعطیلات میں ہوا کرتے تھے۔ ہفتہ وار تعطیل میں قریب کے شہر، اور دوسری بڑی چھٹیوں میں دور کے شہر۔ بیرونی دعوتی سرگرمیوں کی مدت میں وہ اپنے سرکاری سکول میں پابندی کے ساتھ تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ انہوں نے کبھی کسی بیماری یا ناگہانی ضرورت کا بہانہ نہیں کیا۔ سکول کی جبری اور سرکاری مصروفیت نے ان میں پختگی اور خاموش عمل کی عادت پیدا کر دی۔ بے تکلف فطری سادگی اور انکسار کے ساتھ ساتھ تدریس کی پابندی نے ان کو حاسدوں (جن کی تعداد بہت زیادہ تھی) کے حسد و کینہ پروری سے محفوظ رکھا جن کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ ان کے سوا کسی دوسرے کی آواز بلند نہ ہو۔

حسن البنا کی دعوت پر لبیک کہنے والے اول اول زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ تھے۔ مزدور حلقوں میں دعوت کی کامیابی میں ان کی عوام پسندی اور سادہ طبیعت کو بہت دخل تھا، کیونکہ وہ ہر گروہ کو اس کے مزاج کے مطابق مناسب اسلوب میں خطاب کرتے تھے۔ بکثرت سفر اور میل جول مختلف النوع گروہوں اور حلقوں سے تعلق رکھنے کے سبب ان کے اندر لوگوں کے میلانات کو سمجھنے اور مزاج شناسی کا ایک زبردست ملکہ پیدا ہو گیا تھا، اور غالباً یہ ایک اصول انہوں نے ہمیشہ کے لیے اختیار کر لیا تھا۔ وہ اپنے رفقائے دعوت سے کہا کرتے تھے کہ:

"دو کھردرے ہاتھوں والے ساتھی زیادہ سے زیادہ پیدا کرو"

یعنی محنت کشوں کو دوست بناؤ جو اپنے ہاتھوں کی کمائی سے رزقِ حلال کماتے ہوں۔ یہی مضبوط کلائیوں

والے وہ لوگ ہیں جن سے سختی کے وقت بہترین مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ حسن البناء اسی طرح اپنی دعوت دور و نزدیک، جہاں جہاں وہ پہنچ سکے، پہنچاتے رہے۔ دو سال بعد ان کے سفروں کے نتیجے میں ابوصویر، پورٹ سعید اور الملاح کے بڑے شہروں میں اخوان کے شعبے قائم ہو گئے۔ تیسرے سال شہر سویز میں ایک اور شعبہ کھلا۔ چوتھے سال دس شعبے ہو گئے اسماعیلیہ ہی میں لڑکیوں کی اسلامی تربیت کا ایک مرکز کھل گیا۔ بعد ازاں ''الاخوات المسلمات'' کی صورت پیدا ہوئی۔

تبادلہ برائے قاہرہ

''الاخوان المسلمین'' کی تاسیس کے پانچ سال بعد 1933ء میں حسن البناء کا تبادلہ قاہرہ میں کر دیا گیا۔ ان کے اس تبادلے سے دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی مگر حسب سابق خاموشی اور سنجیدگی، مساجد میں قیام وخطاب، ساتھیوں کی تلاش، اور نئے نئے شعبوں (شاخوں) کا قیام، یہ سرگرمیاں خاموشی اور احتیاط کے ساتھ جاری رہیں۔

قاہرہ میں قیام کے ایک سال بعد 1934ء میں حسن البناء نے ایک مقالہ تحریر کیا۔ جس میں بیان کیا کہ ''اخوان'' کی تحریک مصر کے پچاس سے زائد شہروں میں پھیل چکی ہے اور تقریباً ہر شہر میں ''اخوان'' کے تحت کوئی نفع بخش سکیم یا کوئی مفید، فلاحی ادارہ قائم کیا ہے۔ شہر اسماعیلیہ میں مسجد الاخوان اور ایک تربیت گاہ کام کر رہی ہے۔ لڑکوں کی تعلیم کے لیے ''مدرسہ حراء'' اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ''مدرسہ امہات المومنین'' قائم ہیں۔ شہر ابوصویر میں ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے اور اس سے ملحق اسلامی تربیت گاہ ہے۔ شہر محمودیہ اور بحیرہ میں بھی ایک لڑکوں کا سکول اور ایک صنعت گاہ، جس میں وہ غریب و نادار لڑکے جو اپنی تعلیم پوری نہ کر سکے، صنعتی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح مدرسہ حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ قالین بافی اور بنائی کا ایک مرکز قائم ہے۔ دقہیلہ اور نزلہ میں بھی حفظ قرآن کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے۔ مصر کے انتہائی جنوب میں شہر ادفو سے لے کر انتہائے شمال میں شہر اسکندریہ تک ملک کے گوشے گوشے میں ''اخوان'' کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔

روزمرہ کا دستور العمل

حسن البناء کا روزمرہ کا یہ معمول تھا کہ صبح سویرے مرکز میں آ جاتے۔ یہاں ساتھیوں کے لیے کچھ تحریری ہدایات چھوڑ جاتے، جن میں فوری اور ضروری کاموں کے متعلق ہدایات ہوتیں، اس کے بعد سکول پڑھانے جاتے۔ اگر سفر کا پروگرام ہوتا تو سکول سے سیدھے ریلوے سٹیشن چلے جاتے، اگر سفر کا پروگرام نہ ہوتا تو سکول سے چھٹی کے بعد دوبارہ مرکز آتے۔ وہاں ملاقاتیں کرتے۔ ہدایات دیتے۔ جو کام باقی ہوتا، اس کی تکمیل کرتے۔ پھر شب میں تیسری بار مرکز آتے، اور یہ وقت وفود، آنے والوں سے، ملاقات یا کمیٹیوں میں شرکت یا پھر تقریر میں گزرتا اور یہ سب مصروفیات سالانہ تعطیلات میں ان کے دیہات کے دعوتی سفروں میں مانع نہ ہوتیں۔

جس شہر اور قصبے میں ''اخوان'' ضروری سمجھتے وہاں مرشد کو آنے کی دعوت دی جاتی وہاں کے ریلوے سٹیشن پر استقبال کے لیے آنے والے لوگوں کا ہجوم ہو جاتا۔ جائے قیام تک مداح لوگ جلوس کی شکل میں ہمراہ جاتے۔ جلسہ

گاہ میں ان کے خطاب کے لیے حسب ضرورت شامیانے نصب کیے جاتے۔ خطاب کے بعد ان کا کام اسی پر ختم نہ ہو جاتا کہ تقریر کے بعد وہ اپنے گھر اور سامعین اپنے گھر، بلکہ مجمع میں سے جس کو بھی وہ ''خاص طور پر'' متوجہ دیکھتے، اس کو اپنے ساتھ ملا لینا ان کی خاص مہم تھی۔ چنانچہ خطاب کے بعد دیر تک جو لوگ چاہتے، ان کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ اس موقع پر دعوت کی خاطر نتیجہ خیز گفتگو ہوتی، جس میں نوجوانوں کی بیداری سے متعلق اور مصر و اسلام کے مستقبل پر تبادلہ خیال ہوتا۔ ملک کے جنوبی حصہ وہ شہر بہ شہر اور گاؤں در گاؤں تین روز میں طے کر لیتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صبح انہوں نے بنی سویف میں کی، تو دوپہر منیا میں، پھر شام واسطی میں اور رات فیوم میں گزاری ہے (یہ سب مصر کے مشہور قصبے ہیں) اس طرح ایک گھنٹہ یا گھنٹے سے کچھ کم سوتے، اور بیٹھے ہی تکیے پر سر رکھتے، سو جاتے۔ لوگ ان کے آس پاس بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

سیاست میں شرکت اور دعوت اسلام

اسی زمانے میں ''الاخوان'' نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ حسن البناء نے ریڈیو اور عام عوامی اداروں میں دینی اور سیاسی تقریروں کا آغاز کیا۔ یکے بعد دیگرے آنے والے مصری وزرائے اعظم کے نام خطوط بھیجے۔ محمد محمود کے عہد سے لے کر دوسری جنگ عظیم کی ابتدا تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان خطوط کا مرکزی نکتہ اسلامی نظام کی بنیاد پر داخلی اصلاحات کی دعوت تھی۔ لیکن ''الاخوان'' وزرائے اعظم کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا سکے، کیونکہ ان کی سیاسی کارکردگی پر دین کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے حکومت اور حکومتی عہدہ داروں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

1936ء میں حسن البناء نے سابق شاہ مصر فاروق، سابق وزیر اعظم مصطفیٰ نحاس، عرب ممالک کے فرماں رواؤں اور مختلف مسلم ممالک کے سربراہوں، معروف دینی اور سیاسی رہنماؤں کے نام ایک اہم خط ''نحو النور'' کے نام سے بھیجا، جس میں اسلام، اس کا نظام، اس کے دستور، اس کے تمدن، تہذیب کی طرف ان کو دعوت دی اور مغربیت، مغربی طرز زندگی، مغربی معاشرت و تہذیب کو ترک کرنے کا مطالبہ کیا، اور اسلامی اور مغربی دونوں نظاموں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ ترقی کی راہ پر گامزن ایک قوم کی جو عسکری، دستوری، معاشرتی اور معاشی ضروریات ہو سکتی ہیں، اسلام ان سب کی ضمانت دیتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ''آپ لوگ سب سے پہلے اس بیمار دنیا کو بچانے کے لیے طب قرآنی سے ماخوذ خوراک لے کر آگے بڑھیں''۔

اپنی اس طویل تحریر میں، جو بعد ازاں ایک الگ مقالے کی صورت میں شائع ہوئی، انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل اصلاح کے لیے پچاس دفعات پر مشتمل ایک لائحہ عمل پیش کیا۔ اس مقالے میں جو مطالبہ سب سے اہم تھا، وہ یہ تھا کہ فرقہ بندی کا خاتمہ کیا جائے اور امت کی سیاسی قوتوں کو ایک رخ پر اور ایک صف بنا کر کام لیا جائے۔

تحریک اخوان کا تعارف

1938ء میں دعوت اپنے تمام عوامل و عناصر مکمل کر چکی تھی۔ اب وہ اپنے کامل قالب اور مکمل نظام کے ساتھ قوم کے سامنے آئی۔ اس موقع پر ''پانچویں کانفرنس'' سے خطاب کرتے ہوئے اپنے خطاب میں تحریک اخوان کا

تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ ایک جامع اور ہمہ گیر تحریک ہے، جس میں اصلاح کے تمام پہلو موجود ہیں۔ یہ سلفی دعوت ہے، کیونکہ اخوان کی دعوت ہے کہ قرآن وسنت رسول ﷺ کو مرکز نظر بنایا جائے۔ یہ سنی مذہب ہے، کیونکہ اخوان کی کوشش ہے کہ ہر شے میں سنت رسول ﷺ پر عمل کیا جائے یہ ایک صوفیانہ حقیقت ہے، کیونکہ اخوان سمجھتے ہیں کہ خیر وصلاح کی بنیاد پاکیزگی نفس، صفائی قلب، اللہ کی محبت اور تعاون علی الخیر ہے۔ یہ ایک سیاسی جماعت ہے، کیونکہ اخوان حکومت کی داخلی وخارجی اصلاح اور باعزت خوددارانہ قومی تربیت وزندگی کے داعی ہیں۔ یہ ایک ورزشی جماعت ہے، کیونکہ یہ اپنے ورزشی گروپوں کے ذریعے جسمانی ورزش کا خاص اہتمام کرتی ہے۔ یہ ایک علمی و ثقافتی انجمن ہے، کیونکہ اخوانی تربیت گاہیں درحقیقت تعلیم وتہذیب کے مدرسے اور عقل وروح کی جلا ونمود کے مراکز ہیں۔ یہ ایک اقتصادی ادارہ ہے، کیونکہ اسلام مالی امور ومعاملات پر خاص توجہ دیتا ہے۔ ''اخوان'' نے اپنی اسلامی طرز کی لمیٹڈ کمپنیوں سے قومی اقتصادی حالت کو مضبوط تر بنانے میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ ایک سماجی تحریک ہے، کیونکہ اخوان اسلامی معاشرے کے امراض پر خاص توجہ دیتے، اس کے علاج پر غور وفکر کرتے اور امت مسلمہ کو سماجی امراض سے پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں''۔

اخوان کی سیاسی سرگرمیاں

1939ء تا 1940ء کے درمیانی عرصے میں سیاسی جدوجہد میں ''اخوان'' ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس کی سیاسی سرگرمیوں میں نئی جان آئی اور دائرہ عمل میں نئی وسعت پیدا ہوئی۔ اخوان کی جدوجہد اب سہ چند ہوگئی۔ اب قاہرہ یونیورسٹی اور جامعہ الازہر کے نوجوان طلبہ کا ایک نیا گروہ شامل ہوا۔ محنت کش ور پیشہ ور طبقوں کے لوگ بھی کافی تعداد میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ کارخانوں کے مزدور، تاجر، صنعت کار، انجینیر، ڈاکٹر، مدرسین، وغیرہ۔ غرض اب ہر گروہ اور طبقے کے نمائندے شامل تھے۔ ''اخوان'' کی اقتصادی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوگئیں۔ عسکری اور ورزشی شعبوں کی طرف بھی ان کی تمام شاخیں اب پوری طرح منظم ہو چکی تھیں اور وہ ایک ایسی طاقت بن گئے جو ہر لحاظ سے قابل لحاظ سمجھی جانے لگی۔

اخوان پر مصائب کا آغاز

دریں اثنا مصری حکومت یکے بعد دیگرے مندرجہ ذیل وزرائے اعظم سنبھالتے رہے:

علی ماہر۔ حسن صبری۔ حسین سری۔ مصطفی نحاس۔ احمد ماہر۔ نقراشی۔ اسماعیل صدقی۔ نقراشی (دوسری بار)۔

علی ماہر اور حسن صبری کی وزارتوں کے دوران میں حسن البنا نے اپنے خاص رسائل، مضامین، اور خطابات میں برابر پند ونصائح، مشورے اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، وہ ہر وزیراعظم کو جنگ کی آگ سے مصر کو دور رکھنے کا مشورہ دیتے رہے۔ دوران جنگ انہوں نے اپنی حکومت پر نہ کوئی دباؤ ڈالا، نہ کوئی مشورہ دیا۔

برطانوی سفیر اور فوجی کمانڈر کے دباؤ پر حسین سری کی وزارت کے زمانے میں ''اخوان'' پر مصائب کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ان کے ہفتہ وار جریدے ''تعارف'' اور ''شجاع'' اور ماہنامہ ''المنار'' کی اشاعت سرکاری طور پر بند کر دی گئی۔ ان کی تحریروں، کتابچوں کی اشاعت وطباعت ممنوع قرار دی گئی۔ ان کا پریس بند کر دیا گیا۔ اخبارات کو تنبیہ

کر دی گئی کہ "اخوان" اور ان کی کسی سرگرمی یا شخصیت کا کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ ان کی تقریبات اور اجتماعات کو روک دیا گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ جماعت کے سرکردہ رہنماؤں کو دور دور شہروں میں ڈال دیا گیا۔ جماعت کے صدر حسن البنا کو دور جنوب کے ایک شہر قنا اور نائب صدر کو شمال کے شہر دمیاط منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں پارلیمنٹ کے مطالبے اور اصرار پر دونوں حضرات کو واپس لایا گیا۔ لیکن چند ماہ کے بعد حسن البنا کو گرفتار کیا گیا۔ اسی طرح اخوان کے جنرل سیکرٹری کو بھی۔ لیکن "اخوان المسلمین" کو اپنے صدر کی گرفتاری سے جو صدمہ پہنچا اور انقلاب کی سی ایک لہر بیدار ہوئی تو ان کے خوف سے ان دونوں کو جلد ہی رہا کر دیا گیا۔

اس تاریک دور میں مصری حکومتوں کا یہ حال تھا کہ وہ برطانوی استعمار کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھیں۔ حکومت کو قومی آزادی اور حرمت کا ذرا بھی پاس نہ تھا، کیونکہ وہ اپنے انگریز آقاؤں کو اسی طرح خوش کر سکتے تھے۔ اپنے سامراجی آقا کو خوش کرنے کے لیے ہر مصری حکومت کو اس میں ذرا بھی باک نہ تھا کہ ایسی جماعتوں کو مٹانے کے درپے رہیں، جن کا مقصد دین و وطن کی خدمت ہے۔ مخلص کارکنوں کو شہر بدر کر دیں۔ ان کو ایذا پہنچائیں۔ قید خانے ان سے بھر دیں، اور اخبارات کو ان کا نام تک لینے کی اجازت نہ ہو۔ اس سارے ظلم و ستم، دارو گیر اور قید و بند کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا یعنی دبنے اور فنا ہونے کی بجائے "تحریک اخوان" عوام کا مرکز توجہ بن گئی، اور اس جماعت کو نئے اور تازہ دم کارکن اور مددگار حاصل ہوئے۔ جب مصطفیٰ نحاس کی وزارت آئی تو حسن البنا نے اسماعیلیہ کے حلقۂ انتخاب سے پارلیمنٹ کے لیے کھڑا ہونا چاہا۔۔۔

"اخوان" کی جدوجہد کا نیا دور

نحاس پاشا کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں حسن البنا نے شہر اسماعیلیہ کے حلقۂ انتخاب سے پارلیمنٹ کے لیے کھڑا ہونا چاہا، یہ شہر اخوان کی تحریک کا گہوارہ تھا۔ انتخاب لڑنے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اخوان کی نمائندگی کرتے ہوئے پارلیمنٹ پر اثر انداز ہوں اور پارلیمنٹ کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش کریں۔ لیکن وزیر اعظم نحاس پاشا نے ان سے کہا کہ وہ کاغذات نامزدگی داخل نہ کریں۔ حسن البناء نے مصلحت کے تحت نحاس کی بات قبول کر لی۔ اس کے بدلے نحاس نے "اخوان" کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ تقریبات اور اجتماعات کی اجازت دے دی ان کے رسالے "الفتح" کا ڈیکلریشن بحال کر دیا اور ان کا پریس کھول دیا۔

اب پھر برطانوی سفارت خانے کی طرف سے دباؤ پڑا۔ اس بار اخوان کو پہلے سے بھی زیادہ سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ حکومت نے "مرکز" کے سوا ان کے تمام شعبے بند کر دیے۔ اجتماعات، مطبوعات اور دیگر سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کیں۔ "اخوان" نے حکومت کی تمام سختیوں کو بہت صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا، جس کے نتیجے میں حکومت نے بھی سختی کچھ کم کر دی۔ دونوں کے مابین صورت حال میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ کبھی حکومت ان کو چھوٹ دے دیتی تو ان کی سرگرمیاں جاری تو رہتیں لیکن نظر نہ آتیں۔ لیکن جب تک نحاس پاشا وزیر اعظم رہے، وہ برابر حسب عادت زبانی یا تحریری اخوان کو نصیحت سے نوازتے رہے۔

نحاس پاشا کی وزارت کے بعد احمد ماہر کی وزارت آئی جس نے آغاز سخت گیری کی پالیسی سے کیا۔ ''اخوان'' کے جن ارکان نے 1941ء کی اپنی جنرل کانفرنس کے فیصلے کے مطابق اسلامی نظام لانے کے عزم سے پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنا چاہا تھا، ان کو احمد ماہر کی حکومت نے اپنے ہتھکنڈوں سے ناکام کرا دیا۔

پارلیمنٹ کے اس الیکشن میں اہل اسماعیلیہ نے مصری انتخابی تاریخ میں پہلی بار اپنے مصارف خاص سے پروپیگنڈے کے لیے ساٹھ خیمے نصب کیے تھے، جو انتخابی مہم کے دوران میں پروپیگنڈے کے لیے تمام دنوں میں شہر کے مختلف حصوں میں نصب رہے۔ شہر کے ہر شخص کی زبان پر تھا کہ استاد بھاری اکثریت سے جیت جائیں گے۔ عوام محنت کش اور طلبہ سب کے نعرے استاد حسن البنا کے حق میں تھے، جن کو وہ اسلامی بیداری کی تحریک کا قائد سمجھتے تھے، لیکن مصر کی حکومت اور برطانیہ کی فوجی قیادت نے ان کو ہرانے کے لیے تمام ممکنہ وسائل و ذرائع استعمال کیے۔ اس وقت اسماعیلیہ نہر سویز کے کنارے پر برطانوی فوج کی زبردست چھاؤنی تھی جو اس علاقے کی سیاست پر بہت زیادہ اثر انداز تھی۔

استاد حسن البنا کو پارلیمنٹ میں نہ آنے دینے سے حکومت کا مقصد اول تو انگریزوں کو خوش کرنا اور دوم حکومت میں شریک ''آزاد دستور پارٹی'' کے امیدوار کو کامیاب کرانا تھا۔ برطانوی ہیڈ کوارٹر کی مزاحمت برطانوی سفارت خانے کی ہدایات کی بنا پر تھی جو ''اخوان المسلمین'' کی ایک ایک حرکت اور سرگرمی پر کڑی نظر رکھتا تھا، اور جانتا تھا کہ سامراجی مقاصد کی کامیابی کے لیے وہ ایک زبردست خطرہ ہیں۔ چنانچہ انگریز فوجیوں کی ٹولیاں کھلے بندوں ''اخوان'' کے مخالف امیدواروں کے لیے کام کر رہی تھیں، جو ووٹروں کو پولنگ سٹیشن پہنچاتیں اور ہزاروں مزدوروں کو دور دراز کے علاقوں سے فوجی ٹرکوں میں لاتی تھیں، جن کا انتخابی حلقوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دباؤ، دہشت انگیزی، جھوٹے وعدوں اور دھمکیوں کے باوجود حسن البنا اپنے مخالف پر کامیاب ہوئے۔ لیکن حکومت نے ووٹوں میں جعلی ووٹوں کے فرق کا بہانہ بنا کر محض استاد حسن البنا کو ہرانے کے لیے دوبارہ انتخاب کرایا۔ اس مرتبہ برطانوی فوجی علاقے سینا کے انگریز فوجی گورنر نے ''اخوان'' کے نمائندوں کو شہر عریش اور سینا کی انتخابی کمیٹیوں سے الگ کر دیا۔ فوجی گاڑیوں نے دور و نزدیک کی چھاؤنیوں سے مزدوروں کو لانے میں زیادہ سرگرمی سے کام لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کمیٹیوں میں مخالف امیدوار کے حق میں پڑنے والے ووٹوں کی تعداد دونوں امیدواروں کے مجموعی ووٹوں کی تعداد سے بھی کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ اس کھلی دھاندلی سے استاد حسن البنا اور دوسرے تمام اخوانی امیدوار اس دوسرے الیکشن میں بھی ہار گئے۔ ''اخوان'' نے الیکشن لڑنے کی یہ ساری جدوجہد اس مقصد کے پیش نظر کی تھی کہ پارلیمنٹ میں داخل ہو کر، ارکان پارلیمنٹ پر اثر انداز ہو کر اسلامی نظام کے قیام کی راہ ہموار کی جا سکے۔

جنگ عظیم کے دوران

پھر جب وزیراعظم احمد ماہر نے جرمنی اور اٹلی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو ''اخوان'' نے اپنی پالیسی کے تحت اس کی مخالفت کی، اور اپنی تحریروں کے ذریعے وزیراعظم کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں ''عیسوی'' نامی ایک شخص نے اچانک وزیراعظم کو قتل کر دیا۔

حسن البنا اور ان کی جماعت ''اخوان المسلمین'' کا ایک ہی مطالبہ تھا، یعنی اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی قوانین کا نفاذ۔ انہوں نے کہا کہ پچاس سال سے مصر میں غیر اسلامی آئین آزمائے جا رہے ہیں اور وہ سخت ناکام ہو چکے ہیں، لہٰذا اب اسلامی شریعت کا تجربہ کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مصر کے موجودہ دستور اور قانون کے ماخذ کتاب و سنت نہیں، بلکہ یورپ کے دستور اور قوانین ہیں جو اسلام سے متصادم ہیں۔ حسن البنا نے مصریوں میں جہاد کی روح پھونکی اور جہاد کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور بتایا کہ مصر ہی کے ایک عالم امام بدرالدین عینی شارح بخاری ایک سال جہاد کرتے تھے، ایک سال تعلیم و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور ایک سال حج کرتے تھے۔

احمد ماہر کے قتل کا الزام حسن البنا اور ''اخوان'' پر عائد ہوا۔ چنانچہ نئے وزیر اعظم نقراشی نے اپنی حکومت کا افتتاح ''اخوان'' کے صدر اور ان کے جنرل سیکرٹری اور سرکردہ اخوان رہنماؤں کی گرفتاری سے کیا۔ ان پر تہمت لگائی گئی کہ وہ احمد ماہر کے قتل میں براہ راست ملوث ہیں۔ اس گرفتاری کا اصل سبب غالباً یہ تھا کہ عیسوی نے پولیس کو بیان دیتے وقت یہ کہا تھا کہ وہ اعلانِ جنگ کے بارے میں ملک کے لیڈروں کی رائے لینا چاہتا تھا اور جن لیڈروں کے نام اس نے پولیس کو بتائے تھے، ان میں حسن البنا کا نام بھی شامل تھا، لیکن پولیس نے تفتیش کے بعد حسن البنا کو رہا کر دیا، جیل سے باہر آتے ہی ''مرشد'' احمد ماہر مقتول کی تعزیت کے لیے نقراشی کے پاس گئے اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ ''اخوان'' پر سے پابندیاں ہٹائی جائیں اور انہیں کام کرنے کی اجازت دی جائے مگر نقراشی نے ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا، بلکہ ان کی سرگرمیوں، جلسوں، تقریبات حتیٰ کہ گھروں کی بھی نگرانی زیادہ سخت کر دی۔ بعض اوقات حکومت حالات کے دباؤ میں مجبور ہو کر ان کو جلسوں اور کانفرنسوں کی اجازت دے دیتی تھی، لیکن جلد ہی پھر سختی اور ایذا رسانی کی پالیسیوں پر عمل درآمد شروع ہو جاتا تھا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد

دوسری جنگ عظیم کے آغاز (1939ء) تک ''اخوان'' کی دعوت مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر مسلم ملکوں میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ لیکن ''اخوان'' کا سب سے مضبوط مرکز مصر ہی تھا۔ 1945ء میں جنگ کے خاتمے کے بعد ''اخوان'' نے عوامی سطح پر سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں حکومت نے بھی اپنی نگاہیں زیادہ تنگ کر لیں۔ اب ''اخوان'' کے سخت ترین دورِ ابتلا کا آغاز ہوا، کیونکہ انہوں نے قومی تحریک کی قیادت کی تھی اور ملک کے حقوق مکمل طور پر حاصل کرنے کے لیے وطنی شعور کو بیدار کیا تھا، جس کا انگریزوں نے دوران جنگ وعدہ بھی کیا تھا کہ جیسے ہی جنگ ختم ہوگی اور صلح کا اعلان ہوگا، مصریوں کو ان کے حقوق دیئے جائیں گے۔

8 ستمبر 1945ء کو اخوان کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ جماعت کے بنیادی نظام میں بعض ترامیم کی گئیں، جس سے جماعت کے وسیع تر مقاصد اور وسائل کی وضاحت ہوگئی۔ انہوں نے مختلف قسم کی تجارتی کمپنیاں قائم کیں، جن سے جماعت کو بہت مالی فوائد حاصل ہوئے اور جب مالی فوائد کے اثرات محنت کش طبقوں میں پہنچے، تو وہ بھی ''اخوان'' میں شامل ہونے لگے۔ ایک یومیہ اخبار نکالا گیا جس کا پہلا شمارہ 5 مئی 1945ء کو شائع ہوا۔ اس طرح

ان کی آواز مصر اور دیگر عرب ملکوں میں سنی جانے لگی۔ فوجی تربیتی دستے قائم ہوئے اور فوجی تربیت کے لیے مراکز قائم کیے گئے۔ یوں اب "اخوان المسلمین" محض ایک دینی و مذہبی جماعت نہیں رہی۔ حسن البنا کی نظر مصر و عرب سے برطانوی استعمار کے اخراج اور پوری امت مسلمہ کو ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا تھی۔ "اخوان" کے نئے مربوط نظام کے تحت ارکان کو مختلف قسم کے کام تفویض کیے گئے۔ "امیر شعبہ" کے واسطے سے "مرشد" (حسن البنا) کی بیعت کر کے انہوں نے اپنے وعدہ پیمان کو پختہ کیا اور ہر اچھے برے وقت میں اطاعت کا عہد کیا۔ امیر اعلیٰ (مرشد عام) پر پورے اعتماد کا اظہار کیا، اور "مرشد عام" کا منصب تاحیات ان کے لیے مامور ہوا، یعنی نہ تو وہ خود اس منصب کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ "مجلس تاسیس" کے فیصلے کے بغیر ان کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

اخوان کی توسیع

صرف مصر میں "اخوان المسلمین" کے باضابطہ ارکان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ منسوب ارکان اور ہمدردوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ مصر میں اخوان کے شعبوں (شاخوں) کی تعداد دو ہزار اور سوڈان میں پچاس شعبے تھے۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی شعبے قائم تھے، اور ہمدردوں اور مخلصین کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ مخالفین بھی "اخوان" کے خلوص اور وفا پیشگی سے متاثر تھے۔ اسی طرح موید ین بھی جو تمام اسلامی ملکوں اور یورپ اور امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جماعت کی یہ حیرت انگیز توسیع اور گہری تنظیم، یہ چیزیں ایسی تھیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد آنے والی مصری حکومتوں کی طرف سے اس کے مقابلے اور اس پر زیادہ سختیوں کا سبب بنیں۔

مرشد عام حسن البنا نے دوسری بار وزیر اعظم نقراشی پاشا سے ملاقات کی اور اس سے مطالبہ کیا کہ قومی حقوق کے حصول اور وادیٔ نیل (مصر و سوڈان) کی آزادی واتحاد کے لیے موثر اقدام کرے، ورنہ یہ کام قوم کے لیے چھوڑ دے۔ نقراشی نے حسن البنا کے اس مطالبہ کے ضمن میں ایک مکتوب حکومت برطانیہ کو بھیجا، جس کا جواب بھی آ گیا۔ اخوان کو برطانیہ اور مصر کے درمیان خط و کتابت کا یہ سلسلہ پسند نہیں آیا۔ چنانچہ اخوانی طلبہ نے ایک احتجاجی مظاہرہ کیا جس میں "عباس پل" کے حادثے میں پولیس کے ساتھ مظاہرین کا معرکہ پیش آیا۔ (دریائے نیل قاہرہ کے وسط سے گزرتا ہے، جس پر متعدد بڑے بڑے پل دوسری طرف جانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک پل کا نام "کوبری عباس" ہے) اس خون ریز معرکہ آرائی کے نتیجے میں نقراشی کی وزارت مستعفی ہو گئی۔

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد "اخوان" کی حکمت عملی یہ تھی کہ قوم کا سیاسی شعور بیدار کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے عام جلسوں، تقریروں، کتابچوں، دیہات اور قصبوں کے سفر وغیرہ، تمام وسائل استعمال کیے اور حزب اختلاف کی باگ ڈور سنبھالی۔ اخوان جو پہلے سے برطانوی استعمار کے خلاف طاقت کے استعمال کی داعی تھی، اس وقت اس کی تمام سعی وجد و جہد اس مقصد کے لیے تھی، اور یہ بھی اس امید کے ساتھ کہ مصر مکمل آزادی حاصل کر لے۔ اسماعیل صدقی کی وزارت آئی تو مظاہرے زیادہ وسیع اور پر جوش ہو گئے۔ حسن البنا نے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو ایک "قومی کونسل" کی تشکیل کے لیے دعوت دی، تاکہ تمام قومی طاقتوں کو متحد و یکجا کیا جا سکے۔ لیکن سیاسی جماعتوں نے ان کی آواز پر لبیک نہیں کہا۔ اب انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ وزیر اعظم صدقی کو توجہ دلائیں کہ برطانیہ سے بے

نتیجہ گفتگو کا سلسلہ ختم کیا جائے اور علانیہ جہاد کا آغاز کیا جائے۔

''اخوان'' کی سرگرمیاں اس طریقے پر روز افزوں تھیں۔حکومت کے شعبوں میں ان کی گرفت مضبوط ہونے لگی۔ان کی طرف سے حکومت پر الزام لگایا گیا کہ وہ مصر اور اہل مصر کے حقوق سے چشم پوشی کرتے ہوئے، برطانیہ سے مصالحت بلکہ خوشامد اور چاپلوسی کا معاملہ اس حد تک برت رہی ہے کہ مصری حکومت کو برطانیہ کا ایجنٹ کہا جا سکتا ہے۔حکومت نے ایسی غیر سرکاری کمپنیاں اور ادارے قائم کیے ہیں جو در پردہ انگریزوں کی ملکیت ہیں۔محنت کش طبقوں کی بے روزگاری کا کوئی حل حکومت نہیں نکال سکتی۔وہ برطانیہ سے خواہ مخواہ کے مذاکرات ختم کرنے اور جہاد کا اعلان کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہی ہے۔حکومت نے اس الزام کا جواب یوں دیا کہ بہت سے ''اخوان'' کو گرفتار کیا۔ان کے گھروں پر حملے کرائے گئے۔ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ان کا اخبار اور پریس بند کر دیا گیا۔ان کے نائب امیر کو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا۔اخوان کی طرف سے بھی حملے کا دوبدو جواب دیا گیا۔قاہرہ اور اسکندریہ میں دستی بم پھٹے۔امن وامان تباہ ہوا۔حکومت نے ''اخوان'' کے گھروں کا محاصرہ کر لیا۔خانہ تلاشی کی گئی۔صدقی حکومت نے بڑے پیمانے پر ''دفتری کارروائی'' کا آغاز کیا،یعنی سرکاری محکموں میں جتنے اچھے اچھے خوانی ذمہ دار ملازمین تھے،ان کا ملک کے دور دراز دیہی علاقوں میں تبادلہ کر دیا۔

حسن البناء کی شہادت

وزیراعظم صدقی کے استعفیٰ کے بعد 10 دسمبر 1946ء کو نقراشی کی وزارت بنی۔اسی روز حسن البناء نے ایک مضمون شائع کیا جس میں نئی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ قوم کے لیے آسانیاں پیدا کرے، راستہ مختصر کرے، قوم کی خواہش کا لحاظ کرے اور سمجھوتے کی بات چیت ختم کر کے جہاد کا راستہ اختیار کرے۔اس کے بعد وہ مسلسل اخبار میں مضامین کے ذریعے دباؤ ڈالتے رہے، جن میں یہ بتاتے ہوئے کہ حکومت نے اخوان کے استیصال کی کوشش کی، ان کے اسکول بند کر دیئے،ان کے آزاد کارکنوں کو قید کیا اور ہر طرح ان پر زندگی وحرکت کا میدان تنگ کیا،اس کے طرزِ عمل پر کڑی تنقید کی۔نقراشی اور اخوان کے مابین جنگ کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔فلسطین کے مسئلے نے اسے اور بڑھا دیا، جس میں اخوان نے سرگرمی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا،جو ایک طرف تو ان کی طاقت کی آزمائش اور کسوٹی ثابت ہوا اور دوسری طرف ان کے رسوخ اور مصر وعرب ممالک میں عزت ومقبولیت کا سبب بنا۔فلسطین کی جنگ میں اخوان عرب لیگ کی رہنمائی میں شریک ہوئے۔اس عسکری اشتراک نے ان کو جنگی مشق اور تربیت کا موقع دیا،اور ساتھ ہی اس سے ان کی عسکری استعداد اور اثر پذیری کا بھی اندازہ ہوا۔

وزیراعظم نقراشی کو ان کی طاقت سے خطرہ لاحق ہوا۔اس نے اندرون ملک واقع ہونے والے بعض حوادث و واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الزام لگایا کہ ان میں اخوان کا ہاتھ ہے،اور وہ ہر قیمت پر خونین انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔اسی بہانے سے نقراشی نے 8 دسمبر 1948ء کو ایک فوجی حکم جاری کیا،جس کی رو سے اخوان المسلمین اور اس کی تمام شاخوں کو، جہاں جہاں بھی وہ تھیں، ناجائز قرار دیا گیا۔ان کی عملی سرگرمیوں کے تمام مراکز بند کر دیئے

گئے اور جماعت کے تمام کاغذات، دستاویزات، عہد نامے، رسالے، مطبوعات، رقوم، بینک اکاؤنٹ، املاک اور تمام مملوکہ اشیاء پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس فوجی حکم کے بعد اور بھی کئی فوجی احکام صادر ہوئے، جن کی رو سے جماعت کی تجارتی کمپنیوں اور کمرشل اداروں کے حسابات منجمد کرنے اور جماعت کا سرمایہ قبضہ میں لے لینے کا حکم ہوا، جس کو ''وزیر امور عامہ'' اپنی صوابدید کے مطابق پبلک کاموں میں صرف کرنے لگا۔ حسن البناء نے چاہا کہ ان کو ذرا سا موقع دیا جائے، تاکہ وہ صورت حال کو ہموار کرنے کی کوشش کریں، لیکن نقراشی اور اس کی حکومت کی طرف سے اس پر مطلق توجہ کا اظہار نہیں کیا گیا، یہاں تک کہ نقراشی کے قتل نے اس قسم کی کوششوں کا دروازہ بند کر دیا (قتل 28 دسمبر 1948ء کو ہوا تھا)۔ اس قتل کا الزام بھی اخوان پر عائد کیا گیا اور اس طرح حکومت اور ان کے مابین کشمکش مزید بڑھ گئی۔

اخوان کے نام حسن البناء کا پیغام

حسن البناء نے ان تمام مصائب و ابتلا کی پیش گوئی کی تھی، اور وہ اکثر اس کو اس طرح بیان کیا کرتے تھے، جیسے یہ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتے رہتے تھے کہ دعوت و اصلاح کے علم برداروں کی یہ ایک ضروری منزل ہے، جس پر سے ہو کر ہمیشہ انہیں گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ سابقہ انبیاء و مجاہدین کی مثالیں پیش کرتے تھے، اور اس بات پر انہیں کچھ ایسا یقین تھا کہ گویا یہ ان کا محکم عقیدہ تھا، جس کو انہوں نے اپنے رسالے میں اخوان کے لیے ثبت کر دیا تھا۔

حسن البناء نے اخوان کے نام تحریر کیا: ''میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری دعوت کو اب تک بہت سے لوگ نہیں پہچانتے ہیں۔ جس دن وہ اس کو پہچان لیں گے اور اس کے اغراض و مقاصد کو پا لیں گے، تمہیں ان کی طرف سے سخت عداوت و خصومت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تمہیں زبردست دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ یہی وہ وقت ہوگا جب تم اہل دعوت کے راستے پر گامزن ہو گے۔ ابھی تک تو تم غیر معروف ہو اور دعوت کے لیے میدان ہموار کر رہے ہو اور وہ جس جدوجہد، سعی و قربانی کی طالب ہے، اس کی تیاری کر رہے ہو۔ اسلام کی حقیقت سے قوم کی ناواقفیت تمہارے لیے سنگ راہ بنے گی اور بہت سے سرکاری علمائے دین کی طرف سے تمہارے فہم اسلام پر تعجب کا اظہار کیا جائے گا۔ دعوت دین کی راہ میں تمہارے طریق کار پر وہ لوگ عتاب کی نگاہ ڈالیں گے۔ زعماء، قائدین اور اہل اقتدار و رسوخ تم سے حسد کریں گے۔ تمام حکومتیں یکساں تمہاری مزاحمت کریں گی اور ہر حکومت چاہے گی کہ تمہاری سرگرمیوں کو بند کر دے اور تمہارے راستے میں کانٹے بچھائے۔ غیر ملکی لٹیرے (انگریز) ہر طریقے سے تمہارا مقابلہ کریں گے۔ تمہاری دعوت کے نور کو بجھانے کی کوشش کریں گے، اور اس کے لیے وہ کمزور حکومتوں اور پست اخلاق لیڈروں سے مدد لیں گے۔ ان ہاتھوں کو استعمال کریں گے جو ان کی طرف بھیک اور تمہاری طرف جور و تعدی کے لیے پھیلے ہوں گے، اور کوشش کریں گے کہ ہر برائی اور عیب تم پر چسپاں کریں۔ اپنی قوت و اثر اور دولت و حکومت کے ذریعے وہ تمہاری دعوت لوگوں کے سامنے انتہائی ہولناک صورت میں پیش کریں گے۔ یہی وہ وقت ہوگا کہ جب تم آزمائش و امتحان کے دور میں داخل ہو گے۔ تمہاری گرفتاریاں عمل میں آئیں گی۔ تم جیل میں ڈالے جاؤ گے۔

تمہارے تبادلے کئے جائیں گے۔ دور دراز کے علاقوں میں پھینکے جاؤ گے۔ تمہارے وسائل ثروت و راحت کو ضبط کیا جائے گا۔ تمہارے گھروں کی تلاشیاں لی جائیں گی۔ ممکن ہے کہ اس ابتلاء کی مدت طویل ہو:

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ٥ (العنکبوت)

"کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ چھوٹ جائیں گے صرف اتنا کہہ کر کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے"۔

یہ تحریر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے حسن البناء کو الہام ہوا ہو اور وہ غیب کی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ جماعت کے ناجائز اور غیر قانونی قرار دیئے جانے کے بعد وہ سب کچھ پیش آیا جو دوسری جنگ عظیم سے کئی سال پہلے اخوان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔ اس حقیقت کو "ابتلا" سے پہلے بار بار دہراتے رہے، تاکہ اخوان اس کو حوصلے سے برداشت کرنے کے لیے تیار رہیں، اور اچانک ان خوفناک حقائق و وسائل سے دوچار نہ ہوں، جنہوں نے "ہسپانوی احتسابی عدالتوں" کی یاد ذہنوں میں تازہ کر دی۔ حسن البناء کی تمام پیشین گوئیاں، حتی کہ انہوں نے جو خود پرستی پرست دین دار طبقے کے حق میں کی تھیں، صحیح ثابت ہوئیں۔ واقعات نے بتایا کہ اس طبقہ علماء میں سے بعض نے رضا کارانہ طور پر تقریریں نشر کیں، اور حکومت کی اخوان کش پالیسی کی پوری پوری تائید کی۔ اس کے لیے انہوں نے ہمیشہ آیات قرآنی کا استعمال کیا۔ مثلاً سورۃ المائدہ کی آیت 33:

انما جزوا الذین یحاربون اللہ ورسولہ و یسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا و یصلبوا او تقطع ایدیھم و ارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض۔۔۔۔ط

"جو لوگ اللہ اور رسول سے جنگ کرتے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں برعکس کاٹے جائیں یا ان کو جلا وطن کیا جائے"۔

یہ آیت طرہ کے جیل خانے اور دیگر تمام جیل خانوں کی دیواروں پر ان جیلوں کے ناظمین کی جانب سے لکھ کر آویزاں کی گئی تاکہ تمام اخوان اس کو پڑھیں۔ بار بار پڑھیں۔ اب اس سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اخوان جن کا نعرہ تھا:

للہ غایتنا و الرسول زعیمنا

"اللہ ہمارا مقصد، رسول ہمارا قائد"

ان کو اس طرح کی آیت سے کس طرح برانگیختہ کیا جاتا تھا، اور یہ اتہام لگا کر کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، ایک نفسیاتی خلش میں مبتلا کیا جاتا تھا۔

ابراہیم عبدالہادی کی وزارت میں سب کچھ ہوتا رہا جو نقراشی کے بعد برسر اقتدار آئی تھی۔ اس شخص کی یہ کوشش رہی کہ اپنے پیشرو (یعنی نقراشی) کا انتقام پوری جماعت اور اس کے ایک ایک رکن سے گویا شخصی طور پر لے۔ اپنی اس سفاکانہ مہم میں اس نے اس افواہ سے مزید مدد لی کہ بادشاہ سے جماعت کی بگڑی ہوئی ہے اور وہ

انقلابی مقاصد رکھتی ہے۔ اس عہد حکومت میں جو بدترین حادثہ پیش آیا، وہ حسن البناء کا قتل تھا۔ اس سے پہلے مرحوم سے وہ تمام ہتھیار، جن کے لائسنس ان کے پاس تھے، لے لیے گئے تھے۔ ان کا ملک سے باہر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت کی اجازت کے بغیر اندرون ملک بھی نقل و حرکت کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ جب حسن البناء نے حکومت کو اطلاع پہنچائی کہ وہ قصبہ طنطا میں اپنے ایک اخوانی رفیق کے ہاں جانا چاہتے ہیں تو اس رفیق کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ان کے قتل سے پندرہ روز پہلے کا واقعہ ہے۔

حسن البناء کی شہادت

جمعیۃ الشبان المسلمین (ینگ مین مسلم ایسوی ایشن) کی مجلس عاملہ کے رکن ذکی علی نے ''جمعیۃ الشبان'' کے صدر محمد لیثی سے کہا کہ وہ استاد حسن البناء کو جا کر یہ پیغام پہنچا دیں کہ 12 فروری 1949ء بروز ہفتہ شام وہ مجھ سے یہاں ''ایسوی ایشن'' کے دفتر میں ملاقات کریں تاکہ ان کو جماعت اخوان المسلمین کے حل طلب مسائل سے متعلق بعض اہم اور خوش کن فیصلوں کی اطلاع دی جا سکے۔ جس کے لیے ان (ذکی علی) کے عزیز وزیر اعظم ابراہیم عبدالہادی نے انہیں ذمہ دار بنایا ہے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت محمد لیثی نے حسن البناء کے گھر جا کر یہ خبر ان کو پہنچا دی۔

حسن البناء نے ان سے کہا ''ان لوگوں کی نیتیں ٹھیک نہیں، اور وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اس بے چارے بوڑھے شخص کو گرفتار کر لیا ہے، جس کے متعلق میں نے حکومت کو اطلاع دی تھی کہ ایک دو روز میں ان سے ملنے طنطا جاؤں گا۔ بہر حال میں استاد ذکی علی سے ملاقات کے لیے آؤں گا''۔

وقت مقررہ پر موصوف ملنے گئے۔ ملاقات کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، سوائے اس مطالبے کے کہ ہتھیار اور ریڈیو ٹرانسمیٹر حکومت کے حوالے کر دیے جائیں۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ حسن البناء باہر آئے اور ٹیکسی میں بیٹھے۔ ان کے ساتھ ان کے داماد عبدالکریم منصور ایڈووکیٹ بھی تھے۔ محمد لیثی ٹیکسی تک ان کو چھوڑنے کے لیے آئے۔ ایسوی ایشن کا ایک ملازم آیا اور اس نے لیثی سے کہا ''انہیں کوئی ٹیلی فون پر بلا رہا ہے''۔

حسن البناء اور ان کے داماد کو ٹیکسی پر سوار کرانے کے بعد محمد لیثی ٹیلی فون پر آئے ہی تھے کہ انہوں نے فائر کی آواز سنی۔ ٹیلی فون چھوڑ کر وہ فوراً باہر آئے اور دیکھا کہ ایسوی ایشن کی عمارت کے سامنے ایک دراز قد دبلا پتلا شخص جبہ (لمبا کرتا) اور سفید ٹوپی میں کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ یہ دیکھ کر لیثی نے ''پکڑو، پکڑو'' کا شور مچایا۔ نوجوان نے ایک فائر ان پر بھی کیا جو نشانہ خطا گیا۔ پھر وہ لیثی کے پیچھے سڑک پر دوڑا اور دو اور فائر کیے وہ بھی خطا گئے۔ اب جب اس کے پاس گولیاں ختم ہو گئیں تو وہ سامنے کی فٹ پاتھ کی طرف لپکا، جہاں ایک شخص اس سے آ کر مل گیا اور وہ دونوں ایک سیاہ موٹر میں بیٹھ کر ''شارع الملکہ'' (کوئین روڈ) پر روانہ ہو گئے۔ اس اثناء میں استاد البناء ٹیکسی سے اتر کر ایسوی ایشن آ چکے تھے، اور ان کی زبان پر ''مارڈالا، مارڈالا'' کے الفاظ تھے۔ اس وقت محمد لیثی واپس ایسوی ایشن میں آئے اور انہوں نے دیکھا کہ ٹیلی فون کا ریسیور اب تک اٹھا ہوا ہے، ٹیلی فون پر بات کرنے سے معلوم ہوا کہ بات کرنے والا کیپٹن محمد جزار (افسر سی آئی ڈی) ہے۔ محمد لیثی ٹیلی فون پر چلا کر کہنے لگے کہ استاد البناء پر ایسوی ایشن کے سامنے گولی چلائی گئی۔

کیپٹن جزار نے پوچھا: ''وہ مر گئے یا اب تک زندہ ہیں؟''

دریں اثناء حسن البناء کو قریبی ہسپتال ''دارالاسعاف'' پہنچایا گیا۔ محمد لیثی بھی ہسپتال پہنچے۔ یہاں انہوں نے البناء کو کلمہ شہادت پڑھتے پایا۔ وہیں انہوں نے ایک گندمی رنگ کے نوجوان کو بھی دیکھا جو جلباب اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھا، اور بس پر وہ موٹر پر قاتل بھاگے تھے، اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے موٹر کے نمبر لے لیے تھے یعنی 9979۔ محکمہ ٹریفک میں تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ مذکورہ موٹر لیفٹیننٹ کرنل محمود عبدالحمید کی ہے، جو اس وقت سی آئی ڈی (خفیہ پولیس) کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ بعد میں کیپٹن جزار نے روپے، شراب، جنس لطیف اور آخر میں دھمکی اور تخویف کے ذریعے کوشش کی کہ گواہ کو موٹر کا نمبر بدلنے پر آمادہ کرے۔ اس نے یہاں تک کہا: ''یاد رکھو! حسن البناء کا قاتل آزاد ہے اور وہ ہمیشہ آزاد رہے گا۔ اسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ جو شخص بھی اس کی راہ میں آئے گا، اس کو وہ جان سے مار ڈالے گا یا اسے کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اپنے بچوں کو یتیم کرنا تجھ پر حرام ہے''۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ حسن البناء کے قاتل آزادانہ گھومتے رہے، یہاں تک کہ 23 جولائی 1952ء کا فوجی انقلاب پیش آیا اور ان سب کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں لیفٹیننٹ کرنل محمود عبدالمجید، لیفٹیننٹ کرنل احمد کامل، کرنل حسین کامل، حوالدار عبدہ ا منیوس، بادشاہ کا خادم خاص محمد حسن، کیپٹن محمد جزار، حوالدار محمد محفوظ (اس موٹر کا ڈرائیور جس پر قاتل بھاگے تھے، امحسین حماد، محمد سعید، مصطفیٰ محمد ابواللیل غریب اور لانس نائیک حسین محمد بن رضوان شامل تھے۔

شہادت سے چند روز پہلے حسن البناء شہید نے ڈپٹی ہوم منسٹر عبدالرحمٰن عمار کی ایک سرکاری یادداشت جس میں اخوان کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دینے کی سفارش کی گئی تھی، کا جواب دیتے ہوئے حکومت کی جانب سے اخوان کو ناجائز قرار دیے جانے کے اسباب بیان کئے گئے تھے۔ شہید کی آخری تقریر تھی۔

1952ء کا فوجی انقلاب اور اخوان المسلمین

شہادت سے چند روز پہلے حسن البناء شہید نے ڈپٹی ہوم منسٹر عبدالرحمٰن عمار کی ایک سرکاری یادداشت (جس میں اخوان المسلمین کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دینے کی سفارش کی گئی تھی) کا جواب دیتے ہوئے حکومت کی جانب سے اخوان کو ناجائز قرار دیے جانے کے اسباب و وجوہ بیان کیے تھے۔ شہید کی یہ آخری تقریر تھی، جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

اخوان دشمنی کا سب سے بڑا سبب غیر ملکی دباؤ ہے۔ ڈپٹی ہوم منسٹر نے مجھ سے خود اس کا اقرار کیا کہ برطانیہ، امریکا اور فرانس کی جانب سے 6 دسمبر 1948ء کے اجتماع کے بعد ایک یادداشت نقراشی پاشا وزیراعظم کو پیش کی گئی، جس میں انہوں نے فوراً اخوان المسلمین پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔ سامراجی حکومتوں کی جانب سے اس قسم کا مطالبہ ایک فطرتی امر تھا، جو وادی نیل، بلاد عرب اور اسلامی ممالک سے متعلق سرکاری مطالبے کی سی تھی، جو ہر برطانوی سفیر کی طرف سے تمام موقعوں پر ہر نمائندہ حکومت سے کیا جاتا رہا، اور کسی حکومت نے اس کا کوئی عملی جواب، حتیٰ کہ سخت ترین وقتوں میں بھی نہیں دیا تھا۔ برطانوی سفارت خانے نے نحاس پاشا (وزیراعظم) سے

1942ء میں، جب کہ جنگ عظیم دوم چھڑی ہوئی تھی، اور جرمنی مصر کے دروازوں پر تھا، مطالبہ کیا تھا کہ اخوان کو ناجائز قرار دے دیا جائے اور اس کی سرگرمیوں کو روک دیا جائے تو انہوں نے اس مطالبے کو لبیک نہیں کہا تھا۔ البتہ اتنا کہ ایک معینہ مدت کے لیے اخوان کی اندرون ملک شاخوں کو بند تو کر دیا تھا، لیکن "مرکز" اپنا کام کرتا رہا۔

نقراشی پاشا یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس طرح کے مطالبے کو رد کر دے، اور اخوان سے کوئی مزید سمجھوتہ کر لے جو فریقین کے لیے اطمینان بخش ہو۔ اخوان حسن البناء کے سفر حجاز سے واپسی پر پوری طرح سمجھوتے کے لیے تیار تھے، لیکن اسے اس کی توفیق نہ ہوئی اور اس نے مذکورہ بالا جارحانہ اقدام کیا، جس سے ثابت ہوا کہ مصر اب تک مصریوں سے زیادہ اغیار کا ہے اور اس دیار میں ہنوز اغیار ہی کا نفوذ و اقتدار ہے۔ اس کے بعد حسن البناء حالات و اسباب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ سب کچھ بین الاقوامی یہودی تحریک، عالمی کمیونزم، سامراجی حکومتوں اور الحاد و بے دینی کے علم برداروں کی کارکردگی ہے کہ یہ لوگ اخوان اور ان کی تحریک کو اپنے ناپاک اغراض کی راہ میں زبردست رکاوٹ سمجھتے ہیں"۔

ایک صحافی نے پوچھا: "اخوان کو ناجائز قرار دیئے جانے کے اصل اسباب کیا ہیں؟"۔ اس کے جواب میں حسن البناء نے کہا: "یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جماعت بندی کے عوامل بھی اس کے اسباب تھے جو پارلیمنٹ کا الیکشن قریب ہونے کے سبب نمودار ہو رہے تھے، کیونکہ یہ بات مشہور تھی کہ "سعد پارٹی" پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنا چاہتی ہے، تاکہ آئندہ اس کی حکومت برقرار رہے، اور یہ بات بھی مشہور تھی کہ اخوان عوامی حمایت رکھتے ہیں، جو حکومت کی جارحانہ پالیسی کا پامردی سے مقابلہ کرے گی اور کسی طرح اثرات سے عوام کو متاثر نہ ہونے دے گی۔ لہذا جماعتی سیاسی پیش بندی کا تقاضا ہے کہ اس طرح کے اقدام سے ان کو بدنام کیا جائے اور ان کی پوزیشن کمزور کی جائے، اور یہ بھی ضروری تھا کہ دوسرے موثرات کو صورتِ حال پر اثر انداز نہ ہونے دیا جائے اور الیکشن کی تاریخ یعنی اکتوبر 1949ء سے پہلے یہ چال چلی جائے"۔

آنے والے وقت نے اس خیال کی پوری پوری تائید کی۔ چنانچہ 24 فروری 1949ء کو حسن البناء کے قتل کے چند روز بعد ہی "رھوڈس کے صلح نامے" پر دستخط ہونے کا اعلان کیا گیا اور فلسطین سے مصری فوج کو واپس بلا لیا گیا۔

عبدالہادی کی وزارت تقریباً سات ماہ تک قائم رہی۔ اس مدت میں اخوان پر مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ بعض مصرین کو یہ خیال ہو گیا کہ اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آزمائش و ابتلائے عظیم نے ان کے لیے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اس نے اخوان کو تپا کر کندن کر دیا۔ ناقابل، نااہل اور کمزور افراد جماعت سے باہر نکل گئے اور بھاری اکثریت، جس کو ابتلاء و مصائب نے قوی تر اور راسخ تر بنا دیا تھا، دعوت مسلسل پر برقرار رہی۔ اخوان نے اس درمیانی مدت میں خفیہ طور پر نئے مرشد (صدر) کا انتخاب کر لیا تھا اور ان کی تحریک خفیہ کام کرتی رہی۔

25 جولائی 1949ء کو ابراہیم عبدالہادی کی وزارت مستعفی ہوئی اور حسن سری کی مشترک و متحدہ (کولیشن) وزارت قائم ہوئی۔ اس نے بعد کو غیر جانب دار وزارت کی شکل اختیار کر لی، اور اسی کی نگرانی میں الیکشن ہوئے جس میں وفد پارٹی کو اخوان کی تائید کی وجہ سے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور جنوری 1950ء میں نحاس پاشا نے وزارت سنبھالی اور اخوان پر سے آہستہ آہستہ ظلم وستم کا کابوس ہٹنا شروع ہوا۔ ان کے قلم پھر حرکت میں آئے اور ان کے اخبار و رسائل از سر نو زندہ ہوئے اور انہوں نے جناب حسن الہضیبی کو اپنا مرشد عام (صدر یا امیر جماعت) منتخب کیا، جو سپریم کورٹ کے سابق جج تھے۔

15 دسمبر 1950ء کو حکومت نے اخوان کی بعض املاک واپس کیں جن میں ان کا مرکز، دارالاشاعت، پریس اور دیگر شاخوں کے مراکز شامل تھے۔ یہ سب کچھ سپریم کورٹ کے فیصلے کی بنا پر عمل میں آیا جو اخوان کے ساتھ انصاف میں ایک اہم اور تاریخی فیصلہ تھا، جس کی رو سے فیصلہ کیا گیا کہ اخوان کو خلاف قانون قرار دیئے جانے کا حکم سراسر غلط تھا۔ چنانچہ اخوان نے اپنا گزشتہ مقام و وقار حاصل کر لیا۔

اکتوبر 1951ء میں مصر و برطانیہ کے مابین جنگ نے نازک صورت حال اختیار کر لی۔ اخوان کے رضا کار دستوں نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا، حتیٰ کہ وفد پارٹی کی حکومت نے اپنی شکست سے ایک روز قبل اس بنیاد پر اخوان سے بات چیت کی کہ جملہ رضا کاروں کی مکمل نگرانی و کمانڈ حکومت کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ یہ خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں سرکاری طور پر شائع کرائی گئی۔

احمد نجیب الہلالی کی وزارت میں اخوان نے خود کو بہت محتاط رکھا، اور بالخصوص داخلی سیاست میں انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ الیکشن میں شریک نہیں ہوں گے۔ ہلالی سے قبل علی ماہر پاشا کی مختصر اور پھر دوبارہ ہلالی کی وزارت دونوں نے اخوان کے ساتھ ایک نیا طرز عمل اور پالیسی اختیار کی۔ علی ماہر نے تو اخوان کے مرشد عام سے مشورہ بھی لیا اور دیگر لیڈروں کے ساتھ ان سے ملاقات بھی کی۔ ہلالی برابر ان سے مشورہ کرتا رہا۔ وزرائے اعظم کی یہ مصالحت و مشاورت اخوان کی سیاسی قوت پر دلالت کرتی ہے۔

اس کے بعد ملکی مصلحتوں کے ساتھ، سابق شاہ فاروق کے سیاسی کھیل اور مطلق العنانی کے نتیجے میں جلد جلد دو دو، تین تین روزہ وزارتیں قائم ہوتی رہیں۔ چنانچہ حسین سری کی وزارت آئی۔ پھر ہلالی کی دوسری وزارت آئی، جس کے قیام کے دوسرے ہی روز جنرل محمد نجیب کی قیادت میں فوجی انقلاب آیا۔ فوج نے علی ماہر کو وزارت کی پیش کش کی پھر شاہ فاروق کو نوٹس دیا گیا کہ وہ حکومت سے اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہو جائے اور ملک چھوڑ دے۔

جنرل نجیب کا فوجی انقلاب 26 جولائی 1952ء کو برپا ہوا تھا۔ اخوان کے تمام رہنماؤں نے اس اقدام کی تائید و حمایت کی۔ بعض اخبارات میں یہ اطلاعات بھی شائع ہوئیں کہ علی ماہر نے مرشد عام کو وزارت میں شرکت کی دعوت دی، لیکن انہوں نے دعائے کامرانی پیش کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ اس موقع پر شیخ حسن الباقوری کو اخوان سے مستعفی ہونا پڑا، کیونکہ وہ مرشد عام کی معذرت سے بے خبری میں وزارت میں شامل ہو چکے تھے۔ فوجی انقلاب کے اوائل عہد میں اخوان کا اثر و رسوخ مزید بڑھ گیا، اس لیے کہ فاروق کے عہد میں وہ ہمیشہ ملکی بگاڑ اور

اجتری کے خلاف بغاوت میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے تھے، اور اس کے عہد میں تمام ارتوں اور محاموں کے ظلم وستم کا ہدف بنے رہے تھے۔

اخوان کی شاخوں کی تعداد اب ڈیڑھ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ مرشد عام نے مصر کے گوشے گوشے میں سرگرمی سے دورے کیے۔ وہ جس علاقے میں بھی جاتے، وہاں نئی شاخیں قائم ہو جاتیں۔ 1953ء میں صرف قاہرہ شہر میں ستر شاخیں تھیں، اور کارکن ارکان کی تعداد دس لاکھ تھی۔ ایسے کارکنوں کی تعداد الگ ہے جو اپنے مخصوص طریقے پر کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ نہ اپنی عملی سرگرمی کا اظہار کرتے ہیں، اور نہ جماعت کے مخصوص قواعد وضوابط کے پابند رہنا چاہتے ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ، مگر جیسا کہ اخوان کے منشور میں درج ہے، اخوان کے ہاں ہمیشہ "کیفیت" کو حاصل ہے، کمیت کو نہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اخوان کا کارکن یا محض مخلص و ہمدرد کسی کمپنی یا فیکٹری وغیرہ میں ملازم ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی دعوت دین پر یقین کامل اور پختہ فہم واستدلال سے اپنے سارے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں تمام لوگ یا اکثریت اس کی ہم خیال ہوتی ہے۔ مختلف سیاسی جماعتوں سے رابطہ و تعلق اور گزشتہ حکومتوں سے کشاکش کے سبب کارکنوں کو عام لوگوں کو مطمئن کرنے کا تجربہ وملکہ حاصل ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اخوان میں کارکنوں کی تعلیم وتربیت کا اس قدر مستحکم اہتمام ہے کہ ایک کاریگر، مستری یا مزدور بھی اس طرح خطبہ جمعہ یا دینی درس یا سیاسی تقریر کرتا نظر آئے گا، جیسے کوئی بہترین عالم ہو یا خطیب۔ عزم صمیم اور اعتماد کامل کی بدولت وہ مصری معاشرے کے تمام حلقوں میں پھیل گئے ہیں۔

26 جولائی 1952ء کو اخوان کی مجلس عاملہ کا انعقاد ہوا، جس میں ملک کی صورت حال کے بارے میں ایک بیان نشر کرنے اور اصلاح معاشرہ کے بنیادی نکات متعین کرنے کے بارے میں تجویز پاس ہوئی۔ اس کے بعد یکم اگست 1952ء کو اخوان کی "مجلس تاسیسی" کا اجلاس طلب کیا گیا، جس نے مجلس عاملہ کی مذکورہ تجویز کو منظور کیا۔ چنانچہ اخوان نے ایک بیان شائع کیا جس میں مکمل ملکی تطہیر، اخلاقی، تربیتی، دستوری، معاشرتی، اقتصادی اصلاح کے وسائل، قومی تربیت وتقویت، اور پولیس کی اصلاح کے طریقوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے ملکی اصلاح کے بنیادی نکات پیش کیے گئے۔

اس کے بعد فوجی حکومت نے سیاسی پارٹیوں کی رجسٹریشن کا حکم صادر کیا۔ اخوان کی "مجلس تاسیسی" میں اس حکم کے مضمرات پر غور ہوا اور اخوان کے آئین پر نظر ثانی کر کے بعض ترامیم منظور کیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ "مرشد عام کی مدت کار تا حیات کی بجائے تین سال ہو گی، اور "مجلس تاسیسی" کے ارکان کی تعداد 150 ہو گی، لیکن مکرر غور کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ایک بین الاقوامی اسلامی جماعت کی حیثیت سے "اخوان المسلمین" کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ خود کو صرف مصر کے قانون جماعت سازی تک محدود ومقید کرے۔ انہوں نے یہ بھی طے کیا کہ فی الحال وہ حصول حکومت کو اپنے مقاصد میں شمار نہیں کرتے ہیں۔ اسی بناء پر وہ الیکشن میں جماعتی بنیاد پر شامل نہ ہوں گے، لیکن قومی قیادت اور سیاسی وملکی معاملات میں تنقید، احتساب اور رائے دہی کا حق اپنے لیے محفوظ رکھیں گے۔ یہ پالیسی اپنا کر وہ سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کے دائرہ قانون سے صاف بچ گئے۔

3 دسمبر 1953ء کو اخوان نے اپنے مرکز میں سیرت النبی ﷺ کا جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے میں صدر مملکت جنرل محمد نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے شرکت کی۔ مرشد عام نے تقریر کی۔ ان کے بعد جنرل محمد نجیب نے تقریر کی، جس میں اخوان کو مبارکباد دی۔ ان کی روحانی و معنوی قوت کی تعریف کی اور اس کے پہلے مرشد حسن البناء شہید کے ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی۔

12 فروری 1953ء جب اخوان کے مرکز میں حسن البناء کی شہادت کی چوتھی برسی ہوئی تو جنرل محمد نجیب اور ان کے ہمراہ تمام وزراء اور افسران بالا تعزیت کے لیے اخوان کے صدر دفتر (مرکز) آئے۔ جنرل محمد نجیب نے ایک تقریر کی جو ریڈیو سے براہ راست نشر کی گئی۔ اس موقع پر جنرل نجیب نے کہا:

"حسن البناء کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کی یاد کبھی پرانی نہیں ہو سکتی اور جن کی مرتبت و فضیلت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مرحوم نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں گزاری، بلکہ قوم کے لیے گزاری۔ انہوں نے ذاتی فائدے کے لیے کوئی کام نہیں کیا، بلکہ ان کا مقصد حیات ہمیشہ فلاح عام رہا"۔

جنرل محمد نجیب کی تقریر پر حسن البناء کے بھائی عبدالرحمٰن البناء نے اپنے خاندان کی طرف سے جواب دیا۔ اُس روز شام کو ریڈیو سٹیشن سے دوبار جنرل نجیب کی تقریر نشر کی گئی۔ اس رات ریڈیو سے گانے وغیرہ نشر نہیں کیے گئے۔ بلکہ صرف تلاوتِ قرآن، خبریں اور شہید حسن البناء کی تقریروں کے اقتباسات ہی نشر کیے گئے۔

اس طرح حکومت نے سرکاری طور پر اُس بطل جلیل کی چوتھی برسی پر اس کی قدر و منزلت کا اعتراف کیا۔ جس قبر کی طرف چار سال پہلے وہ "تنہا" روانہ ہوا تھا، اور جس کے جنازے میں ان کے والد اور فرزند کے سوا اور کوئی نہ تھا، ہاں چند سپاہی تھے جو لوگوں کو جنازے سے دور رکھنے پر مامور تھے۔ آج اس مرد شہید کی قبر پر خود حکومت نے اپنے صدر اور وزراء کے ساتھ حاضر ہو کر پھولوں کی چادر چڑھائی۔

''سیّدات مسلمات'' کی قائد

زینب الغزالی

''تحریک اخوان المسلمین'' کے شعبہ خواتین کی نگران، معروف عالمہ اور دعوت اسلامی کی مجسم تصویر سیّدہ زینب الغزالی (1917ء۔2005ء) 8 اگست 2005ء کو رحلت کر گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ نے حسن البناء اور سیّد قطب شہید کے ساتھ مل کر اسلام کی عظمت رفتہ کے لیے کام کیا اور جمال عبدالناصر کی فرعونی حکومت کی سختیاں برداشت کیں۔ ان کو گرفتار کیا گیا اور جیل میں سخت سزائیں دی گئیں۔ ان پر کتے چھوڑے گئے جو ان کو جھنجھوڑتے رہے۔ ان کو بے رحمی سے کوڑے مار مار کر لہولہان کیا گیا۔ ان کی ٹانگ توڑ دی گئی۔ ان کو کئی کئی دن بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ وضو اور پینے کے لیے پانی تک نہ دیا گیا۔ رفع حاجت کے لیے بیت الخلا جانا بھی ممنوع تھا اور یہ کیفیت کئی روز تک رہی۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی ''ایام حیاتی'' میں اپنے اوپر ڈھائے جانے والے مظالم بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا خلیل احمد حامدی مرحوم نے ''روداد قفس'' کے نام سے کیا تھا جس کا ایک اقتباس ''اخوان المسلمین'' کی تاریخ کا سلسلہ واقعات خاتون زینب الغزالی کے سانحۂ ارتحال پر ان کی قربانی والی زندگی کی یاد آوری کا حق ادا ہو سکے۔ (س ق م)

علیہ اور غادہ کو آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ چنانچہ میں نے مرشد کی عام دروازے کے سوراخ میں سے اپنی روزانہ کی ملاقات میں انہیں بھی شریک کر لیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب سے موصوف یہاں آئے ہیں تمام تعذیب وتشدد کے باوجود مجھے نفسیاتی طور پر بڑا اطمینان وسکون حاصل ہے۔ علیہ نے بھی اپنے والد کو بیت الخلا کی طرف جاتے اور واپس آتے ہوئے دیکھ لیا۔ غادہ بھی اس نرالی زیارت سے لطف اندوز ہوئی۔

بقیہ دن ہم کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئیں ادھر ادھر کی باتوں میں لگی رہیں۔ غادہ نے اپنی داستان گرفتاری چھیڑ دی۔ بتانے لگیں کہ جب آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو حمیدہ قطب کے پاس گئی۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ پورا خاندان قطب گرفتار ہو چکا ہے۔ آج کی گھڑیاں گراں بھی تھیں اور آہستہ خرام بھی۔ بس درمیان میں باجماعت نماز کی ساعات ان گھڑیوں کی وحشت خیزی کو کم کرنے میں مدد دیتی تھیں۔

تعزیت اور وزارت کی رات

عشاء کی نماز کے فوراً بعد کوٹھڑی کا دروازہ وا ہوا اور بھیڑیا صفت الروبی ایک سپاہی کو ساتھ لیے اندر آیا۔ یہ

دونوں مجھے پھر اسی دفتر میں لے گئے جس کا مزہ میں پہلے دو بار چکھ چکی ہوں۔ دفتر میں میز کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا تھا، میں نے اسے سلام کیا۔ اس کے ہونٹوں پر جنبش تک نہ آئی۔ البتہ وہ مجھے سرخ آنکھوں سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا "تم زینب الغزالی ہو؟" میں نے جواب دیا "جی ہاں" اس نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہنے لگا: "اچھا تم ہو زینب الغزالی! تم نے اس درجہ نفس پر کیوں ظلم ڈھا رکھا ہے۔ کیا یہ سب کچھ اخوان المسلمین کی خاطر ہو رہا ہے؟ حالانکہ ان کے چھوٹے بڑے سب اپنی کھال بچا کر تمہیں تنہا تباہی کے کنوئیں میں دھکیل رہے ہیں اور تم ہو کہ ہمارے لیے لوہے کے چنے بن رہی ہو۔ بہرحال میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ تمہیں اس کنوئیں سے کسی نہ کسی طرح نکال لوں۔ میں تمہارے ساتھ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر بات کروں گا اور پھر تم بھی اپنے گھر چلی جانا۔ یہاں تک بس نہیں بلکہ میں جمال عبدالناصر کے نام سے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہماری اور تمہاری مفاہمت ہو گئی اور تم نے دانش مندی سے کام لیا تو صدر کی طرف سے بلاتاخیر "سیدات مسلمات" کا مرکزی دفتر کھول دینے کے احکام جاری ہو جائیں گے۔ تمہارا ماہنامہ بھی بحال ہو جائے گا۔ ماہنامہ کے لیے دو ہزار پونڈ ماہوار اعانت بھی مقرر کر دی جائے گی۔ "سیدات مسلمات" کی تنظیم کو بھی بھاری بھرکم مالی مدد مل جائے گی اور اس تنظیم کو پہلے سے بھی بہتر طور پر کام کرنے کا موقع ملے گا۔ اگر آپ میرے ساتھ صلح کے لیے تیار ہو جائیں تو میں ابھی آپ کے گھر سے ضروری کپڑے منگوا لیتا ہوں تاکہ آپ ایک گھنٹے کے اندر اندر جمال عبدالناصر سے ملیں۔ آپ نے ہم سے بڑا سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس تباہی میں آپ کو اخوان المسلمین والوں نے ڈالا ہے۔ اللہ انہیں معاف کرے۔ ورنہ صدر کا دل تو بڑا کشادہ ہے"۔

یہ صاحب روانی سے اپنی تقریر کے جوہر دکھاتے رہے اور میں چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔ وہ مجھے کہنے لگے: "زینب بی بی تمہارا یہ ردعمل ہے؟ زینب بی بی، خدا کی قسم! صدر، حکومت اور یہ وزارت سب برطرف کر کے تمہیں یہ وزارت سونپنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہماری مقدم بن جائیں۔ وزارتوں کی گرہیں کھول لیں اور جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہیں۔ آپ خود جان جائیں گی کہ میں آپ کا بھائی اور مخلص خیر خواہ ہوں۔ یہ دیکھو مصر بھی بہت سے بھلے لوگ تم سے محبت کرتے ہیں اور تمہارے حق میں سفارشیں اور اپیلیں کر رہے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھو کہ انہوں نے تمہاری خاطر دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے"۔

میں نے کہا: "حضور میں وزیر نہیں بننا چاہتی۔ زندگی میں کبھی میرے حاشیہ خیال میں بھی ایسی بات نہیں آئی۔ رہا "سیدات مسلمات" کی تنظیم اور اس کا مجلہ تو میں نے ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اسلام کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کوئی لازم نہیں ہے کہ وہ کسی تنظیم یا رسالے کی آڑ میں کام کریں، بلکہ ان کے لیے لا الٰہ الا اللہ کا جھنڈا اپنا فرض سرانجام دینے کے لیے کافی ہے"۔

وہ صاحب کہنے لگے: "تو پھر تم لوگ اخوان المسلمین کو دوبارہ زندہ کرنے کی کیوں کوشش کر رہے تھے؟"

میں نے کہا: "ہم اور آپ ہر چیز کی تعبیر و تفہیم میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً میں یہ سمجھتی ہوں کہ "سیدات مسلمات" کی تنظیم جو 1973ء میں قائم کی گئی تھی، برقرار ہے۔ اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔ جب کہ عبدالناصر کا

یہ خیال ہے کہ یہ تنظیم اس نے توڑ دی ہے اور اس کے دفاتر، املاک اور دیگر ساز وسامان پر اب وہ قبض ہو چکا ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ دعوتِ اسلامی کی ترویج واشاعت اور اسلام کی سربلندی کا فریضہ مسلمانوں پر خود اللہ تعالیٰ نے عائد کیا ہے اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ جاری کرتا ہے، اسے کوئی انسان بند کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ جس طرح سیدات مسلمات کی تنظیم ہماری نظر میں قائم اور باقی ہے اسی طرح اخوان المسلمین کی جماعت بھی باقی اور قائم ہے اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی دعوت اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور رہے گی۔ کلمۂ حق قائم ودائم رہے گا۔ عبدالناصر اور اس کا اقتدار فنا ہو جائے گا مگر اللہ کا کلمہ جریدہ عالم پر ثبت رہے گا اور جب ہم سب کی مہلت عمر ختم ہو جائے گی اور خدائے عز وجل کے حضور پیش ہوں گے تو پھر وہی صورت پیش آئے گی جو خود اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے: (اور عنقریب ظالم جان لیں گے کہ وہ کس کروٹ گرتے ہیں) اللہ تعالیٰ کا دین قائم ودائم ہے۔ امت مسلمہ کا ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہے گا جو حق پر قائم ہوگا اور اللہ کے دین کا دفاع اور اللہ کے رستے میں جہاد کرتا رہے گا۔ مخالفت کرنے والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ اپنے اصول ونظریات کو سینے سے لگائے رکھے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس تک آ پہنچے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر لے جو معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں اور جو امت پر اللہ کا راستہ واضح کرتے ہیں۔ چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دینے والے اللہ کے رسول کے صحیح جانشین ہیں۔ انہی لوگوں کو مد دین اسلام کہا گیا ہے۔ حسن البناء رحمۃ اللہ علیہ نے جماعت اخوان المسلمین کی تاسیس یونہی الل ٹپ نہیں کی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل درآمد کے لیے کی تھی کہ اللہ کا دین از سرنو قائم کیا جائے۔ دین کی بنیادوں پر ایک ریاست قائم کی جائے اور اس میں اللہ کی شریعت کو جاری وساری کیا جائے۔ لہٰذا جمال عبدالناصر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس پر پابندی لگائے اور اسے منسوخ کرے۔"

میں یہ جوابی بیان دے رہی تھی اور وہ صاحب ہمہ تن گوش سن رہے تھے۔ میں جب چپ ہوئی تو وہ کہنے لگے:

"بخدا، زینب تم تو فی الواقع بہترین مقررہ ہو، لیکن میں یہاں تمہارے پاس اس لیے نہیں آیا کہ اخوان المسلمین کے متعلق تم سے کوئی سبق پڑھوں اور تم مجھے اخوان المسلمون کا ایک ممبر بنانے کے لیے مائل کرنے کی کوشش کرو۔ میں تو تمہارے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ باہمی اتفاق سے کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دے جس میں تم نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے۔ سنیے:

اخوان المسلمین کے لوگوں نے سازش کی تمام ذمہ داری تم پر ڈال دی ہے۔

عبدالفتاح اسماعیل کا بیان ہے کہ تم نے ہی اسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

حسن الہضیبی نے بھی اپنی جان چھڑا لی ہے اور ساری بلا تمہاری گردن پر ڈال دی ہے۔ ان کے بیان کے موجب یہ تنظیم تم نے ہی قائم کی ہے۔

سید قطب نے بھی اپنی گلوخلاصی کرالی ہے اور سارا چکر تمہارے خلاف چلا دیا ہے۔

پھر یا تو تم بہت ہی نیک ہو اور یا پھر پاگل۔

عبدالناصر تمہیں اس تکلیف دہ حالت سے نکالنا چاہتا ہے۔ وہی عبدالناصر جس نے پورے ملک کو اپنی دونوں ٹانگوں میں دبوچ رکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس سے درگزر کیا جائے اور تعلقات کا نیا باب شروع کیا جائے۔ اسے معلوم ہے کہ آپ شعلہ بیان مقرر ہیں، لوگوں پر آپ کے اثرات ہیں، لوگ آپ کو چاہتے ہیں اور آپ کو عوامی مقبولیت حاصل ہے۔

زینب بڑے خسارے میں جارہی ہو۔ حالانکہ تمہارے ہاتھ میں جنت جانے والے تاش کے پتے ہیں۔

کیا اس ملک میں کوئی ایسا مائی کا لال موجود ہے جسے عبدالناصر اپنا مقرب بنانا چاہے اور وہ انکار کردے؟

سچی بات ہے زینب، معاف فرمانا، تم تو بالکل پاگل پن میں مبتلا ہو۔ میں اس لیے صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہارا مفاد عزیز ہے، خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ تم یتیموں کی پرورش کرتی ہو اور متعدد نیکی کے کام کرتی ہو۔ عقل کے ناخن لو خاتون! کچھ تو اپنی بھلائی سوچو، کچھ تو میری باتوں پر دھیان دو"۔

میں نے کہا: "جو میں گزارش کر چکی ہوں کیا وہ کافی نہیں ہے؟"

وہ صاحب کہنے لگے: "ہمارا تم سے بالکل معمولی سا مطالبہ ہے۔ اسے پورا کر دینے پر تم دیکھو گی کہ حالات یکسر بدل جائیں گے۔ تم ہمیں ان تمام اخوانیوں کے نام بتا دو جو تمہارے گھر آیا کرتے تھے۔ نیز وہ عبدالناصر کو قتل کرنے کے لیے کیا طریق کار سوچ رہے تھے صدر کو قتل کرنے کے لیے تم نے انھیں سے کب احکام وصول کیے تھے۔ ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہیں گے کہ سید قطبؒ کا اس سلسلے میں کیا رول رہا ہے۔ یہ منصوبہ کیسے تیار کیا گیا۔ مجھے عبدالناصر کے سر کی قسم! تم ان سوالوں کا جواب دے دو تو تمہیں راتوں رات جیل سے نکال دیا جائے گا اور ایک لمحے انتظار کیے بغیر تمہیں وزارت معاشرتی بہبود کا قلمدان سونپ دیا جائے گا۔ حاجن! یہ نہایت سنہری موقع ہے۔ جذبات میں آکر اسے ضائع نہ کرو۔ مجھے اپنی عزت اور صدر کی عزت کی قسم! دانش مند بنو اور اچھی طرح اپنی حالت کا جائزہ لے لو۔ اخوان المسلمین والے تو یک قلم آپادھاپی میں مشغول ہیں"۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بدرو اور بدخو انسان کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ اس کی آنکھوں سے شیطانیت ٹپک رہی ہے۔ اس نے کہا: "کرنل صاحب! ہم وہ تمام ٹیپ لے آئے ہیں جو اس خاتون کے دونوں گھروں میں 1985ء سے خفیہ طور پر لگاتے رہے ہیں۔ زیتون والے گھر میں بھی اور مصر الجدیدہ والے گھر میں بھی۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم وہ سب حاضر کر دیں تاکہ آپ اس خاتون کو سنا دیں۔" میرے "ناصح مشفق" نے اسے یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا کہ ابھی تمہاری ضرورت نہیں ہے، تم چلے جاؤ اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے مجھے کہنے لگا:

"دیکھو زینب بی بی، میں تمہارے خاوند کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بڑا شریف انسان ہے۔ اور میں اس کی خاطر اور خود تمہاری خاطر کوئی خدمت سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ تمہارے بعض بھائی بھی میرے جگری دوست ہیں۔ میں تمہاری بہبود چاہتا ہوں۔ خود صدر صاحب کی بڑی خواہش ہے کہ تم سے صلح ہو جائے۔ وہ بھی حقیقت میں تمہارے حق میں بہتری کے خواہاں ہیں۔ میں اپنی عزت اور صدر عبدالناصر کی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ مفاہمت

کرلیں تو میں ابھی آپ کے سامنے تمام ٹیپیں نذر آتش کروں گا۔ ہم آپ کو اس کھڈ میں سے نکالنا چاہتے ہیں جس میں اخوان المسلمین نے تمہیں پھینک دیا ہے۔ خدائے بزرگ برتر کی قسم، ہم لوگ اخوانیوں سے اچھے مسلمان ہیں۔ اسلام کیا ہے؟ اسلام یہی ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو ضرر نہ پہنچائے''۔

میں نے تمسخر کے ساتھ جواب دیا: ''آپ اس جیل میں جو مناظر دیکھ رہے ہیں۔ کیا ان میں آپ کو اپنے بھائیوں بلکہ تمام خلقِ خدا کے ساتھ ضرر رسانی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا؟''

اس نے نہایت احمقانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا: ''ہم بہت اچھے لوگ ہیں۔ رسول کی قسم! آپ ہمارے ساتھ کچھ تو نرم ہو جائیں۔ آپ جلد ہی دیکھ لیں گی کہ ہم کس قدر شریف اور بھلے مانس لوگ ہیں''۔

میں نے عرض کیا: ''خدا تمہیں توبہ کی توفیق دے اور تم فی الواقع مسلمان بن جاؤ۔'' اتنا سن کر میز کی دراز سے ایک کاغذ نکالا اور قلم ہاتھ میں تھام کر کہنے لگا: ''زینب بی بی، فرمایئے کون کون آپ کے گھر میں آتے رہتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں لوگوں کے نام حفظ نہیں کرتی اور نہ کبھی کسی سے میں نے نام دریافت کیا ہے''۔

کرنل: ''اچھا چھوڑیئے، اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ حسن الہضیبی اور سید قطبؒ کے متعلق کچھ بات ہو جائے''۔

زینب: ''کون سی بات؟''

کرنل: ''عبدالناصر کو قتل کرنے اور حکومت پر قبضہ کرنے والی بات''۔

زینب: ''استاد! مسئلہ عبدالناصر کو قتل اور اقتدار پر قبضہ کرنے سے بھی کہیں زیادہ بڑا ہے۔ عبدالناصر کو قتل کرنا تو ایک حد درجہ گھٹیا حرکت ہے۔ اسلام کے داعیوں کے لیے یہ موضوع خارج از بحث ہے۔ سارا جھگڑا دراصل اسلام کی وجہ سے برپا ہے۔ اس وقت ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے اور ہم اسلام کی سچی، مخلص اور باشعور نسل تیار کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اب اگر عبدالناصر اسلام کے علمبرداروں پر ستم توڑ کر اسلام کے خلاف جنگ برپا کرنا چاہتا ہے اور اسلامی شریعت کے مطابق نظام حکمرانی قائم کرنے سے اس لیے انکار کرتا ہے کہ اسلام رجعت پسندی، پسماندگی اور تنگ نظری کا نام ہے، تو یہ زعم باطل اسے مبارک ہو۔ ہم ایسی باتوں سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔

کرنل (بلبلا کر): تم بالکل ہی پاگل ہو رہی ہو۔ یہ کتنی خطرناک بات تم نے کہی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اگر ابھی تمہاری گردن اڑا دی جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے تو کسی کو تمہارے اس انجام کی خبر تک نہ ہو سکے گی۔ تم جو روپہ اختیار کیے ہوئے ہو، وہ تمہیں ایسے خوفناک انجام کا مستحق ٹھہرانے کے لیے کافی ہے۔ اگر اب تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں تو ایک گھنٹے کے بعد تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا''۔

میں نے اس دھمکی کے جواب میں بڑی بے نیازی سے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ تمام اختیار و اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میں ابھی اپنا جواب مکمل نہ کر پائی تھی کہ اس ''ناصح مشفق'' نے یک بارگی درندے کا

روپ دھار لیا۔ اس پر گویا مرگی کا حملہ ہو گیا اور ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو کر مجھے بے تحاشا گالی بکنے لگا۔ پھر اس نے ایک سپاہی کو پکارا اور اسے کچھ اشارہ کیا، جس کے فوراً بعد ریاض ابراہیم پہنچ گیا۔ اسے کہنے لگا: یہ چپیں عدالت کے لیے رہنے دیں۔ اس عورت کا دماغ چل گیا ہے۔ اس کے ساتھ جو معاملہ کرنا ہے اسے خوب سمجھ لو۔ سعد کو بلاؤ کہ وہ اسے سنبھالے۔

پھر یہ "شفیق ناصح" جو میرے ساتھ سودا بازی کر رہا تھا، واپس چلا گیا۔ سپاہی سعد آ گیا اور وہ ریاض ابراہیم سے کہنے لگا: "ہم دونوں پاشا صاحب" ریاض ابراہیم نے کہا: "سعد اسے درست کر دو"۔ سعد نے پوچھا پاشا صاحب کتنے کوڑے؟ پاشا نے کہا: "پانچ سو۔ میں تھوڑی دیر کے بعد آ کر پتہ کراؤں گا"۔

سعد نے میرے ہاتھ، پاؤں، پشت غرضیکہ جسم کے ہر ہر حصے پر کوڑے مارنے شروع کر دیے۔ ایک دور پورا کرنے کے بعد اس نے مجھے رخ بہ دیوار کھڑا کر دیا اور خود تقریباً گھنٹہ بھر کے لیے غائب ہو گیا۔ واپس آیا تو اس نے تازیانوں کا دوسرا دور شروع کر دیا۔ میں کبھی ہوش کھو بیٹھتی اور کبھی ہوش میں ہوتی۔ پھر یہ لوگ چند اخوانی نوجوانوں کو لے آئے۔ ان پر بھی تازیانوں کی بارش شروع کر دی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کو نہایت فحش اور غلیظ گالیاں دیتے اور ان سے مطالبہ کرتے کہ وہ یہ گالیاں مجھے دیں۔ لیکن داد دیجیے ان کی نوخیز جوانیوں کو کہ یہ میرے حق میں کسی قسم کا بھی نازیبا لفظ منہ سے نکالنے سے صاف انکار کر دیتے جس کے نتیجے میں انہیں مزید تازیانے کھانے پڑتے۔ ان نوجوانوں میں سے ایک طالب علم بھی تھا جس بیچارے کو ان لوگوں نے عین شادی کی تقریب میں گرفتار کر لیا تھا۔

جمال عبدالناصر اور اخوان المسلمین

حسن البناء کی شہادت کے بعد سے 1950ء تک تحریک کا پورا نظم و نسق احمد الباقوری کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد "الاخوان" کی ہیئت تاسیسیہ (جنرل اسمبلی) نے تحریک کے معاملات صالح العشماوی (مدیر "الدعوۃ") کے سپرد کر دیے جو تنظیم کے نائب مرشد عام بھی تھے اور حسن البناء (مرشد عام) کی عدم موجودگی میں ان کی ذمہ داریاں سنبھالا کرتے تھے۔ غیر متوقع طور پر جنرل اسمبلی کے باہر ایک شخص حسن الہضیبی کو 17 اکتوبر 1951ء کو مرشد عام بنا دیا گیا۔ حسن الہضیبی 1942ء میں "الاخوان" کے زیر اثر آئے تھے اور حسن البناء سے بہت متاثر تھے۔ ان کی شخصیت میں وہ ساحرانہ کشش نہ تھی جو تحریک کے بانی کی خصوصیت تھی۔ ان کے تقرر نے "الاخوان" کے اندر اختلاف پیدا کر دیا۔ اس اختلاف کے نتیجے میں اگرچہ کوئی متوازی جماعت وجود میں نہ آئی، تاہم یہ چیز بالکل بے اثر بھی نہ رہی۔

شاہ فاروق شروع سے تحریک سے حد درجہ خائف تھا اور حسن البناء سے بے حد مرعوب۔ اس نے انگریزوں کے اشارے پر اخوان کو انقلاب پسند فوجی افسروں کے خلاف استعمال کرنا چاہا، مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ انقلاب کے شروع ہوتے ہی اخوان نے انقلاب کی پوری حمایت کی اور فوجی افسروں سے مل کر اپنے مشترکہ دشمن شاہ فاروق سے پیچھا چھڑا لیا۔ شاہ فاروق کا تو کہنا یہ تھا کہ اسے نکالنے والے اصل میں اخوان ہی تھے اور انہوں نے ہی فوجی افسروں

کو اس کے خلاف استعمال کیا۔

فوجی افسروں سے اخوان کے تعلقات

فوجی افسروں سے اخوان کے تعلقات کی ابتدا دوسری جنگ عظیم کے آغاز (1940ء) میں ہو چکی تھی۔ حسن البناء نے اپنی دعوت کو فوجی افسروں میں پھیلانے کی طرف خاص توجہ کی تھی اور مختلف ذرائع سے نوج میں نفوذ حاصل کر لیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اخوان کا اثر فوج میں اور زیادہ بڑھ گیا۔ 1948ء میں جنگ فلسطین میں اخوان اور فوجی افسر دوش بدوش لڑے اور اخوان کی پامردی اور خلوص نے ان افسروں کو بہت متاثر کیا۔ خود جمال عبدالناصر پر اخوان سے ہمدردی کا الزام تھا۔ 52-1951ء کی جنگ سویز میں اخوان کو پھر فوجی افسروں کی معیت میں دادِ شجاعت دینے کا موقع ملا۔ اس طرح دونوں بہت قریب آ گئے۔ 1948ء میں تنظیم کے غیر قانونی قرار دیئے جانے کے بعد بھی دونوں کے تعلقات برقرار رہے تھے، مگر ان تعلقات کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ ایسے فوجی افسر بھی کم نہ تھے جو اپنا طریق کار اخوان سے آزادرہ کر متعین کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے بعض اخوان سے قریب ہونے کے باوجود مغربی اثرات کے تحت سیکولرازم کی طرف مائل تھے۔

23 جولائی 1952ء کو فوجی انقلاب برپا ہو گیا۔ انقلابی کونسل اخوان سے ہمدردی رکھتی تھی، چنانچہ حسن البناء کی برسی کے موقع پر اعلیٰ فوجی افسروں نے انہیں خراجِ عقیدت و تحسین پیش کیا۔ شروع میں دونوں میں اتنی قربت تھی کہ انقلابی کونسل کو اخوان کا آلۂ کار سمجھا جانے لگا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب جدید اور نئے مصر کی تعمیر کن اصولوں پر ہو اور کس کی رہنمائی میں ہو؟

اسلام یا سوشلزم

یہ ایسا سوال تھا جس نے دونوں کے درمیان اختلاف کی ناقابلِ عبور خلیج پیدا کر دی، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔ اخوان اسلامی ریاست کے قیام کے خواہاں تھے۔ انقلابی ان کی رہنمائی پر کسی طرح رضامند نہ تھے اور بعض تو سیکولر ریاست کو ترجیح دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صدی کا نصف اول مصر میں وطن پرستی یعنی وطن پر مبنی قوم پرستی کا دور تھا۔ لیکن 1952ء کے انقلاب کے بعد مصر میں جس دور کا آغاز ہوا، وہ عرب قوم پرستی اور سوشلزم کا دور ہے۔ وطن پرستی (قومیت) حصول آزادی کا ایک ذریعہ تھی اور جب مصر انگریزوں سے آزاد ہو چکا تو وطن پرستی کے نظریے کی قوت متحرکہ ختم ہو گئی۔ مصری اب یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ ایک وسیع تر عرب دنیا کے رکن ہیں اور ان کے بہت سے مسائل کا حل عرب دنیا کے اتحاد سے وابستہ ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ دنیا اب بین الاقوامیت کی طرف جا رہی ہے اور وطنی حد بندیاں کمزور پڑ رہی ہیں۔ چنانچہ اس عالمگیر رجحان سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے سوشلزم کا مسلک اختیار کیا۔ سوشلزم کو اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وطن پرستی اور سرمایہ دارانہ معیشت کے نظام سے مصری عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا اور مصر کے وطن پرست چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تھے، اس لیے انہوں نے فطری طور پر اپنے مسائل کا حل اسلام سے باہر تلاش کیا۔ جو سوشلزم ہی ہو سکتا تھا کیونکہ اس وقت وہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں سکہ رائج الوقت تھا۔

اس کے علاوہ چونکہ فلسطین کے مسئلے کی وجہ سے عربوں کی براہ راست مغرب سے کشمکش شروع ہوگئی تھی، اس لیے عرب یہ سمجھتے تھے کہ وہ سوشلزم اختیار کر کے دنیا کے ایک بڑے بلاک سے، جو مغرب کا حریف ہے، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مدد حاصل کر سکیں گے۔ اگرچہ 1956ء کے آئین میں بہت سے دوسرے مسلم ملکوں کی طرح مصر میں بھی اسلام کو سرکاری حیثیت دی گئی تھی، لیکن یہ صرف رسمی چیز تھی۔

جمال ناصر کے دور میں مصری حکومت کی طاقت کا سرچشمہ اسلام نہیں، بلکہ عرب قومیت اور سوشلزم تھے۔ صدر ناصر جدید عرب سوسائٹی اور اس کے حقوق و فرائض کے متعلق وہ نقطہ نظر رکھتے تھے جو اسلامی شریعت اور خدا کی مقرر کردہ حدود کا پابند نہیں تھا، بلکہ اس کا تعین مغربی سوسائٹی اور جدید فکر کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اپنی تصنیف ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' جو 1962ء میں لکھی گئی میں رقم طراز ہیں:

صدر ناصر نے جس قومی منشور ''المیثاق الوطنی'' کا اعلان کیا تھا، اگر اس منشور سے مصر کا لفظ نکال دیا جائے جو بار بار آتا ہے اور جس کی وجہ سے اس معاشرے اور ماحول کا پتہ چل جاتا ہے، جس کے لیے یہ منشور مرتب کیا گیا تھا، اور اس کو کسی سیکولر اور اشتراکی ریاست کی طرف منسوب کر دیا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا، اس لیے کہ یہ سب حکومتیں عقیدے کی آزادی اور انسان اور تہذیب انسانی پر مذاہب سے پیدا ہونے والی روحانی اقدار کے اثر و تسلط کی معترف ہیں۔

مولانا علی ندوی نے اسی تصنیف میں مزید رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس انقلاب کے قائدین نے مصری سوسائٹی اور مصری فکر و دماغ کی مکمل تبدیلی اور تشکیل جدید کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے جو دراصل پوری عرب قوم کی ذہنیت تبدیل کرنے کا ایک ابتدائی مرحلہ تھا۔ انہوں نے عربی قومیت پر ایک مذہب اور عقیدے کی طرح زور دیا۔ انہوں نے ''العزۃ للعرب'' کے نعرے لگائے۔ ملحدین کی حوصلہ افزائی کی گئی اور اہل قلم افراد اور اخبار نویسوں کو اس معاملے میں بالکل چھوٹ دے دی گئی کہ وہ جو چاہیں لکھیں۔ دین اور اس کے شعار کا کھلم کھلا مضحکہ اڑائیں۔ دین کی بے حرمتی کریں اور سوسائٹی میں بے حیائی، بے راہ روی اور فسق و فجور پھیلائیں۔ پریس کو قومیانے سے ان چیزوں میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحافت میں عریاں اور فحش تصویروں، گندے اور جنسی افسانوں، جرائم اور جنسی جذبے کی محرک خبروں اور واقعات کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس کا درپردہ مقصد یہ تھا کہ رفتہ رفتہ سوسائٹی اور عقلیت کو بالکل تبدیل کر دیا جائے اور اس پر مادی رنگ اور اشتراکی طرز پوری طرح غالب آجائے۔

جمال ناصر اور اخوان المسلمین

اس انقلاب کا عرب دنیا پر گہرا اثر پڑا، لیکن مغربی افکار و نظریات رکھنے والے اونچے طبقے پر گہرے اثرات کے باوجود نیا معاشرہ اور نیا نظام اہل مصر کے لیے قبول کرنا آسان نہ تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہاں اخوان المسلمین کی زیر دست اسلامی تحریک عوام اور نوجوانوں میں کافی جگہ بنا چکی تھی۔ انقلاب 1952ء کے موقع پر وفد پارٹی اور اخوان المسلمین صرف دو جماعتیں بااثر تھیں۔ جنوری 1953ء میں وفد پارٹی اور دوسری جماعتوں کو ختم کر دیا گیا۔ صرف اخوان باقی رہے۔ انہوں نے انقلاب کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا، بلکہ ناصر کی ''ڈائری'' میں

اعتراف کیا گیا ہے کہ اخوان کے فوجی شعبے کے انچارج میجر محمود پہلے سپاہی تھے، جنھوں نے فوج میں آزادی کی روح پھونکی اور خفیہ گروہ منظم کیے اور انقلاب کے ابتدائی اور خطرناک دنوں میں امن وامان قائم رکھنے میں پوری مدد دی۔

اخوان کے اسی تعاون کا نتیجہ تھا کہ فوجی انقلاب کے بعد سے ان پر تمام پابندیاں ہٹائی گئیں اور ان کی جائیداد اور املاک واپس کر دی گئی تھیں، لیکن اب، اخوان کے لیے ایک آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ حکومت نے ان کو صرف ایک مذہبی جماعت کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دی۔ اخوان کے لیے مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا یہ تصور ناقابل تصور تھا۔ ''اخوان'' اسلامی اصولوں کی بنیاد پر اصلاحات کرنا چاہتے تھے اور آئینی حکومت بحال کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وفد کے رہنماؤں اور اخوان نے سیاسی جماعتوں کی بحالی اور آئینی حکومت کے قیام کے لیے مہم چلائی اور اس مقصد کے لیے جنرل نجیب کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی، جو اخوان کے حلقوں میں ایک محبوب شخصیت تھی، لیکن انقلابی کمانڈ کونسل کے دوسرے رہنما جمال عبدالناصر کسی اور ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ اخوان کا نصب العین واضح تھا لیکن ناصر کا خفیہ۔ اور جیسا کہ بعد میں پتا چلا ناصر کا راستہ آمریت سیکولرازم اور مغربی مادیت کے مراحل سے گزر کر اشتراکیت تک جانے والا راستہ تھا، اور اخوان کا راستہ جمہوریت کی وادی سے ہو کر احیائے اسلام کے نصب العین تک جاتا تھا۔ جنرل نجیب درمیانی آدمی کی حیثیت سے دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے ملانے والے پل تھے۔ جب اخوان نے جنرل نجیب کی ہمدردی حاصل کرنا چاہی تو جمال ناصر نے ان کو پہلے وزارتِ عظمیٰ سے، پھر صدارت کے عہدے سے الگ کر دیا اور یہ دونوں عہدے خود سنبھال لیے۔ جنرل نجیب نے اپنی سوانح ''مصر کا مستقبل'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے انقلابی کونسل کے اختیارات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور یہ شکایت کی تھی کہ ان کو موثر کردار ادا کرنے کی بجائے ایک عضو معطل بنا دیا گیا ہے۔ جنرل نجیب کی برطرفی سے وہ پل ٹوٹ گیا جو اخوان اور فوجی افسروں کو ملائے ہوئے تھا اور اب اخوان اور ناصر کے درمیان براہِ راست کشمکش شروع ہو گئی۔

حسن الہضیبی: اخوان کے دوسرے مرشد عام

حسن البناء کے بعد اخوان کی قیادت حسن الہضیبی (1891ء-1965ء) کے سپرد کی گئی۔ حسن البناء عربی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے اور ان کی تعلیم بھی قدیم انداز پر ہوئی تھی۔ ہضیبی نے ان کے برعکس جدید تعلیم حاصل کی تھی۔ اور کئی زبانیں جانتے تھے۔ ہضیبی نے 1915ء میں مصری کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ 1924ء تک وکالت کی۔ اسی سال وہ عدلیہ مصریہ میں حاکم (جج) ہو گئے اور ستائیس سال اس عہدے پر کام کیا اور عدالت فائقہ (سپریم کورٹ) کے مشیر رہے۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں 17 اکتوبر 1951ء کو اخوان المسلمین تحریک کے مرشد عام یعنی سربراہ منتخب ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اخوان ابتلا اور آزمائش کی پہلی منزل سے گزر چکے تھے اور وفد پارٹی کی نئی حکومت نے ان پر سے پابندیاں اٹھالی تھیں۔

حسن الہضیبی نے اخوان کی قیادت سنبھالنے کے بعد شاہ فاروق اور ناصر، دونوں کے عہد میں پوری کوشش کی کہ حکومت سے اخوان کا کوئی تصادم نہ ہو، لیکن اخوان اور انقلابی فوجیوں کی بڑی تعداد کے درمیان جو نظریاتی اختلافات مستحکم ہو چکے تھے، وہ مزید پختہ ہو گئے۔ حسن ہضیبی نے اپنے ایک بیان میں، جو انقلاب کے

بعد اخوان کی منزل مقصود کیا ہے۔ اس بیان میں انہوں نے اور باتوں کے علاوہ اس پر زور دیا تھا کہ مصر میں جلد از جلد ایسی مجلس آئین ساز منتخب کی جائے جو ملت اسلامیہ کے بنیادی عقائد پر مبنی دستور تیار کرے۔ ہضیبی کے اس بیان سے فوجی حکام بالعموم اور جمال ناصر بالخصوص اخوان سے ناراض ہو گئے۔ اس کے بعد متعدد ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے یہ خلیج اور کشادہ ہو گئی۔ حکومت نے اخوان کو سرکاری جماعت ''نیشنل ریلی'' میں ضم کرنا چاہا تو اخوان نے جو ایک دینی جماعت کہہ کر اس میں ضم ہونے سے انکار کر دیا۔ اخوان کو تین وزارتیں بھی پیش کی گئیں، لیکن انہوں نے یہ پیش کش بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم حکومت کے لیے بے لوث خیر خواہ ہیں۔ اگر حکومت اچھا کام کرے گی تو ہم تائید کریں گے، لیکن اگر غلط کام کرے گی تو ٹوکیں گے۔

جب اخوان کسی طرح قابو میں نہ آئے تو جمال ناصر نے، جو جنرل نجیب کے عہد میں مجلس وزراء کے رئیس تھے، اخوان کے خلاف الزام تراشیاں شروع کر دیں اور ان پر دہشت پسندانہ سرگرمیوں کا الزام لگایا۔ حسن الہضیبی نے ناصر کے نام ایک خط میں ان تمام الزامات کی تردید کی اور لکھا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ رات دن بغیر کسی محافظ کے تنہا کہیں بھی جگہ اطمینان سے آجا سکتے ہیں۔ مجال ہے کہ کوئی اخوان آپ کی طرف انگلی بھی اٹھائے۔ جس کا اندیشہ موہوم آپ کو لاحق ہے۔ ہضیبی نے خط میں یہ بھی لکھا کہ دلائل کے ساتھ واضح طور پر بتا دیا جائے کہ جس راستے پر ہم گامزن ہیں، وہ قوم کی سلامتی اور بھلائی کا راستہ ہے یا جس پر آپ چلا رہے ہیں، وہ صحیح راستہ ہے۔ یہ بات واضح ہو جائے تو ساری قوم مطمئن ہو سکتی ہے۔

حسن بن اسماعیل الہضیبی

جن حالات کی وجہ سے اخوان المسلمین اور جمال عبدالناصر کی حکومت میں تصادم ناگزیر ہو گیا، وہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ 13 جنوری 1954ء کو اچانک اخوان المسلمین کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور حسن الہضیبی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اخوان کی سرگرمیاں اس پابندی کے بعد بھی ختم نہیں ہوئیں۔ 7 مئی 1954ء کو حکومت نے جب انگریزوں سے معاہدہ کیا تو اخوان نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اس معاہدے کو برطانیہ کے ہاتھ مصر کو فروخت کر دینے کے مترادف قرار دیا۔ اس معاہدے کی مخالفت کرنے کی وجہ سے حکومت نے 10 ستمبر 1954ء کو روزنامہ ''اخوان المسلمون'' کو بند کر دیا۔ 26 اکتوبر کو ناصر کے اوپر قاتلانہ حملہ ہوا، جس نے ناصر کو اخوان کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اخوان بار بار تردید کرتے رہے، لیکن ناصر نے اس حملے کا ذمہ دار اخوان ہی کو قرار دیا اور اس کی آڑ لے کر اخوانی کارکنوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ مصر کے ایک اخبار ''المصری'' کے ایڈیٹر احمد ابوالفتح کے بیان کے مطابق، چند ہفتوں کے اندر اندر گرفتار ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ ان میں سید قطب اور عبدالقادر عودہ جیسے مفکر اور ادیب بھی شامل تھے۔ 7 نومبر 1954ء کو فوجی عدالت نے چھ ممتاز رہنماؤں کو صفائی کا موقع دیئے بغیر سزائے موت کا حکم سنایا۔ حسن الہضیبی کو بھی سزائے موت دی گئی، لیکن بڑھاپے کی وجہ سے پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔

''اخوان'' جیسی عظیم الشان اسلامی تحریک کے صف اول کے قائدین کے حالات سے ہمارے پاکستان کے اکثر و بیشتر لوگ بے خبر ہیں۔ اس وجہ سے ضروری سمجھا گیا ہے کہ چیدہ چیدہ رہنماؤں کے حالات زندگی بھی بیان کر دیے جائیں۔

مرشد عام الہضیبی کے حالات

1949ء میں مرشد اول حسن البناء کی شہادت کے بعد اخوان المسلمون کی جدوجہد ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اگرچہ وزیراعظم ابراہیم الہادی پاشا جولائی 1949ء میں مستعفی ہونے پر مجبور ہوگیا تھا اور اس کی جگہ نئے انتخابات تک حسین سری پاشا کو نگران حکومت کا سربراہ بنایا گیا تھا، لیکن اخوان کی سرگرمیاں تقریباً معطل ہی رہیں۔ اخوان کے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ مرشد عام کا انتخاب اور اخوان کی سرگرمیوں کو معمول پر لانا تھا۔ حسین سری پاشا کی حکومت میں گرفتار شدہ اخوانی بتدریج رہا ہونے شروع ہوگئے تھے۔ نئے انتخابات 1950ء میں منعقد ہوئے۔ وفد پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں، جس کے نتیجے میں مصطفیٰ نحاس پاشا وزیراعظم بنائے گئے۔ ان کے اقتدار پر آتے ہی اخوان نے سکھ کا سانس لیا اور صالح عشاوی ڈپٹی لیڈر کی رہنمائی میں کام کا آغاز کر دیا گیا۔ مشاورتی اسمبلی نے کثرت رائے سے حسن بن اسماعیل الہضیبی کو نیا مرشد عام منتخب کیا۔ وہ نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ 1954ء سے لے کر اپنی وفات (1971ء) تک زیادہ عرصہ قید و بند میں گزارا۔ اس عرصے میں آپ پر اتنی سختیاں کی گئیں کہ ایک سے زیادہ مرتبہ دنیا کے مختلف ممالک میں آپ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ حتیٰ کہ 1967ء میں بیروت اور کویت کے اخبارات نے نہایت وثوق سے یہ خبر شائع کی کہ وہ قید خانے میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ جمال ناصر کی وفات کے بعد آپ جیل سے رہا ہو کر 1972ء میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو اخوانی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ایک دفعہ پھر یہ امید پیدا ہوگئی کہ اخوان ان کی قیادت میں دوبارہ سرگرمی سے کام شروع کریں گے۔ لیکن مسلسل بیماری، تشدد اور قید تنہائی کے باعث آپ کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چنانچہ اگلے 11 نومبر 1973ء بمطابق 13 شوال 1393ھ کو انتقال فرما گئے۔ مصر کے سابق صدر جنرل نجیب نے اپنے تعزیتی پیغام میں آپ کو ''مصر کا عظیم انسان'' کے نام سے یاد کیا۔

ابتدائی حالات

حسن بن اسماعیل الہضیبی 1891ء/1309ھ شبائی بن کے علاقے عرب الصوالحہ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم قریبی قصبے قطب سے حاصل کی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو والدین کی خواہش تھی کہ ان کا فرزند جامعہ الازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ لیکن آپ کا ارادہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ چنانچہ والدین کی خواہشات کے باوجود آپ قاہرہ کے لاء سکول میں داخل ہوگئے 1915ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی اور قوم پرست لیڈر حافظ محمد رمضان کے نائب کی حیثیت سے پریکٹس کرنے لگے۔ 1919ء میں سعد زغلول پاشا نے انگریزوں کے خلاف تحریک چلائی تو حسن البناء کی طرح آپ بھی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے۔ نو سال پریکٹس کرنے کے بعد مارچ 1942ء میں آپ اپیل کورٹ کے جج بنا دیے گئے۔

مسلسل ستائیس برس تک آپ محکمہ قانون سے وابستہ رہے۔ 1951ء میں اخوانی رہنماؤں کے مشورے پر سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ کر خود کو اخوان المسلمین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی شادی شاہی خاندان کے چیمبر لین نجیب سلیم کی بیٹی سے ہوئی۔

اخوان المسلمین میں شمولیت

حسن ہضیبی نے اخوان المسلمون میں اپنی شمولیت کے بارے میں لکھا ہے: ''ایک روز چند دیہاتی نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ میں پہلی مرتبہ ان سے ملا۔ اپنے سے بڑوں سے ملنے میں نوجوانوں کے اندر جو جھجک پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ بڑوں سے ملاقاتوں سے جھجکتے ہیں، یہ سب کچھ ان میں نہیں تھا۔ ان کے رویے میں جرأت، یقین اور اعتماد تھا۔ باتیں ہونے لگیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ دیہات کے رہنے والے، معمولی پڑھے لکھے، کتنے ادب اور اعتماد کے ساتھ بڑوں کے پاس بیٹھے ہیں۔ مجھے ان میں ذرہ برابر تصنع اور بناوٹ کی جھلک نظر نہیں آئی۔ وہ سب کو برابر سمجھتے ہیں۔ یہ محسوس نہیں کرتے کہ کوئی ان سے بڑا بھی ہے۔ مصر کے مسائل کے متعلق وہ ایسے انداز میں باتیں کرتے رہے، جیسے کوئی مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان باتیں کر رہا ہو۔ مسائل کا حل بھی ان کے پاس تھا۔ دینی مسائل میں بھی ان کی گفتگو نہایت سلجھی ہوئی، سنجیدہ اور تقلید سے یکسر آزاد تھی۔ صرف دینی مسائل ہی پر نہیں، بلکہ دنیاوی مسائل پر بھی بولنے کی قدرت رکھتے تھے۔ مجھے ان کے رویے اور انداز کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا کہ تم لوگوں نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا ہے؟ کہنے لگے: ''اخوان المسلمین'' سے۔ ہم ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی دعوت ہمہ گیر ہے۔ تربیت، اخلاق، سیاست، معیشت، معاشرت کی اصلاح اور تمام چھوٹے بڑے مسائل پر حاوی ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس جماعت کے ہمہ گیر نظریے سے الگ نہیں۔۔۔۔۔ اس دن سے مجھے اخوان کی تحریک سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے ان کا لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا۔ داعی سے تعارف کا موقع پیدا ہوئے بغیر ان کی دعوت سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ میں نے اسے ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودوں سے پہچانا تھا''۔

خفیہ رکنیت اور سرگرمیاں

1942ء سے 1951ء تک آپ اخوان کے خفیہ رکن رہے۔ حسن البناء کی شہادت کے بعد مکتب ارشاد (اسمبلی) نے آپ کو مرشد عام مقرر کیا۔ یہ عہدہ آپ نے اس شرط پر قبول کیا کہ جتنی دیر وہ سرکاری ملازمت میں رہیں گے، اسے خفیہ رکھا جائے گا۔ چنانچہ ڈپٹی لیڈر صالح عشاوی مرشد عام کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1951ء میں آپ کی خفیہ رکنیت ختم کر دی گئی۔ تو آپ نے سرکاری ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور عملی سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ 7 اکتوبر کو اخوان نے مرشد عام کے انتخابات منعقد کرائے۔ کل پانچ امیدواروں میں سے کونسل نے آپ کو تا حیات مرشد چنا۔ آپ کے انتخاب کے فوراً بعد استاد صالح عشاوی، حسن الباقوری اور عبدالرحمٰن السندی وغیرہ نے مل کر کونسل پر دستور کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا اور آپ کو مرشد عام تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اخوان میں اندرونی چپقلش شروع ہوگئی اور بدنظمی سے اخوان کی پوزیشن خاصی متاثر ہوئی۔ اخوان کی تاریخ کے اس شدید ترین بحران نے اخوان کے دشمنوں کو کارروائی کا موقع فراہم کیا۔ حسن الہضیبی کو قیادت سے الگ کرنے کے

لیے جمال عبدالناصر کے ایما پر ایک قرارداد تیار کی گئی۔ اخوان کی اندرونی چپقلش سے جو بحران پیدا ہوا تھا گرچہ وقتی طور پر دب گیا تھا، لیکن اس بحران سے سب سے زیادہ فائدہ جمال عبدالناصر اور اس کی انقلابی کونسل کو ہوا۔

مشکلات کا مقابلہ

مرشد عام منتخب ہوتے ہی سب سے پہلا مسئلہ اندرونی بحران پر قابو پانا تھا۔ آپ نے اخوان کی کونسل سے خصوصی اختیارات لے کر سوسائٹی سے ناپسندیدہ عنصر کو نکال باہر کیا۔

دوسرا بڑا مسئلہ شاہ فاروق سے تعلقات کا تھا۔ شاہ فاروق اور اخوان کے تعلقات ابتدا ہی سے ناخوشگوار چلے آ رہے تھے۔ فاروق ہر وقت اخوان کو ختم کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ فاروق کے نزدیک مصر میں بادشاہت کے لیے سب سے بڑا خطرہ اخوان تھے۔ حسن الہضیبی کے مرشد عام منتخب ہوتے ہی شاہی حلقوں کو امید تھی کہ وہ شاہ سے ملاقات کی درخواست کریں گے۔ چنانچہ شاہ کے قریبی حلقوں نے اس سلسلے میں آپ سے ملاقات کی، لیکن آپ نے ملاقات کی درخواست کرنے سے انکار کر دیا۔ بقول عمر تلمسانی: "کہاں مرشد عام اور کہاں مغرور و متکبر فاروق" بالآخر بادشاہ نے آپ کو ملاقات کی دعوت دی جسے آپ نے قبول کر لیا۔ 13 نومبر 1951ء کو آپ شاہ فاروق سے ملے اور اخوان کے بارے میں ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ شاہ فاروق نے حکومت اور اخوان کے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کے لیے تین شرائط پیش کیں۔

1۔ سوسائٹی کو انقلابی عناصر سے پاک کیا جائے۔

2۔ برطانیہ کی مخالفت ترک کی جائے۔

3۔ سوسائٹی (اخوان) کو اینٹی کمیونسٹ تنظیم بنا دیا جائے۔

ان دنوں اخوان برطانوی فوج کے خلاف سویز کے علاقے میں جنگ لڑ رہے تھے۔ آپ نے شاہ فاروق کی یہ شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہی دنوں قاہرہ میں حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ لوٹ مار، تشدد اور آتش زنی کے واقعات پیش آنے لگے۔ ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ حکومت نے آپ کو اور دوسرے اخوان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا، لیکن جلد ہی عوامی دباؤ سے پریشان ہو کر رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد آپ نے شاہ فاروق سے ملاقات کی اور مصر کی بگڑتی ہوئی صورت حال میں عوام کا ساتھ دینے کو کہا اور ساتھ ہی اخوان کے بارے میں شاہ کے خیالات میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ یہ ملاقات بھی ناکام رہی۔

تیسرا بڑا مسئلہ اخوان کی خفیہ سرگرمیوں سے متعلق تھا۔ اخوان کے دشمن اور مخالفین انہی سرگرمیوں کی وجہ سے اخوان کو دہشت گرد اور تشدد پسند تنظیم قرار دیتے تھے۔ حسن الہضیبی کسی قسم کی خفیہ سرگرمیوں پر نہ تو یقین رکھتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کا تحفظ دینے کو تیار تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا کی خدمت میں اخفا نہیں ہونا چاہیے۔ اخوان کی خفیہ سرگرمیوں، جن کا حدود اربعہ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے تک محدود تھا، ختم کی جائیں۔ آپ نے سوسائٹی کے بیشتر ارکان کی مخالفت لے کر خفیہ شعبے کو ختم کر دیا۔

چوتھا بڑا مسئلہ مصری فوج کی خفیہ تحریک "تحریک آزادی پسند افسران" سے تعلقات استوار کرنے کا تھا۔

1952ء میں جب آزاد افسران نے شاہ فاروق کا تختہ الٹا تو اخوان بھی ایک حصہ دار کی حیثیت سے یہ انقلاب برپا کرنے میں شریک تھے۔ انقلاب کے اصل خالق تو اخوان تھے۔ انقلاب کے دوسرے دن رائے عامہ کو ہموار کرنے کا سہرا بھی اخوان کے سر تھا۔ اس کے علاوہ ناکامی کی صورت میں افسروں کو پناہ دینا، ملک سے بحفاظت نکالنا اور شاہ پرستوں سے مقابلہ بھی اخوان کے ذمہ تھا۔

انقلاب کے فوراً بعد انقلابی کونسل نے اخوان المسلمین کو وزارت میں اشتراک کی پیشکش کی۔ حسن الہضیبی نے اخوان اور انقلابی کونسل کے مزاج میں فرق محسوس کرتے ہوئے وزارت میں شرکت سے انکار کر دیا۔ انہی دنوں انقلابی کونسل سے نہر سویز کے علاقے پر برطانوی قبضے کے متعلق مذاکرات کا آغاز ہوا۔ مئی 1954ء میں جب مذاکرات سے تعطل پیدا ہوا تو حسن الہضیبی نے ایک بیان میں کہا:

''ہم اخوان جغرافیائی حدود کے قائل نہیں۔ ہمارا تعلق اسلام کی فلاح و بہبود سے ہے۔ ہم اسلام کے دفاع کی جنگ دنیا کے ہر خطے میں لڑیں گے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اسلام کے دفاع کی جنگ ہمیں سویز میں لڑنا پڑے، بلکہ اگر تیونس میں بھی لڑنی پڑی تو لڑیں گے۔ یہ اسلام کے مفاد میں نہیں ہے کہ جنگ پہلے سویز میں ہو یا تیونس میں۔ ہمارے اپنے ارادے اور منصوبے ہیں ہمارے آزاد کمانڈر ہیں جو عام طور پر وسیع تر مفادات کے نگران و نگاہبان ہیں۔

سیّد قطب تختہ دار پر

مارچ 1946ء میں جب مصر میں ہنگامی حالت کا خاتمہ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ ان میں اخوان بھی تھے لیکن ایک سال کے بعد ہی اخوان پھر ابتلا اور آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ جولائی 1965ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں پکڑ دھکڑ کی ایک نئی مہم شروع ہو گئی، جس کے دوران سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چھ ہزار اخوان گرفتار کر لیے گئے۔ غیر سرکاری اطلاع کے مطابق یہ تعداد پچاس ہزار تک بیان کی گئی ہے جس میں سات آٹھ سو خواتین بھی شامل تھیں۔ جمال عبدالناصر نے روس میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ اخوان نے میرے قتل کی سازش کی ہے۔ میں نے پہلے ان کو معاف کر دیا تھا، لیکن اب معاف نہیں کروں گا۔ حسن الہضیبی بھی دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور ان کو تین سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ جس کی تاب نہ لا کر وہ 8 نومبر 1965ء کو شہید ہو گئے۔

سیّد قطب شہید کے حالاتِ زندگی

اس مرتبہ جو لوگ گرفتار کیے گئے تھے، ان میں سب سے ممتاز شخصیت سید قطب (1906ء۔1966ء) کی تھی جو نہ صرف اخوان کے حلقے کے، بلکہ اپنے زمانے میں مصر کے سب سے بڑے اسلامی مفکر اور ادیب تھے۔ آپ 1906ء میں قصبہ موشیہ کی ایک معزز شخصیت کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد صدیوں پہلے جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوئے تھے۔ آپ کے والد حاجی ابراہیم قطب متوسط درجے کے زمیندار تھے جن کا

زیادہ وقت عبادت اور ذکر الٰہی میں گزرتا تھا۔ آپ کی والدہ سیدہ فاطمہ حسین اپنی دین داری اور قرآن سے طبعی رغبت کے سبب قطب خاندان میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ قرآن مجید سے آپ ی والدہ کی والہانہ محبت نے آپ کی شخصیت و سیرت بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ آپ پیدائشی ذہین و فطین اور قوت حافظہ کی بے پناہ خوبیاں رکھتے تھے۔ چنانچہ اوائل عمری میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے سے حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کے لیے حلوان (قاہرہ کے مضافات کی ایک قریبی بستی) کے ''دار العلوم تجہیزیہ'' میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں آپ کے والدین موشیہ سے حلوان منتقل ہو گئے تھے۔ آپ نے وہیں سے 1929ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1933ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے گریجوایشن کیا اور اسی سال ایجوکیشن میں ڈپلومہ لے کر آپ دار العلوم ہی میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ انسپکٹر آف سکولز بھی مقرر رہے۔ 1933ء سے 1948ء تک آپ ماہر تعلیم، بلند پایہ انشا پرداز، شاعر، افسانہ نویس، ادیب، محقق اور تنقید نگار کی حیثیت سے مصر کے بلند پایہ علمی و ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ 1948ء میں آپ سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے امریکا گئے۔ امریکا میں آپ کا قیام تقریباً ڈھائی سال رہا۔ امریکا سے واپسی پر آپ نے برطانیہ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور سپین کا مطالعاتی دورہ کیا۔

اخوان المسلمون میں شرکت

آپ امریکا ہی میں تھے کہ اخوان المسلمون کے مرشد عام حسن البناء کی شہادت کا واقعہ پیش آیا جس پر امریکا میں بے پناہ خوشیاں منائی گئیں۔ اس سے متاثر ہو کر آپ اخوان میں شامل ہو گئے۔ 1953ء میں آپ نے محکمہ تعلیم کی ملازمت چھوڑ دی اور خود کو اخوان کے لیے وقف کر دیا۔ وہاں روزنامہ ''المسلمین'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر شعبہ نشر و اشاعت کے سیکرٹری مامور ہوئے۔ یہ نازک ذمہ داری آپ کے کندھوں پر اس وقت ڈالی گئی جب اخوان اپنی تاریخ کے سنگین ترین بحران سے گزر رہے تھے۔ جمال عبدالناصر کی انقلابی کونسل اور اخوان میں چپقلش کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان حالات میں آپ روزنامہ ''المسلمین'' کے صفحات پر انقلابی کونسل کے عزائم کے بارے میں بے لاگ تبصرے اور تنقید کر کے عوام کو فوجی جنتا کے اصل کردار سے آگاہ کرتے رہے۔

آخر کار وہی ہوا جس کی نشان دہی سید قطب کے مضامین کرتے رہے تھے۔ ناصر نے میونسپلٹیوں اور جنرل نجیب سے فارغ ہو کر اخوان پر پابندی لگا دی۔ بے شمار لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا، جن میں سید قطب بھی شامل تھے۔ آپ کا جرم صرف یہ تھا کہ آپ انقلابی کونسل پر تنقید کرتے تھے اور آپ کی کتب کے مطالعے سے نوجوانوں میں اسلامی روح بیدار ہو رہی تھی اور اس کے اثرات بہت جلد مصری سوسائٹی پر ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گرفتاری کے وقت آپ شدید بخار میں مبتلا تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ آپ کو ہتھکڑیاں پہنا کر گھر سے جیل تک پیدل لایا گیا۔ مولانا خلیل احمد حامدی ہفت روزہ ''الشہاب'' کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''فوجی افسر جب سید قطب کو گرفتار کرنے کے لیے ان کے گھر میں داخل ہوئے تو سید اس وقت انتہائی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہیں اسی حالت میں پابند سلاسل کر لیا گیا، اور پیدل جیل تک لے جایا گیا۔ راستے میں شدت

کرب کی وجہ سے بے ہوش ہو کر اللہ اکبر وللہ الحمد کے نعرے جاری ہوتے۔ انہیں جب سجن حربی (فوجی جیل) میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازے پر ان کی ملاقات جیل کے کمانڈر اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی۔ جونہی سید قطب نے جیل کے اندر قدم رکھا تو جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے زد و کوب کرتے رہے۔ جیل کے اندر ان پر ایک سدھایا ہوا گرگ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا جو ان کی ران منہ میں لے کر ادھر ادھر گھسیٹتا رہا۔ اس تمہیدی کارروائی کے بعد انہیں ایک کوٹھڑی میں لے جایا گیا اور ان سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل سات گھنٹے تک جاری رہا۔ سیّد قطب کی جسمانی طاقت اگرچہ جواب دے چکی تھی، مگر قلبی حرارت اور سکون و صبر کی طاقت نے انہیں چٹان میں تبدیل کر دیا۔ ان کو طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں۔ مگر وہ اللہ اکبر وللہ الحمد کے سرور جاودانی میں مستغرق رہے۔ رات کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیئے جاتے اور صبح کے وقت بلا ناغہ انہیں پریڈ کروائی جاتی۔ ان مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ 3 مئی 1955ء کو انہیں فوجی ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت موصوف امراض سینہ، ضعفِ قلب، جوڑوں کے درد اور اسی نوعیت کی دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے۔

جولائی 1955ء میں ایک خصوصی فوجی ٹربیونل کے ذریعے آپ پر بغاوت اور تشدد کے مختلف الزامات کے تحت مقدمہ چلا کر پندرہ برس کی قید کا حکم سنایا گیا۔ جیل میں آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ کتب کے مسودے کسی نہ کسی طریقے سے جیل سے باہر رفقاء کو پہنچ جاتے۔ وہ ان کی اشاعت و طباعت کا بندوبست کرتے تھے۔ قرآن مجید کی مایہ ناز تفسیر ''فی ظلال القرآن'' آپ نے جیل ہی میں مکمل کی تھی۔ آخری کتاب ''المعالم فی الطریق'' بھی آپ نے جیل میں مکمل کی۔

دس سال بعد آپ کو عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی ذاتی سفارش پر اگست 1964ء میں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد آپ کو عراقی وزارت تعلیم کی طرف سے ایک اعلیٰ منصب کی پیش کش کی گئی۔ سیّد قطب نے عمر تلمسانی سے مشورہ کیا۔ بقول عمر تلمسانی:

> ''میں نے انہیں مشورہ دیا کہ پیش کش قبول کر لیں اور عراق چلے جائیں۔ انقلابیوں کے عزائم نظر آ رہے تھے، اور میں سیّد شہید کی زندگی کو خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ میرے مشورے کے باوجود سیّد قطب نے فیصلہ کیا کہ اپنی رائے اور عالمانہ فکر کا دفاع کرنے کے لیے مصر ہی میں رہنا چاہیے''۔

مقدمے کی کارروائی

رسوائے زمانہ سیکورٹی پولیس اور سرکاری ''سوشلسٹ یونین'' کے غنڈے مسلسل آپ کے تعاقب میں رہتے۔ ابھی آپ کو رہا ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ امریکی اور روسی حکومت کے اشارے پر دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کی وجہ ایک مقالہ بتائی گئی، جس میں سرمایہ داری، سوشلزم اور مارکسزم کی ناکامی کا ماتم کیا گیا تھا، اور ان کے مقابلے میں اسلام کو ایک برتر اور قابل عمل قوت قرار دیا گیا تھا، لیکن فردِ جرم میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا: تشدد، بم

سازش، جمال عبدالناصر اور دوسری اہم شخصیات کے قتل کی سازش، اور دوسرے بے جا الزامات۔

مصری وکلاء میں سے کسی کی یہ جرأت نہیں تھی کہ اس "باغی" کے مقدمے کی پیروی کے لیے آپ کو پیش کرے۔ سوڈان اور مراکش کے وکلاء، فرانس کی بار ایسوسی ایشن کے صدر ولیم تھارپ، ہیگ کے ہورویل جے ایم وینڈال نے سیّد قطب اور ان کے ساتھیوں کے مقدمے کی پیروی کے لیے درخواستیں دیں، مگر رد کر دی گئیں۔ سوڈان کے دو وکیل کسی نہ کسی طرح مقدمے کی پیروی کے لیے قاہرہ پہنچ گئے۔ انہیں زبردستی قاہرہ سے نکال دیا گیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے مسز آرچر نے مصر کا دورہ کر کے ان مظالم کے خلاف عالمی ضمیر اور رائے عامہ کو جھنجھوڑا، جو اخوانیوں پر جیلوں میں کیے جا رہے تھے۔ گرفتاری سے لے کر مقدمے کی سماعت تک مصری حکمرانوں نے تہذیب اور شائستگی کی تمام حدود پھلانگ کر جس طرح آپ کو تشدد اور تعذیب کا نشانہ بنایا اور وحشیانہ سلوک آپ کے ساتھ روا رکھا، اس کے آگے جرمن نازیوں کے مظالم کی داستانیں ہیچ نظر آتی ہیں۔

مقدمے کی کارروائی کے دوران سیّد قطب نے یہ جانتے ہوئے کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو گا، نہایت سکون اور مدلل انداز سے خطاب کیا۔ آپ کے جیل کے ایک ساتھی احمد رائف مصری کے الفاظ میں:

> "سیّد قطب نے انتہائی کمزوری اور اعصابی ضعف کے باوجود کرنل وجودی کے سامنے کھل کر اظہار خیال کیا اور جو ان کے دل میں تھا، اسے زبان پر لے آئے۔ اس وقت مصری پریس کے مختلف نمائندے بھی موجود تھے۔ اس دور کے مصری پریس کے بارے میں اگر نہایت ہلکے لفظ بھی استعمال کریں تو کہا جائے، کہ وہ کرائے کا ٹٹو پریس تھا۔ سیّد قطب نے کرنل وجودی اور ضمیر فروش پریس کے سامنے اس وحشیانہ تعذیب وتشدد کی داستانیں سنائیں جن کا نشانہ اخوان المسلمین کے ملزموں کو بنایا گیا تھا۔ کمرۂ عدالت میں سیّد قطب کے بیانات کا ردعمل مضحکہ خیز قہقہوں اور تشفی آمیز نظروں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس ردعمل میں پریس بھی شامل تھا اور خفیہ ایجنسیوں کے جلاد اور چمچہ گیر اور کرائے کے نعرے باز حاضرین بھی۔ سیّد نے باوجود اس بات کے کہ وہ ان لوگوں کے عزائم اور اپنے انجام کو بخوبی جان چکے تھے، اپنی بات بے کم وکاست کہہ ڈالی، اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کی ذات پر جیل میں جو کچھ گزری، اس کا انہوں نے اشارہ تک نہ کیا، بلکہ دوسرے اخوانیوں پر جو مظالم توڑے گئے ان کی شکایت کی"۔

نام نہاد فوجی ٹریبونل نے مختصر ترین کارروائی کر کے 19 اگست 1966ء کو دوسرے دو اخوانی رہنماؤں یوسف حواش اور اسماعیل عبدالفتاح کے ہمراہ موت کی سزا سنائی۔ سزا کا حکم سن کر سیّد قطب زیر لب مسکرائے اور فرمایا:

> "مجھے معلوم تھا کہ اس مرتبہ جمال عبدالناصر کی حکومت میرے سر کی طالب ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے اور نہ اپنی موت کا رنج، بلکہ میں اس پر خوش ہوں کہ اپنے مقصد کے لیے جان دے رہا ہوں۔ اس امر کا فیصلہ مستقبل کا مؤرخ کرے گا اور اخوان راہ راست پر تھے یا حکومت"۔

پھانسی کی رات حمزہ لبیونی نے حمیدہ قطب کو، جو خود بھی جیل میں تھیں، بلایا اور پھانسی کے احکامات دے کر کہا "سید قطب اگر اس بات کا اقرار کریں کہ اخوان کا تعلق مصر سے باہر کہیں اور ہے۔ پھر انہیں خرابی صحت کے بہانے رہا کر دیا جائے گا"۔ چنانچہ اس سلسلے میں حمیدہ قطب کی سید قطب سے ملاقات کرائی گئی۔ حمیدہ نے اپنے اور حمزہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سید قطب کو سنائی۔ حمیدہ کے الفاظ میں:

بھائی نے پوچھا، کیا تم اس پر خوش ہوگی۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ وہ بولے نفع و نقصان لوگوں کے قبضہ قدرت میں نہیں ہے، بلکہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ لوگ میری عمر گھٹانے یا بڑھانے کا فیصلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہی تمام چیزوں پر قادر ومحیط ہے"۔

پھانسی کے وقت کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بی بی سی کا نمائندہ مقیم قاہرہ، کہتا ہے کہ "سید قطب تختہ دار کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کوئی دولہا اپنی دلہن کو لینے چلا ہو" اس سزا کے خلاف عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ جمال عبدالناصر کے نام دنیا کے کونے کونے سے اسلام، انسانیت اور انصاف کے نام پر معافی کی اپیلیں کی گئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں تار روانہ کیے گئے، لیکن بزدل ناصر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اچانک 29 اگست 1966ء کو دوپہر کے وقت قاہرہ ریڈیو نے اپنی نشریات روک کر اعلان کیا: "فرعون مصر کے حکم سے اخوان المسلمین کے تین رہنماؤں کو آج فجر کے وقت پھانسی دے دی گئی"۔

سیّد قطبؒ کی آپ بیتی

سید قطب شہید نے اپنے ہاتھ سے تقریباً پچاس صفحات میں ایک تحریر قلم بند کی تھی، جو انہوں نے عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار کی تھی۔ اس تحریر میں "اخوان المسلمین" سے اپنا تعلق اور پیش آمدہ واقعات کے علاوہ سید صاحب نے اپنے ذہنی ارتقا کا سفر بیان کیا تھا، نیز ان الزامات کی تردید کی تھی جو اس پر وقتاً فوقتاً لگائے جاتے رہے تھے۔ یہ تحریر پہلی بار لندن سے شائع ہونے والے عربی ہفت روزہ "المسلمین" نے فروری، مارچ 1985ء میں اپنی پانچ اشاعتوں میں شائع کی تھی۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو جناب محمد اقبال مسعود ندوی نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ یاد رہے کہ جمال عبدالناصر کی حکومت نے کچھ ہی عرصہ بعد 1966ء میں سید قطب کو پھانسی دے دی تھی (س۔ق۔م)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

1948 میں مجھے وزارتِ تعلیم کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھیجا گیا تھا۔ میں اس وقت اخوان کے بارے میں بہت معمولی واقفیت رکھتا تھا، مگر جب 1949ء میں اخوان کے بانی حسن البناء کو شہید کیا گیا تو میں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ تمام امریکی و برطانوی اخبارات نے اس خبر کو بہت اہمیت دی اور اظہارِ افسوس مگر

بباطن خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ انہیں اطمینان اس بات کا تھا کہ اخوان کی جماعت پر پابندی لگا دی گئی ہے، کیونکہ اس جماعت کی وجہ سے شرق اوسط کے حساس علاقے میں مغربی مفادات پر چوٹ آ رہی تھی اور فرنگی تہذیبی قدریں روبہ زوال ہونے لگی تھیں۔

1950ء میں کتنی ہی کتابیں وہاں اس انداز کی شائع ہوئیں۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک امریکی مصنف جیمز ہیوارٹ ڈان کی کتاب ہے جس کا عنوان ہے: ''جدید مصر میں سیاسی اور دینی لہریں''۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ صیہونی سازش پسندوں اور مغربی استعمار کی نظر میں یہ جماعت ان کے مفادات کے لیے کتنی نقصان دہ ہے۔

اسی زمانے کی بات ہے، جب میری کتاب ''اسلام میں اجتماعی عدل'' شائع ہوئی۔ 1949ء کے آس پاس اس میں، میں نے چند سطریں بطور انتساب لکھیں، وہ اس طرح تھیں:

''ان نوجوانوں کے نام جو میرے حسن تخیل میں زندہ و تابندہ ہیں اور جو اس دین کو وہ مقام دلا کر رہیں گے، جس پر یہ ابتدائی زمانے میں فائز تھا۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں گے، خواہ کوئی انہیں ملامت کرے یا ان کا مذاق اڑائے''۔

میری اس عبارت میں کسی فرد یا جماعت کی طرف اشارہ نہ تھا، مگر اخوان کے حلقے میں یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کے مخاطب اخوانی ہیں۔ یہ کتاب ان کے دل کی آواز بھی تھی، اور وہ مصنف کے مکمل طور پر ہم خیال تھے۔ ان کی کوشش رہتی کہ وہ مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ میں 1950ء کے آخر میں واپس مصر آ گیا۔ اب اخوانی نوجوان آ کر مجھ سے ملنے لگے۔ کتاب کے حوالے سے تبادلہ خیال ہوتا۔ جماعت خود اس وقت معتوب تھی۔ اس لیے ان کا کوئی مرکز تھا، نہ سلسلہ وار اجتماعات کا امکان تھا۔

1951ء سے خود میری مصروفیت یہ تھی کہ میں شاہی نظام اور جاگیردارانہ مزاج کے خلاف قلمی محاذ کھول چکا تھا۔ اس سلسلے میں میری دو کتابیں شائع ہوئیں۔ میں نے بے شمار مقالات اور مضامین لکھے اور ہر اس پرچے میں بھیجے جو ایسا مواد شائع کرنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔ بیشتر مقالات ''جدید قومی پارٹی'' اور ''اشتراکی پارٹی'' کے ترجمان جرائد میں چھپے۔ ماہنامہ ''دعوۃ'' اس وقت صالح عشماوی نکالا کرتے تھے۔ یہ اخوان کا ترجمان تھا۔ اس نے بھی میرے مضامین چھاپے۔ کئی مضمون الرسالہ میں بھی چھپے۔ اس وقت یہ سوال پیش نظر نہ تھا کہ میں کس پارٹی کا ہوں یا چھاپنے والا پرچہ کس جماعت کا ہے۔ پھر 23 جولائی 1952ء کو وہ انقلاب آ گیا جس نے شاہی نظام کی بساط لپیٹ دی۔

اب میری تحریریں انقلاب لانے والوں کے ساتھ تھیں، مگر پھر یہ ہوا کہ جیسے جیسے حکومت پر گرفت مضبوط ہونے لگی، انقلاب کی روح غائب ہوتی چلی گئی۔ میں اس تبدیلی کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ پھر بھی یہ کوشش کرتا رہا کہ آزادیٔ رائے سے فائدہ اٹھاؤں اور وہ اسباب سامنے لاؤں جن سے انقلاب نے جنم لیا تھا اور وہ خطرات پیش کروں جو انقلاب کے صحیح راستے سے ہٹنے کی بناء پر پیدا ہو سکتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلامی انداز پر کام کرنے کے لیے اس وقت سب سے موزوں

جماعت صرف 'اخوان' ہے اور یہی واحد تنظیم ہے جو عالم عرب کے وسیع خطے کے اندر اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں قائدانہ رول ادا کر سکتی ہے۔ امریکا کے زمانہ قیام کا میرا مطالعہ بھی تھا کہ ہمارے یہاں جو صیہونی اور مغربی استعماری سازشیں چل رہی ہیں، ان کی تکمیل کی راہ میں اگر کوئی جماعت رکاوٹ بن سکتی ہے تو وہ ''اخوان'' ہے۔ بالآخر 1953ء میں اخوان کی رکنیت میں نے حاصل کر لی۔

میری رکنیت جماعت کے حلقوں میں خوشگوار اثر ہوا۔ منگل کے روز کا مشہور درس قرآن میرے ذمے تھا اور جماعت کے پرچے کی ادارت بھی مجھے سونپی گئی۔ میں نے کچھ پمفلٹ تیار کیے تھے جو ہر ماہ چھپتے تھے۔ اس کے سوا جماعت کے تنظیمی امور اور پالیسی سازی میں میرا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

پھر 1954ء حادثہ پیش آ گیا، جس میں اخوان کے رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ میں بھی اسیروں کی صف میں تھا۔ رہائی مارچ میں ہوئی، مگر 26 اکتوبر کو مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اب الزام یہ تھا کہ جماعت نے ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم قائم کر رکھی ہے اور میں اس کا رکن ہوں اور اس کے پروپیگنڈے کا ذمہ دار ہوں۔ حالانکہ یہ سراسر بہتان تھا۔ جماعت کا کوئی شعبہ نہ تھا اور نہ میرا ایسے کسی شعبے سے کوئی تعلق تھا۔

وہ حادثہ جو آمدہ کے تمام واقعات کا پیش خیمہ بنا، تاریخ میں ''منشیۃ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس حادثے میں یہ ہوا تھا کہ ایک اجتماع میں جمال عبدالناصر پر ایک شخص نے گولی چلائی جو لگ نہ سکی۔ حملہ آور محمود عبداللطیف گرفتار ہوا۔ یہ کہا گیا کہ وہ جماعت اخوان کا رکن تھا اور ان کی سازش پر بھیجا گیا تھا، تاکہ اس طرح اخوان حکومت پر قبضہ کر لیں۔ اس حادثے کا ذکر میں کچھ تفصیل سے کروں گا۔

امریکا کی سازش

یہ 1951ء کی بات ہے۔ ایک صاحب تھے، ڈاکٹر احمد حسین۔ اس وقت وفد پارٹی کی حکومت تھی۔ یہ اس میں سماجی بہبود کے وزیر تھے۔ یہ وزیر صاحب 1951ء میں امریکا کے ایک سرکاری دورے پر گئے، مگر واپس آئے تو اس طرح کہ وزارت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ وزیر اعظم نحاس پاشا نے ممکنہ ترغیبات سے استعفا واپس لینے پر آمادہ کیا، مگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ پھر انہوں نے ایک تنظیم کا بنانے اعلان کیا، جس کا نام تھا ''جمعیت فلاح''۔ اس کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ کسانوں اور مزدوروں کی اجتماعی فلاح و بہبود کا کام کیا جائے اور انہیں معاشرتی انصاف دلوایا جائے۔ اس تمام مہم کی تکمیل کے لیے ایک بھاری بھرکم منصوبے کا اعلان کیا گیا۔

امریکی اخبارات نے اس تنظیم کو جس طرح کھل کر سراہا، اس نے اس کا تعلق اس علاقے میں امریکی سیاست سے واضح کر دیا۔ نوجوان احمد حسین اور اس کی بیوی کے اردگرد جو کسی یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی، مدح خوانی کا ایسا ہالہ کھینچ دیا گیا کہ تنظیم بنتے ہی اس کے بہت سے ممبر ہو گئے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ڈاکٹر احمد حسین سے عمر اور تجربے میں کہیں آگے تھے۔

''جمعیت فلاح'' کے ارکان میں وزیر خارجہ ڈاکٹر محمد صلاح، ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری، مشہور قانون دان اور وزیر تعلیم، اخوان کے ایک زمانے میں رکن اور بعد میں شیخ الازہر شیخ باقوری اور نہ جانے کون کون شامل تھے۔ ظاہر

ہے کہ اس قدر تیزی سے مقبولیت پانا بے معنی ہرگز نہ تھا۔ بہرحال انقلاب پرستوں اور اخوان کے درمیان اختلاف کا آغاز اس تنظیم کی تشکیل کے بعد ہی سے ہوا۔

''جمعیت فلاح'' کے سیکرٹری استاد فواد جلال تھے، جو جنرل نجیب کی سربراہی میں تشکیل شدہ اولین کابینہ میں وزیر رہ چکے تھے۔ حکومت کے حلقوں میں ان کی پہنچ تھی۔ وہ انقلاب پرستوں اور اخوان کے درمیان اختلافات کے بیج بوتے رہے اور کوئی اختلاف سامنے آتا تو اسے اس طرح بڑھاتے کہ رائی کا پہاڑ بنا دیتے۔ جمال عبدالناصر ان پر اعتماد کرتے تھے جس سے وہ فائدہ اٹھاتے۔ یہ باتیں وہ میرے سامنے بھی کیا کرتے، کیونکہ وہ یہی سمجھتے کہ میں انقلابیوں میں سے ایک ہوں اور ان کا ہم خیال۔ کچھ اس وقت تک میرے ساتھ میں انقلابیوں کا معاملہ تھا بھی ایسا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرتے تھے۔ کئی تقریبات میں ان کی نمائندگی میں کرتا اور کئی اہم منصوبوں کے لیے میرا نام زیر غور تھا۔ پھر اس وقت تک فضا ایسی تھی کہ آزادی سے تبادلۂ خیال کر سکتے تھے۔ بہت سے موضوعات ایسے تھے، جن میں جمعیت کے ممبر بھی شریک ہو جاتے، جیسے مزدوروں کے مسائل، کمیونزم کا نقطۂ نظر، بلکہ اور آگے بڑھ کر انتقال اقتدار اور دستور سازی سے متعلق نکات۔ ایسے اہم مسائل پر بھی یہ لوگ مباحثے میں شریک ہو جاتے تھے۔

الغرض میں استاد فواد کے منصوبے اور جمعیت فلاح کی سرگرمیوں کو اس نظر سے دیکھتا تھا کہ یہ ایک امریکی ذہنیت کا حامل ادارہ ہے جس کا امریکیوں سے رابطہ بھی ہے اور اس کا مقصد اخوان اور انقلابیوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنا ہے۔

میں صرف خاموش تماشائی نہ تھا، بلکہ میں نے عملی طور سے اس منصوبے کو ناکام بنانے میں حصہ بھی لیا اور پوری کوشش کی کہ انقلابیوں اور اخوان میں تصادم کی نوبت نہ آنے پائے، مگر مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں کامیاب نہ ہوا اور دوسرا نقطۂ نظر حاوی ہو گیا۔

جس وقت منشیہ کا حادثہ پیش آیا، اس وقت سے اب تک میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ ایک پہلے سے تیار کردہ سازش تھی۔ حادثہ جس طرح پیش آیا اور جو حالات اس وقت پائے جاتے تھے، وہ سب ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں ڈالتے تھے اور لگتا تھا کہ پورا واقع کچھ غیر فطری انداز میں پیش آیا ہے۔ میرا اس وقت غالب احساس یہی تھا کہ اخوان اور انقلاب پرستوں کے درمیان تصادم کی جو سازش چل رہی ہے، یہ حادثہ اس کی ایک کڑی ہے، اور جو نتائج نکلے وہ سراسر غیر ملکی عناصر کے حق میں جاتے تھے۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ مجھے اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ یہ حادثہ امریکی سازش کا نتیجہ تھا۔

1954ء میں فوجی جیل کے ذمہ دار صلاح وسوقی نے مجھ سے اس واقعے کی بابت پوچھ پاچھ کی تھی۔ میں نے صراحت سے اس کے سامنے اپنی رائے رکھی، جس کو سن کر وہ اچھل سا گیا اور کہنے لگا: ''تم جیسا سمجھدار اور تعلیم یافتہ شخص بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک ڈراما تھا؟'' میں نے جواب دیا ''بالکل نہیں۔ میں نے یہ کب کہا کہ وہ ڈراما تھا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے سے طے شدہ سازش تھی، جس کے پیچھے ایک خاص مقصد تھا، جس کی خاطر غیر ملکی ہاتھوں نے اسے اس حد تک پہنچایا'' میرا جواب سن کر وہ کچھ ڈھیلا پڑا، مگر کہا کہ چلو، یہ بھی مان لیں، تب بھی اس حقیقت سے تو

انکار نہ کر سکو گے کہ جس شخص نے یہ کام کیا، وہ اخوان میں سے تھا؟

میرا شعور اس پر مطمئن تھا کہ یہ ایک سازش ہے، مگر میں ثبوت کی تلاش میں تھا، تاکہ حقیقتِ واقعہ تک پہنچ سکوں۔ جب میں 1955ء میں لیمان طرۃ جیل میں بند تھا، دیگر گرفتار اخوانی رہنماؤں سے اس کی تفصیل پوچھی، مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ نکلا جو اس واقعے سے واقف ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ جانتے تھے کہ محمود عبداللطیف نے گولی چلائی خود محمود عبداللطیف کے واقف بھی ایک ہی بات کہتے تھے، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے پیش آ گیا۔ بعض کہتے، اس راز کا انکشاف وقت گزرنے کے بعد ہی ہوگا۔

اس کی شہادت نہ بھی مل سکے، مگر نتیجہ پھر بھی یہی رہے گا۔ میرا احساس یہی کہتا ہے۔ مسئلے کو ایک اور زاویے سے دیکھیے۔ صیہونیت اور مغربی استعمار کی سوچی سمجھی سیاست یہ رہی ہے کہ اگر اس علاقے میں اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہے تو اخوان المسلمین کو راہ سے ہٹانا ضروری ہے۔ یہ سیاست کامیاب ہوگئی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ان سازشوں کو پنپنے کا موقع ملا، اور اب بھی وقت کا تقاضا یہی ہے کہ اسلامی تحریک میں پھر سے روح پھونکی جائے، کیونکہ صرف اسی طرح اغیار کی سازشیں ناکام ہوسکتی ہیں۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر حال میں ادا کرنا چاہیے، خواہ حکومت اپنی بعض مصلحتوں کے سبب اسے پسند نہ کرے۔ حکومت اگر صحیح طرح سے سوچ سکتی ہے تو غلطی بھی کر سکتی ہے اور اس چھان بین کیا جائے کہ اس حادثے کے نتیجے میں ہزاروں افراد ظلم کا نشانہ بنے۔ ہزاروں گھر اور خاندان اجاڑ دیے گئے۔ اگر بات صرف اس قدر ہوتی کہ ایک شخص نے گولی چلا دی تو پھر یہ سب کیوں ہوا؟ اور کیوں غیر ملکی صحافت اور تشہیر بازوں کی بات قبول کر لی گئی کہ اس حادثے کے ذمہ دار اخوان ہیں جن کی بیخ کنی نہ کی گئی تو ملک خطرے میں پڑ جائے گا اور انقلاب باقی نہ رہے گا؟ کیا واقعتاً ایسا ہی تھا؟ کتنی ہی کتابیں لکھی گئیں۔ بے شمار پمفلٹ اور رسالے چھپے۔ یہ بات مغرب میں اس طرح اچھالی گئی کہ جھوٹ سچ لگنے لگا۔ سنجیدہ تجزیوں تک میں یہی نقطۂ نظر دہرایا گیا۔ جانسن رپورٹ تیار ہوئی تھی، دریائے اردن کے بارے میں۔ اس میں بھی یہی بات ابھار کر پیش کی گئی۔

جب ہم نے دیکھا کہ پورا مصری معاشرہ اخلاقی گراوٹ، الحاد اور بے دینی کی لپیٹ میں آ گیا ہے، انتشار بڑھتا جا رہا ہے، اور ان ساری شرپسند طاقتوں کو چیلنج کرنے والی طاقت ''اخوان المسلمین'' کی تھی جسے منظر سے ہٹا دیا گیا ہے تو میرے احساس اور جذبے کی شدت بڑھ گئی۔

جب میں جیل میں تھا تو وہاں کے بے روزن دیوار عمارتوں میں یہ سب کچھ سنتا، نوشتہ دیوار پڑھتا۔ جیل سے باہر آیا تو خود مشاہدہ کیا۔ آنکھوں دیکھا حال کانوں سنی ہوئی باتوں سے بھی زیادہ تلخ تھا۔ پورا معاشرہ ایک بڑی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

بات ذہن نشین کرانی میں جا کر سمجھنے کی ہے۔ صیہونی اور مغربی سازشی عناصر نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر دی ہیں کہ انسانی معاشرے کی شکل ہی مسخ کر دی جائے۔ اس علاقے میں ایسے بے روح جسم رہ جائیں جو بے وقعت انبوہ سے زیادہ نہ ہوں۔ پھر کسی بیرونی حملے کو روکنا کیا، خود آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہیں گے۔ یہاں پہنچ کر دو

اسلحہ بھی بے کار ہو گا جو خواہ کتنا ہی جدید ترین ہو، مگر اصل چیز انسان ہے نہ کہ ہتھیار۔ معاشرہ جب مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے تو پھر لاکھوں افراد پانی کی لہروں پر بہتے خس و خاشاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لہریں اپنی مرضی سے انہیں جدھر چاہیں، بہا لے جائیں۔

حقیقت پسندی سے اگر دیکھا جائے کہ اخلاقی زوال کیوں آیا، تو وہ اخوان المسلمون کو اس محاذ سے ہٹانے کے بعد ہی آیا۔ اس کا تربیتی پروگرام نہ رہا۔ دعوتی سرگرمیاں موقوف کی گئیں تو دماغ میں ہر طرح کے فساد نے ٹھکانا بنا لیا۔ اس طرح یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ اخوان کو منظر سے ہٹانا مغربی سازشوں کی کامیابی کا ثبوت تھا۔

1955ء سے 1962ء تک، تمام وقت میں نے اس پر غور و فکر کیا کہ الاخوان کا خلا کس طرح بھرا جائے گا، تاکہ اس میدان میں تسلسل برقرار رہے۔ پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر کام آگے بڑھنے کا طریق کار کیا ہو اور اس کا آغاز کس انداز سے ہو۔ یہیں سے ایک نئی منزل کے سفر کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں بھی خاص واقعات پیش آتے رہے تھے، جن کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کروں گا۔

جیل یا قتل گاہ

حادثہ منشیہ کے نتیجے میں اخوان کے ساتھ ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا۔ جیلیں بھر گئیں۔ سزا و عذاب کا ایک سلسلہ چلا، جو دراز تر ہوتا گیا۔ گھر اجڑے، بچے اور عورتیں بے سہارا ہو گئے۔ انہیں حکومت سے مدد ملی نہ وہ اپنے وسائل کام میں لا سکے۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا، اور آج بھی یہ کوششیں جاری ہیں جو اگر کامیاب ہو جائیں تو ایک قتل عام ہو کہ بقیہ اخوان بھی صاف کر دیے جائیں۔ تانے بانے اس انداز سے بُنے جا رہے ہیں کہ سب کچھ ہو جائے گا، اصل حقیقت کا علم کسی کو نہ ہو سکے۔

یہ اپریل، مئی 1955ء کی بات ہے۔ گرفتار اخوان کو مصر کی تین جیلوں میں بھرا گیا تھا:

1۔ لیمان طرۃ جیل۔ اس میں تقریباً چار سو اخوان قید میں رکھے گئے۔

2۔ مصر کی جیل۔ یہاں بھی قیدیوں کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔

3۔ فوجی جیل۔ اس میں دو ہزار قیدی تھے۔ ان کا معاملہ نہ تو عدالت کے سامنے لایا گیا تھا، نہ ان کے بارے میں سزا تجویز کی گئی تھی۔

لیمان طرۃ جیل میں جو قیدی تھے، ان میں بعض سابق فوجی افسر بھی تھے، جیسے فواد جاسر، حسین حمودہ، عبدالکریم عطیہ، جمال ربیع۔ ان میں سے میں فقط معروف خضری کو جانتا ہوں۔

جمال ربیع نے ایک منصوبہ تیار کر کے اخوان کے سامنے رکھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ تینوں جیلوں کے قیدیوں میں ایسی مفاہمت ہو جائے کہ ایک ہی طے شدہ وقت پر سب جیل کے ذمہ داروں پر حملہ کر کے انہیں قابو کر دیں۔ وہاں پر موجود اسلحے پر قبضہ کر کے جیل سے باہر آ جائیں اور انقلاب لانے کی کوشش کریں۔ اخوان کے حامی فوجی ان کا ساتھ دیں گے۔ اس منصوبے کی فوجی تفصیلات تک میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بہرحال بنیادی نکتہ یہ تھا کہ دریائے نیل

کے یا قصرِ صدارت پر سہ کر دیا جائے گا تو انقلاب کامیاب ہو جائے گا۔ اس طرح کی تفصیلات میں نے اس وقت سنی تو تھیں مگر لغو خیال کر کے میں نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

جمال ربیع نے یہ منصوبہ خود اس کے بقول فواد جاسر اور حسین حمودہ کے سامنے رکھا تھا، مگر انہوں نے بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ پھر صالح ابو رفیق سے بات کی تو انہوں نے اسے ڈانٹ دیا اور سختی سے ایسے اقدام سے روکا۔ صالح ابو رفیق نے یہ بات مجھے بتائی۔ پھر جمال ربیع نے خود مجھ سے بات کی اور کہنے لگا: ''جماعت اخوان تو ایسے جی دار لوگوں سے خالی ہے جو اس منصوبے کی تکمیل میں میرا ساتھ دینے کی ہمت کریں''۔ میں عسکری باریکیوں سے واقف نہیں، مگر میں نے یہی سمجھا تھا کہ یہ خودکشی کا منصوبہ ہے، جس پر غور کرنا بھی پاگل پن ہے۔۔۔۔۔ مگر وہ تھا کہ مجھ سے بار بار اس منصوبے پر کام آگے بڑھانے کے لیے کہتا اور یہی دعویٰ کرتا کہ یہ منصوبہ ہر اعتبار سے قابلِ عمل اور مکمل ہے۔ میں ان دنوں لیمان طرۃ میں قید تھا۔ اس وقت تک مجھے عدالت میں پیش کیا گیا تھا نہ میرے خلاف چارج شیٹ لائی گئی تھی۔ اس دوران میری بیماری نے شدت اختیار کر لی اور میرے پھیپھڑوں پر ورم آ گیا، جس سے خون رسنے لگا۔ اس لیے مجھے 5 جنوری 1955ء کو جیل کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ علاج سے میری حالت کچھ بہتر ہوئی تو پھر جیل لوٹا دیا گیا اور عدالت کے سامنے پیش کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔۔۔ جمال ربیع اس وقت مجھ سے ملا اور پھر کہنے لگا: ''آپ معروف خضری سے مل کر اس منصوبے پر بات کیجئے گا''۔ میں نے اس کی بات سنجیدگی سے کبھی نہ سنی تھی۔ بہرحال یہ وعدہ کر لیا کہ معروف سے بات کروں گا۔

جب معروف خضری سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اس کے سامنے یہ منصوبہ رکھا اور اس سے پہلے کہ وہ یہ معلوم کرتا کہ یہ منصوبہ کس کے ذہن کی پیداوار ہے، وہ ایک دم طیش میں آ گیا اور جھلا کر بولا: ''یہ اخوان کے قتلِ عام کی سازش ہے۔ یہ کامیاب ہو گئی تو جو جیل میں ہیں، وہ بھی صاف کر دیے جائیں گے اور جو جیل سے باہر ہیں، وہ بھی''۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہ منصوبہ پیش کس نے کیا ہے؟ میں نے جمال ربیع کا نام لیا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ دونوں دوست ہیں اور جب گرفتار ہوئے تو وہ دونوں ایک ہی جگہ سے پکڑے گئے تھے۔ اس نے کہا: ''نہ نہ۔۔۔۔۔ یہ خودکشی کی کوشش ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا بھی غلط ہے''۔

پھر میرا مقدمہ چلا اور مجھے لیمان طرۃ جیل میں واپس بھیج دیا گیا۔ وہاں میں نے جمال ربیع کو معروف خضری کی رائے سے آگاہ کیا لیکن وہ پھر بھی جیل میں قیدی اخوان کو آمادہ کرتا رہا کہ وہ اس منصوبے پر عمل کریں، مگر اسے کسی کی حمایت حاصل نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں لیمان طرۃ جیل میں جو فوجی پلٹن متعین تھی، اس کا کمانڈر کیپٹن عبدالباسط بنا تھا۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ جیل کے ہسپتال میں آتا تو وہاں اس طرح کی باتیں کرتا کہ کوئی ایسا راستہ نکالا جائے کہ اخوان جیل کے اسلحے پر قبضہ کر لیں، جیل سے باہر آ جائیں اور انقلاب لائیں۔ جیل کی بامشقت زندگی ختم کرنے کا یہ واحد طریقہ ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کیپٹن عبدالباسط بنا اپنے سگے بڑے بھائی حسن البناء کی زندگی میں بھی الاخوان المسلمین سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ مگر ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا: ''یہ سب ہوگا کیسے؟'' اس نے جواب دیا:

''میں ایک پلٹن کا کمانڈر رہوں۔ اپنی خدمات اور اپنی پلٹن کا سارا اسلحہ اخوان کے سپرد کردوں گا۔ بہر حال کچھ ہونا چاہیے کیونکہ اخوان پر بے پناہ مظالم ٹوٹ رہے ہیں''۔ میرے ذہن میں کیپٹن کی بات سن کر جمال ربیع کا منصوبہ گونجنے لگا۔ معروف خضری کی آواز کانوں سے ٹکرائی: ''یہ اخوان کے قتل کی سازش ہے۔ پھر وہ دونوں تین بجیں گے نہ جیل سے باہر۔'' میں نے اس سے کہا: ''ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کردیا ہے اور ہماری ذمہ داری جیل میں داخل ہونے کے بعد ختم ہوگئی۔ اب ہمیں کچھ اور نہیں کرنا۔ کسی کا دل چاہتا ہے تو وہ شوق سے کرتا پھرے''۔

اس کے کچھ عرصہ بعد اس کی پلٹن کہیں اور منتقل کردی گئی۔ ادھر ایک تبدیلی یہ آئی کہ یہاں موجود اخوان کے سرکردہ رہنما دوسری جگہوں پر منتقل کردیئے گئے۔ قتل کا منصوبہ اس وقت تو کامیاب نہ ہوسکا، مگر 1957ء میں لیمان طرۃ جیل کے اندر ایک قتل عام ہو ہی گیا۔۔۔ اس وقت ایک ایسا افسر ہوا کرتا تھا۔ کیپٹن یا لیفٹیننٹ رینک کا۔ اس کا نام تھا عبداللہ ماہر۔ اسی جیل میں پانچ یہودی نوجوان تھے جو کسی جاسوسی سکینڈل میں سزا بھگت رہے تھے۔

عبداللہ ماہر کا ان سب سے عجیب نوعیت کا تعلق تھا۔ وہ ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا۔ ان کا کھانا گھر سے آتا، جو انہیں پہنچا دیا جاتا، حالانکہ اس جیل میں کسی قیدی کو یہ سہولت نہ مل سکتی تھی۔ ان کی کئی ضرورتیں اسی طرح پوری ہوجاتی تھیں۔ ایک یہودی کی بہن بھی آتی جاتی تھی۔ اس سے بھی عبداللہ ماہر بہت قریب تھا اور اس کا تعلق ایسا ہوگیا تھا کہ جیل کے تمام قیدی واقف ہوگئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس فوجی افسر نے یہ وطیرہ بنالیا کہ موقع بے موقع اخوان کو چھیڑتا، اشتعال دلانے کی کوشش کرتا اور ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتا کہ بات آگے بڑھ کر مار پیٹ تک پہنچ جائے۔ جیل کے ذمہ دار اسے تو نظر انداز کردیتے اور اخوان کو سزا دیتے۔

ایک بار کچھ اخوان نوجوانوں نے اس کی اور اس کے ساتھی افسر کی حرکتوں سے تنگ آکر ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا کہ اب وہ مزید برداشت نہیں کریں گے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اس وقت وہاں اخوان کے رہنما تھے ہی نہیں، صرف نوجوان تھے، جنہیں قابو میں کرنے والا وہاں کوئی نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ ان افسروں سے ان کی ہاتھا پائی ہوگئی۔ دوسرے قیدیوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اخوان کی سزاؤں میں اضافہ ہوگیا، مگر عبداللہ ماہر اور اس کا نائب افسر برابر فضا کو مسموم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور کسی نہ کسی حیلے بہانے چھیڑ چھاڑ شروع کردیتے۔ زیادہ تر اخوان قید با مشقت کاٹ رہے تھے۔ انہیں ایک پہاڑ پر لے جاکر ان سے پتھر تڑوائے جاتے۔ ایک دن ان کے کانوں میں یہ بھنک پڑی کہ جب پہاڑ پر جائیں گے تو انہیں گولیوں سے اڑا کر مشہور کردیا جائے گا کہ وہ بھاگنے کی کوشش میں مارے گئے یا یہ کہ وہ حکم عدولی کررہے تھے۔ بہر حال اخوان اس دن اپنی کوٹھڑیوں سے باہر نہ نکلے اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنے وکیل کو بلا کر یہ اطلاع اس کے نوٹس میں لائیں گے۔ ان ظالموں نے اس اطلاع کی تردید کرنے کی بجائے انہیں کوٹھڑیوں ہی میں بھون ڈالا۔ اکیس اخوان موت سے ہمکنار ہوئے اور اتنے ہی زخمی۔

یہ کھلی حقیقت ہے کہ جب وہ لوگ قید خانے میں تھے اور ان کی سرزنش کرنا ہی تھی تو اور بھی طریقے اختیار کیے جاسکتے تھے، مثلاً یہ کھانا پینا بند کردیا جاتا۔ وہ کب تک اپنی ضد پر اڑے رہتے، ایک دن ڈھیلے پڑ جاتے۔ لیکن جو کچھ

ہوا اور جس طرح ہوا، اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ یہ طے شدہ سازش تھی، جسے خفیہ ہاتھ کامیاب کراتے رہے۔ اس خفیہ ہاتھ کا نام جان لینا اتنا اہم نہیں، جتنا یہ سمجھ لینا کہ اخوان المسلمین کا خاتمہ ہی غیر ملکی مفاد میں تھا۔ اس کام کے لیے ہر طرح کے وسائل اختیار کیے گئے، جن میں گھر اجاڑنا بھی شامل تھا، قتل کرنا بھی، جسمانی تشدد بھی اور ذہنی اذیت میں مبتلا کرنا بھی۔

پھر اسے بھی صرف اتفاق کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ صلاح دسوقی صاحب ہی لیمان طرۃ جیل کے سانحۂ قتل کی تحقیقات پر کیوں مامور کیے گئے۔ اخوان میں یہ عام طور سے مشہور تھا کہ ابتدائی عدالتی تحقیقات میں انہیں مظلوم قرار دیا گیا تھا، مگر جیسے ہی صلاح دسوقی آئے، تحقیق نے نیا موڑ لیا اور اب اخوان مجرم قرار پائے۔ مان لیجیے کہ اس افواہ میں حقیقت نہ تھی، مگر عدالت نے جو رخ اختیار کیا اور جو فیصلہ سنایا گیا، وہ تو سب کے سامنے ہے، اس سے تو افواہ کی صداقت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ مسئلہ صرف اس حد تک نہ تھا کہ ایک واقعہ ہوا جس میں اخوان نے حصہ لیا اور افسروں کے ساتھ ہاتھا پائی کی، بلکہ مقصد یہ تھا کہ انہیں کسی بہانے موت کے گھاٹ اتارا جائے۔

لیمان طرۃ جیل کے اس خون آشام حادثے کے بعد وہاں اخوان کے اہم لوگوں میں سے صرف محمد یوسف ہواش اور محمد زہری سلمان رہ گئے تھے۔ محمد زہری سلمان کا مطالعہ اور ذہنی ساخت اس طرح کی تھی کہ ان کے ساتھ اس موضوع پر بات کرنا مشکل تھا۔ صرف ہواش تھے جو اس لحاظ سے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ ہم دونوں نے بہت سا وقت اس غور و فکر میں صرف کیا کہ ''اخوان المسلمین'' کا از سر نو اور بھرپور جائزہ لیا جائے۔

سیّد قطبؒ کی نگاہ میں تحریک اسلامی کی تصویر

اخوان المسلمین اور اسلام کی اولین تحریک کا باہمی موازنہ کر کے ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ عصر حاضر میں اسلامی تحریک کو انہی حالات کا سامنا ہے جو اسلام کی اولین دعوت کے زمانے میں پائے جاتے تھے، خصوصاً اس اعتبار سے کہ موجودہ معاشرہ اسلامی عقائد کی حیثیت سے روشناس نہیں رہا۔ وہ اسلامی نظام اور اسلامی شریعت ہی سے دور نہیں ہوا، بلکہ اس نے اسلامی قدروں اور اسلامی اخلاق سے بھی روگردانی اختیار کر لی ہے۔ ادھر یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف صیہونی اور صلیبی استعماری طاقتوں نے اپنی باہمی رسہ کشی کے باوجود اسلامی دعوت کو مٹانے کے لیے اتحاد کر رکھا ہے اور اسلام کے نام لیوا ادارے اور تنظیمیں، خواہ ان کا دائرہ کار محدود تر ہو، ان کا خصوصی ہدف ہیں۔ اس مقصد کے لیے جس طرح کی سازش کی جائے، اور جو طریق کار اختیار کیے جائیں وہ سب روا ہیں۔

دشمن کا یہ حال ہے کہ وہ اس کام سے کسی لمحے غافل نہیں، مگر اسلامی تحریکات کا یہ مشغلہ رہ گیا ہے کہ محدود علاقائی و ملکی سیاست بازی میں اپنی صلاحیتیں کھپا دیتی ہیں اور یہ طے کرنے میں لگی رہتی ہیں کہ فلاں ملک سے معاہدہ ہو یا فلاں ملک سے اعلانِ جنگ ہو، فلاں پارٹی سے مفاہمت ہو اور فلاں پارٹی سے دشمنی۔ اسلامی تحریکات کا ایک کام یہ بھی ہو گیا ہے کہ وہ حکومتوں سے مطالبہ کریں کہ اسلامی نظام نافذ کریں اور شریعت کے مطابق حکومت چلائیں، جب کہ معاشرہ کا حال یہ ہے کہ وہ اسلامی عقائد اور ان کے تقاضوں کے سمجھنے کے اہل رہے نہیں، نہ عقیدے کے

تحفظ میں کسی حمیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں اور نہ ان کی زندگی میں اسلامی اخلاق کوئی مقام بنا سکتے ہیں۔ اس لیے اسلامی تحریکات کو اپنے کام کا آغاز بالکل ابتدائی سطح سے اور بنیادی فرائض سے شروع کرنا پڑے گا۔

بیداری کے لیے اسلامی عقیدے کا مفہوم دلوں اور دماغوں میں از سر نو پیدا کرنا ہوگا۔ جو دعوت کو جو قبول کرے اور صحیح مفہوم تک پہنچ جائے، اس کی اس طرح تربیت ہو کہ وہ اسلام کے رنگ میں رنگ جائے اور وقتی اور عارضی نوعیت کے سیاسی، بنتے بگڑتے واقعات میں دلچسپی لے کر وقت ضائع نہ کرے۔ نیز اس بے سود کوشش سے بھی بچے کہ اسلامی نظام بزور نافذ کر کے اسلامی حکومت تو قائم کر دی جائے گی، مگر اسلامی معاشرہ اسے ذہنی طور سے قبول کرنے اور خود سے اپنے اوپر وہ نظام نافذ کرنے کا اہل ہو نہ اس کے لیے تیار۔ حالانکہ اگر معاشرہ یہ رنگ اپنا لے تو حکومت کو خود اس راہ پر لایا جا سکتا ہے۔

پوری تحریک کا ڈھانچہ اسی طرح کے تربیتی نظام پر استوار کیا جانا چاہیے۔۔۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو ایک اور منصوبہ بھی تیار کرنا پڑے گا، جس کا مقصد خارجی شب خون سے تحریک کو اور اس سے وابستہ افراد کو بچانا ہو کہ سرگرمیاں بھی جاری رہیں اور تحریکی افراد آسانی سے غیر ملکی سازشوں کو بروئے کار لانے والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بھی نہ بن سکیں، جیسا کہ اخوان کے ساتھ 1948ء، 1954ء اور 1957ء میں ہوا۔ دوسری اسلامی تحریکات کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے، جس کی ایک مثال پاکستان کی ''جماعت اسلامی'' ہے جسے اسلام کی علمبرداری کے نتیجے میں ایسی ہی عالمی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا، جیسا کہ اخوان کے ساتھ ہوا۔

یہ تحفظ کس طرح حاصل ہوگا؟ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ جماعت کے اندر ہی اس کے لیے ایک اعلیٰ تربیت یافتہ شعبہ قائم کیا جائے جو کمانڈوز پر مشتمل ہو جو اسلام کے اصول و احکام کے ماننے والے ہوں، اخلاقی و نظریاتی اعتبار سے دین سے وابستہ ہوں، پھر فن حرب سے واقف ہوں، بہادر اور جاں باز ہوں۔ یہ کمانڈوز کسی طرح بھی اپنی طرف سے زیادتی کا آغاز نہیں ہونے دیں گے۔ انہیں حکومت وقت سے دلچسپی ہوگی نہ اس کے خلاف سیاست بازی سے، اور نہ اکھاڑ پچھاڑ سے۔ اگر تحریک کو اپنے تربیتی منصوبے پر عمل کرنے دیا جائے، افہام و تفہیم کا عمل جاری رہے، اس دعوت کو راستے سے ہٹانے کے لیے کسی طرح کی زیادتی اور طاقت کا استعمال نہ ہو اور اس سے وابستہ افراد بے خانماں برباد نہ کئے جائیں تو یہ کمانڈوز کسی طرح کی مداخلت نہ کریں گے، مگر جب بھی تحریک پر ایسا حملہ ہو تو وہ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور تحریک کی بحالی کی حد تک طاقت کا جواب طاقت سے دیں گے۔

غرض یہ کہ اسلامی نظام کا نفاذ اور اللہ کی شریعت کے مطابق حکومت چلانے کی مہم ایسی نہیں کہ اسے وقتی انداز کی سیاست سے حاصل کر لیا جائے۔ اسے اس وقت تک حاصل ہونا ممکن نہ ہوگا، جب تک خود معاشرہ اس کی طرف پیش قدمی نہ کرے۔

اسلامی تحریک کی یہ وہ تصویر ہے جسے میری حس نے جس طرح اخذ کیا، بھائی ہواش بھی اسی طرح محسوس کر رہے تھے۔ کرنے کا کام یہ تھا کہ اخوان کے دوسرے ارکان تک یہ پیغام پہنچایا جائے اور جو ذریعہ میسر آ سکے، اس کام میں لایا جائے، اور جو ہم آہنگ اور ہم خیال ہوں، ان کے ساتھ تحریک کا آغاز ہو۔

1962ء سے آغاز میں اس تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں نے قید میں بند اخوان سے رابطہ قائم کر کے، ان تک اپنے احساسات پہنچانے شروع کیے۔ یہ قیدی زیادہ تر قناطر جیل کے تھے جو لیمان طرۃ جیل میں علاج کی غرض سے لائے گئے تھے۔ ملنے کا موقع اس وقت آتا جب وہ پریڈ کے لیے جیل کے صحن میں جمع ہوتے۔ ظاہر ہے ملاقاتیں سب سے نہ ہو سکتی تھیں، صرف چند قیدی تھے جن سے ملنے کا موقع ملا۔

میں اس وقت اخوان کی جماعت میں صرف ایک فرد تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اخوان مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور مجھے ایک اسلامی مفکر اور مصنف کے طور پر یوں اہم ممبر مانتے تھے کہ میرے تجربے اور اسلامی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے باوجود جماعت کے تنظیمی ڈھانچے یا اس کی فکری قیادت میں میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ یہ کام صرف رہنما ادارے کا تھا کہ وہ کسی کو وہ ذمہ داری سونپے۔ میں نہ اس ادارے کا ممبر تھا نہ مجھے اس کی طرف سے ایسی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ جو قیدی قناطر جیل سے آئے انہوں نے مجھ سے تبادلۂ خیال کیا کہ اسلامی تحریک کا انداز کیا ہونا چاہیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اسلامی عقیدے کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس وقت انسانی معاشرے اس سے کتنے دور ہو چکے ہیں اور یہی حال مسلمان معاشروں کا بھی ہو چکا ہے، جن کے ہاں دین ایک آبائی میراث کی شکل میں منتقل ہوتا رہا ہے اور اس کی صحیح روح غبار آلود ہو گئی ہے۔

ان ملنے والوں میں سب ایک عمر کے تھے نہ ایک سطح کے۔ بعض مزدور پیشہ تھے اور بعض مختلف سطح کے طالب علم جو ذہنی پختگی کے اعتبار سے ایک سطح کے نہ تھے۔ پھر بعض سے ملاقات صرف گھنٹے دو گھنٹے کی رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے قناطر جیل جا کر جو بات پہنچائی، وہ اس سے مختلف ہو سکتی ہے، بلکہ بگڑی حالت میں بھی پہنچی ہو گی۔ ہاں کچھ نے پوری امانت سے منتقل کیا ہوگا۔ اس وجہ سے انہوں نے مجھ سے ان کتابوں کی فہرست مانگی جو اخوان کے مطالعے میں بنیادی حیثیت سے رکھی جائیں۔ میں نے منتخب کتابوں کی فہرست بنا کر انہیں بھجوا دی۔ پھر ایک تربیتی پروگرام دے دیا جو مختلف گروپوں کے لیے تھا۔

1962ء سے 1964ء تک ایسے ایک سو (100) گروپ بن چکے تھے جو اس طرح تقسیم کیے جا سکتے ہیں: 25 گروپ تو اس مطالعے کے نظام سے ہم آہنگ ہو چکے تھے، اور اسلامی عقیدے کا صحیح تصور، نیز اسلامی تحریک کے صحیح دائرہ کار کو پا چکے تھے۔ تقریباً 23 گروپ وہ تھے جو اس طرز فکر کے مخالف تھے، کیونکہ جماعت کے رہنماؤں کی طرف سے اس کی تائید نہیں ملی تھی۔ تقریباً 50 گروپ وہ تھے جو مطالعے کے مرحلے سے گزر رہے تھے، مگر ابھی کسی واضح نتیجے تک نہ پہنچے تھے، یہاں تک کہ جیل کی مدت ختم ہوگئی اور 1965ء میں سب رہا کر دیے گئے۔

جن حضرات نے مطالعے میں حصہ لیا اور اس فکر کو ہضم کیا، ان میں سرفہرست یہ تھے:

مصطفیٰ کمال، رفعت صیاد، سید عید، فوزی نجم، طوخی، صبری عنتر، عبدالمجید ماضی، وغیرہ۔

وہ لوگ جنہوں نے اس فکر کی شدت سے اور کھل کر مخالفت کی، ان میں سرفہرست یہ تھے: امین صدقی، عبدالرحمن بنان، لطفی نجم، عبدالرحمن جلال وغیرہ۔

وہ گروپ جو اسلام کا صحیح مفہوم پا چکا تھا اور اس کی طرف دعوت بھی شروع کر چکا تھا اس کے کئی افراد مجھ سے

رہائی کے بعد ملنے آئے، مگر ایک تو رہائی کی مدت آٹھ ماہ تھی، پھر ملاقاتیں بھی گنی چنی، وقت بھی کم تھا، اس لیے ان لوگوں کے ساتھ بہت تفصیل سے نشستیں نہ رہیں۔ مصطفیٰ کمال سے میری صرف ایک بار ملاقات ہوئی۔ نعمت صیاد سے چھ بار، سید عید سے دس بار یا کچھ زیادہ، فوزی نجم سے تین بار، طوخی سے تین بار، سید دسوقی سے تین چار بار۔ ان کے علاوہ اور لوگوں سے ایک ایک بار ملا۔

تربیت واصلاح کا نیا انداز

رہائی کے بعد میری ملاقاتیں ان نوجوانوں سے ہوئیں جو اسلامی مزاج رکھتے تھے اور ان کا تعلق الاخوان المسلمین سے باقاعدہ طور پر تھا، جیسے عبدالفتاح اسماعیل، علی عشماوی، احمد عبدالمجید مجدی، صبری وغیرہ۔ ان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے چار سال پہلے ایک تنظیم بنائی تھی۔ اس میں وہ لوگ بھی تھے جو قید ہوئے تھے۔ زیادہ تر گرفتاری سے بچے رہے تھے اور بعض اخوان سے باقاعدہ تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان کا جوڑ اس طرح بنتا گیا کہ ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ تحریک اسلامی کا احیا ضروری ہے، مگر موجودہ حالات میں طرز عمل کو بدلنا ہوگا۔ آغاز میں وہ لوگ اپنے گرفتار ساتھیوں کے خاندانوں کے لیے چندہ جمع کرتے رہے۔ اس دوران میں ایک دوسرے سے تعارف اور تبادلۂ خیال ہوا۔ افکار کی ہم آہنگی سے تعلقات مستحکم ہو گئے تو انہوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ایک جماعت تشکیل دیں گے، تاکہ سب ہم خیال افراد مل کر کام کریں، مگر وہ سب کے سب جوشیلے، ناتجربہ کار نوجوان تھے۔ اس لیے انہوں نے جماعت کے بڑوں میں سے ایسے شخص کو ڈھونڈا جو ان کی رہنمائی کر سکے۔ وہ استاذ فرید [illegible] سے ملے اور قید خانوں میں رہنماؤں سے بھی بات کی، مگر کوئی راضی نہ ہوا۔

اس وقت انہوں نے طے کیا کہ جب میں رہا ہو جاؤں گا تو قیادت مجھے سونپی جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ انہوں نے میری کتابیں پڑھی تھیں۔ میری تقریریں بھی سنی تھیں، اور انہیں اندازہ ہوا تھا کہ میرے افکار، مشاہدے وسعت دیتے ہیں۔ پہلے ان کے خیال میں سارا مسئلہ بس یہی تھا کہ ایک رضا کار فدائی تنظیم بنا کر اخوان کے خلاف ماحول بنانے والے افراد کو ختم کر دیا جائے اور اسلامی نظام کے قیام کا اعلان کر دیا جائے۔ مگر اب انہیں احساس ہوا کہ معاملہ اس سے زیادہ اہم اور وسیع ہے اور کام کرنے کا میدان کہیں بڑا ہے، کیونکہ حکومت بنانے سے پہلے معاشرے کی تربیت و تعمیر ضروری ہے۔

اب مسئلہ قیادت کا تھا، جس کے لیے وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ میرے سامنے دو راستے تھے

(۱) میں ان کے ساتھ تعاون کرنے سے قطعی انکار کر دوں۔ اس لیے کہ تنظیم سازی کا مرحلہ میرے منصوبے کے مطابق بہت بعد کا تھا۔ میں ان کے طریق کار سے متفق نہ تھا، کیونکہ تنظیم میں شامل افراد کی تربیت تو ہوئی نہیں۔ پھر ان سے وہ نتائج کیسے حاصل کیے جا سکتے تھے جو ایک بامقصد تحریک کے لیے ضروری ہیں۔ رشد و درست نظریاتی وابستگی کے بغیر جوش کا شکار ہو جائیں گے اور معاملہ قابو سے باہر ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں ان کے ساتھ تعاون تو کروں مگر اس شرط کے ساتھ کہ طریق کار میں جو بے نظمی ہوئی ہے اس کی تلافی کی جائے اور تحریک اپنے اصلی تصور کی طرف آئے۔ تعاون کرنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی

کہ وہ قابو میں رہیں گے اور جوش میں آ کر غلط قدم نہ اٹھائیں گے۔ خاص طور سے اس لیے بھی کہ وہ اس وقت شدید قسم کے ردعمل کا شکار تھے۔ پھر ان کے ساتھ رہ کر ہی یہ ممکن تھا کہ میں ان کی توجہ اسلامی نظام کے نفاذ سے ہٹا کر عقیدے کی سمت اور اصلاح کی طرف موڑ دوں۔ چنانچہ میں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے از راہِ احتیاط ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ موجودہ حالات میں تحریک اسلامی میں آنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ وسیع النظر، عمیق فہم اور اسلام کی گہری معلومات رکھتا ہو۔ پھر تحریک کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ عالم اسلام کے حالات کیا ہیں۔ گردوپیش میں کیا طوفان اٹھ رہے ہیں۔ دنیائے اسلام کے سامنے چیلنج کیا ہے اور اس کا جواب کیسے دینا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا:

”تم لوگ مجھ سے رہنمائی چاہتے ہو، مگر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں لا علاج بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ یہ درست ہے کہ موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے، لیکن یہ صحیح ہے کہ تقدیر میں اللہ ہی کے پیدا کردہ اسباب اور ظاہری حالات کے مطابق تیاری بھی شامل ہے۔ اس لیے تمہیں یہ بھی کرنا ہے کہ قیادت بھی اپنے اندر ہی سے اٹھاؤ اور ایسے لوگ تیار کرو جو یہ ذمہ داری سنبھال سکیں۔ میری اپنی کوشش تو یہی ہوگی کہ میں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر تمہیں دین سے باخبر کروں اور فکری طور پر تم میں رہنمائی کے جوہر پیدا کروں۔ جہاں تک تمہاری دین داری، تقویٰ، اخلاص اور تعلق باللہ کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ اس اعتبار سے تم لوگوں کا معاملہ قابل اطمینان ہے۔“

سیّد قطب شہیدؒ کی ڈائری کا ایک ورق

بہرحال میں ان کے اجتماعات میں شرکت ہوتا رہا۔ جو کبھی ہفتے دو ہفتے میں ایک بار ہوتے اور کبھی مہینے میں ایک بار۔ اس کی وجہ میری مصروفیت تھی۔ درس کا آغاز میں نے تحریک اسلامی کی تاریخ سے کیا اور انہیں بتایا کہ مخالف کیمپ میں کون کون ہے۔ ہر ایک کا کام کا انداز کیسا ہے اور کون سے راستوں سے حملہ ہوتا ہے۔ اس کیمپ میں مشرک بھی ہیں، بے دین بھی، صیہونی بھی اور صلیبی بھی۔

عالم اسلام کی جدید تاریخ پر بھی میں نے مختصر روشنی ڈالی۔ خصوصاً فرانس کے مصر پر حملے کے بعد جو حالات ہوئے اور ان کے عالم اسلام پر کیا اثرات پڑے، ان کی طرف اشارہ کیا۔ تربیت دینے کے لیے انہیں خبریں سناتا اور ان سے تجزیہ کرنے کے لیے کہتا۔ اسی طرح ان سے کہا کہ کچھ لوگ عالمی خبر رساں اداروں کے نشریے سنیں اور مواد جمع کر کے اس پر تبصرہ کریں اور جو لوگ فرانسیسی اور انگریزی سے واقف ہوں، وہ ان پرچوں کو دیکھیں جو مغرب میں چھپتے ہیں اور جن میں عالم اسلام سے متعلق مضامین ہوتے ہیں۔

اس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ ہم طاقت کا استعمال نظام حکومت کے بدلنے یا اسلامی نظام قائم کرنے میں ہرگز نہیں کریں گے، مگر تنظیم پر آنچ آئی تو جواب دینے میں تامل نہیں کریں گے، تاکہ تنظیم کا یہ مقصد کہ معاشرے میں تربیت یافتہ افراد تیار کیے جائیں اور اسے اسلام کے مکمل نفاذ کی بنیاد بنایا جائے۔ فدائی گروپ بنانے کا مطلب یہ تھا

کہ ان کے لیے اسلحے کی فراہمی ہو اور اس کے لیے مالی وسائل مہیا کیے جائیں۔ جہاں تک تربیت کا سوال ہے تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے ملنے سے قبل ہی وہ مرحلہ طے کر چکے تھے، لیکن انہوں نے ایک پہلو پر توجہ نہ دی تھی۔ وہ یہ کہ تربیت لینے والا صرف وہ شخص ہو جو عقیدے کی پختگی اور دین سے وابستگی میں آگے ہو۔ اسی لیے میں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی تھی اور یہ بھی پوچھا تھا کہ ایسے کتنے افراد ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں۔ بہ حال طے ہوا کہ تربیت کا کام تیزی سے شروع کیا جائے، لیکن اگر صرف باتیں ہی ہوتی رہیں، کام نہ ہوا تو نوجوان مایوسی کا شکار ہونے لگیں گے۔ اس کے ساتھ ان افواہوں نے بھی اس جانب توجہ زیادہ کروادی کہ اخوان کی گرفتاری کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

اسلحے کی فراہمی

اسلحے کی فراہمی کا مسئلہ ایسا ہے کہ اسے دو رخ سے دیکھنا چاہیے:

1۔ مجدی نے مجھے بتایا کہ اسلحے کی فراہمی کا معاملہ خاصا پیچیدہ ہے، حتیٰ کہ تربیت کے لیے بھی اسلحہ دستیاب نہیں ہو رہا، اس لیے گھر بم سازی کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اب تک جو تجربے ہوئے ہیں، وہ حوصلہ افزا ہیں۔ بس ان کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

2۔ ایک مرتبہ علی عشماوی بغیر کسی پیشگی اطلاع کے مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے بتایا کہ دو سال پہلے انہوں نے ایک دوسرے عرب ملکوں کے اخوانی سے کچھ خاص نوعیت کا اسلحہ بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی، لیکن اب ساتھی کا جواب آیا ہے کہ اسلحہ فراہم کیا جا سکتا ہے، جو کافی مقدار میں ہے اور تقریباً دو ماہ کے اندر سوڈان بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ تنی گرفتاریوں سے پہلے کی بات ہے اور اس وقت حالات کے بگڑنے کا اندازہ نہ تھا۔

یہ اطلاع ایک ملی۔ اس لیے باقاعدہ طور پر سب کے ساتھ کچھ طے کرنے کا موقع نہ ملا۔ دوسرے ہی دن شیخ اسماعیل میرے پاس آئے اور ایسا لگا تھا کہ علی عشماوی سے انہیں ساری بات معلوم ہو گئی ہے۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے، کیونکہ وہ اس طرح کا منصوبہ پسند نہ کرتے تھے۔ مجھ سے کہا کہ اس موضوع کو ہضیبی کے آنے تک ملتوی کر دیا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم نے بھی یہی طے کیا ہے کہ سب جمع ہو کر مشورہ کریں گے۔

سب جمع ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ لیبیا کا راستہ چنتے ہیں تو میں بھی ایسے افراد کو جانتا ہوں جو اس کام میں مدد دے سکتے ہیں۔ یہ لیبیا کے دو اخوانی تھے جو جیل میں ساتھ رہے تھے۔ ایک طیب شین جو مرس سیان کے علاقے میں بنیادی تعلیم گاہ میں استاد تھے جو ڈرائیور لیبیا سے مصر تک کا صحرائی علاقہ طے کرتے تھے، ان سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ دوسرے مبروک نامی ایک شخص تھے، جنہوں نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ مصر اور لیبیا کے درمیان چلنے والے قافلوں میں ان کے بعض رشتے دار بھی کام کرتے ہیں۔ اس وقت میں نے زیادہ دلچسپی نہ لی تھی اور نہ پوچھا تھا کہ وہ قافلے کس طرح کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بس یہ کہا تھا کہ آپ کو لیبیا سے کچھ منگوانا ہو تو بہت حفاظت سے آپ تک پہنچ جائے گا۔ وہ تجارت بھی کرتے تھے اور دوران گفتگو ذکر آیا کہ وہ مصر میں بنی

ان کا مرشد حسن ہضیبی کے گھر میں آنا جانا تھا اور وہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔

ان حالات سے یہ نتیجہ تو نکالا جا سکتا تھا کہ لاوا پک رہا ہے اور اخوان کو کسی نئی سازش میں پھانسنے کے لیے جال پھیلایا جا رہا ہے۔ اخوان جائیں گے تو یہ تنظیم بھی زیر عتاب آئے گی۔ اس لیے ضروری تھا کہ فوجی تربیت جلد از جلد مکمل کی جائے مگر وسائل تو تھے نہیں، اس لیے منصوبہ کاغذ کی حد تک ہی رہا۔

ان نوجوانوں کے ساتھ یہ میرا آخری اجتماع تھا۔ ان میں سے، بس شیخ عبدالفتاح اسماعیل اور علی عشماوی سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی تھی، مگر اس وقت یہ نہ پوچھ سکا کہ تربیت رک گئی یا چل رہی ہے۔ پھر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ اخوان پکڑے گئے، مگر اس تنظیم کے افراد آزاد تھے۔ منصوبے کی منظوری اور گرفتاری کے درمیان مختصر وقفے میں ظاہر ہے کہ تربیت نہیں ہو سکتی۔

میں نے زینب غزالی کے ذریعے اشارہ بھیجا کہ وہ سوڈان کا منصوبہ یعنی اسلحے کی فراہمی ترک کر دیں اور دوسرے اقدامات بھی نہ کیے جائیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ یہ پابندی عارضی ہے یا مستقل۔ میں نے کہا کہ یہ عارضی پابندی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ بھرپور حملہ کرنے کا موقع مل جائے، اس پر غور کیا جا سکتا ہے، چونکہ ایسا موقع نہ ملا، اس لیے عملاً یہ منصوبہ ترک ہی ہو گیا۔

اولین اجتماعات میں زیادتی کا جواب دینے کے متعلق تجویزیں چل رہی تھیں۔ ایک تجویز یہ آئی کہ مواصلات کا نظام تباہ کر دیا جائے۔ پل اڑائے جائیں۔ اس طرح حکومت فوری حرکت سے باز رہے گی، مگر یہ تجویز پسند نہ کی گئی، کیونکہ اس سے سب عام لوگ متاثر ہوتے۔

میں نے ایک بار کہا تھا کہ صیہونیت کے حامی اس خطے کو برباد کرنے کے لیے انسان کی روحانی طاقت کمزور کرنے کے سبب فحاشی، الحاد، منشیات اور اخلاق سوز لٹریچر پھیلائیں گے اور اقتصادیات کی کمر توڑنے کے لیے معاشی بد حالی لائی جائے گی جس کے بعد فوجی حملہ ہو گا۔ چنانچہ فیصلہ یہی ہوا کہ صرف وہ عمارتیں تباہ کی جائیں، جن سے حکومت کا کام متاثر ہو، اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ مگر بات آگے کیسے بڑھتی؟ سرمایہ تھا، نہ اسلحہ اور نہ تربیت۔

مصر کے باہر کے اخوان

پچھلے سال ہی کی بات ہے کہ بھائی علی عشماوی نے مجھ سے کہا کہ مصر میں عراقی اخوان کے ایک نمائندے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ مصر میں اپنی تعلیم مکمل کر کے عراق لوٹ رہے ہیں۔ ان کا نام عاصم ہے۔ میں نے انہیں وقت دے دیا۔ وہ آئے اور ان سے خاصی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ موضوع سخن مختلف ملکوں میں اخوان کے حالات رہے۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ بیرونی اخوان مصر کی جماعت خوان کو اپنا قائد مانتے ہیں، اس لیے اس سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں، مگر یہاں کی قیادت ان سے رابطہ رکھتی ہے نہ کوئی مشورہ دیتی ہے، جس کی وجہ سے ہر گروپ اپنے اجتہاد سے کام لے کر مناسب طریق کار اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اس بات پر کبیدہ خاطر تھے کہ مصر کے اخوان میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا۔۔۔۔

میں نے تحریک چلانے کے سلسلے میں ان سے کہا کہ نظام کے قیام سے پہلے عقیدے کی حقیقت سمجھائی جائے۔ تنظیم سے پہلے افراد کی تربیت کی جائے، اور ''اسلامی انقلاب'' لانے کو مقصد بنا کر ساری جدوجہد ضائع نہ کی جائے۔ اسی طرح تحریک کو وقتی سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بچا کر رکھا جائے۔

کچھ ماہ کے بعد ساتھی عراق سے پھر مصر آئے تو مجھ سے ملے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ عراق کے اخوان نے ہمیں پابند کیا ہے کہ ہم آپ سے رابطہ رکھیں، کیونکہ آپ کا طرز فکر اور طریق کار ہمارے انداز سے قریب تر ہے۔ پھر انہوں نے مجھے 200 پونڈ بطور ہدیہ دیے۔ میں نے یہ رقم علی عشماوی کے سپرد کی۔ اس کے بعد ان سے رابطہ نہ رہا۔

گزشتہ مئی میں اردن کے اخوانی نمائندے مجھ سے ملے۔ نام شاید عبدالرحمٰن تھا اور پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر۔ انہوں نے مجھے رہائی پر مبارک باد دی اور اردنی اخوان کے نگران اعلیٰ استاد عبدالرحمٰن خلیفہ کا سلام پہنچایا۔ انہوں نے بتایا کہ تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کے سربراہ محمد شقیری نے اخوان سے تنظیم کے اندر دعوت کا کام کرنے کے لیے کہا۔ اخوان نے انہیں سنجیدہ دیکھ کر آمادگی ظاہر کی اور ایک انتظامی باڈی تشکیل پائی، لیکن اس میں اخوان کو لینے کی بجائے ایسے افراد لیے گئے جو کمیونسٹ خیال کے تھے۔ اخوان نے اس مرتبہ توجہ دلائی تو انہوں نے نظر ثانی کا وعدہ کیا۔

انہوں نے شکایتاً یہ بھی کہا کہ مصر کے اخوان اردن کے اخوان سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے، حالانکہ موخر الذکر اپنے آپ کو قاہرہ کے تحت سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک قصہ بھی سنایا کہ ایک بار مصری سفیر کی استاد عبدالرحمٰن خلیفہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ان سے کہا کہ اگر انہیں قاہرہ کی طرف سے سرکاری طور پر دعوت نامہ ملے تو کیا وہ مصر آئیں گے۔ استاد خلیفہ نے جواب دیا کہ میں اپنی قیادت کا پابند ہوں۔ اگر مرشد حسن الہضیبی نے مجھے بلایا، یا انہوں نے منظوری دے دی تو میں ضرور آؤں گا۔ سفیر نے کہا کہ آپ لوگ اپنا مستقبل مصری اخوان سے وابستہ نہ کیجئے۔ استاد خلیفہ نے کہا کہ ہم تو ان کا ایک حصہ ہیں اور ان کے تابع۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ تنظیم آزادی فلسطین کے بارے میں ہم کیا رویہ رکھیں۔ میں نے کہا کہ ایسے مسئلے پر، جو آپ کا داخلی مسئلہ ہے میں کوئی متعین مشورہ نہیں دے سکتا، کیونکہ میں مرشد نہیں ہوں۔ دوسرے آپ اپنے حالات مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں۔

مرشد حسن ہضیبی بیمار تھے اور ان کے ایک چچازاد بھائی کی وفات ہوگئی تھی، اس لیے میں ان کے پاس گیا کہ عیادت بھی ہو جائے اور تعزیت بھی، تو انہوں نے کہا: ''شام کے عرب قوم پرست استاد عصام عطار (شام میں اخوان کے سربراہ) سے ملے اور پیش کش کی کہ امین حافظ کی بعث پارٹی کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے دونوں مشترکہ محاذ بنائیں، کیونکہ بعث جہاں اخوان کے خلاف ہیں، وہیں عرب قوم پرستوں کو بھی نہیں بخشتے۔ عصام عطاء نے کہا کہ ایسا محاذ بنایا گیا تو اسے شام کے اخوان پسند کریں گے، نہ دوسرے عرب ممالک کے اخوان، کیونکہ عرب قوم پرستوں کے مصری حکومت اور پارٹی سے گہرے تعلقات ہیں، اور مصر کے اخوان جیلوں میں پڑے ہیں، اس لیے ایک ظالم حکومت کے ہمنواؤں سے معاہدہ پسندیدہ فعل نہیں۔ اگر مصری اخوان رہا کر دیے جائیں، تب اس پیش کش

پر غور کیا جا سکتا ہے"۔

ایک بار علی عثمانی نے مجھ سے کہا کہ سوڈانی اخوان کے ایک نمائندے مصر میں رہتے تھے۔ وہ مجھ سے تو نہ مل سکے البتہ علی عثمانی سے ان کی ایک دو بار ملاقات ہوئی۔ ان کی گفتگو علی عثمانی نے میرے سامنے دہرائی۔ ان کے کہنے کے مطابق سوڈانی حکومت کو ختم کرنے میں اخوان کا ہاتھ تھا (یہاں ابراہیم عبود کی فوجی حکومت مراد ہے جو 1964ء میں عوامی دباؤ سے ختم ہو گئی تھی) آنے والے انتخابات کے بارے میں وہ بہت پرامید تھے اور کہتے تھے آئندہ حکومت اسلامی ہوگی (اور بعد میں مئی 1965ء کے جو انتخابی نتائج سامنے آئے وہ بہت حوصلہ شکن تھے)۔

میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسلام لانے کا یہ طریقہ نہیں۔ اسلام کا غلبہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے لیے وہ کوشش کی جائے جو نیچے سے اصلاح کا کام شروع کرے، خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے اور کتنا ہی انتظار کرنا پڑے۔ اوپر سے نفاذ کے ذریعے اسلام نہیں آئے گا، کیونکہ اس سے پہلے عقیدہ از سر نو تازہ کرنا ہوگا اور مقصد تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ان تجربات سے نہیں گزرے، جن سے اخوان گزر چکے ہیں۔ جب وہ ان تجربات سے گزریں گے، تب شاید ان کی سوچ میں تبدیلی آئے۔

میری گرفتاری سے ایک ہفتہ پہلے اگست میں لیبیا سے تین ساتھی ملنے آئے۔ ان میں سے ایک کا نام یاد ہے۔ طیب۔ مصر سے لوٹتے ہوئے مجھ سے ملاقات کی تھی اور بتایا تھا کہ فاتح آپ سے ملنے کا اشتیاق رکھتے ہیں اور کب سے انتظار کر رہے ہیں کہ آپ رہا ہوں تو ملاقات ہو۔

حسب وعدہ وہ آئے اور ان کے ساتھ مبروک بھی تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے پوچھا کہ منشیہ کے حادثے کی حقیقت کیا ہے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ ایسا کام اخوان میں سے کوئی کر سکتا ہے۔ پھر عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ ایک شخص اتنی دور سے ریوالور سے گولی چلائے جو ناصر تک پہنچ جائے۔ میں نے اپنی معلومات کے مطابق بتایا کہ اس قصے کے کردار تین ہیں۔ اصلاح دسوقی، ایک کرنل جس کا ابھی انتقال ہوا ہے، اور تیسرا ایک غیر معروف شخص۔

میرے یہاں وہ اس ملاقات سے دو روز قبل ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ وہ کس جیل میں رکھے گئے ہیں۔ مجھے پتہ معلوم نہ تھا کہ انہیں کس جیل میں رکھا گیا ہے اور کیوں گرفتار کیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی پرانی یا نئی تنظیم یا جماعت میں سرگرم ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اب تو خود میری گرفتاری کا امکان ہے۔ گرفتاریوں کا دائرہ بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخوان سے وابستہ سب ہی پکڑے جائیں گے، اور منشیہ کا حادثہ پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ بھی کوئی طاقت، یا حکومت، یا کیمپ حکومت مصر کو گرا سکے تو ایک بار پھر وہ اخوان کے ساتھ ایسا واقعہ دہرا سکتے ہیں۔

مجھے یہ خبریں بھی ملی تھیں کہ مصری حکومت میری بعض کتابیں ضبط کرنا چاہتی ہے اور آئندہ نئے ایڈیشن نہ چھاپنے دے گی۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے فاتح سے کہا کہ ضبطی کا واقعہ ہو جائے اور مصر سے باہر کوئی بھی ناشر میری کتابیں چھاپنا چاہے، تو اسے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ لیبیا میں ایک پریس اور کتاب گھر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس ادارے کی ایک شاخ

بیروت میں ہوگی، کیونکہ وہاں درآمد، برآمد اور طباعت کی خاطر خواہ سہولتیں موجود ہیں۔ انہوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ مصنف کو جو رائلٹی دی جاتی ہے، وہ پیشگی دیئے جاتے ہیں۔ کتابیں بعد میں چھپتی رہیں گی۔ میں نے شکریے کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جیل سے رہائی کے بعد پچھلے سال ہی ایک شامی اخوانی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے وقت گزار رہے تھے۔ انہوں نے شامی اخوان المسلمین کے سربراہ عصام عطار کی طرف سے رہائی پر ان کی طرف سے مبارک باد پہنچائی۔ انہوں نے بتایا کہ شامی اخوان کو اندیشہ ہے کہ بعض انہیں سخت نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ ان کے استفسار پر میں نے مشورہ دیا کہ وقتی سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے جس قدر ممکن ہو دور رہیں، کیونکہ اصل کام پھیلاؤ ہے، اور اس کا میدان اس قدر ہمہ گیر اور بڑا ہے کہ نتائج آہستہ آہستہ دیر سے نکلیں گے۔ یہ میدان ہے اسلامی عقیدے، اقدار، اخلاق اور اسلامی طرز عمل کی تعمیر کا، تاکہ نیا اسلامی معاشرہ تیار ہو جو امت کی مرضی کے مطابق طویل اور صبر آزما جدوجہد میں لگا رہے، یہاں تک کہ اسلامی نظام قائم ہو جائے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ شام کے اخوان جماعت کے قیام ہی سے سیاسی اتار چڑھاؤ میں اتنے زیادہ الجھ گئے تھے کہ ان کی تربیت سازی کا کام متاثر ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ملکی سیاست میں حصہ نہ لیں اور سیاسی واقعات پر اثر انداز نہ ہوں تو ہم الگ تھلگ کر دیے جائیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ اخوان پاکستانی اور اسلامی تحریک کو میدان سے ہٹانے کا جو عمل جاری ہے، وہ علاقائی اسباب سے وابستہ نہیں، بلکہ اس کا تعلق تو صیہونیوں اور صلیبیوں کی استعماری سازشوں سے ہے، جو بہت ہی مہارت سے ایسے حالات کی پرورش کرتے ہیں اور ایسے حادثات اتفاقاً پیش آ جاتے ہیں کہ جب تحریکات پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے، جیسے فلاں علاقائی سبب سے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ ہمارے دشمن، دشمنانِ اسلام تو ہیں ہی مگر ان کی خوش قسمتی ہے کہ خود ہمارے اندر سے ہی انہیں ایسے عناصر مل جاتے ہیں جو اس مقصد میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔

پچھلے سال ہی رہائی کے بعد سید وجیہ الدین استاد شیخ امجد الزہاوی کے بھتیجے ہیں، عراق سے مصر تشریف لائیں۔ علامہ امجد زہاوی عراق کے بڑے عالم اور اسلام کے خادم تھے۔ وہ مجھ سے ملنے آئیں اور امجد زہاوی کی طرف سے سلام اور مبارک باد پہنچائی۔ انہوں نے کہا جب آپ جیل میں تھے اور آپ کی خرابی صحت کی اطلاع شیخ کو ملتی تو وہ بہت کبیدہ خاطر ہوتے۔ ایک مرتبہ وہ عراق کے صدر عبدالسلام عارف سے اسی لیے ملنے گئے۔ صدر عبدالسلام عارف نے کہا کہ میں خود سید قطب کو جانتا ہوں۔ ان کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' جیل میں میری ہمدم تھی اور ان کی رہائی کے لیے میں خود جمال عبدالناصر سے بات کروں گا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور آپ کو رہائی ملی۔ جب عبدالسلام عارف قاہرہ سے لوٹ کر بغداد پہنچے تو ایئرپورٹ ہی سے ایک شخص کو میرے پاس بھیجا کہ مبارک ہو، کوشش کامیاب ہوئی۔

رہائی کے بعد ہی عزت مآب سفیر عراق متعینہ مصر بھی مجھ سے ملنے آئے اور صدر عبدالسلام عارف کا سلام پہنچایا۔ سفیر نے بتایا کہ صدر کو میری صحت کی بڑی فکر ہے۔ اس کے علاوہ وہ بھی کوئی بات جسے وہ پسند کرتے ہیں، ہو تو ضرور

بتائیے۔انہوں نے بتایا۔صدر عبدالکریم قاسم نے صدر عبدالسلام عارف کو جیل میں ڈالا تھا تو اس وقت وہ ''فی ظلال القرآن'' سے جیل کی تنہائی دور کرتے تھے۔ میں نے ان کی آمد پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر صدر محترم مناسب خیال کریں تو اپنی کوششیں بروئے کار لا کر اخوان کے دیگر تمام افراد کی رہائی پر زور دیں۔سفیر محترم نے وعدہ کیا اور اجازت چاہی۔

عرب سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں صدر عبدالسلام عارف بھی شریک ہوئے۔اس موقع پر میں نے انہیں شکریے کا تار بھیجا، جس کا جواب انہوں نے خط کے ذریعے دیا، مگر وہ خط مجھ تک نہ پہنچنے دیا گیا۔ مجھے اس کا بعد میں اس طرح علم ہوا کہ یہی سفیر جو، اب وزیر تعلیم ہو چکے تھے، مجھ سے ملنے آئے اور صدر کا ایک تحفہ بھی ساتھ لائے ان سے معلوم ہوا کہ صدر نے مجھے خط لکھا تھا۔ میں نے صدر کو اپنی کتابوں کا تحفہ بھیجا۔ ایک مجموعہ وزیر محترم کو بھی دیا۔

رہائی کے بعد عراقی اپیل کورٹ کے جج ضیاء شیت خطاب بھی مجھ سے ملنے آئے تھے۔انہوں نے بھی صدر کی وساطت سے میری رہائی پر لوگوں کی خوشی کا اظہار کیا۔انہوں نے بتایا کہ عبدالسلام عارف دین دار گھرانے کے فرد ہیں اور خود بھی دین دار ہیں۔پھر ان کے بھانجے جن کا نام شاید حازم تھا، میرے پاس آئے اور اپنے ماموں محمود شیت خطاب کا سلام پہنچایا۔ ان کی ایک تصنیف بھی دی، جس کا نام تھا ''محمدؐ قائد''۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کچھ کتابیں تحفۃً دیں۔

چھ ماہ ہوئے سعودی ریڈیو کا ایک رجسٹرڈ خط، جس کے ساتھ 13 پونڈ کا چیک بھی تھا، موصول ہوا۔خط سے معلوم ہوا کہ یہ رقم مجھے میری تفسیر کے اقتباسات پر مشتمل ریڈیائی پروگرام کے بدلے میں بھیجی جا رہی ہے۔ جو شعبان سے رمضان تک (1385ھ) قسط وار نشر ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سعودی ریڈیو میری کتاب کے اقتباسات کئی سال سے نشر کرتا رہا تھا۔ میں نے حکومت مصر سے رابطہ قائم کر کے پوری تفصیل سنا دی، تاکہ بدگمانی پیدا نہ ہو۔متعلقہ افسر نے میرا تحریری بیان لیا اور مجھے معاوضہ طلب کرنے میں حق بجانب قرار دیا۔

اس کے بعد میں نے وہ رقم بھی وصول کی اور سعودی وزیر اطلاعات و نشریات کو خط بھی لکھا کہ میرا اور بھی معاوضہ آپ لوگوں کے ذمہ ہے، وہ بھی مجھے ملنا چاہیے۔اس خط کی ایک کاپی حکومت کو بھیج دی، مگر سعودی وزیر نے جواب نہ دیا۔

اسی برس قاہرہ میں علماء کی کانفرنس ہوئی۔ عالم اسلام کے نمائندے اس میں شریک ہوئے۔الجزائر کے نمائندے نے زینب الغزالی کے گھر سے مجھے ٹیلی فون کر کے وقت لیا اور پھر ملنے آئے۔انہوں نے ان نظریاتی لہروں کا تذکرہ کیا جو الجزائر کے حالات اور اسلام سے وابستگی پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ انقلاب کامیاب ہی اسلام کے نام پر ہوا ہے۔قوم اسلام سے وابستگی رکھتی ہے، مگر اس کے تقاضوں سے ناواقف ہے، کیونکہ مغربی اقتدار نے پوری کوشش کی کہ یہ قوم اپنے عقیدے سے غافل اور اسلام سے دور رہے۔

سیّد قطبؒ کی ڈائری

قیادت کرنے والے طبقے کے ذہن میں مغربی کلچر اور مارکسی معاشی تصورات کچھ ایسے بیٹھے ہیں کہ جذبات اسلام کے ساتھ ہیں لیکن دماغ ان نظریات کے ساتھ۔ قوم کو بھی وہ اس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ مقابلے میں اسلامی فکر موجود نہیں کیونکہ علماء، مشائخ اور واعظ روایتی باتیں اور پرانے مسئلے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اس طرح باطل نظریات کا مقابلہ ممکن ہی نہیں۔ خطرہ ہے، قوم یا تو اسلام کو ان چیزوں کے ساتھ گڈمڈ کر دے۔ یا پھر اسلام سے دور ہو جائے۔ (الجزائر میں اس وقت بن باللہ کی حکومت تھی۔ پھر بومدین انقلاب لائے اور ملک میں سوشلزم کی طرف مزید پیش قدمی ہونے لگی)

ان کے استفسار پر میں نے ''کمیونسٹ نظریات کے مقابلے میں تین کتابوں سے مدد لینے کا مشورہ دیا۔

1۔ اسلام کا اجتماعی عدل

2۔ عالمی امن اور اسلام

3۔ اسلام اور سرمایہ داری کا معرکہ

ان کے علاوہ اس موضوع پر استاد ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف دیکھنے کی بھی تلقین کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ کتابیں تو عربی دان حضرات کے لیے مفید ہوں گی جو وہاں گنے چنے ہیں۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ میں بہت اختصار سے ایک خاکہ سا بنا دوں جس میں اسلامی عدل اجتماعی کے اہم نکات آجائیں۔ پھر وہ اسے فرانسیسی میں منتقل کروا لیں گے۔ اس طرح وہاں کے تعلیم یافتہ افراد تک یہ باتیں پہنچ سکیں گی۔ میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ ایسے نکات لکھ دوں گا مگر پھر وہ یکایک قاہرہ سے چلے گئے۔

میرے نام خطوط اور تار بھی آئے۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر مبارک باد پر مشتمل ہوتے جیسے ندوۃ العلماء لکھنو یا جماعت اسلامی کراچی کی طرف سے غلام محمد کا تار (چونکہ ابوالاعلیٰ مودودی گرفتار تھے اس لیے کراچی کی جماعت نے تار بھجوایا) اور ایک خط لکھنے والے کوئی صدیقی تھے۔ (ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی طرف اشارہ ہے)۔

پاکستان کا تار پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمجھے ہیں کہ اخوان کے سب لوگ رہا ہو گئے، حالانکہ صرف میری رہائی ہوئی تھی۔ بہرحال انہوں نے مجھے مبارک باد دی کہ دس برس کی قید کا سلسلہ ختم ہوا۔ المیہ یہ ہے کہ بھارت کی بت پرست قوم کا لیڈر اپنے مخالفوں کو جیل بھیجتا ہے نہ سزائیں دیتا ہے مگر مسلم حکمران اس وسعت قلبی اور رواداری سے دور ہو گئے ہیں۔ مسلمان کا اصل محافظ تو خدا ہے خواہ وہ قیدی ہے یا آزاد۔ ان خطوں کا جواب دیتا مگر اس مہلت ہی سے محروم کر دیا گیا۔ ہندو پاک سے اور بھی خط آئے جو رکھے رہے، پھر وہ ضائع بھی ہو گئے۔ باہر سے میرا تعلق

اس سے زیادہ تھا۔

دوسری تنظیموں اور افراد سے اخوان کے تعلقات

جب میں راس البر میں ٹھہرا ہوا تھا، علی عشاوی ملنے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ زکریا محی الدین نے ''بعض اخوان سے کہا کہ سرکاری جماعت ''یونائیٹڈ سوشلسٹ پارٹی'' میں دین پسندوں کو آنا چاہیے، تاکہ کمیونسٹوں کو پارٹی پر چھانے سے روکا جا سکے۔ اس سلسلے میں زکریا مرشد حسن ہضیبی سے بھی ملے ہیں۔ یہ بھی امید ہے کہ اخوان کو بحال کر دیا جائے۔ یہ سب کن سمتوں سے ہو رہا ہے، اس کا علم نہیں۔ میں نے علی سے کہا کہ اس افواہ نے زیادہ نہ کھنچئے دراصل حلوان میں نوجوانوں کے لیے ایک کیمپ لگایا گیا تھا جو کئی ہفتے کا تھا۔ اس کا مقصد نوجوانوں کو سیاسی فکری اور علمی تربیت دینا بھی تھا اور تفریح مہیا کرنا بھی۔ اس طرح حکومت کے لیے ان کی وفاداریاں حاصل کی جاتیں مگر وہاں زیادہ تر مقررین میونسٹ ذہن کے تھے اور سوشلزم کو اسلامی عقیدے کے ساتھ پیوند کاری کر کے اپنے افکار پھیلا رہے تھے۔ بعض نے اسلام پر تنقید سے بھی گریز نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوانوں میں بے چینی اور بیزاری پھیلنے لگی۔ تب زکریا محی الدین وہاں گئے اور نوجوانوں سے کہا کہ ہماری حکومت کمیونسٹ نہیں، مقررین نے حکومت کی ترجمانی نہیں کی بلکہ وہ ان کے ذاتی خیالات ہیں۔ ان مقررین میں استاد کمال ابوالمجد بھی تھے جو اسلامی ذہن رکھتے تھے۔ زکریا محی الدین نے کہا کہ وہ سوشلسٹ پارٹی کے اندر دینی فکر پھیلائیں۔

مجھے تو یہ سارا قصہ میرے گاؤں کے ایک نوجوان سے معلوم ہوا تھا جو حلوان میں آیا تھا اور اسیوط کے ٹیچر ٹریننگ کالج میں استاد تھا اور اس کیمپ کے لیڈروں میں سے تھا۔ یہ نوجوان (شاذلی) وہاں کی گئیں تقریریں اپنے پاس محفوظ کیے ہوئے تھا۔ میں نے ان تقریروں پر ایک نظر ڈالی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان میں کمیونزم چھپائے نہیں چھپ رہا۔ سوشلزم بھی کہتے ہیں بلکہ سوشلزم کی آڑ بھی لی جا رہی ہے جتنی کہ وہاں کے نظام کو عربی سوشلزم بھی کہتے ہیں جو سوشلزم کی عربی نقل بتاتے ہیں مگر اصل نمونہ کارل مارکس کا کمیونزم ہے۔ مصر میں جو کچھ نافذ ہو رہا ہے، وہ مرحلہ وار اسی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس نوجوان نے ایک بات اور بھی کہی۔ وہ یہ کہ نوجوان اسلامی تعلیمات اور اسلامی تربیت سے بے بہرہ ہیں۔ ان کے دل مومن ہیں مگر ذہن خالی۔ اسلامی عقیدے پر چوٹ لگتی ہے تو وہ بھڑک اٹھتے ہیں۔ مگر یہ تقریریں اس وقت کامیاب ہو جائیں گی جب ان میں اسلام سے وابستگی کا اعلان بھی ہوتا رہے اور افکار غیر اسلامی پھیلا دیے جائیں۔ پھر جذبات تو مسلمان ہوں گے مگر افکار نہیں۔

مجھے اس کا یہ تجزیہ بالکل صحیح اور برمحل لگا، خصوصاً اس لیے بھی کہ کیمپ مکمل طور پر سوشلسٹ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ رہی سہی کسر اخلاقی پستی اور ذہنی آوارگی نے پوری کر دی۔ اس کی مثالیں مصری ہفت روزہ جریدوں 'طلیعہ'' ''کاتب'' ''روز الیوسف'' ''صباح الخیر'' میں دیکھی جا سکتی ہیں جو وہاں کی کارروائی چھاپ رہے تھے۔ اب جب سارا ماحول ایک نظریے کے حق میں اور ساری پرکشش چیزیں اس سے وابستہ ہوں تو اس کے مقابلے میں عقیدہ اور اسلامی تعلیمات بوسیدہ خیالات کے طعنوں سے تاثیر اور اہمیت کھو بیٹھیں گی اور مقابلہ برابری کا نہیں ہو گا۔ اس طرح کامیابی

مادہ پرستوں اور الحادی طاقتوں اور اخلاقی بے راہ روی کو ملے گی اور وہ پھر حکومت کو بھی اسی طرف لے جائیں گے۔

اخوان کے علاوہ دوسروں سے تعلقات

1960ء کے آخر کی بات ہے۔ میں لیمان طرۃ جیل میں تھا اور میری صحت بگڑتی جا رہی تھی۔ جیل ہسپتال کے علاج سے بھی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ حاجی حسین صدقی ایک صاحب معاون میں رہتے ہیں، میرے بھائی انہیں جانتے ہیں، وہ میری بیماری سے بہت پریشان ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میرا علاج کسی یونیورسٹی کے ہسپتال میں ہو۔ ادھر میری حالت اور خراب ہونے لگی تو جیل سے مجھے منیل یونیورسٹی کے ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں یہ پتہ چلا کہ میری تکلیف کا سبب دل کی تکلیف (انجائنا) ہے۔ جیل ہسپتال میں اتنے آلات نہ تھے اس لیے وہاں اس کا پتہ نہ چل سکا۔ پھیپھڑوں پر بھی سوجن تھی، آنتوں میں ورم تھا اور کئی امراض پیدا ہو گئے تھے۔ اس ہسپتال میں دوبارہ چھ ماہ کے لیے مجھے رکھا گیا، پھر واپس جیل میں آنے پر طبیعت بہت بگڑ گئی تو خرابی صحت کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔

گھر پر حاجی حسین صدقی اور ان کے اہل خانہ مجھے مبارکباد دینے آئے۔ انہوں نے شیخ الودن کا ذکر کیا جو میری بیماری کے بارے میں ہر وقت پوچھتے رہتے تھے۔ ان دنوں ان کی کمر میں درد ہے، اس لیے وہ خود نہیں آ سکے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ بہت ہی متقی اور صحابہ کا نمونہ ہیں۔ میں نے کہا میں ان سے خود جا کر ملوں گا۔ زینب الغزالی سے میری ملاقات بھی حاجی صاحب کے گھر پر ہوئی تھی۔ ہم سب لوگ حاجی صاحب کی گاڑی میں شیخ سے ملنے گئے۔

اس کے بعد شیخ سے دو تین بار ملنے کا موقع ملا۔ ایک ملاقات تنہائی میں ہوئی۔ شیخ اس بات پر بہت افسوس کا اظہار کر رہے تھے کہ نوجوان دین سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں اخلاقی گراوٹ بہت بڑھ گئی ہے۔ میں نے کہا "شیخ! آپ اطمینان رکھئے۔ ابھی اچھے ایسے نوجوان ہیں جو اس امت کے پاسبان ہیں۔ وہ دین کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں اور ان کے اخلاق بلند ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مجھ سے ملتے رہتے ہیں اور میرے مشورے بھی قبول کر لیتے ہیں۔ شیخ نے بہت خوشی کا اظہار کیا کہ اللہ آپ سے دین کا کام لے۔ آپ نے مجھے مطمئن کر دیا۔ میرے لیے دعا کی۔

انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں نے شیخ حسن البناء سے کہا تھا کہ سیاست میں دخل نہ دیں بلکہ نئی نسل کو اسلام سے جوڑو اور ان کی ایسی تربیت کرو کہ وہ اسلام کو معاشرے میں متحرک کر دیں۔ مگر فوراً سیاسی حوادث نے انہیں مہلت نہ دی۔ اخوان پر کیا کیا آفتیں نہ آئیں۔ اب میدان خالی ہے۔ اخلاقی قدروں کا کوئی محافظ نہ رہا اور نوجوان نسل اسلام سے برگشتہ ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے ان سے کہا "شیخ ایسی بات بھی نہیں۔ دین کے علمبردار میدان سے ہٹے نہیں اور اخوان نے اپنا فرض بھلایا نہیں"۔

آخری پکار

میں نے جو کچھ کہا ہے ترتیب وار اس کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ 1954ء میں ایک سازش تیار کی گئی، جس کا نشانہ اخوان بنے اور ان پر سخت دور گزرا جب کہ وہ اس سازش میں شریک نہ تھے نہ اس حادثے کے ذمے دار۔ ان پر ظلم کیا گیا۔ وہ گروہ در گروہ اس الزام میں پکڑے گئے کہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ ان کے گھر اجاڑ دیے گئے اور سزاؤں کا طویل سلسلہ چل نکلا۔ چنانچہ اخوان کے اندر اس قسم کی سوچ رکھنے والے ابھرے۔ اس کا جواب تشدد سے دیا جائے تاکہ آئندہ ایسے واقعات نہ دہرائے جائیں۔

2۔ اخوان المسلمین اور دیگر اسلامی تحریکات کو ختم کرنے کی سازش صیہونی اور صلیبی استعمار پسندوں کی تیار کردہ تھی۔ وہ مسلمانوں میں جو عقائد سے دوری اور اخلاقی فساد دیکھنا چاہتے تھے، وہ تحریکات کو ختم کرکے ہی آ سکتا تھا۔ 1954ء میں ان کی سازش کامیاب ہوگئی اور اگر اس وقت بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو ایک بار پھر یہ طاقتیں وار کریں گی خواہ اسلامی تحریکات کو دبانے کا نام دیں یا کچھ اور۔ تحریکات غلطیاں کر سکتی ہیں اور ہوتی ہوں گی مگر الحاد اور اخلاقی زوال کے راستے کی رکاوٹ بھی یہی تحریکات تھیں ورنہ لادینیت کا جو سیلاب اتاترک کی کوششوں سے آیا تھا، مشرق اوسط بھی اس کے بہاؤ میں تھا اور کوئی بند باندھنے والا نہ تھا۔

3۔ 1954ء میں جیسے ہی اخوان میدان سے ہٹا دیے گئے الحاد اور اخلاقی گراوٹ نے معاشرے کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کیا۔ آئندہ اخوان کو نشانہ بنایا جارہا تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا بھیانک نتائج دیکھنے میں آئیں گے۔ اس لیے مسئلے میں دوراندیشی کی ضرورت ہے۔ اسے جماعتی، علاقائی، ملکی، حکومتی مسئلہ بنا کر اس کی اہمیت ختم نہ کی جائے۔ یہ اخلاق کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ یہ پوری انسانیت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ خود یہ حکومت انقلابی دعوؤں کے ساتھ برسر اقتدار آئی ہے اور اسے عمل سے ثبوت دینا ہے۔ قوم کی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔ اس کے لیے بھی وہ افراد معاون ہوں گے جو بلند اخلاق رکھتے ہوں، صاحب کردار ہوں، عقیدے کے وفادار ہوں۔ یہ ہے اصل طاقت جس کے سہارے کوئی نظام نہیں چلتا ہے۔ سرحد کا تحفظ اس وقت کوئی معنی نہیں رکھتا جب فوج کردار میں شکست کھا جائے۔ ہمارا دشمن سے اصل مقابلہ دین کا ہے اور اس کے لیے نعرے کافی نہ ہوں گے، عمل چاہیے۔

4۔ لوگ اکثر ہم سے پوچھتے ہیں کیا ایک تم ہی مسلمان ہو؟ اسلامی کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ مسجدوں میں نمازیں پڑھی جا رہی ہیں۔ ہر سال حج ہوتا ہے، لوگ جاتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی سے دینی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ پھر اور کیا چاہیے؟ کیا سب کافی نہیں؟

میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام ان ساری باتوں سے زیادہ وسیع تر اور ہمہ گیر ہے۔ وہ پوری زندگی کا مکمل ضابطہ ہے اور اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب افراد کی تربیت کرکے انہیں اسلام کا نمونہ بنایا جائے کہ معاشرہ اسلام کو اپنا لے۔ اس کے بعد نظام حکومت بھی اسلام کے تابع ہو جائے گا۔ اسلام میں مجرد فلسفہ ہے نہ صرف افکار کا نام، جسے پھیلا دیا جائے مگر سننے والے نہ تربیت کے مرحلوں سے گزریں نہ ان افکار کو عمل سے جلا ملے اور نہ

قوانین میں اسے اپنایا جائے۔ اسلام کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے صحیح نتائج نہیں نکل سکتے۔

اس زمانے میں الاخوان المسلمین کی تحریک اسی کام کے لیے اٹھی تھی اور وہ کامیابی کے ساتھ یہ محاذ سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے تربیت سازی کے ذریعے جو افراد تیار کیے، وہ نمونہ تھے۔ اس میں غلطیاں بھی ہوں گی مگر یہ غلطیاں اس تجربے کو یکسر رد نہیں کر سکتیں۔ وسائل میں غلطی ہو تو مقصد غلط نہیں۔ پھر ان غلطیوں تک پہنچانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے جنھوں نے اخوان کے ساتھ ایسا سلوک کیا اور انہیں اپنی سوچ دوسری طرف موڑنے کا موقع دیا۔

1952ء میں خود میں نے پوری کوشش کی کہ انقلابی جماعت کے حلقے میں تربیت سازی کا کام کروں۔ نوجوانوں کو جمع کر کے محنت شروع کی اور بڑے اچھے نتائج نکلنے لگے مگر انقلابی حکومت میں آگئے تو شاہی نظام آ گیا، حکومت کا نشہ ہونے لگا۔ امریکہ نواز جمعیت فلاح نے ایسے حالات پیدا کیے کہ ان کوششوں پر پانی پھر جائے۔ حکمرانوں کے آس پاس مفاد پرستوں کا ایسا ٹولہ جمع ہوا، جسے یہ کوشش اچھی نہ لگی، حکمرانوں کو اس کی اہمیت کا احساس نہ تھا۔ غرض وہ تنظیم ٹھپ ہوگئی۔ اس کے بعد صرف الاخوان المسلمین سے کچھ امید کی جا سکتی تھی کیونکہ وہی اس ذمے داری کو سنبھالے ہوئے تھے۔

اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کسی ملک میں اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہاں تربیت سازی نہ ہو جائے اور اس کام کے لیے باقاعدہ ایک تحریک برسر عمل نہ ہو کیونکہ حکومتیں اپنے مفادات کی وجہ سے اس پہلو سے غافل ہیں بلکہ بعض دفعہ رکاوٹ بنتی ہیں لیکن جب ایسے افراد بڑھیں گے تو شریعت ہر معاملے میں رہنمائی کرے گی اور حکومت بھی اس کے تحت آ جائے گی۔

یہ باتیں وہ شخص لکھ رہا ہے جو اللہ کے پاس جانے والا ہے اور اس کی پوری کوشش اور خواہش ہے کہ وہ اخلاق کا دامن تھامے رہے اور اس کا ضمیر مطمئن ہو جائے کہ اس نے دعوت پہنچا دی اور اس کام سے آخری لمحے تک غافل نہ رہا۔ جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلامتی ہو۔

(سید قطب، فوجی جیل، ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۵ء)

شیخ عمر تلمسانیؒ

مصر کی اسلامی تحریک کے قائدین شیخ حسن البنا شہید، مفتی محمد عبدہ، علامہ رشید رضا، شیخ حسن الہضیبی، سیدہ زینب الغزالی اور سید قطب شہید کے حالات و خدمات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ تین بزرگ اور بھی ہیں جن کے تذکرے کے بغیر یہ بیان ادھورا رہے گا۔ شیخ عمر تلمسانی، سید محمد حامد ابوالنصر اور جسٹس عبدالقادر عودہ شہید۔

نومبر 1973ء میں الاخوان المسلمین کے مرشد عام شیخ حسن الہضیبی کی وفات سے اخوان کی صفوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا تھا، جس کا پُر ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔ اخوان کے مخالفین طنزاً یہ کہتے تھے کہ وہ دن دور نہیں جب اخوان کا تذکرہ صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا، گلیوں میں اور بازاروں میں اس کے اثرات اب ختم ہو جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے عمر تلمسانی کی شکل میں اخوان کو حسن الہضیبی کا ایسا نعم البدل عطا کیا جس نے تقریبا

تیرہ برس اخوان کی قیادت کی اور اس جواں فکر بوڑھے نے حقیقی معنی میں اس متوقع بحران پر قابو پالیا، جس کا انتظار اخوان کے مخالفین مدتوں سے کر رہے تھے۔ عمر تلمسانی مصر کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں محبت والفت کی ایک علامت تھے۔ آپ کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ بیماری کے باوجود آپ نے اسلام پسند طلبہ اور دینی و سیاسی حلقوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے جنازے میں چھ لاکھ کے قریب افراد نے شرکت کی۔ ان میں صدر حسنی مبارک کے ذاتی نمائندے، وزراء، سفراء، وزیر اعظم ڈاکٹر علی لطفی، تمام سیاسی و دینی جماعتوں اور تنظیموں کے رہنما بھی شامل تھے۔ تین لاکھ کی تعداد میں تو صرف طلبہ شامل تھے اور جنازے کے جلوس میں پندرہ ہزار کاریں شامل تھیں۔ قاہرہ ایئر پورٹ اس دن دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ تھا، جہاں ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے حکومت کی پوری مشنری کو خصوصی انتظامات کرنے پڑے تھے۔ سوڈان، اردن، سعودی عرب، خلیجی ریاستوں، شام، جرمنی، انگلستان اور فرانس وغیرہ سے شیخ کے دیوانے آخری دیدار، ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کے لیے امڈے چلے آرہے تھے۔

شیخ عمر تلمسانی 4 نومبر 1904ء کو قاہرہ کے ایک ممتاز علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد الجزائر کے ایک قصبے تلمسان کے رہنے والے تھے۔ 1835ء میں فرانسیسی استعماریت پسندوں نے جب الجزائر کو اپنی کالونی بنایا تو آپ کے دادا عبدالقادر پاشا تلمسان سے ہجرت کر کے قاہرہ میں مقیم ہو گئے۔ تلمسان الجزائر کا وہ قصبہ ہے، جو اپنے عوام کی بہادری کے سبب بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ اس قصبے کے باشندوں نے 1835ء میں فرانسیسی افواج کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ فرانسیسی افواج کو سب سے زیادہ مزاحمت کا سامنا تلمسان میں کرنا پڑا تھا۔ آج بھی پیرس کے قومی عجائب گھر میں تلمسان کے بہادر اور غیور عوام سے چھینے ہوئے ہتھیاروں کا خاصا بڑا ذخیرہ برائے نمائش موجود ہے۔ تلمسانیوں کا یہ کردار کہ باطل کے آگے گردن نہیں جھکائیں گے، عمر تلمسانی کی پوری زندگی اس کردار سے عبارت ہے۔

عبدالقادر پاشا تلمسانی کا خاندان قاہرہ میں تقریباً 70 برس مقیم رہا۔ 1907ء میں شہر کے ہنگاموں سے تنگ آکر وہ ضلع تلیوبیہ کے ایک گاؤں ''نوی'' میں اپنی جاگیر پر چلے گئے۔ قاہرہ میں آپ نے اپنی تمام جائیداد کرائے پر اٹھا دی۔ کبھی کبھار اس جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے قاہرہ آیا کرتے تھے۔ اپنی دین داری، مطالعۂ کتب اور سخاوت میں پورے ضلع کو جانی پہچانی شخصیت تھے۔ انہیں محمد بن عبدالوہاب سے گہری عقیدت تھی۔ حج کے زمانے میں آپ محمد بن عبدالوہاب کی تصانیف شائع کر کے مفت تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ عمر تلمسانی کے بقول: ''آج بھی سعودی عرب کے کتب خانوں میں میرے دادا کی طبع شدہ کتب موجود ہیں''۔

آپ کے دادا کا رابطہ اپنے زمانے کے جید علمائے دین سے رہتا تھا۔ خاص طور پر علمائے الازہر سے آپ کے نہایت گہرے اور قریبی تعلقات تھے۔ جامعہ الازہر کے علماء اکثر بعض دینی و سیاسی امور پر مشاورت کے لیے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان مجالس میں محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات اور وہابی تحریک کے اثرات پر بحث ہوتی تھی۔ شیخ عمر تلمسانی اپنے دادا کی ان مجالس میں اکثر شریک ہوتے تھے، جس کا فائدہ ان کو یہ پہنچا کہ ایک طرف ان کی

عقیدت محمد بن عبدالوہاب سے بڑھتی گئی اور دوسری طرف بلند پایہ علمی و دینی شخصیات کے درمیان بحث مباحثہ کے سبب ان کے اندر دین فہمی کا شعور پیدا ہوتا گیا۔ شیخ عمر تلمسانی کی شخصیت بنانے میں جامعہ الازہر کے علماء کے علاوہ ان مجالس کے مذاکرات نے بھی مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ تحمل اور بردباری گویا اس مذاکرات کا نمایاں وصف تھا۔ ان کے نقوش آخری وقت تک آپ کی زندگی پر حاوی رہے۔ چنانچہ مصر میں مختلف مسالک سے وابستہ علماء کے درمیان اتحاد کے لیے ان کی کوششیں اسی تربیت کا حصہ ہیں۔ اسی طرح شیخ جب نوجوان طلبہ میں بیٹھتے تو ان کی تیز و تند، جوشیلی گفتگو اور اعتراضات سن کر کبھی نہ گھبراتے، بلکہ ان کی باتیں سن کر آخر میں نہایت تحمل سے اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ ان کی رائے اتنی صائب ہوتی تھی کہ مخالفین کے تمام اعتراضات وہیں دم توڑ دیتے اور دوستوں کے دل میں آپ کا احترام پہلے سے بڑھ جاتا۔

عمر تلمسانی نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک مدرسے ''سیدی علی'' میں حاصل کی۔ وہیں قرآن مجید حفظ کیا۔ مزید تعلیم قاہرہ کے سیکنڈری سکول میں حاصل کی۔ حسن البناء ہی کی طرح آپ نے دوران تعلیم 1919ء کے انگریزوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں میں شرکت کی۔ یہ احتجاجی مظاہرے سعد زاغلول پاشا کی اپیل پر انگریزوں کے خلاف شروع کیے گئے تھے۔ کالج کے زمانے میں تفسیر زمخشری، تفسیر ابن کثیر، تاریخ ابن ہشام، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا مطالعہ کیا۔ 1923ء میں دوران تعلیم آپ کی شادی ہوئی۔ اسی سال والد کا انتقال ہوا۔ اسی سال آپ نے قاہرہ کے لاء کالج میں داخلہ لیا۔ 1931ء میں اپنی علیحدہ پریکٹس کا آغاز کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر 1932ء تک آپ کی ہمدردیاں وفد پارٹی کے ساتھ تھیں۔ آپ وفد کے پروگرام اور طریق کار سے مکمل اتفاق رکھنے کے باوجود کبھی ان کے رکن نہ بن سکے۔ غالباً اس کا واحد سبب یہ تھا کہ ابھی آپ نے باضابطہ سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی عملی زندگی کے تقاضے آپ پر واضح تھے۔

1931ء میں پہلی دفعہ آپ نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا اور شکست کھائی۔ اس کے بعد بھی آپ نے انتخابات میں حصہ لیا اور شکست کھائی۔ ان دونا کامیوں کا سبب یہی تھا کہ آپ کسی جماعت سے باضابطہ منسلک نہیں تھے۔ الاخوان المسلمین میں شمولیت سے پہلے آپ الاہرام، البلاغ، الجہاد، المصور، الطائف اور التجارہ وغیرہ کے باقاعدہ قاری تھے۔ 1933ء میں آپ الاخوان المسلمین میں شامل ہوئے اور پھر مرتے دم تک اسی جماعت سے وابستہ رہے۔

الاخوان المسلمین

شیخ عمر تلمسانی اپنی یادداشتوں میں الاخوان المسلمین میں شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ 1933ء کے اوائل کی بات ہے۔ جمعہ کا دن تھا اور میں اس وقت پھولوں کی کیاری میں بیٹھا ہوا تھا۔ فارم کے چوکیدار نے آکر بتایا کہ دو اپ ٹو ڈیٹ قسم کے افراد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے اپنے اہل و عیال کو زنان خانے میں چلے جانے کا اشارہ کیا اور چوکیدار سے کہا کہ مہمانوں کو اندر لے آئے۔ دونوں نوجوان اندر آئے اور اپنا تعارف کرایا۔ ایک تو عزت محمد حسن اور دوسرے محمد عبدالعلی۔ اول الذکر ''شبین القناطر'' کے مذبح خانے میں ملازم تھے اور

دوسرے صاحب ڈپٹی ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر۔ مہمانوں کے استقبال اور مدارات میں کچھ وقت گزر اچکے تو عزت محمد حسن نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا: "آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟"

یہ سوال مجھے عجیب سا لگا اور میں نے تخیل اور معقولات سمجھا، مزاح کے انداز میں جواب دیا: "میں یہاں چوزے پالتا ہوں"۔ میرے مزاحیہ جواب سے مہمانوں کے اعصاب پر کوئی غیر معمولی اثر نہ ہوا۔ یہ جواب سن کر عزت محمد حسن نے کہا: "آپ جیسے نوجوانوں کے لیے چوزے پالنے سے زیادہ اہم کام منتظر ہیں"۔ میں ابھی گفتگو کو سنجیدگی کے بجائے مزاح ہی کے موڈ میں سن رہا تھا۔ سو میں نے اس انداز میں سوال جڑ دیا: "چوزے پالنے سے زیادہ اہم کام کیا ہو سکتا ہے"۔ مہمان کا جواب سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا: "مسلمان آپ کی توجہ کے مستحق ہیں جو اپنے دین سے دور ہٹ گئے ہیں اور اس غفلت نے انہیں اتنا بے وقعت کر دیا ہے کہ ان کے اپنے وطن میں بھی ان کا کوئی وزن اور کوئی عزت نہیں رہی اور اقوام عالم کے درمیان تو ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے"۔ میں نے کہا: "میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری بساط ہی کیا ہے"۔ مہمانوں نے بتایا کہ آپ اس میدان میں تنہا نہیں ہیں، بلکہ آپ جیسے نوجوانوں کی ایک تنظیم بن چکی ہے اور ایک عظیم شخص سید حسن البناء اس تنظیم کے رہنما اور مرشد عام ہیں۔

چند روز کے بعد وہ دونوں نوجوان میرے دفتر میں تشریف لائے اور مجھے بتایا کہ سید حسن البناء سے میری ملاقات کا پروگرام بن چکا ہے۔ مرشد عام قاہرہ میں شارع الیکلینہ مرخیامیہ کے علاقے میں محلہ عبداللہ بک میں رہتے ہیں۔ میں ٹھیک وقت پر مرشد عام کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے پھر کی دار کنڈی کھمائی اور بڑا دروازہ کھل گیا۔ میں نے دستک دی اور جواب میں ایک آواز سنائی دی: "کون؟" میں نے کہا: "عمر تلمسانی ایڈووکیٹ"۔ وہ شخص اوپر کے کمرے سے نیچے اترا اور میرا استقبال کیا۔ پھر بیرونی دروازے سے داخل ہوتے ہوئے جو دائیں جانب کمرہ تھا اس کا دروازہ کھولا۔ میں میزبان کے پیچھے اس کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہ چلا کہ کمرے کے اندر کیا ہے۔ میری ظاہرہ پرشکوہ ہیبت کے باوجود اس شخص کے چہرے پر کوئی بے اطمینانی یا اضطراب نہ تھا۔ میرا میزبان ہی سید حسن البناء تھا۔ عام لوگ تو مجھے دیکھ کر دعوت حق کے فریضے کے لیے فوراً "ناموزوں" قرار دے دیتے، لیکن مرشد عام نے بڑے انہماک سے میرے سامنے اپنا پیغام اور پروگرام پیش کرنا شروع کیا۔ ان کا پیغام اول و آخر ایک ہی تھا: شریعت کا مکمل نفاذ اور اس مقصد کے لیے عوام کی شعوری تیاری۔ عوام کے سامنے اس حقیقت کو واشگاف کر دینا کوئی خیر اور بھلائی سوائے اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ شریعت ربانی کو مکمل طور پر اپنے انفرادی اور اجتماعی امور میں نافذ کیا جائے"۔

"حسن البناء نے بڑے مؤثر انداز میں اپنی دعوت پیش کی اور اس سارے کلام کو میں نے غور سے سنا۔ ان کی گفتگو کے دوران میں نے ایک دفعہ بھی قطع کلامی نہ کی۔ جب وہ اپنی بات پوری کر چکے تو مجھ سے پوچھا: "کیا آپ کا اطمینان ہو گیا"۔ قبل اس کے کہ میں زبان کھولتا، فرمانے لگے: "دیکھو، ابھی جواب مت دینا۔ آپ کے پاس پورے ایک ہفتے کی مہلت ہے۔ غور و فکر کرو۔ اپنے دل کو ٹٹولو، سوچو، اپنے دل کی رائے لو۔ میں آپ کو پکنک کی اور سیر و تفریح کی دعوت نہیں دے رہا۔ جس بات کی طرف بلا رہا ہوں، وہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر آپ کا دل مطمئن ہو جائے

اور اللہ آپ کو شرح صدر عطا فرمائے تو بسم اللہ۔ اگلے ہفتے بیعت کے لیے آجاؤ۔ اور اگر آپ اس سے سب اپنے آپ کو تیار نہ پائیں، تب بھی کوئی فکر کی بات نہیں۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی اور اطمینان بخش ہے کہ آپ الاخوان المسلمین کے خیر خواہ اور ہمدرد بن جائیں''۔ جس ایمان افروز ملاقات میں بیٹھنے اور جس لاثانی گفتگو سے مستفید ہونے کی سعادت مجھے ملی تھی، اس کے بعد بھلا کون بیعت کرنے میں لمحہ بھر کے لیے بھی تاخیر کرتا۔ میں چلا آیا اور حسب الحکم ایک ہفتے کے بعد مقررہ وقت پر حاضر خدمت ہوا۔ اللہ پر توکل کیا اور حسن البناء کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔ یہ بیعت میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے''۔

1933ء میں شیخ عمر تلمسانی نے الاخوان المسلمین میں شمولیت اختیار کی۔ تین سال بعد آپ کو سرکاری وکیل کے عہدے کی پیشکش ہوئی، جسے آپ نے مسترد کر دیا۔ اخوان میں شمولیت کے بعد بھی آپ ایک مدت تک وکالت کرتے رہے۔ لیکن مقدمات لیتے وقت اچھی طرح چھان بین کرتے تھے۔ اگر آپ کا ضمیر مطمئن نہ ہوتا تو بڑی سے بڑی رقم بھی ٹھکرا دیتے تھے۔ آپ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مدعی کے بغیر مقدمہ لڑا جائے۔ چنانچہ آپ مدعی کو مقدمے کی پیچیدگیوں اور خرابیوں سے آگاہ کرتے تھے۔

1938ء میں الاخوان المسلمین کی پانچویں سالانہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے حسن البناء نے قومی سیاست میں اخوان کی شمولیت کا اعلان کیا تو مرشد عام کے فیصلے کے مطابق آپ نے اپنے آپ کو اخوان کے لیے وقف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رہی سہی وکالت بھی ختم ہوگئی۔ 1949ء میں شیخ عمر تلمسانی وزیراعظم نقراشی پاشا کے زمانے میں پہلی بار گرفتار ہوئے۔ 1950ء میں جیل سے رہا ہوئے۔ نئے مرشد عام حسن الہضیبی کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔

1954ء میں جمال عبدالناصر جنرل نجیب کو اقتدار سے الگ کر کے خود صدر اور وزیراعظم بنا تو اس نے فوراً ہی اخوان پر بھی ہاتھ ڈالا۔ وجہ یہ بتائی کہ اخوان جمال عبدالناصر کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس مہم میں حکومت نے تقریباً 80 ہزار اخوان گرفتار کیے۔ ان میں شیخ عمر بھی شامل تھے۔ تقریباً سترہ برس آپ اخوانی کارکنوں کے ساتھ مختلف جیلوں میں بند رہے اور جیل کی سختیاں اور تشدد برداشت کرتے رہے۔ آپ اس وقت الاخوان المسلمین کے ''مکتب ارشاد'' کے رکن تھے۔ نام نہاد عوامی کارروائی کا ڈراما رچا کر آپ کو پندرہ برس قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ پندرہ برس گزرنے کے بعد بھی آپ کو رہا نہیں کیا گیا، بلکہ جمال عبدالناصر کے انتقال (ستمبر 1970ء) کے گیارہ ماہ بعد انور السادات نے دیگر اخوانیوں کے ہمراہ آپ کو رہا کیا۔

شیخ عمر تلمسانیؒ کی جدوجہد

جیل میں آپ کے ساتھ بدترین قسم کا غیر انسانی سلوک کیا گیا۔ آپ نے اس سزا کے بارے میں لکھا ہے: ''مجھے جیل کی کوٹھڑی نمبر 24 میں بند کیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیل کا نائی میرے بال کاٹنے کے لیے آیا۔ میں نے اپنا

سر اس کے سامنے جھکا دیا کہ وہ اپنا کام کرے، مگر اس اللہ کے بندے نے میری گدی پر ایک دھول جمائی اور کہا، کتے کے بچے! زمین پر بیٹھ جا۔ جب وہ میرا سر استرے سے مونڈ چکا تو میں نے دیکھا کہ جیل کے افسر ایک لمبا موٹا اور نہایت غلیظ رسہ لے کر میری کوٹھڑی میں آ گئے اور مجھے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ میری رانوں کے بیچ سے لے کر سینے تک وہ رسہ میرے جسم کے گرد لپیٹا گیا اور مضبوط گرہیں لگا دی گئیں۔ پھر مجھے ایک کرسی پر کھڑا کیا گیا اور رسے کا ایک سرا چھت سے، ساتھ کھونٹی سے باندھ کر کرسی میرے نیچے سے کھسکا دی گئی۔ میں چھت اور زمین کے درمیان رسے سے بندھا ہوا معلق رہ گیا۔ مجھ پر نہایت غلیظ گالیوں اور سخت کوڑوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ درد سے میرا برا حال تھا، لیکن میں نے اف تک نہ کی، کیونکہ ان درندوں کو میری چیخ و پکار سے لطف آیا تھا۔ اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر ہنسیں۔ جب میرا جسم سن ہو گیا تو انہوں نے ایک مخصوص جگہ پر کوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ ایک جگہ کوڑے برسانے کی بجائے جسم کے مختلف حصوں پر کوڑے برسائیں مگر انہوں نے انکار کر دیا"۔

سترہ برس کی طویل نظر بندی

سترہ برس کی طویل نظر بندی کے بعد شیخ عمر تلمسانی 1971ء میں رہا ہوئے تو دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔ اگرچہ الاخوان المسلمین پر پابندی بدستور برقرار رہی۔ اس کے باوجود اخوان مرشد عام حسن الہضیبی کی وفات کے بعد آپ کو اتفاق رائے سے کونسل کے ارکان نے مرشد عام منتخب کیا۔ اس وقت اخوان اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ 1972ء میں انور السادات نے ایک خاص مقصد اور پالیسی کے تحت اخوان کی سزائیں معاف کر دی تھیں اور وہ جیلوں سے رہا ہو کر آنے لگے تھے، لیکن مسلسل نظر بندی، تشدد اور غیر انسانی سلوک نے نہ صرف یہ کہ کارکنوں کی شخصیتوں کو تباہ کر دیا تھا، بلکہ ان کے گھریلو اور خاندانی نظام کو بھی درہم برہم کر دیا تھا۔ ان حالات میں نئے مرشد عام پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ ایک طرف کارکنوں کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں ایک مرکز پر اکٹھا کرنا اور دوسری طرف حکومت پر دباؤ ڈالنا کہ الاخوان المسلمین پر جمال عبدالناصر کے زمانے میں لگائی گئی غیر قانونی پابندی کو واپس لیا جائے اور الاخوان المسلمین کو باضابطہ کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ شیخ عمر نے نہایت ٹھنڈے دل و دماغ اور غیر جذباتی انداز میں الاخوان المسلمین کی پالیسیاں مرتب کیں اور مستقبل کے لیے اس انداز سے منصوبہ بندی کی کہ الاخوان المسلمین کا تربیتی نظام متاثر نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ نے اس حد تک احتیاط برتی کہ اخوان قوتیں نوجوان اخوانیوں کو یہ طعنہ دینے لگیں کہ اخوان نے جہاد کا راستہ چھوڑ کر حکمرانوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اخوانی نوجوان جذبات میں آ کر اپنی ہی قیادت کے خلاف بغاوت کر دیں یا پھر ایسی پالیسی پر عمل شروع کر دیں جس سے تصادم ناگزیر ہو جائے۔ مرشد عام شیخ عمر اگرچہ انور السادات کی پالیسیوں کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن جذبات میں آ کر یا مخالفین کے طعنے سن کر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے، جس سے حکومت کو دوبارہ اخوان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع ملے۔ چنانچہ سادات کے پورے زمانہ اقتدار میں آپ اس کی پالیسیوں پر سخت تنقید کرتے رہے، لیکن اخلاق اور قانونی حدود کے اندر رہ کر۔ سادات نے اپنے گیارہ سالہ دور حکومت میں پہلے دو سال تو جمال عبدالناصر کی مذمت اور اس کی پالیسیوں پر تنقید میں ضائع کیے۔ اس ضمن میں انو

السادات کا اندازہ تھا کہ اسے اخوان سے اخلاقی مدد ملے گی لیکن اخوان سادات کی ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ سادات نے جس مقصد کی خاطر اخوانیوں کو جیلوں سے رہا کرنا شروع کر دیا، وہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔

اخوان بلاشبہ جمال عبدالناصر کے ڈسے ہوئے تھے، لیکن وہ انورالسادات کی مدد کیوں کرتے۔ آخر وہ ساتھی کس کا تھا۔ ناصرازم کی مذمت سے فارغ ہو کر انورالسادات مصر کا قومی ہیرو بننے کے شوق میں اسرائیل سے الجھ بیٹھا۔ جنگ میں مصر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس شکست نے عوام اور حکومت دونوں کے لیے بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیے۔ ان مسائل میں ''قاہرہ یروشلم تعلقات'' کا مسئلہ سب سے زیادہ شدت سے اٹھا۔ سادات نے امریکا کے توسط سے اسرائیل کے ساتھ دوستی اور محبت کے رشتے استوار کرنے شروع کیے۔ چار سال کے طویل مذاکرات کے بعد آخر کار مصر اور اسرائیل امریکا کی وساطت سے ''کیمپ ڈیوڈ'' (1979ء) سمجھوتے پر متفق ہو گئے۔ انور السادات مشرق وسطیٰ کا پہلا مسلمان حکمران تھا، جس نے نہ صرف یہ کہ اسرائیل کا سرکاری دورہ کیا، بلکہ اسرائیل کے ساتھ سیاسی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات بھی استوار کیے۔

مرشد عام شیخ عمر تلمسانی نے مصر اسرائیل تعلقات اور کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے بارے میں عوامی اجتماعات اور ''الدعوۃ'' کے شذرات کے ذریعے انورالسادات پر سخت تنقید کی۔ اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں بھی پورے ملک میں انورالسادات پر لعن طعن ہوتی رہی تھی کہ قبطیوں کے مسئلے پر قاہرہ اور دوسرے بڑے شہروں میں فسادات شروع ہو گئے۔ اخوان اس مسئلے میں بھلا کیسے لاتعلق رہ سکتے تھے۔ قبطی مسئلے کو سلجھانے کے لیے دیگر مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ آپ نے بھی حصہ لیا۔ انورالسادات نے، جو پہلے ہی کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر عمر تلمسانی کی شدید تنقید سے زچ تھا، ایک پبلک جلسے میں آپ کی موجودگی میں، مسلمانوں اور قبطیوں میں تعلقات خراب کرنے کی ذمہ داری آپ پر ڈالی۔ اگرچہ شیخ نے اس الزام کی تردید اسی وقت سادات کی موجودگی میں کر دی تھی اور خود انور السادات نے بھی آپ سے معافی مانگ لی تھی، لیکن اس کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں تھا۔ چنانچہ بہت جلد ہی پندرہ سو دیگر افراد کے ہمراہ آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں اکثریت اخوان ہی کی تھی۔

نومبر 1981ء میں ایک سو پندرہ دن کی نظر بندی کے بعد حسنی مبارک کے دور میں آپ رہا ہوئے۔ آپ پر نہ تو مقدمہ چلایا گیا اور نہ کوئی الزام ہی ثابت کیا جا سکا۔ ڈاکٹر کمال شانیری (سید قطب شہید کے بہنوئی) جیل میں تشدد کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ عمر تلمسانی ابھی نظر بندی ہی تھے کہ اکتوبر 1981ء میں انور السادات کو تین گن کے برسٹ مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ انور السادات کے دورِ حکومت آپ اسی کوشش میں لگے رہے کہ کسی طرح اخوان کو دوبارہ کام کرنے کی اجازت مل جائے اور سادات جو اخوان کی طاقت اور اثر و رسوخ سے بخوبی آگاہ تھا، عجلت میں یا جذبات میں آ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا جس پر اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔ یہی رکاوٹ صدر حسنی مبارک کے راستے میں ہے۔ آمر مطلق اس معاملے میں خاصے بزدل اور وہمی ہوتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں پروفیسر غلام اعظم کی شہریت کا مسئلہ بھی اسی لیے ایک طویل عرصے سے معلق چلا آ رہا تھا کہ اگر انہیں شہریت دے دی تو کہیں پھر حکومت کا تختہ ہی نہ الٹ دیں۔ شیخ عمر تلمسانی حکمرانوں کی اس سوچ اور فکر سے مایوس نہیں تھے۔ آپ ہر رد عمل جانتے

کے لیے اخبار نویس اکثر یہ سوال کرتے تھے کہ اگر اخوان پر پابندی نہ اٹھائی گئی اور انہیں جائز طریقے سے کام کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو اخوان کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ 1981ء میں اخبار ''الشرق الاوسط'' کو انٹرویو دیتے ہوئے شیخ عمر نے اخوان کی پالیسی کی یوں وضاحت کی:

''اخوان کا راستہ تربیت کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا۔ اگر ہمیں اپنے اوپر ضبط ہو اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ راستے پر چلنا چاہیں تو کوئی طاقت ہمیں اپنے راستے پر چلنے سے نہیں روک سکتی اور اس کے نتائج ظاہر ہو کر رہیں گے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہر کنبے کا سربراہ اپنے کنبے کی تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق کرے، اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے اور اسلام کے معیار مطلوب کے مطابق ہم افراد تیار کرتے جائیں تو سوچئے، اقتدار کس کے قبضے میں ہوگا؟ ان ہی تربیت یافتہ افراد میں سے علماء، جج، فوجی افسر، وزراء، سربراہان مملکت مقرر ہوں گے اور ان شاء اللہ انقلاب آ کر رہے گا۔ جس کے سبب ہم کام کر رہے ہیں''۔

چنانچہ انور سادات کے دور میں آپ خاندانی تربیتی نظام کے مقاصد کو سامنے رکھ کر الاخوان المسلمین کو منظم کرتے رہے اور اس کے مثبت نتائج بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ صدر انور السادات کے قتل کے بعد آپ نے ''کسی اور نام سے'' اخوانیوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے قانونی طور پر کام کرنے کے لیے کونسل کے ارکان سے صلاح مشورے کیے۔ لیکن مسلسل بیماری اور بیرونی ممالک کے دوروں کے سبب یہ کام التوا کا شکار ہوتا گیا۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنی وفات سے چند روز پہلے صدر حسنی مبارک کو ایک نصیحت آمیز خط بھی تحریر کیا، جس میں آپ نے الاخوان المسلمین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں، غیر مصنفانہ اور ظالمانہ سلوک پر احتجاج اور اسے مصر کے آئین اور انسانی بنیادی حقوق کی سنگین خلاف ورزی قرار دیا۔

شیخ کا تیرہ سالہ دورِ امامت

آپ نے اپنے تیرہ سالہ دورِ امامت میں پہلا کام یہ کیا کہ اخوان کی پالیسی مرتب کرتے وقت ذاتی دشمنی، گروہی تعصبات اور سیاسی مخاصمت کو جگہ نہیں دی، بلکہ ہمیشہ دینی، ملکی اور قومی مفادات کو مقدم رکھا۔ ''الدعوۃ'' میں ملکی سیاسی صورت حال پر آپ کے تبصرے، انٹرویوز اور مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ آپ نے کبھی بھی کسی مخالف لیڈر کا نام لے کر یا اشارۃً ایسے الفاظ تحریر نہیں کیے، جن سے اس جماعت کے کارکنوں میں اشتعال پھیلے یا ان کی حوصلہ شکنی ہو جاتی کہ سادات کے دور میں قاہرہ پروشلم تعلقات کے حوالے سے کیمپ ڈیوڈ میں ملک کی عزت و ناموس کا سودا کیا گیا۔ آپ نے ایک مضمون میں کیمپ ڈیوڈ کے مشرق وسطیٰ اور مصری سیاست پر اس کے منحوس اثرات کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا، لیکن انور السادات کی ذات کے متعلق یا اس کے سابقہ ماضی کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ عمر تلمسانی ذاتی دشمنی یا ناراضگی کے سبب صدر مملکت پر اعتراض کرتے ہیں۔

آپ کی شخصیت کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ آپ نے اخوانی طلبہ کو ایک نئے پلیٹ فارم ''الجماعۃ

الاسلامیہ'' پر اکٹھا کیا۔ چنانچہ اخوانی طلبہ اس تنظیم کے قیام کے بعد پہلے سے زیادہ متحرک ہو کر کام کرنے لگے۔ ''الجماعۃ الاسلامیہ'' نے نہایت قلیل عرصے میں قاہرہ، الازہر، عین الشمس اور اسیوط یونیورسٹیوں میں طلبہ انجمنوں پر قبضہ کرلیا۔ پورے مصر میں اخوانی طلبہ آج ایک بہت بڑی قوت بن کر سامنے آچکے ہیں۔ طلبہ کے حقوق کے بارے میں ان کو اعتماد میں لیے بغیر حکومت کو کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ سادات کے قتل کے بعد مصر کی یونیورسٹیوں میں بے پردگی اور مخلوط تعلیم کے خلاف لہر اٹھی تھی، اس کے روحِ رواں اسی ''الجماعۃ الاسلامیہ'' کے کارکن تھے۔

آپ کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو نفاذ شریعت کے لیے آپ کی کوششیں ہیں۔ آپ نے نفاذ شریعت کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان رابطہ اور اتحاد کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس رابطے کی ابتدا 1981ء کی نظر بندی کے دوران ہوئی تھی۔ جیل سے باہر آ کر آپ نے اس کام کو جاری رکھا۔ لیکن جلد ہی انتخابات کا اعلان سامنے آ گیا۔ اخوان قانونی طور پر انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، لیکن گزشتہ نصف صدی سے اخوان دعوت و تبلیغ کا جو کام کر رہے تھے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ انتخابات میں ضرور حصہ لیں۔ چنانچہ آپ ہی کے تدبر سے ماضی کی حریف جماعت ''وفد'' سے اخوان کا انتخابی معاہدہ قرار پایا معاہدے کے مطابق اخوان وفد کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیں گے اور وفد پارلیمنٹ کے اندر نفاذ شریعت کی کوششوں میں اخوان کا ساتھ دیں گے۔ اخوان اس کے بدلے پورے ملک میں اپنے حمایتوں سے وفد کے امیدواروں کو ووٹ لے کر دیں گے۔ اخوان کے اس فیصلے پر مخالفین نے شدید اعتراضات کئے، یاد رہے کہ اسی زمانے میں صدر حسنی مبارک نے اخوان کو یہ پیشکش کی کہ اخوان اور سرکاری پارٹی ایک جماعت میں ضم ہو جاتے ہیں، تاکہ اخوان انتخابات میں حصہ لے سکیں۔ شیخ عمر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ اخوان نے وفد کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا۔ وفد نے کل 57 نشستیں حاصل کیں، جن میں 25 نشستوں میں اخوان کامیاب رہے۔

آپ کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپ نے پورے ملک میں زکوۃ کمیٹیوں کی تشکیل کی۔ آپ ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ میں حکومت کی عدم دلچسپی کے سبب عوام زکوۃ جیسے اہم دینی فریضے سے غفلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیگر دینی جماعتوں کے تعاون سے محلہ وار حلقے بنا کر زکوۃ کی وصولی اور تقسیم کا کام شروع کیا۔ یہ سلسلہ نہایت کامیابی کے ساتھ اب تک چل رہا ہے۔ زکوۃ کمیٹیوں اور حلقوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اخوان کا پیغام گھر گھر پہنچ رہا ہے۔

اپریل 1987ء میں شیخ عمر تلمسانی کے انتقال سے یقیناً اخوانی نوجوانوں کے سروں سے شفقت کا ہاتھ اٹھ گیا، وہ اس پیرانہ سالی میں بھی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انہیں حسن البناء شہید، حسن الہضیبی اور سید قطب شہید کے کارنامے سنا سنا کر گرم رکھا کرتے تھے۔ عمر تلمسانی کا انتقال اخوان کے مرشد و مربی اور ''الدعوۃ'' کے ایڈیٹر کا انتقال نہیں، بلکہ یہ بیسویں صدی کے عظیم انسان کا انتقال تھا، جس نے انتہائی کٹھن حالات میں صبر و استقامت سے اقامت دین کا اہم فریضہ انجام دیا، جس کی حق گوئی، بے باکی، جرأت اور خلوص کا سبھی اعتراف کرتے تھے۔

جسٹس عبدالقادر عودہؒ شہید

دسمبر 1954ء کا سورج طلوع ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ مصری انقلابی حکومت کے خود ساختہ پیپلز ٹریبونل کے تین ارکان جمال سالم، حسین شافعی اور انور السادات نے کمال مہربانی اور شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمال عبدالناصر حکومت کے باغی جسٹس عبدالقادر عودہ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ مقدمے کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی، اس کے باوجود یہ صاحب عزیمت شخص نتائج کی پروا کیے بغیر انقلابی کونسل کے گماشتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں گویا ہوا:

"کیا ایک جج کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسی دنیا میں بے تعلق ہو کر رہ سکے جہاں قانون ختم کر دیا گیا ہو اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون نافذ کر دیا گیا، جہاں قانون لوٹ کھسوٹ اور جبر و تشدد کے جواز کا آلۂ کار بن کر رہ گیا ہو اور خوشامدی حکومت کے منصب دار ہر طرح کے فوائد سے متمتع ہو سکتے ہوں، اور جہاں نفاق کامیابی کا واحد ذریعہ خیال کیا جاتا ہو اور بد کرداری اور بد اخلاقی کو جاہ و منزلت کی اولین شرط سمجھا جاتا ہو۔۔۔ کیا ایک جج یہ بات برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ملک میں جاہلیت اور آمریت کی حکمرانی ہو۔ زبردست اپنا قانون اپنا ایک کر کے کمائیں اور زبردست گل چھرے اڑائیں۔ کمزور کو زندہ رہنے کے لیے سوکھی روٹی اور میلا چیتھڑا بھی میسر نہ ہو، اور طاقتور سونے اور چاندی سے دل بہلا رہا ہو، اور اگر کمزور انحراف کرے تو قانون اس کے خلاف حرکت میں آ جائے۔۔۔ کیا ایک جج یہ بات برداشت کر سکتا ہے کہ ملک کے دستور میں تو یہ دفعہ درج ہو کہ مملکت کا مذہب اسلام ہے، لیکن اس کی حکومت اور حکمران اسلام کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کریں اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے بن جائیں۔ تعاون علی البر و تقوی کی خواہش رکھنے والے نشانۂ ستم بنیں اور تعاون علی الاثم و العدوان کے مرتکب کی سرپرستی کریں۔۔۔ ایسے حالات میں ایک جج غیر جانب دار کیسے رہ سکتا ہے"۔

جسٹس عبدالقادر عودہ کے اس ایمان افروز بیان کے بعد پیپلز ٹریبونل کی کارروائی تین دسمبر تک روک دی گئی اور پھر جمال سالم نے اگلے دن 4 دسمبر 1954ء کو صدر عدالت کی حیثیت سے بارہ قیدیوں کو سزائے موت اور نو کو مختلف سزائیں سنائیں۔

ٹھیک چار روز کے بعد چشم فلک نے یہ دردناک منظر بھی دیکھا کہ جسٹس عبدالقادر عودہ رقص کرتا ہوا تختۂ دار کی

طرف روانہ ہوا اور اللہ کی راہ میں شہادت پائی۔ وہ سینہ تانے تختہ دار کی طرف جا رہا تھا اور بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شرمندہ و نادم صحافیوں کی طرف دیکھا اور فرمایا:

''میرا خون انقلاب کے لیے عذاب ثابت ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں، جس نے مجھے شہادت کی موت دی''۔

جسٹس کے خلاف فردِ جرم

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبدالقادر عودہ کو پھانسی کی سزا کیوں دی گئی؟ آخر ان کا قصور کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ہمیں اس فردِ جرم کا جائزہ لینا ہوگا جو حکومت کی طرف سے ملزموں کو مہیا کی گئی تھی۔ اس میں لکھا تھا: ''الاخوان المسلمین کا رویہ فوجی انقلاب کے بارے میں ہمیشہ سے منفی اور معاندانہ رہا ہے۔ انہوں نے شروع دن سے انقلابی تحریک کی مخالفت کی ہے اور اسے ناکام بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کیا ہے۔ انہوں نے فوج اور پولیس کے اندر اپنی خفیہ تنظیمیں قائم کی ہیں اور حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ملک گیر سازش تیار کی ہے۔ اس کے علاوہ اخوان کے قائدین نے انگریزوں سے خفیہ گٹھ جوڑ کیا ہے اور ان سے مل کر فوجی حکومت کے خلاف منصوبہ بنایا ہے۔ اس حکومت نے اخوان کو خلافِ قانون قرار دیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں دوبارہ کام کرنے کا موقع دیا گیا، لیکن وہ اپنی سابقہ روش اور جوڑ توڑ سے باز نہ آئے، حتیٰ کہ انہوں نے وزیر اعظم جمال عبدالناصر کے قتل کی سازش کی۔ ان حالات میں یہ امر ناگزیر تھا کہ اخوان کا خاتمہ کر دیا جائے اور مصر کو رجعت پسند عناصر سے پاک کر دیا جائے''۔

الاخوان المسلمین نے انقلاب مصر 1952ء کے لیے جو خدمات سرانجام دی تھیں، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ انقلاب مصر پر سینکڑوں کتب اور ہزاروں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان تحریروں میں کسی نہ کسی شکل میں انقلاب کی تحریک میں اخوان کی شمولیت اور خدمات مصر کی حالیہ تاریخ کا لازمی جز بن چکی ہیں۔ جمال عبدالناصر اور اس کے حواری صرف یہ چاہتے تھے کہ اخوان انقلاب کی جدوجہد کے دوران کیے جانے والے وعدوں کی یاد دہانی نہ کرائیں اور جو کچھ بھی ہو کریں، ان کی مخالفت نہ کریں۔ لہٰذا اخوان کی مرکزی قیادت انقلابی کونسل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ چنانچہ ان کو راستے سے ہٹانے کے لیے جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈراما رچایا گیا۔

جہاں تک جسٹس عبدالقادر عودہ کا تعلق ہے، انہوں نے 1951ء میں مرشد عام حسن الہضیبی کے حکم پر عدالت عالیہ کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیانت، قانونی مہارت اور خداداد صلاحیت کے سبب آپ کا شمار جلد ہی اخوان کے صف اول کے قائدین میں ہونے لگا۔ اس وقت مصر کے سیاسی حالات نہایت ابتر ہو چکے تھے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ یوں سری قوم انگریزوں کو وطن سے نکالنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد و منظم تھی۔ شاہ فاروق اور اس کے حمایتی انگریزوں کے وجود کو اپنے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ ان حالات میں اخوان نے نہر زون کے علاقے میں مقیم برطانوی فوج کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔

جسٹس عبدالقادر عودہ کو ملازمت سے فارغ کرنے کا پس منظر بھی یہی تھا۔ اس سلسلے میں اخوان نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف رضا کاروں کی بھرتی کے لیے کیمپ قائم کیے اور بہت جلد ہی تین صد رضا کاروں کا پہلا دستہ مصر کی باقاعدہ فوج کے ساتھ مل کر جہاد میں مصروف ہو گیا۔ جنگ فلسطین کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اخوان کو فوج کے ساتھ یوں آزادانہ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ شیخ عبدالقادر عودہ رضا کاروں کو اسلحے کی سپلائی کے نگران تھے۔ فوج کے نوجوان افسروں خاص طور پر جمال عبدالناصر، عبدالحکیم عامر، سالم برادران، زکریا محی الدین، خالد محی الدین اور انور سادات وغیرہ سے ان کا اکثر رابطہ رہتا تھا۔ جنرل نجیب، جمال عبدالناصر، انور السادات، شاہ فاروق وغیرہ سبھی اپنی یادداشتوں میں تسلیم کرتے ہیں کہ اخوان کی مدد کے بغیر جولائی 1952ء کا انقلاب کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا۔ انقلاب کی منصوبہ بندی کرتے وقت یہ طے ہوا تھا کہ اگر نہر زون کے علاقے میں مقیم برطانوی فوجی دستے یا شاہ فاروق کی سیاسی پولیس مزاحمت کریں یا کسی اور وجہ سے انقلاب کی کامیابی مشکوک نظر آنے یا کوئی ادارہ انقلاب کے راستے میں رکاوٹ بنے تو انقلابی کونسل کے ''جیالوں'' کو محفوظ مقامات تک پہنچانے، بیرون ملک فرار کرانے یا مقابلے کی صورت میں اخوان رضا کار دستے مزاحمتی حصار قائم کریں گے۔

یہ نازک ذمہ داری بھی جسٹس عبدالقادر عودہ کے سپرد کی گئی تھی۔ آپ اخوانی کمانڈوز کے سپریم کمانڈر تھے، جن کا کام ہر صورت میں انقلاب کو کامیاب بنانا تھا۔ عبدالقادر شہید الاخوان المسلمین میں شامل ہونے سے پہلے کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ حربی میدان میں ان کے اصل جوہر تو اب کھل رہے تھے۔ نوجوان افسر عبدالقادر عودہ کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس پر یہ بات انقلاب ہی کے دنوں میں عیاں ہو گئی تھی کہ انقلاب کے بعد اگر اخوان فوج سے مطمئن نہ ہوئے تو سخت مزاحمت ہو گی۔ اس سلسلے میں انہیں دو جسٹسوں یعنی حسن الہضیبی اور عبدالقادر عودہ سے زیادہ خطرہ تھا۔ انقلاب کے بعد اخوان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب تھے کہ فوج واپس بیرکوں میں چلی جائے اور معمول کی پارلیمانی زندگی شروع کی جائے۔ اس طرح ملک میں اسلامی نظام کی راہ ہموار ہو گئی۔ لیکن جمال عبدالناصر اور اس کا سازشی ٹولہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اخوان اور انقلابی کونسل کا ہنی مون کا پہلا سال خیریت سے گزرا۔ انقلابی کونسل نے الاخوان المسلمین کو مطمئن کرنے کے لیے سو ارکان پر مشتمل دستور یہ تشکیل دی، جس میں الاخوان المسلمین کے تین ارکان یعنی جسٹس عبدالقادر عودہ، استاد صالح عشماوی اور محمد کمال خلیفہ شامل کیے گئے۔ عبدالقادر عودہ نے دستور کمیٹی کے سامنے اسلامی دستور تشکیل کے لیے ٹھوس تجاویز اور بنیادی اصول، جن پر دستور کا ڈھانچہ ترتیب دینا تھا، فراہم کیے۔ اس کے علاوہ بنیادی حقوق کی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے خواتین کے حقوق کے ضمن میں بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کیا۔ دستوری کمیٹی جس انداز سے کام کر رہی تھی، اخوانی نمائندوں نے بہت جلد ہی محسوس کیا کہ انقلابی کونسل انہیں صرف ''لالی پاپ'' دے کر ٹرخا رہی ہے۔ ایسی طفل تسلیاں تیسری دنیا کے فوجی حکمران سیاستدانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہمیشہ سے دیتے رہے ہیں۔ حقیقت میں اندرون خانہ کچھ اور ہی منصوبہ بندی جاری تھی چنانچہ پہلے جنرل نجیب کو نہایت گھٹیا طریقے سے رخصت کیا گیا اور پھر اخوان پر ہاتھ ڈالا گیا۔

حالاتِ زندگی

عبدالقادر عودہ 1907ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ 1935ء میں کلیۃ الحقوق سے امتیازی حیثیت سے قانون کا امتحان پاس کیا اور محکمہ قانون میں ملازمت اختیار کر لی۔ 1942ء میں آپ اسماعیلیہ میں جج کی حیثیت سے تعینات تھے کہ آپ کو حسن البنا کی نشست پر پریذائیڈنگ افسر مقرر کیا گیا۔ اس حیثیت سے آپ نے انگریزوں، سعد پارٹی اور وفد پارٹی کو اپنے حلقے میں گڑبڑ نہیں کرنے دی۔ انتخابات کے موقع پر آپ پہلی مرتبہ اخوانی کارکنوں کے حسن اخلاق اور اپنے مرشد عام سے محبت کی بناء پر متاثر ہوئے۔ 1949ء میں آپ نیشنل کورٹ کے جج تھے کہ حسن البناء کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اسی سال آپ حسن الہضیبی کی دعوت پر الاخوان المسلمین میں شامل ہوئے۔ سرکاری ملازم کی حیثیت سے آپ کی رکنیت خفیہ رکھی گئی۔ 1951ء میں مرشد عام حسن الہضیبی کے حکم پر آپ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے آپ کو اخوان کے لیے وقف کر دیا۔ جلد ہی الاخوان المسلمین کی گائیڈنس کونسل اور مشاورتی اسمبلی نے آپ کو الاخوان المسلمین کا ڈپٹی لیڈر منتخب کیا۔ اخوان کے اپنے لیڈر کی حیثیت سے آپ الاخوان المسلمین کو انقلاب مصر 1952ء سے پہلے کے بحران اور پھر انتخابات کے بعد کے بحران سے نکالنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ انقلابی کونسل کی بدنیتی کے سبب آپ کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں اور بالآخر آپ کو اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا۔

جسٹس عبدالقادر عودہ کا شمار جدید مغربی قانون اور اسلامی فقہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب ''التشریع الجنائی الاسلامی'' 1951ء میں فواد اول انعام کی مستحق ٹھہرائی گئی۔ انعام دینے والی کمیٹی نے شرط یہ لگائی کہ اگر مصنف مذکورہ خاندانی ملکیت کے بارے میں چند فقرے حذف کر دیں تو انہیں ایک ہزار مصری پونڈ کا انعام دے دیا جائے گا۔ عبدالقادر عودہ نے انکار کر دیا۔ یوں انعام کے مستحق ٹھہرائے جانے کے باوجود آپ انعام حاصل نہ کر سکے۔ یہ کتاب آپ نے 1949ء میں تحریر کی تھی۔ آپ کی بعض تصانیف یہ ہیں:۔

1۔ الاسلام واوضاعنا القانونیۃ

2۔ الاسلام واوضاعنا السیاسیۃ

3۔ المال والحکم فی الاسلام

جسٹس عبدالقادر عودہ کا شمار مصر کے ان چیدہ چیدہ افراد میں ہوتا ہے جو بین الاقوامی قانون، خاص طور پر فرانسیسی قانون میں مہارت رکھتے تھے۔ وکلاء، اساتذہ، دانشوروں اور عدلیہ کے ججوں میں آپ کا ایک خاص مقام تھا۔ قانون کے تقابلی مطالعے پر آپ کی کتاب ''التشریع الجنائی الاسلامی'' اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ جج فیصلے کرتے وقت اس کتاب سے رہنمائی لیتے ہیں اور اپنے فیصلوں میں اس کتاب کا بطور خاص حوالہ دیتے ہیں۔

انقلابی کونسل کے بائیں بازو کے ارکان جنرل نجیب اور عبدالقادر عودہ کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ جنرل نجیب انقلاب مصر 1952ء کے اصل ہیرو تھے۔ انقلاب کے بعد مصر کے پہلے صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ انقلابی کونسل نے انہیں اعتماد میں لیے بغیر 15 جنوری 1954ء کو اخوان پر

پابندی لگادی۔ جب جنرل نجیب نے احتجاج کیا تو 23 فروری 1954ء کو انہیں زبردستی فارغ کر دیا گیا۔ ان دو واقعات کا عبدالقادر عودہ کی شہادت سے گہرا تعلق ہے۔ انقلابی کونسل کے اس اقدام سے فوج اور عوام میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ 27 فروری کو اخوانی طلبہ نے جنرل نجیب کے حق میں جلوس نکالا۔ جلوس کے شرکاء انقلابی کونسل کے خلاف نعرے لگارہے تھے اور جنرل نجیب سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ خدیو اسماعیل پل پر جلوس کے ایک حصے کو پولیس نے آگے بڑھنے سے روکا اور گولی چلادی۔ جلوس کا ایک اور حصہ عبدالقادر عودہ کی قیادت میں قصر عابد میں پہنچ گیا۔ جنرل نجیب نے قصر عابدین کی بالکونی پر کھڑے ہو کر جلوس سے خطاب کیا۔ اچانک اس کی نظر عبدالقادر پر پڑی۔ جنرل نجیب نے انہیں بالکونی پر بلوایا۔ عبدالقادر عودہ اس حالت میں بالکونی پر گئے کہ ان کے ہاتھ میں زخمی طلبہ کے خون سے بھرا ہوا رومال تھا۔ انہوں نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''آپ لوگوں نے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے اور مطالبات پیش کر دیئے ہیں۔ اب آپ لوگ گھروں کو چلے جائیں''۔

شیخ عمر تلمسانی نے لکھا ہے: ''عبدالقادر کا یہ کہنا تھا کہ چند منٹوں کے اندر میدان عابدین یوں خالی ہو گیا کہ گویا وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ اس پر جمال عبدالناصر نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ عبدالقادر کی مقبولیت اس کی حکومت کے لیے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اسی دن پولیس نے 117 اشخاص کو گرفتار کر لیا جن میں عبدالقادر عودہ بھی شامل تھے''۔

اخوان کے چوتھے مرشد عام

سیّد محمد حامد ابوالنصر

مئی 1986ء میں الاخوان المسلمون کے تیسرے مرشد عام شیخ عمر تلمسانی کے انتقال کے بعد مکتب ارشاد نے اپنے ایک سینئر رکن سیّد محمد ابوالنصر کو اتفاق رائے سے نیا مرشد عام منتخب کیا۔

سیّد محمد حامد 25 مارچ 1913ء کو دریائے نیل کے مغرب میں مصر سعید کے ایک شہر منفلوط میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک متوسط مگر آسودہ حال زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ گھرانہ طویل عرصے سے اپنی سیاسی و سماجی خدمات اور انگریز دشمنی کی وجہ سے عوام میں مقبول چلا آرہا ہے۔ آپ کے دادا علاقے کی ایک نہایت معزز مذہبی اور سماجی شخصیت تھے جن کا شمار کرنل احمد اعرابی پاشا کے ان قابل اعتماد دوستوں میں ہوتا تھا، جنہوں نے 1876ء میں ایک خفیہ تنظیم ''الحزب الوطنی'' قائم کی تھی اس تنظیم نے اپنے قیام کے فوراً بعد جذبہ قومیت ابھارنے اور حکومت کی اہم پالیسیوں میں برطانوی مداخلت اور انتظامی شعبوں میں برطانوی اور فرانسیسی اثر و رسوخ کے خلاف احتجاجات کا سلسلہ شروع کیا۔ جس نے 1879ء میں ایک زبردست تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ 1880ء میں خدیو توفیق نے قوم پرستوں کی سرگرمیوں سے تنگ آکر پورے ملک سے اس تنظیم کے سینکڑوں لیڈر اور کارکن گرفتار کیے، جن میں آپ کے دادا بھی شامل تھے۔ انہیں ان کے دینی اور سماجی رتبے کے پیش نظر گھر میں نظر بند کیا گیا۔ پھر اس نظر

بندی کے دوران انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

اپنی خاندانی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے سیّد محمد حامد نے اوائل عمری میں علاقے کی سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کالج کے زمانے میں آپ ''انجمن شبان المسلمین'' میں شامل ہوئے اور منفلوط شاخ کے خزانچی بنائے گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ ''جمعیت الاصلاح الاجتماعی'' میں شامل ہوئے اور بعد ازاں اس کے صدر بنائے گئے۔ اس زمانے میں آپ ''حزب الوفد'' میں بھی شامل ہوئے۔ 1932ء میں آپ ابھی بی اے کے طالب علم تھے کہ علاقے کی ایک معزز شخصیت اور معروف ازہری عالم دین شیخ محمود سویلم سے زبانی الاخوان المسلمین اور اس کے مرشد عام کا نام سنا۔ شیخ محمود سویلم نے شیخ حسن البناء کا تعارف اس انداز سے کرایا کہ آپ کے دل میں مرشد عام سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ ہر وقت اسی سوچ میں رہتے تھے کہ مرشد عام سے کیسے اور کہاں ملاقات کی جائے۔ اس انتظار میں دو سال گزر گئے۔

حسن البناء سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں سیّد محمد حامد رقم طراز ہیں: جناب محمد عبدالرحیم نے مجھے بتایا کہ امام حسن البناء شہید ''جمعیت شبان المسلمین'' کی دعوت پر اسیوط آئے ہوئے ہیں۔ میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور اسیوط کے دفتر میں رابطہ قائم کیا۔ امام شہید سے مجھے پہلی بار ہم کلام ہونے کا شرف ٹیلی فون پر حاصل ہوا۔ میں نے عرض کیا: ''کیا فضیلت الاستاد حسن البناء موجود ہیں''۔ انہوں نے شیریں لہجے میں جواب دیا ''جی ہاں، میں بول رہا ہوں''

میں نے کہا: ''جناب کی آمد سے اسیوط کا سارا علاقہ بقعۂ نور بن گیا ہے۔ کیا اس فیض عام سے منفلوط کو بھی کچھ حصہ مل سکتا ہے؟''

امام شہید نے پوچھا: ''کیا زمین تیار ہے؟''

میں نے بڑے زور کے ساتھ کہا: ''جی ہاں بالکل تیار، اور بیج کی منتظر ہے''۔

امام شہید میرے جواب سے بہت خوش ہوئے، اور فرمایا: ''اگر یہ بات ہے تو پھر ان شاء اللہ مغرب سے پہلے حاضر ہو جائیں گے''۔

''میں نے ان کے اعزاز میں فوری طور پر دو پروگرام مرتب کیے۔ ایک عصرانہ جس کے لیے منفلوط میں بڑے بڑے سرکاری افسروں، صاحب حیثیت تاجروں اور معروف شخصیات کو دعوت دی۔ معزز مہمان مغرب سے ذرا پہلے تشریف لائے۔ مجھے آج تک وہ پہلی ملاقات یاد ہے۔ پورا ماحول معزز مہمان کے وجود گرامی سے جگمگا اٹھا۔ ابھی آپ نے حاضرین سے ہاتھ ملانے اور باہمی تعارف کا مرحلہ طے نہیں کیا تھا کہ مسجد سے مغرب کی آواز سنائی دی۔ اذان کی آواز سنتے ہی مرشد عام نے مسجد کا رخ کیا۔ ہمارے گھر سے متصل ہماری آبائی مسجد ''ابو النصر'' میں سب لوگوں کے ساتھ نماز ادا کی اور نماز کے فوراً بعد دعوت میں تشریف لائے۔ اس تقریب میں امام شہید نے مختصر خطاب فرمایا، جس میں دعوت کے بنیادی نکات پیش کیے۔ خطاب اتنا موثر اور دل نشین تھا کہ ایک ایک لفظ لوگوں کے دلوں میں اترتا چلا گیا۔ پروگرام کے بعد ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ اس نے بہت کچھ پالیا ہے۔

نمازِ عشاء کے بعد دوسرا پروگرام ہوا۔ یہ اجتماع عام تھا جو "جمعیت شبان المسلمین" کے دفتر کے وسیع و عریض میدان میں برپا ہوا۔ خطاب اتنا اثر انگیز تھا کہ کئی مرتبہ لوگوں کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ شعلہ نوا خطیب نے جہاں مجمع کو رلایا، وہاں کئی مواقع پر ایسے لطائف بھی بیان کیے کہ مجلس کشت زعفران بن گئی۔ جلسے کے بعد آپ میرے گھر تشریف لائے۔ میں نے آپ کے قیام کے لیے مقدور بھر اہتمام کر رکھا تھا۔ آپ قالین پر چار زانوں بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا: "سیّد محمد، اور سناؤ کیا حال ہے؟ آج رات کے پروگرام کو تم نے کیسا پایا؟" میں نے عرض کیا کہ حسن خطابت سے ہر شخص متاثر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: "حسن خطابت کو چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے جو مضمون اور پیغام پیش کیا ہے، اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے کہا: "مضمون اور پیغام تو اکثر خطیب اور واعظ بھی پیش کرتے ہیں، مگر وہ ماضی اور مسائل کا موازنہ کرنے کے بعد سامعین کو منجدھار میں چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ نے اس حالت زار سے نکلنے کی طرف بھی ارشاد فرمایا ہے۔ آپ نے پوچھا ہے، تم اپنی رائے دو کہ موجودہ حالت سے نکلنے کے بارے میں تم نے کبھی غور کیا؟" تو میں ہمیشہ اپنا پستول اپنے پاس رکھتا تھا۔ میں نے پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا، امت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا ایک ہی وسیلہ ہے، اور وہ یہ ہے۔ میرا جواب سن کر آپ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، جیسے آپ نے اپنا مقصود پالیا ہو۔ آپ نے مجھ سے کہا، ذرا تفصیل سے اپنا مدعا بیان کرو۔ میں نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ میرے الفاظ سن کر امام شہید نے اپنے بیگ میں سے قرآن مجید کا نسخہ نکالا اور فرمایا، اس کے ساتھ یہ بھی شامل کرو، اور اگر ہمت ہے تو دونوں ہاتھ رکھ کر مجھ سے عہد کرو۔ ۔ ۔ ۔ کیا ایسا کر سکتے ہو؟ میں نے پورے عزم و یقین سے ساتھ کہا، میں بالکل تیار ہوں۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس وقت مشیت ایزدی تھی جس نے مجھے راہ سجھائی اور میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ امام کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب بیعت ہو چکی تو مرشد عام نے میرے لیے استقامت کی دعائیں مانگیں اور مجھے مبارک باد بھی دی اور فرمایا تمہارے اس پورے علاقے میں پہلی بیعت ہے۔

مرشد عام حسن البناء نے آپ ہی کو اس علاقے کا امیر مقرر کیا اور توسیع دعوت کے لیے علاقے کا دورہ کرنے کی ہدایت کی۔ اگلے سال بیروط اور قوصیہ میں بھی اخوان کی شاخیں قائم کر دی گئیں اور اسی سال آپ کو صوبہ اسیوط کا امیر بنا دیا گیا۔ 1939ء میں آپ قبائلی علاقوں کی طرف سے مکتب ارشاد کے رکن نامزد ہوئے۔ مسلسل دس سال 1949ء تک آپ اس کے رکن رہے۔ مکتب ارشاد کے رکن کی حیثیت سے آپ نے حسن البناء کی معیت میں متعدد مقامات کے دورے کیے۔ 1946ء میں آپ نے منفلوط کے حلقے سے پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا۔ انتخابات میں حکومت کی زبردست دھاندلی کی وجہ سے آپ شکست کھا گئے۔ 1946ء میں دو مرتبہ آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ان حملوں میں وفد پارٹی ملوث تھی۔

جنگ عظیم دوم کے دوران میں حکومت نے مرشد عام کو قاہرہ سے گرفتار کر کے قنطا جیسے دور دراز مقام پر بھیج دیا۔ آپ نے قبطی لیڈر توفیق پاشا سے شیخ حسن البناء کی تقرری کے سلسلے میں متعدد ملاقاتیں کیں۔ توفیق پاشا نے مرشد عام کی نظر بندی کے مسئلے کو پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ چنانچہ رسوائی کے ڈر سے حکومت نے مرشد عام کو رہا کر دیا۔

1948ء کے جہاد فلسطین میں اخوانی مجاہدین کے لیے اسلحہ اور خوراک کی ترسیل کو ممکن بنایا۔ 1949ء میں آپ پہلی دفعہ بغیر لائسنس پستول رکھنے کے الزام میں گرفتار ہوئے اور چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ پستول پولیس والے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ دوسرے دن آپ بیس پونڈ کی ضمانت پر رہا ہوئے۔

انقلاب مصر 1952ء کے لیے ''آزاد افسروں'' کے ساتھ مل کر جن اخوانی لیڈروں نے شاہ فاروق کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی کی تھی، آپ بھی ان میں شامل تھے۔ 1953ء میں انقلابی کونسل اور اخوان کے درمیان اصولی اختلافات شروع ہوئے تو مرشد عام حسن الہضیبی نے مکتب ارشاد کے جن سینئر ارکان کو مذاکرات کی ذمہ داری سونپی، ان میں آپ نمایاں تھے۔ آپ نے جمال عبدالناصر کے اصل عزائم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دیا تھا کہ جمال عبدالناصر مرشد عام کو ان کے عہدے سے الگ کر کے اپنی مرضی کے کسی اور اخوانی کو آگے لانا چاہتا ہے تاکہ الاخوان المسلمین میں انتشار پیدا ہو سکے۔ چنانچہ آپ نے مرشد عام حسن الہضیبی اور جسٹس عبدالقادر عودہ کی پہلی گرفتاریوں کے زمانے میں جمال عبدالناصر کی اس سازش کو تن تنہا ناکام بنایا۔

اخوان میں انتشار اور بدنظمی پیدا کرنے میں ناکام ہونے کے بعد انقلابی کونسل نے جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈرامہ رچایا اور ذمہ داری اخوان پر ڈالی گئی۔ اس سلسلے میں پورے ملک میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ مکتب ارشاد کے رکن کی حیثیت سے آپ بھی گرفتار ہوئے۔ آپ کا تعلق جمال عبدالناصر کے آبائی علاقے سے تھا، اس نے آپ کو پیش کش کی کہ اگر اخوان سے لاتعلقی کا اعلان کر دیں تو رہائی مل سکتی ہے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ جیل میں دیگر لیڈروں کی طرح آپ کے ساتھ بھی غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ فوجی عدالت نے آپ کو عمر قید کی سزا دی۔ آپ دوران قید ملک کی تمام بڑی جیلوں میں رہے۔ آپ کے دو بھائیوں کو سرکاری ملازمتوں سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ان میں ایک جج اور ایک فوج میں جنرل تھے۔

جمال عبدالناصر کے دور حکومت کا پورا عرصہ آپ جیل میں رہے۔ 1973ء میں انور السادات کے حکم پر جن اخوانیوں کو رہا کیا گیا، آپ بھی ان میں شامل تھے۔ رہائی کے بعد حسن الہضیبی کی قیادت میں آپ دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔ چنانچہ اخوانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شیخ عمر تلمسانی کے تیرہ سالہ دور امامت میں آپ ان کے قریبی ساتھی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ الاخوان المسلمون کے مرشد عام منتخب ہوئے۔ اخوان کے مخالف حلقوں نے آپ کے انتخاب کو متنازع بنانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

کویت کے ایک اسلامی جریدے نے مرشد عام منتخب ہونے کے بعد آپ کا انٹرویو شائع کیا۔ انٹرویو سے پہلے آپ کا تعارف کراتے ہوئے آپ کی امارت کے دور کے لیے فتح اور کامیابی کی پیش گوئی کی۔ جریدے نے لکھا:

> ''عام طور پر لوگوں کو خیال ہے کہ شہید حسن البناء نے الاخوان المسلمین کی بنیاد ڈالی اور اساس قائم کی۔ پھر شیخ الہضیبی دعوت کے کٹھن اور مشکل مرحلوں میں نہایت استقامت اور کامیابی کے ساتھ اسے لے کر آگے بڑھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے تنور

نے دروازے بند کر دیئے۔ ان کے بعد شیخ عمر تلمسانی اسے ایک سید ھے راستے پر لے کر آگے بڑھے اور اسے ساحل امن و سلامتی تک پہنچایا اور دنیا کے گوشے گوشے میں لوگ اس عظیم تحریک سے آشنا ہو گئے اور اب نئے مرشد عام استاد حامد ابوالنصر کے انتخاب کے بعد عام طور سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے اخوان کو نصر اور کامیابی سے ہمکنار کرے گا"۔

کویت کے ... مدیر نے آپ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، دنیا بھر میں نتائج اس کے مطابق نکلے۔ 1987ء میں مصر میں عام انتخابات ہوئے۔ اخوان نے پابندی کے باوجود انتخابات میں محدود پیمانے پر حصہ لیا اور 41 نشستیں جیتیں اور سب سے بڑا اپوزیشن گروپ ترتیب دیا۔ نومبر 1990ء میں تین سال کے بعد حسنی مبارک نے دوبارہ پارلیمنٹ کے انتخابات کرائے۔ انتخابات سے پہلے انتخابی قوانین میں من مانے طریقے سے ترامیم کیں۔ ان قوانین کے خلاف مرشد عام سیّد حامد ابوالنصر کی اپیل پر اخوان کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں نے بھی انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ نومبر 1992ء میں مصر کے بلدیاتی انتخابات میں اخوان ایک دفعہ پھر سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی کی حیثیت سے ابھرے۔ اردن میں اخوان 26 نشستوں پر کامیاب ہوئے۔

سیّد حامد ابوالنصر نے اپنے دور میں وہی حکمت عملی اختیار کی جس پر حسن البنا، شیخ عمر تلمسانی اور دوسرے قائدین گامزن تھے۔ اخوان کو بالخصوص انتخابات کی راہ پر لگانے میں سیّد حامد نے پوری توجہ دی اور اخوان کو انتخابات میں بڑی تعداد میں نشستیں حاصل ہوئی ہیں۔ یہ بھی سیّد حامد کی پالیسی کے ثمرات میں سے ہے۔

سنوسی تحریک

قائدین کا تعارف

سیّد محمد بن علی سنوسی

انیسویں صدی میں لیبیا کے جنوبی صحرائی علاقے میں سنوسی تحریک کا آغاز ہوا، جس کے بانی سیّد محمد بن علی سنوسی (1787ء۔ 1859ء) تھے۔ وہ الجزائر کے شہر مستغانم کے قریب قصبہ ترش میں پیدا ہوئے۔ وہ بربر نسل کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ قرآن حفظ کرنے اور ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے فاس (مراکش) کی جامعہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے مصر کا رخ کیا، لیکن قاہرہ کا ماحول ان کو موافق نہیں آیا۔ جامعہ ازہر کے علماء ان کے خلاف ہو گئے۔ علاوہ ازیں ان کو والی مصر محمد علی کی اصلاحات بھی پسند نہ آئیں اور انہوں نے اس کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی علانیہ مذمت کی۔

قاہرہ سے محمد بن علی 1830ء میں مکہ مکرمہ چلے گئے اور 1842ء تک شیخ احمد بن ادریس (بانی سلسلہ خضریہ) کے زیر تربیت رہے۔ 1837ء میں انہوں نے جبل ابوقبیس پر اپنے سلسلے کا پہلا زاویہ قائم کیا۔ بعد میں یہی زاویے (حلقے) سنوسی تحریک میں مرکزی حیثیت اختیار کر گئے۔ زاویوں کی تعداد 1859ء میں 22 تھی جو بڑھتے بڑھتے 1922ء میں تین سو ہو گئی۔ یہ زاویے دینی اور سماجی مرکز ہوتے تھے، جہاں قریب و جوار کے قبائل کے بچے قرآن مجید اور معمولی نوشت و خواند کے علاوہ زراعت، باغبانی، پارچہ بافی، معماری اور نجاری کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انہیں عسکری تربیت بھی دی جاتی تھی۔ یہیں باہمی تنازعات طے پاتے تھے۔ ان زاویوں کے معلمین اور متعلمین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بھی کوشاں رہتے تھے۔ ان کی مساعی سے سوڈان، صحرائے اعظم اور مغربی افریقہ میں لاکھوں زنگی (ملحد) حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ عام مسلمانوں کی اخلاقی حالت سدھر گئی اور وہ مقامات جو رہزنوں اور جرائم پیشہ اقوام کے مسکن تھے، امن و سلامتی کا گہوارہ بن گئے۔ غرض کہ سنوسی تحریک نے اپنے پیروؤں کے دل میں احیائے اسلام کا جذبہ، عالمگیر اخوت کا داعیہ اور ملک کی عزت و آبرو کے لیے دل و جان سے قربانی کا حوصلہ پیدا کیا، جس کے حیرت انگیز مظاہر جنگ طرابلس (1911ء) میں نظر آئے۔ مصر کے الاخوان المسلمین کی طرح سنوسی ایک ہی وقت میں مبلغ، معلم، کسان اور مجاہد تھے۔ جب انہیں جہاد کی دعوت پہنچتی تو وہ میدان جنگ کا رخ اختیار کر لیتے۔ سید محمد بن علی سنوسی اگرچہ مالکی مسلک کے مقلد تھے، لیکن اجتہاد کے بھی داعی تھے۔ ان کی دعوت کا مدار توحید، قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ پر تھا۔ اس کے علاوہ وہ امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کے افکار سے بھی متاثر تھے۔ چنانچہ ان کی تصانیف شریعت اور طریقت کا خوشگوار امتزاج تھیں۔ ان کے نظریات کا محور یہ تھا کہ قرآن متن ہے اور حدیث اس کی شرح ہے۔

سید محمد مہدی (1844ء۔1902)

سید محمد بن علی کے جانشین اور صاحبزادے سید محمد مہدی کے زمانے میں سنوسی تحریک کی دعوت اور اثر و نفوذ عروج پر پہنچ گیا۔ کفرہ نے ایک دار العلوم کی شکل اختیار کر لی، جسے 1895ء میں ان کے والد نے اپنا صدر مقام بنا دیا تھا۔ اب وہاں کے کتب خانے میں مختلف علوم کی آٹھ ہزار کتابیں تھیں۔ صحرائے اعظم میں کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کرنا (اور انیسویں صدی میں) بڑی حیرت کی بات تھی۔ سنوسی مبلغین کی تبلیغی و اشاعتی کوششوں سے دنیا کے سب سے بڑے صحرا میں نہ صرف یہ کہ چوری، قتل و غارت اور دوسرے جرائم ختم ہو گئے، بلکہ صحرائے اعظم کے جنوبی حصوں میں آباد سیاہ فام حبشیوں میں اسلام بھی پھیلا۔ محمد مہدی نے سنوسی کارکنوں کی فنی تربیت اور جنگی مشقوں کا انتظام بھی کیا اور اس طرح ان رضا کار مجاہدوں کی مدد سے وہ ایک وسیع و عریض صحرائی سلطنت کے حکمران بن گئے۔

فرانس سے تصادم

انیسویں صدی کے آخر میں جب فرانس نے مغربی افریقہ پر قبضہ کرنا چاہا تو سنوسیوں سے اس کا تصادم ہو گیا۔ سید مہدی کے انتقال کے وقت ان کے صاحبزادے سید محمد ادریس کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ اس لیے تحریک کی

قیادت ان کے چچا زاد بھائی سیّد احمد شریف (1873ء۔1933ء) نے سنبھالی۔ فرانس نے سنوسیوں کے خلاف 1902ء میں فوجی کارروائی شروع کی۔ سیّد احمد شریف مسلسل دس سال تک فرانس کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن اس جنگ میں سنوسی تحریک کو نقصان پہنچا اور صحرائے اعظم کے جنوبی علاقوں میں اس تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔

اٹلی سے تصادم

فرانس سے جنگ ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سنوسیوں کا اٹلی سے تصادم ہو گیا۔ یہ حملہ شمال کی سمت سے لیبیا پر ہوا تھا۔ سنوسی اگرچہ لیبیا کی صحرائی زندگی پر چھائے ہوئے تھے، لیکن لیبیا انتظامی لحاظ سے عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور ساحلی علاقوں اور شہروں میں ترکی حکومت مستحکم تھی۔ اطالوی باشندے کچھ عرصے سے ساحلی علاقوں اور شہروں میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور انہوں نے کاروباری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اٹلی نے اپنے سیاسی عزائم کو پورا کرنے کے لیے ان ہی اطالوی باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کے بہانے سے لیبیا میں مداخلت شروع کر دی۔ یہ وہی طریقہ تھا جس پر حکومت برطانیہ مصر میں اور حکومت فرانس شمالی افریقہ میں عمل کر چکی تھی۔ اٹلی نے 26 ستمبر 1911ء کو ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور 5 اکتوبر کو طرابلس پر قبضہ کر لیا۔

ترکوں کے لیے لیبیا میں جنگ جاری رکھنا بہت مشکل تھا۔ وہ سمندر کی راہ سے کوئی موثر کمک نہیں بھیج سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بلقان میں صورتِ حال سنگین ہو گئی تھی، اس لیے ترکوں نے اکتوبر 1912ء میں اٹلی سے صلح کر لی اور لیبیا سے تمام فوجیں واپس بلانے کا وعدہ لیا۔ اس دوران میں سیّد احمد شریف کفرہ سے جغبوب آئے اور وہاں ترک رہنما انور پاشا سے ملاقات کی جو بھیس بدل کر مصر کے راستے لیبیا پہنچے تھے۔ اٹلی کو امید تھی کہ عربوں اور ترکوں کی نسلی کشمکش کی وجہ سے لیبیا کے سنوسی اور دوسرے عرب اٹلی والوں کا خیر مقدم کریں گے، لیکن لیبیا کے حالات شام، عراق اور حجاز سے مختلف تھے۔ یہاں سنوسی تحریک نے اخوت اسلامی کا رشتہ اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ نسلی اور علاقائی مفادات اور تعصبات اس کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ لیبیا کے باشندوں نے سنوسی قیادت میں ترکوں کی بھرپور مدد کی اور قدم قدم پر اٹلی کا مقابلہ کیا۔

جنگِ آزادی میں سنوسیوں کا کردار

1914ء میں جنگ عظیم کے آغاز تک بیشتر ترک فوجیں لیبیا سے واپس چلی گئی تھیں، اس لیے اب اٹلی سے جنگ کا سارا بوجھ سنوسیوں کے کندھوں پر آ پڑا۔ اس جنگ میں جواب لیبیا کی جنگ آزادی بن چکی تھی، سیّد احمد شریف کی قیادت میں سنوسیوں نے 1918ء تک اٹلی سے جنگ کی۔ 1915ء میں اٹلی اتحادیوں کی طرف سے جنگ عظیم میں شامل ہو گیا، جس کی وجہ سے سنوسی مجاہدین کا برطانیہ سے بھی تصادم ہو گیا۔ اور فروری 1916ء میں برطانوی فوجوں نے سنوسی حریت پسندوں کو شکست دی۔ سیّد احمد شریف اب لیبیا سے نکل کر نخلستان داخلہ (مصر) میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، جہاں سے ستمبر 1918ء میں وہ ترکی چلے گئے۔

یہ وہی سیّد احمد سنوسی ہیں جو عرب قوم پرستوں کے مقابلے میں برابر خلافت عثمانیہ کی تائید کرتے رہے۔ 1910ء میں سیّد احمد سنوسی نے سیّد محمد سنوسی کو لیبیا میں سنوسی تحریک کی قیادت سونپی اور خود ترکی سے امداد لینے

استنبول چلے گئے، لیکن اگلے سال ترکوں کو عالمی جنگ میں شکست ہوگئی۔ سیّد احمد شریف نے اب اتاترک کی حمایت کی، لیکن جب اتاترک کامیاب ہو گئے تو ان کی مغرب پرستانہ اصلاحات سے مایوس ہو کر سیّد احمد سنوسی 1923ء میں دمشق چلے گئے۔ یہاں انہوں نے شام کو ترکی کے ساتھ متحد کرنے اور اسلامی ممالک کے اتحاد کے لیے جدوجہد کی، لیکن 1924ء میں فرانس کی گرفتاری سے بچنے کے لیے سعودی عرب میں پناہ لی اور وہیں مدینہ منورہ میں 1933ء میں وفات پائی۔

سیّد محمد ادریس سنوسی

اب سنوسی تحریک کی قیادت سیّد محمد ادریس سنوسی کے ہاتھ آ گئی۔ اٹلی اور محمد ادریس کے درمیان صلح کے مذاکرات شروع ہوئے۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں اٹلی نے محمد ادریس کو صحرائی علاقوں میں سنوسی تحریک کا امیر تسلیم کر لیا، لیکن اٹلی نے بعد میں اس معاہدے کی خلاف ورزی کی، جس کی وجہ سے پھر لڑائی شروع ہو گئی اور محمد ادریس سنوسی کو دسمبر 1922ء میں مصر میں پناہ لینی پڑی، جہاں سے وہ سنوسیوں کی تحریک مزاحمت کی قیادت کرتے رہے۔

محمد ادریس کے مصر چلے جانے کے بعد مارچ 1923ء میں اٹلی نے لیبیا پر مکمل تسلط حاصل کرنے کی غرض سے ایک نئی مہم شروع کی۔ سنوسیوں نے حسب سابق ان جارحانہ کارروائیوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا۔ جنگ کا یہ سلسلہ 1933ء تک جاری رہا۔ اس جنگ میں سنوسی مجاہدین کی قیادت ایک سنوسی شیخ عمر مختار نے کی۔ اس جنگ میں اٹلی کی فوجوں نے سخت ظلم وستم اور بربریت اور دہشت گردی کا مظاہرہ کیا۔ سنوسی زاویے ڈھا دیے گئے۔ کنوؤں کو پاٹ دیا گیا، تا کہ مجاہد صحرا میں پیاس سے مر جائیں۔ جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور عمر مختار اور دوسرے رہنماؤں کو ہوائی جہاز میں اوپر لے جا کر نیچے زمین پر پھینک دیا۔ اٹلی والوں نے اپنے خیال میں ستر سالہ بوڑھے مجاہد کو ہلاک کر کے یہ سمجھ لیا کہ اب وہ اطمینان سے ہمیشہ کے لیے لیبیا پر حکومت کرے گا، لیکن آج طرابلس کی سب سے بڑی شاہراہ اس مرد مجاہد کے نام پر شارع عمر مختار کہلاتی ہے۔

لیبیا کی آزادی

خلاصہ کلام یہ کہ 1933ء میں سنوسی تحریک کی مسلح مزاحمت ختم کر دی گئی، لیکن سیاسی و سماجی تحریک برابر جاری رہی۔ اطالوی دور حکومت میں دوسری یورپی نو آبادیوں کی طرح اٹلی نے بھی اپنی نو آبادی لیبیا میں اقتصادی مفادات کے کئی اہم کام انجام دیے۔ تقریباً ڈھائی لاکھ ایکٹر نیم صحرائی زمین زیر کاشت لائی گئی۔ زیتون اور مختلف پھلوں، بادام، انگور اور لیموں کے درخت ہزاروں ایکٹر پر لگائے گئے، لیکن ہر یورپی آبادی کی طرح اس معاشی اور زرعی اصلاحات سے اہل لیبیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اٹلی دراصل لیبیا کو ایک اطالوی ملک بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے لاکھوں کی تعداد میں اطالوی باشندے لیبیا میں آباد کیے گئے۔ مقامی باشندوں سے زمینیں چھین کر ان کو دے دی گئیں۔ ساحل کی بہترین زمینوں پر اطالوی باشندوں نے قبضہ کر لیا اور مقامی باشندوں کے لیے صحرائے اعظم چھوڑ دیا گیا۔ اطالوی آبادکاری کا یہ سلسلہ دوسری جنگ عظیم تک جاری رہا۔

جون 1941ء میں [illegible] نازی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہوا تو برطانیہ جو پہلی

جنگ عظیم میں اٹلی کا حلیف تھا، اب اٹلی کا حریف ہوگیا۔ سیّد محمد ادریس سنوسی نے لیبیا کی آزادی کے لیے اپنی خدمات برطانیہ کو پیش کردیں اور لیبیا میں ہونے والی جنگ میں جرمنی اور اٹلی کے خلاف برطانوی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ طرابلس اور دوسرے شہر برطانیہ کے زیرانتظام آگئے اور شہر فزان پر فرانس نے قبضہ جمالیا۔ جون 1949ء میں برطانیہ نے سیّد محمد ادریس کو سائرے نیکا کا امیر تسلیم کرلیا۔ اس کے بعد لیبیا کی آزادی کے لیے گفت وشنید شروع ہوئی۔ جس کے نتیجے میں 24 دسمبر 1951ء کو لیبیا ایک آزاد اور خودمختار ملک بن گیا۔ سیّد محمد ادریس سنوسی اس نئی وفاقی مملکت کے بادشاہ تسلیم کیے گئے۔

حصولِ آزادی کے بعد

لیبیا میں دستور ساز اسمبلی پہلے ہی قائم ہوگئی تھی، جو ایک سینٹ اور ایک ایوان نمائندگان پر مشتمل تھی۔ لیبیا کی نوآزاد مملکت کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ ایک آزاد جمہوریہ بنتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سنوسی سلسلے اور تحریک کی دینی و اخلاقی روایات کا وارث ہونے کے باوجود ادریس سنوسی نے لیبیا میں آئینی بادشاہت قائم کردی، اور جس دن آزاد ہوا، اسی دن دستور ساز اسمبلی نے بادشاہت کے حق میں فیصلہ دے کر لیبیا کو موروثی بادشاہت قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ سنوسی تحریک اور سلسلے کے بنیادی اصولوں اور روایات کے خلاف تھا۔ اس لیے جلد ہی ایک شخص کے اس یک طرفہ، آمرانہ فیصلے کے خلاف قدرت کا فیصلہ بھی آگیا۔ اگرچہ لیبیا دنیائے اسلام میں تیل پیدا کرنے والا چوتھا بڑا ملک بن گیا تھا، بن غازی اور طرابلس میں دو یونیورسٹیاں قائم ہوگئی تھیں، اور البیضاء میں سنوسی تحریک کے بانی کے نام پر "محمد بن علی اسلامی یونیورسٹی" قائم کی گئی تھی۔ اب بے شک لیبیا، برطانیہ اور امریکا کی مالی امداد کا محتاج نہیں رہا تھا، اس سبب ان کے فوجی اڈوں کو ختم کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا تھا، لیکن ابھی مذاکرات جاری تھے کہ یکم ستمبر 1969ء کو، جب شاہ ادریس سنوسی یونان کے دورے پر تھے، فوج نے بغاوت کرکے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا اور لیبیا کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا۔ لیبیا کا فوجی انقلاب بھی عراق، شام، مصر، سوڈان اور پاکستان کی طرح فوج نے برپا کیا تھا۔ لیبیا کے فوجی انقلاب کو کئی سال ہورہے ہیں اور انقلاب کے قائد کرنل معمر قذافی جمہوریہ اسلامیہ لیبیا کے پہلے صدر بنے۔

سنوسی تحریک کے مقاصد اور اثرات

سنوسی کبیر شیخ محمد بن علی کی آواز پہلی آواز تھی جو لیبیا کے راہ گزاروں سے مغربی استعمار کے خلاف بلند ہوئی۔ حافظ خالد محمود ترمذی لکھتے ہیں: "امام سنوسی کبیر کی تحریک کی نوعیت اس دور کی سیاسی تحریکوں سے بالکل مختلف تھی۔ سنوسی تحریک اسلام کا ایک انقلابی تصور رکھتی تھی اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو صحیح اسلامی اقدار کا حامل و تابع بنانا چاہتی تھی۔ اس تحریک کے بعد اس کی تقلید میں عالم اسلام میں متعدد تحریکیں اٹھیں جو طریقۂ کار اور اپنے افکار و نظریات کے معمولی اختلافات کے ساتھ ایک ہی مقصد کی حامل تھیں یعنی اقامت دین اور اعلائے کلمۃ الحق۔

اس عہد کی اسلامی تحریکیں

نجد میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک توحید تو خیر اس تحریک سے پہلے برپا ہوئی، اور بعض سے تمام تحریکوں کا پیش رو قرار دیتے ہیں، لیکن وہ اس تحریک سے قدرے مختلف تھی۔ بہر حال نائجیریا میں فولانی جہاد جو عثمان ابن فومتی کی سرکردگی میں ہوا اور جنہوں نے مغربی افریقہ میں ایک اسلامی ریاست ''سکوتو'' قائم کی۔ الجزائر میں عبدالحمید بن بادیس (متوفی 1940ء) کی وطنی تحریک جو سنوسی تحریک کی طرح ایک اصلاحی تحریک تھی اور بالآخر 1954ء میں الجزائر کی آزادی پر منتج ہوئی۔ ہندوستان میں حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور نثار علی عرف تیتو میر کی ''طریقہ محمدیہ'' کی تحریک۔ ترکی میں بدیع الزماں سعید نورسی (1873ء۔ 1960ء) کی ''نوری تحریک''۔ مصر میں امام حسن البناء شہید (1906ء۔ 1949ء) کی تحریک الاخوان المسلمین، الجزیرہ میں عبدالقادر الجزائری (1808ء۔ 1883ء)، گنی، سینیگال اور مالی میں الحاج عمر تجانی شہید (1794ء۔ 1864ء) کا جہاد اور صومالیہ میں محمد عبداللہ حسن (1864ء۔ 1920ء) کی تحریک جسے انگریز ''پاگل مُلّا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انڈونیشیا میں تحریک ماشومی، روسی ترکستان میں امام شامل کی جہادی تحریک اور لیبیا میں سنوسی تحریک اس بات کے ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے زبردست نظریاتی اور عملی قوت ودیعت کی ہے، اور جس میں ہر قسم کے کٹھن مراحل اور صبر آزما حالات سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

سنوسی تحریک کا سیاسی پس منظر

جس زمانے میں سنوسی تحریک شروع ہوئی، اس وقت وہ دور تھا جب سلطنت عثمانیہ روبہ زوال تھی۔ مسلمانانِ عالم پر جمود طاری تھا۔ فرنگی دیو استبداد جدید جنگی اسلحہ اور تکنیک کے بل بوتے پر اسلامی سلطنتوں اور حکومتوں کو ایک ایک کرکے ہڑپ کررہا تھا۔ جوع الارض ہر لمحہ بڑھ رہی تھی۔ مسلمانوں میں ہر طرح کی اخلاقی پستی اور مادی پس ماندگی و درماندگی پورے عروج پر تھی۔ خلافت عثمانیہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھی اور اس کے زیر نگیں ممالک یورپی اتحادی طاقتوں کے خونیں پنجے میں کراہ رہے تھے اور آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ترکی کی حالت جاں بہ لب مریض کی سی تھی۔ انگریز ترکی کو مرد بیمار کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اصل تنازعہ اس کی وراثت کے بارے میں تھا۔ یورپ اور روس اس مرد بیمار کی وراثت اس کی زندگی میں اس کی موت سے پہلے تقسیم کرلینا چاہتے تھے۔ چنانچہ فرانس الجزائر اور تیونس پر قبضہ جما رہا تھا۔ اٹلی طرابلس پر پنجہ گاڑے ہوئے تھا۔ مصر برائے نام محمد علی کے زیر تسلط تھا، اصل حکمرانی برطانیہ اور فرانس کی تھی۔ جب الجزائر پر برطانیہ نے فرانس کا قبضہ تسلیم کیا تو فرانس نے مصر پر برطانیہ کا تسلط مان لیا۔

استاد شاگرد کا مکالمہ

یہ حالات تھے جن میں سنوسی نے اپنی تحریک شروع کی۔ بانی تحریک محمد بن سنوسی کے زمانہ طالب علمی کا ایک خاص واقعہ یہاں قابلِ ذکر ہے۔ ایک دفعہ وہ ایک ریت کے ٹیلے پر گہری سوچ میں بیٹھے ہوئے تھے اور ریت پر

انگلیوں سے لکیریں کھینچ رہے تھے کہ آپ کے ایک استاد کا گزر ادھر سے ہوا۔ آپ کو متفکر دیکھ کر استاد نے دریافت کیا: ''میاں کیا سوچ رہے ہو؟ بہت متفکر دکھائی دیتے ہو''۔ سنوسی نے جواب دیا: ''میں عالم اسلام کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو اس ریوڑ کی طرح ہے جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔ امراء وسلاطین موجود ہیں۔ علماء ومشائخ اور پیر ومرشد کثیر تعداد میں ہر جگہ، ہر مقام پر موجود ہیں، لیکن مسلمانانِ عالم کسی ایسے ہادی ورہبر کے شدید محتاج ہیں جو تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر، ایک مقصد پر متحد کر دے اور اس انتشار وافتراق کا سبب یہ ہے کہ علماء وشیوخ میں غیرت کا فقدان ہے۔ فروعی مسائل پر ان کے اختلافات نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے اور فرقے فرقے کر دیا ہے۔ وہ علوم ومعارف کی نشر واشاعت سے غافل ہیں۔ توحید کی دعوت نہیں دیتے جو اتحاد ملت کی اساس ہے۔ علماء ومشائخ پر امت مسلمہ کا قرض واجب ہے کہ سوڈان اور غربی افریقہ کے قبائل بت پرستی میں مبتلا ہیں اور ان بت پرست قبائل میں تبلیغ کی بجائے یہ لوگ اپنی مساجد میں بلند بانگ وعظ دارشاد میں مشغول ہیں، اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔ انہیں اپنے آرام وراحت کے علاوہ کوئی غم نہیں ہے، لذتوں کے پیچھے پڑے ہیں، واجبات سے غافل ہیں۔ اپنی غفلت پر ان کا ضمیر بھی ملامت نہیں کرتا۔ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ ہر آئے دن کوئی نہ کوئی ملک مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ اغیار ان پر قبضہ جمائے جاتے ہیں اور اسلام کی روح خطرے میں ہے۔ استاد محترم! مجھے یہی فکر کھائی جا رہی ہے''۔ اس نے پوچھا ''پھر اس کا کیا علاج ہے؟'' سنوسی نے جواب دیا: ''ساجتھد، ساجتھد، ساجتھد''۔ عنقریب میں ہی کوشش کروں گا''۔

یعنی طالب علمی کے زمانے ہی سے سنوسی کو شدید تشویش تھی کہ روح اسلام اور دنیائے اسلام خطرے میں ہے اور آپ کو مسلمانوں کی اصلاح کی فکر تھی۔ ان کے اس واقعے سے تبلیغی جماعت کے بانی محمد الیاس کی زندگی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ انہیں بھی رات دن یہی فکر ستائے رکھتی تھی کہ اسلامی اوامر واحکام ترک کیے جا رہے ہیں۔ نماز روزے کی پروا نہیں۔ فرائض سے غفلت برتی جا رہی ہے۔ آپ اس فکر میں ساری ساری رات جاگتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کی اہلیہ نے شب بیداری کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: ''اگر میں تمہیں بتا دوں تو راتوں کو جاگنے والے دو ہو جائیں گے''۔ پھر اللہ نے آپ کے ذہن میں تبلیغ کے کام کی اہمیت اجاگر کر دی اور یوں مسلمانوں میں سلسلہ تبلیغ واصلاح چل نکلا۔

سنوسی تحریک کے اثرات

سنوسی تحریک عالم اسلام کی ان تحریکوں میں سے ہے، جنھوں نے اپنے دور عروج میں مسلمانوں کے ذہن و فکر، دل ودماغ کو بہت متاثر کیا۔ تاریخ اسلام پر سیاسی واجتماعی طور پر اس تحریک نے دوررس اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک نے ایک طرف تو سیاسی میدان میں اطالوی اور فرانسیسی اور برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا، اور دوسری طرف خود مسلمانوں کے اندر جو برائیاں اور کمزوریاں راہ پا گئی تھیں، ان کو دور کر کے ان کی اصلاح کی کوشش کی اور معاشرے میں صحیح جدوجہد کی، جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ دین ودنیا کی دوری ختم کر کے مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کر دیا جائے۔

تحریک کے اغراض و مقاصد

تحریک کے بانی اور روح رواں محمد بن علی نے اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے حصول اور قرآن وسنت کے احیاء وبقا کے لیے وقف کر دی تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلامی اقدار نہ صرف خود اپنائیں بلکہ دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ دوسروں کو بھی ان کی تبلیغ وتلقین کریں۔

محترمہ مریم جمیلہ سنوسی تحریک کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''سنوسی تحریک کا منتہا ومقصود خالصتہً قرآن وسنت کے احکام کی روشنی میں عالم اسلام کا مکمل روحانی ارتقا تھا، یعنی اسلامی نظام کا نفاذ''۔

علامہ محمد اسد کے خیال میں اس تحریک کا مقصد ایک اسلامی دولتِ مشترکہ کا قیام تھا۔ وہ اپنی کتاب ''شاہراہ مکہ'' میں لکھتے ہیں: ''الجیریا کے عظیم عالمِ دین محمد بن علی سنوسی (جو قبیلہ بنوسنوس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے سنوسی کہلائے) نے اُنیسویں صدی کے پہلے نصف میں ایک ایسی اسلامی برادری یا اسلامی جماعت کی تشکیل کی، جو ایک اسلامی دولتِ مشترکہ کے قیام کی راہ ہموار کر سکے۔''

سیّد رضوان علی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ''مُسلم نیوز انٹرنیشنل'' (فروری 1963ء) میں لکھا:

''امام سنوسی کی تحریک کا بنیادی مقصد روحانی اور اخلاقی اصلاح تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان پھر سے صدرِ اوّل کے اسلام کو اپنائیں۔ انہوں نے اسلام میں جو بدعتیں اور خرافات ورسوم داخل ہوگئی تھیں، اُن کا سختی سے ردّ کیا۔ آپ نے اس غرض کے لیے جو زاویے قائم کیے، اُن میں آپ کے پیروکار قرآن وسنت کے احکام کے مطابق خالص اسلامی طریقے سے اپنی زندگی گزارتے تھے۔''

سیّد احتشام احمد ندوی، پروفیسر مُسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ اپنے مضمون ''سنوسی تحریک نظریاتی وتنظیمی بنیادیں'' میں رقم طراز ہیں:

''شیخ سنوسی کے خطوط جو انہوں نے اپنے بعض احباب کے نام لکھے ہیں، اُن کے پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ اُن کی تحریک اور تعلیم کا مقصد قرآن وحدیث کی بنیاد پر دنیا کی تعمیر جدید تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں دینی شعور پیدا ہو جائے اور پھر وہ اُس کی بنیاد پر دنیا کی تعمیر کر سکیں۔ شیخ سنوسی نے ہر جگہ دینی علوم کے ساتھ تجارت، صنعت میں ترقی کی تلقین کی ہے۔ وہ دین اور دنیا کو الگ الگ نہیں بتاتے۔''

خود شیخ سنوسی یوں فرماتے ہیں: ''صرف علومِ دین ومنقولات مسلمانوں کی ترقی کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صنعت وحرفت میں ترقی کریں، جس میں کہ یورپ بہت آگے نکل پڑا ہے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ کے ساتھ ساتھ صنعتی علوم (یعنی ٹیکنالوجی) کی تحصیل بھی بہت ضروری ہے۔''

سنوسی کا ایک خط

زاویہ کفرہ کی تعمیر کی منصوبہ بندی کے موضوع پر سنوسی نے اہلِ زاویہ کے نام ایک خط میں تحریک کے اغراض و مقاصد کی نشان دہی کی ہے، اُس خط کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

''حمد وثناء کے بعد سب سے پہلے ہم آپ سب کی خیریت اور آپ کے تمام حالات دریافت کرنا چاہتے

ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ آپ کے حالات کو اپنی کتاب اور اپنے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق کر دے۔ دوسرے ہم اسلام کے نام پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی درخواست کرتے ہیں: کیونکہ اللہ کا فرمان ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ o (الانفال: 20)

''اے مومنو! اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو''

نیز ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج ......o (النساء: 80)

''اور جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی، اُس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔''

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا o (النساء: 69)

''اور جس کسی نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ اُن لوگوں کا ساتھی ہوا، جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں اور (تمام) نیک اور راست باز انسان ہیں''

ہم چاہتے ہیں کہ آپ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔ پانچ وقت کی نمازیں ادا کریں۔ رمضان کے روزے رکھیں۔ حج بیت اللہ شریف کریں، اور اُن افعال سے پرہیز کریں جن سے اللہ نے منع کیا ہے، یعنی جھوٹ نہ بولیں، غیبت نہ کریں، دوسروں کا مال ناحق نہ کھائیں۔ شراب نہ پئیں۔ ناحق قتل نہ کریں۔ جھوٹی گواہی نہ دیں۔ ان ہدایات کی پیروی کرنے سے آپ کو ہمیشہ باقی رہنے والی بھلائیاں اور بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔

نیز آپ کے قبیلے کے کچھ لوگ ہمارے پاس آئے تھے اور انہوں نے درخواست کی تھی کہ ہم اپنے کچھ اخوان اُن کے ساتھ بھیج دیں جو آپ کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام سکھائیں اور صحیح راستے کی طرف آپ کی رہنمائی کریں۔ ہم نے آپ کی درخواست پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا، کیونکہ ہمارا یہی پیشہ ہے، یہی ہمارا مشن ہے اور اسی کام کے لیے اللہ نے ہمیں بھیجا ہے کہ مسلمانوں کو اُن کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔ جو نہیں جانتے، اُن کو سکھائیں، اور جو راہ گم کر بیٹھے ہیں، انہیں سیدھی راہ بتائیں، لیکن اِس پر عمل درآمد ہم اس لیے نہیں کر سکے کہ ہم اس وقت حرمین شریفین میں تھے اور جب ہم یہاں آئے تو لوگوں کو اللہ کا راستہ بتانے میں اس قدر مصروف ہو گئے کہ ہمیں وقت ہی نہ ملا اور پھر آپ کا کوئی آدمی بھی موجود نہیں تھا جس کے ساتھ ہم اپنے اخوان کو بھیج دیتے۔

سنوسی تحریک کے اثرات

امام سنوسی نے حصول علم کے لیے دنیائے اسلام کے تمام مشہور و معروف علمی مراکز سے مثلاً جامع زیتونہ، جامع قزوئین اور جامعہ الازہر وغیرہ سے خوشہ چینی کی تھی اور اسی غرض سے مکمل بارہ سال آپ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ حصول علم کے ساتھ ساتھ آپ نے اس وقت دنیائے اسلام میں رائج تصوف کے تقریباً تمام سلاسل (طریق) میں درک حاصل کیا تھا۔ علوم شریعت میں تو سنوسی نے اتنا تجر اور تفقہ فی الدین بہم پہنچایا تھا کہ آپ کو مجدد تسلیم کیا جاتا ہے۔ مزید برآں تمام عالم اسلام کی سیر و سیاحت کی تھی اور عالم اسلام کی معاشرتی، معاشی پسماندگی، اخلاقی پستی اور سیاسی زوال کا بچشم خود مطالعہ کیا تھا، اور اس پستی کے اسباب پر مدتوں گہرا غور و خوض کیا تھا اور اس سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے تھے۔

1۔ عالم اسلام کو ایسے مصلحین کی اشد ضرورت ہے جو مسلمانوں میں خالص دین اسلام کی تعلیمات کی عام نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھائیں۔

2۔ امت مسلمہ انتشار و انحطاط کا شکار ہے، فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مسلمان حکمران مشاورتی اور جمہوری حکومت کی بجائے مطلق العنان اور استبدادی حکومت قائم کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جو صریحاً اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔

3۔ علماء کی اپنے فرائض کی ادائیگی سے غفلت اور سہل انگاری۔ علماء عموماً مسلمانوں میں علوم کی اشاعت اور صنعت و حرفت کی اہمیت سے یکسر غافل ہیں۔

ان نتائج کو سامنے رکھ کر انہوں نے تمام عالم اسلام میں زاویے یعنی علمی و اصلاحی مراکز کا جال بچھا دیا۔ ان کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے متحارب اور دشمن قبائل کو باہم شیر و شکر کر کے ان کے انتشار و افتراق کو اتحاد و اتفاق میں بدل دیا۔ الغرض سنوسی تحریک ایک ایسی جامع و مانع اصلاحی و احیائی تحریک تھی جو قدیم و جدید اسلامی افکار و نظریات کی جامع تھی۔

اب آخر میں اس تحریک کے بارے میں دنیائے اسلام کے چند فاضل مصنفین اور دانشوروں کی آراء پیش کی جاتی ہیں۔

کامیاب ترین تحریک

عرب دانشور محمد الطیب نے لکھا: اس مبارک تحریک کی ضیا پاشیوں سے شمالی افریقہ منور و تابناک ہو گیا اور اس کے نور کی کرنوں سے سوڈان، مغربی اور وسطی افریقہ کے میدان، مکہ کی وادی اور لیبیا کے صحرا روشن ہو گئے اور یہ

تحریک بڑے موزوں وقت پر برپا ہوئی، جب اس کی اشد ضرورت تھی، جس وقت جزیرہ عرب میں اس کی معاصر تحریک چل رہی تھی یعنی شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریکِ توحید، جس کا اثر ونفوذ جزیرہ عرب تک محدود تھا، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ انتہا پسند اور حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی تھی، اس لیے اس کا اثر صرف جزیرہ عرب تک، بلکہ صحیح یہ ہے کہ نجد ہی تک محدود رہا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس وقت خلافت عثمانیہ محمد عبدالوہاب کے خلاف برسرِ پیکار تھی اور اس کے خلاف عملی اقدامات کر رہی تھی۔ اس نے مسلمانوں میں اسلام کے نام پر کھلی نعرے بازی شروع کر رکھی تھی، یہاں تک کہ اس کو دین سے خارج قرار دے دیا تھا اور مسجدوں کے خطیبوں کو حکم دے رکھا تھا کہ محراب ومنبر سے اس بات کا اعلان کریں۔ ایسے نازک وقت میں امام اکبر سنوسی نے تحریک کے مرکز نجد کا دورہ کیا۔ پھر سید جمال الدین افغانی اپنی تحریک اتحاد اسلامی لے کر اٹھے جو اپنے اغراض ومقاصد کے لحاظ سے بہ تمام وکمال سنوسی تحریک سے متعلق تھی، جس میں ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا اور اس طرح ان تحریکوں نے اصلاحات کی بلند بانگ صداؤں سے طویل عرصے سے گہری نیند میں سوئے ہوئے عالم اسلام کو بیدار کیا۔ بہر حال سنوسی تحریک اس میدان میں سب سے پہلی اور سب سے زیادہ گونج دار آواز تھی۔ وسائل کے لحاظ سے کامیاب ترین اور سریع الاثر، جس نے نہ صرف لیبیا ملکہ شمالی افریقہ، مصر، سوڈان، حجاز، ہندوستان، انڈونیشیا، ترکی اور ایران میں لاکھوں لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائی۔

امام سنوسی بحیثیت مجدد

محترمہ مریم جمیلہ نے اپنی ایک مشہور تصنیف ''اسلام نظریہ وعمل'' میں لکھا: ''اپنے اس کام میں سنوسی زیادہ تر امام احمد حنبل، امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ آپ کے سامنے اپنے ہم عصر مجدد محمد بن عبدالوہاب کی تحریک بھی تھی۔ اگرچہ دونوں مجددوں کے مقاصد، امنگیں اور نظریات یکساں تھے۔ تاہم تصوف کے بارے میں سنوسی تحریک کا رویہ وہابی تحریک کے عمل سے قطعی مختلف اور مؤدبانہ تھا۔ البتہ وہ تصوف کی مناسب حد تک حوصلہ افزائی کے باوجود ایسے سلاسل تصوف کو، جن میں سماع اور وجد جائز ہے، دوسرے خلاف شرع فعل کی طرح سخت ممنوع قرار دیتے تھے۔

سید احتشام احمد ندوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا: ''سنوسی تحریک کی ابتدا کسی خاص واقع کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ شیخ سنوسی نے عالم اسلام کی مجموعی حالت پر اچھی طرح غور کر کے اور سوچ سمجھ کر یہ تحریک شروع کی تھی جو نہ کسی خاص ملک یا خاص قوم تک محدود تھی، نہ کسی خاص وقت کے لیے مخصوص تھی۔ نظریاتی حیثیت سے یہ دعوت بہت وسیع تھی۔ خود شیخ سنوسی اگرچہ مالکی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان کی دعوت میں ہر طرح کے لوگ شریک تھے۔ وہ اندھی تقلید کے بھی قائل نہ تھے۔ تقلید کے عیوب پر انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس تحریک کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ ان غلط عقائد، رجحانات، رسوم کو جو مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں، دور کیا جائے اور خالص دین کی دعوت عام کی جائے۔ ذہنی وعقلی حیثیت سے مسلمانوں میں توسیع اور وسعت نظری پیدا کی جائے''۔

مستشرقین نے امام سنوسیؒ کو عام طور پر بحیثیت صوفی اور ان کی تحریک کو تصوف کے ایک سلسلے کے طور پر پیش کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ آپ عالم ہونے کے ناطے علماء اور اولیاء کی یکساں قدر کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں ان سے کسب فیض بھی کرتے، لیکن مرنے کے بعد قبر پرستی کے قائل نہیں تھے۔

آپ اگرچہ ابن تیمیہؒ کے افکار سے بھی متاثر تھے، لیکن تصوف کے معاملے میں محمد بن عبدالوہاب کی طرح سخت گیر اور متشدد نہ تھے کہ بالکل ہی نفی کرتے، نہ اس قدر غلو پسند تھے، جتنے اس وقت کے صوفیہ تھے، بلکہ آپ نے امام غزالیؒ کی طرح شریعت و طریقت میں حسین امتزاج پیدا کیا۔ چونکہ اس زمانے میں تصوف کا دور دورہ تھا، لہذا آپ نے اس سے کام لیا اور اسی راہ سے لوگوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، لیکن عام صوفیا کی طرح علم کے دشمن نہ تھے:

آپ کے ایک مستند سوانح نگار Evana Pritchar نے اپنی کتاب کا آغاز ہی اس جملے سے کیا ہے: ''سنوسیہ تصوف کا ایک نیا سلسلہ ہے یا جیسا کہ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ درویش ہیں''۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں:

> ''سنوسیہ بہت ہی مذہب کا پابند ایک طریقہ ہے۔ یہ کوئی فرقہ نہیں ہے، بلکہ ایک برادری یا جماعت ہے۔ اس کے بانی کے مخالفین ایک غیر جانب دار شخص کو بھی یہ باور نہیں کرا سکے کہ سنوسی الحاد و زندقہ کے مرتکب تھے، اگرچہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ وہ صرف چند بہت ہی معمولی معاملات میں سنوسی پر مالکی فقہ سے روگردانی کرنے کا الزام لگانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ بہر حال اس کا تصوف بہت ہی سادہ اور منزہ تھا۔ یہاں تک کہ وہابی جیسے سخت گیر نقاد بھی سنوسیہ میں کسی قسم کی بدعت کا وجود ثابت نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہابیوں نے حجاز میں صرف سنوسیہ کی موجودگی کو برداشت کیا ہے''۔

> لیکن اس کے برعکس مصنف و مفکر ایس رضوان علی لکھتے ہیں:

> ''سنوسی تحریک کوئی تصوف کا طریقہ نہیں ہے، جیسا کہ مغربی مصنفین نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ اپنے ابتدائی مراحل میں یہ ضرور ایک روحانی ارتقاء کی تحریک تھی، لیکن بعد ازاں یہ ایک مکمل تحریک بن گئی جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط تھی، یہاں تک کہ جب ضرورت پڑی تو جنگ آزادی لڑنے کے لیے بھی تیار تھی، سنوسی نے اپنے پیروکاروں میں ایمان و ایقان جرأت و ہمت کا ایسا جواں جذبہ پیدا کیا تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے سبب ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لیے ہمہ وقت مستعد و تیار رہتے تھے''۔

امام سنوسیؒ کی کرشمہ ساز شخصیت

ڈاکٹر نیقولہ زیادۃ آپ کی ہمہ پہلو شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سنوسی کبیرؒ کی کامیابی عظیم کامیابی تھی اور اس کی عظمت کا اندازہ بہتر طور پر تبھی ہو سکتا ہے جب ہم ان نامساعد حالات کا تصور کریں جن میں سنوسی کو کام کرنا پڑا۔ یہ کارنامہ یقیناً ایک

عظیم شخصیت کا مرہونِ منت تھا، جو عقلی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے اپنے معاصرین اور ساتھیوں سے بدرجہا بہتر تھی۔ وہ اپنی ذہانت و فطانت کی وجہ سے مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے، جس پر ان کے تبحرِ علمی، اصابت رائے اور نئے جدید خیالات کو قبول کرنے پر آمادگی سے، ان کی شخصیت میں ایک مقناطیسی اثر پیدا کر دیا تھا کہ لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ کام، کام اور مسلسل کام اور تخلیقی عمل ان کی زندگی کا دلچسپ ترین مشغلہ تھا"۔

ایک ترک مؤرخ نے ان کی شخصیت کے بارے میں اپنا تاثر یوں رقم کیا:

"سنوسی تحریک کے مقاصد کی عظمت، ان کے حصول کے سادہ اور کمیاب وسائل اور ان کو پیش آمدہ بھیر مسائل کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے جو اس کے بانی کو پیش آئے اور جن کا اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا تو کوئی بھی اس شخص کی عظمت اور ذہانت و فطانت ور عقل و دانش کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو اللہ نے اسے ودیعت کی تھیں"۔

معروف مستشرق سی سی آدم ان کی ہمہ گیر شخصیت کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

"سید السنوسی کافی قد آور اور مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فصیح البیان مقرر تھے، شاگردوں کی کثرت کو دیکھا جائے تو ایک اچھے استاد تھے۔ صحرا کے غیر مہذب عربوں سے معاملہ کرنے کا فن جانتے تھے۔ ہجوم کو قابو کرنے کے لیے، جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں اور جو شخص بھی ان سے ملتا تھا، اس پر اپنے علم و فضل اور حسن اخلاق کا گہرا اثر قائم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ آپ غیر معمولی روحانی طاقت اور اس پر تصرف کے مالک ہیں"۔

امام سنوسی بحیثیت مصلح

ڈاکٹر نقولہ زیادۃ نے امام سنوسی کو بہت بڑا مصلح ثابت کرنے کے لیے لکھا ہے: وہ دونوں (امام ابن علی سنوسی اور ان کے فرزند محمد بن علی سنوسی) عالم اسلام کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ عالم اسلام سے آغاز کر کے وہ نجی اصلاح کے دائرے کو تمام دنیا تک پھیلا دینا چاہتے تھے۔ اسلام کے پیروکاروں کے باہم مختلف گروہوں کو باہم متحد کر کے انہیں ایک عظیم روحانی، اور ممکن ہو تو سیاسی جمعیت و تنظیم میں بدل دینا ان کا مقصود تھا۔ لیکن انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ فرد کی ظاہری حالت کو بدل کر یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ اس کے باطن کی کایا پلٹ نہ کی جائے۔ لہٰذا انہوں نے مسلم فرد کے باطن کو بدلنے پر اولین توجہ مبذول کی اور لیبیا سنوسی کبیر اور ان کے جانشین کے لیے ایک عملی تجربہ گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا، جہاں انہوں نے مسلم افراد کی ایسی اخلاقی اور روحانی اصلاح کی کہ وہ دوسرے اصلاح یافتہ مسلمانوں کے لیے نمونہ ثابت ہوئے۔ مزید براں امام سنوسی بطور بانی تحریک اور ان کے فرزند بطور ایک تبلیغی تنظیم کے امیر کے نئے علاقوں میں تبلیغ اسلام کی اہمیت کو محسوس کر چکے تھے جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کے لیے ذریعہ نجات تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ لیبیا کی آزادی بلا شبہ سنوسی تحریک کی مرہون منت ہے اور یہ اعزاز تحریک سنوسیہ اور مستقل مزاج قیادت کے سر بندھتا ہے۔ تحریک کا آغاز تو مسلمانوں میں ایمان وایقان کی شمع روشن کرنا تھا تاکہ وہ اپنی زندگی اسلامی اقدار اور اصولوں کے مطابق گزار سکیں، لیکن اس کا انجام ایک وسیع سلطنت کے قیام پر منتج ہوا۔ یہ واقعہ گزشتہ صدی کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔

سوڈان کی مہدیہ تحریک

مسلم ملک سوڈان دنیا کے قدیم ترین ملکوں میں سے ہے۔ مصر کی طرح سوڈان میں بھی دریائے نیل کی وادی دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ سوڈان کا شمالی حصہ زمانہ قدیم میں نوبیہ کہلاتا تھا۔ نوبیہ کی قدیم تہذیب دراصل مصری تہذیب ہی تھی جس کے اثرات شمالی سوڈان میں مصر کی سلطنت قدیم (2900 ق م تا 2500 ق م) کے زمانے ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد خود نوبیہ میں 800 ق م کے قریب ناپاتا (Napata) اور میرو (Meroe) کی سلطنتیں قائم ہوئیں اور 300ء تک سوڈان کی اس سلطنت کی حدود بحیرۂ روم تک پہنچ گئی تھیں۔ خرطوم اور مصر کے درمیان حال ہی میں جو کھدائی ہوئی ہے، اس سے ان قدیم تہذیبوں کے بکثرت آثار دریافت ہوئے ہیں جو اہرام، عبادت گاہوں، محلات اور مجسموں کی شکل میں ہیں۔

ناپاتا اور میرو کے زوال کے بعد سوڈان میں عیسائیت کو فروغ ہوا۔ اگرچہ سوڈانیوں نے چھٹی صدی عیسوی تک مسیحیت قبول نہیں کی تھی، لیکن اگلی چند صدیوں میں شمالی سوڈان کا بڑا حصہ مسیحی مذہب قبول کر چکا تھا۔ سوڈان کی مسیحی ریاستوں میں دنقلہ (Dongola) اور ایلوا کی حکومتیں قابل ذکر ہیں۔ یہ سلطنتیں چودھویں صدی کے بعد تک قائم رہیں۔ اس کے بعد ان کے کھنڈروں پر اسلامی حکومتوں کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

اسلامی دور

مسلمانوں نے نوبیہ پر ساتویں صدی عیسوی ہی سے حملے شروع کر دیئے تھے۔ یہ خلافت راشدہ کا زمانہ تھا، لیکن مسلمان ان حملوں میں نوبیہ پر قابض نہ ہو سکے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عرب قبائل بہت بڑی تعداد میں بحیرہ قلزم کے راستے مشرقی سوڈان میں داخل ہوئے اور سنار کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ عربوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ نیگرو باشندوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے اور ایک وقت آیا کہ سنار کے علاقے میں عربوں کی اکثریت ہوگئی اور یہاں کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔ پندرہویں صدی تک مسلمانوں کا اس تمام علاقے پر قبضہ ہوگیا جو اب شمالی سوڈان کہلاتا ہے۔ پندرہویں صدی میں یہاں دو طاقتور اسلامی حکومتیں قائم تھیں۔ ایک سنار کے سلاطین جو فنج (Fung) کہلاتے تھے اور دوسرے مغرب میں دارفور کے سلاطین۔ فنج حکمران عدلان (1596ء تا 1603ء) کے زمانے میں، جو مغل بادشاہ اکبر کا ہم عصر تھا، سنار کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور بغداد اور قاہرہ تک سے اہل علم سنار پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ سنار کی تاریخی جامعہ مسجد، جو اب تک موجود ہے،

اسی عدلان ے پڑ یتے نے بنوائی تھی۔ فنج خاندان کے عہد میں جسے اٹھارویں صدی میں زوال ہوا، پورا شمالی سوڈان اسلام قبول ر چکا تھا۔

فنج خ ندان کے زوال کے بعد سوڈان انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ یہ صورت حال تھی کہ مصری حکمران محمد علی پاشا نے 1820ء میں نوبیہ اور اگلے سال سنار فتح کر لیا۔ اس کے بعد مصری تسلط آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ 187) ء میں استرائیہ یعنی موجودہ سوڈان کا انتہائی جنوبی صوبہ بھی مصری سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

محمد احمد سوڈانی

مصری حکو ت نے سوڈانی باشندوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، جس کا سوڈانیوں پر شدید ردعمل ہوا اور 1883 . میں ا ہوں نے ایک درویش صفت شخص محمد احمد کی رہنمائی میں جو مہدی سوڈانی کے نام سے مشہور ہیں، علَم بغاوت بلند کر یا۔ مہدی سوڈانی کے پیروؤں نے جو درویش کہلاتے تھے، دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیہ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ مصر کی انگریز حکومت نے بغاوت کچلنے کے لیے ایک نگریز جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں لیکن جنرل گورڈن کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جنرل لورڈ ن مارا گیا اور 26 جنوری 1885ء کو خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہو گیا۔ مہدی سوڈانی اب مصر پر حملے کی تیاریاں کرر ہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

محمد احمد سو نی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف سیاسی رہنما اور ایک حکومت کے بانی ہی نہیں تھے، بلکہ ایک مصلح ی تھے۔ وہ 1843ء میں جزیرہ دنقلہ میں پیدا ہوئے۔ وہ نوبیہ کے عرب بربر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کی زندگی میں مہدی نے حضرت علیؓ اور رسول کریم ﷺ سے اپنی قرابت داری اور سلسلۂ بیعت کو ثابت کرنے کے یے اپنے حسب نسب کی جو تفصیل دی ہے، اس کی رو سے انہوں نے باپ کی جانب سے حضرت امام حسنؓ سے اور و لدہ کی جانب سے حضرت امام حسینؓ اور حضرت عباسؓ سے صلبی نسبت ظاہر کی۔ وہ جہاز میں کام والے ایک بڑھئی ے دوسرے فرزند تھے۔ ابتدا ہی سے ان کی طبیعت تصوّف کی طرف مائل تھی اور معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے 1861ء میں سلسلہ سمانیہ میں شیخ محمد شریف سے بیعت کی۔ سات سال کی مریدی کے بعد شیخ محمد شریف نے ہے ا سلسلے کی خلافت سے ممتاز کیا۔ کچھ عرصہ خرطوم میں قیام کرنے کے بعد جہاں انہوں نے شادی بھی کر لی، وہ نیل ابیض سے آبا نامی جزیرے میں چلے گئے۔ یہاں انہوں نے ایک جامع مسجد اور ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی۔ ان کے گرد مریدوں کا ہجوم ہو گیا۔ ان کے پیرومرشد شیخ محمد شریف بھی 1872ء میں ان کے قریب ہی آ بسے۔ ایسے شاہد مو جود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات محمد احمد کو کچھ ناگوار گزری۔

اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد محمد احمد کو دل میں یہ القاء ہوا کہ وہ مہدی المنتظر ہیں۔ یہ کیفیت ان روایات کے زیر اثر پیدا ہوئی جو مسلمانوں میں حضرت مہدی کے متعلق پائی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کے تعلقات اپنے مرشد سے کشیدہ ہو گئے۔ اب وہ اپنے طریقت کے حریف شیخ القرشی سے جا ملے اور 1880ء میں ان کے سجادہ نشین بھی

بن گئے۔ دنقلہ سے سنار اور نیل ارزق سے کردفان تک کے علاقے میں سیاحت کے دوران انہوں نے بھانپ لیا کہ لوگوں میں بددلی اور بے اطمینانی موجود ہے اور ان پر مصر کی انگریز حکومت کی جانب سے تشدد ہو رہا ہے۔ سوڈان کی مخلوط آبادی، اس کا مذہبی جنون، ترکوں اور عربوں کا باہمی نفاق، ترکوں کے حکمران طبقے سے شیعوں کی دیرینہ مخالفت، یہ سب باتیں ایسی تھیں جو ان کے دعوائے مہدویت کے لیے بارآور ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جو تحریک شروع کی، وہ ان کی روحانی واردات پر مبنی تھی جس کا انہیں پورا یقین تھا۔ شروع ہی سے یہ تحریک سیاسی اور معاشرتی افکار و خیالات سے مخلوط ہو گئی جو مذہب سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔

بعد میں اس تحریک نے کچھ منفی رخ بھی اختیار کیا۔ محمد احمد نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ دنیا کو بدکاری اور برائی سے پاک کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے سب سے پہلے تو لوگوں کو ترکوں کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دی۔ اس سے قبل وہ کردفان اور دارفور کے متعدد سرداروں کو بیعت کے ذریعے اپنے سے وابستہ کر چکے تھے اور عبداللہ التعایشی، جو بعد میں ان کے خلیفہ ہوئے، کے سے مردان کار کو اپنے ساتھ ملا چکے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف کتابچوں اور فرمانوں کے ذریعے لوگوں کو اپنی تائید پر مائل کر لیا کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے ان کو زیارت سے مشرف فرمایا ہے۔ آپ ہی نے ان کو مہدی مقرر فرمایا ہے، اور نیز یہ کہ انہوں نے حضرت خضر، جبریل اور اقطاب کی زیارت بھی کی ہے اور انہیں دعوت دی ہے کہ وہ لوگوں کی مذہبی زندگی کی اصلاح اور تطہیر کریں۔ لوگ ''ہجرت'' کر کے ان کے پاس آئیں اور ان کی بیعت کریں، انہیں امام مہدی المنتظر مان کر ان کے پیچھے چلیں اور جہاد کریں، وغیرہ وغیرہ۔

دار نوبہ گدیر کی پہاڑی ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ جولائی 1881ء میں وہ پہلی مرتبہ المہدی کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ انہوں نے خرطوم کی حکومت سے گفت و شنید کی، وہ بے سود ثابت ہوئی۔ حکومت نے ابوالسعود کی قیادت میں فوج کے جو دستے ان کے خلاف بھیجے تھے، وہ ان کے مریدوں نے تباہ کر دیئے۔ اس سے ان کا حوصلہ بڑھا اور مزید فتوحات حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ مصری حکومت کو عرابی پاشا کی بغاوت کی وجہ سے زیادہ شدید کارروائی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کے خلاف مہدویہ سلسلہ بلا روک ٹوک مشرقی سوڈان تک پھیل گیا۔ وہاں عثمان دقنہ، جو غلاموں کی تجارت کرتا تھا اور بعد میں مہدی کا قابل ترین سپہ سالار ثابت ہوا، محمد احمد کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ مہدی کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ المغرب کی جانب بھی اپنی طاقت بڑھائے اور اس غرض سے انہوں نے لیبیا کے محمد بن علی سنوسی سے تعلقات و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

وہ اپنے پورے عروج پر تھے کہ 1884ء کی مہم انہیں خرطوم لے گئی، جہاں جنرل گورڈن نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن خرطوم 30 جنوری 1885ء کو مہدی کے قبضے میں آ گیا اور گورڈن مارا گیا۔ اس فتح کے بعد محمد احمد زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکے۔ وہ 22 جون 1885ء کو ام درمان میں، جو خرطوم کے قریب ہے، فوت ہو گئے، یہاں ان کے جانشین خلیفہ عبداللہ نے ان کے مزار پر ایک قبہ تعمیر کرایا۔ اب یہ مہدیوں کا صدر مقام بن گیا، تا آنکہ کچنر نے 1898ء میں عبداللہ کی حکومت اور سلسلۂ مہدیہ دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

سلسلۂ مہدیہ کی تحریک

مہدی سوڈانی نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد نیل کے مغربی کنارے پر خرطوم کے بالمقابل ام درمان کے شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دیں۔ نئے سکے ڈھالے گئے اور جن لوگوں کو سابقہ حکومت نے ناجائز طور پر زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا، ان کو زمینیں واپس کر دی گئیں۔ ان کی تعلیمات کی بعض خصوصیات سے مقبول عام تصوف کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا زاہدانہ کردار دنیاوی ترقی کے منافی تھا۔ مہدیہ سلسلہ چونکہ رسمی تعلیم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اس لیے تعلیم یافتہ طبقہ ان کے حلقۂ مریدین سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ ان کے نزدیک قرآن پاک کے علاوہ اگر کسی چیز کو کوئی وقعت حاصل تھی تو وہ مہدی کے احکام تھے یا راتب (وظائف واذکار کا مجموعہ) اور ''مجلس'' نامی ایک کتاب، جس میں محمد احمد کا مرتب کردہ مجموعہ، احادیث تھا۔ بعض قواعد وضوابط کے مطابق آرائش وزیبائش، موسیقی، شادی بیاہ کی رسوم پر فضول خرچی، تمباکو نوشی اور شراب نوشی منع تھی، بالخصوص پیر پرستی اور جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈوں کی مخالفت میں بڑے غلو سے کام لیا جاتا تھا۔ عورتوں کو سخت پردہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ مہدی سوڈانی اپنے پیرووں سے حسب ذیل حلف لیتے تھے۔

''ہم خدا اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں، اور یہ کہ ہم توحید کی خاطر آپ کی اطاعت کریں گے۔ ہم کسی کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے، اور کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے، اور کسی جائز کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کو خیر باد کہیں گے اور خدا کی خوشنودی کے لیے کام کریں گے، اور یہ کہ جہاد سے منہ نہیں موڑیں گے''۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد احمد اپنی وفات سے کچھ پہلے اپنے مریدین اور معتقدین کی نظروں میں ایک دیوتا سا بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کے لیے مندرجہ ذیل چھ ارکان مقرر کیے:

1۔ صلوٰۃ، نماز باجماعت پر بے حد زور دیا گیا۔

2۔ جہاد، اہل سنت والجماعت کے عمل کے خلاف حج کے بدل کے طور پر۔

3۔ اللہ کے احکام کی اطاعت۔

4۔ اضافہ شدہ کلمۂ شہادت۔

5۔ تلاوت قرآن۔

6۔ راتب (یعنی وظائف واذکار)

ان کے چند خیالات اور بھی تھے مثلاً یہ کہ امیر وغریب سب برابر ہیں۔ کچھ خیالات شیعوں کی انقلابی خصوصیات کی بازگشت تھے اور کچھ اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھے۔ عملی طور پر مہدیہ فرقے میں اتحاد ومساوات کا اصول بدرجۂ کمال کارفرما تھا۔ غلام اور غلاموں کے تاجر ایک ہی جھنڈے تلے، شانہ بہ شانہ ہو کر انگریز نواز مصری حکومت کے خلاف لڑنے لگے تھے۔ مہدیوں کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ مہدی کا تمام دنیا پر غلبہ ہو جائے گا۔ چنانچہ سوڈان کی فتح کے بعد مصر، مکہ اور قسطنطنیہ کی فتح کا منصوبہ بنایا گیا۔ ان کی ذات کے متعلق طرح

طرح کے افسانے ابتدا ہی میں مشہور ہو گئے تھے بعض اوقات غالی معتقدان کے بیانات و اعلانات کو کرامات اور مکشوفات ثابت کر کے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔

مہدی سوڈانی کی وفات کے بعد حکومت و قیادت کی ذمہ داری ان کے جانشین خلیفہ عبداللہ نے سنبھالی۔

سوڈان اسلامائزیشن کی راہ پر

مہدی سوڈانی کا جانشین خلیفہ عبداللہ 1885ء تا 1898ء حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر پر درویشوں کا حملہ ناکام ہو گیا اور مصری فوج نے اپنے نئے انگریز سردار لارڈ کچنر کی قیادت میں 1898ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔ درویشوں نے اگرچہ بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن جدید اسلحے سے لیس فوج کا وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ خلیفہ عبداللہ نومبر 1899ء میں جنگ میں کام آیا اور سوڈان پر پھر مصری اور برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔ جنوری 1900ء میں مشہور درویش سپہ سالار عثمان دغنہ، جس نے مہدی سوڈانی کے وقت میں بڑا نام پیدا کیا تھا، گرفتار ہو گیا۔ کچنر نے جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر مہدی سوڈانی کی قبر کھدوا دی اور ہڈیاں جلا دیں۔ اس کے بعد 1903ء تا 1908ء سوڈانی درویشوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف بغاوتیں کیں لیکن وہ کچل دی گئیں۔

انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروؤں کو کچلنے کے لیے ان کو بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اب دنیا بھر میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ مہدی محمد احمد سوڈان کی بیداری اور آزادی کی تحریک کے پیشرو تھے۔ ان کی ہڈیاں اگرچہ کچنر نے قبر سے نکلوا کر جلا ڈالیں، لیکن ام درمان میں ان کا مقبرہ آج سوڈان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

برطانوی سامراج کا عہد

لارڈ کچنر کی سرکردگی، جو مصری فوج کا سپہ سالار تھا، سوڈان پر مصری قبضہ دراصل مصری حکومت کی بحالی نہیں تھا، بلکہ سوڈان پر انگریزی تسلط کا پیش خیمہ تھا۔ کیونکہ 19 جنوری 1899ء میں مصر اور برطانیہ میں ایک معاہدہ ہو گیا تھا، جس کے تحت سوڈان پر برطانیہ اور مصر دونوں کی بالادستی تسلیم کی گئی تھی، لیکن سوڈان کے حقیقی حکمران اب انگریز ہی تھے۔ 1924ء میں سوڈان کے انگریز گورنر جنرل کے قتل کے بعد مصر کا رہا سہا آئینی سہارا بھی ختم ہو گیا اور سوڈان براہ راست برطانیہ کے تسلط میں آ گیا۔

انگریزوں نے اپنے عہد (1899ء۔1956ء) میں جہاں بعض قابلِ تعریف کام انجام دیئے، وہاں انہوں نے مصر اور سوڈان کے درمیان افتراق پیدا کرنے کی بھی پوری کوشش کی، اور جنوبی سوڈان کو شمالی سوڈان سے الگ کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جنوبی سوڈان میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور وہاں کے باشندے حبشی النسل (نیگرو) ہیں، جب کہ باقی جنوبی سوڈان کے باشندے عربی النسل ہیں اور زبان بھی عربی بولتے ہیں اور مسلمان

ہیں۔ جنوبی سوڈان کے باشندوں کی اکثریت مظاہر پرست اور بت پرست ہے۔ مشرکانہ عقائد رکھتے ہیں۔ برطانوی عہد میں ان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ بنایا گیا اور بہت سے لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی سوڈان کے باشندوں کا ایک بڑا طبقہ سوڈان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگا۔

برطانوی اقتدار سے آزادی

برطانوی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے سے پہلے سوڈان کے باشندے دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ ایک گروہ مصر اور سوڈان کے اتحاد کا حامی تھا اور دوسرا مصر سے مکمل علیحدگی چاہتا تھا۔ پہلے گروہ کو اشقہ پارٹی کی حمایت حاصل تھی، جس کے رہنما اسماعیل ازہری تھے۔ سوڈان کے با اثر صوفی سلسلے ''ختمیہ'' کے رہنما سید علی میرغنی اس گروہ کے ساتھ تھے۔ دوسرا گروہ جو مکمل علیحدگی اور خود مختاری کا حامی تھا، اس کے قائد مہدی سوڈانی کے صاحبزادے سید عبدالرحمٰن (1885ء - 1961ء) تھے۔ وہ سوڈان کی دوسری با اثر جماعت ''امہ پارٹی'' کے رہنما تھے۔ اہل سوڈان کے درمیان اس تفریق کی وجہ سے سوڈان کے مصر کے ساتھ الحاق کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور طویل جدوجہد کے نتیجے میں برطانیہ نے یکم جنوری 1956ء کو سوڈان کو آزاد کر دیا۔

آزادی کے بعد

آزادی حاصل کرنے کے بعد اشقہ پارٹی کے رہنما اسماعیل ازہری نے پہلی حکومت بنائی۔ یہ بات اگرچہ مصر سے الحاق کے حامیوں کے لیے بڑی حوصلہ افزا تھی لیکن مصر اس وقت صدر ناصر کی قیادت میں آمریت اور قوم پرستی کے جس راستے پر جا رہا تھا، اس میں سوڈانیوں کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ الاخوان المسلمین کے ساتھ مصری حکومت کے ظالمانہ سلوک نے اس رشتے کو بھی کمزور کر دیا جو وادی نیل کی وحدت کو قائم رکھنے میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اسماعیل ازہری کی حکومت ٹوٹ گئی اور سوڈانی قوم پرستی [illegible] کی سب سے بڑی علم بردار جماعت امہ پارٹی کے ایک رہنما عبداللہ خلیل نے نئی حکومت بنائی۔ اب الحاق مصر کی امید ختم ہو چکی تھی لیکن مصر اب بھی سوڈان میں خفیہ طور پر جوڑ توڑ کرتا رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نومبر 1958ء میں سوڈان بھی فوجی انقلاب سے دوچار ہوا، جس سے اس زمانے میں دنیائے اسلام کے کئی ملکوں کو سابقہ پڑ رہا تھا (جن میں ہمارا پاکستان بھی شامل ہے)۔ سوڈانی کمانڈر ان چیف جنرل ابراہیم عبود نے 17 نومبر کو آئینی اور جمہوری حکومت توڑ کر فوجی حکومت قائم کر دی۔ تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دیا گیا، اور جب سیاسی رہنماؤں نے آئینی حکومت بحال کرنے کے لیے زیادہ دباؤ ڈالا تو جولائی 1961ء میں دونوں سیاسی رہنماؤں یعنی اسماعیل ازہری اور عبداللہ خلیل کو گرفتار کر لیا گیا۔ سید عبدالرحمٰن کو ان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے گرفتار نہیں کیا جا سکا، لیکن اکتوبر 1961ء میں وہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔ جنرل عبود کی آمریت چار سال تک قائم رہی۔ بالآخر حریت پسند عوامی طاقتوں کے آگے ان کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور وہ 15 نومبر 1964ء کو مستعفی ہو گئے، جس کے نتیجے میں سوڈان میں ایک بار پھر جمہوری نظام قائم ہو گیا۔

اسلامی دستور کے لیے جدو جہد

پاکستان کی طرح سوڈان میں بھی آزادی کے بعد دستور سازی کے مسئلے کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ وہاں شروع ہی سے اسلامی عناصر کافی منضبط اور متحد تھے۔ گویا آزادی کے بعد سوڈان کو ایک اسلامی دستور بننے والا تھا، اور اس جانب ابتدائی برسوں میں کافی پیش رفت ہو رہی تھی، لیکن پاکستان کی طرح سوڈان میں بھی اسلامی دستور سازی کی منزل فوجی انقلاب نے دور کر دی۔

جنرل عبود کی آمریت کے خاتمے کے بعد مئی 1965ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی۔ امہ پارٹی نے، جس کے رہنما اب امام ہادی المہدی اور صادق المہدی تھے، اسماعیل ازہری کی حزب الاتحاد الدیموقراطی (Unionist Democratic Party) کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیا کہ سوڈان کا دستور اسلامی احکام و تعلیمات پر مبنی ہو۔ یہ صورت حال کمیونسٹوں کے لیے پریشانی کا موجب بنی جو سوڈان کو ایک لادینی اشتراکی ملک بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مئی 1969ء میں فوج کے ہم خیال افسروں کی مدد سے کمیونسٹوں نے جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سوڈان میں سوشلسٹ آمریت قائم کر دی۔ دوسرے اشتراکی ممالک کی طرح سوڈان میں بھی تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ام درمان کی اسلامی یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ الاخوان المسلمین اور امہ پارٹی کے رہنماؤں کو خاص طور پر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ جزیرہ آبا پر، جو مہدی سوڈانی کے پیروؤں کا سب سے بڑا مرکز تھا، حملہ کیا گیا اس حملے میں امہ پارٹی کے رہنما اور مہدی سوڈانی کے پوتے ہادی المہدی (1915ء-1970ء) سرکاری فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ وہ اپنے بھائی صدیق المہدی کے انتقال کے بعد 1961ء سے امہ پارٹی کے رہنما تھے۔ امہ پارٹی کے دوسرے رہنما صادق المہدی کو، جو 1966ء اور 1967ء میں سوڈان کے وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے اور صدیق المہدی کے فرزند تھے، کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ملک کے بزرگ رہنما اور تحریک آزادی کے قائد اسماعیل ازہری کو جیل میں ڈال دیا گیا، جہاں پراسرار حالات میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جعفر محمد نمیری کا دورِ صدارت

سوڈان کے اس سوشلسٹ انقلاب کے بانی فوج کے ایک افسر جعفر محمد النمیر تھے۔ کرنل نمیری نے 800 فوجیوں کی مدد سے 25 مئی 1969ء کو خون خرابے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لیا، کیونکہ فوج کی بڑی تعداد جنوبی سوڈان میں مصروف جنگ تھی۔ اب وہ انقلابی کمانڈ کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے ملک کے صدر بن گئے اور جنرل ہو گئے۔

جنرل نمیری نے برسر اقتدار آنے کے بعد تمام سیاسی جماعتیں توڑ دیں۔ 64 سیاست دانوں اور اعلیٰ فوجی افسروں کو گرفتار کر لیا اور سوڈان کا نام "ڈیموکریٹک جمہوریہ سوڈان" رکھا اور سوشلزم کے ذریعے ملک کو ترقی دینے کا عزم کیا۔ نوجوانی میں صدر نمیری مہدیوں سے وابستہ تھے، لیکن اب ان کے خلاف ہو گئے اور ان کی تنظیم "انصار" کو توڑنے کے لیے انہوں نے کمیونسٹوں کا سہارا لیا اور اکتوبر 1969ء میں سوڈانی کابینہ میں تین کمیونسٹ وزیر شامل

کیے۔ جن پر انصار نے مارچ 1970ء میں زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے کو صدر نمیری نے سختی سے کچل دیا اور ایک ہزار انصار مارے گئے، لیکن جنرل نمیری کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کمیونسٹوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ کمیونسٹ وزیر سرکاری رازوں سے اپنی پارٹی کو مطلع کر دیتے ہیں تو انہوں نے نومبر 1970ء میں ان وزیروں کو برطرف کر دیا۔ ایک سال بعد 12 فروری 1971ء کو انہوں نے اعلان کیا کہ سوڈان سے کمیونزم کے تمام آثار مٹا دیئے جائیں گے۔ 19 جولائی 1971ء کو روس اور بلغاریہ کی مدد سے سوڈانی فوج کے کمیونسٹ افسروں نے بغاوت کر دی اور انہوں نے صدر نمیری کو گرفتار کر کے میجر ہاشم العطا کی سربراہی میں حکومت قائم کر لی۔ لیکن یہ حکومت تین دن سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ فوج نے نمیری کا ساتھ دیا اور مصر اور لیبیا نے بھی ان کو امداد دی۔ مصر نے نہر سویز کے علاقے میں تعینات سوڈانی فوجی دستوں کو بھی طیاروں کے ذریعے سوڈان پہنچا دیا۔ لیبیا نے سوڈان کے وزیر دفاع میجر جنرل خالد حسن عباس کو، جو یوگوسلاویہ میں تھے، سوڈان پہنچا دیا اور انہوں نے 22 جولائی کو صدر نمیری کو قید سے آزاد کرا لیا۔ باغی افسروں کو گولی مار دی گئی اور فوج سے سارے کمیونسٹ نکال دیئے گئے۔

30 ستمبر 1971ء کے ریفرنڈم کے نتیجے میں محمد جعفر نمیری سوڈان کے باضابطہ صدر منتخب ہو گئے۔ ان کا اہم کارنامہ شمال اور جنوب کے درمیان پر امن مصالحت کا سمجھوتہ تھا۔ اس سمجھوتے کے نتیجے میں جنوب کے متحدہ سوڈانی قومی محاذ نے بیس سال تک مخالفت کرنے کے بعد خود کو ختم کر لیا۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سوڈان میں کمیونسٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لیے توڑ دی، لیکن دائیں بازو کے اسلام پسند عناصر کی طاقت توڑنے میں وہ ناکام رہے۔ ان کے سب سے طاقتور حریف الانصار تھے، جن کو لیبیا کے صدر قذافی کی تائید اور مدد حاصل تھی اور جس کے رہنما صادق المہدی کی صدر قذافی سرپرستی کر رہے تھے۔ لیبیا اور انصار کے جلاوطن رضا کاروں کو فوجی تربیت دی جا رہی تھی اور اسلحہ فراہم کیا جا رہا تھا۔ جنوری 1973ء میں اور پھر جولائی 1976ء میں انصار نے صدر نمیری کا تختہ الٹنے کی کوشش بھی کی، لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور بغاوت ہر بار کچل دی گئی۔

اسلامی جماعتوں کی طرف جھکاؤ

اس دوران میں سوڈان کی خارجہ پالیسی میں کئی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سے مصر کی طرح سوڈان نے بھی امریکا سے تعلقات ختم کر لیے تھے، لیکن 1971ء کے بعد یہ دیکھ کر کہ روس کی حکومت لیبیا اور حبشہ کی طرف جھک رہی ہے، اور روسی سوڈانی کمیونسٹوں سے مل کر سازش کر رہے ہیں، صدر نمیری نے 1972ء میں امریکا سے تعلقات بحال کر لیے اور مصر سے جہاں اب صدر سادات برسر اقتدار تھے، نیز سعودی عرب سے تعلقات کو اور زیادہ مستحکم بنا لیا۔ 1977ء میں سوڈان سے روسی مشیروں کو نکال دینے کے بعد سوڈان نے اسلحہ بھی امریکا سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اسی سال حبشہ میں کمیونسٹ انقلاب آ گیا اور اری ٹیریا کی جدوجہد آزادی، جس کی پشت پناہ سوڈان کر رہا تھا، خطرے میں پڑ گئی۔ سعودی عرب بھی اری ٹیریا کی تحریک آزادی میں حریت پسندوں کی مدد کر رہا تھا اور سوڈان کی مالی مدد بھی کر رہا تھا۔

صدر نمیری نے ان بدلتے ہوئے حالات میں یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ غیر مسلم طاقتوں اور سوشلسٹ عناصر پر اعتماد کرنے کی بجائے انہیں اسلامی عناصر اور جماعتوں پر اعتماد کرنا ہوگا اور اس سلسلے میں ان وخود اپنے وطن کے اسلامی عناصر کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُمہ پارٹی کے قائد صادق المہدی سے تصفیے کی گفتگو شروع کی۔ اسی دوران فروری 1978ء میں سوڈان میں عام انتخابات ہوئے جو نمیری کے برسر اقتدار آنے کے بعد پہلے انتخابات تھے۔ ان میں تقریباً نصف نشستوں پر حزب اختلاف کے نمائندے کامیاب ہوگئے۔ جنرل نمیری کے لیے اب صادق المہدی سے تصفیہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا تھا۔ چنانچہ 12 اپریل 1978ء کو قومی متحدہ محاذ کے ارکان سے، جن کی قیادت صادق المہدی کر رہے تھے، نمیری نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ معاہدے کے تحت محاذ نے وعدہ کیا کہ وہ چھاپہ مار کر سرگرمیاں بند کر دے گا اور اسلحہ حکومت کے سپرد کر دے گا۔ دوسری طرف حکومت نے انصار اور اخوان سے تعلق رکھنے والے 900 قیدی، جن کی بڑی تعداد طلبہ پر مشتمل تھی، رہا کر دیئے۔ حکومت نے صادق المہدی اور تمام جلاوطن رہنماؤں کو سوڈان واپس آنے کی اجازت دے دی اور وعدہ کیا کہ ان کو مکمل حقوق اور آزادی حاصل ہوگی۔

اسلامی جماعتوں سے معاہدہ کرنے کے بعد جنرل نمیری نے وسط 1979ء میں سوڈانی سوشلسٹ یونین کے پولیٹیکل بیورو کے 27 ارکان میں سے 9 کو نکال دیا۔ نائب صدر ابراہیم کو جو 1970ء میں انصار کے قتل عام کے ذمہ دار تھے، برطرف کر دیا اور الاخوان المسلمین اور سوڈان کی ایک با اثر مذہبی جماعت "الختمیہ" کا تعاون حاصل کیا اور ان کے تین افراد کو حکومت میں شامل کر کے سوڈانی آئین و قانون کو شریعت کے مطابق بنانے کا کام سپرد کیا اور یہ کام تیز کرنے کے لیے اخوان کے رہنما ڈاکٹر حسن ترابی کو اٹارنی جنرل مقرر کیا۔

ڈاکٹر حسن ترابی

حسن ترابی اور سوڈان ایک دوسرے کی شناخت ہیں، جیسے جڑواں بچے۔ فوجی آمریت ہو یا مہدیوں کی مصلحت آمیز حکومت، جمہوریت کی بالادستی کی جنگ ہو یا نفاذِ اسلام کا مقدمہ، ہر جگہ اور ہر مسئلے میں ڈاکٹر حسن ترابی مرکزی کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حسن عبداللہ ترابی 1932ء میں مشرقی سوڈان کے ایک قصبے کسالہ کے ایک معزز دینی و علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علاقے کے لوگوں میں آپ کا خاندان مفتیوں اور صوفیوں کے نام سے مشہور تھا۔ آپ کے والد شیخ عبداللہ ترابی اسلامی قانون اور فقہ کے ممتاز عالم اور صوبے کی سب سے بڑی عدالت کے جج تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ گھر پر حسن ترابی نے عربی ادب، فقہ، علم الکلام، تفسیر اور حدیث وغیرہ علوم کی تعلیم حاصل کی، جب کہ زمانے کے رواج کے مطابق آپ نے جدید مغربی علوم کی تحصیل مختلف سرکاری اداروں میں کی۔ فارغ اوقات میں آپ کی والدہ بھی آپ کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیتی رہی۔ آپ کی شخصیت میں گہرا دینی رنگ نظر آتا ہے، یہ والدین کی کوششوں کا ثمر ہے۔

1953ء میں آپ خرطوم یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے طالب علم تھے کہ الاخوان المسلمین کے رہنماؤں حسن البناء شہید، سید قطب شہید اور جسٹس عبدالقادر عودہ کی تحریریں نظر سے گزریں۔ ان دانش وروں کی تحریروں کا آپ نے گہرا اثر لیا۔ آپ کی شخصیت کی تشکیل میں والدین کے علاوہ اخوانی رہنماؤں کی تحریروں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ اس وقت مصر میں الاخوان المسلمین اور جمال عبدالناصر کی باہمی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ 1955ء میں آپ نے قانون کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ برطانیہ قیام کے دوران میں آپ نے ''سوڈان سٹوڈنٹس یونین'' نامی ایک تنظیم کی بنیادی رکھی۔ آپ اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ 1957ء میں آپ برطانیہ سے ایل ایل ایم کی ڈگری لے کر واپس سوڈان آئے اور خرطوم یونیورسٹی میں قانون کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ دو سال بعد آپ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس چلے گئے۔ فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے آپ نے 1962ء میں ''ہنگامی قانون سازی'' کے موضوع پر مقالہ تحریر کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وطن واپس لوٹے۔ حکومت نے آپ کی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ تعلیم کے پیش نظر آپ کو اسی شعبے کا ڈین مقرر کیا۔

سوڈان میں ان دنوں جنرل ابراہیم عبود کی حکومت تھی جو وزیراعظم عبداللہ خلیل کے ساتھ سازش کرکے اقتدار میں آیا تھا۔ عوام میں جنرل کے خلاف نفرت کے جذبات پائے جاتے تھے۔ جنرل عبود کی پشت پر البتہ فوج کی طاقت موجود تھی۔ حسن ترابی الاخوان المسلمین سے ذہنی وفکری وابستگی کے باوجود ابھی عملی سیاست میں سرگرم نہیں ہوئے تھے۔ آپ کی توجہ طلبہ کو منظم کرنے پر لگی ہوئی تھی۔ جس بات نے حسن ترابی کو یونیورسٹی کے پرسکون ماحول سے نکال کر سیاست کی ہنگامہ خیز زندگی میں دھکیلا، وہ جنوبی سوڈان کا مسئلہ تھا جو حکمرانوں کی بدتدبیری کے سبب بتدریج الجھتا جا رہا تھا۔ جنوبی سوڈان کے عیسائی بار بار صوبائی خودمختاری کا مسئلہ بڑی شد و مد سے ابھار رہے تھے۔ حکومت اس مسئلے کا سیاسی حل ڈھونڈنے کی بجائے تحریک کو تشدد سے دبانا چاہتی تھی۔ جنرل ابراہیم عبود اگرچہ جنوبی سوڈان کے مسئلے کے حل کے لیے نت نئی تجاویز پر عمل کر رہا تھا، لیکن حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ حالات کی بہتری کے لیے حکومت نے ایک مذاکرے کا انتظام کیا جس میں سوڈانی دانشوروں اور سیاست دانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ حسن ترابی کو شعبۂ قانون کے ڈین کی حیثیت سے مذاکرات میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر دانش ور جنوبی سوڈان کے مسئلے پر حکومت کے موقف کی تائید کریں گے، لیکن یہاں تو بساط ہی الٹ گئی۔ ڈاکٹر پروفیسر حسن ترابی نے اپنی تقریر میں سوڈان میں خانہ جنگی ختم کرانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر چند اصلاحات نافذ کر دی جائیں تو جنوبی سوڈان کا مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے جو اصلاحات تجویز کیں، وہ یہ تھیں:

1۔ عوام کے بنیادی حقوق بحال کیے جائیں۔

2۔ تحریر و تقریر پر جو پابندیاں عائد ہیں، انہیں ختم کیا جائے۔

3۔ سیاسی مقدمات واپس لیے جائیں اور فوجی عقوبت خانوں میں تفتیش کا طریقہ ختم کیا جائے۔

4۔ منتخب پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لایا جائے۔

5۔ جنوبی سوڈان کو خود مختاری دی جائے۔ صوبوں کے پاس تعلیم، صحت، پولیس اور سماجی بہبود کے محکمے ہوں۔

6۔ جنوبی سوڈان کو مزید فنڈز مہیا کیے جائیں۔

ڈاکٹر حسن ترابی نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا: "اس سلسلے کا پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ فوج اقتدار سے الگ ہو جائے"۔

آپ کی تقریر جنرل ابراہیم عبود اور اس کی حکومت کے خلاف بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ اس سے ان عناصر کو تقویت ملی جو فوجی حکومت کو ملک کے مفاد کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ چنانچہ قوم نے اسی سال جنرل عبود کو حکومت چھوڑنے پر مجبور کر دیا، اور یوں سوڈان میں پارلیمانی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ اب آپ کی کوششوں سے دائیں بازو کی اسلامی تحریکوں کا ایک نیا محاذ "اسلامی منشور" کے نام سے وجود میں آیا۔ محاذ کے قیام کا مقصد سوڈان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے منظم تحریک چلانا تھا۔ عبود کے حکومت کے چھوڑنے پر عبوری دور کے لیے خاتم الخلیفہ کو صدر بنایا گیا۔ خاتم الخلیفہ نے وعدے کے مطابق عام انتخابات منعقد کرا کے اقتدار یونینسٹ پارٹی اور اُمہ پارٹی کے نمائندوں محمد احمد المحجوب (وزیر اعظم) اور اسماعیل الازہری (صدر) کے سپرد کیا۔ حسن ترابی ان انتخابات میں دو سال کے لیے (گریجوایٹس کی نشست پر) دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ دستوریہ کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہونے کے سبب اس کی مدت میں مزید ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح آپ تین سال تک دستوریہ کے رکن رہے۔ 1969ء میں جعفر النمیری کے انقلاب سے پہلے درمیانی مدت کے انتخابات میں آپ نے حصہ لیا، لیکن شکست کھا گئے۔ چند ماہ کے بعد جعفر النمیری نے ماسکو نواز کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر اسماعیل الازہری کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ دیگر بڑے بڑے لیڈروں کے ہمراہ آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ 1969ء کے سوشلسٹ انقلاب سے لے کر لیفٹیننٹ جنرل عمر حسن احمد البشیر کے انقلاب تک آپ پانچ مرتبہ گرفتار کیے گئے۔ مارچ 1976ء میں آپ کو جیل میں دل کا دورہ پڑا۔ اس سے آپ کی صحت اس حد تک گر گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ دورہ جان لیوا ثابت نہ ہو۔ جیل میں آپ کی بیماری کا سن کا اندرون اور بیرون ملک آپ کے چاہنے والوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ مراکش کے مشہور عالم دین، دانشور اور سیاسی لیڈر علامہ علال الفاسی نے جعفر النمیری کو ایک خط تحریر کیا جس میں اس پر زور دیا گیا کہ حسن ترابی کی صحت کی حفاظت کی جائے۔ ادھر خرطوم یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کے حق میں مظاہرے شروع کر دیئے جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئے۔ نتیجتاً حکومت آپ کو بہتر سہولتیں فراہم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ جیل جانے سے پہلے آپ انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانیں جانتے تھے۔ قید کے دوران آپ نے قرآن مجید حفظ کرنے کے علاوہ جرمن زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔ آپ آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی کتاب "تجدید اصول فقہ" دنیا بھر کے ماہرین قانون سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ آپ کی ازدواجی زندگی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آپ کے کٹر مخالف صادق المہدی کی ہمشیرہ آپ کی بیوی ہے۔

1976ء میں کمیونسٹوں نے جعفر النمیری کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی تو النمیری اس نتیجے پر پہنچا کہ بڑی طاقتوں روس اور امریکا کی طرف جھکاؤ سے سیاسی بے چینی ختم نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے عوام کے حقیقی نمائندوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ النمیری نے ''الانصار'' اور ''محاذ اسلامی منشور'' سے مصالحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ صادق المہدی اور حسن ترابی کو جیل سے نکال کر مذاکرات کی دعوت دی۔ مذاکرات سے پہلے حسن ترابی، صادق المہدی اور حزب اختلاف کے دوسرے لیڈروں نے باہمی مشاورت سے ''سوڈان نیشنل فرنٹ'' تشکیل دیا اور یہ طے پایا کہ اگر جعفر النمیری ان کے مطالبات تسلیم کرلے تو اس کے ساتھ تعاون کیا جاسکتا ہے۔ مطالبات پانچ یوں تھے:

1۔ 1965ء کا دستور بحال کر کے شریعت کو ملک کا قانون قرار دیا جائے۔

2۔ سوڈان کو بتدریج اسلامی مملکت بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

3۔ نمائندہ منتخب اداروں کو تشکیل دیا جائے۔

4۔ بنیادی حقوق بحال کیے جائیں۔

5۔ تحریر و تقریر کی آزادی دی جائے۔

طویل مذاکرات کے بعد جعفر النمیری نے سوڈانی نیشنل فرنٹ کے مطالبات تسلیم کرلیے۔ چنانچہ نیشنل فرنٹ نے جعفر النمیری کی حمایت کا اعلان کردیا۔ اس اعلان کے بعد جعفر النمیری نے فرنٹ کے متعدد ارکان کو اپنی کابینہ میں شامل کرلیا۔ ڈاکٹر حسن ترابی وزیر قانون بنائے گئے۔ مارچ 1980ء میں انہیں سیاسی بیورو کا رکن اور امور خارجہ کا مشیر بنایا گیا۔ ملکی قوانین کو اسلامی قانون کے ڈھالنے کے لیے تین اخوانیوں ڈاکٹر حسن عبداللہ المغربی، ڈاکٹر غفار شیخ اور علی عبدالرحمن کو نفاذ شریعت کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا۔ تین سال سے زائد عرصہ آپ اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل کر شب و روز محنت کر کے اسلامی نظام کے نفاذ میں مصروف رہے۔ اچانک 10 مارچ 1985ء کو آپ کو اپنے ساتھیوں نے ہمراہ تمام عہدوں سے الگ کر کے پابند سلاسل کردیا گیا۔ مرد آہن جعفر النمیری نے مرد مومن جنرل ضیاء الحق کی طرح اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اہل قوم کو شریعت اسلامی نافذ کرنے کا پروگرام بتایا تھا۔ وہ 9 اپریل کو پاکستان کے سرکاری دورے پر اسلام آباد پہنچنے والے تھے کہ ان کے دست راست وزیر دفاع جنرل عبدالرحمن سوار الذہاب نے ان کا 16 سالہ اقتدار فوجی انقلاب کے ذریعے ختم کردیا۔ بعد ازاں جنرل عبدالرحمن سوار الذہاب نے جعفر النمیری کا تختہ الٹ دیا۔ نئے سربراہ نے ڈاکٹر حسن ترابی سمیت تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا اور انتخابات کے انعقاد کے بعد اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر حسن ترابی نے جیل سے باہر آتے ہی اسلام پسند عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا کام شروع کیا۔ چنانچہ ستمبر 1985ء میں آپ نے خرطوم میں ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس کے اختتام پر دائیں بازو کے عناصر پر مشتمل ''نیشنل اسلامک فرنٹ'' کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ آپ کو متفقہ طور پر فرنٹ کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ 1986ء میں جنرل سوار الذہاب نے وعدے کے مطابق انتخابات منعقد کرائے۔ ڈاکٹر حسن ترابی ان انتخابات میں شکست کھا گئے۔ فرنٹ نے 53 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ 301 کے ایوان میں کسی بھی سیاسی

جماعت کے پاس حکومت بنانے کے لیے مطلوبہ تعداد نہیں تھی، اس لیے مخلوط حکومت کے قیام کا امکان تھا۔ ڈاکٹر حسن ترابی نے انتخابات کے فوراً بعد یہ اعلان کیا کہ جس حکومت میں کمیونسٹ شریک ہوں گے، اخوان اس میں شامل نہیں ہوں گے، اور جو پارٹی اسلامی قوانین ختم کرنا چاہے گی، اس کے ساتھ ہمارا تعاون ممکن نہیں ہوگا۔ امہ پارٹی کے رہنما صادق المہدی نے ابتداء میں یونینسٹ پارٹی کے تعاون سے مخلوط حکومت بنائی جو زیادہ دیر نہ چل سکی۔

صادق المہدی نے اب کی دفعہ تینوں بڑی جماعتوں یعنی اُمہ، یونینسٹ اور اسلامی فرنٹ پر مشتمل مخلوط حکومت تشکیل دی۔ ڈاکٹر حسن ترابی وزیر قانون وعدل بنائے گئے۔ اسلامی فرنٹ کی طرف سے شمولیت صرف اس ایک وعدے پر کی گئی تھی کہ جعفر النمیری کے دور میں نفاذ اسلام کے لیے جو قوانین بنائے گئے تھے، انہیں ختم نہیں کیا جائے گا، بلکہ انہیں مزید بہتر بنایا جائے گا۔ صادق المہدی حکومت بنانے کے بعد اپنے وعدے سے منحرف ہوتا نظر آ رہا تھا کہ حسن ترابی نے ترکی میں اسلامی کونسل کی کانفرنس کے موقع پر غیر ملکی مندوبین کی موجودگی میں صادق المہدی سے مذاکرات کیے۔ چنانچہ دونوں رہنما اس بات پر متفق ہو گئے کہ نفاذ اسلام کے عمل کو جاری رکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں مسلم ممالک کے دانشوروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور طے کیا گیا کہ کمیٹی 1983ء کے اسلامائزیشن کے پروگرام کا جائزہ لے کر اس میں ترامیم تجویز کرے گی۔ اتفاق رائے سے پروفیسر خورشید احمد (پاکستان)، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقا (اردن) اور ڈاکٹر علیم الاول (متحدہ عرب جمہوریہ) کمیٹی کے رکن نامزد کیے گئے۔ 1937ء میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ ڈاکٹر حسن ترابی نے وزیر قانون کی حیثیت سے کمیٹی کی رپورٹ کابینہ میں پیش کی۔ ان نئے قوانین نے جعفر النمیری کے نافذ کردہ 1983ء کے قانون فوجداری اور 1985ء کے قوانین کی جگہ لینا تھی۔ یہ نئے قوانین سات شرعی حدود یعنی شراب، بدکاری، قذف، مرتد کی سزا، قصاص، سرقہ اور رہزنی کے بارے میں تھے۔ مسودہ قانون کو پارلیمنٹ نے بھاری اکثریت سے منظور کر لیا۔

لیکن سوڈان کی بدقسمتی کہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر محمد عثمان المیر غنی نے ان قوانین کو بہانہ بنا کر مخلوط حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی اور جنوبی سوڈان کے بھگوڑے لیڈر جان گرینگ سے ایتھوپیا جا کر سوڈان کی سلامتی کے خلاف معاہدہ کیا۔ ایتھوپیا سے واپس آ کر المیر غنی نے وزیر اعظم صادق المہدی سے مطالبہ کیا کہ وہ نفاذ اسلام کا پروگرام ختم کر دے۔ لیبیا اور متحدہ عرب جمہوریہ سے فوجی معاہدہ ختم کرے اور جان گرینگ کی گوریلا تنظیم ''سوڈانی پیپلز لبریشن آرمی'' کو باقاعدہ فوج کا حصہ بنائے۔ وزیر اعظم صادق المہدی نے یہ مطالبات فوراً ہی منظور کر لئے۔ ڈاکٹر حسن ترابی نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور یوں اسلامی فرنٹ مخلوط حکومت سے علیحدہ ہو گیا۔ نتیجتاً ایک نیا سیاسی بحران پیدا ہوا۔ لیفٹیننٹ جنرل عمر حسن البشیر نے صادق المہدی کی حکومت کا تختہ الٹ کر 30 جون 1989ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا۔ دوسرے سیاسی لیڈروں کے ہمراہ آپ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ چھ ماہ بعد 1990ء میں رہا کیا گیا۔ رہائی پاتے ہی آپ نے فوجی حکومت کو نفاذ اسلام کے لیے ہر قسم کا تعاون پیش کیا۔ چنانچہ جنرل عمر نے ماضی میں آپ کی خدمات اور الاخوان المسلمین کے اثرات دیکھتے ہوئے آپ کی پیشکش قبول کر لی اور نفاذ اسلام کا جو کام صادق المہدی کے ساتھ مل کر سرانجام دے رہے تھے، اسی کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ بہت جلد اس تعاون کے

مثبت نتائج قوم کے سامنے آنکلے۔ اسلامی قوانین کا نفاذ، خود کفالت اور جنوبی سوڈان کے مسئلے کے حل کے لیے آپ جو کوشش کر رہے تھے، اندرونِ ملک مختصری (عیسائی) اقلیت کے علاوہ امریکا، اسرائیل، روس اور یورپی ممالک کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگے۔ چنانچہ 1999ء میں صدارتی انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد جب صدر عمر بشیر نے دوبارہ ملک میں کثیر جماعتی نظام قائم کیا تو حسن ترابی کو نظر بند کر دیا گیا کیونکہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر مملکت کے اختیارات کم کرنا چاہتے تھے۔

الجزائر: سلطنتِ عثمانیہ کے بعد

مصر سے لے کر الجزائر تک سارا شمالی افریقہ سولہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ صرف مراکش ایک ایسا ملک تھا جس پر عثمانی ترکوں کا اقتدار قائم نہ ہو سکا۔ اگرچہ وہاں کی انتظامی، فوجی اور ثقافتی زندگی پر ترکوں کے گہرے اثرات پڑے۔ شمالی افریقہ کے ان ملکوں میں سب سے پہلے الجزائر ترکوں کے ہاتھ سے نکلا اور سب سے آخر میں لیبیا نکلا۔

الجزائر پر ترکوں کا قبضہ 1553ء سے 1830ء تک رہا۔ الجزائر نے اپنی موجودہ شکل اسی زمانے میں اختیار کی اور شہر الجزائر کے نام سے پورے ملک کا نام الجزائر پڑا۔ یہاں جو ترک گورنر مقرر کئے جاتے تھے، وہ پہلے "بے" کہلاتے تھے پھر ان کو داعی یا دے کر کہا جانے لگا۔ یہ گورنر رفتہ رفتہ باب عالی کے اثر سے آزاد ہوتے گئے اور سترہویں صدی میں عملاً خود مختار ہو گئے۔ الجزائر کے یہ تمام حکمران عثمانی سلطنت کی بالادستی کو تسلیم کرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جو شمالی افریقہ کے تین ملکوں تیونس، الجزائر اور مراکش کے ساحلی علاقوں میں ان بحری مہم بازوں کو عروج حاصل ہوا جن کو یورپ کی تواریخ میں ساحل بربر کے "بحری قزاق" لکھا جاتا ہے۔ الجزائر ان سمندری مہم بازوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مشہور ترک امیر الجزائر خیر الدین باربروسہ شروع میں ایک بحری قزاق ہی تھا اور وہی ترکوں کے تحت الجزائر کی پہلی حکومت کا بانی تھا۔

الجزائر میں اسلام کا ظہور

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الجزائر کو فرانس کی غلامی میں دینے سے پہلے اس ملک میں ظہور اسلام سے لے کر مغرب کی غلامی میں جانے کے واقعات اختصار سے بیان کر دیئے جائیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں داعیانِ اسلام نے شمالی افریقہ کو بازنطینی (رومی) سلطنت کے جبر و تشدد سے نجات دلائی تھی۔ مسلمانوں کے سپہ سالار عقبہ بن نافع نے قیروان کی بنیاد رکھی۔ پھر تھوڑی سی فوج لے کر لشکر جرار کی طرح نکلا اور پورے مغرب کو روندتا ہوا ساحل اوقیانوس پر پہنچ گیا۔ بربر قبائل نے بخوشی اسلام قبول کیا اور انہوں نے سپین پر حملے کے وقت عربوں کا ساتھ دیا۔ حضرت عقبہ بن نافع کا مقبرہ الجزائر کے شہر بسکرہ میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں الجزائر کی حکومت بنو اغلب کے ہاتھ آئی۔ نویں صدی میں فاطمی اقتدار کی

داغ بیل پڑی۔ دسویں صدی میں بنو زیدی فاطمیوں کے سب سے مفید اور کارآمد آلہ کار بن گئے۔ فاطمیوں کے پہلے گورنر یوسف ابن زیری نے 972ء میں مکمل خود مختاری حاصل کر لی۔ اس کے پوتے بادلیس کے عہد حکومت میں اس کے چچا حماد نے الجزائر میں ایک نئے خاندان کی حکومت قائم کی، جس نے ''بنو حماد'' کے نام سے عرصے تک حکمرانی کی۔ اس زمانے میں مذہبی اصلاح کی تحریک ''المرابطہ'' کے نام سے چل پڑی۔ گیارہویں صدی میں 1087ء تک مرابطیوں نے شمال میں الجزائر سے لے کر جنوب میں سینیگال تک وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا حتیٰ کہ مرابطیوں نے اسپین پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا۔

محمد ابن تومرت نے 1170ء میں مذہبی اصلاح کی ایک اور تحریک شروع کی جو ''موحدون'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ موحدون نے اسلامی اندلس کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ یوں انہوں نے اپنی سلطنت کے شہروں، خصوصاً تلمسان کو، اندلس کے شاندار تمدن کی برکات سے مالا مال کر دیا۔

4 جنوری 1492ء کو اسپین کے عیسائیوں نے اندلس کی آخری سلطنت غرناطہ پر قبضہ کیا اور مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے لگے۔ اس کڑے وقت میں جو مسلمان شمالی افریقہ میں پناہ گزیں ہونے کے لیے جہازوں پر سوار ہو جاتے، ان پر سمندر میں چھاپے مارے جاتے۔ ان مسلمانوں کی حفاظت و امداد میں جن مجاہدین نے جان کی بازی لگائی، ان میں عروج اور اس کے بھائی خیر الدین کو ممتاز درجہ حاصل ہے، جو تاریخ میں ''بار بروسہ برادران'' کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اندلس کے ساحل اور جزیروں سے اٹھا اٹھا کر شمالی افریقہ بھی پہنچاتے اور ان پر حملہ کرنے والے فرنگی جہازوں کو بھی ڈبو دیتے تھے۔ اس وجہ سے اہل مغرب نے ان کا نام ''بحری قزاق'' رکھ دیا۔

اسپین نے بندرگاہ الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ بندرگاہ سے تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس پر ہسپانوی فوج نے ایک مستحکم قلعہ بنا کر توپیں نصب کر دیں، جن کا رخ بندرگاہ کی طرف تھا۔ عروج بار بروسہ نے الجزائریوں کی درخواست پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ اسپین والوں نے تلمسان کا محاصرہ بیس روز تک جاری رکھا۔ عروج کی شہادت کے بعد خیر الدین بار بروسہ نے شہید بھائی کا منصب قیادت سنبھال کر مفتوحہ علاقے سلطان ترکی کے حوالے کر دیئے۔

عثمانی سلاطین نے پاشاؤں کو گورنر بنا کر بھیجنا شروع کر دیا، جن کی میعاد صرف تین سال ہوتی تھی۔ آخر میں مختلف جیوش کے سالار جنہیں ''آغا'' کہتے تھے خواہ اپنے ہی حاکم اعلیٰ چننے لگے، جس کا لقب ''بے'' قرار پایا۔ ان عثمانی گورنروں ''بے'' کے تحت شمالی افریقہ کے تمام صوبے، الجزائر سمیت خود مختار ہوتے تھے

یہ حالات تھے جب فرانسیسی سامراج کے منحوس سایے نے الجزائر کی فضا تاریک کر دی، اور فرانس کے استعمار کے خلاف امیر عبدالقادر الجزائر نے علم بغاوت بلند کیا۔

جمعیۃ العلماء الجزائر

الجزائر پر فرانسیسی سامراج کے قبضے کے اسباب بے حد عجیب تھے۔ فرانس نے اپنی طوائف الملوکی کے

زمانے میں (1795ء۔1799ء) الجزائر سے گیہوں خریدے تھے، جن کی قیمت 70 لاکھ فرانک سے زیادہ تھی۔ بیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک یہ قیمت ادا نہ ہوئی۔ 1819ء میں حکومت الجزائر اور حکومت فرانس کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔ واجب الادا رقم قسطوں میں ادا کر دی جائے گی۔ 1821ء سے قسطیں ادا ہونے لگیں، لیکن یہ عہد بھی فرانس نے پورا نہ کیا۔ الجزائر کے حکمران حسین پاشا نے چارلس دہم کو رقم کے متعلق خطوط لکھے، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ 1828ء میں جب فرانس کا سفیر حسین پاشا کے پاس آیا تو پاشا نے خطوط کا جواب نہ دینے کی شکایت کی۔ سفیر نے تمام سفارتی واخلاقی آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا:

"ہمارے بادشاہ سلامت اس شخص کو براہ راست مخاطب نہیں کرتے جو درجے میں ان سے فروتر ہو۔"

اس پر حسین پاشا کو اتنا طیش آیا کہ ہاتھ میں جو پنکھا تھا، وہ سفیر کے منہ پر دے مارا۔ بس اس واقعے کو بہانہ بنا کر فرانسیسی بیڑے کو حکم ملا کہ بندرگاہ الجزائر کا محاصرہ کر لیا جائے۔ پھر 1830ء میں باقاعدہ حملہ کر دیا گیا۔ عین اس موقع پر سید محی الدین الحسینی نے فرانس کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا۔ اس تحریک آزادی کو سید موصوف کے فرزند ناصر الدین عبدالقادر الحسینی نے سنبھال لیا۔

امیر عبدالقادر الجزائری

عبدالقادر الحسینی جو امیر عبدالقادر الجزائری کے نام سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں، 1808ء میں ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کرنے کے بعد وہ اکیس سال کی عمر میں حج کرنے مکہ معظمہ گئے۔ اس سفر کے دوران انہیں بغداد، دمشق اور قاہرہ میں قیام کرنے اور علماء سے ملنے کا موقع ملا۔ محمد علی پاشا والئی مصر اپنے ملک کو ترقی دینے کی جو کوششیں کر رہا تھا، امیر عبدالقادر اس سے بہت متاثر ہوئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اسی زمانے میں امام سنوسی نے محمد علی پاشا کی غیر اسلامی اصلاحات کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا اور بددل ہو کر قاہرہ سے واپس چلے گئے تھے، لیکن امیر عبدالقادر نے امام سنوسی کے برعکس محمد علی پاشا کی اصلاحات کو پسند کیا تھا، حالانکہ عبدالقادر خود بھی اسلامی فکر کے علم بردار تھے۔ غالباً دونوں کے نقطۂ نظر کا یہ فرق شخصی رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ سنوسی کی زندگی میں زہد غالب تھا، جب کہ عبدالقادر کی زندگی میں سیاسی سوجھ بوجھ کا غلبہ تھا۔ عبدالقادر خود بھی غیر اسلامی رجحانات کو ناپسند کرتے تھے، لیکن محمد علی پاشا کی اصلاحات کے تمام پہلو غیر اسلامی نہیں تھے۔ اس کی یہ کوشش کہ مصر ایک جدید ملک بن جائے، ایک قابل قدر کوشش تھی۔ جدید دور کے ایک مصلح کی حیثیت سے عبدالقادر کو اس کی اصلاحات کا یہ پہلو پسند تھا، لیکن وہ ان اصلاحات کو اسلامی رنگ دینا چاہتے تھے، لیکن سنوسی وقت کے تقاضے سمجھ نہ سکے اور انہوں نے اپنی اصلاحی وفلاحی کام کو محض اخلاقی حدود تک محدود رکھا، اور سیاست و معیشت کا اثر نہ پڑنے دیا۔

عبدالقادر اس سال مشرق وسطیٰ کے سفر سے واپس الجزائر آئے، جس سال فرانسیسی الجزائر پر قابض ہوا تھا۔ نئی صورت حال نے عبدالقادر کو مضطرب کر دیا اور انہوں نے فرانس سے جنگ کرنے کا عزم کر لیا۔

اس زمانے میں الجزائر میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں اور اس قابل نہیں تھیں کہ متحد ہو کر فرانس کا مقابلہ کر سکیں۔ عبدالقادر نے ان ریاستوں اور قبائل کے اختلافات ختم کیے اور ان کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ متحد ہو کر فرانس کا مقابلہ کریں۔ ان قبائل نے 22 نومبر 1832ء کو عبدالقادر کو جن کی عمر صرف 25 سال تھی، اپنا امیر مقرر کر لیا۔ الجزائری مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کے بعد امیر عبدالقادر نے قصبہ مسکرہ کی مسجد میں فرانسیسیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے جلد ہی مغربی الجزائر کے قبائل کو اپنے جھنڈے کے تحت متحد کر لیا اور فرانسیسی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں، یہاں تک کہ فروری 1834ء میں فرانس عبدالقادر کو مغربی الجزائر کا امیر تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن اگلے سال فرانس سے پھر تصادم شروع ہو گئے اور جنگوں کا یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ 1839ء تک امیر عبدالقادر الجزائر کے ایک تہائی حصے پر قابض ہو گئے (اس زمانے میں برعظیم پاک و ہند میں انگریزی سامراج کے خلاف سیّد احمد شہید کی تحریک کا دوسرا دور جاری تھا)۔ اس کے بعد امیر کی مشکلات بڑھ گئیں۔ ادھر فرانس نے اپنی فوجوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ جدید اسلحہ بھی فراوانی کی ساتھ الجزائر بھیجا۔ چنانچہ امیر عبدالقادر 21 دسمبر 1847ء کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

امیر عبدالقادر نے جو نظام حکومت قائم کیا تھا، اس میں آزاد علاقے ''دارالسّلام'' کہلاتے تھے اور فرانسیسی مقبوضہ علاقے دارالکفر۔ مسلمانوں کے لیے دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالسّلام آنا واجب تھا۔ امیر عبدالقادر نے اپنے لیے ''امیر المومنین'' کا لقب اختیار کیا تھا اور مشورے کے لیے ایک مجلس شوریٰ بنائی تھی جو گیارہ علماء پر مشتمل تھی۔ نظام حکومت مختلف امور کے وزیروں کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔ ریاست مختلف محکموں میں تقسیم تھی اور ہر محکمے میں ایک قاضی مقرر تھا جو امورِ نظم و نسق کی مطابقت شرعی اصولوں سے پیدا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ کسی مسئلے میں ابہام ہوتا یا وضاحت مقصود ہوتی تو ایسی مشکل صورتِ حال میں علمائے خاص یا جامعہ الازہر کے مالکی شیخ سے فتویٰ منگایا جاتا تھا۔ امیر عبدالقادر نے فوج کی تنظیم جدید خطوط پر کی تھی اور اس سلسلے میں یورپی ممالک سے مدد بھی لی۔ بعض صورتوں میں امیر عبدالقادر کی فوج مراکش کی فوج سے بہتر تھی۔ انہوں نے الجزائر میں اسلحہ سازی کا کارخانہ بھی قائم کیا تھا۔ الجزائر میں امیر عبدالقادر کی یہ ریاست، بالاکوٹ میں سیّد احمد شہید کی شہادت کے ایک سال بعد قائم ہوئی تھی۔ دونوں کی قائم کردہ ریاستوں میں نفاذ اسلام کی کوشش مشترک تھی، لیکن بڑا فرق یہ تھا کہ امیر عبدالقادر جدید دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کو سیّد احمد شہید مجاہدین کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ شاید یورپ سے نزدیکی اور محمد علی پاشا کے مصر سے تعلق، اس کی بڑی وجہ ہو۔

الجزائر کی تاریخ میں عقبہ بن نافع اور خیر الدین باربروسہ کے بعد کسی اور شخص کو وہ شہرت، عظمت اور نیک نامی حاصل نہیں ہوئی جو عبدالقادر الجزائری کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے آدمیوں اور وسائل کی کمی کے باوجود جس دلیری اور بے جگری سے فرانسیسی افواج کا پندرہ سال تک مقابلہ کیا، اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ مؤرخین نے ان کی انتظامی صلاحیت اور سیاسی تدبر کی بڑی تعریف کی ہے۔ حکومت فرانس نے دو مرتبہ مجبور ہو کر امیر عبدالقادر سے صلح کی اور دونوں مرتبہ بدعہدی کر کے نئے سرے سے جنگ چھیڑ دی۔ فرانس نے یورپ کی سازشی طبیعت کے عین مطابق

الجزائر کے جنوب۔ چھوٹے امراء اور سرداران قبائل کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا رہا تھا۔

حکومت فرانس کے ایما پر شاہ مراکش نے بھی اپنے ملک کے دروازے امیر عبدالقادر پر بند کر دیئے۔ اس طرح مجبور ہو کر 1847ء میں امیر عبدالقادر نے اس شرط پر صلح کر لی کہ امیر کو مع اہل و عیال اسکندریہ جانے کی اجازت دے دی جائے۔ حوالگی کے بعد معاہدے کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے فرانسیسی فوجی افسر امیر عبدالقادر کو طولون لے گئے اور فرانس میں نظر بند کر دیا۔ 1852ء میں نپولین سوم نے امیر کو رہا کر دیا اور انہوں نے پہلے بروسہ، پھر دمشق میں سکونت اختیار کی۔ زندگی کے باقی ایام وہیں گزار کر مئی 1883ء میں وفات پائی۔

مسالی حج

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں الجزائر کی تحریک آزادی اور قومی جدوجہد کا دوسرا دور شروع ہوا جسے سماجی اصلاحات اور پرامن سیاسی جدوجہد کا دور کہا جاتا ہے۔ الجزائر کے ایک مزدور رہنما مسالی حج نے 1924ء میں ''النجم الافریقیہ الشمالی'' کے نام سے ایک مزدور تنظیم قائم کی جس نے جلد ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے 1936ء میں یہ جماعت توڑ دی۔ مسالی حج نے اس کے فوراً بعد ''الجزائر کے عوام کی پارٹی (پی پی اے)'' کے نام سے ایک نئی پارٹی قائم کر لی۔ یہ پارٹی ایک ایسی الجزائری ریاست کی حکومت تھی جو اپنی روح میں خالص اسلامی ہو لیکن قیادت مزدور طبقہ کرے۔ اس بات کا کمیونزم کے نظریات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مسالی حج شعلہ بیان خطیب تھے۔ ان کو 1941ء میں فرانسیسی حکومت نے بغاوت کے جرم میں 16 سال کی سزائے قید دی تھی۔ اب ان کی یہ نئی پارٹی بھی توڑ دی گئی۔ پی پی اے کا علماء، طلباء اور خواتین پر خاص اثر تھا۔ مسالی حج کو 1943ء میں معاف کر دیا گیا، لیکن 1946ء کے اواخر تک وہ یا تو جلاوطن رہے یا فوج کی نگرانی میں رہے۔ اس کے بعد وہ رہا کر دیئے گئے۔ انہوں نے 1947ء میں نئی جماعت ''ایم ایل ٹی ڈی'' قائم کی یعنی جمہوری آزادیوں کی فتح کی تحریک۔

مسالی حج کی قائم کردہ ''ایم ایل ٹی ڈی'' اگرچہ الجزائر کی سب سے بڑی اور فعال جماعت تھی، لیکن ملک میں اس وقت تک مسلمانوں کی کئی اور جماعتیں اور تنظیمیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تنظیم ''حزب منشور الجزائر'' تھی، جس کو 1943ء میں فرحت عباس نے قائم کیا تھا۔ یہ جماعت ''فرانسیسی یونین'' کے اندر رہتے ہوئے الجزائر کو خودمختار جمہوریہ بنانا چاہتی تھی۔ بعد میں اس جماعت کا نام ''جمہوریہ اتحاد مسلمانان الجزائر'' ہو گیا۔

جمعیۃ العلماء الجزائر

الجزائر کی ایک اور اہم تنظیم ''جمعیۃ العلماء الجزائر'' تھی، جسے 1929ء میں شیخ عبدالحمید بن بادیس نے قائم کیا تھا۔ وہ الجزائر کے ایک ممتاز عالم دین تھے۔ انہوں نے تیونس کی جامعہ زیتونیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بیس سال تک اپنے شہر میں درسِ قرآن دیتے رہے اور تفسیر بیان کرتے رہے۔ ان کا درس قرآن اتنا جامع ہوتا تھا کہ تاریخ، فلسفہ اور قدیم و جدید علوم سب اس دائرے میں آ جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ جمعیۃ العلماء دینی اور معاشرتی اصلاح پر زور دیتی تھی، فرانس کی اسلام دشمن پالیسی کو بے نقاب کرتی تھی اور اپنا پیغام، مدرسوں، کلبوں اور اخبارات و رسائل کے ذریعے پہنچاتی تھی۔ ہفت روزہ ''البصائر'' جو شہر طنجہ

سے شائع ہوتا تھا، جمعیۃ العلماء کا ترجمان تھا۔ الجزائر کی تحریک آزادی میں اس جریدے کو وہی حیثیت حاصل ہے جو برعظیم پاک و ہند میں مولانا آزاد کے ''الہلال'' اور مولانا محمد علی جوہر کے ''کامریڈ'' کو حاصل تھی۔ سیاسی اعتبار سے جمعیۃ العلماء الجزائر کی آزادی اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک سے اتحاد کے لیے کوشش کرتی تھی۔ جمعیۃ العلماء نے الجزائر میں اسلامی ثقافت و تہذیب کو زندہ رکھا، اور شمالی افریقہ میں اسلامی ثقافت کے دو بڑے مراکز یعنی جامع زیتونیہ اور جامع قزوین سے قریبی رابطہ استوار رکھا۔ جمعیۃ الجزائر کی آزادی (1962ء) سے قبل 125 دینی مدرسے اور ایک ثانوی مدرسہ ''ادارہ بن بادلیس'' چلاتی تھی۔

نیشنل لبریشن آرمی

فرانسیسی استعمار کے خلاف جنگ آزادی کا آغاز کرنے والے مجاہدین کی تعداد تین ہزار سے زیادہ تھی۔ انہوں نے 1945ء میں پہلی بار فرانسیسی افواج پر گوریلا طرز پر حملوں کا آغاز کیا، لیکن باقاعدہ جنگ کا آغاز نومبر 1954ء سے ہوا۔ نیشنل لبریشن آرمی کے حملوں کو فرانسیسی افواج نے بہت شدت سے کچل دیا، لیکن یہ جنگ آزادی اور حریت کی جنگ تھی، رک نہ سکی۔ پہلے پہل گوریلا مجاہدین نے پہاڑی علاقوں اور گھنے جنگلات کو اپنا مرکز بنایا، جہاں وہ اپنی خفیہ پناہ گاہوں میں حملوں کے بعد پناہ لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ گوریلا کارروائیوں کا دائرہ سارے الجزائر میں پھیل گیا۔

مجاہدین فرانس کے فوجیوں کے علاوہ ان الجزائری لوگوں کو نشانہ بناتے تھے جو فرانسیسی سامراج کی حمایت کرتے تھے۔ فرانسیسی افواج جدید اسلحے سے پوری طرح لیس ہونے کی وجہ سے مجاہدین کی بڑی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہیں، لیکن جنگ نے الجزائر کو فرانس کے لیے ویت نام بنا دیا تھا۔ عالمی برادری فرانس پر سیاسی دباؤ ڈال رہی تھی اور مطالبہ کر رہی تھی کہ الجزائر سے فرانس اپنی فوجوں کو واپس بلائے۔ وسط 1956ء میں جنگ میں فرانس کا پلڑا بھاری تھا۔ فرانس نے مزید افواج اور اسلحہ الجزائر بھیج دیا تھا۔ ایک منظم فوجی منصوبے کے تحت بڑے بڑے شہروں، قصبوں اور علاقوں میں فرانسیسی افواج نے تمام اہم تنصیبات پر قبضہ کر لیا۔ مواصلات کے مرکز ان کے قبضے میں تھے۔ جگہ جگہ مسلح دستے گشت کرتے۔ اس طرح ہر علاقے میں فرانسیسی افواج نے مرکزیت قائم کر کے مجاہدین کی سرگرمیوں کو کسی قدر روک دیا تھا۔ اس کا حل مجاہدین نے یہ نکالا کہ وہ شہروں میں اچانک حملے کرتے اور افواج کو نقصان پہنچا کر غائب ہو جاتے۔ شہروں میں ان کی حمایت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عام شہری فوجیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور جب بھی موقع ملتا، ان کے خلاف مجاہدین کو مکمل امداد فراہم کرتے تھے۔

فرانس نے مجاہدین کی نئی حکمت عملی کو ناکام بنانے کے لیے جبر و تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ دارالحکومت الجزیرہ میں شدید ترین جنگ بھی اس دور کا واقعہ ہے۔ اس شدید خونی معرکے سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ''نیشنل لبریشن آرمی'' اس قدر مستحکم و مضبوط نہیں ہے کہ فرانس کی جوابی کارروائی کا مقابلہ کر سکے۔ الجزائر کے سیاسی رہنماؤں فرحت عباس اور بالخصوص مسالی حج نے تمام آزادی پسند گروپوں اور جتھوں کو ملا کر ایک نئی تنظیم این ایل ایف (نیشنل لبریشن فرنٹ) یعنی ''محاذ قومی آزادی'' قائم کی۔ 1956ء میں تمام گروپوں، متوسط طبقے اور مذہبی گروہوں نے اپنی اپنی

جماعتیں ''محاذ'' میں مدغم کر دیں۔ 1956ء میں محاذ نے ''جمہوریہ الجزائر کی عبوری حکومت'' کے نام سے تیونس میں حکومت قائم کر دی جو ''جی پی آر اے'' کے مختلف نام سے عالمی سیاسی دنیا میں مشہور ہوئی۔ ایک دوا ساز اور مجاہدین کے ایک سرگرم گروپ کے سابق سیکرٹری جنرل یوسف بن خدہ کو 1960ء میں ''محاذ'' کا صدر بنایا گیا۔ وہ محاذ کا صدر دفتر الجزائر لے آئے۔

1958ء میں فرانسیسی افواج نے سرحدیں مکمل طور پر بند کر کے مجاہدین کے ٹھکانوں کو ایک ایک کر کے نشانہ بنانا شروع کیا۔ ان ٹھکانوں کے درمیان مواصلات کے نظام کو ختم کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ مجاہدین کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا جائے۔ تاہم ان رکاوٹوں کے باوجود مجاہدین نے ایک بار پھر محدود حملوں کا راستہ اختیار کیا۔

اس مرتبہ الجزائری خواتین نے بھی مجاہدین کا ساتھ دیا اور خود فوجی وردی پہن کر میدان جنگ میں اتر آئیں۔ فرانسیسی افواج نے خواتین پر ظلم ڈھائے، لیکن اب جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی۔ ایک بہادر مسلمان لڑکی جمیلہ بو ہائرد الجزائر کی حرمت بن گئی۔ فرانسیسی فوج نے اسے گرفتار کر کے 1958ء میں کورٹ مارشل میں پیش کیا۔ اس نے اپنے بیان میں جس جرأت سے جو سنہری الفاظ استعمال کیے، وہ الجزائر کی تاریخ کا مستقل حصہ بن چکے ہیں۔ جمیلہ نے فرانسیسی افواج کے لیڈر سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''ہاں یہ سچ ہے، میں اپنے ملک سے محبت کرتی ہوں۔ میں اپنے ملک کو اپنی زندگی میں آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اسی مقصد کی خاطر، ہاں صرف اسی مقصد کی وجہ سے تم لوگوں نے مجھ پر تشدد کیا ہے اور تم میری جان لینے پر تلے ہوئے۔ لیکن یاد رکھو، جب تم ہمیں قتل کرتے ہو تو دراصل اپنے ملک کی آزادی کو قتل کرتے ہو، اس کی عزت کو داغ دار کرتے ہو اور اس کے مستقبل کو خطرے میں ڈالتے ہو''۔

جدید الجزائر میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش

1960ء میں جب یوسف بن خدہ عبوری حکومت کا صدر دفتر تیونس سے الجزائر لے آئے تو انہیں بن بیلا اور بومدین جیسے سخت گیر اور انقلاب پسند لیڈروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جنہیں چند ماہ قبل فرانس کی جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ ان دونوں انقلابی لیڈروں نے شہر تلمسان میں اپنی پارٹی کا پولٹ بیورو قائم کر لیا۔

1961ء تک بیس لاکھ افراد نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ پہاڑی علاقوں کی طرف نکل گئے یا دوسرے میدانی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ ہزاروں افراد نے شہروں کا رخ کیا، جہاں پہلے ہی آبادی کا کافی دباؤ بڑھ چکا تھا اور نظم ونسق چلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ فرانس نے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے دوہری پالیسی پر عمل کیا۔ ایک طرف شہریوں کو سمجھانے اور قائل کرنے پر زور دیا گیا کہ وہ مجاہدین کا ساتھ نہ دیں۔ دوسری طرف مجاہدین اور دوسرے شہریوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی گئی۔ مسالی حج نے ''قومی محاذ آزادی'' سے نکل کر ''الجیرین نیشنل

موومنٹ'' کے نام سے نئی جنگجو جماعت بنالی۔ اس جماعت کو فرانس میں مقیم الجزائریوں کی مدد حاصل تھی۔ مکمل آزادی کے لیے یہ جماعت بھی ''محاذ'' کی طرح جہاد کی حامی تھی۔ جون 1960ء میں فرانس کے شہر میلن (Melun) کے مقام پر پہلی بار جنگ ختم کرنے کے لیے مذاکرات کا آغاز کیا اور محاذ آزادی کی قیادت سے تبادلۂ خیال کیا۔ اس دوران میں گوریلا سرگرمیاں جاری رہیں۔ جنگ نے فرانس میں بھی بے چینی پیدا کر دی تھی، کیونکہ فرانس اکثر و بیشتر گوریلا کارروائیوں کا نشانہ بنتا تھا۔ ان کی خفیہ گوریلا کارروائیوں نے فرانسیسی عوام کو اپنی حکومت کے خلاف احتجاج پر مجبور کر دیا۔ حکومتِ فرانس کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب زیادہ عرصہ الجزائر کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہے۔

1961ء کے اواخر میں مجاہدین نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز پولیس ہیڈ کوارٹر کو بنالیا۔ جہاں اور جس جگہ فرانسیسی پولیس کا کوئی اہل کار نظر آتا، اسے اڑا دیا جاتا۔ مجاہدین کی خصوصی تنظیم (او اے ایس) ان کارروائیوں کو کنٹرول کرتی تھی اور ''محاذ آزادی'' کے چھاپہ مار بھی ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ فرانس کا صدر چارلس ڈیگال اس بات کا حامی تھا کہ او اے ایس کے ہاتھوں سب کچھ ختم ہو جانے سے پہلے ''محاذ آزادی'' کے ساتھ کوئی معاملہ کر لیا جائے تاکہ فرانس کی ساکھ بحال رہے۔ چنانچہ پورا سال خفیہ مذاکرات میں گزر گیا۔ 18 مارچ 1962ء کو الجزائر میں فرانسیسی افواج کے کمانڈر جنرل چارلس ایلدرٹ نے فرانس کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ الجزائر کی عبوری حکومت کے صدر یوسف بن خدہ نے بھی ایسا ہی اعلان کر دیا، جس کے بعد فریقین کی جانب سے جنگ ختم کر دی گئی۔

اس چھ سالہ جنگ میں آٹھ لاکھ مسلمان شہید کر دیے گئے۔ ایک لاکھ افراد کو کیمپوں اور جیلوں میں رکھا گیا۔ تین لاکھ ہجرت پر مجبور کر دیے گئے، جب کہ تین لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ ہر بیس الجزائریوں میں سے ایک شہید ہو گیا۔ ایک تہائی آبادی گھر سے بے گھر ہو گئی۔ الجزائر کی جنگ آزادی ایک ایسا معرکہ تھا جسے کوئی ایک نام دینا درست نہ ہوگا۔ اس جنگ میں الجزائر کے ایک ایک باشندے نے یکجان ہو کر صرف ایک مقصد ''آزادی'' کے لیے اپنا تن من، دھن، سب کچھ قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔ مذہبی جماعتوں، کمیونسٹ لیڈروں، قوم پرست رہنماؤں، مردوں، عورتوں، غرض ہر کسی نے اپنا کردار ادا کیا اور بالآخر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس جنگ میں شریک ہر سپاہی مسلمان تھا۔ ملک آزاد ہوا تو وہ بھی عالم اسلام کا ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا۔ تین جولائی 1962ء کو فرانس نے الجزائر کو باضابطہ آزاد ملک کے طور پر تسلیم کر لیا۔

جولائی 1962ء میں، یعنی حصول آزادی کے صرف ایک ماہ بعد یوسف بن خدہ اور اس کے حامیوں نے دارالحکومت الجزیرہ کا کنٹرول سنبھال لیا، جب کہ باقی ماندہ ملک بن بیلا اور بومدین کے کنٹرول میں رہا۔ یعنی آزادی کے فوراً بعد قیادت کا بحران پیدا ہونے کی وجہ سے خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ نیشنل لبریشن آرمی نے بن بیلا کی حمایت کی۔ حالات کا رخ یوسف بن خدہ کے خلاف تھا۔ نئی قانون ساز اسمبلی کے ارکان کی جو فہرست مرتب کی گئی، وہ کمیونسٹ پارٹی، مسالی نواز اور بوضیاف کے بائیں بازو کے سوشلسٹ حامیوں پر مشتمل تھی۔ یوسف بن خدہ اور اس کے حامی

اس میں شامل نہ تھے۔ 25 ستمبر 1962ء کو الجزائر کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ بن بیلا اس کے پہلے وزیر اعظم اور فرحت عباس صدر قرار پائے۔ نیا آئین بنایا گیا، جس کی رو سے اسلام کو نئی مملکت کا مذہب اور عربی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

15 ستمبر 1963ء کو بن بیلا کو با قاعدہ صدر منتخب کیا گیا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ محاذ آزادی (ایف ایل این) کو اونچے طبقے کی محافظ فوج کی حیثیت دی جائے یا اسے ایک عوامی جماعت بنا دیا جائے۔ صدر بن بیلا اسے اونچے اور مخصوص طبقے کی جماعت بنانے کے حق میں تھے۔ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بن بیلا کے آمرانہ اقدامات نے فوج میں بدامنی اور خلفشار کو جنم دیا۔ جون 1965ء کو وزیر دفاع کرنل حواری بومدین نے کسی خون خرابے کے بغیر بن بیلا کا تختہ الٹ دیا، اسمبلی کو توڑ دیا، آئین کو معطل کر دیا اور اس کی جگہ ایک انقلابی کونسل قائم کر دی۔ بومدین نے انقلابی کونسل کی سربراہی کے علاوہ وزارت عظمیٰ اور وزارت دفاع اپنے پاس رکھ لی۔ بن بیلا کو نظر انداز کر دیا۔ نئی حکومت نے ملک کے حالات سے مطابقت کرنے والے سوشلزم کو اختیار کرنے کا اعلان کیا، اور یہ بھی وعدہ کیا کہ ''ملک ایک حقیقی جمہوری ریاست ہوگا، جس میں قانون کی حکمرانی ہوگی۔''

جون 1967ء کو عرب اسرائیل جنگ میں الجزائر نے بھی اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ امریکا سے سفارتی تعلقات منقطع کر لیے اور روس سے انتہائی قریبی فوجی اور اقتصادی روابط قائم کر لیے۔

1968ء کو بومدین نے اپنے خلاف ایک بغاوت کو کچلتے ہوئے محاذ آزادی (لبریشن فرنٹ) اور فوج میں اپنے مخالفین کو نکال باہر کیا۔ ایک قاتلانہ حملے میں بچنے کے بعد ہزاروں مخالفین کو گرفتار کر لیا۔

1971ء میں فرانسیسی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ فرانس نے جواب میں الجزائر سے خصوصی تعلقات منقطع کر لیے۔ بومدین کی حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک شروع ہوئی، جس میں طلبہ نے ہراول کا کام دیا۔ احمد مدعزی کی وفات اور بعض اہم رہنماؤں کی برطرفی، علیحدگی یا جلا وطنی کے بعد ''محاذ آزادی'' میں بومدین واحد رہنما رہ گئے جو تحریک آزادی کے وقت سے اب تک ''محاذ'' کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔

1973ء امریکا سے اقتصادی معاہدہ ہوا، جس کی رو سے طے پایا کہ امریکا الجزائر کی قدرتی گیس ایک ارب مکعب فٹ یومیہ کے حساب سے آئندہ 25 سال تک درآمد کرے گا۔ اس اقتصادی معاہدے کے بعد امریکا اور الجزائر کے مابین دوبارہ سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔

1976ء میں مغربی صحرا میں مراکش اور ماریطانیہ کی فوجوں سے الجزائر فوج کی جھڑپیں ہوئیں۔ نیا آئین منظور کر کے نافذ کیا گیا۔ نئے انتخابات ہوئے۔ بومدین کو صدر منتخب کر لیا گیا۔

1977ء میں فرنٹ کو ملک کی نگران جماعت بنا دیا گیا، جس کا کام لیبر یونینوں، کسانوں کی تنظیموں، سابقہ فوجیوں، خواتین، طلبہ تنظیموں، علماء اور مذہبی جماعتوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا۔ گویا سیاسی جماعت کو انتظامیہ اور مقامی بیوروکریسی کا نگران بنا دیا گیا، جس سے نظم ونسق اور سرکاری کاموں کی انجام دہی میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔

1978ء میں حواری بومدین کا انتقال ہوا۔ اب اس کی قائم کردہ انقلابی کونسل توڑ کر ایک زیادہ بڑی مرکزی

کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان کی تعداد 160 تھی۔ انہوں نے ویرون ملٹری ڈسٹرکٹ کے کمانڈر شاذلی بن جدید کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا۔ شاذلی نے 19 ارکان کی ''پولٹ بیورو'' نامزد کی۔ آئین کی رو سے پارٹی کا سیکرٹری جنرل ہی ریاست کا سربراہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مرکزی کمیٹی نے شاذلی کو ملک کا صدر بنا دیا۔

1980ء میں فرنٹ کی خصوصی کانگریس میں شاذلی بن جدید کو پارٹی مقتدر قیادت اور اس کے ڈھانچے میں تبدیلیوں کے لیے مکمل اختیارات دیئے گئے۔ انہوں نے پولٹ بیورو کے ارکان کی تعداد گھٹا کر سات کر دی۔ پارٹی کے اجلاسوں کی روٹین ہفتہ وار سے گھٹا کر ماہانہ کر دی اور اختیارات کو اپنی ذات میں مرتکز کر لیا۔ انہوں نے قومی اسمبلی کے الیکشن کے لیے امیدواروں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے نیا قومی کمیشن تشکیل دیا۔ فرنٹ کے صدر ایک سابق فوجی محمد شریف ساعدیہ کی چھٹی کرا دی اور اس کی جگہ اپنے برادر نسبتی عبدالحمید موری کو فرنٹ کا صدر بنا دیا۔ اس نے صدارت کا منصب سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ وہ فرنٹ کو اپنی پرانی صورت میں واپس لے جائے گا اور اس میں معاشرے کے ہر طبقے کو نمائندگی دے گا، جس کا مطلب تھا پارٹی کے اندر اور باہر جمہوری اصلاحات۔ شاذلی نے پولٹ بیورو کے اختیارات کم کر دیئے۔ پولٹ بیورو سے بومدین کی سخت گیر پالیسی کے حامی کرنل یحیاوی اور سابقہ وزیر خارجہ بوطفلیکا اور بومدین کے دوسرے حامیوں کو نکال باہر کیا، جن میں بومدین کے سابق سیکیورٹی افسر بھی شامل تھے۔ 1980ء میں بن بیلا کو پندرہ سالہ نظر بندی سے رہائی ملی لیکن انہیں حکومتی ڈھانچے سے دور رکھا گیا۔

اسلام پسند تنظیموں کا ظہور

بومدین کی وفات کے بعد الجزائر کے شہروں، قصبوں اور دیہات تک میں اسلام پسند تنظیموں کے احتجاجی مظاہرے روزمرہ کا معمول بن گئے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کے مظاہروں نے امن و امان کی صورتِ حال ابتر کر دی۔

اخوان المسلمین کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ اقتصادی بدحالی کے مارے ہوئے لوگ احتجاج کے سوا اور کیا کر سکتے تھے، لیکن حکومت نے عوام کے مسائل حل کرنے کی بجائے انہیں کچلنے کے لیے فوج سے مفاہمت کر لی۔ فوج جو ہمیشہ حکومت میں اپنا حصہ مانگتی ہے۔

نومبر 1988ء میں ''فرنٹ'' کے کنونشن میں پارٹی اور سٹیٹ کی علیحدگی کا آغاز کر دیا گیا۔ کنونشن میں پارٹی کے سیکرٹری جنرل کو، جس کا نام بہ حیثیت عہدہ ملک کی صدارت کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا تھا، ختم کر دیا گیا۔ پارٹی کے پولٹ بیورو کو بھی موقوف کر دیا گیا۔ صرف مرکزی کمیٹی کو باقی رہنے دیا گیا جو زیادہ اور بڑی نمائندہ تھی۔

پارٹی کی اصلاحات کے سلسلے میں موری کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پارٹی کے اندر تین گروپ تھے۔ اصلاح پسند، پرانے نظریات کے حامل ارکان، اور اسلام پسند حلقہ، جسے طنزاً ''داڑھی والے'' کہا جاتا تھا۔ بومدین سے پہلے، بن بیلا کے دور میں فرنٹ کی صف اول میں دانشور اور انقلابی سوچ رکھنے والے مفکر، ادیب اور کارکن شامل تھے۔ بومدین کے دور میں زیادہ تر اسامیوں پر فوجیوں کا غلبہ ہو گیا۔ شاذلی بن جدید کا انتخاب اصلاح پسندوں اور سوشلسٹوں کے درمیان ایک قسم کا سمجھوتہ تھا۔ شاذلی کے عہد میں پرانے نظریات کے حامل ارکان کا صفایا کر دیا گیا۔

دسمبر 1991ء میں الجزائر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عام پارلیمانی انتخابات ہوئے۔ اسلام پسند پارٹی ''اسلامک سالویشن فرنٹ'' (ایف آئی ایس) بھاری اکثریت سے جیت گئی، لیکن فوج کو اسلام پسندوں کی فتح پسند نہ آئی۔ فوج نے کسی دلیل کے بغیر الیکشن کے نتائج کو منسوخ کر دیا۔ فوج کی اس دھاندلی کے خلاف الجزائر کے عوام نے اسی جوش سے احتجاجی تحریک چلائی، جس جوش وخروش سے انہوں نے فرانس کے خلاف تحریک آزادی چلائی تھی۔ ملک میں خانہ جنگی چھڑ گئی جو 1998ء تک جاری رہی۔ شہروں سے نکل کر دیہات تک میں قتل وقتال شروع ہوا۔ بین الاقوامی اداروں کے اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ افراد خانہ جنگی میں ہلاک ہوئے۔ حکومت خانہ جنگی کو روکنے میں بالکل ناکام ہوگئی، کیونکہ فوج کے ساتھ مل کر وہ خود بھی فریق تھی۔ فوج نے بھی منہ پھیر لیا۔ وہ تماشائی بنی رہی۔ الجزائر نے عالمی برادری کی ثالثی کی پیشکشوں کی پروا نہ کی۔ اپنی خانہ جنگی کو سرحدوں تک محدود رکھا اور بیرونی دنیا کو بے خبر رکھا۔

اپریل 1999ء کو نئے الیکشن ہوئے، جس کے نتیجے میں عبدالعزیز بوطفلیقا نئے صدر منتخب ہوئے۔ انہوں نے صدر منتخب ہونے کے چھ ماہ بعد ستمبر 1999ء میں ریفرنڈم کرایا، جس میں انہیں 98 فیصد ووٹ ملے۔ ریفرنڈم کرانے کا مقصد یہ تھا کہ خانہ جنگی کے دوران میں ایف آئی ایس کے جو افراد قتل، خواتین کی بے حرمتی اور دوسرے سنگین جرائم میں ملوث ہوئے، انہیں رہا کر دیا جائے اور قومی مصالحت کی راہ نکالی جائے۔ خیال یہ تھا کہ ایسے اقدامات سے ملک میں امن وامان کا ماحول قائم ہوگا اور برسوں خانہ جنگی میں مبتلا رہنے والے، اس بدنصیب ملک کے لوگوں کو بھی سکھ چین کی روٹی نصیب ہوگی، لیکن ہوا یہ کہ عبدالعزیز صاحب ریفرنڈم میں بھاری اکثریت حاصل کرنے کے باوجود فوج کی گود میں جا بیٹھے، کیونکہ فوج کی حمایت ومدد کے بغیر مضبوط سے مضبوط لیڈر کا بھی کرسی صدارت میں بیٹھنا ممکن نہیں۔ الجزائر آئین کی رو سے بظاہر ''الجمہوریہ'' ہے، لیکن فی الحقیقت بدترین فوجی آمریت والا مسلم ملک ہے۔

اسلام اور مغربیت کی کشمکش

1962ء میں حصول آزادی سے لے کر آج تک جتنی بھی حکومتیں الجزائر میں برسراقتدار آئیں، انہوں نے اپنی خارجہ پالیسی میں ایک بات کو بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا۔ ہر حکمران نے بیرونی دنیا کو یہ تاثر دیا کہ الجزائر میں اسلامی انقلاب آنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگر اسلام پسند جماعتوں اور تنظیموں کو آزادی دی گئی تو وہ کسی بھی لمحے ایسا کھیل کھیلیں گی کہ زمام کار ''روشن خیال'' سیاست دانوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔ اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ہر حکومت یہ دلیل سامنے لاتی ہے کہ جنگ آزادی میں علماء نے ہراول کا کام دیا ہے۔ آزادی کی طویل اور خوفناک جنگ میں اسلام ہی نے لوگوں کو منظم ومتحد ہونے کا جذبہ دیا تھا۔ اب اس جذبے کے آگے بند نہ باندھا گیا تو داڑھی بردار مولوی الجزائر کو مستقبل کی روشنی میں لے جانے کی بجائے ماضی کے اندھیروں میں لے جائیں گے۔ تمام عرب ممالک، امریکا اور یورپ، تمام لبرل اور سیکولر ممالک اس منطق کو تسلیم کرتے رہے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ الجزائر جیسے بڑے مسلم ملک میں اسلامی قوتوں کو برسراقتدار آنے سے کیسے

روکا جا سکتا ہے۔

فرانس کو اپنے استعمار کے اوائل ہی میں اس بات کا تجربہ ہوگیا تھا کہ قبضہ مستحکم کرنے کے لیے مولویوں اور صوفیوں کے وجود کا خاتمہ ضروری ہے۔ فرانس کے لیے اسلام ایک مستقل فوجی خطرہ تھا جو مسلمانوں کو ہر دم جہاد کے لیے تیار و مستعد اور سامراجی طاقتوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کر دیتا ہے۔ فرانس نے پورے الجزائر پر قبضہ جمانے کے بعد مسجد کے اماموں اور خطیبوں کے تقرر کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مساجد میں درس و تدریس اور عربی زبان کی تعلیم پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ پولیس خطبات جمعہ کی باقاعدہ خفیہ ڈائری مرتب کر کے حکام کو بھیجتی تھی۔ اس امر کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ اسلام کے معاشی اور معاشرتی نظام پر کوئی مجلس یا اجلاس نہ ہو، تاکہ رفتہ رفتہ لوگ ایک دو نسلوں میں اسلام کی تعلیمات و نظریات سے بالکل نابلد اور بے خبر ہو جائیں۔

الجزائر میں اسلامی تحریکوں کا آغاز

شیخ عبدالحمید بن بادیس بہت دانا اور مدبر عالم تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرانس کی حکمت عملی کے تحت علماء کو آہستہ آہستہ منظر سے ہٹایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کی ''جمعیۃ العلماء المسلمین'' نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے منصوبہ بنایا اور اس کا باقاعدہ آغاز 1925ء سے کیا۔ بن بادیس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخصیت کا ذکر ضروری ہے، اور وہ ہیں شیخ الطیب العقابی، جنہوں نے ''پروگریس کلب'' قائم کر کے 1931ء سے عوام کو روحانی، فکری اور نظریاتی طور پر اسلام کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے کا اہم فریضہ سرانجام دینا شروع کیا۔

ان بزرگوں کی اسلامی تحریکیں سارے الجزائر میں پھیل گئیں۔ لوگوں میں اپنے اپنے محلے میں چندہ گیری سے مسجدیں تعمیر کرنے کا شوق بیدار ہوا۔ جب فرانسیسی حکام کسی مسجد پر قبضہ کرتے تو لوگ علماء کی قیادت میں کسی گھر یا کسی کمیونٹی سنٹر کو مسجد میں تبدیل کر لیتے۔ فرانسیسی استبداد کے ردِعمل کے طور پر دینی مدارس بھی تیزی سے قائم ہوتے چلے گئے۔ لوگوں میں یہ شعور پختہ ہوتا چلا گیا کہ غیر ملکی حکمرانوں نے انہیں مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے بانجھ بنانے کا جو منصوبہ بنایا ہے، ہمیں اس منصوبے کو سختی سے ناکام بنانا ہے۔ الجزائری عوام کے اس زبردست مزاحمتی جذبے نے انہیں جینے کا ایک انداز دے دیا تھا۔ نئے سکولوں میں عوام اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے خیال سے جاتے تھے جو قانونی پابندیوں کی وجہ سے محدود ہوتے جا رہے تھے۔ فرانسیسی اساتذہ کے زیرانتظام چلنے والے تعلیمی اداروں نے بھی الجزائری معاشرے میں ایسے طبقے پیدا کر دیئے تھے جن میں رہن سہن، نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، اندازِ طعام اور اندازِ فکر قطعی طور پر مغربی اور فرانسیسی ہو چکا تھا۔ عوام اس نئے اندازِ زیست کے خلاف بھی اپنے اندر ایک خاص نفرت محسوس کرتے تھے۔ عربی زبان کے تحفظ، ترویج اور تعلیم پر زور بھی اسی ردِعمل کی تحریک سے پیدا ہوا تھا۔

سیاسی جماعتیں دیکھ رہی تھیں کہ لوگوں میں مذہبی عوام گہرے اثرات مرتب کر رہے تھے، اور لوگ تیزی سے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے بددل ہو رہے تھے۔ نومبر 1954ء میں جس فکری انقلاب کا آغاز ہوا، اس

کی سیاسی نظریہ سازی اور تنظیم میں تیس سال پہلے شروع ہونے والی احیائے اسلام کی تحریکوں کا اثر بڑا نمایاں اور گہرا تھا۔ سیاسی جماعتوں کا اثر کم اور سطحی رہا۔ اسلامی نظریات لوگوں میں سامراج کے خلاف زبردست جدوجہد کو اپنی جذباتی زندگی کا حصہ بناتے تھے، اس لیے لوگ فرانسیسی سامراج کے مقابلے میں نکلنا اپنا دینی اور مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ نیشنل لبریشن آرمی میں علماء کو ''مرشدوں'' کے عہدے پر تعینات کیا جاتا۔ مرشد لوگوں کو جنگ آزادی کے تقاضوں سے روشناس کراتے اور انہیں آگے بڑھ کر جینے اور مرنے کے راستے بتاتے جو دراصل اسلام کے نظریہ جہاد کی عملی تعبیر ہوتی۔ جنگ آزادی کے مجاہدوں کو متحرک کرنے کے لیے قرآنی آیات پر مبنی نعرے عام ہوتے گئے حتیٰ کہ ایسا مرحلہ بھی آیا کہ دوران جنگ زخمی ہونے والے مجاہدوں نے ان ڈاکٹروں سے مرہم پٹی کرانا بھی ترک کر دی جو پانچ وقت نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری جنگ تو انہی سیکولر عناصر کے خلاف ہے جو دین کو اپنے دنیاوی مقاصد کے لیے تو استعمال کرتے ہیں لیکن دین پر عمل نہیں کرتے۔

ملک سے الجزائریوں کی جتنی بھی قیادت تھی، اس کی غالب اکثریت سیکولر تھی۔ ان ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں کی نظریں ہمیشہ فرانس کی خوشنودی حاصل کرنے پر مرکوز رہتی تھی۔

جنگ آزادی کے لیے جو گروپ کام کر رہے تھے، ان میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ کمیونسٹوں نے 1962ء کے ''طرابلس پروگرام'' کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا، جس کے ذریعے وہ یہ اعلان کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ الجزائر کا انقلاب اسلامی نہیں بلکہ سوشلسٹ ہوگا۔ محاذ جنگ پر اگلے مورچوں پر لڑنے والے فوجی افسروں میں سے جو بعد ازاں جنگ آزادی میں شریک ہوئے، وہ باقاعدہ اعلان کرتے تھے کہ وہ لینن، مارکس اور ماؤزے تنگ سے متاثر ہیں۔ 1962ء میں حصول آزادی کے بعد جب یوسف بن خدہ جیسے بڑے رہنما سیاست سے کنارہ کش ہوئے اور بن بیلا نے قیادت سنبھالی تو نئے حکمرانوں کا بنیادی نظریہ اشتراکی انقلاب برپا کرنا قرار پایا۔ نئی حکومت میں کمیونسٹوں کا غلبہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسلامی عناصر آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے۔

سیکولر قوتوں کا غلبہ

یہ ایک افسوس ناک اور حیرت انگیز تبدیلی تھی۔ الجزائر میں اسلام نے فرانسیسی تسلط سے لے کر حصول آزادی تک، تمام مراحل میں مرکزی اور فعال کردار ادا کیا تھا، لیکن جب حکومتیں بننے کا وقت آیا تو اسلام کو ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا اور اشتراکیت حکومت کے ہر شعبے میں حلول کر گئی۔ نئے حکمرانوں کو الجزائری عوام میں اسلام کی طاقت واثر آفرینی کا علم تھا، اس لیے وہ کوشش کرتے تھے کہ ایک طرف عوام کے سامنے اسلام کے خلاف کوئی بات زبان سے نہ نکالیں، اور دوسری طرف رفتہ رفتہ عوام سے علماء کا اثر اور رابطہ ختم کر دیا جائے۔ علماء کے طبقے میں سے اپنے مطلب کے افراد چن کر حکومت کے مختلف شعبوں میں داخل کر لیے گئے۔ چنانچہ علمائے سُو نے حکومت کو مارچ 1963ء میں نئے دستور اور قوانین کے لیے آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کی ایسی منفی تعبیرات پیش کی جن کو سیاسی رنگ دے کر صنعتوں اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ اپریل 1964ء میں ''محاذ قومی آزادی'' کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں کمیونسٹوں نے ''الجزائری چارٹر'' کے نام سے اپنا پروگرام پیش کیا۔ اس پر خاصی طویل بحث ہوئی۔ لوگوں

نے کہا کہ اسلام کو الجزائر میں زبردست مقبولیت حاصل ہے اور ہمارا اصل چارٹر اسلام ہے۔ فرنٹ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور ایک ایسا پروگرام منظور کیا جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ سوشلسٹ ہونے کے باوجود اسلامی بھی ہے اور الجزائر کے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس کی مثال وہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیش کیا تھا۔ کہا گیا تھا کہ اسلامی سوشلزم پاکستان کے عوام کی امنگوں کا ترجمان ہے۔ الجزائر کا اسلامی سوشلزم بھی ایک نیم پختہ اقتصادی پروگرام تھا جس نے پہلے سے موجودہ ڈھانچے کو بھی منتشر کر کے رکھ دیا، اور اگر کوئی فائدہ پہنچایا تو چند مخصوص افراد اور بیوروکریسی کو۔ عوام نے علماء کی رہنمائی میں اسلامی سوشلزم کے پروگرام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ خصوصاً شیخ البشیر الابراہیمی نے بڑی شدومد سے اس کی مخالفت کی۔ شیخ ابراہیمی، شیخ احمد بن بادلیس کے جانشین تھے۔ وہ 1940ء سے 1955ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ انہوں نے قاہرہ ریڈیو کے ''صوت العرب'' پروگرام سے 1955ء میں اپنی تاریخ ساز تقریر نشر کی تھی اور عوام سے پرجوش انداز میں کہا تھا کہ وہ نیشنل فرنٹ کی جنگ آزادی کے لیے کام کریں۔ شیخ ابراہیمی کو اسلامی سوشلزم کی مخالفت کرنے کے جرم میں نظر بند کر دیا گیا۔ ان کی نظر بندی کے خلاف ''جمعیۃ القیام الاسلامیہ'' نے دارالحکومت کے سب سے بڑے ہال میں سب سے بڑا جلسہ کیا۔ یہ جلسہ اتنا زبردست اور اثر انگیز تھا کہ ایوان اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی ذرائع ابلاغ میں بھی اس کا مدتوں چرچا رہا۔ اس جلسے سے یہ بات ایک بار پھر ثابت ہوگئی کہ اب بھی حکمران جماعت ''نیشنل لبریشن فرنٹ'' کے مقابلے میں اسلامی تحریک زیادہ مقبول ہے۔ اس صورتِ حال نے فرنٹ کے اندر موجود اسلامی عناصر کو تقویت ملی اور اشتراکی اور اسلامی عناصر کے درمیان جو کشمکش دیر سے چلی آرہی تھی، وہ اتنی شدید ہوگئی کہ 19 جون 1965ء کو کرنل ہوری بومدین نے بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

کرنل ہوری بومدین کی حکمت عملی

کرنل بومدین نے اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور اس حوالے سے اس کا تعارف ایک دینی پس منظر رکھنے والے فرد کے طور پر پہلے سے ہو چکا تھا ان کے اقتدار سنبھالنے پر عوام نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ بن بیلا کے کمیونسٹ مشیروں کی مخالفت بھی کھلے عام کرتے رہے تھے۔ اس لیے بھی ان کا اقتدار میں آنا اسلامی قوتوں کے لیے ایک نیک شگون تھا۔ بومدین نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اہم حکومتی عہدے اسلامی جماعتوں کے نمائندوں کو تفویض کر دیئے۔ وزارت اطلاعات ونشریات کا قلم دان شیخ ابراہیمی کے فرزند شیخ طالب ابراہیمی کے سپرد کر دیا، جن کو بن بیلا نے جلاوطن کر کے صحرا میں قید کر رکھا تھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی کے لیے قرعہ فال شیخ العباسی بن الحسین کے نام نکلا۔ جمعیۃ العلماء المسلمین کے سرکردہ رہنماؤں کو مختلف سرکاری شعبوں میں اہم انتظامی عہدے دیئے گئے۔ اعلیٰ تعلیم کی نظامت کا منصب شیخ مالک بن نبی کو دیا گیا۔ بن نبی بڑے پائے کے مصنف تھے۔ انہوں نے بومدین کے فوجی انقلاب کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالات اور مضامین تحریر کیے۔ انہوں نے تحریروں سے عوام کو تلقین کی کہ وہ انقلاب کے حقیقی مقاصد کی طرف توجہ دیں۔ انہوں نے عوام کی معاشرتی زندگی میں بدعنوانی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر بھی تنقید کی۔

ان تمام مثبت اقدامات کے باوجود معاشرے میں بدعنوانی کو فروغ ملتا گیا۔ نیشنل فرنٹ کے اندر جو بدعنوانی اور کرپشن جڑ پکڑ چکی تھی، وہ کم ہونے کی بجائے اندر ہی اندر، زہر کی طرح سرایت کر گئی۔ زیادہ دکھ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ خود ''جمعیۃ العلماء المسلمین'' میں بھی ناپسندیدہ عناصر نے راہ پالی اور بدعنوانی علماء کا بھی شیوہ بن گیا۔ اس نئی صورت حال میں شیخ عبداللطیف السلطانی جیسے جید علماء نے حوری بومدین کی حکومت کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے 1971ء میں زرعی اصلاحات کے نفاذ کے خلاف بھی احتجاج کیا۔ ان کے انٹرویو مختلف اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ شیخ عبد لطیف اور ان کے ہم خیال علماء کو ایک بار پھر عوام میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ بومدین نے اپنے ملک میں چند اصلاحات نافذ کر کے نام کمایا تھا، وہ اس نے فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد اسلامی سربراہی کانفرنس (او آئی سی) میں اسلامی اصول واحکام کے خلاف تقریر کر کے گنوا دیا۔ ہر مسلمان نے اسلام کے بارے میں ان کے خیالات کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

عوامی تحریک کا آغاز

بومدین کی حکومت کے خلاف عوام کی احتجاجی تحریک کا آغاز 1976ء میں شہر بلیدہ میں سرکاری اداروں پر حملوں سے ہوا، جس کے نتیجے میں اسلامی جماعتوں کے چند نوجوان کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں استاد محفوظ نحناح بھی شامل تھے۔ وہ متیجاہ کی مسجد میں اپنے خطبات جمعہ اور جوشیلی تقاریر کی وجہ سے سیاسی ماحول کو گرم رکھتے تھے۔ انہی کی تحریک پر یونیورسٹی کے طلبہ میں سٹڈی سرکل بنائے گئے، جو بہت مقبول ہوئے۔ سٹڈی سرکل میں طلبہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر اور بحث مباحثہ کرتے تھے۔ مختلف قومی، بین الاقوامی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لیے اسلامی تعلیمات سے ہدایات لینا بھی ان فکری حلقوں کا ایک اہم مقصد تھا۔ ایک مذاکرے میں اس امر پر غور کیا گیا کہ تعلیمی اداروں میں اشتراکی اور فرانسیسی نظریات کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں کسی الجزائری تعلیمی ادارے میں پہلی مسجد 1968ء میں تعمیر کی گئی، جس کے بعد یہ رواج بن گیا کہ یونیورسٹیوں میں مسجدیں بنائی گئیں۔ الجزائر کی یورپی بستیوں میں مساجد کی تعمیر کے لیے باقاعدہ فنڈز قائم کیے جاتے اور ان کو پورا کرنے کے لیے چندہ مہم چلائی جاتی۔ لیکن جس روز مسجد کا افتتاح ہوتا محکمہ اوقاف والے آکر اسے اپنی تحویل میں لے لیتے۔ سرکاری پیش امام، سرکاری خطیب اور سرکاری مؤذن کا تقرر ہوتا اور لازمی قرار دے دیا جاتا کہ جمعۃ المبارک کو سرکاری خطبہ ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ جو خطبہ حکومت فراہم کرتی، اس میں انقلاب الجزائر کے اشتراکی نظریے کی تشریح کی جاتی اور اس پر عمل درآمد کی تلقین کی جاتی اور عوام کو تنبیہہ کی جاتی کہ عمل نہ کرنے کی صورت میں سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ مساجد پر سرکاری کنٹرول کے مسئلے پر عوام سے کئی بار تنازعے ہوئے اور ہوتے رہے، اور یوں حکومت کے خلاف غیظانہ جذبات پروان چڑھتے رہے۔ عوام اظہار رائے کی آزادی مانگتے، جب کہ حکومت کسی بھی مسجد کو عوام کے لیے ''کھلا'' چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ بالآخر صدر بن بیلا نے خطیبوں کو اجازت دے دی کہ وہ اسلامی تعلیمات پر خطبہ دے سکتے ہیں، لیکن اس میں حکومت کے خلاف نکتہ چینی نہیں ہونی چاہیے۔

1981ء میں ایک مسجد میں خطیب کو سرکاری طور پر خطبہ جمعہ کے دوران سختی سے روک دیا گیا، کیونکہ وہ خطبے

میں حکومت پر تنقید کر رہا تھا۔ اس پر زبردست ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے مسجد کے اندر گھس کر فائرنگ کر دی، جس سے چند افراد شہید اور بے شمار زخمی ہوئے۔ 1982ء میں دارالحکومت میں زبردست عوامی مظاہرہ ہوا۔ اس مظاہرے کا مقصد یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے مسجد کو سیل کرنے، 22 طلبہ کو گرفتار کرانے اور اسلام کے خلاف کارروائیاں کرنے پر احتجاج کرنا تھا۔ ان طلبہ کو 1985ء تک جیل میں رکھا گیا۔ تشدد اور مار پیٹ کے ذریعے انہیں اقبال جرم پر مجبور کیا جاتا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ طلبہ کو پانچ وقت نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ عدلیہ نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ یونیورسٹی میں قرآن کی تلاوت کرنا اور نماز کی تلقین کرنا سزا کے لیے کافی جرم نہیں ہے۔

شہر عاشور میں 1982ء میں بھی ایسا ہی واقعہ ہوا، جب پولیس نے ایک خطیب کو تقریر کرنے سے روک دیا۔ لوگوں نے پولیس کا اسلحہ چوری کر لیا اور اطلس کی پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے۔ انہوں نے 1987ء تک اپنی مزاحمت جاری رکھی اور پولیس کا مقابلہ کیا، لیکن بدقسمتی سے اس سال ان کا لیڈر مارا گیا۔ ان کی مزاحمتی تحریک کو مغربی ذرائع ابلاغ دیدہ دانستہ نظر انداز کرتے تھے۔ ادھر حکومت مسلسل ایسے علماءِ سُو کی تلاش میں رہتی تھی جنہیں خریدا جا سکتا، اور جن کو محکمہ اوقاف میں ملازمت دے کر مسجدوں پر مامور کیا جا سکتا، جہاں حکومت پر تنقید کو گناہ قرار دیا جاتا۔ حکومت کے ایک اور اقدام نے بھی لوگوں کو متنفر کر دیا۔ وہ یہ کہ سادہ کپڑوں میں سرکاری اہل کار نماز باجماعت ادا کرتا ہے۔ لوگوں میں یہ احساس شدت سے جڑ پکڑ رہا تھا کہ وہ اب بھی غیر ملکی استعمار کے عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں، وہ فرانس کے غلام ہیں اور ان کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ایسے اقدامات کے باعث رجوع الی الاسلام کی تحریک مزید تیز ہو گئی۔ احیائے اسلام کی تحریکوں اور تنظیموں نے دانستہ طور پر لٹریچر شائع کرنے سے اجتناب کیا، کیونکہ حکومت کے لیے ان پر گرفت کرنا آسان ہو جاتا۔ وہ سینہ بہ سینہ زبانی تعلیم و تلقین پر خاص زور دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں مسلسل خطرہ رہتا تھا کہ ان کی کتابیں، رسالے، پمفلٹ اور دوسرا تحریری مطبوعہ مواد ضبط کر لیا جائے گا اور انہیں پابند سلاسل کر دیا جائے گا، جس سے ان کی اسلامی تحریک اور سرگرمیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ یہ لوگ امام ابن تیمیہ کے نظریات کے زیادہ قریب تھے۔

الجزائر میں فوج اور نیشنل فرنٹ کی شازشیں

الجزائری عوام کو اسلامی تعلیمات کے اثرات سے ''محفوظ'' رکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ فکری سطح پر بند گلی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ غیر ملکی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود خود کو آزاد و خود مختار نہ سمجھنے والے شہریوں کی ملکی ترقی و تعمیر میں شرکت کم ہوتی گئی۔ جب کہ دوسری طرف وہ لوگ جو حکمران جماعت (نیشنل فرنٹ) اور فوج میں اعلیٰ عہدوں اور اہم ذمہ داریوں پر فائز تھے، ان کی ذاتی خواہشات و مفادات نے کرپشن اور بدعنوانی کے عفریت کو اس قدر خوفناک کر دیا کہ معیشت کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ حکمران اور حکومت دونوں سیکولر تھے، جب کہ عوام ایک اسلامی اور جمہوری معاشرے کے طلب گار تھے۔ عوام کو یقین تھا اور اب بھی ہے کہ حصول آزادی کے بعد ملکی وسائل پر چند افراد یا چند خاندانوں

کا قبضہ نہیں رہنا چاہیے۔ دولت کا ارتکاز ختم ہونا چاہیے، لیکن فرنٹ اور فوج نے مل جل کر ایسا نہیں ہونے دیا۔ عوام میں معاشی خوشحالی اور ترقی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

حکمران جماعت کے سامنے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان پر آزادی کے بعد معاشرے کی تشکیل جدید کی ذمہ داری تھی۔ ان کا مقصد ملکی نظم ونسق کو چلانا ہی نہیں ہونا چاہیے تھا، بلکہ ایک طویل، تھکا دینے والی جنگ آزادی کے کامیاب انجام سے ایک روشن صبح طلوع ہونی چاہیے تھی، جسے طلوع ہونے سے حکومت نے روکا۔ فرانس نے اپنے دور میں مقامی لوگوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا، ان کی جگہ یورپی ملکوں کے لوگوں کو آباد کر دیا تھا یا حکومت کے وفادار لوگوں کو۔ عوام کو بجا طور پر توقع تھی کہ آزادی کے بعد جب نیا سورج طلوع ہو کر نیا دور آئے گا تو ان کے آباؤ اجداد کی زمینیں انہیں واپس کر دی جائیں گی، اور مقامی لوگوں کو جس ظالمانہ طریقے سے تنگ کیا گیا تھا، اس کا ازالہ ہو سکے گا۔ دولت کی تقسیم کا نیا نظام ہو گا۔ صنعتوں کو فروغ ملے گا اور ایک نئے معاشی نظام کے لیے کام ہو گا جو آمدنی کے لیے صرف اور صرف تیل اور گیس کے ذخائر ہی پر بھروسا نہیں کرے گا، بلکہ کچھ اور بھی منصوبہ بندی ہو گی، لیکن حکمران بٹ سوٹ کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ وہ ملکی معیشت کو سہارا دینے کے لیے 95 فیصد تیل اور گیس پر انحصار کرتے رہے، جس سے صنعت وحرفت اور زراعت کی ترقی رک گئی، بلکہ بے روزگاری، افراط زر اور مہنگائی میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا، جس سے عام آدمی کے لیے زندگی مزید دشوار اور کٹھن ہو گئی۔

اس معاشی اور معاشرتی ابتری نے جس سیاسی بحران کو جنم دیا تھا، اسے حکمران جماعت ''نیشنل فرنٹ'' اور فوج نے حل کرنے کی بجائے الٹی تدبیریں اختیار کیں، یعنی مفادات آپس میں بانٹ لیے، جیسے یہ جنگ آزادی کا مال غنیمت ہو۔ اقتدار عوام کے ہاتھوں میں منتقل ہونے کی بجائے فوج اور نیشنل فرنٹ کے قبضے میں آ گیا۔ حکمران جماعت نے وعدے کیے کہ وہ جمہوریت لائے گی۔ جمہوریت لانے کے سب سے بلند آہنگ دعوے شاذلی بن جدید نے کیے تھے، لیکن وہ بھی ایفا نہ ہو سکے۔ شاذلی خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ اقتدار عوام کے ایسے نمائندوں کو منتقل ہو جائے جو ان کے مقاصد اور اشتراکی نظریے سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ الجزائر کا سیاسی بحران شخصیتوں کا پیدا کردہ ضرور تھا، بہر حال سیاسی بحران کی اصل وجہ نظریاتی بانجھ پن تھی۔ شخصیات بعض موقعوں پر وہ کردار ادا کرنے سے قاصر رہیں جو قومی مفادات کے حوالے سے ان کا فرض تھا، جب کہ نظریاتی بانجھ پن نے قائدین کو ایک مخصوص دائرے سے قدم باہر رکھنے کی اجازت نہ دی۔ ہر قائد نے ناکام نظام کے اندر رہ کر ہی اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی اور ناکامی کے اسباب جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ناکام نظام کے اندر کامیاب ہو جانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ رہبروں کا مقصد ہی رہزنی بن گیا تھا اور اسی لیے وہ ایسے نظام کو تسلسل دینے کی کوشش کرتے تھے جو بہر حال الجزائری معاشرے کے بالکل برعکس اصولوں پر قائم تھا۔

شاذلی بن جدید کا عہد

27 دسمبر 1978ء کو کرنل حوری بومدین کی وفات کے بعد نیشنل فرنٹ اور فوج کے باہمی اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ شاذلی بن جدید مسند اقتدار تک محض اس لیے جا پہنچے تھے کہ انہیں فوج اور نیشنل فرنٹ دونوں حلقوں

میں ایک غیر جانبدار شخصیت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انہیں فی الواقعی دوسرے غیر جانب دار لیڈروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ غیر جانب دار اور اعتدال پسند خیال کیا جاتا تھا۔ وہ فوج اور نیشنل فرنٹ دونوں کے مفادات (الگ الگ) کے بہتر تحفظ کرنے کی پوزیشن میں تھے، اسی لیے انہیں فوجی بیوروکریسی بھی پسند کرتی تھی اور سول بیوروکریسی بھی۔ حوری بومدین نے ان کے لیے راستہ بھی اس طرح ہموار کر دیا تھا کہ نیشنل فرنٹ کا سیاسی کردار قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ نیشنل فرنٹ کی جگہ سیاسی منصوبہ سازی (بلکہ سیاسی منصوبہ بازی) کرتے تھے۔ چنانچہ الجزائر میں ایک ایسی حکومت شاذلی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی موجود تھی جس میں بظاہر فوج کی شرکت نہیں تھی، لیکن در پردہ تمام فیصلے فوج ہی کرتی تھی، جب کہ نیشنل فرنٹ کی حیثیت محض انتظامیہ کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ شاذلی بن جدید اور ان کی حکومت کے سامنے فوجی جنتا اور سول بیوروکریسی کے زیر اثر، ہر وقت یہی بات رہتی تھی کہ کب اور کس موڑ پر ایک اتحادی کو چھوڑنا اور اس کی جگہ دوسرے اتحادی کو ساتھ ملانا ہے۔

چونکہ فوج اور نیشنل فرنٹ کے درمیان کوئی قابل ذکر راز نہیں رہا تھا، اس لیے باہم دست و گریباں رہنے والے سیاسی رہنما فوجی کمانڈروں کی حمایت کرتے اور فوجی کمانڈر اپنے مفادات کی خاطر اپنے پسندیدہ سیاسی رہنماؤں کو آگے لاتے۔ اس دوستی یا جنگ میں پلیٹ فارم نیشنل فرنٹ (پاکستان میں "مسلم لیگ" کی مانند) کا استعمال ہوتا۔ جب بھی سیاست دانوں نے کہا کہ فوج کی تنظیم نو ہونی چاہیے اور اس کو بیرکوں میں واپس جانا چاہیے، اس کا یہی نتیجہ نکلا کہ فوج نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ سیاسی میدان نیشنل فرنٹ کے لیے کھلا نہیں چھوڑ سکتے۔ فوجی جرنیلوں کو اس قدر طاقت حاصل تھی کہ جب چاہتے، صدر سے کوئی بھی فرمان دستخط کرا کر جاری کرا لیتے۔ چنانچہ انہوں نے شاذلی بن جدید سے ایک آرڈیننس جاری کرایا کہ ایسے سپیشل آرمی یونٹ قائم کیے جائیں جن کے کمانڈر نائبین کا کام کریں گے اور کمانڈر انچیف کی مدد کریں گے، جب کہ کمانڈر ان چیف خود صدر مملکت تھے۔ اسی طرح فوجی جرنیلوں نے "ملٹری کونسل" بنوائی، جس میں بحری، بری اور فضائیہ کے کمانڈر شامل تھے۔ چنانچہ صدر مملکت کے مشیر سیاسی رہنما نہیں، بلکہ فوجی کمانڈر تھے۔ شاذلی بن جدید نے جب 1988ء میں "ہنگامی حالت" کا اعلان کیا تو یہ بات بھی سامنے آگئی، کہ فوجی کمانڈر جب چاہیں اپنے اختلافات ختم کر کے حکومت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ ملک میں امن و امان کی ذمہ داری جنرل عبداللہ بالحوشت کی تھی۔ گویا وزیر داخلہ تھے۔ یہ قدامت پسند جنرل تھے۔ فوج نے توازن برقرار رکھنے کے لیے ان کے ساتھ ترقی پسند، سوشلسٹ بریگیڈیئر خالد نزار کو تعینات کر رکھا تھا۔ شاذلی بن جدید جب بھی عوام کے سامنے آتے، یہ دونوں فوجی ان کے دائیں بائیں موجود ہوتے۔

جب شاذلی بن جدید نے فروری 1979ء میں مسند اقتدار سنبھالی تھی تو فوج اور سیاست کے درمیان باہمی اختلافات کساد بازاری کا شکار تھی۔ تیل کی قیمتوں میں کمی ہو رہی تھی۔ اس پر الجزائر کے سیاسی بحران نے مزید مخدوش صورت حال پیدا کر دی۔ شاذلی بن جدید تو اس نظام کے ایک قیدی تھے۔ وہ آنے والے بحرانوں کا حل کیا نکالتے۔ شاذلی بن جدید نے الجزائر کو عرب تشخص کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ عرب تشخص کا صاف مطلب یہ تھا کہ دوبارہ عربی زبان و تہذیب سے الجزائر کا رشتہ استوار کیا جائے۔ لیکن نیشنل فرنٹ کے اندر موجود مختلف نقطہ نظر

رکھنے والوں کی وجہ سے، یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ طالب ابراہیمی اور شریف موسیٰ کو فرنٹ کی مقتدر شخصیات کا درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے تہذیبی رویوں پر اپنے شخصی نظریات کی چھاپ لگا دی۔ دونوں میں فکری و نظری سطح پر اختلاف رائے تھا، اس لیے نیشنل فرنٹ میں گروپ بندی ہوگئی۔ بربر لوگوں کا خیال تھا کہ ملک کو عرب ازم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش پر سنجیدگی سے کام نہیں ہو رہا۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ عرب ازم کی تحریک کی آڑ میں انہیں سیاسی میدان سے نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ شاذلی کی یہ کوشش اس اعتبار سے بھی نامکمل اور نا تمام رہ گئی تھی کہ اس کے ذریعے عربی طلبہ کو ملازمتیں نہیں مل سکتی تھیں۔ عربی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو فرانسیسی طرزِ تعلیم کے سرپرستوں نے دبا کر رکھا ہوا تھا۔ اب بھی یہی صورت حال ہے کہ فرانسیسی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو عربی مدارس اور کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ پر مکمل فوقیت حاصل ہے۔

الجزائر عرب نہیں ہے

چنانچہ اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر چند فوجی جرنیلوں نے 1986ء میں بغاوت کی بھی کوشش کی۔ اس بغاوت کو چند عناصر نے ملک میں بے چینی اور بدامنی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس بے چینی کی لہر کا بنیادی نعرہ تھا ''الجزائر عرب نہیں ہے''۔ یہ ایک افریقی ملک ہے اور عربوں نے الجزائر کی دولت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ نظام عربوں کو تحفظ دے رہا ہے اور بربروں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ بربروں کی کوشش یہ رہی ہے کہ الجزائر کا تعلق تاریخی و تہذیبی ورثے سے جوڑا جائے۔ بربروں اور عربوں کی اس باہمی کشمکش میں عربوں کو فوقیت حاصل رہی۔ چنانچہ پیرس، تیونس، مراکش اور لیبیا میں عرب سفیروں کا تقرر کیا گیا۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ الجزائر کے دارالحکومت میں مکانات کا مسئلہ بھی سیاسی بحران کا منظرنامہ بن گئے۔ اس شہر میں آٹھ لاکھ انسانوں کے رہنے کی گنجائش تھی، جہاں اب تیس لاکھ انسان بستے ہیں۔ حکام نے آبادی میں کمی کرنے کے لیے نسلی بنیادوں پر کام لیا۔ کمپیوٹروں کے ذریعے وہ علاقے جہاں آبادی کی گنجائش زیادہ تھی، ان کی نشان دہی کی گئی۔ ان علاقوں سے لوگوں کو زبردستی نکال کر ان کے آبائی علاقوں میں جانے پر مجبور کر دیا گیا، لیکن دوسری طرف بیوروکریسی کے لیے اس شہر میں عالی شان اور پرتعیش مکانات تعمیر کیے گئے، جس سے عوام میں شدید ردِعمل ظاہر ہوا۔

دینی مدارس کی بندش

فاتح قوم مفتوح قوم کی روح کچلنے کے لیے اس کی زبان کے تمام رشتے کاٹ دیتی ہے، جن میں ذریعہ تعلیم بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے بھی یہی کیا تھا کہ فارسی اور عربی کو برطرف کر کے اپنی انگریزی کو دفتری و سرکاری زبان قرار دے دیا اور ذریعہ تعلیم بھی بنا دیا۔ فرانس نے بھی الجزائر پر آمرانہ تسلط قائم کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے ان کی زبان اور ذریعہ تعلیم کو تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں کو مدرسے اور سکول قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نو آبادکار یورپی لوگ حکومت فرانس پر دباؤ ڈالتے رہے کہ الجزائر کو تعلیم کے شعبے میں آنے سے سختی سے روکا جائے۔ چنانچہ ایسے قوانین بنا دیے گئے کہ مدرسہ اور سکول کھولنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا

سکتا تھا۔ یورپی طرز کے سکول جگہ جگہ سرکاری سرپرستی میں کھول دیئے گئے۔ (مثلاً جیسا کہ ہندوستان میں ہوا، سینٹ اینتھونی سکول، کیتھڈرل سکول، سینٹ جارج، سینٹ جونز سکول وغیرہ) مسلمان اپنے بچوں کو بے دین غیر مسلم سکولوں میں بھی بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مغربی تہذیب میں رچ بس کر اپنی اصلیت، اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے دور ہو جائیں گے۔

فرانسیسی نظام تعلیم

سرکاری سکولوں کا نصاب مکمل طور پر فرانسیسی تھا۔ کہا گیا کہ ان سکولوں کے ذریعے الجزائری بچوں کو فرانسیسی تہذیب سے آشنا کرایا جائے گا اور تہذیب سے نا آشنا جاہل الجزائریوں کو مہذب بنایا جائے گا۔ اس مشن کے تحت فرانسیسی زبان، ثقافت اور تہذیب کو متعارف و مستحکم کرنے کے لیے ایک طویل المیعاد منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ ان سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ فرانس کے مشاہیر، تاریخی کارناموں اور واقعات سے بھرپور ہوتی، جس میں اسلام، مسلمان، کلمہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، قرآن وسنت کا ذکر تک نہ ہوتا تھا۔ اس نظام تعلیم کے ذریعے ایک طرف تو مسلمان کو ختم کرنا مقصود تھا اور دوسری طرف ''عرب'' کو۔ سرکاری سکولوں میں داخلے کے لیے طالب علم اور اس کے خاندان کے بارے میں چھان بین کی جاتی اور مقامی آبادی میں سے ایسے منتخب گھرانوں ہی کے نونہال داخل کئے جاتے تھے جو بڑے ہو کر فرانس کے خوشامدی ملازم کا کردار ادا کر سکیں۔

فرانسیسی نظام تعلیم نے الجزائر کی معاشرت اور سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تعلیم ہی کی مدد سے فرانس نے الجزائر اور دیگر نو مسلم نو آبادیوں میں انتظامی مشنری قائم کر لی تھی۔ دیہی سکولوں سے لے کر شہروں میں ''سینٹ لوئی'' کی سطح کے اونچے سکولوں تک فرانسیسی نصاب پڑھانے کے پابند تھے۔ عربی بولنا جرم اور فرانسیسی میں بات کرنا تہذیب یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ 1903ء سے پہلے سکولوں میں عیسائی پادریوں اور مبلغوں کو کام کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ 1903ء میں یہ کام خود حکومت نے سنبھال لیا۔ اب شہروں اور دیہات میں بے دین اور بے خدا مغربی تہذیب پھیلانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جانے لگا۔ مسلمان ایک طرف اپنے دین کو مسخ ہونے سے بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور دوسری طرف عیسائیت کے جارحانہ حملوں کا تدارک بھی کرتے تھے۔ فرانس چاہتا تھا کہ وہ الجزائر پر اپنا قومی تسلط رفتہ رفتہ سول انتظامیہ میں تبدیل کر دے اور اس تبدیلی کا بہترین طریقہ فرانسیسی نظام تعلیم کا اجرا اور استحکام تھا۔

کرسچین مشن سکولوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے سرکاری امداد دی جاتی تھی اور مسلمانوں کو دینی مدرسے کھولنے کی اجازت بڑی مشکل سے دی جاتی تھی۔ اجازت دینے کے بعد طرح طرح کی پابندیاں اور رکاوٹیں کھڑی کی جاتی تھیں، جن کے باعث مدرسہ قائم کرنے والے دو چار برس میں تھک ہار کر مدرسہ بند کر دینے پر مجبور ہو جاتے۔ 1903ء میں ایک حکم جاری کر دیا گیا کہ دینی مدارس کو محدود اور کنٹرول کیا جائے۔ جس مدرسے میں طلبہ کی تعداد 20 سے کم ہوگی، اسے غیر قانونی تصور کیا جائے گا۔ جن اوقات میں فرانسیسی سکول کھلے ہوں، ان اوقات میں مدرسوں میں تعلیم و تدریس نہیں ہو سکتی۔

الجزائری مسلمانوں کے لیے دوہرا نظام تعلیم

عیسائی صاف کہتے تھے کہ خداوند نے الجزائر انہیں عطا کیا ہے۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانا اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر سے بربریت نکل جائے۔ یہ ایک انسانی ضرورت ہے۔ یہی ایک پالیسی ہے جسے بروئے کار لائے بغیر فرانسیسی حکومت کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ چنانچہ سرکاری احکامات کے تحت الجزائر کی مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ گرجا گھروں کے لیے فرانس اور دوسرے یورپی ملکوں سے پادری کثیر تعداد میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے۔

ایک فرانسیسی سرکاری رپورٹ کے مطابق الجزائر پر قبضے کے وقت مسلمانوں کے دینی مدرسوں کا ایک وسیع جال موجود تھا۔ ان مدرسوں میں اسلامی علوم اور عربی کی تعلیم و تدریس ہوتی تھی۔ تیونس میں بھی بالکل ایسی ہی صورت حال تھی، جہاں ان مدرسوں کے ساتھ ساتھ مسجد سکول بھی قائم تھے۔ قاہرہ کے جامعۃ الازہر کے معیار کا ایک بڑا مدرسہ ''جامعہ زیتونیہ'' بھی موجود تھا، جو ایک مسجد میں قائم کیا گیا تھا۔ اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم کے دو سکول بھی قائم تھے، جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین غیر ملکی زبانوں میں پڑھائے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ اسلامی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

الجزائر پر قبضے کے بعد فرانس نے دوہرا نظام تعلیم رائج کیا۔ ایک قسم کے نظام تعلیم کے لیے کتابیں اور اساتذہ فرانس سے درآمد کیے گئے، جب کہ دوسرا نظام الجزائر کے مسلمانوں کے لیے تھا۔ یہ نظام تعلیم ''فرنچ زدہ'' مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کا نصاب بھی فرانس کی وزارتِ تعلیم نے مرتب کیا تھا اور اس نصاب کے مطابق قاعدے اور کتابیں بھی فرانس سے چھپ کر آتی تھیں (بالکل پاکستان کے انگریزی زدہ مسلمانوں والا معاملہ تھا!)۔ فرانسیسی زبان ذریعہ تعلیم تھی اور عربی ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے پڑھی جا سکتی تھی۔ دینی مدارس حکومت کی سخت پابندیوں کے باعث رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے۔ فرانسیسی تسلط کے پچاس سال بعد فرنچ مسلم سکولوں میں (انڈیا کے اینگلو انڈین سکولوں کی طرح) جزائری طلبہ کی تعداد بمشکل پندرہ سو تھی۔ یہ تعداد پرائمری سکولوں میں تھی، جب کہ ہائی سکولوں میں دو ہزار طلبہ میں سے الجزائری طلبہ کی تعداد 226 تھی۔

یہ صورت حال دوسری جنگ عظیم کے کچھ عرصہ بعد تک قائم رہی۔ فرانس کو بہتری کا خیال اس وقت آیا جب الجزائر کے عوام اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے اور الجزائری عوام کے انقلاب کا آغاز ہو رہا تھا۔ 1954ء میں حقیقی صورت حال یہ تھی کہ دس میں سے ایک الجزائری طالب علم کو ''فرنچ مسلم'' سکولوں میں داخلہ حاصل تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فرانس کی کوشش یہ رہی کہ الجزائریوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ الجزائر کے ساتھ جو

سلوک ہوا، وہی فرانس نے اپنی دوسری نوآبادیوں مثلاً تیونس اور مراکش میں بھی روا رکھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس کو اپنی غلام نوآبادیوں میں بہتری کا خیال آیا۔ الجزائر میں تعلیمی اصلاحات کا اعلان کیا گیا، جن میں سے ایک اعلان سکولوں کو قومی تحویل میں لینے کا بھی تھا۔ لیکن اسے یہ کہہ کر مشروط کر دیا گیا کہ ذریعہ تعلیم فرانسیسی زبان ہوگی۔ فرانسیسی زبان واحد ذریعہ تعلیم تھی۔ تیونس میں آزادی سے صرف چھ سال قبل ریاضی کو عربی زبان میں پڑھانے کی اجازت دی گئی، لیکن صرف پرائمری سطح تک۔

1930ء کے عشرے میں فرانسیسی حکومت کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ الجزائریوں کے قلب و ذہن سے اسلام کی روح کو نکال دینا آسان کام نہیں ہے۔ فرانسیسی حکمران اسلام کے بنیادی اور اصل ماخذ پر حملہ کرنے سے کتراتے تھے اور اسے رجعت پسند اور قدامت پسند کہہ کر جان چھڑانا چاہتے تھے۔ اب انہوں نے ایسے ہتھکنڈے اختیار کرنا شروع کر دیئے، جن کے تحت لوگ اسلام سے بددل ہو جائیں، اور دوسری طرف خاص اہتمام کیا جائے کہ افریقہ کو اسلام سے پہلے کے دور میں لے جایا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ دور جاہلیت کا تھا، جب افریقیوں کو تہذیب سے ذرا بھی آشنائی نہ تھی۔ الجزائر میں عیسائی مبلغین اور پادریوں کو حکومت فرانس کی جانب سے سرکاری امداد مل رہی تھی کہ وہ افریقہ کے جنگلوں اور صحراؤں میں تن تنہا نکل کر، عیسائیت کی رہبانیت کی طرز پر اسلام سے پہلے کی زندگی ہی کو نیکی اور تقوی قرار دیں، لیکن فرانس میں ایسے دانشور اور مفکر بھی موجود تھے جن کو یہ شعور حاصل ہو گیا تھا کہ مسلمان کی قوت ایمانی پر ایسے مصنوعی حربوں اور طریقوں سے ضرب لگانا ممکن نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا کہ فرانس اور اسلام کے درمیان مخاصمت وعداوت کو کم کیا جائے اور مسلمانوں کو دوست بنا کر فرانسیسی بنایا جائے۔

دینی مدارس کا احیاء

1924ء کی تعلیمی اصلاحات کے تحت ''قرآن سکول'' قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ تمام گورنروں کو حکومت فرانس کا یہ حکم پہنچا دیا گیا کہ گورنر جنرل کی اجازت سے ایسے مدرسے قائم کیے جا سکتے ہیں، جن کا مقصد مسلمانوں اور انتظامیہ کے درمیان رابطہ پیدا کرنا ہو۔ ایسے مدرسوں میں تعلیم پانے والے افراد مقامی آبادیوں کے لیے قائم ٹربیونل (پنچایت یا یونین کونسل) کے ناظم اور منصف ہوں گے، یعنی وفادار بیوروکریٹ۔

الجزائر کے علمائے دین ان تمام حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اسلامی قانون کا نفاذ و اطلاق ان کی منزل مقصود تھی۔ اسلامی نظام تعلیم کا قیام ان کا مشن تھا۔ ان کے خیال میں اسلامی نظام تعلیم چار بنیادی اہداف کے حصول کا نام تھا:

پہلا دینی تعلیم

دوسرا اخلاقی تربیت

تیسرا ذہنی تربیت

چوتھا مادی ضروریات کی تکمیل

ابن بادیس کی اصل جدوجہد اور تحریک کا مقصد ان اہداف کا حصول تھا۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے ایک

ایک فرد کو اجتماعیت میں رنگنے کی کوشش کی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہر مسلمان انفرادی حیثیت میں آنحضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر صدق دل سے عمل کرے اور اپنی کوشش کے اثرات و ثمرات سماج کی طرف منتقل کر دے۔ اسی لیے ان کے تعلیمی نظریات میں اس بات کو اولیت حاصل تھی کہ ہر مسلمان اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں ایک مکمل انسان ہو۔ وہ مکمل انسانی شخصیت پر یقین رکھتے تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ فرانسیسی استعمار و استبداد میں یہ کام انتہائی مشکل ہے۔ وہ مسلمانوں کو جسمانی اعتبار سے مضبوط، ذہنی طور پر بالغ نظر اور اخلاقی اعتبار سے مکمل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نظریات کے مطابق انسانی کمال یہ ہے کہ وہ علم کا پیاسا ہو، عزم کا پختہ ہو، قوت کا منبع ہو۔ کام کرنے سے آگے آگے ہو اور اس کا کردار نفاست اور پاکیزگی کا آئینہ دار ہو۔ انسانی شخصیت کی پیدائش کے ساتھ ہی تعمیر ہونا شروع ہو جاتی ہے اور موت تک تعمیر ہوتی رہتی ہے۔

''علم، عزم اور کام'' یہ احمد بن بادیس کا سہ لفظی نعرہ تھا اور مشن بھی۔ یہ تین خوبیاں مزید تین خوبیوں پر انحصار کرتی ہیں۔ کام کا تعلق مضبوط اور تندرست جسم سے ہے۔ ثقہ علم اور پختہ عزم کو اعلیٰ اور بلند کردار سے حوصلہ ملتا ہے، جس سے مفید کام جنم لیتا ہے، اس لیے نوع انسانی کو ان تین خوبیوں کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ ایسے افراد تیار ہو جائیں تو اسلامی تہذیب کے احیاء کا کام مشکل نہیں رہتا۔ الجزائر کے علمائے دین کے سامنے ایسے افراد تیار کرنے کا نصب العین تھا۔ الجزائر کی نئی نسل کو نئے حوصلوں اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا تھا۔ احمد بن بادیس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا:

> ''ہم اپنے شاگردوں کو قرآن پڑھاتے ہیں اور انہیں نصیحت اور ہدایت کرتے ہیں کہ وہ قرآن کا مطالعہ پہلے دن سے، اور پھر ہر دن ایسے جذبے اور لگن سے کریں کہ ان کے قلوب میں یہ امید روشن ہو جائے کہ قرآن سے ان کے باطن میں بھی وہی عظیم انقلاب جنم لے گا جو ہمارے آباؤ اجداد اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے برابر کیا تھا''۔

احمد بن بادیس کے نظریات نے علمائے دین میں ایسی انقلابی روح پھونکی کہ وہ اسلام کے نہ صرف تحفظ پر کمر بستہ ہو گئے، بلکہ اس کے مکمل احیاء و تجدید، معاشرتی زندگی میں اسلام کے نفاذ اور عملی سیاست میں اسلام کے اصولوں کی بالادستی کے لیے ہر چیز قربان کرنے پر تیار تھے۔

اس تحریک کو فرانس کی سخت گیر پالیسی کا ردِ عمل بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ خود علمائے دین کی جدوجہد بھی تھی کہ اسلامی اقدار و تعلیمات کو، ان کی اصلی حالت میں پیش کیا جائے، تعلیم کو عام کیا جائے اور مسجد کو ایک بار پھر تعلیم و تدریس اور ذہنی تربیت کا مرکز بنا کر کام کا آغاز ہو، تاکہ ایک طرف تو الجزائری مسلمانوں کے منتشر گروہوں کو متحد و منظم کیا جائے اور دوسری طرف انہیں فرانسیسی سامراج کے خلاف جنگ آزادی کے لیے تیار کیا جائے۔ مسجد سے متعلقہ ہر فرد کو، خواہ وہ امام تھا یا خطیب، موذن تھا یا خادم، اس نے عام مسلمانوں کو تعلیم دینا اپنا فرض قرار دے لیا۔ سب سے پہلے ایمانیات، پھر عبادات اور پھر معاملات کے بارے میں عام اصولوں کی تعلیم و تلقین کی گئی۔

حکومت فرانس علمائے دین کی ان سرگرمیوں سے آگاہ تھی۔ مساجد کے اندر ہونے والی تعلیمی سرگرمیوں کی

رپورٹ اسے باقاعدگی سے ملتی تھی۔ یہ کام اس کے ہمدرد، تنخواہ دار، خیر خواہ انجام دیتے تھے، جن کا بظاہر علماء اور طلبہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فرانس دینی تعلیم کی سرگرمیوں کو اپنے تسلط کے خلاف خطرہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ 18 فروری 1933ء کو الجزائر کے گورنر نے ایک حکم نامہ جاری کیا، جس کے تحت علمائے کرام کو کسی بھی قسم کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیاں مسجدوں میں جاری رکھنے سے روک دیا گیا۔ حکم میں علمائے دین کو انتشار پسند، تخریب کار اور دہشت گرد کے طور پر پیش کیا گیا، اور کہا گیا کہ وہ غیر ملکی عربوں اور مسلم ممالک کے گماشتوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ علماء نے اس سرکاری حکم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ حکومت فرانس، الجزائر کے گورنر جنرل اور وزیر داخلہ سے دو مطالبے کیے گئے۔

1۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ان مساجد کو فی الفور کھولا جائے جن کو تالا لگا دیا گیا ہے اور جہاں تعلیم و تدریس خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے۔

2۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ الجزائر کے علماء کو خود ''قرآن سکول'' کھولنے کی عام اجازت دی جائے۔ علماء کو یہ حق دیا جائے کہ وہ عوام کو اسلامی اصولوں کے مطابق تعلیم دے سکیں اور ان کی تربیت کر سکیں۔ اور اس کے لیے مسجدوں کو مرکز کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔

فرانس کے صدر کو ایک یادداشت پیش کی گئی، جس میں کہا گیا کہ مسجدوں کی بندش ہرگز قبول نہیں، جہاں لوگوں کو اپنے دین کی تعلیم دینے سے روک دیا گیا ہے۔ یہ نوے لاکھ مسلمانوں کا بنیادی حق ہے جسے سلب نہیں کیا جا سکتا۔

1935ء میں ''جمعیت العلماء الجزائر'' کی جنرل اسمبلی میں احمد بن بادیس نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں پر مساجد کے دروازے بند کرنا انتہائی اشتعال انگیز اقدام ہے۔ جمعیت ہرگز اس اقدام کو قبول نہیں کرے گی اور اس حکم کے خلاف زبردست احتجاجی تحریک چلائی جائے گی۔ انہوں نے علمائے کرام کی جانب سے فرمایا کہ میں حکومت پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے مذہب پر اس پابندی پر سخت احتجاج کرتے ہیں۔

حکومت فرانس نے علمائے کرام کے کسی مطالبے کو تسلیم نہیں کیا، لیکن عوام نے زبردست قبولیت اور پذیرائی بخشی۔ جب 1933ء میں مسجدوں کی بندش کا حکم جاری ہوا تھا، اسی سال عوام نے ازخود، چندہ دیری سے 90 کے قریب نئی مساجد قائم کی تھیں۔ اماموں اور خطیبوں کی تعداد کم تھی، اس لیے ''جمعیۃ العلماء'' نے فیصلہ کیا کہ علماء چوبیس گھنٹے کام کرتے رہیں گے اور مساجد میں مذکورہ کمی کو پورا کرتے رہیں گے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جائیں گے اور مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ مسلمان تو گویا اس موقع کی تلاش اور انتظار میں تھے۔ جب کسی عالم دین کو ان کے علاقے میں آنا ہوتا، اس کا شاندار استقبال کیا جاتا۔ وہ کھلے میدانوں میں جمع ہو جاتے اور آنے والے مہمانوں کی تقریریں غور اور توجہ سے سنتے اور فرانسیسی سامراج کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے۔ حکومت فرانس نے ایک بار پھر مداخلت کی اور الجزائر میں علماء کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی۔ ہر عالم دین کو پابند کر دیا

گیا کہ وہ اپنے شہر یا قصبے سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی مسجد میں تعلیم و تبلیغ نہیں کر سکتا۔ علماء کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ اگر اسے اپنے کسی قریبی عزیز کی وفات پر بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے لیے باقاعدہ اجازت طلب کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اکثر معاملوں میں یہ خصوصی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا جاتا۔

الجزائر کی مغرب نواز فوج

جب الجزائر کی مسجدیں مسلمانوں اور علماء کے لیے مقفل کر دی گئیں تو علماء نے ایک انوکھا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے نوجوانوں کو راغب کرنے کے لیے سماجی (سوشل) کلب قائم کیے۔ ان کلبوں میں لیکچر کا اہتمام کیا جاتا اور نوجوانوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ وہ اس لیکچر پر سوال و جواب اور مباحثے میں شریک ہوں۔ سٹڈی سرکل کی طرز پر اس بحث سے تعلیم کا کام لیا جاتا تھا۔ ان کلبوں کو تین درجوں میں منظم کیا گیا۔ بچوں کے کلب، نوجوانوں اور طلبہ کے کلب اور پختہ عمر کے افراد کے کلب۔ فرانسیسی تہذیب کے زیر اثر نوجوان نسل میں نائٹ کلبوں کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا، جہاں قمار بازی کے ساتھ ساتھ دوسری تمام برائیاں بھی موجود تھیں۔ حکومت ایسے نائٹ کلب کھولنے کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ ان نائٹ کلبوں کے ردعمل ہی میں علماء نے سماجی کلب قائم کیے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد یہ بتایا گیا کہ ان کے ذریعے نوجوان نسل کو تربیت فراہم کی جائے گی۔ سماجی کلبوں کی تشکیل اس طرز پر کی گئی تھی کہ وہ مساجد اور مدارس کی کمی کو پورا کر سکیں۔ علماء کو بخوبی علم تھا کہ ایک شرابی اور جواری نسل کی تیاری کے ذریعے فرانس ان کا مستقبل برباد کرنا چاہتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو بلوغت اور شباب کی ممکنہ برائیوں سے بچایا جا سکے اور ان کی اخلاقی تربیت اور کردار سازی پر خاص توجہ دی جائے۔ انہوں نے نئی نسل کو یہ درس دیا کہ وہ خود کو امت مسلمہ کی قیادت کے لیے تیار کرے۔ ان سماجی کلبوں میں نوجوانوں کو فرانسیسی قبضے سے پیدا شدہ نازک صورتِ حال اور اس کے نقصانات سے بخوبی آگاہ کیا جاتا۔ ان کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنی اسلامی اور عربی تہذیب کے تحفظ کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔

بالآخر علماء کو چند شرائط کے ساتھ سکول قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ علماء کے ان دینی مدرسوں میں طلبہ کو قرآن وحدیث اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ عربی زبان کی اہمیت بتائی جاتی اور دوسری غیر ملکی زبانوں میں مروجہ علوم سیکھنے کے لیے طلبہ کو تیار کیا جاتا تھا۔ اسلام سے گہری وابستگی اور بنیادی احکام وتعلیمات کا علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان سے گہری واقفیت ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی زبان کو محفوظ کر کے ہی روح اسلام کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ علماء چونکہ پیشے کے اعتبار سے ''ٹیچر'' ہوتے تھے، اس لیے وہ درس وتدریس کی بنیادی ضرورتوں کو خوب سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ حکومت وقت ان کے راستے میں نت نئی رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی ہے، لہٰذا وہ اپنی دوہری ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے تھے۔

علماء کے قائم کردہ سکولوں کو ''جمعیت العلماء الجزائر'' کے نظم ونسق کے تحت مربوط کیا گیا۔ ذہین اور غیر معمولی صلاحیت کے طلبہ کو جامعۃ الازہر اور دوسرے اعلیٰ جامعات میں داخل کرانے کا انتظام کیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں

تیونس کی جامعہ زیتونیہ سے خصوصی استفادہ کیا گیا۔ علماء کو اس امر کا بھی شدت سے احساس تھا کہ طلبہ کا رابطہ عربی زبان اور تہذیب سے ٹوٹنے نہ پائے۔ انہوں نے مفت تعلیم کا بھی بندوبست کیا، تاکہ الجزائر کا ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے۔ 1948ء میں ''جمعیت'' کے زیر اہتمام 140 پرائمری سکول کام کر رہے تھے۔ اس سال ثانوی تعلیم کے ادارے بھی قائم کیے گئے۔ پہلا ثانوی سکول ''انسٹی ٹیوٹ آف بن بادیس'' کے نام سے قائم کیا گیا، جسے الجزائر کے مسلمانوں کی تعلیم کا سنگ میل قرار دیا جاتا ہے۔ 1951ء میں اس ادارے میں 702 طلبہ زیر تعلیم تھے، جب کہ یہ تعداد 1955ء میں 903 ہوگئی۔ اس ادارے کی طرز پر دوسرے شہروں میں بھی ثانوی تعلیم کے ادارے کھل گئے۔

دینی مدارس، جن کو وہاں ''قرآنی سکول'' کہا جاتا تھا، بڑی تیزی سے پورے الجزائر میں پھیل گئے۔ بعض علاقے تو ایسے بھی تھے جہاں دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ نے فرانسیسی فوج میں جبری بھرتی کے خلاف اتحاد کر لیا تھا اور وہ فوج میں خدمات انجام دینے سے صاف انکار کر رہے تھے۔ وہ جبری بھرتی اور فرانسیسی فوج کی ملازمت کو ظلم سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ فرانس انہیں جبراً بھرتی کر کے خود ان کے مسلمان بھائیوں کے خلاف استعمال کرتا ہے جو کہ سراسر کفر ہے، جب کہ کیمپوں میں رہائش کے دوران بری عادتیں پڑ جاتی ہیں۔ علماء کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ ان کے زیر اثر علاقوں میں طوائفوں کو اپنے اڈے اور نائٹ کلب بند کرنے پڑے۔

اب حکومت فرانس نے بھی زیادہ سنجیدگی اور سختی کے ساتھ علمائے دین کی تعلیمی سرگرمیوں کی نگرانی شروع کر دی۔ وزارت داخلہ نے ان حالات کے پیش نظر ایک حکم جاری کیا، جس کی رو سے عربی زبان کو ''غیر ملکی زبان'' قرار دے دیا گیا۔ علماء کو عربی زبان کی تعلیم و تدریس سے قانوناً روک دیا گیا اور پولیس اور فوج سے کہا گیا کہ وہ اس حکم پر عمل درآمد کرائیں۔ علماء کو سخت دکھ ہوا۔ انہوں نے گورنر جنرل سے باقاعدہ طور پر سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے پریس میں بھی بے شمار یادداشتیں اور قراردادیں ارسال کیں کہ ایک عرب ملک میں عربی زبان ہی کو غیر ملکی زبان قرار دیا جا رہا ہے۔ حکومت فرانس نے ایک اور حکم نامہ قدرے نرمی سے جاری کیا، جس میں کہا گیا کہ عربی زبان کی تعلیم و تدریس کے لیے علماء کو باقاعدہ اجازت لینا ہوگی۔ خلاف ورزی کرنے پر علماء کو شدید سزائیں دی جائیں گی۔ علماء نے اس حکم نامے کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، جس پر انہیں قید و بند اور جرمانے کی سزائیں دی گئیں۔ 1949ء میں 27 علماء کے مقدمات صرف دارالحکومت الجزائر کی عدالتوں کو بھیجے گئے۔ علماء نے کہا کہ جس طرح فرانس میں فرانسیسی زبان پڑھانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں، اسی طرح الجزائر میں عربی پڑھانے کے لیے کسی قسم کی اجازت نہیں لی جائے گی۔

نئے حکم کا ردِ عمل

حکومت فرانس کے اس نئے حکم کا شدید ردِ عمل ہوا۔ ڈاکٹر، انجنیئر، وکیل، غرض ہر شعبے سے وابستہ مسلمان ''جمعیت العلماء'' سے رابطہ کرنے لگے، حالانکہ وہ عالم فاضل تھے، نہ انہیں عربی آتی تھی، لیکن وہ علماء کے ساتھ احتجاجی تحریک میں شامل ہو گئے۔ تحریک میں ان لوگوں کی شمولیت کے بعد احمد بن بادیس نے ایک بیان میں کہا کہ کچھ سرکاری لوگ سمجھتے تھے کہ اسلام اور عربی صرف علمائے کرام کا مسئلہ ہے، لیکن عوام کے تمام طبقوں کی زبردست

حمایت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سارے الجزائر کا مسئلہ ہے۔ اب یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ یورپ اور فرانس میں تعلیم پانے والے الجزائری لوگ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اسلام اور عربی زبان کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں۔

علمائے کرام کی جدوجہد کا نقطۂ عروج ان کے تین بنیادی مطالبات تھے۔ عربی زبان کی تعلیم و تدریس، مساجد میں تعلیم و تدریس کی آزادی اور غیر ملکی قوانین کی برابری کے ساتھ اسلامی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے معاملات فیصل کیے جائیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام سختیوں، رکاوٹوں اور پابندیوں کے باوجود الجزائر اسلامی تہذیب کے احیاء و تجدید کے راستے پر گامزن رہا اور علمائے کرام کے ولولہ انگیز اور غیر متزلزل کردار نے اسلامی اقدار کے تحفظ اور فروغ، اسلامی تعلیم کی توسیع اور عربی زبان کے تحفظ میں زبردست کردار ادا کیا، ورنہ ممکن تھا کہ عربی کو ہمیشہ کے لیے الجزائر کی سرزمین سے نکال دیا جاتا، لیکن اس مذہبی جنگ میں الجزائر کے کسی ایک مسلمان نے بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ ہر مسلمان مرد اور عورت علمائے کرام کے شانہ بہ شانہ احیائے اسلام کے لیے بھی لڑتے رہے اور جنگ آزادی میں بھی تاریخ ساز کردار ادا کرتے رہے۔

الجزائر کا ایٹم بم

الجزائر میں وکل کونسلوں کے انتخابات کے بعد یورپ نے محسوس کر لیا تھا کہ ''نیشنل فرنٹ'' کی حکمرانی کو زوال آچکا ہے اور اسلام پسند قوتیں ابھر رہی ہیں۔ اس خدشے کے تحت کہ آئندہ پارلیمانی انتخابات میں نیشنل فرنٹ (این ایل ایف) کو شکست ہوگی اور اس کی جگہ اسلامی فرنٹ حکومت بنائے گا، یورپ نے دوسرے اقدامات کے علاوہ ایک باقاعدہ مہم کے تحت الجزائر کو بدنام کرنا شروع کر دیا کہ الجزائر عرب دنیا کا پہلا ایٹم بم بنا رہا ہے۔ اس سازش کا آغاز برطانوی پریس سے ہوا اور پھر امریکی میڈیا کا دل پسند موضوع بننے کے بعد یہ پروپیگنڈا اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ برطانیہ میں اس کا آغاز عربی زبان کے اخبارات کے ذریعے کیا گیا، تاکہ یہ تاثر دیا جائے کہ گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے ہیں۔ کہانی یہ گھڑی گئی کہ چین نے الجزائر کو 40 میگاواٹ قوت کا ایٹمی پلانٹ دیا ہے، جس سے بجلی پیدا نہیں کی جائے گی، کیونکہ بجلی پیدا کرنے کے لیے بہت چھوٹا ہے، لیکن ایٹمی تحقیق کے لیے بہت بڑا اور مناسب ہے۔ اخبار ''الشرق الاوسط'' کی یکم مئی 1991ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ الجزائر نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس نے ایک ایٹمی ری ایکٹر بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ تاہم وہ مغرب کے خدشات دور کرنے کے لیے تیار ہے۔ الجزائری حکومت ''ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی'' کو اپنے ایٹمی پروگرام کی تمام معلومات اور تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے تیار ہے اور معائنے سے بھی انکار نہیں کرے گا۔

حقیقت یہ تھی کہ چین اور الجزائر نے 1988ء میں ایٹمی پلانٹ کے سمجھوتے پر دستخط کیے تھے۔ دارالحکومت الجزیرہ سے 250 کلومیٹر جنوب میں ایک مقام پر اس ری ایکٹر کو نصب کیا جانا تھا۔ اس کی قوت صرف 15 میگاواٹ تھی۔ اس لیے پرامن مقاصد کے سوا اس کا دوسرا استعمال ممکن ہی نہ تھا۔ اس پروجیکٹ کا آغاز حوری بومدین نے کیا تھا جو الجزائر کو علاقے کی طاقت بنانا چاہتے تھے۔ یہ منصوبہ سراسر صنعتی تھا اور اس کا ایٹمی اسلحے کی تیاری سے کوئی تعلق

نہیں تھا۔ بومدین کی کوشش تھی کہ وہ اپنے ملک کی صنعتی بنیادوں کو مضبوط کر دیں، تاکہ وہ عرب اور افریقہ میں اہم کردار ادا کر سکے۔ بومدین نے افریقی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے کے لیے "افریقی اتحادی کی شاہراہ" کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔

یورپ والوں کا کہنا تھا کہ شاذلی بن جدید نے اس پرامن مقاصد والے ایٹمی پروگرام کو فوجی بنا دیا تھا۔ ان کے دورِ حکومت میں چین سے ایٹمی ری ایکٹر حاصل کیا گیا۔

مغرب نے اس مسئلے پر الجزائر کی حکومت اور حزبِ اختلاف کو لڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ مغربی میڈیا مسلسل پروپیگنڈا کرتا رہا کہ "اسلامی فرنٹ" برسرِ اقتدار آ کر ایٹمی صلاحیت کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال کرے گا، جب کہ حکومت کو باور کرایا گیا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کی صورت میں امریکی افواج حملہ آور ہوں گی اور بڑا فضائی حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ جنوری 1991ء میں خلیجی جنگ میں اتحادی فضائیہ کے حملوں کو امریکا اور یورپ اس طرح استعمال کر رہے تھے جس سے خلیجی ممالک اور مشرقِ وسطیٰ کے کسی بھی ملک کے فوجی طاقت کے طور پر ابھرنے کا امکان نہ رہے۔ خلیجی جنگ سے قبل 12 جون 1990ء کو الجزائر کو امریکا کے فضائی حملے کی دھمکی بھی دی گئی۔ سی آئی اے کا کہنا تھا کہ ایٹم بردار الجزائر پورے خطے میں طاقت کا توازن تبدیل کر دے گا۔ اگر یہ صلاحیت "اسلامی فرنٹ" کے مذہبی جنونیوں کے ہاتھ آ گئی تو وہ اسے تباہ کن فوجی مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔ الجزائر کو برابر یہ خطرہ بھی لاحق رہا کہ اسرائیل نے جس طرح عراق کے ایٹمی پلانٹ پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا، اسی طرح الجزائر کے ایٹمی پروگرام پر بھی حملہ کر سکتا ہے، جب کہ فرانس کے فضائی حملے کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

متحدہ عرب امارات کے اخبارات نے اپنے اداریوں میں بار بار اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ چین سے حاصل کردہ پلانٹ پرامن مقاصد کے لیے ہے، لیکن مغربی میڈیا نے اس طرح کی یقین دہانی پر اعتبار نہیں کیا۔ اس دوران میں ایک واقعہ ہوا۔ برطانیہ کے فوجی اتاشی کو الجزائر کے ایٹمی پلانٹ کی تصویر اتارتے ہوئے پکڑ لیا گیا اور اسے فوری طور پر الجزائر چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔ قطر کے اخبار "الشرق" نے 30 اپریل 1991ء کی اشاعت میں لکھا کہ الجزائر کے ایٹمی سائنس دانوں کی تعداد 300 ہے اور انہیں سوویت یونین کی مدد اور رہنمائی حاصل ہے۔ اخبار نے یہ بھی لکھا کہ الجزائر نے 1989ء میں ارجنٹائن سے ایک ایٹمی ری ایکٹر حاصل کیا ہے اور اب اس کے پاس تین پلانٹ ہیں۔

دسمبر 1991ء میں پہلے مرحلے کے انتخابات میں "اسلامی فرنٹ" کی حکومت کی شاندار کامیابی کے بعد امریکی و یورپی میڈیا نے الجزائر کے ایٹمی پلانٹ پر اعتراضات میں مزید شدت پیدا کر دی اور کہا کہ اس پروگرام سے خطے کے امن کو لاحق خطرات "اسلامی فرنٹ" کی حکومت کے آنے سے بہت شدید ہو جائیں گے۔ جب فوج نے ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا تو کچھ ہی دنوں کے بعد مغربی میڈیا نے سرٹیفکیٹ جاری کر دیا کہ الجزائر ایٹم بم نہیں بنا رہا، اس کے پاس اس قسم کی صلاحیت نہیں ہے۔ (امریکا اور برطانیہ نے مل کر ایسا ہی ڈرامہ عراق میں رچایا تھا۔ میڈیا سے بھرپور پروپیگنڈا کرایا گیا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں، اس لیے

حملے کا بہانہ بنایا گیا اور اب برطانیہ نے اعتراف کرلیا ہے کہ عراق میں ایسے ہتھیار نہیں تھے)۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کے دوسرے ملکوں کی طرح الجزائر بھی مغربی طاقتوں کے زیر اثر جی رہے ہیں۔ مغربی طاقتیں مقامی فوج کے ذریعے اپنا تسلط جماتی ہیں۔ الجزائر بھی اپنے آئین کی رو سے ''الجمہوریہ'' ہے، لیکن فی الحقیقت بدترین فوجی آمریت والا مسلم ملک ہے۔ فوجی آمریت کے خلاف جب بھی الجزائر کے عوام کو موقع ملتا ہے، احتجاجی تحریک سر اٹھاتی ہے۔ تحریک گرم ہونے لگتی ہے تو فوج آگے بڑھ کر اسے ٹھنڈا کردیتی ہے اور یوں الجزائر کی تاریخ جمہوری برفیلی ٹھنڈک میں ٹھٹھری ہوئی کھڑی ہے۔ الجزائر کی سرزمین اسلام کے احیاء وتجدید کے لیے انتہائی موزوں ہے مگر احیاء وتجدید کے لیے آزادی اور خود مختاری کی فضا درکار ہوتی ہے، جو الجزائریوں کو اپنی مغرب نواز فوج کے باعث میسر نہیں۔

مراکش میں احیائے اسلام کی تحریک

شمالی افریقہ کے ملکوں میں مراکش پر فرانس نے سب سے آخر میں قبضہ کیا۔ یہ مولائے عبدالحفیظ کا دور تھا۔ جب 1912ء میں اسپین نے شمالی مراکش پر جو ''ریف'' کہلاتا ہے، اور فرانس نے باقی ملک پر اپنا قبضہ جمایا۔ مراکش میں اپنے 44 سالہ اقتدار میں فرانس جس پالیسی پر عمل پیرا رہا، وہ تیونس اور الجزائر میں اس کی پالیسی سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں بھی ملک کو ان خطوط پر چلایا گیا جن پر فرانس شمالی افریقہ کے دوسرے ملکوں میں عمل کررہا تھا۔ معاشی پالیسی کی طرح سماجی اور ثقافتی پالیسی بھی عرب کش اور مسلم کش تھی۔ عربی زبان اور اسلامی علوم کی درس و تدریس میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ فرانسیسی کلچر کی سرپرستی کی گئی اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو فرانسیسی کلچر کے مداح تھے۔ فرانسیسی حکومت نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ عربوں اور بربر باشندوں کی اکثریت مسلمان ہیں اور ان میں بیشتر کی مادری زبان عربی ہے، بربر بولی کو عربی کے مقابلے میں فروغ دینے کی کوشش کی۔ بلکہ بربر باشندوں کے لیے اسلامی قوانین کی جگہ بربروں کے رواجی قانون کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے 1930ء میں ایک حکم جاری کیا گیا۔ فرانسیسی حکومت کی اس سامراجی اور اسلام دشمن پالیسی کے خلاف ملک میں ردعمل شروع ہوا اور اس طرح مراکش میں قومی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

غازی عبدالکریم

مراکش میں غیر ملکی تسلط کے خلاف پہلی مزاحمتی تحریک شمالی مراکش میں ریف کے پہاڑی علاقے میں شروع ہوئی۔ اس جنگ آزادی کے ہیرو غازی محمد بن عبدالکریم خطابی (1882ء۔ 1963ء) تھے۔ ریف کا علاقہ 1912ء سے اسپین کے قبضے میں تھا۔ عبدالکریم ریف کے ایک پہاڑی گاؤں اجدیر میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے ہو کر انہوں نے فاس کی جامع قرویین میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے ذاتی طور پر ہسپانوی زبان کی تحصیل کی۔ 1914ء میں ملیلہ کے قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے۔ اس زمانے میں عبدالکریم اسپین کے اتنے خلاف

نہیں تھے، جتنے فرانس کے خلاف تھے۔ ان کی سرگرمیوں کے خلاف جب فرانس نے احتجاج کیا تو اسپینی حکام نے ان کو قید کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے آخر میں عبدالکریم جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پہاڑوں میں اپنے قبیلے کے درمیان پہنچنے کے بعد انہوں نے اسپین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنے بھائی احمد بن عبدالکریم کے ساتھ مل کر وطن کو آزاد کرانے کا عہد کیا۔ اسپین کی حکومت نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک بڑی فوج روانہ کی جسے 21 جولائی 1921ء کی درمیانی شب میں امیر عبدالکریم نے ایسی شکست دی کہ انیس ہزار ہسپانوی سپاہیوں میں سے سولہ ہزار سپاہی جنگ میں کام آئے۔

اس جنگ کے بعد ریف کا ایک بڑا حصہ مجاہدین کے قبضے میں آ گیا اور امیر عبدالکریم نے جمہوریہ ریف کے نام سے ایک آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس حکومت کے دو مقصد تھے۔ مراکش پر سے فرانس کی بالادستی کا خاتمہ اور ریف سے اسپین کا اخراج۔ امیر نے یورپ کی حکومتوں سے اچھے اور خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور ان سے جمہوریہ کے استحکام میں مدد لینا چاہی۔ کان کنی کی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ وزراء ایک مجلس کے سامنے جواب دہ تھے جو سرداران قبائل پر مشتمل تھی۔ امیر عبدالکریم نے یہ کوشش بھی کی کہ برطانیہ اور فرانس جمہوریہ ریف کو تسلیم کر لیں۔ اسپین سے لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا اور اگلے تین برسوں میں چند ساحلی شہروں کو چھوڑ کر پورا ریف امیر عبدالکریم کے قبضے میں آ گیا۔ ایک طاقتور یورپی ملک کے مقابلے میں ان شاندار کامیابیوں نے امیر عبدالکریم کا نام پوری دنیا میں روشن کر دیا، لیکن ان کی یہ روز افزوں کامیابی فرانس کے لیے تشویش کا باعث بن گئی اور فرانس کو مراکش میں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ اپریل 1925ء میں ریفی مجاہدین کا فرانسیسی فوجوں سے سرحدی تصادم بھی ہو گیا اور مجاہدین کے بعض مسلح دستے شہر فاس کے قریب بارہ میل پر پہنچ گئے۔ اس واقعے نے فرانس کو مداخلت کا موقع فراہم کر دیا۔ فرانس اور الجزائر سے کمک مراکش پہنچنا شروع ہو گئی۔ اکتوبر 1925ء میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار فرانسیسی فوج ریف کی سرحد پر پہنچ گئی۔ اس دوران میں اسپین نے بھی ریف کے ساحل پر اپنی فوجیں اتار دیں اور فرانس اور اسپین کی مشترکہ فوج نے، جس کی تعداد 2 لاکھ 80 ہزار تھی، ریف کی چھوٹی سی جمہوریہ پر حملہ بول دیا۔ جدید ترین اسلحہ سے لیس اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرنا مٹھی بھر مجاہدین کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ چند ماہ کی مزاحمت کے بعد امیر عبدالکریم نے 27 مئی 1926ء کو فرانس کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ میرکی جنگ آزادی اگرچہ ناکام ہو گئی، لیکن انہوں نے محدود وسائل کے ساتھ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کا جس شجاعت و دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، وہ عسکریت کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

فرانس نے امیر عبدالکریم کو جزیرہ ری یونین میں نظر بند کر دیا، جہاں انہوں نے پورے اکیس سال گزار دیئے۔ اس کے بعد مئی 1947ء میں جب ان کو فرانس منتقل کیا جا رہا تھا اور ان کا جہاز نہر سویز سے گزر رہا تھا تو وہ اچانک جہاز سے اتر کر مصر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ شاہ فاروق نے شمالی افریقہ کے رہنماؤں کی درخواست پر ان کو پناہ دے دی۔ قاہرہ میں امیر عبدالکریم کئی سال تک ''المغرب'' کے صدر دفتر کے، جو شمالی افریقہ کی مختلف قومی تحریکوں کا مرکز تھا، سربراہ رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پورے شمالی افریقہ کو فرانس کے تسلط سے آزاد ہوتے

دیکھ لیا، لیکن ان کا قیام قاہرہ ہی میں رہا۔ اور یہیں 6 فروری 1963ء کو ان کا انتقال ہوا۔

قومی سرگرمیوں کا آغاز

مراکش میں قومی سرگرمیوں کا آغاز نومبر 1925ء میں اس وقت سے ہوا جب مراکش کے عظیم رہنما علال الفاسی نے شہر فاس میں ایک انجمن قائم کی۔ اس کے بعد اگست 1926ء میں احمد بالافرج اور محمد حسن الوزانی نے شہر رباط میں دوسری انجمن قائم کی۔ فرانس کے استبدادی قوانین کی وجہ سے چونکہ سرگرمیوں میں کھل کر حصہ لینا ممکن نہیں تھا، اس لیے یہ انجمنیں خفیہ طریقے پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھتی تھیں۔ ان انجمنوں نے اپنے کام کا آغاز مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ کی انجمنوں کی حیثیت سے کیا۔ مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاحات ان کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ سیاسیات ابھی ان کے دائرہ عمل سے خارج تھی۔

جب مئی 1930ء میں بربروں میں رواجی قانون نافذ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اس حکم نے سارے ملک میں احتجاج کی آگ لگادی اور اس طرح دیکھتے دیکھتے قومی تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ امیر شکیب ارسلان نے، جو جنیوا میں مقیم تھے، اس فرمان کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ اس کے اثرات انڈونیشیا اور ہندوستان تک پہنچ گئے۔ فرانس پر الزام لگایا کہ وہ بربر باشندوں کو مرتد کرنا چاہتا ہے۔

چار سال بعد مئی 1934ء میں ''کتلۃ العمل الوطنی'' کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم ہوئی جو مراکش کی پہلی قوم پرست تنظیم تھی۔ ایک سال میں اس کے ارکان کی تعداد دو لاکھ ہوگئی۔ اس تنظیم کی طرف سے فاس اور پیرس سے اخبارات شائع کیے جاتے تھے۔ یہ جماعت زیادہ تر عوام کی شکایات حکومت تک پہنچاتی تھی۔ آزادی کا مطالبہ اس نے بھی نہیں کیا۔ بہر حال تنظیم کے قائد علال الفاسی نے مراکش کے سلطان محمد خامس (1927ء۔ 1961ء) سے ملاقات کی اور قومی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہنگاموں اور مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ اکتوبر 1937ء میں یہ جماعت توڑ دی گئی۔ علال الفاسی وسطی افریقہ کے علاقے گیبون جلاوطن کر دیئے گئے۔ احمد بالافرج کسی طرح چھپتے چھپاتے طنجہ پہنچ گئے جو اس وقت بین الاقوامی انتداب میں تھا۔

حزبِ استقلال اور تحریک آزادی

مراکش میں آزادی کی تحریک حقیقی معنوں میں 1943ء میں اس وقت شروع ہوئی جب احمد بالافرج نے دسمبر 1943ء میں بمقام طنجہ ''حزب استقلال'' قائم کی۔ علال الفاسی چونکہ جلاوطن تھے، اس لیے وہ اس جماعت کی تشکیل میں عملی حصہ نہیں لے سکے۔ لیکن بعد ازاں حزبِ استقلال کے سربراہ وہی منتخب ہوئے۔ اگلے سال حزب استقلال نے مکمل آزادی کے لیے پورے زور شور سے تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس مہم سے سلطان محمد خامس نے ہمدردی کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے فرانسیسی حکام بادشاہ کے خلاف ہو گئے اور ان کو برطرف کرنے کے لیے سازش کرنے لگے۔ اس مقصد کے تحت 1951ء میں بربر قبائل کو سلطان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب سلطان پھر بھی قابو میں نہیں آئے تو دو سال بعد ان کو پہلے کورسیکا اور اس کے بعد مڈغاسکر جلاوطن کر دیا۔ فرانس کے اس اقدام کے خلاف ملک بھر میں ہنگامے اور مظاہرے شروع ہوئے اور ریف کے باشندوں نے بغاوت کر دی۔

آخر کار فرانس کو عوام کے مطالبات کے آگے جھکنا پڑا اور سلطان کو مراکش آنے کی اجازت مل گئی، جہاں عوام نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ سلطان خامس کی واپسی حریت پسندوں کی زبردست کامیابی تھی۔ چنانچہ 2 مارچ 1956ء کو مراکش کی آزادی تسلیم کر لی گئی اور مراکش پر فرانس کی بالادستی کا خاتمہ ہو گیا، جو 1912ء سے قائم چلی آ رہی ہے۔ اگلے ماہ 7 اپریل کو اسپین بھی ریف سے دست بردار ہو گیا اور وہ حسب سابق شریفی مملکت کا ایک حصہ بن گیا۔ اسی سال اکتوبر میں طنجہ بین الاقوامی انتداب سے آزاد ہو گیا اور یہ ساحلی شہر مراکش کا گرمائی صدر مقام قرار پایا۔ آزادی کے بعد سلطان محمد خامس نے نمازِ جمعہ رباط میں موحدین کے دور میں تعمیر کی جانے والی نامکمل ''جامع حسن'' میں ادا کی۔

علال الفاسی

مراکش کی جنگ آزادی میں سب سے نمایاں نام علال الفاسی کا ہے جو سیاسی قائد ہونے کے علاوہ مراکش کے ایک عظیم مدبر، عالم اور ادیب بھی تھے۔ تحریک آزادی کے لیے قربانیاں دینے کے علاوہ مراکش میں احیائے اسلام کی تحریکات میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ جب انہوں نے فاس میں 1925ء میں ایک خفیہ انجمن قائم کی تھی تو اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس کے علاوہ وہ عین جوانی میں فاس کی جامع قرویین میں استاد ہو گئے۔ اکتوبر 1937ء میں جب مراکش میں ہنگامے ہوئے تو ان کو فرانسیسی حکومت نے گرفتار کر کے گیبون جلا وطن کر دیا اور نو سال کے بعد 1946ء میں ان کو مراکش واپس آنے کی اجازت ملی، لیکن ان کو جلد ہی دوبارہ جلا وطن کر دیا گیا۔ اب علال الفاسی نے بیرونی ممالک میں مراکش کی آزادی کے لیے کام کیا۔ 1947ء میں طنجہ میں حزب استقلال کی شاخ قائم کی۔ قاہرہ میں حزب استقلال کا جو دفتر قائم کیا، اس کے سربراہ علال الفاسی تھے۔ 1952ء میں انہوں نے یورپ، امریکا اور لاطینی امریکا کے ممالک کا دورہ کیا اور وطن کی آزادی کے لیے عالمی رائے عامہ ہموار کی۔

علال الفاسی اس علمی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو عرب ممالک میں ''سلفی'' کہلاتے ہیں اور جن کا مقصد ہر مسئلے کو کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرنا ہوتا ہے۔ علال الفاسی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں شمالی افریقہ کی سیاسی تاریخ پر ہیں۔ ''نقد الذاتی'' ان کی خود نوشت سوانح ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اہل مراکش کی قومی و سیاسی زندگی کو مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب اور معاشرے کی علیحدگی اور سیکولر ریاست کا تصور مسیحیت اور یورپی فکر کی پیداوار ہے۔ ایک اسلامی معاشرے میں نہ تو اس کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ایک اسلامی ریاست صرف مذہب ہی پر مبنی ہو سکتی ہے''۔

علال الفاسی نے ایک اور مقام پر لکھا ہے:

> ''اسلام عقل اور آزادی پر زور دیتا ہے اور ترقی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام اللہ اور بندے کے درمیان تمام واسطوں کی نفی کرتا ہے، لہٰذا اسلام کو مراکش میں ایک صحیح قومی تعلیم اور ایک جدید قومی نظام کی بنیاد ہونا چاہیے۔ اسلام معاشی زندگی کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے

اور اگر اس مقصد کے تحت اسلامی تعلیمات کو عملی شکل دی جائے تو سماجی انصاف کا ایک ایسا نظام قائم کیا جاسکتا ہے جو انسان کو معاشی غلامی سے نجات دلا سکے"۔

اسلام اور مغرب کی کشمکش

حصولِ آزادی سے پہلے "حزب استقلال" مراکش کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اور اس کی یہ حیثیت آزادی کے بعد بھی کئی سال تک قائم رہی اور حکومت میں اس کو برابر نمائندگی ملتی رہی، لیکن جنوری 1959ء میں جماعت اندرونی اختلافات کا شکار ہوگئی۔ حزب استقلال میں ابتدا ہی سے دو گروپ موجود تھے۔ ایک وہ گروپ جس کے رہنما علال الفاسی تھے۔ یہ گروپ عرب اور اسلامی تہذیب کے احیاء کا علم بردار تھا اور مراکش میں مغربیت کے ثقافتی اثرات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس گروپ کا تعلق سلفی تحریک سے تھا اور وہ مراکش میں احیاء و تجدید کا کام اسلام کے بنیادی اصولوں کے تحت کرنا چاہتا تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسرا گروپ، جس کے قائد احمد بالافرج اور حسن الوزانی تھے، مغربی تہذیب کے زیر اثر تھا۔ پہلے گروپ میں جامع قرویین کے طلبہ شامل تھے اور دوسرے گروپ میں وہ لوگ تھے جنہوں نے مغربی سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی تھی اور فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ علال الفاسی کی زبردست شخصیت ان دونوں گروپوں کو ایک مدت تک ایک ساتھ رکھنے میں کامیاب رہی، لیکن ان کے یہ اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مغرب پرستوں کا ایک گروپ جو اشتراکیت کی طرف مائل تھا، جنوری 1959ء میں حزب استقلال سے الگ ہوگیا، اور "ہردل عزیز قوتوں کی قومی یونین (U.N.F.P) کے نام سے اس نے ایک علیحدہ جماعت بنالی۔ مہدی بن برقہ اس نئی جماعت کے رہنما تھے۔ اس اختلاف وافتراق نے حزب استقلال کو کمزور کر دیا اور جب 1963ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو نوتشکیل سرکاری پارٹی F.D.I.C نے 69، حزب استقلال نے 41 اور U.N.F.P نے 28 نشستیں حاصل کیں۔ گویا اس کے بعد حزب استقلال حزب اختلاف بن گئی۔

مراکش اور موریطانیہ میں اسلامی تحریک

دوسرے نو آزاد ملکوں کی طرح آزادی کے بعد مراکش کا ایک اہم مسئلہ آئین کی تیاری تھا۔ اسلامی نظام کے علم بردار جن میں جامع قرویین کے اساتذہ پیش پیش تھے، نئے آئین کی تشکیل اسلامی اصولوں کے تحت کرنا چاہتے تھے۔ ہر اسلامی ملک کی طرح مراکش میں بھی اس مطالبے کو عوام کی تائید حاصل تھی۔ چنانچہ جب مراکش کے ایک رہنما اور ادیب محمد مکی ناصری نے 1957ء میں سلطان محمد خامس کو اسلامی آئین و نظم و ریاست کے متعلق عصر حاضر کے جید و معتبر علماء اور دانشوروں کی تصانیف پیش کیں تو سلطان نے وعدہ کیا کہ "میں ان شاء اللہ ملک کی گاڑی کو اسلام کے مطابق چلاؤں گا"۔ اس تحریک میں الجزائری عالم محمد بشیر ابراہیمی اور مراکشی عالم عبداللہ کنون نمایاں حصہ لے رہے تھے۔

فروری 1961ء میں سلطان محمد خامس کا انتقال ہو گیا۔ نیا آئین اس کے بعد جلد ہی مکمل ہو گیا اور شاہ حسن دوم نے جو اپنے والد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے تھے، دسمبر 1962ء میں نیا دستور نافذ کر دیا۔ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں میں اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے یہ دستور بادشاہ نے خود تیار کیا اور اس پر استصواب کرایا۔ دستور کے حق میں 37 لاکھ سے زیادہ ووٹ آئے اور مخالفت میں صرف ایک لاکھ تیرہ ہزار ووٹ آئے۔ ملک کی تمام دینی جماعتوں، خواتین کی انجمنوں، طلبہ کی یونینوں اور صنعت حرفت سے تعلق رکھنے والی جماعتوں نے دستور کے حق میں رائے دی۔ چونکہ اس دستور کا جھکاؤ زیادہ تر اسلامی اصول وقوانین کی طرف تھا، اس لیے کمیونسٹوں اور بائیں بازو والے کمیونسٹ عناصر نے مخالفت میں رائے دی۔ دستور کی کامیابی کا سہرا بڑی حد تک استقلال پارٹی کے رہنما علال الفاسی کے سر ہے، جنھوں نے دستور کو اسلامی خطوط پر مدوّن کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔

اس نئے دستور کی رُو سے مراکش کا سرکاری مذہب اسلام اور قومی وسرکاری زبان عربی قرار دی گئی تھی۔ دستور کی ایک شق میں کہا گیا تھا کہ دین اسلام کی حمایت حکمران کا فرض ہوگا۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا گیا اور نظام حکومت پارلیمانی قرار دیا گیا تھا۔ اس دستور میں اگرچہ یہ واضح نہیں کیا گیا تھا کہ دستور سازی کا ماخذ کتاب وسنت ہوں گے یا نہیں، لیکن اسلام پسند جماعتوں نے دستور کی حمایت اس بنیاد پر کی کہ دستور میں ترمیم کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے، اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے دستور میں جو خامیاں رہ گئی تھیں، ان کو دور کیا جا سکتا تھا، لیکن مراکش کا یہ دستور زیادہ مدت نہیں چلا۔ شاہی اختیارات اور دوسرے مسائل پر خصوصاً دستور میں اسلامی دفعات شامل کرنے کے مسئلے پر بادشاہ سے سیاسی جماعتوں کا اختلاف بڑھتا گیا۔ مراکش کے سب سے بڑے شہر دار البیضا (کاسابلانکا) میں وسیع پیمانے پر ہنگامے ہوئے، جس کے نتیجے میں 1965ء میں شاہ حسن دوم نے ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا اور مراکش کا دستور معطل کر دیا۔

پانچ سال بعد مارچ 1972ء میں استصواب رائے حاصل کرنے کے بعد شاہ حسن نے دوسرا آئین نافذ کیا، جس کے بعد بادشاہ نے استقلال پارٹی اور یونائیٹڈ فرنٹ کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی، لیکن ان پارٹیوں نے حکومت میں شرکت کے لیے چند بنیادی شرائط پیش کیں، جن کو شاہ حسن نے منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد مراکش کی سیاسی صورت یہ رہی کہ ملک میں آئینی بادشاہت کا نظام قائم رہا اور بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک میں پارلیمانی نظام بھی موجود رہا۔

جولائی 1971ء میں فوج کے ایک حصے نے، جو بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا، بادشاہت ختم کرنا چاہی لیکن وزیر دفاع اور کمانڈر ان چیف جنرل محمد افکیر نے فوجی بغاوت کچل دی۔ 1972ء میں شاہ حسین پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی گئی۔ اسے اپنی ناکامی سمجھ کر جنرل محمد افکیر نے خودکشی کر لی اور فوج کی کمان بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ 1973ء میں بھی ملک میں دہشت پسندانہ سرگرمیاں جاری رہیں، جن میں افسوس کہ پڑوسی اسلامی ملک لیبیا کے صدر قذافی کا ہاتھ تھا اور وہ مراکش کے بائیں بازو کے عناصر سے ساز باز کر کے حکومت کا تختہ پلٹنا چاہتے تھے،

لیکن ایسی تمام اندرونی و بیرونی سازشوں کو کچلنے میں شاہ حسن دوم کامیاب رہے۔ ان کی کامیابی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہ حسن کو ملک میں خاص مقبولیت حاصل تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ملک میں کوئی مضبوط حزب اختلاف موجود نہیں تھی، اور جتنی بھی مخالف جماعتیں تھیں، ان میں آپس میں اتفاق رائے نہ تھا، بلکہ ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتی تھیں۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ شاہ حسن خود بھی مراکشی عوام کے جذبات اور ان کی نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی ایسے اقدامات کیے جن سے ان کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوا، مثلاً:

1۔ ستمبر 1969ء میں رباط میں پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس (او آئی سی) منعقد کی، جو بیت المقدس کے ایک حصے کو نذر آتش کرنے کے سنگین اقدام کے ضمن میں اسرائیل کے خلاف منعقد کی گئی تھی۔ اس میں تقریباً تمام اسلامی ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی تھی۔ صدر مملکت جنرل محمد یحییٰ خان نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ اس موقع پر فاس میں ایک تعلیمی کانفرنس بھی شاہ حسن نے طلب کی جس میں دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ماہرین تعلیم کو مدعو کیا گیا تھا۔

2۔ 1973ء میں شاہ حسن نے فرانسیسی اور ہسپانوی باشندوں کی پانچ لاکھ ایکڑ زمین قومی ملکیت میں لے کر کسانوں میں مفت تقسیم کر دی۔ سمندر میں ماہی گیری کی حدود بارہ میل سے بڑھا کر ستر میل کر دی۔

3۔ اکتوبر 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کے خلاف فوجی دستے بھیج کر جنگ میں عملی حصہ لیا۔

4۔ جولائی 1974ء کے بعد سابق ہسپانوی صحرا کو حاصل کرنے کے لیے شاہ حسن نے جو کوششیں کیں، ان میں بھی ان کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ملک کی حزب اختلاف کی جماعتوں نے ان کوششوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ملک میں جو تھوڑی بہت حزب اختلاف موجود تھی، وہ بھی شاہ حسن کے ان اقدامات سے ختم ہو گئی۔

ہسپانوی صحرا کا الحاق

ہسپانوی صحرا مراکش کے جنوب میں ایک لاکھ مربع میل رقبے پر مشتمل ایک وسیع علاقہ ہے، جس کی آبادی اس وقت ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ مراکش جس طرح موریطانیہ پر اپنا حق ملکیت سمجھتا تھا، اسی طرح ہسپانوی صحرا کو بھی مراکش ہی کا ایک حصہ تصور کرتا تھا، جس پر ہسپانیہ نے 1978ء میں ایک لاکھ مسلح رضا کاروں کو لے کر، ہسپانوی صحرا کی سرحد تک مارچ کیا، جس کے نتیجے میں 14 نومبر کو مراکش، موریطانیہ اور اسپین کے درمیان سہ فریقی سمجھوتہ ہو گیا۔ جب اسپین نے اس علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں تو مراکش نے اس سمجھوتے کے تحت ہسپانوی صحرا کے دو تہائی حصے پر قبضہ کر لیا اور ایک تہائی حصہ موریطانیہ نے اپنے ملک میں شامل کر لیا، لیکن صحرا کے چھاپہ ماروں نے جو کمیونسٹ تنظیم پولیساریو کے تحت کام کر رہے تھے، اس سمجھوتے کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ صحرا کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت دیکھنا چاہتے تھے۔ الجزائر نے بھی اس سمجھوتے کو تسلیم نہیں کیا اور چھاپہ ماروں کی فوجی امداد شروع کر دی۔ کئی دوسرے کمیونسٹ ملکوں کی طرف سے بھی چھاپہ ماروں کو مدد ملنے لگی۔ موریطانیہ کی حکومت ان چھاپہ ماروں کا زیادہ عرصہ مقابلہ نہ کر سکی اور وہ اگست 1979ء میں صحرا کے علاقے سے پولیساریو کے حق میں دست بردار ہو گئی۔

مراکش نے اس کے بعد موریطانیہ کے حصے پر بھی قبضہ کر لیا اور اس طرح پورے ہسپانوی صحرا ء مراکش میں ضم کر لیا اور اس کو المغرب والجنوبی کا نام دیا۔

مراکش میں حصول آزادی کے بعد پرائمری تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ ملک میں دو یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے کئی ادارے ہیں۔ شہر فاس میں ''جامع قرویین'' کے نام سے اسلامی تعلیمات کا ایک قدیم مدرسہ ہے جو شمالی افریقہ کا قدیم اور عظیم مدرسہ ہے۔ مراکش عربی کتابوں کی نشر و اشاعت کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز ہے، یہاں کے کتب خانے (لائبریریاں) بھی اپنے نوادر مخطوطات کی کثرت و قدامت کی وجہ سے بہت ممتاز ہے۔

مراکش کے علماء میں محمد الفاسی (پیدائش 1908ء) بہت محترم و ممتاز ہیں۔ وہ جمعیت علمائے مراکش کے صدر ہیں۔ جامع قرویین کے شیخ اور محمد خامس یونیورسٹی (رباط) کے ریکٹر ہیں۔ وہ عربی اور فرانسیسی کے مصنف ہیں اور ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مراکش کی دوسری اہم علمی شخصیت عبداللہ کنون کی ہے۔ وہ عربی ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں اور اسلامی فقہ، قانون اور تاریخ اسلام کے فاضل ہیں۔ وہ تطوان کے ''معہد مولائے حسن'' (ادارۂ تحقیقات) کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ ممتاز دینی جریدے ''لسان الدین'' کے کافی عرصے تک مدیر رہے۔ انہوں نے شمالی افریقہ کی علمی و ادبی اور دینی تاریخ پر تحقیق کی ہے اور اس موضوع پر ان کی کتابیں مقبول عام ہیں۔

مراکش کی ایک ممتاز علمی اور دینی شخصیت عبدالرحیم غنیمہ کی ہے۔ اسلام اور جدید مغربی سائنسی علوم دونوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ اسلامی فقہ اور تاریخ پر ان کی کئی تحقیقی کتابیں مصر اور مراکش میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی سب سے مقبول و مشہور کتاب ''الجامعات الاسلامیہ الکبریٰ'' (بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیاں) ہیں۔ اپنی تالیف میں انہوں نے اسلام کے دور اول سے لے کر عہد حاضر تک ملت اسلامی کی تعلیمی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ تطوان کے ادارۂ تحقیقات نے اس کتاب پر مصنف کو ایوارڈ دیا تھا۔

مراکش میں بھی دوسرے مسلم ممالک کی طرح آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی احیائے اسلام کی تحریک جاری ہے، لیکن ایسے ملک میں جہاں ایسی بادشاہت ہو جو مغربی امداد کی مرہون منت ہو، تجدیدی و احیائی تحریک کی کامیابی ابھی انتظار کی حالت میں ہے۔ ؎

موریطانیہ میں اسلامی تحریک

مغربی افریقہ میں فرانس سے آزاد ہونے والے ملکوں میں موریطانیہ واحد ملک ہے جس نے اسلامی جمہوریہ (ری پبلک) ہونے کا اعلان کیا ہے۔ ورنہ باقی تمام اسلامی ملکوں میں مذہب و سیاست کو یورپی ملکوں کی طرح الگ کر دیا گیا ہے اور تمام حکومتیں سیکولر ہیں۔ موریطانیہ کا اسلامی جمہوریہ قرار دیا جانا وہاں کے عوام کے دباؤ کا اثر ہے۔ عوامی دباؤ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے حکومت سے برابر مطالبہ جاری رہتا ہے کہ زندگی کے تمام امور و معاملات میں حکومت اسلامی قانون نافذ کرے۔ جہاں تک عائلی معاملات کا تعلق ہے، وہاں پہلے ہی اسلامی قانون نافذ ہے۔ دیوانی اور فوجداری قوانین میں اسلامی شقیں بڑھائی گئی ہیں۔

موریطانیہ کی تقریباً پوری آبادی مسلمان ہے۔ آبادی تیس لاکھ ہے یعنی لاہور سے بھی کم۔ مساجد کی کثرت ہے۔ لوگ عام طور پر نماز اور روزے کے پابند ہیں۔ دینی مدرسے بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ سرکاری زبان عربی ہے۔ موریطانیہ کے مسلمانوں کی دینی حمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر موریطانیہ نے امریکا سے سفارتی تعلقات ختم کر لیے تھے۔ رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام دارالحکومت نواکشوٹ میں مبلغین اور اماموں کی تربیت کے لیے ایک مرکز قائم کیا گیا، جو عمدگی سے کام کر رہا ہے۔

موریطانیہ افریقہ کا آخری ملک ہے جس نے فرانس سے آزادی حاصل کی۔ یہ المغرب العربی کا چوتھا ملک ہے جس پر دنیائے عرب کی مغربی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ موریطانیہ مراکش کے جنوب میں واقع ہے اور پورا کا پورا ملک صحرائے اعظم کا حصہ ہے۔ یہاں کی تہذیب وثقافت پر مراکش کے اثرات گہرے ہیں، اور سولھویں صدی کے بعد سے یعنی اس وقت سے جب مراکش کے منصور الذہبی نے مالی پر قبضہ کیا تھا، موریطانیہ پر مراکش کی سیاسی بالادستی عرصۂ دراز تک قائم رہی۔ اس سے قبل مرابطین اور موحدین کے عہد میں بھی یہ خطہ مراکش کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب فرانس نے مغربی افریقہ کے ملکوں پر قبضہ کرنے کی عسکری مہم شروع کی تو موریطانیہ بھی فرانس کی جارحانہ کارروائیوں سے نہ بچ سکا اور فرانس نے آہستہ آہستہ پورے ملک پر (1903ء میں) قبضہ کر لیا۔

موریطانیہ کی تحریک آزادی

جب موریطانیہ میں آزادی کی تحریک چلی تو موریطانیہ کی سیاسی جماعت ''نہضۃ الوطنیہ'' مراکش کے ساتھ الحاق کی حامی تھی لیکن حکومت فرانس نے اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ دوسری جماعت ''یونین نیشنل'' جو جنوب کے نیگرو باشندوں کی ترجمانی کرتی تھی، مالی کے ساتھ وفاق بنانے کی حامی تھی۔ اس جماعت نے اکتوبر 1960ء میں ایک دوسری جماعت پی آر ایم سے، جس کی قیادت مختار الدادہ کر رہے تھے، معاہدہ کر کے متحد محاذ بنا لیا۔ فرانس کے نئے آئین کے بعد موریطانیہ نے 27 نومبر 1958ء کو اسلامی جمہوریہ بننے کا اعلان کر دیا تھا۔

1959ء میں عام انتخابات ہوئے جن میں حکمران پارٹی نے تمام نشستوں پر قبضہ کر لیا اور محمد مختار الدادہ وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد نئی حکومت نے فرانس سے آزادی کی درخواست کی، جسے منظور کر لیا گیا اور 25 نومبر 1960ء کو موریطانیہ نو آزاد ممالک کی صف میں شامل ہو گیا، لیکن عرب ملکوں میں سوائے تیونس کے، کسی نے موریطانیہ کی آزادی کو تسلیم نہیں کیا۔ عرب ممالک مراکش کے اس دعوے کے حامی تھے کہ موریطانیہ جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ جغرافیائی، تاریخی، نسلی اور لسانی لحاظ سے مراکش کا ایک حصہ ہے۔ یہ اختلاف 1970ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد 9 جون 1970ء کو مراکش اور موریطانیہ نے دوستی کے معاہدے پر دستخط کیے اور مراکش نے موریطانیہ کو جداگانہ اور آزاد ملک تسلیم کر لیا اور اپنے دعوے سے دست بردار ہو گیا۔ دونوں ملکوں نے یہ بھی طے کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جو ہسپانوی صحرا ہے، اسے سپین سے آزاد کرانے میں دونوں ملک تعاون کریں گے۔ مراکش سے اس تصفیے کے بعد 1973ء میں موریطانیہ کو عرب لیگ اور بعد ازاں او آئی سی کا رکن بنا لیا گیا۔

آزادی سے پہلے موریطانیہ کا صدر مقام سینٹ لوئی تھا جواب سینیگال میں ہے۔ 1957ء میں دارالحکومت نواکشوت (نواک شوط) منتقل کر دیا۔ آزادی سے پہلے اس شہر کی آبادی صرف پانچ ہزار تھی، اب دو لاکھ سے زائد ہے۔

سینیگال میں اسلام

شمالی افریقہ میں مصر، سوڈان، صومالیہ اور مغرب میں لیبیا، تیونس اور الجزائر اور مراکش ایسے ملک ہیں جہاں مغربی استعمار سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اسلام کی اصل دینی روح، احکام شریعت اور تہذیبی اقدار کے احیاء کے لیے باضابطہ تحریکیں زور شور سے چلتی رہی ہیں لیکن مغربی افریقہ کے سیاہ فام ملکوں میں اگرچہ اسلام کی روشنی برعظیم پاک و ہند کے ساتھ ساتھ آگئی تھی، لیکن وہاں مظاہر پرستی کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں کہ وہاں کے مسلمانوں میں عبادات کے سوا، معاملات اور بالخصوص حکومتی سطح کے امور میں اسلام رائج نہیں ہو سکا۔ آزادی کے بعد بھی وہاں سیکولر نظام اختیار کیا گیا اور مذہب کو ریاست سے الگ رکھا گیا ہے۔ سینیگال، مالی، گیمبیا، نائجر، چاڈ، ان ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، جس کی وجہ سے یہ اسلامی سربراہی کانفرنس کی تنظیم کے رکن ہیں۔

مغربی افریقہ کے نیگرو علاقوں میں سب سے پہلے سینیگال کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں مرابطین کے مشہور مبلغ اور رہنما عبداللہ بن یٰسین نے 1050ء کے قریب دریائے سینیگال کے ایک جزیرے میں اپنا تبلیغی مرکز قائم کیا تھا۔ سب سے پہلے سینیگالی قبیلے تکرور کے حکمران نے اسلام قبول کیا اور 1076ء میں نما تا کی مظاہر پرست (ملحد) حکومت نے مرابطین کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہاں کے باشندوں کی کثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت اس ملک کی آبادی ایک کروڑ پچانوے لاکھ ہے، جس میں سے 94 فیصد مسلمان، ایک فیصد لا مذہب اور 5 فیصد عیسائی ہیں۔ دارالحکومت ڈاکار ہے، جس کی آبادی 25 لاکھ کے قریب ہے۔

سینیگال زمانہ قدیم میں زیادہ تر ان بڑی سلطنتوں کے زیر اثر رہا ہے جو دریائے نائجر کی وادی میں قائم ہوتی رہی تھیں۔ چنانچہ نما تا، مالی اور سونگھائی تمام سلطنتوں کی سینگال پر کسی نہ کسی شکل میں بالادستی قائم رہ چکی تھی۔ 1559ء میں ایک مقامی قبیلہ ''فولا'' جو مظاہر پرست تھا، سنیگال پر قابض ہو گیا اور 1706ء تک سنیگال پر اس غیر مسلم قبیلے کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد فولا قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔

یورپ کی قوموں میں سب سے پہلے پرتگالی 1444ء میں سنیگال پہنچے۔ انہوں نے مقامی باشندوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اور غلاموں کی خرید و فروخت کو وسیع پیمانے پر رواج دیا۔ دو سو سال بعد 1645ء میں فرانسیسی آئے اور انہوں نے دریائے سنیگال کے دہانے پر اس جگہ ایک کارخانہ قائم کیا، جہاں بعد میں سینٹ لوئی کا شہر آباد ہوا۔

حاجی عمر تجانی

یورپ کی دوسری قوموں کی طرح فرانسیسیوں نے بھی تجارت کی آڑ میں سنیگال کے داخلی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور آہستہ آہستہ اندرون ملک قدم بڑھانا شروع کر دیا۔ سنیگال میں جن لوگوں نے فرانسیسیوں کا

جم کر مقابلہ کیا، ان میں حاجی عمر تجانی (1797ء۔1865ء) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ حاجی عمر تجانی سینگال کے ضلع فوتو تورو کے رہنے والے تھے اوران کا تعلق قبیلہ تکرور سے تھا۔ 1820ء میں انہوں نے حج کیا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں چند سال رہ کر دینی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ حجاز سے واپس آئے تو فرانسیسی سینگال کے ساحلی علاقے پر قبضہ جما چکے تھے اوراب ملک کے اندرونی حصوں میں بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حاجی عمر تجانی نے فرانسیسیوں کے خلاف افریقی باشندوں کو منظم کیا۔ ہزاروں مظاہر پرست، لا مذہب ان کی تبلیغی کوششوں سے اسلام لائے اور 1838ء میں وہ اس قابل ہوگئے کہ مغربی حملہ آوروں کا قوت سے مقابلہ کرسکیں۔ چنانچہ 1848ء میں انہوں نے شمالی نائجر کے علاقے میں قصبہ مانڈنگ پر اور 1854ء میں کارٹا پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال فرانس کا مقررہ نیا گورنر جنرل فید ہرب (Faid Harbe)، جو فرانسیسی نوآبادیوں کا نپولین کہلاتا ہے، سینگال آیا۔ اس نے حاجی عمر تجانی کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ کے مقام پر ایک قلعہ بنوایا (مغربی افریقہ میں شہر کا وہ حصہ، جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی ہے، عام طور پر مدینہ کہلاتا ہے، لیکن سینگال کا یہ شہر مدینہ ایک مستقل شہر ہے)

حاجی عمر تجانی نے 1857ء میں قلعہ مدینہ کا محاصرہ کرلیا جو ایک سو دن تک جاری رہا۔ اس دوران میں فید ہرب نئی امدادی فوج لے کر پہنچ گیا اور حاجی عمر کو پسپا ہونا پڑا۔ حاجی عمر فرانسیسیوں کے ساتھ کئی لڑائیوں کے بعد 1865ء میں، جب وہ فولانیوں کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے، شہید ہوگئے۔ اس وقت فرانسیسی پورے سینگال پر قابض ہو چکے تھے۔ آزادی سے قبل سینگال فرانسیسی مغربی افریقہ کے گورنر جنرل کی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔ اس علاقے کے دوار ہان کو فرانس کی اسمبلی میں دو نشستیں حاصل تھیں۔

حصولِ آزادی

فرانسیسی دورِ استعمار میں مغربی افریقہ کے دوسرے علاقوں کی طرح سینگال بھی آئینی اصلاحات کے مختلف ادوار سے گزرا۔ 28 ستمبر 1958ء کے استصواب رائے میں سینگال نے نئے فرانسیسی آئین کے حق میں رائے دی اور اس طرح کامل آزادی کے مقابلے میں، فرانسیسی اتحاد میں رہ کر اندرونی خودمختاری کو ترجیح دی۔ اسی سال 25 نومبر کو سینگال خودمختار جمہوریہ (ری پبلک) بن گیا۔ 22 مارچ 1959ء کو اسمبلی کے انتخابات ہوئے، جن میں یونین پروگیسو سینگال (U.P.S) نے اسمبلی کی تمام نشستوں پر قبضہ کرلیا۔ محمد ضیا نئی جمہوریہ کے پہلے وزیراعظم منتخب ہوئے۔ 4 اپریل 1959ء کو جمہوریہ سینگال اور جمہوریہ مالی نے، جو اس وقت جمہوریہ سوڈان کہلاتا تھا، مل کر ''مالی فیڈریشن'' قائم کی جو زیادہ دن نہ چل سکی۔ مغربی سوڈان کے رہنما اشتراکیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اوران کے یہاں ایک سیاسی پارٹی سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ سوڈانی رہنما ایک مضبوط مرکزی حکومت کے حامی تھے۔ سینگال کے رہنماؤں کا موقف اس سے قطعی مختلف تھا۔ ان کو نہ تو ایک جماعتی نظام سے دلچسپی تھی اور نہ مضبوط مرکز سے۔ وہ ایک ایسا وفاقی نظام چاہتے تھے جس میں بعد میں مغربی افریقہ کے دوسرے ملک بھی شامل ہوسکیں۔

یہ سیاسی اختلافات نہ صرف سینگال اور سوڈان کے اتحاد میں حائل ہوئے، بلکہ ان کی وجہ سے مغربی افریقہ کے دوسرے علاقوں میں بھی کوئی موثر اتحاد قائم نہ ہو سکا، حالانکہ مغربی افریقہ میں ایک وسیع تر ریاست بنانے متحدہ

افریقہ کی تشکیل کا جذبہ عام ہے اور آزادی کے فوراً بعد سوڈان اور سینگال کے علاوہ ناجر، اپر وولٹا (موجودہ برکینا فاسو) اور دہومی تک نے ''مالی فیڈریشن'' میں شامل ہونے کی خواہش کی تھی۔ سینگال اور سوڈان کے رہنماؤں کے باہمی اختلافات نے جلد ہی نازک صورتِ حال اختیار کر لی۔ 19 اگست 1960ء کو سوڈان کے صدر مودیبو کیتا (Modibokeita) نے، جو اب مالی فیڈریشن کے صدر ہو گئے تھے، پورے فیڈریشن میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا اور نائب صدر محمد ضیا کو، جو وزیر دفاع بھی تھے، ان کے دفاعی وزارت کے اختیارات سے محروم کر دیا۔ مالی کے اس آمرانہ طرز کے خلاف دوسرے ہی دن یعنی 20 اگست کو سینگال نے مالی فیڈریشن سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ سینگال کے فوجی دستوں نے فیڈریشن کے دارالحکومت ڈاکار میں تمام سرکاری عمارتوں کو گھیرے میں لے لیا اور صدر مودیبو کیتا اور دوسرے سوڈانی حکام کو ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا۔ دو دن بعد اگرچہ ان سب کو رہا کر دیا گیا، لیکن 26 اگست کو سینگال اسمبلی نے اپنے لیے علیحدہ آئین منظور کر لیا۔ 11 ستمبر 1960ء کو فرانسیسی حکومت نے بھی سینگال کو ایک جداگانہ مملکت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور اس طرح فیڈریشن پانچ ماہ قائم رہ کر ختم ہو گئی۔

نئے سیاسی رجحانات

سینگال کے رہنماؤں میں محمد ضیاء اور لیوپولڈ سنگور سب سے نمایاں ہیں۔ محمد ضیاء کا شمار ملک کے قابل ترین رہنما میں ہوتا ہے۔ وہ 1910ء میں پیدا ہوئے۔ سینٹ لوئی اور ڈاکار میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد معلم اور صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ آزادی سے قبل سینگال کی اسمبلی کے رکن تھے۔ 1956ء میں وہ فرانس کی قومی اسمبلی میں سینگال کی طرف سے رکن منتخب ہوئے۔ آزادی کے بعد وہ پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ پھر مالی فیڈریشن میں نائب صدر اور وزیر دفاع مامور ہوئے۔ ستمبر 1960ء میں جب سینگال کی نئی حکومت بنی تو وہ وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ محمد ضیاء، مغربی افریقہ کی تہذیب کے احیاء کے زبردست حامی ہیں۔ وہ بہت اچھے مقرر اور ماہر معاشیات اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

لیوپولڈ سدار سنگور کیتھولک عیسائی ہیں۔ 1906ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار افریقہ کے اعتدال پسند سوشلسٹ رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ فرانسیسی ثقافت کے مداح ہیں اور فرانسیسی زبان کے اچھے شاعر بھی ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جس کی 90 فیصد سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہو، ایک عیسائی کا صدر ہونا تعجب کی بات ہے، لیکن افریقہ کے نو آزاد ملکوں میں اس کی مثالیں عام ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک سیکولر طرز حکومت کے حامی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمان عام طور پر تعلیم، سیاست اور اقتصاد و تجارت کے شعبوں میں عیسائیوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں، جس کی وجہ سے افریقی ملکوں کی قیادت عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔

مالی فیڈریشن کے خاتمے کے بعد صدر سنگور کو صدارت کے عہدے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کی مسلم نواز پالیسی ہے۔ انہوں نے فرانسیسی دور میں بھی مغربی افریقہ کے مدارس میں عربی زبان اور دینی تعلیم کو داخل نصاب کرنے کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ صدر بننے کے بعد انہوں نے عربی زبان اور دینی اسلامی تعلیم کے فروغ کے لیے کئی اقدامات کیے۔ ان کی مقبولیت کا ثبوت ان

کی وہ کامیابی ہے جو ن کو وزیراعظم محمد ضیاء کے مقابلے میں ہوئی۔ دسمبر 1962ء میں انہوں نے نہ صرف محمد ضیاء کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کردیا، بلکہ 1963ء میں نیا آئین بنا کر صدارتی طرز حکومت نافذ کردیا، جس کے تحت وزارت عظمیٰ کے عہدے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مارچ 1966ء میں صدر سنگور پر قاتلانہ حملہ ہوا، جس کے بعد انہوں نے تمام مخالف سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ صرف سرکاری جماعت ''پروگریسو یونین'' قائم رہی، اس لیے 1968ء کے انتخابات اس نے کسی مقابلے کے بغیر جیت لیے۔ 1968ء اور 1969ء میں طلبہ، مزدوروں اور کسانوں نے ہڑتالیں کیں، جن کو سختی سے دبا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1970ء میں آئین میں ترمیم کر کے وزیراعظم کا عہدہ بحال کردیا گیا اور ایک مسلمان عبدو ضیوف Abdou Diouf کو وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ جنوری 1973ء کے انتخابات میں صدر سنگور پھر بلا مقابلہ منتخب ہوگئے اور ان کی پارٹی نے قومی اسمبلی کی تمام نشستیں حاصل کرلیں۔

1974ء میں تمام سیاسی قیدی رہا کردیے گئے۔ محمد ضیاء بھی رہا کردیے گئے۔ رہائی کے بعد محمد ضیاء نے ڈیموکریٹک پارٹی بنائی جس نے حزب اختلاف کا کردار ادا کیا۔

1976ء میں سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار میں ''تنظیم افریقی اتحاد'' اور عرب لیگ کی ایک مشترک کانفرنس ہوئی، جس میں سینیگال کے صدر سنگور نے تجویز پیش کی کہ ان دونوں تنظیموں کا ادغام ہونا چاہیے اور ایک ایسی مصالحتی یا ثالثی عدالت قائم ہونی چاہیے، جس میں افریقی ممالک کے باہمی تنازعات کا تصفیہ ہوا کرے۔ فروری 1978ء میں بارہ برس کے بعد کثیر جماعتی انتخابات ہوئے۔ پہلی مرتبہ ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنما عبداللہ وعدہ نے صدر سنگور کا مقابلہ کیا، لیکن صدر سنگور 80 فیصد ووٹ حاصل کر کے پھر صدر منتخب ہوگئے۔ اس مرتبہ ان کی یونین پارٹی کے 83 نمائندے اور ڈیموکریٹک پارٹی کے 17 نمائندے کامیاب ہوئے۔

آزادی کے بعد کئی سال تک فرانس اور سینیگال کے درمیان بہت قریبی سیاسی اور معاشی تعلقات قائم رہے اور مسلم اکثریت کا ملک ہونے کے باوجود سینیگال نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کیے، لیکن اکتوبر 1973ء میں عرب اسرائیل جنگ کے وقت سینیگال نے اسرائیل سے تعلقات منقطع کرلیے اور اسلامی دنیا سے قریب تر ہو گیا۔ چنانچہ 1995ء میں او آئی سی کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس ڈاکار میں منعقد ہوئی۔

سینیگال کی معیشت کی بنیاد زراعت اور مویشی بانی پر ہے۔ مونگ پھلی سب سے بڑی زرعی پیداوار ہے اور بڑی تعداد میں برآمد کی جاتی ہے۔ ماہی گیری بھی ملک کی معیشت میں اہمیت رکھتی ہے۔ 1972ء میں سینیگال، مالی اور موریطانیہ نے دریائے سینیگال کے آبی وسائل کو ترقی دینے کے لیے ایک برقابی پروجیکٹ پر کام شروع کیا۔ یہ دریا ان تینوں ملکوں میں سے گزرتا ہے۔

1980ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی قیادت میں حزب اختلاف کے ایک ہزار سے زائد ارکان نے ایوان صدر کے سامنے سخت احتجاجی مظاہرے کیے۔ سینیگال نے لیبیا سے سفارتی تعلقات منقطع کرلیے۔ 31 دسمبر کو صدر سینگور سیاست سے سبک دوش ہوگئے۔

یکم جنوری 1981ء کو عبدہ ضیوف نے صدارت کا عہدہ سنبھال لیا۔ قومی اسمبلی نے ایک قانون بنایا جس کی رو سے سیاسی جماعتوں کی تشکیل اور سرگرمیوں پر سے ہر طرح کی پابندیاں اٹھالی گئیں۔ قومی اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے گیمبیا کے ساتھ کنفیڈریشن میں شامل ہونا منظور کر لیا۔ ''سینی گیمبیا'' کے نام سے دو ملکوں پر مشتمل کنفیڈریشن وجود میں آ گئی ہے۔ طے پایا کہ دونوں ملک اپنی اپنی جگہ خود مختار ہوں گے۔ صرف دفاع اور مالی امور مشترک ہوں گے۔ 1987ء جون کے انتخابات میں عبدہ ضیوف کو دوبارہ صدر منتخب کیا گیا۔ 2000ء مارچ میں صدارتی انتخابات ہوئے جو عبدہ ضیوف کے معاصر عبداللہ وعدہ نے 60 فیصد ووٹ لے کر جیت لیے۔

افریقہ کا دیو: نائیجیریا

مغربی افریقہ میں نائیجیریا ایک ایسا ملک ہے جو پاک و ہند کی طرح برطانوی سامراج کے زیر تسلط تھا۔ نائیجیریا کی موجودہ آبادی تقریباً پندرہ کروڑ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد نصف کے لگ بھگ ہے اور مسلم اکثریت کے علاقے اپنے رقبے اور آبادی میں نصف سے زیادہ نائیجیریا پر مشتمل ہیں۔ اس علاقے میں اسلام گیارہویں صدی میں پھیل چکا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب پاکستان اور ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ موجودہ نائیجیریا کی سب سے بڑی ریاست بورنو، جو شمال مشرق میں واقع ہے، کانم کی سلطنت ہی کا ایک حصہ تھی۔ دوسرے شمالی حصوں میں بھی چودھویں صدی میں اسلام پھیل چکا تھا اور لا مذہب ہاؤسا ریاستوں کے کئی حکمران مسلمان ہو چکے تھے۔ سولہویں صدی تک صحرائے اعظم کے جنوب کے ساحلی علاقے کو چھوڑ کر باقی نائیجیریا فولانی قبیلے کی مختلف ریاستوں میں منقسم تھا، جن پر انگریزوں نے یکے بعد دیگرے آسانی سے قبضہ کر لیا اور 1903ء تک انہوں نے پورے نائیجیریا کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ اس نئی مملکت کو انگریزوں نے دریائے نائیجیر کی نسبت سے جو اس ملک کے وسط سے گزرتا ہے، نائیجیریا کا نام دیا۔ برطانوی حکومت نے نائیجیریا کو انتظامی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک شمالی حصہ، دوسرا جنوبی۔ 1939ء میں جنوبی حصے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا: مشرقی علاقہ اور مغربی علاقہ۔

شمالی علاقہ جو پورے نائیجیریا کے تین چوتھائی رقبے اور 58 فیصد آبادی پر مشتمل تھا، اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مغربی علاقے میں جہاں یوروبا نسل کے باشندوں کی اکثریت ہے، مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی تھی، لیکن اکثریت کسی بھی مذہب کے پیروؤں کو حاصل نہ تھی۔ مشرقی علاقے میں جہاں ایبو نسل کے باشندوں کی اکثریت تھی، عیسائیت کا زور تھا۔ ان تینوں علاقوں کو وہاں کے سب سے بڑے تین قبیلوں کی نسبت سے ہاؤسا لینڈ، یوروبا لینڈ اور ایبو لینڈ بھی کہا جاتا تھا۔

انگریزوں نے نائیجیریا کے کچھ حصوں کو براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا تھا اور بقیہ حصوں میں مقامی حکومتوں کو برقرار رکھا تھا۔ شمال میں ان مقامی حکومتوں کی تعداد تیس تھی اور یہ سب مسلمان تھیں۔ ان مقامی حکومتوں یا ریاستوں کے حکمران امیر کہلاتے ہیں۔ رقبے میں بورنو اور آبادی میں کانو سب سے بڑی ریاستیں ہیں۔ انگریزوں اور ان ریاستوں کے امیروں کے درمیان جو معاہدے ہوئے تھے، ان کی رو سے برطانیہ نے وعدہ کیا تھا کہ ان

ریاستوں میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات اوران کے مروجہ قوانین میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

تحریکِ آزادی

1946ء نائیجیریا کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سال ملک کے تینوں حصوں میں علاقائی اسمبلیاں قائم کی گئیں اور مرکز میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی۔اس کے بعد جو سیاسی جدوجہد شروع ہوئی، اس میں نائیجیریا کے مسلمانوں نے جداگانہ حیثیت سے حصہ نہیں لیا۔یہ جدوجہد زیادہ تر علاقائی اور نسلی بنیاد پر ہوئی۔لیکن شمال میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں کی قیادت تقریباً پوری کی پوری مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، اس لیے شمال کی سیاست ایک طرح سے مسلمانوں کی سیاست بن گئی۔

شمالی نائیجیریا کے مسلمانوں کو نئی آئینی اصلاحات کی وجہ سے کئی خطرے تھے۔مرکزی اسمبلی میں شمال کو تناسب سے کم نمائندگی دی گئی تھی اور شمال والے اکثریت میں ہونے کے باوجود اسمبلی میں اقلیت میں تھے۔علاوہ ازیں جنوب کے لوگوں میں سیاسی شعور زیادہ تھا، اس لیے مرکزی سرکاری ملازمتوں پر بھی وہی چھائے ہوئے تھے۔ چونکہ نائیجیریا کے ساحلی علاقے انگریزوں کے قبضے میں پہلے آئے تھے، اس لیے حکومت نے اس پر زیادہ توجہ دی۔ چونکہ یہاں عیسائیوں کی آبادی پہلے ہی سے زیادہ تھی، اس لیے بھی انگریزوں نے اس علاقے کی ترقی پر خاص توجہ کی۔اس کے علاوہ عیسائی تبلیغی ادارے بھی شروع ہی سے ان علاقوں میں سکول اور ہسپتال قائم کرنے میں مصروف رہے، جس کی وجہ سے نائیجیریا کے جنوبی علاقوں کو شمالی علاقے کی نسبت تعلیمی، سیاسی اور معاشی ترقی کے زیادہ مواقع میسر آئے۔جنوبی علاقوں کے لوگوں کو انگریزی زبان سیکھنے، پڑھنے اور مغربی تہذیب اختیار کرنے میں بھی کسی قسم کی جھجک نہیں تھی۔لیکن یہ باتیں دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح نائیجیریا کے مسلمانوں کے لیے آسانی سے قابل قبول نہیں تھیں۔نتیجہ یہ نکلا کہ برعظیم کے مسلمانوں کی طرح شمالی نائیجیریا کے مسلمان بھی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور جنوبی علاقوں کی مسیحی باشندے اقلیت میں ہونے کے باوجود سیاست، حکومت، تعلیم، کاروبار اور تجارت وصنعت پر اسی طرح چھا گئے، جس طرح ہندو قیام پاکستان سے قبل ان علاقوں کی پوری معیشت اور سماجی زندگی پر چھائے ہوئے تھے، جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔اس غیر مساوی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے مسلم شمالی حصے اور غیر مسلم جنوبی حصے کے درمیان مستقل تصادم رہتا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر شمالی حصے کے مسلمانوں کو خوف یہ تھا کہ ایک مرکزی حکومت کے تحت وہ جنوب والوں کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔اس اندیشے کے تدارک کے لیے شمال کے لوگوں نے حسب ذیل تینوں مطالبے پیش کیے:

1۔ ملک میں مرکزی وحدانی نظام کی بجائے وفاقی نظام قائم کیا جائے، جس میں ہر علاقے کو اندرونی خود مختاری حاصل ہو۔

2۔ وفاقی مجلس قانون ساز میں شمال کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

3۔ ملک کی آمدنی ہر علاقے میں آبادی کے تناسب سے تقسیم کی جائے۔

ان مطالبات کی منظوری کی صورت میں چونکہ جنوب کی اجارہ داری میں فرق آتا تھا، اس لیے شمال کے ان

مطالبات کی جنوب کے باشندوں نے شدت سے مخالفت کی، اور شمال اور جنوب کی یہ کشمکش اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک مرتبہ شمال کے مسلم رہنما نے یہاں تک کہہ دیا: ''اگر جنوب کے لوگ متحدہ نائیجیریا چاہتے ہیں تو ان کو اسلام قبول کر لینا چاہیے۔''

بہرحال 1957ء میں یہ کشمکش ختم ہوگئی۔ شمال کے تینوں مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور نائیجیریا کے لیے وفاقی نظام قائم ہوگیا۔ 2 ستمبر 1957ء کو شمال کے مسلم رہنما ابوبکر تفاوا بلیوا وفاقی نائیجیریا کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور وہ اس عہدے پر 1966ء میں شہادت پانے تک فائز رہے۔ اسی سال یعنی 1957ء میں مشرقی اور مغربی علاقوں کو اندرونی خودمختاری دی گئی۔ شمالی علاقے کو 15 مارچ 1959ء کو خودمختاری حاصل ہوئی اور یکم اکتوبر 1960ء کو ابوبکر کی قیادت میں نائیجیریا نے برطانیہ سے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ اس کے بعد نئے آئین کی تیاری شروع ہوئی اور اس کی تکمیل کے بعد یکم اکتوبر 1964ء کو نائیجیریا کو ایک جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ ابوبکر وزیر اعظم رہے اور مشرقی علاقے کے ممتاز سیاسی رہنما ڈاکٹر ازکوئی، جو پہلے گورنر جنرل تھے، صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔

تحریکِ آزادی کے قائد

نائیجیریا کی آزادی کی جدوجہد میں جن رہنماؤں نے حصہ لیا، ان میں احمد وبلو، ابوبکر تفاوا بلیوا، ڈاکٹر ازکوئی اور ایووولووو سب سے ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر ازکوئی نسلاً ایبو ہیں۔ ایووولووو نسلاً یوروبا ہیں۔ احمد وبلو اور ابوبکر شمالی نائیجیریا کے ترجمان تھے، لیکن سب سے بڑی شخصیت احمد وبلو (وفات 1966ء) کی تھی۔ انہوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سوکوتو میں معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ 1949ء میں شمالی علاقے کی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ 1952ء میں وہ ''شمالی عوام کی کانگریس'' کے صدر منتخب ہوئے جو نائیجیریا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ ان کو شمالی نائیجیریا کی ترقی سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وفاق کی تشکیل کے بعد انہوں نے پورے ملک کی وزارتِ عظمٰی پر شمالی نائیجیریا (مسلمانوں) کی وزارتِ عظمٰی کو ترجیح دی اور ملک کے وزیر اعظم کا عہدہ اپنے نائب ابوبکر کے سپرد کر دیا۔ احمد وبلو کو انگریزی زبان پر عبور تھا اور وہ ''مائی لائف'' کے نام سے خودنوشت سوانح عمری کے مصنف تھے۔ یہ کتاب کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی تھی اور یہ شمال کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا ایک مستند ماخذ تھا۔ احمد وبلو ایک دین دار مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی حج کیے، وہ چونکہ نائیجیریا میں اسلام لانے والے صوفی بزرگ، ولی اللہ عثمان فودیو کی اولاد میں سے تھے، اس لیے ان کو نائیجیریا کے علاوہ مغربی افریقہ کے بڑے حصے میں مذہبی لحاظ سے بھی احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو نائیجیریا میں اسلام کی اشاعت وتوسیع سے گہری دلچسپی تھی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کی کوششوں سے ہزاروں لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے۔

احمد وبلو کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی شخصیت ابوبکر تفاوا بلیوا مرحوم تھے۔ 1945ء میں انہوں نے لندن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن سے معلّمی کی سند حاصل کی۔ 1951ء میں وہ شمالی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1952ء میں شمال میں وزیر تعمیرات ہوئے۔ اس کے بعد ان کے پاس کوئی نہ کوئی وزارت برابر رہی، یہاں

تک کہ 1950ء میں وہ وفاق نائیجیریا کے وزیراعظم منتخب ہوئے اور آخر وقت تک اس عہدے پر فائز رہے۔ وہ انگریزی کے بہترین مقرر تھے۔ ان کو نام ونمود سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن ان کی دیانت، قوتِ فیصلہ اور ان تھک محنت نے ان کو سارے ملک میں مقبول بنا دیا تھا۔

سیاسی جماعتیں

1966ء کے فوجی انقلاب سے پہلے نائیجیریا میں کئی سیاسی جماعتیں موجود تھیں، لیکن ان میں تین جماعتیں سب سے اہم اور بااثر تھیں۔ ان میں سب سے بڑی شمالی عوام کی کانگریس (این پی سی) تھیں۔ یہ جماعت 1941ء میں قائم کی گئی تھی۔ یہ جماعت شمال کے عوام کی ترجمان تھی جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، لیکن چونکہ شمال میں مسلمانوں کی تعداد 75 فیصد تھی، اس لیے عملاً یہ جماعت مسلمانوں کی ترجمان بن گئی۔ 1958ء میں اس کی قومی مجلس عاملہ کے 74 ارکان میں 64 مسلمان اور نو عیسائی تھے۔ اس جماعت کا نعرہ تھا: ''ایک شمال، ایک قوم''۔

نائیجیریا کی دوسری بڑی سیاسی جماعت نائیجیریا کی قومی کونسل (این این سی) تھی۔ یہ جماعت مضبوط وفاقی حکومت کی حامی تھی۔ اس کے بانی ڈاکٹر ازکوئی تھے جو صحافت اور قوم پرستی کے بانی تھے۔ مجلس قانون ساز میں اس جماعت کے 89 نمائندے تھے۔ یہ جماعت اگرچہ کل نائیجیریا کی بنیاد پر کام کر رہی تھی، لیکن اس کا اثر مشرقی نائیجیریا تک محدود تھا۔ 1958ء میں اس کی قومی مجلس عاملہ کے 71 ارکان میں 55 عیسائی تھے اور صرف چھ مسلمان تھے۔ اس جماعت نے ابتدا میں این پی سی کے ساتھ مل کر حکومت چلائی، لیکن 1965ء کے انتخابات کے بعد الگ ہو گئی۔

نائیجیریا کی تیسری بڑی جماعت ایکشن گروپ تھی، جس کو عرف عام میں ''اے ڈبلیو او'' کہا جاتا ہے۔ یہ جماعت وفاق کی حامی تھی، جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اور مرکز کو کم سے کم۔ 1958ء میں اس جماعت کی وفاقی مجلس عاملہ میں مغربی علاقے کے 33 ارکان میں سے صرف تین مسلمان تھے اور مغرب کے بارہ وزیروں میں صرف دو مسلمان تھے۔

یوروبا مسلمانوں کی سیاسی جماعت کا نام ''نیشنل مسلم لیگ'' تھا جو انہوں نے اپنی شکایات کے ازالے کے لیے ایکشن گروپ سے الگ بنائی تھی۔ ان کی شکایات یہ تھیں:

1۔ مسلمانوں کے دینی مدرسوں سے غفلت برتی جاتی ہے۔
2۔ تعلیمی اور دیگر مسلم اداروں کے لیے رقم مخصوص کرنے میں امتیاز برتا جاتا ہے۔
3۔ مدرسوں کے نصاب میں عربی نظام کی تعلیم شامل نہیں۔
4۔ مسلمان طلبہ کو وظائف کم دیئے جاتے ہیں۔
5۔ مسیحی سکولوں میں تعلیم کے ذریعے مسلمان بچوں کو عیسائی بنالیا جاتا ہے۔
6۔ اسمبلیوں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو کم نمائندگی دی جاتی ہے۔

لیکن نیشنل مسلم لیگ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ دوسرے رہنماؤں اور جماعتوں نے سیاست میں مذہب کو

لانے کی اس کوشش کی سختی سے مخالفت کی۔ تاہم مسلمانوں کی اس کوشش نے ''ایکشن گروپ'' کو مجبور کر دیا اور یوں گروپ میں مسلمانوں کو زیادہ نمائندگی دی گئی اور ان کی بعض شکایات کا ازالہ کیا گیا۔

سلطنتِ عثمانیہ کا عروج و زوال

سلطنت عثمانیہ عالم اسلام کی ایک بہت پائیدار اور وسیع سلطنت تھی جو تاریخ اسلام میں ترکی زبان بولنے والی ایک قوم نے قائم کی اور جو اسلامی عروج کی متاخر صدیوں میں صورت پذیر ہوئی۔ اس سلطنت کا اصلی مرکز ایشیائے کوچک تھا جو اسلامی دنیا کے انتہائی شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔ اس سلطنت کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ پہلا دور عثمان اول (1299 تا 1326ء) سے شروع ہو کر جولائی 1413ء میں اس وقت ختم ہوا جو بایزید یلدرم کے لڑکے محمد نے اپنے بھائی موسیٰ پر فتح پائی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں خاندان تغلق کے سلاطین کی حکمرانی تھی۔

2۔ دوسرا دور 1443ء سے 1566ء تک چلا۔ یہ دور توسیع و ترقی کا دور ہے، جس میں سلطنت اپنی انتہائی وسعت، ترقی اور عروج کو پہنچی، جب ہندوستان میں بھی سلطنت مغلیہ اپنے عروج پر تھی۔ اس دور کے اہم سلاطین محمد اول، محمد ثانی فاتح، بایزید ثانی، سلیم اول اور سلیمان اول قانونی ہیں۔

3۔ تیسرے دور میں سلطنت عثمانیہ ممالک محروسہ پر قابض رہی، تا آں کہ ہنگری اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ دور سلطان سلیم ثانی (1566۔1574ء) سے لے کر مصطفیٰ ثانی (1695۔ 1703ء) تک جاری رہا۔

4۔ چوتھے دور میں سلطنت بتدریج کمزور ہوتی گئی اور قومی باج گزار امیروں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ دور سلطان احمد ثالث (1703۔1730ء) سے لے کر سلطان محمود ثانی (1808۔1839ء) تک جاری رہا۔ جس رفتار سے سلطنت عثمانیہ کو زوال آ رہا تھا، اسی رفتار سے سلطنت مغلیہ کو بھی ضعف آ رہا تھا۔

5۔ پانچواں دور تنظیمات کا ہے، جس میں مغربی تہذیب و تمدن اور نظام حکومت کے اثرات نے سلطنت کی روایات و اقتدار، طرز فکر اور نظم و نسق کو تہ و بالا کر دیا۔ اس دور کے خلفاء یہ ہیں: عبد المجید (1839۔ 1861ء)، عبد العزیز (1861۔1876ء)، مراد خامس (1876)، عبد الحمید ثانی (1876۔ 1909ء)، محمد خامس (1909۔ 1918ء)، محمد سادس (1918۔1922ء)۔ 29 اکتوبر 1923 سے مصطفیٰ کمال پاشا کی صدارت میں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔

سلطنت عثمانیہ کی حدود

سلطنت کے بانی اپنی اصل کے لحاظ سے خانہ بدوش ترکمان اور قبیلہ قائی سے تعلق رکھتے تھے، جو اوغوز ترکوں کی ایک شاخ ہے۔ ابتدا میں ریاست کی تاریخ اناطولیہ کی دیگر ہم عصر ریاستوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ عثمان اول کی وفات کے وقت اس کی مملکت کی مشرقی سرحد دریائے سقاریہ تک، اور جنوب میں ''اسکی'' شہر تک جا پہنچی تھی۔ ازنیق، ازنیق مید اور بروصہ سلطان اُورخاں کے عہد (1330ء) میں فتح ہوئے۔ اور اسی وقت بروصہ صدر مقام قرار پایا۔ یہ ترکمانی سُنّی علماء کے اثرات و کردار سے بتدریج متاثر ہوئے اور اسی پر سلطنت عثمانیہ کے مابعد ارتقا کی بنیاد پڑی۔

سلطان محمد ثانی نے 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کیا اور 1461ء میں طرابزون کی سلطنت کو سر کر کے اناطولیہ کی فتح کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان فتوحات کا اثر ترکوں اور اہل یورپ پر گہرا پڑا تھا۔ اس کی وفات تک بلقان کا سارا جزیرہ نما سلطنت عثمانیہ کے زیرنگیں آ چکا تھا۔ جزیرہ روڈس کے سوا، بحیرۂ ایجہ (Aegean Sea) کے مجمع الجزائر کو بھی اس طریقے سے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ اور دریائے ڈینیوب کی ریاستیں ولیکیا اور مولڈیویا، اور 1475ء سے قازان کریمیا کی ریاست بھی باج گزار رہیں۔ اس دوران میں یورپ کی سیاسی ریاستیں سلطنت عثمانیہ کے خلاف سازشیں کرتی رہیں، مگر کوئی خاص نقصان نہ پہنچا سکیں۔ سلیمان اول کے دور میں ہنگری کی مملکت کا بیشتر حصہ فتح کر لیا گیا۔ روڈس بھی مقبوضہ علاقے میں شامل کر لیا گیا۔ ایشائی محاذ پر عراق بھی فتح ہو گیا، اور سلیمان کو ''سلطان البرین و البحرین'' کہا جانے لگا۔

فتوحات کے اس دوسرے دور میں مملکت کا اندرونی، مذہبی اور تمدنی ارتقا بھی حیرت انگیز تھا۔ مسلمانوں میں اسلامی اقدار سے نسبت کا جذبہ مستحکم ہوا۔ فقہاء کی ایک بڑی تعداد مشرقی ممالک سے سلطنت کے جدید تمدنی مراکز میں آ بسی۔ صوفیہ اور ان کے مختلف سلسلوں کے درویشوں کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ مراد ثانی کے عہد میں ''شیخ الاسلام'' کے منصب کو پہلی بار نمایاں اہمیت حاصل ہوئی اور بعد میں نئے قوانین نے بھی اس منصب کی باقاعدہ توثیق کر دی۔ انتہا پسند شیعیت کے خفیہ میلانات کے خلاف مجادلہ جاری رہا اور اس مجادلے نے کئی بار حکومت کے خلاف بغاوتوں کی صورت اختیار کی۔ سلیم اول کے دور میں شیعوں کو سختی سے دبا دیا گیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد عیسائیوں اور یہودیوں کو اپنے مذہبی معاملات میں خود مختاری دے دی گئی۔ ان غیر مسلموں سے مسلمانوں کا رویہ رواداری کے اصول پر مبنی رہا۔

سلطنت عثمانیہ کے تیسرے دور میں سلیم ثانی نے قبرص فتح کر لیا (1570ء)، مگر اس کے بعد ہی ایک بحری جنگ میں ترکوں کو شکست دی گئی، جس کا نقصان سلطنت کی اندرونی کمزوری میں اضافے کی صورت میں انہیں اٹھانا پڑا۔ رفتہ رفتہ تبریز اور اریوان بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور 1613ء میں انہیں ایران سے صلح کرنا پڑی۔ سولہویں صدی کے آخری دس سال میں ٹرانسلوانیا اور رومانیہ کی ریاستیں کچھ عرصے کے لیے خود مختار بھی ہو گئیں۔ مگر 1580ء میں انگلستان سے اور 1603ء میں ہالینڈ سے جو مراسم پیدا ہوئے، وہ بہ حیثیت مجموعی مفید ثابت ہوئے۔ سترہویں صدی میں قبرص کا الحاق ہوا اور اس کے بعد کریٹ فتح ہوا جو ایک حیرت انگیز واقع تھا۔ سلطان مراد رابع کے

دور میں ایشیائی سرحد پر دوبارہ شوکت وجلالت قائم ہوئی، کیونکہ کافی عسکری طاقت بڑھ گئی تھی۔ اسی دور میں ٹرانسلوانیا اور ڈینیوب کی ریاستوں میں ترکی اقتدار کو مستحکم اور بحیرۂ اسود کی شمالی سرحدوں کو مضبوط کیا گیا۔ تاتاریوں سے آزوف چھین لیا گیا، مگر 1688ء میں صوبہ ہنگری ہاتھ سے نکل گیا اور آسٹریا کی فوجیں بلقان میں داخل ہوگئیں، اور آخر کار 1699ء میں کارلووٹز کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے ترکی کو پورے ملک ہنگری سے دست بردار ہونا پڑا۔ ٹرانسلوانیا کی سیادت کا دعویٰ ترک کرنا پڑا اور موریا پر یونان کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا۔

اٹھارویں صدی میں زوال وانحطاط کے اسباب کا ناگزیر اثر سلطنت میں شدت محسوس ہونے لگا اور بیرونی طاقتوں نے زوال کے اسباب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ اس دور میں ایک نیا اور زبردست دشمن "روس" کی شکل میں نمودار ہوا جس کی سلطنت کافی وسیع ہو چکی تھی۔ رومانیہ اور سرویا کے آرتھوڈوکس عیسائیوں کو وہ اپنا نجات دہندہ معلوم ہونے لگا۔ 1768ء میں ترکوں کی فوجی کمزوری نمایاں ہوگئی، جب روس کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا جس میں روسی فوجیں بلغاریہ کے اندر دور تک گھس آئیں، آخر کار 1744ء میں ایک معاہدہ ہوا، جس کی رو سے کریمیا پوری طرح خود مختار ہو گیا، مگر 1783ء میں روس نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ڈینیوب کی ریاستوں پر روس کا حق حمایت تسلیم کیا گیا۔ 1776ء میں ایران سے جنگ ہوئی اور صوبہ عراق کا شہر بصرہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے (عارضی طور پر) جاتا رہا۔ سلطنت عثمانیہ کو ایک بار پھر روسیوں سے آٹھ سال جنگ میں سخت نقصان اٹھانا پڑا، جس کا خاتمہ 1792ء میں صلح پر ہوا۔ 1802ء میں فرانس سے صلح نامہ طے پایا، جس کے بعد روس سے پھر جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں سے بھی مخالفت پیدا ہوگئی۔ 1812ء کے بخارسٹ کے صلح نامے کی رو سے سلطنت عثمانیہ کے ہاتھوں سے بسارابیا بھی روس کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد یونان کی بغاوت کا صدمہ بھی سہنا پڑا۔ 1820ء سے 1830ء تک چلنے والی تحریک بغاوت کے نتیجے میں یونان خود مختار ہو گیا، لیکن اس سے پہلے روس سے ایک اور تباہ کن جنگ لڑنا پڑی اور 1829ء میں ترکی کو ادرنہ کی صلح پر مجبور ہونا پڑا۔

پانچویں دور میں نظام حکومت میں جدید طریقے اختیار کیے گئے اور تنظیمات کے نفاذ میں زیادہ تر فرانسیسی طرز حکومت کو نمونہ بنایا گیا، تاکہ بلاتفریق مذہب براہ راست حکومتِ عثمانیہ کی زیر فرمان، برابر کے سیاسی اور شہری حقوق تمام باشندوں کو حاصل ہوں۔ 1849ء کی جمہوری انقلابی تحریک کی، جو مولڈیویا اور ولیکیا میں رونما ہوئی، ترکی اور روس دونوں نے یکساں طور پر مخالفت کی، لیکن اس کا نتیجہ ایک میثاق کی صورت میں نکلا، جس کی رو سے ان دونوں ریاستوں میں ترکی کا اقتدار برائے نام رہ گیا۔ 1883ء میں روسی یلغار کے بعد بیرونی طاقتوں کی دخل اندازی صرف سیاسی معاملات تک محدود نہ رہی، بلکہ اندرونی نظام حکومت کی بہت سی جزئیات میں بھی وہ مداخلت کرنے لگیں۔ اس قسم کی دخل اندازی ان کے لیے "امتیازات" (خصوصی معاہدے) کی وجہ سے ممکن ہوئی، جنہیں 1914ء میں یورپی طاقتوں کے باہمی تصادم کے سبب ترکوں نے منسوخ کیا۔

1878ء کے معاہدے کے مطابق مونٹے نیگرو، سربیا اور رومانیہ قطعی طور پر عثمانیوں کے قبضے سے نکل گئے اور بلغاریہ کو ایک خود مختار حکومت کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ قفقاز کی سرحد قارص اور باطوم ترکوں کے ہاتھ

سے نکل گئے اور جزیرۂ قبرص کے نظم و نسق سنبھالنے کا انگریزوں نے بندوبست کر لیا۔ انگلستان نے بھی 1882ء میں مصر میں اپنے سبز قدم جما لیے۔

1897ء میں ترکی اور یونان کے درمیان جنگ ہوئی جس میں یونان کو شمال کی جانب توسیع حاصل ہوئی۔

1898ء میں کریٹ جزیرہ خود مختار رہا۔

1909ء میں سلطان عبدالحمید کی معزولی کے بعد بلغاریہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگووینا کا الحاق کر لیا۔

1912ء میں اٹلی سے جنگ ہوئی تو عہد نامہ لوزان کی رو سے طرابلس کا علاقہ چھن گیا۔

1913ء میں جنگ بلقان میں یورپ میں ترکی کے مقبوضات صرف مشرقی تھریس (بہ شمول ادرنہ) تک محدود ہو کر رہ گئے۔

پہلی جنگ عظیم (1914 تا 1919ء) کے پہلے سال میں ترکی نے یورپ کی طاقتوں کا ساتھ دیا تو فرانس اور انگلستان نے پہلی مرتبہ اتحاد کرتے ہوئے ترکی کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ فرانسیسی اور انگریزی افواج کی متفقہ کارروائی کے نتیجے میں فلسطین و شام کے تمام علاقے عثمانی فوج کے ہاتھ سے نکل گئے۔

1917ء میں شریف مکہ نے ''شاہ حجاز'' کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

1918ء میں روس سے جنگ ختم ہوئی، مگر اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے تمام شمالی شام اور سلیشیا کا علاقہ ہتھیا لیا۔ انگلستان نے شمالی عراق اور موصل کے غیر مفتوحہ علاقے بھی لے لیے اور اطالوی فوجیں اناطولیہ کے ساحل پر اتر آئیں۔ یونان کو مشرقی تھریس اور سمرنا (ازمیر) پر قبضہ کرنے کی اجازت مل گئی۔

1920ء میں ترکی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا اور اس نے ''میثاق ملی'' منظور کر کے سخت رویہ اختیار کیا، مگر اگست میں ''عہد نامہ سیورے'' پر ترکی کو دستخط کرنے پڑے، جس کی رُو سے سلطنت عثمانیہ کے رہے سہے علاقوں کے بڑے بڑے حصے بھی، جن میں قسطنطنیہ اور سمرنا شامل تھے، دوسروں کے تصرف میں چلے گئے۔

یہی وہ حالات تھے جب غیر ملکیوں کی دخل اندازی، خصوصاً یونانیوں کے سمرنا میں اتر آنے کے خلاف منظم قومی مزاحمت وجود میں آ گئی۔ انجمن اتحاد و ترقی اور مغرب نواز طبقوں کو عثمانی حکومت کے خلاف کھل کھیلنے کا زرین موقع میسر آیا اور انقرہ کی مجلس ملی کبیر نے یکم نومبر 1922ء کو حکومت قسطنطنیہ کی برطرفی اور سلطان محمد سادس وحید الدین کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ اس پر سلطنت عثمانیہ اور عثمانی خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔ قسطنطنیہ اور مشرقی تھریس پر انجمن اتحاد و ترقی کی فوجوں نے قبضہ کر لیا اور آخری سلطان دار الخلافہ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ شہر اب دار الخلافت بھی نہ رہا۔ عثمانی خاندان کا صرف ایک نشان باقی رہ گیا، اور وہ یہ کہ سلطان عبدالحمید بن سلطان عبدالعزیز خلیفہ کی حیثیت سے اس شہر میں مقیم رہا، مگر 2 مارچ 1924ء کو مجلس ملی کبیر نے ایک فرمان کے ذریعے خلافت کو بھی منسوخ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی عبدالحمید اور آل عثمان کے تمام افراد کو ترکی سے جلاوطن کر دیا گیا۔

ترکوں پر اسلام کے اثرات

20 اپریل 1924ء کے آئین کے بعد سے ترکی ایک جمہوری سلطنت بن گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ قسطنطنیہ کی جگہ دارالحکومت اب انقرہ بن گیا۔ مجلس ملّی کبیر نے قانون سازی میں خاصی سرگرمی اور مستعدی دکھائی۔ مارچ 1924ء میں خلافت منسوخ کر دینے کے بعد حکمرانوں نے ملک کو سیکولرازم کی راہ پر لگا دیا۔ نہ کوئی شیخ الاسلام رہا، نہ وزیرِ اوقاف۔ ستمبر 1925ء میں صوفیوں کے مختلف سلسلوں کے تکیے بند کر دیے گئے۔ ترکی ٹوپی کا استعمال ممنوع قرار پایا۔ لاطینی حروف کو سرکاری طور پر رائج کیا گیا اور 1928ء سے عربی زبان اور اس کا رسم الخط ترک کر دیا گیا اور مذہب اور مذہب پسندوں کی ہر سطح پر مخالفت کی گئی۔

قسطنطنیہ سے استنبول تک

شہر استنبول تقریباً پانچ سو سال تک خلافت اسلامی کا مستقر رہا اور دنیائے اسلام کی قیادت کرتا رہا۔ یہ شہر آستانۂ علیا، درسعادت اور اسلامبول کے ناموں سے معروف رہا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں اسلامی تمدن و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز یہی شہر تھا۔ اس کا پہلا نام قسطنطنیہ تھا جسے بزنطی عیسائی بادشاہ قسطنطین اعظم نے 11 مئی 330ء کو فتح کرنے کے بعد سلطنت شرقیہ (مشرقی رومن ایمپائر) کا صدر مقام بنایا اور جس کا نیا نام فاتح بادشاہ کے نام پر رکھا گیا۔ عربوں کے ہاں بھی قسطنطنیہ کے نام سے معروف تھا، اگرچہ وہ اس کے قدیم نام بوزنطیہ سے بھی واقف تھے۔ اس مشہور و مستند حدیث نبوی ﷺ میں فتح روم و قسطنطنیہ کی بشارت دی گئی ہے۔

> ”تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کر لو گے۔ رحمت ہو اس بادشاہ اور اس لشکر پر جس کے ہاتھوں یہ فتح نصیب ہو۔“

(مسلم شریف، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، مسند احمد)

چنانچہ بنو امیہ نے اپنے دورِ حکومت میں اس مقدس فریضے کی انجام دہی کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ سب سے پہلے یکم ستمبر 653ء کو طرابلس الشام میں جہازوں کا ایک بیڑہ قسطنطنیہ پر چڑھائی کے لیے تیار کیا گیا، جس نے بسر بن ابی ارطاۃؓ کی قیادت میں یونانی بیڑے کو شکست دی، لیکن قسطنطنیہ تک اس کی پہنچ نہ ہو سکی۔ اسی وقت حضرت امیر معاویہؓ نے خشکی کے راستے بھی بوزنطی حکومت پر حملہ کیا تھا۔ 664ء میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید نے حملہ کیا جو برغمہ تک بڑھتے چلے گئے۔ بعد کے برسوں کے دوران فضالہ بن عبید چالیڈن تک پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے یزید بن معاویہؓ کو روانہ کیا گیا۔ عرب اپریل سے دسمبر 672ء تک شہر پر حملے کرتے رہے۔ انہوں نے سردی کا موسم سزی کس میں گزارا اور اس کے بعد موسم بہار میں پھر نئے حملے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ سات برس کی کوشش کے

بعد انہیں واپس ہونا پڑا۔ بیڑے کا ایک حصہ آتش یونانی سے فنا ہو گیا۔ اس محاصرے کے دوران صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ کی شہادت ہوئی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے قریب دفن کیے گئے۔ سلطان محمد فاتح کے محاصرے کے زمانے میں آق شمس الدین نے آپؓ کی قبر دریافت کی اور 1458ء میں سلطان نے اسی مقام پر مسجد تعمیر کرائی۔

اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اکتوبر 715ء میں تخت نشین ہوا، تو اس نے قسطنطنیہ کے خلاف ایک بڑی مہم کی تیاری کی۔ اس لشکر کا سالار سلیمان کا بھائی مسلمہ تھا۔ اس لشکر میں محاصرے کے لیے توپیں بھی موجود تھیں۔ مسلمہ نے ایشیائے کوچک سے گزر کر درۂ دانیال کو ابیڈوس کے قریب سے عبور کیا اور قسطنطنیہ کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ایک سال تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر کار بلغاروں کے حملے اور سامان رسد کی کمی کی وجہ سے اسے ناکام واپس ہونا پڑا۔ عباسی خلیفہ المہدی کے فرزند ہارون نے بھی فتح قسطنطنیہ کا ارادہ کیا۔ وہ اپنے لشکر کے ہمراہ قسطنطنیہ کے قریب خیمہ زن ہو گیا، لیکن ملکہ آئرین نے، جو اپنے بیٹے قسطنطین کی نائب تھی، فوراً صلح کر لی اور خراج ادا کرنا منظور کر لیا۔

عربوں کے آخری حملے کے چھ سو سال بعد عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ بایزید اول نے 1396ء میں اس شہر کا محاصرہ کیا، لیکن چند ماہ کے بعد سگسمنڈ اول کی قیادت میں فرانس اور ہنگری کی مزید فوجی کمک کی خبر سن کر محاصرہ اٹھا لیا۔ مراد ثانی نے اپنے دور حکومت میں اس شہر کا محاصرہ کیا، لیکن 1422ء میں جون سے ستمبر تک اس کے تمام حملے بے سود ثابت ہوئے۔ بعد میں باہم صلح ہو گئی جو سلطان کی وفات تک قائم رہی۔ سلطان محمد ثانی کے نام فتح قسطنطنیہ کا عظیم الشان کارنامہ مقدر ہو چکا تھا، جس کی نسبت سے وہ ''محمد فاتح'' کہلاتا ہے۔

سلطان محمد فاتح نے سمندر کی طرف سے سامان رسد اور ہر ممکن کمک کا راستہ بند کرنے کے لیے 1452ء میں باسفورس کے یورپی ساحل پر قلعہ رومیلی حصار بنایا۔ شہر کا محاصرہ 9 اپریل 1453ء کو شروع ہوا اور جمعرات 29 مئی کو ختم ہوا۔ حملے کا خاص زور شہر کی خشکی کی طرف کی ان فصیلوں پر تھا جو توپ دروازہ اور ادرنہ دروازہ کے درمیان تھیں، جہاں محاصرہ کرنے والوں کی بھاری گولہ باری نے فصیل کا بڑا حصہ منہدم کر دیا تھا۔ اس محاصرے کے دو اہم حادثے خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں:

1۔ ترکی بیڑے کا شاخ زرین میں، جو ایک بھاری زنجیر کے ذریعے بند کر دی گئی تھی، اس طرح داخل ہو جانا کہ اسے زمین پر گھسیٹ کر شاخ زرین میں پہنچایا گیا۔

2۔ شیخ آق شمس الدین کا حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر کا دریافت کرنا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے چند روز بعد، اہل جینوا کی غلطہ نامی نواحی بستی نے بھی، جو محاصرے کے دوران میں غیر جانب دار رہی تھی، اطاعت قبول کر لی۔ فتح کے فوراً بعد کے برسوں میں سلطان نے شہر کو دوبارہ آباد کرنے اور اسے شاہی مسکن بنانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ سلطان نے فتح کے دن آیا صوفیہ میں جمعہ کی نماز پڑھی تھی اور اسے عیسائیوں سے خرید کر جامع مسجد میں تبدیل کر دیا تھا۔

مسجدوں کا شہر

استنبول کو مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے، جن کی کثرتِ تعداد، تزئین و آرائش، اور شکوہ و جلالت کے لحاظ سے پوری

دنیائے اسلام میں یہ شہر بے نظیر ہے۔ چنانچہ جامع ایا صوفیہ کی معروف عالمی مسجد کے علاوہ مندرجہ ذیل مساجد مشہور ہیں۔ جامع محمدیہ جسے سلطان فاتح نے بوزنطی شہنشاہوں کے مقبرے کی جگہ چوتھی پہاڑی پر تعمیر کرایا۔ جامع کے ساتھ آٹھ مدرسے بھی شامل ہیں۔ اسی جامع کے پاس سلطان فاتح کا مقبرہ بھی ہے۔

مسجد بایزید ثانی جو بڑے بازاروں میں ہے۔ جامع سلیمیہ جو پانچویں پہاڑی پر محلّہ فنار میں واقع ہے۔ جس میں سلطان سلیم اول کی قبر ہے۔ اسی میں سلطان عبدالمجید کی قبر بھی ہے۔

جامع شہزادہ تیسری پہاڑی پر سلطان سلیمان اول کے لیے مشہور معمار سنان نے تعمیر کی۔

جامع سلیمانیہ بھی سلطان سلیمان کی فرمائش پر سنان نے تعمیر کی۔ اس میں چار مدرسے، ایک لنگر خانہ اور دیگر مکانات ہیں۔

جامع احمدیہ آت میدان میں واقع اپنے چھ میناروں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسے سلطان احمد اول نے 1617ء میں پورا کیا۔ ماضی میں یہ سرکاری مسجد کی حیثیت رکھتی تھی، جیسے لاہور میں شاہی مسجد۔

مسجد لالہ لی۔ شاہی مسجدوں میں سب سے چھوٹی مسجد، شہر کے اندرونی حصے میں بحیرۂ مارمورا کی جانب چشمۂ لالہ کے قریب جامع سلیمیہ کے نمونے پر تعمیر کی گئی۔

یہ وہ بڑی بڑی مسجدیں ہیں جو استنبول کی فصیلوں کے اندر واقع ہیں۔ شہر کی تمام مسجدوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے۔

1920ء کے بعد استنبول ترکی کا پایۂ تخت نہیں رہا اور جمہوریہ کے قیام کے بعد شروع کے چند برسوں میں اس کی رونق اور خوشحالی میں نمایاں فرق واقع ہوا، مگر جلد ہی یہ انحطاط جاتا رہا اور استنبول کی آبادی، اقتصادی ترقی اور تہذیبی حیثیت میں پھر اضافہ ہونا شروع ہوا۔ اس وقت یہ شہر جمہوریہ ترکی کے ایک صوبے کا مرکز ہے جس میں باسفورس کے دونوں طرف کا علاقہ اور جزیرہ نمائے بوز برون کا شمال مغربی حصہ شامل ہیں۔

ترکوں پر اسلام کے گہرے اثرات

خلافت عثمانیہ کے اس پورے دور میں، یعنی جب تک استنبول دارالخلافہ رہا، ترکوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اسلام اور اس کے شعائر و آداب کا گہرا اثر رہا، ترک عام زندگی میں قرآن و سُنّت کی پابندی کو لازم سمجھتے ہیں۔ حکومت بھی کم و بیش مذہبی احکام کی پابندی کرتی رہی۔ علمائے کرام اور مفتیان عظام کی عزت و تکریم اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا رہا۔ مفتی کا درجہ عام طور پر قاضی کے بعد تھا، مگر استنبول میں مفتی اعظم قاضیوں سے زیادہ اختیارات رکھتا تھا۔ سلطان محمد فاتح نے اسے شیخ الاسلام کا لقب عطا کیا تھا۔ سلطان سلیمان نے اپنے عہد میں شیخ الاسلام کو علماء کا صدر مقرر کر دیا اور اس حیثیت سے اس کا عہدہ حکومت کے تمام مناصب سے بلند ہو گیا اور تقریباً سلطان کے فوراً بعد اس کا درجہ طے ہوا، کیونکہ وہی قانون شریعت کا شارح اور وکیل تھا اور اس کی حیثیت سلطان سے بہر حال اونچی تھی۔ بایزید ثانی کا معمول تھا کہ مفتی اعظم کے استقبال کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا اور اسے اپنے سے اونچی جگہ پر بٹھاتا تھا۔

سلطان سلیم اور مفتی جمالی کا واقعہ مشہور ہے۔ سلیم جب مصر کی مہم سے واپس آیا تو اس نے چاہا کہ سلطنت میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے لیے تمام عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دے، خواہ جبر واکراہ سے ہی کام لینا پڑے۔ شیخ الاسلام جمالی آفندی نے اس بناء پر فتوی دینے سے انکار کر دیا کہ سلطان محمد فاتح نے عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی عطا کی تھی اور اس معاہدے کی پابندی قانون شریعت کے لحاظ سے ضروری تھی۔ انہوں نے تین بوڑھے ینی چری بھی، جن کی عمر سو سو سال سے زیادہ تھی، بطور گواہ اس معاہدے کے ثبوت میں پیش کیے۔ یہ تینوں سلطان محمد فاتح کے پرچم تلے لڑ چکے تھے۔ فوراً سلطان سلیم کو یہ خیال ترک کر دینا پڑا۔ ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''سلیم جیسا شخص بھی شیخ الاسلام کے آگے سر جھکانے پر مجبور تھا، اور یہ کہ سلطنت عثمانیہ کا نظام اور اس کے اصول بڑے سے بڑے سلطان کی شخصیت سے زیادہ قوی تھے۔''

ترکوں پر اسلام کے گہرے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف ایڈون پیرس نے لکھا ہے کہ اناطولیہ کے ترکوں میں مذہبی جذبہ بہت گہرا ہوتا ہے اور اس کا مشاہدہ سیاحوں اور مؤرخوں نے بھی کیا ہے۔ ترک کسان نماز کا سخت پابند ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس اس کے دل میں پوری طرح بیدار رہتا ہے۔ وہ اپنا دن نماز سے شروع کرتا ہے اور نماز کے الفاظ کی تکرار اس کے سیرت و کردار پر ضرور اثر ڈالتی ہے، اور یہ اثر رمضان کے روزوں اور دوسرے مذہبی ارکان کی بجا آوری سے اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔

ترکوں کے اسلامی اخلاق و عادات کے ضمن میں مصنف لارینٹ نے وہاں کی معاشرت کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے بھی ان پر اسلام کے اثرات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے مطابق: ''اگر کوئی شخص سڑک پر کسی عورت سے ملتا ہے تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، گویا اس کی طرف دیکھنا ممنوع ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترک بے حجاب عورتوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے اگر کسی عیسائی سے کسی ترک کا جھگڑا ہو جائے اور اس عیسائی کی بیوی لڑاکا ہو تو وہ اسے ترکوں سے جھگڑنے اور بدزبانی کرنے کے لیے کھڑا کر دے گا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ کسی ترک کے لیے سب سے بڑی ذلت اور شرم کی بات یہ ہے کہ وہ عورت پر ہاتھ اٹھائے۔ زیادہ سے زیادہ جرأت اس کی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ عورت کے لیے سخت اور اہانت آمیز الفاظ استعمال کرے یا چپ رہ کر وہاں سے چلا جائے۔''

مولانا شبلی نعمانی نے 1892ء میں قسطنطنیہ کا سفر کیا تو وہ ترکوں کی فطری سادگی سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا صاحب اپنے ''سفرنامہ روم، مصر و شام'' میں لکھتے ہیں: ''ترکوں کی معاشرت میں مجھے جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے، وہ یہ کہ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے، فضول شان و شوکت کا نام نہیں۔ بڑے بڑے وزراء و امراء بازار سے نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں۔ میں نے بارہا وزیر اعظم کی سواری دیکھی ہے۔ صرف دو تین سوار پانچ سوار سے زیادہ نہیں ہوتے۔ مکانات اور تمام یومیہ معاشرت کی چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی ہے۔ عثمان پاشا، درویش پاشا، ترکی بادشاہ جس حیثیت اور رتبے کے لوگ ہیں، اس لحاظ سے ان کے مکانات کو کم از کم حیدرآباد

(دکن) کا فلک نما اور بشیر باغ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ ہمارے مولوی مہدی علی صاحب کی کوٹھی تک ہے اب بھی نہیں۔ نوکر چاکر بھی کثرت سے نہیں ہوتے، جیسا ہمارے ہاں کے نواب اور فرضی شہزادوں کے یہاں دستور ہے۔ حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فخر کریں، بجا ہے کہ انہوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایے میں پل کر بیابیانہ پن نہ چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اموی (اندلس والے) اور تیموری تو سو دو سو برس ہی میں اچھے خاصے نکیلے بن گئے تھے۔

علامہ بدیع الزماں نورسی

خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد ترکی جمہوریہ قائم ہوئی تو معاشرت و سیاست اور فکر و نظر پہ مغربی تہذیب کا عکس نمایاں کرنے کی بھرپور جد و جہد کی گئی۔ ''انجمن اتحاد و ترقی'' نے عالم اسلام سے رشتہ منقطع کر کے ترکی کو مغرب (یورپ) سے مربوط کیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے جانشینوں نے سرکاری سطح پر ملک کا قبلہ تبدیل کرنے کے لیے تمام تدابیر اختیار کیں، مگر آج بھی یہ مثل بالکل صادق آتی ہے کہ کسی ترک سے ملاقات ہو تو سمجھ لیجیے کہ:

وہ مسلمان ہے
سُنّی ہے
اور حنفی ہے

''ری پبلک'' کے قیام سے لے کر آج تک ترکوں کی اسلام پسندی نمایاں رہی ہے۔ طرق وسائل، جبر و اکراہ، ظلم و تشدد اور ترغیب و تحریص کے حربے اور وسائل ان کی مذہبی حمیت، اسلامی غیرت اور ملی جذبے کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے عہد میں اور ان کے بعد بھی ایسے مشاہیر موجود تھے جنھوں نے سخت ترین حالات میں بھی اسلام کا پرچم سربلند کیے رکھا اور سیکولرازم کی آندھی میں اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ 1924ء سے آج تک احیائے اسلام کے لیے جماعتیں اور تحریکیں بھی اٹھتی رہی ہیں۔ چنانچہ ان کی مسلسل کاوشوں کے نتیجے میں ترکی کی حالیہ (سیکولر) تاریخ میں پہلی بار 28 جون 1996ء کو اسلام پسند ''رفاہ پارٹی'' نے مخلوط حکومت تشکیل دی اور پروفیسر نجم الدین اربکان نے وزیر اعظم کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں عہدے کا حلف لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ فوج کے دباؤ اور سیاست کاروں کی اسلام مخالف سرگرمیوں خصوصاً امریکا برطانیہ کی پروپیگنڈا مہم کے سامنے ان کی حکومت گیارہ ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ اس موقع پر ترکی کے نامور صحافی محمد نظا موگلو نے بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا:

''رفاہ پارٹی پر پابندی لگائی جا سکتی ہے اور اس کے رہنماؤں کو دار و گیر میں مبتلا کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے بعض کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جا سکتا ہے۔ ایسا ماضی میں بھی ہو چکا ہے اور مستقبل میں بھی اس کا امکان موجود ہے، لیکن جمہوریہ ترکی کی 74 سالہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ترکوں کے اسلامی جذبے کو دبایا نہیں جا سکتا۔ یہ اسلامی جذبہ ماضی سے کہیں زیادہ آج اپنی اہمیت منوانے کے لیے تیار ہے، مگر مختصر مدت کے لیے کوئی برا تجربہ نہ ہوگا کہ ترکی کی فوج اور اس کے ہم نواؤں کی رسی اتنی دراز کر دی جائے جتنی کہ وہ چاہتے ہیں اور

انہیں دعوت دی جائے کہ وہ آگے آئیں اور ترکی کے اسلامی تشخص کو مسخ کرنے کا 13 نکاتی پروگرام نافذ کریں۔ اگر وہ تیار ہیں تو انہیں پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنے دیں۔ زمانہ مسلمانوں کے حق میں ہے۔ یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ دانشمندانہ اور اسلامی طریقے سے کس طرح زمانے کے اس فیصلے کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔"

ترکی جدید کی 74 سالہ تاریخ میں اسلام کے لیے جو تجدیدی، اصلاحی اور احیائی تحریکیں وقتاً فوقتاً ابھرتی رہی ہیں، ان میں سب سے پہلے شیخ بدیع الزماں سعید نورسی (1873ء۔ 1960ء) کا نام آتا ہے جن کے "130 رسائل نور" آج بھی ترک عوام ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے سیکولر نظریات اور مغربی تہذیب وطرز حکومت کے مقابلے میں ترکی میں احیائے اسلام کی ایک آواز بلند ہوئی جو نحیف ونزار، وسائل وذرائع سے محروم، مگر ایمان کی جرأت سے معمور اور روحانیت کی قوت سے سرشار آواز تھی۔ یہ آواز کمالی الحاد کے سیلاب پر بند باندھنے میں تو کامیاب نہ ہوسکی، مگر دلوں میں اسلام کی جوت ضرور جگا گئی اور تزکیہ وتربیت کے ایک مستحکم نظام کے ذریعے سیکولر انکار وافکار کو ترکوں کے دلوں پر حاوی نہ ہونے دیا، بلکہ اپنے رسائل، خطبات، بیانات اور عملی احتجاجی جدوجہد کے ذریعے عوام کا رشتہ اسلام سے قائم رکھا اور انہیں قرآنی ہدایت سے فیض یاب ہونے پر آمادہ کیا۔ یہ آواز شیخ سعید نورسی کی تھی، جن کی ذہانت، علمی قابلیت اور خداداد صلاحیت کی بناء پر علماء نے انہیں "بدیع الزماں" کا خطاب دیا۔

شیخ سعید نورسی کی دعوتی اور اصلاحی تحریک کو جمہوریہ ترکی میں تنظیم وتحریک اسلامی کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ آپ کے رسائل اور تنظیم نے ہی کمال کی زندگی میں کمالی الحاد کا مقابلہ کیا۔ سیکولر اصولوں کی مخالفت کی اور دعوت وتزکیہ کے ذریعے ترکی میں احیائے اسلام کی تخم ریزی کی، جو آگے چل کر ایک شجر سایہ دار کی شکل میں پروان چڑھا۔ لیکن شیخ نورسی کی زندگی اور تحریک نے آخری زمانے میں بالکل نیا موڑ لیا جو ماضی کے طریق کار سے مختلف بلکہ متصادم تھا۔ اس لیے شیخ نے اپنی زندگی کے ان دونوں ادوار اور فرق کرنے کے لیے پہلے دور کو "سعید القدیم" اور دوسرے دور کو "سعید الجدید" سے موسوم کیا ہے۔

شیخ سعید نورسی 1873ء میں صوبہ تبلس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں کرد خاندان میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی اور ارد گرد واقع سکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ان کا شمار علماء میں ہونے لگا۔ زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت اور تواضع وانکساری میں بچپن سے نمونہ تھے۔ آپ کی زندگی کا اصل اصول تھا: "دع ما یریبک الی ما لا یریبک (مشکوک چیزوں کو چھوڑ کر ان چیزوں کو اختیار کرو جن پر تمہیں اطمینان اور شرح صدر ہو)۔ تیر اندازی، گھڑ سواری ودوسری جسمانی کاموں کے ذریعے حفظانِ صحت کے اصول ابتدا ہی سے آپ کی زندگی میں جاری وساری رہے۔ جہاد وشجاعت کا جذبہ آپ کے اندر قدرتاً موجود تھا۔ جس مسلک کو صائب اور برحق سمجھا، اس پر کسی خوف اور تردد کے بغیر عمل کیا۔

ترکی کے داخلی وخارجی مسائل، بڑی طاقتوں کی اسلام دشمنی، سازش اور ان کے مناسب حل نے آپ کو

ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھا۔ بیس برس کے تھے کہ اسی اضطراب نے آپ کو مسائل کے بھنور میں کود پڑنے پر مجبور کیا۔ ایک روز اخبار میں ایک برطانوی وزیر کا بیان پڑھا کہ ''جب تک قرآن مسلمانوں کے درمیان موجود ہے اور ان کے معاشرے میں اسے عزت و عقیدت حاصل ہے، ہمارے لیے ترقی کے راستے مسدود ہیں۔ لہٰذا ہماری کامیابی کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم اس کتاب کی قدر و منزلت میں کمی کریں۔'' یہ بیان پڑھنا تھا کہ شیخ آپے سے باہر ہو گئے اور اسی وقت عزم صمیم کیا کہ پوری زندگی قرآن کی خدمت میں بسر کریں گے۔ آپ نے شہر وان کا سفر کیا جہاں پندرہ سال تک مقیم رہے۔ وہاں جامعہ الازہر کی طرز پر ''جامعۃ الزہرا'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کرنے کا خیال آیا۔ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں الازہر (قاہرہ) کے شیخ نجیب استنبول تشریف لائے تو شیخ سعید نورسی نے ان سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات بڑی دلچسپ اور معنی خیز رہی۔ شیخ نجیب نے پوچھا: ''عثمانی حکومت اور یورپی اقوام کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟'' شیخ سعید نے سیاست سے گریز کرتے ہوئے ایسا مسکت جواب دیا، جس نے مزید سوالات کی گنجائش ختم کر دی: ''اہل یورپ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب اسلام یورپ میں قدم جما لے گا، جب کہ عثمانی خلافت میں یورپی طور طریقے رائج ہو رہے ہیں جو جلد ہی ہمارے معاشرے پر حاوی ہو جائیں گے۔''

شیخ نورسی کا جامعۃ الزہرا قائم کرنے کا منصوبہ 1951ء ہی میں روبہ عمل ہو سکا، جب کہ عدنان مندریس وزیراعظم نے آپ کو مالی امداد فراہم کی۔ اس جامعہ کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عربی، ترکی اور کردتینوں زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی، مگر سب سے زیادہ زور عربی پر تھا۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ روایتی سوم کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم کو بھی شامل نصاب کیا گیا تھا، کیونکہ ان کے بقول: ''مذہبی علوم ایمان اور روح کی روشنی ہیں، سائنسی علوم عقل و دانش کے لیے روشنی کا کام کرتے ہیں اور حق و صداقت ان دونوں کے مزاج ہی سے ظہور میں آتی ہے''۔ بہر حال جامعۃ الزہرا قائم ہوئی تاکہ ملک کے تینوں فکری و تعلیمی طبقوں میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور جدید علوم کے حاملین (اہل سکول)، مذہبی علوم کے طلبہ (اہل مدرسہ) اور طریقت کے متبعین (اہل تکیہ) کے درمیان ہم آہنگی کی راہ نکالی جا سکے۔

شیخ نے جامعۃ الزہرا کے لیے حکومت سے تعاون و امداد حاصل کرنے اور دارالحکومت کے علماء سے مناظرہ کرنے کی غرض سے وان چھوڑ کر 32 سال کی عمر میں استنبول آ گئے، جہاں سلطان عبدالحمید ثانی کا تیس سالہ دور حکومت اختتام کے قریب تھا اور ''انجمن اتحاد و ترقی'' سلطان کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ شیخ اس صورت حال میں بالکل غیر جانب دار نہ رہ سکے۔ انہوں نے سلطان کے خلاف کوئی جارحانہ رویہ اختیار نہ کیا، حالانکہ ان کی ہمدردی انجمن اتحاد و ترقی کے ساتھ تھی۔ جولائی 1908ء کی بغاوت میں شیخ نے بھی حصہ لیا تھا جس کے نتیجے میں عثمانی دستور کی از سر نو تدوین ہوئی تھی۔ چونکہ یہ بغاوت بتدریج خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور ترکی جمہوریہ کی تشکیل پر منتج ہوئی تھی، اس لیے، اسلامی جماعتیں اس کے شدید خلاف تھیں، مگر تعجب ہے کہ شیخ نورسی نے اس اقدام کا ساتھ دیا اور سلطان کے مخالفوں کی حمایت کی۔

انجمن اتحادِ محمدیؐ

مغربی فکر، تہذیب اور طرزِ حکومت سے متاثر و مرعوب نوجوان ترکوں نے ''انجمن اتحاد و ترقی'' قائم کی، جس کا مقصد سلطان عبدالحمید خان ثانی کی حکومت کا تختہ پلٹنا تھا۔ جولائی 1908ء میں ترک نوجوان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

''تنظیمات'' کی راہ سے مغربی افکار و اقدار کی برتری اور مغربی طاقتوں کی شہ پر ترکی میں داخلی انتشار پہلے ہی برپا ہو چکا تھا۔ سلطان عبدالحمید خان اپنی دینی حمیت کی وجہ سے ان نوجوانوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ جب انہیں معزول کر دیا گیا تو مغربی طاقتوں کو کھل کھیلنے کا پورا موقع مل گیا۔ اس مغربی طرزِ فکر کا مقابلہ کرنے کے لیے ''انجمن اتحادِ محمدی'' کی تشکیل کی گئی۔ ''وحدت آزادی اور اصلاح'' اس انجمن کا نعرہ قرار پایا، مگر ساتھ ہی شریعت کے نفاذ پر اصرار بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ انجمن کے بانی شیخ نورسی نے لکھا:

> ''اگر ہم نے اسلامی طریقے کے مطابق آزادی حاصل نہ کی تو استبداد اور غلامی دونوں لعنتیں پھر ہمارے اوپر مسلط ہو جائیں گی اور ہماری حیثیت قربانی کے بکرے سے زیادہ نہ ہوگی۔''

شیخ کی قائم کردہ اس انجمن کی سرگرمیوں سے نہ صرف مغرب نواز انجمن اتحاد کے رہنماؤں کو تشویش لاحق ہوئی بلکہ فری میسن نے اپنے ایک یہودی لیڈر کو آپ سے مناظرے کے لیے بھیجا۔ استنبول میں مناظرہ ہوا۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہودی آخر میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا:

> ''یہ عجیب و غریب آدمی ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے مجھے اسلام کے سلسلے میں اپنے دلائل سے مرعوب کیا ہے۔''

''انجمن اتحادِ محمدی'' 5 اپریل 1909ء کو قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانیوں میں درویش وحدتی بھی شریک تھا جو ایک اخبار ''وولکان'' کا مالک تھا۔ اس اخبار کو انجمن کا ترجمان قرار دیا گیا۔ انجمن کا مقصد اسلام کی بنیاد پر خلافت عثمانیہ کی تشکیل نو اور بنائے اسلام کی وحدت تھا۔ اخبار ''وولکان'' میں شیخ نورسی نے مغربیت اور الحاد کے خلاف مضامین اور کالموں کا سلسلہ شروع کیا۔ انجمن کی تشکیل کے فوراً بعد اپریل 1909ء ہی میں البانوی سپاہیوں کی بغاوت پھوٹ پڑی جس کے اثرات نے استنبول کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور استنبول اور دوسرے شہروں کے لوگ بھی اس بغاوت میں شریک ہو گئے۔ باغیوں کا ایک ہی نعرہ تھا کہ ''ہم شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔'' اس بغاوت کا رخ ظاہر ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی کی مغرب نواز تحریک کے خلاف تھا۔ سلونیکا کی فوج نے کمانڈر محمود شوکت پاشا کی قیادت میں اس بغاوت کو کچل دیا۔ انجمن اتحاد و ترقی کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور اس نے سلطان عبدالحمید خان کو معزول کر کے سلطان محمد رشاد کو تختِ خلافت پر بٹھا دیا۔ اپریل 1909ء کی اس ناکام بغاوت میں انجمن اتحادِ محمدی اور اس کے قائد شیخ سعید نورسی نے بھی حصہ لیا تھا۔ لہٰذا انجمن کے متعدد افراد کو گرفتار کیا گیا اور ان پر بھی سرکاری طور پر جبر و تشدد کیا گیا۔ آپ کو عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ وہاں آپ نے جو مومنانہ اور بصیرت افروز بیان دیا، اس کا ایک ایک حرف آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اگر مجھے ہزار بار زندگی ملے اور اسلامی اصولوں میں سے

مجھے کسی ایک اصول کے تحفظ و دفاع کی خاطر مجھے قربانی دینی پڑے تو مجھے ذرا بھی تردد اور اضطراب نہ ہوگا۔ میں ملت اسلامیہ کے سوا کسی اور چیز کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں کہ میں اس برزخ (جیل) کے سامنے کھڑا اس گاڑی کے انتظار میں ہوں جو مجھے آخرت تک لے جائے۔ میں نہایت شوق سے سفر آخرت کے لیے تیار ہوں، اور میں بھی پھانسی کی سزا پانے والوں میں شامل ہونے کا آرزومند ہوں۔ تم لوگوں نے میرے لیے جلاوطنی کی سزا تجویز کی ہے جو بہت معمولی سزا ہے۔ اگر تمہارے اندر طاقت ہو تو اس سے بڑی سزا دو۔۔۔۔۔۔ یہ حکومت دورِ استبداد میں عقل کی دشمن تھی اور آج زندگی کی دشمن بن گئی ہے۔ اگر موجودہ حکومت کا یہی حال رہا تو یہاں صرف پاگل لوگ ہی زندہ رہیں گے، چاروں طرف موت رقص کناں ہوگی اور ظالموں کے لیے جہنم کی زندگی مقدر ہے۔

تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ انجمن اتحاد محمدیؐ سے میرا کیا تعلق ہے؟ میرا جواب ہے کہ ہاں، مجھے فخر ہے کہ میں اس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ لیکن کیا تم بتا سکتے ہو کہ چند سر پھرے اور احمقوں کو چھوڑ کر، کس کا اس انجمن سے تعلق نہیں ہے؟ میرا دوسرا جرم یہ ہے کہ میں لادین مصنفین اور فری میسن سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کے راستے میں رکاوٹ ہوں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ ایک قلم کار کو اپنی دعوت و تبلیغ اور تحریروں میں شائستہ و مہذب ہونا چاہیے، خاص طور پر جب وہ خود کو مسلمان اور امت کا ترجمان کہتا ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جس طرح ایک باوقار اور سنجیدہ شخص کے لیے گویوں کا لباس زیب تن کرنا مناسب نہیں ہے، اسی طرح استنبول کے لیے یورپی تہذیب کو اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

مصطفیٰ کمال کے الحاد کے خلاف

شیخ بدیع الزماں سعید نورسی نے عدالت میں جو بیان دیا تھا، وہ اخبارات میں شائع ہوا، ہر مسلمان تک آپ کی آواز پہنچ گئی۔ ہزاروں عقیدت مند عدالت کے باہر جمع ہو گئے اور انہوں نے حکومت کے ظلم و استبداد کے خلاف نعرے بلند کیے اور شیخ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے گھبرا کر سزا میں تخفیف کی اور آپ کو جلد ہی جیل سے رہا کر دیا۔ آپ نے استنبول کو خیر باد کہہ کر وان کا رخ کیا اور وہاں تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگ گئے۔ بعد میں متعدد مقالات اور مضامین میں شیخ نے اپریل 1909ء کی بغاوت میں حصہ لینے والوں کو امن و امان برقرار رکھنے کی تلقین کی اور دوسری طرف ان کے مطالبات کی جائز بنیادیں بھی فراہم کیں اور انہیں قانونی و شرعی طور پر درست قرار دیا۔ شیخ نے اس بغاوت کو ایک دستوری جدوجہد سے تعبیر کیا، جس سے شریعت کی تنفیذ عمل میں آسکتی تھی اور شریعت کے نفاذ سے دستوری جدوجہد زیادہ مضبوط اور فعال ہو سکتی تھی، لیکن عوام نے شرعی حکومت اور سلطنت عثمانیہ کو ہم معنی سمجھ کر اس تحریک کا ساتھ دیا اور عثمانی خلافت کی بحالی کو اس بغاوت کا اولین مقصد تصور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ متعدد مفاد پرست گروہ بھی اس میں شامل ہو گئے اور انہوں نے نفاذ شریعت کی عسکری جدوجہد کو سبوتاژ کر دیا۔ شریعت کے نفاذ کے مطالبے کے پس پشت متعدد عوامل اور مختلف محرکات سرگرم ہو گئے۔

ان حادثات کے باوجود شیخ نورسی نے شریعت سے ہم آہنگ دستور سازی کی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ

آمریت، مطلق العنانی، استبداد اور بادشاہت کے خلاف سرگرم عمل رہے اور سیکولر ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے رہنماؤں کے فکر و نظر میں تبدیلی کے لیے بھی کوشاں رہے۔ عدالت سے رہائی کے بعد دستور سازی کی حمایت میں سلونیکا تشریف لے گئے اور وہاں دستوری جدوجہد اور شریعت سے اس کے تطابق پر تقریر کی۔ پھر مشرقی اناطولیہ میں اپنے وطن واپس آ گئے۔ یہاں قیام کے دوران بعض سوالات کے جواب میں انہوں نے دستور سازی کے مزید خدوخال واضح کیے۔ ان کے نزدیک بادشاہت کا نظام مسلمانوں کو ان کے بنیادی معاملات سے بے گانہ اور محروم رکھتا ہے۔ سلطان ہر قسم کی اطاعت اور فرماں برداری کا اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے، اور وہ ان وفاداریوں پر بھی غاصبانہ قبضہ جمانا چاہتا ہے جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، لیکن شیخ کے نزدیک اسلام کی بقا و استحکام اور اس کی سعادت و خوشحالی کسی مخصوص طرز حکومت پر منحصر نہیں ہے۔ اسلام کی قوت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے ادبار و مصائب اب ختم ہونے کو ہیں اور مستقبل اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔

پہلی جنگ عظیم (1914ء۔1918ء) کے دوران آپ نے فوج میں رضا کارانہ خدمات انجام دیں۔ دن کو اپنے عسکری فرائض بجالاتے اور شام کو واپسی پر نوجوان طلبہ کے سامنے قرآن اور اسلامی علوم کا درس دیتے۔ اسی مرحلے میں آپ نے عربی زبان میں ''اشادرات الاعجاز فی مظان الایجاز'' نامی مشہور تصنیف تیار کی۔ دوران جنگ روسیوں کے ہاتھوں قید ہو کر سائبیریا بھیج دیے گئے۔ ایک طویل عرصے تک وہاں کی تکالیف برداشت کیں، پھر وہاں سے فرار ہو کر، جرمنی، ویانا اور بلغاریہ ہوتے ہوئے آپ واپس استنبول پہنچے۔

1918ء میں خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی مغربی طاقتوں کی سازش کامیاب ہوئی، اور مختلف مغربی طاقتوں نے عثمانی سلطنت کے مختلف خطوں پر اپنا تصرف قائم کر لیا۔ انگریز استنبول پر چڑھ آئے اور انہوں نے سیاسی یلغار کے ساتھ تہذیبی و فکری یورش کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ کلیسا کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ اہم قرار پایا۔ عیسائی پادریوں نے اسلامی علماء کے سامنے اپنے چھ اشکالات پیش کیے اور ان کے مدلل جوابات کی فرمائش کی۔ علماء نے یہ سوالات شیخ کی خدمت میں رکھے اور عیسائیوں کی فرمائش کے مطابق چھ سو الفاظ میں ان کا جواب دینے کی درخواست کی۔ شیخ نورسی نے جواب میں فرمایا:

> ''یہ سوالات چھ سو الفاظ اور چھ الفاظ تو کیا، ایک لفظ میں بھی جواب دینے کے قابل نہیں ہیں، بلکہ ان سوالات کو تو پوچھنے والوں کے منہ پر دے مارنا چاہیے۔''

معاملہ پھر عدالت میں پہنچا۔ انگریزوں نے آپ کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کی، مگر اناطولیہ میں آپ کے زبردست اثرات اور اس کے سخت ردعمل کے خوف سے فیصلہ تبدیل کر دیا گیا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مقبرے کے قریب

مقبوضہ استنبول میں اپنی آمد کے دو سال بعد شیخ سعید نورسی ایک دن حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مرقد سے متصل قبرستان میں تشریف لے گئے جہاں تنہائی، سکون، سکوت، عافیت اور مراقبے کے لیے سازگار ماحول نے دل و دماغ کی گرہیں کھول دیں۔ یہ قبرستان ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں سے پورا شہر صاف نظر آتا ہے۔ شیخ نے

یہاں پہنچ کر محسوس کیا کہ نہ صرف قبرستان پر موت کا سناٹا ہے، بلکہ پورے شہر پر مردنی کی کیفیت طاری ہے۔ جنگ اور اس کے بعد شکست کی وجہ سے قدیم نظام سسک رہا ہے اور پرانی دنیا جاں بلب ہے۔ اس سے وابستہ شیخ کا وجود اور قدیم تشخص بھی اب ختم ہو رہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ زندہ اور متحرک اشخاص بھی چلتی پھرتی نعشیں ہیں، کیونکہ موت سے مفر کسی کو نہیں اور جو موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں وہی آخرت کی ابدی زندگی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اصل زندگی موت کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مرقد مبارک کے پہلو میں شیخ کے قلب و ذہن میں یہ تصور جاگزیں ہوا۔ اور وہیں سے ''سعید القدیم'' کی وفات ہوگئی اور آپ کی ذات اور شخصیت میں ''سعید الجدید'' نے جنم لیا جو پہلے سے زیادہ پاکیزہ، سعادت مند اور کامیاب فرد تھا۔

سعید القدیم کی شخصیت اپنی صلاحیتوں پر نازاں، کشمکش اور معرکہ آرائی کے لیے آمادہ، دنیاوی و سیاسی معاملات میں امیدوں، آرزوؤں اور حوصلوں سے معمور تھی۔ علمی معاملات میں مختلف مسائل پر اس نے مناظرے کیے تھے۔ ترکی کے سیاسی خلفشار پر اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا تھا اور اصلاح و تبدیلی کے لیے سرگرم عمل تھی، مگر سعید الجدید کی شخصیت معتدل و متوازن، باوقار اور سنجیدہ، اختلاف اور کشمکش سے گریز کرنے والی اور سیاسی دائرہ عمل سے اجتناب کرنے والی تھی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ شیخ نورسی نے جدید شخصیت کے روپ میں ملت اسلامیہ اور اس کے مسائل سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہاں سے شیخ نورسی دریائے باسفورس کے کنارے ایک کاشانہ میں منتقل ہو گئے۔ یہاں شیخ نے قرآن پاک کا مطالعہ اور اس پر تدبر شروع کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی تصنیف ''فتوح الغیب'' اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے ''مکتوبات'' کا بہ نظر غائر مطالعہ شیخ نے یہیں کیا۔ ان مطالعات کے نتیجے میں شیخ کو احساس ہوا کہ جیسے باطن کی ساری ظلمتیں چھٹ گئی ہیں اور قرآن کے نور نے ان کے سارے وجود کو منور کر دیا ہے۔ قرآنی نور کے اس تجربے نے شیخ کی آئندہ تمام تحریروں اور بیانات کی تحریک نے ''رسائل نور'' کا قالب اختیار کر لیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے فوج کو منظم کر کے اناطولیہ میں بیرونی طاقتوں کے حملوں کو جس طرح ناکام بنایا تھا اور ترک قوم کے اندر جس طرح بیداری، خود اعتمادی اور عزت نفس کی روح پھونک دی تھی، اس کے پیش نظر شیخ کے دل میں اس کا احترام پایا جاتا تھا۔ چنانچہ 1920ء میں مصطفیٰ کمال کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں شرکت کی دعوت شیخ کو دی گئی، جسے انہوں نے منظور کر لیا، مگر جب اس کے غیر اسلامی رجحانات اور سیکولر نظریات کا آپ کو علم ہوا تو آپ نے شرکت کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پارلیمنٹ میں مصطفیٰ کمال کی موجودگی میں ایک بصیرت افروز، مومنانہ تقریر کی، جس میں دس نکات کے تحت پارلیمنٹ کے ارکان کو نصیحت کی گئی تھی۔ آپ نے آغاز تقریر میں فرمایا:

''اے نمائندو! جان لو کہ تمہیں ایک عظیم مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

اپنی طویل تقریر میں شیخ نے دین پر ثابت قدم رہنے اور نماز قائم کرنے پر زور دیا۔ مصطفیٰ کمال یہ تقریر سن کر بلبلا اٹھا۔ اس نے خطاب کے بعد شیخ کو اپنے دفتر میں بلایا۔ دونوں میں گرما گرم بحث ہوئی۔ مصطفیٰ کمال نے سرد

لہجے میں کہا:

"بلاشبہ آپ جیسے قابل قدر اساتذہ کی ہمیں ضرورت ہے،اور ہم آپ کی عزت وتکریم کرتے ہیں،مگر ہم نے آپ کو دعوت اس لیے دی تھی کہ آپ کے قیمتی مشوروں سے استفادہ کریں۔ آپ نے تو اپنی خطابت کا سارا زور نماز پر صرف کیا اور ارکان پارلیمنٹ کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔"

شیخ نے غصے سے مصطفیٰ کمال کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا:

"پاشا۔۔۔پاشا۔۔۔۔اسلام لانے کے بعد ایک مسلمان کی سب سے بڑی ذمہ داری نماز قائم کرنا ہے۔جو شخص نماز ادا نہیں کرتا وہ خدا اور رسول ﷺ کا غدار اور بدعہد ہے اور کسی غدار اور بدعہد کا حکم ماننا واجب نہیں ہے۔"

شیخ کا تیز لب ولہجہ اور عزیمت واستقامت دیکھ کر مصطفیٰ کمال خاموش ہو گیا۔تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے معذرت کر لی اور آئندہ اس موضوع پر گفتگو کرنے میں محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔

شیخ نورسی مصطفیٰ کمال کو الحاد اور سیکولرازم کی تاریکی سے نکال کر اسلام کی روشنی میں لانا چاہتے تھے اور خدمت اسلام اور دفاع دین کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے،مگر کمالی حکومت اور لادین عناصر نے مسلسل ایسے حالات پیدا کیے کہ شیخ کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔مصطفیٰ کمال شیخ کی عوامی مقبولیت کو اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا اور ان سے عقیدت ومحبت کا اظہار کر کے انہیں اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا۔چنانچہ اس نے شیخ کو مشرقی اناطولیہ کا رئیس الواعظین مقرر کر دیا۔آپ کو دار الحکمۃ بورڈ کا رکن بنایا۔دار الحکمۃ کا مقصد قابض حکومتوں اور طاقتوں کے اثرات سے شیخ الاسلام کی آزادی کو محفوظ رکھنا تھا۔اس بورڈ کے ارکان میں مشہور ترک شاعر محمد عاکف بے اور حقیقی ازمیرلی، اسماعیل حقی جیسے لوگ بھی شامل تھے۔جب مصطفیٰ کمال پاشا نے شیخ نورسی کو ایک شاندار بنگلہ کی پیشکش کی،مگر شیخ نے ایمانی فراست سے اس کی نیت تاڑ لی اور اس کی تمام نوازشیں ٹھکرا دیں۔پارلیمنٹ کے ارکان کے منع کرنے کے باوجود انقرہ سے شیخ وان پہنچے۔

یہ 1921ء کا واقعہ ہے۔یہیں سے کمالی الحاد کی شدید مخالفت اور سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر شیخ نے خاموش دعوت وتبلیغ اور تربیت وتزکیہ پر توجہ کر دی۔

شیخ بدیع الزمان کا فکر انگیز خطبہ

شیخ بدیع الزمان سعید نورسی نے 1923ء میں شام کا سفر کیا اور شامی علماء کے اصرار پر جامع اموی میں خطبہ دیا جس میں دس ہزار سے زیادہ افراد موجود تھے۔کبار علماء کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔اس خطبے میں آپ نے جن حقائق کی نشاندہی کی تھی،وہ آگے چل کر رونما ہو کر رہے۔اگرچہ دو عالمی جنگوں اور پچیس سالہ استبدادی حکومت نے ان حقائق کے رونما ہونے میں کچھ تاخیر کی،مگر عالم اسلام کی سطح پر وہ تمام پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں،اس لیے

''خطبہ شامیہ'' کی حیثیت محض ایک رسمی تقریر کی نہیں ہے، بلکہ اسلامی عمرانیات کا مطالعہ ہے۔ یہاں اس خطبے کے چند اقتباسات دیئے جا رہے ہیں جس سے شیخ کی دعوت و تحریک کے بعض بنیادی گوشے سامنے آتے ہیں۔

آپ نے حمد و ثنا کے بعد خطبے کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا: ''میں اس منبر پر آپ کی رہنمائی کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔ رہنمائی میری حدود سے باہر کا کام ہے۔ آپ حضرات کے تعلق سے میری مثال اس طفل مکتب کی سی ہے جو صبح کو مدرسے جاتا ہے۔ پھر شام کو واپس آ کر والدین کے سامنے اپنا سبق دہراتا ہے، تاکہ جو کچھ اس نے مدرسے میں پڑھا ہے، اس کی صحت و خطا کا پتا چل جائے۔ یہی حال ہمارا اور تمام اسلامی گروہوں کا ہے۔ آپ عرب ہیں۔ ہم ترکوں کی حیثیت آپ کے شاگردوں کی ہے۔ آپ ہمارے استاد اور معلّم ہیں۔ ہم نے آپ ہی سے درس لیا ہے۔ یہاں میں وہ آموختہ دہراتا ہوں جو میں نے اپنے اساتذہ سے سیکھا ہے۔''

''میں نے زندگی کے حقائق سے، اجتماعی و معاشرتی زندگی کے عمل سے، اور انسانیت جس دور سے گزر رہی ہے اس کی حقیقتوں سے یہ تعلیم پائی ہے کہ چھ مہلک بیماریاں ایسی ہیں، جنھوں نے ہمیں قرون وسطی کی ظلمتوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے، جب کہ آج اغیار اور خاص طور پر یورپین نہایت سرعت کے ساتھ مستقبل کی طرف رواں دواں ہیں اور وہ ترقی اور علمی پیش رفت کے میدانوں میں سبقت کر رہے ہیں۔ وہ مہلک بیماریاں مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ مایوسی و نامرادی، جو ہماری نفسی نامرادی و حیرت کا اصل سبب ہے۔
2۔ اجتماعی و سیاسی زندگی میں صداقت اور راست بازی کا فقدان۔
3۔ نفرت و عداوت سے محبت۔
4۔ مسلمانوں کے درمیان روحانی رابطے کی کمی۔
5۔ مختلف متعدی امراض کی طرح استبداد کا عام ہونا۔
6۔ عوامی منفعت کی پروا کیے بغیر ذاتی و شخصی مفادات میں عزائم اور ارادوں کی محصوری۔

ان چھ مہلک امراض کا علاج کرنے کے لیے قرآن کریم ہی سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے، کیونکہ قرآن ہی ہماری معاشرتی زندگی کے لیے شفاخانہ کا کام کرے گا۔ ہم اسی یونیورسل شفاخانے سے چھ کلمات کا انتخاب کرتے ہیں، کیونکہ علاج کا کوئی طریقہ اس کے سوا مجھے نہیں معلوم۔

پھر شیخ نے یہ چھ کلمات اور ان کی تشریح بیان کی:

(1) اُمید (2) مایوسی سے اجتناب (3) صداقت اور راست بازی
(4) محبت (5) رابطۂ اسلامی (6) شوریٰ

''امید'' سے شیخ کی مراد رحمت خداوندی پر اعتماد کرنا اور آخری حد تک اس کا سہارا لینا ہے۔ شیخ نے امید اور رحمت خداوندی کا سہارا لے کر عالم اسلام کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ مسلمانوں کی دنیاوی سعادت و خوشحالی، خاص طور پر عثمانیوں اور عربوں کی مادی فلاح و بہبود کا وقت آیا چاہتا ہے۔ انھی کی ترقی، بیداری اور ہوش مندی پر عالم اسلام کی ترقی و کامرانی موقوف ہے، اور اب مایوسی و نامرادی کے باوجود خوشحالی کا سورج طلوع ہونے کو ہے۔

شیخ نے فرمایا: ''میں اس منبر پر سے پورے ایمان و اعتقاد کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ پوری دنیا مایوسی کے باوجود یہ سن لے کہ مستقبل تنہا اسلام کے لیے ہے اور وہ وقت آ رہا ہے کہ قرآن اور اس کے ایمانی حقائق کے سوا کسی اور دستور کی حکومت نہ رہے گی، اس لیے ہم پر واجب ہے کہ تقدیر الٰہی کے دائرے میں اپنی موجودہ صورتِ حال پر راضی بہ رضا ہوں اور زیادہ نالہ و شیون نہ کریں، جب کہ روشن مستقبل ہمارے انتظار میں ہے، یہ ایسا دعویٰ ہے، جس کے حق میں میرے پاس متعدد دلائل ہیں۔''

اسلام معنوی ترقی کا ضامن ہے

شیخ نورسی نے اسلام کے روشن مستقبل کے حق میں ایک مضبوط دلیل یہ فراہم کی کہ اسلام مادی و معنوی ترقی کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کے اندر معنوی ترقی کی صلاحیت کی موجودگی پر گفتگو کرتے ہوئے شیخ نے فرمایا:

''یہ معلوم ہے کہ تاریخ واقعات و حقائق کا بہترین ریکارڈ اور حادثات و واقعات کا سچا گواہ ہے۔ جاپانی کمانڈر جس نے روس کو شکست دی تھی، اسلام کی عظمت و حقانیت پر مندرجہ ذیل گواہی دیتا ہے:

> ''تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کی قوت، ترقی اور کامرانی کا راز ان کی دین داری، مذہب پابندی اور اعلیٰ اخلاق و کردار میں پوشیدہ ہے۔ وہ جس قدر اپنے دین کے پابند اور اس کے اصولوں کے علم بردار ہوں گے، ترقی و کامرانی کے زینے طے کرتے رہیں گے۔ اسی طرح اس کے برعکس صورتِ حال بھی ہوگی، یعنی جس قدر دین سے ان کا تعلق کمزور ہوگا، اس کے اصولوں سے دور ہوں گے، اسی قدر پسماندہ ہوں گے اور مختلف حوادث کا شکار رہیں گے۔ وہ تنگی و بدحالی میں مبتلا ہوں گے اور محکومیت و مغلوبیت ان کا مقصد ہوگا۔ دوسرے مذاہب کا معاملہ اسلام کے برعکس ہے۔ دوسرے مذاہب کے علم بردار جس قدر اپنے دین سے دور ہوں گے، اور دین کے لیے ان کا تعصب اور ان کی شدت جس قدر کمزور ہوگی، وہ تہذیبی ترقی و کامرانی کے مراحل اتنی ہی آسانی سے طے کرلیں گے، اور جس قدر مذہب کے معاملے میں وہ متعصب اور شدت پسند ہوں گے، انحطاط و زوال میں وہ اسی قدر پھنستے جائیں گے۔''

یہ صرف جاپانی کمانڈر کی رائے نہیں، بلکہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔ تاریخ انسانی میں خوشحالی و سعادت کے دور سے لے کر آج تک تم کوئی ایسا واقعہ نہیں پاؤ گے، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمان نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس کی جگہ کسی اور مذہب کو اختیار کرلیا ہو، اور اس ترک و اخذ میں اس نے عقلی استدلال اور منطقی صحت مند دلائل کا سہارا لیا ہو۔ یہاں عوام کی تقلید سے بحث نہیں ہے، جو کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، نہ دین سے بغاوت اور اس کی اعلیٰ اقدار سے سرکشی زیرِ گفتگو ہے، کیونکہ یہ ایک دوسری چیز ہے، جب کہ دوسری طرف یہ صورتِ حال بھی ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیروکار، یہاں تک کہ تعصب کے شکار افراد بھی، جیسے قدیم روسی اور انگریز اسلام قبول کر رہے ہیں، اور ان کا قبول اسلام بحث و مطالعہ اور عقلی استدلال و محاکمہ کے بعد وجود میں آتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ افواج اور جماعتوں کی سطح پر اسلام کو قبول کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

اگر ہم اسلام کو نافذ کریں اور اپنے رویے اور افعال میں اس کے اخلاقی کمالات اور ایمانی حقائق کا مظاہرہ کریں تو دوسرے مذاہب کے پیروکار اسلام کے دامن میں گروہ در گروہ داخل ہوں گے، جب کہ نوعِ انسانی نے جہالت کی بدترین تکلیفیں جھیلی ہیں اور جدید علوم وفنون کے نتائج کی روشنی میں اس نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں، اور اس سے انسان کی حقیقت و ماہیت کا پتا چلا لیا ہے۔ اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ بغیر کسی مذہب کے یونہی زندگی گزارے، بلکہ جو لوگ بڑے ملحد اور دشمن دین بنتے ہیں، وہ بھی آخر میں خواہی نخواہی مذہب کا سہارا لیتے ہیں، کیونکہ انسان مختلف قسم کے مصائب و آفات کا شکار ہے۔ بیرونی و اندرونی حالات، ہر طرف سے دشمنوں کی یلغار کا اسے سامنا ہے، جب کہ وہ عاجز و درماندہ ہے۔ وسائل سے محروم ہے اور اس کی ضروریات لامحدود ہیں، لیکن وہ محتاج اور ضرورت مند ہے۔ اس کے لیے کوئی ملجا و ماویٰ اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کے خالق کی معرفت حاصل کرے، اس پر ایمان لے آئے اور آخرت کی تصدیق کرے۔ اس سے اس کی لامحدود آرزوئیں اور لامتناہی خواہشات پوری ہو سکتی ہیں اور جہالت کی بے ہوشی سے بیدار انسانیت کے لیے کوئی راہِ نجات اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ خالق حقیقی کا اعتراف واقرار کرے۔"

شیخ نورسی کا استدلال یہ تھا کہ آج انسانیت الحاد و بغاوت کی طغیانیوں کا سامنا کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ مذہب کی ضرورت قطعی اور حتمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار عقل وتدبر سے کام لینے، بحث وتحقیق کی فضا قائم کرنے اور تفکر کو مشعل راہ بنانے پر زور دیتا ہے، تاکہ انسان حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے۔ مثال کے طور پر:

- ☆ فاعلموا ان الله عزیز حکیم (خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے)
- ☆ فاعلم انما یتبعون اھواء ھم (سمجھ لو کہ یہ دراصل اپنی خواہشات کے پیرو ہیں)
- ☆ افلا یعقلون (کیا یہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے)
- ☆ افلا ینظرون (کیا یہ دیکھتے نہیں)
- ☆ افلا یتدبرون القرآن (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے)
- ☆ فاعتبروا یاولی الابصار (پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو)

شیخ نورسی نے ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے بیان فرمایا: "یہ آیات انسانی عقل سے خطاب کرتی ہیں اور بار بار پوچھتی ہیں، تم نے علم کا راستہ چھوڑ کر جہالت کا طریقہ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ تم نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر حق سے اعراض کیوں کیا ہے؟ کس چیز نے تمہیں دیوانگی اور جنون میں مبتلا کر دیا ہے، جب کہ تم صاحب عقل ہو، کس چیز نے تمہیں واقعات زندگی پر غور وتدبر کرنے سے منع کر دیا ہے کہ تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور صراطِ مستقیم پر نہیں چلتے؟ تم تفکر کیوں نہیں کرتے؟ اور اپنی عقلوں کو حکم کیوں نہیں بناتے کہ گمراہی سے بچ سکو؟ قرآن ہمیں آواز دے رہا ہے کہ اے لوگو! بیدار ہو جاؤ اور عبرت حاصل کرو۔ ماضی کی اقوام سے نصیحت پکڑو، اور معنوی آفات اور دنیاوی مصائب سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کرو۔"

شیخ نے اپنا یہ مؤقف صراحت سے بیان کیا کہ ہم قرآن کے خادم دلیل و برہان ہی کو تسلیم کرتے ہیں، مگر یہ

دلیل و برہان راہبوں اور درویشوں کی تقلید سے بتلانہیں ہے، بلکہ ایمانی حقائق سے معمور ہے۔ مستقبل میں عقل وعلم ہی کی حکومت ہوگی ور قرآن کے احکام ہی نافذ العمل ہوں گے، کیونکہ قرآن کی بنیاد عقل، منطق اور برہان پر ہے۔ آفتاب اسلام کو جن بدلیوں نے ڈھانپ لیا تھا، وہ اب چھٹ رہی ہیں۔ چالیس سال سے طلوع فجر کے آثار ہویدا ہیں۔ 1731ھ (1951ء) میں صبح صادق طلوع ہوا چاہتی ہے۔ اگر یہ فجر کاذب ہوئی تو تیس، چالیس کے بعد فجر صادق کے نمودار ہونے کو کوئی روک نہیں سکے گا۔''

شیخ ذرسی نے خطبہ شامیہ میں آفتاب اسلام پر گہن لگانے کے آٹھ اسباب بتائے:

1۔ اغیار اہل مغرب کی اسلام سے ناواقفیت۔

2۔ تہذیب وتمدن سے ان کی دوری وناآشنائی۔

3۔ دین اسلام کے لیے اغیار کا تعصب۔

(یہ تینوں اسباب شیخ کے تجزیے کے مطابق علمی ترقی اور تمدن کے محاسن رونما ہونے سے ختم ہو چکے ہیں۔)

4۔ راہبوں اور پادریوں کی چودھراہٹ اور نام نہاد روحانی رہنماؤں کا عوام کے ذہن وفکر پر حاوی ہونا۔

5۔ ایسے راہبوں، پادریوں اور روحانی رہنماؤں کی اندھی پیروی اور تقلید۔

حریت فکر کی تحریک عام ہونے کے بعد اور نوع انسانی میں حقائق کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہونے کے بعد چوتھی اور پانچویں رکاوٹ بھی مائل بہ زوال ہے اور جلد ہی اس قسم کی سیادت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

6۔ ہمارے اندر آمریت اور استبداد کی روح نے جڑ پکڑ لی ہے۔

7۔ شریعت اسلامی کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے ہمارے اندر بدترین اخلاق اور مذموم صفات پیدا ہو گئی ہیں۔

یہ دونوں رکاوٹیں آسانی سے دور نہ ہوں گی۔ انفرادی استبداد اس وقت ختم ہو سکتا ہے جب اجتماعی استبداد کا دروازہ بند ہو جائے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ انفرادی استبداد کو زوال آ رہا ہے، اور تیس چالیس کے بعد اجتماعی استبداد بھی رخصت ہو جائے گا۔ اگر حمیت اسلامی بیدار ہو جائے اور مذموم اخلاق کے رسوا کن نتائج سے آگاہی ہو جائے تو اس رکاوٹ کا بھی خاتمہ ہو سکتا ہے۔

8۔ پہلی نظر میں مذہب اور سائنس کے نتائج میں جو تھوڑا بہت تضاد دکھائی دے رہا ہے، وہ بھی غلبۂ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا ہے، لیکن یہ رکاوٹ بھی دور ہو رہی ہے اور میں نے اپنے رسالہ ''المعجزات القرآنیہ'' میں اس تضاد کو دور کیا ہے۔ مختلف محققین اسلام کی اس میدان میں قابل قدر خدمات رہی ہیں۔

پانچ قوتیں، چھ کلمے

شیخ بدیع الزماں نورسی نے 1923ء میں جامع اموی (دمشق) میں دس ہزار سے زیادہ افراد کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اسلام کے روشن مستقبل کی دوسری دلیل یہ دی کہ اسلام مادی ترقی اور دنیاوی خوشحالی کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانچ قوتیں عالم اسلام کے معنوی تشخص میں مجتمع ہیں، اور ان پانچ قوتوں کا ایسا زور اور دباؤ ہے کہ انہیں مغلوب نہیں کیا جاسکتا۔

عالم اسلام کی پانچ قوتیں

پہلی قوت وہ اسلامی حقیقت ہے جو تمام کمالات کی معلمہ ہے، جس نے ساڑھے تین سو ملین مسلمانوں کو جسد واحد بنا رکھا ہے اور انہیں حقیقی تمدن اور صحت مند علوم وفنون سے مسلح کر دیا ہے۔ اس قوت کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کرسکتی، نہ اسے شکست دے سکتی ہے۔

دوسری قوت وہ شدید ضرورت ہے جو تمدن اور تمام صنعتوں کی حقیقی معلمہ ہے۔ ضرورت یا اختراع ہی وہ قوت ہے جس کے لیے تکمیل کے، وسائل ومبادی مہیا ہیں۔ یہی حال فقر و مفلسی کا ہے، جس نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔ اس قوت کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے نہ اسے مغلوب بنایا جاسکتا ہے۔

تیسری قوت وہ شرعی وقانونی آزادی ہے جو انسانیت کو بلند مقاصد کی تحصیل اور اعلیٰ اقدار تک رسائی کے لیے مسابقت کے طریقوں کو تعلیم دیتی ہے، جو ظلم واستبداد کو شکست وریخت سے دوچار کرتی ہے۔ جو علوی جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرتی ہے اور حسد ورقابت، مکمل بیداری اور متنوع سرگرمیوں اور تمدنی کارناموں کے لیے انسان کو آمادہ کرتی ہے، یعنی قانونی وشرعی آزادی کا مطلب ہے، انسانیت کے شایاں درجات کمال کی طرف لپکنے، آگے بڑھنے اور جست لگانے کا جذبہ۔

چوتھی قوت ایمانی شجاعت ہے جس میں شفقت ومحبت کا آمیزہ بھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلمان ظالموں کے سامنے سر نہ جھکائے اور مظلوموں کو ذلیل نہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں آمریت اور استبداد سے مصالحت نہ کرے اور مسکینوں پر تحکم نہ جتائے اور ان کے سامنے تکبر کا اظہار نہ کرے۔ یہ شرعی آزادی کی اہم ترین اساس ہے۔

پانچویں قوت اسلام کی عزت وشوکت یعنی اللہ کے کلمے کی سربلندی ہے۔ ہمارے زمانے میں اللہ کے کلمے کی سربلندی مادی ترقی اور حقیقی تمدن پر موقوف ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ شبہ ہرگز نہ آئے کہ عالم اسلام کی

عظمت وشوکت کی حفاظت کرکے ایمان قطعی کا ادراک کرے گا۔ عالم اسلام کی معنوی شخصیت ہی مستقبل میں اس امر قطعی کو حاصل کرسکے گی۔ جس طرح ماضی میں اسلام کے خلاف تعصب کے خاتمے، عناد وسرکشی کے استیصال اور عدوان وبغاوت کی بیخ کنی کے لیے تلوار ہی واحد ذریعہ تھی، اسی طرح حقیقی تمدن، مادی ترقی اور حق وصداقت کی معنوی تلواریں ہی مستقبل میں دشمنوں کو مغلوب کریں گی اور ان کی جمعیت کو منتشر کریں گی۔''

پہلا کلمہ: اسلام کی سربلندی

''جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دنیائے اسلام کی پانچویں قوت اللہ کے کلمہ کی سربلندی ہے۔ یہی میرے نزدیک پہلا کلمہ ہے یعنی مادی ترقی اور حقیقی تمدن۔ تمدن اور ثقافت سے ہماری مراد اس کے نفع بخش اور مفید پہلو ہیں۔ بدقسمتی سے اس کے مضر اور نقصان دہ پہلوؤں کو بعض احمقوں نے محاسن تصور کرلیا ہے۔ مضر، نقصان دہ اور ہلاکت خیز تمدن نے جنگیں برپا کیں اور پوری انسانیت کو لہولہان کردیا۔ تمدن کے محاسن وبرکات اسلام کے فضل وبرکت کے ظہور سے ہی وجود میں آئیں گے۔ آج یورپ جس تمدن اور ثقافت پر ناز کرتا ہے، وہ ہدایت اور نیکی کا منبع نہیں، بلکہ ہوا وہوس، استبداد اور ناجائز مسابقت کا سرچشمہ ہے۔ اے برادرانِ اسلام! اے اہل ایمان! جب آپ کے سامنے مادی ومعنوی ترقی کے تمام وسائل وذرائع موجود ہیں، اور مستقبل میں خوشحالی وسعادت تک پہنچنے کے لیے ریلوے لائن کی طرح صراطِ مستقیم تیار ہے تو آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں؟ آپ عالم اسلام کی معنوی روح کو بے وقعت کیوں سمجھتے ہیں؟ اور نامرادی کے عالم میں یہ کیوں تصور کرنے لگتے ہیں کہ یہ دنیا اغیار کے لیے تو ترقی وخوشحالی کا گھر ہے اور مسلمانوں کے لیے پسماندگی، بدحالی اور ذلت کا مسکن ہے؟ اس طرح کی سوچ بہت بڑی غلطی ہے جس کے ارتکاب سے ہر مسلمان کو بچنا چاہیے۔''

دوسرا کلمہ: مایوسی کفر ہے

دوسرے کلمہ کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ نورسی نے فرمایا: ''میری زندگی کے تجربات نے مجھے یہ سبق سکھایا ہے کہ مایوسی سم قاتل اور کفر ہے۔ یہی مرض تھا جس نے امت کو مفلوج کردیا اور بیس ملین مسلمانوں کے ایک مشرقی ملک (ترکی) میں دو ملین افراد پر ایک مغربی سلطنت مسلط ہوگئی۔ اسی مایوسی نے ہم سے ہمارے اوصاف حمیدہ چھین لیے اور ہمیں ذاتی نفع ونقصان کے احساس میں محصور کردیا ہے۔۔۔۔ اے عرب مسلمانو! امت مسلمہ نے آپ ہی سے متانت واستقامت کا درس لیا ہے۔ میں رحمت الٰہی کی بدولت پُرامید ہوں کہ عرب جلد ہی مایوسی سے دامن چھڑا لیں گے اور اسلام کی بہادر فوج (ترک مسلمان) کی طرف تعاون، خیرسگالی اور حقیقی وفاق کا ہاتھ دراز کریں گے اور مل جل کر ساری دنیا میں قرآن کا پرچم بلند کریں گے۔''

تیسرا کلمہ: صداقت وراست بازی

''صداقت وراست بازی اسلام کی اہم ترین اساس ہے۔ جی ہاں، صدق وصفا مسلمانوں کی اجتماعی ومعاشرتی زندگی میں رشتۂ حیات ہے۔ ریا اور نمائش تو عملی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ اور مداہنت اور تصنع رذیل اور گھٹیا

درجے کا جھوٹ ہے۔اور منافقت سخت نقصان دہ جھوٹ ہے۔خود جھوٹ کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر الزام اور افترا پردازی ہے۔اس کے برعکس ایمان نام ہے صداقت کا۔اس طرح صدق اور کذب ،سچائی اور جھوٹ کے درمیان مشرق ومغرب سے بھی زیادہ فاصلہ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جس طرح آگ اور پانی میں اختلاط نہیں ہو سکتا،اسی طرح صدق اور کذب میں بھی اختلاط نہ ہو، جب کہ اس وقت سیاست حاضرہ اور ظالمانہ تشہیر نے دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی انسانیت کے اقدار و کمالات کو خلط ملط کر دیا ہے۔''

شیخ نے اس امر کی بھی صراحت کر دی کہ'' ضرورت یا مفاد عامہ کی خاطر جھوٹ بولنے کی اجازت اگرچہ بعض علماء نے عارضی طور پر دے دی ہے مگر اس دور میں اس قسم کے فتاوی پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ان فتاوی کا غلط استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصلحت اور مفاد عامہ تو شرعی احکام پر عمل کرنے پر پنہاں ہے۔ مثال کے طور پر سفر میں نماز قصر کرنے کی اجازت مشقت سے بچنے کے لیے دی گئی ہے، مگر یہ مشقت قصر کی علت نہیں ہے، کیونکہ مشقت کی کوئی متعین حد نہیں ہے، اس لیے سفر ہی اس حکم کی علت ہے۔اسی طرح مصلحت یا مفاد عامہ کو جھوٹ کے لیے علت قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ جھوٹ کی کوئی متعین حد نہیں ہے اور اس کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ شیخ نے یہ وضاحت بھی کی کہ آدمی کے سچے اور راست باز ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سچی بات کو موقع بے موقع دہراتا رہے۔ اگر سچائی کا اظہار نہ کیا جا سکتا ہو تو وہاں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے۔ غلط بیانی اور جھوٹ بولنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی۔''

چوتھا کلمہ: محبت اور خیر سگالی

شیخ نے فرمایا کہ''چوتھا کلمہ محبت اور خیر سگالی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ محبت واخوت اسلام کے مزاج وطبیعت اور اس کے اساسی روابط میں شامل ہیں۔ جو شخص نفرت اور دشمنی اپنے سینے میں پالتا ہے،اس کی مثال اس بچے کی ہے جس کا مزاج بگڑ چکا ہے،وہ رونا چاہتا ہے،اور رونے کے لیے کوئی وجہ جواز ڈھونڈتا ہے۔ بسا اوقات مچھر کے پر سے بھی ہلکی چیز اس کے رونے کا سبب بن جاتی ہے۔نفرت اور دشمنی اپنے سینے میں پالنے والے شخص کی ایک اور مثال اس زود رنج اور بدشگونی لینے والے فرد سے بھی دی جا سکتی ہے جو کسی چیز کے بارے میں خوش گمانی نہیں رکھتا، جب تک کہ بدگمانی بالکل ناممکن نہ ہو جائے۔اس طرح ایک برائی کی وجہ سے دسیوں نیکیاں چھپ جاتی ہیں۔ یہ اسلامی اخلاق کے منافی ہے، جو ہر ایک کے بارے میں خوش گمانی اور انصاف سے کام لینے کا تقاضہ کرتا ہے۔''

پانچواں کلمہ: اسلامی وحدت

شیخ نورسی نے پانچواں کلمہ 'اسلامی رابطہ' قرار دیا یعنی اتحاد بین المسلمین، جس کی مدد سے امت مسلمہ بنیان مرصوص بن سکتی ہے۔ دنیا کے تمام مسلمان ایک خاندان کی طرح باہم مربوط ومتحد ہو سکتے ہیں۔ مختلف اسلامی گروہوں اور جماعتوں میں اسلامی اخوت کے اس رابطے کو وجود میں آنا چاہیے تاکہ معنوی و مادی امور میں وہ ایک دوسرے کے دست و بازو بن سکیں۔اس نکتے کی صراحت کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:

''اس عظیم جامعہ مسجد میں موجود، اور پچاس برس کے بعد جامعۂ عالم اسلامی (بین الاقوامی

اسلامی یونیورسٹی) کے وارث بھائیو! آپ میں سے کوئی یہ عذر پیش نہ کرے کہ ہم تو پرامن ہیں اور کسی کو گزند نہیں پہنچاتے، لیکن ہم کسی کی طرف دستِ تعاون دراز بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح کا عذر نا قابل قبول ہے۔ آپ نے اتحاد اسلامی اور امت مسلمہ کی حقیقی وحدت پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں لی اور اس معاملے میں سہل انگاری کا ثبوت دیا، جس کا زبردست نقصان آپ کو پہنچا، اور وہ یہ کہ آپ نے حق کی حمایت و مدافعت نہیں کی۔ جس طرح ایک برائی بہت سی برائیوں کا سبب بنتی ہے، اسی طرح ہمارے زمانے میں نیکی کا فائدہ نیکی کرنے والے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملتا ہے اور ان کے درمیان مادی و معنوی رشتے اور روابط مستحکم ہوتے ہیں۔''

عربوں کو اسلامی وحدت اور دینی اتحاد کی دعوت دیتے ہوئے شیخ نے اس امید کا اظہار بھی کیا کہ آئندہ چالیس پچاس برس کے بعد عرب ممالک متحد ہوں گے، جس طرح امریکا کی ریاستوں میں اتحاد ہوا ہے، اور اس وقت عرب اپنے کھوئے ہوئے بلند مقام کا احیاء کر سکیں گے، متحدہ اسلامی قیادت پیدا کریں گے اور نصف کرۂ ارض پر رحمت عام بن کر حکومت کریں گے۔ تاہم شیخ نے یہ صفائی بھی پیش کی: ''کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ میں اپنی اس تقریر سے آپ کو سیاست میں الجھانا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں۔ اسلامی حقیقت ہر سیاست سے بلند و برتر ہے، اور سیاست اور اس کی تمام صورتیں اور انواع اسلام ہی کی خادم ہیں۔ میں اپنے ناقص فہم کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے دور میں مسلمانوں کی اجتماعی و معاشرتی ہیئت کی مثال ایک کارخانے کی ہے، جس میں کئی موٹر، پہیے اور مختلف آلات اور مشینیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مشین بیکار ہو جائے یا ایک پرزہ دوسرے پرزے میں مل جائے تو بلا شبہ کارخانے کا میکانکی نظام معطل ہو جائے گا اور پورا کارخانہ بند ہو جائے گا۔ آج جب کہ ہمیں اسلامی ممالک کے اتحاد کے ادارے کو وجود میں لانا ہے، ایک دوسرے کی ذاتی و شخصی خطاؤں کو درگزر کیجئے اور انہیں زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔۔۔۔ ہمیں بدرجہ افسوس اور آزردگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اغیار (یا ان کا ایک گروہ) جس طرح سستی اور گھٹیا قیمت کے بدلے، ہماری دولت اور ہمارے وطن عزیز پر قابض ہوئے، اسی طرح انہوں نے ہمارے اعلیٰ اخلاق اور اوصاف حمیدہ کے ایک بڑے حصے کا سرقہ کر لیا، جس پر ہمیں فخر و ناز تھا۔ ان اوصاف و اقدار کو انہوں نے اپنی ترقی و کامرانی کے لیے نظریۂ حیات باور کیا اور اس کے بدلے اپنی گھٹیا فطرت و طبیعت اور ادنیٰ اخلاق ہمارے حوالے کر دیئے۔''

شیخ نے اغیار کے ''اعلیٰ'' نقطۂ نظر کی وضاحت میں، جو انہوں نے مسلمانوں سے اخذ و استفادہ کیا، ایک مثال پیش کی کہ آج ترقی یافتہ اقوام کا حال یہ ہے کہ ان کے ہر فرد کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ ''اگر مجھے موت آ جائے تو کوئی حرج نہیں، میری قوم کو ہر حال میں زندہ رہنا چاہیے، کیونکہ قوم زندہ رہے گی تو ہماری زندگی کی ضمانت بھی رہے گی۔'' جب کہ مسلمانوں کی خود غرضی، خود پرستی اور اپنی ذات میں مرتکز رہنے کا حال یہ ہے کہ بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ایک مسلمان یہ اعلان کر دیتا ہے: ''اگر میں پیاسا مروں تو بارش نہ ہو'' اور کہ ''اگر خوشحالی میرے نصیب میں نہیں تو کسی کے

بھی مقدر میں نہ ہو۔" یہ ابلیسی اور سفلی مزاج اور طرزِ فکر مسلمانوں کی میراث نہ تھی، یہ تو انہوں نے اغیار سے سیکھی۔ حیثیت کے پیروکار فرزند ان توحید کا سارا اثاثہ اور تہذیبی میراث لے اڑے۔ اس طرح کا طرزِ فکر محض حماقت، دین سے غفلت اور کم علمی اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔

چھٹا کلمہ: شوریٰ

شیخ نورسی نے خطبۂ شامیہ میں فرمایا: "چھٹا کلمہ شوریٰ ہے۔ قرآن ہمیں تمام معاملات میں مشورہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جس طرح افراد انسانی کے درمیان افکار و خیالات کا تبادلہ، نتیجہ ہے باہمی مشاورت اور تاریخ کے اسباق سے استفادے کا، اور یہی سبب تھا انسانیت کی ترقی کا اور اس ٹھوس بنیاد کا جس پر تمام علوم کی عمارت تعمیر ہوئی، اسی طرح ایشیا کی پسماندگی کا اہم ترین سبب شرعی شوریٰ کو نظر انداز کرنا اور اس سے بے توجہی برتنا ہے۔ جس طرح افراد کے مابین مشاورت ناگزیر ہے، اسی طرح مختلف گروہوں اور ملکوں کے درمیان بھی مشاورت واجب ہے۔ مسلمانوں کو جس قسم کے استبداد نے محصور بنا رکھا ہے اور ان کی عقل و فکر پر جو تالے پڑے ہوئے ہیں، انہیں وہ شورائی نظام ہی کھول سکتا ہے، جس سے شرعی حریت اور آزادی جنم لیتی ہے۔ اخلاص اور باہمی رابطے سے جنم لینے والی مشاورت اسی طرح کے نتائج پیدا کرتی ہے، جس طرح تین الف مل کر ایک سو گیارہ بن جاتے ہیں۔ حقیقی تعاون اور اخوت کے ماحول میں تین آدمی اپنی قوم کے لیے سو آدمیوں کے برابر ہوتے ہیں۔

قومی حمیّت یا اسلامی حمیّت

عالم اسلام میں مذہب اور سیکولرازم کے درمیان معرکہ آرائی اور اس کے نتیجے میں اسلام پسندوں اور مغرب نوازوں میں کشمکش دراصل دو مختلف و متضاد تہذیبوں کے افکار و اقدار کا نتیجہ تھی۔ شیخ بدیع الزماں سعید نورسی سے سوال کیا گیا کہ قومی حمیت اور اسلامی حمیت میں تصادم ہو تو کس کو ترجیح دی جائے تو انہوں نے کھل کر اسلامی مؤقف کی حمایت کی۔ چنانچہ سلطان رشاد نے جب روم کی سیاحت کی اور شیخ کو مشرقی ولایات کے نمائندے کی حیثیت میں اپنے ساتھ لے گیا تو ٹرین کے سفر میں ان کے دو ساتھی دو رفیقوں نے یہ نازک مسئلہ چھیڑ دیا۔ شیخ نے فرمایا:

"ہم مسلمانوں کے نزدیک دین اور قومیت اپنی ذات میں متحد ہیں، بلکہ دین قومیت کی زندگی اور اس کی روح ہے۔ جو لوگ ان میں تفریق کرتے ہیں، ان کے نزدیک دینی حمیت عوام و خواص سب پر محیط ہوتی ہے، جب کہ قومی حمیت ایک فی صد کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ ہم مسلمانوں کے نزدیک دینی احساس ہی دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ تقدیر ازلی نے تمام انبیاء کو مشرق میں مبعوث کر کے یہ اشارہ دیا ہے کہ دینی و مذہبی احساس ہی نے مشرق کو بیدار اور بلند کیا ہے اور اسی سے اس کی ترقی و ہوش مندی وابستہ ہے۔ مذہبی حمیت ہی ہماری مستحکم رسی ہے۔ یہی ہمارا مضبوط بندھن ہے اور یہی وہ نورانی سلسلہ ہے جو ہمیں منظم کرتا ہے۔"

دونوں رفیقوں نے اس پر دلیل کا مطالبہ کیا تو شیخ نے ٹرین میں بیٹھے بیٹھے، اتفاق سے ایک بچے کو دیکھا جو

ریلوے کی پٹری کے ساتھ ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس بچے کی عمر تقریباً چھ سال کی رہی ہوگی۔ شیخ نے دونوں رفیقوں سے کہا: ''اس بچے نے لسان حال سے تمہارے سوال کا جواب دیا ہے۔ وہ اس خوفناک زمینی گاڑی کی گزرگاہ سے ذرا فاصلے پر کھیلنے میں مصروف ہے، جو اپنی ہولناک آواز کی چیخ و پکار سے گویا اعلان کر رہی ہے کہ تباہی ہے، بربادی ہے اس شخص کے لیے جو میرے سامنے آئے اور میرا مقابلہ کرے۔ اس چیلنج کے باوجود یہ بچہ پوری آزادی اور جرأت کے ساتھ راستے کے کنارے کھڑا ہے، گویا اسے ٹرین کی کوئی فکر نہیں ہے اور اس گاڑی کی چیخ و پکار، خوفناک آواز اور رعب و دبدبہ کا یہ کہہ کر مذاق اڑا رہا ہے کہ اے ٹرین! تو مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔ تو ایک نظام کی پابند ہے۔ تیری لگام تیرے ڈرائیور کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تیرے بس میں نہیں ہے کہ مجھ پر ظلم کر سکے۔ تو اپنے رب کی اجازت سے اپنی راہ لے۔ اس بچے کے مقابلے میں رستم ایرانی اور ہرقل یونانی کی طرح کے عظیم پہلوانوں کو دیکھیے۔ وہ دونوں اس ٹرین کے نظام اور طریق کار سے ناواقف تھے۔ انہوں نے دور سے ٹرین کو حملہ آور ہوتے یا کسی سرنگ سے نکلتے دیکھا تو زبردست قوت و شجاعت کے باوجود ٹرین کی گزرگاہ سے ہزاروں گز دور بھاگ کھڑے ہوئے۔ ٹرین کے چیلنج سے وہ پژمردہ ہو گئے اور ان کی جسارت کافور ہو گئی اور بداعتقادی کی وجہ سے اسے مطیع گدھا سمجھنے کی بجائے خونخوار شیر تصور کر لیا۔ ان دونوں عظیم سورماؤں کے مقابلے میں وہ بچہ زیادہ جری و بہادر اور آزاد و خودمختار اس لیے ہے کہ اس کے قلب میں حقیقت اور سچائی کا تخم موجود ہے۔ ہماری زندگی کا بھی ایک نگران اور ڈرائیور ہے جو ایک نظام کے تحت اسے رواں دواں رکھتا ہے۔ جس چیز نے سورماؤں کو خوفزدہ کیا، وہ دراصل یہ حقیقت تھی کہ انہیں ان اس گاڑی کے نظام اور اس کے ڈرائیور سے ناآشنائی اور بے اطمینانی تھی۔''

اس مثال کے ذریعے شیخ نے اپنے رفیقوں کو سمجھایا کہ اس کائنات کو دیکھو، کتنے ستارے، سیارے، اجرام فلکی اور حادثات و واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب گویا بری و بحری کشتیاں اور سواریاں ہیں جن کی نکیل قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ معنوی دنیا میں اس کی نظیریں اور مثالیں موجود ہیں۔ یہ محو پرواز سیارے اپنے مسلسل اندرونی حادثات اور دھاکوں کے سبب وہم و تشکیک کے علم برداروں کو چیلنج کرتے رہتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ کائنات کے استبداد اور اس کے خوف کے وہم سے انسان کو نجات دلانے والی چیز اس کا یہ ایمان ہے کہ ہر چیز تقدیر کی پابند ہے۔ ہر فرد تقدیر الٰہی کے مطابق ہی مصروف عمل ہے۔ جو شخص دین حق کی اس حقیقت سے محروم ہوتا ہے، وہ لازمی طور پر مضمحل اور ضعیف القلب ہوتا ہے۔ اس کی ہمت و جسارت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا وجدان پراگندہ ہو جاتا ہے اور وہ کائنات اور اس کے واقعات و حوادث کا ایسا اسیر ہو جاتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حریت و شجاعت کے تمام کلمات کی بنیاد دین حق کے سوا کچھ نہیں۔ آخر میں وہ کہتے ہیں:

''تم دیکھتے نہیں کہ اس حقیقت کا ایک شعلہ جب نور اسلام سے منور اسلامی فوج کے قلب میں فروزاں ہوا تو ہماری فوج ترقی کے اس درجے پر پہنچ گئی، جس میں ہر شخص نے لشکر اسلام میں معنوی قوت کی کثرت و غلبہ کا اعتراف کیا، جب کہ سینکڑوں سال سے ہماری سلطنت زوال و انحطاط کا شکار رہی ہے۔ یہ شعلہ وہ دینی احساس تھا جس نے فوج سے کہلوایا کہ 'جہاد میں زندگی بھی ہے اور خوشحالی و سعادت بھی۔ اگر موت آئی تو شہادت کی سعادت میسر ہوگی

اور اگر فتح وغلبہ سے ہمکنار ہوئے تو غازی ہوں گے۔''

تہذیب جدید اور جہادِ اسلامی

شیخ کے دونوں رفیقوں نے یہ سوال بھی کیا کہ جدید مغربی تہذیب مذہبی جہاد کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر دونوں میں موافقت کیسے پیدا ہوگی؟ شیخ نورسی نے اس کے جواب میں فرمایا: ''تہذیب جدید غیر قانونی وسائل و ذرائع کو دفاع کے لیے اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے، پھر اس جہاد کی اجازت کیوں نہیں دیتی، اور اس کے لیے ہمت افزائی کا ماحول کیوں نہیں بناتی، جو سب سے مستحکم شریعت اور بہترین قانون ہے؟ دنیا میں جب تک برائی کا وجود ہے، نیکی اس سے جہاد کرتی رہے گی۔ جہاد ازلی و ابدی حکم ہے۔ پھر ہمارا موقف اور طرزِ عمل دفاع کا ہے، جارحیت کا نہیں۔ ہمارے دین کی اساس بھی یہی بتاتی ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ **لا اکراہ فی الدین**۔ نیز فرمایا: ''**تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا و بینکم**'' آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ شرعی حکم ہمیں مدافعت کی پوزیشن میں کھڑا کر دیتا ہے۔ لفظ ''**تعالوا**'' سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہمارا اولین فریضہ معاہدہ، اتفاق اور مفاہمت کی طرف دعوت دینا ہے۔۔۔۔ اس کے بعد ہم جہاد کا آغاز کریں۔''

شیخ نورسی نے قومی حمیت کے مقابلے میں اسلامی حمیت کی فضیلت و برتری کے اظہار و اثبات کے لیے ایک حکایت بھی بیان کی۔ انہوں نے ایک ایسے ملک کی مثال دی جہاں اسلامی حدود نافذ تھیں اور سرقہ و دیگر جرائم کا خاتمہ ہو گیا تھا اور لوگ اپنے مال و اسباب کی حفاظت کی طرف سے بے فکر رہتے تھے اور انہیں گھروں پر قفل لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی، اور اس کی وجہ شیخ نے یہ بتائی کہ اس ملک میں جب کوئی شخص چوری کا ارادہ کرتا اور مال غیر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا تو سلسلہ عرش سے مربوط حد کے جاری ہونے کا حکم الٰہی اسے یاد آ جاتا اور خود اس کے قلب سے ایمان کی خاصیت کی وجہ سے عرشِ الٰہی سے نازل ہونے والے کلام ازلی کی یہ صدا گونج اٹھتی:

﴿**السارق و السارقة فاقطعوا ایدیهما**﴾ (المائدہ: 38)

''چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔''

اس اعتقاد سے اس کے علوی احساسات کے تار جھنجھنا اٹھتے اور روح کی گہرائی اور وجدان کے اندرون سے اس کی معنوی قوت چوری کے میلان پر حملہ آور ہو جاتی اور اس طرح سرقہ کا رجحان دب جاتا۔ شیخ نے اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس علوی تنبیہ اور وجدانی نصیحت سے بڑھ کر کوئی رجحان یا میلان طاقتور نہیں ہو سکتا، کیونکہ افعال صادر ہوتے ہیں قلب کے میلانات سے اور یہ میلانات پیدا ہوتے ہیں روح کے احساسات سے، اور روح حرکت میں آتی ہے ایمان کی روشنی سے۔ اس طرح دینی حمیت اور اسلامی غیرت ہی امن عامہ کے قیام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

اسلام پسندوں کے خلاف مہم

دونوں رفیقوں نے شیخ سعید نورسی کے سامنے یہ سوال بھی پیش کیا کہ تہذیب جدید نے جہاں استبداد کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے، وہیں حاملین مذہب کے خلاف بھی دشمنی و نفرت کے احساس کو بھڑکایا ہے۔ یہ دونوں

احساسات وجذبات مغرب سے ہمارے ہاں در آئے ہیں۔نئی تہذیب وثقافت پر فریفتہ نوجوان جس طرح تحکم اور جبرواستبداد پر حملے کر رہے ہیں،اسی طرح مذہبی ودینی شعور پر بے اعتمادی کا اظہار کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے شیخ کی رائے دریافت کی۔

شیخ نے اس کے جواب میں فرمایا:''کہ مغرب کی جانب سے تریاق اور زہر دونوں فراہم ہوئے ہیں۔استبداد کے خلاف مظلوموں کا اعلان جنگ بہت واضح ہے،لیکن مغربی ممالک میں مذہب اور مذہبی احساس کے خلاف جو نفرت وعداوت کی فضا پروان چڑھی ہے،اس کی وجہ عیسائیت اور خصوصاً کیتھولک چرچ ہے،جس نے یورپ میں بڑے ہولناک داخلی فتنے اور اضطرابات اور بغاوتیں جنم دیں اور مدتوں تک یہ مذہب داخلی سیاست کا آلہ کار بنا رہا۔ کلیسا کے محکمہ احتساب (Inquisitio) کی سفاکانہ کارروائیوں کی بدولت لاکھوں عیسائی ظلم واذیت اور دہشت وبربریت کا نشانہ بنے اور پانچ سو سال تک انسانی عقل حیران وششدر رہی کہ یہ کیسا خوفناک ڈراما کھیلا جارہا ہے۔''

شیخ نے فرمایا''کلیسا کا محکمۂ احتساب،یہ وحشی ادارہ مردہ نہیں ہوا،بلکہ اس نے تہذیب اور کلچر کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور اپنے چہرے پر ڈپلومیسی کی نقاب ڈال لی ہے۔غیر عیسائی اقوام وافراد سے ان کا رویہ اسی منافقت پر مبنی ہے۔''

کلیسا کے وحشیانہ اقدامات اور اہل دانش اور مخالف پادریوں کے خلاف ان ظالمانہ کارروائیوں کا ردعمل مغرب میں یہ ہوا کہ روح مذہب اور اہل مذہب کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی،جس میں پروٹسٹنٹ مذہب کے حامل افراد نے اپنے مخالفین سے انتقام لے لیا،لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ کیتھولک چرچ کی اس بربریت اور درندگی کے باوجود پیرس میں اسی مذہب کی حکومت ہے،جب کہ سینکڑوں فرانسیسی فلاسفہ نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔

شیخ نورسی نے کیتھولک چرچ کے مظالم کے خلاف ہونے والے (پروٹسٹنٹ) ردعمل کو اسلام سے غیر متعلق قرار دیا اور دونوں مذہب کے درمیان آسمان وزمین کا فرق کہا،کیونکہ عالم اسلام میں باہمی عداوت اور تصادم کی بنیاد مذہبی کبھی نہیں رہی بلکہ عام طور پر مسلمانوں اور ان پر ظلم وزیادتی کرنے والوں کے درمیان جنگ ہوتی رہی۔دوسرا فرق یہ ہے کہ تاریخ اسلام میں شاذونادر واقعات سے قطع نظر،سیاست کی مکارانہ ڈپلومیسی کے لیے اسلام کبھی آلہ کار نہیں بنا۔اس نمایاں فرق کے باوجود اگر مسلمانوں نے یورپ کی روش اختیار کی تو عالم اسلام آئندہ ہزار سال تک اضطراب وانتشار کا شکار رہے گا۔

دونوں رفیقوں نے اسی سے متصل دوسرا سوال پیش کیا کہ جب عالم اسلام میں نفرت اور دشمنی کا یہ جذبہ قابل قبول نہیں تھا تو ہمارے اندر یہ جذبہ کیسے سرایت کر گیا۔آخر اس کا سبب کیا ہے؟ شیخ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:''جو غیر ملکی لٹریچر ترجمہ ہو کر ہم تک منتقل ہوا ہے،اس نے اگر اپنے مقاصد اور لوازمہ کے ذریعے ہمارے افکار کو منور کیا ہے تو بیشتر اثرات اس نے ہمارے جذبات واحساسات کو اپنے اسلوب بیان اور طرز تحریر کے ذریعے الجھا دیا ہے بلکہ گمراہ کر دیا ہے۔مغرب کے مورخین،ادیب اور مفکرین کے مسلمات اور مقدس ترین اصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی خاموشی سے،لاپروائی سے یا طرز تکلم سے استہزا اور عدم احترام کا تاثر ضرور قائم کر دیتے ہیں۔ان کے طرز تحریر اور اسلوب بیان سے ہم مسلمانوں کے اندر جو فتنے رونما ہوئے،ان میں سب سے بڑا فتنہ حاملین دین متین اور

علماء مدارس دینی کے خلاف استہزا کا ماحول پیدا کرنا تھا، جب کہ علماء سب سے زیادہ عزت و تکریم اور محبت و مرحمت کے مستحق ہیں، علماء ہی اسلام کے ستون ہیں۔ البتہ مسئلہ یہ ہے کہ زمانے کے عدم تعاون کے سبب ان میں کامل اور محقق علماء کمیاب ہیں۔"

شیخ بدیع الزماں نورسی کو جلاوطنی اور قید و بند کی سزائیں

مصطفیٰ کمال پاشا کی زندگی میں پہلے اس کے رفیق، بعد ازاں اس کے سخت حریف شیخ بدیع الزماں نورسی شہر وان میں تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول تھے، کہ 1925ء میں انقرہ میں کمالی سیکولر حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی، جس کی قیادت نقشبندی رہنما سعید کے ہاتھ میں تھی۔ شیخ نورسی کا اس بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہوں نے تو اپنے مقالات اور مضامین میں باغیوں کو خون بہانے اور فتنہ و فساد برپا کرنے سے منع کیا تھا، کیونکہ طرز حکومت سے قطع نظر، جن لوگوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے گئے تھے، وہ مسلمان ہی تھے اور اس تصادم میں مسلمانوں ہی کا خون بہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود شیخ کو شک کی بنیاد پر وان سے مشرقی اناطولیہ کے ایک گاؤں بُردور میں جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے بعد تو جلاوطنی، قید و بند اور دار و گیر کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور شیخ کو مسلسل اذیتیں دی جاتی رہیں۔ پولیس کی نگرانی میں نظر بندی، عدالت میں حاضری، بے بنیاد مقدمات، جھوٹے الزامات و اتہامات نے شیخ کی زندگی اجیرن کر دی، مگر "رسائل نور" کی تصنیف و تالیف اور اس کی خفیہ ترسیل و اشاعت کا کام جاری رہا۔ اس گاؤں میں جلاوطنی کے دوران شیخ نے رسالہ "روشنی کے اولین دروازے" تصنیف کیا، جس میں قرآن کی اساسیات پر تیس اسباق شامل تھے۔ بُردور سے شیخ کو پھر جلاوطن کر کے اسپارٹا کے ایک گاؤں بارلا میں منتقل کر دیا گیا۔

بارلا میں ان سے کسی کو ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ پولیس کی سخت نگرانی میں آپ کو رکھا گیا، مگر آپ کے اوصاف حمیدہ اور کردار سے متاثر ہو کر بعض پہرے دار آپ کے گرویدہ ہو گئے اور وہ آپ کے افکار و نظریات کے ہم نوا اور مبلغ بن گئے۔ اس طرح "رسالہ نور" کی تصنیف و تالیف اور ترسیل کا موقع یہاں بھی آپ کو میسر آ گیا۔ یہاں آپ آٹھ سال تک مقید رہے۔ اپنے سارے کام خود کرتے اور کفر و الحاد کے خلاف اسلام کی شمع روشن رکھتے۔

1934ء میں آپ پر خفیہ مذہبی تنظیم قائم کرنے اور "ترکی جمہوریہ" کی بنیادیں سبوتاژ کرنے کا الزام لگایا گیا اور ایک سو بیس طلبہ کے ساتھ، جو شیخ کے "رسائل نور" رکھنے کے جرم میں حوالۂ زنداں کیے گئے تھے، آپ کو شہر "اسکی سیر" کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت کی طویل کارروائیوں کے بعد بھی کوئی ٹھوس ثبوت حکومتی افسروں کو نہ مل سکا۔ آخر کار آپ کو پندرہ دیگر افراد کے ساتھ چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔

عدالت میں جرأت مندانہ بیان

شیخ نورسی نے عدالت میں ایک جرأت مندانہ بیان میں کہا: "اے حاکمو! مجھے یہاں اس جرم میں لایا گیا ہے کہ میں رجعت پسند ہوں۔ میں نے دین کے ذریعے امن عامہ کو درہم برہم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں کہتا ہوں

کہ اسلامی علوم سے میرے تعلق کا مقصد صرف اللہ تعالٰی کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس کے سوا میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تم لوگ پوچھتے ہو کہ کیا میں کسی طریقت و تصوف کا پیرو کار ہوں؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہمارا یہ دور ایمان کی حفاظت کرنے کا دور ہے۔ طریقت و تصوف کی حفاظت کرنے کا دور نہیں ہے۔ جنت میں مسلمان بغیر کسی طریقت کی پیروی کے داخل ہو جائیں گے، مگر ایمان کے بغیر جنت میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔ تم پوچھتے ہو کہ میں عوام الناس کو اپنے گرد جمع کرنے اور جماعت چلانے کے لیے پیسہ کہاں سے لاتا ہوں؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کے پاس ایسے ثبوت کہاں سے فراہم ہوئے، جن کی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ میں کسی جمعیت کا ذمہ دار ہوں یا میں کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہوں جس میں پیسے کی ضرورت پڑتی ہے؟''

جیل سے رہائی کے بعد بحیرۂ اسود کے ساحل پر واقع ایک گاؤں کا ستامانو میں آپ کو منتقل کر دیا گیا، جہاں پولیس کی نگرانی کے باوجود اپنے عقیدت مندوں سے آپ ملاقات کرتے رہے اور انہیں ہدایت و نصیحت سے نوازتے رہے۔ یہاں آپ کا رابطہ مشرقی اناطولیہ کے دوسرے حصوں سے آنے والے کارکنوں کے ساتھ بھی رہا۔ مختلف علاقوں سے آنے والے خطوط و مکاتیب کے جوابات بھی آپ ارسال کرنے لگے۔ ان خطوط میں شیخ نے سیاسی امور پر کوئی گفتگو نہ کی، بلکہ ''رسائل نور'' کے بعض نکات کی تشریح و توضیح کی، اور اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ ان رسائل کی نقلیں تیار کر کے زیادہ سے زیادہ افراد تک انہیں پہنچایا جائے اور اس کی منظم تقسیم کا لائحہ عمل بنایا جائے۔

اس دور میں شیخ نورسی کی آواز فوجی چھاؤنیوں اور حکومت کے ایوانوں میں زیادہ زور سے گونجی اور مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنی سیکولرازم کی بنیادیں متزلزل محسوس ہونے لگیں۔ اس نے گھبرا کر 1943ء میں دنیزلی کی عدالت میں شیخ کو پھر حاضر ہونے کا حکم دیا۔ الزامات کی نوعیت وہی تھی۔ وہی حربے، وہی ہتھکنڈے پھر آزمائے گئے، مگر اس مرتبہ حکومت نے مزید تحقیق اور تلاش جرم کی غرض سے انقرہ یونیورسٹی کے ماہرین قانون اور لاء کے پروفیسروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی اور ''رسائل نور'' کی کئی نقلیں تیار کر کے کمیٹی کے ارکان کو فراہم کیں۔ کمیٹی کے بحث و مباحثے کے بعد یہ رائے دی کہ یہ رسائل خالص مذہبی نوعیت کے ہیں اور فرد جرم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ پر ایک نیا جرم عائد کیا گیا کہ وہ امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آخر کار 9 جون 1944ء کو شیخ نورسی اور ان کے ہم نواؤں کو عدالت نے بری قرار دے دیا اور جیل سے رہا کر دیئے گئے۔

سیکولرازم اور مذہب کی بحث

عدالت میں آپ نے جو بیان دیا، اس سے عوام الناس میں آپ کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ''جماعت نور'' کے کارکن قید و بند کی صعوبتیں (مدرسۂ یوسفی) کو سنت یوسفی سے تعبیر کرنے لگے، اور ''رسائل نور'' کے مشن اور پیغام کی دعوت و اشاعت میں مزید تن دہی اور جانفشانی سے لگ گئے۔ شیخ نے عدالت میں ایک طویل تقریر کی۔ جس میں سیکولرازم، جمہوریت اور مذہب کے مسائل پر آپ نے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا:

''بلاشبہ ہم جمعیت ہیں اور اس جمعیت سے تقریباً چار ملین مسلمانوں کا تعلق ہے، اور وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس جمعیت کے دستور سے، اپنے اٹوٹ تعلق کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ اس کی اہم دفعات کی بجا آوری سے سبقت کرتے

ہیں، کیونکہ مومن تو بھائی بھائی ہیں۔ ہم بھی اس جمعیت کے رکن ہیں اور ان مومن بھائیوں کو قرآنی حقائق سے متعارف کرانا ہماری ذمہ داری ہے، خواہ اس کے لیے عمر قید کی سزا ہی کیوں نہ تجویز کی جائے۔

''تم لوگ اس تحریک کو کیونکر روک سکتے ہو؟ اس کا مقصد تو قرآن کی خدمت کرنا اور اس کے حقائق سے لوگوں کو متعارف کرانا ہے۔ اس حقیقت کا تعلق ذاتِ الٰہی سے ہے، اور اس حقیقت کی تکمیل کی راہ میں کون رکاوٹ بن سکتا ہے جو براہِ راست ذاتِ الٰہی سے متعلق ہو؟

مذہب اور سیاست

''میرے مخاطب صرف عدالت کے وکلاء ہی نہیں، بلکہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے سازشی افراد بھی ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے افراد پر سیاست میں ملوث ہونے اور خفیہ جماعت قائم کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے جو صرف قرآنی آیات کی تشریح اور اس کے معجزات کی باریکیوں پر غور و بحث کرتے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر دوزی جیسا شاطر مستشرق شرمناک انداز میں قرآنی حقائق کے متعلق اعلانیہ جھوٹی باتیں کرتا ہے تو اظہار خیال آزادی کے تحت اسے جائز قرار دیا جاتا ہے اور قرآنی نور کو، جو مسلمانوں کے دلوں کو منور کرنے اور انہیں متحد رکھنے کے لیے آیا، انسانوں کے امن و امان کے لیے خطرہ بتایا جاتا ہے، اور اس کے لیے سیاست، خباثت، شرارت اور سازش جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔''

صالح جمہوریت

''تم الزام لگاتے ہو کہ میں جمہوریت کا دشمن ہوں۔ میں تم سے کہنا چاہوں گا کہ طالب علمی کے زمانے میں جب میں اپنا کھانا لے کر سکول آیا کرتا تھا تو اپنا حصہ کھانے کے بعد بچا کھچا کھانا چیونٹیوں میں تقسیم کر دیتا تھا، کیونکہ مجھے اس کی اجتماعیت بہت پسند تھی۔ ایک صالح جمہوریت کی میرے دل میں کتنی قدر ہے، تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جمہوریت کو میرے قابلِ احترام سمجھنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میں خلفاء اسلام کا احترام کرتا ہوں، کیونکہ وہ خلیفہ ہونے کے علاوہ جمہوریہ کے صدر بھی تھے۔ وہ صرف زبانی جمہوریت کے قائل نہ تھے، بلکہ صحیح معنوں پر اس کے عامل تھے۔''

سیکولرازم

''رہا سیکولرزام کا معاملہ، جسے تم سیکولر جمہوریت کہتے ہو، تو جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس کا دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ فکری و نظری آزادی کے نام پر ہر طرح کے اخلاقی جرائم، کذب، بہتان تراشی اور اللہ کی شان میں گستاخی کو تم ہر وقت ہوا دیتے ہو، یہاں تک کہ جب کبھی کسی قرآنی آیت کے ذریعے کوئی فرد تم کو خبردار کرنا چاہتا ہے تو تم برانگیختہ ہو جاتے ہو اور تم خفیہ تنظیم کے قیام، سیاست و حکومت میں دخل اندازی اور انسانیت کے لیے اصل خطرہ تمہارے افکار و نظریات ہیں جن کو تم سیکولرازم یا زیادہ جدید لفظوں میں سیکولر جمہوریت کے پردے میں چھپا کر پیش کرتے ہو۔ اگر صورتِ حال یہی رہی تو جان رکھو کہ اگر مجھے ہزار بار بھی زندگی

ملی تو میں اپنی ہر زندگی کو اسلامی حقائق میں سے کسی ایک حقیقت کو قائم کرنے کی خاطر قربان کر دوں گا۔ تم سب کے مقابلے میں صرف ایک ہی محافظ پر بھروسا کرتا ہوں۔"

دستور کی دفعہ

"تم اعتراض کرتے ہو کہ میری دینی سرگرمیوں کے پیچھے کوئی مفاد پوشیدہ ہے، اس طرح تم امن و تحفظ کا نام لے کر دین اسلام کا گلا گھونٹنا چاہتے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ "رسالہ نور" آج بیس سال سے ہدایت و معرفت کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ کیا اس مدت کے دوران ان رسائل کی وجہ سے کوئی ایک ایسا حادثہ بھی تمہارے ریکارڈ میں ہے جس سے امن عامہ کو نقصان پہنچا ہو؟ دستور کی دفعہ 163 ایسی گیند ہے، جسے تم اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہتے ہو لڑھکا دیتے ہو اور تمہاری تمام کارروائیوں کے پیچھے اسلام دشمنی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اے لوگو! سن لو، تم نے دنیا کے ذریعے دین کا سودا کیا ہے اور کفر کی دلدل میں تم بری طرح دھنس چکے ہو۔ میں پوری قوت و اعتماد کے ساتھ تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو، کر لو! ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم اسلام کی راہ میں قربان ہو جائیں۔ ہمیں تو ہر لمحہ تمہارے پھانسی کے حکم کا انتظار رہتا ہے۔ اور یہ باہر رہتے ہوئے قید اور نظر بندی کی زندگی جیل کی زندگی سے سو درجہ بدتر ہے۔"

ترکی ہیٹ

"تم مجھ پر الزام لگاتے ہو کہ میں نے گزشتہ بیس برسوں کے دوران ایک مرتبہ بھی ترکی ہیٹ استعمال نہیں کیا، اور ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنتا ہوں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی تمہاری حکومت تسلیم نہیں کی، جب کہ سترہ ملین افراد یہ پوشاک پہنتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ ان کی تعداد تو سترہ ملین تو کیا، سات ملین بھی نہیں ہے بلکہ ایسے افراد تو صفر کے برابر ہیں جو اپنی پسند سے یہ ٹوپی پہنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مٹھی بھر احمقوں کی جماعت سے بچائے جو دیوانہ وار یورپ کے پیچھے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔"

1947ء میں شیخ نورسی کو شہر فیون جلاوطن کر دیا گیا اور پولیس کی سخت نگرانی میں ملاقات کرنے اور لکھنے پڑھنے کی تمام آزادی چھین لی گئی، مگر یہاں بھی شیخ کی اصلاحی مصروفیت کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکی، اور جس عدالت میں آپ پر مقدمہ چلایا گیا تھا، اسی کے افسر اور ذمہ داران آپ کی تقریر اور "رسائل نور" سے متاثر ہو کر معتقدین کی جماعت میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کی بدولت کارکنوں کو شیخ سے ملاقات کرنے کی رخصت حاصل ہو گئی اور اس طرح دینی و ثقافتی سرگرمیوں کی سرکاری سطح پر جو اجازت ملی تھی، اس کے ضمن میں "جماعت نور" کو بھی قدرے سکون حاصل ہوا۔ فیون سے شیخ نے سیکولر کمالی حکومت کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ آپ نے لکھا:

"میں تمہارے ذریعے یہ خیالات انقرہ کے عوام تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ جب ایک شخص قاضی بھی ہے اور مدعی بھی، تو شکایت کس سے کی جائے۔ ایک زمانے تک میں اس کشمکش و پیچ میں پڑا رہا۔ آج میری حالت قیدی کی زندگی سے بدتر ہے، کیونکہ نہ تو میں پوری طرح آزاد ہوں اور نہ پوری طرح مقید۔ موجودہ زندگی کا ایک دن میری قید کی زندگی کے ایک مہینے پر بھاری ہے۔ اس شدید سردی میں میری کمزوری اور سن رسیدگی کے باوجود مجھے ہر چیز کے

استعمال سے روک دیا گیا ہے۔ میں بیس سال سے تن تنہا یہ مشکلات کو برداشت کر رہا ہوں۔

انسانیت کے ناطے اس حکومت کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ میرے حقوق کی حفاظت کرے۔ مسلسل نو ماہ کی تحقیق وتفتیش نے حکومت کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ مجھے ان تمام الزامات سے بری قرار دے، جو بیس برس سے مجھ پر لگائے جا رہے ہیں۔ اور آج کوئی شخص میری دیانت وصداقت کو جھٹلا نہیں سکتا، لیکن یہاں کچھ بیرونی طاقتیں موجود ہیں جو ہر طرح سے ملک اور وطن کو نقصان پہنچانا چاہتی ہیں۔ ان قوتوں نے مجھے خاموش کرنے اور میرا جرم ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ ان کا ایک ہی مقصد ہے کہ مجھے اس قدر پریشان کیا جائے کہ میں ان کے فیصلوں کو تسلیم کر لوں اور وہ مجھے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیں جو ظلم وزیادتی کی انتہا ہے۔ اگر بغرض محال یہ لوگ عوام کے سامنے میری زبان بند کرنے پر قادر بھی ہو گئے، تب بھی وہ ''رسائل نور'' کی آواز کو کسی طرح خاموش نہیں کر سکیں گے جو عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکی ہے۔ یہ رسالہ بیان وتقریر کی جگہ میری قائم مقامی کرے گا اور اس سرزمین کی کوئی قوت اس آواز کو دبا نہ سکے گی۔''

اسی سال 1947ء کے ماہ دسمبر میں تیسری بار آپ کو فیون ہی کی عدالت میں طلب کیا گیا۔ آپ کے ساتھ پندرہ دن ان کارکنوں کو بھی پابند سلاسل کیا گیا جو آپ کے قریبی عقیدت مند تھے۔ نیز مختلف شہروں اور قصبوں سے ان نوجوانوں کو حراست میں لے لیا گیا جو ''رسائل نور'' تقسیم کرتے تھے۔ الزامات حسب سابق خفیہ تنظیم قائم کرنے اور ریاست کی سیکولر بنیادیں منہدم کرنے سے متعلق لگائے گئے۔ جواب اور جواب الجواب کا پرانا سلسلہ شروع ہوا، مگر شیخ کو بیس ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ عدالت عالیہ نے یہ سزا منسوخ کر دی، مگر انہی الزامات کے جرم میں دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور دو سال نظر بندی کے بعد ستمبر 1949ء میں شیخ رہا ہوئے۔

''رسائل نور''

شیخ بدیع الزماں نورسی دو سال کی نظر بندی کے بعد ستمبر 1949ء میں رہا ہوئے۔ اس دوران ''رسائل نور'' کی توسیع واشاعت میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ مشرقی اناطولیہ سے آگے بڑھ کر دیار بکر کو اس دعوت کا مرکز بنایا گیا اور انقرہ اور استنبول کے یونیورسٹی طلبہ میں رسائل کی تقسیم پر خاص توجہ دی گئی اور اس کا مثبت نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی شیخ نورسی کی تعلیمات سے متعارف ہونے لگا اور بتدریج حکومتی حلقوں کی جارحانہ کارروائیوں میں کمی آئی، خاص طور سے جب مئی 1950ء میں عدنان مندریس وزیراعظم ہوئے تو انہوں نے اپنے انتخابی منشور میں اسلامی افکار واقدار کے لیے نرم رویہ اختیار کرنے کا وعدہ کیا، اور ازمیر کے ایک جلسۂ عام میں انہوں نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ:

> ''ترکی مسلمان ملک ہے اور مسلمان رہے گا اور اسلام کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کی تکمیل کی جائے گی۔''

اس سے اسلامی حلقوں کو امید پیدا ہو گئی کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے استبدادی سیکولرازم کا خاتمہ ہونے کو ہے اور

اسلام کی تہذیبی وثقافتی میراث کی بازیافت ہو سکے گی۔ شیخ سعید نورسی ۔نے عدنان مندریس کو اسلام کا ہیرو قرار دیا اور حکومتی معاملات میں اسلامی اصولوں کو اختیار کرنے کی اسے تاکید کی۔ وزیراعظم کی جانب سے کوئی خاطر خواہ ردعمل سامنے نہ آیا۔ البتہ 1925ء سے اب تک کے طویل عرصے میں پہلی بار شیخ آزادی سے نقل وحرکت کرنے اور احباب واعزہ سے ملاقات کرنے کے قابل ہو سکے۔ تاہم جلد ہی تجربات نے واضح کر دیا کہ عدنان مندریس کے اسلامی اعلانات محض سراب تھے۔ وقتی سیاسی مفادات کی تحصیل ان کا مطمح نظر تھی اور کچھ علامتی ونمائشی اقدامات کے سوا انہوں نے اسلامی اقدار کے لیے کچھ نہیں کیا۔

1952ء میں مندریس حکومت نے شیخ سعید نورسی اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا اور استنبول میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ استنبول یونیورسٹی کے طلبہ پر ''رسائل نور'' کی اشاعت اور تقسیم کی فردجرم عائد کی گئی تھی، خاص طور سے ایک رسالہ ''نوجوانوں کے لیے ایک رہنما'' کو ہدف بنایا گیا تھا۔ اس رسالے میں شیخ نورسی کے مندرجہ ذیل خیالات کو قابل اعتراض قرار دیا گیا تھا:

1۔ خواتین کے لیے حسن وخوبصورتی اور وقار کے اعتبار سے مغربی لباس کے مقابلے میں اسلامی لباس زیادہ موزوں ہے۔

2۔ تعلیم کی ہر سطح پر مذہبی تعلیم کو ضروری قرار دیا جائے۔

ان دونوں نکات کو حکومت نے ملک کے لیے خطرناک قرار دیا۔ شیخ نورسی نے بھری عدالت میں تلخ ترین تقریر کی اور حکومت سے سوال کیا کہ کیا یہ لازم ہے کہ خواتین اپنی زینت اور اپنے جسموں کی نمائش کرتی پھریں اور کیا یہ ضروری ہے کہ بچوں کی تعلیم کا انتظام اس طرح کیا جائے کہ انہیں اپنے دین کا ذرا بھی احساس اور شعور نہ ہو؟ یہ گرفتاری اور مقدمہ بازی بتاتی ہے کہ حکومت دین کے خلاف اقدامات کرنے کے لیے سیکولرازم کا نقاب استعمال کر رہی ہے۔

شیخ کو معتقدین کے ہجوم میں باعزت رہا کر دیا گیا، مگر انہیں استنبول چھوڑ کر امیرڈاگ منتقل ہونے کی ہدایت کر دی گئی۔

1953ء میں شیخ نورسی اسپارٹا منتقل ہو گئے اور زندگی کے بقیہ ایام وہیں بسر کیے۔ اس جگہ سے آپ کو بے پناہ عقیدت تھی، کیونکہ اس کے ایک گاؤں بارلا سے آپ نے ''رسالہ نور'' کی تصنیف کا کام شروع کیا تھا اور معتقدین کی ایک بڑی تعداد اس علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ یہاں ''رسائل نور'' کے بعض حصے زیور طباعت سے بھی آراستہ ہوئے، جب کہ اس سے پہلے طباعت کی سہولت حاصل نہ ہوئی تھی۔ رسائل کی نقلیں ہاتھ سے تیار کر کے کارکن عوام میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی پولیس کی تفتیش، دھمکی اور جانچ پڑتال کی ذہنی اذیتوں سے شیخ کا پیچھا نہ چھوٹا اور ان کے معتقد اور کارکن بعد میں داروگیر کا نشانہ بنتے رہے۔ شیخ نے مارچ 1960ء میں اورفہ جانے کا قصد کیا۔ وہاں پہنچتے ہی انقرہ کی حکومت نے فوراً شہر چھوڑنے اور اسپارٹا واپس جانے کے احکامات صادر کر دیے، مگر شیخ کے معتقدین نے ان کی سخت علالت کی وجہ سے حکم کی تعمیل کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے دو دن کے بعد

24 مارچ 1960ء/ 27 رمضان 1379ء کو شیخ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رسائل نور کی وسعت واشاعت

شیخ نورسی نے اپنی زندگی میں 130 رسائل نور تصنیف کیے۔ ان رسائل میں قرآنی معارف واسرار کی متصوفانہ تشریح تھی۔ شیخ نے قرآن کی باضابطہ تفسیر لکھنے کی بجائے مختلف افکار ومطالب کو، جو ان کے اپنے تجربات و مشاہدات سے پیدا ہوئے تھے، قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کیا اور اعجاز قرآن کے اچھوتے پہلوؤں پر قلم اٹھایا۔ یہ رسائل تفسیر کے طرز تحریر اور اسلوب نگارش کا نمونہ پیش کرنے کی بجائے، قلبی واردات اور نفسی کیفیات کی صوفیانہ تشریح ہیں، مگر ان میں جدید مغربی تہذیب، مادیت اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی ہے، بلکہ ترکی کے سیکولر معاشرے پر زبردست تنقید اور اصلاح حال کی ترغیب دی گئی ہے، اور یہی وہ امتیاز ہے جس نے شیخ بدیع الزماں نورسی کو صوفیا اور ارباب خانقاہ سے نکال کر مصلحین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

1890ء میں شیخ نے تبلیس میں قیام کر کے علم الکلام اور جدید علوم کی تحصیل کی تھی اور اسی وقت ان کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ جدید مادیت کے مقابلے میں قرآنی دعوت کی تعبیر وتشریح کے لیے نئے علم الکلام اور نئی طرز تشریح کی ضرورت ہے۔ قدیم زمانے میں علم الکلام نے اسلامی اساسات اور تعلیمات کے دفاع وتحفظ کا فریضہ انجام دیا تھا، لیکن اب عصر حاضر کے تقاضوں اور ضروریات کی تکمیل کے لیے علم جدید سے ہم آہنگ تفسیر وتعبیر کی ضرورت تھی۔ یہاں شیخ نے باطن کے نفسی مسائل اور تزکیہ کے طریق کار پر بھی غور وخوض کیا تھا اور مشرقی اناطولیہ کے متعدد صوفیا کی خدمت میں حاضری دی تھی اور ان کے گہرے اثرات قبول کیے تھے، مگر اس نظام طریقت کو وہ دور جدید کی اصلاح کے لیے غیر موزوں سمجھتے تھے۔

شیخ کی ابتدائی زندگی کا یہ منصوبہ ابھی تک محتاج تکمیل تھا اور نئے علم الکلام کی روشنی میں قرآنی معارف کے دفاع وتحفظ کا فریضہ ان کے ذہن میں کلبلا رہا تھا کہ جنگ عظیم اول کے آغاز ہی میں شیخ نے ایک خواب دیکھا، جس نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ انہوں نے خواب میں جبل ارادت سے آتش فشاں پھٹتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اس خواب کی تعبیر اس طرح بیان کی:

''جب میں نیند سے بیدار ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی بڑا دھماکا ہونے کو ہے اور اس دھماکے کے بعد، جو ایک انقلاب پر منتج ہوا، دفاع وتحفظ قرآن کی دیواریں منہدم ہو جائیں گی۔ تب قرآن خود براہ راست اپنا دفاع کرے گا اور تمام یورشوں اور حملوں کے مقابلے میں اس کی خداداد معجزاتی فطرت وخصوصیت اسے آہنی دیوار بنا دے گی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی نااہلی اور عدم صلاحیت کے باوجود اس معجزاتی کیفیت وفطرت کے بعض حصوں کی رونمائی اور اظہار کا موقع مجھے بھی عطا ہوگا اور یہ کہ مجھے خود یہ فریضہ انجام دینا چاہیے۔''

شیخ نے ایک دوسرے موقع پر اس امر کی بھی وضاحت کی کہ ''قدیم زمانے میں عقیدے کی بنیادیں مستحکم تھیں اور انہیں بے چون وچرا تسلیم کیا جاتا تھا۔ جزئیات وتفصیلات کے ضمن میں علمائے کرام کے اقوال مستند ومعتبر خیال کیے جاتے تھے، خواہ ان کے ساتھ دلائل کی قوت نہ ہو۔ اب ضلالت وگمراہی نے ہمارے دینی عقائد اور اساسات پر

بھی اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے، اس لیے خدائے ذوالجلال نے، جو ہر مرض کے لیے مناسب علاج بھی فراہم کرتا ہے، قرآن پاک کی تسبیحات سے روشنی کی کرن نمودار کی اور نہایت معجزانہ طریقے سے خدمتِ قرآن کے لیے میری تحریروں کو خاص کیا اور میری کمزوریوں اور عیوب پر اور افلاس اور کم مائیگی پر پردہ ڈال دیا۔"

ان تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ سعید نورسی آغاز جوانی ہی سے جدید مغربی مادیت کے مضر اثرات اور اسلامی عقائد کے خلاف اس کے چیلنج کے متعلق فکر مند تھے، اور ایک نئے علم الکلام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ 1921ء میں جب انہیں سعید القدیم سے سعید الجدید کے ذہنی سفر کا موقع ملا تو سیاست اور عمرانیات سے یکسو ہو کر "رسائل نور" کی تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور ان تحریروں کے ذریعے ذہنی و فکری تربیت کا سامان فراہم کیا، کیونکہ زمانے کی حقیقی ضرورت، جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، عوام الناس کو غلط سمت سفر سے روکنا اور صراطِ مستقیم پر قرآن کی روشنی ڈالنا ہے، تاکہ اس نور کی برکت سے غلط اور صحیح میں وہ امتیاز کر سکیں۔ یہ مقصد سیاسی سرگرمی اور انتخابات وغیرہ کے جھمیلوں سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ قرآنی روشنی کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس سے فیض نہ اٹھایا جائے یا استفادہ نہ کیا جائے، یہ تو الگ بات ہے، مگر اس کے متعلق کسی اختلاف یا شبہ یا بحث مباحثہ کی گنجائش نہیں ہے۔

شیخ نورسی نے اپنے "رسائل نور" کی تصنیف و توسیع کے محرکات پر تمثیلی و مجازی پیرائے میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پل پر سے سخت تاریکی میں گزر رہے ہیں۔ پل کے دائیں جانب ایک وسیع قبرستان، اداسی میں غرق نظر آ رہا تھا، جب کہ بائیں جانب گہرا متلاطم سمندر تھا۔ انہوں نے روشنی کے لیے ایک لیمپ سنبھال رکھا تھا، مگر یکایک دیکھا کہ ان کی راہ میں مختلف درندے کھڑے ہیں۔ لیمپ ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور اسی لمحے پورا ماحول منور ہو گیا۔ قبرستان ایک خوبصورت اور خوش منظر نخلستان نظر آنے لگا، جہاں اسماء الحسنیٰ کے ورد اور پاکیزہ گفتگو میں سارے افراد مصروف تھے۔ پل کے بائیں جانب گہرا متلاطم سمندر ایک پرسکون مرغزار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ درندے بھی اب پالتو اور بے ضرر جانور نظر آ رہے تھے۔

اس خواب کی تعبیر سعید نورسی نے اس طرح کی کہ دونوں پہاڑوں سے مراد زندگی کا آغاز و انجام یعنی مبداء و معاد تھے۔ پل کا دایاں جانب ماضی کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور بایاں جانب مستقبل کی طرف۔ پل سے مراد خود زندگی ہے۔ شمع جو گر کر ٹوٹ گئی، انانیت و نفس تھی۔ وحشی درندے جو شمع کی غلط روشنی کی وجہ سے درندے نظر آ رہے تھے، دراصل زندگی کے نشیب و فراز تھے۔ جب انانیت کی شمع ٹوٹ گئی تو سارا منظر واضح اور نمایاں ہو گیا اور خدا کی بے پایاں مہربانی اور نوازش کا مظہر دکھائی دینے لگا۔ اس خواب کو شیخ نے قرآن مجید کی متعدد آیات کی روشنی میں دیکھا۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل آیات کا اس پر انطباق کیا:

> "جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا حامی و مددگار اللہ ہے، اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ

انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔''

(سورۃ البقرہ: 257)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے۔ اس طرح روشنی پر روشنی بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

(سورہ نور: 35)

سورۃ النور کی ان آیات پر غور و تدبر کرتے ہوئے شیخ سعید نورسی نے افکار و خیالات اور عالمی رجحانات کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے رزق و معاش کی ضرورت مند دنیائے حیوانات پر نظر ڈالی اور فلسفۂ مادیت کے تناظر میں موجودہ دنیا کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تو انہیں یہ زندہ دنیا بڑی المناک اور خوفناک نظر آئی، کیونکہ اس کی کمزوری و درماندگی کے باوصف اس کی مفلسی و غربت اور شدت احتیاج نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا۔

شیخ نورسی کی تفسیر قرآن

سورۂ نور کی آیات پر غور کرنے کے بعد شیخ نورسی نے مزید لکھا، اور ملاحظہ کیجئے کہ کیسے جاندار اسلوب میں لکھا:

''چونکہ میں نے اہل غفلت کی آنکھ سے مشاہدہ کیا تھا، اس لیے میں نے ایک چیخ ماری جس میں نوحہ و ماتم شامل تھا، لیکن جب میں نے ایمان اور حکمت قرآن کی عینک استعمال کی تو یکا یک ''الرحمٰن'' کے نام سے ''الرزاق'' کے برج سے ایک مشعل نمودار ہوئی، جیسے عین دوپہر کو آفتاب نمودار ہو، جس سے مفلس و نادار اور بدحال زندہ دنیا روشنی میں نہا گئی اور رحمت کی روشنی نے اسے سایے میں ڈھانپ لیا۔ پھر میں نے اس حیوانی دنیا کے ایک دوسرے پہلو کو دیکھا تو چڑیوں کے بچے کمزوری، عاجزی اور درماندگی کے سبب پر پھڑ پھڑاتے نظر آئے، جب کہ المناک اندھیرا تھا۔ اس صورت حال نے ہر فرد بشر کو رقیق القلب اور ترحم آموز بنا دیا، چونکہ میں نے اہل غفلت کی آنکھ سے مشاہدہ کیا تھا، اس لیے حسرت و افسوس کے ساتھ ''واحسرتا'' پکارا تھا۔ اب ایمان نے میری رہنمائی کی۔ میں نے اسم ''الرحمٰن'' کو برج ''شفقت'' سے طلوع ہوتے دیکھا۔ یکا یک اس کی روشنیوں نے اس المناک اور غم زدہ دنیا کو حسین و جمیل اور خوش منظر بنا دیا اور وہ دنیا محبوب اور پسندیدہ نظر آنے لگی اور میری آنکھوں سے غم والم اور حزن و شکوہ کے بہنے والے آنسو فرحت و مسرت کے

آنسوؤں میں تبدیل ہوگئے۔"

مادہ پرست، مغرب زدہ دنیا کی الناکیوں، تباہیوں اور اندرونی و بیرونی ظلمتوں پر تنقید کرتے ہوئے شیخ نورسی نے آگے لکھا "ایسے وقت میں جب کہ میں نے بنی نوع انسان کو ظلمتوں میں غرقاب دیکھا اور قلب و روح اور عقل کے ساتھ اور اپنے تمام جذبات اور احساسات کے ساتھ، بلکہ اپنے وجود کے تمام مساموں اور ذروں کے ساتھ۔۔۔میں سخت مایوسی کے عالم میں تھا کہ یکایک قرآنی روشنی اور ایمانی قوت نے اس گمراہ کن عینک کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور بصیرت وعقل کی روشنی عطا کی۔ میں نے اس کے درمیان سے اللہ کے اسم "عادل" کو الحکیم کے برج سے، "الرحمٰن" کو الکریم کے برج سے، "الحی" کو المحسن کے برج سے "رب" کو المالک کے برج سے روشن آفتاب کی طرح طلوع ہوتے دیکھا۔ چنانچہ وہ تمام ظلمتیں کافور ہوگئیں جو بنی نوع انسان کے اندرون کی دنیاؤں پر سایہ فگن تھیں اور ایک روشن اور ضیاپاش کائنات وجود میں آگئی۔ اسی طرح جہنمی حالات کافور ہوگئے اور بدحال اور مفلس دنیا پر عالم آخرت کے روزن کھل گئے اور اسے منور کر دیا۔"

یہی اشارہ وکنایہ کی زبان اور ادبی اسلوب "رسائل نور" کی تمام تحریروں پر حاوی ہے، اور آیات قرآنی کے حوالے سے اسی طرح کے متصوفانہ تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ شیخ نے اپنے ان رسائل کو خود قرآن کریم کی حقیقی تفسیر قرار دیا ہے، کیونکہ قرآن کے معجزانہ اسرار سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس طرح ضلالت و گمراہی کی کھائیوں میں قدم رکھنے سے اس دنیا میں معنوی جہنم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح ایمان کی وادی میں داخلہ اس دنیا کی معنوی جنت سے فیض یابی کا سبب بنتا ہے۔ پھر "رسائل نور" کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جس طرح فساد و معصیت اور ارتکاب جرائم سے روحانی تکالیف ہوتی ہیں، اسی طرح اس کے برعکس حسنات، خصائل حمیدہ اور شرعی حقائق کی پابندی سے روحانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں جو جنت کی مسرتوں اور لذتوں کے مشابہ ہوتی ہیں۔ "رسائل نور" کے بارے میں ترکی کے ایک دانشور ترگت پویان نے لکھا ہے: "رسائل ارباب فساد و ضلالت کو استکبار و اصرار سے روک دیتے ہیں، بشرطیکہ وہ عقل کی دولت سے مالا مال ہوں۔"

خود شیخ بدیع الزماں نورسی نے "رسائل نور" کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "ہم اللہ تعالیٰ کے بے پایاں شکر گزار ہیں کہ ان رسائل نور کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہمارے دور کے ان زخموں کے لیے شافی تریاق کا کام کریں جن سے ابھی تک خون بہہ رہا ہے۔ یہ رسائل معجز بیان قرآن حکیم کے معجزات میں سے ایک معنوی معجزہ ہیں۔ یہ قرآن کی چند شعاعیں ہیں۔ ان رسائل نے اپنے متعدد تقابلی مطالعوں سے، سرکشی میں ملوث معاندین کے خلاف، قرآن کی شمشیر برہنہ سے جنگ چھیڑ رکھی ہے اور الہامی توحید اور ایمانی حقائق پر ۔۔۔جن کی تعداد کائنات کے ذروں کے مساوی ہے۔۔۔دلائل و براہین کے انبار لگا دیئے ہیں۔"

جدید مغرب زدہ تہذیب کے دل دادہ نوجوانوں کے لیے "رسائل نور" کے وہ حصے زیادہ پرکشش ثابت ہوئے ہیں، جن میں سائنسی ایجادات اور صنعتی وٹیکنیکل ترقیوں کے متعلق قرآن کی پیشین گوئیوں اور معجزات کا تذکرہ اور ان کی تفصیل تھی۔ ہوائی جہاز، ریلوے، ریڈیو، بجلی اور اب کمپیوٹر وغیرہ کی تمام دور جدید کی ترقیوں اور اختراعات

کی خبر وحی الٰہی کے ذریعے دے دی گئی تھی۔ دورِ جدید کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیوں اور ایجادوں کی قرآنی پیش گوئیوں اور سائنسی معجزات سے تعرض کرنا ''رسائل نور'' کا ایک خاص پہلو ہے اور اس سلسلے میں قرآن کی آیات سے استنباط و استدلال اور اس کے ذریعے قرآنی ہدایت سے فیض یاب ہونے پر زور د اصرار شیخ کا امتیازی وصف ہے۔ مثال کے طور پر شیخ نے انبیائے کرام کے معجزوں پر گفتگو کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ قرآن میں ان کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے؟ کیا اس کا مقصد محض انبیائے کرام کے معجزوں کی خبر دینا ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے؟ یا اس تذکرے سے انبیائے سابقہ کے حسی معجزات اور حضور اکرم ﷺ کے عقلی معجزۂ قرآن کے درمیان تقابل کرنا اور حضور ﷺ کی فضیلت ثابت کرنا ہے، جیسا کہ بعض مصنفین کا نقطۂ نظر ہے۔

شیخ نورسی نے انبیائے کرام کے معجزوں کے متعلق ایک اچھوتا نظریہ پیش کیا ہے جو قرآن اور سائنس کے مسئلے پر بڑا جامع، ترقی یافتہ اور حیرت انگیز نظریہ ہے۔ قرآنی معجزات کی ایسی بلند پایہ تعبیر شاید دوسرے مصنفین و مفکرین کے یہاں نظر نہ آئے۔ وہ لکھتے ہیں: ''قرآن نے انبیاء کے معجزات کا تذکرہ کر کے انسانیت کو بتا دیا ہے کہ مستقبل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایسی ترقی رونما ہوگی جس سے ان معجزات کا دوبارہ ظہور ممکن ہو جائے گا۔ ماضی میں محیر العقول طریقے سے یہ معجزات رونما ہوتے تھے، لیکن مستقبل میں نوعِ انسانی کا قافلہ اتنا ترقی یافتہ ہو چکا ہوگا کہ یہی معجزات عام طریقوں سے ہوں گے۔ گویا قرآن یہ دعوت دے رہا ہے کہ آؤ اور سعی و جہد کے ذریعے دو مہینوں کی مسافت ایک دن میں طے کرو، جیسا کہ حضرت سلیمانؑ کو یہ معجزہ عطا ہوا تھا۔ آؤ میڈیکل سائنس کے ذریعے پیچیدہ ترین امراض کا علاج دریافت کرو جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ اس طرح کے معجزات سے سرفراز تھے۔ چٹانیں کاٹ کر پانی نکالو اور انسانیت کی پیاس بجھاؤ، جس طرح حضرت موسیٰ کا عصا تھا۔''

اسی طرح شیخ نورسی نے دوسرے انبیاء کے معجزات کا تذکرہ کیا اور سائنسی و صنعتی ترقی کے ذریعے انہیں عالم وجود میں لانے کی قرآنی دعوت پر زور دیا اور آخر میں لکھا: ''ان معجزات پر قیاس کرتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن انسانیت کو معنوی و مادی ترقیوں کی طرف سے آگے بڑھانے کے لیے ہمارے سامنے اسباق اور دروس پیش کرتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ہر شے کا مربّی ہے۔

رسائل نور اور شیخ کے اصلاحی مشن کے خلاف مصطفیٰ کمال پاشا کی سیکولر حکومت اور اس کے اہل کاروں کے علاوہ سیکولر صحافیوں اور مصطفیٰ کمال پاشا کے پرستار مصنفین نے بھی شور مچایا۔ اخبارات و رسائل میں ترقی پسند، بزعم خود روشن خیال اور لادین طبقوں نے ان کے خلاف اعتراضات کا بازار گرم کر دیا۔ ایک سخت الزام یہ لگایا گیا کہ وہ کرد قومیت کے علم بردار ہیں اور اسلام کا نام لے کر دراصل اناطولیہ میں کرد ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں، جو کرد قوم پرستوں کا نصب العین تھا۔ سیکولر اخبارات اور جرائد نے ''رسائل نور'' اور شیخ کے معتقدین کے خلاف اس شدت سے پروپیگنڈا کیا تعلیم یافتہ طبقے ان کے خلاف ہو گئے۔ بے شک وہ بجا طور پر کرد خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ترکی جمہوریہ کے قیام سے پہلے وہ اپنے آپ کو ''سعید کردی'' کہتے تھے، مگر اس نسبت میں کرد قومیت کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا۔ جامعۃ الزہراء کے نصاب تعلیم میں کرد زبان کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے پر انہوں نے عمل کیا تھا، مگر ترکی اور عربی زبانوں

میں تعلیم دی جاتی تھی اور کردزبان ان دونوں زبانوں کی تابع تھی۔ مزید برآں شیخ نے اسلامی اخوت کے مقابلے میں کرد قومیت کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ کردوں کی فلاح و بہبود ترکوں کی فلاح پر موقوف ہے اور 1925ء میں ترک فوج کے خلاف کرد انقلابیوں کو ہتھیار اٹھانے سے منع کیا تھا۔

دوسرا الزام شیخ پر یہ لگایا گیا کہ انہوں نے ایک نئے سلسلۂ طریقت کی بنیاد رکھی ہے اور اس طرح 1925ء کے ترکی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ ''رسائل نور'' کا مطالعہ کرنے والے اشخاص کو جب بھی حراست میں لیا جاتا تو پریس یہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا کہ یہ افراد کسی نئے آئین کے پیروکار، صوفی سلسلۂ طریقت پر عمل کرنے والے ہیں، جب کہ اصل حقیقت صرف اتنی تھی کہ یہ اجتماعی دعاؤں کا اہتمام کرتے تھے۔ شیخ سعید نورسی نے تو طریقت کے تمام سلسلوں کو عصر حاضر کے لیے غیر موزوں قرار دیا تھا۔ انہوں نے صوفیاء کی صحبت اختیار کی تھی، مکتوبات مجدد الف ثانی کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس سے بے حد متاثر تھے، مگر اس کے باوجود وہ کسی سلسلے سے بیعت نہ تھے ان کا قول تھا کہ دور جدید کی جہالت کا مقابلہ کرنے کے لیے تصوف کارآمد نہیں ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ: ''آدمی روٹی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، ہاں پھل کے بغیر وہ زندہ ہوسکتا ہے۔ تصوف کی حیثیت پھل کی ہے اور قرآنی حقائق کی مثال روٹی کی ہے۔''

انہوں نے 1934 میں ایک عدالت میں اپنے بیان کے دوران یہ بھی کہا تھا: ''یہ دور ایمان کی حفاظت کرنے کا دور ہے۔ طریقت کی حفاظت کرنے کا دور نہیں ہے۔ جنت میں مسلمان بغیر کسی طریقت کی پابندی کیے ہوئے داخل ہو جائیں گے، مگر ایمان کے بغیر جنت میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔''

ان بے بنیاد اعتراضات سے قطع نظر یہ بات بہرحال ترکی کی اسلامی تحریکوں کے حلقوں میں گردش کرتی رہی ہے کہ شیخ سعید نورسی نے اسلامی نظام حکومت کے قیام کے دعوت دی نہ اس کا کوئی خاکہ پیش کیا، بلکہ اسلام کے سیاسی افکار سے بحث ہی نہیں کی۔ اگرچہ ان کے ''رسائل نور'' نے قرآن کی جو تعبیر و تفسیر پیش کی، اس کے سیاسی مضمرات ضرور تھے اور انہوں نے معاشرے میں ہلچل بھی برپا کی۔

دوسری تعجب خیز بات یہ ہے کہ 1925ء کی شیخ سعید کردی کی بغاوت کی آپ نے مخالفت کی، حالانکہ اس جدوجہد کا مقصد شرعی حکومت کا قیام تھا۔

تیسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ 1946ء میں شیخ اور ان کے پیروکاروں نے عدنان مندریس کی حمایت کی، بلکہ شیخ کی وفات کے بعد ان کے معتقدین نے ''ملی سلامت پارٹی'' جیسی اسلام پسند جماعت کی مخالفت کی، اس کے رہنماؤں پر بے بنیاد الزامات لگائے اور اس کے مقابلے میں ''جسٹس پارٹی'' جیسی سیکولر، ملحد اور دشمن اسلام پارٹی کی حمایت کی جو قابل افسوس اور باعثِ ندامت ہے۔

ان اصلاح طلب پہلوؤں سے قطع نظر شیخ بدیع الزماں سعید نورسی اور ان کے ''رسائل نور'' نے ترک معاشرے میں اسلامی تزکیہ وتربیت کی جو تخم ریزی کی، جدید مادیت کا مقابلہ قرآن کی روشنی کے ذریعے جس حکمت سے کیا، اور اس راہ کی تمام آزمائشوں کی جس مردانہ وار طریقے سے مزاحمت کی، وہ اسلامی ترکی کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے جس مغرب نواز سیکولرازم کا بزور آغاز کیا تھا، اس کا منہ پھیرنے والی شخصیت شیخ

نورسی تھے۔ انہی کوششوں کے نتیجے میں ترکی جمہوریہ میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار اٹھے اور انہوں نے ساتویں دہائی کے آخر میں "ملی نظام پارٹی" کی بنیاد رکھی جس نے تحریک اسلامی اور تجدید و احیائے دین کا واضح تصور ترک قوم کو دیا اور ترکوں پر اسلامی نظام حیات کے نقوش مرتسم کئے۔

خلافت کے خاتمے میں تنظیمات کا کردار

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے تک ترکی میں سیکولرازم اور مغربیت کا شجر سر سبز و شاداب اور تناور و مستحکم ہو چکا تھا، جسے ماہرین عمرانیات کے تجزیوں کے مطابق مذہب پسندی کا کوئی جھونکا نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ لیکن ایک ہی عشرے کے بعد وہی ماہرین عمرانیات اور دانشور اسلام کے شجر طیبہ کو برگ و بار لاتا دیکھنے لگے، اور ترکوں کی اپنی قدیم میراث و تہذیب کی طرف واپسی کو وہ ملک کے امن و امان اور یورپی ممالک کے مفادات کے لیے چیلنج تصور کرنے لگے اور اپنے تحقیقاتی اداروں، اکادمیوں اور ماہرین و سکالرز کو اسلامی احیاء کے اسباب و محرکات کے پتا لگانے کے لیے وقف کر دیا، تاکہ ان کا بروقت تدارک کیا جا سکے اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکا جا سکے۔
مصطفیٰ کمال پاشا، ضیا گوک الپ اور نامق کمال اور دوسرے ترک دانشوروں کے افکار و نظریات کا ترکی قوم نے گہرا اثر قبول کیا جو ترک قومیت اور سیکولر ثقافت کے مدعی اور علم بردار تھے، اور جنہوں نے پوری قوم کو اس کے تابناک ماضی اور عظیم ورثے سے کاٹ کر یورپی فکر و تاریخ میں ضم ہو جانے کی دعوت دی یا کم از کم سیکولر قومیت اور ملی وجود کا ملغوبہ تیار کر کے اسلام کے آفاقی تصور سے اسے منحرف رکھا اور ان افراد اور اداروں کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی جو اسلام کے احیاء و تجدید اور ملت کی نشاۃ ثانیہ کی آرزو رکھتے تھے، لیکن ترکی میں سیکولرازم اور مغربی تہذیب و اثرات و افکار کی توسیع و تنقید کا تجزیہ کرنے کے لیے روایتی عثمانی بیوروکریسی کی تاریخ اور اٹھارویں صدی کی تنظیمات کا ذکر کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر ترکی میں روایت پسندی اور جدیدیت کی کشمکش کو سمجھنا آسان نہ ہوگا۔

تنظیمات کا کردار

سلطنت عثمانیہ کی بنیاد دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی یکجائی پر رکھی گئی تھی اور مذہبی و دنیوی تمام اختیارات خلیفہ کی ذات میں مرتکز ہوتے تھے۔ اسلام کا یہ تصور بھی جاگزیں تھا کہ شریعت کے نفاذ کے لیے ریاست ناگزیر ہے، مگر مذہب و شریعت پر ریاست کی عملی بالادستی اس وقت بتدریج نمایاں ہوتی گئی جب قوانین میں اصلاح و تبدیلی کے لیے تنظیمات کی تحریک چلائی گئی۔ تنظیمات دراصل ان اصلاحات کو کہتے ہیں جو عثمانی حکومت اور اداروں کے سلسلے میں سلطان عبدالحمید (1823۔1861ء) کے عہد میں جاری ہوئیں اور جن کی ابتدا اس فرمان سے ہوئی جسے عام طور پر "گلخانہ کا خطِ شریف" کہا جاتا ہے۔ تنظیمات خیریہ کی ترکیب پہلے پہل سلطان محمود ثانی (1784۔1839ء) کے عہد حکومت کے آخری برسوں میں ملتی ہے۔ دور تنظیمات کا خاتمہ 1880 میں ہوا جب سلطان عبدالحمید ثانی (1842۔1918ء) کی حکومت قائم تھی۔

''فرمان خطِ شریف'' میں اس بات کا اعلان تھا کہ ساری رعایا کی آبرو، اور جان و مال محفوظ رہیں گے۔ التزام یعنی ٹیکسوں کو جارے پر دینے کا دستور موقوف ہو جائے گا۔ فوج میں بھرتی کا کام زیادہ باقاعدگی سے ہوا کرے گا۔ جملہ ملزموں کے مقدمات کھلی عدالتوں میں پیش ہوں گے۔ اہل اسلام اور دوسرے، تمام مذاہب کے پیرو قانون کی نظر میں برابر سمجھے جائیں گے۔ اس فرمان میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی تھی کہ جدید قوانین کا مقصد ''اصول عتیقہ'' میں مکمل تبدیلی لانا ہے۔ اس فرمان کا مسودہ تیار کرتے وقت مصطفیٰ رشید پاشا کا مقصد ملکی حکومت پر دوبارہ اعتماد قائم کرنا اور یورپی ممالک کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا تھا، کیونکہ داخلی امور میں ان کی مداخلت تشویشناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

فرمان خط ہمایوں (فروری 1856ء) کو غیر مسلم رعایا کے حقوق کے تحفظ کے متعلق 1839ء کے وعدوں کی مکمل توثیق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس فرمان کی خاص بات یہ تھی کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی مقدمات کے تصفیوں کے لیے مخلوط عدالتیں قائم کرنے اور ان سے متعلق جملہ قوانین کو جلد از جلد منضبط کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اور غیر ملکی طاقتوں کو یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی حدود میں اراضی کی ملکیت حاصل کر سکتی ہیں۔ تاہم یورپی طاقتوں کی دخل اندازی کا سلسلہ 1856ء کے بعد بھی ختم نہ ہوا اور وہ ترکی کے خلاف سازشوں میں مصروف رہیں۔

23 دسمبر 1876ء کو سلطنت عثمانیہ کے نئے دستور کا اعلان ہوا، لیکن اس آئینی اصلاح سے بھی کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور آئین ساز شخص مدحت پاشا کو دو ہی مہینے بعد جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے فوراً بعد سلطان عبدالحمید نے اس آئین کو نظر انداز کر دیا۔ تاہم اس دور میں اصلاحات کا سلسلہ مکمل طور پر معطل نہ کیا گیا۔ 1879ء کے قوانین سے جو خاص طور پر دیوانی محکمے کے متعلق تھے، تنظیمات کی قانون سازی ایک لحاظ سے تکمیل پا گئی۔

ان قوانین و اصلاحات میں غیر ملکی عناصر و افکار کی آمیزش بلکہ ان کی بالادستی نمایاں تھی۔ 1839ء کے بعد صوبوں کے نظم و نسق کا جو نیا طریقہ رشید پاشا نے متعارف کرایا تھا، وہ فرانسیسی طرز کا تھا۔ اسی طرح 1864ء اور 1871ء کے قانون ولایات پر بھی یہی اثر برقرار رہا۔ 1850ء کا ضابطۂ تجارت زیادہ تر فرانسیسی قانون پر مبنی تھا۔ یہی حال 1858ء کے ضابطہ تعزیرات اور 1863ء کے ضابطۂ قانون تجارت کا تھا۔ البتہ 1869ء کے ضابطۂ دیوانی میں کوشش کی گئی تھی کہ قانون ملکیت اور قانون ضمانات وغیرہ کو حنفی مذہب کے مطابق جمع کر لیا جائے۔ غیر مسلم طبقات اور جماعتوں کے لیے جو بنیادی قواعد 1860ء میں شائع ہوئے، ان کا رجحان اس طرح تھا کہ اداری امور میں کلیسائی عنصر کے اقتدار کو کم کر کے غیر کلیسائی عنصر کو زیادہ اختیار دیا جائے۔ ان جماعتوں نے عام طور پر قانون و عدالتی معاملات میں اپنی خودمختاری قائم رکھی۔

1854ء میں تعلیمی نظام کی اصلاح کی غرض سے ایک ''مجلس معارف'' مقرر ہوئی جس کے پہلے صدر فواد پاشا تھے اور بعد میں جودت پاشا۔ چنانچہ مذہبی تعلیم کی روایات سے تصادم ناگزیر تھا۔ ایک یونیورسٹی اسی سال قائم ہوئی، مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور ثانوی اور ابتدائی مدارس کے قیام میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔

1868ء میں غلط سرائے کے ثانوی مدرسے کا افتتاح ہوا، جس میں تعلیم فرانسیسی زبان میں دی جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ غیر ملکی ثقافت وتہذیب کو ترکی میں داخل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس اقدام کی بڑی سختی سے مخالفت ہوئی۔

تحریک تنظیمات کی مخالفت علماء کی جانب سے اس لیے ہوئی کہ وہ شرعی امور میں اختیارات اور حقوق سے محروم کر دیئے گئے تھے اور اس تحریک کے ذریعے اسلامی قوانین کی بہت سی دفعات پر ضرب لگائی گئی تھی۔ غیر مسلم طبقات نے ان اقدامات کے خلاف بے چینی کا اظہار اس لیے کیا کہ حقوق مساوات کے حصول میں انہیں نفع ہی نفع نظر نہیں آتا تھا۔ ان مراعات کی وجہ سے ان کی باہمی چپقلش اور اختلافات مزید وسیع ہو گئے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تنظیمات کی راہ میں حائل مشکلات زیادہ تر غیر مسلم رعایا ہی کی الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی تھیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یورپی ممالک بات بات پر ہمیشہ دخل اندازی پر اتر آتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ خود ترکی میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ان تنظیمات کو ترکی کے مفادات کے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔

مجلس معارف کے صدر احمد جودت پاشا (1822ء-1895ء) آئینی اصلاحات اور علمی وادبی ترقیات کے حق میں تھے اور ترکی کو جامد ماحول سے نکال کر ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش کھڑا کرنا چاہتے تھے، مگر فرانسیسی قوانین وضوابط کی جگہ اسلامی شریعت کے نفاذ پر ان کا اصرار تھا۔ وہ ایسے معاشرتی وسیاسی اداروں اور تنظیمات کے خلاف تھے جن میں اسلام کو کلیدی مقام حاصل نہ ہو۔ ان کے خیال میں ترکی کے زوال وانحطاط کا واحد حل یہ تھا کہ صنعتی وٹیکنیکل میدانوں میں اور فوجی وعسکری شعبوں میں تو جدیدیت ہو، لیکن ترک معاشرے کی قومی تعمیر میں اسلام کا مرکزی کردار ہو۔ جودت پاشا نے وزیر عدل وقانون کی حیثیت سے اپنے پہلے دور وزارت ہی میں ایک طرف تو قضاۃ کی تعلیم وہدایت اور عدالتی کاروبار کی اصلاح کے لیے قانونی اور شرعی نصاب مقرر کیے اور دوسری طرف اس بات کی بھی بنیاد ڈالی کہ ایک انجمن بنا کر اس کے زیر نگرانی حنفی فقہ کی بنیاد پر ایک مجلّہ یعنی مجموعۂ قانون تیار کیا جائے۔ اس قسم کے مجلّے یا ضابطے (یعنی ایسا ضابطہ جو اسلامی اصول وقواعد پر مبنی ہو) کی منظوری حاصل کرنے کے لیے جودت پاشا کو جواد پاشا اور شروانی زادہ رشدی پاشا کی تائید وحمایت حاصل تھی، لیکن علی پاشا اس تجویز کا مخالف تھا اور اس کی بجائے فرانسیسی ضابطۂ دیوانی اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

جودت پاشا کے طرز عمل اور تصانیف دونوں میں ترقی پسندی اور مذہب پسندی کا ایک خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ ایک طرف اس نے بڑے استقلال کے ساتھ ترکی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ روشن خیالی اور بیداری پیدا کرنے کی حمایت کی اور حکمران طبقے میں جہالت تعصب اور خود پرستی کے اظہار کی عوام میں رائج غلط معتقدات کی سخت مذمت کی ہے تو دوسری طرف اس کے خیالات پر اسلامی اثرات غالب ہیں اور عمر کے آخری حصے میں تنظیمات کے متعلق اس کے خیالات میں تبدیلی نظر آتی ہے، بلکہ سلطان عبدالحمید ثانی کے دور کے عام رجحانات سے ہم آہنگ ہو کر وہ رجعت پسندانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے۔

سلطان عبدالحمید ثانی پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے جدید ترقیوں کی مخالفت کی اور ترکی کو پسماندہ، مفلوک الحال اور قدامت پسند بنائے رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، حالانکہ یہ سراسر بہتان تراشی اور سلطان کے کردار کو داغ دار کرنے کی ایک یہودی سازش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب وثقافت کو مستعار لینے کے سخت خلاف تھے، کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق مشرق کی اسلامی تہذیب مکمل اور ہر پہلو سے مغربی تہذیب سے برتر اور ممتاز تھی۔ ہاں مغرب کے پاس جدید علوم تھے، جنہیں جوں کا توں اختیار کرنے کے حق میں وہ نہیں تھے، بلکہ وہ اس معاملے میں تدریج کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے:

''یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میں یورپ کی ہر نئی چیز کا مخالف ہوں، البتہ جلد بازی شیطان کی روش ہے اور اس کے مقابلے میں اطمینان اور اعتدال میرا مسلک ہے۔ ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے اس عظیم نعمت (نظام شریعت) کو ضرور رکھنا چاہیے جس سے اللہ نے ہمیں سرفراز کیا ہے۔ اسلام ترقی کا مخالف نہیں ہے، البتہ قابل قدر اور قیمتی چیزوں کو طبعی اور فطری انداز میں نافذ ہونا چاہیے۔ ان کی آمد اندرون سے اور حسب ضرورت ہو۔ ان معاملات میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی، اگر انہیں خارج سے تھوپنے کی کوشش کی جائے گی۔''

''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مقالہ نگار جے ڈینائی نے اس الزام کی تردید کی ہے کہ سلطان عبدالحمید روشن خیال نہ تھا۔ اس نے ثبوت میں ان تعلیمی اداروں کو پیش کیا ہے جو سلطان کے دور میں قائم ہوئے۔ مولانا شبلی نعمانی (1857ء۔1914ء) نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ سلطان کے دور میں تعلیمی ترقی کی رفتار کافی تیز تھی۔ چنانچہ اس کی تخت نشینی کے وقت ''مدارس رشیدیہ'' کی تعداد 96 تھی جو 1849ء میں بڑھ کر 405 ہوگئی۔ اس کے دور میں دو ہزار سے زائد نئے مدارس قائم ہوئے۔ مصارف تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ سے بڑھ کر آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ ہو گئے۔ مذکور مقالہ نگار کے مطابق سلطان نے تمام شعبوں میں مغربی علوم وفنون سے استفادہ کے لیے کالج، سکول، تربیتی مراکز اور تحقیقی ادارے قائم کیے۔ سائنس کالج، آرٹس کالج، لاء کالج، مکتب حقوق، پولیٹیکل سائنس کالج، مکتب ملکیہ، فائن آرٹس اکیڈمی، مکتب صنعت خودکفالت، کامرس، زراعت، طب، حیوانات، طبیعیات، کیمیا، بحری تجارت وغیرہ کے کالج، اساتذہ کے لیے تربیتی کالج، یتیموں، اندھوں، گونگوں اور بہروں کے لیے اسکول، ثانوی مدارس، غرضیکہ ہر علم، فن اور ہر تکنیک کے اسکول اور کالج سلطان نے قائم کیے۔ دمشق، بغداد، بیروت، سلانیک اور قونیہ وغیرہ میں ان اداروں کا جال بچھ گیا، جن میں ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اسی طرح مغربی علوم وتجربات سے استفادہ کے لیے سلطان نے فرانس اور جرمنی جیسے ملکوں میں تعلیمی اور ثقافتی وفود روانہ کیے۔

سلطان عبدالحمید ثانی کے اس روشن خیالی اور ان کی تعلیمی وسائنسی خدمات کے باوجود نوجوانوں ترکوں نے انہیں عتاب کا نشانہ بنایا اور لادین اور سیکولر عناصر کا زور بڑھتا گیا اور اسلام پسند طبقات سیاسی طور پر کمزور ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں کے ذریعے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی تجدد پسندی

مصطفیٰ کمال اتاترک کی ذہنی وفکری نشوونما اور مزاجی وطبعی ارتقا جس ماحول میں ہوا، اس کی بہترین عکاسی اس کے ترک سوانح نگار ''عرفان اورگا'' نے کی ہے۔ اسی کے مطابق وہ کالج کی زندگی ہی سے مشتعل مزاج اور حسن پرست تھا۔ شراب نوشی سے تسکین حاصل کرتا اور خدا اور حیات بعد الموت پر اعتقاد کا مذاق اڑاتا تھا۔ اسے دوسروں کو اپنی مرضی کے آگے جھکانے میں مزا آتا تھا۔ وہ کسی کو اپنے برابر کا نہ سمجھتا تھا۔ مناسٹر میں اسے والٹر اور روسو کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، جن سے اس کے باغیانہ جذبات میں مزید شدید پیدا ہوئی۔ جوانی میں ضیا گوکلپ کی تعلیمات کو اس نے گویا حفظ کرلیا، جو مذہبی آزادی اور مغربی تقلید کا نقیب اور علم بردار تھا۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال کی اصل جنگ مذہب کے خلاف تھی۔ وہ بچپن ہی سے یہ سمجھتا آیا تھا کہ دنیا کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک خدا محض ایک پراسرار اور مغالطہ آمیز نام تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ماضی میں اسلام محض ایک تخریبی طاقت رہا ہے اور اس نے ترکی اور ترک قوم کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور یہ کہ اسلام کی وجہ سے ذہنی جمود، ضعیف الاعتقادی اور توہمات کی دلدل میں پھنسے رہے۔ اس کا شروع سے مصمم ارادہ تھا کہ مذہب کو ممنوع قرار دینا چاہیے، خواہ اس کے لیے طاقت استعمال کرنی پڑے، خواہ دھوکے اور فریب سے کام لینا پڑے۔

ایک دوسرے مقام پر عرفان اورگا نے لکھا ہے کہ مصطفیٰ کمال کے نزدیک نفسیاتی اصول ونظریات اور فلسفیانہ اصلاحات واستدلالات بے معنی تھے، اس لیے قدرتی طور پر ترکی قوم کے لیے مذہب کو غیر ضروری اور بے کار قرار دینے میں اسے کوئی تامل نہ تھا، لیکن مذہب کی جگہ اس نے ترک قوم کو ایک نیا دیوتا دیا، یعنی مغربی تہذیب، تو یہ امر باعث تعجب نہ تھا، کیونکہ قوم نے اپنی روح کے لیے جنگ کی تھی۔ اس نے دوسری قوموں کی تاریخ سے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ پرانے دیوتا ذرا مشکل ہی سے مرتے ہیں، اس لیے خدا کا خیال ترکی قوم کے دل سے دیر سے نکلے گا۔

یہی سوانح نگار مذہب سے مصطفیٰ کمال کی نفرت کا تذکرہ کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھتا ہے کہ یہ کوئی راز کی بات نہ تھی کہ وہ ایک غیر مذہبی آدمی تھا۔ اسی وجہ سے یہ افواہ عام طور پر سرگرم رہتی تھی، خلافت کی منسوخی جلد عمل میں آنے والی ہے۔ اس افواہ سے مزید سنسنی پھیل گئی کہ مصطفیٰ کمال نے شیخ الاسلام کے سر پر جو قابل احترام بزرگ تھے، قرآن مجید پھینک مارا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ واقعہ پیش نہیں آیا اور یہ محض افواہ تھی۔

مغربی تہذیب سے مصطفیٰ کمال کی عقیدت وشیفتگی کا ذکر کرتے ہوئے سوانح نگار لکھتا ہے کہ وہ جس چیز کی تلقین کرتا تھا اور جس پر وہ خود بھی عمل کرتا تھا، وہ نئے خدا (مغربی تہذیب) کی پرستش اور اس کی پرجوش وفاداری تھی۔ اس نے لفظ ''تہذیب جدید'' کو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دیا۔ جب وہ جدید تہذیب

کے متعلق گفتگو کرتا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی اور اس کے چہرے پر ایسی کیفیت نمودار ہوتی تھی جو کسی صوفی کے مراقبے کے وقت اس کے چہرے پر نظر آتی ہے۔

بہر حال مصطفیٰ کمال اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ترک قوم کو مغلوب و مسحور کر لیا۔ ترکوں کو روحانیت سے دور کر کے ملک کو سیکولر اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا۔ خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ شرعی اداروں، محکموں اور قوانین شریعت کو منسوخ کر کے سوئٹزر لینڈ کا قانون دیوانی، اٹلی کا قانونِ فوجداری اور جرمنی کا قانون بین الاقوامی تجارت نافذ کر دیا۔ پرسنل لاء کو یورپ کے قانون دیوانی کے مطابق کر دیا۔ دینی تعلیم ممنوع قرار پائی۔ خواتین کے پردے کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط جاری کیا۔ عربی میں اذان ممنوع قرار پائی۔ قوم کا لباس مغربی کر دیا گیا۔ ہیٹ کا استعمال لازمی قرار پایا۔ انگریز مورخ آرمسٹرونگ کے بقول: ''اتاترک نے ترکی قوم اور حکومت کی دینی اساس کو منہدم کر دیا اور قوم کا نقطۂ نظر اور قبلہ ہی بدل دیا۔''

عرفان اورگا نے سیکولر ریاست کے فیصلوں اور اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ پارلیمنٹ نے جو فیصلے کیے ہیں، درحقیقت وہ اسلام کے حق میں ضرب کاری اور پیام مرگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ تعلیم کی وحدت کا قانون نظام تعلیم میں دور رس تبدیلیوں کا سبب بنا۔ تمام تعلیمی نظام جو ترکی کی حدود میں پایا جاتا تھا، وزارتِ تعلیم کے قبضے میں آ گیا۔ اس تبدیلی نے مدرسوں کی تدریسی سرگرمیوں اور اساتذہ اور علماء کی آزادی کو ختم کر دیا۔ دوسرا اہم قدم وزارتِ مذہبی امور کا خاتمہ تھا۔ اس وزارت کا کام مذہبی و خیراتی مقاصد کی تکمیل اور مساجد اور یتیم خانوں کی نگہداشت تھا۔

1924ء میں قوانین دیوانی و فوجداری کی سیکولرائزیشن کے بعد اگلا نشانہ عوام میں مروج نظام طریقت تھا، جسے جدیدیت اور مغربیت کی ترویج کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ 1925ء میں دو نقشبندی صوفی بزرگوں شیخ سانت اور شیخ عبداللہ کی قیادت میں بغاوت رونما ہوئی، جسے سختی سے کچل دیا اور تمام خانقاہیں اور صوفی سلسلے ختم کر دیئے گئے۔

اتاترک کے بعد ترکوں پر کیا گزری؟

اتاترک کی وفات کے بعد 11 نومبر 1938ء کو ان کے رفیق کار عصمت انونو نے صدارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ وہ 22 مئی 1950ء تک سیکولر جمہوریہ کے صدر رہے۔

ان کے بعد جلال بایار نے 27 مئی 1960ء تک بہ حیثیت صدر کام کیا۔

پھر جنرل جمال گرسل نے صدر مملکت کی حیثیت میں دوبارہ عنانِ اقتدار پر قبضہ کیا اور 28 مارچ 1966ء تک ترکی کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔

جودت سنائی (29 مارچ 1966ء تا 28 مارچ 1973ء)

فہری کوروترک (6 اپریل 1973ء تا 6 اپریل 1980ء)

کنعان ایورن (18 ستمبر 1980ء تا 8 نومبر 1989ء)

ترگت اوزال(9 نومبر 1989ء تا 17 اپریل 1993ء)[
سلیمان ڈیمرل (16 مئی 1993ء تا 16 مئی 2000ء)
احمد نجدت سیزر (16 مئی 2000ء.....)

مصطفیٰ کمال اتاترک کے بعد حکمران جماعت ری پبلیکن پیپلز پارٹی کی ساتویں کانگریس منعقدہ 1947ء میں کثیر جماعتی نظام پر گفتگو ہوئی۔اس سے پہلے 1937ء کے ترمیم شدہ دستور میں حکمران جماعت کے چھ بنیادی اصول شامل ہو چکے تھے، جو یہ تھے:

1۔ Republicanism (جمہوریت)
2۔ Nationalism (قومیت)
3۔ Populism (عوامیت)
4۔ Etalism (ریاستی اشتراک)
5۔ Secularism (لامذہبیت)
6۔ Reformism (اصلاح پسندی)

یہ چھ اصول دستور میں شامل کر لیے گئے۔1946ء میں کثیر جماعتی نظام سیاست کی گنجائش نکال گئی، جس کا عملی نفاذ 1950ء میں ہوا، جب کہ ڈیموکریٹ پارٹی نے انتخاب میں فتح حاصل کر کے اپنی حکومت بنائی۔اس نئی جماعت کو مذہبی طبقوں کی حمایت حاصل تھی۔دوسری طرف اس پارٹی کے بعض رہنما بھی ترکی کی تجدد پسندی اور سیکولرازم کی پالیسی میں سخت گیری اور انتہا پسندی کے خلاف تھے۔یہ ترک عوام کی مذہب کی طرف واپسی اور اسلام سے ان کی عقیدت وشیفتگی کا اظہار ہی تھا کہ انتخاب میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدواروں کے حق میں ووٹ دیئے۔ انہوں نے اپنی تقریروں، بیانات اور خطبات میں ری پبلیکن پیپلز پارٹی (آر پی پی) کی مذہب کے خلاف سرگرمیوں پر سخت نکتہ چینی کی۔انہوں نے عوامی جلسوں جلوسوں میں تقریریں کر کے اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا کہ حکمران جماعت مذہبی تعلیم وتربیت کے تمام آثار مٹا دینے پر کمربستہ ہے۔

چنانچہ ڈیموکریٹک پارٹی نے اس مسئلے پر توجہ دی۔وزارت تعلیم نے پرائمری سکولوں کے نصاب میں مذہبی تعلیم وتربیت کے منتخب کورس متعارف کرائے۔نیز ائمہ مساجد اور مبلّغین کی تربیت کے لیے بعض نصابات کا اہتمام کیا۔مذہبی احکام پر عمل درآمد اور عبادات کی بجا آوری سے متعلق بھی حکومت کے رویے میں نرمی اور لچک پیدا ہوئی۔ 1948ء میں پہلی مرتبہ زائرین بیت اللہ کو غیر ملکی زرمبادلہ کی اجازت دی گئی۔1949ء میں بزرگوں اور اولیاء کے مزارات کی زیارت کا موقع فراہم کیا گیا۔

نئی سیاسی جماعت نے مذہب کی طرف کچھ رجحان کا اظہار ضرور کیا، مگر عوام کی امنگوں اور اسلامی جذبات کا ساتھ نہ دے سکی۔اپنے مخصوص سیاسی مفادات کی وجہ سے صدر جمہوریہ جلال بایار چند قدموں کی پیش رفت سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔چنانچہ علماء اور مذہب پسند طبقات کو مایوسی ہوئی۔دین دار عوام کا حکومت پر دباؤ بڑھا تو ڈیموکریٹک

پارٹی نے پارلیمنٹ میں سیکولرازم پر اپنے یقین کا اظہار کیا اور ایک قانون منظور کر کے مذہب کو سیاسی یا ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر پابندی لگادی۔

تاہم مذہب سے عوامی وابستگی کے علانیہ مظاہرے کا اتنا فرق ضرور ہوا کہ اب انتخابی منشور میں مذہب پسندی کی جھلک نظر آنے لگی اور ری پبلیکن پیپلز پارٹی کے خلاف مذہبی نعروں کا رجحان بڑھ گیا۔ 1957ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی اور شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کی جماعت نور کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا، لیکن 27 مئی 1960ء کے فوجی انقلاب نے اس سیاسی سمجھوتے اور اتحاد کا خاتمہ کر دیا۔ جنرل جمال گرسل کے فوجی انقلاب کا مقصد ملک میں اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنا اور اسے سیکولرازم کی کمالی راہ پر گامزن رکھنا تھا۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی جانشین جسٹس پارٹی نے اسلام کے حق میں نسبتاً لچکدار پالیسی اختیار کی اور جنگ عظیم دوم کے بعد ترکی کی سیاست میں مذہب کے معاملے میں جو نرمی اور لچک پیدا ہوگئی تھی، اسے برقرار رکھا، لیکن جسٹس پارٹی نے بھی 1961ء کے ترمیم شدہ دستور کی پوری پابندی کی، جس نے ترکی کے سیکولر کردار اور لامذہبیت کو بحال رکھا تھا۔ نئی حکومت نے بھی اسلامی سرگرمیوں کی اجازت ایک حد تک ہی دی۔ بس انہی مذہبی اعمال و تقریبات کو گوارا کیا گیا جن سے ملک کے سیکولر کردار پر حرف نہ آتا ہو۔

اس دوران میں ایک اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ 1966ء میں شیعوں نے اپنی سیاسی جماعت ''پارٹی آف یونین'' کے نام سے تشکیل کر لی اور انتخابات میں اسے کامیابی بھی حاصل ہوگئی، مگر ان کا فائدہ بائیں بازو کی جماعت نے اٹھایا اور اس نے متعدد شیعہ مسائل کو ابھار کر سیاسی منفعت حاصل کر لی۔ انہی حالات میں پروفیسر نجم الدین اربکان نے 1970ء میں ''نیشنل آرڈر پارٹی'' کی بنیاد رکھی، جس کا ترکی نام ''ملی نظام پارٹی'' رکھا گیا۔

ترکی میں احیائے اسلام کا ایک اہم کردار:
پروفیسر نجم الدین اربکان

ترکی کی حالیہ تاریخ میں، اور خصوصاً سیکولرازم مغربیت اور لامذہبیت کے خلاف اسلام کے احیاء کے لیے پروفیسر اربکان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا اسلامی اخلاق کے منافی ہوگا۔ وہ 1926ء میں ترکی کی شمالی سرحد پر بحر اسود کے ساحلی شہر سینوب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد صبری بک سلجوقی سرداروں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا عثمانی کابینہ کے آخری وزیر خزانہ تھے۔ اسی بنا پر ان کا گھرانا ''ناظر زادہ'' یعنی دین زادہ کہلاتا تھا۔ جب ترکی میں خطابات کا قانون صادر ہوا تو انہیں اربکان کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔

پروفیسر اربکان کے والد نے استنبول سے قانون و شریعت کی ڈگری حاصل کی تھی اور اناضول کے علاقے میں چالیس برس تک سول اور شرعی جج کے منصب پر فائز رہے تھے۔ اپنے فرزند نجم الدین کی تعلیم و تربیت کی خود نگرانی کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تعلیمی اور اخلاقی اعتبار سے فائق اور قابل احترام تھے۔ 1943ء میں ثانوی تعلیم مکمل کر کے

استنبول کے انجینئرنگ کالج کے ٹیسٹ میں بیٹھے تو اتنے نمبر حاصل کر لئے کہ انہیں انجینئرنگ کے دوسرے سال میں داخلہ دے دیا گیا۔ 1948ء میں انہوں نے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کامیابی حاصل کی، تو یونیورسٹی ہی میں انہیں لیکچرار مقرر کر دیا گیا۔ 1951ء تک انہوں نے کئی تحقیقی مضامین لکھے اور پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی تیار کر کے پیش کر دیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ اسی سال ان کی امتیازی قابلیت اور حسن کارکردگی کی وجہ سے یونیورسٹی نے انہیں مغربی جرمنی کی آخن یونیورسٹی میں ٹینک سازی اور اس کی ٹیکنالوجی میں مہارت خصوصی حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ 1952ء میں پی ایچ ڈی کی دوہری ڈگری لے کر ترکی واپس آ گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ایسوسی ایٹ پروفیسر، اور پھر پورے پروفیسر منتخب کر لیے گئے۔

پروفیسر اربکان 1969ء تک استنبول یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور اس دوران میں ان کے تحقیقی مضامین، صنعتی اور ٹیکنیکل شعبے میں سرگرمیاں عوام اور حکومت کے ایوانوں میں خراج تحسین وصول کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر کئی صنعتی ادارے اور کارخانے بھی قائم کیے، جس کی وجہ سے نوجوانوں کو روزگار فراہم ہوا۔ انہوں نے ان کے حوصلے بڑھائے۔ ڈاکٹر اربکان ان کارخانوں کے ذریعے ترکی کو صنعتی لحاظ سے مستحکم اور خود کفیل بنانا چاہتے تھے اور قوم کے اندر اس مزاج کی آبیاری کرنا چاہتے تھے کہ وہ اغیار کے محتاج اور دست نگر نہ رہیں اور اپنی محنت میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا حوصلہ پیدا کریں۔

یونیورسٹی کی تدریسی اور تحقیقی ذمہ داریوں کے ساتھ وہ 1956ء سے 1963ء تک محکمہ صنعت وحرفت کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ 1969ء میں وہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ 1968ء میں چیمبر کی صدارت کے لیے ایک ممتاز سیکولر لیڈر سری انور یاتور کے مقابلے میں وہ زبردست اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ اس اعلیٰ اور حساس منصب کے لیے ان کی کامیابی اور چیمبر کی صدارت روس اور امریکا دونوں کو پسند نہ آئی۔ کمیونسٹ روس، سرمایہ دار امریکا اور یہودی لابی نے اسے ایک خطرے کی گھنٹی تصور کیا۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اعظم سلیمان دیمرل کے توسط سے صدر مملکت سے شکایت کی گئی اور ساری طاقتوں نے مل کر دباؤ ڈالا کہ چیمبر کی صدارت سے ڈاکٹر اربکان کو رخصت کیا جائے۔

ڈاکٹر اربکان کی سرگرمیوں اور رویوں پر مشرقی ومغربی سامراجی طاقتوں اور ترکی کے سیکولر اکابرین کی نگاہ ان کی طالب علمی کے زمانے ہی سے تھی، کیونکہ وہ ابتداہی سے دو چیزوں کے پابند تھے، صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور ہر کام میں منصوبہ بندی۔ استاد فتحی یکن نے ترکی کی ''ملی نظام پارٹی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر اربکان کو ترکی کی تاریخ، اصل مسئلے (سیکولرازم اور اسلام کی کشمکش) سے متعلق حقائق کا مکمل ادراک تھا۔ پروفیسر صاحب کا پختہ یقین بلکہ عقیدہ تھا کہ اسلام ہی نجات کی کشتی ہے جو نہ صرف ترکی کو بلکہ پوری انسانیت کو امن وامان اور سلامتی وکامرانی کے ساحل سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

چنانچہ پروفیسر اربکان کو چیمبر آف کامرس کی صدارت سے نہ صرف علیحدہ کر دیا گیا، بلکہ ان سے بذریعہ پولیس فوری طور پر دفتر بھی خالی کرا لیا گیا۔ عوام کو اور خود انہیں بھی اس سخت کارروائی کا اندیشہ نہ تھا، کیونکہ سلیمان

دیمرل اوران کی جسٹس پارٹی نے کمال اتاترک کے جانشینوں کے برعکس مذہب اور دینی مدارس کے لیے نسبتاً اعتدال پسندرویہ اختیار کیا تھا، مگراس غیرانسانی اور غیراخلاقی سلوک کے بعد اسلام پسندوں کو اندازہ ہوگیا کہ دونوں سیاسی پارٹیاں ترکی کو اس کے تابناک ماضی اور عظیم ورثے سے محروم رکھنے میں برابر شریک ہیں۔ چنانچہ پروفیسر اربکان اوران کے رفقائے کار یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ وطن کے تحفظ، ترقی وفلاح اور رفاہ و بہبود کے لیے اور دشمنوں کے فکری، سیاسی، اقتصادی اور عسکری تسلط کے خلاف صف آراء ہونے کے لیے سیاست اور قانون کا میدان منتخب کیا جائے۔

1969ء کا الیکشن قریب تھا۔ پروفیسر اربکان نے جسٹس پارٹی کے ٹکٹ پر قونیہ کے حلقے سے الیکشن لڑنے کی گزارش کی، مگر پارٹی کی قیادت نے ٹکٹ دینے سے انکار کردیا۔ مجبور ہو کر وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں کھڑے ہوئے۔ ان کا انتخابی نعرہ تھا: ''عزیز وطن ترکی کے اس ورثے کے تحفظ کے لیے''۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ کامیابی حاصل کی۔ بلد ہی پارلیمنٹ میں انہوں نے اپنے ہم خیال احباب کا ایک محاذ قائم کرلیا اور 26 جنوری 1970ء کو ''ملی پارٹی'' کے نام سے اپنی پارٹی بنالی۔ اس پارٹی کا نشان ''بند مٹھی'' تھا جو اتحاد و استحکام کی علامت تھا اور اس کی شہادت کی انگلی ہوا میں لہراتی ہوئی روشن مستقبل کی جانب اشارہ کررہی تھی۔

ملی نظام پارٹی کی جانب سے ایک اعلانیہ نشر کیا گیا، جس میں ترکی کے ماضی، حال اور مستقبل کا تجزیہ پیش کیا گیا اور واضح الفاظ میں صراحت کی گئی کہ اس پارٹی کا رکن صرف وہی ہوسکتا ہے جو پنج وقتہ نماز کا پابند ہو اور اس کے صلاح، تقویٰ اور استقامت کے بارے میں اطمینان کرلیا گیا ہو۔ پارٹی کا اولین مقصد ملک میں نظم وضبط، خوشحالی و ترقی اور خیر وفلاح کو عام کرنا ہے۔ اعلانیہ کے آخر میں کہا گیا کہ ''اس کا مقصد اُمت کی عظمت رفتہ کا احیا ہے۔ یہ امت اخلاق وفضائل کے زبردست ذخیرے کی مالک ہے۔ اس کی تاریخ تابناک ہے۔ دورِ حاضر میں اس کا صاحب ایمان نوجوان یہ حوصلہ رکھتا ہے کہ وطن عزیز اور اس کے مسائل ومشکلات کو سمجھ کر اس کی امداد کرسکے۔''

ترکی کے داخلی مسائل کو پروفیسر اربکان اور ان کی ملی نظام پارٹی نے دو خانوں میں تقسیم کررکھا تھا۔ مادی اور روحانی۔ مادی شعبوں میں پارٹی کی تنقید دو چیزوں پر شدید تھی:

1۔ غیرملکی سرمایہ اور غیرملکی مارکیٹ پر ترکی معیشت کا انحصار۔

2۔ قومی آمدنی میں زبردست گراوٹ اور دولت کی غیرمنصفانہ تقسیم۔

روحانیت اور معنویت کے میدان میں پارٹی کے نزدیک حکومت کی کارکردگی ابتر تھی:

1۔ پارٹی کے نزدیک ترکی دنیا کی واحد قوم تھی، جس کا تعلیمی نظام قومی مقاصد کے حصول کے لیے شہری اور جوان پیدا کرنے میں ناکام تھا۔

2۔ اس کی تعلیمی پالیسی خود اپنی تاریخ وتہذیب کی تردید کے گرد گھومتی تھی۔

ترکی کا سیکولر، مغربی نظام ریاست پروفیسر نجم الدین اربکان کی اسلامی فکر کو کیسے گوارا کرسکتا تھا۔ چنانچہ ملی نظام پارٹی کی سخت تنقیدوں، بیانات اور اسلامی پالیسیوں کے خلاف عدالت میں سرکاری وکیل نے استغاثہ دائر کردیا

اور عدالت نے اس بنیاد پر پارٹی کو کالعدم قرار دے دیا کہ یہ ملک میں دستور کی سیکولر قدروں کی توہین وتذلیل کر رہی ہے، اور سیاسی جماعتوں کی تشکیل وترویج سے متعلق قانون کی صریح خلاف ورزی کر رہی ہے۔ چنانچہ ملی نظام پارٹی کی تشکیل کے صرف سترہ ماہ بعد ہی مئی 1971ء میں اسے خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔

ملی نظام پارٹی کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں، تاہم مختلف حوالوں سے اتنی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ مختصر مدت ہی میں پارٹی نے چھوٹے درجے کے تاجروں، صنعت کاروں اور علماء میں مقبولیت حاصل کر لی تھی اور اس کا دائرہ کار زیادہ تر اناطولیہ کے علاقے تھے۔ چنانچہ بعض تجزیہ نگاروں کی یہ بات کسی قدر درست معلوم ہوتی ہے کہ ملی نظام پارٹی پر بندش کی وجہ سے اس کی اسلامی سرگرمیوں اور عوامی مقبولیت کے علاوہ سیاست کے میدان میں اس کے وہ بڑھتے ہوئے اثرات تھے، جس کی وجہ سے برسر اقتدار جماعت جسٹس پارٹی بھی اسے اپنے لیے خطرہ تصور کرنے لگی تھی۔

ملّی سلامت پارٹی (1973ء)

مئی 1971ء میں ملی نظام پارٹی کی اسلامی جدوجہد میں کسی قدر کامیابی اور عوامی مقبولیت سے گھبرا کر ترکی کی فوج نے انقلاب برپا کر دیا اور پارٹی کو خلاف قانون قرار دے کر اس کی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگا دی تاکہ ملک کمالی سیکولرازم کی راہ پر گامزن رہے اور اسلامی نظام کی راہ ہموار نہ ہو سکے۔ بدلتے ہوئے حالات میں اسلامی احیائی تحریک کے سربراہ پروفیسر نجم الدین اربکان نے نئی حکمت عملی اختیار کی اور 11 اکتوبر 1972ء کو ''ملی سلامت پارٹی'' کے نام سے ایک نئی جماعت تشکیل دی۔

1973ء میں پارلیمانی انتخابات ہوئے تو ملی سلامت پارٹی نے اس میں حصہ لیا۔ گیارہ فی صد ووٹ حاصل کر کے اور 48 نمائندوں کو فتح یاب بنا کر پروفیسر نجم الدین اربکان نے ثابت کر دیا کہ اسلام سے محبت وعقیدت کا جذبہ ترکی قوم میں موجود ہے۔ 1974ء کے انتخابات میں پارٹی کے نمائندوں کی تعداد گھٹ کر نصف رہ گئی، لیکن اس کے سیاسی اثرات اتنے وسیع اور مستحکم ہو گئے تھے کہ متعدد بار اسے مخلوط حکومتوں میں شامل کیا گیا۔ 1970ء کے ایرانی انقلاب کا بھی اثر ترکی کے عوام پر پڑا اور مغرب کے خلاف نفرت اور اس سے جہاد کے جذبات ترکی کے مسلمانوں میں پھر پیدا ہوئے۔ ملی سلامت پارٹی اور اس کے رہنما، خصوصاً پروفیسر نجم الدین اربکان قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایک بار پھر ہر دل عزیز اور سوالیہ نشان بن گئے اور ترکی میں اسلامی انقلاب کی دھمک سنائی دینے لگی کہ 12 ستمبر 1980ء کو فوج نے انقلاب برپا کر کے عوامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ پارلیمنٹ توڑ دی اور اقتدار پر قابض ہو کر اسلام پسندوں کے خلاف قانونی اور سیاسی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ پروفیسر اربکان کو اس جرم میں حوالۂ زنداں کر دیا گیا کہ انہوں نے سیاسی مقاصد کے لیے اسلام کو استعمال کیا تھا اور ملک کے سیکولر کردار کو چیلنج کیا تھا۔ تاہم فوجی جرنیلوں کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہو گیا کہ اب پچھلی تین دہائیوں سے ترکی سیاست میں جو ارتقاء ہوا ہے اور اسلام سے محبت وعقیدت کے جذبات میں جو تیزی آئی ہے، اسے زیادہ دیر تک دبایا نہیں جا سکتا۔

ترکی میں اسلام اور سیکولرازم کی دستوری کشمکش

1961ء میں ترکی کے دستور میں جو ترمیمات ہوئی تھیں، اب تک انہی پر عمل ہو رہا تھا۔ اس ترمیم شدہ دستور نے 1920ء کے دستور کے سیکولر کردار کو محفوظ رکھا تھا۔ اس دستور کے مطابق مندرجہ ذیل قوانین و دفعات کو نہ عدالت عالیہ میں چیلنج کیا جا سکتا تھا اور نہ اس میں کسی قسم کی ترمیم یا حذف و اضافہ ممکن تھا:

1۔ وحدت تعلیم سے متعلق قانون

2۔ مغربی ہیٹ سے متعلق قانون

3۔ خانقاہوں اور زاویوں سے متعلق قانون

4۔ سول میرج پر مشتمل سول قانون

5۔ بین الاقوامی اعداد کو اختیار کرنے سے متعلق قانون

6۔ لاطینی رسم الخط اختیار کرنے سے متعلق قانون

7۔ آفندی، بے پاشا اور دوسرے خطابات کے استعمال کی ممانعت کا قانون

8۔ متعین لباسوں کے استعمال پر پابندی سے متعلق قانون

اس دستور میں ملک کے سیکولر کردار سے متعلق تمام قوانین کا اندراج کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ تنسیخ خلافت کی دفعہ بھی غیر ضروری ہوگئی، کیونکہ دستور بنانے والوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کبھی خلافت کا احیاء ہو سکے گا۔ نظامتِ مذہبی امور کی جگہ اب نظامتِ رسوم (Cults) نے لے لی تھی۔ یہاں اس امر کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ دستور کی بعض دفعات پہلے ہی منسوخ ہوگئی تھیں۔ مثال کے طور پر اذان ترکی زبان میں دینے اور مزارات پر حاضری کی ممانعت کی تنسیخ پہلے ہی عمل میں آ چکی تھی۔ ان تین دہائیوں میں مذہبی آزادی اور عبادات و عقائد کی انجام دہی کی سرکاری اجازت کو بعض ماہرین سیاست نے مستحکم و منضبط جمہوریت کے قابل تعریف پہلو سے تعبیر کیا اور پانچ سو میٹر کے دائرے پر مشتمل ''صرف ایک مسجد ایک میونسپل ایریا میں'' 1930ء کی سرکاری درکی اجازت کی جگہ اب وسیع پیمانے پر مساجد کی تعمیر و آبادکاری کو فراخ ولانہ اقدام اور سیکولر جمہوریت کا مثبت اور تعمیری قدم قرار دیا، حالانکہ یہ سیاسی تجزیہ بالکل غیر متوازن تھا۔ حقیقت میں یہ ترک قوم کی اسلام کی طرف واپسی کی دلیل تھی اور مفاد پرست اور طالع آزما حکومت نے عوامی مطالبے اور دباؤ سے مجبور ہو کر مذہبی آزادی کے خلاف عصبیت اور تشدد میں قدرے کمی کی تھی۔

1961ء کے دستور کی دفعہ کے مطابق سیکولرازم ریاست کا بنیادی اصول ہے۔ اس دفعہ کا ترجمہ یہ ہے:

''کوئی فرد ریاست کے سماجی، معاشی، سیاسی یا قانونی نظام میں ترمیم وتبدیلی کی خاطر مذہب کا استحصال نہیں کر سکتا، تاکہ مذہبی اصولوں کو فروغ دے سکے، اور نہ وہ اپنے ذاتی یا سیاسی مفادات کی تحصیل کے لیے مذہب کا سہارا لے سکتا ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی دفعہ کے تحت مذہبی حقوق کی ضمانت بھی تمام شہریوں کو فراہم کی گئی ہے۔ دفعہ 12 مذہبی مساوات کی تلقین کرتی ہے۔ دفعہ 57 کی عبارت کے مطابق تمام سیاسی جماعتوں سے مطلوب ہے کہ وہ سیکولرازم کے اصولوں سے ہم آہنگ رہیں۔ دفعہ 21 کا اصرار ہے کہ مذہبی تعلیم کو جدید سائنس سے مطابقت رکھتے ہوئے جاری رہنا چاہیے۔ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 163 کے تحت ان تمام دفعات کا نفاذ ناگزیر ہے۔ اسی ضابطے کی دو مزید دفعات 142 اور 242 کے مطابق مذہب کا سیاسی استعمال فوجداری جرم اور واجب تعزیر ہے۔ دفعہ 241 مذہبی رہنماؤں اور علماء پر یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ وہ ریاست کے سیکولر قوانین اور لادینیت کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔ دفعہ 242 کا اعلان ہے کہ حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلانے یا خاوت کرنے کے لیے سرکاری مذہبی منصب یا خطاب کا استعمال سخت سزاؤں کا موجب ہے۔ دستور کی ایک اور دفعہ، جو تنظیمیں اور انجمنیں تشکیل دینے سے متعلق ہے، ان جماعتوں اور انجمنوں کو خلاف قانون قرار دیتی ہے جو مذہبی بنیاد پر تشکیل پائیں۔ دفعہ 163 ان افراد اور گروہوں کو بھی قابل سزا قرار دیتی ہے جو سیکولرازم کے اصولوں کو خطرے میں ڈالیں۔ اسی طرح سیاسی جماعتوں کی تشکیل سے متعلق ایکٹ بھی مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر بندش لگاتا ہے۔

دستور کی دفعات اور پارلیمنٹ کے ضوابط کی وجہ سے ترکی کے اسلام پسند حلقے کھل کر سیکولرازم کی مخالفت کر سکتے ہیں نہ مذہب کی علانیہ اشاعت وترویج کا کام کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے ترکی میں احیائے اسلام کی سرگرمیاں سیاسی راہ سے، تدریج کے ساتھ اور قواعد وضوابط اور دستوری دفعات کے دائرے میں رہتے ہوئے انجام پاتی ہیں۔ ''ملی نظام پارٹی'' کو عدالتی حکم کے تحت اسی وجہ سے غیر قانونی قرار دیا گیا تھا کہ اس نے اسلام کا نام لے کر ملکی قوانین میں خلل اندازی کی تھی۔ 1980ء میں ''ملی سلامت پارٹی'' کی مخلوط حکومت کے باوجود ضابطہ فوجداری کی دفعہ 163 کا نفاذ کیا گیا اور دوسری سیاسی جماعتوں سمیت ''ملی سلامت پارٹی'' بھی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور ملک میں فوجی حکومت قائم ہو گئی۔

ترکی میں فوج کی سیکولرازم اور کمالیت سے غیر مشروط وفاداری ہی اسلام پسندی کی راہ میں واحد رکاوٹ نہ تھی، بلکہ ترکی ضابطۂ دیوانی (جو سوئٹزرلینڈ کے ضابطۂ دیوانی پر مبنی ہے) آج بھی پرسنل لاء کی روح ہے اور سماجی و عمرانی تبدیلیوں کی راہ میں مضبوط چٹان کی طرح کھڑا ہے، کیونکہ طبقۂ اشرافیہ جو ذرائع ابلاغ پر حاوی ہے اور جو ضابطۂ دیوانی کے نفاذ کا ذمہ دار ہے، ججوں، وکیلوں، پروفیسروں اور سرکاری افسروں پر مشتمل ہے۔ اور یہ طبقۂ اشرافیہ سیکولرازم کی آغوش میں پروان چڑھا ہے اور انہی اداروں میں اس کی تعلیم وتربیت ہوئی ہے، پھر اس پر مستزاد یہ کہ ترکی میں بنیادی تبدیلی کے لیے پارلیمانی قانون سازی اور سیاسی جوڑ توڑ کافی نہیں ہے، کیونکہ سماجی سطح پر اشرافیہ کے

مفادات اور اس کی ذہنیت سیکولرازم کو تحفظ فراہم کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں متعدد بار سیکولر نظریات کے دفاع کے نام پر فوجی انقلاب آئے اور عوام کی جانب سے فوجی انقلاب کی منظم و مؤثر مزاحمت نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ دو اہم عوامل مزید کار فرما ہیں:

1۔ ترکی میں دینی تعلیم کی اساتذہ، علمائے دین اور محققین علوم اسلامیہ کی سخت کمی ہے۔ مساجد و مدارس میں کام کرنے والے مفتیوں اور علماء کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہے جس سے وہ کسی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوں۔ وہ نظامتِ مذہبی امور سے وابستہ ہوتے ہیں اور تنخواہ دار ملازم ہونے کی وجہ سے ریاست کی مقررہ پالیسی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔

2۔ ترکی میں مذہب کو کلیدی و مرکزی مقام حاصل نہیں ہے۔ حکومت سے اختلاف یا بے اطمینانی کے اظہار کے لیے دوسرے پلیٹ فارم اور ادارے موجود ہیں، جب کہ ایران کے حالیہ انقلاب میں اور پاکستان کے قیام و تشکیل میں مذہب ہی کو کلیدی اور مرکزی کردار حاصل رہا ہے۔

معاشی منصوبہ بندی

1946ء میں جب کثیر الجماعتی سیاسی نظام رائج ہوا تو مذہبی عبادات و شعائر کی آزادی نہ دینے کا مسئلہ شد و مد سے اٹھا اور تمام سیاسی جماعتوں نے حکمران جماعت ''ری پبلیکن پارٹی'' پر الزام لگایا کہ وہ اسلام کو پابہ سلاسل کرتی جا رہی ہے۔ گزشتہ 27 برسوں سے برسر اقتدار حکمران جماعت کے مقابلے میں یہ سیاسی جماعتیں اسلام کے سلسلے میں زیادہ مخلص، وفادار اور سنجیدہ نہ تھیں، بلکہ انہوں نے ایک عوامی مطالبے کو اپنے منشور میں شامل کر کے انتخابی سیاست میں فتح مند ہونا چاہا تھا اور اس طرح مذہبی استحصال کر کے اقتدار تک رسائی حاصل کرنا ان کا نصب العین تھا۔ چنانچہ 1950ء میں پارلیمانی انتخاب ہوا تو یہ سیاسی پارٹیاں ناکام ہوئیں اور عوامی حمایت و تائید سے محروم ہونے کی وجہ سے صفحۂ سیاست سے مٹ گئیں۔ یہ ناکام پارٹیاں حسب ذیل تھیں:

1۔ قومی ترقی پارٹی
2۔ انصاف پارٹی
3۔ کسان پارٹی
4۔ اسلامی تحفظ پارٹی
5۔ اسلامی اصلاح پارٹی
6۔ کرد حقوق پارٹی

''ڈیموکریٹ پارٹی'' جس نے حکمران جماعت کو شکست دے کر حکومت تشکیل دی تھی، مذہبی آزادی کی علم بردار ہونے کے ساتھ متعدد بنیادی مسائل میں بھی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس پارٹی نے خاص طور پر کسانوں کے مسائل پر بھرپور توجہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سے پہلے ری پبلیکن پارٹی کا رویہ کسانوں اور عوام کے ساتھ بے نیازی کا تھا۔ مصنف آرنلڈ لیڈر نے اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تنظیمات کے دور کے بعد مغرب نے طبقہ اشرافیہ کی زندگی، سماجی تعلقات و روابط پر قابل لحاظ اثرات مرتب کیے، مگر مقامی معززین اور کسانوں کی تہذیب و ثقافت سے مغرب کا کوئی تعامل نہ ہو سکا۔ اگرچہ مذہب کے عوامی اور سرکاری تصورات کے درمیان تہذیبی، ثقافتی تفریق کا ایک اہم عنصر رہا ہے۔ تاہم اسلام کی عوامی مقبولیت نے بھی دونوں کے درمیان رشتہ وارتباط قائم کیا ہے۔ یہ ارتباط اس وقت ختم ہو گیا جب سیکولر رجحان سے غیر مطمئن مذہبی مقتدرین نے مرکز پر سخت تنقیدیں کیں اور عوام کی روایتی تہذیب کے احیاء و تجدید کی تائید کی، جن کے غیر متشدد، پر امن اسلامی عقائد و شعائر کی وہ مخالفت کر چکے تھے۔ مرکز اور نواح کے درمیان اس نئی تہذیبی تفریق و تقسیم نے راسخ العقیدہ اسلام کو نواحی تہذیب کی حمایت میں کھڑا کر دیا۔"

یہی مصنف 1950ء کی سیاست کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں نتیجہ نکالتا ہے:

"اگرچہ مرکزی سطح پر ڈیموکریٹ پارٹی کے بہت سے رہنما بھی سابقہ پارٹیوں کے لیڈروں کی طرح بیوروکریٹ طبقے ہی کا حصہ سمجھے جاتے تھے، مگر تھوڑے ہی عرصے میں ڈیموکریٹ پارٹی کی شناخت نواحی آبادی کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ خاص ہو گئی۔ ترکی سیاست میں ڈیموکریٹ پارٹی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس نے دیہات اور نواح کی آبادیوں کو اپنی پارٹی میں شامل کیا۔ اسی وجہ سے دوسری پارٹیوں کے رہنماؤں نے ڈیموکریٹ پارٹی کے ارکان کو اجڈ اور گنوار کا خطاب دیا۔ ڈیموکریٹ پارٹی کے رہنماؤں نے اسے پارٹی کے عوامی کردار کا ٹھوس ثبوت تصور کیا اور مرکز کے قابل نفرت رویے کے برعکس خود کو کسانوں اور دیہاتیوں کے کاز کا علمبردار باور کرانے کے لیے انہوں نے تمام ممکنہ تدابیر اختیار کیں۔"

اس نئی صورت حال میں زرعی پیداوار سے ٹیکس کے خاتمے، زرعی قرضوں کی سہولیات اور زراعت کو فروغ دینے کے لیے سڑکوں کی تعمیر اور ذرائع نقل و حمل کی فراوانی کی تدابیر اختیار کرنے کا اعلان کیا گیا۔ پچھلی حکمران جماعت نے کسانوں اور دیہاتیوں کو دیہاڑی دار مزدور سمجھ رکھا تھا اور ترکی میں جدیدیت کی مہم کی کامیابی کے لیے انہیں بطور وسیلہ استعمال کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومی ترقی پارٹی کے رہنما اور وزیراعظم عدنان مندریس نے ایک تقریر میں کہا تھا:

"ہم کیا کریں گے۔۔۔ سڑکیں نہیں ہیں، ہم سڑکیں بنائیں گے۔ ہم پانی اور سڑکیں ہر گاؤں تک لے جائیں گے۔ زمین زرخیز نہیں ہے۔ ہم اسے زرخیز بنائیں گے۔ ہم زمین سے محروم کسانوں کو زمین فراہم کریں گے۔ رہائش کے لیے گھر نہیں ہیں۔ سیمنٹ فیکٹریاں نہیں ہیں۔ خوراک کا بحران ہے۔ ہم شکر کے کارخانے لگائیں گے۔ ہمارے پاس مناسب لباس کے لیے کپڑا نہیں۔ ہم کپڑے کے نئے کارخانے بنائیں گے۔"

ملی سلامت پارٹی کا اسلامی منشور

تیس سال تک ترکی کی سیاست، مذہب اور معاشیات (یا مذہب اور سیکولرازم) کے معجون مرکب کے گرد گھومتی رہی۔ سیکولر عناصر ترکی کو ہر قیمت پر مصطفیٰ کمال کی لائی ہوئی لادینیت بلکہ کفر و الحاد کی طرف لوٹانے کی جدوجہد کرتے رہے اور ڈیموکریٹ پارٹی کے رہنما علماء کی حمایت لے کر اس کے محدود تصور ہی پر قناعت کرتے رہے۔ چنانچہ 1966ء میں وزیراعظم سلیمان دیمرل نے، جس کی حکومت 1980ء کے فوجی انقلاب کے ذریعے منقطع ہوگئی تھی، اس طرح کے مباحثے کا آغاز کیا تھا کہ اپنے آپ کو مسلمان قرار دینا یا خدا کا حوالہ دینا (ان شاء اللہ، ماشاء اللہ وغیرہ) ہمیشہ سے سیاسی مقصد کے لیے اسلام کے استحصال کا ذریعہ بنتا رہا ہے، لیکن اس طرح کے اعلانات کو رجعت پسندی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ملی سلامت پارٹی کی اقتصادی پالیسی

"ملی سلامت پارٹی" نے مذہب کے روایت پرستانہ تصور اور سیکولرازم دونوں رجحانات کے باوجود اسلامی تحریک کا آغاز کیا۔ اس نئی جماعت نے ترک قوم کی معاشی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے تک پہنچی کہ اس معاشی زبوں حالی کے ذمہ دار مغرب کے سرمایہ دارانہ عیسائی مفادات ہیں۔ مغربی اقوام اپنی مصلحتوں اور سیاسی و معاشی مفادات کے پیشِ نظر اس کی معیشت کو زوال پذیر رکھنا چاہتی ہیں، اور اس زوال سے نجات پانے کے لیے یورپی معاشی کمیونٹی (ای ای سی) کے سحر سے نکلنے کی جدوجہد کرنی چاہیے، کیونکہ یہ تنظیم مغربی مسیحی سرمایہ داری کی معاشی پالیسی کے گرد گھومتی ہے۔ "ملی سلامت پارٹی" کا موقف یہ تھا کہ ترکی صنعت و حرفت کی پالیسی اور مہم خود کفیلی اور خود انحصاری کی حامل ہو، اور جاپان کی مثال کو سامنے رکھ کر صنعتی فروغ کی تحریک میں وہ مغرب کا مقابلہ کرے۔ مختلف صنعتی شعبوں میں استحکام و استقلال کے حصول کے اس موقف نے عوامی مقبولیت حاصل کی اور ملک کے سنجیدہ اور مخلص طبقے پارٹی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اوسط درجے کے صنعت کار، تاجر اور معاشی ماہرین نے پروفیسر نجم الدین اربکان کی اس پالیسی کی حمایت و تائید کی جو انجینیرنگ کے پروفیسر ہونے کے علاوہ واٹر پمپ بنانے والی ایک چھوٹی فیکٹری (سن موٹر انڈسٹریز) کے مالک بھی تھے۔ سلامت پارٹی بنک کے سود اور اس کے ذریعے تقسیم ہونے والے سودی قرضوں کے بھی خلاف تھی۔ اس کا علانیہ موقف تھا کہ ملکی معیشت کو سود سے پاک ہونا چاہیے۔

مغربیت کے خلاف اقدامات

ملی سلامت پارٹی نے ترکی کی ضرر رساں مغربیت کے خلاف سخت نوٹس لیا۔ رقص و سرود کے پروگراموں اور مغربی تھیٹروں کو ترکوں کی حقیقی تہذیب کا دشمن قرار دیا اور اس طرح کے تفریحی کلبوں اور ثقافتی بدعتوں کو ترکی تہذیب

وتمدن کی مغرب کاری کا وسیلہ ٹھہرایا۔ ترک معاشرے کو پارٹی نے روبہ زوال قرار دیا، کیونکہ بڑوں کا ادب واحترام اس معاشرے سے رخصت ہورہا ہے اور مردوں کی مخلوط محفلوں نے اسے منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔

معاشرتی تبدیلیاں: اسلام پسندی کی طرف

''ملی سلامت پارٹی'' کی عوامی مقبولیت اور اس کے روز افزوں اثرات کی ایک وجہ ماہرین عمرانیات نے بدلتے ہوئے سماجی حالات کو قرار دیا ہے۔ 1960ء تا 1980ء کے دوران ترکی کی اوسط فی کس سالانہ پیداوار 3.6 فیصد رہی ہے جس سے ترکی معاشی ترقی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ملک کی آبادی 1960ء میں 17 ملین تھی جو 1980ء میں بڑھ کر 46 ملین ہوگئی۔ 1935ء فیصد آبادی شہروں میں رہائش پذیر تھی، مگر 1980ء میں شہری آبادی بڑھ کر 46 فیصد ہوگئی اور یہ تبدیلی دراصل ان ترقیوں کی وجہ سے ممکن ہوئی جو 1960ء کے بعد عمل میں آئیں۔ چنانچہ آٹھویں دہائی میں ترکی کی صورتِ حال یہ تھی کہ یہ مشرق وسطیٰ میں واحد ملک تھا جس کے دو بڑے شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کی شرح 5 فیصد سالانہ تھی۔ دیہات اور نواحی علاقوں سے شہروں اور قصبوں کی طرف یہ مہاجرت ملکی سیاست اور سماجی حالات میں بنیادی تبدیلی کا سبب بنی۔

پانچویں دہائی میں انقرہ میں اقامت اختیار کرنے والے دیہاتیوں اور کسانوں کا رویہ شہری اصول وضوابط کے لیے انتہائی جارحانہ تھا۔ وہ شہر کے تربیت اصولوں اور شہری اقدار سے بے نیاز نظر آتے تھے، مگر رفتہ رفتہ اس رویے میں تبدیلی آئی اور وہ ''مہذب معاشرے'' کی اخلاقیات سے مانوس ہوتے گئے۔ اس بے نیازی کی دو وجوہ یہ بتائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ متعدد افراد یکایک سیاست کی تبدیلی سے قومی شہرت کے حامل قرار پائے اور انہوں نے اس بے نیازی اور لاعلمی کو کسی قسم کا نقص محسوس نہ کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں یورپ کی تقلید پر ترکوں کی سخت تنقیدیں شروع ہوئیں اور مغرب کی نقالی پر نکتہ چینی ہوئی۔

ترکی میں شہروں کی طرف نواحی آبادی کی مہاجرت کے علاوہ روایت پسند خاندانوں کی تعلیم وتربیت بھی اسلام پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان میں مددگار ثابت ہوئی۔ محکمہ مذہبی امور کے منظور شدہ نصابات اور قرآنی دروس اور تعمیر مسجد کی انجمنوں نے بھی احیائے اسلام کی اس نئی تحریک میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔ ان انجمنوں کی تعداد 1951ء میں 237 تھی، جب کہ 1967ء میں ان کی تعداد بڑھ کر 2510 ہوگئی اور انہوں نے چھوٹے شہروں اور قصبوں کی زندگی پر اچھا خاصا اثر ڈالا۔

اسباب وعلل خواہ کچھ بھی ہوں، آٹھویں دہائی تک پہنچتے پہنچتے اسلام ترکی معاشرے میں مستحکم ہوگیا اور قصبوں اور چھوٹے شہروں میں خاص طور پر بڑے شہروں میں عام طور پر ''ملی سلامت پارٹی'' اسلامی تحریک کی توانا اور طاقتور آواز بن گئی۔ اس کے سربراہ پروفیسر نجم الدین اربکان، جو خود ایک صوفی مزاج شخص ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی کوشش سے ترکی کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کے حوصلہ افزا پہلو ذیل کی مثالوں سے سمجھے جاسکتے ہیں:

1۔ قبرص کے مسئلے پر یونان اور ترکی کی جنگ میں پوری فضا پر اسلام پسندی کے جذبات کا رنگ غالب رہا۔

ایام جنگ میں اسلامی جہاد کا بڑا چرچا رہا اور تین باتیں کھل کر سامنے آ گئیں۔ پہلی حقیقت یہ نمایاں ہوئی کہ اس جنگ میں ترکوں کو جو فتح نصیب ہوئی، وہ اسلام کی بدولت ہوئی۔ دوسری بات یہ تسلیم کی گئی کہ مسلم عوام اور اسلام پسند حلقوں نے ہی قبرص کے ترکوں کو یونانیوں کے مظالم سے نجات دلائی ہے۔ 1925ء میں قبرص پر انگریزوں کی تولیت قائم ہوئی اور پچاس سال تک قبرصی ترک یونانی اور قبرصی عیسائیوں اور ان کی دہشت پسندانہ تحریکوں مثلاً یونان کی تحریک اینوسس اور قبرص کی تحریک ایوکا کے ہاتھوں ظلم و ستم سہتے رہے، مگر ترکی کا سیکولر نظام اور لادین عناصر طفل تسلیوں کے سوا کوئی اقدام نہ کر سکے۔ اب ''ملی سلامت پارٹی'' کی مجاہدانہ پیش رفت نے قبرصی ترکوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی پر بھی خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ تیسری بات یہ ابھر کر سامنے آئی کہ قبرص کے اندر برطانوی اور فرانسیسی افواج پر مشتمل جو جنگی اڈہ قائم تھا، وہ ختم کر دیا گیا۔

2۔ یونان اور ترکی کی اس جنگ میں جب امریکا نے ترکی کو عسکری امداد دینے سے گریز کیا تو مخلوط حکومت میں شامل ہونے کی وجہ سے ''ملی سلامت پارٹی'' نے حکومت کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کر دیا کہ اگر امریکا امداد نہیں دیتا تو اس کا ترکی میں واقع فوجی اڈہ ختم کر دیا جائے گا اور فی الحقیقت اس اڈے کو بند کر دیا، یہاں تک کہ امریکا ترکی کی فوجی امداد بحال کرنے پر مجبور ہوا۔

3۔ مسلم عوام کی جانب سے یہ دباؤ بڑھا کہ ترکی دستور کی اس دفعہ کو منسوخ کیا جائے جس میں سیکولرازم کو حکومت کا بنیادی چارٹر قرار دیا گیا ہے۔ خلافت اسلامیہ کی بحالی کا نعرہ بھی عام اور مقبول ہوا۔ مارچ 1976ء میں ترک نوجوانوں نے ''فتح استنبول'' کی یاد میں یوم شوکت اسلام منایا۔ (استنبول کا قدیم نام قسطنطنیہ تھا۔ 1453ء میں سلطان محمد دوم نے بازنطینی حکومت کا خاتمہ کر کے اس کا نام استنبول رکھا تھا)۔

4۔ ترک نوجوانوں نے فوزی چقماق پاشا کی برسی منائی۔ یہ ترک جرنیل مصطفیٰ کمال پاشا کا ساتھی تھا۔ ترک افواج کی تنظیم نو کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اتاترک کے ساتھ مل کر ترکی کو آزاد کروانے اور اس دور میں ترک قوم کے اندر روح جہاد پھونکنے میں اس کا بڑا دخل تھا۔ لوزان کانفرنس 1923ء کے بعد جب اتاترک نے اپنا راستہ بدل لیا اور قبلہ تبدیل کر لیا تو یہ اس سے الگ ہو گیا۔

5۔ 13 اپریل 1976ء کو استنبول میں مسلم وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا سہرا اسلامی عناصر کے سر ہے۔ بائیں بازو کے رہنما، کمیونسٹ اور ملحدین اس کانفرنس کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ کانفرنس کے دنوں میں صدر جمہوریہ فہری کوروترک ملک سے باہر چلا گیا، کیونکہ اس کے لیے مسلمان ممالک کے وزراء خارجہ کا اجتماع ناقابلِ برداشت تھا۔ کانفرنس کو وزیر اعظم سلیمان دیمرل اور نجم الدین اربکان نے ہر لحاظ سے کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر اسلام پسند نوجوانوں نے مظاہروں کے ذریعے اور مسجدوں میں زیادہ حاضری دے کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ سلطان احمد کی مسجد میں جب وزراء نماز

جمعہ ادا کرنے گئے تو دس ہزار نوجوان مسجد کے اندر موجود تھے اور وہ جامع ایا صوفیہ کی واگزاری کا مطالبہ کر رہے تھے۔

6۔ دینی مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ وزارتِ مذہبی امور نے گرمیوں کی تعطیلات میں تمام مساجد میں قرآنی درس و تدریس کی جماعتیں جاری کرنے کا حکم صادر کیا۔ فوج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف سے تمام ملٹری کالجوں اور عسکری تربیتی اداروں کے نام حکم نامہ جاری ہوا کہ ان میں اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی جائے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اسلام سپاہی کا حوصلہ بلند رکھتا ہے۔

انہی اقدامات اور اسلامی رجحانات کے بڑھتے ہوئے اثرات اور مسلم عوام کے ابھرتے ہوئے احیائی جذبات کو دیکھ کر سیکولر طبقے ہراساں ہو گئے، جس کی وجہ سے فوج نے 12 ستمبر 1980ء کو انقلاب برپا کر دیا۔ پارلیمنٹ کو کالعدم قرار دے دیا اور تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں، جن میں ''ملی سلامت پارٹی'' بھی شامل تھی۔

ملی سلامت پارٹی کا اسلامی منشور

''ملی سلامت پارٹی'' کے پہلے سیکرٹری جنرل اور قائد دراصل سلیمان عارف عامر تھے جو ''ملی نظام پارٹی'' کے بھی سیکرٹری جنرل رہ چکے تھے۔ ابتداء میں پروفیسر نجم الدین اربکان پس پردہ رہ کر کام کرتے تھے، کیونکہ نوتشکیل شدہ پارٹی کو سیکولر اور مغرب نواز حلقوں کی نظر بد سے محفوظ رکھنا بھی ضروری تھا، اسی لیے آغاز کار میں وہ ملی سلامت پارٹی کو ملی نظام پارٹی کا تسلسل قرار دینے میں کافی محتاط تھے۔

''قومی سلامت پارٹی'' کا سرکاری ترجمان ''ملی گزٹ'' 12 جنوری 1973ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ حسن اکسائی جو پہلے ''ملی پارٹی'' سے وابستہ تھے اور اب نوتشکیل شدہ پارٹی کے بھی اہم رکن بن چکے تھے، اس اخبار کے مالک اور مدیر تھے۔ پارٹی کے منشور کا مونوگرام ''ملی گزٹ'' کے ٹائٹل پر نمایاں حیثیت میں لکھا ہوا تھا:

''جب مذہبی نظام عدل قائم ہو جائے گا تو کفر کا خاتمہ ہو جائے گا۔''

پروفیسر نجم الدین اربکان اور دوسرے رہنما اس اخبار کے مستقل مضمون نگار اور کالم نویس تھے۔ مختلف جلسوں میں پروفیسر اربکان نے اخبار کو ''ملی شعور و بیداری'' کا حامی قرار دیا جو دراصل پارٹی کا شعار تھا۔ 21 جنوری 1973ء کو پارٹی کا اجلاس عام ہوا اور سلیمان عارف عامر دوبارہ صدر منتخب ہو گئے اور 16 مئی 1973ء کو پروفیسر اربکان اور دو اراکین پارلیمنٹ نے عام انتخابات سے پانچ ماہ قبل ''ملی سلامت پارٹی'' میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی اور پارٹی کی انتخابی مہم میں لگ گئے۔

ترکی میں سیکولرازم کے خلاف صف آرائی

ملی سلامت پارٹی نے اپنا منشور اور پروگرام شائع کیا تو صراحت کردی گئی کہ مادی و معاشی ترقی سے پہلے اخلاقی ارتقا اور مذہبی احیاء ناگزیر ہے۔ نجی ملکیت، ترکی معاشرت کی اقدار کا تحفظ اور بنیادی انسانی حقوق اور آزادی کی حفاظت پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ نیز صنعت و حرفت کے فروغ اور مختلف صوبوں اور سماجی طبقوں میں عدم مساوات کے خاتمے کو ترجیحات میں شامل کرنے کی تاکید کی گئی۔ اس منشور کی دفعہ 12 کے مطابق سینٹ کا خاتمہ اور صدارتی طرزِ حکومت ترکی کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ سیکولرازم کی بھی مشروط حمایت کی گئی، کیونکہ اس سے آزادئ فکر و اظہارِ رائے کی ضمانت ملتی ہے، مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہ ہوگا کہ اصحابِ فکر و مذہب پر کوئی سختی کی جائے اور اُن پر کوئی قدغن لگائی جائے۔

پروگرام کی دفعہ 19 کے تحت اعلان کیا گیا تھا کہ تمام مسلمانوں کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا جائے، مگر روحانی، قومی اور اخلاقی اقدار کا احترام ہر حال میں ناگزیر ہے۔ مختلف قسم کی تجاویز اور سفارشات بھی پروگرام میں شامل کی گئیں، مثال کے طور پر:

- ☆ فوجداری عدالتوں میں جیوری کا نظام قائم کیا جائے۔
- ☆ صوبائی انتظامی عدالتیں قائم کی جائیں۔
- ☆ نظامِ تعلیم کی اساس اخلاق، اقدار اور اعتدال پر رکھی جائے۔
- ☆ بچوں کی مذہبی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ کی جائے۔
- ☆ بھاری اسلحے کی صنعتیں قائم کی جائیں۔
- ☆ خاندانی منصوبہ بندی کو ممنوع قرار دیا جائے اور افزائشِ آبادی کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

پارٹی کے اس انتخابی منشور اور عوامی پروگرام سے شاید اس کا عالمگیر تصور زیادہ واضح نہ ہوسکے، البتہ پارٹی کے ترجمان ''ملی گزٹ'' میں جو بیانات، قراردادیں، تقاریر اور مقالے شائع ہوئے، ان سے مختلف مذہبی و غیر مذہبی مسائل و معاملات پر پارٹی کا ردعمل اور اس کے رہنماؤں کے افکار و نظریات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ ترکی مذہب و سیاست کے ایک تجزیہ نگار نے ''ملی گزٹ'' میں شائع شدہ مواد کی کئی فہرستیں اور جدولیں شائع کی ہیں، جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1973ء میں پروفیسر نجم الدین اربکان کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ ترکی میں صنعت کاری کو فروغ دینا تھا۔ ملک کے اس اہم قومی اقتصادی مسئلے پر تاکید و اصرار کے ساتھ توجہ مبذول کرنے سے پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہوا اور مذہبی عناصر سے منسوب رہبانیت کی بھی نفی ہوئی۔ اس سے اس خیال کی بھی

نفی ہوئی کہ مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔اس صورتِ حال کے برعکس 1980ء میں ترکی معیشت کا اہم ترین مسئلہ مہنگائی اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں کافی اضافہ تھا۔اسی لیے پروفیسر اربکان نے آٹھویں دہائی میں سب سے زیادہ زور اسی مسئلے پر دیا۔

مذہب اور سیکولرازم کی کشمکش

ملی سلامت پارٹی کے لیے مذہب اور سیکولرازم کی کشمکش کے موضوعات سب سے زیادہ توجہ کے باعث بنے رہے۔1973ء کی ایک تقریر میں پروفیسر نجم الدین اربکان نے اسلامی نقطۂ نظر کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''صداقت اور حقانیت کا تنہا ماخذ اسلام کے پاس ہے۔مطالعات بتاتے ہیں کہ موجودہ علوم وفنون کا سا ٹھ ستر فی صد مسلمانوں کا عطیہ ہے۔میں کہتا ہوں کہ آج جن علوم کو مغربی سائنس کا نام دیا جارہا ہے،طبیعیات،کیمیا، ریاضی،فلکیات،طب جدید،جغرافیہ اور دوسرے تمام علوم،ان سب کی بنیاد مسلمانوں نے ڈالی ہے۔اہلِ مغرب جو ہم پر حقارت کی نظر رکھتے ہیں،اور ہمیں ذلیل سمجھتے ہیں،انہوں نے ریاضی اور شماریات کا پورا علم مسلمانوں سے سیکھا ہے۔آج ہم یورپ میں صفائی ستھرائی کا جو ماحول دیکھ رہے ہیں،وہ بھی مسلمانوں سے آیا ہے۔اس لیے کسی یورپی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم پر ذلت کی نگاہ ڈالے اور ہمیں کمتر سمجھے۔۔۔انسانوں کے بارے میں بنیادی علم انبیائے کرام کا مرہونِ منت ہے۔تمام موجودہ علوم کی اساسیات قرآن میں موجود ہیں۔آج ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں، اسے قرآن سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ہم کہتے ہیں کہ ہم خلائی دور میں سانس لے رہے ہیں۔قرآن میں خلاء سے متعلق متعدد آیات وارد ہوئی ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے اشارہ کر دیا تھا کہ آنے والا دور خلائی دور ہوگا۔ ۔۔۔جدید سائنس کے موجد مسلمان ہی تھے۔آج مغرب میں جو کچھ ہے،اس پر ڈینگیں مارنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے اور مغربی اقوام کے لیے ایک ہی راہِ نجات ہے کہ ہم سب مسلمان ہو جائیں۔''

1973ء میں ملی سلامت پارٹی اور اس کے رہنماؤں نے مذہب اور اخلاقی اقدار پر کافی زور دیا،مگر اسلامی ریاست کی تشکیل کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔اس وقت پارٹی کا سیاسی استحکام اور اندرونی تنظیم ہی پیشِ نظر تھی،مگر جیسے جیسے پارٹی اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی گئی اور اندرونی صفوں میں اتحاد اور تنظیم پیدا ہوتی گئی،اسلامی ریاست،اس کی خصوصیات اور مبادیات پر کھلے لفظوں میں گفتگو ہونے لگی اور اخبارات میں مضامین شائع ہونے لگے۔

خود پروفیسر اربکان نے پاکستان میں صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے اصلاحی اقدامات کو سراہا۔ایران کے اسلامی انقلاب کا تجزیہ کیا گیا،اور ترکی،پاکستان اور ایران میں برپا اسلامی احیائی تحریکات کے درمیان موازنہ کر کے ان کو ایک دوسرے کے ہم پلہ اور قریب قرار دیا۔دانشور احمد ناظم نستان نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ سلطنت عثمانیہ نے اسلام ہی کی برکت سے کئی براعظموں پر حکومت کی،اس لیے:''ترکی کے لیے اسلام،ایران اور پاکستان سے کہیں زیادہ پسندیدہ اور قابلِ قبول ہے۔ہمارا ملک دوسرے اسلامی ملکوں سے کہیں زیادہ اسلامی حکمرانی کا حق دار ہے۔ہمیں دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ جلد وہ دن واپس لائے۔''

ایک دوسرے دانشور اور سیاسی رہنما احمد سغلام نے کہا:

''آج پوری دنیا میں جو تحریک زوروں پر ہے، اس کا ایک ہی مقصد ہے: قانونِ اسلامی کو نافذ کیا جائے اور جہاد اسلامی کو روبہ عمل لایا جائے۔۔۔ اربکان، ضیاء الحق، خمینی، گلبدین حکمت یار اور برہان الدین ربانی جیسے رہنما اسی نصب العین کے حصول کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔''

بسا اوقات واضح لفظوں میں بھی اسلامی حکومت کی تشکیل پر گفتگو ہونے لگی۔ مثلاً ''ملی گزٹ'' 11 جولائی 1980ء کے شمارے کے اداریے میں لکھا گیا:

''اگر ہم اس ملک میں اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے آرزومند ہیں تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ یہاں اسلامی قانون نافذ العمل نہیں ہے۔ جب اسلام کی حکومت تمام اداروں پر قائم ہو جائے گی اور ایوانِ صدارت سے لے کر کوڑا کرکٹ کی صفائی تک ہر جگہ اسلام ہی کا اظہار ہوگا۔ تب ہی ہم یہ کہہ سکیں گے کہ یہاں اسلام موجود ہے۔''

''ملی سلامت پارٹی'' کے رہنماؤں نے اب بین الاقوامی مسائل پر بھی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے مسلم ممالک کی متحدہ تنظیم (Organization of the United Nations of Islam) کا نعرہ دیا۔ اسلامی ممالک کی مشترکہ منڈی، عالمی اسلامی ثقافت، اسلامی بھاری صنعت سازی، اسلامی بھاری اسلحہ سازی اور اسلامی بین الاقوامی بیت المال کے قیام کی تجاویز بھی پیش کیں۔ اسلامی مفکرین نے مطالبہ کیا کہ تمام تر اداروں کی تنظیم نو قرآن کی اساس پر ہو۔ طِب، تجارت، تعلیم، فوج، صنعت وزراعت اور وزارتِ مذہبی امور کی اسلام کاری کی جائے، اور اس طرح رفتہ رفتہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔

سیکولرازم کے خلاف صف آرائی

''ملی سلامت پارٹی'' کے رہنماؤں کا یہ اندازِ فکر اور نقطۂ نظر مصطفیٰ کمال پاشا کے تصور سیکولرازم کے خلاف تھا۔ اس کا مقصد ملک کو لادینیت اور مغربیت کی راہ پر لگانا تھا اور اس کے متعین اصولوں کا مطلب مذہبی امور و معاملات میں حکومت کی عدم دلچسپی اور تمام مذاہب سے یکساں معاملہ رکھنا تھا، اسی لیے دستور اور قانون کے دائرے میں رہ کر ایک طرف حکومت سے سیکولرازم کے صحیح نفاذ کا مطالبہ پارٹی کے چند رہنماؤں نے کیا، تاکہ حریت فکر کا احترام کیا جائے۔

1973ء میں سیاسی حالات کے دباؤ میں ''ملی سلامت پارٹی'' کے رہنما سیکولرازم کے خلاف کوئی بیان نہ دے سکتے تھے، اسی لیے انہوں نے اشارہ وکنایہ میں گفتگو کی، بلکہ سیکولرازم کی حمایت بھی بسا اوقات کی، تاکہ کمیونسٹوں اور لادین طبقوں کی طرح مذہبی حلقوں کو بھی فکر و اظہار رائے کی آزادی حاصل ہو سکے۔ چنانچہ پارٹی کے ایک رہنما نے 1973ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''میں حساس موضوعات پر متفکر و مضطرب ہوں اور ان پر اظہار خیال کرنا میرے لیے مشکلات کا باعث ہے۔ ہمیں اپنے جذبات سے مغلوب و متاثر نہیں ہونا چاہیے اور ان موضوعات پر زیادہ توجہ ہمارے لیے نامناسب ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں بارودی سرنگوں پر کس طرح قدم رکھنا ہے۔''

سیکولرازم کی ایک جائز حد تک حمایت کا مطلب یہ بھی تھا کہ مذہبی طبقوں کی مخالفت اور ان سے منافرت کا سلسلہ بند ہو، کیونکہ ''اس وقت اہل ایمان کے حقوق پر قدغن عائد ہے اور اس ناانصافی کا خاتمہ ناگزیر ہے۔'' دوسری طرف عوامی مقبولیت کے حصول کے بعد اور پارٹی کی اندرونی تنظیم کے ساتھ 1980ء میں سیکولرازم کو خلاف اسلام قرار دیا جانے لگا۔ اب واشگاف الفاظ میں سیکولرازم کی تردید کی جانے لگی:

''ملی گزٹ'' نے اپنے 8 مارچ 1980ء کے اداریے میں لکھا: ''جدید ترکی کا سیاسی نظام اسلام کے اصولوں سے متصادم ہے۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ مذہب کے زیرِ قیادت سیاسی و مذہبی امور و مسائل کا اتحاد و انضمام ہو۔ اس سیاق میں سیکولرازم کا فلسفہ اور سیکولرازم کا نظام اسلامی شریعت اور دین کے خلاف ہیں۔ خاص طور پر ترکی میں سیکولرازم کا نفاذ اس لیے کیا گیا ہے کہ لامذہبیت اور الحاد کی کامیابی کو یقینی بنایا جاسکے۔''

16 مارچ 1980ء کے اداریے میں ملی گزٹ نے لکھا: ''وہ لوگ جھوٹے اور فریب کار ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب اور سیاست دو الگ چیزیں ہیں۔۔۔۔ مسلمان دنیا کے معاملات کو آخرت کے معاملات سے الگ نہیں کرسکتے۔''

اسی طرح 6 اپریل 1980ء کے اداریے میں زیادہ واضح اور دوٹوک الفاظ میں ''ملی گزٹ'' نے لکھا: ''یہ بالکل واضح بات ہے کہ فرد قانون سازی کا اختیار نہیں رکھتا۔ اگر وہ کوئی قانون بناتا ہے یا قانون بنانے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے۔ اسلامی قانون کا خالق وہی ہے جو آدمی کا خالق ہے۔ خدا نے آدمیوں کو انہی قوانین کی مطابقت میں پیدا کیا ہے۔ انسانی قوانین انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔۔۔۔ اسلام ہر دور کے لیے قانون ہے۔ یہ مذہب بھی ہے اور ریاست بھی۔۔۔۔ قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ قبرستانوں میں اس کی تلاوت کی جائے یا مسجدوں میں مقفل ہوکر محفوظ ہوجائے۔ قرآن تو حکومت کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔''

ترکی میں مغربیت اور اسلام کی کشمکش

ملی سلامت پارٹی کے نظریہ ساز مفکرین اپنی تحریروں، تقریروں اور بیانات میں سیکولرازم کے خلاف لکھنے اور بولنے لگے، جب کہ ترکی معاشرہ جبر و استبداد اور اسلام و انسانی اقدار کا مخالف وہ دور بھی دیکھ چکا ہے جس میں مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے لادینی نظریات کے خلاف کوئی کمزور آواز بھی ملک اور وطن سے بغاوت اور غداری سمجھی جاتی تھی، لیکن اس نئی اسلامی تحریک کی مسلسل جدوجہد اور قربانی نے حالات کو بدل کر رکھ دیا اور فکر و نظر کے زاویے ایسے درست ہو

پروفیسر نجم الدین اربکان بھی واضح طور پر سیکولرازم کے خلاف پوری طاقت سے صف آرا ہو گئے۔ پاکستان کے دورے کے موقع پر انہوں نے تمام سیاسی احتیاط اور اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر سیکولرازم اور لادینیت کے خلاف تقریر کی۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات کے وقت انہوں نے زور دیا کہ "ایک اسلامی ریاست کی بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ پوری زندگی کو اسلام کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے، سب سے پہلے ریاست کا سرکاری مذہب اسلام کو قرار دینا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو دین اسلام خطرے میں رہے گا۔"

بنیادی انسانی حقوق، حریت فکر و عمل اور جمہوریت کے تعلق سے بھی "ملی سلامت پارٹی" اور اس کے رہنماؤں کا موقف اسلامی تعلیمات پر مبنی رہا ہے۔ انہوں نے ایک طرف آزادی فکر و نظر اور اظہار رائے کی مکمل حمایت کی اور کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے عناصر کے لیے بھی آزادی و حریت کی وکالت کی، لیکن دوسری طرف اس موقف کا بھی کھل کر اظہار کیا کہ ترکی ایک مسلم ملک ہے اور یہاں اسلام کی بالادستی ہونی چاہیے۔ انہوں نے صراحت کی:

> "ہم تشکیل حکومت میں قیادت کر رہے ہیں۔ حکومت کی تشکیل اس طرح ہو گی جس طرح ہمارے بھائیوں کی خواہش ہے۔ ملی سلامت پارٹی کا کچھ مفہوم اور اس کا کوئی مقصد ہے۔ یہ پارٹی عریانی اور خلاف وقار لباس کی حمایت نہیں کر سکتی۔ نوجوانوں کی تربیت اس لیے نہیں ہو گی کہ وہ کمیونسٹ اور دہریہ بنیں، سینما گھروں میں غیر اخلاقی اور فحش فلموں پر پابندی ہو گی۔ ہر شخص اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق لکھنے اور بولنے کا حق دار ہو گا، البتہ جو لوگ اپنے گھروں میں کتابیں پڑھتے ہیں، واجب التعزیر نہ ہوں گے۔"

ساتھ ہی اس امر کی بھی صراحت کی کہ سیکولرازم اپنے مخصوص پس منظر، نظام فکر و عمل اور فلسفہ زندگی کے ساتھ اسلام سے متصادم بھی ہے، اگرچہ اس کے عام معانی اسلام کی تعلیمات سے نہیں ٹکراتے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک اور انہیں فکر و عمل کی آزادی کا تصور قرآن میں بھی موجود ہے۔ "ملی گزٹ" نے اپنے 9 مارچ 1980ء کے اداریے میں لکھا:

> "ہم نجات، فلاح کے تذکروں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اسلام کا طریقہ نجات وفلاح ہے۔ دوسرا کافرانہ ومشرکانہ طریقہ ہے، جو نجات کا ضامن نہیں بن سکتا۔ آخر الذکر کا انحصار وحی الٰہی پر نہیں ہے، اور انسانی حماقتوں پر اس کی بنیاد ہے جو خود باہم متضاد و متصادم ہیں، جیسے اشتراکیت، سرمایہ داری، اشتمالیت اور جمہوریت۔"
>
> "خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اپنی مرضی اور فیصلے کے مطابق نہیں، بلکہ قرآن مجید کے مطابق حکومت کریں۔ اگر ووٹوں کے ذریعے انسانوں پر حکومت جائز ہوتی تو وحی الٰہی کی ضرورت نہ تھی۔ جن معاشروں میں عوام کے ووٹوں سے معاملات طے پاتے ہیں، وہاں اسلام زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ جمہوریت مغربی اور عیسائی طریقوں کے مطابق جاہل عوام پر حکومت کرنے کی ایک مغربی سازش ہے۔ یہ دراصل اسلام پر عیسائیت کی فتح ہے۔ صرف

الہامی قوانین ہی نافذ کیے جاسکتے ہیں۔انسان قابل نفاذ قوانین نہیں بنا سکتا۔''

''یہودیوں کے ذریعے یروشلم کو دارالسلطنت بنانے کا اعلان دراصل فطری نتیجہ ہے عالم اسلام کے بہت سے پہلے سے زوال پذیر ہونے کا،فراموش کردہ مسلم اخوت کا،قومی ونسلی رجحانات کی اشتعال انگیزی کا،مغرب کی سازشی پالیسیوں کا،تسلیم شدہ سیکولر، لادین اور جمہوری اصولوں کا۔ان سارے اسباب نے مل کر یروشلم کو دارالسلطنت بنایا ہے۔''

''ملی گزٹ'' کے اداریوں کے مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1980ء میں پارٹی کے رہنما اور کارکن کھل کر سیکولرازم کے مخالف ہو گئے تھے اور یہ کہ ترکی کی ساری خرابیوں کی جڑ معاشرے کا لادینی رخ تھا۔

ملی سلامت پارٹی کے رہنماؤں نے اسلام کے شاندار ماضی اور سلطنت عثمانیہ کی میراث کا حوالہ دیا۔مثال کے طور پر ان کے مقررین کا دعویٰ تھا کہ ملی نظام پارٹی اور ملی سلامت پارٹی کے رہنماؤں میں ترکی کی سرکردہ شخصیات شامل ہیں۔جو اسلام سے گہری عقیدت ومحبت رکھتی ہیں۔چند جملے بطور اقتباس ملاحظہ ہوں:

☆ ملی سلامت پارٹی ترکی کی اسلامی روایت کا تسلسل اور اس کی ضامن ہے۔

☆ پارٹی اسی عظیم الشان میراث کا احیاء کرے گی جو چھ سو سال تک سلطنت عثمانیہ کی شکل میں جلوہ گر رہی۔

☆ سیکولرازم اور مغربیت ہی سلطنت عثمانیہ کے زوال کے ذمہ دار ہیں۔

☆ ملی سلامت پارٹی کے پاس شاندار ماضی کے احیاء کا اسلامی فارمولا موجود ہے۔

پروفیسر نجم الدین اربکان نے اس اسلامی فارمولے کا اعلان معاشی سرکاری پلان کی تردید کرتے ہوئے بھی کیا۔ان کا اصرار واعلان تھا کہ قومی تاریخی اقدار کی تدریس وتربیت بچوں اور نوجوانوں کے لیے ناگزیر ہے۔بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے محبت وشفقت کی عملی تعلیم بھی ضروری ہے۔وہ کہا کرتے تھے کہ ملی سلامت پارٹی جب اقتدار میں آئے گی تو ہی شکل وصورت کے جوانوں کے عورتوں کے سے بال کاٹ دے گی۔نوجوان خواتین اور لڑکیوں کو باوقار اور باعفت بننے کی ترغیب دی جائے گی اور دہشت گردی کے علاج کے طور پر سچی اور صحیح دینی تعلیم دی جائے گی۔

پروفیسر اربکان ترکی خارجہ پالیسی پر مغرب کے اثرات بد کے سخت مخالف تھے۔وہ مغرب سے ترکی کی وابستگی اور خاص تعلق کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے سخت خطرہ تصور کرتے تھے اور اسے درحقیقت عالم اسلام سے مربوط کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ان کے خیال میں ترکی استحصال اور آمریت پسندی میں مغربیت کی راہ پر گامزن تھا۔وہ کہتے ہیں:

''ایک آئیڈیالوجی کی حیثیت سے کمیونزم صیہونیت کا ایک بازو ہے تو سرمایہ داری اس کا دوسرا بازو ہے۔دراصل صیہونیت پوری دنیا پر حکومت کرنے کی آرزو رکھتی ہے اوران دونوں بازوؤں کا استحصال اپنی مرضی کے مطابق کرتی ہے۔۔۔۔مالٹا کانفرنس کا مقصد صیہونیت کے نام پر دنیا کو منقسم کرنا تھا۔جب سے کچھ نئی طاقتوں کا ظہور ہوا ہے،وہ اس تقسیم سے ہم

آہنگ ہونا چاہتی ہے۔ تاہم پچھلی دہائی میں عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ نے صورت حال یکسر بدل کر رکھ دی ہے۔ اب دنیائے اسلام میں تجدید واحیاء کی نئی تحریک اٹھی ہے۔ اب ہمیں آپس میں لڑنے کی پالیسی بند کرنا ہوگی اور نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا۔"

پروفیسر اربکان نے سالٹ کی دوسری کانفرنس کو عالم اسلام کے خلاف سرمایہ داری اور کمیونزم کی ایک متحدہ سازش قرار دیا۔ قبرص کے مسئلے پر سب سے زیادہ معرکہ آرائی رہی۔ متحدہ قبرص میں ترک مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے جاتے تھے اور ان کی فریادرسی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جب پروفیسر اربکان نائب وزیراعظم بنے تو انہوں نے یونانیوں کے خلاف مسلمانوں کی امداد وحمایت میں وہاں ترکی فوجیں اتار دیں۔ جنگ کے بعد قبرص دو حصوں میں منقسم ہوگیا اور ترکی قبرص کے صدر رؤف ونکتاش بنے۔ اس موقع پر اربکان نے ری پبلکن پارٹی اور جسٹس پارٹی کی مذمت کی، جنہوں نے یونانی مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس مسئلے کو سلجھا دیا تھا۔ قبرص کے مسئلے میں پروفیسر اربکان فاتح بن کر ابھرے۔

اسلامی ممالک کے ساتھ رابطہ وتعلق کی استواری کے مسئلے پر پروفیسر اربکان نے سب سے زیادہ بیانات دیے۔ دنیا بھر کی اسلامی احیائی تحریکات سے تعلق کو مستحکم کیا گیا۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے ہونے والی عالمی جدوجہد سے واقفیت اور اس کی حمایت وتائید پر رفقاء وکارکنان نے لب کشائی کی اور مغرب سے رابطہ استوار کرنے کی بجائے اسلامی دنیا سے گہرے تعلقات پر زور دیا۔ مغربی فکر وثقافت، تہذیب وتمدن اور اداروں پر سخت تنقید کی گئی۔ مغربی بلاک کو اربکان نے خصوصی ہدف بنایا اور اپنی بیشتر تقریروں میں اس کی اسلام دشمنی اور مسلم کشی نمایاں کی۔ مشنری سکولوں کے نظام ونصاب، جوئے خانوں، شراب نوشی کے اڈوں، جنسی بے راہ روی اور فحاشی کی علم بردار انجمنوں پر تیز وتند حملے کیے اور انہیں ترکی معاشرے سے ختم کرنے کی مہم چلائی گئی۔ یہاں تک کہا گیا کہ "یونان قدیم کے تمام بڑے نام نہاد فلسفی جنسی بے راہ روی کے شکار تھے۔" اور یہ کہ:

"اہل مغرب خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ موسیقی سے دل بہلاتے ہیں اور اپنے مذہبی تہوار اور مقدس ایام کا جشن شراب وکباب کے ساتھ مناتے ہیں۔ وہ بدکرداری، جنسی آوارگی اور قتل وغارت گری کا ہر جرم کر سکتے ہیں اور ایک مذہبی اعتراف کے ذریعے نجات کا پروانہ بھی حاصل کر لیتے ہیں عیسائیت کو قبول کیے بغیر اور اسلام کی مخالفت کیے بنا ایک مغربی کی طرح سوچنا اور عمل کرنا محال ہے۔"

"ہم ڈیڑھ صدی سے توہمات وخرافات میں، لباس وزیبائش میں، روایات ورسوم میں اور شراب ومکاری کی محفلوں کے قیام میں مغرب کی تقلید کرتے آرہے ہیں۔ ہم نے اپنے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا وہی نصاب ونظام مقرر کیا ہے، جو مغرب میں رائج ہے۔ ہم نے اپنے دلوں سے خدا کی یاد محو کر دی ہے۔ عقل نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ ہم نے اپنے دستور، قانون اور تعلیم کو سیکولر بنا دیا ہے۔ ہم نے شراب وکباب سے تمام بندشیں اٹھالی

ہیں، لیکن پچھلے سال میں ہم ایک بھی نوبل پرائز حاصل نہ کر سکے۔اس کے باوجود ہماری قوم یہودی فری میسن سازش کا شکار ہونے کے لیے تیار ہے جو تمام اقوام مغرب کے پس پردہ متحرک وفعال ہے۔"

صیہونی تحریک پر پروفیسر اربکان نے مختلف قسم کے اعتراضات قائم کیے۔اس تحریک کو انہوں نے دنیا کی تمام سازشوں اور تخریب کاریوں میں ملوث قرار دیا۔ڈارون، سگمنڈ فرائیڈ، درخائم اور کارل مارکس سب کے افکار و نظریات انسانی عقل وفکر کو منحرف کرنے کی یہودی سازش کا حصہ تھے۔ترکی کی تمام دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں صیہونیت کا کردار رہا ہے۔قومیت کا نظریہ، جس نے مسلم ممالک کو حصوں بخروں میں تقسیم کر دیا، یہودی سازش کا ایجاد کردہ تھا۔یورپ کی مشترکہ منڈی ہی نہیں، بلکہ اقوام متحدہ کا ادارہ بھی صیہونی سازش کا حصہ ہے۔سرمایہ داری اور اشتراکیت کی مصنوعی تقسیم دراصل یہودیوں کے عالمی غلبے کے حقیقی خطرے پر پردہ ڈالنے کا منصوبہ ہے۔مارشل ٹیٹو ایک یہودی تھا، جس نے صیہونیت کے لیے کام کیا، یہاں تک کہ جاگیرداری بھی یہودی سازش ہی کی اسکیم تھی۔ چونکہ ہر باطل اور غلط منصوبے میں یہودی شامل ہوتے ہیں، اس لیے لازماً انہوں نے سلطان محمد الفاتح کو زہر دیا ہوگا۔نسل پرستی بھی ایک یہودی سازش تھی اور بے چارہ ہٹلر ظالم و بے رحم یہودیوں کا محض ایک مہرہ تھا۔یہودی انسانیت کے بدترین دشمن ہیں، جس کی صراحت قرآن پاک نے کر دی ہے۔

قومی و عالمی مسائل پر ملی سلامت پارٹی اور اس کے حکمرانوں نے کوئی مصالحت ومنافقت نہ کی۔انہوں نے ہر طرح کے دباؤ اور ترغیب کے ہر حربے سے بے نیاز ہو کر اسلامی موقف اختیار کیا۔شرعی نقطہ نظر کی وکالت و مدافعت کی اور ترک عوام کو ان کے شاندار ورثے اور تابناک ماضی سے قریب کرنے کی جدوجہد کی، جس میں انہیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی، اور عوام کا اعتماد واطمینان پا کر انہوں نے اسلامی احیائی تحریک کو اقدام وعمل کے مرحلے میں داخل کیا، اور یہی بات سیکولر عناصر اور کمالی فوج کو برداشت نہ ہو سکی اور ان سب نے مل کر ملک میں فوجی حکومت از سر نو قائم کر دی۔

سیکولرازم کے خلاف دستوری کاوشیں

مصطفیٰ کمال پاشا کی وفات کے بعد 10 نومبر 1938ء کو جنرل عصمت انونو ترکی جمہوریہ کے صدر منتخب ہوئے۔وہ مصطفیٰ کمال کے پرانے دوست، جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم کے تجربہ کار سپاہی اور جمہوریہ ترکی کے پہلے وزیر اعظم تھے۔11 نومبر 1938ء کو صدارت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد 1950ء تک وہی ملک کے سیاہ وسفید کے مالک رہے اور حکمران جماعت خلق فرقہ سی (ری پبلکن پیپلز پارٹی) کی بدترین آمریت اور مطلق العنانی قائم رہی۔1950ء کے عام انتخابات میں ملک کے 88 فیصد باشندوں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا اور حزب مخالف ڈیموکریٹ پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ملک کے نئے صدر جلال بایار منتخب ہوئے اور وزیر اعظم عدنان مندریس مقرر ہوئے، جنہوں نے ملک میں کچھ جمہوری قدروں کو بحال کیا، مساجد تعمیر کروائیں،

عربی زبان اوراذان سے پابندی ہٹائی اور سکولوں میں دینی تعلیم کا انتظام کیا۔

مذہبی آزادی کی بحالی سے عدنان مندریس جلد ہی ترک عوام میں مقبول ہو گئے، لیکن مقبولیت کا الٹا اثر ہوا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر اور ان کے وزراء مطلق العنان بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارٹی میں انتشار و افتراق شروع ہو گیا اور فوزی لطفی عثمان اور ان کے ساتھ اٹھارہ دیگر ارکان اسمبلی نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ دسمبر 1955ء میں انہوں نے ایک نئی جماعت ''حریت پارٹی'' قائم کر لی۔ پھر 22 اگست 1957ء کو متحدہ محاذ بنایا گیا، تاکہ ڈیموکریٹ پارٹی کا عام انتخابات میں مقابلہ کیا جائے۔ اس محاذ میں ری پبلیکن پارٹی، جمہوری ملت پارٹی اور حریت پارٹی، یعنی تین پارٹیاں شامل تھیں۔ 27 اکتوبر 1957ء کو انتخابات کرائے گئے، مگر حکومت کی دھاندلیوں کے سامنے متحدہ محاذ ناکام ہو گیا اور عدنان مندریس کی جماعت پھر برسراقتدار آ گئی۔

ڈیموکریٹ پارٹی کے دوبارہ برسراقتدار آنے کے بعد اس کی آمریت اور اس کے استبدادی رویے میں مزید اضافہ ہوا۔ داخلہ وخارجہ پالیسی میں تبدیلیاں آئیں۔ امریکی سرمایہ داروں کو ترکی میں سرمایہ لگانے کی چھوٹ مل گئی۔ مصنوعات کی درآمد پر کوئی پابندی نہ رہی اور مغربی ممالک کی مصنوعات سے ترکی بازار پُر ہو گئے اور قومی معیشت کا ایسا زبردست خسارہ ہوا کہ ملک تقریباً پندرہ ارب ڈالر کا مقروض ہو گیا۔ تحریر وتقریر کی آزادی پر کڑی پابندی لگا دی گئی اور مصارف زندگی بہت بڑھ گئے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے سے حزب اختلاف کے رہنماؤں کو روک دیا گیا۔ چنانچہ اپریل 1960ء سے عوامی مظاہرے شروع ہو گئے۔ ہر طرف سے مندریس کے استعفےٰ کا مطالبہ ہونے لگا۔ جلسوں اور جلوسوں پر قدغن لگانے کے لیے مارشل لاء لگا دیا گیا، مگر عوام کے مشتعل جذبات ٹھنڈے نہ ہوئے۔ چنانچہ جنرل جمال گُرسل کی قیادت میں 21 مئی 1960ء کو فوجی انقلاب برپا ہو گیا۔ صدر وزیراعظم اور دوسرے وزراء گرفتار کر لیے گئے اور ملک کا انتظام فوجی افسروں کی انجمن اتحاد وترقی کے ہاتھ میں چلا گیا جو 38 فوجی افسروں پر مشتمل تھی اور جس کے رہنما خود جنرل جمال گُرسل تھے۔ دوسرے دن 28 مئی 1960ء کو ایک عبوری حکومت تشکیل دی گئی، جس نے جنرل جمال گُرسل کو وزیراعظم اور فوج کا کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا۔ جنرل گُرسل نے پارلیمنٹ کو برخاست کر کے تمام گرفتار کارکنوں اور اخباری نمائندوں کو رہا کر دیا اور تمام سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ فی الحال فوج نے ملکی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور ایک کمیشن مقرر ہو چکا ہے جو ایک نیا عارضی دستور مرتب کرے گا جس کی منظوری کے بعد ملک میں عام انتخابات ہوں گے اور فوجی حکومت منتخب حکومت کے حق میں دست بردار ہو جائے گی۔

1960ء کا عارضی دستور

اس عارضی دستور کا اعلان 12 جنوری 1960ء کو کیا گیا اور فوجی انقلاب کے رہنما جنرل گُرسل کو نظم ونسق کے تمام اختیارات حاصل ہو گئے۔ وہ اب باقاعدہ ترکی کے ''صدر مملکت'' مقرر ہو گئے، اور مارچ 1966ء تک اس عہدے پر قابض رہے۔ اس دستور کے مطابق ''انجمن اتحاد قومی'' کو جو ہنگامی حالات میں قائم ہوئی تھی، اس وقت تک کے لیے مکمل اختیارات حاصل ہوئے، جب تک نئے انتخابات نہ ہو جائیں، اسے عارضی قوانین بنانے

اورانہیں مشتہر کرنے کا حق حاصل ہوا۔انجمن کے صدر کو صدر مملکت اور فوج کا کمانڈران چیف مقرر کیا گیا۔انجمن کو کابینہ کے ارکان کو برطرف کرنے اور صدر انجمن کو نئے ارکان کابینہ مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا۔عارضی صدر مملکت کو انجمن کے بنائے ہوئے نئے عارضی قانون پر نظر ثانی کرنے کا حق بھی دیا گیا۔نیز یہ کہ انجمن کو ایک تحقیقاتی کمیشن اور ایک ہائیکورٹ کی تشکیل کا اختیار بھی دیا گیا، تاکہ سابق صدر، سابق وزیراعظم، سابق ارکان کابینہ اور دوسرے افسروں کے جرائم کی تحقیقات کی جاسکے اور ان پر مقدمہ چلایا جاسکے۔انجمن کو نئے انتخابات کرانے کا حق بھی دیا گیا، تاکہ ملکی اختیارات اسمبلی کو منتقل کردینے کے بعد ''انجمن اتحاد قومی'' کو توڑ دیا جائے۔

14 نومبر 1960ء کو انجمن اتحاد قومی (Committee of National Unity) سے چودہ فوجی افسروں کو نکال دیا گیا۔عارضی دستور میں وعدہ کیا گیا تھا کہ جلد ہی نیا دستور تشکیل دیا جائے گا۔اس مقصد کے لیے 6 جنوری 1961ء کو دستور ساز اسمبلی کی تشکیل ہوئی اور نئے دستور پر بڑی تیزی سے کام کا آغاز کردیا گیا اور چند ماہ کی مشقت کے بعد 27 مئی 1961ء کو دستور کی تکمیل ہوگئی۔

اس دستور کا مقصد بظاہر ''ملک میں جمہوریت کو ترقی دینا اور ایک ایسی قوم کی تشکیل وتعمیر کرنا تھا جو مہذب، خوشحال اور جمہوری ہو'' مگر درحقیقت ترکی سیاست کے دائرے سے ان تمام سیاسی پارٹیوں کو خارج کردینا اور ان کا مستقبل تاریک کردینا مقصود تھا جو مصطفیٰ کمال کی سیکولرازم کی راہ سے انحراف کررہی ہوں، اسی لیے نئے دستور کی دفعات میں سیاسی جماعتوں کے وجود و بقا کو جمہوریت کی ترقی کے لیے ناگزیر قرار دیا گیا، مگر ساتھ ہی انہیں دستوری عدالت کے ذریعے تحلیل کردینے کی تجویز بھی منظور کی گئی ''اگر وہ دستوری اور جمہوری اصولوں کی خلاف ورزی کریں۔''

یہ نیا دستور اپنی روح اور مزاج کے اعتبار سے 1924ء کے کمالی دستور سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اتاترک کی سیکولرازم کے ساتھ مکمل وفاداری اور ان پر یقین کامل کا اعلان تھا۔

1971ء کا دستور

1965ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی تشکیل وتنظیم میں تبدیلی آگئی۔نئی سیاسی جماعت ''جسٹس پارٹی'' نے اکثریت حاصل کرکے کابینہ تشکیل دی۔1971ء میں فوجی مداخلت کے سبب دوسالہ عارضی مدت کے لیے ایک نئی کابینہ تشکیل پائی۔یہ کوئی باضابطہ مداخلت نہ تھی، بلکہ ایک طرح کا انتباہ تھا کہ اگر ملک میں امن وقانون کی بحالی نہ ہوئی اور سیکولرازم اور کمال ازم کا تحفظ نہ کیا گیا تو ملک کی باگ ڈور فوج اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔طے پایا کہ ایک معزز اور غیر متنازعہ شخص کو وزیراعظم کی حیثیت سے مقرر کیا جائے، لیکن فوج نے کسی شخص کا نام نہیں لیا، نہ کابینہ کی تشکیل کے لیے کوئی ہدایت جاری کی۔انتخابات میں سلیمان ڈیمریل اور ان کی جسٹس پارٹی نے کامیابی حاصل کی تھی، مگر انہوں نے صدر مملکت جودت شائے سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جانب سے 1971ء تک غیر پارٹی کابینہ کارکردگی کے خلاف کوئی چیلنج نہیں ہوا، اسی لیے حکومت کی جانب سے یہ اعلان ہوا کہ ملک اور جمہوریہ کے خلاف ایک مضبوط اور سرگرم بغاوت کا اندیشہ ہے'' اور اس اعلان کے خلاف کوئی عوامی ردعمل

سامنے نہ آیا تو مختلف صوبوں میں، جہاں امن و قانون کی صورت حال ابتر رہ گئی تھی، مارشل لاء لگا دیا گیا۔ نئے وزیر اعظم نہت ارم نے اعلان کیا: "مشرقی ترکی میں سبوتاژ، بغاوت اور علیحدگی پسند تحریک پرورش پا رہی ہے، متعدد گرفتاریاں ہوئیں اور لیبر پارٹی کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔

20 ستمبر 1971ء کو دستور میں جو ترمیمات کی گئیں، ان سے گویا ایک نیا دستور سامنے آیا، جس سے ملٹری کمانڈروں اور مسلح افواج کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک میں کس طرح کا سیاسی استحکام لانا چاہتے ہیں۔ اس نئے دستور کے دو مقاصد تھے:

1۔ قومی وحدت، ملکی سالمیت اور امن عامہ کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کے اختیارات میں توسیع کرنا۔

2۔ بڑی مہارت اور باریک بینی سے فوجی حکومت کو خود مختار اور آزاد بنانا۔

پہلے مقصد کے حصول کے لیے انتظامیہ کو مستحکم اور مضبوط بنایا گیا، تاکہ وہ ان عناصر کے خلاف سخت کارروائی کرے، جو:

(الف) طبقہ، فرقہ، نسل، مذہب یا زبان کا استحصال کریں۔
(ب) قوم کو منقسم کرنے کی تدبیر کریں۔
(ج) قومی وحدت کے خلاف تشدد اور انتہا پسندی کا پرچار کریں۔

فوجی حکومت کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ پارٹیوں، انجمنوں اور تنظیموں پر پابندی عائد کر سکتی ہے۔ کابینہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ پارلیمنٹ کی ہدایت پر امن و امان سے متعلق احکام نافذ کر سکتی ہے اور اس سلسلے میں نئے احکام بنا سکتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں قدغن لگا سکتی ہے کہ وہ جرائم پیشہ اور سازشی عناصر کو تحفظ نہ دیں۔ حکومت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتی ہے۔ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر مارشل لاء کی مدت میں توسیع کر سکتی ہے۔ کابینہ اکتوبر 1971ء میں ہونے والے عام انتخابات کو ملکی حالات کے پیش نظر اکتوبر 1973ء تک ملتوی کر سکتی ہے۔

اس دستور نے مسلح افواج کے اختیارات میں کافی اضافہ کر دیا۔ ایک نیا قانون منظور کر کے وزیر دفاع کے اختیارات کی بھی گنجائش نکال لی۔ نیشنل سکیورٹی کونسل کو یہ حق مل گیا کہ وہ دفاعی امور کے علاوہ امور عامہ کے بارے میں بھی تجاویز و سفارشات کابینہ کو پیش کر سکتی ہے۔ عام شہریوں کے مقدمات فوجی عدالتوں میں پیش کرنے کے امکانات بڑھا دیئے گئے۔ فوجی عملے کی تمام نقل و حرکت کی سرگرمیوں پر سول انتظامی عدالتوں کا حق و اختیار ختم کر دیا گیا اور کورٹ مارشل کے ارکان کا درجہ اور رتبہ بڑھا دیا گیا۔

1971ء کی ان دستوری ترمیمات کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا، کیونکہ حکومت کی پالیسی پر فوج زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی، یہاں تک دفاعی امور میں بھی حکومت کے فیصلے زیادہ تر آزادانہ رہے، اور سیاسی جماعتوں کی تنقید اور مخالفت بڑھتی گئی۔ وزیر اعظم سلیمان دیمریل نے فوجی دخل اندازیوں پر تند و تیز حملے کیے اور فوجی حکمرانوں کے مفادات اور

ن کی نیت اور عزائم کی قلعی کھولی۔ علاوہ ازیں خود فوج کے سینئر کمانڈروں میں بھی چپقلش اور باہمی آویزش شروع ہو گئی اور نتیجے کے طور پر 28 مارچ 1971ء کو صدر مملکت جودت ثنائی کی مدت مکمل ہوئی تو سیاسی رہنماؤں اور فوجی کمانڈروں کے درمیان تصادم اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

1971ء میں ترکی میں عام انتخابات ہوئے تو نتائج میں پھر ردوبدل ہوا۔ فوجی حکومت کی ریشہ دوانیوں اور دھاندلیوں کی وجہ سے ایک بار پھر "ری پبلیکن پارٹی" برسراقتدار آگئی۔ اس کے بعد 1977ء میں عام انتخابات ہوئے اور 1980ء تک سلیمان ڈیمریل اور بولنٹ جاوید وزیراعظم کی حیثیت میں، باری باری ملک کی زمام اقتدار سنبھالے رہے اور جسٹس پارٹی کے تعاون سے ایڈمرل فہری کوروترک صدر مملکت کے منصب پر فائز رہے۔ 1980ء میں فوج نے پھر مداخلت کی۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو معطل کر دیا اور دو سال تک فوج ہی ترکی عوام کی قسمت کی مالک رہی۔ 1982ء میں ایک نیا دستور بنا اور نومبر 1983ء میں اس دستور کی بنیاد پر عام انتخابات کرائے گئے۔

1982ء کا دستور

ملک میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت، تشدد، دہشت گردی اور امن وامان کی ابتری نے فوج کو برابر مضطرب رکھا۔ 1971ء کے بعد گیارہ صوبوں میں مارشل لاء کے نفاذ سے امن وامان کی صورتِ حال کچھ بہتر ہوئی تھی، مگر 1971ء کے انتخابات کے بعد سول حکومت قائم ہوئی تو سیاسی مجرم پھر دندنانے لگے، اور مشرقی ترکی میں تشدد اور علیحدگی پسندی کے جو افراد اور طبقات روح رواں تھے، انہوں نے پھر عوامی حکومت سے فائدہ اٹھا کر سازشوں کا آغاز کر دیا۔ دسمبر 1977ء میں ایک ضلع میں زبردست نسلی فساد پھوٹ پڑا اور اس فرقہ وارانہ فساد میں بہت سے افراد جاں بحق ہوئے۔ ادھر مخلوط حکومت کی تشکیل سے مذہبی عناصر نے ملک میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے راہیں ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا جو فوج کے سیکولر اور کمال پرست مزاج کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ملی سلامت پارٹی اور اس کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان نے حکومت میں شامل ہو کر تعلیمی اداروں میں اصلاحات کا جو پروگرام شروع کیا تھا اور خارجہ پالیسی میں تبدیلی کر کے اسلامی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کی جدوجہد ہو رہی تھی، اس کی زد مصطفیٰ کمال پاشا کے چھوڑے ہوئے لادین اور سیکولر اصولوں پر پڑ رہی تھی۔

1980ء میں 30 اگست کی "یوم فتح" کی تقریبات کے موقع پر ملی سلامت پارٹی کے رہنما مسلح افواج کے سربراہوں کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لیے حاضر نہ ہوئے۔ 6 ستمبر 1980ء کو ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی ایک فوجی تقریب میں، قومی ترانے کے وقت، پارٹی کے رہنما خاموش بیٹھے رہے، اور اس طرح سرکاری ترجمان کے مطابق انہوں نے ملک وقوم کی تذلیل کی۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ 5 ستمبر 1980ء کو "ملی سلامت پارٹی" کے دباؤ میں وزیر خارجہ کو اسلامی کاز کا دفاع نہ کر سکنے کے جرم میں کابینہ سے برطرف کر دیا گیا۔ ان تمام حالات کے نتیجے میں 18 ستمبر 1980ء کو جنرل کنعان ایورن نے فوجی انقلاب برپا کر دیا اور تمام سیاسی جماعتوں کو معطل کر کے انہیں خلاف قانون قرار دے دیا۔

ترکی: فوج اور سیاسی جماعتوں کی کشمکش

چیف آف جنرل سٹاف کنعان ایورن کی شہرت ایک بے داغ اور بے لوث فوجی افسر کی تھی۔ انہیں سیاستدان بھی عزت واحترام سے دیکھتے تھے۔ 1978ء میں بلند ایجویت نے انہیں فوج کا اعلیٰ عہدہ دیا تھا۔ جب کہ جنرل سمیع سانکار کو جسٹس پارٹی سے ہمدردی رکھنے کے شبہ میں وزیراعظم نے ریٹائرڈ کر دیا تھا۔ 1980ء کے فوجی انقلاب سے پہلے کنعان ایورن نے نیشنل سیکیورٹی کونسل کے ذریعے سیاست دانوں سے تعاون کرنے کی اپیل کی تھی۔ 1982ء کے دستور کی روشنی میں آئندہ سال جو انتخابات ہوئے، اس میں وہ صدر مملکت منتخب ہوئے۔

1982ء کا دستور مرتب کرنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ با اختیار انتظامیہ تشکیل دی جا سکے۔ سیاسی جماعتوں کے قانون اور انتخابات کے قواعد میں ایسی ترامیم کی جائے، جس سے زیادہ مستحکم حکومت بنائی جا سکے جو ملک میں امن، قانون کی بحالی پر قابو پا سکے۔ مخصوص حالات میں عام سیاسی حقوق سے محروم کر دینے کی قوت بھی حکومت کو دی گئی، مگر عوام کو بنیادی حقوق سے محروم قرار دینا اور اس کی آزادی کو سلب کر دینا ہر حال میں ممنوع قرار پایا۔ دستور کی دفعہ میں اس بات کا اضافہ کیا گیا کہ نیشنل سیکیورٹی کونسل زیادہ با اختیار ہوگی اور اس کے فیصلے کابینہ کو ترجیحی طور پر ملحوظ رکھنا ہوں گے۔ 1971ء کے دستور میں کونسل کو یہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ کابینہ کو اپنے بنیادی نظریات بطور سفارش پیش کر سکتی تھی اور بس۔ اب کونسل کابینہ کو ہر قسم کی ہدایت دینے کی مجاز ہوگئی اور کابینہ ترجیحی بنیادوں پر انہیں نافذ کرنے کی پابند ہوگئی۔ اس طرح انتظامیہ میں فوج کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔

1971ء کے دستور کے مقابلے میں اب زیر بحث 1982ء کے نئے دستور میں بعض اختیارات میں کمی کی گئی۔ مثال کے طور پر مسلح افواج کے لیے یہ قانون منظور ہوا کہ مسلح افواج میں کام کرنے والے پرائیویٹ افراد اور کارپورل اور ملٹری سکولوں کے طلبہ حق رائے دہی سے محروم ہوں گے۔ درحقیقت دفعہ 66 کے مطابق حق رائے دہی سے محروم اکیس سال سے اوپر کے صرف وہی لوگ تھے جو مجرم تھے اور جیلوں میں قید کی زندگی گزار رہے تھے۔ اب مزید لوگوں کو اس بنیادی حق سے محروم کر دیا گیا۔

فوجی کمانڈر مسلح افواج کے حقوق کے تحفظ و دفاع کی خاطر صدر مملکت کے اختیارات کی توسیع کے حق میں تھے۔ اگرچہ اس بات کی صراحت کہیں نہیں کی گئی کہ صدر کو فوج کا پس منظر رکھنے والے افراد میں سے منتخب ہونا چاہیے، بہرحال پارلیمنٹ کی جانب سے کمانڈران چیف کے دفتر کی نمائندگی کرنی تھی اور دفعہ 104 کے تحت صدر کو اختیار دیا گیا کہ وہ ترکی کی مسلح افواج کو جب اور جس طرح چاہے، حکماً استعمال کر سکتا ہے۔ چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کر سکتا ہے، نیشنل سیکیورٹی کونسل کا اجلاس طلب کر سکتا ہے اور مارشل لاء نافذ کر سکتا ہے۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ صدر مملکت کے توسط سے بھی فوج کے اختیارات بڑھا دیے گئے، مگر کوئی ایسا طریق کار متعین نہیں کیا گیا، جس سے صدر مسلح افواج کی آزادی کو سلب کر لینے سے سیاست دانوں کو روک سکے۔ حکومت کے روزمرہ معمولات کی انجام دہی سیاست دانوں کی صلاحیت وقوت میں مزاحم ہو سکے۔

نئی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل

نیشنل سیکیورٹی کونسل نے نئے پارٹی سسٹم کی تشکیل کی، تاکہ 1980ء سے پہلے کی تمام سیاسی جماعتوں کو دوبارہ سیاست کی دہلیز پر قدم رکھنے سے روکا جا سکے اور انہیں نئے پرچم سے کام کرنے کا موقع نہ مل سکے، اور اب جو نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں، وہ فوج سے تصادم اور معرکہ آرائی نہ کریں۔ چنانچہ نئے دستور کے تحت حکومت کے رہنماؤں اور حزب اختلاف کے رہنماؤں کو بھی، دس سال تک جماعتی سیاست میں مصروف رہنے سے روک دیا۔ اسی طرح ممنوعہ سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اراکین سینیٹ وقومی اسمبلی پر پانچ سال تک پارٹی سیاست میں سرگرم ہونے پر قدغن لگا دی گئی۔ لیکن یہ تمام پابندیاں 1987ء میں ہٹالی گئیں۔

نئے دستور کی ایک اور دفعہ ممنوعہ، سیاسی جماعتوں کے بانیان، صدور، انتظامی کمیٹیوں کے ہر سطح کے ارکان، اور سیاسی جماعتوں کی پارلیمانی ارکان کسی نئی سیاسی جماعت کی بنیاد نہیں ڈال سکتے اور نہ اس کی انتظامیہ کی رکنیت اختیار کر سکتے تھے، نہ کوئی عہدہ قبول کر سکتے تھے۔ کوئی ایسی سیاسی جماعت تشکیل نہیں دی جا سکتی تھی، جس کے اراکین کی اکثریت کسی ایسی سیاسی جماعت سے متعلق رہی ہو، جسے فوجی حکومت نے 1981ء میں ممنوع قرار دے دیا ہو۔ یہ بندش 1987ء میں ختم ہو گئی۔

دفعہ 96 کی رو سے نئی سیاسی جماعتیں ان سیاسی پارٹیوں کے نام، علامات اور پرچم وغیرہ استعمال نہیں کر سکتی تھیں جو 16 اکتوبر 1981ء کو ختم کر دی گئیں تھیں۔ ان پر یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی تھی کہ وہ اس امر کی صراحت کر سکیں کہ ان کا تعلق 1981ء سے پہلے کی کسی سیاسی جماعت سے ہے۔ نیز سیاسی جماعتوں پر یہ پابندی بھی لگائی کہ وہ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے فیصلوں اور پالیسیوں پر تنقید نہیں کریں گے۔

تمام پرانی اور نئی سیاسی جماعتوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے نیشنل سیکیورٹی کونسل کو اختیار دیا گیا کہ ان پر نظر رکھے اور بوقت ضرورت انہیں نااہل قرار دے دے۔ اس طرح کونسل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ اس نے بہت سی سیاسی جماعتوں کو پہلے عام انتخابات میں شریک ہونے سے روک دیا اور انہیں کسی اور سیاسی جماعت کی تائید وحمایت کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔

16 مئی 1983ء کو جیسے ہی سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی ختم ہوئی، ترکی کی سیاست کے سٹیج پر متعدد نئی سیاسی جماعتیں نمودار ہوئیں۔ ان میں سے ''نیشنلسٹ ڈیموکریسی پارٹی'' اور ''پاپولسٹ پارٹی'' کی تشکیل میں فوجی قیادت کی حوصلہ افزائی شامل تھی۔ یہ دونوں پارٹیاں علی الترتیب دائیں بازو اور بائیں بازو کی نمائندہ سمجھی جاتی تھیں۔ ''مدر لینڈ پارٹی'' ترگت اوزال کی سربراہی میں وجود میں آئی، جو پہلے جسٹس پارٹی حکومت کے انڈر سیکرٹری، اور پھر فوجی حکومت کے عہد میں دو سال تک نائب وزیراعظم کی حیثیت سے ''بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف)'' کے

مطالبے پر کی گئی معاشی اصلاحات کے انچارج کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ چوتھی قابل ذکر سیاسی جماعت ''گریٹ ترکی پارٹی'' تھی جس کی بنیاد ایک ریٹائرڈ جنرل علی فتحی نے رکھی تھی۔ پانچویں جماعت ''سوشل ڈیموکریسی'' کے نام سے وجود میں آئی، جس کی سربراہی معروف سیاست دان عصمت انونو کے بیٹے اردل انونو کے ہاتھوں میں تھی۔ اسی وقت ''رفاہ پارٹی'' بھی نمودار ہوئی جس کے سربراہ پروفیسر نجم الدین اربکان تھے، جنھوں نے ملکی حالات کے پیش نظر ابتدا میں پس پردہ رہنا قریب مصلحت سمجھا۔ پھر جلد ہی اعلانیہ اس سے وابستہ ہو گئے۔ یہ پارٹی اسلام پسند مگر ممنوعہ جماعت ''ملی سلامت پارٹی'' ہی کا تسلسل تھی۔

''گریٹ ترکی پارٹی'' جو سابق جسٹس پارٹی ہی کی توسیع تھی اور اسی نام اور رجحان سے جلد ہی پہچانی جانے لگی اور اس کے رہنماؤں نے اس تعلق و تسلسل سے نہ صرف فائدہ اٹھایا، بلکہ اس کا استحصال کرنے کا پلان بھی تیار کیا۔ یہ جماعت 31 مئی 1983ء کو خلاف قانون قرار دے دی گئی، کیونکہ ''نیشنل سیکیورٹی کونسل'' کے سربراہ کسی قیمت پر 1980ء سے پہلی کی کوئی یادگار باقی رکھنے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ اس جماعت کے رہنماؤں نے ''ٹرتھ پارٹی'' کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل دے ڈالی، مگر 1983ء کے عام انتخابات میں یہ پارٹی شریک نہ ہو سکی۔

''سوشل ڈیموکریسی پارٹی'' بھی جو معطل ری پبلکن پیپلز پارٹی کا خلاء پر کرنے کا عزم لے کر اٹھی تھی، اس عام انتخابات میں حصہ نہ لے سکی۔ البتہ مدر لینڈ پارٹی نے جوش و خروش سے الیکشن میں حصہ لیا اور ترگت اوزال نے ایک ماہر سیاست دان کی حیثیت سے 1983ء کے الیکشن میں فتح حاصل کر لی۔ انتخابات سے قبل ''نیشنل سیکیورٹی کونسل'' نے 2 جون 1983ء کو انتخابی امیدواروں کو مسترد اور نااہل قرار دینے کا اختیار حاصل کر لیا۔ چنانچہ کونسل نے نومبر 1983ء کے الیکشن سے پہلے مدر لینڈ پارٹی کے 292 امیدواروں نیشنلسٹ ڈیموکریسی پارٹی کے 398، اور پاپولسٹ پارٹی کے 389 امیدواروں کو مسترد کر دیا۔

رفاہ پارٹی کی اسلام پسندی

رفاہ پارٹی درحقیقت قومی شعور کی حامل اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے وجود میں آئی تھی۔ یہی مقصد ''ملی سلامت پارٹی'' کا بھی تھا، جسے 1980ء کے فوجی انقلاب نے تحلیل کر دیا تھا۔ یہ پارٹی مادی ترقیوں سے زیادہ روحانی ارتقا پر زور دیتی تھی، جس کے بغیر مادی ترقیاں بے معنی ہیں۔ پارٹی تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرتی تھی۔ اس پارٹی کے رہنماؤں کے نزدیک پچھلی صدی میں جدیدیت اور مغربیت کی تحریک اس لیے ناکام ہوئی کہ اس میں روحانیت کا فقدان تھا۔ ترکی صنعتی دوڑ میں باقی دنیا سے اس لیے پیچھے رہ گیا تھا کہ اس نے خارجی افکار و نظریات اور خارجی وسائل پر بھروسا کیا تھا۔ مغربی تہذیب، فکر و ثقافت اور مغربی طرز زندگی کی درآمد نے ملک میں اخلاقی و تہذیبی بحران پیدا کر دیا، جس سے قومی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس کے فکر و نظر کے سوتے خشک ہو گئے اور پوری قوم اغیار پر تکیہ کر کے خود کفالتی اور خود انحصاری کا جذبہ کھو بیٹھی۔

رفاہ پارٹی کے مطابق مادیت کی چمک دمک اور روحانیت کے فقدان نے آج دنیا کو اضطراب و فسادات،

جنگ وجدل، تشدد و دہشت گردی، ظلم واستحصال، غربت وافلاس اور مایوسی و نامرادی میں مبتلا کر دیا ہے۔ انسانیت روحانی و اخلاقی زندگی سے دور ہو چکی ہے۔ فحاشی و بدکاری عام ہے۔ منشیات اور جرائم نے نوجوانوں کی قوت و صلاحیت سلب کر لی ہے۔ دماغی و قلبی امراض عام ہو گئے ہیں۔ طرح طرح کی نفسیاتی بیماریاں پھیل رہی ہیں اور انسانوں نے محبت واخوت، امن وامان، بقائے باہمی قوت برداشت، رواداری، صداقت وامانت کی جن اقدار کی تعلیم حاصل کی تھی، وہ عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ اب ایک نئے شعور کی ضرورت ہے جو مادی زندگی کو اعلیٰ روحانی واخلاقی اقدار کے سایے میں پروان چڑھائے۔ یہ نیا شعور کیا ہے؟ اور اس کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ ان سوالوں پر رائے زنی کرتے ہوئے ”رفاہ پارٹی“ کے رہنماؤں نے ملکی (اور فوجی) دباؤ میں احتیاط سے کام لیا، مگر مخالف سمجھ رہے تھے کہ ان اقدار کے احیاء کا مطلب اسلامی نظام کا احیاء ہے۔

رفاہ پارٹی نے ترکی میں بھاری صنعتیں لگانے کا اعلان کیا، تاکہ ترکی میں معیشت کے میدان میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا ہے، اسے درست کیا جا سکے اور مختلف طبقات کے درمیان موجودہ زبردست معاشی تفاوت ختم کیا جا سکے۔ اس نے آزاد خارجہ پالیسی مرتب کرنے کا بھی اعلان کیا، جس سے ترکی اپنے افرادی وسائل اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس سلسلے میں پارٹی نے اس موقف کا اعادہ کیا کہ ان ممالک سے مستحکم روابط قائم کیے جائیں گے جن کے روحانی و ثقافتی اور تاریخی تناظر میں اشتراک پایا جاتا ہے، یعنی مشرق وسطیٰ اور عالم اسلام ہے۔

1989ء میں پروفیسر نجم الدین اربکان نے بتایا کہ بلدیات کے حالیہ انتخابات میں رفاہ پارٹی کی کارکردگی نسبتاً بہتر رہی ہے۔ اس وقت 80 بلدیات پر رفاہ پارٹی کا قبضہ تھا۔ ان میں نمایاں ترین قونیہ، سیواس، اورنہ، وان اور مرعش کی بلدیات تھیں۔ قونیہ کے چیئرمین نے کامیاب ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ طالبات کے لیے الگ بسیں جاری کر دیں۔ اس پر لادین اور سیکولر طبقے نے بڑا ہنگامہ کیا۔ اخبارات میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور کہا جانے لگا کہ قونیہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی ہے، لیکن قونیہ کے عوام نے اس فیصلے پر بڑی خوشیاں منائیں۔ بلدیہ سیواس کے چیئرمین نے سینماؤں کے سامنے عریاں تصاویر لگانے پر سخت پابندی عائد کر دی۔ بلدیہ اورفہ کے چیئرمین نے بیان دیا کہ مجھے کمال پاشا سے کوئی عقیدت نہیں ہے۔ اس پر یہود نواز حلقے برہم ہو گئے۔ ترکی کی خفیہ پولیس نہیں گرفتار کر کے انقرہ لے گئی اور کئی گھنٹے کی پوچھ گچھ کے بعد انہیں رہا کیا گیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میرا ضمیر مصطفیٰ کمال کو ناپسند کرتا ہے اور میرے ضمیر پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔

کردستان کا مسئلہ اور رفاہ پارٹی

پروفیسر نجم الدین اربکان نے بتایا کہ ”رفاہ پارٹی کی اسلام پسندی، اور اس کی پالیسی کے نتیجے میں اسلام کی یہ پیش رفت دیکھ کر مغربی طاقتیں پریشان ہو گئیں۔ امریکا نے ترکی میں اپنا سفیر بدل دیا اور اس کی جگہ یک یہودی سفیر کو ترکی میں مامور کیا اور جو امور اسلامی کا ماہر خصوصی ہے، پہلے اسے ملائیشیا کے لیے تجویز کیا گیا تھا لیکن ملائیشیا نے اسے لینے سے انکار کر دیا، کیونکہ یہ سی آئی اے کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ فرانس کا سفیر بھی یہودی ہے۔ یہ پہلے، تیونس میں

تعینات تھا۔ اب سے ترکی منتقل کر دیا گیا ہے۔ مغرب سمجھتا ہے کہ ترکی چھ کروڑ آبادی کا ملک ہے، اگر اتنی بڑی آبادی کی قوم عالم اسلام کے اتحاد کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تو دنیا میں اسلام کو زبردست قوت حاصل ہو جائے گی۔‘‘

پروفیسر ارشان نے ترکی میں بڑھتے ہوئے اسلامی رجحانات پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ ترکی میں اب ایک لاکھ مساجد ہیں، جن کے ذریعے کسی نہ کسی انداز میں اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے۔ پیش اماموں، خطیبوں اور دینی مدارس کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ اب تک 8 اعلیٰ اسلامی کالج وجود میں آ گئے ہیں، البتہ یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کالجوں میں فقہ اور دوسرے علوم اسلامی جدید طریقے سے پڑھائے جائیں۔ اسلامی لٹریچر کثرت سے پھیل رہا ہے۔ مولانا مودودی کی تفسیر ’’تفہیم القرآن‘‘ کا مکمل ترکی ترجمہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے اور اس کی اشاعت تیزی سے پھیل رہی ہے۔

رفاہ پارٹی کی اسلام پسندی کا اظہار اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ اس کے ایک نمایاں فرد شیخ امین سراج نے جو جامعہ ازہر (قاہرہ) کے گریجوایٹ ہیں اور عربی زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں، انہوں نے استنبول کی تاریخی مسجد ’’جامع الفاتح‘‘ میں حدیث شریف کا مستقل درس شروع کیا تو استنبول یونیورسٹی کے طلبہ، دینی اداروں کے نوجوانوں اور عوام الناس کا ایک زبردست اجتماع ہو گیا۔ اس تاریخی مسجد کی تعمیر سلطان محمد فاتحؒ (1429ء۔1481ء) نے فتح قسطنطنیہ کے فوراً بعد 1453ء میں شروع کرائی تھی۔ اس نے ایا صوفیہ کا وہ کلیسا زر کثیر صرف کر کے خرید لیا، جسے بازنطینی شہنشاہ قسطنطین نے 532ء میں تعمیر کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر 1934ء تک اس مسجد میں برابر اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی رہیں۔ عصمت انونو نے اپنے عہد حکومت میں مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے 1935ء میں اسے کلیسا میں تبدیل کر دیا اور اس میں اذان دینے اور نماز پڑھنے پر پابندی لگا دی۔ سلطان محمد فاتح نے ’’جامع الفاتح‘‘ سے ملحق حفظ قرآن کا ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا اور وقف کی آمدنی کے ذریعے اس کے اخراجات کا انتظام کر دیا تھا۔ سلطان کو قرآن مجید سے اس قدر دلچسپی تھی کہ اپنی تمام سیاسی و جنگی مصروفیات کے باوجود وہ حفاظ قرآن کی تقریبات میں شریک ہوتا تھا۔ جب بھی اسے نظم حکومت سے فرصت ملتی، وہ ادارہ مذکور کے ایک مخصوص حجرے میں جا بیٹھتا اور علماء و مشائخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے قرآن حفظ کرتا۔

شیخ امین سراج اور اس کے رفقاء نے 1958ء میں اس ادارہ کا احیاء کیا اور حفظ قرآن کی جماعتیں دوبارہ شروع ہو گئیں۔ جامع الفاتح میں درس حدیث کے علاوہ علم تفسیر، علم فقہ واصول اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم بھی دی جانے لگی اور رفتہ رفتہ اس ادارے نے ترکی کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک مقام بنا لیا۔ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے بھی اس ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ 1958ء سے پہلے اس مسجد کے مختلف گوشوں میں چھپ کر خاموشی سے درس دیا جاتا تھا۔ شیخ امین سراج نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں بتایا کہ ہم لوگ مسجد کے کنارے ایک کمرے میں 1943ء سے 1950ء تک چھپ چھپ کر دینی علوم حاصل کرتے رہے۔ اس زمانے میں علم دین کے طلبہ کے لیے یہی طریقہ باقی رہ گیا تھا۔

جامع ایا صوفیہ کے سامنے جامع سلطان احمد میں ایک دوسرے خطیب اور عالم دین شیخ امر اللہ نے دعوت

دین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کا تعلق بھی رفاہ پارٹی سے ہے۔ ان کی خطابت اور جرأت استنبول میں بڑی شہرت رکھتی تھی۔ اس کا اندازہ نماز جمعہ کی غیر معمولی حاضری سے لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جمعہ کے خطبوں میں دل کھول کر اسلام اور احیائے اسلام کے موضوع پر شاندار اور پُر اثر تقریریں کیں اور لادینیت اور مغربیت پر تنقیدیں کرتے رہے۔

1991ء کا پارلیمانی انتخاب

20 اکتوبر 1991ء کو ترکی میں پارلیمانی انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات کے لیے رفاہ پارٹی نے جو منشور اور پروگرام شائع کیا، اس میں حسب ذیل امور پر خصوصی توجہ دی:

معاشی نظام عدل و انصاف پر مبنی ہوگا جس میں سود کا کوئی مقام نہ ہوگا نہ کسی فرد پر ٹیکس کی ادائیگی واجب ہوگی۔ اس معاشی نظام میں نئی صنعتوں اور کارخانوں کی تشکیل پر زور دیا گیا اور علاقائی سطح پر ریاست کی رہنمائی میں سرمایہ کاری اور شراکت کی حوصلہ افزائی کی اسکیم سامنے رکھی گئی۔ پارٹی نے وعدہ کیا کہ صنعتی وزرعی خدمات میں اور سیاحت کے شعبے میں توسیع کی جائے گی۔

خارجہ پالیسی میں رفاہ پارٹی کی طرف سے ایک نئے نظام اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ یہ نیا نظام مسلم ممالک اور مسلم معاشروں کے تعاون ہی سے قائم ہوگا۔ مغربی دنیا میں ترکی کی عزت و وقار میں اضافہ اس وقت ہوگا جب ایک ''اسلامی دولتِ مشترکہ'' کا قیام عمل میں آ جائے گا۔ عالم اسلام کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے رفاہ پارٹی نے ''مسلم ممالک کی دفاعی تنظیم'' مسلم ممالک کی مشترکہ منڈی اور ''مسلم ممالک کی ثقافتی وتہذیبی امدادی انجمن'' کی تشکیل پر خاص طور سے زور دیا۔

بنیادی آزادیوں اور حقوق کے ضمن میں پارٹی نے اعلان کیا کہ ایک عادلانہ اور اخلاقی نظام کی تشکیل ہی سے امن و امان اور تحفظ کا ماحول فراہم ہوگا۔ عوام کو اپنے افکار و نظریات پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی اور اس سے انفرادی خوشی اور خوشحالی آئے گی۔ ٹریڈ یونین اور مزدوروں کی فلاح و بہبود سے متعلق پارٹی کی پالیسی یہ تھی کہ مزدوروں اور مالکوں کے درمیان باہمی معاہدے کے ذریعے کام اور اس کی اجرت کی تفصیلات پہلے سے طے ہونی چاہئیں اور طرفین کے تعلقات کی بنیاد شراکت اور حصہ داری پر ہونی چاہیے۔ مزدوروں کے حقوق اور مراعات کے بندوبست کے لیے ٹریڈ یونینوں کو کلیدی رول ادا کرنا ہوگا۔

تعلیم کے سلسلے میں رفاہ پارٹی نے اپنے اس مؤقف کا اعادہ کیا کہ اس کا مقصد اسلامی اور قومی تاریخ کا شعور بیدار کرنا ہے۔ بچوں کے اندر کیریئر پلاننگ کی اسکیم نافذ العمل ہونی چاہیے۔ تعلیم کو زیادہ آزاد اور خودمختار بنایا جائے تاکہ قومی نظریات کی تعلیم، تکمیل کے لیے تحقیقات و مطالعات کا عمل مہارت اور تنظیم کے ساتھ نافذ ہو سکے۔ تعلیم کے تمام مراحل کو رفاہ پارٹی نے اسلامی و قومی تاریخ و تہذیب سے مربوط رکھنا ضروری قرار دیا۔

انتخابات کے نتیجے میں ٹرتھ پارٹی اور مدرلینڈ پارٹی اکثریت میں آئی اور انہوں نے متحدہ محاذ بنا کر مخلوط حکومت بنائی۔ رفاہ پارٹی کو حزب اختلاف میں بیٹھنا پڑا۔ مارچ 1994ء کے بلدیاتی انتخابات کے نتائج نے

حکمرانوں کی راتوں کی نیندیں اڑادیں، کیونکہ رفاہ پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ وہ حزب اختلاف کے رہنماؤں سے مل کر اسرائیل اور امریکا کی امداد حاصل کر کے رفاہ پارٹی اور اس کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہوگئے۔ 13 اپریل کو انقرہ میں رفاہ کے صدر نے ایک بیان میں کہا: ''حزب الرفاہ اقتدار میں آرہی ہے۔ اب یہ سوچنا چھ کروڑ ترکی عوام کا کام ہے اقتدار کی یہ منتقلی پرامن طریقے سے ہوگی یا خوں ریزی ناگزیر ہوگی۔''

انقرہ کے اٹارنی جنرل نے اس تقریر پر اعتراض کیا کہ اس سے قانون کی خلاف ورزی ہوئی اور انہیں اسٹیٹ سکیورٹی کورٹ کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی۔ بلدیاتی انتخابات کے نتیجے میں رفاہ پارٹی کو جو فتح حاصل ہوئی، اس کی ایک وجہ پارٹی کی اسلام پسندی تھی، دوسری وجہ پارٹی کے اصول وضوابط اور کارکنوں کا بے لوث مخلصانہ کردار، تیسری وجہ ترکی حکومت کی داخلہ وخارجہ پالیسیوں کا ابہام، تضاد اور منافقانہ روش ہے۔

کردستان کا مسئلہ

سالہا سال سے کردستان کا مسئلہ ترکی حکومت کے لیے کافی مشکلات کا باعث بنا ہوا ہے، اور یہ مسئلہ دراصل ترک قومیت ہی کا پیدا کردہ ہے۔ خلافت عثمانیہ کے آخری ادوار میں مغربی طاقتوں نے ترک قومیت کو خوب ہوا دی اور مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر مصطفیٰ کمال پاشا (1881ء۔1934ء) اور ضیا گوگ پاشا (1875ء۔1924ء) نے اسلامی ملی تصور کے باوجود ترک قومیت کی نشر واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ترک قومیت کی مے اس قدر بلند ہو گئی کہ عوام اس نشے سے سرشار ہو کر عربوں اور مسلمانوں سے کٹ کر رہ گئے۔ اب اسی قومیت (نیشنلزم) کی تخم ریزی اسلام دشمن قوتیں کردوں میں کر رہی ہیں، اور انہیں کردستان کی علیحدہ ریاست کی تاسیس و تشکیل کے لیے فکری نظریاتی، اخلاقی، مادی اور عسکری امداد وحمایت سے نواز رہی ہیں۔ ترکی کے حکمرانوں کو پھر بھی یہ امید لگی ہوئی ہے کہ مغربی طاقتوں کا رویہ ''سیکولر ترکی'' کے مفاد میں اور دہشت گردی کے خلاف ہوگا۔

دراصل کردستان کے مسئلے کے دو پہلو ہیں:

1۔ ترکی عوام کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو ''کرد'' کہتا ہے، مختلف سطح کی محرومیوں اور عدم مساوات کا شکار ہے اور موجودہ ''کردستان ورکرز پارٹی'' (پی کے کے) انہی محرومیوں اور مظلومیوں کی پیداوار اور ردعمل ہے۔ اس مسئلے کو ترکی حکومت اپنی داخلہ پالیسی میں مناسب اصلاح کر کے حل کر سکتی ہے، جس سے ان کی مشکلات باہمی تعاون کے ماحول میں دور ہو سکیں۔

2۔ پی کے کے ان انتہا پسند کردوں کی تنظیم ہے، جن کو بیرونی طاقتوں کی حمایت اور امداد حاصل ہے۔ اس تنظیم کی حکمت عملی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تشدد اور جارحیت کا ارتکاب کیا جائے، جن کے ردعمل میں سکیورٹی فورسز سخت کارروائی کریں اور اس طرح بالواسطہ یا براہ راست مظلوم طبقے کی حمایت انہیں حاصل ہو جائے اور دنیا کی نگاہ میں وہ مظلومیت کا پیکر بن کر آجائیں۔

ترکی حکومت نے مسئلے کے اول الذکر پہلو پر کبھی توجہ نہ دی اور اس طرح وہ ''پی کے کے'' کے جال میں پھنستی

چلی گئی اور مسئلہ دن بدن زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ ترکی کے وزیر اعظم تانسو چیلر نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں یہ مسئلہ پہلے اتنا گھمبیر نہ معلوم ہوا تھا اور یہ کہ ''عسکری حل'' کے سوا انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

رفاہ پارٹی کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان نے ایک بیان میں کہا: ''کردوں کے مسئلے کا واحد حل اسلام میں مضمر ہے، مگر بدقسمتی سے ترکی دستور نے اسلام کو رفض و بدعت سے زیادہ قابل نفرت بنا دیا ہے۔'' اور اب عسکری و فوجی حل کے سوا کوئی راہ حکمرانوں کو نظر نہیں آ رہی ہے۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ کردوں کی انسانی حقوق کی انجمن نے 874 ایسے دیہات کی نشان دہی کی ہے، جو اب تک سیکیورٹی فورسز کے ذریعے خالی کرائے جا چکے ہیں۔ 1995ء میں چار ہزار سے زیادہ کردوں کا خون ناحق بہا دیا گیا۔ اس جارحیت سے پی کے کے ن داستان مظلومیت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور ترکی افواج کے بارے میں عوامی تاثر کافی خراب ہوا ہے۔

ایک دلچسپ پہلو اس کا یہ ہے کہ پی کے کے عام طور پر کمیونسٹ پارٹی سمجھی جاتی ہے، مگر اس نے بھی مذہب کا سہارا لے کر ترکی افواج کو کافر قرار دے دیا ہے اور یہ نقطۂ نظر ان مظلومین میں عام ہو رہا ہے جو دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

اسرائیل اور ترکی کے باہمی تعلقات اور رفاہ پارٹی

اس وقت کے ترکی کے وزیر خارجہ حکمت سیتن نے نومبر 1993ء کے دورۂ یروشلم کے دوران، واضح الفاظ میں اسرائیل سے دوستانہ تعلقات کی حمایت کی۔ اس حقیقت سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے کہ بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ غاصبانہ و ظالمانہ ہے اور عالم اسلام اور دنیا کے بیشتر انصاف پسند ممالک نے بار بار اس قبضے کی مذمت کی ہے۔ تاہم او آئی سی اور موتمر عالم اسلامی کا رکن ہونے کے باوجود ترکی کے وزیر خارجہ نے نام نہاد ''بستان امن'' میں جا کر شجر کاری کی۔ ان کی زبان اس وقت بھی خاموش رہی جب اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے یہ بیان دیا:

> ''یروشلم کی حیثیت پر کسی نقد و تبصرہ کی دعوت دینا اسرائیل کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ہمیں آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یروشلم ماضی میں اسرائیل کا دارالحکومت رہا ہے اور آج بھی ہے۔''

ترکی کے وزیر خارجہ نے بارہ دفعات پر مشتمل اسرائیل سے تہذیبی و اقتصادی مفاہمت کے معاہدے پر دستخط کیے اور فتح کے نشے میں انقرہ واپس آئے۔ اس کے جواب میں جنوری 1994ء میں اسرائیل کے صدر وائز مین نے ترکی کا چار روزہ دورہ کیا۔ اسرائیل میں متعین ترکی سفیر نے اسے یہودیوں کے ساتھ تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ قرار دیا۔ صدر وائزمین نے اپنے دورے کے تین مقاصد بتائے:

1۔ عرب اور مسلم ممالک میں ترکی کی وساطت سے معاشی و سیاسی اور عسکری اثر و نفوذ حاصل کرنا۔
2۔ خطے کی تعمیر نو میں ترکی حکومت کا تعاون حاصل کرنا۔
3۔ ترکی سے پانی کی اسرائیلی ضرورت پوری کرنا۔

وائزمین نے جب شہر سانی رفاہ کا دورہ کیا اور وہاں ''جنوب مشرقی اناطولیہ پروجیکٹ'' کا معائنہ کرنے پہنچے تو ترک عوام نے اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور اپنے سخت غم و غصے کا اظہار کیا۔ اگرچہ وزیر مملکت نجم الدین سیوہیری نے صفائی پیش کی کہ صدر وائزمین کے دورے سے ہمارے پروجیکٹ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تاہم عوام نے ریڈیو اسٹیشنوں پر قبضہ کر کے اپنی برہمی کا اظہار کیا اور اعلان کیا کہ ہم انبیائے کرام علیہم السلام کے اس شہر میں وائزمین کی آمد کے خلاف ہیں۔

دراصل وائزمین کی میزبانی کے پس پردہ ترکی حکومت چاہتی تھی کہ ''کردستان ورکرز پارٹی'' (پی کے کے) کی دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے اسرائیل سے کوئی دفاعی معاہدہ ہو جائے اور مشترکہ دشمن حافظ الاسد (صدر شام) کے خلاف جو کرد دہشت گردوں کو پناہ دے رہا ہے، اسرائیل کی حمایت مل جائے۔ لیکن وائزمین نے بڑی عیاری سے ان مسائل کو نظر انداز کیا۔ اس نے حافظ الاسد کو دشمن قرار دیتے ہوئے امن کے قیام میں اس کے رویے کی مخالفت کی۔ اس کے باوجود اس نے ترکی کو صدر حافظ الاسد سے کردستان کے مسئلے پر گفت و شنید کا مشورہ دیا۔ اس نے پی کے کے کو ایک دہشت گرد تنظیم ماننے سے انکار کر دیا، مگر بار بار اصرار کے بعد اس نے حکومت کی دل جوئی کے لیے صرف اتنا کہا کہ جن لوگوں کو مسائل کے سامنے اپنی مجبوری اور مظلومیت کا احساس ہے، انہیں دہشت گردی کا سہارا لینے سے پہلے دوبارہ اپنے موقف پر غور کرنا چاہیے۔ آزاد کرد ریاست کے بارے میں اس کا مبہم جواب یہ تھا: ''ہم مشرق وسطیٰ میں آزاد فلسطینی ریاست کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ جاسوسی نظام اور کارکنوں کی تربیت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ آپ کو دہشت گردوں کے خلاف جنگ خود لڑنا ہو گی۔ یہ کسی ملک کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ دوسرے ملک کی دہشت گردی کے خاتمے کے لیے وہاں جا کر جسمانی طور پر جنگ میں شریک ہو۔''

ترکی سیاست کا یہ زبردست المیہ تھا کہ وہاں کی حکمران جماعت اور حزب اختلاف، اسرائیل سے سفارتی اور دوستانہ تعلقات رکھنے کے حق میں تھیں۔ چنانچہ حزب اختلاف (اے این اے پی) کے رہنما مسعود یلماز نے بھی صدر وائزمین کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ البتہ رفاہ پارٹی کا موقف اس معاملے میں سخت تھا۔ پارٹی کے ڈپٹی چیئرمین صبغت کازن نے اپنے بیان میں کہا: ''اسرائیل دہشت گردی کی جائے پیدائش ہے، اور اس نے ترکی سرحدوں پر حرص و طمع کی نگاہ جما رکھی ہے۔''

اسرائیل اور ترکی کے باہمی تعلقات کے علاوہ کردستان کے مسئلے پر بھی رفاہ پارٹی کا موقف بالکل واضح ہے۔ 14 اکتوبر 1994ء کو امریکی کانگریس کے پچاس ارکین نے وزیر اعظم ترکی کو ایک خط میں لکھا کہ انہیں اس امر پر سخت تشویش و اضطراب ہے کہ منتخب اراکین پارلیمنٹ کو قومی اسمبلی میں کردوں کے مسئلے پر اظہار خیال کرنے کے جرم میں موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ امریکی کانگریس کے ان ارکان نے ترکی حکومت کو وارننگ دی کہ اگر کردوں کو سیاسی عمل میں شریک نہ کیا گیا تو کردستان کا مسئلہ حل نہ ہو سکے گا اور دہشت گرد ہر طرح سے مستحکم ہو جائیں گے اور ہم جانتے ہیں کہ ترکی حکومت اس بات کو کبھی پسند نہ کرے گی۔'' اس طرح کے سرکاری خطوط جرمنی کے

اراکین پارلیمنٹ کی جانب سے اور دوسرے یورپی ممالک کی طرف سے ترکی کے وزیراعظم کو موصول ہوئے۔

یورپی یونین کے یہ ممالک کردستان کی علیحدگی پسند تحریک کو ہوا دے رہے ہیں اور آزاد کرد جمہوریہ کے قیام کے لیے ترکی حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔ اکتوبر 1994ء میں یورپی پارلیمنٹ نے ترکی میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر اپنی رپورٹ شائع کی اور ترکی دستور میں مناسب ترامیم کرنے پر زور دیا تاکہ جمہوریت کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ اس رپورٹ میں ترکی میں اسلام پسند جماعت (رفاہ پارٹی) کو جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیا۔

ترکی کا ترمیم یافتہ، موجودہ دستور جنرل کنعان ایورن کی فوجی حکومت کا تحفہ ہے، جسے مغرب کی اشیرباد حاصل تھی۔ ترکی عوام دستور کی بعض غیر جمہوری دفعات کی تبدیلی کے حق میں پہلے سے تھے، لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ عوام کا مقصد اور یورپی یونین کا مقصد ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ اگر ترک عوام آئین میں ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں تو یورپی یونین کی اسمبلی بھی اسے اپنا حق سمجھتی ہے کہ ترکی جمہوریت کا وہ ماڈل تیار ہو جو اس کی مرضی ومنشا کے مطابق ہو۔ چنانچہ یورپی یونین کی اسمبلی کے صدر نے ترکی کو دھمکی دی کہ اگر مجوزہ دفعات میں ترمیم نہ کی گئی تو یورپی یونین ترکی کی رکنیت کا جائزہ لے گی اور یورپ کی وحدت کے دائرے میں رہ کر، اس کے مفادات کے مدنظر اقدام کرے گی۔

اس وقت کردستان کے مسئلے پر پروفیسر نجم الدین اربکان اور ان کی رفاہ پارٹی نے صاف اور دوٹوک الفاظ میں اپنا موقف بیان کیا، پارٹی کے وائس چیئرمین عبداللہ گل نے کہا: ''رفاہ پارٹی کردوں کے اس حق کی حمایت کرتی ہے کہ وہ تہذیبی روایات اور ثقافت کا تحفظ کریں، اور اپنی کرد زبان کا بھی تحفظ کریں جیسا کہ سلطنت عثمانیہ کے عہد میں تھا۔ اس وقت یہ کوئی مسئلہ نہ تھا، کیونکہ یہ ایک فطری انسانی حق سمجھا جاتا تھا۔ تاہم یہ ایک داخلی مسئلہ ہے جو اسلام کی روشنی میں برادرانہ جذبات کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ اسے نسل پرستی کے ذہن کے ساتھ حل نہیں کیا جا سکتا۔''

داخلی اور خارجی پالیسی پر رفاہ پارٹی کے صریح اسلامی موقف اور مخلصانہ رویے کے علاوہ پارٹی کے زیر انتظام چلنے والی بلدیات کی بہتر کارکردگی اور روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء کی ارزاں قیمتوں میں فراہمی نے بھی اس کی عوامی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ مادی سیکولرازم کے پروردہ سیاست دانوں کی اخلاقی کمزوریوں، تہذیبی بحران اور ملی سیاست کے بارے میں ان کی افادی روش نے عوام کو ان سے دور کر دیا ہے اور کرپشن اور بدکرداری کے خلاف ان کی نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ دیار بکر بلدیہ کی روزانہ آمدنی پہلے تین ملین ترکی لیرا ہوا کرتی تھی، لیکن رفاہ پارٹی کے میئر بلدیہ نے اس شہر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو اپنی کارکردگی اور امانت کی بدولت دو ماہ کے مختصر عرصے میں اس آمدنی کو پچاس ملین ترکی لیرا تک پہنچا دیا۔ بلدیہ قونیہ میں اس جماعت کے میئر نے اخراجات میں تخفیف کی خاطر ٹیکسی اور عوامی ذرائع نقل وحمل کے استعمال کا سرکاری انتظام کیا اور پرائیویٹ کاروں اور مختلف گاڑیوں سے اجتناب کیا، جس کی وجہ سے ایک بڑی رقم کی بچت ہوئی، جو اب تک ناقابل تصور تھی۔ بلدیہ انقرہ میں رفاہ پارٹی نے انتظام سنبھالتے ہی پانی کی قیمتوں میں پچاس فی صد کی تخفیف کر دی اور وہاں زمین دوز میٹرو سسٹم کی تعمیر کا منصوبہ

بنایا۔سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے سابق میئر بلدیہ نے جو بعد میں ڈپٹی وزیراعظم بنے، ریل کاریں درآمد کی تھیں اور ہر ریل کار کی قیمت ساٹھ بلین ترکی لیرا تھی۔ رفاہ پارٹی میئر بلدیہ نے اپنے عہدے کا چارج لیا تو درآمد کا یہ سلسلہ روک دیا اور ترکی ہی میں ان گاڑیوں کی صنعت سازی شروع کی۔ چنانچہ پانچ بلین ترکی لیرا ہی میں انہوں نے یہ ریل کاریں تیار کرائیں۔

اسلام پسند رفاہ پارٹی کے کارکنوں نے مارچ 1994ء کے بلدیاتی انتخابات کے بعد مختلف شہروں کے انتظامات سنبھالے تو ان پر قرضوں کا زبردست بار تھا، کیونکہ سیاست دانوں کی بدکرداری اور فضول خرچی نے معیشت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔مثال کے طور پر ارض روم پر ایک کھرب لیرے کا قرض تھا۔استنبول 53 کھرب لیرے کا مقروض تھا اور انقرہ پر 120 کھرب لیرے کا بوجھ تھا۔رفاہ پارٹی نے اس صورتِ حال کا سخت نوٹس لیا۔انتظام و انصرام کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں لیا۔اسراف اور فضول خرچی کو سختی سے روکا۔رشوت ستانی اور کرپشن پر قدغن لگائی۔عوامی فنڈ کا غلط استعمال روکا۔آمدنیوں میں اضافہ کیا اور ملکی صنعتوں کو فروغ دے کر ایک طرف روزگار کے مواقع فراہم کیے اور دوسری طرف ملک کو خودکفالت اور خودانحصاری کی راہ دکھائی۔انتخابات سے قبل رفاہ پارٹی کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ وہ حجاب کی پابندی نہ کرنے والی خواتین کے سر قلم کر دے گی۔ثابت ہوا کہ یہ مخالفین کا محض پروپیگنڈا تھا۔ چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی اور ناجائز نفع اندوزی کا سر رفاہ پارٹی نے اسلامی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ضرور قلم کر دیا۔

1994ء میں ترکی کے بلدیاتی انتخابات میں کامیابی اور اس کے بعد بے لوث خدمات اور اصلاحات کے یہی وہ حالات تھے جب کویت کے معروف و مقبول عربی ہفت روزہ جریدے ''المجتمع'' کے نامہ نگار احمد منصور نے پروفیسر نجم الدین اربکان، قائد رفاہ پارٹی سے ایک طویل انٹرویو لیا۔اس انٹرویو کا ایک اقتباس احیائے اسلام کے نقطۂ نظر سے قابل ذکر ہے:

''سوویت یونین کے سقوط اور اشتراکیت کے زوال کے بعد مغربی دنیا نے نیو ورلڈ کا نعرہ دیا اور نئے منصوبوں اور نئی تجاویز کے ساتھ ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل کی دعوت دی۔ چونکہ مغربی تہذیب حق و انصاف پر مبنی نہیں، بلکہ طاقت و قوت پر قائم ہے، اس لیے نئے نظام کے ذریعے مغربی دنیا باقی دنیا پر قابض ہونا چاہتی ہے اور اپنی طاقت وقوت کے بل پر اس کی صلاحیتوں کا استحصال کرنے کی آرزومند ہے۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ تنہا اسلام ہی وہ نظریۂ حیات ہے جو ہر حق دار کو اس کا حق دلاتا، ظلم و استبداد کا خاتمہ کرتا اور انہیں انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ واحد کی بندگی میں داخل کرتا ہے۔

ہم ایک حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔وہ یہ کہ اسلام ایک آفاقی مذہب اور دین حنیف ہونے کی وجہ سے صرف مسلمانوں کی خوشحالی و کامرانی کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا، بلکہ اس کے پیش نظر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود ہے، اسی لیے ہم انسانیت کی سعادت و خوشحالی کے لیے متحرک ہیں اور پوری دنیا کی بہبود کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس جو اسلامی دستور (قرآن) اور اسوۂ رسول ﷺ ہے، وہ خالق کی تعظیم و مخلوق پر شفقت و محبت کی

تلقین کرتے ہیں، مگر مغرب میں انتہا پسند صیہونیوں اور عیسائیوں کے ایسے مراکز موجود ہیں جو تمام وسائل اور ذرائع کو اختیار کر کے اسلام کے خلاف شعلہ زنی اور مسلمانوں کے خلاف الزام تراشی میں مصروف ہیں۔ غالباً بیت المقدس ان کی حرص وطمع اور مفاد ومنفعت کو دور قدیم ہی سے ظاہر کرتا رہا ہے، جہاں وہ ہمیشہ قتل وخون ریزی کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ یہ ان کی تاریخ کو نمایاں کرنے والی بہترین مثال ہے۔ بوسنیا اور ہرسک، کشمیر اور فلسطین اور آذربائیجان وغیرہ، دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے جرائم ان کی اس ذہنیت پر شاہد ہیں۔ نیٹو کی حلیف طاقتیں پہلے اپنی فوجی چالوں میں دشمن ''سوویت یونین'' کی طرف اشارہ کرنے کے لیے سرخ پرچم کا نشان استعمال کرتی تھیں، مگر اب نئے دشمن (اسلام) کی علامت ان کے نزدیک سبز پرچم بن چکی ہے۔

پروفیسر نجم الدین اربکان نے اپنے انٹرویو میں مزید فرمایا: ''مغرب کی ان ظالمانہ کارروائیوں اور دین اسلام اور دنیائے اسلام کے خلاف ان کی دشمنیوں اور سازشوں کے عوامل ایسے ہیں، جنھوں نے اسلامی بیداری کی تخم ریزی میں اور اس کی افزائش وارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور اس کی بہترین مثال ترکی میں اسلامی احیاء وتجدید کی تحریک ہے۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ ترکی 1946ء سے متعدد سیاسی جماعتوں کی رزم گاہ رہا ہے، جس میں اگر کوئی انقطاع ہوا ہے تو فوجی انقلاب کی وجہ سے۔ مغرب نواز حکومتیں تقریباً پچاس برسوں میں تشکیل پاتی رہی ہیں، لیکن ترکی میں اور بعض مسلم ملکوں میں پچھلے جو واقعات رونما ہوئے ہیں، ان سے مغرب کی ناجائز مفاد پرستی کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ترکی قوم نیند سے بیدار ہوئی اور آج ترکی میں کسی بڑی تبدیلی کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ جس طرح سوویت یونین کے سقوط سے ایک بڑا انقلاب رونما ہوا اور ظلم واستبداد کی طویل رات رخصت ہوئی، آج ترکی قوم کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ تقلید مغرب پر استوار ترکی نظام روبہ زوال ہے اور یہ حقیقت پچھلے تین انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہے۔''

پروفیسر اربکان نے جن پچھلے تین انتخابات کا حوالہ دیا ہے، ان میں بتدریج اسلام پسند امیدوار انتخابات میں زیادہ کامیابیاں حاصل کرتے رہے ہیں۔

ترکی میں اسلام پسند پارٹی کی تیسری سیاسی فتح

طیب اردگان کی پہلی سیاسی فتح حیران کن تھی۔ اس وقت اسلام پسندوں کی قیادت پروفیسر نجم الدین اربکان کے ہاتھوں میں تھی، لیکن اردگان نے اسلام پسندوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر، آہنی ارادے کے مالک پروفیسر نجم الدین اربکان کے سیاسی کیریئر کا خاتمہ کر دیا۔ اربکان کی سیاسی مہارتوں کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ اپنی تشکیل شدہ پارٹیوں پر پے درپے پابندیاں انہیں یکے بعد دیگرے نئی سے نئی جماعت کی تشکیل سے باز نہ رکھ سکیں اور وہ بالآخر ایک ایسے مضبوط گروہ کی تخلیق میں کامیاب ہو گئے جو بعد میں فوجیوں، سے مزاحمت کی روش پر کاربند ہوا، ان فوجیوں کے خلاف جو اتاترک کے سیکولر عقیدے کے خود ساختہ نگہبان بنے ہوئے ہیں۔ پروفیسر اربکان نے سیکولرازم سے لڑنے میں جہاں خود جرأت وخلوص کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ایک ایسے فلسفے ... ہے جو لچک کا

مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ پہلے سلیمان ڈیمرل کی انصاف پارٹی سے الگ ہوئے، جسے ترک عوام کی اکثریت عدنان مندریس کی ''جمہوری پارٹی'' کا تسلسل سمجھتی تھی، اس لیے کہ ''انصاف'' (جسٹس پارٹی) اس انتخاب میں عوام کے ووٹوں سے برسرِ اقتدار آئی جو عدنان مندریس کی سزائے موت کے بعد پہلا انتخاب تھا۔ 1968ء میں انصاف پارٹی سے علیحدگی اختیار کرنے کے ساتھ ہی پروفیسر اربکان نے اپنی ایک الگ پارٹی قومی نظام پارٹی (نیشنل آرڈر پارٹی) کے نام سے تشکیل دے دی۔ اس پارٹی پر 1971ء میں پابندی عائد کردی گئی۔ 1973ء میں پھر انھوں نے ''قومی نجات پارٹی'' کے نام سے ایک پارٹی بناڈالی اور پارلیمنٹ میں اتنی نشستیں حاصل کرلیں جو بلند ایجویت کی ''ری پبلیکن پیپلز پارٹی'' کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے کے لیے کافی تھیں۔ 1976ء میں اربکان نے بلند ایجویت کو دھمکی دی کہ اگر حکومت نے قبرص پر حملہ نہیں کیا تو وہ مخلوط حکومت سے الگ ہو جائیں گے۔ بلند ایجویت نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ بڑے پیمانے پر دہشت گردانہ کارروائیوں اور اقتصادی حالات میں ابتری کے بعد فوجی سربراہ جنرل کنعان یورین نے 1980ء میں اقتدار پر قبضہ کرلیا اور تمام پارٹیوں پر پابندی لگادی۔

جب سیاسی سرگرمیاں دوبارہ بحال ہوئیں تو پروفیسر اربکان نے 1983ء میں ''رفاہ پارٹی'' بنائی۔ رفاہ پارٹی نے 1995ء کے انتخابات میں 21.3 فیصد ووٹ حاصل کر کے سب کو حیران کردیا۔ کثیر الجماعتی نظام میں یہ پارٹی بہت مضبوط پوزیشن میں تھی، جس کی بنیاد پر اربکان وزیراعظم مامور ہوئے۔ لیکن جنرلوں سے ان کی ایک نہیں بنی، جنھوں نے بغیر کسی بغاوت کے، صرف دباؤ ڈال کر وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا۔ 1998ء میں ایک عدالت نے ان کی پارٹی پر پابندی عائد کردی، لیکن مغلوب نہ ہونے والے اربکان نے ایک دوسری جماعت ورچو Virtue پارٹی بنالی، جب اسے بھی کالعدم قرار دے دیا گیا تو انھوں نے Felicity پارٹی تشکیل دی۔ اسے بھی 2001ء میں کالعدم قرار دے دیا گیا۔

یہ صورتِ حال کہ ہر پارٹی کو، جسے پروفیسر اربکان تشکیل دیتے تھے، فوجی لوگ کام شروع کرنے سے پہلے ہی کالعدم قرار دیتے تھے، ان کے پیروکاروں، خصوصاً طیب اردگان کے لیے، جو کہ استنبول کے سابق میئر تھے، بہت زیادہ پریشان کن تھی۔ چنانچہ طیب اردگان اور عبداللہ گل اس نتیجے پر پہنچے کہ جنرلوں کے ساتھ اربکان کا براہ راست تصادم اسلامی کاز کے حق میں مفید نہیں ہے، اور یہ کہ اگر جنرلوں کو ان کی جائز حدود میں رکھنا ہے اور ترکی کے احیائے اسلام کے لیے بھی جدوجہد کرنی ہے تو ایک نئی اپروچ کی ضرورت ہے، خصوصاً ایسی حالت میں، جہاں سیکولرازم 1924ء سے مسلسل اقتدار میں چلی آرہی ہو اور یہ تصادم تمام اداروں کی رگ و پے میں سرایت کرگیا ہو۔

اس نقطۂ نظر کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی میں پروفیسر اربکان کے خلاف بغاوت ہوئی اور جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی وجود میں آئی جس سے ترکی نام کا مخفف اے کے پی بنتا ہے۔ 2002ء کے عام انتخابات میں اردگان نے اپنی پارٹی کو حیرت انگیز فتح دلائی، اس طرح کہ 550 کی پارلیمنٹ میں 363 نشستیں حاصل کیں۔ دو تہائی اکثریت کے حصول میں صرف چار نشستیں کم رہ گئیں، جس کے ساتھ ترکی کی ایک ایوانی پارلیمنٹ میں آئین میں ترمیم کرانے کا مجاز ہوسکتی تھی۔ اس طرح دس برسوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جو مخلوط نہیں تھی۔

طیب اردگان خود تو پارلیمنٹ سے غیر حاضر تھے، اس لیے کہ ان پر بغاوت کا الزام تھا، جس کی وجہ سے وہ انتخاب میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ ان پر بغاوت کا الزام اس بناء پر عائد ہوا تھا کہ اپنی ایک نظم میں اردگان نے مسجد کے گنبد کو ہیلمٹ سے اور مینار کو رائفل سے تشبیہہ دی تھی۔ عبداللہ گل وزیر اعظم بنے، انہوں نے اردگان کو اس وقت راستہ دے دیا، جب اے کے پی کے قائد نے اپنے اوپر عائد کردہ الزام کے خلاف مقدمہ جیت لیا اور ضمنی انتخاب لڑ کر کامیاب ہو گئے، اور پارلیمنٹ میں شریک ہو گئے۔

نئے وزیر اعظم طیب اردگان نے ایسے جذباتی نعروں اور شعلہ بیانیوں کو ترک کر دیا جو اربکان سے مخصوص تھے۔ انہوں نے یورپی یونین کو ''مسیحی کلب'' کہنا شروع کر دیا اور ایسی ''نئی دنیا'' کی باتیں شروع کر دیں جو قازقستان سے مراکش تک کے علاقوں پر محیط تھی۔ دوسری طرف اردگان نے یہ مصلحت آمیز عہد کیا کہ وہ ترکی کے سیکولر آئین کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ساتھ ہی یہ وضاحت کی کہ وہ ترکی کی یورپی یونین میں شمولیت کی درخواست کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے ایسی اصلاحات متعارف کرانے پر بھی آمادگی کا اظہار کیا جو کوپن ہیگن کے معیارات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ ان اصلاحات میں سزائے موت کا خاتمہ، ان قوانین میں ترمیم جن سے آزادیٔ اظہار سلب ہوتی ہو، نیز کردوں کو ان کے ثقافتی حقوق دینا شامل تھے۔

سب سے اہم بات اردگان کی اقتصادی میدان میں کامیابی تھی۔ بیرونی سرمایہ کاری بڑھ گئی، بے روزگاری کم ہوگئی اور افراطِ زر کی شرح اس حد تک گری کہ یک ہندسہ ہوگئی۔ 2007ء کے لیے افراطِ زر کی شرح میں کمی کا ہدف 4 فیصد مقرر کیا۔ پروفیسر نجم الدین اربکان کے برعکس اردگان نے جنرلوں کے ساتھ معاملہ بڑے تدبر اور ذہانت کے ساتھ کیا۔ جب وہ اقتدار میں آئے تو ''قومی سلامتی کونسل'' میں بالادستی فوج کو حاصل تھی اور کونسل کے فیصلے ماننا حکومت پر لازم تھا۔ ''ساتویں ریفارم پیکج'' کے طفیل جسے پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا، فوج کا قومی سلامتی کونسل پر سے کنٹرول ختم ہو گیا۔ ان آئینی اصلاحات کی وجہ سے کونسل ایک ایسی مشاورتی مجلس میں تبدیل ہو کر رہ گئی جس کی تجاویز کا تعلق صرف فوجی اور سلامتی امور سے ہو۔

اے کے پی کی اسلام پسندی اور اسلامی سرچشموں سے گہری وابستگی کے باوجود طیب اردگان نے آئین کے سیکولر کردار میں تبدیلی و ترمیم کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ انہوں نے وضاحت سے صاف ہی کہہ دیا کہ ترکی کی سمت یورپی ہی رہے گی۔ وہ بالآخر 2005ء میں اپنی پالیسی میں کامیاب ہو گئے۔ جب یورپی یونین نے اپنے اندر ترکی کی شمولیت کے ضمن میں، ترکی کے ساتھ مذاکرات کا دروازہ کھول دیا۔

بہرحال اپنی حکومت کی مغرب نوازی اور امریکا کے ساتھ قریبی تعلقات کے باوجود اردگان نے عراق کے مسئلے پر امریکی خطوط پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ علاوہ ازیں اسرائیل کے ساتھ ترکی کے فوجی تعاون اور دوستانہ تعلقات کے باوجود انہوں نے مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کی کارروائیوں کو ریاستی دہشت گردی کا نام دیتے ہوئے، ان کی پرزور مذمت کی۔ وہ پارلیمنٹ میں واضح اکثریت اور ایک مضبوط حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے، بہت احتیاط کے ساتھ قدم بڑھا رہے ہیں۔ جہاں ترقی ممکن نہ ہو سکی، انہوں نے انتظار اور مصالحانہ روش کو ترجیح دی،

بجائے اس کے کہ جذبات میں آ کر کوئی بحران کھڑا کیا ہو اور پھر سب کچھ کھو دیا جائے۔ صدر کے طور پر عبداللہ گل کے انتخاب کے معاملے میں اردگان نے عملیت پسندی کا مظاہرہ کیا، جب کہ انہیں جرنلوں اور اپوزیشن پارٹیوں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا تھا۔ جب عدالت نے صدارتی انتخاب روک دیا تو اردگان نے عام انتخابات قبل از وقت منعقد کرا دیے، اور یہ سیاسی پانسہ ان کے لیے اور ان کی پارٹی کے لیے مفید رہا کہ وہ اب دوبارہ اقتدار میں ہیں اور وافر اکثریت کے ساتھ، یعنی 46.6 فی صد ووٹوں کے ساتھ، جب کہ 2002ء میں انہوں نے 34 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے۔ انتخابات کے بعد انہوں نے یہ اشارہ دیا ہے کہ وہ آئین میں چند ترامیم لائیں گے، تاکہ صدر کے انتخاب میں براہ راست ووٹنگ کا طریقہ اپنایا جائے۔

خواتین کے اسکارف کے بارے میں انہوں نے مصالحانہ روش اختیار کی ہے، اور خواتین کو اسکارف کے ساتھ یونیورسٹیوں اور سرکاری اداروں میں اب بھی داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اہلیہ ایمن کو تمام سرکاری تقریبات سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ انتخابی مہم کے دوران ازخود یورپی یونین میں شمولیت کے مسئلے کو دھیما رکھا، یہ جانتے ہوئے کہ عوام خواہ سیکولر ہوں یا اسلام پسند، یورپی یونین میں شمولیت کی تاخیر پر اور ان توہین آمیز شرائط پر، جو یورپی یونین میں شمولیت کے لیے ترکی پر عائد کر رکھی ہیں، سخت نالاں ہیں۔ شمولیت کے مسئلے کو قبرص سے مربوط کرنے کو اردگان نے بھی مسترد کر دیا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے یورپی یونین کے ان مطالبات کے آگے جھکاؤ ظاہر نہیں کیا ہے جو دفعہ 301 کی منسوخی کے لیے ہے، کیونکہ یہ دفعہ "ترکیت" کی توہین کرنے والوں کو سزائے قید دینے کی تاکید کرتی ہے۔ اس قانون کا غصہ نوبل انعام یافتہ اورہان پاموک اور ناول نگار ایلف شفق پر گر چکا ہے۔ افسوس کہ بعض یورپی حکومتیں جمہوریت کے کاز میں ترکی کی مدد نہیں کر رہی ہیں، اس طرح کہ وہ ترکی کی یورپی یونین میں شمولیت کی راہ میں دشواریاں کھڑی کر رہی ہیں۔ یورپی یونین کے رہنما جو نکتہ سمجھ نہیں پا رہے، وہ یہ ہے کہ اے کے پی کی ناکامی کا مطلب جرنلوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

ترکی کے اداروں میں اسلامی احیاء کی لہر

27 مارچ 1994ء کو ترکی کی بلدیات کے انتخابات اسلام اور سیکولرازم کی بنیاد پر ہوئے۔ رجسٹرڈ رائے دہندگان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ سیکولر جماعتوں کے مقابلے میں رفاہ پارٹی کو بھاری کامیابی ہوئی۔ تمام بڑی بلدیات، جیسے استنبول، انقرہ، سیواس، ارض روم، قونیہ، دیار بکر اور مرعش میں رفاہ پارٹی کے نمائندے کامیاب ہوئے۔ بڑی اہم جماعتوں نے مل کر جتنی بلدیات پر اقتدار حاصل کیا، ان سے زیادہ تنہا رفاہ پارٹی کے تسلط میں آئیں۔ چنانچہ تقریباً 700 بلدیات میں سے 400 بلدیات پر رفاہ پارٹی کا قبضہ رہا۔ یہ صورت حال دیکھ کر سیکولر جماعتوں میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے مختلف مخالفانہ، ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترکی کے ہر دو اشخاص میں سے ایک شخص رفاہ پارٹی کی حمایت کر رہا تھا۔

بلدیاتی انتخابات میں فتح یاب ہونے کے بعد جن بلدیات پر رفاہ پارٹی کو اقتدار حاصل ہوا، وہاں پارٹی نے

حسب توفیق اسلامی عدل ونظم حکومت کے مطابق منصوبہ بندی کی اور پروگرام بروئے کار لائے گئے۔ اس سلسلے میں حکومت کو کتنی کامیابی ہوئی اور کن مشکلات ومسائل کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پارٹی کے قائد پروفیسر نجم الدین اربکان نے کہا:

''ہم نے جب پچھلے مہینوں میں رفاہ پارٹی کے زیر انتظام چلنے والی بلدیات کا جائزہ لیا تو ہم نے دیکھا کہ رفاہ کے ذمہ داروں نے اس مختصر عرصے میں بڑے بڑے منصوبوں کو مکمل کر لیا، جنہیں دیکھ کر ترک قوم عش عش کر اٹھی۔ اس قومی مسرت وتعظیم کے چار بڑے اسباب ہیں:

1۔ رفاہ پارٹی ہی ترکی قوم کے عقائد کی نمائندہ جماعت ہے۔

2۔ ہماری جماعت ترکی کی قدیم تاریخ اور درخشندہ تہذیب کی نمائندگی کر رہی ہے۔

3۔ ان بلدیات کے ذمہ داران شب وروز کی مخلصانہ جدوجہد میں مصروف ہیں، جس کا مشاہدہ اس قوم کا ہر فرد کر رہا ہے۔

4۔ منفعت بخش تمام پروگراموں میں ترکی عوام کو شریک کیا جاتا ہے۔

اسلام پسند رفاہ پارٹی کے برعکس مغرب نواز سیکولر جماعتوں کا جو رویہ رہا۔ ان کے تضادات جانے پہچانے ہیں:

1۔ انہوں نے ترکی قوم کے عقائد کے خلاف، حتیٰ کہ خواتین کے سکارف پہننے پر بھی محاذ آرائی کی۔

2۔ اس ملک کی قدیم تاریخ وتہذیب کے استیصال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

3۔ انہوں نے قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دی اور فوری مصلحتوں پر ملک کے مستقبل کو قربان کیا۔

4۔ انہوں نے کسی منصوبے میں عوام کو شریک نہیں کیا اور اپنے سرکاری تفوق اور برتری کا خیال رکھا۔

ان اسباب کی وجہ سے پانچ ماہ کے مختصر عرصے میں ان بلدیات کی ہر چیز بدل کر رہ گئی۔ ان کی سالانہ آمدنی میں کم از کم دس گنا اضافہ ہوا۔ اخراجات پر روک لگائی گئی اور عوامی دولت کے غلط استعمال کا سختی سے محاسبہ کیا گیا جو پچھلی حکومتوں کے لیے ناقابل تصور اور ناممکن العمل تھا۔

یہاں ترکی میں رفاہ پارٹی کی بلدیاتی کارگزاری اور کامیابی کی چند ایسی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جو پاکستان کے ناظمین بلدیات کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

انقرہ میں بس کمپنی میں منافع

انقرہ میں اس وقت تقریباً بارہ سو سرکاری بسیں چلتی تھیں، لیکن ماضی میں ان سے آمدنی کی بجائے خسارہ ہوتا رہا تھا۔ رفاہ پارٹی نے بس کمپنیوں میں جاری لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کا سدباب کیا اور پانچ مہینوں میں حالات کو اپنے قابو میں کر کے خسارہ پلٹا کر نفع میں بدل دیا، بلکہ پچھلا قرضہ بھی اتار گیا۔

استنبول میں پانی کی فراہمی

بلدیہ استنبول کے پچھلے ناظمین نے ایک فرانسیسی کمپنی سے معاہدہ کر رکھا تھا اور صرف مشورے کی قیمت دس

ملین ڈالر چکائی تھی۔ آٹھ ماہ گزرنے کے باوجود کوئی پیش رفت نہ ہوئی تھی۔ رفاہ پارٹی نے برسر اقتدار آتے ہی فرانسیسی کمپنی کا معاہدہ منسوخ کیا اور اس سلسلے میں جو خرد برد تھی، اس کی تحقیقات کرائیں اور بدعنوان لوگوں کو سزائیں دی گئیں، اور چند مہینوں کے اندر اخراجات میں خاصی کمی کی گئی اور پانی کی فراہمی تیز تر کی گئی۔ اسی طرح بلدیہ کی صفائی اور کوڑے کرکٹ کا مسئلہ بھی خاصا سنگین رہا ہے۔ استنبول شہر جس میں بارہ ملین سے زیادہ آبادی کی صفائی پر کافی اخراجات آتے ہیں۔ رفاہ پارٹی نے کوڑے کرکٹ کو کسی مفید کام میں قابل استعمال بنانے کے لیے ایک کارخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس نے پوری گنجائش اور رفتار سے کام شروع کر دیا۔

بنیادی ضرورت کی اشیاء

اس وقت اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بحث پوری دنیا کے اہل فکر میں جاری تھی، اور ایک تیسرا راستہ اسلامی اقتصادی نظام کی طرف بھی کھلا ہوا تھا، لیکن اس پر بہت کم باتیں ہوتی تھیں لیکن رفاہ پارٹی نے، جو اسلام کے عادلانہ نظام کے داعی تھی، میسر قانون دفعات اور امکانات اور وسائل کے مطابق بلدیاتی اداروں کے ذریعے نظام عدل کی متعدد سیاسیات کے نفاذ میں کامیابی حاصل کی، مثال کے طور پر روٹی، گوشت اور سبزیوں کی وافر مقدار میں فراہمی کو یقینی بنایا گیا۔ تاجر برادری نے ان اشیاء کی جو قیمتیں مقرر کیں، رفاہ پارٹی کی بلدیات (یوٹیلٹی سٹورز) میں ایک تہائی نسبت مہیا کی گئیں۔ روٹیوں کے ایک پیکٹ کی قیمت چھ ہزار لیرا تھی، جب کہ رفاہ پارٹی کی بلدیات میں ان کی قیمت دو ہزار لیرا فی پیکٹ مقرر کی گئی۔

بیرونی امداد، قرضے

یہ سوال ترکی ہی نہیں، بلکہ دنیائے اسلام کے تمام ملکوں پر عائد ہوتا ہے اور اس سوال نے شدت اختیار کر لی ہے کہ مغرب کی غلام یہ حکومتیں اتنے قرضے اور امداد کیوں لیتی ہے، جن سے ان کی آزادی اور خود مختاری گھٹ کر غلامی کی حدود میں داخل ہو چکی ہیں؟ پھر یہ قرضے اور امداد صحیح جگہوں پر خرچ ہونے کی بجائے سرکاری دفاتر، عمارات اور ان کی تزئین اور رہائش اور افسروں کے اللے تللے پر کیوں صرف کرتی ہیں؟ وہ اپنے اداروں کی ترقی کے لیے ہر وقت مغرب کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلائے رکھتی ہیں اور انہیں اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ملک کا انجام کیا ہو گا۔ وہ نوٹ پہ نوٹ چھاپتی چلی جاتی ہیں جن سے کرنسی کی اصل قدر گھٹتی جاتی ہے اور اقتصادیات اوپر اوپر سے خوشحال نظر آتی ہے اور اندر سے کھوکھلی ہوتی جاتی ہے۔

بالکل یہی صورت حال ترکی کو بھی پیش آتی رہی ہے، جب کہ سیکولرازم اور اسلام کی کشمکش نے وہاں کی اقتصادی پوزیشن کو مضمحل کر رکھا ہے۔ سیکولر مزاج کی وزیر اعظم محترمہ تانسو چیلر نے امریکا کا دورہ کیا تو انہوں نے ایک اجلاس میں تقریر کی: ''امریکا ہمیں مالی امداد دینے اور قرضے فراہم کرنے پر مجبور ہے، کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ بصورتِ دیگر رفاہ پارٹی تاک میں لگی ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہے تو رفاہ پارٹی اقتدار میں آ جائے گی اور آپ خوب جانتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہے اور ترکی میں مذہبی جماعت کے برسر اقتدار آنے کا مفہوم آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ پھر ترکی کی مسلمان افواج ویانا کی فصیلوں اور پیرس کے دروازوں پر

دستک دے رہی ہوں گی۔''

مغرب کو اسلام سے خوف زدہ کر کے امداد اور قرضے حاصل کرنے کا یہ انوکھا طریقہ مغرب نواز غلام حکومتوں نے اختیار کر رکھا ہے اسی طرح جنرل پرویز مشرف امریکا کو یہی ڈراوا دیتا رہا کہ میرے بعد روشن خیال اور اعتدال پسند پارٹی کے بجائے مذہبی جماعتوں کے برسر اقتدار آنے کا اندیشہ ہے، جسے دور کرنے کے لیے امریکا نے جنرل پرویز مشرف اور پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایک اور مثال پیش ہے۔محترمہ تانسو چیلر نے اپنے فرانس کے دورے میں ''اسٹریٹجک سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ'' میں لیکچر دیا، جس میں پارلیمنٹ کے اراکین اور سیاست دان اور تجزیہ نگار صحافیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔لیکچر کے اختتام پر ایک صحافی نے سوال کیا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اگر فرانس نے ہمیں مالی امداد نہ دی تو رفاہ پارٹی ترکی میں برسر اقتدار آجائے گی۔ بالفرض اگر ایسا ہوا تو کیا ترکی کی سیکولر فوج رفاہ پارٹی کے خلاف فوجی انقلاب برپا نہیں کرے گی، جیسا کہ الجزائر میں اسلام پسند عوام کے خلاف ہو چکا ہے۔اس کے جواب میں محترمہ چیلر نے فرمایا: ''ترکی فوج ایک بنیادی اور اہم سبب کی بناء پر ایسا نہیں کرے گی۔ وہ یہ کہ ترکی کے حالات الجزائر کے حالات سے مختلف ہیں دوسرے یہ کہ ترکی فوج جمہوریت کی تائید وحمایت کرتی ہے، اس کی مخالفت نہیں کرتی۔ترکی میں جب بھی فوج نے اقتدار سنبھالا، حالات کے قابو میں آتے ہی وہ بیرکوں میں واپس چلی گئی اور سیاسی معاملات قومی نمائندوں کے حوالے کر دیا۔''

ان کی اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر نجم الدین اربکان نے، جو اس وقت حزب اختلاف میں تھے، فرمایا ''محترمہ چیلر کے پیش نظر پہلی حقیقت یہ تھی کہ ترکی میں جن فوجی کمانڈروں نے اقتدار پر قبضہ کیا فوجی انقلاب کے خاتمے پر عوام کے اندر سے ان کی دہشت ختم ہوگئی اور ان کے لیے محبت کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور باوردی فوجی عوام کے اندر چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ رہے۔اس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ 1960ء میں جو فوجی انقلاب آیا تھا، اس کے سربراہوں کی زندگی بعد میں اجیرن ہوگئی، اور قاضی سالم پاشا، جس نے وزیر اعظم مندریس کو پھانسی کی سزا دلوائی تھی، وہ عوام کے غیض وغضب اور نفرت وحقارت کا نشانہ بنے بغیر نہ رہ سکا۔قاضی صاحب کے لیے گھر سے باہر نکلنا دوبھر ہو گیا جس پر سرکاری سیکیورٹی گارڈ متعین تھے۔ چنانچہ ہمارے فوجی جرنیلوں کو اس مسئلے کی سنگینی اور اثرات کا پورا احساس ہے۔''

''محترمہ چیلر کو جس دوسری حقیقت کا اچھی طرح ادراک ہے، وہ یہ ہے کہ 27 مارچ 1994ء کے گزشتہ بلدیاتی انتخابات میں عجیب وغریب نتائج کا ظہور ہوا۔وہ علاقے اور شہر جہاں فوجی افسروں کی رہائش تھی، اور جن کو فوجی چھاؤنیاں کہنا چاہیے ان میں رفاہ پارٹی کے نمائندے کامیاب ہوئے۔ان شہروں میں جہاں نیوی کے افسر بڑی تعداد میں رہتے ہیں، انہوں نے ہمارے نمائندوں کو کامیاب کرایا۔اسی طرح جن شہروں میں ایئر فورس کے افسر رہائش پذیر ہیں، جیسے قونیہ، سنجان اور انقرہ، وہاں رفاہ پارٹی کو بڑے پیمانے پر ووٹ ملے۔ استنبول، توزلا، سمندرہ اور کارٹل کے علاقے جہاں آرمی کے افسر رہتے ہیں، وہ رفاہ پارٹی کی فتح وکامرانی کے حلقے ثابت ہوئے۔ان حقائق

کے پیش نظر جن کا محترمہ چیلر اور سیاسی تجزیہ نگاروں کو اچھی طرح احساس ہے، یہ اشارہ ملتا ہے کہ ترکی فوج کو ملک کے مفاد کے سوا کوئی چیز عزیز نہیں ہے اور وہ آزادی اور جمہوریت کا احترام کرتی ہے کہ اسی سے ملک کی سالمیت اور خوشحالی وابستہ ہے۔ ترکی فوج کو قوم کے خلاف تیار کرنا، جیسا کہ تیسری دنیا کے متعدد ملکوں میں ہو رہا ہے، بڑے خسارے کا سودا ہوگا کیونکہ ترکی کا اپنا تشخص ہے، اسی لیے ترکی فوج رفاہ پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے دلچسپی رکھتی ہے اور مسلمان ترک عوام بھی اسی دن کے منتظر ہیں اور خود مغربی لیڈروں کو بھی اسی کا انتظار ہے۔

پروفیسر نجم الدین اربکان کے طویل انٹرویو کے اس اقتباس سے، جہاں ترکی سیاست کے موجودہ نشیب و فراز اور رفاہ پارٹی کی خدمات اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، وہیں ترکی میں ابھرنے والی اسلامی احیا کی تحریک کے واضح آثار و شواہد ملتے ہیں۔ اس سے اس امر کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ترکی میں اسلام پسند رہنما خواہ پروفیسر اربکان ہوں یا طیب اردگان اپنے اپنے انداز میں اعتدال، توازن اور معقولیت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور وہ حکمت و فراست کے ساتھ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے میں مصروف ہیں۔

مغربی دنیا اور ترکی کی اسلامی تحریک

ترکی میں احیائے اسلام کی بڑھتی ہوئی تحریک نے تمام سیاسی رہنماؤں، مدبروں اور دانشوروں کے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مذہبی طبقے اور اسلامی تحریک کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو اس کی وجہ عوام کا مذہبی جذبہ یا احیائی رجحان نہیں ہے، بلکہ بعض معاشرتی و سیاسی عوامل ہیں جو اس کے بنیادی اسباب ہیں۔ مثال کے طور پر مصنف اور دانشور سٹین اوزک نے لکھا:

> ''موجودہ مذہبی بیداری اوسط درجے کے تاجروں، صنعت کاروں اور اناطولیہ کے عوام کے مفادات کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، کیونکہ ڈیموکریٹک پارٹی اور جسٹس پارٹی اونچے طبقے کے تاجروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور اوسط درجے کے تاجروں کو 1970ء تک ہی اپنی حمایت اور تائید میں رکھ سکے۔ ساتویں دہائی میں سرمایہ داری اور صنعت کاری اس قدر عروج پر پہنچ گئی کہ شہروں میں آباد اونچے طبقے کے تاجروں اور دیہات میں آباد اوسط درجے کے تاجروں کے مفادات کے درمیان ہم آہنگی اور توازن برقرار رکھنا ان سیاسی پارٹیوں کے لیے ممکن نہ رہا۔ چنانچہ موخر الذکر طبقے نے ''ملی سلامت پارٹی'' تشکیل دی۔''

مذہبی بیداری کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ دراصل دیہات سے شہروں کی طرف عوام کی نقل مکانی اور دو مختلف تہذیبوں اور روایات و اقدار کے مابین تصادم کا نتیجہ ہے۔ ملی سلامت پارٹی گویا پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے احیائے اسلام کا پرچم بلند کیا۔ ملی سلامت پارٹی کے بعد رفاہ پارٹی نے اسلامی تحریک کو مزید آگے بڑھایا، جس نے مارچ 1994ء کے بلدیاتی انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر کے اہل مغرب کو خوف زدہ کر دیا اور حیران و ششدر بھی۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ اسلام اور تحریک اسلامی کو عالمی پیمانے پر دہشت گرد، رجعت پسند،

متعصب اور بنیاد پرست قرار دیا جارہا ہے اور حق وانصاف کی آواز بلند کرنے والے مسلمانوں کی بھیانک تصویر پیش کی جارہی ہے، مغرب کو ترکی میں اپنے مفادات بھی خطرے میں نظر آرہے ہیں اور ترکی مسلمانوں کے استحصال کے مواقع رفتہ رفتہ کم ہوتے جارہے ہیں۔ لہٰذا مغرب کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ اس سے پہلے کہ ترکی میں تحریک اسلامی مستحکم ہو اور وہ دنیائے اسلام میں ایک فعال و مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائے (جیسا کہ ماضی میں سلطنت عثمانیہ کے عہد میں وہ اُمت کی قیادت کرتا رہا ہے) اس تحریک کو دبانے اور کچلنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اور حربہ اختیار کیا جائے۔

27 مارچ 1994ء کے بلدیاتی انتخابات میں رفاہ پارٹی کی غیر متوقع اور غیر معمولی شاندار کامیابی کے بعد یورپ اور امریکا کے اخبارات وجرائد، سیاسی وسماجی مطالعات کے اداروں، دفاعی تجزیہ نگاروں اور تھنک ٹینکوں میں پروفیسر نجم الدین اربکان کی شخصیت، ان کی رفاہ پارٹی کے افکار ونظریات، مستقبل کے عزائم اور منصوبے، مغرب کے لیے ان کا رویہ اور رجحانات، ان کی غیر معمولی اسلام پسندی اور اسلامی تحریک سبھی کچھ زیر بحث آئے۔ مغربی ممالک کے سفیر، ایلچی اور خفیہ قاصد رفاہ پارٹی کے رہنماؤں اور بلدیات کے صدور کی خدمت میں پہنچنے لگے اور ظاہر وخفیہ استفسارات وسوالات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ پروفیسر نجم الدین اربکان کے بقول ان تمام قاصدوں اور نامہ نگاروں کے سوالات کا مرکز ومحور ایک ہی نکتہ ہوتا تھا کہ حکومت پر قابض ہونے کے بعد وہ ان کی پارٹی ترکی میں کیا بنیادی تبدیلیاں لانے کا ارادہ رکھتی ہے؟

مغرب کے اس بنیادی اور مرکزی سوال کے جواب میں پروفیسر اربکان نے بڑی وضاحت سے ترکی کے سیاسی حالات اور تبدیلیوں پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ ہم بنیادی طور پر تین قسم کی تبدیلیوں کا عزم رکھتے ہیں: اقتصادی تبدیلیاں، مذہبی تبدیلیاں اور خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں۔

1۔ اقتصادی تبدیلیاں

پروفیسر اربکان نے فرمایا: ''معاشی میدان میں اہم اور بنیادی تبدیلی رونما ہوگی۔ ترکی معاشی اعتبار سے پسماندہ اور یورپی یونین کا کمزور شریک کار ہے۔ وہ مسلسل مغربی ممالک کے سامنے قرضوں اور امدادوں کی بھیک کے لیے دست سوال دراز کرتا رہتا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اس کی حیثیت ایک طاقتور شریک کار کی ہو اور وہ قرضوں کی ادائیگی سے جلد از جلد نجات پائے۔۔۔۔۔ ترکی کی سیاسی جماعتیں مغرب کی مقلد ہیں اور یہ ان دونوں کی ملی بھگت کے کارنامے ہیں کہ ملک اقتصاد کے میدان میں دیوالیہ ہو گیا ہے اور قرضوں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے سالانہ سود کی ادائیگی بھی ترکی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ رفاہ پارٹی اس صورتِ حال کو یہیں روک دینا چاہتی ہے۔ ہم ملکی پیداوار کی افزائش اور اس کی حوصلہ افزائی پر یقین رکھتے ہیں۔ اقتصادی ترقی میں ترکی کی راہ میں کئی رکاوٹیں ہیں، سب سے بڑی رکاوٹ اس کی بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔''

پروفیسر اربکان کو اقتصادی بدحالی پر تشویش اس لیے ہے کہ ترکی ابتدا ہی سے یورپ کی مشترکہ منڈی کا رکن رہا ہے۔ 60 فیصد ترکی کی تجارت یورپی ممالک کے ساتھ ہے اور ترکی میں باہر سے آنے والی تجارتی اشیاء کا 70 فیصد

یورپی ممالک سے درآمد ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ترکی غیر ملکی مال تجارت کی بہترین منڈی بنا ہوا ہے، اور اس کی اپنی پیداوار کی کھپت نہیں ہو پا رہی۔

بعض ترکی ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ یورپی یونین میں ترکی کی شرکت سے ملکی پیداوار میں اضافہ ہو گا۔ اس کی پیداوار کا معیار بھی بڑھے گا اور ترکی اشیاء کی کھپت بیرونی منڈیوں میں بھی ہو سکے گی، جب کہ ایک بڑا طبقہ اس نقطہ نظر کا مخالف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یورپی یونین میں شمولیت سے ترکی اقتصادیات پر بہت برا اثر پڑے گا کیونکہ بیرونی اشیاء قیمت میں سستی اور تعداد میں بکثرت ہوں گی۔ اس صورت میں بے کاری اور بے روزگاری بڑھے گی اور یورپی یونین کسی قسم کی کوئی مالی امداد ترکی کو فراہم نہ کرے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ یورپی یونین کی طرف سے یونان، اسپین اور پرتگال وغیرہ ملکوں نے اربوں ڈالر اپنی اقتصادی بہتری کے لیے حاصل کیے، لیکن اس فنڈ سے ترکی خزانے میں ایک ڈالر بھی داخل نہ ہو سکا۔

یہی وجہ ہے کہ پروفیسر اربکان یورپی یونین میں ترکی کی شمولیت کے مسئلے پر سخت مضطرب رہتے تھے، کیونکہ یورپ نے ترکی کو ایک باوقار اور مساوی شریک کار کی حیثیت میں کبھی تسلیم نہیں کیا۔

2۔ عقیدہ و آزادی اظہار کے میدان میں

دوسری اہم تبدیلی پروفیسر اربکان نے عقیدہ و مذہب اور اظہار رائے کی آزادی کے میدان میں تجویز کی، کیونکہ ترکی ایک بظاہر جمہوری ملک ہونے کے باوجود بدترین قسم کی آمریت اور کمالی استبداد کے شکنجے میں مبتلا رہا ہے۔ مصطفی کمال پاشا کی آزادی فکر و نظر اور مغربی اقدار و افکار کی تقلید و حمایت کی بات تو ضرور کی اور مغربی تہذیب و ثقافت کا علمبردار بنا رہا، مگر عملاً اس نے آمریت، مطلق العنانی، استبداد اور خودرائی کی بدترین مثال قائم کی۔ اسلام کے خلاف شرمناک پروپیگنڈا کیا۔ علمائے اسلام کی تکذیب کی مہم چلائی۔ عربی زبان و ثقافت کے خلاف باضابطہ تنظیم و تحریک کی قیادت کی اور سیکولرازم اور جمہوریت کا مفہوم و منشا صرف لادین عناصر اور طبقوں کے لیے مخصوص رکھا۔ اس کے زیر اثر بعد کی حکومتوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیے رکھا۔ آئین کو خلاف مذہب بنائے رکھنے پر اصرار تمام سیاسی جماعتوں کو رہی ہے۔ اسی لیے پروفیسر اربکان نے عقیدہ و فکر کی آزادی کو بہت بنیادی قرار دیا۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''رفاہ پارٹی (حزب الرفاہ) برسر اقتدار آنے کے بعد تمام انسانوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص عقیدہ و فکر کی آزادی سے ہم کنار کرے گی۔ وہ کسی خوف اور تردد کے بغیر اپنے نصب العین اور نظریے کا اعلان کر سکیں گے۔ سیکولر طبقہ ملک میں سقوطِ خلافت کے بعد ہی سے برسر اقتدار رہا ہے اور ان حضرات کے نزدیک سیکولرازم کا مفہوم اب تک یہ رہا ہے کہ مذہب سے کھلی دشمنی کی جائے، جب کہ اہل مغرب کے نزدیک سیکولرازم کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ یورپ اپنے سیکولر نظام میں دین و عقیدہ کی پوری آزادی دیتا ہے، بلکہ وہ آزادی عقیدہ کے محافظ ہونے کا مدعی بھی ہے۔ اجلاس میں یا پارلیمنٹ میں کوئی شخص کسی موضوع پر بات کرنے اور بحث کے دوران ارسطو، افلاطون وغیرہ یونانی فلاسفہ سے استدلال کرے تو لوگ توجہ اور سکون سے سنتے ہیں، لیکن اگر کسی قرآنی یا حدیث رسول ﷺ کا حوالہ دے تو اعتراض، احتجاج، الزام شروع ہو جاتا ہے، اور پارلیمنٹ میں یہ

شرمناک منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ اراکین میز اور ڈیسک بجا بجا کر بولنے والے کو خاموش کر دیتے ہیں۔ ترکی جمہوریہ کے دستور کی دفعہ 24 میں جو بات کہی گئی ہے، وہ دنیا کے کسی دستور میں موجود نہیں ہے اور یہ انتہائی افسوسناک ہے۔ دستور کی عبارت یہ ہے: ''وہ الفاظ اور عبارتیں جو مذہب کی نظر میں مقدس ہیں، ان کا استعمال قانون کی نگاہ میں جرم ہے۔'' نیز یہ کہ ''حکومت کے کسی جزو یا بنیاد یا ادارے کو مذہب سے ہم آہنگ کرنا ممنوع ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کا کوئی حوالہ، خواہ وہ عوام کے مفادات کا محافظ ہو، جرم ہے اور اگر اس حوالے کا کوئی تعلق دین و شریعت سے نہیں ہے تو اس پر ہر طرح کی گفتگو جائز اور قانونی ہے۔ یہ چیز سیکولرازم کے اصولوں کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی سفارت کار جب ہماری یہ باتیں سنتے اور دیکھتے ہیں تو انہیں حیرت ہوتی ہے، کیونکہ ان کے سربراہان مملکت تو انجیل پر حلف اٹھاتے ہیں اور گفتگو میں اس کی قسم کھاتے ہیں۔ ان کے نظام حکومت کے سیکولر ہونے کے باوجود ان کے کلیسا کا سیاست میں بھی کردار ہوتا ہے۔''

ترک پارلیمنٹ کی کھلی مذہبی دشمنی کی مثال دینے کے لیے پروفیسر اربکان نے خود اپنا تجربہ بتایا: ''حزب الرفاہ نے قومی اسمبلی میں یہ تجویز رکھی کہ دستور کی ان دفعات کو تبدیل کر دیا جائے جو انسانوں کو فکر و عقیدہ کی آزادی سے محروم قرار دیتی ہیں۔ ہم نے اس تجویز پر بحث کرتے ہوئے اراکین پارلیمنٹ سے کہا کہ ترکی دستور میں موجود فقرے دنیا کے کسی دستور میں نہیں پائے جاتے، کیونکہ دنیا کے تمام دساتیر، جن کی تعداد 160 ہے، حریت عقیدہ اور آزادئ مذہب کی ضمانت دیتے ہیں، تو کیوں نہ ہم دستور کی دفعہ 24 کی جگہ امریکی دستور کی وہ عبارت رکھ لیں جو مذہب و عقیدہ کی آزادی سے متعلق ہے۔ امریکا سیکولرازم کی جائے پیدائش ہے اور آپ بیشتر چیزوں میں امریکا کی تقلید کرتے ہیں، کیوں نہ اس معاملے میں آپ امریکا ہی کو نمونہ بنا لیں؟ ہم نے امریکی دستور کی کاپی حاصل کی اور اسے اس مخصوص کمیٹی کے ارکان میں تقسیم کر دیا جو اس کام کے لیے مختص کی گئی تھی۔ اراکین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ امریکی دستور کا دیباچہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: ''ہم قادرِ مطلق، خداوند کے نام سے اس دستور کا آغاز کرتے ہیں۔'' اسی طرح کے دوسرے جملے بھی انہوں نے دیکھے، مثلاً ڈالر پر چھپا ہوا یہ جملہ: ''ہم گاڈ پر ایمان رکھتے ہیں۔'' جب اراکین نے اس طرح کے جملے دیکھے تو برجستہ پکار اٹھے کہ ہمیں امریکی دستور منظور نہیں۔۔۔۔ ہم نے پوچھا، سوئٹزرلینڈ کے دستور کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عالمِ اسلامی کا اتحاد

ترکی پارلیمنٹ کے ارکان کی کھلی مذہبی عداوت کی مثال دیتے ہوئے، پروفیسر اربکان نے پارلیمنٹ کے ارکان سے کہا: ''آپ حضرات نے اپنا سول قانون سوئٹزرلینڈ ہی سے مستعار لیا ہے۔ بہتر ہے۔ یہ دفعہ 24 بھی سوئٹزرلینڈ کے دستور ہی سے مستعار لے لیں۔ چنانچہ ہم نے اس دستور کی کاپیاں بھی ان میں تقسیم کرا دیں، اور ان سے درخواست کی کہ ترکی دستور کی دفعہ 24 کی جگہ سوئٹزرلینڈ کے دستور کی دفعہ 27 کو اپنا لیا جائے، جس کی عبارت ہے:

"حکومت سرکاری سکولوں میں جو تعلیم دے گی، اسے کسی بھی اعتبار سے قوم کے عقائد سے مختلف یا متصادم نہ ہونا چاہیے۔"

چنانچہ اس بنیاد پر سوئٹزرلینڈ میں تعلیمی نصاب و نظام مختلف مذاہب کے افکار و عقائد کا مخالف نہیں ہوسکتا۔ ارکان پارلیمنٹ نے یہ عبارت پڑھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بیک زبان بول پڑے کہ یہ دفعہ ہمارے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہم نے ماضی کی کئی دہائیوں تک عقائد کو تبدیل کرنے کے لیے جنگ لڑی ہے۔

پروفیسر اربکان نے مزید لکھا: "آپ اسرائیل اور یہودیوں کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ آیئے ہم ترکی دستور کی دفعہ 24 کی جگہ اسرائیل کے دستور کی دفعہ ہی کو اختیار کر لیں۔ پھر ہم نے اسرائیل کی کاپیاں ان کے درمیان تقسیم کرائیں۔ انہوں نے اس کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ پوری دفعہ تورات سے ماخوذ ہے:

"ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں صحراؤں اور ریگستانوں سے نجات دی اور ان بلاد مقدسہ تک ہماری رسائی کی۔"

یہ عبارت ہو بہو تورات سے نقل کی گئی۔ انہوں نے اسرائیلی دستور کو بھی ٹھکرا دیا۔ اسی طرح ہم نے ان تمام دساتیر عالم کا حوالہ دیا اور وہ یکے بعد دیگرے سب کو مسترد کرتے رہے۔

آخر میں ہم نے کہا: "چونکہ آپ نے دنیا کے تمام دساتیر کو مسترد کر دیا ہے، اس لیے اب ان وحشیوں ہی کا دستور باقی بچتا ہے جو افریقہ کے جنگلوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ نے ہر چیز ٹھکرا دی ہے۔ اب ہم جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حوالہ دیتے ہیں تو آپ ہنگامہ کرتے ہیں اور شور و غوغا سے مخاطب کو چپ کرانا چاہتے ہیں۔ آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟"

ہم نے مغربی سفارت کاروں سے گفتگو کرتے ہوئے اپنا یہ واقعہ سنایا، اور ان کے سامنے وضاحت کی کہ ہم اپنی قوم کے لیے مذہبی آزادی کے طلب گار ہیں، جس کا نفاذ آپ اپنے ملکوں میں کر رہے ہیں۔ ہم یہاں مسلمانوں کو اسی آزادی سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں، جس سے مغربی دنیا کا ہر عیسائی بہرہ ور ہے۔ ہم ان حقوق کا حصول چاہتے ہیں، جن سے آپ کے ملکوں کے شہری فیض یاب ہو رہے ہیں۔

خارجہ پالیسی کی تبدیلی

پروفیسر اربکان نے تیسری بنیادی تبدیلی خارجہ پالیسی میں تجویز کی۔ انہوں نے کہا کہ حزب الرفاہ کے اقتدار میں آنے کے بعد چھ ارب انسانوں کو خوشحال بنانے کی مہم چلائی جائے گی، کیونکہ پارٹی کا مقصد پوری انسانیت کو خوشحالی اور سعادت و فلاح سے ہمکنار کرنا ہے۔ چونکہ ترکی اس خطے میں ایک طاقتور ملک ہے، اس لیے بلقان میں اس کا مقصد امن و امان کا قیام ہے۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ کی سطح پر قفقاز کے علاقے میں امن و امان اور سلامتی و استحکام کا حصول اس کا نصب العین ہوگا۔ رفاہ پارٹی چاہے گی کہ ان خطوں میں عوام کو ان کے جائز اور قانونی بنیادی حقوق میسر ہوں۔ ظالموں پر قدغن لگے اور ظلم و استبداد کی پالیسی کا خاتمہ ہو۔

پروفیسر اربکان نے مغربی ممالک کے سفیروں کو مخاطب کر کے کہا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تمام بلند بانگ انسان

دوستی کے دعوؤں کے باوجود آپ کو اپنے مفادات ہی سے دلچسپی ہے اور ہوسکتا ہے کہ آپ کو رفاہ پارٹی کی حکومت پسند نہ ہو، اور آپ اسے برداشت نہ کریں، کیونکہ ہم عدل و انصاف کے داعی ہیں۔ وہ اس مصلحت آمیز عدل سے یکسر مختلف ہے، جس کے استحکام کے لیے آپ مصروف ہیں۔ حقیقی سلامتی مصنوعی سلامتی سے یقیناً مختلف ہوتی ہے۔ اگر آپ حضرات واقعی حقیقی اور منصفانہ سلامتی کے داعی ہیں تو اس کے قیام میں رفاہ پارٹی سب سے زیادہ مضبوط پارٹی ثابت ہوگی۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے ملاقات

پروفیسر اربکان نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس غالی سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ جب موصوف نے یہ عہدہ سنبھالا تو مسلم ممالک کے ارکان کا ایک وفد ان سے نیویارک میں ملا۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ سابق سیکرٹری جنرل ڈیکویار نے بعض مسائل میں دوغلی پالیسی اور ظالمانہ رویہ اختیار کیا، جس سے دنیا میں مسائل اور مشکلات اور فتنوں میں اضافہ ہوا۔ اب یہ عظیم ذمہ داری آپ نے سنبھالی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب ہے۔ ہم اسلامی ممالک کے نمائندوں کی حیثیت سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ابھی جب کہ آپ نے اپنے کام کا آغاز ہی کیا ہے۔ ہم یہ صراحت کرنا چاہتے ہیں کہ پیش رو کی روش پر ہرگز نہ چلیں۔ دوہرے معیار نافذ نہ کریں۔ کمزور اقوام کے حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالیں اور آذربائیجان، بوسنیا، فلسطین اور کشمیر میں جاری مظالم کا سلسلہ فوراً بند کریں۔ ہم نے یہ بات کہی تو بطروس غالی نے جواب دیا:

> ''اقوام متحدہ دادرسی کے لیے اور مظالم روکنے کے لیے نہیں ہے۔ آپ یہاں حقوق کا مطالبہ کرنے نہ آئیں۔''

ہم نے کہا کہ اگر اقوام متحدہ انسانیت کے مفادات اور حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتا تو مسلمان ایسے ادارے سے دست بردار ہونے میں حق بجانب ہوں گے۔ اگر اقوام متحدہ عدل و انصاف فراہم نہ کرسکے، اپنے وجود کا جواز پیش نہ کرسکے، اور رکن ممالک کے حقوق کا احترام نہ کرسکے تو مظلوم اقوام زیادہ دنوں تک اقوام متحدہ جیسے ظالم و جابر ادارے کے ساتھ نہ چل سکیں گی۔

پروفیسر اربکان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بطروس غالی نے جو فکر و فہم پیش کیا وہی تمام مغربی اداروں اور ان کے سربراہوں کا فکر و فہم ہے، اسی لیے رفاہ پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد اسلامی ممالک کے اتحاد کی بھرپور جدوجہد کی جائے گی، لیکن اس اتحاد کا مقصد مغرب پر حملہ کرنا نہیں اور نہ اس کے خلاف محاذ بنانا ہوگا، بلکہ اس کے برعکس ہمارے اتحاد کا مطلب و مقصد یہ ہوگا کہ ہم اپنے مفادات پر مغرب کے حملوں اور جارحانہ کارروائیوں کی روک تھام کریں، تاکہ پوری دنیا میں امن و سلامتی قائم ہو اور انسان کے بنیادی حقوق کی ضمانت ہو اور انہیں ہر ملک میں تسلیم کیا جائے۔

عالمِ اسلام کا اتحاد

رفاہ پارٹی کے قائد پروفیسر اربکان نے دنیائے اسلام کے اتحاد کے پانچ بنیادی نکات قرار دیئے۔

1۔ آج مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب کے قریب ہے، ان کے پاس 57 آزاد اور خود مختار ممالک موجود ہیں۔ مسلمانوں کے دوسو بڑے گروہ یا جماعتیں دنیا کے دوسرے خطوں اور ملکوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد کی ذمہ داری ہے کہ اقوامِ متحدہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی بجائے اسلامی ممالک کی کوئی مشترکہ تنظیم قائم کریں۔ اگر مسلمان اس طرح کی کسی متحدہ تنظیم کے قیام کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو دنیا کی تمام قوتیں ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوں گی، کیونکہ یہ قوت و طاقت کے تمام وسائل سے مالا مال ہیں۔

2۔ دوسرا قدم اسلامی ممالک کی فوجی و عسکری تنظیم کا قیام ہے، تاکہ (نیٹو کے باوجود) اپنے اسلامی ملکوں کی سرحدوں، عوام کی آزادی اور حقوق کی حفاظت و مدافعت کر سکے۔

3۔ مشترکہ اسلامی منڈی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے جو اسلامی ممالک کے مفادات کی (یورپ کی مشترکہ منڈی کے ساتھ ساتھ) نگہداشت اور محافظت کر سکے۔

4۔ مشترکہ اسلامی بینک کا قیام۔

5۔ یونیسکو کی طرز پر اسلامی ممالک کی تعلیمی اور ثقافتی تنظیم کا قیام۔

جب مسلمانانِ عالم ان پانچوں نکات پر مشتمل اسلامی اتحاد کا آغاز و نفاذ شروع کر دیں گے، تو مسلمانوں پر ظلم واستبداد کی ذمہ دار تمام قوتیں منتشر اور کمزور ہونے لگیں گی۔ اقوامِ متحدہ کے استبداد کی ایک سادہ اور عام فہم مثال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کا کوئی مستقل ممبر سیکیورٹی کونسل میں نہیں ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے اندر بنیادی تبدیلی ناگزیر ہے، ورنہ مسلمانانِ عالم عدل و انصاف کے قیام کے لیے اپنی مخصوص عالمی تنظیم خود قائم کریں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ تنظیم عالم اسلام تک محدود رہے، بلکہ اس کی رکنیت ہر وہ ملک حاصل کر سکتا ہے جو اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھتا ہو۔ اس فکر کی حمایت میں سارے عوامل موجود ہیں۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور عالم اسلام میں کوئی حقیقی اختلاف موجود نہیں ہے۔ آج جو اختلافات ہیں، وہ برسرِ اقتدار گروہ کے پیدا کردہ ہیں اور ان کی بنیادی وجہ مغربی حکومتوں کی فتنہ پروری اور ریشہ دوانیاں ہیں۔ یہ اختلافات مصنوعی اور تراشیدہ ہیں، جن کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر اربکان نے اس امر پر زور دیا ہے کہ دنیائے اسلام کے اتحاد کی یہ تجاویز ناممکن العمل اور محض خیال نہیں ہیں، بلکہ ان پر عمل کرنا بالکل آسان ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے پروفیسر صاحب نے یورپی یونین کی مثال پیش کی۔ انہوں نے بتایا کہ 1954ء میں پاپائے ویٹی کن نے روم میں ایک خاص نشست منعقد کی، جس میں فرانس کے وزیر اعظم شومان، اٹلی کے وزیر اعظم دوجاس پیر اور جرمنی کے وزیر اعظم ایڈنائر کو دعوت دی اور ان تین بڑی کیتھولک ریاستوں کے سربراہوں کو سمجھایا کہ تم نے دوسری عالمی جنگ میں اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ میرے کیتھولک بچو! تم نے ایک دوسرے کو قتل کیا ہے۔ اب آپس میں عہد کرو کہ باہمی جنگ و جدال سے پرہیز کرو گے۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کے پہلو بہ پہلو ایک طاقتور یورپی اتحاد قائم کرو۔۔۔۔ اس نشست کے بعد

تینوں ملکوں نے کیتھولک اتحاد کے قیام کے لیے تین سال تک کام کیا۔ 1957ء میں ''معاہدہ روم'' کا اعلان ہوا، جس میں ابتدا میں یہی تین ملک شامل تھے۔ بعد میں دوسرے ممالک بتدریج اس میں شامل ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان کے ارکان کی تعداد بارہ ہوگئی۔ مستقبل میں یہ تعداد بڑھ کر بیس بھی ہوسکتی ہے۔ یہ اتحاد ایک اہم طاقت بن گیا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بنیاد ایک مذہب پر اور ویٹی کن کے پوپ کی دعوت پر رکھی گئی تھی۔

اس لیے جب ہم اسلامی اتحاد کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ انتظار نہیں رہتا کہ سارے 57 ممالک متحد ہو جائیں، تبھی اس مشترکہ تنظیم کی بنیاد پڑے، بلکہ مغربی اقوام کی طرح تین ملکوں یا ان سے بھی کم کے اشتراک وتعاون سے یہ اتحاد وجود میں آسکتا ہے۔ دوسری مملکتوں کے لیے دروازہ کھلا رہے گا۔ وہ دھیرے دھیرے اس میں شامل ہوتی جائیں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں اس کی رکنیت ان غیر مسلم حکومتوں کے لیے بھی کھول دی جائے۔ جو ہمارے اصولوں سے متفق ہوں اور ہماری شرائط کو تسلیم کرتی ہوں۔

عالم اسلام کے اتحاد کے بارے میں پروفیسر اربکان نے دو باتوں کی مزید وضاحت کی:

1۔ یہ ضروری ہے کہ اس اتحاد اسلامی میں صرف مسلم حکومتوں ہی کا عمل دخل ہو اور کسی مغربی حکومت کا اثر نفوذ نہ ہو۔

2۔ اس تنظیم کا بنیادی اصول حق پرستی ہو۔ وہ قوت پرستی سے اجتناب کرے۔

ترکی اور یونان کے تعلقات

یونان کے ساتھ ترکی کے تعلقات ہمیشہ اختلاف ومخالفت، تصادم ومعرکہ آرائی پر مبنی رہے ہیں۔ مغربی طاقتوں کی شہ پر یونان ترکی کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتا رہتا ہے، اور مستقل طور پر کوئی ایسا مسئلہ اٹھائے رکھتا ہے، جس سے ترکی کو اندرونی اور خارجی سطحوں پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

یونان ایک عظیم الشان تہذیب اور تابناک فکر وفلسفہ کا بانی ہونے کا مدعی رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یونانی فلاسفہ اور اہل فکر ودانش ہی آج تک دنیاوی افکار ونظریات کے موسس اور رہنما کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سکندر یونانی کی فتوحات یونان کے لیے مثالی نمونے کا کام کرتی ہیں۔ اپنے پورے فلسفے و یونانی میغالی آئیڈیا (رفیع الشان فکر) کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرقی رومی شہنشاہیت کی تشکیل نو ہونی چاہیے۔ اس میں موجودہ یونان، بحرایجہ (آتجین) کے جزائر، مغربی اناطولیہ، استنبول اور بلقان کے بیشتر حصے شامل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان تمام علاقوں پر یونانیوں کی حکومت ان کا موروثی حق ہے۔ یہ فکر برسر اقتدار جماعت کے رویے اور رجحان کے مطابق عروج پذیر یا زوال آشنا ہوتی رہتی ہے۔

جس وقت ترکی میں پروفیسر نجم الدین اربکان اور ان کی رفاہ پارٹی برسر اقتدار تھی، یونان میں پاپاندریو کی صدارت میں اشتراکی تحریک کی حکومت تھی۔ ترکی میں احیائے اسلام کی تحریک کا آغاز تھا اور یونان اپنے قدیم یونانی ورثے پر نازاں تھے۔ چنانچہ دونوں ملکوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے، اور بحیرہ ایجہ کے جزائر کا مسئلہ بھی ابھر گیا۔ قبرص

کا مسئلہ بھی شدت پکڑ گیا۔ یونان نے مقدونیہ کی خودمختاری کے خلاف بھی سوال اٹھایا اور اعتراضات وارد کیے۔ یورپی مشترکہ منڈی سے ترکی کو جو اقتصادی فوائد ملنے کی توقع تھی، اس کے خلاف یونان نے زبردست مہم چلائی۔

بحیرۂ ایجہ ترکی اور یونان کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ اس میں تقریباً دو ہزار جزیرے ایسے ہیں جو یونان کے زیر نگیں ہیں اور چند جزائر پر ترکی حکومت کا قبضہ ہے۔ معاہدہ لوزان کے مطابق جس نے سلطنت عثمانیہ کو بیشتر یورپی مقبوضات سے دست بردار کر دیا تھا، یہ جزائر یونان کے ساتھ ملا دیے گئے تھے، حالانکہ نقشے پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ جزائر یونان سے کہیں زیادہ ترکی کے قریب ہیں، اور اس لیے ان پر ترکی کا حق زیادہ بنتا ہے۔ اب جھگڑا پیدا کرنے کے لیے یونان نے ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ سمندر کے پانی سے 6 میل کے بجائے 12 میل تک اس کا حق بنتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ سمندر میں یونان کا 72 فیصد غلبہ ہوگا، جب کہ ترکی کا قبضہ صرف 9 فیصد تک محدود ہو جائے گا اور 19 فیصد بحری خطہ کسی فریق کے قبضے کے بغیر کھلا رہے گا۔ اسی طرح یونان نے 1947ء کے ''معاہدہ پیرس'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحیرۂ ایجہ جزائر کو مسلح کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہی صورت حال بحر ایجہ میں پٹرول کی دریافت اور استعمال کے بارے میں ہے، جس سے کشیدگی بڑھتی جاتی ہے۔

قبرص کا مسئلہ

قبرص کا مسئلہ بھی بڑا متنازعہ اور سنگین ہے۔ ترک مسلمانوں پر قبرصی حکومت بے پناہ مظالم کرتی رہی ہے۔ تنظیم ''ایوکا'' نے ان کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ جزیرۂ قبرص میں جب سمپسن کی قیادت میں فوجی انقلاب آیا اور اس نے قبرصی مسلمانوں کا مستقبل تاریک کرنے کے لیے یونان سے اس کا الحاق کرنا چاہا تو رفاہ پارٹی کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان نے 20 جون 1974ء کو ترکی فوجیں قبرص میں اتار دیں۔ وہ اس وقت نائب وزیر اعظم تھے۔ ترک فوجوں نے مسلم آبادی والے قبرصی حصے پر بہت جلد قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے قبرص دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصے پر یونان کا قبضہ ہے اور دوسرے حصے پر ترکی کا۔ اس وقت سے یونان، یورپی ممالک اور امریکا سب مل کر کوشش کر رہے ہیں کہ یونان کا سابقہ قبضہ بحال ہو جائے۔ ترکی کا موقف یہ ہے کہ قبرص کا پورا جزیرہ اس کی ملکیت ہے۔ یہ تو برطانیہ کی شرارت تھی، جس نے یونان کے مفاد میں اپنے استعمار کے وقت اس کو یونان سے ملحق کر دیا جو سراسر غیر قانونی اور غیر اخلاقی زیادتی تھی۔ اس وجہ سے ترکی قبرص سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔

بعد میں کنعان ایورن نے ایک دفعہ مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنے دور صدارت میں قبرص سے دستبردار ہونے پر کچھ رضامندی ظاہر کی تھی، لیکن ترکی قوم میں اس پر زبردست احتجاج ہوا اور اسے مجبوراً اپنے بیان کو واپس لینا پڑا۔

اقوام متحدہ اور اس کے سیکرٹری جنرل بطرس غالی نے ہر چند کوشش کی کہ قبرص کے مسئلے کا کوئی ایسا حل نکل آئے جو یونان کے لیے قابل قبول ہو، خواہ مسلمانوں کے مفادات مجروح ہوں، لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ شمالی قبرص کے صدر رؤف ونکتاش نے اعلان کیا کہ ان کا ملک یونانی قبرص کے ساتھ کسی وفاق کو قبول نہیں کرے

گا۔اپریل 1994ء میں ترکی کی وزیراعظم تانسو چیلر نے امریکا کا دورہ کیا تو سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کے امن مشن پلان پر رضامندی کا اظہار کیا۔اخبارات میں ان کا بیان شائع ہوا کہ وہ قبرص سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں، اور یہ کہ وہ شمالی قبرص کے صدر رؤف دنکتاش پر دباؤ ڈالیں گی کہ اپنے موقف سے ہٹ جائیں، لیکن جب وہ ترکی واپس آئیں تو انہیں عوامی غیظ وغضب کا سامنا کرنا پڑا اور وہ صدر کلنٹن سے کیے گئے وعدوں سے مجبوراً دست بردار ہو گئیں۔اس کے مقابلے میں یونانی حکومت ہنوز پورے جزیرۂ قبرص پر قابض ہونے کا خواب دیکھ رہی ہے، اور اس کا دعویٰ ہے کہ جزیرے میں ترکوں کا وجود فقط چار صدیوں سے ہے، جب کہ یہ جزیرہ ابتدا ہی سے یونان کا حصہ رہا ہے۔اس لیے وہ پورے جزیرے کو مسلح کر رہے ہیں۔اس وقت ان کی تربیت یافتہ ریزرو فوج کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے جو سو فیصد عیسائی ہیں۔یونان کے سیاسی وعسکری عزائم کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یونانی (عیسائی) قبرص کے جنرل نے ایک فوجی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''ایک ایک گھر اور ایک ایک گلی کے اندر جنگ لڑنے کے لیے ضروری ہے کہ یونانی قبرص کے ہر گاؤں اور قصبے کے ایک ایک بالغ شخص کو مسلح کر دو۔ٹینکوں اور دور تک مار کرنے والے ہتھیاروں کا توڑ کرنا بہت ضروری ہے۔ہمارے پاس ایسے راکٹ ہونے چاہئیں جن سے ہم ترکی بحریہ کو تباہ کر سکیں۔ہمیں سریع الحرکت بحری فوج کی ضرورت ہے۔خشکی پر چلنے والی توپیں اور آبدوز جنگی کشتیاں بھی درکار ہیں۔جو جگہیں کمزور پڑ رہی ہیں، انہیں طاقتور اور مستحکم بنایا جائے۔ہر فرد کے درمیان اسلحہ تقسیم کر دیا جائے۔''

معاملہ زبانی بیانات اور تقریروں تک محدود نہ رہا، بلکہ یونانی قبرص نے یونان کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی کر لیا، جب کہ ترکی حکومت اس بات کے لیے تیار تھی کہ قبرص کے دونوں حصوں کا ایک وفاق تشکیل کیا جائے، بشرطیکہ صدر جمہوریہ کا تقرر باری باری ہو اور کابینہ میں 4 اور 6 کی نسبت قائم رکھی جائے۔لیکن رفاہ پارٹی اور اس کے قائد پروفیسر اربکان نے اس تجویز کی مخالفت کی۔انہوں نے وفاق کی تجویز کو یکسر مسترد کر دیا۔ان کا موقف یہ تھا کہ شمالی قبرص کو آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے، اور اسے مضبوط اور مستحکم بنانا چاہیے۔اسی سے جنگ بندی اور امن مشن کامیاب ہوسکتا ہے۔

صوبہ تراقیا کا مسئلہ

ترکی اور یونان کے درمیان ایک اور اخلاقی مسئلہ صوبہ تراقیا کا ہے جو مشرقی شمالی یونان میں واقع ہے۔اس کے شمال میں بلغاریہ کی سرحدیں ہیں۔جنوب میں بحیرۂ ایجہ کا پانی ہے اور ترکی سرحدوں سے اسے دریائے مترج جدا کرتا ہے۔1913ء تک صوبہ تراقیا سلطنت عثمانیہ کا ایک اہم حصہ تھا۔1913ء کے بعد بلغاریہ کے مقبوضات میں شامل ہو گیا۔پہلی جنگ عظیم میں اس پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا۔پھر اسے یونان کے حوالے کر دیا گیا۔1923ء کے معاہدہ لوزان کی رو سے صوبے کی کل آبادی دو لاکھ تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ 30 ہزار تھی۔1999ء میں آبادی تین لاکھ 60 ہزار تھی اور مسلمان ایک لاکھ 60 ہزار کی تعداد میں ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ 67 فیصد

سے گھٹ کر 30 فیصد آبادی رہ گئی، اور جس صوبے میں وہ بھاری اکثریت میں تھے، وہاں اب اقلیت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہاں مسلمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ایک بڑی تعداد نقل مکانی پر مجبور ہو گئی۔ پھر عیسائی حکومت کے قوانین بھی ان کے خلاف ہر لحاظ سے ظالمانہ اور استبدادی ہیں۔ یونانی آئین کی دفعہ 19 کے مطابق وزیر داخلہ ہر غیر یونانی النسل شہری کی شہریت کو منسوخ کر سکتا ہے، اگر وہ کسی وجہ سے ملک چھوڑ رہا ہو۔ اس سے زیادہ تعجب خیز ملک کا یہ قانون ہے کہ الیکشن میں کسی امیدوار کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ پورے یونان سے کم از کم تین فیصد ووٹ حاصل کرے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کوئی مسلم امیدوار آج تک پارلیمانی الیکشن میں کامیاب نہیں ہوا، خواہ اس نے اپنے حلقے میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہوں، کیونکہ پورے یونان کی سطح پر اسے تین فیصد ووٹ کبھی نہیں مل سکتے۔ تراقیا کی یہ مسلم اقلیت المناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ تمام سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق سے محروم ہیں، یہاں تک کہ ان کی مذہبی زندگی بھی یونانیوں کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ آزادانہ اپنے مفتیوں اور ائمہ مساجد کا انتخاب بھی نہیں کر سکتے۔

انتخاب سے اقتدار تک

ترکی کے آئین کے مطابق دسمبر 1995ء میں آئندہ پانچ سال کے لیے پارلیمانی انتخابات مقرر تھے۔ تمام سیاسی جماعتیں اپنی اپنی کامیابی کے لیے سرتوڑ جدوجہد اور سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھیں۔ مئی کا مہینہ آیا تو فتح استنبول کی 542 یادگاری تقریب اس سیاسی جدوجہد کا مرکز بن گئی۔ 28 مئی کو ہر سال رفاہ پارٹی، اسلامی و قومی رجحانات کی حامل دوسری جماعتیں، بعض ٹیلی ویژن اسٹیشنوں اور خود استنبول کی بلدیہ کی کوشش کی وجہ سے سلطان محمد الفاتح (دورِ حکومت 1451ء۔ 1481ء) کی فتح قسطنطنیہ (28 مئی 1453ء) کی یادگار منانے کے لیے زبردست تقریبات کا اہتمام ہوتا ہے۔ اسلام پسند جماعتوں نے اس یادگاری تقریب کا اہتمام اس لیے شروع کیا تھا کہ ترکی کو اس کے عظیم الشان قومی ورثے، تاریخ ثقافت اور تشخص سے مربوط کیا جائے اور اسلام اور اسلامی تہذیب سے رابطے کا احیاء کیا جائے۔ سیکولر عناصر کی کوشش یہ رہتی ہے کہ اس تاریخ ساز فتح کی یادگاری تقریب کو بھی رقص و سرود اور لہو و لعب میں برباد کر دیا جائے اور اس طرح ترک قوم کے ماضی پر پردہ پڑا رہے۔

جامع مسجد ایا صوفیہ

فتح استنبول یعنی فتح قسطنطنیہ کی 542 ویں یادگاری تقریب کے موقع پر سیکولر عناصر نے جامع مسجد ایا صوفیہ میں ''نرسیس'' کے نام سے رقص و سرود کا ایک ثقافتی پروگرام منانے کا اعلان کیا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جامع مسجد ایا صوفیہ کی اہمیت پر مختصر روشنی ڈالی جائے۔ ایا صوفیہ استنبول کی سب سے بڑی جامع مسجد ہے اور زمانہ قدیم میں مشرقی دنیائے نصرانیت کا سب سے بڑا صدر کلیسا تھا۔ اسے قسطنطین اعظم کے بیٹے قسطنطیوس نے، باپ کی وصیت کے مطابق اپنے برادرِ نسبتی لائی سینس پر فتح پانے کے بعد تعمیر کرایا تھا۔ 15 فروری 360ء کو اس کی رسم تقدیس ادا کی

گئی تھی۔ سلطان محمد الفاتح نے 28 مئی 1453ء کو قسطنطنیہ فتح کیا تو یہ کلیسا مسجد میں تبدیل کر دیا گیا اور وہاں اللہ اکبر کی اذانیں گونجنے لگیں۔ کلیسا کے اندرونی حصے میں مختلف ادوار میں مختلف تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ وہ پچی کاری، جس سے چھتوں اور دیواروں کو مزین کیا گیا تھا، سرمئی قلعی کے نیچے چھپا دی گئی۔ وہ بت نشین دیوار جو پادریوں اور عوام کے درمیان حائل تھی، توڑ ڈالی گئی۔ قبلہ یروشلم سے ہٹا کر مسجد حرام کی جانب کر دیا گیا۔ سلطان فاتح نے زبردست پشتے بنوائے اور موجودہ اونچے اور پتلے میناروں میں سے پہلا مینار بھی اسی کا تعمیر کردہ ہے۔ باقی دو مینار اس کے بیٹے سلطان مراد ثالث نے بنوائے۔ سولہویں صدی کے نصف آخر میں عیسائی قبرستان کو سلاطین کے قبرستان میں تبدیل کرنے کا کام شروع ہو گیا۔ سلطان مراد رابع نے مسجد کی خالی دیواروں کو مشہور خطاط مصطفیٰ چوپی سے بڑے بڑے سنہری حروف میں آیات قرآنی لکھوا کر مزین کرا دیا۔ خلفائے راشدین کے نام بھی نہایت واضح اور جلی حروف میں لکھے گئے۔ سلطان مراد رابع کے بعد مسجد کی نگہداشت میں کمی ہوتی گئی اور اسی دور سے سلطنت عثمانیہ کا عام زوال بھی شروع ہو گیا۔ 1906ء کے موسم گرما میں وزیر تعلیم نے مسجد سے ملحق کتب خانے کی عمارت کی مکمل مرمت کا حکم صادر کیا، جس کی دیکھ بھال کے لیے پانچ مہتمم مقرر تھے۔ 1934ء میں صدر جمہوریہ کمال اتاترک نے اعلان کیا کہ آج سے ایا صوفیہ اسلامی عبادت گاہ نہیں رہے گی۔ انہوں نے اسے ادارہ نوادر خانہ کی تحویل میں دے دیا۔ بعد ازاں کلیسا کے اندر جو تصویریں منقش تھیں، ان کے اوپر سے قلعی دور کر دی گئی اور 1936ء میں حضرت مریمؑ، شہنشاہ قسطنطین اور شہنشاہ یوسنیانوس کی تصاویر دوبارہ دکھائی دینے لگیں۔

28 مئی 1995ء کو ''فتح استنبول'' کی 542 ویں یادگاری تقریب منانے کے لیے سیکولر حکومت نے ایا صوفیہ کو مرکز بنایا اور یہاں ''زیسس'' کے نام سے رقص و سرود کا ایک ثقافتی پروگرام منانے کا اعلان کیا۔ مگر اسلام پسند عناصر کی بروقت مداخلت نے وزیر ثقافت کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس نے جامع مسجد کی بجائے اس کے باغیچے میں اس تقریب کے انعقاد کا اعلان کیا، مگر مسلمانوں نے اسے بھی گوارا نہ کیا۔ وہ ایک روز پہلے 27 مئی کو احتجاجی مظاہرے کے لیے بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے اور ثقافتی تقریب پر پابندی لگانے اور جامع مسجد کو نماز کے لیے واگزار کرنے کا مطالبہ کیا۔ حکومت نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا، جب کہ 1453ء سے 1934ء تک مسلسل اس میں توحید کی اذان گونجتی رہی تھی۔ یہ عصمت انونو تھا جس نے جامع مسجد کو عجائب گھر میں تبدیل کیا تھا۔

آخر کار اگلے دن 29 مئی 1995ء کو رفاہ پارٹی نے انونو سٹیڈیم میں ایک عظیم الشان تقریب کا اہتمام کیا جس میں ایک لاکھ سے زائد افراد شریک ہوئے۔ مختلف اسلامی ممالک کے نمائندوں نے شرکت کر کے استنبول کی قدیم شوکت وسطوت کے احیاء کی راہ ہموار کی۔ عوام کا اژدھام اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ ترک جوش مسرت سے رو پڑے۔ کلمۂ توحید کے سبز عربی پرچموں کے جلو میں بوڑھے اور جوان، خواتین اور مرد چیخ اٹھے۔ انہیں فتح قسطنطنیہ کی تاریخی یاد نے تڑپا دیا۔ پروفیسر نجم الدین اربکان نے اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''جو شخص ایا صوفیہ کو اس کے مقصدِ تعمیر اور سلطان محمد الفاتح کی وصیت کے خلاف استعمال کرے گا، اس پر اللہ کی لعنتوں کی بارش ہو گی۔ ہم عریاں خواتین کو ایا صوفیہ جامع مسجد

میں رقص کی اجازت نہیں دیں گے۔"

سیکولر اسلام کا نیا ایڈیشن

صدر مملکت سلیمان ڈیمریل نے اسلام پسند عناصر کا راستہ روکنے کے لیے ایک نئی سازش تیار کی۔ اس نے سیکولر اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جس کی زد سیکولرازم پر نہ پڑتی ہو جو حکومت کے ملحدانہ اقدامات کی راہ میں حائل نہ ہو اور جس کے ذریعے انقلاب واحیاء کی چنگاریوں کو سرد کیا جا سکے۔ چنانچہ اس نے ہائر ایجوکیشن کمیٹی کو ہدایات دیں کہ ایک "اسلامی منشور" کی تدوین کے لیے چھ علماء کی ایک مجلس بنائے جو "اسلام کی حقیقت" کی تشریح و توضیح کرے اور عوام کو اس سے روشناس کرائے اور اماموں اور خطیبوں کے مذہبی مدارس اور دینی کالجوں میں ان تعلیمات کی درس وتدریس کا انتظام کرے۔ چنانچہ اس صدارتی آرڈیننس پر بڑی مستعدی اور سرعت سے عمل درآمد ہوا۔ آناً فاناً سیکولر اسلام کا ایک اور ایڈیشن تیار ہو گیا، جس کا عنوان تھا "حقیقت اسلام" اور یہ پوری کتاب کا پہلا حصہ تھا۔ اس کے پہلے ایک لاکھ 25 ہزار نسخے مارکیٹ میں آ گئے۔ زیادہ تر مفت تقسیم کئے گئے۔ اس کتاب کا مقصد بقول سیکولر حکمرانوں کے "حقیقی اسلامی مذہب کی نشر واشاعت تھا جس میں مختلف مذاہب ومکاتب اور فرقوں کے درمیان تصادم سے گریز کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔"

ترکی کے ایک صحافی مصطفیٰ اوزجان نے حکومتی سازشوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "سلیمان ڈیمریل کی یہ چال بھی ناکام ہو گئی کیونکہ ترکی اور دوسرے تمام ممالک میں مذہب کو سلطنت کے وقتی مفادات ومصالح کا تابع بنانے کی شرمناک کوشش ماضی میں بھی کبھی بار آور نہ ہو سکی۔ اسلام کے خلاف ایک طویل جنگ لڑنے اور اس میں مسلسل شکست کھانے کے بعد ترک حکومت اب مفاہمت پر اتر آئی ہے اور صدر مملکت ایک قومی اسلام کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں۔ مغرب بھی "عالمگیر اسلام" کے تصور سے خوف زدہ ہو کر "علاقائی اسلام" کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہے، تاکہ عالم اسلام کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔"

صحافی اوزجان نے مزید لکھا: "ترکی میں مضبوط ومستحکم سیاسی اسلام سے مغرب خوف زدہ ہے۔ وہ اپنے افراد کے ذریعے ایک متبادل اسلام کی ایجاد پر لگا ہوا ہے، جس پر علاقائیت کی گہری چھاپ ہو اور جو ترکی کے لیے سازگار ہو، اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اسلام کے عالمی تصور کو کمزور کیا جائے، خاص طور سے جب وہ ستر برسوں سے اسلام پر الحاد اور عیسائیت کا لبادہ اوڑھانے میں مصروف رہے اور انہیں نامرادی کے سوا کچھ نہ ملا۔"

اوزان نے زور دے کر لکھا کہ "ان تمام سازشوں کا انجام ناکامی ہے، کیونکہ انڈونیشیا میں پنج شیل کا پروگرام آج تک اسلام کا متبادل نہیں بن سکا۔ ترکی بھی انڈونیشیا کی تقلید میں اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف ہے۔ سلیمان ڈیمریل نے ان مذہبی ثانوی مدارس اور دینی کالجوں کے طلبہ کو ہدف بنایا جو رفاہ پارٹی (سابق ملی سلامت پارٹی) نے مخلوط حکومت میں شامل ہو کر قائم کیے تھے اور جہاں سے مذہبی بیداری کی لہر اٹھی تھی۔ اب حکومت چاہتی تھی کہ وہاں سے سیکولر حکومت کے وفادار طلبہ اور خطیب فارغ التحصیل ہوں تاکہ ترکی برانڈ پنج شیل کی ترویج ہو سکے" (پنج شیل یعنی پانچ اصول، انڈونیشیا کے صدر سوکارنو کا وہ سیکولر پروگرام ہے جس میں انہوں نے

مذہب اور سیکولرازم کا ایک معجون مرکب تیار کیا تھا)

علویوں کا متبادل قرآن

جون 1995ء میں بازاروں میں ایک نیا قرآن فروخت ہونے لگا جس پر Al-Ternutif Kurann کا عنوان تحریر تھا۔ یہ دراصل علوی شیعہ کی ایک سازش تھی اور وہ ترکوں کو مذہبی تصادم میں مبتلا کر کے رفاہ پارٹی کو اگلے الیکشن میں ناکام بنانا چاہتے تھے، تاکہ مذہبی منافرت کی آڑ لے کر حکومت اسلام پسند جماعتوں پر پابندی لگا دے۔ اس قرآن کا عربی متن بالکل صحیح تھا۔ اس میں کسی تحریف و ترمیم کی جسارت نہیں کی گئی تھی، بلکہ اس کی ترکی زبان میں جو تشریح و تفسیر کی گئی تھی، وہ بڑی فتنہ انگیز تھی۔ اس قرآن کو ترکی کی سڑکوں اور بازاروں میں ''مصحفِ فاطمہ'' کا نام دیا گیا، مگر دینی کالجوں کے اساتذہ نے بروقت اس کی تردید کر دی اور اعلان کیا کہ قرآن بس ایک ہے اور شیعہ و سُنّی کسی ماخذ میں ''مصحفِ فاطمہ'' کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ادارہ مذہبی امور کے سربراہ محمد نوری ایلماز نے ایک بیان میں کہا کہ ''متبادل قرآن'' کی اصطلاح ایک بہت بڑی غلطی ہے اور وہ اس نسخے پر ایک انکوائری کمیٹی بٹھائیں گے۔ ادارہ الجمۃ التعریف کے صدر حسن مشان علوی نے ایک بیان جاری کیا کہ علویوں کے لیے ایک علیحدہ قرآن کی اشاعت دراصل ایک گھناؤنی سازش ہے اور اس کا مقصد علویوں کو تباہ کرنا ہے اور اس شرمناک منصوبے کی ایک کڑی ہے جو شیعہ سُنّی فسادات کے لیے تیار کیا جاتا ہے، کیونکہ جب اس طرح کے پروپیگنڈے ہوں گے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ شیعہ اسلام کے دائرے سے خارج ہیں اور اس طرح کی باتیں فتنہ انگیز ہیں کہ یہ قرآن علویوں کے لیے تیار کیا گیا ہے اور یہ کہ موجودہ قرآن سے امام علیؓ اور اہلِ بیت سے متعلق آیات نکال دی گئی ہیں۔ یہ باتیں غلط ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ علویوں کے نزدیک جو تفسیری نکات درست ہیں، اور جن کا تعلق اہلِ بیت سے ہے، انہیں اس نسخے میں جگہ دی گئی ہے۔'' یہ گویا علوی ردعمل کا اظہار تھا۔

ترکی میں علویوں کا مسئلہ خلافتِ عثمانیہ سے براہ راست مربوط ہے۔ وہ عثمانیوں کو سُنّی حکومت کے نقیب قرار دے کر ان کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ چار صدیاں قبل پیر سلطان عبدال نے حکومت کے خلاف مزاحمتی تحریک کی قیادت کی۔ چنانچہ سلطان سلیم نے ایک مذہبی فتوے کی بنیاد پر علویوں کی تطہیر کی مہم چلائی، جس کی کسک وہ آج تک اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ انہیں مصطفیٰ کمال پاشا کے برسراقتدار آنے پر ہی اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا، 1919ء میں جب مصطفیٰ کمال نے علویوں کے سلسلۂ بکتاشیہ کے بانی حاجی بکتاش ولی کے مزار کی زیارت کی اور اپریل 1920ء میں اس نے علوی رہنما شلبی جمال الدین آفندی کو مجلس ملی کبیر کا نائب صدر بنا دیا تو علویوں نے کھل کر اس کا ساتھ دیا اور اس کے ہر طرح کے اقدامات کے حامی بن گئے۔ 1950ء تک وہ حکومت کا کل پرزہ بن کر دادِ عیش دیتے رہے، مگر جب عدنان مندریس برسراقتدار آئے تو پھر ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی، کیونکہ مندریس کے مزاج میں اسلام کی محبت جاگزیں تھی۔

اس مسئلے کا خطرناک پہلو علویوں کی نئی تنظیم ''کیزل یول'' (سرخ گزرگاہ) کا وجود ہے جو کردوں کی طرح ایک آزاد علوی ریاست کے قیام کی علم بردار ہے۔ اب علویوں کی جانب سے مستقل مطالبے ہونے لگے کہ سیاسی

پارٹیوں کے پروگراموں اور حکومت کے تمام فیصلوں میں ان کے جداگانہ تشخص کا لحاظ رکھا جائے۔ مذہبی امور کی سربراہی مجلس میں بھی شریک کیا جائے۔ شیعہ آبادیوں میں مساجد کی تعمیر پر بندش لگا دی جائے اور بڑے شہروں میں علویوں کے بیت الصلوٰۃ کی تعمیر کے لیے جگہ مخصوص کی جائے۔ علوی مطالعات کے ادارے قائم کیے جائیں۔ مملکت کی سنی آئیڈیالوجی کا خاتمہ کیا جائے۔ حکومت مذہب کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لے اور تمام مذاہب کی سرگرمیوں پر ہونے والے اخراجات کی کفالت کرے اور سیکولرازم کا مکمل نفاذ کرے۔ امن عامہ کی خاطر سنی دینی تعلیم پر پابندی لگائی جائے اور 1982ء کے دستور سے وہ تمام دفعات خارج کی جائیں جو سیکولرازم کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض مطالبات کی حمایت سیاسی سطح پر "پیپلز ری پبلک پارٹی" نے کی اور اس پر مستزاد اندورن و بیرون ملک کی تین سو سے زائد شیعہ تنظیموں کی پشت پناہی بھی ان مطالبات کو حاصل ہوئی اور یوں شیعہ سنی تصادم کی راہ ہموار کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔

متحدہ اسلامی محاذ کی صف بندی

اگلے پارلیمانی انتخابات میں رفاہ پارٹی کی پیش رفت اور کامیابی پر قدغن لگانے کے لیے دوسری اسلام پسند جماعتوں، صوفیہ و مشائخ اور مذہبی گروپوں کو استعمال کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی تاکہ اسلام کے مقابلے میں اسلام ہی کو صف آرا کر دیا جائے۔ نوری تحریک کے امام فتح اللہ جولان یکایک تمام سیاسی پارٹیوں کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز بن گئے۔ شیخ سعید نوری (1783ء۔1860ء) کی وفات کے بعد ان کی تحریک چار دھڑوں میں بٹ گئی۔ ہر دھڑے نے شیخ نوری کے افکار و نظریات ہی کو حرز جاں بنایا۔ فتح اللہ جولان کا گروپ ان میں سب سے زیادہ منظم و مستحکم تھا اور اس کے لاکھوں پیرو کار ملک میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس گروپ اور اس کے امام کے گرد سیاست دانوں کے طواف کا مقصد اگلے انتخابات میں ان کی تائید و حمایت حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ٹرتھ پارٹی اور مدر لینڈ نے امام کے آگے دانہ و دام ڈالے۔ اسی طرح ری پبلکن پیپلز پارٹی کے رہنما سٹین نے بھی کسی سے پیچھے رہنا گوارا نہ کیا۔

دوسری طرف سیکولر عناصر نے ڈاکٹر اسعد جوشان کی بھرپور حمایت کی جو ایک اسلامی جمہوری محاذ کی تشکیل میں مصروف تھے تاکہ تمام صوفی سلسلے اور مختلف اسلامی جماعتیں ایک پرچم تلے جمع ہو جائیں اور یا کرگت اوزال کی (جو مرحوم صدر ترگت اوزال کے چچازاد اور اربکان کے سابق حامیوں میں سے تھے) یا قومیت و اسلامیت کی علم بردار جماعت گرینڈ یونٹی پارٹی کے قائد محسن یازی اوغلی کی سیاسی قیادت کو تسلیم کر لیں اور اس طرح رفاہ پارٹی کے مقابلے میں یہ محاذ اسلام کا علم بردار بن کر انتخابات میں سامنے آئے اور اسلام پسندوں کے ووٹ منقسم ہو کر سیکولر عناصر کے لیے استحکام کا سبب بن سکیں۔

رفاہ پارٹی کی دستوری جدوجہد

ترکی پارلیمنٹ میں رفاہ پارٹی کے نمائندوں کی تعداد صرف 38 تھی مگر اس کے سیاسی اثرات کا دشمنوں نے

بھی اعتراف کیا۔ رفاہ پارٹی پارلیمنٹ کے اندر ایک خفیہ اسلامی لابی کی تشکیل میں کامیاب ہوئی اور دوسری پارٹیوں کے اسلام پسند عناصر کے خفیہ تعاون سے مذہب مخالف دستوری جملوں اور دفعات کو اس نے نکلوا دیا۔ مقصد حقیقی دستوری اصلاحات کا تعارف کرانا تھا۔ دستور کی تہذیب کاری کی طرف یہ پہلا قدم تھا اور ان سیاسی پارٹیوں کے 345 ووٹوں کی مدد سے دستوری تبدیلیوں کی منظوری بالکل ممکن تھی، کیونکہ ترقی دستور کے مطابق اگر پارلیمنٹ میں تین سو سے زائد ووٹ مل جائیں تو کوئی بھی دستوری تبدیلی کی جاسکتی ہے اور اگر مطلوبہ تبدیلی کے حق میں 270 سے 300 تک ووٹ پڑیں تو ریفرنڈم کے ذریعے تبدیلی کا مرحلہ مکمل ہوگا۔ یہی وہ حکمت عملی تھی جس کو رفاہ پارٹی نے اختیار کیا تھا۔

خود رفاہ پارٹی کا بیان تھا کہ ریفرنڈم کا طریقہ کار سیکولرازم اور مذہب کے درمیان نہیں، بلکہ دین اور اس کے دشمنوں کے درمیان ریفرنڈم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ پروفیسر اربکان نے اخباری بیانات میں اعلان کیا کہ وہ مغربی ممالک میں رائج کسی دستور کے نفاذ میں حائل نہیں ہوں گے۔ اگر سوئٹزرلینڈ کا دستور ترکی میں نافذ کر دیا جائے تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ دراصل ان کا اشارہ اس حقیقت کی طرف تھا کہ سیکولر مملکتیں تمام مذاہب سے یکساں معاملہ کرتی ہیں، لیکن ترکی کا قانون نرالا ہے۔ انہوں نے مملکت اسپین کی مثال دی جہاں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز کے لیے بارہ بجے سے چار بجے تک کا وقفہ ملتا ہے، اور اسکولوں کے مسلمان طلبہ کو جمعہ کے دن چھٹی دی جاتی ہے، اور ترکی میں جہاں مسلمان 99 فیصد ہیں، حکومت جمعہ کو تعطیل نہیں کرتی، جب کہ ہفتہ کو یہودیوں کی تعطیل اور اتوار کو عیسائیوں کی تعطیل رہتی ہے۔

رفاہ پارٹی نے کوشش کی کہ دستور سے دفعہ 24 منسوخ کر دی جائے، جس کی رو سے وہ تمام انفرادی و اجتماعی سرگرمیاں ممنوع قرار پاتی ہیں جو ترکی کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی و معاشرتی نظام کی تبدیلی کو اپنا نصب العین بنائیں اور ایک نئے نظام کے قیام کو مطمح نظر قرار دیں۔

رفاہ پارٹی نے دفعہ 68 میں ترمیم کرنے کی بھی کوشش کی۔ یہ دفعہ سیاسی جماعتوں کے اصول و قواعد کی تنظیم سے بحث کرتی ہے۔ رفاہ پارٹی کی تجویز کردہ ترمیم یہ تھی کہ "سیاسی پارٹیوں کے اصول اور پروگرام جمہوریت اور آزادی فکر کے اصولوں کے مخالف نہ ہوں۔" مخالفین ترمیم کی اس تجویز پر بلبلا اٹھے۔ کہا گیا کہ رفاہ پارٹی سیکولرازم کو شکست دینا چاہتی ہے۔ ری پبلیکن پیپلز پارٹی نے شور مچایا کہ "رفاہ پیچھے کی طرف لوٹانا چاہتی ہے اور یہ اس کا پہلا قدم ہے۔"

چنانچہ دسمبر 1995ء کے پارلیمانی انتخابات میں رفاہ پارٹی کو 21.32 فیصد ووٹ ملے۔ رفاہ پارٹی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری مگر سیکولرازم کی پرستار اور کمالیت کی نقیب سیاسی جماعتیں بھلا اسے حکومت سازی کا موقع کیسے دیتیں۔ ان سب نے مل کر اعلان کیا کہ وہ اسلام پسندوں کے ساتھ کسی مخلوط حکومت میں شامل نہیں ہوں گی، کیونکہ اسلامی نظام کو کسی قیمت پر وہ گوارا نہیں کریں گی۔

دوسری جماعت مدرلینڈ پارٹی تھی جس کے قائد مسعود ایلماز تھے۔ اسے ترگت اوزال نے 1983ء میں قائم

کیا تھا۔ 1987ء کے انتخاب میں اسے اکثریت حاصل ہوگئی تھی اور 292 نشستوں پر اسی کا قبضہ تھا۔ اس وقت دستور کے مطابق ترگت اوزال صدرِ مملکت بن گئے تھے، مگر اگلے انتخاب 1991ء میں اسے شکست ہوئی اور اسے صرف 94 نشستیں حاصل ہوسکیں۔ یہ پارٹی لبرل ازم کی زیادہ حامی اور امریکا سے بہت قریب سمجھی جاتی تھی۔

بائیں بازو کی ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ بلند ایجویت تھے۔ یہ جماعت اتاترک کے اجتماعی و معاشرتی انقلاب کی حامی ہے۔ یہ معتدل قومی افکار و رجحانات کی بھی علم بردار ہے۔

ری پبلکن پارٹی، جس کی بنیاد کمال اتاترک نے 1923ء میں رکھی تھی، کمالی افکار کی مکمل وارث اور امین جماعت ہے۔ یہ سیکولرازم اور الحاد کی سب سے بڑی داعی اور مبلغ ہے۔ اس کی تاسیس جدید 1983ء میں اردینال انونو نے کی تھی۔

متذکرہ سیکولر پارٹیوں نے رفاہ پارٹی کی راہ میں چٹانیں کھڑی کرنے کی کوششیں کیں۔ یاد رہے کہ ترکی فوج بھی الحاد اور کمالی اصولوں کی سب سے زیادہ حامی اور محافظ ہے۔ اس سے پہلے ترکی فوج 1960ء، 1970ء اور 1981ء میں مداخلت کرچکی ہے اور اس مداخلت کی ایک بڑی وجہ اسلامی رجحانات کی بیخ کنی رہی ہے۔ 1960ء میں عدنان مندریس کو پھانسی کی سزا اسی لیے سنائی گئی تھی کہ فوج نے اس پر ''جماعت نور'' سے رابطہ رکھنے کا الزام لگایا تھا اور کمال اتاترک کے اصولوں سے بغاوت کی تہمت ان پر رکھی تھی۔

آخر کار صدر نے پروفیسر اربکان (رفاہ پارٹی) کو حکومت سازی کی دعوت دی اور انہوں نے تمام پارٹیوں سے صلاح ومشورہ کیا۔ مختلف جماعتوں کے درمیان مصالحتی گفتگو ہوئی۔ بالآخر ٹرتھ پارٹی کی سربراہ تانسو چیلر اور مدرلینڈ کے رہنما مسعود ایلماز نے مل کر مخلوط حکومت بنانے کا دعویٰ پیش کردیا۔ انتخاب کے ڈھائی ماہ کے بعد 2 مارچ 1996ء کو انہوں نے اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیا۔ 544 اراکین پارلیمنٹ میں سے 257 نے تحریک کے حق میں اور 207 نے خلاف ووٹ دیے۔ 80 ارکان نے اجتناب کیا۔ دونوں حریف پارٹیوں نے اس طرح باہمی سمجھوتہ کیا کہ مسعود ایلماز پہلے سال وزیراعظم ہوں گے۔ اس کے بعد اگلے دو سال تک تانسو چیلر وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر رونق افروز رہیں گی اور چوتھے سال مسعود ایلماز پھر وزیراعظم ہو جائیں گے۔ چیلر کابینہ سے خارج ہو جائیں گی اور ان کے معتمد خاص ناہید مندریس کو نائب وزیراعظم کے عہدے پر فائز کیا جائے گا۔

یہ مخلوط حکومت اقلیت میں تھی اور پارلیمنٹ میں 15 نشستوں کی مزید حمایت لینے کے لیے اسے بلند ایجویت کی بائیں بازو والی جماعت ڈیموکریٹک پارٹی کی بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑا۔ تحریک اعتماد کی منظوری کے دو دنوں کے بعد ہی ترکی کی پارلیمنٹ نے وزیراعظم کی ایک یادداشت منظور کی جس کے تحت دس صوبوں میں ایمرجنسی کی توسیع کر دی گئی۔

پروفیسر نجم الدین اربکان بطور وزیراعظم

مدرلینڈ پارٹی کے رہنما مسعود ایلماز کی وزارتِ عظمیٰ میں حکومت تو تشکیل پا گئی، مگر یہ تین ماہ سے زائد برقرار نہ رہ سکی، کیونکہ افکار و نظریات کے باہمی متصادم و متضاد ہونے کے ساتھ اعتماد اور حسن ظن کی زبردست کمی اور

مفادات و مصالح کے ٹکراؤ نے اتحادی جماعتوں کے درمیان کشمکش پیدا کر دی۔ پھر ترکی رہنماؤں میں کردار کے کھوکھلا پن اور کرپشن اور لامتناہی مادی حرص و طمع نے اس پر مزید غضب ڈھایا۔ اس صورتِ حال کا راست فائدہ اسلام پسند پارٹی ''رفاہ'' نے اٹھایا اور اس کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان نے 3 جون 1996ء کو حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پارلیمنٹ میں پیش کر دی۔ اب اسلام پسندوں اور سیکولرازم کے علم برداروں کے درمیان سیاسی جنگ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی، مگر یہاں بھی میدان رفاہ پارٹی کے حق میں رہا۔ 316 اراکین پارلیمنٹ نے تحریک کی حمایت کی۔ 122 اراکین پارلیمنٹ نے اس تحریک کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ چار افراد نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا اور 108 اراکین نے اس نشست ہی کا بائیکاٹ کیا۔ تحریک پر کافی بحث و مباحثہ ہوا اور 8 جون 1996ء کو یہ مخلوط حکومت زمین بوس ہوگئی۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسلام پسند رفاہ پارٹی کو دوبارہ حکومت بنانے کا موقع ملے یا پھر دوبارہ انتخابات کرائے جائیں، جس کے نتیجے میں رفاہ پارٹی کے قطعی اکثریت حاصل کرنے کا خدشہ سبھی پارٹیوں کو تھا۔ چنانچہ اسلام پسندوں کی سیاسی جدوجہد تیز تر ہوگئی۔ ان کی مدرلینڈ پارٹی اور ٹرتھ پارٹی کی رہنما محترمہ تانسو چیلر سے مفاہمت ہوگئی۔ 28 جون 1996ء کو وزیر اعظم کی حیثیت سے پروفیسر اربکان نے عہدے کا حلف لیا۔ رفاہ 159 ارکان اور ٹرتھ پارٹی 129 اراکین، 36 وزارتوں میں تعداد کے لحاظ سے برابر کی تقسیم عمل میں آئی۔ تانسو چیلر نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ متعین ہوئیں۔

یہ مخلوط حکومت تقریباً ایک سال کی مدت تک اطمینان اور امن و امان سے حکومت کرتی رہی۔ لیکن کمالی سیکولرازم کے محافظ فوجی جرنلوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ انہوں نے اس مخلوط حکومت کے قیام کی اجازت اس لیے دے دی تھی کہ یہ زیادہ عرصہ نہ چل سکے گی۔ ارکان اپنے اسلامی پروگرام کے نفاذ کے لیے عجلت سے کام لیں گے اور انقلابی طریق عمل اختیار کریں گے اور جلد ہی وہ رفاہ پارٹی پر پابندی لگانے اور حکومت کو برطرف کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے، مگر ان کی توقعات پوری نہیں اتریں۔ اسلام پسندوں نے اعتدال و میانہ روی، حکمت اور مفاہمت کی راہ اپنائی۔ انہوں نے ملکی معیشت کی اصلاح، ترکی کو دنیا میں جائز اور برابری کا مقام دلانے والے عوامی مسائل کو حل کرنے کی کوششیں دستور کی حدود میں رہ کر کیں، اور اس طرح ان کی یہ مفاہمت پسندی بھی فوج کے لیے خطرہ بن گئی۔ ذرائع ابلاغ کے سیکولر عناصر نے مہم چلائی کہ پروفیسر اربکان نے اپنے اسلامی ایجنڈے پر سودے بازی کر لی ہے، تاکہ اسلام پسندوں کی عوامی حمایت کا گراف نیچے آ جائے اور دوسری طرف انہوں نے تانسو چیلر کو غیرت دلائی کہ تم نے سیکولرازم کو اسلام پسند اربکان کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، لیکن تانسو چیلر نے یہ کہہ کر سب کو حیرت میں ڈال دیا ہے کہ یہ حکومت 2000ء تک برقرار رہے گی اور ہم رفاہ پارٹی سے انتخابی اتحاد بھی کر سکتے ہیں۔

ترکی میں سیکولرازم اور اسلام کی کشمکش

ترکی کے اسلام پسند وزیر اعظم پروفیسر نجم الدین اربکان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد انتہائی دانش مندی اور

راست کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے امریکا یا یورپی یونین سے سیاسی یا تجارتی تعلقات منقطع کرنے کی بجائے ترکی سے دوستی کی دعوے دار مغربی حکومتوں سے برابری کی سطح پر گفت وشنید کی۔ ترکی نے اپریل 1987ء میں یورپی یونین کی مکمل رکنیت حاصل کرنے کی درخواست دی تھی، لیکن ابھی تک اسے رکنیت نہیں دی گئی، البتہ بعض یورپی ممالک کی جانب سے فراخدلانہ رضامندی کا اظہار ہوتا رہا ہے، لیکن زیادہ تعداد ان ممالک کی ہے جو ترکی کو محض اس لیے مکمل رکنیت دینے کے خلاف ہیں کہ وہ اسلامی ملک ہے۔ مثلاً ہالینڈ کے وزیر خارجہ نے یورپی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> "اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دیانت داری سے کام لیں اور اپنے پڑوسی اور ناٹو کے حلیف ترکی کو صاف صاف بتا دیں کہ اسے یورپی یونین میں داخلہ کیوں نہیں دیا جا سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ترکی ایک بڑی مملکت ہے، لیکن وہ بڑی اسلامی مملکت ہے۔ کیا ہم بڑی مسلم مملکت کا وجود یورپ میں پسند کریں گے؟"

ترکی کی جانب سے اس کا ردِعمل بھی قابل ذکر ہے۔ مثلاً 14 دسمبر 1996ء کو ڈبلن (آئرلینڈ) میں یورپی یونین کی سربراہ کانفرنس کے عشائیہ میں اربکان کو مدعو کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر شرکت سے معذرت کر دی:

> "مجھے آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں بڑی مسرت ہوگی، بشرطیکہ آپ اور آپ کے دوست ہمارے ساتھ مساوی یورپی شریک کی حیثیت سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

31 دسمبر 1995ء کو یورپی پارلیمنٹ نے 149 کے مقابلے میں 549 ووٹوں کی اکثریت سے، ترکی کی "یورپی کسٹمز یونین" کی رکنیت یہ جتا کر منظور کی تھی کہ:

> "یہ رکنیت ترکی کو اسلام کے اثرات سے بچانے کی خاطر، بوجھل دل کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔"

لیکن پروفیسر اربکان کے رویے کے برعکس، اس وقت کی وزیر اعظم تانسو چیلر یورپی ممالک کے علاوہ امریکا اور اسرائیل کی احسان مند ہوئیں۔ محترمہ کا خیال تھا کہ اس طرح یورپی یونین کی مکمل رکنیت کی راہ ہموار ہو رہی ہے، حالانکہ 1996ء کے دوران میں یورپی یونین کی وجہ سے ترکی کی ٹیکس کی آمدنی میں پانچ ارب ڈالر کی کمی ہوئی اور یورپی یونین کے ممالک سے تجارت میں مزید پانچ ارب کا نقصان ہوا۔ لیکن پروفیسر اربکان نے وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالنے کے بعد کہا تھا:

> "ہم یورپی یونین میں داخلے کی بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔ اگر وہ چاہتے ہیں تو ہماری رکنیت منظور کریں اور اگر نہیں چاہتے تو ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہم ایشیا اور افریقہ کے ممالک کے سے تعلقات کو ترجیح دیں گے۔"

اسلامی ممالک سے تعلقات

وزیر اعظم اربکان نے الجزائر سے انڈونیشیا تک ایک ارب مسلمانوں کی "اقتصادی برادری" منظم کرنے

کے لیے عملی اقدامات کیے۔ انہوں نے مسلم ممالک کے دورے کیے اور انہیں ''نئی دنیا'' کے نئے امریکی نظام میں اپنا مقام حاصل کرنے کی اجتماعی حکمت عملی اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ ان کی دعوت پر جنوری 1997 میں انقرہ میں انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، پاکستان، ایران، مصر اور نائیجیریا کے وزرائے خارجہ جمع ہوئے اور ترقی پذیر ممالک کا گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اعلان کیا گیا کہ یہ آٹھ مسلم ممالک (D-8) پوری انسانیت کے لیے منصفانہ نظام کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکی نے اپنی مغرب نواز پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے، اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کچھ اقدامات کئے ہیں۔ ترکی نے ایران کے ساتھ 23 ارب ڈالر کی گیس خریدنے کا معاہدہ کیا۔ [illegible] روس کی بجائے پائپ لائن کے ذریعے گیس کی سپلائی شروع ہوئی، جس سے ترکی کو 30 فیصد بچت ہوئی۔ اس معاہدے پر امریکا ترکی اور ایران دونوں مسلم ملکوں سے خفا ہو گیا۔ امریکی حکومت کا کہنا تھا کہ ہم نے ایران پر جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، ترکی نے ان کو توڑا ہے۔ ترکی نے یمن، نائیجیریا اور مصر سے بھی گیس خریدنے کے معاہدے کیے [illegible] پر اسرائیل کو شکایت ہوئی۔

اسرائیل کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لیے ترکی کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل حقی کارادائی فروری 1997ء میں اسرائیل گئے اور اپنی منتخب سیاسی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر دونوں ممالک کے ''حقیقی اخلاقی اور جذباتی تعلقات'' کو خراج تحسین پیش کیا۔ 27 فروری کو جنرل صاحب اسرائیل یاترا کے بعد ترکی واپس آئے۔ 28 فروری کو قومی سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا، جو 9 گھنٹے تک جاری رہا۔ یکم مارچ کو وزیراعظم کے ہاتھ میں ایک 24 نکاتی ایجنڈا تھما دیا گیا، جس میں ملک کے اندر مذہبی سوتوں کو خشک کرنے اور سیکولر حکومت کو بحال کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

پروفیسر اربکان اور ان کی رفاہ پارٹی کی متعدل حکمتِ عملی اور نفاذ اسلام کا بتدریج خاموش طریق کار بھی اسے بہت مہنگا پڑا۔ وزیر قانون وانصاف نے یہ تجویز رکھی کہ ایسے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے جن کو نصف قرآن حفظ ہے اور ان لوگوں کی سزا میں کچھ تخفیف کر دی جائے، جن کو دو پارے حفظ ہیں یا وزارتِ تعلیم وتربیت کے خاص شعبوں میں جامعہ ازہر اور اسلامی اعلیٰ جامعات کے فارغ التحصیل کے لیے ملازمتوں کا کچھ کوٹا مقرر کر دیا جائے۔ وزیر انصاف کی اس بے ضرر سی تجویز کے علاوہ پارٹی کے بعض دوسرے اقدامات کو بھی تنقید کا ہدف بنایا گیا، مثلاً

1۔ ملازمت پیشہ خواتین اور زیرِ تعلیم طالبات کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ چاہیں تو سروں کو ڈھانپنے کے لیے سکارف استعمال کر سکتی ہیں۔

2۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کی کھالیں دینی مدارس کو دینے کی اجازت دی گئی۔

3۔ استنبول اور انقرہ کے بعض علاقوں میں نئی مساجد تعمیر کرنے کی اجازت دی گئی۔

4۔ دفتری اوقات میں تبدیلی کی گئی تا کہ لوگ جمعہ کی نماز ادا کر سکیں۔ رمضان میں اوقات کار میں لمبا وقفہ دیا گیا تا کہ روزہ دار افطاری کر سکیں۔

5۔ مکہ معظمہ تک ایک سپر ہائی وے کی تجویز، تاکہ ترک مسلمان کم خرچ پر سہولت سے فریضۂ حج ادا کر سکیں اور راستے کے علاقوں سے منافع بخش تجارت میں اضافہ ہو۔

6۔ وزیراعظم کا مذہبی رہنماؤں کو افطار پر بلانا۔ مہمانوں کا اپنے روایتی اسلامی لباس میں آنا اور سرکاری لباس کی پابندی کی خلاف ورزی۔

اسکارف کا مسئلہ

اسکارف کے مسئلے پر سیکولر خواتین نے ایک احتجاجی مظاہرہ کیا، جس کی تصاویر عالمی پریس میں شائع ہوئیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وزیراعظم اربکان نے کہا:

''یہ لوگ اپنے آپ کو نام نہاد سیکولرازم کا علم بردار کہتے ہیں، مظاہرہ کرتے ہیں، اسکارف کو خطرے کا نشان بتاتے ہیں اور اسے سیکولرازم کے حق میں مظاہرہ قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، کیونکہ اس طرح اسکارف باندھنے والی خواتین اور طالبات کو مسترد کیا جاتا ہے اور انہیں خارج کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسکارف باندھنے والی خواتین جمع ہوں، وہ بے حجاب خواتین کو دھمکیاں دیں، ان کی مذمت کریں، ان پر لعنت بھیجیں تو یہ بھی سیکولرازم کے خلاف ہوگا۔ سیکولرازم اس تصادم کی اجازت نہیں دیتا۔

اگر کچھ لوگ اب بھی سابق ری پبلیکن پارٹی کے نظریات رکھتے ہیں تو ان کو اپنے اندر تبدیلی لانی چاہیے نہ کہ ترکی کو۔ ان کا دور ختم ہو چکا ہے۔ نیا ترکی بیدار ہے۔ آپ جائیں اور شمار کریں۔ ہماری 90 فیصد خواتین سر ڈھانپتی ہیں۔ آپ کسی گاؤں یا ضلع میں پانچ ایسی خواتین نہیں پائیں گے جو اپنے سر ننگا رکھتی ہوں۔ یہ ایک قوم کی تہذیبی روایت ہے، قومی لباس ہے۔ اس کا ایک عقیدہ ہے۔ کیا آپ کے پاس کرنے کا کوئی اور کام نہیں رہ گیا ہے؟ آخر آپ خواتین کے سر ڈھانپنے کے معاملے میں مداخلت کیوں کرتے ہیں؟ یہ سراسر غلط ہے، قدامت پسندی ہے، تاریکی اور ظلمت کی پیروی ہے۔ آپ اس ذہنیت کو عام نہیں کر سکتے، اس لیے اس میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو نہ تھکائیں۔ آپ عوام کے عقیدے اور تاریخ کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتے۔''

فروری 1997ء میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ انقرہ کے قریب ایک قصبے سنکان میں رفاہ پارٹی کی بلدیہ کے زیراہتمام ''یوم القدس'' منایا گیا۔ شب کو ایک ڈرامے میں القدس کی آزادی کے لیے جہاد کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ایرانی سفیر نے صیہونیت کے خلاف تقریر کی۔ فوجی حلقوں میں اس سے بھی زلزلہ آ گیا۔ قصبے کی سڑکوں پر تیس ٹینکوں اور فوجی گاڑیوں نے لوگوں کو ہراساں کرنے کے لیے گشت کیا۔ بلدیہ کے میئر پر فردِ جرم عائد کی گئی۔ ایرانی سفیر از خود واپس چلے گئے۔

ایسی مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے، اعلیٰ فوجی کمانڈر گھات لگائے بیٹھے رہے کہ کب موقع ملے اور وہ اسلام پسند حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ فوج کے ایک سربراہ جنرل کنعان نے وارننگ دی کہ اسلامی بنیاد پرستوں کا صفایا ضروری ہے۔ ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اندرونی سطح پر بھی اور خارجی تناظر میں بھی رفاہ پارٹی اور اسلام پسندوں کو مختلف مسائل، خطرات،

اندیشوں اور چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ترکی میں سیکولرازم کا بہت پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہاں سیکولرازم، تنگ نظری، تشدد، عدم رواداری اور آزادی وخود مختاری کو کچلنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ترکی ایشیا اور یورپ کی سرحد پر ایک نہایت اہم مسلم ملک ہے اور وہاں احیائے اسلام کی کسی تحریک کو اسلام دشمن طاقتیں کسی طرح برداشت نہیں کرسکتیں۔

رفاہ پارٹی کی گیارہ ماہ کی حکومت کو پارلیمنٹ میں بارہ مرتبہ عدم اعتماد کی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فوج نے مخلوط حکومت میں شریک ''ٹروتھ پارٹی'' کی رہنما تانسو چیلر کو حکومت سے باہر نکل آنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس میں ناکامی ہوئی تو ڈپٹی لیڈر کے سامنے دانہ ودام پھینکا۔ اس طرح پارلیمنٹ میں حکومت اکثریت سے ہاتھ دھو بیٹھی اور مجبور ہو کر 18 جون 1997ء کو وزیراعظم، پروفیسر نجم الدین اربکان نے استعفاء دے دیا اور رفاہ پارٹی اقتدار سے محروم ہوگئی۔ پھر 12 جولائی 1997ء کو ''مدر لینڈ پارٹی'' کے رہنما مسعود ایلماز نے حکومت تشکیل دی اور اس طرح مسلم ترکی ایک بار رجعت قہقری کا شکار ہو کر الحاد کی ظلمتوں میں بھٹکنے لگا۔

تنظیمات: ایک اہم قانونی ودستوری ادارہ

ترکی میں احیائے اسلام کی تحریکوں کا تذکرہ ہو اور ''تنظیمات'' کا ذکر نہ ہو، یہ بہت عجیب بات ہوگی۔ تنظیمات کے بارے میں کہیں کہیں سرسری ذکر ہو چکا ہے، اب قدرے تفصیل سے اس اہم قانونی ودستوری ادارے کا بیان کیا جائے گا۔

اسے تنظیمات خیریہ بھی کہا جاتا ہے یعنی سود مند قانون سازی۔ تنظیمات سے وہ اصلاحات مراد ہیں جو سلطنت عثمانیہ کی حکومت اور اداروں کے سلسلے میں سلطان عبدالمجید کے عہد حکومت میں جاری ہوئیں اور جن کی ابتدا اس فرمان سے ہوئی جسے عام طور پر گل خانہ کا ''خطِ شریف'' کہا جاتا ہے۔ تنظیمات کا پہلا دور 1839ء تا 1877ء اور دوسرا دور 1908ء تا 1918ء قرار دیا جاتا ہے۔ پہلے دور میں دستور سازی کی اصلاحی مہم میں جو کسر رہ گئی تھی، دوسرے دور میں پوری ہوگئی۔

تنظیمات نے ان اصلاحات کو جاری رکھا، جنہیں سلطان سلیم ثالث اور محمود ثانی نے اس غرض سے شروع کیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کو، جو اندرونی اور بیرونی لحاظ سے کمزور ہو چکی تھی، بچایا جا سکے۔ سلطان محمود ثانی اندرون ملک میں نظام جاگیرداری کو منسوخ کرنے اور ینی چری فوج کے رجعت پسند عنصر کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح داخلی معاملات میں اس نے اپنی طاقت کو متحد و مستحکم کرلیا، لیکن وہ مصر اور یونان چھن جانے کو نہ روک سکا۔ کارنامہ اس کے جانشینوں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے جانشینوں کے ماتحت افسروں کے حصے آیا۔ چونکہ خود سلاطین اصلاحات کے اجراء ونفاذ کا کام بتدریج ترک سرکاری افسروں ہی کے ایک اصلاحی گروپ کے ذمے ہوتا گیا۔ 1839ء سے لے کر کریمیا کی جنگ کے خاتمے تک اصلاحات کے روح رواں مصطفیٰ رشید پاشا تھا (وفات 1858ء) جو چھ مرتبہ وزیراعظم بنا۔ اصلاحات کے دوسرے دور میں، جس کا آغاز فرمان معروف بہ ''خطِ ہمایوں''

کے ذریعے فروری 1856ء میں ہوا، مصلحین کی قیادت علی پاشا (وفات 1871ء) اور فواد پاشا (1869ء) نے کی۔ تیسرے دور کا آغاز 1871ء سے ہوا، جس کی رہبری ترکی کی عظیم شخصیت مدحت پاشا (وفات 1883ء) نے کی تھی۔

گل خانہ کا ''خط شریف'' کسی قسم کے افکار تازہ کی وجہ سے ممتاز نہ تھا۔ اس فرمان میں سلطان نے اس بات کا اعلان کیا کہ ''آج کے دن سے مابدولت کی خواہش ہے کہ ہماری ساری رعایا کی آبرو اور مال محفوظ رہے۔ ''التزام''، یعنی ٹیکسوں کی وصولی کو اجارے پر دینے کا قانون موقوف ہو۔ فوج میں بھرتی کا کام زیادہ باقاعدگی کے ساتھ ہوا کرے۔ جملہ ملزموں کے مقدمات کھلی عدالتوں میں پیش ہوں۔'' یہ ضابطہ صراحت کے ساتھ وضع کیا گیا کہ رعایا کے جملہ افراد بلا لحاظ مذہب (''اہل اسلام وملل سائرہ'') قانون کی نظر میں برابر سمجھے جائیں۔ ''مجلس احکام عدلیہ'' تو موجود ہی ہے، ضروری ایکٹ بنانے کے لیے اس کے ارکان کی تعداد میں کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔

اس شاہی فرمان کے دیباچے میں یہ بیان کر دیا گیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی سابقہ خوش اقبالی قرآن مجید کے احترام کی وجہ سے تھی۔ آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ جدید قوانین کا مقصد یہ ہے کہ ''اصول عتیقہ'' یعنی پرانے اصولوں وضوابط میں پوری پوری تبدیلی کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خط یعنی فرمان کا مسودہ تیار کرتے وقت اگر مقصد ایک طرف یہ تھا کہ ملکی حکومت پر دوبارہ اعتماد قائم کیا جائے تو دوسری طرف یہ بھی تھا کہ یورپی ممالک (حال یورپی یونین) کو کسی طرح مطمئن کیا جائے، کیونکہ ملک کے داخلی امور میں ان کے آئے روز کی دخل اندازی تشویش ناک صورت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس وقت تو یہ دوہرا مقصد حاصل ہو گیا، لیکن جونہی اصلاحات کے رائج کرنے کی کوشش کی گئی، بے شمار مشکلات کا سامنا ہوا اور قدرتی طور پر حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ نئے قوانین یورپی ممالک کے دستوری نظام، بالخصوص فرانس کے نظام پر مبنی تھے اور جب انہیں جاری کیا گیا تو ملک میں ایسے مسائل اور امتیازات پیدا ہو گئے جو قدیم نظام میں کبھی اس طرح باعث تشویش نہ ہوئے تھے۔ چار قسم کی مصلحتیں پیش نظر رکھنا ضروری تھیں:

1۔ سول اور فوجی افسروں کی مصلحتیں۔ یہ پرانے نظام کے ماتحت سلطان کے غلام ہوا کرتے تھے۔

2۔ آزاد مسلمان رعایا کی مصلحتیں۔ ان میں علماء کا گروہ بہت نمایاں تھا۔

3۔ غیر مسلم رعایا کی مصلحتیں

4۔ غیر ممالک کی مصلحتیں

پہلے دو گروہوں کو یکجا کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ انہیں مذہب نے متحد کر رکھا تھا اور سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالمجید سرکاری ملازموں کے جان و مال پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو چکے تھے۔ محمود ثانی نے بھی جاگیرداری کا نظام موقوف کر کے اسلامی عناصر کو متحد کرنے میں بڑی مدد دی۔ لیکن عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق عطا ہونے کے باعث اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا کہ سلطان محمد فاتح کے وقت سے جو خود اختیاری یہود و نصاریٰ کو حاصل تھی، وہ اب اس سے محروم ہو جائیں گے۔ علمائے اسلام کے خلاف ایسی کوششوں سے، جن کے

ذریعے وہ اپنے شرعی اختیارات اور حق ادارہ سے محروم ہو جائیں اور اسی طرح ان مشکلات کے پیش نظر جو غیر مسلموں کو فوج میں بھرتی کرنے سے پیدا ہوئیں، یہ جلد ظاہر ہو گیا کہ حقوق مساوات مل جانے سے خود غیر مسلموں کو زرا نفع ہی نفع نظر نہیں آتا تھا، بلکہ اس رعایت کی وجہ سے غیر مسلم جماعتوں کی باہمی چپقلش اور اختلافات اور زیادہ بڑھ گئے تھے، اور یہ اختلاف اکثر حالات میں ایسے سنگین تھے۔

کہ غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان بھی ویسے سخت اختلاف نہ تھے۔ آخر میں غیر ملکی گروہ جو تعداد کے لحاظ سے تو بہت کمزور تھا، لیکن آزادیاں اور خصوصی مراعات، جو انہیں امتیازات کے ماتحت حاصل تھیں، ان کی وجہ سے وہ ایسی حیثیت قائم کر چکا تھا، جو پہلے سے اس لیے مضبوط تر ہو گئی کہ غیر ملکی طاقتوں نے اس حیثیت سے فائدہ اٹھایا۔ یہ فائدہ صرف ان کی اپنی بہبودی کے لیے نہیں تھا، بلکہ اس غرض سے بھی تھا کہ غیر مسلم رعایا کی کشمکش کے سلسلے میں جو یہ رعایا اپنی خصوصی مراعات کو بدستور قائم رکھنے کے لیے کر رہی تھی، اپنے آپ کو ان کا حامی اور محافظ بنا لیں (فرانس بوجہ خصوصی امتیازات اور روس بوجہ عہدنامہ کوچک قینارجہ)۔ غرضیکہ تنظیمات کی راہ میں زیادہ شدید مشکلات عیسائیوں اور یہودیوں ہی کی الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ کریٹ، بوسنہ اور ہرسک (ہرزی گووینا)، لبنان اور بلغاریہ میں بغاوتیں ہوئیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ یورپی ممالک (بشمول پاپائے روم) ہمیشہ مداخلت پر اتر آتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ خود ترکی میں خاصا بڑا فریق پیدا ہو گیا جو ان تنظیمات کو سلطنت عثمانیہ کے مفادات کے لیے خطرناک سمجھتا تھا، لیکن جو راستہ سلطان ایک دفعہ اختیار کر چکا تھا، ترک نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ خود پرانے ادارے بھی اب خود لوگوں کے تحفظ حقوق کے ضامن نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن مذہبی نقطۂ نظر سے تنظیمات کی مخالفت سامنے نہ آئی تھی۔ جب ''خط شریف'' پڑھا گیا تو شیخ الاسلام خود موجود تھے گو معلوم نہ ہوتا تھا کہ مختلف قوانین جو اس سلسلے میں نافذ کیے گئے، ان کی منظوری انہوں نے فتوے کے ذریعے دی۔ اس کے برعکس وزراء اور سرکاری افسر، جو اصلاحات (تنظیمات) کے نفاذ کے ذمہ دار تھے، ہمیشہ قانون شریعت کی بعض صریح دفعات کو منسوخ کرنے سے انکار کر دیتے تھے، مثلاً قتل مرتد یا عدالت کے روبرو غیر مسلم کی شہادت کا عدم جواز گو انہیں ہر ایسے قانون کے اجرا میں کوئی عذر نہ تھا جس سے شریعت کا کوئی تعلق نہ ہو۔

غرض ''تنظیمات'' کا نفاذ بڑی پر آشوب فضا میں ہوا۔ کوئی وزیر اعظم شاذ ہی کسی منصوبے یا پروگرام کو مکمل طور پر امن کے ساتھ نباہ سکتا تھا۔ اچانک وزارت معزول ہو جاتی تھی۔ پھر اچانک ہی بحال بھی ہو جاتی تھی۔ باوجودیکہ سلطان عبدالمجید اصلاحات کی طرف نسبتاً زیادہ مائل تھا، رشید پاشا 1846ء اور 1858ء کے درمیان چھ دفعہ وزیر اعظم بنا۔ عہدوں میں اس قسم کی تبدیلیاں سلطان عبدالعزیز کے زمانے میں بھی ہوئیں، جو اپنے پیشرو سے بہت زیادہ متلون مزاج تھا۔ مدحت پاشا نے 1873ء میں صرف تین ہفتے تک وزارت کی اور دوسری بار کل سات ہفتے ایسے وقت بھی آئے جب غیر ملکی مداخلات کی وجہ سے اچانک نئی جدوجہد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ صورت حال بالخصوص پیرس کی صلح کانفرنس سے پہلے کے مذاکرات کے وقت پیدا ہوئی۔ ترکی کے حلیف اس وقت سلطان کو بین الاقوامی قرارداد کے ذریعے پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ ان اصلاحات کا فوری نفاذ کرے جو ابھی تک التوا میں پڑی ہوئی

تھیں۔ اس کا نتیجہ "خط ہمایون" (فروری 1856ء) کی شکل میں نکلا جو کہنے کو سلطان نے اپنے ادارے سے جاری کیا تھا۔ معاہدہ پیرس 30 مارچ 1856ء کی رو سے یورپی ممالک صریح طور پر اقرار کر کے اس امر کو ذہن نشین کرتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے داخلی امور میں انہیں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔ اس "خط ہمایون" کو عیسائیوں اور یہودیوں کے حقوق کی مساوات کے متعلق 1839ء کے وعدوں کی توثیق ہی سمجھنا چاہیے۔ اس فرمان میں خاص طور پر یہ تحریر تھا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی مقدمات کے فیصلے کے لیے مخلوط عدالتیں قائم کی جائیں گی اور ان کے متعلق جملہ قوانین کو جتنا جلد ممکن ہو سکا، منضبط کر دیا جائے گا۔ اسی ایکٹ میں ایک اور اہم بات یہ درج تھی کہ غیر ملکی طاقتوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی حدود میں اراضی کی ملکیت حاصل کر سکیں گی۔ تاہم یورپی طاقتوں کی دخل اندازی کا سلسلہ 1856ء کے بعد بھی ختم نہ ہوا اور 1859ء میں انہوں نے ترکی کے یورپی مقبوضات میں تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ 1867ء میں یورپی ممالک نے سلطنت عثمانیہ سے پھر باز پرس شروع کی لیکن وہ اس بات پر آپس میں متفق نہ ہو سکیں کہ حصول مقصد کے لیے کون سی تدابیر اختیار کی جائیں۔ روس کا مطالبہ یہ تھا کہ انتہائی لا مرکزیت کا نظام وجود میں لایا جائے، مگر فرانس نے باب عالی کو اس بات پر ابھارا کہ وہ رعایا کے مختلف طبقوں کو آپس میں ملا دینے کی حکمت عملی کو عمل میں لا کر دیکھے۔ رعایا کو آپس میں ملا دینے والا طریقہ وقتی طور پر مناسب حال سمجھا گیا۔ چنانچہ شہر غلطہ سرائے میں فرانسیسی زبان کی تعلیم کے لیے ایک ثانوی مدرسے کا افتتاح اسی کا ایک نتیجہ تھا۔ 1870ء میں یورپ کے واقعات (مثلاً فرانس اور جرمنی کی جنگ) کی وجہ سے یورپی دباؤ کچھ کم ہو گیا۔ ٹھیک یہی وہ زمانہ ہے جس میں ترکی میں لامرکزیت کی طرف زیادہ رجحان پیدا ہوا، لیکن طریق عمل کچھ ایسا تھا کہ اس سے نہ تو یورپی ممالک خوش ہوئے اور نہ غیر مسلم رعایا۔ تاہم اس حکمت عملی میں تھوڑی بہت کامیابی ضروری ہوئی۔ مثلاً طرابلس اور تونس میں عثمانی حکومت کچھ مضبوط ہو گئی، لیکن اس کا ردعمل بھی جلد ہی محسوس ہونے لگا۔ سلاوی صوبوں میں 1875ء میں بغاوت ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1876ء میں قسطنطنیہ میں ایک یورپی کانفرنس کا اجلاس ہوا، اور اس سے اگلے سال روس سے تباہ کن جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے رومانیہ اور سربیا کے صوبے سلطنت عثمانیہ سے الگ ہو گئے اور بلغاریہ تقریباً خود مختار ہو گیا۔ (عہد نامہ برلن، 13 جولائی 1879ء کی رو سے)۔

احیائے اسلام اور تنظیمات

سلاوی صوبوں میں 1875ء میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1876ء میں قسطنطنیہ میں ایک "یورپی کانفرنس" کا اجلاس ہوا اور اس سے اگلے سال روس سے تباہ کن لڑائی چھڑ گئی، جس کی وجہ سے رومانیہ اور سربیا کے صوبے سلطنت عثمانیہ سے الگ ہو گئے اور بلغاریہ تقریباً خود مختار بن گیا، (از روئے عہد نامہ برلن، 13 جولائی 1879ء)

وہ طریقہ جس کی رو سے ترکی حکومت کو اس دخل اندازی کی پیش بندی منظور تھی وہ سلطنت عثمانیہ کے دستور (آئین) کا اعلان تھا جو 23 ستمبر 1876ء کو یعنی یورپی کانفرنس کے اجلاس کے پہلے دن ہوا، لیکن اس علاج

سے جس کے متعلق نئے سلطان عبدالحمید کو پہلے سے شبہ تھا، متوقع کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مدحت پاشا، جس نے یہ آئین تیار کیا تھا، دو ہی مہینے کے بعد جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے فوراً بعد سلطان نے اس آئین کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ تاہم سلطان عبدالحمید کے دورِ حکومت کے طویل عرصے میں جو جنگ روس کے بعد آیا، اصلاحات کو مکمل طور پر معطل نہ کیا گیا۔ 1879ء کے قوانین سے جو خاص کر دیوانی محکمے (عدلیہ) کے متعلق تھے، تنظیمات کی قانون سازی ایک لحاظ سے تکمیل پا گئی۔

اب ہم مختلف اصلاحات کا سرسری جائزہ لیتے ہیں:

قضا کی مجلس اعلیٰ (Grand Council Justice)، جسے مجلس تنظیمات بھی کہتے تھے، کی ہیئت میں 1854ء، 1861ء اور آخر کار 1868ء میں کئی تبدیلیاں ہوئیں اور اس کی فعالیت اداری اور ضمنائی عمال میں تقسیم ہو گئی۔ یعنی شورائی دولت (کونسل آف سٹیٹ) میں، جس کی شکل وصورت 1918ء تک باقی رہی، اور دیوانِ احکام عدلیہ (ہائیکورٹ آف جسٹس) میں۔ 1839ء کے فوراً بعد ہی رشید پاشا نے فرانسیسی طرز پر صوبوں کے نظم ونسق کا ایک نیا طریقہ جاری کیا اور ''التزام'' کو منسوخ کر دیا۔ (التزام سے مراد ٹیکسوں کو اجارے پر دینے کا طریقہ ہے جو ترکی میں رائج تھا)۔ ثابت ہوا کہ اس نظام میں مرکزیت کی افراط ہے اور اس لیے 1852ء میں گورنروں کے اختیارات میں دوبارہ توسیع کی گئی۔ ٹیکسوں کی اجارہ داری کا دستور پھر سے رائج کرنا پڑا، کیونکہ براہ راست ٹیکس لگانے سے خزانے کو کافی آمدنی نہ ہوتی تھی۔ 1864ء کے قانون ولایات (صوبہ جات) سے، جس کی تکمیل 1871ء میں ایک قانون کے ذریعے کی گئی، ولایات کا اداری نظام مکمل کر دیا گیا اور یہ قانون 1918ء تک جاری رہا۔ 1864ء کا یہ قانون اس وجہ سے بھی اہم تھا کہ اس کے ذریعے صوبوں کو نئی عدالتیں ملیں جو قاضیوں کی عدالتوں سے مختلف تھیں، گو ان کے جج بسا اوقات علماء ہی ہوا کرتے تھے۔

1864ء سے پہلے بھی قسطنطنیہ اور متعدد بڑے بڑے صوبائی شہروں میں دو عدالتیں ایک تجارتی اور ایک مخلوط (عثمانیوں اور غیر ملکیوں کے مابین مقدمات کے لیے) قائم کر دی گئی تھیں۔ ان دونوں عدالتوں کو 1860ء میں ملا دیا گیا، لیکن 1875ء اور 1879ء کے قوانین کے صادر ہونے سے پہلے تمام غیر شرعی عدالتیں وزارتِ انصاف کے ماتحت نہ آ سکیں۔ پہلا قانون عرف (کامن لاء) 1850ء کا ضابطۂ تجارت تھا جو زیادہ فرانسیسی قانون پر مبنی تھا اور یہی حال 1858ء کے ضابطۂ تعزیرات اور 1863ء کے ضابطۂ قانون تجارت بحریہ اور 1861ء کے ضابطۂ تجارت کا تھا۔ البتہ 1869ء کے ضابطہ دیوانی میں کوشش کی گئی کہ قانون ملکیت اور قانون ضمانات وغیرہ کو حنفی مذہب کے مطابق جمع ومرتب کر لیا جائے۔ یہ ضابطۂ دیوانی ایک مجلس نے، احمد جودت پاشا کی صدارت مرتب کیا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد لازمی متصور نہ ہوتا تھا، بلکہ یہ گویا ان ججوں کے مطالعے کے لیے ایک کتابچہ تھا، جنھوں نے اسلامی شریعت کا مطالعہ نہیں کیا۔ قانون برائے اجرائے فیصلہ جات اور ضابطۂ دیوانی دونوں 1879ء میں وضع ہوئے تھے، لیکن انہیں غیر ملکی سفارتوں نے تسلیم نہ کیا، اس لیے مخلوط مقدمات میں انہیں کبھی استعمال نہ کیا گیا۔

مختلف النوع غیر مسلم جماعتوں کے لیے قانون سازی کا کام بے حد پیچیدہ تھا۔ ان میں سے بڑی بڑی

جماعتوں کے لیے جو "بنیادی قوانین" 1860ء میں شائع ہوئے، ان کا رجحان اس طرف تھا کہ اداری امور میں روحانی (کلیسائی) عنصر کے اقتدار کو کم کر کے غیر روحانی عنصر کو زیادہ اختیار دیا جائے۔ ان جماعتوں نے عام طور پر قضا (عدلیہ) کے معاملات میں اپنی خود مختاری قائم رکھی۔ بابِ عالی کو اکثر اوقات ان جماعتوں کے اندرونی تنازعات اور رومن کیتھولک اور مشرقی کلیسا کے پیروکاروں کے (جو روما کی گدی سے منسلک و متحد تھے) باہمی اختلافات کا فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ یہاں بھی غیر ملکی طاقتوں کو ہر وقت دخل دینے کا موقع ملتا، بالخصوص روس کو ترکی کے گریگوری کلیسا کے مسائل میں مداخلت کا موقع ملتا تھا۔ اسی طرح اور تھوڈوکس بلغاریوں کی اختلافی جماعت کے مسئلے میں بھی یہی کیفیت تھی جنہیں 1870ء میں ایک خود مختار جماعت کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ غیر مسلموں کو فوج میں بھرتی کرنے کا فیصلہ 1855ء میں پیدا ہوا تھا اور خراج سرکاری طور پر موقوف کر دیا گیا، لیکن اس فیصلے پر "تنظیمات" کے دوران میں کوئی عمل نہ ہوا۔ اس کی جگہ معافی ٹیکس (یعنی بدل) رائج ہوا۔

تعلقات خارجہ کے سلسلے میں غیر ملکی امتیازات کی تنسیخ کے متعلق تمام کوششیں، جن کی ابتدا پیرس کانگریس میں ہوئی، بے کار ثابت ہوئیں۔ 1873ء کے قانون کے نفاذ کے موقع پر ایک خفیف سی اصولی تبدیلی کی گئی، جس کی وجہ سے غیر ملکیوں کو زمین کی ملکیت حاصل کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

1845ء میں تعلیم کی کامل اصلاح کی غرض سے ایک "مجلس معارف" مقرر ہوئی۔ پہلے اس کا صدر فواد پاشا تھا اور بعد میں جودت پاشا۔ اس ضمن میں مذہبی تعلیم اور مدرسوں کی روایات سے ٹکر لینا لازمی خیال کیا گیا۔ 1845ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی، لیکن اس کا پہلے پہل براہ راست کوئی حسب دل خواہ نتیجہ نہ نکلا اور رشدیہ (ثانوی) اور اعدادیہ (پرائمری) مدارس کے قیام میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ 1868ء میں غلطہ سرائے کے ثانوی مدرسے کا افتتاح ہوا، جس میں تعلیم فرانسیسی زبان میں دی جاتی تھی تو اس کے معنی یہ لیے گئے، کہ غیر ملکی ثقافت کو ملک میں داخل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی بڑی سختی سے مخالفت ہوئی۔ غرض کہ انیسویں صدی کے اواخر میں جا کر یہ اقدامات بار آور ہونے لگے۔

"تنظیمات" کے دور میں اقتصادی نوعیت کے منصوبے بہت کم ظہور میں آئے۔ ملک کی مالی حالت برابر افسوسناک رہی اور یہ حالت غیر ملکی قرضوں (1854ء سے) اور سلطان عبدالعزیز کی فضول خرچیوں کے باعث بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ قومی قرضے کے بین الاقوامی محاسبے پر، جس کا ان حالات میں وجود میں آنا لازمی تھا، 1879ء کی مالی تباہی کے بعد تک عمل شروع نہ ہوا، 20 دسمبر 1881ء کے فرمان کے مطابق عثمانی سلطنت کے قرضے کی بین الاقوامی کونسل قائم ہوئی۔

تنظیمات کے دور میں ترکی کے اسلامی عوامل کی عقلی تجدید و احیاء کا بھی کچھ پتا چلتا ہے، جس سے ترکوں کی جدید ثقافت کی بنیاد پڑی۔ یہی زمانہ تھا جس میں شناسی، نامق کمال اور احمد وفیق محو عمل رہے۔ اسی دور میں احمد جودت پاشا بھی تھے جو مشہور مورخ، ادیب اور قانون ساز تھے۔ ضیا گوگ پاشا بھی تھے، جس نے موجودہ ترکی قوم پرستی کی تحریک کے اصول وضع کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے بعد ترکی کو ذہنی و فکری ارتقا کے سلسلے میں یہ دور

نہایت اہم ثابت ہوا۔

یہ دور اسلام کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے ضمن میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس کا مطالعہ مفکرین کی شخصی کاوشوں کی وساطت سے ہی ہوسکتا ہے۔ اور اب جدید مفکرین کی فرداً فرداً کاوشوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

احیائے اسلام اور ترک خواتین

سلطنت عثمانیہ میں تنظیمات کا دور جہاں سیاسی ومعاشی اور معاشرتی وتجارتی میدانوں میں بنیادی اصلاحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا، اور اس کے جلو میں دستور وسیاست کی متعدد تبدیلیاں ظہور میں آئیں، وہیں ترک خواتین کی مذہبی وسماجی اور سیاسی ومعاشرتی زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عثمانی خلافت کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی گئی تھی اور متعدد کمزوریوں اور ذاتی زندگی کی خرابیوں کے باوجود عثمانی سلاطین بہ حیثیت مجموعی اسلام ہی کے ترجمان اور نمائندے سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے عائلی نظام کی بنیادیں قرآنی اصولوں پر بڑی حد تک استوار تھیں اور خواتین کا دائرہ عمل بنیادی طور پر ان کا اپنا گھر تھا اور وہ شمع خانہ بن کر تعلیم وتربیت کے اہم ادارے 'خاندان' کی تب وتاب میں اضافہ کرتی تھیں، مگر مغربی افکار ونظریات نے ترکی میں آزادی نسواں کی تحریکات کو فروغ دیا اور رفتہ رفتہ ترکی خواتین بھی حقوق ومطالبات کی راہ پر گامزن ہوگئیں۔

سلطان عبدالعزیز (1830ء۔1876ء)

انیسویں صدی کے اواخر میں سلطان عبدالعزیز کے عہد حکومت میں جو اصلاحات ہوئیں، ان میں خواتین کے بارے میں بعض اقدامات کیے گئے۔ سلطان عبدالعزیز 32 ویں عثمانی سلطان تھے۔ وہ 9 فروری 1830ء کو پیدا ہوئے۔ اس کے عہد کی یادگار وہ شورشیں اور بغاوتیں ہیں جو بلقان کے صوبوں مونٹی نیگرو، سرویا، بوسنیا، ہرزیگونیا، بلغاریہ اور کریٹ میں برپا ہوئیں اور جن کی وجہ سے بڑی طاقتوں نے مداخلت کی۔ 1870ء سے استنبول میں فرانس اور انگلستان کی جگہ روس کا اثر بڑھ گیا، لیکن ان تمام بے چینیوں کے باوجود تنظیمات کی حکمت عملی ترک نہیں کی گئی۔ صوبائی نظم ونسق 1867ء میں فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا۔ ادارۂ اوقاف میں بھی اصلاح کی کوشش کی گئی۔ فرانس کے مشورے پر دو مجلسیں قائم کی گئیں۔ ایک امور سلطنت سے متعلق مجلس شوریٰ، جس کے ارکان میں مسلمان اور عیسائی دونوں شامل تھے اور دوسری مجلس عدالتی امور سے متعلق۔ تعلیم کا انتظام بھی فرانسیسی طرز پر ہوا۔ تمام فوج خصوصاً بحریہ کو دوبارہ منظم کیا گیا۔ غیر ملکیوں کو منقولہ جائیداد حاصل کرنے کی اجازت دے دی گئی، مگر مالی اصلاحات کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں اور یہی وجہ ہے کہ آئندہ اصلاحات کا سلسلہ تقریباً رک گیا۔ چنانچہ اس صورت حال کے خلاف عوام میں بے چینی اور ناراضگی پھیل گئی۔ 30 مارچ 1876ء کو سلطان کو معزول کر دیا گیا اور چند روز بعد اس نے خودکشی کر لی۔

سلطان عبدالعزیز نے 1863ء میں خواتین کی تعلیم سے متعلق بعض اہم اقدامات کیے، اور مورخین لکھتے ہیں

کہ خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے ترکی میں یہ پہلی سرکاری کوشش تھی۔ سلطان نے خواتین اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک کالج قائم کرنے کا شاہی فرمان جاری کیا۔ ابتدا میں طالبات کے نصاب میں حفظ و تجوید قرآن اور چند دینی کتب کا مطالعہ شامل تھا، مگر رفتہ رفتہ دوسرے معاصر علوم بھی ان کے نصاب میں داخل کئے گئے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ تعلیم کے لیے مجلس تعلیم نے اپنے ایک رکن کمال آفندی کو، جو سکولوں کے انسپکٹر جنرل تھے، یورپ روانہ کیا، تاکہ فرانس، جرمنی اور انگلستان کی جامعات کے نظام کا مطالعہ کریں۔ کمال آفندی کئی ماہ پیرس میں مقیم رہے۔ حکومتِ فرانس نے تمام ضروری معلومات فراہم کیں۔ وہاں سے واپس آ کر انہوں نے مغربی نظام و نصاب تعلیم کی روشنی میں متعدد اقدامات کیے۔ مختلف علوم وفنون کے کالج اور سکول قائم کیے گئے، جن میں فرانسیسی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ طبیعیات، کیمیا اور ارضیات وغیرہ کی تعلیم بھی دی گئی اور ان کی عملی مشق بھی کرائی گئی۔ تمام بڑے کالجوں کے ساتھ ہوسٹل بھی تعمیر کیے گئے، جن میں اعلیٰ درجے کا نظم وضبط نافذ کیا گیا۔

سلطان عبدالحمید خان (1842ء۔1918ء)

سلطان عبدالعزیز کے بعد دوسرے سلطان جنہوں نے ترکوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی، سلطان عبدالحمید خان تھے۔ انہوں نے تعلیمِ نسواں پر زور دیا، تاکہ خواتین ازدواجی زندگی میں بہترین رفیق اور معاون ثابت ہو سکیں۔ عام طور پر سلطان عبدالحمید خان کو اصلاحات و ترقیات کا دشمن، رجعت پسند اور مطلق العنان حکمران خیال کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے سلطان کی پابندیٔ شریعت اور مذہبی فطرت تھی۔ وہ غیر اسلامی افکار اور ان کے ماننے والوں کے سخت خلاف تھے۔ ان پر مطلق العنانی اور استبداد کا الزام اس لیے عائد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے وزیر اعظم کے باب عالی کے مقابلے میں قصر شاہی اور بار سلطانی کو زیادہ اہمیت دی تھی، تاکہ امور مملکت پر مکمل شخصی تسلط قائم ہو جائے۔ سلطان کو ترقی کا دشمن قرار دینا اس لیے غلط ہے کہ سلطان کی تخت نشینی کے وقت مدارس رشدیہ کی تعداد 96 تھی لیکن مولانا شبلی نعمانی کے بقول 1892ء میں بڑھ کر 405 ہو گئی تھی۔ ہر قسم کے نئے مدارس،، جو سلطان کی طویل حکومت میں قائم ہوئے، ان کی تعداد دو ہزار ہے۔ اس کے ساتھ سکولوں اور کالجوں میں طلبہ کی تعداد اس کثرت سے بڑھی کہ پچھلے برسوں کے مقابلے میں تعلیمی ترقی کی رپورٹ بدر جہا بہتر ہے۔ مکتب الحقوق، قسطنطنیہ میں طلبہ کی تعداد شبلی نے بارہ سو بتائی ہے۔ انہوں نے قاہرہ کے اخبار ''المویئد'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان نے جب عنان حکومت سنبھالی تو مصارفِ تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ تھے۔ سلطان نے اسے بڑھا کر آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ کر دیئے۔

(حوالہ ''سفرنامہ روم مصر'' از مولانا شبلی)

سلطان عبدالحمید خان کے زمانے میں ترک خواتین پردے کی سخت پابند ہوتی تھیں۔ کوئی خاتون نقاب کے بغیر اپنے مکان کے نیچے والی سڑک پر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ کوئی عورت، اگر کسی وجہ سے گھر سے باہر ہوتی تو غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اپنے مکان میں واپس چلی جاتی تھی۔ سلطان خود خواتین کے پردے کا سخت حامی تھا۔ وہ ہر سال نقاب کے زیادہ موٹے ہونے اور برقعے کے زیادہ کھلے اور ڈھیلے ہونے کے بارے میں شاہی فرمان جاری کرتا تھا۔ کوئی ترک سڑک پر اپنی بیوی یا بہن سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنا خلاف قانون تھا اور ایسے معاملات

میں پولیس فوراً مداخلت کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے سرکاری اور پرائیویٹ مدارس کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی اور پردہ حفاظت کا ایسا معقول انتظام ہوتا تھا کہ شرفاء کو اپنی لڑکیوں کو مدرسوں میں بھیجنے میں کچھ تامل نہ ہوتا تھا۔ علمی مضامین کے ساتھ فرانسیسی زبان بھی داخل نصاب تھی اور بعض زنانہ مدرسوں میں موسیقی کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ معلمات کی تعلیم کے لیے بھی مدارس قائم کیے گئے تھے۔ ان مدارس کی وجہ سے خواتین میں تعلیم اتنی عام ہوگئی تھی کہ بمشکل کوئی عورت ایسی مل سکتی تھی جس نے مناسب درجے تک تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ 1892ء میں عورتوں کو چلنے پھرنے کی آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ ہر درجے اور رتبے کی عورتیں بازار میں نکلتی تھیں۔ سیر گاہوں میں تفریح کے لیے جاتی تھیں۔ دعوت کے جلسوں اور علمی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ ان آزادیوں کے باوجود معاشرہ مکمل طور پر غیر مخلوط تھا۔ گھروں میں وہ یورپی لباس پہنتی تھی، مگر جب انہیں باہر نکلنا ہوتا تھا تو ڈھیلا ڈھالا ریشمی گون پہن لیتی تھیں جو گردن سے لے کر ٹخنوں کے نیچے تک ہوتا تھا، اور اوپر سے نیچے تک بٹن لگے ہوتے تھے۔ سوائے چہرے کے تمام جسم ڈھک جاتا تھا۔ سلطان عبدالحمید خان کے دور میں آزادئ نسواں کی تحریکیں شروع ہوچکی تھیں، مگر اس کے مذہبی مزاج اور شرعی طبیعت کی وجہ سے انہیں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ سلطان نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے گھروں اور سکولوں میں عیسائی اتالیقہ رکھنے پر پابندی عائد کردی تھی، تاکہ عیسائیت کے اثرات سے نئی نسل محفوظ رہے۔

تنظیمات کے دوسرے دور میں 1908ء میں جب سلطان عبدالحمید خان کو معزول کردیا گیا تھا، غربی نسوانی تحریکات اور ملحدانہ انجمنوں کو کام کرنے کی پوری آزادی مل گئی۔ اسی سال شہر سلونیکا میں خواتین کی پہلی سوسائٹی ''سرخ وسفید کلب'' کی تشکیل ہوئی۔ دوسری تحریکوں اور انجمنوں نے بھی خواتین کی تعلیم کے منصوبے اور پروگرام بنائے۔ خالدہ ادیب خانم کی سربراہی میں ''انجمن بہبود خواتین'' نے مختلف عائلی وسماجی مسائل میں دلچسپی لی اور مغربی فکر کی بھرپور ترجمانی کی۔ ''انجمن عثمانی برائے خواتین'' کی سیکرٹری قادریہ احسان نے 1910ء میں پہلی بار اپنی تصویر شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ اعلیٰ طبقے کی خواتین نے پہلے تو نقاب کے لیے ہلکی اور باریک جالیاں استعمال کیں، پھر رفتہ رفتہ انہوں نے نقاب کا استعمال ترک کردیا۔ پہلی مرتبہ 1912ء میں کچھ خواتین نے بے نقاب ہوکر امریکی سفارت خانے کے ایک استقبالیہ میں شرکت کی۔ سب سے زیادہ ترقی پسند اور ''روشن خیال'' عثمانی انجمن برائے تحفظ خواتین ثابت ہوئی۔ یہ انجمن خود کو عورتوں کے حقوق کی نگران بھی خیال کرتی تھی۔ 1913ء میں اس انجمن کی صدر محترمہ نوری علوی میدان میں آئی ''دنیائے خواتین'' کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس کے پہلے شمارے میں (نومبر 1913ء) عورتوں کی تصویریں پہلی مرتبہ شائع ہوئیں۔ جنگ بلقان کے زمانے میں انجمن ہلال احمر (ریڈ کراس سوسائٹی) سے وابستہ خواتین نے ترکی نرسوں کی تربیت کا آغاز کیا۔ نومبر 1913ء ہی میں نوجوانانِ ترک نے خواتین کے لیے محاضرات کا اہتمام کیا جس میں روسی النسل خواتین کا کردار سب سے نمایاں تھا۔

جنگ عظیم کے زمانے (1914ء۔1918ء) میں ترک خواتین کی معاشرتی زندگی میں زبردست تغیر واقع ہوا۔ باپردہ اور بے پردہ خواتین نے عوامی زندگی میں قدم رکھا۔ اسلحہ ساز فیکٹریوں اور فوڈ انڈسٹری میں خواتین

ملازمت کرنے لگیں۔ وزارتِ تجارت نے خواتین مزدور فورس کی تشکیل کے لیے قانون وضع کیا۔ صرف اروفہ کی فیکٹری میں ایک ہزار خواتین ملازم تھیں۔ ازمیر، سیواس، انقرہ اور قونیہ میں چار ہزار سات سو اسی خواتین کو کمبل بُنائی کے کام پر رکھا گیا۔ ایڈن میں گیارہ ہزار اور کوتاہیہ، اسکیسر اور کاراہسار میں پندرہ سو پچاس خواتین کو ٹیکسٹائل کی صنعت میں ملازمت مل گئی۔ کارخانوں میں خواتین کے ملازمت کرنے کی وجہ سے خاندانی نظام تباہ ہو کر رہ گیا اور ترقی کی دوڑ میں مردوں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے شوق میں انہوں نے مختلف قسم کی الجھنوں اور پریشانیوں کو خود دعوت دے دی۔

خاندانی اور عائلی زندگی کو تباہی کی طرف لے جانے والے رجحانات کے باوجود بینکوں میں، ڈاک خانوں میں، مرکزی اور بلدیاتی محکموں میں، ہسپتالوں میں خواتین کی ملازمتوں کے لیے دروازے وا ہو گئے۔ 1915ء میں انور پاشا کی اہلیہ ایمن نقی نے مختلف صنعتوں میں خواتین کی زیادہ ملازمتوں کے لیے تحریک چلائی اور اس مقصد کے لیے ایک تنظیم قائم کی۔ ایک سرکاری حکم نامے کے ذریعے اس دور میں دفاتر میں کام کرتے وقت نقاب ہٹانے کی اجازت بھی دی گئی، مگر یہ حکم جنگ کی مخصوص صورت حال اور اشرافیہ کے ایک محدود طبقے تک ہی لاگو تھا۔ پھر عوام اور سرکاری اہلکاروں کا مزاج زیادہ تر مذہبی ہونے کی وجہ سے بھی اس صورت حال میں زیادتی کی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود مغربی دانش وروں کی یہ شکایت رہی کہ اس دور میں پولیس ایسی خواتین کو واپس ان کے گھروں کو بھیج دیتی تھی جن کے کوٹ مطلوبہ پیمائش سے کم لمبے ہوتے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے آخری دور میں خواتین کی عسکری سرگرمی اور سرکاری اور نجی شعبوں میں ان کی ملازمتوں نے جہاں شہری زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی اور خواتین کے اندر خود کفالت کا احساس پیدا کر دیا تھا، وہیں متعدد خاندانی اور عائلی مشکلات، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل بھی پیدا کر دیئے تھے، ان کی وجہ سے معاشرے سے اخلاقی قدریں کمزور پڑ گئیں اور مذہب کی گرفت بھی کمزور ہو گئی۔

ترکی میں آزادیٔ نسواں کی تحریک

اسی دور میں ضیاء گوک الپ جیسے ادیب اور دانشور بھی منصۂ شہود پر آئے، جنہوں نے ترک قومیت کا راگ الاپا اور ترک معاشرے کو سیکولر قومیت کی بنیاد پر استوار کرنے کی تحریک کی۔ اس کے خیالات نے بلاشبہ 25 اکتوبر 1917ء کے عائلی قانون پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ ضیاء سیکولرازم اور لادینی جمہوریت کا علم بردار ہونے کی وجہ سے حقوق نسواں بلکہ مکمل آزادیٔ نسواں کا بھی وکیل تھا۔ اس نے نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ کے معاملات میں، جن کا مذہب سے گہرا تعلق ہے، خواتین کے لیے مساوی حقوق کا نعرہ لگایا، جس سے ترکی میں مغرب نواز نسوانی تحریکوں کو مزید تقویت ملی۔

ضیاء گوک الپ ترک قومیت اور اسلام کے درمیان تصادم کو ناگزیر نہیں سمجھتا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کو اختیار کرنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب دراصل اس قدیم تہذیب کے تسلسل کی ایک شکل ہے جس کی

نشوونما اور تحفظ میں ترکوں کا خاص حصہ رہا ہے، اور یہ کہ معاشرے مذہب وثقافت کے اختلاف کے باوجود ایک مشترک تہذیب اختیار کر سکتے ہیں۔ جاپانی اور یہودی، مذہب اور ثقافت میں اختلاف کے باوجود مغربی تہذیب اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں اس نے روس کی مثال بھی دی، جس نے قدامت پسند کٹر مسیحی کلیسائی پیروی اور مشرقی تہذیب کو اختیار کیا اور مغرب کی آزاد اور طاقتور قوموں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کھل کر مغربی تہذیب کی وکالت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ہمیں دو میں سے ایک راستہ اختیار کرنا پڑے گا، یا تو ہم مغربی تہذیب کو قبول کریں یا مغربی طاقتوں کا غلام رہنا پسند کریں۔ ہمیں ایک طرف کا ہو کر رہنا پڑے گا۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم اپنی حریت اور آزادی کی حفاظت کے لیے مغربی تہذیب پر اپنا اقتدار قائم کریں۔''

ضیاء گوک الپ کے نزدیک جدید ترکی قوم کی تشکیل مشرقی تہذیب کے دائرے سے مغربی تہذیب کے حلقۂ اثر میں منتقل ہو کر عمل میں آئی ہے۔ اس تبدیلی میں اسلام کے وہ عناصر جو ترکی ثقافت کے جزو لاینفک بن چکے ہیں، ایک زندہ روحانی طاقت کی حیثیت سے باقی رہیں گے۔ ترک قوم صرف اسی حد تک مغربی رنگ اختیار کرے گی، جہاں تک کہ وہ جدیدیت کو اپنے مذہب اور تمدن سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد مغرب پسند نسوانی تحریکوں کو تیزی سے فروغ ملا۔ 19 مارچ 1918ء کو وزیر معارف علی کمال نے استنبول میں فیکلٹی آف فلاسفی میں خواتین کے لیے نئے نصاب کا افتتاح کیا۔ 1921ء میں طالبات کے لیے جداگانہ کلاس روم مخصوص کیے گئے جہاں لیکچر کے دوران وہ اپنے نقاب ہٹا سکتی تھیں۔ 1922ء میں ترکی کی پہلی خاتون ڈاکٹر صفیہ علی نے استنبول میں اپنا پرائیویٹ کلینک قائم کیا۔

ان حالات وواقعات کے ساتھ ترکی کی تاریخ میں یہ سانحہ بھی رونما ہوا کہ 15 مئی 1919ء کو مغربی طاقتوں کی شہ پر ازمیر میں یونانی فوجی گھس آئے۔ برطانوی سپاہیوں نے استنبول پر قبضہ کر لیا اور جنوبی اناطولیہ میں فرانسیسی اور اطالوی فوجی دستوں نے فوجی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے خلاف پوری ترک قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوانوں اور طلبہ نے عوام کے ساتھ مل کر زبردست احتجاجی مظاہرے کیے اور تشدد اور قتل وخون کا بازار گرم ہو گیا۔ خواتین کے اندر بھی غیظ وغضب اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی جذبات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ احتجاجی جلسوں، عوامی مظاہروں اور جلسوں میں نہ صرف یہ کہ خواتین نے شرکت کی، اور خالدہ ادیب خانم، نقبیہ ایلگون اور منور سمیع وغیرہ نے جلسوں جلوسوں سے خطاب بھی کیا، بلکہ بہت سی جری اور بہادر خواتین نے اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کی تشکیل کردہ فوج میں باضابطہ شمولیت بھی اختیار کی تاکہ آزادی جنگ میں شرکت کر سکیں۔

ترکی کی جنگ آزادی میں نہ صرف یہ کہ خواتین نے خود شرکت کی، بلکہ اس دور کی سیاست پر بھی وہ اثر انداز ہوئیں۔ 9 ستمبر 1919ء کو اناطولیہ کی خواتین نے ''تنظیم خواتین برائے دفاع'' کی تشکیل وتاسیس کا اعلان کیا۔ پھر اس کی ایک شاخ سیواس میں قائم ہوئی۔ پھر اس کی شاخیں دوسرے شہروں میں قائم ہو گئیں۔ 1920ء میں صرف قصبہ نیکڈ شاخ کی اراکین کی تعداد ایک ہزار 90 تھی، جن کی اکثریت شہری ملازمین، اساتذہ اور مقامی تاجروں کی

بیٹیوں اور بیویوں پر مشتمل تھی۔ ان تنظیموں کا مقصد مغربی ممالک کے عوام پر ملکی دفاع و تحفظ کے لیے وحدت و سالمیت اور مسلسل جدوجہد کے عزم کا اظہار کرنا تھا۔

خلافت عثمانیہ کے ان آخری ایام میں آزادئ نسواں کی تحریکوں کو فروغ کا زیادہ موقع ملا۔ ترک نوجوانوں نے سلطنت عثمانیہ اور اس کی ہر یادگار کے خلاف داخلی اور خارجی محاذوں پر جنگ لڑی اور خواتین کو گھروں سے نکال کر کارگہ حیات میں کھڑا کرنے پر ساری توجہ اور سارے وسائل صرف کر دیئے، مگر انہیں اس میدان میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مغرب کو یہی شکایت رہی، بلکہ اب تک ہے کہ ترک خواتین رجعت پسند ہیں اور مذہب کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

برطانیہ کے ایک اخبار میں ایک دانشور کا مضمون چھپا، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''حقوق نسواں کی جدوجہد، ترک خواتین کی رویّوں کو تبدیل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ مثال کے طور پر خواتین کے ایک جریدے ''محاسن'' میں تحریک نسواں پر ایک مقالے میں مصنف نے عجیب و غریب انداز میں بحث چھیڑی کہ خواتین، جو ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی اہلیت رکھتی تھیں، ان کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ اسی طرح 1911ء میں عثمانی پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں ایک رکن نے کہا کہ مرد اور عورتوں پر بدکاری کی غیر مساوی سزا کی وجہ یہ ہے کہ قانون سازوں کے ذہن پر یہ نظریہ پوری طرح حاوی ہے کہ مرد عورتوں پر بالا دست ہیں۔ اسی طرح 1921ء کے پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں، جب کہ آتشک کی بیماری پر قابو پانے کے لیے ایک ملک گیر مہم کے منصوبے پر دھواں دھار بحث جاری تھی اور پارلیمنٹ کے ارکان لفظوں کی جنگ میں مصروف تھے، ایک تجویز یہ بھی سامنے آئی کہ غیر شادی شدہ خواتین کا بھی طبی معائنہ ہونا چاہیے۔ 1921ء ہی میں وزیر تعلیم حمد اللہ صوفی کو مستعفی ہونا پڑا، کیونکہ اس نے مردوں اور عورتوں کے ایک مخلوط اجلاس میں تقریر کی تھی۔ یہ بھی ترکوں کی رجعت پسندی کا ایک ثبوت ہے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ کمال ازم کے ایک ممتاز مبلغ نے خود بھی برسر اجلاس اعتراف کیا ہے کہ ترک خواتین کو صرف نام کی آزادی دی گئی ہے، ورنہ وہ اپنی ذہنی، علمی اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے آج بھی غلام ہیں۔''

ترک جمہوریہ اور خواتین

مصطفیٰ کمال پاشا اور انجمن اتحاد و ترقی سے تعلق رکھنے والے اس کے ہم نواؤں نے 1924ء میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ اور وزارتِ مذہبی امور کو منسوخ کر دیا۔ دینی تعلیم پر خط تنسیخ پھیر کر اور پورے ملک میں سیکولر تعلیمی وحدت کی تنفید، شرعی عدالتوں کی موقوفی، مساجد و مقابر اور زاویوں پر پابندی کا اعلان کر کے مذہب کے خلاف جدوجہد میں کامیابی حاصل کر لی۔ 1926ء میں اسلام کے عائلی قوانین کی جگہ سوئٹزر لینڈ کے

ضابطۂ دیوانی کے نفاذ کے احکامات جاری کیے اور 1925ء میں خواتین اسلام کے خلاف یہ سرکاری بیان دے کر طبل جنگ بجادیا:

''خواتین کو کھلی آنکھوں سے دنیا دیکھنے دو اور دنیا کو ان کے چہرے دیکھنے کا موقع دو''

خواتین اسلام اور ان کے ثبات، با اخلاق اور تعمیری کردار کے خلاف یہ جدوجہد صرف ترکی ہی میں جاری نہ تھی، بلکہ مغرب کے دانشوروں اور اخبارات نے اس زمانے میں پورے وسط ایشیا میں، روس کی مسلمان خواتین کو، مشرق وسطیٰ اور ہندوستان میں اسلامی شعائر سے متنفر کرنے میں زبردست کردار ادا کیا اور ترغیب و تحریص کے تمام وسائل اختیار کیے گئے۔ پردے اور شریعت کے خلاف یہ جنگ زیادہ شدت اور تشدد کے ساتھ ترکی ہی نہیں، بلکہ دوسرے مسلم ملکوں میں بھی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

سوئٹزرلینڈ سے اس کا ضابطۂ دیوانی مستعار لینے کے بعد انجمن اتحاد و ترقی نے ترکی کا عائلی اور خاندانی نظام اس کی بنیادوں تک منہدم کر دیا۔ طلاق، نکاح اور وراثت کے معاملات میں علانیہ شریعت کی خلاف ورزی کی گئی اور عورت کو تمام امور میں مساوی حقوق کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اس کے باوجود عورت کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا، اگر تھا تو صرف محدود عورتوں کو، یہ حق 1934ء میں دیا گیا۔

زمانۂ حال میں، 1980ء کے بعد سے ترکی سیاست اور معاشرت میں حیرت انگیز تبدیلی آئی ہے۔ اسلام پسندوں کا دباؤ ترکی معاشرے پر بڑھا ہے اور تعلیم و ثقافت، خدمتِ خلق اور پارلیمانی سیاست کے میدانوں میں اسلام فعال اور متحرک ہوا ہے۔ اگرچہ مغرب نواز اور سیکولر عناصر کی سرگرمیاں بھی جاری ہیں اور مغربی تحریکوں کے عوامی سطح پر مطالبات اور حقوق کے جلسے اور مذاکرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ 8 دسمبر 1975ء کو 27 خواتین تنظیموں کی ایک مشترکہ کانگرس انقرہ میں منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ ذیل مطالبات ایک قرارداد کی صورت میں پیش کیے گئے:

1۔ خاندان کے سربراہ کو شوہر کی ذات میں محصور نہ کیا جائے۔

2۔ بیوی کو شوہر کے خاندانی نام کا لاحقہ لگانے پر مجبور نہ کیا جائے۔

3۔ بیوی کو کسی ملازمت سے یا کوئی پیشہ اختیار کرنے سے منع کرنے کا حق شوہر سے چھین لیا جائے۔

4۔ جہیز کے مکمل خاتمے کے لیے تمام قانونی، انتظامی اور تعلیمی ذرائع اختیار کیے جائیں۔

5۔ شادی کی عدالت میں رجسٹریشن کرانے کے بعد اس پر کسی مذہبی تقریب (ولیمہ وغیرہ) کی ممانعت کی جائے۔

6۔ مسلح افواج میں خواتین کی شرکت کی اجازت دی جائے۔

جریدہ ''خاتون و خاندان'' کی خدمات

ترکی میں مغربی تہذیب اور سیکولرازم کے اثرات کا جائزہ کے لیے محققین عام طور پر وہاں ہونے والی شادیوں اور طلاقوں کے اعداد و شمار پر نظر رکھتے ہیں اور 1950ء تا 1974ء کی ربع صدی کو خاص طور پر اس لیے

ملحوظ رکھتے ہیں کہ اس عرصے میں وہاں سیکولرازم کو عروج حاصل رہا ہے۔ یہاں ہم تین بڑے شہروں کے اعداد پیش کر رہے ہیں:

شادیوں کے اعداد و شمار:

	1950ء	1960ء	1974ء
استنبول	10057	12323	26445
انقرہ	3019	5236	10461
ازمیر	3599	4666	10269

طلاقوں کے اعداد و شمار:

استنبول	929	1129	1501
نقرہ	526	727	1057
ازمیر	612	806	895

یہ اعداد و شمار اس طبقہ خواتین کے ذہنی و فکری رویوں اور عملی سرگرمیوں کے ہیں جو ترکی میں مغربیت، الحاد، اور کمالی سیکولرازم پر فدا ہے اور مغرب کو اپنا قبلہ سمجھ کر اسی کے گرد طواف کرنا اپنی سعادت و کامیابی سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ ان شہروں اور قصبوں میں زیادہ متحرک ہے جہاں مغربی تحریکوں کے سرکاری، ثقافتی اور تعلیمی اداروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جو تعلیم و تبلیغ، تشدد و تخریب، عریانی و فحاشی کے تمام ذرائع اور حربوں کو استعمال کر کے الحاد اور سیکولرازم کی قدیم اور مضبوطی سے لڑی ہوئی بنیادوں سے لوگوں کو ذرہ برابر بھی منحرف ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور دولت و شہرت کے دام تزویر میں مغرب زدہ خواتین کو پھنسا کر ان کا استحصال کر رہے ہیں، مگر چھوٹے شہروں، مرکز سے دور خطوں اور دیہات میں قدیم ترکی روایت، ثقافت و تمدن اور اسلام سے گہری وابستگی برابر موجود رہی۔ حکومت نے تمام حربے آزما کر ان میں مغربیت پھیلانے کی کوشش کی اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے اقتدار کے دور میں مختلف سیاسی و ثقافتی پروگراموں کے ذریعے اسلام سے ان کی عقیدت اور راسخ العقیدگی ختم کرنے کی جدوجہد کی، مگر نتیجہ الٹا نکلا۔ قرآن مجید نے دین کے دشمنوں کی اس سازش کا تذکرہ کرتے ہوئے، سورۃ الصف میں پہلے ہی صراحت کر رکھی ہے۔

﴿یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم ط واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون ۞﴾

"یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا، خواہ کافروں کو یہ کتنا ناگوار ہو۔"

یہ آیت 3 ہجری میں غزوہ احد کے بعد نازل ہوئی تھی، جب کہ اسلام صرف شہر مدینہ تک محدود تھا۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور سارا عرب اس دین کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ اس غزوے میں مسلمانوں کو جو زک پہنچی تھی، اس کی وجہ سے ان کی ہوا اکھڑ گئی تھی اور گرد و پیش کے قبائل ان پر شیر ہو گئے تھے۔ ان حالات میں فرمایا گیا کہ اللہ کا یہ نور کسی کے بجھائے نہ بجھ سکے گا، بلکہ پوری طرح روشن ہو کر اور دنیا بھر میں پھیل کر رہے گا۔

اب ذرا ترک خواتین میں اسلام اور شریعت سے محبت وعقیدت کی بازیافت کا حال بھی ملاحظہ کیجئے۔

1983ء کے پارلیمانی انتخابات کے وقت مذہب کی پابندی، اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی ضرورت، حج بیت اللہ کا اہتمام اور مساجد کی تعمیر جیسے معاملات ہر سیاسی جماعت کے منشور میں شامل تھے۔ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مدر لینڈ پارٹی کے رہنما اور وزیر اعظم ترگت اوزال نے علانیہ اعتراف کیا:

''میں اسلام پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، جہاں تک سرکاری فرائض اجازت دیتے ہیں۔''

اس اعلان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پہلے حصے میں اسلام پر عمل کرنے کی کوشش کا جو اعتراف کیا جارہا ہے، اسے ترکی کی کمالی تاریخ کے بعد ایک اہم مذہبی اور سیاسی موڑ کہنا چاہیے۔ گویا 1983ء سے پہلے کسی بڑی سرکاری شخصیت کو بھی اس کا اقرار کرنے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی، لیکن اسلامی احکام وشعائر کی یہ پابندی بھی اس وقت تک مشروط تھی یعنی ''جہاں تک سرکاری فرائض اجازت دیتے تھے۔''

1983ء کے انتخابات کے بعد حکومت اور عوام کا رجحان احیائے اسلام کی ضرورت کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ ترگت اوزال کے وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں وزارتِ مذہبی امور قائم ہوئی، جس کے تحت متعدد مذہبی اقدامات کیے گئے، یہاں تک کہ پرائمری سکولوں میں بھی بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جانے لگی۔

خواتین کا جریدہ ''کادین وی عائلی''

اس دور میں اسلام پسند خواتین کی سرگرمیاں بھی شروع ہوئیں، جن میں مغرب زدہ خواتین کے خلاف ایک حلقہ بنتا گیا۔ خواتین کی تبلیغی اور ابلاغی سرگرمیوں نے بھی زور پکڑا۔ خواتین کے اپنے رسالے اور جریدے بھی شائع ہونے لگے اور خواتین کے مسائل پر اسلام کی روشن خیال اور معتدل ہم عصر تعبیرات کی روشنی میں اظہار خیال ہونے لگا، خصوصاً جریدہ کادین وی عائلی Kadin ve Aile (خاتون اور خاندان) کے مضامین ومباحث نے نہ صرف ملک گیر شہرت ہی حاصل نہ کی، بلکہ خواتین میں اسلام کے لیے بیداری اور شعور پیدا کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ خواتین کے رسالے پاکستان میں بھی بہت نکلتے ہیں، لیکن وہ رومانی کہانیوں اور شادی طلاق کے مزے دار قصوں سے زیادہ کچھ نہیں کر پاتے۔ ترکی کے مذکورہ رسالے ''خاتون اور خاندان'' نے ایک طرف تو سیکولرازم کی جڑوں اور بنیادوں پر حملہ کیا، اور دوسری طرف ان جڑوں بنیادوں کے نیچے اسلام کی جو مضبوط تہہ صدیوں سے جمی ہوئی تھی، اس کی بحالی اور صفائی کی کوشش کی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جریدے پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

ماہنامہ ''خاتون اور خاندان'' نامی یہ جریدہ اپریل 1985ء میں شائع ہونا شروع ہوا، اور بہت جلد ترکی کی خواتین میں مقبول ہوگیا۔ رسالے کا مالک ایک مرد تھا، مگر اس کی مدیرہ اور اس کے معاون مدیر، مضمون نگاری اکثریت اور انتظامی عملہ سب خواتین پر مشتمل تھا۔ جریدے میں ایک طرف حقوق نسواں پر کافی زور ہوتا تھا تو دوسری طرف مرد اور عورت کے قدرتی اختلاف وفرق پر بھی مباحث ہوتے تھے۔ مختلف سیاسی ومعاشرتی میدانوں میں خواتین کے حقوق وفرائض اجاگر کیے گئے۔ خواتین میں اپنی صنف کی انفرادیت وعظمت کا شعور پیدا کیا گیا۔ اسلامی احکام کے مطابق خاندانی وعائلی زندگی میں اور ترکی روایات کے ماحول میں مختلف نوع کے تجربات ومشاہدات نے خواتین کی

مخصوص صلاحیتوں کی ترقی کے امکانات اجاگر کیے ہیں۔

جریدہ ''خاتون اور خاندان'' کے پہلے شمارے کے اداریے ہی نے خواتین کے حلقے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس اداریے کا ایک اقتباس (ترجمہ):

''آپ کی حیثیت ہماری نگاہ میں ان مقدس ماؤں، بچیوں، خالاؤں اور پھوپھیوں کی ہے جن کے سروں پر گلابی اسکارف ہوں، ہاتھوں میں تسبیح کے دانے ہوں، اور ہونٹوں پر ذکرو وظائف کا ورد ہو یا آپ کی حیثیت سنجیدہ، متین، ایثار پیشہ، مخلص اور محبت کرنے والی خاتون خانہ کی ہو جو اپنے شوہروں اور گھرانوں کے لیے وفادار ہو، یا آپ کی حیثیت صفائی پسند، محبت کرنے والی ہشاش بشاش، باصلاحیت اور ہنسانے والی بہنوں کی ہو۔۔۔۔۔ ہم جانتے ہیں کہ گھونسلا چڑیا ہی بناتی ہے، چڑا نہیں بناتا۔۔۔۔۔ یہ آپ ہی ہیں جو بچوں کو جنم دیتی ہیں اور پھر ان کی پرورش اور تربیت کرتی ہیں۔ یہ آپ ہی ہیں جو بچوں میں اچھی عادات واطوار کی تعلیم اور تربیت دیتی ہیں۔ یہ آپ ہی ہیں جو لوریاں دے کر بچوں کو نیند کی آغوش میں پہنچاتی ہیں اور اپنے دودھ سے ان کو توانائی اور طاقت عطا کرتی ہیں۔ یہ آپ ہی ہیں جو انہیں پاکیزہ اخلاق کی راہ پر لگاتی ہیں اور نماز کی تعلیم دیتی ہیں اور ان کو روزہ رکھواتی ہیں۔ یہ آپ ہی ہیں جن کی وجہ سے آپ کا شوہر مسرور کامیاب ہوتا ہے۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو باہر کی تمام مصیبتوں کو بھول جاتا ہے اور زندگی کی مشکلیں اور سختیاں فراموش کر دیتا ہے۔ یہ آپ ہی ہیں جس کی ذات سے اسے سکون وقرار ملتا ہے اور وہ مسرور ومطمئن بستر پر دراز ہو کر سو جاتا ہے۔''

جریدے کی خاتون مدیرہ ترک خواتین کو اپنے آئندہ اداریوں میں ان کی عائلی ذمہ داریاں یاد دلاتی ہے اور بچوں کی تعلیم وتربیت اور خاندان کے انتظام میں ان کے فرائض پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ مسلمان مردوں کو بار بار یہ حدیث نبوی ﷺ یاد دلاتی ہے: ''جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے''۔ وہ ان سیکولر طاقتوں پر تنقید کرتی ہے جو ترک خواتین کو اس کے خاندان سے کاٹ دینا چاہتی ہیں۔ اس نے اپنے ایک اداریے میں لکھا:

''اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں ایسے ادارے اور ضعیف نیت، بدنہاد، عیار اور اوباش فطرت کے حامل افراد بھی شامل ہیں جو خاتون خانہ کو اس کے پر سکون آشیانے سے باہر نکال دینا چاہتے ہیں۔ اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے اسے دور کر دینے کی ناپاک خواہش رکھتے ہیں اور اس کے اہم فطری فرائض سے اسے غافل کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ عورت فیشن اور شو بازی میں ان کی تسکین کا سامان بنے۔ اس کی بوالہوسی کی شکار ہو، تفریح کا ذریعہ بنے، کھلونا بن جائے اور سامان لذت فراہم کرے۔ قحبہ گری اور فحاشی میں مدہوش رہے۔ منشیات، سٹہ، عشوہ گری اور غیر فطری تعلقات رکھنا اس کا وطیرہ ہو جائے

۔۔۔۔ یہ چالاک اور عیار افراد خاندان کو، جو معاشرے کا سنگ بنیاد ہے، تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور افراد کے باہمی رشتہ اخوت کو تار تار کر دینا چاہتے ہیں۔''

رسالے میں انقلاب خیز اداریوں کے علاوہ وہ مثبت اور مفید مضامین بھی شائع ہوئے۔ طلاق کو اسلام میں مباح قرار دیا گیا ہے، مگر اسے سخت ناپسندیدہ بھی کہا گیا ہے۔ ترکی میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح کو روکنے کے لیے پُراثر مضامین شائع کیے اور خواہ مخواہ کی طلاقوں کو روکنے میں کافی کامیابی حاصل کی۔ اس جریدے نے خواتین کو شمعِ خانہ قرار دیا اور گھر سے باہر دفتروں میں کام کاج، ملازمت اور دوسری مصروفیتوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ رسالے میں گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین کے مسائل پر خصوصی مضامین شائع کیے۔ مثلاً نسوانی امراض کی ایک ماہر ڈاکٹر کا طویل انٹرویو شائع کیا گیا، جس میں تجربات و مشاہدات اور طبی تحقیقات سے ثابت کیا گیا کہ جب ایک عورت ملازمت کی خاطر اپنے گھر سے باہر قدم نکالتی ہے تو خاندان کے لیے اس کی اولین ذمہ داریوں پر برا اثر پڑتا ہے، اور وہ نفسیاتی اور معاشرتی الجھنوں کی پیچیدگیوں میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ ہر فیشن کی اندھی تقلید کرنے کی روایت مختلف مسائل کو جنم دیتی ہے۔ اس سے ترک خواتین اپنی ماضی کی روایات سے کٹ جاتی ہیں۔ ان میں غرور اور خود پسندی آ جاتی ہے اور مغرب کی ثقافتی عریانیت بلکہ سامراجیت کو فروغ ملتا ہے۔ فیشن کی تقلید بالآخر مذہب کی خلاف ورزی پر منتج ہوتی ہے۔ ایک حدیث نبوی ﷺ میں نہ صرف خواتین کو، بلکہ مسلمان مردوں کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ وہ ایسے لباس استعمال نہ کریں جس سے غیر مسلموں سے مشابہت پیدا ہوتی ہو۔ خواتین کے لیے مردوں جیسا لباس پہننے کی خاص ممانعت ہے، کیونکہ اس سے مرد و زن کی فطری تقسیم ختم ہو جاتی ہے۔

جریدے کی محترمہ مدیرہ اور رسالے کا ادارتی عملہ اور مضمون نگار خواتین اسلام کے ایک زندہ، فعال دین اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ دین ہونے پر یقین رکھتی ہیں۔ ایسا دین جو زندگی کے مسائل میں بڑا متوازن اور معتدل رویہ اپناتا ہے، افراط و تفریط سے بچ کر، امت وسط کی نمائندگی کرنے والا دین ہے۔ چنانچہ ماہنامہ ''خاتون اور خاندان'' بھی اسی متوازن رویے اور معتدل رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی نائب مدیرہ کہتی ہیں:

''میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں بی اے ہوں۔ میں نے اتاترک کیزلیزیسی سکول میں بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے۔ میرا خاندان ایک ماڈرن خاندان ہے، لیکن جدیدیت کا مطلب کیا ہے؟ ہم جب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ہم طلبہ نے اپنے اپنے خاندانوں کی جدیدیت کے متعلق سوالات کا سلسلہ چھیڑ دیا تھا۔ ہم آپس میں بحث کیا کرتے تھے کہ صراط مستقیم کیا ہے، فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے۔ ہم چند سہیلیوں نے ایک گروپ بنایا اور طے کیا کہ ہم مغربی طریقوں کی تقلید نہیں کریں گی۔ ہم جینز اور کھلے لباس نہیں پہنیں گی، بلکہ اس کے خلاف دوسری لڑکیوں کو بھی ترغیب دیں گی اور ہر موقع پر احتجاج کریں گی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے سروں کو بھی ڈھانکنا شروع کر دیا۔ حصول تعلیم کے بعد جب ملازمت کا مرحلہ آیا تو میں نے گھر سے باہر کسی ملازمت پر جانا پسند نہ کیا، لیکن نائب مدیرہ کی یہ

ملازمت ہر لحاظ سے میرے لیے موزوں ہے، کیونکہ اس سے مجھے اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق کام کرنے کی آزادی حاصل ہے۔''

سبیل ارسلان خانم
(ترکی کی خواتین کمیٹیوں کی صدر)

ماہنامہ ''خاتون اور خاندان'' نے خواتین کے لیے ملازمت کو ممنوع اور ناجائز قرار نہیں دیا، بلکہ ایسی ملازمتوں کی اجازت دی جس سے عقیدہ وایمان پر حرف نہ آتا ہو اور عورت کی عزت نفس، ناموس اور وقار پر آنچ نہ آتی ہو۔ چنانچہ اسلامی احکام وقوانین کی پوری پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے خاندان اور گھر سے باہر سماجی اور فلاحی کاموں اور صنعتی کارخانوں میں خواتین کی مشغولیت کو جائز قرار دیا۔ یوم میلاد النبیﷺ کے جلسوں، تعزیتی جلسوں، قرآنی دروس، مساجد میں حاضری، مذہبی تہواروں کی تقریبات، نکاح، ولیمہ وغیرہ اور دوسرے مذہبی پروگراموں میں شرکت سے خواتین کی انتظامی صلاحیتوں میں نکھار آسکتا ہے اور اس طرح کی سرگرمیوں سے خیالات کے تبادلے کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ رسالے نے فن خطاطی میں خواتین کی حوصلہ افزائی کی اور اس کے انعامی مقابلے بھی منعقد کرائے۔

خواتین کے انفرادی اور معاشرتی حقوق کی وکالت بھی کی گئی۔ اسلام نے خواتین کو جو حقوق وتحفظات دے رکھے ہیں، ان کی پوری حمایت کی گئی۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے بعد اسے اسکارف اوڑھنے پر بڑا اختلاف بلکہ تصادم رہا ہے۔ حمایت ومخالفت کی گرم بازاری نے پریس اور الیکٹرونکس میڈیا میں اس سلسلے کو بہت نمایاں اور اہم بنا دیا ہے۔ مذکورہ جریدے، خاتون وخاندان نے اسکارف کی حمایت میں پے در پے مدلل مضامین شائع کیے۔ خاص طور پر اسکولوں اور یونیورسٹی میں طالبات کے حجاب پر خصوصی زور دیا۔ اس مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر مشہور خواتین اور سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو شائع کیے۔ ایک خاتون لیڈر نے اسکارف کے استعمال کو پسندیدہ قرار نہیں دیا، اس کے باوجود اسے ایک خاتون کا انفرادی حق تسلیم کیا۔ اس کی مرضی ہے کہ وہ اسکارف اوڑھے یا نہ اوڑھے۔ جو طالبات اور خواتین اپنا سر ڈھانپنے کے لیے اسکارف کا اس لیے استعمال کرتی ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے، وہ بھی اپنے انفرادی حق ہی کا استعمال کرتی ہیں اور ترکی کے دستور نے بھی مذہبی آزادی ہر شہری کو دے رکھی ہے، اور وہ اس آزادی اور حق کو استعمال کرنے کا بجا طور پر مجاز ہے۔ ملک کا شہری ہونے اور اپنے تمام حقوق استعمال کرنے کا شعور ترک خواتین میں اس رسالے ہی نے پیدا کیا۔

رسالے میں عالم اسلام کی معروف خواتین پر معلومات افروز مضامین بھی شائع ہوئے۔ سری لنکا، پاکستان اور صومالیہ کی نمایاں خواتین سے متعارف کرایا گیا۔ افغانستان کی مہاجر خواتین سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔ سرینام کی ایک نومسلم خاتون سے انٹرویو لیا گیا۔ خاتون نے بتایا کہ سرینام میں مسلم بچوں کا استحصال کیا جاتا ہے، ان سے جبری

محنت لی جاتی ہے۔ اس کے خلاف پوری دنیا کے مسلمانوں کو صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیے۔ اسی طرح ایک انٹرویو ایران کی رکن پارلیمنٹ سے لیا گیا، جس میں ایران میں مسلم خواتین کو حاصل حقوق ومراعات سے قارئین کو متعارف کرایا گیا۔ ملائیشیا کی خواتین کے حالات پر مضامین شائع کیے گئے کہ وہ کس طرح حکومت کی مداخلت کے بغیر اسکارف یا حجاب کی کوئی اور صورت استعمال کرنے پر آزاد ہیں۔

رسالے نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ مختلف ملکوں اور قوموں کی خواتین کو اسلام ہی کے ذریعے متحد کیا جا سکتا ہے۔ پوری دنیا کی مسلمان خواتین کو دین کے پرچم تلے لا کر ان میں تنظیم، یک جہتی اور قوت و وحدت پیدا کی جا سکتی ہے۔ مغرب کی غیر مسلم خواتین کی قدر و قیمت برابر گھٹ رہی ہے۔ اب خود انہیں بھی محسوس ہونے لگا کہ ان کی تذلیل کی جا رہی ہے۔ چنانچہ وہاں آزادیٔ نسواں کی تحریکیں دم توڑ رہی ہیں۔ ترکی میں ایسی جتنی بھی تحریکیں ماضی میں وقتاً فوقتاً ابھرتی رہی ہیں، وہ ختم ہو رہی ہیں، کیونکہ اب تک انہیں محض مغربی عورت سمجھا جا رہا ہے۔ اب کچھ عرصے سے انہیں مسلمان عورت سمجھا جانے لگا ہے۔ رسالے نے غیر مسلم خواتین کے انٹرویو بھی شائع کیے تاکہ ان کی روشنی میں دوسری غیر مسلم خواتین کو بھی اسلام کی دعوت دی جا سکے۔

1972ء میں ''' کی تشکیل اور اس کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکان کے بیانات اور عوامی تقریروں نے اسلام پسند خواتین کو ذہنی و فکری استحکام عطا کیا، کیونکہ اس پارٹی کی تشکیل اسلامی اصول واقدار کے نفاذ کے لیے ہوئی تھی۔ پروفیسر اربکان چونکہ مغرب کے مخالف اور غیر اسلامی افکار اور اداروں کے ناقد تھے، اس لیے انہوں نے مغرب کے عائلی نظام، آزادیٔ نسواں اور حقوق نسواں کی انجمنوں کو یکسر مسترد کر دیا۔ 1973ء تا 1977ء کے درمیانی عرصے میں پروفیسر صاحب نے تین مخلوط حکومتوں میں شامل ہو کر مغربی افکار واقدار کے خلاف مہم چلائی۔ خواتین کے مغربی لباس اور طرزِ معاشرت پر سخت تنقید کی۔ منی اسکرٹ کے استعمال کو خلاف تہذیب قرار دیا۔ قحبہ گری کے انسداد کے لیے جدوجہد کی۔ استنبول کے بڑے چوک سے ایک عریاں نسوانی مجسمے کو اکھاڑ پھینکا گیا اور اسے قابل شرم مجسمہ قرار دیا۔ ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں فحش اور عریاں پروگراموں کی شمولیت کے خلاف آواز اٹھائی۔ غیر ملکی ثقافت پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔ نائٹ کلبوں اور شبانہ تفریحی تقریبات کو قابل اعتراض قرار دیا، کیونکہ ان میں نوجوانوں کو اخلاق باختگی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شراب نوشی اور مرد وزن کی مخلوط پارٹیاں بھی خاندانی نظام کی روایات واقدار کو تباہ کرتی ہیں، اس لیے ان پر بھی تنقید کی گئی۔

''ملی سلامت پارٹی'' پر پابندی لگنے کے بعد 1983ء میں پروفیسر نجم الدین اربکان نے ''اسلامی رفاہ پارٹی'' کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت کی تشکیل کے ذریعے تحریک اسلامی کے منصوبوں، پروگراموں اور مقاصد کی تکمیل کا آغاز کیا تو خواتین پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ دعوت واصلاح کے تمام پروگراموں میں انہیں شامل کیا گیا۔ پورے ملک میں ان کی شاخیں قائم کر کے خدمت دین اور اقامت اسلام کے لیے انہیں منظم کیا گیا۔ ترکی میں احیائے اسلام کی جدید تحریک چلانے اور اسے کامیابی سے ہم کنار کرنے میں رفاہ پارٹی کی شاندار جدوجہد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فی الوقت پورے ملک میں مصطفیٰ کمال اور اس کے جانشینوں کی پھیلائی ہوئی گمراہی کے خلاف

اسلامی تہذیب، خاندانی نظام اور مسلمان خواتین کے اسلامی کردار کے احیاء میں ان کا کردار بڑا اہم اور فیصلہ کن ثابت ہوا ہے۔

خاص طور پر رفاہ پارٹی کی قائم کردہ خواتین کمیٹیوں نے ترکی میں تجدید اسلام کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اتنے سلیقے، نظم و نسق اور مہارت و حکمت کے ساتھ خواتین میں اسلامی بیداری پیدا کرنے کا کام کیا کہ پورے ملک میں ان کا وزن محسوس کیا گیا۔ مارچ 1994ء کے بلدیاتی انتخابات میں خواتین کمیٹیوں کا کردار بہت نمایاں رہا۔ انہوں نے تمام شہروں میں رفاہ پارٹی کے حق میں جلوس اور جلسے منعقد کیے۔ باحجاب ہزاروں خواتین کے نہایت منظم جلوسوں کو دیکھ کر عالمی ذرائع ابلاغ اور ان کی ایجنسیاں بوکھلا اٹھیں اور انہیں ترکی میں ''اسلامی انقلاب'' کی دھمک سنائی دینے لگی۔ خواتین کمیٹیوں کی صدر سیبل ارسلان خانم ایڈووکیٹ سے کویت کے معروف عربی ہفت روزہ ''المجتمع'' نے ایک انٹرویو لیا جو بعدازاں ماہنامہ امپیکٹ (انگلستان) میں انگریزی میں چھپ تھا۔ انگریزی سے اردو میں اس انٹرویو کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

سوال: وہ کون سے اہم منصوبے اور پروگرام ہیں جو یہ کمیٹیاں چلا رہی ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کے بڑے مراکز کون کون سے ہیں؟

جواب: تعلیم، تربیت، ثقافت، صحت اور سماجی بہبود کے میدان میں یہ خواتین کمیٹیاں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان سرگرمیوں اور خدمات کے ذریعے ہی ہم ترکی میں عام خواتین تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں، اور ان کے سامنے اسلام کا نظام حق و عدل واضح کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں سمجھاتی ہیں کہ اسلامی نظام کا قیام ناگزیر ہے، کیونکہ جس معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس کا تحفظ اور اس کے روشن مستقبل کی ضمانت یہی نظام دے سکتا ہے۔ ہم خواتین سے ساتھ گھل مل کر ''عورت، بچہ اور خاندان'' کی مثلث میں ہم آہنگ ہو کر اپنا رفاہی اور رفلاحی پروگرام چلاتے ہیں۔ اس وقت اکثر شہروں اور علاقوں میں ہم نے شاخیں قائم کر دی ہیں، مگر اب تک سب سے زیادہ کامیابی ہمیں استنبول میں ہوئی ہے جو ترکی کا سب سے بڑا شہر ہے اور جہاں مختلف قومیتوں اور طبقات کے لوگ آباد ہیں۔ اس شہر کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ مختلف قومیتوں کی مشترکہ آماج گاہ ہونے کی وجہ سے بھی مسلمان اپنی اصل سے دور ہوتے چلے گئے، مگر رفاہ پارٹی نے انہیں ان کی اصل یاد دلائی اور اسلام کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی۔ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ خواتین میں اسلام کی طرف دوبارہ آنے کا شعور پختہ ہو گیا ہے۔

سوال: وہ کون سے معاشرتی و اجتماعی پروگرام ہیں جو آپ ترکی معاشرے میں نافذ کرنا چاہتی ہیں؟

جواب: ہم ترکی میں جن تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں، ان میں سب سے اہم کام ترکی عقل و دانش پر سے مغربی فکر و تہذیب کو مٹا کر اسے اس کی اصل بنیاد اسلام کی طرف لانا ہے جو عدل کے نظام پر استوار ہے۔

سوال: آپ ترکی میں جس قسم کا سیاسی کردار ادا کر رہی ہیں؟ اس کی فطرت اور اس کا مزاج کیا ہے، جب کہ ترکی خواتین کا تعلیمی معیار بہت بلند ہے؟

جواب: سب سے پہلے میں یہ صراحت کرنا چاہتی ہوں کہ ترک عورت آزادی کے بحران میں مبتلا ہے۔ تعلیمی

معیار بلند ہونے کے، باوجود اس کے ساتھ کنیز کا معاملہ کیا جاتا ہے، اگرچہ یہ کنیز جدید شکل وصورت کی ہے۔ تجارت کی افزائش کے لیے اسے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ آزادی کے نام پر عورت کو عریاں کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ آج اس کی ردائے حیا تار تار ہے۔ ہماری اولین ترجیح ہوگی کہ ہم اسے اس کی حقیقی نسوانی فطرت اور وجود کی طرف واپس لائیں اور اسے بتائیں کہ اللہ نے اس کی تخلیق بہترین ساخت پر کی ہے۔ لیکن اگر مسلمان عورت نے مغرب کی پیروی جاری رکھی تو اس کا وجود مٹ جائے گا، کیونکہ مغرب نے اسے اس کے وجود، اس کے علم، اس کی ثقافت اور اس کے قلب وروح سے عاری کر کے اسے گھٹیا سامان تجارت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی طرح ہم خواتین میں خود اعتمادی کی روح پھونکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ اپنے دین پر ایمان واعتماد کے ذریعے خود اعتمادی پیدا کریں اور پرعزم اور صاحب یقین بنیں اور شکوک وشبہات سے مغلوب ہونے نہ جائیں۔ اسلام پر ایمان وایقان کی دولت سے مالا مال ہوں۔ مغرب کی دل فریبی اور اس کی مصنوعی چمک دمک سے مرعوب نہ ہوں۔ مغرب کی فتنہ سامانیوں کے سامنے شکست خوردہ نہ بنیں۔ خواتین کمیٹیوں کے ذریعے ترکی معاشرت میں یہی فکر رائج کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مسلمان عورت کا اصل تشخص بحال ہو اور اس کی حقیقی شناخت مستحکم ہو سکے۔

سوال: ترکی میں پچاس سال سے رائج سیکولرازم کے ترک خواتین پر کیا اثرات وارد ہوئے ہیں، اور آپ ان کی اسلامی شناخت کی بحالی کے لیے کیا اور کیسی جدوجہد کر رہی ہیں؟

جواب: سیکولر عناصر نے ترکی کو یورپ کا چربہ بنا دیا ہے، اور استنبول اور لندن وپیرس میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے کہ یہاں مسجدیں ہیں اور ان سے بلند ہونے والی اذانیں جو مسلمانوں کی اصل شناخت کا پتا دیتی ہیں، حالانکہ ان بے دینوں نے ترکی اور ترکوں کے اندر سے اسلامی تشخص کو کھرچ کھرچ کر نکال دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، لیکن اب ترک عورت اپنی اصل شناخت کو بحال کرنے میں مصروف ہوگئی ہے، اور ترک عورت کی اپنی اصل شناخت کو بحال کرنے کی یہ جدوجہد مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔ سب سے پہلے اسلام کی صحیح معرفت اور علم کا مسئلہ ہے۔ پھر اسلام سے محبت کرنے اور اس کی اصل اقدار واصول اپنانے کا مسئلہ ہے۔ پھر اس کی خاطر جہاد کا مرحلہ آتا ہے۔ ہم ابھی دعوت کے مرحلے سے گزر رہے ہیں اور دعوت کے ذریعے خواتین کے دلوں میں اس کی محبت وعظمت کا نقش قائم کر رہے ہیں۔

سوال: بلاشبہ سیاسی ومعاشرتی مصروفیات وقت اور زندگی کا بڑا حصہ لے لیتی ہیں۔ ایسی صورت میں عورت کی ازدواجی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ ان دوہری ذمہ داریوں میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں؟

جواب: آپ عالم اسلام کے جغرافیے پر نظر دوڑائیں۔ ہر جگہ مسلمان عورت کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔ ماں کی حیثیت میں، بیوی کے روپ میں، بہن اور بیٹی کی شکل میں۔ ہر جگہ اس کا چہرہ دھواں دھواں اور آنکھیں اشک بار ہیں۔ فلسطین کی مائیں، بوسنیا کی دوشیزائیں، افغانستان کی بیٹیاں، آذربائیجان کی بہنیں، سب دل فگار اور زخم خوردہ ہیں۔ ان میں سے کتنی ہیں جو اپنے شوہروں سے محروم ہوگئی ہیں۔ کتنی ہیں جنہوں نے اپنے جگر گوشوں کو میدان شہادت کی راہ دکھائی ہے، کتنی ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ یہ المناک صورتِ حال

ہمارے لیے شرم اور غیرت کی بات ہوگی کہ ہم اپنے نصب العین کی خاطر اپنے سکون اور راحت کو خیر باد نہ کہیں۔ اپنا وقت اور اپنی دولت کی قربانی نہ دیں، اور اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ پُر لطف زندگی میں مست رہیں، جب کہ رسول کریم ﷺ نے مشرق و مغرب، تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ قرار دیا ہے۔ ہمیں یہ شرف حاصل ہے کہ ہم آپ ﷺ کے امتی ہیں اور اس شرف کا تقاضا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے دست و بازو بنیں۔

ایک طرف حجاب، دوسری طرف بندوق

ترکی کی ''معتوب'' رکن پارلیمنٹ مروی کی وچی سے انٹرویو

مروی کاوچی ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کی رکن تھیں۔ ان کی کہانی سے دنیا ہل گئی تھی۔ وہ 1999ء میں اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی اور اپنے حجاب کی وجہ سے زبردست اختلافی شخصیت بن گئی۔ 2 مئی 1999ء کو انہیں اسمبلی میں حلف اٹھانے سے اس لیے روک دیا گیا کہ وہ اپنا سر اسکارف سے ڈھکے ہوئے تھی۔ انہیں خودکش بمبار اور ان کی پارٹی ''فضیلت'' کو ایسی خوں آشام بلا کہا گیا جو ترکی کی جمہوری روایات پر حملہ آور ہے۔ انہیں نہ صرف اسمبلی کی رکنیت کا حلف اٹھانے نہیں دیا گیا، بلکہ ان کی ترک شہریت بھی منسوخ کر دی گئی۔ پھر وہ شمالی امریکا چلی گئی اور وہاں مختلف موضوعات پر لیکچر دیے۔ ٹورنٹو (کینیڈا) کے ٹی وی شو ''مفادات عربیہ'' کی شریک میزبان نے ان سے انٹرویو کیا، جو بعد ازاں ''امپیکٹ'' لندن میں چھپا۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ حاضر ہے۔

س: اسمبلی میں جب پہلی مرتبہ آپ حجاب میں تشریف لائیں تو آپ کے ذہن میں کیا تھا؟

ج: جمہوریہ کی 76 سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ حجاب پہننے والی کوئی خاتون اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھی (نسرین سینلی بن تھیں، مگر انہوں نے مجبور ہو کر حجاب اتار دیا تھا)۔ چونکہ میں پہلی ایسی خاتون تھی، اس لیے معاملہ اور بھی سخت تھا، حالانکہ میں ترکی کی ان 70 فیصد خواتین کی نمائندہ تھی، جو حجاب پہنتی ہیں۔ لیکن اشرافیہ کی ایک چھوٹی سی اقلیت موجود ہے جو طویل عرصے سے ملک پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ اتنے مہذب، وسیع الظرف اور جمہوری نہیں ہیں کہ ان لوگوں کا احترام کریں، جو ان کی طرح کے کپڑے نہیں پہنتے یا ان کی طرح نہیں سوچتے۔ ان لوگوں سے مخالفت کی توقع تو تھی، مگر یہ گمان نہیں تھا کہ یہ اس قدر غیر مہذب اور ظالم ہوں گے۔

س: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ بحیثیت خاتون بھی آپ کے عمل نے اس سلوک میں کوئی رول ادا کیا، جو ان لامذہب لوگوں نے آپ کے ساتھ روا رکھا؟

ج: جی ہاں، میرا خیال ہے کہ نہ صرف مذہبی معاملے کی وجہ سے مجھے الگ تھلگ کیا گیا، بلکہ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ میں ایک عورت ہوں۔ یہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ نام نہاد لامذہب، نام نہاد جمہوری خواتین ایک ساتھی خاتون کی مخالفت کر رہی تھیں۔ ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ امریکا میں برپا ہونے والی شہری حقوق کی تحریک کے مماثل ہے۔ ترکی کی وہ خواتین جو حجاب پہنتی اور کام بھی کرتی ہیں، ہر چند کہ وہ اکثریت میں ہیں، لیکن ان کی حیثیت

دراصل ترکی میں ''سیاہ فام'' لوگوں کی سی ہے۔

س: آپ کے خیال میں وہ اہم معاملات کیا ہیں، جن کی وجہ سے ترکی کے لامذہب (سیکولر) لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے؟

ج: اس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ نام نہاد لا مذہب روایات ہیں جو اتاترک کے زمانے سے اختیار کی گئی ہیں۔ اگرچہ بعد میں ان میں بہت سی تبدیلیاں بھی آچکی ہیں، لیکن ان روایات کی وجہ سے بنیادی انسانی حقوق اور آزادیٔ مذہب کے نئے مفہوم متعین ہو گئے ہیں۔ ترکی کے دستور کے مطابق مذہب ریاست کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا، لیکن ریاست کو مذہب کے ہر معاملے میں مداخلت کا اختیار حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی اختیار ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ بچوں کو قرآن کیسے پڑھایا جائے۔ مثال کے طور پر گزشتہ سال پارلیمنٹ نے ایک قانون بنایا ہے کہ بارہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو گھر میں یا باہر کہیں بھی قرآن پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی، اور یہ کہ صرف موسم گرما کی تعطیلات میں قرآن پڑھایا جا سکتا ہے، وہ بھی ہفتے میں صرف تین بار اور اس کا دورانیہ کسی طرح بھی تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ قانون سازوں کا حفظِ قرآن کے مدارس بند کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ قرآن کی تعلیم کو ابتدا ہی میں روک دیا جائے۔ اس قانون کا نفاذ پوری طاقت سے کیا جا رہا ہے۔

دوسرا عامل اسلام کے بارے میں کچھ لوگوں کے دماغوں کا یہ خبط ہے کہ ہم بھی سعودی عرب یا ایران کی طرح ہونے والے ہیں، اور یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ دو گروہوں میں تقسیم ہو رہا ہے، جو کسی ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہونے سے منکر ہیں۔

ترکی میں پورا نظام، پورا معاشرہ ہی بدعنوان ہے۔ میں ان لوگوں کے نام نہیں لے سکتی جو بطور خاص اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں، مگر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس میں سرکاری افسر، پارلیمنٹ کے ارکان، فوجی افسر اور کم از کم پانچ تاجر، جو ترکی میں اخباری گروپوں کے مالکان ہیں، شامل ہیں۔ جب اشرافیہ کے اس چھوٹے سے ٹولے نے یہ محسوس کیا کہ ان کے اس غیر مہذب اور بدعنوان نظام کو خطرہ ہے، جس میں ٹیکس دہندگان کا پیسہ بڑی آسانی سے ان کی جیبوں میں آجاتا ہے تو انہوں نے مزاحمت کا فیصلہ کیا۔

جو لوگ اسلام میں حجاب کی مخالفت کرتے ہیں، ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ کروڑوں کے غبن میں ملوث ہیں۔ برآمدی معاملات میں حکومت کو دھوکا دیتے ہیں اور یوں ترک عوام کا پیسہ بٹور کر امریکا اور سوئٹزر لینڈ میں جمع کرتے ہیں۔ اگر کوئی سرکاری اہل کار اپنے افسر کی نگاہوں میں معتبر ہونا چاہتا ہے، ترقی چاہتا ہے تو اسلام کو برا کہنے لگتا ہے۔ ایسے ہی ایک گروہ کی طرف سے بطور رکن پارلیمنٹ میں مجھے ہدف بنایا گیا، زبردستی روکا گیا، کیونکہ حجاب اسلامی تہذیب اور انسانی شائستگی کا نشان ہے اور یہی ان کے لیے خطرہ ہے۔

س: آپ امریکا چلی آئیں۔ وہاں آپ کا کیسا استقبال ہوا؟

ج: میں اب محض اپنی نمائندہ نہیں ہوں۔ بلکہ لوگ مجھے ترکی کی 25 سال سے کچلی ہوئی ان خواتین کی نمائندہ سمجھتے ہیں، جو حجاب پہنتی ہیں۔ وہ مذہب اور اپنے مستقبل یا پیشے میں سے ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہیں۔ ان

خواتین کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ میں بطور رکن پارلیمنٹ ہر اس جگہ ان کی آواز پہنچانا چاہتی ہوں، جہاں تک ممکن ہو۔

س: کیا کسی مرحلے پر لامذہب اشرافیہ اور اسلامی لوگوں کے مابین کوئی مفاہمت ہوسکتی ہے؟

ج: اس سوال کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔ ہماری شدید خواہش ہے کہ ہم ان کے ساتھ کسی جگہ مل کر بیٹھیں اور اس مسئلے پر کھل کر گفتگو کریں۔

س: کیا وہ بھی ایسا چاہتے ہیں؟

ج: یہ سوال ان سے کریں۔ ہم تو مظلوم لوگ ہیں۔ ہمیں برسوں سے ذلیل وخوار کیا جارہا ہے۔ درحقیقت یہ طے کرنا تو ان کا کام ہے کہ کیا واقعی وہ کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں، مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں اور کیا ترکی کو بہتر اور پر امن ملک بنانا چاہتے ہیں۔ ہم تو عثمانیوں کے وارث ہیں۔ جو صدیوں تک پرامن طور پر رہتے رہے ہیں۔

س: میں اکثر یہ دلیل سنتی ہوں کہ جب آپ حجاب پہن کر عام مقامات پر جاتی ہیں تو آپ غیر جانب دار نہیں رہ سکتیں؟

ج: میں پوچھتی ہوں کہ جب کوئی حجاب نہیں پہنتا، اسلام سے نفرت کرتا ہے، اور جو لوگ اسکارف استعمال کرتے ہیں، ان کو برا بھلا کہتا ہے، تو کیا وہ غیر جانب دار ہوتا ہے؟

س: جو کچھ آپ کرنا چاہتی ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کیسے ہوتی ہے؟

ج: میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ میں اپنے خیالات دوسروں پر نہیں تھوپتی۔ میں نے خواتین کو حجاب لینے پر مجبور نہیں کیا۔ میں نے ان کی طرح دوسروں کو اپنے انداز میں سوچنے پر مجبور نہیں کیا۔ میں کسی بینک غبن میں ملوث نہیں ہوں۔ میں نے تو مذہب کے نقطۂ نظر سے کوئی غلط کام کیا ہے اور نہ ترکی کے دستور کے خلاف۔ یہ تو تاریخ ہے کہ سچ بولنے والا ہمیشہ تکلیف اٹھاتا ہے۔ میں صرف سچ کی علم بردار ہوں اور ہمارا سچ عالمی ہے۔

سلطان عبدالحمید کی خفیہ ڈائری

بالآخر عثمانی سلطان کی گم شدہ ڈائری مل گئی ہے، جس سے وہ مؤرخ کی نظر میں تمام الزامات سے بری ہو گئے ہیں جو ان پر عائد کیے گئے تھے۔ یہ ڈائری خود نوشت ہے، اور اس کی تلخیص پیش کرنے سے پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان عبدالحمید کون ہیں اور عثمانی سلاطین میں ان کی کیا اہمیت ہے۔

سلطان عبدالحمید ثانی غازی (1842ء۔1918ء) کے والد سلطان عبدالمجید (1823ء۔1861ء) وہ پہلے عثمانی سلطان تھے جو فرانسیسی زبان بول سکتے تھے۔ انہوں نے 1849ء میں ہنگری کو آسٹریا کے حوالے سے انکار کر کے عالمگیر شہرت حاصل کی تھی۔ سلطان عبدالمجید کو ''تنظیمات'' کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

سلطان عبدالحمید نے اپنی آنکھوں سے والد اور ان کے بعد چچا سلطان عبدالعزیز (1830ء۔1876ء) کو مغربی اصلاحات ''تنظیمات'' اور مغربی افکار و اصلاحات کو نافذ کرتے دیکھا۔ اس طرح طفولیت اور جوانی میں انہوں نے ترکی پر یورپی طاقتوں کی حریصانہ نگاہوں اور روس کی للچائی ہوئی نظروں کو تاڑ لیا تھا اور یہ محسوس کر لیا تھا کہ

مغربی فکر وتہذیب عثمانی سلطنت کو متزلزل کیسے دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیمات کے متعلق ان کا رویہ خاصا محتاط اور دوراندیشی پر مبنی تھا۔

سلطان نے مغربی طاقتوں کی مداخلت سے بچنے کے لیے وزیراعظم مدحت پاشا کے مشورے سے استنبول میں ایک بین الاقوامی مجلس طلب کی اور 23 دسمبر 1876ء کو افتتاح کے موقع پر ہی ایک شاہی فرمان (خط ہمایوں) جاری کیا جس کی رو سے پہلے دستور اساسی کا نفاذ ہوا۔ اس کے تحت دو ایوانی پارلیمنٹ قائم ہوئی۔ پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس مشہور لیڈر احمد وفیق پاشا کی صدارت میں 17 مارچ 1877ء کو طلب کیا گیا اور پھر تیس سال کی مدت کے لیے ملتوی ہو گیا۔ سلطان کے دور میں دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ ایک روس کے خلاف اور دوسری یونان کے خلاف۔ یورپی طاقتوں نے دونوں جنگوں کے موقع پر سلطان کے خلاف کارروائی کی، جس کے باعث "نوجوان ترکوں" کی بغاوت جلد کامیاب ہو گئی۔ جولائی 1908ء میں میجر نیازی بے نے مناستر پر قبضہ کر لیا اور اسی مہینے میں میجر انور بے نے سلونیکا میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان دب گئے اور نتیجتاً دستور ساز پارلیمنٹ کو 24 جولائی کو پھر بحال کر دیا۔ 13 اپریل 1909ء کو چند فوجی دستوں نے مذہب کے نام پر مشتعل ہو کر اچانک سر اٹھایا۔ لیکن مقدونیہ کی تیسری فوج نے وہ آئین بھی واپس دلایا اور وہ نوجوان ترک بھی واپس آ گئے جو ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ اس حادثے میں انجمن اتحاد وترقی کے فوجیوں کا قتل عام ہوا اور عوام میں سخت بے چینی پھیلی۔ یورپی طاقتوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سلطان کے خلاف شورش برپا کر دی۔ اتحاد وترقی کی فوجیں سلونیکا سے استنبول میں داخل ہو گئیں اور سلطان پر مندرجہ ذیل الزامات لگا کر انہیں معزول کر دیا:

1۔ 13 اپریل 1909ء کے قومی حادثے کی سازش کی اور فوجیوں کے قتلِ عام میں حصہ لیا۔

2۔ سلطان نے مذہبی مصاحف اور فقہ کی کتابیں نذر آتش کیں۔

3۔ سلطان خوں ریزی اور ظلم وستم کے مجرم ہیں اور انہوں نے پوری سلطنت میں بدامنی پھیلائی ہے۔

ان الزامات کو بنیاد بنا کر سلطان کو سلونیکا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ جب 1912ء میں جنگ بلقان چھڑی تو انہیں باسفورس کے کنارے قصر بیلر بی میں منتقل کر دیا گیا، جہاں 10 فروری 1918ء کو 75 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا اور اپنے دادا محمود عثمانی کے مقبرے میں مدفون ہوئے۔

سلطان عبدالحمید کو داخلی محاذ پر دو اہم معاملات سے نمٹنا پڑا۔ ایک تو بابِ عالی کا اثر ونفوذ اور دوسرے ترک نوجوانوں کی سازشیں۔ اگرچہ سابقہ سلاطین کے اختیارات بھی لامحدود تھے لیکن وہ لوگ حکومت کے معاملات میں بہت کم دخل دیتے تھے۔ انہوں نے حکومت کے تمام امور اپنے وزیراعظم (صدر اعظم) کے حوالے کر رکھے تھے۔ حکومت وزیراعظم کے "بابِ عالی" کا دوسرا نام تھا۔ اس کے مقابلے میں سلطان عبدالحمید ثانی نے امور مملکت پر مکمل گرفت رکھنے کے لیے بابِ عالی کی بجائے قصر شاہی اور "دربار سلطانی" کو زیادہ اہمیت دی۔ ترکی میں اس نئے ذریعے کا نام "مابین" تھا۔ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں درمیان (یعنی جو ڈیوڑھی بابِ عالی اور رہائشی سروں کے درمیان ہو)۔ مابین ایک الگ عمارت تھی جس میں درخواستیں وصول کرنے والے اہل کاروں کے دفاتر تھے۔

''ترک نوجوان'' بنیادی طور پر مغربی ممالک کے تعلیم یافتہ اور وہاں کے فکر و تہذیب کے خوشہ چین تھے۔ وہ مغربی طرز جمہوریت کے داعی اور اسی میں ملک کی فلاح و بہبود کی ضمانت سمجھتے تھے۔ ترک نوجوانوں کی انجمن 1860ء میں خفیہ طور پر قائم ہوئی تھی۔ اسی لیے سلطان کی نظریں اس کی تاک میں رہتی تھیں۔ انجمن اتحاد و ترقی، نوجوان ترک اور دیگر ناموں سے یہ باغیانہ عناصر ترکی میں یورپی طاقتوں کی شاطرانہ سیاست کا مہرہ بنے ہوئے تھے۔ انہی لوگوں نے سلطان عبدالعزیز کو معزول کیا تھا اور ان کی جگہ سلطان مراد پنجم کو تخت پر بٹھایا تھا۔ مراد کی عمر اس وقت 36 سال تھی اور یورپ کے سرکاری حلقوں سے ان کے مراسم تھے۔ انگلستان کے ولی عہد کے وہ پکے دوست تھے اور اسی کی وساطت سے سلطان مراد کے تعلقات یہودیوں کی تنظیم فری میسن سے قائم ہوئے تھے۔ ترک نوجوانوں کی تنظیم سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔

نوجوان ترکوں کو قوی امید تھی کہ سلطان مراد کے عہد میں ترکی میں یورپ کا عمل دخل بڑھے گا، کیونکہ نوجوانوں کی تعلیم، تہذیب اور فکر و اسلوب زندگی پر مغرب کی گہری چھاپ تھی۔ اسی لیے انہوں نے سلطان عبدالعزیز کو حکومت سے ہٹایا تھا اور ایک سازش کے تحت انہیں قتل کر دیا گیا تھا، مگر سلطان مراد پر ان تمام حالات اور سازشوں کے اثر سے جنون کا دورہ پڑا اور 93 دن کی بادشاہت کے بعد اسے معزول کر کے سلطان عبدالحمید کو خلیفہ بنایا گیا، لیکن سلطان عبدالحمید نے برسر اقتدار ہونے کے بعد ان عناصر کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سلطان کی خفیہ ڈائری

اس خفیہ ڈائری کا اصل نام ''المذکرات'' ہے۔ سلطان نے قصر بیلر بی کے ایام اسیری میں قلم بند کی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے دور کے سیاسی و تہذیبی حالات بیان کیے ہیں۔ اس خودنوشت ڈائری میں نوجوان ترکوں کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں سے خیانت و بدعہدی کا تذکرہ بھی ہے اور یورپی طاقتوں کی شاطرانہ سیاست کی پردہ دری بھی، سلطان کے خلاف ہونے والی سازشوں کا بیان بھی ہے اور انجمن اتحاد و ترقی کے اراکین کے مظالم کی تفصیلات بھی۔ یہ ڈائری سلطان کی دینی حمیت و غیرت، ملکی امور سے گہری دلچسپی اور یہودیوں اور یورپی طاقتوں سے سخت نفرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ سلطان پر مختلف نوعیت کے جو الزامات مغربی مصنفین نے عائد کیے ہیں، اور انہیں جس طرح وطن دشمن، رجعت پسند، علوم کا دشمن، ادب، روشن خیالی اور ترقی پسندی سے عناد رکھنے والا سلطان ثابت کرنے کی سازش کی جاتی رہی ہے، اس کی قلعی بھی یہ ڈائری کھول دیتی ہے۔

ڈائری کے مترجم نے ترجمے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا: ''میں نے ان یادداشتوں کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا، تاکہ مسلم اور بالخصوص عرب محققین و مؤرخین کے سامنے ان واقعات و حوادث کے سلسلے میں، جن میں سلطان عبدالحمید کی ذات مرکز و محور رہی ہے، سلطان کا نقطۂ نظر بھی سامنے آ جائے۔ اس لیے کہ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کے سامنے سلطان کے حریف عناصر ہی کے خیالات و آراء آئی ہیں اور اہل یورپ نے انہی کی تائید و حمایت کی ہے، بلکہ مغربی مفکرین و مؤرخین نے تو بہت آگے بڑھ کر سلطان پر تنقید کرنے میں بڑی مبالغہ آرائی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلطان کی ذاتی یادداشتیں دنیا کے سامنے پیش کر کے میں نے سلطان

کی شخصیت اور ان کے عہد کی تصویر مکمل کر دی ہے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی تاریخی مسئلے میں فریقین کے ماخذ کی موجودگی سے تاریخ نگاری میں انصاف و دیانت کا قوی امکان رہتا ہے۔''

سلطان کی اسلامی حمیت

اپنی ڈائری میں سلطان عبدالحمید خان نے سلطنت عثمانیہ اور دشمنان اسلام کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں کفر کی طاقتیں ہمیشہ ایکا کر لیتی ہیں۔ سلطان لکھتے ہیں: ''جب میں تخت حکومت پر فروکش ہوا تو تمام حقائق سے واقف نہ تھا۔ ان کی پہچان دھیرے دھیرے تجربے سے ہوئی اور روسی جنگوں کے دوران بہت سے امور سے پردہ ہٹا۔ ایک اور حقیقت بھی سامنے آئی کہ ہم دنیا میں تنہا کھڑے ہیں۔ ہمیں دشمنوں کا سامنا ہے اور ہمارا دوست کوئی نہیں ہے۔ صلیب ہر وقت متحد ہو سکتی ہے، لیکن ہلال ہمیشہ تنہا رہے گا۔ ہر طاقت دولت عثمانیہ سے فائدہ اٹھانے کی خواہش مند ہے اور ہم سے دوستی کا دم بھرتی ہے، لیکن جب اس کی امید نہیں آتی تو ہم سے دشمنی پر آمادہ ہو جاتی ہے، اسی لیے میری سیاست کی بنیاد یہ تھی کہ دشمن کا مقابلہ اسی کے ہتھیار سے کرو۔''

''۔۔۔۔جس سال میں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی، انگریز ہندوستان کی سیاست پر قابض ہوئے اور بحرِ ہند کے راستے محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے اپنی پوری توانائی صرف کر دی۔ دوسری طرف وہ چین اور وسط ایشیا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ روس نے بھی ان برسوں میں وسط ایشیا پر اپنی توجہ مرکوز کی اور فرغانہ اور خوقند پر قابض ہو گیا، اور اس کے بعد کرغستان، ترکستان اور تاجکستان کو بھی اس نے ہڑپ کر لیا۔ اس وقت ایشیا میں انگریزوں اور روسیوں میں مقابلہ آرائی ہو رہی تھی۔

''امریکا میں ایک نئی طاقتور حکومت جنم لے رہی تھی۔۔۔۔ عالمی سطح پر یہودی منظم ہوئے اور انہوں نے فری میسن کی تنظیم کے ذریعے 'ارض موعود' کی جدوجہد تیز کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ میرے پاس آئے اور کثیر رقم کے عوض فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری کے لیے ایک خطۂ زمین کا مجھ سے مطالبہ کیا۔ ظاہر ہے کہ انکار کے سوا میرے پاس چارہ نہ تھا۔''

سلطان عبدالحمید دنیائے اسلام کے اتحاد کے علم بردار تھے۔ وہ یہ حقیقت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ سلطنت عثمانیہ کے مسلمانوں پر انحصار کرنا اور دنیا کے دوسرے خطوں میں رہنے والے مسلمانوں سے بے نیازی برتنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ایشیا کے تمام مسلمانوں کو متحد دیکھنا چاہتے تھے، اور چین، ہندوستان، افریقہ، مشرقی وسطی اور دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اخوت کا رشتہ مضبوطی سے قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

''خلافت کے خلاف انگریزوں کی یہ آخری سازش نہ تھی۔ انگریز ایشیا کے 150 ملین مسلمانوں پر حکمرانی کر رہے ہیں، جن پر خلافت کے بڑے گہرے اثرات موجود ہیں۔ اسی لیے انگریزوں کو شکوک و شبہات کا موقع دیئے بغیر میں علماء و مشائخ، صوفیہ، دراویش اور معزز اشراف کو وسط ایشیا میں بھیجتا رہتا تھا اور وسط ایشیا کے مسلمانوں سے خلافت کے حوالے سے مضبوط و مستحکم تعلقات رکھنے پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔''

روشن خیال اور ترقی پسندی

سلطان عبدالحمید کی روشن خیالی اور ادب و تعلیم سے ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد حکومت میں جدید علوم کے متعدد کالج اور مدارس قائم کیے۔ تعلیم کے بجٹ کے لیے کثیر رقم مختص کی۔ فرانسیسی زبان سیکھی اور اس زبان میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا۔ سلطان اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں

"افسوس ہے کہ لوگوں نے مجھے ادب اور لٹریچر کا دشمن مشتہر کر رکھا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں ادب کا دشمن نہیں ہوں۔ ہاں ادب کے نام پر بے ادبی کرنے والوں کا مخالف ضرور رہوں۔ میں نے ادیبوں سے دشمنی نہیں کی، بلکہ ان لوگوں کی مخالفت کی، جنہوں نے ادب کو نقصان پہنچایا۔"

"یہ رائے عامہ کی طاقت نہ تھی جس نے مجھے ضیا بک کو استنبول سے دور بھیجنے پر آمادہ کیا، خواہ وزیر بنا کر یا والی کی صورت میں، بلکہ اس کے علم و فضل کا احترام کرنے کی وجہ سے میں نے اسے یہ عزت بخشی۔ کتنے ہی لوگ میرے سد راہ بنے، جب میں نے مدحت پاشا کو یورپ بھیجا، جب کہ عوام پر اس کے گہرے اثرات تھے، اور دو سلاطین کی معزولی میں وہ ایک اہم عامل سمجھا جاتا تھا۔

اگر میں ادب کا دشمن ہوتا تو رامق کمال بک کو اس کی وفات تک اپنی ذاتی جیب سے مسلسل تنخواہ نہ دیتا رہتا اور اس کے بیٹے کو حکومت میں ملازم نہ رکھتا۔

اگر میں ادب کا دشمن ہوتا تو میں اکرم بک (شاعر) اور ابو الضیا بک (ادیب) کی مخالفت اور لعن طعن کو برداشت نہ کرتا۔

اگر میں ادب کا دشمن ہوتا تو عبدالحق حامد (ادیب) کے قرضوں کی ادائی نہ کرتا اور اسے بھاری مشاہرے پر متعین نہ کرتا۔"

اور اگر میں ادب اور تاریخ نویسی کا دشمن ہوتا تو مراد بک کی تمام حماقتیں برداشت نہ کرتا جو ایک زمانے میں میری حکومت کی مخالفت کرتا تھا۔ میں اس بات پر راضی نہ ہوتا کہ میری سلطنت کے آخری ایام تک وہ سلطنت کی خدمت میں لگا رہے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔

ہرگز نہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں ادیبوں کا دوست اور ان کا مشفق رہا ہوں۔ اگر میں ان کا دشمن ہوتا تو کیا میرے پاس ایسے افراد نہ تھے جو بیچ سڑک پر ادیبوں اور قلم کاروں کو قتل کر دیتے؟

کیا میں اربابِ علم کا دشمن ہوں؟

''انجمن اتحاد و ترقی'' کے ادیب، شاعر اور فن کار اور ماسونی تحریک کے ایجنٹ یہ پروپیگنڈا کرتے رہے کہ سلطان عبدالحمید عقل و دانش کا دشمن تھا۔ مغربی مصنفین اور ان سے متاثر مسلمان قلم کار بھی اب تک یہی رٹ لگائے ہوئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان نے علوم و فنون کی سرپرستی کی اور عقل و دانش کے نام پر مغربیت اور الحاد کی تبلیغ کرنے والوں کا انہوں نے ساتھ نہیں دیا۔ سلطان نے اپنی ''ڈائری'' میں لکھا ہے:

''بغیر شرم کے یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ ''میں اربابِ دانش کا دشمن ہوں۔'' اگر اربابِ دانش اسی طرح کے لوگ ہوتے ہیں تو ہاں، میں نے اپنی زندگی میں کبھی اس عقل کو اہمیت نہیں دی، اور اگر ان کی مراد ایسے لوگوں سے ہے جو صحیح معنوں میں دانش مند ہیں تو ان سے میری دشمنی کی کوئی مثال پیش کریں۔ اگر وہ کوئی ایک دلیل بھی اپنی تائید میں پیش کر دیں تو میں ان کی ساری باتیں تسلیم کر دوں گا۔ میں تو پوری زندگی دانش مند انسان کی تلاش میں رہا ہوں۔ افسوس کہ کوئی ایک بھی فرد ایسا نہ مل سکا، جسے دانش مند کہا جا سکے، اسی لیے میں انہی مصنفین اور قلم کاروں سے تعاون کرنے پر مجبور ہوا۔''

''اگر میں عقل و علم کا دشمن ہوتا تو یونیورسٹی کا افتتاح نہ کرتا اور ایسے مدرسوں کی تشکیل نہ کرتا جو حکومت کے لیے مہذب اور تعلیم یافتہ افراد پیدا کریں جیسے ''مکتب ملکیہ شاہانہ'' کا قیام۔ اور اگر میں عقل و علم کا دشمن ہوتا تو کیا ان دوشیزاؤں کے لیے جو مردوں سے اختلاط پسند نہیں کرتیں، دارالمعلمات (ٹیچرس کالج) کے قیام کی منظوری دے سکتا تھا؟ اور اگر میں عقل و علم کا دشمن ہوتا تو کیا غلطہ سرائے کے مدرسے کو یورپی یونیورسٹی کے معیار تک لے جاتا اور وہاں کے لیے حقوق کے نصاب کی تعلیم لازمی قرار دیتا؟''

''جب میں نے مکتب ملکیہ شاہانہ میں فلسفے کی تدریس کا فرمان جاری کیا تو تمام طلبہ بغاوت پر اتر آئے۔ انہوں نے کہا: لوگ ہمیں کافر بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ کفر علم میں نہیں، بلکہ جہالت میں ہے۔ میں نے فلسفے کی تعلیم کو لازمی کر دیا اور طلبہ نے نام کی تبدیلی کے ساتھ اس کی تعلیم حاصل کی۔ ہم نے فلسفے کی جگہ اس کا نام بدل کر حکمت رکھ دیا۔ اسی طرح یونیورسٹی میں ان اسباق کی تدریس طبعیات کے نام سے شروع کرنے کا میں نے حکم دے دیا۔

متعلمین اور معلمین کی تیاری کے لیے میں نے مدارس کھولنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان لوگوں کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی، جو اس میدان میں کام کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے جودت پاشا، احمد مدحت آفندی، یہاں تک کہ مراد آفندی کی بھی، جو اپنے آپ کو بڑا مؤرخ سمجھتا ہے، اور دوسرے بہت سے مصنفین کی امداد کی، اور

انہیں کتابیں فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی لی۔

میں نے دوسرے ادیبوں کی حمایت اور کفالت کس طرح کی، اس پر گفتگو پہلے بھی کر چکا ہوں۔ یتیموں کے لیے دارالشفقت کی بنیاد مجھ سے پہلے رکھ دی گئی تھی، لیکن یہ ادارہ تقریباً بند پڑا تھا۔ اس کا قیام میری سلطنت کے یتیموں کی نگہداشت اور عنایت کے لیے ہوا تھا۔ آج اس کا متحرک وجود میری کوششوں کا مرہون ہے، لیکن آج کتنے ہی غریب میری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔ تقریباً ان سب لوگوں نے تعلیم انہی مدارس میں حاصل کی ہے، جن کا افتتاح میں نے کیا ہے۔ انہیں کوئی ندامت نہیں ہوتی، اور یہ باعثِ صد افسوس ہے کہ مجھ پر ''عقل و دانش کا دشمن'' جیسے لقب کا اطلاق کر رہے ہیں۔''

''میں کبھی کسی تعلیم یافتہ شخص سے خوف زدہ نہیں ہوا۔ میں تو ان احمقوں سے ڈرتا ہوں جو بعض کتابیں پڑھ کر اپنے کو عالم سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ مغرب پر فریفتہ وہ لوگ ہیں، جسے مغرب کے معاملات اور لباسوں نے فتنے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ میری ادنیٰ توجہ کے مستحق نہیں رہے۔ مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ سلطان عقل و علم کا دشمن ہو سکتا ہے، جس نے تیس سالہ دورِ حکومت میں اس بات کی بھرپور جدوجہد کی ہو کہ وہ ہر گاؤں میں ایک مسجد اور مسجد کے پہلو میں ایک مدرسہ قائم کر دے؟ یہ لوگ ذرا ان کتابیں کی فہرست ہی کو دیکھ لیں جو میرے دور میں شائع ہوئیں اور بعد کے دور سے ان کا تقابل کر لیں۔ یورپ کے کتنے ہی ادیب، فلسفی اور بڑے عالم ہیں، جن کی بہترین تخلیقات میرے دور میں شائع ہوئیں اور ان کو خریدنے اور پڑھنے کا رواج ہوا۔ میں نے تعلیم کے لیے یورپ وفود روانہ کیے۔ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ان میں سے چار پانچ فتنہ پرور نکلے، لیکن ان کی اکثریت حکومت کے لیے بہترین خدمات انجام دے رہی ہے اور مجھے ان پر فخر ہے۔''

''میرے دورِ حکومت میں بکواس کرنے والے پیدا نہیں ہوئے۔ لوگوں نے تعلیم و تعلم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میرے دور میں بڑے علماء پیدا ہوئے۔ ہر شخص نے بقدر صلاحیت علم حاصل کیا اور میں نے ان کی ہمت افزائی بھی کی۔ آخر میں (تعلیم و تعلم میں) ان لوگوں کی ہمت افزائی کیوں نہ کرتا، جب کہ میرے ملک پر نازل ہونے والی مصیبتوں کی بنیادی ہماری عدم واقفیت اور جہالت رہی ہے۔

تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی میں نے ملک کے کونے کونے میں ٹیلی گراف کا نظام رائج کیا، جب کہ اس وقت یورپ کے بعض ممالک میں بھی یہ متعارف نہ ہو سکا تھا۔ میری جیب خاص سے استنبول میں آبدوز کشتیوں کے تجربے کیے گئے۔ اس وقت انگلستان میں بھی ان آبدوزوں کا وجود تک نہ تھا۔ اگرچہ میرے بعد لوگوں نے اس پروگرام کو منسوخ کر دیا اور اس ناکردہ گناہ کو میرے سر تھوپ دیا گیا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ میں دکھی دل سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں کسی بھی مفید اور بہتر چیز کا مخالف نہیں رہا۔ پھر اس اہم ترین پہلو کا دشمن میں کیسے ہو سکتا تھا؟''

دستور سازی کی جدوجہد

سلطان عبدالحمید خان پر مطلق العنانی اور استبداد کا الزام لگایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تحریک مشروطیت کی مخالفت کی تھی، تاکہ ان کی آمریت کی راہ میں کوئی چیز سدِّ راہ ثابت نہ ہو۔ سلطان نے ان الزامات کا

بھی جواب دیا ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"آج لوگ کہتے ہیں کہ میری طبیعت میں شک اور اضطراب ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا، کہ اس کے کچھ اثرات میری طبیعت میں پائے جاتے ہیں۔ عیوب اور کوتاہیوں سے ماوراذات حق سبحانہ کی ہے۔ بہتر میں پوری شدت سے اس بات کی تردید کرتا ہوں کہ میں ترقی کا دشمن ہوں۔"

اگر میں نے یہ بات احمد رضا بک سے اس زمانے میں کہی ہوتی تو اس بدگمانی کا احتمال تھا کہ خوف واضطراب سے میں اپنا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ حکمران دنیاوی سلطنت وحکومت کے تمام افعال واعمال کے لیے تاریخ کے سامنے جوابدہ ہیں اور آخرت میں وہ اللہ کے حضور پیش ہوں گے۔ انہیں افراد کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا ہوگی۔

دوسری بار عثمانی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے ہوئے میں نے وضاحت کردی تھی کہ پارلیمنٹ پہلی بار اس لیے معطل ہوگئی تھی کہ ترک قوم ابھی سیاسی بلوغت کو نہ پہنچی تھی۔ اس وقت لوگوں نے اس پر تنقید کی تھی اور اسے بے بنیاد قرار دیا تھا۔ تیس سال کی مدت گزر گئی۔ بتائیے، کیا یہ پارلیمانی نمائندے پختگی اور بلوغت کو پہنچ پائے جو بظاہر تعلیم یافتہ ہیں؟

پہلی پارلیمنٹ کسی نہ کسی شکل میں منعقد ہوئی اور دوسری پارلیمنٹ بھی وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہی۔ میرا شک اور اضطراب اس حد کو پہنچ گیا کہ مجلس قانون ساز میں بیٹھ کر مخالفین نے خوشیاں منائیں اور رقص کیا۔ جب طرابلس سلطنت عثمانیہ سے الگ ہوا، اس کے بعد بھی حکومت کے حامیوں نے جنگ عظیم چھڑ جانے کا تالیاں بجا کر استقبال کیا۔ قومی صحافت اس پر خاموش رہی۔ البتہ میں نے سنا کہ جو مفید منصوبے تکمیل کو پہنچے، ان کی تکمیل کا سہرا بھی انہی پارلیمانی نمائندوں کے سر باندھ دیا گیا، مثال کے طور پر ریلوے لائن کا منصوبہ۔ ان لوگوں نے اتحاد و اعتماد اور تجارت کا ایسا کاروبار شروع کیا کہ مجھے مجبوراً یہ تصور کرنا پڑا کہ مشروطیت اور دستور سازی کے اصول و آداب کے تحت یہ قوم ابھی پختہ اور باکمال نہیں ہوسکتی۔

میں واضح کرتا ہوں کہ پارلیمنٹ کے افتتاح کے وقت میں نے اقتدار یا ذاتی مفاد کی خاطر منصوبہ بندی کرنے کی بجائے سلطنت کے مفاد کو مقدم رکھا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے آمریت اور استبداد کے تحفظ کی خاطر اقدامات کیے، وہ جانب داری کے مرض میں مبتلا ہیں۔

جب میں نے مشروطیت کا اعلان کر دیا تو کیا فائدہ ہوا؟ کیا مملکت کے قرضوں میں کوئی کمی ہوئی؟ کیا سڑکوں، شاہراہوں، ہسپتالوں، سکولوں اور مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا؟ کیا اس کے بعد بنے والے قوانین زیادہ قریب عقل ہوگئے؟ کیا امن وامان کا مسئلہ حل ہوگیا؟ کیا باشندے اب زیادہ خوشحال ہوگئے ہیں؟ کیا اموات کم ہوگئی ہیں؟ بچوں کی شرح پیدائش بڑھ گئی ہے؟ کیا اب عالمی رائے عامہ ہمارے حق میں زیادہ ہوگئی ہے؟ اس طرح متعدد سوالات ہیں جن کا کوئی جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ میری فکر اور میرا اطمینان ہمیشہ اس حکومت کے خلاف ہوگا جو مشروطیت پر مبنی ہوگی۔ کامیاب دوا بھی سم قاتل بن جاتی ہے، جب وہ ڈاکٹروں کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے یا ان لوگوں کے پاس پہنچ جائے جو اس کے استعمال سے ناواقف ہوں۔

نیم حکیم خطرۂ جاں۔

حکومت کو کمزور کرنے کا الزام

سلطان عبدالحمید پر نااہلی، عدم استعداد اور فرائض سے چشم پوشی کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ سلطان نے اس الزام کی تردید بھی اپنی ''ڈائری'' میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرے ایک معاون نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اس نے ایک جہاز میں چار پانچ آدمیوں کو باہم جھگڑتے دیکھا۔ ان میں ایک شخصیت، جو زبان کا کافی تیز تھا، غضب ناک ہو کر چیخا کہ ملک میں جو آگ لگی ہوئی ہے اور بدامنی پھیلی ہوئی ہے، یہ عبدالحمید کا ترکہ ہے۔ اس نے مدحت پاشا کو جیل میں بند کر دیا، پھر اسے قتل کرا دیا۔ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا، جس کی وجہ سے ہم اس حالت بد کو پہنچے۔ یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔۔۔۔ میرے اس معاون نے کافی چھان بین کے بعد پتا چلایا کہ یہ شخص ڈاکٹر ناظم بک سلانیکی ہے جو میرے خلاف یہ مذموم پروپیگنڈا کر رہا ہے۔۔۔'' (ڈاکٹر ناظم بک (1870ء۔1926ء) ترکی کا مشہور سیاست دان، انجمن اتحاد و ترقی کے بانیوں میں سے تھا۔)

''۔۔۔۔ میں ڈاکٹر ناظم بک کے بارے میں تیس برسوں سے سنتا آ رہا ہوں۔ وہ احمد رضا بک کے ساتھ مل کر میرے خلاف کام کرتا ہے۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ انجمن اتحاد و ترقی کے متعصب ارکان میں سے ہے۔ وہ انانیت پسند ہے۔ اپنی ذات میں مگن رہتا ہے، اور کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ کسی سے محبت اور اخلاص کا معاملہ نہیں رکھتا، کیونکہ اس کے اندر محبت کی رمق بھی نہیں پائی جاتی۔ میں بسا اوقات اپنے مخالفین کی زندگی اور سرگرمیوں کا پتا چلا لیا کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ناظم بک اپنے اصل ڈاکٹری پیشے کے لیے کام نہیں کرتا، اور اسے طبابت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ وہ ہمہ وقت سیاست میں مشغول رہتا ہے، لیکن ان کی سیاست کیا ہے، یہ کبھی واضح نہ ہو سکا۔ وہ مختلف سیاسی سرگرمیوں میں مشغول رہتا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس کے اندر ایک ہی خصوصیت ہے۔ یہ کہ وہ اپنے دستور کی نظر میں ایک ممتاز شہری ہے جو حکومت کی چھوٹی بڑی کسی ذمہ داری کو قبول کرنے سے سختی سے انکار کر دیتا ہے۔

یہاں میں ڈاکٹر ناظم بک کی شخصیت پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ایسا شخص ہے جو اپنے اندر بلند ترین اور پاکیزہ ترین چیزوں سے خود کو عاری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حتیٰ کہ وہ خود کو قلب و ضمیر سے بھی محروم رکھ سکتا ہے۔ یہاں تو مجھے اس گھٹیا اور سوقیانہ الزام پر گفتگو کرنی ہے جو اس نے جہاز میں بیٹھ کر مجھ پر عائد کیا ہے۔ عبدالحمید نے فتنوں کو شعلہ زن کیا ہے یا نہیں؟ کیا اشتعال انگیزی کے لیے مصالحہ پہلے سے موجود تھا؟ کیا عبدالحمید کے تیس سالہ دور سے پہلے اس کی چنگاریاں نہیں تھیں؟ یہاں بحث مباحثے اور مناظرہ کا موقع نہیں ہے۔ یہ تو تاریخ ہے۔ ڈاکٹر ناظم بک اور اس کے رفقاء کسی دن تاریخ کا حصہ ہوں گے۔

میں نے حکومت ان نام نہاد ''مجاہدین'' کو سونپ دی تھی اور ایک سال کے بعد صاحب اقتدار اپنے بھائی کو سلطنت عثمانیہ حوالے کر دی تھی۔ میرے دور میں سلطنت کی حدود اشقودرہ سے خلیج بصرہ تک اور بحر اسود سے صحرائے افریقہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اگر تقابل کیا جائے تو میرے جانشینوں کو معلوم ہوگا کہ میں نے کوئی فتنہ انگیزی نہیں کی۔

میں نے تو ایک بڑا علاقہ ترکے میں چھوڑا ہے، جس میں تیس ملین سے زیادہ انسان آباد ہیں، اور ایک زبردست فوج چھوڑی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا ان لوگوں نے میرے عہد حکومت میں انجام دیئے گئے، کاموں کا تہائی حصہ بھی پورا کیا ہے؟ تہائی حصہ تو جانے دیجئے، ہم کہتے ہیں کہ کیا اس کا دسواں حصہ بھی ان لوگوں نے انجام دیا ہے؟

''جب میں برسر اقتدار ہوا تو ہمارے قرضے تین سو ملین ترکی لیرا کے قریب تھے۔ میں نے بتدریج کم کر کے تیس ملین لیرا تک پہنچایا، یعنی قرضے میں دس گناہ تخفیف کی، جب کہ دو بڑی جنگیں ہوئیں اور بغاوتوں نے سر ابھارا۔ لیکن ناظم بک اور اس کے رفقاء نے قرضوں کو تیس ملین سے بڑھا کر چار سو ملین تک پہنچایا، یعنی تیرہ گناہ اضافہ کیا۔ یعنی میرے جانشینوں نے، میری مراد اپنے بھائی سے نہیں ہے، کیونکہ امور سلطنت اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ اسی لیے میں نے جانشینوں کا لفظ استعمال کیا ہے، قرضوں میں زبردست اضافہ کر کے بڑی کامیابی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔''

میرے تخت پر بیٹھنے کے وقت حالات کیا تھے؟ میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یاد آیا: بوسنیا اور ہرسک (ہرزیگوینا) نے بغاوت کر دی تھی۔ فوج کو شکست دے کر جبل اسود میں اسے محصور کر دیا تھا۔ سرب ہماری منظم فوجوں کے ساتھ اعلان جنگ کر رہے تھے۔ انہی دنوں روس کی ہولناک جنگ بھی چھڑ گئی۔

یہ تمام داخلی و خارجی واقعات و حالات میرے دور حکومت کی پیداوار نہ تھے۔ دو سلطانوں کی یکے بعد دیگرے معزولی کے بعد میں برسر اقتدار آیا تھا۔ وزارتی بحران 93 دن تک جاری رہا تھا اور سلطنت معاشی لحاظ سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اور قوم اس خام خیالی میں مبتلا تھی کہ وہ پختگی اور بلوغت کو پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے مدحت پاشا کو فوراً صدر اعظم کے عہدے پر مامور کیا۔ اسے عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ نتیجے کے طور پر میں نے قوم کے لیے وہ مسائل چھوڑے جو روس کے تجویز کردہ تھے، یعنی دوسرے لفظوں میں روس کے ساتھ مل کر جنگ لڑی جائے یا انکار کر دیا جائے۔ مدحت پاشا نے مجلس عمومی کی صدارت کی، جو خاص اس مسئلے پر بحث و مباحثے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ میں روس سے ہونے والی جنگ اور اس کے نتائج کے بارے میں ذمہ دار تھا نہ جواب دہ، نہ اپنی ذاتی حیثیت میں، نہ سلطان ہونے کی حیثیت میں۔ جب ہم جنگ پر گفتگو کرتے ہیں تو میرا قول یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس وقت جن لوگوں کو فوج کی سربراہی دی تھی، وہ غیر معمولی کمانڈر تھے۔ ان کی اہمیت سلطنت عثمانیہ کے اسی دور میں نہ تھی، بلکہ اگلے پچھلے تمام ادوار میں وہ نادر خصوصیات کے مالک تھے۔

یہ تاریخ کے ساتھ بڑی بددیانتی اور ناانصافی ہوگی کہ اس جنگ میں شکست اور اس کے اسباب و نتائج کا ذمہ دار مجھے قرار دیا جائے اور میرے دور حکومت کو اس سلسلے میں موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔ مواصلاتی وسائل کی کمی، اور علاقہ روملی کی غیر مسلم اقلیتوں میں بغاوت کی چنگاری، جس کی لپٹیں ولایت اورنہ کے اندرون تک پہنچ رہی تھیں، پہلے سے موجود تھی۔

میں نے اس جنگ کی بھینٹ چڑھنے والے افراد کی مدد کے لیے فوری اقدامات کیے۔ میں نے اپنے مہاجروں کی راحت رسانی، ان کے لیے رہائشی سہولتوں کی فراہمی اور ان کے مصائب کم کرنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کیا۔ استنبول سے، سیواس اور حلب تک ملک کے تمام گوشوں میں مہاجرین کی آبادیاں بسائی گئیں۔ میں نے

اللہ کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے اپنی جیب خاص سے کثیر رقم صرف کی اور اللہ کے بندوں کے لیے، جن کی امانت کا بوجھ میرے کندھوں پر اس نے ڈالا تھا، میں نے ان میں سے بیشتر آبادیوں اور بستیوں میں جامع مسجدوں کے مصارف برداشت کیے۔

میرا ذہن کبھی فارغ نہیں رہا، حتیٰ کہ آج کی بدحالی کے ایام میں بھی۔ ویسے میرے اکثر ایام فراخی اور وسعت کے ساتھ بسر ہوئے۔ اپنے مہاجر بھائیوں کے اخراجات، ان کے علاج معالجے، دوا دارو اور ضروری اشیاء کی فراہمی سے میرا ذہن کبھی خالی نہیں رہا۔ میں آج اپنا دفاع کرنے کے لیے ان باتوں کو یاد نہیں کر رہا ہوں، کیونکہ جو لوگ میرے قائم مقام بنے ہیں، انہوں نے اپنے افعال سے خود بہت سی چیزوں کی میری جانب سے مدافعت کر دی ہے۔ اس مہربانی کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اگرچہ اس زوال اور ذلت کی پرچھائیں بھی نظر نہ آئی، جو انہوں نے میرے دین اور میرے سلطنت کی وجہ سے فرضی طور پر طاری کی تھی۔

میں اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ ان چھوٹی موٹی خدمات پر فخر کروں، جن کو میں نے شمار کرایا ہے، کیونکہ وہ تو میرا فرض تھا۔ آج مجھے ندامت اور افسوس کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر میں زندہ رہا تو اپنے قلم سے اور تفصیل کے ساتھ اعتراف کروں گا کہ مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔

ذرا اس وطن پرست ڈاکٹر ناظم بک کو دیکھئے۔ وہ اعلان کر رہا ہے کہ وہ حق پر ہے اور میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شعلہ فشانی اور آتش زدگی عبدالحمید کا ترکہ ہے۔ اگر حق کا پرستار یہ ڈاکٹر مرد ہوتا تو اس حقیقت کی تصدیق اس پر واجب ہوتی کہ آگ زنی پر پانی ڈال کر اسے بجھانے کی بجائے ان لوگوں نے اس پر پٹرول چھڑک دیا ہے۔

ترک نوجوان اور اُن کی وطن دشمنی

ترک نوجوانوں (Young Turks) نے مغربی افکار و نظریات کی سلطنت میں آبیاری کی۔ تنظیمات اور مشروطیت کے نام پر یورپی مقاصد کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنے۔ یورپی ممالک کے سامراجی عزائم کے لیے تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔ اسلامی اقدار و تنظیمات کی بیخ کنی اور خلافتِ عثمانیہ کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان کے بارے میں سلطان عبدالحمید کے مشاہدات، تجربات اور بیانات قابل مطالعہ ہیں۔ دشمنان اسلام نے کس طرح ہر ملک میں میر جعفر اور میر صادق کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ ان منافقین نے چند سکوں کی خاطر سلطنت کی جڑیں کھودیں۔ عثمانی تاریخ و تہذیب کی شان و شوکت خاک میں ملائی۔ مذہب اور علم برداران مذہب کے خلاف ہر قسم کی ناپاک سازشوں میں حصہ لیا۔ سلطان اپنی ڈائری میں رقم طراز ہیں:

''یہ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ ''جدید عثمانی'' جو یورپ فرار ہو گئے تھے، میرے چچا عبدالعزیز خان کو معزول کر کے منزل مراد کو پہنچ گئے۔ عبدالعزیز خان کو معزول کر دیا گیا اور اس کے بعد ہی روسی ترک جنگ چھڑ گئی، جس میں روملی کا نصف حصہ ہاتھ سے نکل گیا اور ترک نوجوانوں نے، جو یورپ کی طرف بھاگ گئے تھے، میری معزولی کے لیے روس کی طرف داری کی اور اس کا ساتھ دیا اور مجھے معزول کر کے انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

پھر وہ عمومی جنگ میں کود پڑے اور عثمانی سلطنت کو تباہ و برباد کر کے چھوڑا۔"

جدید عثمانی اور نوجوان ترک، دونوں جماعتوں نے ترکی ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ دونوں مغرب پر فریفتہ تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ نجات کی واحد راہ مشروطیت کے نفاذ میں پوشیدہ ہے۔ ہر فریق نے اپنے مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے فوج کے ایک دھڑے کو اپنے ساتھ ملایا اور فوج، جس پر فریقین نے انحصار کیا تھا، اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔

جی ہاں، یہ کیسا عجیب سانحہ ہے کہ دو عظیم حادثات کے بعد بھی زندہ ہوں۔ میں نے صبر و استقامت سے وہ کام کیا جو میرے چچا غصہ و غضب سے نہ کر سکے۔ میں نے عفو و درگزر کی پالیسی اپنائی، جب کہ میرے چچا انتقام و مواخذہ کے طریقے کے ذریعے کامیاب نہ ہو سکے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ جدید عثمانی اور نوجوان ترک سب مل کر ان بڑی طاقتوں کی ہم نوائی کر رہے تھے جو سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی تھیں۔ یہی نوجوان بڑی طاقتوں کی امید اور آرزو تھے کہ ان کے خاکے میں رنگ یہی نوجوان بھریں گے۔ اس سے سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہو جاتا۔ ہم نے دو مرتبہ شکست کھائی، جب کہ ہم نے وہ نافذ کیا جو بڑی طاقتوں کا عزم تھا اور ہم ان کے اشاروں پر چلے۔ تو کیا ان لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں جو وطن کی بچی کھچی مٹی کی آخری مشت میں زندگی گزار رہے ہیں؟

اگر اللہ چاہے تو سب کچھ ممکن ہے۔

میری اولاد میرے فرزند وہ ہیں جنہوں نے اس وطن میں پرورش پائی ہے۔ انہوں نے اس عظیم کائنات کی سیاحت کی ہے۔ آخر انہوں نے وہ حقیقت کیوں نہ سمجھی، جسے میں اپنے محل کی چار دیواری میں مقید ہو کر بھی محسوس کر رہا ہوں؟ ان کے دماغ میں یہ بات کیوں نہ آئی کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اتنی بڑی سلطنت کا بیڑا غرق کر دیا جسے ان کے آباؤ اجداد کے خون نے سیراب کیا تھا؟

میں کسی کو مجرم نہیں کہتا، لیکن خود انہی لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز، فرانسیسی اور روسی یہاں تک کہ جرمن اور آسٹریلیائی بھی یعنی تمام بڑی یورپی طاقتیں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے ہو جانے ہی میں اپنا مفاد دیکھتی ہیں۔ یہ سب اس عظیم سلطنت کی دشمن تھیں۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہ بڑی طاقتیں باہم گتھم گتھا رہتی تھیں، بلکہ جب عثمانیوں سے جنگ کرنے کا معاملہ ہوتا تو جلد ہی یہ سب متفق ہو جاتیں اور ایک دوسری کی حلیف بن جاتی تھیں۔ ان کے درمیان نااتفاقی صرف اس بات میں پائی جاتی تھی کہ سلطنت عثمانیہ کے سب سے بڑے حصے کا مالک کون ہوگا؟

کیا ترک نوجوان ان طاقتوں کی باہمی امداد اور معاونت کا راز نہیں سمجھ سکے؟ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور آئندہ بھی کہوں گا۔ ماضی میں بھی صراحت کی ہے اور مستقبل میں بھی کروں گا کہ ان نوجوانوں نے یہ نہیں سوچا کہ عثمانی سلطنت مختلف قومیتوں کا گہوارہ ہے، اور اس طرح کی سلطنت میں مشروطیت کی تحریک ملک کے اصلی اور بنیادی عنصر کے حق میں پیام موت ثابت ہوگی۔ کیا انگریزوں کی پارلیمنٹ میں کوئی ایک بھی ہندوستانی، افریقی یا مصری نمائندہ شریک ہے؟ اور کیا فرانس کی پارلیمنٹ میں کوئی ایک الجزائری نمائندہ موجود ہے؟ یہ نوجوان عثمانی پارلیمنٹ

میں روم، آرمینیا، بلغاریہ، سرب اور عرب سے سارے خطوں کے نمائندوں کی موجودگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

نہیں، ہرگز نہیں، میں اس فرزند وطن کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا تھا جس نے تعلیم حاصل کی، غور و تدبر کیا اور وطن کے تصفیے کے لیے اپنے کو وقف کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ بڑی سادگی سے یہ دھوکا کھا گئے۔ یہ نوجوان فریب خوردہ ہیں، لیکن وہ لاکھوں اور کروڑوں معزز ابنائے وطن جو فریب خوردہ نہیں ہیں، انہوں نے بڑی قیمت ادا کی۔ ان میں سے اکثر قتل کر دیئے گئے اور تباہ و برباد کر دیئے گئے۔

یہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو ''نوجوان ترک'' کہا ہے، اصل میں تین یا پانچ اشخاص تھے۔ انہوں نے یورپ میں رہ کر برسوں تک میرے خلاف کام کیا، سازشیں کیں، منصوبے بنائے اور تحریر و تصنیف کے میدان میں زہر اگلتے رہے۔ یہ سب انہوں نے کیا، مگر یہ نہ سوچا کہ میرے خلاف سازش کرنے کا مطلب وطن کے خلاف سازش کرنا ہے۔ یہ جو اخبارات نکالتے تھے، وہ غیر ملکی ڈاک سے ملک میں آتے تھے اور غیر ملکیوں ہی کے ذریعے یہاں تقسیم ہوتے تھے۔ کئی سال گزر گئے، مگر اس کے کوئی خاص مفید اثرات ظاہر نہ ہوئے، کیونکہ وہ ایسی سرگرمیاں نہ تھیں جو مفید اور نفع بخش افکار و خیالات کی پیداوار ہوں۔

اس کے باوجود میرے ان سے مراسم تھے۔ میں ان کے اخبارات کی خریداری کے بہانے ان کی بھاری امداد کر دیا کرتا تھا، تاکہ بیرون ملک افلاس کے سبب کسی مصیبت کا شکار نہ ہوں، اور اس حقیقت سے صرف نظر کر لیتا تھا کہ بعض اشخاص مستت میں (خرابی کے لیے) رقمیں بھیجتے ہیں، تاکہ وہ غیر ملکیوں کے آلۂ کار بنیں۔ میں کہا کرتا تھا کہ ان نوجوانوں کا میری مخالفت کرنا اگرچہ غلط ہے، مگر اسے شرافت کے دائرے میں ہونا چاہیے۔

مصر اور یورپ سے مختلف ناموں سے نکلنے والے تمام اخبارات نے اور ان ملکوں میں گھومنے والے ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے افراد نے ایک بھی ماہر صحافی اور قلم کار پیدا نہیں کیا، لیکن فری میسن کی انجمنوں نے ہمارے تعاقب کے باوجود ان بے راہ رو قلم پکڑنے والوں کو پیرو بنا کر پیش کیا، جب کہ انہوں نے ''اتحاد و ترقی'' کے رکن افسروں کو تحریک دی۔ یہ ہے داستان نوجوان ترکوں اور انجمن اتحاد و ترقی کی۔ جی ہاں! یہی داستان ہے، یہی حکایت ہے، لیکن آج افسوس کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے ان کے نتائج کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لوگ کہیں گے، تم سب کچھ جانتے تھے، مگر ان کو روکا نہیں۔ آخر سلطنت کے زوال اور اس کی بربادی سے تم نے آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ ہرگز نہیں، معاملہ ایسا نہیں تھا۔ معاملہ آنکھیں بند کرنے کا نہیں تھا۔ میں ہر لحہ بیدار تھا، مگر ان کو روکنے کی استطاعت مجھ میں نہیں تھی۔ میں تنہا تھا اور ان کے ساتھ دشمنوں کی یہ پوری دنیا تھی۔ میرا مزاج اور میرے حالات کچھ کام نہ آسکتے تھے۔

میرے دوست طعنہ دیتے ہیں کہ میں آرام پسند اور کاہل ہوں، اور دشمن کہتے ہیں کہ میں ظالم اور غدار ہوں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ میں سلطان سلیم اول ہوں اور نہ سلطان سلیم اول کا ملک اور اس کی سلطنت میرے زیر نگیں ہے۔۔۔۔ جو کچھ میرے بس میں تھا، میں نے کیا۔ اگر سلطان سلیم اول میرے دور میں ہوتے تو ممکن تھا کہ وہ بھی وہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کیا، نیک اور مفید کام کے لیے سعی و جہد کی۔ کوشش کی کہ باشندگان ملک کو نقصان نہ پہنچے۔ ہر جگہ خون ریزی کی میں نے مخالفت کی، لیکن میری تمام کوشش بے سود رہی۔

میں نے نوجوان ترکوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ نہیں کیا۔ میرے ملک نے ان ترکوں نوجوانوں کی غفلت کی بہت بڑی قیمت ادا کی۔ یہ ایسی غفلت ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا، اور یہ واقعہ رونما ہو چکا۔''

یہ سلطان عبدالحمید ثانی کی ڈائری کے چند اوراق کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقائق کس قدر مختلف ہیں اور کس طرح ان کے دشمنوں نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور بعد ازاں اتاترک کے حلیفوں نے انہیں بغیر تحقیق کے قبول کر لیا ہے۔

چند مشاہیر ترکی

مدحت پاشا (1822ء۔1885ء)

مدحت پاشا کا اصل نام احمد شفیق اور تخلص مدحت تھا۔ پہلے مشرقی علوم، عربی اور فارسی کی تحصیل کی۔ ان میں مہارت پیدا کرنے کے بعد بابِ عالی میں ملازمت اختیار کر لی۔ پھر مغربی افکار و نظریات کے علم بردار رشید پاشا کی حوصلہ افزائی پر فرانسیسی زبان سیکھی اور اس میں بھی کمال پیدا کیا۔ 1860ء میں صوبہ نیش کے والی اور 1864ء میں تین سال کے لیے طونہ کے والی بنائے گئے۔ اس کے ایک سال بعد استنبول میں مجلس شوریٰ کے صدر رہے۔ پھر بغداد کے والی (گورنر) بنے لیکن اس وقت کے وزیراعظم (صدراعظم) محمد ندیم پاشا سے اختلاف کرنے کی وجہ سے مدحت پاشا کو بغداد سے نقل مکانی کرنا پڑی۔ تاہم حالات نے پلٹا کھایا اور دوسرے ترک نوجوانوں کی مدد سے اس نے سلطان کو معزول کر دیا اور ان کی جگہ مراد پنجم کو نیا سلطان مقرر کر دیا۔ سلطان مراد صرف 93 دن ہی تختِ حکومت پر بیٹھ سکا کہ جنون کے مرض میں مبتلا ہو کر اسے معزول ہونا پڑا۔ اس کے بعد سلطان عبدالحمید خان ثانی کو تختِ خلافت پر بٹھایا گیا۔ مدحت پاشا انگریزوں کا دل دادہ اور انگریز طرزِ حکومت اور طرزِ معاشرت کا داعی اور علم بردار تھا۔ دوسری طرف اسے انگریزوں کی خفیہ اور عیاں تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔

ضیا بک (1825ء۔1880ء)

ضیا بک کا شمار ان شعراء و ادبا میں ہوتا ہے، جن کو عثمانی تنظیمات کے دور میں نمایاں ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے صدارت عظمیٰ سیکرٹریٹ میں کام کیا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ اپنی پوری زندگی کے آغاز میں اس کی شاعری کا اسلوب اور منہاج سلفی رہا۔ 1855ء میں رشید پاشا نے اسے قصر سلطانی میں ملازم متعین کیا۔ رشید پاشا سے مغربی ادب کا درس لیا اور خاص طور پر فرانسیسی زبان سیکھی۔ ساڑھے سات سال تک قصر سلطانی میں سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ جب صدراعظم عالی پاشا سے اختلاف ہوا تو اسے قبرص کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔ وہ نوجوان ترکوں کی تحریک کا رکن اور مغربی افکار کا داعی بن گیا۔ مصری امیر مصطفیٰ فاضل پاشا کی دعوت پر 1869ء میں یورپ چلا گیا۔ لندن سے اخبار ''مخبر'' اور پھر ''حریت'' نکالے۔ نامق کمال سے تعارف ہوا۔ چنانچہ جب ادب کے میدان میں اس کی تخلیقات نے شہرت حاصل کی تو خاص طور پر ''ظفر نامہ'' اور

ترکیب بند کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ عالی پاشا کی وفات کے بعد ترکی واپس آیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان عبدالحمید کے عہد میں "قانون اساسی" کی تشکیل میں اس نے بھی حصہ لیا تھا۔ سلطان نے اسے وزیر کا منصب دے کر شام کا گورنر مقرر کیا۔ پھر اطنہ کا گورنر ہوا۔ وہیں اس کی وفات اور تدفین ہوئی۔

مراد ابوضیا توفیق (1849ء۔1913ء)

مراد ابوضیا توفیق ادیب وشاعر، سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف تھا۔ کچھ مدت یورپ میں تعلیم حاصل کی اور فرانسیسی زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ عثمانی سلطنت کے متعدد اہم مناصب پر فائز رہا، جیسے المدرسہ الفعیہ (ٹیکنالوجی سکول) کے ڈائریکٹر اور مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ ایک رسالہ "ابوالفضیاء" جاری کیا۔ سلطان نے اسے روڈس اور قونیہ بھیج دیا۔ 1908ء کے انقلاب کے بعد وہ استنبول واپس آیا۔ اس کے بعد وہ شہر انطالیہ سے پارلیمنٹ کا نمائندہ منتخب ہوا۔ حکومت نے اس کا پریس بند کر رکھا تھا۔ اب اس نے اپنا پریس کھلوایا۔ یہاں سے اس نے اپنے استاد نامق کمال شناسی کے اخبار "تصویر افکار" کا دوبارہ اجراء کیا۔ مراد توفیق کی پوری عمر سلطان کی دی ہوئی سختیوں میں گزری۔

عبدالحق حامد (1852ء۔1937ء)

عبدالحق حامد جدید ترکی ادب کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ترکی اور فرانس میں تعلیم پائی۔ فرانسیسی، عربی اور فارسی پر عبور رکھتا تھا۔ باب عالی میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے والد تہران (ایران) میں سلطنت عثمانیہ کے سفیر تھے۔ چنانچہ والد کی معیت میں بیٹا بھی تہران چلا گیا۔ باپ کی وفات کے بعد استنبول واپس آیا۔ مختلف قسم کی حکومتی ذمہ داریاں نبھائیں۔ پیرس اور بمبئی سمیت متعدد ملکوں میں عثمانی سلطنت کے سفارت خانوں اور قونصل خانوں میں مامور رہا۔ بمبئی میں تقرر کے دوران وہیں بیوی بیمار ہوئی۔ چنانچہ اسے لے کر وطن واپس آ رہا تھا کہ راستے میں مرض نے شدت پکڑی۔ دونوں بیروت میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے اور وہیں بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس ذاتی حادثے نے عبدالحق حامد کو ہلا کر رکھ دیا، جس کا اظہار اس کی شاعری میں ہوا۔ اس کے بعد لندن اور برسلز میں اپنے ملک کے سفارت خانوں میں کام کیا۔ 1912ء میں عثمانی سینیٹ کا رکن مقرر ہوا۔ ترکی جمہوریہ میں 1928ء میں استنبول سے پارلیمنٹ کا نمائندہ منتخب ہوا۔ اس کے متعدد ادبی شاہکار منظر پر آئے، جو آج تک ترکی ادب میں شہرت رکھتے ہیں۔

مراد بک میزانجی (1853ء۔1914ء)

مراد بک میزانجی ترکی کا ممتاز صحافی اور مؤرخ، تفلیس میں پیدا ہوا۔ روس میں تعلیم حاصل کی۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے دور میں مدرسہ ملکیہ میں تاریخ کا استاد مقرر ہوا۔ ترکی کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی زبانوں کا شناور بھی تھا۔ سلطان کی مخالفت کرنے کی وجہ سے مصر اور پھر یورپ فرار ہو گیا، لیکن بعد میں استنبول واپس آ گیا۔ اسے مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا گیا۔ یورپ کے قیام کے دوران اس نے اخبار "المیزان" جاری کیا اور اسی مناسبت سے "میزانجی" مشہور ہوا۔ استنبول واپس آنے کے بعد بھی اس نے نئے اسلوب میں اخبار کو جاری رکھا۔

''انجمن اتحاد و ترقی'' کی اس نے مخالفت کی، اسی لیے انجمن کے سربراہوں نے اسے بھی 31 مارچ کے قومی حادثے میں ملوث کر دیا۔ اس پر سلطان کی تائید و حمایت کا الزام عائد کر کے اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ بعد میں وہ وطن واپس آ گیا اور یہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے تاریخ عالم پر مفصل کتاب لکھی جو چھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس نے سلطنت عثمانیہ کی تاریخ بھی لکھی جس کے ابتدائی حصے اس کی زندگی میں چھپ گئے تھے اور بعد کے حصے اس کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔

ڈاکٹر ناظم بک (1870ء۔1926ء)

ڈاکٹر ناظم بک ''انجمن اتحاد و ترقی'' کے بانیوں میں سے تھا۔ سلونیکا میں پیدا ہوا، اس لیے ڈاکٹر سلانیکی کے نام سے مشہور ہوا۔ سلطنت عثمانیہ میں طب کی تعلیم حاصل کی اور اس کی تکمیل فرانس میں کی۔ پیرس میں انجمن اتحاد و ترقی کے صدر احمد رضا بک کے ساتھ تعاون کیا۔ 1907ء میں انجمن کی دعوت پر سلونیکا واپس آیا اور پیرس اور سلونیکا کی انجمن کی دونوں شاخوں کے درمیان رابطہ افسر کا کام کرتا رہا۔ اناطولیہ میں اتحاد و ترقی کے لیے پروپیگنڈا کرنے میں اس کا خاص کردار رہا ہے۔ جب انجمن کو سلطان عبدالحمید کے خلاف کامیابی مل گئی اور مشروطیت کا اعلان کر دیا گیا تو اس نے حکومت میں کوئی منصب قبول نہیں کیا، اسی لیے سلونیکا میں وہ سب سے بڑے اور معروف ترین ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ وہ انجمن اتحاد و ترقی کی مرکزی کمیٹی کا مستقل رکن رہا۔ 1911ء میں انجمن کا جنرل سیکرٹری بنا اور 1918ء میں وزیر معارف ہوا۔ 1936ء میں ازمیر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف ایک سازش میں ملوث ہونے کے جرم میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

عصمت پاشا انونو (1880ء۔1974ء)

عصمت پاشا انونو مصطفیٰ کمال پاشا کے دستِ راست رفیق خاص اور معتمد سمرنا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد استنبول کے مدرسہ حربیہ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے فراغت کے بعد 1907ء میں انہیں یوز باشی یعنی کپتان کا عہدہ مل گیا۔ سلطان عبدالحمید خان ثانی کو 1909ء میں ایک فوجی دستے نے معزول کیا تو اس یلغار میں عصمت پاشا بھی انور پاشا کے ساتھ تھے۔ 1911ء میں اٹلی کی جارحیت کے خلاف ہونے والی جنگ میں بھی عصمت پاشا نے انور پاشا کا ساتھ دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد ترکی مقبوضات ایک ایک کر کے عثمانی سلطنت کے ہاتھ سے نکلنے لگے اور اتحادی (یورپی) افواج نے ترکی کی صدہا سالہ پرانی سلطنت کا خاتمہ کرنا چاہا تو مصطفیٰ کمال نے انقرہ میں ایک متوازی حکومت قائم کر کے اتحادیوں، یونانیوں اور استنبول کی اپنی مجبور و بے بس حکومت کے خلاف جنگ شروع کی۔ اس وقت عصمت پاشا ان کے دست راست تھے۔ سقاریہ کے معرکے میں فتح کا سہرا انہی کے سر تھا۔ علاوہ ازیں قفقاز میں کاظم قرہ بکر پاشا کی روسیوں کے خلاف کامیابی اور قارص پر قبضے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ 1922ء کی مشہور لوزان کانفرنس میں انہوں نے ترکی کی نمائندگی کی۔ مصطفیٰ کمال نے جب ترکی جمہوریہ کے صدر کا عہدہ سنبھالا تو عصمت پاشا کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ تفویض ہوا۔ اپنے عہدِ وزارت میں انہوں نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیے، ان میں میثاق بلقان (یعنی بلقان کی ریاستوں سے امن کا معاہدہ) اور میثاق سعد آباد

بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ میثاق سعد آباد اپنے مشرقی ہمسایوں ایران اور عراق سے دوستی اور خیر سگالی کا معاہدہ تھا جس میں بعد ازاں افغانستان بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ عصمت پاشا نے آئین میں بھی بعض ضروری ترامیم مجلس ملی سے منظور کرائیں اور حکومت کے نظم و نسق میں کئی خوش آئند تبدیلیاں کیں۔ مصطفیٰ کمال کے بعد عصمت پاشا ترکی کے صدر منتخب ہو گئے، اور 1950ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ ان کے زمانہ صدارت میں جنگ عظیم دوم شروع ہوئی، لیکن انہوں نے کمال تدبر سے ترکی کو غیر جانبدار رکھا۔ 1950 سے 1960ء تک وہ حزب اختلاف کے رہنما رہے۔ 1960ء کے فوجی انقلاب کے بعد انہوں نے تین بار وزارتیں بنائیں، لیکن وہ اپنے وعدے پورا نہ کر سکے اور 1972ء میں ان کی جگہ بلند ایجویت پارٹی کے صدر منتخب ہو گئے۔ 1974ء میں وفات پائی۔

عدنان مندریس (1899ء۔ 1961ء)

عدنان مندریس ایک جاگیردار کے بیٹے تھے۔ ازمیر کے امریکن کالج اور انقرہ کے فیکلٹی آف لاز میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں جدید طرز پر کاشت کاری کے لیے اپنی جائیداد فروخت کر دی۔ 1930ء میں پہلی بار قومی سیاست میں داخل ہوئے اور ملک کی واحد سیاسی جماعت ری پبلیکن پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ 1945ء میں انہیں پارٹی سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تین دوستوں کی مدد سے 1946ء میں ڈیموکریٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1950ء میں ترکی جمہوریہ میں پہلی بار آزادانہ انتخابات ہوئے تو مندریس اور ان کی پارٹی کامیاب ہو گئی۔ مندریس نے انتخاب جیتنے کے بعد اسلامی عناصر سے ہاتھ ملایا اور انہیں کچھ مراعات اور سہولیات فراہم کیں۔ ترکی معیشت میں نجی ملکیت اور پرائیویٹ کاروبار کی ہمت افزائی کی۔ کسانوں میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور 1954ء کے الیکشن میں وہ ایک بار پھر کامیاب ہو گئے۔ اب انہوں نے مخالفین سے نمٹنا شروع کیا۔ پریس کی آزادی پر قدغن لگائی۔ صحافیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ بلدیاتی انتخابات معطل کر دیئے۔ ان اقدامات سے اہل دانش و صحافت بلبلا اٹھے۔ ادھر فوج بھی مضطرب ہوئی جو کمال اتاترک کے نظریات کی محافظ تھی۔ لیکن 1957ء کے عام انتخابات میں عدنان مندریس کو پھر کامیابی ہوئی۔ تاہم مخالفت بھی بڑھ گئی۔ شورش میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ 27 مئی 1960ء کو فوج نے تختہ الٹ دیا۔ مندریس اور اس کے سینکڑوں رفقاء کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ گیارہ مہینوں کی قانونی کارروائی کے بعد انہیں پھانسی دے دی گئی۔

ایران میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش

ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کی مغرب زدہ جدیدیت کا احوال رقم کرنے کے بعد اب قلم ایران کی طرف رواں ہوتا ہے۔ یہاں جو مغربیت نے حال کھیلا، وہ دوسرے اسلامی ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ایران کی جدید تاریخ کا ورق کھولنے سے پہلے، تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ہمیں ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کے زمانہ عروج کی معاصر ایرانی سلطنت ''صفوی'' میں جھانکنا ہوگا۔

تاریخی پس منظر

صفوی خاندان کے بانی شاہ اسماعیل (1487ء۔1524ء) کا یہ کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے کہ اس نے پھر ایران کو متحد کر دیا۔ مشرق میں ازبکوں اور مغرب میں عثمانیوں کا زور توڑا۔ قوم کی اخلاقی وحدت جو بکثرت رائے، شیعیت سے وابستہ تھی پر مہر توثیق ثبت کرنے کے لیے شیعیت کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا۔

شاہ اسماعیل کو پرتگیزیوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی، جن کے لیڈر الفانسو البوکرق نے جزیرہ ہرمز اور آس پاس کے ساحلی علاقوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مغربی طاقت نے ایران سے چھیڑ خانی کی تھی۔ یہ مغربیت کی پہلی لہر تھی۔ گویا جدیدیت کی ہوا ادھر بھی آنے لگی تھی۔ جس سے اندیشہ تھا کہ وہ تحریک جس نے ایران کو مشرق کی طرف بڑھایا تھا، اب ختم ہو جائے گی اور اب ایک نئی تحریک جنم لے گی جس کی کشش کے تحت ایران مغرب کی طرف کھنچتا چلا جائے گا۔

اسماعیل کے پوتے عباس اول صفوی (1587ء۔1629ء) نے ایران کو ایک بار پھر ایک عظیم خوشحال اور طاقتور قوم بنا دیا۔ وہ ہندوستان کے بادشاہ اکبر اور انگلستان کی ملکہ الزبتھ اول کا ہم عصر تھا۔ اس نے 1597ء میں ازبکوں کو ہرات کے مقام پر شکست فاش دی۔ اس کے بعد گیلان، مازندران اور افغانستان پر یکے بعد دیگرے قبضہ کیا۔ 1605ء میں ترکوں کو بصرہ کے مقام پر شکست دی اور ایران کے سابقہ علاقے واپس حاصل کیے۔ 1622ء میں ہرمز کا علاقہ پرتگیزوں سے واپس حاصل کیا۔ 1623ء میں ایک سال کے محاصرے کے بعد بغداد پر قبضہ کیا۔ اصفہان کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ وہاں کی آبادی چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ دنیا کی آدھی آبادی اصفہان میں ہے۔ عباس اعظم کے عہد میں علوم و فنون کو غیر معمولی ترقی ہوئی۔

عباس اعظم نے (شہنشاہ جہانگیر کی طرح) ولندیزیوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کو ایران میں تجارتی کوٹھیاں (مراکز) قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ بھی درست ہے کہ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہرمز کا جزیرہ پرتگیزیوں سے واپس لینے میں عباس اول کی بڑی مدد کی، بلکہ ان کا تعاقب کرنے میں بھی پوری پوری کمک پہنچائی۔

ایرانی نپولین کا زمانہ

1629ء تا 1736ء۔ یہ صدی بھی ایران کے خلاف گئی۔ عثمانیوں سے شکست کھانی پڑی۔ روس بھی بڑھ چڑھ کر حملے کرتا رہا۔ 1724ء کے معاہدے کی رُو سے ترکی اور روس نے مل کر ایران کے شمالی صوبوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ افغان اشرف نے پورے مشرقی ایران پر قبضہ جما لیا۔ اصفہان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ایران کے حصے بخرے ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اب دوبارہ یہ ملک کبھی نہ اٹھ سکے گا۔

لیکن نادر شاہ کے زمانے میں، جسے تاریخ میں ''ایرانی نپولین'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایران کو ایک بار پھر ابھرنے اور بڑھنے چڑھنے کی توفیق ہوئی۔ وہی صفویوں والی شان و شوکت اور عظمت و جلالت دوبارہ لوٹ آئی۔ شمال میں مشہد اور ہرات کے مقامات پر باغیوں کی سرکوبی کی۔ افغان اشرف کو بری طرح شکست دے کر اس سے اپنا

اصفہان 1729ء میں واپس حاصل کیا۔ ترکوں کا ان کی سرحدوں کے اندر تک تعاقب کیا۔ پھر روسیوں کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے آمنا سامنا کرنے کی بھی جرأت نہ کی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

نادر شاہ نے اب مشرق کا رخ کیا۔ افغانوں کو شکست دی۔ کابل و غزنی کو فتح کرتا ہوا ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ کرنال کے میدان میں محمد شاہ کی فوجوں کو شکست دی اور مارچ 1739ء میں دہلی میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس شہر میں 348 سال کی کمائی، دولت، عزت، تہذیب، تمدن آناً فاناً ختم ہوئے۔ تقریباً دو ماہ دہلی میں قیام کرنے کے بعد واپس ایران لوٹ آیا اور اپنے ساتھ بیش بہا دولت، کوہ نور ہیرا اور شاہجہان بادشاہ کا تخت طاؤس بھی اٹھا لایا۔ ہندوستان سے واپسی پر خیوا اور بخارا فتح کیے اور کردوں کی بغاوت کو فرو کرنے جا رہا تھا کہ افشار قبیلے کے آدمیوں کے ہاتھوں اپنے خیمے میں قتل ہوا۔

نادر شاہ کے بہت سے قصے مشہور ہیں، لیکن ہمیں ایک قصہ بہت پسند آیا۔ ہندوستان میں دوران جنگ اس نے سفید داڑھی والے ایک بہادر اور شجاع شخص کو دیکھا۔ اس کی پھرتی اور شجاعت سے متاثر ہو کر اسے اپنے پاس طلب کیا اور پوچھا ''تیرہ سال پہلے تم کہاں تھے؟ فتح اصفہان کے موقع پر تم سے ملاقات ہو جاتی تو اچھا تھا'' بوڑھے نے جواب دیا: ''حضور! اس روز تو اصفہان ہی میں تھا۔ آپ جانے کہاں تھے''

نادر شاہ کو نپولین سے اس لیے تشبیہ دی جاتی ہے کہ اس کی فتوحات بے شمار ہیں۔ اس کے فاتحانہ انداز میں نپولین کی سی سطوت تھی، لیکن ایک فرق بھی تھا۔ نپولین نے تو بالآخر متحدہ محاذ سے شکست کھائی تھی۔ نادر شاہ نے کبھی شکست نہیں کھائی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ نپولین انتہائی اچھا منتظم تھا، جب کہ نادر شاہ میں نظم و نسق کی قابلیت نہ تھی اور ظلم و ستم کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ اپنے بیٹے کی بھی آنکھیں نکلوا دیں۔

1747ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور اصل طاقت شیراز کے کریم خان زند کے ہاتھ آ گئی۔ اس نے ایران کو ایک متحد مملکت بنا دیا۔ اس کے بیٹے نااہل ثابت ہوئے اور استر آباد کا قاچار خاندان 1925ء تک ایران پر حکومت کرتا رہا۔

قاچاریوں کے عہد میں ایران کا انتشار طوائف الملوکی کی حد تک پہنچ گیا۔ ایک ایسی انارکی تھی کہ مغربی طاقتوں کی روز افزوں نئی نئی صنعتوں کی ترقی میں وہ اور بھی زیادہ افسوس ناک اور شرمناک محسوس ہوتی ہے۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے معاشی اقتدار کے نتیجے میں نوآبادیات کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ مغربی طاقتیں معاشی، سیاسی اور عسکری اعتبار سے کرۂ ارض کے چہار اطراف میں جارحانہ پھیلتی چلی جا رہی تھیں اور ایران اور آس پاس کے مسلم ممالک اسی حساب سے سکڑتے جا رہے تھے۔ انگلستان اور فرانس کی باہمی کشمکش نے ایران کو الجھا کر رکھ دیا۔ نپولین ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایران سے دوستی چاہتا تھا، جب کہ یہ انگریزوں کے مفاد کے خلاف تھا۔ 1814ء میں انگلستان نے ایران کے ساتھ عہد نامہ طے کر لیا۔ ادھر روس کے ساتھ ایران کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ 1814ء میں صلح نامہ انگلستان اور 1828ء میں صلح نامہ ترکمان چائی کی رو سے ایران کو دریائے ارس کے شمال میں پورے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ 1856ء میں ایران نے ہرات پر قبضہ کر لیا تو برطانیہ نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

1857ء میں ہندوستان میں انگریز آخری مغل بادشاہ کو شکست دے رہے تھے، ادھر صلح نامہ پیرس کی رو سے ایران کو ہرات چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ روسی اثر اتنا بڑھ گیا کہ ایران کے بہت سے علاقے روس کے قبضے میں چلے گئے۔
1827ء میں صوبہ سیستان، افغانستان اور ایران کے مابین تقسیم ہوا۔

قاچار حکمران فتح علی شاہ (1797ء۔1834ء) نے جارجیا (روس) پر دوبارہ قبضہ جمانے کی سخت کوشش کی۔ وہ نپولین کا انتہائی مداح تھا۔ 1807ء میں نپولین نے جنرل گامٹ دی گردونے کی سربراہی میں سیاسی وفوجی وفد تہران بھیجا تو ان کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ اس مشن نے ایران کے خشکی کے راستوں کا اچھی طرح معائنہ کیا، تاکہ ہندوستان کی جانب ایک طاقتور فوجی مہم روانہ کی جاسکے۔

1739ء میں جب نادر شاہ نے دہلی کو فتح کیا تو اس وقت نپولین مصر میں بیٹھا اس کی فتوحات کا بہ نظر غائر جائزہ لے رہا تھا۔ آج اس کا ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ محض ایک خواب معلوم ہوتا ہے، لیکن فتح علی شاہ اور اس کے بیٹے عباس مرزا کی باہمی خط وکتابت، جو انہوں نے نپولین، جنرل گامسٹ دی گردونے اور فرانس کے وزیر خارجہ سے کی اور جو تاریخی ریکارڈ میں محفوظ ہیں، اس کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نپولین ایران کو "مغرب کی فصیل" قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک ایسا قدرتی اور عجیب ملک ہے کہ جب چاہے مغرب کو مشرق کے خلاف اور مشرق کو مغرب کے خلاف کرسکتا ہے۔ چنانچہ جنگی اہمیت کے اس علاقے کو جارحیت کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور مدافعت کے لیے بھی۔ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ روسیوں کو جنگ سے باز رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ نپولین ہندوستان کی طرف پیش قدمی کررہا ہو تو روس اوپر سے لشکر کشی کردے۔ دوسرے یہ بھی ضروری تھا کہ خود اس کا مددگار ملک یعنی ایران فوجی لحاظ سے طاقتور اور خود اعتماد ہو اور اس کے پاس مضبوط توپ خانہ اور کم از کم بیس ہزار جدید گنیں ہوں۔

یہ بھی ضروری تھا کہ ایران کی ایک لاکھ چوالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل مضبوط فوج کو انتہائی سنجیدگی سے جدید عسکری خطوط پر تربیت دی جائے، تاکہ وہ نپولین کے لشکر کے ہراول دستے کے طور پر بھی اور میمنہ و یسار کے طور پر بھی کام آسکیں۔ جنرل گردانے نے 26 جنوری 1808ء کو لکھا: "آج تہران کے ہر شخص کے ہونٹوں پر یہ بات ہے کہ نپولین ایران کے راستے ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔"

تہران اصفہان اور شیراز کے فرانسیسی سفارت خانوں نے اندازہ لگا کر رپورٹ پیش کی کہ "ہندوستان کی مہم کامیاب ہونے میں پانچ سات ماہ لگ جائیں گے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ نپولین کی "گرینڈ آرمی" بذریعہ سڑک (حلب، بغداد، بصرہ، شیراز، یزد) آتی ہے یا ایک حصہ ارزروم، ہمدان، یزد اور ہرات کے راستے پیش قدمی کرے گا اور دوسرا حصہ طوروس، تہران، خراسان اور ہرات کے راستے ہندوستان پر چڑھائی کرے گا۔"

جنرل موصوف مزید لکھتا ہے: "ہر دو سپاہیوں کے لیے ایک باربردار جانور درکار ہوگا۔ بندوقیں، کارتوس اور چھرے، اور بارود کا دوسرا چھوٹا اسلحہ مقامی طور پر ساتھ کے ساتھ بنالیا جائے گا۔ ایران میں شورہ ملی درجے کا مل جاتا ہے۔ پنجاب کو سکھ جو انگریزوں سے جنگ کررہے ہیں، وہ ہماری مدد کے لیے پچاس ہزار سپاہ کا بندوبست کریں گے۔"

لیکن فتح علی شاہ نپولین کے اتحاد سے کوئی بھی فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ روس کے لشکر نے شمال سے ایران پر حملہ بول دیا۔

جنرل گردانے نے نپولین کو ایک مکتوب دوڑایا: ''خلیج فارس میں انگریزوں کا ایک وفد سر ہرفورڈ جونز کی سربراہی میں آ رہا ہے۔ یہ بڑا گھاگ اور بدمعاش آدمی ہے اور روپے پیسے سے دوسروں کو خریدنا خوب جانتا ہے۔ یہ ایرانیوں کو بھی خرید لے گا۔''

اس وقت نپولین سپین میں انگریزوں کا تعاقب کر رہا تھا، تاکہ اپنے بھائی جوزف کا تاج و تخت ان سے واپس حاصل کر سکے۔ اس کا ایران کے راستے ہندوستان پر حملہ کرنے کا عزم مصمم محض ایک ایسا خواب بن کر رہ گیا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

پہلوی خاندان کا اقتدار

انگریزوں نے میرزا محمد حسن حسینی شیرازی نامی ایک عالم مجتہد کے قلم کی نکلی ہوئی روشنائی میں اسلام کی عظمت و قوت کا مشاہدہ کیا اور دیکھا کہ انہوں نے اپنے ایک سطری فتوے سے اس وقت کی عظیم ترین طاقت برٹش ایمپائر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ فتویٰ فارسی زبان میں تھا۔ ترجمہ یہ ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ آج سے تمباکو کا استعمال چاہے، جس طرح سے بھی ہو، امام زمان سے جنگ کرنے کے حکم میں ہے۔''

انگریزوں کو اس فتوے سے اندازہ ہو گیا کہ اسلامی ممالک میں بتدریج بڑھتی ہوئی بیداری اور اسلام کی طرف ان کی بازگشت انہیں ایک بڑی مشکل سے دوچار کر دے گی، ایسی مشکل کہ بوڑھے سامراج کے لیے مستقل دردِ سر بن جائے گی اور ساری دنیا پر برطانیہ کی دائمی شہنشاہیت اور اوقیانوس پیما جہازوں کے ناخداؤں کی مطلق العنان حکومت کا خواب برباد ہو جائے گا۔ برطانیہ جیسی مستحکم حکومت کے ذمہ داروں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایران میں مسلمانوں نے میرزا شیرازی کے فتوے کی اطلاع پا کر ہی اپنے حقے توڑ ڈالے اور ناصر الدین شاہ قاچار جس نے انگریزوں سے تمباکو کا سودا کیا تھا، نے دیکھا کہ وہ خود اپنے محل کے اندر اپنی بیوی، خادمہ اور دوسرے خادموں کے ذریعے اس فتوے کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ یہ واقعہ انگریزوں کے لیے ایک بڑی شکست کے ساتھ ساتھ ایک سبق بھی تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ ایران میں ان کا مقابلہ دراصل اسلام سے ہے اور عوام اسلام کو بادشاہوں کے درباروں میں نہیں، بلکہ علماء کے فتوؤں میں ڈھونڈتے ہیں۔

ایک دوسرا تلخ تجربہ جو انگریزوں کو اسلام اور روحانیت سے ہوا ہے، وہ آئینی حکومت (مشروطیت) کی تحریک کا تھا جو علماء ہی کے ذریعے شروع ہو گئی تھی، جس کا مقصد ملک کے اندر ہونے والے مظالم کا خاتمہ، برطانوی سامراج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس مرتبہ تحریک کے طویل ہو جانے کے باعث انگریزوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے حواریوں اور ایجنٹوں، یعنی ان مغرب پرستوں اور انگریزی تہذیب کے

شیدائیوں کی مدد سے تحریک کو اس کے راستے سے منحرف کر دیں، جن کو یہ بات سازگار اور موافق نہ تھی کہ ظلم و استبداد کا خاتمہ ہو کر ایک اسلامی حکومت قائم ہو اور اس طرح شیخ فضل اللہ نوری پر تہمت لگا کر عوام کو فریب دے سکے کہ وہ خود ہی آئینی حکومت کے مخالف ہیں، تاکہ تحریک کو روحانیت کے ہاتھ سے نکالنے کے لیے زمین ہموار ہو جائے۔

شیخ فضل اللہ نوری آئینی تحریک (مشروطیت) کے بانیوں میں سے تھے۔ اپنی ذکاوت، ذہانت اور دور بینی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ برطانوی ایجنٹوں کے ذریعے تحریک کو منحرف کر دیئے جانے کا خطرہ ہے اور مغرب زدہ افراد برطانیہ کے حکم سے دستور اساسی کی تدوین مغربی طرز فکر کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں اور اس پر اسلامی رنگ و روغن لگا کر اسے اسلامی دستور اساسی کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں۔ اسے شیخ فضل اللہ نوری نے ''ایسی حکومت کہا تھا جس کی جڑیں برطانوی سفارت خانے میں پیوست ہوں۔'' انہوں نے ایسی حکومت کی شدت سے مخالفت کی اور ایک ایسی اسلامی حکومت کا مطالبہ کیا جس کا دستور اساسی قرآن کی روشنی میں بنایا گیا ہو، مغربی فکر کی بنیاد پر نہیں۔ شیخ فضل اللہ نوری کو آئینی حکومت کے ان جھوٹے طرف داروں کے ہاتھوں تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا جو ایران میں اپنی پوری کوششوں سے سامراج کی جڑیں مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ شیخ فضل اللہ نوری کو شہید کر کے یہ سامراجی ایجنٹ وزارت کی کرسیوں پر جا بیٹھے، تاکہ ایک ایسی حکومت کی حفاظت کی جا سکے جس کا نتیجہ خاندان کے سیاہ مظالم کی صورت میں ہوا۔

اب اگرچہ اسلامی تحریک کو منحرف کر کے اپنا من پسند نظام حکومت ایران میں رائج کرنے میں کامیاب ہو گئے، مگر ایک بار پھر انہیں علمائے دین کی وجہ سے جو پریشانیاں پیش آئیں، اس کی وجہ سے انہیں یہ پورا احساس ہو گیا کہ ایران میں واقعی ان کا مقابلہ اسلام اور روحانیت سے ہے۔

ایک اور بڑا تلخ تجربہ جو انگریزوں کو اسلام اور علمائے اسلام سے ہوا، 1920ء میں عراق کی اسلامی تحریک کا تھا جو اس ملک سے انگریزوں کے خاتمے کا باعث بنی۔ اس مقابلے میں بھی، جو مرزا محمد تقی شیرازی، ابو القاسم کاشانی اور ان کے والد آیت اللہ سید مصطفیٰ کاشانی جیسے علماء کی قیادت میں عمل میں آیا، انگریزوں نے ایک بار پھر عوام کے درمیان روحانیت اور علماء کے اثر و رسوخ کی طاقت کا تجربہ اور مشاہدہ کیا۔ اس تجربے کا اعادہ 1953ء میں تیل کے قومیانے کے موقع پر ہوا۔ اس مرتبہ بھی انگریزوں نے اپنے مقابلے پر اسی طاقتور عالم دین کو پایا، جس نے عراق میں ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحریک میں دوسری طاقتوں نے بھی سرگرمی دکھائی تھی، مگر سامراجیوں کو بخوبی معلوم تھا کہ اس تحریک کی اصل طاقت، جس نے گلی کوچوں کو عوام سے بھر دیا تھا، اور تحریک میں جان ڈالی تھی، وہ روحانیت ہی تھی۔ اس وقت آیت اللہ ابو القاسم کاشانی ہی تھے، جنہوں نے اپنی جوانی کو جیل اور جلاوطنی کے لیے قربان کر دیا تھا۔ جو عالم جوانی سے عالم پیری تک قید خانوں کی ناقابل بیان سختیاں جھیلتے رہے۔ اس بار بھی سامراجیوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اس تحریک کو بھی اصلی راستے سے منحرف کر کے علماء اور روحانیت اور اخلاقی اقدار کو اس تحریک سے جدا کر دیں جو اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور ایک نئے سامراج یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکا کی آمد کے لیے میدان ہموار کر دیں۔

بیسویں صدی میں جو حادثات رونما ہوئے ہیں، وہ دو لحاظ سے قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ایران اور عراقی عوام کم از کم گزشتہ ایک صدی سے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اور اس جدوجہد میں علماء ہی پیش پیش رہے ہیں اور انہی کے ہاتھوں میں قیادت رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمباکو کے مسئلے میں میرزا شیرازی نے سامراجیوں کے لیے جو مصیبت کھڑی کر دی تھی، اس کی وجہ سے وہ لوگ ہمیشہ اس نکتے پر توجہ رکھنے لگے تھے۔ عوام کو سامراج کے مقابلہ پر جو چیز لا سکتی ہے، وہ اسلام ہے اور وہ افراد جو اسلام کو عوام میں ترویج دیتے ہیں، ان کو اسلام سے آشنا کرتے ہیں اور انہیں اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر حرکت میں لاتے ہیں، وہ میرزا شیرازی شیخ فضل اللہ نوری، آیت اللہ کاشانی اور دوسرے حقیقت شناس علماء ہیں۔

دراصل یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکا کے سامراجی عناصر تمباکو کے معاملے میں پہلا تلخ تجربہ حاصل کرنے کے بعد بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے کہ کیوں نہ ایرانیوں کی تحریک احیائے اسلام کی جڑ ہی کاٹ دی جائے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان اصولی طور پر اسلام کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے، لہٰذا کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کو باور کرایا جائے کہ انگریز اسلام کے خلاف کوئی مخاصمت نہیں رکھتے، بلکہ اسلام کے بہت بڑے حامی ہیں۔

پہلوی خاندان کا اقتدار

ایران میں اسلام کو مٹانے کی ذمہ داری رضا خان کو سونپی گئی۔ رضا خان کون تھا؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے آیئے اس کے فرزند رضا شاہ پہلوی کی خودنوشت سے چند متعلقہ اوراق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ رضا شاہ لکھتے ہیں

"1907ء میں جب روس اور برطانیہ میں معاہدہ طے پایا، ہمارے والد بزرگوار کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اس وقت وہ ایک ایرانی کاسک یونٹ کے کمانڈر تھے۔ وہ بہت عظیم اور قوی الجثہ آدمی تھے۔ جاگیرداروں کے پالے ہوئے غنڈوں، بدمعاشوں اور لٹیروں کے دل ان کا نام سنتے ہی لرز اٹھتے تھے۔ ادیبوں، صحافیوں، مصوروں، مجسمہ سازوں اور فوٹوگرافروں نے اپنے اپنے فن کے میدان میں انہیں مناسب ہدیہ عقیدت پیش کر رکھا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے چھڑنے سے پہلے میکسم گن کی وجہ سے ان کا نام "میکسم رضا" پڑ گیا تھا۔ ان کا ایک ایسا فوٹو اب تک محفوظ ہے جس میں مشین گن لیے کھڑے ہیں اور خود اس گن پر بھی گولیوں کے نشانات لگے ہیں۔ اس وقت ملک میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مشین گنیں موجود تھیں۔ والد صاحب کی شہرت روز بروز پھیلتی جا رہی تھی۔ 1915ء میں جب ایران، ترکوں اور جرمنوں اور دوسری طرف روسیوں اور انگریزوں کے مابین میدان جنگ بن گیا تو اس بات سے والد صاحب کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس پر انہیں غصہ بھی آتا تھا۔

1919ء میں معاہدہ ورسیلز کے بعد ایران محض برطانیہ کی ایک نوآبادی بن کر رہ گیا۔ البتہ شمالی صوبوں میں بالشویک انقلاب کے اثرات پہنچ چکے تھے اور کسی بھی وقت وہاں کمیونزم کی فتح کا اعلان ہو سکتا تھا۔"

"کئی بار کوششوں کے باوجود موت نے ان کے قریب آنے سے انکار کر دیا، اور وہ برابر دلیری اور جرأت

سے دشمن کے خلاف کارروائیاں کرتے رہے۔ بالشویک انقلاب کے موقع پر انہوں نے روسی افسروں کو مار مار کر ایران سے نکال باہر کیا اور ایرانی کاسکوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کاسک (قزاق) ایک تاتاری قبیلے کا نام ہے جو بحر اسود کے شمال میں آباد ہے، اور جس کے افراد اکثر روسی رسالوں میں بھرتی ہوئے ہیں۔ اب وہ ڈھائی ہزار افراد کے گھڑسوار رسالے کے کمانڈر تھے اور مقام تھا غزوین۔ یہ مقام جنگی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا اور انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ یہ 20 اگست 1920ء کی بات ہے کہ انہیں محسوس ہوا کہ یہ ان کے مادر وطن کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے اور اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔''

''انہوں نے انتہائی خفیہ طریقے سے تہران کا محاصرہ کر لیا اور 23 فروری 1921ء کو اس زمانے کے حکمران احمد شاہ کو شکست پر مجبور کر دیا۔ یہ محاصرہ اتنا کامیاب تھا کہ چند روز کے اندر اندر بغیر خون خرابے کے حکومت تبدیل ہو گئی۔ ایران میں انگریز افواج کے کمانڈر جنرل آئرن سائڈ نے بعد میں کہا: ''رضا خان واحد آدمی تھا جو ایران کو بچا سکتا تھا اور اس نے بچا لیا۔''

''یہ وہ وقت تھا جب دنیا کی آنکھیں کمال اتاترک پر لگی ہوئی تھیں جو ترکی کو ایک جدید مملکت بنانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ والد صاحب (رضا خان) اتاترک کے زبردست مداح تھے اور ترکی کا وہ عظیم سیاست دان بھی والد صاحب کو دل سے پسند کرتا تھا۔ والد صاحب بھی انہی خطوط پر ایران کو ایک جدید، خوشحال اور فلاحی مملکت بنانے کے لیے خواب دیکھتے تھے، جن خطوط پر اتاترک اپنے وطن ترکی کو ایک عظیم سلطنت بنا رہے تھے۔

کٹر قسم کے شیعہ مولوی اور بیشتر سیاست دان اور تاجر ایران کو ایک ''جمہوریہ'' بنانے کے سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ترکی کے برعکس ایران کے حالات مختلف ہیں۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف زبانیں بولنے والی مختلف نسلیں اور قومیتیں آباد ہیں۔ یاد رہے کہ اسلام میں ملائیت کی فی الحقیقت کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چونکہ لغت میں کوئی بہتر لفظ موجود نہیں ہے، اس لیے لفظ مولوی یا ملا کا مطلب ہے، قرآن کا سکالر، دینیات کا جاننے والا۔ کبھی کبھی غلطی سے مولوی کو عالم دین کا مترادف بھی سمجھا جانے لگتا ہے۔ عوام الناس پر ظاہر ہے کہ ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے اور اسی اثر رسوخ کے حساب اور تناسب سے مولویوں کے درجے اور سلسلے بھی قائم ہیں۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی اس سے بڑا اور کوئی اس سے بھی بڑا۔ ملا وہ ہے جس نے قرآن مجید پڑھ رکھا ہو۔ ''حافظ'' وہ ہے جس نے کلام پاک حفظ کر رکھا ہے۔ ''آیت اللہ'' پہلے زمانے میں علماء و فضلاء کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اب یہ بڑا امتیاز مخاطب کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے جناب، مسٹر، جناب والا کے کلمات۔ لفظ ''امام'' ایران میں صرف بارہ اماموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

''ہاں تو شیعہ مولویوں، سیاست دانوں اور تاجروں کا یہ خیال تھا کہ ایران میں وحدت و سالمیت قائم کرنے کے لیے بادشاہت کی ضرورت ہے، جمہوریت کی نہیں۔ چنانچہ ان حالات میں 31 اکتوبر 1925ء کو پارلیمنٹ نے قاچار حکومت کے خلاف ووٹ دے کر قاچاریوں کی حکومت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ ایک نئی دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا، جس کے تمام ارکان نے (چار کو چھوڑ کر) اتفاق رائے سے جنرل رضا خاں کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ کیا۔

جنرل رضا خان بادشاہ بننے کے بعد رضا شاہ پہلوی کہلائے۔ ''پہلوی'' کا لفظ انہوں نے ایران کی قدیم تاریخ سے اخذ کیا۔ ساسانیوں کے عہد میں ایران کے شہنشاہوں کی سرکاری زبان بھی پہلوی کہلاتی تھی اوران کی تحریروں اورا حکام کو بھی پہلوی کہا جاتا تھا۔ تاریخ ایران کی یہ میراث یعنی لفظ ''پہلوی'' انہوں نے ہمارے حوالے کی اور ہم اپنی اولاد کو عطا کریں گے۔

''تاج پوشی کی رسم 25 اپریل 1926ء کو ادا ہوئی۔ رسم کے دوران میں ایک اعلان یہ بھی ہوا کہ ہم بادشاہ حضور کے شہزادے اور جانشین ہوں گے۔ اس وقت ہماری عمر صرف سات برس کی تھی۔

جنرل رضا خان کے کارنامے

ان کے فرزند رضا شاہ کی نظر میں

اب پہلوی خاندان کے بانی جنرل رضا خان کا تذکرہ رہے گا، اس لیے کہ ایران میں مغرب زدگی کی وبا اس نے بالکل اسی طرح پھیلائی جس طرح اس کے ہم عصر جنرل مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں پھیلائی، جس کے مضر اثرات سے آج تک نہ ترکی نکل سکا نہ ایران، آج بھی دونوں مسلم ملکوں پر مغربی حکمرانوں کا سخت دباؤ ہے۔ تاہم فی الحال پہلوی خاندان کے طرزِ حکومت کا وہ رخ پیش کیا جا رہا ہے، جو رضا خان اور اس کے بیٹے رضا شاہ اوران کے حواریوں نے پیش کیا۔ آمریت واستبداد کے طرف داروں کے نقشہ پیش کرنے کے بعد ہم ان کا اصل چہرہ دکھائیں گے۔ (پڑھتے وقت اپنے پاکستان میں بھی آمروں کے چہرے دیکھتے جایئے!)

رضا شاہ (1919ء۔1980ء) اپنے والد کی تعریف وتوصیف اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں: ''مشرق کے بادشاہوں کا ساطنطنہ اور دیگر خصوصیات ان میں مطلق نہ تھیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی ایک طرح کی فوجی خدمت سمجھتے تھے۔ فرش پر سادہ گدے پر سوتے تھے۔ صبح پانچ بجے سو کر اٹھتے تھے۔ دن میں صرف دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ باقی وقت کام میں مشغول رہتے تھے۔ انہیں کام کا جنون تھا۔''

''اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد ایران اور روس نے باہم دوستی اور عدم جارحیت کا معاہدہ کیا، جس کی رو سے سابقہ حکومتوں کے تمام معاہدے اور مراعات وغیرہ ختم ہوگئے۔ 1919ء کا برطانیہ اور ایران کا معاہدہ کالعدم قرار دیا۔''

''پہلا کام یہ کیا کہ اچھی فوج بنائی۔ جلد ہی ایک انفنٹری ڈویژن کھڑی کر لی گئی۔ ایک خودکار بریگیڈ اور چند سپیشل یونٹیں بنائیں۔ قومی شاہراہ پر اہم مقامات پر چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کرائے۔ اس کے بعد انہوں نے پہلے نیوی بنائی۔ پھر ایئر فورس منظم کی۔ نئی مسلح فوج کے اولین کمانڈر فرانسیسی افسروں پر مشتمل تھے۔ ایرانی افسروں کو تربیت کے لیے فرانس بھیجا جانے لگا۔ وہاں کی مشہور ملٹری اکیڈمی سینٹ سائر، جو نپولین نے قائم کی تھی، ایرانی افسروں کی تربیت گاہ بن گئی۔''

''فوجی طاقت کے پہلو بہ پہلو صنعت وحرفت کی ترقی کے لیے ایک نظام بنایا۔ اشیاء صرف ملک ہی میں بنائی جائیں اور درآمدات پر کم سے کم انحصار کیا جائے۔ والد محترم کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ زرعی اصلاحات برپا کر کے کسانوں اور کاشت کاروں کے لیے کام کریں، لیکن قدرت نے مہلت نہ دی۔''

''رفتہ رفتہ والد صاحب نے تمام غیر ملکی اجارہ داریوں کو ختم کر دیا۔ کسٹم ڈیوٹی وغیرہ جو سابقہ حکومت نے بلجیم کو پٹے پر دے رکھی تھی، اسے اپنے حق میں واگزار کرایا۔ اور اب اس کی آمدنی کو بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی کے لیے صرف کیا جانے لگا۔ ہماری پولیس سویڈن کے ہاتھوں میں تھی۔ ملک میں جتنے بھی بنک تھے، روسیوں کے تھے یا انگریزوں کے۔ بنک نوٹوں کے اجراء پر بھی انگریزوں کی اجارہ داری تھی۔ تار اور تار برقی کے محکمے بھی انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ ان تمام چیزوں کو موقوف کر دیا گیا اور سونے اور ہیرے جواہرات کی بنیاد پر نئے نوٹوں کا اجرا کیا گیا۔ یہ ہیرے، اور جواہرات ایران کے لیے نادر شاہ ہندوستان سے لایا تھا۔''

''کوہ نور اس وقت بے شک برطانوی تاج کی زینت بنا ہوا ہے، لیکن دریائے نور ہمارے پاس بھی ہے جو غالباً کوہ نور سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ قیمتی ہیرا دیگر ہیروں اور جواہرات کے ساتھ تہران کے سنٹرل بنک میں محفوظ ہے۔ اس بنک میں ایسی متعدد تجوریاں ہیں جو موتیوں، ہیروں اور جواہرات سے بھری پڑی ہیں۔''

''والد صاحب نے نئی بستیاں آباد کیں۔ نئے قصبے تعمیر کرائے۔ سکول کھولے۔ ایران کی پہلی یونیورسٹی قائم کی۔ ہسپتال کھولے۔ کارخانے کھولے۔ سڑکیں بنوائیں۔ بندرگاہیں اور اولین بجلی گھر قائم کیے۔ اس وقت کوئی قومی کرنسی نہ تھی۔ نیشنل سٹیٹ بنک سے مرکزی حکومت کی ضمانت پر کاغذی نوٹ جاری کرائے۔ 1927ء میں ٹرانس ایرانی ریلوے کی تعمیر وتنصیب کا کام شروع کیا جو 1939ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ ریلوے لائن 1500 کلومیٹر لمبی ہے جو بحیرۂ کیسپین سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔''

''1936ء میں ایران میں فرانس کے طرز اور نمونے پر عدالتی نظام قائم کیا گیا۔ لازمی پرائمری تعلیم کا آغاز کیا گیا، حالانکہ قابل اور تربیت یافتہ اساتذہ کا قحط تھا۔ جدید قانون اور جدید تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''مولوی'' کو جو احتساب وقضا کے اختیارات حاصل تھے، وہ بہت حد تک محدود ہو گئے۔''

اس تبدیلی پر تبصرہ آرائی فرماتے ہوئے شاہ ایران لکھتے ہیں: ''اس بنیادی تبدیلی کی اہمیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ مشرق قریب کے تقریباً تمام اسلامی ممالک میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ ایک جدید سیاسی نظام، جو بلاشبہ مغرب سے ماخوذ تھا، مولوی کی خوشنودی حاصل نہ کر سکا، کیونکہ جدیدیت نے مولوی کے بے شمار حقوق و امراعات سلب کر لیے ہیں اور اس سے اس کے مفادات کو ضعف پہنچا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایسے نازک موڑ پر اپنی روحانی دولت میں اضافہ کرتے اور سیرت وکردار کو بلند کرتے، انہوں نے سیاسی اقتدار اور سیاسی سرگرمی ہی کو اپنی کل کائنات بنا لیا۔ جہاں تک کمیونسٹوں کا تعلق ہے، انہوں نے بھی اپنے اصل نظریے سے منافقت، بے وفائی کی اور کمیونزم سے انحراف کرتے ہوئے ''اسلامی کمیونزم'' کی اصطلاح وضع کی، تاکہ مسلمانوں کو اس بہانے کمیونزم کی طرف مائل کیا جا سکے، لیکن کمیونزم اور اسلام میں منطقی ضدین کا بھی فاصلہ ہے اور قطبین کا بھی۔''

"اگر ہمارے والد صاحب بعض کٹر قسم مولویوں کے سیاسی عزائم کا سختی سے مقابلہ نہ کرتے تو جس کام کا انہوں نے بیڑا اٹھایا تھا، اسے پورا کرنا، ان کے لیے بہت دشوار ہو جاتا، ایران کا ایک جدید مملکت کے طور پر ابھرنا ممکن نہ ہوتا۔ چونکہ وہ رجعت پسند، جنونی، خبطی، فرقہ پرست مولویوں کی عزت نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ لامذہب اور بے دین ہیں حالانکہ وہ سچے اور مخلص مسلمان تھے۔ وہ دیانت، سچائی اور شجاعت پر عقیدہ رکھتے تھے۔۔۔۔ مولوی کے روحانی اقتدار اور منبر پر اس کی عظمت و بالاتری کو بالکل نہیں چھیڑا گیا، نہ اس کی حیثیت و اہمیت کا مقابلہ کیا گیا، نہ کیا جا سکتا تھا۔ دین کو دنیا پر جو تفوق حاصل ہے، وہ ایک مسلّمہ تھا اور ہے۔ اصل مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایران کو بیسویں صدی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا جائے۔ اسے جدید بنایا جائے (اور مولوی صاحبان وقت کو پیچھے کی طرف پلٹانے کی کوشش کرتے ہیں)۔ والد صاحب کا ادعا یہ تھا کہ بیسویں صدی میں کوئی قوم جو ابہام، اوہام، ظلمت کا شکار ہو، وہ ہرگز پنپ نہیں سکتی۔ روحانیت ایک ایسی چیز ہے جس کو سیاست و معاشیات سے بلند و ماوراء رہنا چاہیے۔ وہ مخلص اور عظیم مسلمان تھے۔"

"انہوں نے کمیونزم اور کفر و الحاد کی قوتوں کا بھی سختی سے مقابلہ کر کے اپنے مذہب کو مادہ پرستی سے بچایا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسا کرتے وقت انہوں نے مولویوں کے مطالبات کو بھی تسلیم کر لیا جو اپنے عقائد و اعمال میں بہت رجعت پسند اور پچھلے زمانے کے لوگ تھے۔"

"انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایران کے شہریوں کو پرانے زمانے کا مشرقی لباس۔۔۔۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے، چوڑی موری کے پاجامے، بھاری بھرکم پگڑیاں اور ٹوپیاں۔۔۔۔ ترک کر دینا چاہیے۔ بعض لوگوں کو اس فیصلے سے تکلیف پہنچی اور ان کی بھوں چڑھائی۔ اور جب عورتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے برقعے اتار پھینکیں اور سیاہ نقابیں اتار کر مردوں کے شانہ بشانہ میدان عمل میں آئیں تو بعض مولویوں نے اسلام کے نام پر ان کی سخت مخالفت کی۔ ہم نے بھی والد محترم سے ان فیصلوں پر سختی سے عمل کرایا۔"

دوسری جنگ عظیم

اب ایران کی حالیہ تاریخ مزید تیزی سے یوں آگے کو بڑھی کہ 3 ستمبر 1939ء کو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ جنگ کے ابتدائی زمانے میں، اور پھر اپریل 1941ء تک، جب تک محوری طاقتوں نے بلقان پر جارحانہ حملہ نہیں کیا، خیال یہی تھا کہ اس خوفناک جنگ میں ایران کو ملوث نہیں کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ جب 22 جون 1941ء کو روس پر حملہ ہوا، تب بھی ایران نے بڑے دعوے کے ساتھ اپنی غیر جانب داری کا ایک بار پھر اعلان کیا۔

روس کی حالت پتلی ہو گئی۔ اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اتحادیوں سے مدد طلب کی جائے۔ رسد اور کمک کا شمال سے آنا دشوار تھا۔ بحیرۂ روم کی طرف سے آنا ممکن نہ تھا۔ ترکی نے آبنائے بند کر دی تھی۔ جنرل رومیل نے شمالی افریقہ پر چڑھائی کر رکھی تھی اور اسکندریہ کسی بھی وقت اس کے تسلط میں آنے والا تھا۔ بلغاریہ اور یونان جرمنی کی ماتحتی میں پہلے ہی جا چکے تھے۔ 1942ء کی گرمیوں میں جرمنی کی یونٹیں کوہ قاف میں مائکوپ کے تیل کے مرکز تک پہنچ چکی تھیں۔

اتحادی طاقتوں کے لیے روس کی مدد کرنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا، اور وہ تھا خلیج فارس کا راستہ۔ پس ایران ایک بار پھر سیاسی اعتبار سے نہ سہی، جنگی اعتبار سے نہایت اہم علاقہ بن گیا۔ عین اس زمانے میں اٹلی کے طیاروں نے خلیج فارس کے علاقے میں دو تین بم گرا دیئے۔ کہا یہ گیا کہ خلیج میں جرمنی کے جو تجارتی جہاز موجود ہیں، وہ فوج کے ہیں اور مسلح ہیں۔ روس کو رسد اور کمک بھیجنے کے لیے ایران کا راستہ کھولنے پر اتحادی طاقتوں سے معاہدہ ہو سکتا تھا۔ لیکن برطانیہ نے معاملے و پسِ پشت ڈال دیا۔

ادھر تہران میں روس اور برطانیہ کے سفیر ایران پر سخت دباؤ ڈال رہے تھے کہ ایران میں جرمنی کے جتنے بھی کاریگر اور ماہرین کام کر رہے ہیں، انہیں نکال باہر کیا جائے۔ ایرانی حکومت بھی اس مشکل صورت حال سے نکلنے کی تدبیریں سوچ رہی اور کوئی مناسب اقدام کرنے والی تھی کہ 22 اگست 1941ء کی صبح کو، کسی قسم کی وارننگ یا چیلنج کے بغیر دونوں طاقتوں کی متحدہ افواج نے ایران پر حملہ کر دیا۔

شمال کی طرف سے روس کی بکتر بند ڈویژن نے آذربائیجان کی سرحد عبور کی۔ دوسری روسی یونٹیں خراسان کے مشرق میں، اور پوری مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ پوری طاقت سے آگے بڑھیں۔ پانچ برطانوی ڈویژن جنوب مشرق، مغرب اور جنوب سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ رائل ایئر فورس کے بمبار طیارے اہواز، بندر شاہ پور اور خرم شہر کے فوجی ٹھکانوں پر ٹھیک ٹھیک بمباری کر رہے تھے، لیکن انہوں نے تیل کے کارخانوں کو دانستہ معاف کر رکھا تھا، کیونکہ وقت پر ان کے کام آئیں گے۔ 25 اگست کو رائل نیوی کے ایک جنگی جہاز نے آبادان کے قریب ایران کے ایک جہاز کو ڈبو دیا۔ سوویت روس کی فضائیہ نے تبریز، غزدین، بندر پہلوی، فزاجیہ اور رشت کے قصبوں پر بمباری کی۔

28 اگست کو رضا شاہ پہلوی نے اپنی فوج کو ہتھیار رکھ دینے کا حکم دیا۔ ان کو وارننگ دی گئی تھی کہ ہتھیار نہ ڈالے گئے، تو 17 ستمبر کو اتحادی افواج تہران کے محصور شہر میں داخل ہو جائیں گی۔

17 ستمبر 1941ء کو رضا شاہ پہلوی تاج و تخت سے دست بردار ہو گئے۔ پارلیمنٹ کے سامنے یہ اعلان وزیر اعظم فروغی نے پڑھ کر سنایا:

> ''میں نے اللہ اور قوم کی تائید کے ساتھ اپنے پیارے بیٹے محمد رضا پہلوی کے حق میں دست بردار ہونے کا نازک فیصلہ کر لیا ہے۔''

دست برداری کے بعد رضا شاہ نے جلاوطنی اختیار کی۔ 1944ء میں جوہانسبرگ کے مقام پر وفات پائی۔ اس وقت نئے اور آخری بادشاہ محمد رضا کی عمر بائیس سال تھی۔

تصویر کا دوسرا رخ

حقیقت یہ تھی کہ رضا شاہ کو ایران میں اسلام اور اسلامی روایات کو مٹانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اور یہ کام انہوں نے ذاتی دلچسپی اور تن دہی سے انجام دیا۔ اس وقت تک سلطنت برطانیہ کا سورج غروب ہو رہا تھا اور مغرب ہی میں امریکا کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ ساتھ اب امریکیوں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک یہ خاندان مغرب نوازی کے پردے میں اسلام کشی کی ذمہ داری نبھا رہا ہے، اس وقت تک اسے برقرار رکھا جائے۔

پہلوی خاندان (یعنی باپ اور پھر بیٹے نے) اس خیانت آمیز ذمہ داری کو اس مہارت سے انجام دیا کہ امریکا نے ان کو مزید ترقی دینے کے لیے، اپنی اس پٹھو حکومت کو مشرق وسطیٰ میں سامراجی (بلکہ سی آئی اے) ایجنٹ کی حیثیت سے منتخب کر لیا اور خلیج فارس اور بحیرۂ عمان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری رضا شاہ کو سونپ دی گئی جو مغرب کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ رضا خان کو یہ واضح ہدایت بھی کر دی گئی کہ وہ اسرائیل کے ساتھ تعاون کرے اور علاقے کی رجعت پسند حکومتوں کو مستحکم بنائے۔

مغربی، بالخصوص امریکی سامراج نے تمام اسلامی ممالک سے اسلامی تہذیب کو مٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا، تاکہ وہ اس طرح مسلمانوں کو کمزور کر کے اپنی راہ سے تمام روڑے ہٹا سکے۔ اپنے سب سے پہلے اقدام کا آغاز رضا خان پہلوی کی مدد سے ایران میں کیا۔ مرد و زن کی شناخت ختم، یکساں لباس، عریانی، دینی مدارس کی تخریب، اور زندگی کے ہر گوشے میں مغربیت کی ترویج، یہ سب چیزیں ماضی میں ناصر الدین قاچار نے بھی ایرانیوں سے زبردستی اختیار کرائی تھیں، مگر رضا خان نے تو سرگرمی اور فعالیت دکھانے میں کمال کر دیا۔

5 جون 1963ء کی چنگاری

ایران میں مغربی تہذیب کی ترویج کے لیے متعدد اقدامات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ایرانی نوجوانوں کو حصول تعلیم کی غرض سے یورپی ممالک میں بھیجا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی خوب برین ''واشنگ'' کی جائے اور اسلام کو ایک قدیم، فرسودہ اور ماضی پرست مذہب بتا کر انہیں جدیدیت کی راہ پر لگایا جائے۔ یہاں تک کہ انہیں ''اسلامک سٹڈیز'' کے نام پر بھی یورپ بھیجا جاتا تھا۔ وہاں سے وہ اسلام کا ایسا جدید تصور لے کر آتے تھے، جس سے اسلام کی روح یکسر غائب ہوتی ہے۔ یہ مغرب زدہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان چونکہ جدید سائنسی و معاشرتی علوم کے ماہر ہوتے تھے اس لیے انہیں پہلوی حکومت سرکاری ملازمتوں میں ترجیح دیتی تھی، انہیں یورپ میں تعلیم دلوانے پر بھی بے دریغ خرچ کرتی تھی، اور سرکاری ملازمتوں میں بھی زیادہ مشاہروں پر انہیں فوراً ابھرتی کیا جاتا تھا۔

اسلام کے دائرے میں رکھتے ہوئے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کا یہ منصوبہ صرف ایران ہی کے لیے مخصوص نہ تھا، بلکہ مختلف انداز سے تمام اسلامی ممالک، انڈونیشیا سے لے کر لیبیا اور تیونس تک پھیلا ہوا تھا۔ خصوصاً ترکی میں کمال اتاترک کے ذریعے پوری شدت سے علمی جامہ پہنایا گیا۔ چونکہ کمال پاشا کے لیے حالات سازگار تھے، اس لیے اس نے سامراجی مقاصد کو پورا کرنے میں جلدی کامیابی حاصل کر لی اور بڑی تیزی کے ساتھ اس نے اسلامی بلکہ قومی تمدن اور ثقافت کو بھی مسخ کر دیا۔

انگریزوں کو جب یہ احساس ہو گیا کہ جنرل رضا خان ایران میں مغربیت کی ترویج کی مہم میں اب زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا تو اسے ہٹا کر اس کے بیٹے محمد رضا کو برسر اقتدار لے آئے، جس کی تعلیم و تربیت یورپ میں ہوئی تھی اور جس کی ساخت پرداخت پہلے ہی سامراجی اور امریکی مقاصد کے لیے کی گئی تھی۔ محمد رضا ایک بے عزم، بے ارادہ کٹھ پتلی تھا، جو اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ ہر اشارہ امریکا سے آتا تھا۔ وہ امریکا کے ہاتھوں بکا ہوا

تھا، مگر چونکہ ملک میں اس کی پوزیشن زیادہ مضبوط نہیں تھی، اس لیے وہ سامراجی مقاصد کو ان کے حسب دل خواہ پورے نہیں کر سکا۔ البتہ 1953ء کی فوجی بغاوت کے بعد شاہ نے امریکا کی مدد سے کسی حد تک اپنی پوزیشن مضبوط کر لی اور اسلام کو مٹانے یا دوسرے لفظوں میں مغربیت کو پھیلانے میں تیزی سے عمل درآمد شروع ہو گیا۔

مارچ 1961ء میں آیت اللہ بروجردی کا انتقال ہوا جو ایران کے ایک سربرآوردہ عالم تھے اور عام ایرانیوں پر ان کی شخصیت کا بڑا اثر رسوخ تھا۔ امریکا نے یہ سمجھا کہ ان کی وفات کے ساتھ ایرانیوں پر علمائے دین کا اثر بھی ختم ہوا۔ یہی موقع ہے کہ مغربیت کے اثرات پوری شدومد سے پھیلائے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے شطرنج کی بساط پر پیادہ محمد رضا کو شاہ بنا دیا۔ لیکن جب شاہ کی وساطت سے صوبائی اور ریاستی اداروں میں آزمائشی طور پر مداخلت کی جانے لگی اور عام ایرانیوں کا شدید ردعمل سامنے آیا تو امریکا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ علماء اور روحانیت کے اثرات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ شاخیں کاٹنے سے کام نہ چلے گا۔ شجر اسلام کو جڑ سے کاٹنا پڑے گا۔ خصوصاً قم کے علماء کی بیخ کنی کرنی پڑے گی، کیونکہ وہاں خمینی کے علم، تقویٰ اور خطابت کی شہرت بہت زیادہ ہے۔

1961ء کے بعد سے جو احیائی تحریک ایران میں مغربیت کے خلاف چلی، وہ نقطۂ آغاز نہ تھی، بلکہ اس طویل جدوجہد کی ایک کڑی تھی جو گزشتہ ایک صدی میں سامراجیوں اور استحصال پسندوں کے خلاف علماء کی سرپرستی میں چل رہی تھی جواب خمینی کے مبارزے اور جدوجہد کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ خمینی کی جدوجہد 1940ء میں رضا خان پہلوی کے دورِ حکومت ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت زمانۂ شباب میں انہوں نے "کشف الاسرار" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جس میں رضا خان پہلوی اور اس کے مربی برطانیہ اور امریکا کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا تھا اور ان پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ خمینی ان علماء میں نمایاں تھے جو ہمیشہ رضا خان پہلوی کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے رہے۔ لیکن آپ کا کمال یہ تھا کہ عین زمانہ ستم میں اپنے بیٹے مصطفیٰ خمینی اور اپنے شاگردوں کی تربیت کے لیے زبردست کوشش کرتے رہے، تاکہ وہ مستقبل میں تحریک کو آگے بڑھانے کے لائق ہو سکیں۔

خمینی قوم پرستوں اور بعض علماء کی طرح شاہ سے تعاون اور ساز باز کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ بادشاہت اور ملوکیت کی بجائے "اسلامی حکومت" کے قیام کی خواہش اور کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے ہمیشہ امریکا اور اسلام کے منصوبوں اور سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے زبردست، مدلل اور پرجوش تقریریں کیں اور ہر موقع پر ایرانی قوم کو پیغامات دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی شخصیت پوری دنیا میں ایک بیدار مغز اور شجاع، عالم باعمل کی حیثیت سے مشہور ہو گئی۔ امریکا ہمیشہ آپ کو اپنے مقاصد کی راہ میں ایک زبردست روڑا سمجھتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ آپ کو کسی نہ کسی حربے سے راہ سے ہٹا دیا جائے۔

ایرانی انقلاب اور خمینی

ایران میں بادشاہت کا اختتام اور اسلامی انقلاب کا آنا ساری دنیا کے لیے حیرت اور تعجب کا باعث ہوا۔ ایرانی ذرائع ابلاغ اور جدید ایرانی ادب، کسی کے مطالعے سے یہ محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ایران اسلامی انقلاب کی

دہلیز پر آ گیا ہے، البتہ زیریں سطح پر اسلام کے احیاء کی آرزو قاچار خاندان کے وقتوں ہی سے زیریں سطح پر پختہ ہو رہی تھی۔ ایرانی خواص اور حکمران طبقے پر مغربی تہذیب کی گرفت بہت مضبوط ہو چکی تھی لیکن عوام پر ہمیشہ سے علماء کا اثر تھا۔ البتہ اسلامی بنیاد پر کام کرنے والی کوئی مضبوط تحریک موجود نہ تھی۔ تیل کو قومی ملکیت بنانے کے زمانے میں آیت اللہ کاشانی کی زیر قیادت "فدائیان اسلام" کی تحریک نے زور پکڑا تھا لیکن اس تحریک نے تدبر اور سیاست سے کام لیا۔ اس نے جذباتی رنگ اختیار کر لیا تھا، جس کی وجہ سے اسے کچل دیا گیا۔ اس زمانے میں ایرانی سینیٹ کے ایک رکن ظہیر الاسلام نے پاکستان کی "قرارداد مقاصد" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ قرارداد اسلام کی تاریخ میں ایک زرین باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایران کو بھی چاہیے کہ اپنے ذہن اور فکر کو مسلمان بنانے کے لیے ویسی ہی قرارداد منظور کرائے۔"

ظہیر الاسلام کے اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں صحیح اسلامی خطوط پر سوچنے والے موجود تھے، لیکن شاہ ایران کی جمہوریت کش پالیسی اور استبدادی حکومت نے اسلام پسند لوگوں کے لیے کام کرنے کے تمام جائز راستے بند کر دیے تھے، جس کی وجہ سے یہ تحریک زیر زمین کام کرتی رہی۔ بالآخر جب شاہ کی آمریت اور استبداد کے خلاف عوام کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ بادشاہت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو علماء نے قیادت کا خلا کامیابی سے پُر کر دیا اور عوام کی بروقت رہنمائی کر کے اسلامی انقلاب کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انقلاب کے ہیرو آیت اللہ خمینی ہیں، جن کی قیادت کو علماء نے بھی صدق دلی سے قبول کیا۔ ایران میں علماء کے دو طبقے ہیں۔ علمی اور دینی حیثیت سے بلند عہدوں پر فائز علماء کو آیت اللہ العظمیٰ کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے درجے کے علماء کو صرف آیت اللہ کہا جاتا ہے۔ دار التبلیغ الاسلامی کے نام سے قم میں ایک علمی اور دینی مرکز قائم ہے۔ قم تہران سے 75 میل جنوب میں اہل تشیع کا اہم مذہبی اور علمی مرکز ہے۔ امام رضا کی ہمشیرہ اور امام موسیٰ کاظم کی دختر فاطمہ معصومہ کا روضہ اسی شہر میں ہے۔ روضہ کی عمارت ناصر الدین قاچار نے تعمیر کرائی تھی۔ آیت اللہ خمینی قم کے مرجع علماء میں سے ہیں۔ "مرجع" کا رتبہ آیت اللہ سے بڑا ہوتا ہے۔ باقی تین مرجع آیت اللہ کاظم شریعت مداری، آیت اللہ مرعشی اور آیت اللہ گل پائیگانی ہیں۔ اگرچہ ان میں خمینی مرجع اعلیٰ کبھی نہیں رہے، لیکن اسلامی انقلاب کی قیادت کر کے انہوں نے عوام کی مقبولیت حاصل کر لی۔

آیت اللہ خمینی 24 ستمبر 1902ء کو ایران کے قصبے خمین میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا سید احمد موسوی لکھنؤ (انڈیا) کے رہنے والے تھے اور نجف (عراق) میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد خمین میں آباد ہو گئے تھے۔ خمینی کے والد مصطفیٰ موسوی وہیں ایک ایرانی خاتون کے بطن سے پیدا ہوئے۔ خمینی ابھی پانچ ماہ کے تھے کہ ان کے والد کو شرپسندوں نے قتل کر دیا۔ خمینی نے اصفہان، ارک اور مشہد سے تعلیم حاصل کی اور 1927ء میں قم کے حوزہ علمیہ سے اجتہاد کی سند حاصل کی، جس کے بعد انہوں نے درس دینا شروع کر دیا۔ وہ دار العلوم قم میں ہفتے میں ایک دن خطبہ دیتے تھے۔ ان کے یہ خطبے بڑے مقبول ہوئے۔ یہ خطبے جمال الدین افغانی کے خطبوں کی یاد دلاتے تھے، جن میں اتحاد اسلامی کے ساتھ ساتھ شاہ کی آمریت کے خلاف بھی مدلل اور انقلاب خیز بیانات دیے جاتے تھے۔ خمینی اپنی

تقریروں میں خاص طور پر حکومت کے غیر اسلامی اقدامات پر شدید تنقید کرتے تھے۔

خمینی کی گرفتاری

3 جون 1963ء کو قم کے مدرسہ فیضیہ میں عاشور کے دن خمینی نے ایک زبردست انقلاب خیز تقریر کی، جس میں انہوں نے اسلام دشمن روش سے اجتناب نہ کرنے کی صورت میں شاہ کو ایران سے نکال باہر کرنے کی سخت دھمکی دی تھی۔ اس جرم میں امریکا نے انہیں گرفتار کر کے قید وسلاسل میں جکڑنے کا منصوبہ بنایا، جسے شاہ کی وساطت ہی سے عملی جامہ پہنایا جا سکتا تھا۔ خمینی نے اس تقریر میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو امریکا اور اسرائیل کے خلاف متحدہ اقدام کرنے کی دعوت دی تھی۔ امریکا اور اسرائیل کی ننگی جارحیت اور توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف یہ پہلی، موثر اور کارگر آواز تھی جو امریکا اور اسرائیل اور ان کے ایجنٹ ایران کے لیے خطرے کی وارننگ تھی۔ اس آواز کو فوراً کچل دینا بہت ضروری تھا۔

چنانچہ دو روز کے بعد 5 جون کو فجر کی اذان سے پہلے خمینی کو گرفتار کر کے تہران کی ایک جیل میں محبوس کر دیا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی پورے ایران میں، خصوصاً تہران، مشہد، شیراز، اصفہان اور تبریز جیسے بڑے شہروں میں عوام نے اپنے قائد کی حمایت میں شاہ کے خلاف زبردست مظاہرے کیے۔ ملک کا چپہ چپہ حرکت میں آ گیا۔ تمام جماعتیں شریک ہو گئیں۔ خفیہ پیغامات تقسیم ہونے لگے۔ مسجدوں سے باغیانہ اعلانات ہونے لگے۔ تقریریں ہونے لگیں۔ مسجدوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، امام بارگاہوں، طلبہ کے حلقوں میں مظاہروں کی باتیں ہوئیں۔ بازاروں میں ہڑتالیں ہوئیں۔ کمپنیوں کے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔ تیل کمپنیوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی نعرہ تھا، مرگ بر امریکا، مرگ بر شاہ اور انقلاب زندہ باد! لیکن شاہی حکومت نے انتہائی بربریت اور بے رحمی سے عوام کا قتل عام کیا۔ مارشل لاء پورے ملک میں نافذ کر کے بغاوت کی آگ کو خاموش کر دیا، لیکن 5 جون کو جو آگ بھڑکی تھی، اس کی چنگاریاں ظلم وتشدد کی راکھ کے نیچے برابر سلگتی رہیں اور آخر کار پندرہ سال کے بعد اس قابل ہو گئیں کہ ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کے اونچے محل کو گرا کر خاک میں ملا دیا۔

5 جون 1963ء کو خمینی کی گرفتاری اور اس کے خلاف پورے ایرانی عوام کا برسر بغاوت ہو جانے کا واقعہ اس لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے ایران کے اسلامی اور مذہبی معاشرے میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس واقعے سے پہلے جتنے بھی واقعات پیش آئے تھے، خصوصاً 1953ء کی فوجی بغاوت، تیل کے قومیانے کی تحریک، سیکولر جماعتوں کے انحرافات، بعض علماء اور ''فدائیانِ اسلام'' کے بعض افراد کا پھانسی پر چڑھانا، نیز ان کا سلام پسند عناصر کا منتشر ہو جانا جو شاہی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ان تمام واقعات نے اسلام پسند حلقوں میں مایوسی اور سرد مہری پیدا کر دی تھی۔ دوسری طرف شاہی حکومت امریکی منصوبوں کے زیر اثر، زیادہ شد و مد سے ایرانی عوام میں مغربی تہذیب وثقافت کو پھیلانے کے اقدامات کرنے لگی۔ ہر اقدام کے ذریعے ایرانیوں کو عیش پسند اور آرام طلب، مادہ پرست بنانے کی کوشش ہو رہی تھیں۔ گویا ایرانیوں کی آنکھوں پر چربی چڑھائی جا رہی تھی کہ مغربیت اور شاہیت کے کرتوت انہیں نظر نہ آئیں۔ جس طرح چینیوں کو مغربی سامراج نے افیون کھلا کھلا کر افیونی بنا

دیا تھا، اسی طرح ایرانیوں کو مغربی تہذیب کے گندے انڈے کھلا کھلا کر انہیں تعیش پسند بنا دیا گیا۔

5 جون 1963ء کے واقعے کو ایران کی پوری اسلامی تحریک سے الگ رکھ کر محض قتل عام کا واقعہ قرار دینا خلاف عقل ہوگا۔ دراصل یہ واقعہ اسلامی حکومت (فقہ جعفریہ کی بنیاد ہی پر سہی) قائم کرنے اور بادشاہت وملوکیت ختم کرنے کی گزشتہ صدیوں کی تحریک کا ایک تسلسل تھا۔ البتہ یہ واقعہ ایک سنگ میل ثابت ہوا، جس نے ایران کی نئی مسلمان نسل کو سیاسی و مذہبی تنظیم پر مجبور کیا۔ اسی تاریخ سے بادشاہت وآمریت کی سرنگونی کے لیے سیاسی جدوجہد کرنے والے بے شمار گروہ وجود میں آئے جو احیائے اسلام کی آرزوؤں اور مقاصد سے سرشار تھے۔ ان تمام گروہوں میں سب سے سچا گروہ ''ہیئت ہائے موتلفہ اسلامی'' نامی گروہ تھا جو فدایانِ اسلام کے بچے کھچے افراد پر مشتمل تھا جو علماء کی قیادت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اس گروہ نے جو اہم اقدامات کیے، ان میں سے ایک 1964ء میں شاہی حکومت کے وزیراعظم حسن علی منصور کا قتل تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے 1964ء میں خمینی کو آٹھ ماہ کی قید سے رہائی کے بعد دوبارہ گرفتار کر کے ترکیہ جلاوطن کیا تھا۔

ایران میں اسلام مٹانے کی تحریک

آیت اللہ خمینی کے ترکیہ جلاوطن کر دیئے جانے کے بعد امریکا نواز، پہلوی حکومت کو تیزی سے اپنی سامراجی ذمہ داری نبھانے کا بڑا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ آپ کو ترکیہ جلاوطن کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے امریکی ماہرین کو قانون سے بالاتر قرار دیئے جانے پر سخت اعتراض کیا تھا۔ آپ نے اپریل 1964ء میں قم میں ایک تقریر کے دوران اعلان کیا تھا:

''امریکی صدر ایرانی قوم کی نظر میں نفرت انگیز ترین شخص ہے۔''

اس تقریر میں خمینی نے تمام مسلم ممالک اور امتِ مسلمہ کو تباہ و برباد کرنے کے لیے امریکا، برطانیہ اور روس کے انسانیت سوز منصوبوں کی نقاب کشی کی تھی۔ مسلم ممالک کے سربراہوں اور پوری مسلم دنیا کے تمام علمائے دین (خواہ ان کا تعلق کسی بھی مسلک اور فرقے سے ہو) کو خبردار کیا تھا کہ اسلام انتہائی زبردست خطرات سے دوچار ہے۔ بڑی مغربی طاقتیں اسلام کو نیست و نابود کر کے اسلامی ممالک اور ان کے انسانی وقدرتی وسائل کا استحصال کرنے کے عزائم رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی اس تقریر میں واضح طور پر علماء کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا: ''امریکا عالم اسلام میں علماء کے اثر ورسوخ کو ختم کر کے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے، کیونکہ جب تک علماء کا اثر ورسوخ باقی ہے، اس کی گاڑی ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتی۔''

خمینی کی جلاوطنی سے پہلوی حکومت نے یہ موقع حاصل کر لیا کہ اپنے مخالف بہت سے علماء، طلبہ اور اسلام پسند انقلابی گروہوں کو گرفتار یا قتل کر کے ملک میں حبس اور خانہ جنگی کا ماحول پیدا کرے، تاکہ اسلام کے ساتھ مقابلہ جوئی کے لیے میدان ہموار ہو سکے۔ درحقیقت 1964ء سے 1978ء تک کا زمانہ ایران میں اسلام پسند عناصر کے لیے انتہائی مشکلات کا زمانہ تھا، جسے ایران میں اسلام کو مٹانے کا زمانۂ عروج سمجھنا چاہیے۔ اس زمانے میں اسلام اور

اسلامیت کو مٹانے کی غرض سے جو حربے استعمال کیے گئے ہیں، ان کی فہرست طولانی ہے۔ خاص خاص حربے یہ تھے:

1۔ سرکاری اسلام

2۔ سرکاری کمیونزم

3۔ جھوٹا نیشنلزم

4۔ مغربی لبرل ازم (آزاد خیالی)

ایران میں بادشاہت کی موت اور اس کی جگہ اسلام کے نام پر لائے جانے والے یہ چار حربے کسی قدر تشریح چاہتے ہیں۔

سرکاری اسلام

مغربی سامراج کے کرتا دھرتا اس امر سے اچھی طرح واقف تھے کہ مسلم ممالک میں عوام کا دین اسلام سے انتہائی گہرا روحانی اور قلبی تعلق ہے، جس سے اعلانیہ اور کھلم کھلا مقابلہ ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ ایسی غلطی کی گئی تو الٹا اسلام کی مزید تقویت کا باعث ہوگی، کیونکہ عامۃ المسلمین اس پر شدید ردِ عمل کا اظہار کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کبھی اسلام کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی اور کبھی براہ راست اسلام کی مخالفت نہیں کی۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اسلامی ممالک میں اپنی ''پٹھو'' حکومتوں کے علانیہ اور خفیہ تعاون سے حقیقی اسلام کی جگہ غیر حقیقی (روایتی) اسلام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ غیر حقیقی، روایتی اسلام کو اس مضمون کی حد تک ہم ''سرکاری اسلام'' کہہ رہے ہیں، جس سے سامراجیوں کو چار بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں:

1۔ اول یہ کہ انہیں یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ ظاہری طور پر عوام کے مذہبی عقائد، اسلامی تعلیمات و احکام کے خلاف کوئی اقدام کیے بغیر اسلامی ثقافت کی جگہ مغربی ثقافت کو خاموشی سے رائج کرتے جائیں اور کسی رکاوٹ کے بغیر درپردہ مسلم ممالک کی دولت کے ذخائر کو مغربی ممالک میں منتقل کرتے جائیں۔

2۔ سرکاری اسلام کو رائج کرنے کا دوسرا بڑا فائدہ سامراجیوں کو یہ پہنچتا ہے کہ وہ سرکاری عمال (اربابِ حکومت) کی مدد سے اپنی پٹھو حکومتوں کو برقرار و قائم رکھ سکتے ہیں، کیونکہ انہیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلم ممالک میں عمال حکومت اپنے آپ کو اسلام کا حامی بتاتے رہیں گے اور خود کو مذہبی شعائر و رسوم کو انجام دینے والا ظاہر کرتے رہیں گے تو وہ عوام میں ہر دل عزیز رہیں گے اور یوں اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکیں گے۔ لہٰذا اگر دین کے معاملات میں ان کی طرف سے ذرہ برابر بھی بے اعتقادی اور بے اعتنائی ظاہر ہوئی تو ان کی حکومت عوام کے درمیان متزلزل ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ افسران حکومت بالعموم خود کو سچا، عامل، پنج وقتہ نمازی، روزہ دار ظاہر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور یہی وجہ تھی کہ ایران میں پہلوی حکومت جو خود بھی غیر حقیقی اسلام کی حامی تھی، ایسے علماء اور اسلام پسند افراد کو، جو حکومت کی اسلام دشمنی پر تنقید کیا کرتے تھے جلاوطن یا جیلوں میں ڈال دیا کرتی تھی، اور ایسا مشکل اور کٹھن ماحول بنا رکھا تھا کہ کوئی شخص حقیقی اسلام کی ترویج و تبلیغ تو کیا، سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حقیقی اور سچا اسلام لانے کی باتیں کرنے والا حکومت کا باغی اور غدار سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ خود اوپر اوپر سے اسلام کا حامی ہونے کا دم بھرا کرتی تھی۔ اور

انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب قرآن مجید کی طباعت، نئی نئی مساجد کی تعمیر اور مذہبی رسوم کی ادائیگی پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتی تھی۔ جو لوگ ان سامراجی حربوں سے واقف تھے، وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ دکھاوا ہے اور اسلام پر ایمان دینے والے، ان سادہ لوح عوام کو فریب دینے کے لیے کیا جا رہا ہے جو سامراجیوں کی فریب کارانہ سیاست اور چالوں سے بے خبر ہیں۔

3۔ تیسرا فائدہ سامراجیوں کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک میں ان کی پٹھو حکومتوں کے قائم رہنے سے ان کا اپنا وجود بھی باقی رہتا ہے۔ ان کو یہ اطمینان بھی رہتا ہے کہ تیسری دنیا کی دوسری غیر مسلم قوموں کے بیدار ہونے کا بھی خطرہ نہیں ہے، کیونکہ سامراجیوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اگر اسلامی ممالک میں حقیقی اسلام رائج ہو جائے تو مسلمان یقیناً مغربی سامراج سے مقابلہ جوئی اور سبقت آزمائی کریں گے، اور اسلامی ممالک میں بیداری کی تحریک دنیا کی دوسری مظلوم و محروم قوموں کو بھی حرکت میں لائے گی اور انہیں عالمی سامراج کی بیخ کنی کے لیے متحد کرے گی، اور دنیا کی تمام مسلم و غیر مسلم اقوام کا اتحاد سامراجی طاقتوں کے لیے خطرناک ہوگا (چنانچہ ایران میں اسلامی انقلاب کے کامیاب ہوتے ہی ان کو اس کا تلخ تجربہ ہو گیا تھا)

4۔ چوتھا فائدہ سامراجیوں کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ ”سرکاری اسلام“ کو رواج دینے سے ایسے بہت سے لوگوں کی نظر میں بھی دین کا بھرم جاتا رہتا ہے جو صحیح اور حقیقی دین کی جستجو میں رہتے ہیں۔ مروجہ سرکاری اسلام میں چونکہ انہیں وہ چیز نظر نہیں آتی جس کی وہ جستجو اور آرزو میں رہتے ہیں، اس لیے وہ حقیقی اسلام سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ مغربی دنیا میں کسی ”سرکاری مذہب“ کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ وہاں موجود مسیحیت، جو زندگی کے زمینی حقائق اور اصولوں سے تہی دست ہے، اس کا وجود خود کسی ”سرکاری مذہب“ سے کم نہیں۔ ایسے مذہب کی ترقی اور رواج پانے سے سامراجی طاقتوں کو کسی قسم کی پریشانی اور خطرہ نہیں ہے، لیکن اسلامی ممالک میں ایک ”سرکاری اسلام“ کو ایجاد کیے بغیر وہاں سامراجیوں کو اپنے عزائم میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

سرکاری اسلام کی ترقی و ترویج کرنے والے گروہوں میں ایک گروہ ان ”لندن پلٹ“ مغرب زدہ افراد کا رہا ہے جو ”اعلیٰ تعلیم و تربیت“ حاصل کرنے کے بعد اپنے اصلی وطن لوٹنے پر اپنی گفتگو کے دوران ہر جملے پر انگریزی لہجے میں انگریزی الفاظ کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے ذہن کے ہر خلیے اور جسم کے ہر مسام پر مغربی ثقافت کا رنگ چھایا ہوا ہوتا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ایران میں بھی یہی ہوا۔ ان کے لندن یا پیرس پلٹ لوگوں کے خیال میں ایران صرف اسی صورت میں مہذب اور ترقی یافتہ ہو سکتا ہے جب وہاں کے عوام سر سے پاؤں تک مغربی تہذیب و ثقافت میں ڈھل جائیں، البتہ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ مغربی ممالک میں تعلیم یا تربیت کے حصول کے لیے جانے والے تمام افراد پر یہ بات صادق نہیں آتی، کیونکہ ان میں سے اچھے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ قرآن حکیم کے مطابق ”جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔“ یہ لوگ کسی یورپی ملک میں گئے، تو انہوں نے اپنی اسلامی روایات، عادات و خصائل کو ترک کیے بغیر وہاں کے علوم و فنون حاصل کیے اور وطن لوٹنے پر اس کے ذریعے اسلام کی خدمت کی، جب کہ اکثریت ایسے افراد کی ہوتی ہے جو دعوے تو اسلام پسندی کے وہ ضرور کرتے

ہیں، لیکن (نادانستہ ہی سہی) وہ اسلام کے پردے میں مغربی تہذیب کی ترویج اور سرکاری اسلام کی ترقی چاہتے ہیں۔

بیسویں صدی میں اسلامی تہذیب کو جو شدید نقصان پہنچا، وہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ایسے افراد جو اسلامی موضوعات پر یا اسلام اور مغرب کی کشمکش پر لکھتے یا بولتے ہیں، وہ مغرب زدہ تعلیم یافتہ افراد کی پیروی کرتے ہوئے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کسی مغربی اسکالر کی دلیل یا قول ضرور پیش کریں۔ مغربی قول زریں یا دلیل کے بغیر تحقیق کو تشنہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ غلطی ایک طرح کی کوتاہ فکری اور احساس کمتری ہے، جسے اس قدر ترقی دی گئی کہ رفتہ رفتہ عوام کی بھی یہ عادت ہوگئی کہ ہر ایسے اسلامی مفہوم و مطلب کو، جس کے ساتھ مغربی تائید کا دم چھلا لگا ہو، اسے بڑی آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اس کوتاہ فکری اور ثقافتی غلامی کا گناہ ان لندن پلٹ، تعلیم یافتہ افراد کے سر جاتا ہے، جنھوں نے مغربی فکر و ثقافت پر اسلام کا ملمع چڑھا کر اس کی ترویج کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں مسلمان حقیقی اسلام سے مزید دور ہو گئے۔

سرکاری اسلام کا ساتھ دینے والوں میں دوسرا گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو ''مستشرق'' کہلاتا ہے اور مشرق شناسی کا لیبل لگا کر اسلامی ممالک کے اہل دانش کو گمراہ کرتا ہے۔ مستشرقین کی اسلام اور اس کے اصولوں اور شعبوں کے بارے میں معلومات بڑی محدود ہوتی ہیں۔ انہیں مسلمان مفکرین اور محققین کی تحقیقات کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ انہیں آیات قرآنی اور احادیث رسول ﷺ سے اگر واقفیت کے علاوہ یہ لوگ ایک اور زیادتی یہ کرتے ہیں کہ مسلمان مفکرین کی تحقیقات میں حاشیہ آرائی کر کے انہیں مسخ کرتے ہیں۔ پھر ان پر خاص مغربی افکار کا رنگ چڑھا کر انہیں انتہائی خوبصورتی سے شائع کرتے ہیں اور انہیں اپنے ہمراہ اسلامی ممالک میں لاتے اور سامراج کی پٹھو حکومتوں کی جانب سے منعقد کیے جانے والے سیمناروں اور ورکشاپوں میں ہدیۃً تقسیم کرتے ہیں۔ یہ پٹھو حکومتیں ان کا زبردست پروپیگنڈا کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عام تعلیم یافتہ فریب کھاتے ہیں، بلکہ بلند پایہ محققین و مفکرین بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور یوں ایک سچے اسلام پسند مصنف کو اصل حقائق و تحقیقات کو پیش کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے، کیونکہ پہلے اسے اصل حقیقت پر چھائی ہوئی گمراہی کی گھاس پھونس کو ہٹانا پڑتا ہے۔ یہ بات دوسرے اسلامی ممالک سے کہیں زیادہ ایران میں دیکھنے میں آئی۔ پہلوی حکومت مستشرقین اور ان کے ہم نوا اور زیر اثر ایرانی دانشوروں پر خاص توجہ دیتی، ان پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتی، کیونکہ یہ مسئلہ پہلوی حکومت اور بادشاہت کی بقا کا مسئلہ تھا۔ حقیقی اسلام کے اصولوں کے مطابق خاندانی حکومت و ملوکیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ للہذا پہلوی حکومت میں صرف ایران ہی میں نہیں، بلکہ ایران سے باہر بھی مستشرقین کی مالی حوصلہ افزائی اور ان کی تحقیقات کی تشہیر کے لیے زر کثیر سے متعدد علمی و تحقیقی مراکز قائم کیے گئے تھے، جہاں نام نہاد، مغرب زدہ، تعلیم یافتہ افراد کو اعلیٰ مشاہروں پر مامور کیا گیا تھا۔

اسلام کو ایران میں کمزور کرنے کے لیے سرکاری طور پر کمیونزم (اشتراکیت) کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی، جب کہ اس زمانے میں دنیا بھر میں اشتراکیت کو فکری اور عملی سطح پر مطعون کیا جا رہا تھا۔

انقلابِ اسلامی کے محرکات

ایران میں اسلام کو مٹانے کا ایک اور حربہ ''سرکاری کمیونزم'' کے ذریعے اختیار کیا گیا۔ شاہ ایران کی پہلوی حکومت ہمیشہ براہ راست دربار کے ذریعے یا مختلف سماجی، ادبی اور علمی سوسائٹیوں، انجمنوں اور وزارتوں کے ذریعے عوام کے ایک طبقے کو ایسی انجمنوں کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی رہی جن پر ''ترقی پسند'' کا لیبل لگایا گیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین، ترقی پسند وکلاء، ترقی پسند فن کار۔ ان ترقی پسندوں کی تحریروں، تصویروں اور فن پاروں میں کہیں کہیں حکومت پر ہلکے پھلکے اعتراضات بھی نظر آتے تھے، لیکن بتدریج یہ لوگ بھی اشرافیت اور دہریت کے جال میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ پہلوی حکومت اور امریکی سامراج کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ یہ عناصر ان کاموں اور مشغلوں میں سرگرم رہیں جو حکومت سے براہ راست متصادم نہیں ہیں۔ اور اگر تھوڑا بہت بے ضرر اعتراض ہو تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ حکومت ترقی پسند عناصر کو ہر ممکن ذرائع اور وسائل فراہم کرتی تھی، بلکہ ان کی مالی امداد کے لیے منصوبے بناتی تھی۔ حکومت کو یقین تھا کہ آخر ترقی پسند عناصر ایک نہ ایک دن سامراجی عزائم کے بھنور میں پھنس جائیں گے اور آئندہ ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت سرکاری طور پر اہتمام کرتی تھیں کہ ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات اور مصوروں کی نمائشیں سامراجی اداروں مثلاً ''انجمن ایران و امریکا'' وغیرہ میں پیش کی جائیں۔ انہیں سرکاری ٹیلی ویژن پر نمایاں انداز میں دکھایا جاتا تھا۔ ان کی تصاویر بین الاقوامی مقابلوں میں پیش کی جاتی تھیں اور عموماً ایوارڈ بھی حاصل کرتی تھیں۔

ترقی پسندوں کے افکار اور سرگرمیوں سے شبہ ہوتا کہ ایک کمیونسٹ تحریک وجود میں آ رہی ہے، لیکن حقیقت میں ایران کی کمیونسٹ تحریک ایسی تھی، جس کا فائدہ کمیونزم کی بجائے کمیونزم کے مخالف شہنشاہی نظام کو پہنچ رہا تھا۔

جھوٹی قوم پرستی

سامراجیوں نے اسلام کشی کے باعث پیدا ہو جانے والے خلاء کو پر کرنے کے لیے ایک اور حربہ نیشنلزم یا قوم پرستی کا اپنایا۔ قوم پرستی کے معنی اگر ایک قوم کو اجتماعی طور پر متحد کرنے اور اس کی قومی حیثیت کو اہمیت دینے کے ہیں تو اسلام میں ایسی قوم پرستی کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے۔ اسلام قومیت کے مثبت پہلوؤں کو ماننے سے انکار نہیں کرتا، لیکن اس کے منفی پہلوؤں کی شدید مخالفت کرتا ہے۔

گزشتہ صدی میں قوم پرستی کی تحریک نے جو فتنے کھڑے کیے، اس کا مقصد صرف ایک قوم کو بالاتر اور اصل ظاہر کر کے دوسری اقوام کو اس کے ماتحت ثابت کرنا تھا۔ قوم یا اقوام کو متحد کرنا قوم پرستی کا مقصد نہیں تھا۔ خصوصاً مسلم ممالک میں مغربی استعمار نے جھوٹی قوم پرستی کی تحریکیں چلا کر انہیں انسانی اقدار سے محروم رکھنے کی کوشش کی۔

مسلم ملکوں میں قوم پرستی کو رواج دینے سے سامراجیوں کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے ساتھ مسلم قوموں کا رابطہ ختم کر دیا جائے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلم ملکوں کے درمیان باہمی رابطے کی بنیاد (یعنی اسلام) خود بخود ختم ہو جائے گی یا کمزور پڑ جائے گی، کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اسلام کا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ قومیت کی دیوار کو ہٹا کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متحد کر کے عظیم طاقتور ''امت واحدہ'' کی شکل دے سکتا ہے۔ اسی مقصد سے عالمی سامراج نے خطرے کا احساس کرتے ہوئے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا اور کوششیں شروع کر دیں تا کہ مسلم ملکوں کے درمیان رشتہ وحدت کو ختم کیا جائے اور رفتہ رفتہ قوم پرستی کو اسلام پر فوقیت حاصل ہو جائے۔

چنانچہ ایران میں اسلام کشی کے ساتھ ساتھ ایرانی قوم پرستی کی تحریک کا بھی آغاز ہوا اور یہ تحریک مختلف شکلوں میں جاری رہی۔ شاہ ایران کی پہلوی حکومت کے عہد میں ادبیات و ثقافت کے ماہرین نے بار بار یہ کوشش کی کہ فارسی رسم الخط بدل کر اس کی جگہ لاطینی رسم الخط رائج ہو جائے۔ یہ اقدام اسلامی ثقافت کے ساتھ بہت بڑی خیانت تھی، اس لیے کہ اسلامی ثقافت کا بہت بڑا حصہ فارسی رسم الخط ہی میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس اقدام کو بھی ایرانی قومیت ہی کو نہیں، بلکہ ایران میں اسلام کو مٹانے کی تحریک بھی خیال کیا گیا۔ ایرانی قومیت کے حامیوں نے عربوں کے خلاف بھی بڑی شدت سے، تابڑ توڑ حملے کیے، حالانکہ عرب تو اسلام کا گہوارہ ہے۔ عرب و عجم کی کشمکش کو ایرانی قوم پرستوں نے مٹانے کی بجائے، ہوا دینے کی کوشش کی۔ ان کی پروپیگنڈا مہموں میں مسلمانوں کی ایرانیوں کے ساتھ جنگوں کے تذکرے کیے جانے لگے۔ کوشش کی جاتی تھی کہ ایرانی قوم کے سامنے عربوں اور اسلام کا چہرہ اس طرح بگاڑ کر پیش کیا جائے کہ عام ایرانیوں میں اسلام اور عربوں کے خلاف منافرت پیدا ہو اور ایرانی عوام کا رجحان رفتہ رفتہ ایرانی قومیت کی طرف پختہ ہو جائے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ ایران کی پہلوی حکومت ایرانیوں کے ذہن پر اسلامیت کی بجائے جس قومیت کا نقشہ جما رہی تھی، وہ بھی حقیقی ایرانی قومیت نہیں تھی، بلکہ وہ سامراجی، مغربی تہذیب کے ذریعے ایک مسخ شدہ قومیت تھی جس پر ایرانی قومیت کا ملمع چڑھا دیا گیا تھا۔

گزشتہ صدی کے نصف ثانی میں ایرانی عوام نے اپنے ملک کی تاریخ میں جھوٹی قوم پرستی کا بڑا تلخ تجربہ کیا تھا۔ ''جبہہ ملی (نیشنل فرنٹ)'' جو ایرانی قوم پرستی کی سب سے بڑی داعی سمجھی جاتی تھی، اس نے خوشاہ پور بختیار جیسے افراد کو پروان چڑھایا، جس نے ایرانی تاریخ کے نازک ترین لمحوں میں، آگے بڑھ کر امریکا کی مدد کی اور امریکا کے مفاد کے لیے ایرانی قوم سے غداری کی اور امریکا کی پٹھو حکومت کی وزارتِ اعظمیٰ قبول کر کے عوام کو فریب دینے کے لیے اپنے بہت ہی مختصر دورِ وزارت میں ''قومیت'' کا راگ الاپتا رہا۔ ''پان ایران ازم'' کی تحریک نے بھی قومیت اور قوم پرستی کے نعروں کے پردے میں امریکا کی بڑی خدمات انجام دیں اور پہلوی حکومت کے عزائم و جرائم کی غلط تاویل و توجیہہ کر کے ایران اور ایرانیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد بھی وہ افراد اور وہ تحریکیں جو اپنے نیشنلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، ہمیشہ عوامی تقاضوں کے خلاف امریکیوں کے مفادات کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔

ایران کے علاوہ دوسرے مسلم ملکوں میں بھی قوم پرستی کی تحریکوں نے امتِ مسلمہ کے اتحاد کو نقصان اور مغربی

استعمار کو فائدہ پہنچایا ہے۔عرب ممالک میں ''پان عرب ازم'' اور ترکی میں ''پان ترکی ازم'' فقط حقیقی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکوں کا مقابلہ کرنے کی غرض سے وجود میں آئی ہیں اور مغربی سامراج کے مفادات کا تحفظ کرنے والے حربوں کی حیثیت سے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔امریکا کی پٹھو حکومتوں نے قومی ثقافت کے بہانے فی الحقیقت سامراجی ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔اسی مقصد کے پیش نظر ایران میں پہلوی حکومت نے ایران کے قدیمی (زرتشتی اور مانومی) رسوم و روایات کو نام نہاد مغربی اور امریکی ایران شناس افراد کی مدد سے زندہ کرنے کی بہت کوششیں کیں اور اس کے لیے بے دریغ دولت صرف کی۔اسلامی تاریخ کی بجائے شہنشاہی تاریخ کو رواج دینے کا مقصد بھی یہی تھا۔ شاہ ایران کو ڈیڑھ ہزار سالہ اسلام پر ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کو ترجیح دینے پر بڑا غرور تھا۔

مغربی لبرل ازم

لفظ لبرل ازم (آزاد خیالی) بھی لفظ سامراج یا استعمار کی طرح مسلم ملکوں کے لیے بہت سی خرابیوں اور بدبختیوں کا شکار رہا ہے۔مغرب زدہ افراد کی نظر میں اس کا ایک خاص مفہوم ہے۔حالانکہ حقیقی لبرل ازم اور مغربی لبرل ازم کے درمیان کافی فرق ہے۔جس طرح ''استعمار'' کے اصلی اور لغوی معنی معاشرت و آبادی کے ہیں، مگر استحصال پسندوں نے اس حسین نام کے پردے میں بجائے معاشرت و آبادی کے، اپنے زیر اثر علاقوں میں لوٹ کھسوٹ اور غارت گری مچا رکھی ہے۔اسی طرح لبرل ازم کے معنی و مقصد آزادئ فکر ہے۔لغوی اعتبار سے ''لبرل'' وہ شخص ہے جو آزادئ فکر کا طالب ہے۔مگر افسوس کہ یہ لفظ بھی استعمار کے پیچ وخم سے دو چار ہو کر سامراجیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا اور اپنے اصل معنی یعنی آزادی کا مفہوم کھو بیٹھا اور عملاً یہ لفظ ''لبرل'' اس مفہوم میں استعمال ہونے لگا کہ انسان اپنی تمام ذمہ داریوں اور فرائض سے آزاد ہو کر جدید استعمار و استحصال کی قید میں اسیر ہو کر رہ جائے۔

اسلام کی رو سے حقیقی لبرل ازم انسان کا خدا کے علاوہ ہر شخص اور ہر شے سے آزاد رہنا ہے، مگر مغربی لبرل ازم کا مفہوم ہر شخص اور ہر شے کو اپنا غلام بنانا ہے۔مغربی دنیا میں آج آزاد خیالی کے سایے میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جس کی تقلید مسلم ممالک کے مغرب زدہ افراد کر رہے ہیں، اور اسے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا نام دیا جا رہا ہے، اس کا مقصد انسان کو قوانین خداوندی سے آزاد کر کے مادیت کا غلام بنانا ہے۔مغربی لبرل ازم درحقیقت انسان کو الٰہی فطرت سے حیوانی خصلت کی طرف دعوت دے کر انسان کو آزادی کے نام پر ہوا و ہوس کا شکار بنا دیتا ہے۔

ایران میں دانستہ یا نادانستہ اسلام کو مٹانے کے سلسلے میں پہلوی حکومت کے اہم منصوبوں میں سے ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ وہ ایرانی عوام کو لبرل ازم کا شیدا بنا کر انہیں خداوند تعالیٰ کی عبادت و عبودیت اور الٰہی قوانین سے دور کرنا چاہتی تھی جو اسلامی تہذیب کا اصل سرمایہ ہیں تاکہ سامراجی اپنے ناپاک مقاصد آسانی سے حاصل کر سکیں۔

انقلاب کا اصل محرک

حقیقت یہ ہے کہ انقلاب اسلامی کا اصلی محرک شہنشاہیت اور آمریت کا خاتمہ کر کے حکومت اسلامی کا قیام اور حقیقی اسلام کے نفاذ کے لیے ایرانیوں کا اٹل ارادہ تھا۔ایرانی قوم گزشتہ ایک صدی سے مسلسل اسلامی حکومت کے

قیام کے لیے کوشاں تھی۔ اس کے لیے اس نے بے انتہا جانی و مالی نقصانات برداشت کیے تھے، اس کے باوجود کہ انہیں پوری طرح احساس ہوگیا تھا کہ اسلام دشمن، سامراجی عناصر نے اس مدت میں جو تجربات کیے ہیں، اور ان تجربات کی روشنی میں انہوں نے اسلام مٹانے کے لیے جو منصوبے تیار کیے ہیں، ان کی مدد سے اب وہ بڑی آسانی سے اسلامی تہذیب و ثقافت کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں اب حق وراستی کے لیے جدوجہد کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ دریں حالات ایران میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جب پہلوی حکومت نے اور بالخصوص شاہ ایران نے امریکا کے ساتھ مل کر اسلام دشمنی کا عزم کرلیا اور امریکی سامراج کے بنائے ہوئے منصوبوں پر سختی کے ساتھ عمل کرنا شروع کردیا تو اسلامی حکومت کے قیام کا خواب اور بھی ناممکن ہوگیا تھا۔

دوسری طرف اسلام پسند عنصر، قوم پرستوں اور دوسرے نام نہاد قومی لیڈروں کے غلط رویے اور ان کے تلخ تجربات کی بناء پر، کسی ایسی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لینے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے جو اسلام سے دور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ 19 اگست 1953ء کی فوجی بغاوت سے لے کر 1961ء یعنی خمینی کی تحریک کے آغاز تک اس ملک میں کوئی بھی نمایاں تحریک وجود میں نہیں آئی۔ ہرچند قوم پرست اور کسی حد تک مذہبی جماعتیں کبھی کبھی تحریک جاری کرنے کی خواہش مند نظر آتی تھیں۔

آیت اللہ خمینی اسلام کے علمبردار تھے اور ایرانی عوام ان کی تحریک کو الٰہی تحریک سمجھتے تھے، اس لیے وہ اسلامی عناصر اور قوتوں کو یکجا کرنے اور عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ خمینی ایرانی قوم کو، جسے امریکا اور اس کے پٹھو شاہ ایران نے، اپنے حربوں اور ہتھکنڈوں سے سیاست اور سیاسی مسائل سے بے نیاز بنا دیا تھا، حرکت میں لے آئے اور انہیں پہلوی حکومت اور درحقیقت سامراج سے مقابلہ جوئی کے لیے تیار کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانی عوام نے 5 جون 1963ء کو پہلوی حکومت کی جانب سے خمینی کی گرفتاری کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے، ایران کی تاریخ میں ایک ایسا زبردست اور عظیم مظاہرہ ثبت کردیا جو عوامی تحریک مزاحمت ہونے کے اعتبار سے بے نظیر تھا۔ ایران کی تاریخ میں غیر مذہبی طاقتوں کی جانب سے اس طرح کا کوئی مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ 5 جون 1963ء کا مظاہرہ صرف اور صرف اسلامی جذبے کے تحت تھا اور یہ ایک ایسی عظیم تحریک کا نقطۂ آغاز تھا جو آخرکار 11 فروری 1978ء کو ''انقلاب اسلامی'' کے نام سے کامیاب ہوئی۔ ایران کے اسلامی انقلاب کا اصلی محرک، اسلام کے احیاء، اسلامی حکومت کے قیام اور اسلام کے احکام وقوانین کے نفاذ کا جذبہ تھا۔

دوسرے محرکات

اس سے پہلے کہ ایران میں ''انقلاب اسلامی'' کے احیائے اسلام کے سوا دوسرے محرکات کا جائزہ لیا جائے، ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، اور وہ یہ جس وقت ''اسلامی حکومت'' کے قیام کی بات سامنے آتی ہے تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اسلامی حکومت کے خدوخال اور نظام اور نمایاں پہلو کیا ہوں گے اور اصولی طور پر ایسی حکومت کی ماہیئت کیا ہوگی؟ مغرب کے دانشوروں نے دنیا کے سامنے ایک ''اسلامی حکومت'' کا جو نقشہ پیش کر رکھا ہے وہ انتہائی غلط ہے۔ اسلامی حکومت کے متعلق ایسا تصور اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب اسلام بھی عیسائیت یا

دوسرے مذاہب کی مانند ہو، جن میں صرف ''آسمانی'' مسائل پائے جاتے ہیں اور عوامی و دنیاوی مسائل سے ان کا کوئی تعلق نہیں، جب کہ اسلام ایک ایسا مکمل دین ہے جس کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے۔ اسلام عبادات کے علاوہ اقتصادی، عسکری، سیاسی اور معاشرتی، غرض انسان کی زندگی کے ہر پہلو سے براہ راست ربط و تعلق رکھتا ہے۔

چنانچہ ایران میں ''انقلاب اسلامی'' کا اصلی محرک یہی تھا کہ ایرانی عوام صرف ایک حقیقی ''اسلامی حکومت'' قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی معنوی محرکات کے ساتھ ساتھ معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور عسکری محرکات بھی ان کے پیش نظر تھے۔ پہلوی حکومت سے نجات پانے کے بعد یہی محرکات و عوامل ان کے پیش نظر تھے، جن پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

انقلاب ایران کے ثقافتی و معاشی محرکات

ایران کے اسلامی انقلاب کا ایک بڑا محرک اہل ایران کی ثقافتی وابستگی ہے۔ ایران کی آبادی 98 فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے معاشرتی نظام میں ایسا اسلامی طرز حیات ہونا چاہیے تھا جس کے اصول، قوانین، آئین، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر مبنی ہوں، مگر اس روشن حقیقت کے برخلاف پہلوی حکومت ہمیشہ اسلامی ثقافت کو مٹانے کے درپے رہی اور ایک ایسا مغربی تہذیبی نظام قائم کرنے کی کوشش کرتی رہی جسے اسلامی ملکوں میں مغربی سامراج نے رواج دیا تھا۔ اس نظام میں شہریوں کی بس اتنی اہمیت تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ ''معمول'' ہو، اور نہ صرف یہ کہ وہ محض درآمدی اشیاء کو خوب استعمال کرتا ہو، بلکہ اس کے خیالات، طرز فکر اور سوچ بھی درآمدی ہو۔ اس نظام میں عورت صرف زینت محفل اور جنسی بھوک مٹانے کے لیے تھی۔ پہلوی حکومت نے ایران کی مسلمان عورت کو اس قدر ذلیل و رسوا کر دیا تھا کہ عورت کی حیثیت ایک بازی گر سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی، یعنی ایرانی عورت کے لیے درآمدی اشیاء کی نمائش اور مغربی طرز فکر کی تبلیغ کا ذریعہ بننا ہی اس کا فریضہ اور بہترین مشغلہ تھا۔ عورت کے ساتھ جو توہین آمیز سلوک پہلوی ایران میں ہوا اس کی مثال غیر اسلامی ممالک میں بھی نظر نہیں آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران میں عورتوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا، وہ ہر عورت کے لیے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم بہت بڑی توہین اور ذلت ہے، مگر اسلامی معاشرے میں جہاں ایک عورت کو ایسے پاک و پاکیزہ اور مسلمان بچوں کی تربیت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، جن کا معاشرے کی تعمیری اور معنوی تحریک میں بڑا حصہ ہوتا ہے۔ وہاں عورت کی شخصیت کو اتنا گرایا گیا کہ وہ محض نمائش کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔ عورتوں کے ساتھ اتنی بڑی خیانت کی گئی جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

1977ء کے موسم گرما میں شاہ کی بیوی فرح پہلوی کے حکم اور براہ راست اسی کی سرپرستی میں شیراز میں ایک ''جشن ہنر'' منایا گیا اور اس میں انتہائی مخرب اخلاق اور بدترین جنسی اعمال ''آرٹ'' کے نام پر حیرت زدہ مسلمان عوام کی آنکھوں کے سامنے انجام دیئے گئے۔ اس طرح کے انسانیت سوز اعمال صرف عورتوں کی عزت نفس اور فطری

شرافت ہی کے خلاف نہیں، بلکہ انسان کو تکمیل انسانیت کی راہ سے بھی منحرف کرنا ہے۔ پہلوی حکومت نے ایرانیوں کو اسلامی تہذیب وثقافت سے منحرف کرنے کے لیے دعوت کا استعمال کیا۔

تعلیمی محرکات

ثقافت کا ایک اور اہم شعبہ تعلیم ہے۔ یہ شعبہ سراسر مغرب سے وابستہ تھا۔ یونیورسٹیوں، تعلیمی و تدریسی مراکز، کالجوں اور سکولوں پر پوری طرح مغربی سامراجی نظام کا تسلط تھا۔ تمام درسیات کے مضامین مغرب کی کتابوں سے اخذ کیے جاتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے معلمین اور اساتذہ اکثر یورپ اور امریکا سے بلائے جاتے تھے۔ انسانی و معاشرتی علوم بالکل بے قدر ہو کر رہ گئے تھے۔ یونیورسٹیوں کے ان علوم کے شعبوں میں جتنے مضامین پڑھائے جاتے تھے، ان کا نصاب اور کتابیں صرف مغرب کی درآمدہ تھیں۔ ''وزارتِ فرہنگ و ہنر'' اور اس سے متعلقہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کا کام غیر انسانی اور غیر سماجی اقدار کو رواج دے کر ایرانی نوجوانوں، یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کو غیر اسلامی اور غیر ایرانی بنانا تھا۔ اس وقت کے حالات شاہد ہیں کہ نام نہاد ثقافتی ادارے اور آرٹ کے مراکز عملی طور پر بدکاری کے اڈے بن چکے تھے۔ سینما، ریڈیو، تھیٹر، ٹیلی ویژن، یہاں تک نشریات و مطبوعات بھی مغربی ثقافت کی ترویج کے لیے وقف ہو گئے تھے، اور اس مقصد کے لیے زرکثیر صرف کیا جاتا تھا۔ علم و دانش کو غیر اہم اور بے قدر سمجھنے کا رواج زور پکڑ چکا تھا۔ اس کا سبب بھی یہی تھا کہ ایرانی جوانوں کا اسلامی علم و دانش سے بہرہ مند ہو جانا ہرگز سامراجیوں کے لیے مفید نہ تھا۔

مغرب زدگی ایک متعدی مرض کی طرح ایرانی عوام کے مزاج میں سرایت کر چکی تھی۔ جو لوگ امریکی یا یورپی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کر کے آتے تھے، سماج میں ان کو بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خواہ ان کی علمی استعداد وصلاحیت ایران کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ افراد کے مقابلے میں کم ہی کیوں نہ ہو۔ مغربی ممالک کا سفر کرنا، وہاں سے چند کلمے انگریزی یا فرانسیسی کے یاد کر لینا اور انہیں اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرنا بڑی اہمیت رکھتا تھا، پہننا، اوڑھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، یہاں تک کہ مغرب کی تقلید میں بچوں، سڑکوں، گلیوں، کوچوں اور سکولوں کے نام بھی مغربی زبان پر رکھنا ایک قومی عادت بن چکی تھی۔ درباری اور نام نہاد اشراف کے گھرانوں کی عورتیں آرائش و زیبائش اور ملبوسات کے لیے یورپ اور امریکا جاتی تھیں یا میک اپ کرنے والے ماہرین اور درزی مغربی ملکوں سے ایران بلوائے جاتے تھے۔ یہ سب ایسے حالات میں ہوتا تھا جب ایرانی عوام کی اکثریت عام وسائل سے بھی محروم تھی اور لوگ اپنے بچوں کو بھوک اور غربت کا شکار ہو کر مرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ افلاس کی وجہ سے خودکشی کا رواج شروع ہو گیا تھا۔

پہلوی حکومت کے دور میں ثقافتی و تعلیمی وابستگی اتنی ہمہ گیر اور وسیع تھی کہ عوامی زندگی کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ماضی میں ایران کے مسلمان اطباء، جیسے ابن سینا اور رازی جیسے عظما نے طب اور دوا سازی کے میدان میں کارہائے زریں انجام دیے تھے۔ ایرانی مسلمان کو یہ روایت اور گراں بہا طبی سرمایہ بزرگوں سے میراث میں ملا تھا۔ مغربی سامراجیوں نے نصف صدی کے اندر اندر ایرانی ثقافت کو اس قدر مغرب زدہ بنانے کی کوشش کی کہ ایرانی

عوام اپنی قومی اور روایتی طب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور اس میدان میں بھی وہ مغرب کے دست نگر اور محتاج بن کر رہ گئے۔ اب معمولی سے معمولی دوائیں اور علاج معالجے کے سامان امریکا اور یورپ سے درآمد ہونے لگے اور معمولی مرض کے علاج کے لیے بھی لوگوں کو امریکا اور یورپ کے ہسپتالوں میں داخل کرانے کا رواج عام ہو گیا۔

سب سے زیادہ خطرناک اور نتیجہ خیز چیز مغرب سے فکری وابستگی تھی، جس کے لیے پہلوی حکومت نے زبردست کوشش کی۔ فکری، ثقافتی اور تعلیمی وابستگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی جوان ہر شعبۂ حیات میں اپنی اصلی، فکری صلاحیت کھو بیٹھے اور مغربی فکر و تہذیب کو بروئے کار لانے کا عادی ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ اپنی اسلامی ثقافت سے دور ہوتا ہوا اخلاقی زوال کا شکار ہوتا چلا گیا۔

ظاہر بات ہے کہ ایسے حالات میں تحریک برپا کرنے اور انقلاب لانے کے لیے عوامی انقلابی محرکات میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ عوام اپنی ثقافت کی پاسداری کریں، اپنے تعلیمی نظام کا تحفظ کریں۔ یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ہر انقلاب کا بنیادی محرک اپنی ثقافت و تہذیب کا تحفظ ہوتا ہے، اس لیے ثقافتی محرکات کو ایران کے اسلامی انقلاب یعنی اسلامی حکومت کے قیام سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

اقتصادی محرکات

اقتصادی وابستگی کا مسئلہ ہوسکتا ہے کہ ایسے ممالک کے عوام کے لیے زیادہ قابل بحث نہ ہو جو قدرتی ذرائع و وسائل سے مالا مال نہ ہوں۔ لیکن ایران ایک ایسا ملک ہے جو قدرتی ذرائع، ذخائر اور دولت سے مالا مال ہے۔ اگر ایرانی عوام کسی ایسے دین کے پیروکار ہوتے جس میں معاشی نظام کا فقدان ہوتا تو ان کے لیے مشرقی بلاک یا مغربی بلاک سے یا دونوں ملکوں سے اقتصادی طور پر وابستہ ہونا اتنا گراں نہ گزرتا، مگر اہم بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ایران میں قدرتی ذرائع فراوانی کے ساتھ موجود ہیں اور دوسری طرف ایرانی عوام کا دین اسلام ہے جو ایک عادلانہ معاشی نظام رکھتا ہے۔ جو اشتراکیت اور مغربی سرمایہ داری کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ اس کے باوجود پہلوی حکومت میں اسلام کے معاشی نظام کا شائبہ تک نہ تھا اور نیچے سے اوپر تک پوری اقتصادی زندگی مغرب کی سرمایہ داری اور یہود کی سود خوری سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ پہلوی حکومت اقتصادی لحاظ سے پوری طرح سرمایہ داری نظام سے منسلک ہو گئی تھی۔ اس قدر اقتصادی وابستگی کی وجہ یہ تھی کہ پہلوی حکومت کو اس کی سلامتی اور تحفظ کے لیے سامراجیوں کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اسلام کا اقتصادی نظام نافذ کرنے کا خیال بھی نہ کریں، بلکہ مغربی معاشی نظام کو پوری طرح اور پوری قوت سے رائج کریں۔ اس مقصد کے لیے انہیں بیرونی سرمایہ پوری فراوانی سے فراہم کیا جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ ایران میں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کے اپنے وسائل بکثرت فراہم تھے، لیکن ان کے پھلنے پھولنے کے امکانات پر ذرا بھی توجہ نہ کی گئی، بلکہ غذائی اشیاء بھی باہر سے منگوائی گئیں، کاشت کاروں کو شہروں میں آباد ہونے کی ترغیب دلائی جاتی تھی، تاکہ زراعت اور کھیتی باڑی کے شعبوں میں کام کرنے اور زرعی پیداوار حاصل کرنے کی تمام صلاحیت بالکل ہی ختم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ سامراجی منصوبوں کے مطابق دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں کام کرنے کی امید لے کر آتے تھے، تو ان کو مجبوراً ایسے کارخانوں میں کام کرنا پڑتا

تھا جو پوری طرح سامراجی ممالک سے وابستہ تھے، جہاں پرزے اور مشینری سب کے سب بیرونی ممالک سے منگوائے جاتے تھے۔ محض پرزوں کی فٹنگ ایران میں ہوتی تھی، یا دیہاتی لوگ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر فضول کاموں مثلاً اخبار فروشی اور ٹوپیاں اور درآمدی عینکیں اور جوتے وغیرہ فروخت کرنے میں مشغول ہو جاتے یا پھر اپنی ضرورتوں کو پوری کرنے کے لیے چوری، ڈاکا اور سٹریٹ کرائمز میں مصروف ہو جاتے جس طرح پاکستان اور خصوصی طور پر کراچی میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔)

مغرب پر انحصار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1977ء میں ملک میں غذائی پیداوار صرف اتنی رہ گئی جو محض ایک ماہ کے لیے کافی ہوتی اور سال کے باقی گیارہ مہینوں کے لیے بیرونی یعنی مغربی ممالک سے منگائی جاتی تھی۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب حکومت روزانہ 60 لاکھ بیرل تیل نکالتی تھی اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی صرف درباری اخراجات، اور اسلام کو مٹانے کے لیے سامراجی تفریحی پروگراموں پر صرف کی جاتی تھی۔ اس آمدنی سے ساواک (سازمانِ اطلاعات) کو تقویت پہنچائی جاتی تھی، تاکہ حکومت کے مخالف افراد کی خاطر خواہ سرکوبی کی جا سکے۔ عوام کا کہنا یہ تھا کہ تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی زراعت، قرضہ اور مراعات کو فروغ دینے کے لیے کیوں نہیں استعمال کی جاتی؟ ایران کے بیابانوں کو قابل کاشت بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی؟ آباد علاقے کیوں ویرانوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں؟ کیوں ایسے کارخانے قائم نہیں کیے جاتے جن میں اپنی مصنوعات اپنی صلاحیت کی بنیاد پر تیار کی جا سکیں، اس کی بجائے کیوں مصنوعی اور گھٹیا درجے کی مصنوعات تیار کی جا رہی ہیں۔

ایرانی عوام ایک دوسرے سے پوچھتے تھے، کیا یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ ہماری تمام صنعتیں اور ہمارا پورا اقتصادی نظام غیروں کے قبضے میں رہیں، تاکہ وہ جس وقت چاہیں، ان کو تباہ کر دیں اور ہم ہمیشہ ان کی درآمدات کے محتاج بن کر، سیاسی طور پر ان کے تابع اور فرماں بردار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ کیا ہم ہمیشہ تیل ہی کی آمدنی پر تکیہ کیے بیٹھے رہیں اور کسی ایسے وسیلہ آمدنی کی تلاش و جستجو نہ کریں کہ اگر تیل کے ذخائر کبھی ختم ہو جائیں تو قوم اس کے سہارے آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔

ان سوالوں کا جواب تو کیا ملتا، ایرانی عوام نے دیکھا کہ روز بروز تیل نکالنے کی مقدار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کی پوری آمدنی حکومت کے ایجنٹوں کی عیاشی پر صرف ہو رہی ہے اور ہر لحاظ سے مغرب کی محتاجی بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف زراعت اور کاشت کاری تباہ ہو رہی ہے۔ صنعتوں میں زوال آ رہا ہے۔ کارخانے بھی ایک ایک کر کے بند ہو رہے ہیں۔ اقتصادی ناانصافی بڑھ رہی ہے۔ امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو رہے ہیں۔ بے جا اسراف کی یہ حالت ہو گئی کہ شاہ نے اپنی تاج پوشی کی رسم کے موقع پر مہمانوں کی ضیافت کا سامان باہر کے ملکوں سے منگوایا تھا اور اس تقریب کے لیے پھول تک ہالینڈ سے منگوائے گئے، جن کی درآمد کے لیے لاکھوں روپیہ صرف خصوصی طیارے، کے کرایے پر خرچ ہوا۔ کروڑوں روپیہ صرف کر کے اس ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کی تشہیر کا مضحکہ خیز جشن منایا گیا۔

انقلابِ ایران کے محرکات

مستبد پہلوی حکومت کو ختم کر کے ایران میں جمہوری اسلامی حکومت قائم کرنے کے محرکات میں ایک عوامی محرک یہ بھی تھا کہ عوام اقتصادی عدم توازن، ناانصافی اور جور و ستم کی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور تیل، گیس، لوہا، پتھر اور دوسرے قدرتی وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھا کر انسانی اجتماعی قوت کا کام میں لانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سولہ لاکھ مربع کلومیٹر زمین کو کارآمد بنا کر اقتصادی آزادی اور استقلال حاصل کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ مغرب کی سرمایہ داری اور روس کی اشتراکیت، دونوں سے ہٹ کر اسلامی نظام کی راہ اختیار کی جائے یعنی دولت نہ تو چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز ہو اور نہ کسی خاص گروپ یا طبقے کے ہاتھوں میں منجمد ہو۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں دولت عادلانہ اور منصفانہ طریقے سے عوام کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے۔ دنیا کے موجودہ اقتصادی نظام میں جو معاشرتی امراض پائے جاتے ہیں، وہ سب سرمایہ داری اور اشتراکیت کے غلط فارمولے کا نتیجہ ہیں۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں اس طرح کے امراض کے پھلنے پھولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

فوجی محرک

پہلوی دورِ حکومت میں تیل کی آمدنی کا بڑا حصہ امریکا، یورپ اور اسرائیل سے اسلحے کی خریداری پر صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ ایران کے دفاع کے لیے یہ اسلحہ ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں ہوا، تاہم اسلحے کی حفاظت اور امریکی فوجی ماہرین، جن کے قبضۂ اختیار میں ایرانی افواج تھیں، ان کو بڑی بڑی تنخواہیں اور خصوصی مراعات دی جاتیں۔ اور اس خرچے کا بار ایرانی عوام پر ڈال دیا جاتا، اور یہ اس صورت میں تھا کہ امریکی فوج، روس کے مقابلے میں ایران کو ایک چھاؤنی کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے بدلے امریکا نے ایران کو ایک ڈالر بھی نہیں دیا۔ امریکہ خود اپنے فوجیوں کے لیے لمبی لمبی تنخواہیں وصول کرتا تھا۔ علاوہ ازیں ایرانی فوج کے تمام اسلحے ہمیشہ اسرائیل کے ہاتھوں میں رہے، تاکہ اسرائیل اسلامی ممالک سے جنگ کی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ 1967ء اور 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیلی طیارے ایرانی اڈوں سے اڑائے گئے۔ انہوں نے امریکی اسلحہ ایرانی چھاؤنیوں سے حاصل کیا۔ پوری ایرانی فوج اسرائیل کے اختیار میں تھی۔ بین الاقوامی صیہونیت اور اس کے مربی امریکا کو ایران کا پورا فوجی تعاون حاصل تھا۔

سب سے اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ایرانی فوج اپنی قابلیت اور مہارت میں امریکی فوج سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ بلکہ بعض فنی و عسکری امور میں ایرانی فوج کی صلاحیت و قابلیت امریکی فوج سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اس کے باوجود ایرانی فوج، جنرل سے لے کر عام سپاہی تک، ہمیشہ اور ہر حالت میں امریکی فوج کی نگرانی میں کام کرنے

پر مجبور تھی۔ ایرانی جنرلوں کے سامنے قوم کی آزادی کا مسئلہ کبھی نہ تھا۔ لیکن عام فوجیوں کے نزدیک یہ بڑی شرم اور غیرت کی بات تھی۔ ایک اعلیٰ لیاقت و مہارت رکھنے والا ایرانی فوجی افسر ایک معمولی امریکی سپاہی کے زیرِ فرمان تھا اور اسے امریکی سپاہی کے مقابلے میں بہت کم تنخواہ اور مراعات حاصل تھیں۔

غرضیکہ ایران کے انقلاب کا ایک بڑا محرک امریکا سے ایرانی فوج کی وابستگی بھی تھا۔ ایرانی عوام چاہتے تھے کہ امریکا کی فوجی اطاعت ختم ہو۔ ایران کی اپنی ایک خود مختار، مستقل اور آزاد فوج ہو، تاکہ سب کی آزادی اور خود مختاری کے دفاع کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلم ممالک کے مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ اسرائیل کے مقابلے میں جنگ کر سکیں، اور ہر جگہ کمزوروں اور محروموں کی مدد اور امریکی فوج کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے عملی تدابیر اختیار کر سکیں۔ ایرانیوں کا خیال تھا کہ جو فوج امریکا کی مطیع اور خدمت گزار ہو، وہ کبھی عوام اور اسلامی ممالک اور عام انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

سیاسی محرک

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانانِ عالم غیر مسلم اقوام اور غیر مسلم ممالک سے دوستانہ روابط رکھ سکتے ہیں، مگر وہ دوستانہ روابط کو برقرار رکھنے کے لیے کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کر سکتے۔ ایک اسلامی حکومت کسی ایسی حکومت کے ساتھ، جو کمزور قوموں پر ظلم و ستم روا رکھتی ہو، اور اس کے حقوق آزادی کو پامال کرتی ہو، دوستانہ تعلقات استوار نہیں کر سکتی۔

یہ سادہ اصول پہلوی دورِ حکومت میں دیکھنے میں نہیں آیا، بلکہ اس کے برخلاف پہلوی بادشاہوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مغربی سامراج کا دستِ جبر و تشدد ایرانی قوم اور دوسری قوموں پر دراز ہی ہوتا چلا جائے۔ 1920ء میں برطانیہ کی مداخلت سے ایران میں پہلوی بادشاہت کا سلسلہ شروع ہوا اور 1941ء میں برطانیہ ہی کی براہ راست مداخلت سے رضا خان کی جگہ اس کے بیٹے محمد رضا کو تخت نشین کیا گیا۔ اصولی طور پر پہلوی حکومت سو فی صد پٹھو حکومت تھی۔ 1978ء کے اواخر میں شاہ نے اپنی تقریروں میں خود اس کا اعتراف کیا کہ اس کے عہد حکومت میں وہ نمائندے جو انتخابات کے ذریعے پارلیمنٹ میں آنا چاہتے تھے، ان کے نام تہران میں امریکی سفارت خانے سے اسے دیئے جاتے تھے (شاہ نے ''امریکہ'' کی بجائے ''ایک بڑے ملک'' کہا تھا)

پہلوی دورِ حکومت میں ایسی بے شمار سامراجی تجویزیں مغربی جہاں سوزوں کی طرف سے ایران پر تھوپی گئیں، جن کی وجہ سے ایران کے طبعی و قدرتی وسائل اور سرمایہ اغیار کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ زراعت و صنعت تباہ و برباد ہو گئی۔ ایران ثقافتی، اقتصادی اور فوجی لحاظ سے مکمل طور پر امریکا کا غلام بن کر رہ گیا۔ 1963ء میں ''کیپ چولیشن'' نام کا ایک شرمناک قانون پارلیمنٹ سے منظور کرایا گیا۔ اس قانون کی رو سے ایران میں تمام امریکی باشندے گویا ہر جرم کے لیے آزاد ہو گئے تھے۔ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی ایران میں نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف امریکا کی عدالتوں میں ہو سکتی تھی۔ خمینی نے اس قانون پر سخت اعتراض کیا تھا، جس کے نتیجے میں انہیں سی آئی اے کے حکم پر ساواک نے گرفتار کر کے ترکی جلاوطن کر دیا تھا۔

امریکا سے پہلوی حکومت کی سیاسی وابستگی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ امریکا ہی کے ایماء اور حکم پر اسرائیل اور جنوبی افریقہ سے بہترین روابط قائم کیے گئے تھے، حالانکہ ایرانی عوام بیت المقدس کی وجہ سے فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ دلی ہمدردی اور محبت رکھتے تھے اور اسرائیل کی غاصب اور ناجائز حکومت سے بڑی شدت سے نفرت کرتے تھے۔ شاہ کی حکومت نے اپنے تمام وسائل اور امکانات کے ذریعے صیہونیت کی حمایت کی۔ یہ تمام وسائل اور امکانات شاہ کی ملکیت نہ تھے، بلکہ ایرانی عوام کی گاڑھی کمائی کا نتیجہ تھا۔

اسرائیل کے علاوہ رھوڈیشیا کی نسل پرست حکومت، جنوبی افریقہ کی غاصب اور سامراجی حکومت، اور فلپائن کی مارکوس کی حکومت غرض ان تمام امریکی ایجنٹوں کی حکومتوں کے ساتھ شاہ کی حکومت کے دوستانہ اور انتہائی خوشگوار تعلقات تھے۔ ایران ان کو تیل فراہم کرتا، ان کی مالی امداد کرتا، قرضے دیتا اور سیاسی لحاظ سے ہمیشہ ان کی تائید کرتا۔ نیز تیسری دنیا کی ایسی حکومتوں کے خلاف، جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتیں، امریکی سازشوں میں ایران بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

پہلوی حکومت نے امریکا کی عملاً غلام ہونے کے باوجود اپنے ہمسایہ ملک سوویت روس کو راضی رکھنے کے لیے، ایران کی عوامی دولت کا کچھ حصہ روس کو دے رکھا تھا اور اس سے کچھ معاشرتی اور اقتصادی معاہدے بھی کر رکھے تھے۔ شاہ نے ایک طرف تو امریکا اور اس سے وابستہ مغربی ممالک کو ایران کی عظیم دولت کو لوٹنے کی اجازت دے رکھی تھی تو دوسری طرف روس اور اس کے دوست ممالک کو ''گیس'' کی دولت سے فائدہ اٹھانے کی۔ اس طرح اس نے کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ مغربی ممالک کی طرح مشرقی ممالک بھی صنعت وحرفت، زراعت، تجارت، غرض ہر میدان میں ایران کو اپنے سے وابستہ رکھیں۔

ملک کے اندر شاہ کی پروپیگنڈا مشینری کی کوشش یہ تھی کہ غیروں سے یہ وابستگی، یہ دل بستگی ظاہر نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہ پروپیگنڈا کیا جاتا تھا کہ چونکہ شاہ کی حکومت طاقت، آزادی اور استقلال رکھتی ہے، اس لیے وہ مشرق ومغرب سے روابط رکھنا چاہتی ہے۔

ملک میں جو سکون، جمود اور ٹھہراؤ پایا جاتا تھا، وہ فی الحقیقت مشرق ومغرب، روس اور امریکا، دونوں بلاکوں میں ملک کی قدرتی دولت کی تقسیم کا نتیجہ تھا، مگر شاہ کے حواری اسے شاہ کا ایک معجزہ بتا کر پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایران کو ''جزیرۂ ثبات'' کا لقب دے کر عوام کے ذہنوں میں زبردستی ثبات واستقلال کے غلط معنی ومفہوم بٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی، حالانکہ سامراجیوں کے نقطۂ نظر سے شاہ کے زمانے میں ایران ایک ایسا جزیرۂ ثبات تھا، جہاں سامراجی ایجنٹ آسانی کے ساتھ لوٹ کھسوٹ کر سکتے تھے اور نہ صرف یہ کہ شاہ نے ان کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں، بلکہ اس پر علاقے میں سامراجی مفادات کے تحفظ کی جو ذمہ داری تھی، اسے بھی بڑی خوبی سے انجام دیا اور شاہ کے سامراجی آقاؤں نے اس کے صلے میں اس کو ''ژاندارم خلیج''، یعنی خلیج فارس کے محافظ کے لقب سے نوازا۔ ظاہر ہے کہ یہ ''جزیرۂ ثبات'' جس کا سکون اور ٹھہراؤ ایرانی عوام کے نقطۂ نظر سے ایک ایسا سکون اور ٹھہراؤ تھا، جو طوفان سے پہلے ہوتا ہے۔۔۔ وہ طوفان جو ایران کے مسلم عوام کی حریت اور آزادی کے نعروں کی گونج

سے اٹھا اور شاہ "زانداارم" اور اس کے آقاؤں کو خلیج فارس میں متزلزل کر کے رکھ دیا۔

گھٹن کا ماحول

یہ ایک فطری بات تھی کہ شاہ کی حکومت کے ان تمام جرائم اور خیانتوں پر ایران کے مسلم عوام خاموش نہیں رہ سکتے تھے اور نہ ہی وہ اسلامی ثقافت کو مسخ ہوتے دیکھ سکتے تھے۔ وہ یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا ملک ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور فوجی حیثیت سے دوسروں کا دست نگر بنا رہے اور وہ شاہ کی پٹھو حکومت پر کوئی اعتراض نہ کریں۔

پہلوی حکومت کے استبداد کے خلاف جدوجہد اور مبارزت کا آغاز پہلے بادشاہ رضا خان کے عہد میں ہوا تھا۔ خود خمینی نے بھی رضا خان کے استبدادی دور حکومت ہی میں اپنی جدوجہد شروع کی تھی اور انہوں نے رضا خان کے خلاف اپنی مشہور کتاب "کشف الاسرار" اسی دور میں لکھی تھی اور شائع کی تھی۔ خمینی رضا خان کو سلطنت کے لائق نہیں سمجھتے تھے اور شروع سے ہی اس کی سلطنت کی بساط الٹنے کے حق میں تھے، لیکن خمینی کی اصل تحریک تک پہلوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے میدان ہموار نہیں ہوا تھا۔ خمینی کی تحریک شروع ہونے سے پہلے تک شاہ کے خلاف جو بھی جدوجہد ہوئی، وہ آئین کے دائرے تک محدود رہی۔ اس کا مقصد حکومت کو سرنگوں کرنا تھا، بلکہ حکومت کو ملک میں رائج آئین وقانون کا پابند کرنا تھا، حتیٰ کہ یہ طرز فکر پہلوی حکومت کے زوال اور اسلامی انقلاب کی کامیابی تک بہت سے حریت پسندوں پر حاوی تھا۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد جب کہ اس سیاست اور طرز فکر کی حقیقت تمام ایرانیوں پر روشن ہو چکی ہے، تب بھی زمانہ غلامی کے بعض سیاست دان جو ایک زمانے میں شاہی حکومت کے خلاف جدوجہد بھی کر چکے ہیں، اپنے دلی طرز فکر اور اعتقاد پر قائم ہیں۔ وہ اب بھی اپنے اس سیاسی عقیدے سے دست بردار نہیں ہوئے کہ جدوجہد کا اصل مقصد شاہ کو حکومت سے سلطنت (ریاست) کی طرف پلٹانا تھا۔ اسلامی انقلاب سے پہلے بھی "نہضتِ آزادی" کے لیڈروں کا یہی عقیدہ تھا کہ جدوجہد آزادی، غیر جانب دارانہ اور شفاف انتخابات کے لیے ہونی چاہیے۔ شاہ کو "حکومت" کے لیے "ریاست" کے لیے برقرار رکھنا چاہیے۔ اس گروپ کے لیڈر مہدی بازرگان نے 11 دسمبر 1979ء کو یعنی شاہی حکومت کے زوال کے تقریباً ایک سال بعد ایک اخبار کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے لکھا تھا:

""نہضتِ آزادی اور ہم سب لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ انتخابات ایک الٰہی دسترخوان کی مانند ہیں۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ شاہ کی حکومت جب آزادانہ انتخابات کے لیے رضامند ہو چکی ہے تو پھر اس سے بہتر بات کیا ہو سکتی ہے؟ پہلا کام ہم یہ کریں گے کہ اگر حکومت کا یہ کہنا صحیح ہے کہ انتخابات آزادانہ ہوں گے تو ہم حکومت سے کہیں گے کہ ہمیں سیاسی مرکز اقتدار رکھنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ اجازت ملے گی یا نہیں ملے گی۔ اگر اجازت ملی تو یہ سیاسی مرکز ایک ایسا ذریعہ ہوگا کہ ہم ایک جگہ جمع اور متحد ہو سکیں۔ اور اگر سیاسی مرکز رکھنے کی اجازت نہیں ملتی تو ہم حکومت کا گریبان پکڑیں گے اور کہیں گے کہ تیرا کہنا غلط اور جھوٹ ہے۔ اور اگر سیاسی مرکز رکھنے کی اجازت مل جاتی ہے تو ہم کہیں گے، بہت خوب۔ یہ آزادانہ انتخابات کا ثمر ہے۔ جب ہم اپنے امیدوار کھڑے کریں گے، تو یقینی طور پر لوگ ملی پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دیں گے۔ (ملی پارٹی یعنی حزبِ اختلاف)۔ اگر انتخابات ہوئے تو مخالفین،

خواہ وہ ملی، روحانی، نہضت آزادی یا فلاں وفلاں پارٹی کے ہوں۔۔۔۔ پندرہ بیس لوگ پارلیمنٹ میں جائیں گے۔ اگر نہیں گئے تو ہم انہیں ذلیل وخوار کریں گے اور کہیں گے، جناب جمی کارٹر صاحب، جناب امریکا صاحب، آپ کا حقوق انسانی کا دعویٰ جھوٹ ہے، فریب ہے۔ شاہ کو ایک بہانہ مل گیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ ہم نے عوام کو آزادی دے دی ہے۔ عوام نے انتخابات میں کھل کر حصہ نہ لیا تو شاہ کہے گا کہ ہم نے تو آزادی دے دی تھی، عوام نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ میڈیا کو بھی آزادی ملنی چاہیے، بلکہ میڈیا کی آزادی کے ذریعے انسان ہر طرح کی محاذ آرائی کر سکتا ہے۔ میڈیا کے ساتھ عدلیہ کو بھی آزادی ملنی چاہیے۔''

اسلامی انقلاب کے لیے اسلامی تنظیم کی ضرورت

جس وقت ایران میں اسلامی انقلاب عروج پر تھا اور ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کی سانس اکھڑ چکی تھی، اور وہ ختم ہونے کے قریب تھی، اور عوام پر یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ خمینی کا طرزِ مبارزت شاہی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے پر مبنی بالکل صحیح اور درست ہے، شاہی حکومت قطعی طور پر زوال پذیر ہو کر رہے گی، اس وقت بھی اکثر سیاست دان یہ خیال کرتے تھے کہ پارلیمنٹ کی خود مختاری اور عدلیہ کی آزادی کی ضمانت حاصل ہو جائے تو شاہی نظام کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور برقرار رکھا جانا چاہیے۔ ایسے سیاست دانوں میں مہدی بازرگان اور دوسرے ہم خیال سیاست دان اس بات پر قانع تھے کہ پارلیمنٹ آزاد ہو اور وہ عوام کے صرف بیس منتخب نمائندوں پر مشتمل ہو۔ ان کا خیال تھا کہ صرف اتنے اختیارات حاصل ہونے سے بھی عدلیہ اور میڈیا کی آزادی آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس سیاسی گروہ کی جدوجہد کا یہی آخری ہدف تھا۔ 5 جون 1963ء کے حادثہ فاجعہ سے پہلے شاہ کی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کا یہی اصل موقف تھا۔ 5 جون کے خون ریز واقعے کے بعد بائیں بازوں کی سیاسی جماعتوں کی بھی یہی پوزیشن رہی۔

سیکولر سیاسی قیادت کی بجائے مذہبی جماعتوں نے اپنی مبارزت کی بنیاد شہنشاہیت کے خاتمے پر رکھی۔ مذہبی جماعتوں کے سرخیل خمینی، جن کا موقف شروع ہی سے شاہی حکومت کا خاتمہ تھا، اپنی جلاوطنی کے طویل عرصے، اور آخر میں 11 فروری 1978ء تک، کھلم کھلا اپنی تقاریر و بیانات میں شہنشاہی حکومت اور پہلوی خاندان کے مٹانے کا مطالبہ کرتے رہے۔ شاہ کی خفیہ پولیس ''ساواک'' کے افسر اور کارکن نہ صرف ان افراد کو جو شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیئے جانے کے خواہاں تھے، سختی کے ساتھ کچل دیا کرتے تھے اور قید خانوں میں شکنجوں میں جکڑ کر ہلاک کر دیا کرتے، بلکہ ''نہضت آزادی'' اور دوسری قومی تحریکوں اور جماعتوں کو بھی، جو شاہی حکومت کے مجوزہ قوانین کے دائرے میں رہ کر ہی جدوجہد کرتی تھیں، ان کے ساتھ بھی بڑی خشونت اور رعونت سے پیش آتے تھے۔

شاہی حکومت کے عہد میں خصوصاً 19 اگست 1953ء کی فوجی بغاوت کے بعد سنسر، تشدد اور گھٹن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ کسی قسم کی سیاسی سرگرمی کا کوئی امکان نہ رہا، خواہ وہ شاہ کے اپنے مجوزہ قوانین کے دائرے ہی میں رہ کر کیوں نہ ہو۔ حکومت کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو بری طرح کچل دیا جاتا تھا۔ خمینی کی تصانیف، تصویر، کوئی تحریر یا تقریر کا کیسٹ رکھنا سختی سے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اگر کسی شہری کے پاس خمینی کی اس قسم کی کوئی چیز مل جاتی تو اسے

پھانسی پر چڑھا دیا جاتا یا لمبی مدت کے لیے قید با مشقت میں ڈال دیا جاتا تھا۔ 1953ء سے 1978ء تک کے عرصے میں مختلف طبقوں کے ہزاروں افراد کی تقریر کرنے، کتاب لکھنے، حریت پسند گروہ بنانے یا خمینی کے بیانات اور تقاریر، ان کا کوئی پمفلٹ یا کتاب یا تصویر ہمراہ رکھنے یا تقسیم کرنے یا شاہی حکومت کی خیانتوں کے خلاف دوسرے اقدامات کے جرم میں ساواک کے ذریعے قید خانوں میں شکنجہ دے کر بڑی بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ شاہی ایجنٹوں نے بہت سے مجاہدین کو اور شاہ کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو زندہ جلا دیا، بہتوں کو آروں سے چیر ڈالا۔ بہت سے اسلامی مفکروں اور دانش وروں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جیلوں میں گزارا۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور حوزہ کے بہت سے طلبہ، تاجر پیشہ افراد، مزدوروں اور کاریگروں نے شاہ کی جیلوں میں جان دے دی یا ان کے اعضاء کاٹ دیئے گئے۔ ساواک کے جابر کارکن انقلابیوں سے اعتراف کرانے اور راز معلوم کرنے کے لیے انہیں مختلف قسم کی سخت جسمانی اذیتیں پہنچانے کے ساتھ ساتھ روحانی اذیتیں پہنچاتے تھے۔ ان کی ذہنی ایذا رسانی کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ انقلابی قیدی کی بیوی، بیٹی یا بہن کو پکڑ کر جیل میں لاتے تھے اور اس قیدی کو ڈراتے دھمکاتے تھے کہ اگر اس نے ''راز'' نہ بتایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے ہی اخلاق سوز عمل انجام دیا جائے گا۔ ساواک کا عمل دخل ہر دفتر اور ہر محلے اور ہر گلی میں تھا۔ اس کے ہزارہا ملازمین تھے جن کو سرکاری خزانے سے بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ان کے لیے عیش و عشرت کے تمام سامان فراہم تھے، تاکہ وہ خائن شاہ کی دل و جان سے خدمت کر سکیں۔ یہ لوگ یونیورسٹیوں، کارخانوں، سرکاری محکموں، مسجدوں، عام مقامات، مدرسوں، سڑکوں، حتیٰ کہ علمائے دین کے گھروں اور خاندانوں میں اس طرح گھسے ہوئے تھے کہ لوگ ایک دوسرے سے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔

ایسے پر آشوب حالات میں ایران کی بہادر قوم نے خمینی کی قیادت میں جدوجہد کی اور بے پناہ ایثار اور فداکاری کے ساتھ، ساٹھ ہزار سے زائد شہدا اور کم و بیش ایک لاکھ مجروحین کی قربانی دے کر شاہ کی آمرانہ اور فسطائی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور سی آئی اے اور موساد جیسی جاسوسی تنظیموں کی سازشوں کو ناکام بنا کر ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ''جمہوری اسلامی'' نظام قائم کر دیا جو ایران کے لیے ایک انوکھی بات اور دیرینہ آرزو تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انقلاب کا محرک فقط اسلام کا احیاء اور اسلامی طرز حکومت کا قیام تھا، تاکہ ایرانی قوم ثقافتی، سیاسی، فوجی، اقتصادی اور معاشرتی آزادی اسلامی حکومت کے زیر سایہ حاصل کر سکے۔

سامراجیوں کی تشہیری تحریک

ایران کے مسلمانوں نے متحد و منظم ہو کر اسلامی تحریک ایسے حالات میں شروع کی، جب کہ انقلاب برپا کرنے والی کسی تنظیم کا نام و نشان تک نہ تھا، جو اسلامی ہو اور تحریک کو منظم طریقے پر آگے بڑھانے کی ذمہ دار ہو۔ حتیٰ کہ انقلابیوں کے پاس کوئی اخبار، ریڈیو یا کوئی اور مؤثر ذریعۂ ابلاغ بھی نہیں تھا جو قائد (خمینی) کی آواز عوام تک پہنچا سکتا۔ قائد اور عوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ صرف کیسٹس اور قائد کے پیغامات تھے، جنہیں ابتدائی وسائل سے کثیر تعداد میں تیار کر کے اسلامی گروہوں کی ان نیم منظم انقلابی طاقتوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا جاتا تھا جو قائد اور

عوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھے۔

سامراجی ذرائع ابلاغ، خصوصاً بی بی سی لندن، وائس آف امریکا اور اسرائیل ریڈیو ہمیشہ اپنے سیاسی تجزیوں کی بنیاد پر تحریک کی ناکامی کے راگ الاپتے رہے اور مستقبل کے لیے غلط جائزے اور منفی پیشین گوئیاں کرتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ماسکو ریڈیو نے بھی اپنے کسی جائزے یا تبصرے میں کھلی حقیقت کی طرف اشارہ تک نہیں کیا، حالانکہ ایران میں عوامی انقلاب آجانے سے روس کو تو خوش ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس انقلاب سے بہر حال علاقے میں امریکا کے اثرات ختم ہونے والے تھے اور اس انقلاب سے اس کے دشمن کو ایک ایسے ہمسایہ ملک سے باہر نکلنا تھا، جہاں وہ فقید المثال جاسوسی اور عسکری وسائل وامکانات رکھتا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ ماسکو ریڈیو نے 5 جون 1963ء کے خونین واقعے کو ''رجعت پسند تحریک'' کا نام دیا جس میں چند گھنٹوں کے اندر پندرہ ہزار ایرانی مسلمان حکومت کی بربریت اور سفاکی کے شکار ہو کر خاک وخون میں مل گئے۔

یہ درست ہے کہ روس یا دوسری طاقتوں کے ایسے رجعت پسندانہ تجزیے عالمی طاقتوں کی ضدی طبیعت کے غماز تھے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تحریک وانقلاب کی ایسی تشریحیں اس امر کی نشان دہی کر رہی تھی کہ عالمی طاقتیں اس انقلاب کی حقیقت و ماہیت کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ، وہ اسلامی ممالک جو مغربی استعمار کے نیچے دبے ہوئے، ہر طرح کے ظلم وستم برداشت کر رہے ہیں، انہیں اس مقصد میں صرف اسی وقت کامیابی نصیب ہوگی جو وہ ایران کے انقلاب کے ''طرزِ عمل'' کا غور سے مطالعہ کریں جس سے انقلاب کامیابی کی منزل تک پہنچا ہے، اور وہی شیوہ اختیار کریں جو اسلامی انقلاب کی روح رہی ہے، یعنی تمام عالمی طاقتوں کو مسترد کر کے صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان واعتماد ہی وہ قوت تھا جس نے انقلاب کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

انقلابی قوتوں کی تنظیم

کسی بھی تحریک یا انقلاب کا سب سے اہم مسئلہ ''تنظیم'' کا ہوتا ہے۔ تنظیم کی اہمیت کا اندازہ اس نیت اور عزم سے ہوتا ہے جس کے تحت وہ وجود میں آئی ہے۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان کسی بھی ملک میں ایک ایسی تنظیم بنانے میں اب تک کامیاب نہیں ہوسکے جو خالص اور سو فیصد اسلامی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانان عالم کی نفاذ شریعت کی تمنا برگ وبار نہ لاسکی۔ مختلف مسلم ممالک میں احیائے اسلام کی تحریکات میں ناکام ہونے کا ایک سبب کسی ایسی تنظیم کا نہ ہونا بھی ہے۔ تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالیے۔ خلافت راشدہ کے بعد سینکڑوں سال تک بنی امیہ اور بنی عباس کی ظالمانہ حکومت قائم رہی۔ علویوں کی تحریک، اور خاص ایران میں مشروطیت کی تحریک اور پہلوی دور حکومت میں روحانیت اور علماء کی تحریک ان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں میں اسلامی تحریکیں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہوتے شکست سے دوچار ہوگئیں، اور اگر کامیاب ہو بھی گئیں تو کامیابی کے بعد، حالات مزید ابتر ہوگئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ تحریک سے حاصل ہونے والے نتائج اور اس تحریک کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے کوئی مضبوط اور مستحکم ذریعہ نہیں تھا۔ یعنی کوئی ایسی باقاعدہ تنظیم موجود نہیں جو خالص اسلامی ہو۔ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ ان تحریکوں میں بے گناہوں کا خون بہایا گیا اور اس قربانی سے فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا، جن کا خون دینے والوں کے مقصد سے دور کا

بھی واسطہ نہیں تھا، اور اس راہ پر چلے جو خون دینے والوں کی راہ نہ تھی۔

علمائے عصر پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی تھی کہ انقلاب صرف اسی وقت کامیاب ہو سکے گا جب صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے خالص اسلامی تنظیم کے ذریعے لایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ایسی تنظیم کا وجود ایران کے تمام انقلابی ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کر چکا تھا۔ آخری انقلابی تحریک سے بہت پہلے ''فدائیانِ اسلام'' نامی تنظیم کا وجود اس امر کا شاہد ہے کہ علماء ایک تنظیم کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ فدائیانِ اسلام کے رہنماؤں نے اپنی تنظیم کو تشکیل دینے کے سلسلے میں ''تحریک جنگل'' کے تجربات سے استفادہ کیا تھا۔ تحریک جنگل بھی میرزا کوچک جنگلی نام کے ایک عالم دین کی قیادت میں شروع ہوئی تھی، مگر بہت سے اسباب کی بناء پر یہ تحریک ناکام ہو گئی، جس کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس تحریک کی پشت پر کوئی ''تنظیم'' نہیں تھی۔ بہر حال ''فدائیانِ اسلام'' اور تحریک ''نہضتِ ملی'' کے نام سے مشہور تحریک کی شکست سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ اسلامی قوتوں کی کوئی ایسی تنظیم ہونی چاہیے جو خالص اسلامی ہو، تاکہ وہ اپنے مقصد یعنی اسلامی حکومت قائم کرنے اور اسے دوام و استحکام دینے میں کامیاب ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایسی تنظیم کا وجود میں لانا شاہی حکومت کے پر اضطراب ماحول میں کوئی آسان کام نہیں، بلکہ ممکن ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلامی قوتوں کی صرف یہی کوشش رہی کہ وہ خفیہ طریقے سے آپس میں رابطہ برقرار رکھ سکیں، اور ایک نامکمل، برائے نام تنظیم کے تحت شاہی حکومت کے خلاف مقابلہ آرائی کر سکیں۔

پہلی تحریک

خالص اسلامی قوتوں کے پاس اس وقت کوئی باقاعدہ تنظیم موجود نہیں تھی، جب کہ غیر اسلامی طاقتیں نصف صدی سے تنظیم رکھتی تھیں، اسی طرح ان طاقتوں کے پاس بھی تنظیم موجود تھی، جو کہنے کو تو مسلمان تھیں، مگر ان کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا نہیں تھا، بلکہ ان کی جدوجہد کی نوعیت صرف قومی اور سیاسی تھی، اور ان کا مقصد ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ اگر انہیں انتخابات میں آزادی دے دی جاتی اور ان کے کچھ نمائندوں کو پارلیمنٹ میں لے لیا جاتا تو پہلوی حکومت کے خلاف وہ تحریک سے بھی دستبردار ہونے کو تیار تھیں۔ ایران کی ''تودہ پارٹی'' جو نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی تھی بلکہ اسلام مخالف بھی تھی اور ایران میں پچاس سال سے خیانت کاری کرتی چلی آرہی تھی، تودہ پارٹی سے لے کر جبہہ ملی تک تمام سیاسی جماعتوں کا مقصد ایک جمہوری حکومت قائم کرنا تھا۔ ممکن ہے کہ ان سیکولر جماعتوں کے علاوہ دوسری جماعتوں کا مقصد ابھی مشرقی یا مغربی انداز فکر کی بنیاد پر جمہوری حکومت قائم کرنا رہا ہو، لیکن بہر حال جمہوریت اور اسلامی طرزِ حکومت میں نمایاں فرق ہے۔ علاوہ ازیں ''جبہہ ملی'' سے پیدا ہونے والے بہت سے گروہ اور پارٹیاں مارکسی اور اشتراکی نظریات پر اعتقاد رکھتی تھیں۔ تودہ پارٹی تو خالص کمیونسٹ پارٹی تھی۔ کچھ پارٹیاں ماؤزے تنگ اور چینی اشتراکیت کی حامی تھیں۔ ان تمام سیاسی جماعتوں کا نصب العین ایک ہی تھا کہ شاہی حکومت کو بدل کر جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ اسلام یا اسلامی نظام یا اسلامی حکومت قائم کرنے کے مقصد سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔

ایرانی انقلاب سے پہلے کی سیاسی جماعتیں

جبہہ ملی اور تودہ پارٹی، یہ دو سیاسی جماعتیں تھیں، جو ابتدا میں باہم رقیب کی صورت میں پہلوی حکومت کے ساتھ نبرد آزما ہوئیں۔ دونوں جماعتیں سیکولر تھیں، اور دونوں ہی غیر اسلامی آئیڈیالوجی لے کر میدان عمل میں آئیں۔ جبہہ ملی تہذیبی اقدار کی حامل تھی اور تودہ پارٹی مارکسی نظریے پر یقین رکھتی تھی۔ ان دونوں سیاسی رقیبوں نے، جن میں سے ایک کا مقصد ایران کو مغرب سے وابستہ کرنا تھا اور دوسرے کا روس سے، اہل ایران کے ساتھ کھلی ہوئی خیانت کی۔ تودہ پارٹی نے 18 اگست 1953ء کی بغاوت کے لیے زمین ہموار کی اور جبہہ ملی نے اس وقت ایران کے ساتھ خیانت کی جب اسلامی انقلاب کے عروج کا زمانہ تھا، یعنی 1978ء میں ناہنجار شاہ پور بختیار کے ذریعے شاہی حکومت کی کمک کے لیے آگے بڑھی اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد بھی اس عوامی حکومت کے مقابلے میں کھڑی رہی اور انقلاب کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

جبہہ ملی اپنی کارروائیوں کے دوران ہی آپس کے اختلافات سے دوچار ہوگئی، اور پھر شاخ در شاخ تقسیم ہو کر ہمیشہ کے لیے مرجھا گئی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جبہہ ملی کے پاس کوئی ٹھوس اور معین نظریہ نہیں تھا۔ اس پارٹی کی ایک شاخ جس سے خود کئی دوسری شاخیں پھوٹیں، "نہضتِ آزادی" تھی۔ یہ تنظیم 1962ء میں ان افراد نے بنائی تھی جو اسلامی رجحان رکھنے کی بناء پر جبہہ ملی سے علیحدہ ہوئے تھے، نہضت آزادی کے پاس جو آئیڈیالوجی تھی، وہ اگرچہ اسلامی رجحانات پر مبنی تھی، مگر چونکہ اس تنظیم کے رہنماؤں میں اکثر وہ لوگ تھے جن کی تعلیم مغرب میں ہوئی تھی اور ان کا اسلام بھی مغربی اقتدار سے جڑا ہوا تھا، اس لیے وہ لوگ مکمل طور پر ایک خالص اسلامی تنظیم کی صورت سے کام نہیں کر سکے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ "نہضت آزادی" کو قوم پرستی کے شدید اور تنگ نظر رجحانات جبہہ ملی سے ورثے میں ملے تھے جو اس تنظیم کے افکار میں خالص اسلامی تعلیمات شامل کرنے سے مانع ہو رہے تھے۔ اس جماعت کے لیڈروں میں سے ایک شخص بھی اسلامی علوم میں مجتہد نہیں تھا۔ ان نقائص کے ساتھ ساتھ مغرب زندگی کے مہلک مرض نے اس تنظیم کو کبھی نہیں چھوڑا اور یہ تنظیم جو اسلامی جذبات و رجحانات کے دعوے کے ساتھ "جبہہ ملی" سے جدا ہو کر وجود میں آئی تھی، خالص اسلامی افکار و نظریات پر کاربند نہ رہ سکی۔

"نہضت آزادی" میں مغربی افکار و اقدار کے پیدا ہو جانے کے سبب یہ ہوا کہ 1965ء کے خونیں واقعے کے دو سال بعد اس تنظیم سے جدا ہو کر ایک نئی تنظیم "مجاہدین خلق" کے نام سے وجود میں آئی، جس کے زیر اثر انقلابی کام کرنے والے نوجوان مسلح اور عسکری جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔

"مجاہدین خلق" کے پاس کوئی خاص نظریہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی اس کمزوری اور بے مائیگی کو دور کرنے

کے لیے کارل مارکس، ماؤزے تنگ اور دوسرے مقبول و معروف اشتراکی رہنماؤں کے نظریات کا سہارا لیا اور خود کو اسلامی کہلانے کے باوجود اشتراکیت کے دامِ فریب میں آ گئی۔ چند سال تک تو یہ بات مخفی رہی، مگر 1975ء میں یہ راز فاش ہو گیا۔ ایک طرف تو یہ راز فاش ہو گیا، دوسری طرف اس تنظیم کے بہت سے ارکان کو اشتراکیت قبول نہ کرنے پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تنظیم سے ایک اور گروہ الگ ہو گیا، اور اس نے ایک دوسری تنظیم بنالی۔ بعد میں خود اس نئی تنظیم کی بھی مختلف شاخیں ہو گئیں اور چونکہ یہ شاخیں ''سازمان مجاہدین خلق'' مارکسی ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں، لہٰذا اس تنظیم نے اپنی پالیسی تبدیل کر لی اور پہلے کی طرح پھر اپنا تعارف ایک ''اسلامی'' جماعت کی حیثیت سے کرانا شروع کر دیا، تاکہ مسلمان نوجوان کو دامِ فریب میں لا کر ان کی برین واش کر کے مارکسی تنظیم کی مختلف شاخوں کا ممبر بنایا جا سکے۔

جس زمانے میں ''مجاہدین خلق'' اور دوسری سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں، اسی زمانے میں ایک اور اشتراکی تنظیم بھی ''سازمان چریکہائے فدائی خلق'' کے نام سے ظہور میں آئی۔ اس جماعت کا نظریہ بھی وہی تھا جو تودہ پارٹی کا تھا، یعنی یہ جماعت بھی اشتراکی تھی۔ بعد میں یہ تنظیم کئی شاخوں میں بٹ گئی، مگر ان سب نے مل جل کر ایسا خطرناک راستہ اختیار کیا کہ وہ پارٹی اپنی خیانتوں کے باوجود یہ خطرناک راستہ اختیار نہ کر سکی۔

دوسری انقلاب ساز تحریک

ایک صدی پہلے علماء اور ان سیاسی طاقتوں کی طرف سے جو اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتی تھی، ایران کی شاہی حکومت اور دوسرے ممالک کی ظلم پیشہ حکومتوں (مثلاً عراق) کے خلاف جدوجہد اور مبارزت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ مبارزت قاچاری حکومت کے آخری زمانے میں ''نہضت جنگل'' کی شکل میں مرزا کوچک خان کی قیادت میں شروع ہوئی۔ مرزا کوچک خان جنگلی گیلان کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے قم کے حوزہ علمیہ میں تعلیم پائی تھی اور سید جمال الدین، مرزا شیرازی اور دوسرے علماء کے مبارزات کو ایک نئے مرحلے میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ ''نہضت مشروطیت'' جو روحانی علماء کی قیادت میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی غرض سے شروع ہوئی تھی، وہی اس تحریک کی جڑ تھی اگرچہ سامراجی ایجنٹوں نے ''نہضت مشروطین'' کو اس کے اصل مقصد سے منحرف کر دیا۔ نیز اس تحریک کے پیشوا شیخ فضل اللہ نوری کو جو آئین اور پارلیمنٹ کو اسلامی بنانا چاہتے تھے، تختہ دار پر چڑھا دیا اور ابتدا میں نہضت مشروطیت کا جو مقصد تھا، وہ فوت ہو گیا۔

نہضت مشروطیت کے تلخ تجربے کے بعد علماء اور اسلام پسند طاقتوں کی، حوزۂ علمیہ قم کے ایک طالب علم سید مجتبیٰ نواب صفوی کی قیادت میں ''فدائیان اسلام'' کے نام سے ایک نئی اسلامی تنظیم وجود میں آئی۔ محمد رضا پہلوی کی حکومت کے خلاف ''فدائیان اسلام'' اور آیت اللہ کاشانی کی جدوجہد میں شکست یہ دوسرا تلخ تجربہ تھا۔ دوبارہ علماء اور اسلام پسند طاقتوں کو ایک ایسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی جو صحیح معنوں میں اسلامی ہو۔ چنانچہ 1961ء میں ''حزب ملل اسلامی'' کی تشکیل ہوئی، نیز اس کے ساتھ دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور تنظیموں کی تشکیل اسی فکر کا نتیجہ تھیں، جنہوں نے اسلامی انقلاب کے دوران عوام کو شاہی حکومت کے خلاف بے پناہ جدوجہد کے لیے آمادہ کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں تحریکوں (اسلامی اور سیکولر) میں سے کوئی ایک تحریک بھی انقلاب پسند عوام کو پوری طرح کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکتی تھی۔ پہلی تحریک نے ثابت کر دیا کہ وہ گزشتہ پچاس سال کے طویل عرصے میں عوامی اعتماد حاصل کرنے اور عوام کو حرکت میں لانے سے پوری طرح ناکام رہی تھی۔ 1953ء کی بغاوت کے بعد تودہ پارٹی ایرانی عوام کی نظر میں دشمن ثابت ہوگئی۔ یہ بغاوت اسی پارٹی کے تعاون سے وجود میں آئی تھی۔ اس پارٹی کے رہنما اور اہم ارکان بغاوت (1953ء) سے اسلامی انقلاب کی کامیابی تک (1979ء) ایران سے باہر چکر لگاتے رہے۔ یہ لوگ اس لیے بیرونی ممالک نہیں گئے تھے کہ ان پر پہلوی حکومت کا عتاب نازل ہوا تھا، بلکہ انہیں ایران اس لیے چھوڑنا پڑا تھا کہ ایرانی عوام کو ان سے شدید نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ تودہ پارٹی کے سرغنوں پر شاہی عتاب نازل نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شاہی حکومت کے عہد میں ان میں سے بہت سے لوگ اہم سرکاری عہدوں پر تھے اور محمد رضا شاہ کی حکومت کے آخری زمانے میں بھی ان لوگوں نے شاہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ حتیٰ کہ شاہ کی ''رستا خیز پارٹی'' اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ادارت بھی تودہ پارٹی ہی کے بعض افراد کے ہاتھ میں تھی، اور بعد از اں اسلامی انقلاب کی عدالت نے انہیں اس جرم میں پھانسی دی۔ جبہہ ملّی کے لیڈروں نے بھی ایرانی قوم کے ساتھ کھلی ہوئی غداریاں کیں اور پہلوی حکومت کے ساتھ تعاون کرتے رہے، جس کی وجہ سے عوام میں ان کا بھی کوئی اثر نہیں تھا اور بختیار نے شاہ کا جس طرح سے ساتھ دیا، اس سے تو اس جماعت اور اس سے وابستہ گروہوں کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا اور قوم کے سامنے اس کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ غرض ''جبہہ ملی'' نے بھی اسلامی انقلاب حکومت کے خلاف عوام کو منظم کرنے میں عملاً کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

''نہضت آزادی'' اور ''مجاہدین خلق'' اور وہ تمام تنظیمیں، جن کا تعلق پہلی تحریک سے ہے، وہ بھی علماء کی جدوجہد پر اس وقت اعتراض کر رہی تھیں، جب 1977ء میں اسلامی انقلاب کی لہر تیز ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی ان کا یہی خیال تھا کہ اصولاً صرف یہ طریقہ انقلاب کو کامیاب نہیں بنا سکتا، بلکہ اس طرح تو رہی سہی طاقتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ نہضت آزادی کے رہنماؤں کے متعلق ایران میں مشہور ہے کہ ان کا یہ نعرہ تھا: ''بادشاہ باید سلطنت کند نہ حکومت'' یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف ''نہضت آزادی'' کے ایک نمایاں لیڈر نے اپنے اس انٹرویو میں کیا ہے جو انقلاب اسلامی کی کامیابی کے ایک سال بعد اخبار کو دیا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ایران کے عوام ہرگز اس پر تیار نہیں تھے کہ وہ ''آزادی'' اور جمہوری اسلامی کے نعروں سے باز آجائیں، جس کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگادی تھی اور اس کی جگہ ''نہضت آزادی'' کا دیا ہوا نعرہ لگانے لگیں جو شاہی حکومت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی اور شاہ کو صرف قانونی دائرے میں محدود کرنے کی خواہاں تھی۔ مجاہدین خلق کے لیڈر بھی 1977ء اور 1978ء میں، یعنی جو انقلاب اسلامی کے عروج کا زمانہ تھا، بارہا اعلان کر چکے تھے کہ شاہ کی حکومت کے خلاف علماء کی جدوجہد کے موجودہ طریقے کو ہم قبول نہیں کرتے، بلکہ اس کی جگہ مسلح جدوجہد ہونی چاہیے۔ علماء نے خمینی کی قیادت میں مبارزہ اور جدوجہد کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہ عوامی مظاہرے اور احتجاجی جلوس پر مبنی تھا۔ یہ طریقہ نہ تو ''نہضت آزادی'' کے رہنماؤں کو پسند تھا نہ ہی ''مجاہدین خلق'' کو، بلکہ پہلی تحریک میں چھوٹی بڑی جتنی بھی تنظیمیں شامل تھیں، ان میں کسی کو

بھی پسند نہ تھا۔ حالانکہ جدوجہد کا یہی وہ طریقہ تھا جس نے انقلاب کو کامیاب بنایا اور پہلی تحریک میں شامل جتنی طاقتیں تھیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہ انقلاب کو بار آور کامیاب بنانے کے لیے عوام کو منظم اور آمادہ کرنے کے سلسلے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ ان کی کوشش یہی رہی کہ عوام کو انقلاب سے جدا کر دیں۔

وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ انقلاب کا دھارا جس طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے، آگے بڑھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی تحریک ہرگز آمادہ نہیں تھی کہ یہ انقلاب روحانیت اور علماء کی قیادت میں کامیاب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک میں جو طاقتیں شامل تھیں، ان کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ جلد از جلد مختلف بہانوں سے انقلابی لہر کو اپنے قابو میں کر لیں اور انقلابی تحریک میں جمود پیدا کر دیں، تاکہ موقع آنے پر وہ اپنے منصوبے کے مطابق انقلاب کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے سکیں۔

بہر حال اسلام سے عشق رکھنے والے ایرانی عوام نے انقلاب کی لہر کو گلی کوچوں اور ایران کے چپے چپے میں پھیلا دیا اور جان و مال کی قربانی دے کر اسے کامیاب بنایا، اور ان لوگوں کو دوسری تحریک یعنی روحانیت اور روحانی قیادت پر کامل اعتماد و اعتقاد رکھنے والی طاقتوں نے منظم اور آمادہ کر دیا۔ انہوں نے ہی عوام کو گلی کوچوں اور سڑکوں پر نکالا اور ان کی انقلابی تحریک کو ایک شکل عطا کی اور قائدِ انقلاب سے ان کے رابطے اور تعلق کو برقرار رکھا۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اسلامی انقلاب کی اصلی طاقت عوام ہی تھے۔ اس عوامی طاقت میں تنظیم پیدا کرنے والے مجاہد، علماء اور وہ انقلابی عناصر تھے، جنہوں نے خمینی کے نقشِ قدم پر چل کر شاہی حکومت کا بھرپور مقابلہ کیا اور آج بھی اس انقلاب کو باقی رکھنے والے دراصل عوام ہی ہیں جو اسلام اور خمینی کی راہ پر گامزن ہیں۔ پہلی تحریک کے گندے عناصر انقلاب کی کامیابی سے پہلے اس انقلابی تحریک کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔

انقلاب ایران کے بعد ایک ناکام سازش

1978ء کے اوائل میں جب امریکی سامراج کو یقین ہو گیا کہ پہلوی شاہی حکومت کا زوال آ چکا ہے اور اب انقلاب کامیاب ہو کر رہے گا تو انہوں نے اپنی پروپیگنڈا مہم کا رخ موڑنے کا فیصلہ کیا اور شاہ کی بجائے پہلی تحریکوں، بالخصوص ''جبہہ ملی'' کے رہنماؤں کی تشہیر شروع کر دی۔ بی بی سی لندن، وائس آف امریکا اور ریڈیو اسرائیل نے اپنی اپنی فارسی خبروں اور سیاسی تجزیوں کے ذریعے ''جبہہ ملی'' کے رہنماؤں، لبرل، سیکولر اور دوسرے مغرب زدہ لیڈروں کو ''قائدین انقلاب'' کی حیثیت سے پیش کرنے کی ناکام کوشش بلکہ سازش شروع کی۔ جن لوگوں نے ایرانی اسلامی انقلاب میں بڑا گھناؤنا کردار ادا کیا تھا، انہی کو انقلاب کے اصل ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا۔ مغربی ذرائع ابلاغ، اخبارات سے لے کر ریڈیو تک، ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہر خبر ان امریکی ایجنٹوں سے مربوط ہو جائے اور کسی بھی قلمی ترکیب سے خبروں میں ان کا نام نمایاں ہو جائے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اصل انقلاب کے ہیرو یہی لوگ ہیں۔ یہ سب کچھ ایسے ماحول میں کیا جا رہا تھا جب عوام مجاہد علمائے دین کے زیرِ قیادت اپنی انقلابی تحریک چلا رہے تھے جو ایک عرصے سے شاہی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے مگر سامراجی

تشہیری مہم نے علماء کا نام تک نہ آنے دیا، بلکہ ان کے خلاف زہر اگلنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

ظاہر ہے کہ سامراجی تشہیری مہم کا مقصد اس طرح ایک طرف تو مغربی تہذیب کے علم برداروں کی پوزیشن مضبوط کرنا تھا جو اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف تھے، اور دوسری طرف علماء کو کمزور دکھانا، ان کی کمزوریوں کی نشان دہی کرنا اور خمینی کی قیادت کو دنیا کے سامنے بے اثر بنا کر پیش کرنا تھا۔ سامراجی صحافی اپنے جائزوں کے ذریعے یہ نتیجہ نکال رہے تھے کہ اگر مغرب زدہ، امریکی ایجنٹوں کے مفاد کے مدنظر پہلے ہی سے پروپیگنڈے ہوتے رہیں گے تو شاہ کے فرار اور انقلاب کی کامیابی کے بعد قیادت یا تو صرف مغرب پرستوں کے ہاتھوں میں ہوگی یا کم از کم ان کے اور علماء کے درمیان تقسیم ہو جائے گی اور اس طرح انقلاب کی ''اسلامی'' ماہیت کو ظاہر ہونے اور انقلاب کو اسلام کی راہ پر چلنے سے بآسانی روکا جاسکے گا۔

امریکی سامراج کا یہ جائزہ اگرچہ اپنی جگہ بڑا خطرناک تھا، مگر ایرانی عوام میں علماء کے گہرے اثر رسوخ اور خمینی کی قیادت کی غیر معمولی طاقت، نیز خمینی اور علماء پر ایرانی عوام کے بھرپور اعتماد کی بنا پر یہ جائزہ ''نامکمل'' جائزہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سامراجی تشہیری ادارے اور ذرائع ابلاغ اپنے پٹھوؤں کی شخصیتوں کو ابھارنے کے لیے پروپیگنڈا کر رہے تھے، وہ سب بے اثر ثابت ہوا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اس پروپیگنڈے نے امریکا نواز لیڈروں کی شخصیت و کردار کو مزید مشکوک بنا دیا۔ انقلاب کے لیے ایرانی عوام سامراجی پروپیگنڈے کو معیار قرار دینے کی بجائے اسے خمینی کے معیار پر پرکھتے تھے۔ خمینی کے موقف سے کسی چیز، مسئلے یا اس شخص کے عمل کی اچھائی یا برائی معلوم کر لیتے تھے اور یہ اس لیے کہ خمینی کی ذات ایرانی عوام کے لیے صداقت، شرافت، نیکی اور فداکاری کا مجسمہ اور اسلامی اقتدار کا مرکز تھی۔ اگرچہ امریکی گماشتوں نے اپنے آپ کو خمینی کا وفادار ظاہر کرنے کی ان تھک کوشش کی، مگر ایرانی عوام ان مغرب زدہ لوگوں سے اور ان کے آقاؤں امریکا، برطانیہ اور ان کے اتحادیوں سے اس قدر نفرت رکھتے تھے کہ نہ تو ان کے فریب میں اس وقت آئے اور نہ آج تک آئے ہیں، بلکہ شاید تمام 58 مسلم ملکوں میں ایران واحد ملک ہے جو پوری قوت وشدت سے امریکی سامراج کا مقابلہ کر رہا ہے۔

بہر حال، امریکی سامراجیوں کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہو کر رہ گئیں اور انقلاب کی قیادت کسی شک وشبے کے بغیر، خمینی کے ہاتھوں میں رہی اور انقلاب آگے بڑھتا رہا۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ خمینی کی قیادت کو ضعف پہنچانے کے سلسلے میں ''جبہہ ملی'' کے نمایاں افراد اور دوسرے مغرب زدہ لوگوں کے حق میں سامراجی ایجنٹوں کی تشہیری مہم مکمل طور پر ناکام ہوگئی، مگر ان سامراجی حربوں کا نتیجہ یہ ضرور رہا کہ انقلاب کی کامیابی کے ابتدائی زمانے میں ایسے افراد، جنھوں نے انقلاب برپا کرنے کے سلسلے میں ذرا بھی حصہ نہ لیا تھا، وہ ملک کے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ حد یہ ہے کہ وزارت خارجیہ کے بھی حساس عہدوں پر فائز ہو گئے اور انقلاب کو

کہ انقلاب دراصل ''پہلی تحریک'' ہی نے شروع کیا تھا اور اسی نے انقلاب کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا ہے، اور علماء تو انقلاب کے منظر پر اس وقت رونما ہوئے ہیں جب انقلاب عنقریب آنے والا تھا۔ ان کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ دوسری تحریک میدان سے ہٹ جائے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے دوسری تحریک یعنی علماء کی لائی ہوئی تحریک کو ملیامیٹ کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے خمینی کو اپنی ہر تقریر میں بار بار یہ اعلان کرنا پڑا کہ یہ انقلاب عوام کا لایا ہوا ہے۔ کسی ایک پارٹی یا گروہ کا نہیں۔ خمینی نے اس حقیقت کا اعتراف 27 مئی 1981ء کو بھی مجلس شوریٰ کے سامنے بھی مجلس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب زدہ، لبرل اور حکومت کے دوسرے مخالفین حکومت کو موردِ الزام و عتاب قرار دیا کرتے تھے۔ خمینی نے اس وقت کہا تھا:

> ''یہ علماء ہی تھے، جنہوں نے عوام کو گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں نکالا اور یہ اسلام ہی تھا جس نے عوام کو شہادت کا استقبال کرنے پر آمادہ کیا، ورنہ کوئی جبہہ، کوئی محاذ، کوئی پارٹی اور کوئی گروہ عوام کو اس طرح میدان میں نہیں لاسکتا تھا کہ وہ رضا کارانہ طور پر موت کے پیچھے پیچھے چل پڑے ہوں اور اپنی خوشی سے شہادت کے طلب گار بن جائیں۔''

خمینی نے واضح طور پر جبہہ ملی، تحریک آزادی، مجاہدین خلق اور دوسری ان تمام پارٹیوں اور تنظیموں کے غلط دعووں کا جواب دے دیا تھا۔ ان تمام جماعتوں کا تعلق پہلی تحریک سے ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کوئی پارٹی، کوئی محاذ، کوئی تنظیم یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ اس نے انقلاب کو کامیاب بنایا، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ انہوں نے انقلاب آنے کے بعد اسے جلد از جلد ختم کرنے یا کم از کم کمزور بنانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کیا۔ دوسری تحریک (علماء کی تحریک) سے تعلق رکھنے والی طاقتیں جو فی الحقیقت عوامی تحریک کو منظم کرنے والی تھی، انہوں نے ہمیشہ خود کو عوام کا ایک حصہ خیال کیا اور ان میں سے کسی بھی طاقت نے کبھی بھی انقلاب پر اپنا کوئی احسان نہیں رکھا، بلکہ انقلاب کے بارگراں کو اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے رکھا۔ وہ طاقتیں جو انقلاب کی کامیابی تک آپس میں مربوط اور منظم تھیں، اور عوام کو تیار اور آمادہ کرنے کے سلسلے میں قائد یعنی خمینی کے لیے دست و بازو کی حیثیت رکھتی تھیں، جن میں علماء اور دوسرے انقلاب پسند افراد شامل تھے، انقلاب کی کامیابی کے بعد ''حزب جمہوری اسلامی'' کے نام سے ایک فعال اسلامی تنظیم کی شکل میں اپنی انقلابی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہی تنظیم انقلاب کے بہی خواہ افراد اور سچے انقلابی گروہوں کے لیے قابل اعتبار بنی۔ اس تنظیم نے ہمیشہ عوام ہی کو انقلاب کا اصلی ہیرو سمجھا ہے۔

انقلابی طاقتوں کا مجموعہ

انقلاب کی مختلف طاقتوں، مغرب زدہ عناصر اور سامراجی پروپیگنڈے نے پوری دنیا کو یہ باور کرانے کی ان تھک کوشش کی ہے کہ ایران کا اسلامی انقلاب علماء کے ایک ایسے گروہ نے برپا کیا ہے جو نرے جاہل ہیں، انہیں دنیا کی کچھ معلومات نہیں۔ معاشرے کا روشن خیال طبقہ اور ترقی پسند لوگ اس انقلاب کے حامی نہیں ہیں۔ یہ پروپیگنڈا اتنے وسیع پیمانے پر کیا گیا کہ ان کا کچھ نہ کچھ اثر بیرونی ممالک میں کام کرنے والے ایرانیوں پر بھی ہوا جو انقلاب اسلامی کے دوست، ہمدرد اور خیر خواہ تھے اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوا کہ مخالفین اپنے پروپیگنڈے سے دنیا پر یہ ثابت

کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں کہ ایران کا اسلامی انقلاب صرف ایک خاص گروہ اور طبقے میں محدود ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس انقلاب کا اثر دوسری قوموں پر بھی پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایران میں جو انقلاب آیا، وہ اسلام کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے عزم سے آیا۔ یہی انقلابی تحریک کا منشور اور مقصد تھا۔ چونکہ یہ انقلاب اسلامی جذبے کے تحت اسلام کے نام پر برپا ہوا، اس لیے یہ معاشرے کے ایک یا دو طبقے میں محدود نہیں تھا، بلکہ اس انقلاب میں عوام کے سبھی طبقے شریک اور مددگار تھے۔ یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ، مزدور، کسان، تاجر، اساتذہ اور علماء، فوجی عناصر ہوں یا بیورو کریسی کے افراد، غرض ہر طبقے کے لوگوں نے اس انقلاب میں حصہ لیا تھا۔ انقلابیوں کے بڑے بڑے نہتے جتھے، صرف احتجاجی جلوسوں اور بے مثال تاریخی مظاہروں کے ذریعے ایک ایسی حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہوئے جس کا ایک ایک کارندہ جدید ہتھیاروں سے لیس تھا۔ 1953ء کے خونین واقعے کی ہر سال سالگرہ منائی جاتی ہے، جلوس نکالے جاتے ہیں، جوشیلی تقریریں ہوتی ہیں، لیکن اسلامی انقلاب لانے کی جو سالگرہ جس شان و شوکت اور جوش و جذبے سے منائی جاتی ہے، دوسرے مواقع کی سالگرہیں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

انقلاب برپا ہونے کے بعد وہ کون سی طاقتیں اور کون سے عناصر تھے جو انقلاب کے خلاف تھے:

1۔ علماء کے طبقے میں سے وہ لوگ جن کے مفادات شاہی حکومت یا سرمایہ داروں سے روابط رکھنے سے وابستہ تھے۔ ان نام نہاد علماء نے انقلاب آنے کے بعد اس کی سخت مزاحمت کی۔

2۔ تاجروں میں سے وہ لوگ جو شاہی حکومت کے دور میں کھلم کھلا عوام کو لوٹ رہے تھے، اور جب انقلاب کے بعد ''حزب جمہوری اسلامی'' نے ان کی لوٹ کھسوٹ پر قدغن لگائی تو قدرتاً انہیں انقلاب کا مخالف ہونا ہی چاہیے تھا۔

3۔ سرکاری ملازم اور یونیورسٹی کے اساتذہ، جن کی رشوت خوری کی عادت، فریب دہی اور جنسی بے راہ روی، غرض تمام غیر شرعی آزادیاں انقلابی حکومت نے سلب کر لی تھیں۔

4۔ وہ دانشور جو مغرب سے فکری اور سیاسی وابستگی رکھنے کی وجہ سے انقلاب کے خلاف تھے، اور انقلاب بھی وہ جسے ''اسلامی'' کہا گیا۔ ان دانشوروں کے نزدیک ''اسلامی انقلاب'' ماضی پرستی کے سوا کوئی چیز نہیں۔

5۔ اقلیتی طبقے کے وہ افراد جن کے مفادات کو انقلاب سے نقصان پہنچا ہے۔

ان تمام مخالفین بلکہ دشمنوں کے باوجود کروڑوں ایرانیوں نے، جن میں غریب اور امیر سب شامل ہیں، اتفاق رائے سے ایثار اور فدا کاری سے اسلامی انقلاب برپا کیا، اور انقلاب برپا ہونے کے بعد حتی الامکان اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ انقلاب کے ذمہ دار افراد نے مخالفین کی اصلاح کی کوشش کی، کہ وہ راہ راست پر آجائیں، تاکہ ان کی تعلیم، تجربے اور مہارت سے فائدہ اٹھا کر ملک کی خدمت کی جائے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بہت سے افراد صدق دلی سے تائب ہوکر انقلاب میں جذب ہوکر ملک کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

بہر حال ایران کا اسلامی انقلاب ایک یا چند طبقوں کی محنت و کاوش اور جدو جہد کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ تمام طبقوں نے بھاری اکثریت سے اس انقلاب میں عملی حصہ لیا ہے۔ انقلاب کے بعد بھی، آج تک سرکاری افسر، یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ، ڈاکٹر، انجنیئر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ خلوص و محنت اور پوری لگن سے انقلاب کے نتائج کو ثمر آور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر چہ امریکا کے پٹھو اب بھی ایران میں موجود ہیں، جو شاہ کے مصاحبین کی باقیات ہیں، جن کو امریکا ہر طرح کی مالی امداد فراہم کرتا ہے، لیکن جب بھی ایٹم بم کے مسئلے یا کسی اور مسئلے پر امریکا ایران کو دھمکی دیتا ہے تو اس کے مٹھی بھر ہم نوا بھی اکثریت کے خوف سے ایسے چپ ہو جاتے ہیں جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

کسی بھی انقلاب کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے محض عوام کی اکثریت کی غیر مشروط حمایت کافی نہیں، قیادت کا بھی مخلص ہونا ضروری ہے۔

ایرانی انقلاب کا ڈراپ سین شاہ بھاگ رہا ہے

ایرانی انقلاب کا آخری سین 11 جنوری 1979ء کو اس وقت شروع ہوا جب امریکا کے وزیر خارجہ سائرس وانس نے واشنگٹن سے اعلان کیا کہ شاہ چند ''ہفتوں'' کی تعطیل پر روانہ ہونے والے ہیں۔ پانچ روز کے بعد 16 جنوری کو وہ ایران سے رخصت ہو کر، اپنے دوسرے معاصر آمر مصر انور السادات کے مہمان بنیں گے۔ ان آخری ایام کی داستان شاہ ایران کی انگریزی خود نوشت سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت کے ایران کے حالات پاکستان کے حالات (۲۰۱۱ء) سے بہت ملتے جلتے تھے۔)

اس پورے عرصے کے دوران ہم دُعا کرتے رہے کہ کاش! ہمارے مخالفین نیک نیتی سے کام لیں۔ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ شہری آزادیاں اور حقوق، وہ ان کو مل جائیں گے۔ وہ بدعنوانیوں سے اظہار نفرت کر رہے ہیں۔ ان سے زیادہ ہم خود بدعنوانیوں کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔

بہر صورت ہم نے عزم کر رکھا تھا کہ طاقت کا سہارا نہیں لیں گے، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ ہمیں امید تھی کہ جس سنگین بحران سے ہم گزر رہے ہیں، وہ بھائی چارے اور مصالحت و مفاہمت کی فضا میں آئینی طور پر حل ہو جائے گا اور کوئی بہتری کی سبیل پیدا ہو جائے گی۔ ہمارا خیال تھا کہ ایک ایسی سول حکومت جس میں حزب اختلاف بھی شامل ہو، مظاہروں پر قابو پا لے گی اور ملک پھر امن و امان اور کام کاج کی راہ پر چل پڑے گا۔

چنانچہ ہم نے سب سے پہلے ڈاکٹر صادقی سے رجوع کیا۔ وہ نیشنل فرنٹ کے رہنما تھے اور بڑے مخلص اور محب وطن۔ وہ کسی شرط کے بغیر مخلوط حکومت بنانے پر راضی ہو گئے۔ لیکن غور و فکر کے لیے ایک ہفتے کی مہلت چاہی۔ لیکن ان پر ان کی پارٹی کا دباؤ پڑا تو وہ مخلوط حکومت بنانے سے منحرف ہو گئے، البتہ ہم سے مطالبہ کیا کہ ہم ایران ہی میں رہیں (باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیں) اور ایک ریجنسی کونسل بنا دیں۔ یہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہ تھا، کیونکہ اس کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم حکمران بادشاہ کے فرائض دینے کے نااہل ہیں۔ (ڈاکٹر موصوف واحد سیاست داں تھے، جنھوں نے از راہِ خلوص ہم سے کہا تھا کہ کسی قیمت پر بھی ایران نہ چھوڑیں)۔

سنجانی اور مہدی بازرگان نے تہران واپس آ کر حکومت کے خلاف ایسی شدید اور زبردست مہم چلائی تھی اور ایسے غیر آئینی اور غیر قانونی بیانات دیئے تھے کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مسٹر سنجانی نے قید خانے سے ہم کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ پیغام رسانی کے لیے انہوں نے خود ساواک (ایجنسی) کے سربراہ کو استعمال کیا۔ یعنی اسی جنرل مقدم کو، جو آموزگار کے عہد حکومت میں ایک مذہبی رہنما کا پیغام ہمارے لیے لائے تھے اور جن کو انقلاب کے فوراً بعد شاید انہی خدمات کے عوض گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ ہم پہلے ہی ہر قیمت پر مصالحت و مفاہمت کے لیے تیار تھے۔ اس لیے ہم نے مسٹر سنجانی کی رہائی کا حکم دیا اور انہیں باقاعدہ ملاقات کے لیے مدعو کیا۔ ملاقات کے وقت انہوں نے ہمارے ہاتھ چومے، ہماری ذات سے وفاداری کا پرجوش اظہار کیا اور کہا کہ وہ حکومت بنانے کے لیے تیار ہیں، مگر ایک شرط پر کہ ہم تعطیلات کے بہانے ایران سے چلے جائیں۔ انہوں نے نہ تو یہ کہا کہ ہماری روانگی سے پہلے کسی نوعیت کی ریجنسی کونسل بنائی جائے۔۔۔۔ جس کی تشکیل آئینی لحاظ سے ضروری تھی۔۔۔۔ نہ یہ کہا کہ پارلیمنٹ سے اس اقدام کی منظوری لینی چاہیے۔ ہم نے یہ غیر آئینی راستہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سلسلۂ مذاکرات جاری رہنا چاہیے، تاکہ نتیجہ کوئی نتیجہ خیز حل برآمد نہ ہو جائے، لیکن صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

کیا ان سیاست دانوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ملک تباہی کے کنارے پہنچ گیا؟ کیا انہیں اس امر کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ اب مسئلہ اجارہ داری، مراعات یا کسی سیاسی پارٹی کی برتری کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ اب مسئلہ ملک کی زندگی اور موت کا بن گیا تھا۔

بازاروں اور گلیوں میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو مظاہرے ہو رہے تھے، وہ یقیناً بہت زیادہ تشویش ناک اور پریشان کن تھے، لیکن ان سے بھی زیادہ تشویش اور پریشانی اس بات کی تھی کہ معاشی بے چینی اور بدامنی ملک کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ملک دیوالیہ ہو رہا تھا۔ ہڑتال پر ہڑتال ہو رہی تھی۔ کوئی دن نہ جاتا تھا جب ہڑتال نہ ہوتی تھی۔ تیل کی پیداوار جو 58 لاکھ بیرل تک پہنچ گئی تھی، وہ گھٹ کر 25 دسمبر کو فقط 17 لاکھ بیرل رہ گئی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ معاشی لحاظ سے ملک تباہ حال ہو رہا ہے۔ سوویت روس کو گیس کی فراہمی منقطع ہو گئی تھی۔ ایسی بری صورت حال کو مزید ایک دن کے لیے بھی برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

یہ وقت تھا کہ نیشنل فرنٹ کے ایک سرکردہ لیڈر، ڈاکٹر شاہ پور بختیار نے، ساواک ہی کے سربراہ کی وساطت سے ہم سے رابطہ قائم کیا اور ملاقات چاہی۔ ان سے ہمارا پہلے بھی اگست سے مسٹر آموزگار کے ذریعے رابطہ رہ چکا تھا۔ آموزگار اس وقت وزیراعظم تو نہ رہے تھے، لیکن بڑی حکمت اور دانائی سے ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ ہم اس وقت ہی سے مخلوط حکومت بنانے کی خواہش رکھتے تھے، لیکن حزب اختلاف کے بعض رہنماؤں کی شدت پسندی کے باعث یہ خواہش شرمندہ تکمیل نہ ہو رہی تھی۔ نیشنل فرنٹ کے مسٹر سنجانی تو اشتعال انگیز تقریروں پر اتر آئے تھے، لیکن ڈاکٹر بختیار کا طرز عمل بڑا محتاط اور مدبرانہ تھا۔

چنانچہ ایک شب وہ جنرل مقدم کی ہمراہی میں ہم سے ملاقات کے لیے محل پر تشریف لے آئے۔ بڑی دیر تک مسائل حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر بختیار نے ایک طرف تو ہمیں اپنی غیر معمولی وفاداری کا یقین دلایا اور

دوسری طرف یہ بھی دلائل سے ثابت کیا کہ وہ واحد شخص ہیں جو موجودہ بحران میں حکومت بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر بختیار نے تجویز کیا کہ ''تعطیلات'' پر ایران سے باہر چلے جانے سے پہلے، آئین کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ریجنسی کونسل بنائی جائے اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے اس اقدام کی منظوری لی جائے۔ ہمارے لیے یہ بات قابل قبول تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر بختیار نے بغیر کسی مشکل یا رکاوٹ کے ایک سول کابینہ بنائی، جس کی منظوری ایوان زیریں نے 43 کے مقابلے میں 149 ووٹوں سے دی۔

ایوان بالا یعنی سینیٹ میں کابینہ کی منظوری اور بھی زیادہ اکثریت اور سہولت سے حاصل ہوئی، لیکن بدقسمتی سے انہوں نے جو پروگرام بنایا تھا، وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ انہوں نے اپنا پروگرام قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے ٹیلی ویژن پر آکر بتایا۔ دنیا بھر سے تہران میں جو خصوصی سفارتی نمائندے جمع ہوئے تھے، ان کو تفصیل سے بتایا، مگر ہوا یہ کہ نیشنل فرنٹ میں ان کے ساتھی ان کے دشمن بن گئے اور انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا پتہ صاف کرنے کا ارادہ کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت ملک کے رہنماؤں کو نہ تو امن و امان بحال کرنے سے کوئی غرض تھی، نہ معاشیات کا پہیہ چلانے سے کوئی دلچسپی تھی۔ انہیں صرف شاہ کا سر چاہیے تھا اور کچھ نہیں۔ ہمارے اکثر دوستوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ چند ہفتوں کے لیے ہم ایران سے چلے جائیں تاکہ یہ وقتی جوش ٹھنڈا پڑ جائے۔ لیکن اس کے برعکس فوجی جنرل اس حل کے سخت خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر آپ چلے گئے تو ہر چیز ختم ہو جائے گی۔

ایران کے واقعات وحالات دنیا بھر کے اخباروں کی شہ سرخیاں بنے ہوئے تھے۔

ہم کئی ہفتے مسلسل سوچتے رہے۔ نتیجہ یہی نکلا کہ دن بیت چکے ہیں اور نوشتۂ دیوار سامنے ہے۔

ایک عرصے تک یعنی کوئی دو سال تک ہمیں بعض امریکی دوستوں کا رویہ بہت پریشان کرتا رہا تھا۔ ہمیں خوب معلوم تھا کہ وہ ہمارے فوجی پروگرام کے سخت خلاف ہیں۔ وہ تو علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ جو امریکی ماہرین ایران میں ہمارے فوجیوں کو نئے اسلحے کی ٹیکنالوجی سکھا رہے ہیں، ایک روز سوویت روس ان کو اپنا یرغمال بنا لے گا۔ ان کا مطلب اور نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایران اور امریکا کے مابین جو دو طرفہ فوجی معاہدہ ہے، اسے منسوخ کر دینا چاہیے۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ اگر ایران پر کسی اشتراکی ملک نے حملہ یا قبضہ کیا تو امریکا ہماری مدد کو پہنچے گا۔ امریکا کے مخالفین کی نکتہ چینی سن سن کر ہم عاجز آگئے اور بالآخر ہم نے امریکی حکومت سے کہا کہ وہ موجودہ معاہدوں کے بارے میں اپنے رویے کی صراحت کرے۔

امریکی حکومت نے جواب دیا: ''امریکا اپنے معاہدوں کی ہمیشہ پاسداری کرتا ہے۔۔۔''

چند ماہ کے بعد اتفاق سے ہماری ملاقات ہمارے دوست نیلسن راک فیلر سے ہوئی۔ ہم نے ویسے ہی بے تکلفانہ ان سے پوچھ لیا: ''کیا امریکا اور روس نے دنیا کو آپس میں بانٹ لیا ہے؟''

''ہرگز نہیں'' انہوں نے جواب دیا۔ ساتھ ہی یہ جملہ بھی کہا: ''جہاں تک مجھے معلوم ہے۔''

ستمبر 1978ء میں جب ایران میں صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی، امریکا اور برطانیہ کے سفیر مل کر ہمارے پاس تشریف لائے اور اپنی تائید وحمایت کا یقین دلایا۔

گرمیاں شروع ہونے سے پہلے روسی سفیر سے بھی ہماری متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ انہوں نے بھی ہر بار ہمیں روس کی دوستی اور تعاون کا یقین دلایا۔ پھر وہ چھٹی پر چلے گئے اور چھٹی گزار کر واپس تہران آئے، تو پھر کبھی ان سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔

بہر صورت روس ایران میں پیدا ہونے والی نئی صورت حال سے گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ ہمیں ثبوت کی ضرورت تھی تو وہ ایک مضمون سے مل گیا، جو نومبر 1978ء کے آخر میں اخبار "پراودا" میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ہمیں خبردار کردینے کے لیے کافی تھا۔ مضمون میں لکھا تھا:

"روس، جو ایران سے اچھے پڑوسیوں کے سے تعلقات رکھتا ہے، پُر زور الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ وہ ایران کے اندرونی معاملات میں کسی کی بھی مداخلت کے سخت خلاف ہے، خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو اور کسی بھی دلیل کی اساس پر ہو۔ ایران میں خالصتاً امن و امان کے لیے اندرونی مسائل پیدا ہو چکے ہیں اور ان کو خود ایرانیوں کو حل کرنے چاہئیں۔ تمام ممالک کو اقوام متحدہ کے منشور اور اصولوں، اور دوسری بنیادی بین الاقوامی دستاویزات کی پاسداری کرنی چاہیے۔ تمام ممالک کو ایران اور اس کی آزادی، خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کرنا چاہیے۔ واضح رہے کہ ایران کے معاملات میں کسی قسم کی فوجی یا دوسری مداخلت جس کی سرحدیں سوویت روس سے ملتی ہیں، روس کے مفادات اور سلامتی پر حملہ متصور کی جائے گی۔"

7 دسمبر کو امریکا نے سرکاری اعلان کے ذریعے وضاحت کی کہ امریکا کسی بھی حالت میں ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود امریکا اور برطانیہ کے سفیر ہم سے جب بھی ملے، انہوں نے ہم سے یہی کہا "ہم آپ کی حمایت کرتے ہیں۔"

1978-1979ء کے موسم خزاں اور موسم سرما کے دوران میں دونوں سفیر ہم سے یہی کہتے رہے کہ زیادہ سے زیادہ شہری آزادیاں بحال کی جائیں۔ ہم خود اس کے حق میں تھے، لیکن اس بحرانی کیفیت میں، جب کہ ہمارے پاس تربیت یافتہ لوگ بھی نہ تھے، ایک دم سے شہری آزادیوں کی بے محابا بحالی سے خطرناک نتائج برآمد ہونے کا احتمال تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو امریکا کے بہت سے سیاست دان اور خصوصی نمائندے جو وقتاً فوقتاً ہم سے ملتے تھے، وہ ہمیں سختی اور ثابت قدمی سے ڈٹے رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ جب ہم نے امریکا کے سفیر سے ایک مرتبہ یہ پوچھا کہ ثابت قدمی سے کیا مراد ہے تو انہوں نے جواب دیا: "اس سلسلے میں مجھے اپنی حکومت سے کوئی ہدایت نہیں ملی۔"

اس سے چند ہفتے قبل امریکی ایجنسی سی آئی اے کا ایک نمائندہ ہم سے ملاقات کے لیے تہران آیا تھا۔ اس کی گفتگو کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے معاملے کی نزاکت و اہمیت کا احساس تک نہیں ہے۔ دوران گفتگو جب شہری آزادیوں کا ذکر چھڑا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے اس مسئلے سے یا مشرق وسطیٰ کی سلامتی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور نہ اسے ہدایت تھی کہ وہ اس مسئلے پر ہم سے مذاکرات کرے۔

جب تخریب کاروں نے برطانوی سفارت خانے کو آگ لگائی تو ہمارا ایک جنرل معذرت خواہی کے لیے برطانیہ کے فوجی اتاشی سے ملا۔ وہ ناراضی سے چیخا: "اس مسئلے کا واحد حل سیاسی ہے۔" دسمبر کے آخر میں سینیٹر محمد علی

مسعودی نے ہمیں بتایا کہ امریکی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری مسٹر جارج لیمبارکس نے انہیں راز داری میں بتایا تھا کہ ایران میں عنقریب ایک نیا عہد شروع ہونے والا ہے۔''

بہر حال برسوں سے جو لوگ ہمارے دوست بنے ہوئے تھے، ان کے ترکش میں بھی ہمارے لیے کئی اور تیر تھے۔

جنوری 1979ء کے آغاز میں ہم یہ سن کر حیران رہ گئے کہ امریکی جنرل ہوسار کئی دن سے تہران میں خفیہ طور پر موجود ہیں، لیکن گزشتہ کئی ہفتوں میں ہونے والے واقعات سے ہم نے یہ سبق سیکھا تھا کہ ہر چیز ممکن ہے، اور کسی بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں، مگر پھر بھی وہ ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت میں کئی بار تہران آ چکے تھے، اور جب بھی آتے تھے، وقت مقرر کر کے ہم سے ملتے تھے۔ یہ ملاقاتیں محض رسمی نہ ہوتی تھیں، بلکہ ''ضرورت'' کی ہوتی تھیں، کیونکہ ہم ایران کی مسلح افواج کے سربراہ تھے اور ایران ''سینٹو'' کا باضابطہ مستقل رکن تھا۔

جنرل ہوسار کی سرگرمیوں کا منصوبہ ہمیشہ بہت پہلے سے مرتب کیا جاتا تھا، لیکن اب کے ان کی آمد خفیہ رکھی گئی تھی اور ویسے بھی پراسرار تھی۔ امریکی جنرل اپنے جہازوں میں آتے جاتے ہیں، اور جب وہ اپنے فوجی اڈوں پر آتے ہیں تو کسی قسم کے آداب وضوابط اور رکھ رکھاؤ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

ہم نے اپنے جنرلوں سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ جنرل ہوسار کی آمد خفیہ اور پراسرار کیوں ہے؟ وہ بھی ہماری طرح کچھ نہیں جانتے تھے۔ آخر یہ شخص ایسے حالات میں یہاں کس مقصد سے آیا ہے۔ یقیناً کوئی خاص وجہ ہے۔ عام طور پر اگر کوئی شخص کسی خاص اور سنجیدہ ڈیوٹی پر مامور ہو تو وہ بلا وجہ اپنی حرکات وسکنات کو خفیہ نہیں رکھتا۔

جونہی ایران میں اس کی موجودگی کی خبریں شائع ہوئیں، روس نے اپنے ردِعمل کا اظہار کر دیا: ''جنرل ہوسار تہران میں فوجی بغاوت کرانے کے لیے بیٹھا ہوا ہے۔'' گویا یہ روس کی جانب سے ایک غیر سرکاری وارننگ تھی۔

پیرس سے ''نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون'' کے نمائندے نے سفارت کے برعکس پہلوؤں پر حاشیہ آرائی کی۔ اس نے معاملے کو پلٹ کر دیکھا۔ اس نے لکھا: ''جنرل ہوسار ایران میں فوجی بغاوت روکنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔'' تو گویا امریکا کے رہنما ایران میں فوجی بغاوت روکنے کی فکر میں غلطاں تھے۔ انہیں یہ خیال کیوں آیا؟ ہمارے تمام جنرل، افسر، عہدہ دار باضابطۂ حلف وفاداری اٹھا کر تاج اور آئین کے تابع دار تھے۔ جب تک آئین اور اس سے وفاداری کا جذبہ قائم ہے، بغاوت جیسی چیز بے معنی ہے۔

لیکن غالباً امریکا کے ذرائع ابلاغ ونشریات یہ شواہد رکھتے تھے کہ آئین کو خطرہ ہے اور وہ ٹوٹنے والا ہے۔ پس ایران کی فوج کو غیر جانبدار ہو جانا چاہیے۔ اور یہی بات فوجیوں کو سمجھانے کے لیے جنرل ہوسار ایران گئے۔

جنرل ہوسار سے ہماری ملاقات صرف ایک بار ہوئی، اور اس وقت ہوئی جب امریکا کے سفیر مسٹر سلیوان بھی ہمارے پاس موجود تھے۔ ان دونوں کو کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، سوائے اس دن اور وقت کے، جب ہم ایران کو الوداع کہیں گے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت

شاہ بحسرت و یاس، اپنی ملکہ کے ہمراہ تعطیل کے بہانے 16 جنوری 1978ء کو ملک سے فرار ہوا۔ چند روز کے بعد خمینی پیرس سے سترہ سالہ جلاوطنی کی زندگی ختم کر کے فاتحانہ شان سے ایران آتے ہیں۔ عوامی انقلاب کے نتیجے میں شاہ پور بختیار کی حکومت کا خاتمہ ہوتا ہے اور ہزاروں سال پرانی بادشاہت کے آخری وزیراعظم مہدی بازرگان یہ عہدہ سنبھالتے ہیں۔ ریفرنڈم کرایا جاتا ہے۔ 98 فیصد ووٹ ''اسلامی جمہوریہ'' کے حق میں پڑتے ہیں۔ ان سب ڈرامائی واقعات کا چشم دید احوال جناب مختار مسعود نے اپنی تصنیف ''لوح ایام'' میں اپنے مخصوص ادبی اسلوب میں بیان کیا ہے جو اس زمانے میں آر سی ڈی کے سیکرٹری جنرل تھے جس کا ہیڈ کوارٹر تہران میں تھا۔

بوسنیا کی جغرافیائی اہمیت

بوسنیا و ہرزیگووینا کی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن کے تعارف سے پہلے اس علاقے کا جغرافیہ اور محل وقوع بتانا ضروری ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ یوگوسلاویہ ہی کی ایک جمہوریت تھی۔

یوگوسلاویہ کے شمال میں آسٹریا اور ہنگری واقع ہے۔ مشرق میں رومانیہ اور بلغاریہ ہے۔ جنوب میں یونان اور البانیہ واقع ہیں۔ مغرب میں بحیرۂ اڈریاٹک ہے۔ شمال مغرب میں مختصر سی سرحد اٹلی کے ساتھ بھی ملتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد 1945ء میں بادشاہت کے خاتمے کے بعد ''عوامی جمہوریہ یوگوسلاویہ'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پھر جنوری 1953ء میں یوگوسلاویہ کو ''وفاقی عوامی اشتراکی ری پبلک'' کی حیثیت دی گئی۔ اسے ''جدید یوگوسلاویہ'' بھی کہا گیا جو مارشل ٹیٹو کی سربراہی میں وجود میں آیا۔ اس کی سیاسی تقسیم نسلی بنیادوں پر کی گئی اور اس میں مندرجہ ذیل چھ جمہوریتیں قائم کی گئیں:

1۔ جمہوریہ سربیا:

آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑی جمہوریہ ہے۔ آبادی ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں 85 فیصد سرب (آرتھوڈکس فرقے کے عیسائی)، چار فیصد مسلمان اور پانچ فیصد ہنگرین ہیں اور باقی دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے باشندے ہیں۔ اس کا دارالحکومت بلغراد ہے جو سابقہ یوگوسلاویہ کا بھی دارالحکومت تھا۔ ماضی میں بلغراد اسلامی شہر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا، اس میں 270 مسجدیں تھیں اور 270 قرآنی تعلیم و تدریس کے مکتب تھے۔ مسجدیں اور مدرسے 1878ء میں مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد عیسائیوں نے گرا دیئے اور ان کی جگہ ہوٹل اور تھیٹر قائم کر دیئے۔ یوگوسلاویہ کی وفاقی پارلیمنٹ بھی ایک مسجد کی جگہ پر بنائی گئی ہے جو تاریخ میں ''جامع بتار'' کے نام سے مشہور تھی اور بلغراد کی خوبصورت ترین مساجد میں سے تھی۔ ان تمام مساجد میں سے صرف ایک مسجد باقی رہ گئی ہے

جسے "جامع بیرقلی" کہا جاتا ہے۔ یہ قدیم ترین مسجد ہے اور 1521ء میں تعمیر کی گئی ہے (یعنی ہندوستان میں بابر بادشاہ کی آمد سے پانچ سال پہلے)۔

2۔ جمہوریہ کروشیا:

اسے عرب مؤرخین کرواتیہ لکھتے ہیں۔ آبادی 66 لاکھ کے قریب ہے۔ اس میں 75 فیصد کروات (رومن کیتھولک فرقے کے عیسائی) 12 فیصد سرب اور 13 فیصد دیگر اقوام ہیں جن میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہ دو بڑے صوبوں پر مشتمل ہے۔ ایک صوبہ کرواتیا اور دوسرا اسلاوونیا۔ دارالحکومت زغرب ہے جو بوسنیا کے مسلمان مہاجرین کی پناہ گاہ ہے۔ کروات مذہب کے لحاظ سے کیتھولک عیسائی ہیں اور رومن کیتھولک چرچ سے وابستہ ہیں۔ زغرب میں مقامی مسلمانوں کی کوششوں سے ایک عظیم الشان اسلامک سنٹر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کا افتتاح 1987ء میں ہوا تھا۔ افتتاح سے پہلے کسی تخریب کار نے اس میں آگ لگادی تھی جسے بروقت بجھا دیا گیا۔ اس حادثے کی خبر پوری دنیا میں پھیل گئی تھی اور رابطہ عالم اسلامی، مکہ معظمہ، ندوۃ الشباب ریاض اور جمعیۃ الاصلاح، کویت کی طرف سے شدید احتجاج کیا گیا تھا اور پھر کویت کے بعض مخیر حضرات کی طرف سے نقصان کی تلافی کر دی گئی تھی۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا تھا کہ یہ آگ ایک سرب نوجوان نے لگائی تھی جس کا تعلق اسلام دشمن خفیہ تنظیم سے تھا۔

3۔ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا:

اس کی آبادی 50 لاکھ ہے۔ ان میں 45 فیصد مسلمان، 32 فیصد سرب اور 18 فیصد کروات ہیں۔ اس جمہوریہ کا شمالی حصہ بوسنیا اور جنوبی حصہ ہرزیگووینا کہلاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت سراجیوو ہے۔ اسے "سرایبو" بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ ترکی زبان کے لفظ "سرائے" سے ماخوذ ہے۔ ترکی میں سرائے خلیفہ یا سلطان کی قیام گاہ کو کہتے ہیں، جیسے استنبول کی "سرائے یلدز" سلطان عبدالحمید دوم کی قیام گاہ تھی۔ بوسنوی زبان میں سرائے سے "سراجیوو" بن گیا۔

یہ جمہوریہ دوسری جمہوریاؤں کی طرح نسلی بنیاد پر نہیں تشکیل دی گئی۔ اس میں مسلمان، سرب اور کروات تینوں آباد ہیں۔ مسلمانوں کو نہ نسلی طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور نہ مذہبی طور پر۔ مدت تک انہیں مجبور کیا جاتا رہا کہ وہ یا تو سرب نسل کا حصہ بن جائیں یا کروات کا، اور اگر یہ دونوں باتیں انہیں منظور نہ ہوتو پھر اپنے آپ کو صرف "یوگوسلاوی" کہیں۔ یہاں کے مسلمان عظیم الشان اسلامی تہذیب و تمدن کے وارث رہے ہیں۔ صرف سراجیوو صوبے میں 1092 مساجد تھیں۔ شہر سراجیوو پورے یوگوسلادیہ میں اسلامی تعلیم و تدریس کا مرکز رہا ہے۔ مدرسہ غازی خسرو بیک، غازی خسرو بیک لائبریری اور غازی خسرو بیک مسجد، نہ صرف یوگوسلادیہ کے اندر علم و معرفت کے مینار تھے، بلکہ پوری سلطنت عثمانیہ میں ان کی شہرت تھی۔

4۔ جمہوریہ مقدونیہ:

آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ اس میں 65 فیصد مقدونی نسل کے لوگ ہیں اور ان کی غالب اکثریت

مسلمان ہے۔ اس فیصد بوسنیا نسل کے لوگ ہیں اور وہ سب مسلمان ہیں۔ چار فیصد ترک مسلمان ہیں۔ دو فیصد سرب آرتھوڈکس عیسائی ہیں۔ اس جمہوریہ کا دارالحکومت سکوپیا ہے۔ یہ سابق یوگوسلاویہ کے جنوب میں ہے۔ اس کی سرحدیں بلغاریہ اور یونان سے ملتی ہیں۔ زبان اور کلچر کے لحاظ سے اس پر البانیہ کا رنگ غالب ہے۔ سکوپیا میں مسجدوں کی تعداد 372 ہے۔ مقدونیہ کے نام سے یونان کے اندر بھی ایک صوبہ ہے جس کی سرحد جمہوریہ مقدونیہ سے ملتی ہے۔

5۔ جمہوریہ سلوویناا:

آبادی تقریباً بیس لاکھ۔ دس فیصد آبادی سلوویی نسل پر مشتمل ہے اور رومن کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ تقریباً چھ لاکھ مسلمان ہیں، جو باہر سے آئے ہیں۔ عثمانی دور میں جب یہاں اسلام وارد ہوا تو عثمانی فاتحین وہاں سے واپس آگئے اور انہوں نے وہاں اسلام کی اشاعت پر توجہ نہیں دی۔ اس نے بھی سربوں سے لڑ کر آزادی حاصل کی ہے۔ دارالحکومت لوبلیانا ہے۔ یہاں سب سے مضبوط مسلم تنظیم "مسلم سٹوڈنٹس یونین آف ایسٹ یورپ" ہے۔

6۔ جمہوریہ ماؤنٹ نیگرو:

عرب اسے جبل اسود اور ترک قرہ داغ کہتے ہیں۔ آبادی چھ لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے باشندے ماؤنٹی نیگرو آرتھوڈکس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں چودہ فیصد بوسنیا نسل کے لوگ بھی بستے ہیں جو سب مسلمان ہیں۔ سات فیصد البانی ہیں اور وہ بھی مسلمان ہیں۔ اس کا دارالحکومت ٹیٹوگراڈ ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ عثمانی ترکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں کی تمام اقوام نے ماؤنٹ نیگرو کو اپنا مرکز بنائے رکھا، اور پچھلی جنگ میں بھی یہ جمہوریہ سربوں کے ساتھ مل کر جنوب سے بوسنیا کے اوپر حملہ آور ہوئی تھی۔

کوسوو (قوصوہ) اور سنجق دونوں مسلم صوبے ہیں اور دونوں جمہوریہ سربیا کے اندر واقع ہیں۔ صوبہ کوسوہ کی آبادی 18 لاکھ کے قریب ہے۔ 75 فیصد البانی نسل کے مسلمان ہیں اور دس فیصد بوسنیا اور ترک نسل کے مسلمان ہیں۔ 13 فیصد سرب آرتھوڈکس ہیں۔ سلوویناا اور ماؤنٹ نیگرو کو اگر جمہوریہ کا درجہ دیا جا سکتا تھا تو اسے بھی مستقل جمہوریہ ہونا چاہیے تھا، مگر اسے اس لیے جمہوریہ نہیں بنایا گیا کہ اس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ کوسوو دراصل البانیہ کا حصہ تھا، جسے پہلی جنگ عظیم میں سربیا میں ضم کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوسوو کے مسلمانوں کی اکثریت البانی ہے۔ تمام بلقانی ریاستوں میں کوسوو کے البانی مسلمان دین کی پابندی میں مشہور ہیں۔ اس کی تاریخی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں عثمانی لشکر اور متحدہ عیسائی سرب افواج کے درمیان معرکہ بپا ہوا۔ متحدہ عیسائی افواج شکست کھا گئیں اور اس کے بعد عثمانی فاتحین بلقان اور مشرقی یورپ کی طرف بڑھ گئے۔

سنجق (Sandzak) بھی تقریباً سو فی صد مسلم آبادی پر مشتمل ہے۔ یہاں کے باشندے ترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہادری اور جانبازی میں مشہور ہیں۔ یہ اقلیم دراصل 1877ء تک بوسنیا کا حصہ تھی اور "بشالوک بوسنیا" کے نام سے معروف تھی۔ 1878ء میں برلن کانگریس کے بعد یہ آسٹریا ہنگری کے مقبوضات میں شامل ہوگئی

اور پھر اسے سربیا اور ماؤنٹ نیگرو کے مابین تقسیم کر دیا گیا۔ 1878ء کے برلن معاہدے کے مطابق یہ ایک مستقل اور خود مختار اقلیم تھی اور جمہوریہ سربیا یا جمہوریہ ماؤنٹ نیگرو کا حصہ نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کی خود مختاری کی مزید توثیق کر دی گئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس کی خود مختاری ختم کر دی گئی اور اسے جمہوریہ سربیا اور ماؤنٹ نیگرو کے درمیان بانٹ کر ختم کر دیا گیا۔ اس فیصلے پر مسلمانوں نے احتجاج کیا اور ان کے ہزاروں لوگ قتل کر دیئے گئے۔ سنجق سو فیصد مسلم آبادی کا علاقہ ہے، لیکن اس پر جمہوریہ سربیا کی آرتھوڈوکس حکومت کا شدید دباؤ رہا ہے۔

یورپ میں عثمانی سلاطین کا اسلامی کردار

بوسنیا میں اسلام کی آمد

بوسنیا کے ایک فاضل محقق ڈاکٹر الحاج عمر آفندی رقم طراز ہیں:

”موجودہ یوگوسلاویہ کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت چودھویں صدی کے نصف آخر میں ان مسلمان تاجروں اور مسافروں کے ذریعے ہوئی جو ہنگری اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں آئے، لیکن یہ نیک سرشت لوگ جلد ہی ان علاقوں سے چلے گئے، کیونکہ ہنگری کے حکمرانوں نے ان پر نکل جانے کے لیے سخت جبر و تشدد کیا۔ یہ حکمران کیتھولک تھے اور پاپائے روم کے ماتحت تھے۔“

عثمانی سلاطین سرزمین بوسنیا میں پہلی مرتبہ 1353ء میں قدم زن ہوئے۔ اس کے بعد اس کے نواح کی تمام عیسائی طاقتیں متحد ہو کر عثمانی لشکر کے خلاف صف آراء ہوئیں۔ چنانچہ 1365ء میں ادرنہ کے قریب سخت معرکہ برپا ہوا۔ عثمانی لشکر نے بڑی جرأت کے ساتھ عیسائیوں کی متحدہ طاقت کو شکست فاش دے دی۔ اسی سال سلطان مراد نے مقدونیہ کو فتح کر لیا۔ چنانچہ 1371ء میں بازنطینی سلطنت اور سرب اور بلغار یہ دوبارہ یک جان ہو کر اٹھے اور عثمانیوں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی، مگر انہیں پھر شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلے کی سب سے مشہور جنگ کوسووکی ہے۔

کوسووکی صلیبی جنگ

1389ء میں کوسوو کے میدان میں اسلامی لشکر اور صلیبی فوج کے مابین یہ فیصلہ کن جنگ برپا ہوئی۔ ایک طرف سلطان مراد اسلامی لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ دوسری طرف سرب بادشاہ لازا بذات خود کمان کر رہا تھا۔ 27 اگست 1389ء کا دن تھا۔ کوسوو کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا تھا۔ سربوں نے شروع میں بڑا سخت حملہ کیا، جس سے متعدد مجاہد شہید اور زخمی ہو گئے۔ سلطان مراد ان زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا کہ ایک سرب فوجی نے سلطان پر حملہ کر دیا۔ سلطان شہید ہو گیا۔ پھر یکایک اس کے بیٹے بایزید نے قیادت ہاتھ میں لے لی اور ان صف بندی کر کے سربوں پر جوابی کارروائی کی اور انہیں زبردست ہزیمت دی۔ ان کا بادشاہ مارا گیا۔ پھر عثمانی فاتحین بلقان اور مشرقی یورپ کے اندر آسانی سے آگے بڑھتے گئے اور اس کے بعد سربیا کی تمام سرزمین دولت عثمانیہ کا حصہ بن گئی۔

1452ء میں سربیا کا دارالحکومت بلغراد بھی مسلمانوں کے قدموں کے نیچے آ گیا۔ اب مسلمان بوسنیا کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ بوسنیا کی حکومت اس وقت انتہائی کمزور تھی۔ بایں ہمہ عثمانیوں نے اسے سلطنت میں شامل کرنے کی بجائے باج گزار بنا کر چھوڑ دیا۔ تاہم بعدازاں 1463ء کے موسم بہار میں سلطان محمد فاتح نے بوسنیا کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے اعلان کیا: **لا اکراہ فی الدین** ۔ زبردستی کسی کو دین میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ سلطان محمد فاتح نے اپنا ارادہ پورا کر دکھایا۔ بوسنیا دولتِ عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ وہاں کے مقامی باشندے آرتھوڈکس اور کیتھولک دونوں چیرہ دستوں کی ستم رانیوں سے نجات پا گئے۔

پروفیسر تھامس آرنلڈ نے لکھا ہے: ''جب سلطان محمد فاتح (فاتح اندلس) نے بوسنیا پر فوج کشی کی تو کیتھولک بادشاہ کی رعایا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور شہر سراجیوو کے شاہی شہر کے قلعے کی کنجیاں وہاں کے حاکم نے ترکوں کے حوالے کر دیں۔ دیگر قلعوں اور شہروں نے بھی اس کی پیروی کی۔ چنانچہ ایک ہفتے کے اندر اندر ستر شہر سلطان کے قبضے میں آ گئے اور سلطان محمد فاتح نے بوسنیا کو بھی اپنے مفتوحہ ممالک میں شامل کر لیا۔''

بوسنیا کے باشندے جو پہلے ہی دینِ فطرت سے قریب تھے، مسلمانوں کے اخلاق کریمانہ، رواداری اور عدل گستری دیکھ کر اسلام سے بڑے متاثر ہوئے اور جوق در جوق اسلام کے دامن میں آنے لگے۔ ایک صدی کے اندر اندر بوسنیا و ہرزیگووینا عثمانی سلطنت کا مستحکم قلعہ بن گیا۔ بلکہ بوسنیا کے لاتعداد افراد عثمانی سلطنت کے اہم مناصب پر فائز ہوئے۔ ان کے پانچ سے زائد افراد سلطنت عثمانیہ کے صدر اعظم مقرر ہوئے۔ سلطان کے بعد ریاست کا یہ سب سے بڑا منصب سمجھا جاتا تھا۔

بوسنیا کے اندر اسلامی تہذیب وتمدن کا سورج پوری توانائی سے ابھرا۔ بڑے علماء، فقہاء اور ادباء وشعراء اٹھے۔ علمی درس گاہیں قائم ہوئی اور سب سے بڑھ کر، یہ کہ علاقے جو مدتوں سے عیسائی حکمرانوں کی چیرہ دستیوں، انسانوں کے استحصال اور معاشرتی پسماندگی میں پس رہے تھے، اسلام کے نظام عدل اور علمی دوستی اور انسانیت نوازی کی بہار سے لہلہا اٹھے۔

عثمانی سلطنت اپنے مشرقی علاقوں کی حفاظت میں اس قدر منہمک ہوئی کہ یورپی مقبوضات کی طرف اس کی توجہ کم ہو گئی۔ آہستہ آہستہ اس میں پسپائی شروع ہو گئی۔ سترھویں صدی کے اوائل میں ہنگری والوں نے کروشیا پر قبضہ کر لیا۔ 1967ء جبل اسود (ماؤنٹ نیگرو) نے بغاوت کر دی۔ ہنگری والے مزید آگے بڑھے اور 1718ء میں انہوں نے بلغراد کو زیرِ نگیں کر لیا، مگر عثمانیوں نے 1737ء میں بلغراد کو واگزار کرا لیا۔ 1830ء میں پورا سربیا عثمانیوں کی گرفت سے نکل گیا۔ 1878ء کا سال آیا تو عثمانی حکمرانوں نے برلن کانگریس میں بوسنیا و ہرزیگووینا سے بھی دستبرداری لکھ دی۔ گویا عثمانی حکومت کروشیا میں 140 سال، سربیا میں 380 سال، بوسنیا و ہرزیگووینا میں 415 سال، ماؤنٹ نیگرو میں 420 سال، کوسوو میں 430 سال اور مقدونیہ میں 547 سال قائم رہی۔

یورپ میں عثمانی سلاطین کی جدوجہد

ہمارا اصل موضوع ''بوسنیا و ہرزیگووینا'' ہے، لیکن وہاں اسلامی تہذیب کا حال جاننے کے لیے پہلے ہمیں

پورے یورپ میں، عثمانی سلاطین کے اسلامی کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔ مولانا سعید احمد نے اپنی تصنیف "مسلمانوں کا عروج اور زوال" میں لکھا ہے: "عثمان کے بیٹے اورخان نے جب دس سال کے محاصرے کے بعد 1326ء میں بروصہ کو فتح کر لیا، تو وہ فتح کی خوشخبری لے کر عثمان خان کے پاس آیا۔ عثمان اس وقت بستر مرگ پر پڑا تھا۔ باپ نے بیٹے کی صحت وشجاعت کی داد دی اور اسے اپنا جانشین مقرر کیا اور وصیت کی:

"ہر کام میں خوف خدا اور مرضی مولا کا لحاظ رکھنا۔ لوگوں پر رحم کرنا، ادائے حقوق کے معاملے میں زور آور اور کمزور و ناتواں دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھنا، کتاب وسُنت کو اپنا دستور العمل بنائے رکھنا، اسلام کی تبلیغ واشاعت میں جدوجہد کرنا، احکام شریعت سے کبھی سرتابی نہ کرنا۔"

پھر عثمان خان نے اپنے تمام بیٹوں اور رشتہ داروں کو مخاطب ہو کر کہا:

"تمام بیٹوں اور عزیزوں کو میری یہ نصیحت ہے کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کبھی ترک نہ کریں، اسلام کی اشاعت پر کار بند رہیں۔ محمد ﷺ کے جھنڈے کو سر بلند رکھیں۔ اطراف عالم میں توحید کو فروغ دیں۔ میں ان سب کو کہتا ہوں کہ میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ تم میں سے ہر وہ شخص محمد ﷺ کی شفاعت سے محروم ہو جائے جو اسلام کا راستہ چھوڑ دے اور لوگوں پر ظلم کرے اور جہاد سے دست بردار ہو جائے۔"

عثمان خان کی دین پسندی کا یہ حال ہے کہ جب اس نے یورپ کی طرف رخ کیا تو بازنطینی سلطنت کے امراء کو اس نے پیغام بھیجا کہ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات قبول کر لیں، اسلام قبول کر لیں یا جزیہ ادا کریں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ تینوں باتیں اسلام کے قانونِ جہاد کے مطابق ہیں۔ عثمان خان (بانی سلطنت عثمانیہ) وفائے عہد کے بارے میں اسلامی احکام کی شدت سے پابندی کرتا تھا۔ اسماعیل دانشمند نے "انسائیکلو پیڈیا آف تاریخ اسلام" میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ جب قلعہ اولوباد فتح ہو گیا اور قلعے کے امیر نے، جو وہاں بازنطینی سلطنت کی طرف سے وہاں مقرر تھا، ہتھیار ڈال دیے تو اس نے عثمان بن ارطغرل پر قلعے میں داخلے کی یہ شرط عائد کی کہ کوئی عثمانی سپاہی بذریعہ پل قلعہ میں داخل نہ ہو۔ چنانچہ عثمان کشتیوں کے ذریعے قلعے میں داخل ہوا اور اس کے بعد تمام عثمانی حکمران صدیوں تک اس قلعے میں پل موجود ہونے کے باوجود کشتیوں کے ذریعے قلعے میں داخل ہوتے رہے۔

عثمان کے بیٹے اورخان نے حکومت ہاتھ میں لے لی تو اس نے سب سے پہلے عثمانی سکہ جاری کیا، جس کے ایک طرف کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" نقش کرایا۔ 1328ء میں اس نے جب نئی فوج تشکیل دی تو وہ سب سے پہلے اپنے دور کے ایک خدا پرست عالم الحاج بکتاش کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس فوج کی کامیابی اور راست روی کے لیے دُعا کریں۔ چنانچہ بکتاش نے ایک عسکری کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اور دُعا کی کہ پروردگار اس فوج کو سرخرو کرے۔ اس کی تلواروں کو کارگر بنائے اور اسلام کے راستے میں یہ جو معرکہ آرائی کرے، اس میں اسے نصرت بخشے۔ اورخان نے عثمانی جھنڈے کے اوپر چاند اور اس کے نیچے تلوار کا نشان لگایا۔ جسے وہ "ذوالفقار" کہتا تھا۔ "ذوالفقار" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تلوار کا نام تھا۔

عثمان غازی کے پوتے اور خان کے بیٹے سلطان مراد نے یورپ میں قدم رکھا۔ اس کے مقابلے کے لیے سرویا کے بادشاہ لازار کی سرکردگی میں یورپ کی صلیبی طاقتیں میدان میں آگئیں اور 1389ء میں کوسوو میں مشہور اور فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس نے یورپ کی تاریخ بدل ڈالی۔ سلطان مراد کے ساتھ مجاہدین کے دستے تھے۔ چنانچہ اس نے لڑائی چھڑنے سے پہلے رات کو اللہ تعالیٰ کے حضور جو دعا مانگی، وہ یہ تھی:

''میرے الٰہ، آقا و مولا، میری دعا اور عاجزی قبول فرما، اپنی رحمت سے بارش نازل فرما، جو ہمارے اردگرد اٹھنے والی آندھیوں کے غبار کو ختم کر دے۔ ہمیں وہ روشنی عطا فرما دے، جو ہمارے اردگرد کی تاریکیوں کو کافور کر دے، تاکہ دشمن کے ٹھکانوں کو پوری طرح دیکھ سکیں اور تیرے دین کی سربلندی کے لیے اس سے لڑ سکیں۔''

''اے اللہ، میرے آقا و مولا، بادشاہی اور قوت صرف تیری ہے۔ تو اپنے بندوں میں سے جسے تو چاہے، عزت دیتا ہے۔ میں تیرا ایک عاجز اور حقیر بندہ ہوں۔ تو میری پوشیدہ باتیں بھی جانتا ہے اور کھلی بھی۔ میں تیری عزت و جلال کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس جہاد سے فانی دنیا کا ایندھن اکٹھا نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے تو صرف تیری رضا درکار ہے۔ تیرے سوا کسی کی رضا مجھے مطلوب نہیں۔''

''اے (اللہ) میرے مولا، میں تیری شانِ کریمی کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے میری ذات کی قربانی قبول فرما لے، اور اپنے سیدھے راستے کے سوا کسی اور راستے میں ایک بھی مسلمان کی ہلاکت کا مجھے ذریعہ نہ بنا۔''

''اے اللہ، میرے آقا، اگر میری شہادت میں لشکرِ اسلام کی نجات ہو تو پھر مجھے اپنے راستے کی شہادت سے محروم نہ فرما، تاکہ میں تیرے جوارِ رحمت سے بہرہ ور ہو جاؤں، اور کیا عظیم ہے تیرا جوار۔''

''اے اللہ، میرے مولا و آقا، تو نے مجھے جہاد فی سبیل اللہ کے راستے پر ڈال کر بڑا شرف بخشا ہے اور اب مجھے اپنے راستے میں خلعتِ شہادت سے نواز کر مزید شرف عطا فرما۔''

ترک مؤرخ خواجہ سعد الدین، جو اس سفر میں سلطان مراد کے ساتھ تھا اور ہر لحظہ سلطان کی صحبت میں رہتا تھا، لکھتا ہے: سلطان رات بھر یہ دعائیں دہراتا رہا۔ صبح لڑائی ہوئی، جس میں اللہ نے اس کے لشکر کو کامیابی عطا فرمائی اور اس کی دعا قبول فرما کر اس معرکے میں اسے شہادت سے نوازا۔

ایک اور ترک مؤرخ عاشق پاشا زادہ اپنی کتاب ''تاریخ عاشق پاشا'' میں لکھتا ہے: ''سلطان محمد فاتح نے 1442ء میں طرابزون شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس دوران سلطان محمد فاتح کے پاس طرابزون کے حکمران کی بوڑھی ماں آئی اور اس سے کہنے لگی: ''اے میرے بیٹے! تو اپنی جان اور اپنے لشکر کو طرابزون کی فتح کی خاطر کیوں خطرے میں ڈال رہا ہے، جب کہ تو طرابزون سے زیادہ بڑے اور خوبصورت سو شہر خود بنا سکتا ہے۔''

سلطان محمد فاتح نے جواب دیا: ''اماں جی، ہم محض ایک شہر کی خاطر اپنی جانیں خطرات میں نہیں ڈالتے۔ ہم دراصل اللہ کے راستے میں اپنی جانیں پیش کر رہے ہیں، تا کہ جب ہم یوم الحساب کو اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو ہم فخر سے پیش ہوں۔ شرمندگی میں نہ ڈوبے ہوئے ہوں۔ ہمارے ہاتھ میں وہ تلواریں ہوں جن سے ہم اس کے راستے میں لڑتے رہے ہوں۔ اماں جی، یہ تلواریں جو ہم نے ہاتھ میں لے رکھی ہیں، یہ زینت و تفاخر کے لیے نہیں ہیں، بلکہ یہ اس لیے تھام رکھی ہیں کہ ہم ان سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کریں۔ اماں جی، اللہ کے رستے میں ہم جو مشقت اٹھا رہے ہیں، کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم یہ مشقت اٹھائے بغیر ہی مجاہد کہلوانے کے مستحق ہو جائیں گے۔''

سلطان محمد فاتح نے دنیا سے رخت سفر باندھتے وقت اپنے بیٹے بایزید کو جو وصیت کی تھی اسے ترکی تاریخ کے تمام ماخذ نے نقل کیا ہے، وہ یہ ہے:

''اے بیٹے! زمین پر اسلام کو رواج دینا، زمین پر حکمرانی کرنے والے لوگوں کا فرض ہے۔ جہاں تک تیری ہمت ساتھ دے، تو اللہ کے دین کو پھیلاتا جا''

''اے بیٹے! دین کے کلمے کو ہر کلمے پر بالا کر، دین کے کسی پہلو کے بارے میں غفلت نہ برت۔ جو لوگ دین کے ارادے سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں، انہیں اپنے سے دور رکھ۔ منکرات اور بدعات کے پیچھے دوڑنے سے پرہیز کر۔''

''اے بیٹے! علمائے حق کو قریب رکھ کر۔ ان کی شان بالا کر۔ یہ لوگ نزول آفات کے وقت امت کا اصل توشہ ہوتے ہیں۔''

''اے بیٹے! مال و دولت اور لشکر کی بہتات تجھے کسی غرور میں مبتلا نہ کر دے۔ تو کسی معاملے میں شریعت کی خلاف ورزی پر نہ اتر آئے۔ دین کو مضبوطی سے تھامے رکھ۔ یہی ہماری کامرانیوں کا راز ہے۔''

تواریخ میں عثمانی سلاطین کے ''دستور'' کو نقل کیا گیا ہے، جس میں سلاطین کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں اور جس کی تمام سلاطین پابندی کرتے رہے ہیں:

1۔ سلطان شریعت اسلامیہ کے تمام احکام کی مکمل اطاعت کرے گا۔

2۔ وہ شریعت اسلامیہ کو بالاتر رکھے گا اور علمائے شریعت کا اعزاز و اکرام کرے گا۔

3۔ وہ مسلمانوں کے مقدس مقامات کی حفاظت کرے گا اور امور حج کی پوری توجہ سے تنظیم کرے گا۔

4۔ وہ دشمنوں کے حملوں سے اسلامی سرحدوں کا پوری طرح دفاع کرے گا۔

مؤرخ ڈاکٹر عبدالکریم دولت عثمانیہ کی انفرادیت اور تشخص پر بحث کرتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ لوگ سلطان کے ساتھ پوری طرح چمٹے رہتے تھے۔ وہ ان کو متحد رکھتا تھا اور اس نے پورے ملک کو ایک متحدہ اکائی میں بدل دیا تھا اور افرنگی دشمن سے ان کی حفاظت کرتا تھا۔ اس نے عرصۂ دراز تک اسلام کا پرچم بلند کیے رکھا اور احکام شریعت کا اجراء کیے رکھا۔

سلطان سلیمان اعظم نے دولت عثمانیہ کے لیے جو ''قانون نامہ'' مرتب کرایا تھا، اس میں یہ شرط رکھی تھی کہ وزارتِ عظمیٰ اور دیگر وزارتوں پر صرف وہ شخص فائز ہوگا جو نماز پنج گانہ پابندی سے ادا کرتا ہوگا۔ سلطان عبدالعزیز کے عہد (869ء) میں ''مجلہ الاحکام الشرعیہ'' کے نام سے اسلامی قوانین کا مجموعہ مرتب کیا گیا جو اپنے دور کا بہترین تہذیبی ریکارڈ ہے۔

فرانسیسی مؤرخ دہ سون اٹھارویں صدی کے اواخر میں دولتِ عثمانیہ کے مختلف حصوں میں پچیس سال تک رہتا رہا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''زمانہ امن ہو یا حالتِ جنگ، سیاسی وانتظامی قانون کی بات ہو یا عسکری تنظیم کی، وزیر سے قصاص لینا ہو یا سپہ سالار سے، وزارتِ مفتی کی طرف رجوع کرتی ہے اور زیر بحث معاملے میں اس سے مشورہ لیتی ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ وزارت کے سامنے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ آ جاتا ہے تو وہ مفتی کے ساتھ مذاکرات کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی حکم کے مطابق شریعت ہونے پر ہی اطمینان کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ امورِ مملکت میں علمائے دین کی طرف رجوع کیا جائے۔''

یورپی مؤرخ جونیان اپنی تصنیف ''تاریخ عالم'' میں لکھتا ہے:

''دولتِ عثمانیہ میں مفتی اسلام، شرعی امور ہوں یا شہری وانتظامی معاملات، دونوں میں حکومت کا مرجع ہوتا تھا۔ اس کا رتبہ وزراء سے بالاتر ہوتا تھا۔ یہ روایت اس عمومی سپرٹ کی بنا پر رہی تھی جو دین کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتی تھی۔''

یہی وجہ ہے کہ مؤرخ گبنز اسلام اور ترکوں کے خلاف بغض اور کینے سے بھرے ہوئے لہجے میں یہ کہتا ہے کہ دولتِ عثمانیہ کا نظام دراصل مذہبی تعصب کا شاخسانہ تھا، جس سے ترک قوم کا ایک ایک فرد بھرا ہوا تھا۔

اس کے برعکس نامور ترک مؤرخ احمد رفیق اپنی ''تاریخ عمومی'' میں لکھتا ہے:

''سلطنت بازنطینی کے جو شہر فتح ہو جاتے تھے، ان کے باشندے ترک مسلمانوں کو فاتح نہیں سمجھتے تھے، بلکہ انہیں بازنطینی سلطنت کے جبر وتشدد کے چنگل سے نکالنے والے نجات دہندہ سمجھتے تھے۔''

مریکی مصنفہ ڈاکٹر میری ملز پیٹرک اپنی کتاب ''سلاطین آلِ عثمان'' میں اپنے مسیحی تعصب اور اسلام دشمنی کے باوجود سلطان محمد فاتح کی حیرت انگیز رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''سلطان محمد فاتح نے کہا تھا کہ میں اللہ کی مسجدوں کی حرمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں، جن میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں کہ میں عیسائی رعایا کو یہ ضمانت دیتا ہوں کہ وہ بے روک اپنے کلیساؤں میں جمع ہو کر عبادت وصلوٰۃ کے مراسم سرانجام دیں۔''

عثمانیوں نے ایشیا اور یورپ میں وسیع فتوحات کے بعد ہر مذہب وملت کے ساتھ جس قدر رواداری کا برتاؤ

کیا، اس کا اندازہ صدرِ اعظم کے عظیم الشان منصب پر فائز ہونے والے مختلف النسل افراد سے ہو سکتا ہے۔ ترکی مؤرخ اسماعیل دانشمند نے اپنی تالیف ''انسائیکلوپیڈیا آف تاریخِ عثمانی'' میں بتایا ہے کہ عثمانی تاریخ میں دو سو بانوے افراد صدارتِ عظمٰی (یعنی وزاتِ عظمٰی) کے منصب پر فائز ہوئے، جو نسلی اور قومی لحاظ سے مندرجہ ذیل تعداد کے مطابق تھے۔

ترک الاصل	132	
البانوی	49	
بازنطینی	23	(بلقانی اور یونانی باشندے بازنطینی کہلاتے ہیں)
سلاف	6	(سرب، کروات اور بوسنیا کے لوگ سلاف نسل سے تعلق رکھتے ہیں)
یوگوسلاوی	13	(بوسنیا اور ہرزیگووینا کے لوگ)
چرکس	14	(سوویت یونین میں رہنے والی ایک قوم، جواب آزاد ہے)
چیچن	1	(روسی استعمار کے خلاف سوویت یونین کی ایک قوم)
عرب	4	
ارمن	3	
روسی	1	
یہودی	1	

(بقیہ صدرِ اعظم ہیں جو دیگر گمنام یا کم معروف قومیتوں کے حامل ہیں)

بوسنیا میں اسلامی تہذیب کا ماضی و حال

تقریباً چار صدیوں تک عثمانیوں نے یوگوسلاویہ (بوسنیا کا سابقہ نام) علاقوں پر حکومت کی۔ اس دور میں تہذیب و تمدن میں جو رونق پیدا ہوئی، اس کی ایک جھلک علمی اور ثقافتی تحریک سے مل سکتی ہے۔ یہاں پر ہم دو اہل علم حضرات کی تحقیقات کے نتائج درج کرتے ہیں یہ غانم سلطان اور یوسف محمد الغانم ہیں۔ انہوں نے 1970ء میں یوگوسلاویہ کا دورہ کیا اور بڑی مدت وہاں مقیم رہے اور تعلیم یافتہ لوگوں اور عوام سے مل کر انہوں نے ان علاقوں میں اسلامی عہد کی باقی ماندہ یادگاروں سے متعلق معلومات جمع کیں، جن کو ''المسلمون فی یوغوسلافیا'' کے عنوان سے کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کی تلخیص اردو میں مولانا خلیل احمد حامدی نے کی۔ اس تلخیص کا ایک متعلقہ اقتباس یہاں پیش کیا جارہا ہے:

''سابق یوگوسلاویہ عربی، ترکی اور فارسی مخطوطات کے لحاظ سے پورے یورپ میں ثروت مند ترین ملک سمجھا جاتا ہے۔ مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کی لائبریریاں اور علم و ادب کے گہوارے اور تاریخی دستاویزات کے خزانے یوگوسلاویہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سراجیو میں غازی خسرو بک کی لائبریری، غازی

خسرو بک درس گاہ، بیت لائبریری اور خزینۂ دستاویزات ملتے ہیں۔سکوپیا (مقدونیہ کا دارالحکومت) میں اعلیٰ درجے کا ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ قائم ہے جو اس وقت اکادمی آف سائنسز و آرٹس کے تحت ہے اس میں اسلام اور مشرقی لٹریچر کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔بلغراد میں یونیورسٹی لائبریری اور خزینۂ دستاویزات (آرکائیوز) میں مسلم ورثے کا اہم ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ دستار شہر (جو ہرزیگووینا کا صدر مقام ہے) میں بھی خزینہ دستاویزات موجود ہے۔ بریزدن میں محکمۂ اوقاف کی لائبریری بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

یوگوسلاویہ میں لائبریری کے قیام اور علمی اداروں کی تاسیس کا دور پندرھویں صدی ہے۔علی الخصوص جنوب مشرق کے علاقوں میں بیا اور مقدونیہ میں تو اس دور میں علم وفن کی بڑی چہل پہل تھی۔قدیم ترین مکتبہ بیتولا شہر میں پایا جاتا ہے۔دوسرا قدیم مکتبہ سکوپیا میں ہے جو 1443ء میں قائم ہوا۔الغرض پندرھویں صدی اور سولہویں صدی میں متعدد اسلامی مکتبے قائم ہوئے جو محکمۂ اوقاف کے زیرِ انتظام تھے۔علاوہ ازیں ہر بڑے شہر میں اہل علم کے ذاتی مکتبے بھی لاتعداد تھے۔سولہویں صدی تا اٹھارویں صدی میں علوم وفنون کی ترقی کا یہ حال تھا کہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں اعلیٰ پایے کی درس گاہیں اور علمی مراکز وجود میں آگئے تھے۔ان میں سرکاری بھی تھے اور پرائیویٹ بھی، اور کوئی بستی ایسی نہ تھی جس میں اسلامی علوم اور مشرقی فنون کا عمیق النظر عالم نہ ہو، مثلاً یہ شہر اور قصبے تو شہرت خاص کے حامل تھے، آق حصار، الونہ، بانجہ، بوجنل، نوہ سنیہ، استولجہ، تشنہ۔

علماء وفضلاء تلاشِ علم اور تلاش کتب کی خاطر دنیائے اسلام کے مشہور شہروں میں جاتے تھے، مثلاً استنبول، قاہرہ، دمشق، بغداد، مکّہ اور مدینہ منورہ، بلکہ مشرق بعید اور شمالی افریقہ تک بوسنوی علماء علم ومعرفت کی جستجو میں نکلتے رہے۔لٹریچر کی زبردست تحریک برپا ہوگئی اور دینی علوم سے دلچسپی فراواں ہوگئی۔لوگ اپنے ہاتھ سے کتابوں کے قلمی نسخے تیار کرتے۔آج ان مخطوطات کو دیکھیں تو وہ اس قدر خوشخط اور نفیس ہیں کہ مخطوطے کی بجائے مطبوعہ کتاب کا گمان ہوتا ہے۔اس علمی تحریک کے عروج کی ایک نشانی یہ ہے کہ سراجیوو کی دو سڑکوں کے نام جلد سازوں سے منسوب ہیں۔ایک سڑک کا نام ہے ''چھوٹے جلد ساز'' اور دوسری کا نام ہے ''بڑے جلد ساز''۔ دراصل ان دونوں بازاروں میں صرف کتابوں کی جلد سازی کا کام ہوتا تھا۔

بوسنیا کی یہ لائبریاں تاریخ میں کئی بار تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں۔ویانا کی جنگ (1683۔1699ء) میں آسٹریا کے فرماں روا پرنس اوگن سادولی نے بوسنیا پر لشکرکشی کی اور 1697ء میں بوسنیا کے متعدد شہر بھسم کر ڈالے۔اس وقت بھی اسلامی لائبریاں نذر آتش کی گئیں۔بہت ساری دوسرے علاقوں اور ملکوں میں لوٹ کھسوٹ کر کے پہنچا دی گئیں۔مثلاً ویانا (آسٹریا) کی بڑی لائبریری میں سراجیوو کی ''خسرو بک لائبریری'' کے وہ مخطوطے موجود ہیں جو 1633ء میں لکھے گئے تھے۔اسی طرح چیکوسلواک کی براتسلا خا یونیورسٹی میں بوسنیا کے ایک دانشور، ادیب اور ماہر شرقیات ڈاکٹر صفوت بیگ (وفات 1943ء) کی مکمل ذاتی لائبریری ہے جس میں صرف بوسنیا ہرزیگووینا کے علماء اور ادباء کی تصانیف موجود ہیں۔یہ پوری لائبریری یوگوسلاویہ سے براتسلا خا یونیورسٹی منتقل کی گئی تھی۔

سولہویں صدی عیسوی کی دو اہم لائبریاں فوجا شہر میں، جو دریائے ورینا کے کنارے پر واقع ہے، موجود

ہیں۔ایک لائبریری مدرسہ حسن ناظر جو 1550ء میں قائم کی گئی تھی۔دوسری مشتاق بیگ لائبریری، جس کی تاسیس 1575ء میں ہوئی۔سترہویں صدی کے اوائل میں بھی اس شہر میں ایک تیسری لائبریری، جو پہلی دونوں سے وسیع تر ہے، قائم کی گئی۔یہ لائبریریاں وہاں کی ایک علمی شخصیت عثمان آفندی کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

موستار شہر میں قرہ کوز بک لائبریری بڑی مشہور ہے۔اسے محمد بیگ نے، جو قرہ کوز کے نام سے معروف ہیں، 1570ء میں (جب ہندوستان میں اکبر بادشاہ کی حکومت تھی) قائم کیا تھا۔اس شہر کی دوسری لائبریریاں یہ ہیں:

☆ لائبریری درویش پاشا

☆ لائبریری مصطفیٰ ایوب زادہ

☆ لائبریری ابراہیم آفندی

☆ لائبریری علی پاشا

دریائے نزفوا کے کنارے بوجتل شہر میں بھی ایک بڑی لائبریری موجود ہے۔اسے مذکورہ ابراہیم آفندی موستاری نے ہی سترہویں صدی کے وسط میں قائم کیا تھا۔موصوف اس وقت احمد پاشا وزیر کے سیکرٹری تھے۔اس لائبریری میں بڑے نوادرات اور مخطوطات محفوظ ہیں۔

1704ء میں حاجی ابراہیم پاشا نے شہر تراونتک میں اپنے مدرسے کے ساتھ ایک لائبریری بھی قائم کی تھی جس سے اہل علم ہر دور میں استفادہ کرتے رہے۔

اٹھارویں صدی ہی میں گراجانیگا میں (جو شمالی بوسنیا کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) دو لائبریریاں قائم کی گئیں۔جامع احمد پاشا لائبریری اور خلیق آفندی لائبریری۔الحاج خلیل آفندی بلغراد میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور بلغراد شرعی عدالت کے رجسٹرار بھی رہے ہیں۔

1716ء میں حاجی اسماعیل آغا بن حسین نے جو اس لیے مصری کے لقب سے مشہور ہیں کہ طویل عرصے تک مصر میں مقیم رہے ہیں، سراجیو میں ایک مدرسہ اور اس کے ساتھ ایک لائبریری قائم کی۔اٹھارویں صدی کے وسط میں عبدالکریم سلیم نے بھی سراجیو میں مدرسہ اور لائبریری کی داغ بیل ڈالی۔اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں سراجیوو میں دو عظیم الشان پبلک لائبریریاں قائم کی گئیں۔ایک ''شہدی آفندی لائبریری'' جس کی تاسیس 1759ء میں عثمان شہدی آفندی آق نے کی اور دوسری قنطمیری لائبریری، جس کا بانی سراجیوو کی شرعی عدالت کا رجسٹرار تھا۔یہ لائبریری نہایت قیمتی اور نادر کتابوں کا خزانہ تھی۔

یہ چند لائبریریاں اور کتابوں کے مخزن ہم نے مثال کے طور پر بیان کیے ہیں، ورنہ اس چھوٹے سے ملک کا ہر قصبہ لائبریریوں اور درس گاہوں سے باغ و بہار بنا ہوا تھا۔

سراجیوو کی خسرو بک لائبریری پورے یورپ میں کئی لحاظ سے شہرت کی حامل ہے اور اب یہ مشرقی و اسلامی مخطوطات کا گراں ترین مخزن سمجھی جاتی ہے۔یہ لائبریری 1537ء میں غازی خسرو بک نے قائم کی تھی۔اس لائبریری سے متصل سراجیوو کی سب سے بڑی ''مسجد جامع خسرو بک'' واقع ہے۔غازی خسرو بک بوسنیا کا ایک مشہور

حکمران گزرا ہے۔ اس کی والدہ سلجوقہ سلطان بایزید دوم کی بیٹی تھی، اس لیے غازی سلطنت عثمانیہ کا رکن رکین سمجھا جاتا تھا۔ اس نے سراجیو میں بہت سے رفاہی، علمی اور ثقافتی ادارے قائم کیے۔

خسرو بک لائبریری کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں محکمہ اوقاف کے تمام قدیم مکتبے ضم کر دیئے گئے۔ بہت سی ایسی لائبریریاں بھی اس میں اضافہ کی گئی ہیں جو انفرادی طور پر لوگوں نے وقف کی تھیں۔ خسرو بک لائبریری میں نو ہزار مخطوطات ہیں۔ 84 رجسٹر موجود ہیں جن میں سراجیو کی شرعی عدالت کا پورا ریکارڈ درج ہے۔ یہ بڑا تاریخی ریکارڈ ہے اور تین (سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں) صدیوں کے حالات و واقعات کا خزانہ ہے۔

آمدن و خرچ کے حسابات کے بھی کئی رجسٹر موجود ہیں۔ چار سو کے قریب وقف نامے اور تین ہزار پانچ سو تاریخی دستاویزات ہیں جو سولہویں اور انیسویں صدی کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دس ہزار کے قریب مطبوعہ کتابیں ہیں جو مختلف مشرقی اور یورپی زبانوں میں ہیں۔ ماہانہ اور ہفت روزہ مجلّات اور روزنامہ اخبارات کا بھی وسیع ذخیرہ موجود ہے جو بوسنیا کے ماضی کا حال بتاتا ہے۔

خسرو بک لائبریری میں اکثر و بیشتر کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ دوسرے نمبر پر ترکی زبان، اور پھر فارسی زبان میں۔ عربی زبان کے غلبے کی وجہ یہ ہے کہ بوسنیا کی درس گاہوں میں قرآن کی زبان لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ مذکورہ تینوں زبانوں کے چند ایسے مخطوطات بھی ہیں جو دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ہیں۔ خود بوسنیا کی تاریخ پر بکثرت مخطوطے اور یوگوسلاویہ کی سرزمین میں اسلام کے ورود کے تمام مراحل پر کافی کتابیں ملیں گی۔

بوسنیا مشرف بہ اسلام ہوا تو وہاں کی تہذیب میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ رہن سہن کے طور طریقے بدل گئے۔ مکانات کا طرز تعمیر، لباس کے انداز، لین دین اور کاروبار کے اصول، صفائی اور طہارت کا ذوق، علم و ادب کا شوق، اخوت و محبت کا پرچار، غرض ہر پہلو پر اسلام کی چھاپ لگ گئی۔ لائبریریوں اور درس گاہوں کی بہتات ہوگئی۔ علمی و دینی ماحول کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے علماء فضلا اٹھے اور انہوں نے اسلامی تہذیب اور طرز حیات نہ صرف بوسنیا ہرزیگووینا، بلکہ یورپ کی تمام بلقانی ریاستوں میں فروغ دینا شروع کر دیا۔

لائبریریوں اور درس گاہوں کی کثرت ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خطے کا مسلمان ہمارے برصغیر کا سا نیم خواندہ مسلمان نہیں تھا، جسے بسا اوقات وضو کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ وہاں کا مسلمان عبادات و معاملات میں سچا اور پختہ مسلمان ہے، کیونکہ لائبریریاں اس کی مسلمانی کو ذہنی طور پر بھی استقامت دیتی رہی ہیں۔۔۔۔لیکن 1990ء کے بعد سربوں نے ان مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی ہے، جس میں تین لاکھ مسلمان شہید ہوئے اور یہ مذکورہ لائبریریاں ان کی گولہ باری سے خاک کا تودہ بن گئیں۔ خصوصاً بوسنیا کی مشہور ترین لائبریری کے انہدام کا انتہائی دکھ ہے۔ اس کے انہدام کی المناک داستان تو آگے چل کر اپنے مقام پر بیان ہوگی، یہاں اس کے بانی مبانی کا یاد آ جانا قدرتی امر ہے۔

خسرو بک کا لقب غازی ہے۔ یہ نصوح بیگ کا بیٹا تھا جو بوسنیا کا حاکم رہا اور اس کے بعد البانیہ کا والی بھی رہا۔ نصوح بیگ کی شادی سلطان بایزید دوم کی بیٹی سے ہوئی (1479ء)۔ اس لیے بعض اوقات خسرو بک کو سلطان

زادہ بھی کہا جاتا ہے۔ اپنی ذہانت کی بدولت خسرو بک کم عمری میں 1518ء میں بوسنیا کا واؤ مقرر ہوا، پھر 1521ء میں اسی حیثیت سے اس کا تبادلہ البانیہ اور بعد ازاں سربیا میں ہوا۔ 1525ء میں خسرو بک بوسنیا واپس آ گیا۔ اس کی سکونت سراجیوو میں تھی، جہاں اس نے 1542ء میں وفات پائی اور اسی مسجد کے پہلو میں دفن ہوا جو اس نے 1530ء میں بنوائی تھی۔

غازی خسرو بک ایک جواں ہمت اور پارسا انسان تھا۔ ترکی کے سرحدی علاقوں خصوصاً بوسنیا میں اپنی فتوحات کی بنا پر شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے چھاپہ مار دستوں کی مدد سے ہنگری کا علاقہ بھی تاخت و تاراج کیا۔ ترکی کے نامور مورخ اور سیاح اولیا چلپی کا بیان ہے کہ اس نے 170 قلعے فتح کیے۔ فتوحات سے زیادہ اس کی شہرت اس کے قائم کردہ اوقاف کی وجہ سے ہے، جن کی تعداد 300 ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مارشل ٹیٹو کی حکومت نے یہ اوقاف ضبط کر لیے تھے۔ اس مسجد کے علاوہ جو اس نے 1530ء میں بنوائی تھی، اور جو اس کے نام سے موسوم ہے، اس کے مقابل اس نے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ نیز مردانہ اور زنانہ حمام اور ایک بیزستان (مہمان سرائے) بھی تعمیر کرائی جس کے ساتھ 90 مسقف دکانیں تھیں اور 60 مسقف گودام تھے۔ اس نے اپنی عمارات اور لنگر خانوں کو برقرار رکھنے کے لیے بہت سرمایہ چھوڑا تھا۔ خسرو بک نے بوسنیا میں اپنی ایک مستقل یادگار لوگوں کے دلوں میں قائم کر دی جو ہر وقت اس کے شکر گزار رہتے اور اسے کبھی فراموش نہیں کرتے۔ ہر جگہ ایک ولی اللہ اور محسن کی حیثیت سے اس کی توقیر و تعظیم ہوتی ہے۔

بوسنیا و ہرزیگووینا کا دورِ غلامی

جب سلطنت عثمانیہ معاہدۂ برلن (1878ء) کے تحت بوسنیا و ہرزیگووینا سے دست بردار ہوئی اور آسٹریا و ہنگری نے وہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا تو مسلمان پہلی مرتبہ غیروں کی غلامی میں گرفتار ہوئے۔ آسٹریا و ہنگری نے بوسنیا و ہرزیگووینا میں داخل ہوتے ہی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ چنانچہ مسلمان لاکھوں کی تعداد میں اناضول (ایشیائی ترکی) اور دوسرے مسلم علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ آسٹریا کی حکومت مسلمانوں کے لیے سخت گراں رہی، نہ صرف مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جانے لگا بلکہ کیتھولک حکمرانوں کی طرف سے مسلمانوں کو بالجبر عیسائی بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے لیے خود اپنے ہی وطن میں رہنا دشوار ہو گیا اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے دین اور تہذیب کی حفاظت کے لیے ہجرت کریں۔ مسلمانوں کی ہجرت آسٹرو ہنگری اقتدار میں دو مرتبہ ہوئی۔ پہلی مرتبہ 1878ء کے فوراً بعد جب آسٹریا والوں نے عثمانی سلطنت کے زیر اثر داخلی خود مختاری کے وقت نظام حکومت ہاتھ میں لے لیا اور دوسری مرتبہ جنگ بلقان (1912ء۔1913ء) کے بعد جب عثمانی سلطنت کا رسمی تعلق بھی بوسنیا و ہرزیگووینا اور دیگر صوبوں سے ختم ہو گیا اور آسٹریا و ہنگری نے ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں ضم کر لیا۔ مہاجر مسلمانوں کی تعداد اس وقت صرف ترکی میں چالیس لاکھ کے قریب تھی۔ اس ہجرت کی تفصیل بوسنیا کے ایک دانشور شفقت بینڈوچ نے یوں بیان کی ہے:

''یہ کہا جا سکتا ہے کہ بوسنیا اور سنجق سے مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ 1878ء میں آسٹرو ہنگری استعمار کے دور میں شدت اختیار کر گیا اور جنگ بلقان میں تو کوسوو اور مقدونیہ بھی عثمانیوں کے قبضے سے نکل گئے اور مسلمان لاوارث ہو گئے اور ان کی ہجرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مسلمان مہاجرین کی تعداد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آسٹرو ہنگری ماخذ کے مطابق 1878ء (معاہدہ برلن) سے 1918ء پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک 36 ہزار مسلمان ترکی ہجرت کر گئے۔ بعض دیگر مؤرخین یہ تعداد ایک لاکھ 40 ہزار سے ایک لاکھ 60 ہزار تک بیان کرتے ہیں۔ تیسری روایت یہ ہے کہ ترکی میں بوسنیا و سنجق کے اگلے پچھلے مہاجرین کی کل تعداد چالیس لاکھ ہے اور اگر ہم اس میں پندرہویں صدی عیسوی کے مہاجر بھی ملا لیں جو جنگوں کے دوران اکھڑ کر سلطنت عثمانیہ کے اصل مراکز کی طرف آتے رہے تو آج ان کی تعداد 70 لاکھ پہنچ جاتی ہے۔''

بوسنیا کے ایک اور دانش ور عبداللہ اسماعیلچ کا بیان ہے: ''برلن کانگریس کے بعد بوسنیا پر آسٹرو ہنگری آمریت قائم ہو گئی۔ اس وقت تک پوری بوسنوی قوم نہ صرف مسلمان ہو چکی تھی، بلکہ اسلامی تہذیب میں ڈھل چکی تھی۔ اس کے ہمسایے سرب اور کروات ان بوسنوی مسلمانوں کو ''بوسنوی ترک'' کہہ کر پکارتے تھے۔ بعض لوگ تو علی الاعلان یہ کہتے تھے کہ یہ لوگ (یعنی مسلمان) ترک ہیں۔ بوسنیا و ہرزیگووینا سے عثمانیوں کے نکل جانے کے بعد یہ ترک مشرقی علاقوں (ترکی) کی طرف ہجرت کر گئے، اور کچھ سنجق چلے گئے اور کچھ کوسووا اور البانیہ کوچ کر گئے۔''

سنجق 1877ء تک بوسنیا کے ایک صوبے کا حصہ تھا۔ 1878ء میں یہ بھی آسٹریا، ہنگری استعمار کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد اسے سربیا اور مونٹی نیگرو میں تقسیم کر دیا گیا، تاکہ مسلمانوں کی طاقت کو تقسیم کر دیا جائے۔

دائرہ معارف اسلامیہ کا مقالہ نگار لکھتا ہے (جلد سوم): ''آسٹریا و ہنگری کے حکام کے بعض اقدامات کے متعلق مسلمانوں میں روز بروز بدظنی پیدا ہوتی گئی۔ مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو اپنی نگرانی میں لے آنے کی غرض سے حکومت نے 1882ء میں رئیس العلماء کا عہدہ اختراع کیا جو بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہبی منصب تھا۔ یہ تنظیم اتنی بڑھی کہ اس نے مجلس اوقاف کے اختیارات کو بھی اپنی زیر نگرانی کر لیا۔ مسلمانوں نے پریشان اور خوف زدہ ہو کر 1886ء میں بادشاہ کو ایک عرض داشت پیش کی، جس میں اوقاف کے معاملات میں آزادی کا مطالبہ کیا۔ 1899ء میں موستار کے مفتی علی فہمی کی قیادت میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں تمام مسلمانوں کے لیے مذہبی اور تعلیمی آزادی کے حصول کے لیے زبردست جدوجہد شروع ہوئی۔ 1900ء میں وزیر مالیات بی کلاری (جس نے 1882ء سے 1903ء تک بوسنیا و ہرزیگووینا میں آسٹریا و ہنگری کی طرف سے مسلمانوں کے خاتمے کے لیے بنیادی کردار ادا کیا) کے سامنے ملت اسلامیہ کے لیے ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا جس میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں سلطان کے شاہی حقوق پر خصوصی زور دیا گیا۔ (رسمی طور پر ابھی بوسنیا و ہرزیگووینا سلطنت عثمانیہ کے تحت تھا)، لیکن یہ اصول آسٹریا و ہنگری حکام تسلیم کرنے پر رضا مند نہ ہوئے۔ جب مفتی علی فہمی عثمانی سلطان سے مشورہ کرنے کے لیے استنبول روانہ ہوا تو اسے بوسنیا و ہرزیگووینا میں دوبارہ داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ 1906ء کے بعد اس تحریک نے زیادہ باضابطہ اور متعین صورت اختیار کر لی۔ علی بیگ فردوس کی صدارت میں ''تنظیم

ملتِ اسلامیہ'' کی انتظامی کونسل کا انتخاب ہوا۔ یہ تنظیم اگرچہ مسلم جائیداد کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی آزادی عطا کیے جانے کے لیے بھی حکومت سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ یہ مذاکرات التوا میں پڑے رہے، کیونکہ آسٹریا وہنگری کے حکام ایسی کوئی بات، جس میں سلطان کے شاہی حقوق کا اشارہ ہو، سننے کے لیے تیار نہ تھے۔''

یہ دور کیتھولک حکمرانوں کے غلبے کا دور تھا۔ اس میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتی، وہ ناقابل بیان ہے۔ بوسنیا کے ''بشناق'' (مہاجر) جب اسلام میں داخل ہوئے تھے تو اس وقت مسلمان اقتدار میں تھے۔ اب پہلی مرتبہ مسلمان دوسروں کی غلامی میں آئے اور کیتھولک عیسائیوں نے ان کو عثمانی سلطان کے حامی سمجھ کر ان سے تاریخی انتقام لینا شروع کر دیا، مگر مسلمان بھی بڑے باہمت اور باحوصلہ تھے۔ آزادی کی گود میں پلے تھے۔ انہوں نے نئے حالات کا جرأت سے مقابلہ کیا۔

1900ء میں موستار کے مفتی اور مسلمانوں کے رہنما علی فہمی نے آسٹریا وہنگری کے مظالم اور اسلامی تہذیب کی خاطر آسٹریا کے متعصب عیسائیوں (کیتھولک) کے خلاف تحریک برپا کر دی اور عجب اتفاق ہے کہ سربیا کے آرتھوڈوکس عیسائیوں نے آسٹریا کے کیتھولک کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ وہ بھی کیتھولک فرقے کے مظالم کا شکار ہو چکے تھے۔ اس تحریک میں مسلمانوں کو بے پناہ، جانی و مالی قربانی دینا پڑی۔ آخر کار 15 اپریل 1909ء کو مسلمانوں کو مذہبی امور میں کچھ آزادی نصیب ہوئی۔

1878ء سے لے کر 1909ء تک آسٹریا وہنگری والوں نے مسلمانوں کے اداروں اور اسلامی تہذیب کے نشانات کو جس طرح مٹانے کی کوشش کی ہے، بلغراد شہر کی ایک مثال کے مطالعے سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر علی الکتانی اپنی کتاب ''مسلمان امریکا و یورپ'' میں لکھتے ہیں: ''عثمانیوں نے بلغراد 1452ء میں فتح کر لیا تھا۔ ہنگری والوں نے 1718ء میں اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ عثمانیوں نے 1738ء میں اسے واپس لے لیا۔ 1830ء میں دوبارہ عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ عثمانیوں کی حکومت اس شہر پر 358 سال تک رہی۔ سترھویں صدی میں یہ شہر اسلامی تہذیب کا لہلہاتا ہوا گلستان تھا۔ ترک سیاح اولیا چلپی 1600ء میں یہاں آیا۔ اس وقت اس شہر کی آبادی ایک لاکھ تھی، جس میں تین چوتھائی مسلمان تھے۔ شہر میں 270 مسجدیں تھیں، جن میں سے 33 مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کی جاتی تھی۔ 17 تکیے، 8 ثانوی تعلیم کے مدرسے، 9 دارالحدیث (اسلامی تعلیم کے اعلیٰ ادارے) اور 370 قرآنی مکتب تھے۔ جب اس شہر سے اسلام کی حکمرانی ختم ہوگئی تو پھر ہنگری کے عیسائیوں نے ایک ایک کر کے تمام مدرسے، مکتب اور مسجدیں ختم کر دیں۔ مثلاً رئیس آفندی کی مسجد مسمار کر دی گئی اور اس کی جگہ گھڑ دوڑ کا مرکزی دفتر بنا دیا گیا۔ مسجد الترب‌تہ کو کھنڈر بنا کر اس جگہ سنٹرل تھیٹر کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ مسجد تار بلغراد کی خوبصورت ترین اور وسیع ترین مسجد تھی۔ مسجد تار کو منہدم کر کے اس کی جگہ یوگوسلاویہ کی پارلیمنٹ کی بلڈنگ تعمیر کی گئی۔ بلغراد کا پیلس ہوٹل بھی ایک مسجد کے ملبے پر قائم ہے۔ صرف ایک مسجد پورے شہر میں باقی رہ گئی، جسے محکمہ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ یہ وہ پہلی مسجد ہے جو مسلمانوں نے بلغراد میں تعمیر کی تھی۔ اس کا نام جامع بیرقلی ہے اور اسے سلطان

سلیمان اعظم قانونی کے حکم سے 1521ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔عیسائیوں نے جب 1718ء میں بلغراد پر قبضہ کیا تھا تو اسے کیتھڈرل میں بدل دیا تھا۔لیکن 1738ء میں مسلمانوں نے اسے واگزار کرالیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم (1914ء۔1918ء) میں آسٹریا وہنگری نے جرمنی کا ساتھ دیا اور جب جرمنی کو شکست ہوئی تو اس کے نتیجے میں آسٹریا وہنگری بھی شکست سے دوچار ہوئے۔ واضح رہے کہ پہلی جنگ عظیم کا آغاز بھی اس حادثے سے ہوا تھا جو بوسنیا کے دارالحکومت سراجیوو میں 28 جون 1914ء کو پیش آیا۔ بوسنیا کے ایک شہری نے، جو سرب نسل سے تعلق رکھتا تھا، اور جس کا نام جابریلو پرنسپ تھا، آسٹریا ہنگری ریاست کے ولی عہد فرانسس فرڈی ننڈ کو شارع عام پر قتل کردیا۔ اسی حادثے کے نتیجے میں وہ جنگ برپا ہوئی جسے پہلی جنگ عظیم کہا گیا اور جس میں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔

سلاف (یا سلاو) نسل کے اندر بار بار یہ تحریک اٹھتی رہی کہ اس کے تمام گروہوں کو ایک پلیٹ فارم پر ایک پرچم کے نیچے جمع کیا جائے۔ چنانچہ آسٹرو ہنگری حکومت کا خاتمہ سلاف لیڈروں کے لیے اپنی قدیم خواہشات کو پورا کرنے کا ایک سنہری موقع تھا۔ 1915ء میں دورانِ جنگ ''یوگوسلاویہ کمیٹی'' کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کردی گئی جو جنوبی سلاف کے تمام گروہوں کی نمائندہ کہلاتی تھی۔ 1917ء میں سربیا نے ''یوگوسلاویہ کمیٹی'' کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد کرلیا، اس کی رو سے ایک ایسی متحدہ ریاست کے قیام کا عزم کیا گیا جو جنوبی سلاف کی غالب اکثریت پر مشتمل ہو۔ چنانچہ یکم دسمبر 1918ء کو جنگ کا خاتمہ ہونے پر اس نظریے کے تحت، ایک متحدہ مملکت سرب و کروات و سلووینی (S H S) کہا گیا۔ بوسنیا اور ہرزیگووینا کو سربیا اور کروشیا ہی کا جز سمجھا گیا، اس لیے اس کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اس ریاست کے قیام سے مسلمانوں کو بہت خوشی ہوئی۔ آسٹریا وہنگری اقتدار کے عہد میں ان پر جو مظالم ٹوٹے تھے، اور وہ بے گھر اور بے وطن ہو رہے تھے، ان سے نجات کی امید نظر آئی، مگر ''سلافی مملکت'' کی تشکیل سے سرب قوم کو طاقت کا نشہ چڑھ گیا۔ انہوں نے مسلمانوں سے آنکھیں پھیر لیں اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کو یک دم فراموش کردیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان پھر زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط و پستی کا شکار ہوگئے۔ سربوں نے مسلمانوں پر اپنا سیاسی و عسکری دباؤ اس حد تک بڑھا دیا کہ اسلام کے بنیادی اصول اور اقدار و روایات تک خطرے میں پڑ گئے۔ مسلمان اپنا دین و ایمان بچانے کی خاطر دوبارہ ترکی کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ سیاسی میدان میں مسلمانوں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعے سے لگا لینا کافی ہوگا۔ 1925ء میں جدید سلافی مملکت کی نیشنل اسمبلی کے ایک کروات وزیر نے ''اسلامی تنظیم'' کے ایک نکتۂ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے پورے زور سے کہا: ''اے ترکو! تم ایشیا چلے جاؤ''۔ یہ مختصر سا جملہ مسلمانوں کی اس پریشان کن صورتِ حال کا غماز ہے جو مسلمانوں کو سربوں اور کرواٹس کے مخلوط اقتدار کے اندر پیش آ چکی تھی۔ یہ جملہ محض وقتی جذبات کا عکاس نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ عملاً سیاسی اور معاشرتی میدان میں ان کا یہی رویہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی ساقت و پاش پاش کرنے اور ان کی تعداد کو مختصر کرنے کے لیے طرح طرح کے خوفناک منصوبے وضع

کیے اوران کے نفاذ میں ہر وحشیانہ ہتھکنڈا استعمال کیا۔ زرعی اصلاحات کے نام سے مسلمانوں کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور آرتھوڈوکس کسانوں کو مفت دے دی گئیں۔ اسلامی ادارے بھی زد میں آگئے اور مسلمان پھر نہ صرف بوسنیا وہرزیگووینا سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، بلکہ سنجق اور کوسووکو بھی خیرباد کہنے لگے، جہاں وہ آسٹریا وہنگری کے دورِ حکومت میں آکر پناہ گزین ہو گئے تھے۔

بوسنیا کی تنظیم ملّتِ اسلامیہ

''سلافی نسل کا اتحاد'' ایک جذباتی نعرہ تھا جسے سرب لیڈروں نے اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کے لیے لگایا تھا۔ اس نعرے کے بہاؤ میں وقتی طور پر وہ تمام قومیں بہہ گئیں جن کی اصل نسل سلاف تھی۔ مثلاً سرب، کرواٹس، سلووینی اور ماؤنٹی نیگرو وغیرہ۔ مذہب کے لحاظ سے یہ قومیں 397ء سے عیسائیت کے دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہو چکی تھیں، آرتھوڈوکس اور کیتھولک۔ یہ دو بڑے فرقے صرف مذہبی عقائد وافکار ہی میں باہم مختلف نہ تھے، بلکہ ان کی تہذیب وثقافت، زبان وادب اور سیاست ومعاشرت بھی باہم متضاد ہو چکی تھی۔ ایک کا تعلق رومن تہذیب اور رومن چرچ سے تھا، اور دوسرے کے بازنطینی تہذیب اور مشرقی چرچ سے تھا۔ سلافی اتحاد کے وقتی نعرے نے ان کو یکجا کر دیا، مگر بہت جلد اس کے اثرات زائل ہو گئے اور سربوں اور کروٹیوں کے مابین سیاسی کشمکش نے جنم لیا۔ کروٹیوں کو محسوس ہوا کہ سربوں نے انہیں دھوکا دیا ہے اور وہ درحقیقت ان کے سیاسی مفادات کے آلۂ کار بن گئے ہیں۔ 1929ء میں ان دونوں کی نسلی جنگ عروج پر پہنچ گئی۔ بعض یورپی طاقتیں بھی اس جنگ کو ہوا دے رہی تھیں۔

بوسنیا کے عالم عبداللہ اسمائیلیچ کے تحقیق کے مطابق یوگوسلاویہ کا نسلی مسئلہ تین پہلوؤں پر محیط تھا۔ موصوف لکھتے ہیں:

1۔ اتحادِ سلاف کے وجود میں آتے ہی یہ بات نمایاں ہو گئی کہ سربوں اور کرواٹوں کے درمیان ہم آہنگی ناممکن ہے۔ اتحاد کے فوراً بعد کروات کو یہ احساس ہو گیا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے، کیونکہ سرب جن کو عددی اکثریت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے حق سے زیادہ حکومت کے اندر مناصب سمیٹ لیے ہیں، چنانچہ کروٹ مسلسل یہ جدوجہد کرنے لگے کہ انہیں خودمختاری زیادہ سے زیادہ دی جائے۔ زغرب (جو کروشیا کا دارالحکومت ہے) مملکتِ سلافیہ کے قیام کے بعد ہی لبرل اپوزیشن کا گڑھ بن گیا اور اس نے بلغراد سے یہ مطالبہ شروع کیا کہ سلاف یونین کے اندر پائی جانے والی دیگر اقوام کے بارے میں اپنی پالیسی بدلے۔ زغرب اور بلغراد بڑی سرعت کے ساتھ دو حریف مرکز بن گئے اور مذہبی وقومی جذبات نے اس مسئلے کو شدت سے بھڑکا دیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سربوں اور کرواٹ کے مابین باہمی عداوت واختلاف کی جڑیں صدیوں تک پھیلی ہوئی ہیں اور قومی اختلاف کے ساتھ مذہبی اختلاف نے دونوں کو ایک دوسرے کی ضد بنا دیا ہے۔ 395ء میں جب سلطنت روما ختم ہوئی اور اس کے دو ٹکڑے ہوئے تو سرب بازنطینی سلطنت اور آرتھوڈوکس چرچ سے وابستہ ہو گئے اور کرواٹ رومن سلطنت سے وابستہ رہے اور کیتھولک چرچ کو اپنا قبلہ بنایا اور اس مذہبی اختلاف اور مشرق ومغرب کی تفریق نے ان کی تہذیب وثقافت اور

زبان پر بھی غیر معمولی اثر ڈالا۔ کروات نے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا اور سربوں نے گریک رسم الخط کو اپنی ثقافت کی بنیاد بنایا۔

2۔ بوسنیا کے لوگ، جن کو تاریخ بشناق کہتی ہے، بوگومیلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نسل بلغاریہ سے نقل مکانی کر کے یہاں آئی۔ سرب یا کروات نسل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف اتنا دور کا تعلق ہے کہ بوگومیلی بھی قدیم اصل کے لحاظ سے سلاف ہی کی ایک شاخ ہیں، ورنہ ان کی زبان اور ان کا مذہب ان دونوں سے الگ تھلگ ہے۔ پہلے یہ بوگومیلی چرچ کے پیرو تھے، اور جب وہاں عثمانیوں کے ذریعے اسلام پہنچا تو قومی پیمانے پر مسلمان ہو گئے اور ان کی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب میں بھی تبدیلی آ گئی۔ انہوں نے بشناقی رسم الخط چھوڑ کر عربی رسم الخط اختیار کر لیا اور بوگومیلی کہلانے کی بجائے مسلمان کہلانے لگے۔

3۔ یوگوسلاویہ کی مملکت میں نسلی اقلیتیں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں جو اکثریتی نسلوں کے ساتھ مساویانہ حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں اور اس کے لیے جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔ بڑی بڑی اقلیتیں یہ ہیں:

ویوودنیہ (سربیا کا ایک صوبہ) میں ہنگری اور جرمن اقلیت، مقدونیہ کوسووں میں البانوی آبادی سربیا مقدونیہ اور بوسنیا میں گوجر اقلیت۔ مغربی مؤرخین بوسنیا کے مسلمانوں کو ترک کہتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان ترکوں کی اولاد ہیں جو عثمانی عہد میں یہاں آ کر بسے تھے۔ "گجر" کو عرب مؤرخین "غجر" کہتے ہیں۔ یہ خانہ بدوشوں کی ایسی قوم ہیں جو پورے مغربی اور مشرقی یورپ میں پائی جاتی ہے۔ یہ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ دوسری طرف کروشیا، بوسنیا و ہرزیگووینا اور مقدونیہ میں سرب اقلیت میں ہیں۔ خود سربیا اور مونٹی نیگرو میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یہ اقلیتیں جو ایک علاقے میں اکثریت میں ہوتی ہیں اور دوسرے میں اقلیت بن جاتی ہیں، یوگوسلاویہ کی بے چینی کا اصل سبب بنی رہی ہیں۔

مملکت سلافیہ کے حاکم اعلیٰ بادشاہ الیگزنڈر کراجاجورج نے 1921ء کے دستور کو یک دم منسوخ کر دیا اور اپنی آمریت قائم کر لی اور قومی جنگ (جو مذکورہ بالا اقوام کے درمیان پہلے سے چھڑی ہوئی تھی) کو روکنے کے لیے اس نے متعدد اقدامات کیے۔ اس نے تمام باشندوں کو صرف ایک زبان اور ایک رسم الخط کا پابند کر دیا۔ مملکت کا نام SHS (یعنی مملکت سرب، کروات، سلووینی) کی بجائے "مملکت یوگوسلاویہ" رکھ دیا یعنی جنوبی سلافیوں کی مملکت۔ تمام سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دے دیا۔ نیز آمر بادشاہ کی حکومت نے، جس پر درحقیقت سربوں کا غلبہ تھا، نیا سیاسی اور انتظامی ڈھانچا نافذ کرنے کی کوشش کی، جس میں اس نے مختلف نسلی گروپوں کے درمیان پائے جانے والے تمام تاریخی امتیازات نظر انداز کر دیئے۔ ان اندھا دھند سیاسی اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1934ء میں شاہ الیگزنڈر کسی کروات کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

1939ء میں سرب اور کرواٹس کے مابین ایک نیا معاہدہ طے ہوا، جس کی رو سے کروشیا کو مکمل داخلی خود مختاری دے دی گئی اور ان سارے علاقوں پر کرواٹیوں کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا، جن میں ان کی آبادی سربوں کی آبادی سے زیادہ تھی، بلکہ مسلمانوں کے وجود کو نظر انداز کرتے ہوئے بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلم علاقے بھی کروشیا میں

شامل کر دیے گئے، حالانکہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی 90 فیصد تھی۔ یوں مسلمان کبھی سربوں اور کبھی کروائیوں کی آمریت کی زد میں آتے رہے اور وہ اپنے اصلی وطن بوسنیا و ہرزیگووینا پر بھی اپنی سیادت سے محروم کر دیئے گئے۔ ان کے اقتصادی، معاشرتی حقوق تو پہلے ہی مصلوب تھے۔ اس کے بعد تو وہ گوشہ گمنامی میں جا پڑے۔ دوسری جنگ عظیم تک مسلمانوں کی یہی حالت رہی۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اس دوران میں 25 مارچ 1941ء کو یوگوسلاویہ کی حکومت نے جرمنی کے دباؤ کے تحت نازیوں کے ساتھ ایک مشترکہ الائنس پر دستخط کیے، جس کے بعد 1941ء میں جرمن فوجیں بلغراد میں داخل ہوئیں اور حکمران شاہی خاندان کو جلاوطنی پر مجبور کیا اور یوگوسلاویہ کے اندر جرمنی کی نگرانی میں فسطائی ریاست قائم ہو گئی جس میں پورا سلووینیا، کروشیا اور کچھ حصہ بوسنیا و ہرزیگووینا کا شامل کیا گیا۔ اس ریاست کا نام ''آزاد کروشیا ریاست'' رکھا گیا۔

چنانچہ جرمن فوجوں کے خلاف مضبوط مزاحمتی گروپ تشکیل دیے گئے۔ یہ گروپ دو قسم کے تھے۔ ایک قسم تو وہ تھی جس میں یوگوسلاویہ کی شاہی فوج شامل تھی۔ اس قسم کو چیٹنک کہا جاتا ہے۔ اس کی کمان میہووک کے پاس تھی۔ دوسری قسم نیشنل لبریشن آرمی تھی، جس کی قیادت جوزف ٹیٹو کر رہا تھا۔ (یہ ٹیٹو کروات تھا۔ 1892ء میں پیدا ہوا۔ یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری بن گیا۔ 1945ء میں یوگوسلاویہ کی نازیوں سے آزادی کے بعد وزیراعظم بن گیا۔ وزارتِ دفاع بھی اس کے ہاتھ میں تھی اور فوجوں کا کمانڈر بھی تھا۔ 1953ء میں یوگوسلاویہ کا صدر بن گیا۔ 1980ء میں اپنی موت تک وہ صدر بنا رہا۔ غیر جانبدار تحریک کا داعی بن کر ابھرا۔ انڈیا کا پنڈت نہرو اور مصر کا جمال عبدالناصر اس کے ساتھی تھے اور تینوں نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کو کچلنے اور دبانے اور دنیا میں یہود کے مقاصد کو بروکار لانے میں پوری کوشش کی)

پہلی قسم کے گروپ سرب آرتھوڈوکس تھے، اور دوسرے ان عناصر پر مشتمل تھے جن کی تنظیم ونا بیت سربیا سے باہر ہوئی تھی اور کمیونسٹ نظریات کے علم بردار تھے۔ ان دونوں طرح کے گروپوں کے مابین شدید مناقشت، بلکہ مخاصمت چل رہی تھی۔ اسی دوران ایک تیسری طاقت ابھر آئی، جسے استاشا موومنٹ (Ustase) کہا جاتا ہے۔ یہ کروشیا کے وطن پرست نوجوانوں کی تنظیم تھی جو نازی ازم کے حامی تھے۔ اس سابقت ومخاصمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئی اور ایک نسلی گروپ دوسرے نسلی گروپ کو تباہ و برباد کرتا رہا۔ مسلمان دونوں گروپوں کا شکار ہوتے رہے۔ سربوں کی چیٹنک ملیشیا کے ہاتھوں بوسنیا و ہرزیگووینا اور سنجق اور کوسوو میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا، ان کی تعداد پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ نازیوں نے بھی بڑا ظلم وستم کیا۔ ان کے ہاتھوں صرف دو سال (1940ء۔ 1941ء) میں ایک لاکھ بیس ہزار مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ نازی کیمپوں میں باقاعدہ رجسٹر اندراج کے ذریعے لوگوں کو نمبروار قتل کیا گیا۔ موت کے ان کارخانوں میں مسلمان خواتین کے چہرے نوچ لیے جاتے اور ان کی عصمتیں لوٹ لی جاتیں اور مردوں کی کہنیوں تک کی کھال کھینچ لی جاتی۔ اس طرح نازیوں نے پردے کا اور مردوں سے وضو کا انتقام لیا گیا۔

جنگ کے دوران ہی 29 نومبر 1943ء کو مارشل ٹیٹو نے بوسنیا کے ایک شہر جسی (Jajce) میں عارضی حکومت تشکیل دے دی۔ یہ حکومت دراصل اس دولت یوگوسلاویہ کے قیام کی تمہید تھی جو دو سال بعد ہی چھ جمہوریتوں پر مشتمل وجود میں آنے والی تھی۔ چنانچہ 1924ء میں جب یوگوسلاویہ کے آخری بادشاہ کو بھی تاج وتخت سے الگ کر دیا گیا تو 29 نومبر 1945ء کو ''یوگوسلاویہ فیڈرل ری پبلک'' کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آ گیا۔ اس کا دستور 24 جنوری 1946ء کو نافذ کیا گیا جو سوویت یونین کے 1936ء کے دستور کا چربہ تھا جس میں جزوی تبدیلی کر دی گئی تھی۔

پچاس کے عشرے کے آخری سال اس لحاظ سے یوگوسلاویہ کی معاصر تاریخ کے اہم سال ہیں کہ ان سالوں میں مذہب ونسل کے امتیاز کے بغیر یوگوسلاویہ کی تمام قومی اور وطنی تحریکوں اور کمیونسٹ نظریات کے حامل گروپوں کے مابین شدید تصادم ہوئے۔ کمیونسٹوں نے چیٹنک مومنٹ اور استاشا مومنٹ دونوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی اور دونوں کی وطن پرستی کو مشکوک بنا کر رکھ دیا۔ وہ دراصل اس طرح قومی احساسات کی ترجمانی کرنے والے تمام ماڈلوں کو راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔

مسلمان بے چارے دونوں طرف سے پس رہے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کی مدد کرنے والی نہ تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ آسٹریا، ہنگری دورِ اقتدار میں مسلمانوں کے رہنما مفتی موستار علی فہمی نے 1900ء میں بوسنیا وہرزیگووینا کے مسلمانوں کے حقوق کے لیے جنگ لڑی تھی۔ مفتی علی فہمی قانونی اور سیاسی امداد حاصل کرنے کے لیے جب استنبول گئے تو ہنگری حکام نے اسے واپس بوسنیا میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد 1906ء میں علی بیگ فردوس نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی اور ''تنظیم ملتِ اسلامیہ'' قائم کی اور اسے بذریعہ جمہوری انتخاب مضبوط و محکم بنیادوں پر استوار کیا۔ ان کی جدوجہد کے نتیجے میں مسلمانوں کے اوقاف کی تنظیم ہوئی، جس میں اوقاف کی حفاظت اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا طریقہ کار بیان کیا گیا ہے۔ اسے ''قانون وقفِ معارف'' کہتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے عام اوقاف اور مدارس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اوقاف کی نگرانی کے لیے ایک سپریم کونسل بنائی گئی جو نامزد آٹھ سرکاری ارکان (رئیس العلماء چھ مفتی اور ایک ناظم مجلس اوقاف) اور 24 غیر سرکاری ارکان پر مشتمل تھی۔ سپریم کونسل کا صدر ''رئیس العلماء'' ہوتا تھا۔ یہ نظم اگرچہ وقف اور دینی تعلیم تک محدود تھا، مگر اس نظم کی بدولت مسلمانوں کا دینی تشخص، تہذیبی ادارے اور دینی تعلیم کی حفاظت وترقی کا کچھ انتظام ہو گیا۔ رئیس العلماء کو حکومت نامزد کرتی تھی، اور بہت سے معاملات میں حکومت کی مداخلت ہوتی رہتی تھی۔ تاہم مسلمانوں کے لیے یہ نظام غنیمت تھا۔ اس کے ذریعے مسجدیں اور مدرسے قائم کرنے کا راستہ کھل گیا۔ 1909ء سے لے کر 1930ء تک یہ قانون جاری رہا۔ ''تنظیم ملت اسلامیہ'' کی سرگرمیاں نہ صرف بوسنیا وہرزیگووینا تک تھیں، بلکہ سربیا، ماؤنٹی نیگرو اور مقدونیہ میں بھی اس کے اثرات تھے۔

علی بیگ فردوس کے بعد تنظیم ملت اسلامیہ کی سربراہی ایک اور مضبوط شخصیت کے ہاتھ آ گئی۔ یہ ڈاکٹر محمد سپاہو (Spaho) تھے۔ 1936ء میں نیا آئین نافذ ہوا تو مسلم وقفِ معارف کے قانون میں بھی کچھ تبدیلیاں

ہوئیں۔ مگر ڈاکٹر محمد سپاہو اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی اداروں کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔ اس نئے آئین کے تحت اسلامی کمیونٹی کی نمائندگی مندرجہ ذیل اداروں کے ذریعے ہوئی:

مجلس جماعۃ العلماء، اضلاعی وقف کمیشن، سراجیوو اور سکوپیا میں مجلس علماء وقف معارف کی سپریم کونسل، وقف بورڈ، اور پھر رئیس العلماء اپنی پوری کونسل کے ساتھ یا چیدہ افراد کے ساتھ۔ رئیس العلماء کی سرکاری سکونت گاہ سراجیوو میں تھی۔ مفتی کا عہدہ منسوخ کر دیا گیا۔ یہی وہ تنظیم تھی جس کے ذریعے تنظیم ملت اسلامیہ (یوگوسلاوی مسلم آرگنائزیشن) نے محمد سپاہو کی قیادت میں مسلمانوں کو سنبھالا اور ملک کے اندر مسلمانوں کا ایک مقام پیدا کر لیا۔

یوگوسلاویہ کا خونیں ڈراما

"تنظیم ملت اسلامیہ" کے بعد آگے چل کر بوسنیا کے مسلمان نوجوانوں نے "ینگ مسلم موومنٹ" کے نام سے ایک اور جماعت قائم کی۔ یہ ان نوجوانوں کا پلیٹ فارم تھا جو دنیا کی اسلامی تحریکوں سے متاثر ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر وہ تھے جو حصول تعلیم کے لیے مصر گئے تھے اور حسن البنا کی دعوت سے آشنا ہوئے تھے۔ یوگوسلاوی نوجوانوں کے اندر تحریک الاخوان المسلمین نے بڑی مقبولیت حاصل کی تھی۔ 1945ء میں جب یوگوسلاویہ کو فیڈرل ری پبلک بنایا گیا اور مارشل ٹیٹو کی قیادت میں کمیونزم کے دور کا آغاز ہوا تو دوسرے محب الوطن اور قوم پرست عناصر کے ساتھ مسلمانوں کو بھی کمیونزم کے تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ چنانچہ سب سے پہلے 1949ء میں بڑی درندگی و وحشت کے ساتھ "ینگ مسلم موومنٹ" کو کچل دیا گیا اور چن چن کر اس کے حامیوں کو ظلم و تشدد کی چکی میں پیسا گیا۔ ہزار ہا نوجوان جام شہادت نوش کر گئے اور ایک بڑی تعداد نظر بندی کے کیمپوں میں ایسی حالت میں رکھی گئی کہ ان کے لیے موت ان کی زندگی سے بہتر تھی۔ گرفتار شدگان پر 1983ء میں مرکزی حکومت کی طرف سے ایک ہنگامی کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس عدالت میں 13 اسلامی دانشوروں اور علماء پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ بوسنیا اور ہرزیگووینا میں اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سرفہرست علی عزت بیگووچ بھی تھے جو بوسنیا کی آزادی کے بعد اس کے پہلے صدر بنے۔ انہیں پندرہ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی مگر چھ سال جیل میں گزارنے کے بعد 1989ء میں رہا کر دیئے گئے۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ اسلامی افکار کی اشاعت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر منظم کر رہے ہیں۔

جبر و تشدد کی یہ تمام کارروائی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت، اور تمام وسائل پر، جن میں صنعت، زراعت، تعلیم اور دیگر اجتماعی ادارے شامل ہیں، اس کی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے کی گئی۔ بعد ازاں مارشل ٹیٹو نے اپنی غیر جانب دار ملکوں کی تحریک کا آغاز کیا۔ سوویت یونین سے تو وہ پہلے ہی تعلق ختم کر چکا تھا۔ وہ کمیونزم کا علمبردار تو تھا، مگر سوویت یونین کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا تھا۔ امریکا اور سوویت یونین کی اعصابی، سرد جنگ میں مارشل ٹیٹو نے تیسرا زاویہ پیدا کرتے ہوئے "غیر جانب داری" (Non-Alighned Movement) کا اعلان کیا۔ وہ دراصل یوگوسلاویہ کے لیے دونوں متحارب بلاکوں کی مدد چاہتا تھا۔ اس بناء پر اسے اپنی داخلی سیاست میں بھی کچھ تبدیلیاں

کرنی پڑیں۔ چنانچہ یوگوسلاویہ کے انقلابی عہد میں پچاس اور ساٹھ کے عشرے نسبتاً ملکی استحکام و سکون کے سمجھے جاتے ہیں۔

ساٹھ کے عشرے کے اواخر اور ستر کے عشرے کے اوائل کی بات ہے کہ کرواٹس نے ٹیٹو حکومت کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا۔ وہ اپنے داخلی امور میں زیادہ سے زیادہ آزادی اور خودمختاری چاہتے تھے۔ اس بغاوت کی دو وجوہ تھیں۔ ایک ٹیٹو کی پارٹی پر سربوں کا قبضہ تھا، جو نسلی لحاظ سے کرواٹس کے دشمن چلے آ رہے تھے۔ اور دوسرے سرب کمیونسٹ بھی تھے، اور آرتھوڈکس بھی۔ اس لیے کیتھولک اور آرتھوڈکس کرواٹس کمیونسٹوں کا اقتدار تا دیر برداشت نہ کر سکے۔ اس بغاوت کی وجہ سے یوگوسلاویہ کی حکمران پارٹی ''کمیونسٹ لیگ'' میں سے کرواٹس کو نکال دیا گیا۔

مارشل ٹیٹو کا رخ اب مجموعی طور پر لامرکزیت کی طرف مڑ گیا اور اب اس نے یہ پالیسی اختیار کر لی کہ اختیارات زیادہ سے زیادہ مرکز سے وفاقی جمہوریاؤں کو منتقل کر دیے جائیں۔ 1950ء میں اس نے انتظامی امور میں داخلی خودمختاری کا نظام پہلے ہی جاری کر دیا تھا، جس کی وجہ سے سکون پیدا ہو گیا۔ 1971ء میں ملک کے دستور میں مزید ترمیم کی گئی اور وفاقی جمہوریاؤں کو مزید آزادی دے دی گئی اور اس طرح باری باری صدارتی کونسل کا نظام بھی رائج کیا گیا۔ یعنی ہر جمہوریہ کا صدر ایک معین وقفے کے لیے ملک کا صدر مقرر کیا جاتا تھا۔ اس اقدام کا مقصد مختلف قومیتوں کے اندر یک جہتی کو فروغ دینا تھا۔ 1974ء کے دستور میں اس نظام کو مزید موثر اور کارگر کر دیا گیا۔

نئے حالات میں اور 1974ء کے دستور کی بدولت مسلمانوں کے لیے بھی ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ اب تک مسلمانوں کو یوگوسلاویہ میں الگ قوم تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ 1878ء کی برلن کانگرس کے بعد مسلمانوں کو ''مقامی شہری'' نہیں مانا جاتا تھا۔ 1918ء میں مملکت یوگوسلاویہ کے وجود میں آ جانے کے بعد بھی یہی صورت حال تھی۔ تمام حکومتیں ان سے یہ مطالبہ کرتی رہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو سرب کہیں یا کرواٹس اور ''یوگوسلاوی نسل'' کے نام سے اپنا تشخص قائم کریں۔ مسلمان تمام ظلم و تشدد کے باوجود نہ سرب بننے کے لیے تیار ہوئے اور نہ کروات۔ سرکاری کاغذات میں انہیں اگرچہ ''یوگوسلاوین'' بھی لکھا گیا، مگر عملاً انہوں نے ایسی کوئی پوزیشن قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 1974ء کے دستور میں پہلی مرتبہ ''اسلامی قومیت'' (نیشنلٹی) کو مستقل حیثیت سے تسلیم کیا گیا اور انہیں سربوں اور کرواٹس کے برابر درجہ دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے نئے حالات سے فائدہ اٹھایا اور اپنی دینی، تہذیبی اور ثقافتی وجود کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف ادارے قائم کرنے شروع کر دیے۔ قدیم مساجد کی مرمت اور جدید مساجد کی تعمیر پر توجہ دی۔ سراجیوو میں ایک اعلیٰ سطح کا اسلامی کالج قائم کر لیا۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کی مخلوط شادیاں

''کمیونسٹ لیگ'' کے عہدہ دار مسلمانوں کی بیداری سے بوکھلا گئے۔ مسلمانوں کو دوسری نسلوں کی سطح پر لانے سے ان کا مقصد ''مساوات'' پیدا کرنا تھا اور وہ مسلسل زور دے رہے تھے کہ مسلمان اور دوسرے مذاہب اجتماعی طور پر باہم خلط ملط ہو جائیں۔ بالخصوص مخلوط شادیوں کے لیے انہوں نے زور شور سے مہم چلائی۔ یہ سلسلہ 1980ء تک

جاری رہا۔ مخلوط شادیوں کی مہم ''ایک مدت سے بے شعور رہنے والے'' مسلمانوں کے اندر کسی حد تک کامیاب رہی۔ عبداللہ اسماعیلیچ اپنے مضمون ''یوگوسلاویہ کے مسئلے کا تاریخی پس منظر'' میں اس موضوع پر لکھتے ہیں:

''1981ء کے اعداد و شمار کے مطابق ''یوگوسلاویہ قومیت'' رکھنے والوں کی تعداد بارہ لاکھ ہے۔ ان کی اکثریت مخلوط شادیوں کا نتیجہ ہے۔ مخلوط شادی کا رخ زیادہ تر یہ تھا کہ مسلمان عیسائی لڑکی سے شادی کر لیتا تھا۔ مسلمان لڑکیوں کی عیسائیوں سے شادی کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ نیز مخلوط شادیوں کو رواج بھی بوسنیا و ہرزیگووینا میں دیا گیا۔ اس کا مطلب مسلمانوں کی اکثریت کو متاثر کرنا تھا۔ چنانچہ بوسنیا کے شہر تزلا کے 2 فیصد باشندے یوگوسلاوی قومیت کے حامل ہیں۔ سراجیو میں ان کا تناسب 16 فیصد، شہر زینسا میں 13 فیصد اور موستار میں 12 فیصد ہے۔''

مخلوط شادیوں کا سلسلہ 1980ء تک جاری رہا۔ 1979ء میں جب ایران کے شاہ کے خلاف انقلاب برپا ہوا تو یوگوسلاویہ کے مسلمانوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔ کمیونسٹ جو داخلی طور پر کھوکھلے ہو چکے تھے، مسلمانوں کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے اور مسلمان نوجوانوں پر انہوں نے پھر تشدد اور سختی شروع کر دی۔

یوگوسلاویہ کا خونین ڈراما

یوگوسلاویہ کی تحریک اسلامی کے ایک نوجوان مصنف نے 1985ء میں ایک مختصر کتاب لکھی تھی ''الجوزة فی یوغوسلافیا'' ''یوگوسلاویہ کا خونین ڈراما''۔ مصنف نے یہ کتاب ان رفقاء کے نام منسوب کی ہے، جن کو 1984ء میں کمیونسٹوں نے بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ یہاں ہم اس کتاب کے ایک باب کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یوگوسلاویہ کے مسلمان آج کل بڑے خوفناک اور بدترین تشدد کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اس کا مقصد یوگوسلاویہ کے اندر اسلامی وجود کا مکمل خاتمہ ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً نصف کروڑ ہے، جبکہ کل آبادی تقریباً دو کروڑ دس لاکھ ہے۔ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان و تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان کو اس کی اہلیت و قابلیت کے مطابق ملازمت نہیں ملتی۔ ملازمتوں میں ترجیح کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کو دی جاتی ہے۔ مسلمان کو جس طرح عقائد میں ضربیں لگائی جاتی ہیں، اسی طرح اسے معاشی مار بھی دی جاتی ہے، کمیونسٹ پارٹی اعلانات تو یہ کرتی ہے کہ یوگوسلاویہ کے ہر باشندے کو دین و مذہب کی آزادی حاصل ہے، لیکن اس اعلان کا اطلاق مسلمانوں پر نہیں ہوتا۔ اسلامی کتابوں کی اشاعت و طباعت ممنوع ہے۔ گھروں میں بھی مذہب کی تعلیم دینا جرم ہے، جس کی سخت سزا مقرر ہے۔ اس جرم میں قوراجدہ کے خطیب محمد حسن بک کو پانچ سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کو ''یوگوسلاوی شہری'' تسلیم نہیں کرتی، بلکہ انہیں ترک سمجھتی ہے جو باہر سے آئے ہیں اور یہاں سامراج بن کر رہ رہے ہیں۔ ان سے ہر صورت نجات پانا ضروری ہے۔ نہ صرف نجات، بلکہ ان مسلمانوں کو مشرقی یورپ اور سلاوی اقوام پر ''ترکی سامراج'' کے مظالم کی

قیمت ادا کرنا ہوں۔ دراصل ترکوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے عہد میں سلاوی نسل کو مکمل طور پر نورِ اسلام سے منور نہیں کیا۔ اگر عثمانی ترک پوری توجہ کے ساتھ یہاں اسلام کی ترویج کرتے تو پورا جزیرہ نمائے بلقان آج مسلم ریاست ہوتا، حالانکہ ترک اس علاقے پر پانچ سو سال تک حکمرانی کرتے رہے ہیں۔

یوگوسلاویہ کے عام شہری مسلمانوں کے حسنِ سلوک سے اچھی طرح واقف ہیں جو عہد ماضی میں مسلمان ان کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے حسن سلوک کا احساس انہیں اس وقت ہو گیا تھا جب یوگوسلاویہ کے شمالی اور مغربی صوبوں سے (1878ء میں) ترک دست بردار ہو گئے، اور ان کی جگہ ہنگری و آسٹریا کے حکمران آ گئے، جنہوں نے یوگوسلاویہ کے شہریوں کو مجبور کیا کہ وہ قحبہ خانے کھولیں اور قمار خانے اور شراب نوشی کے اڈے چلائیں۔ انہوں نے یہ صورت ترک حکومت کے عہد میں نہیں دیکھی تھی۔ بہر حال، ترکوں نے یوگوسلاوی باشندوں کے ساتھ وہ بدسلوکی نہیں کی جو جرمنوں نے کی۔ جرمنوں کے عہد میں حالت یہ تھی کہ ایک جرمن کے قتل کے عوض سو یوگوسلاوی باشندے موت کے گھاٹ اتارے جاتے تھے، جن میں بچے بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ اس کے باوجود ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ جرمن زبان یوگوسلاویہ کے سکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اور جرمن گاڑی مرسیڈیز کمیونسٹ پارٹی کے عہدے داروں کی پسندیدہ سواری بنی ہوئی ہے۔ نیز ہم یہ کہیں گے کہ فرض کیجیے کہ صدیوں پہلے ترکوں نے سلاویوں کے ساتھ بھی شدت اور سنگ دلی برتی ہوگی، لیکن اس کا کیا جواز ہے کہ ان کا انتقام آج مسلمانوں سے لیا جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ کمیونسٹوں کی دشمنی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے یہ منصوبہ بنا رکھا ہے کہ کسی طرح یوگوسلاویہ کے چپے چپے سے مسلمانوں کی مکمل بیخ کنی کر دی جائے، جب کہ پارٹی کو یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہے اور نہ یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی مدافعت میں کوئی اٹھنے والا ہے، بلکہ عرب سیاح بڑی تعداد میں یوگوسلاویہ آتے ہیں اور یہاں آ کر گرمیاں گزارتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان عرب ممالک سے بھی سیاح آ رہے ہیں جو مذہب پسند سمجھے جاتے ہیں اور یوگوسلاویہ کے ساتھ ان کے سفارتی تعلقات بھی نہیں ہیں۔ یوگوسلاویہ کے محکمہ سیاحت کی طرف سے فروغ سیاحت کے لیے ایسا پبلسٹی لٹریچر چھاپا جاتا ہے جس میں ساحلوں پر عریاں عورتوں کی ترغیب انگیز تصویریں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی کسی عیسائی کو گرفتار تو کیا، ہاتھ تک نہیں لگا سکتی۔ اسے معلوم ہے کہ ویٹی کن کا پوپ اعظم فوراً دخل دے گا۔ کسی یہودی سے بھی تعرض نہیں کرتی، اس لیے دنیا بھر کی یہودی صحافت واویلا کرنے لگتی ہے۔ کسی یورپی ملک کے سیاح کو بھی جرم کے باوجود کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک مرتبہ ایک برطانوی باشندے (انگریز) نے ایک یوگوسلاوی کو قتل کر دیا تھا۔ عدالت نے انگریز کو چودہ سال جیل کی سزا دی، مگر ملکہ برطانیہ نے فوراً دخل اندازی کی، اور اس انگریز قاتل کو فوراً رہا کر کے پورے اعزاز سے ساتھ واپس بھیج دیا گیا۔

کمیونسٹوں کو نفرت اور تعصب کے لیے مسلمان مل گئے ہیں۔ مسلمان گروہ در گروہ جیلوں میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ یہ جیلیں زمین دوز ہوتی ہیں، اگر ان سے کوئی خوش قسمت نکل آتا ہے تو وہ عمر بھر کے لیے مستقل اپاہج ہو چکا ہوتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی مسلمانوں کو ترک اسلام پر مجبور کرتی ہے۔ طالب علموں کو تعلیمی اداروں میں اور

مزدوروں کو کارخانوں میں نماز پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ مسلمان طلبہ اور مسلمان سپاہیوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ سؤر کا گوشت کھائیں۔ ان کے لیے الگ حلال گوشت کا انتظام ''امتیازی رویہ'' سمجھا جاتا ہے جس کی یوگوسلاویہ میں اجازت نہیں ہے۔

کمیونسٹ پارٹی نے سکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ پر خوف وتشدد کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ ایسے ٹیچر کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے اور اسے خوب ترقی دی جاتی ہے جو مسلمان طالب علم کی بے عزتی کرے اور کلاس روم میں اسلام کا مذاق اڑائے، جو مسلمان طالب علم کو یہ بتائے کہ مادہ ہی اصل معبود ہے اور مذہب افیون ہے، عربوں کی پسماندگی کا اصل سبب اسلام ہے۔ عرب بدو صحرانشین ہیں اور صرف عورت بازی سے شغل رکھتے ہیں۔ ان کے پاس جو پٹرول کی بے تحاشا دولت ہے، وہ عیاشی پر خرچ کرتے ہیں۔ فوج کیا اس افسر کو اعزازی تمغے دیے جاتے ہیں جو مسلمان سپاہیوں کو ذلیل ورسوا کرے، انہیں سؤر کا گوشت کھلائے، نماز سے روکے، یہاں تک کہ بیت الخلاء میں پانی کے استعمال کی بھی اجازت نہ دے۔

یوگوسلاوی مسلمانوں کی حالت عہدِ اشتراکیت میں

یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ پارٹی کو سب سے زیادہ دکھ اس بات سے ہوتا ہے کہ مسلمان کسی عہدے پر پہنچ جائے، بلکہ وہ اس بات سے بھی جل اٹھتی ہے کہ کسی گاؤں یا قصبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی غیر مسلم باشندوں کو بڑے بڑے لالچ دے کر ان شہروں اور قصبوں میں لا کر آباد کر رہی ہے جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی نے کئی شہروں میں قدیم محلوں کے بالمقابل بڑے بڑے نئے محلے کھڑے کر دیے ہیں، جنہیں ''ماڈل ٹاؤن'' کہا جاتا ہے اور ان میں غیر مسلموں کو لا کر بسایا جاتا ہے۔ یوگوسلاویہ کے تقریباً تمام شہروں میں یہ اسکیمیں جاری کی گئی ہیں۔ سراجیوو (جس کا پرانا نام سرائے بوسنہ ہے)، سکوپیا اور پرشیتنا شہروں میں ایسے محلے جگہ جگہ بنائے گئے ہیں۔ بوسنیا کے اندر ایک ہی اسلامی درس گاہ ہے۔ اس کے قریب ہی خفیہ پولیس کا سنٹر بنایا گیا ہے۔ خفیہ پولیس والوں کی تعداد درس گاہ کے طلبہ کی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ خفیہ پولیس کا آدمی استاد کی اجازت کے بغیر کلاس روم میں داخل ہوسکتا ہے۔ تمام کلاس روموں میں گفتگو سننے کے آلات نصب کیے ہوئے ہیں۔ وہ جس طالب کو اسلامی تعلیم میں سنجیدہ اور محنت کرنے والا دیکھتے ہیں، اسے جو چاہیں، سزا دے سکتے ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی نے مسلمانوں کے اوقاف ضبط کر لیے ہیں۔ یہ اوقاف بوسنیا کے نیک نفس اور صالح حکمران غازی خسرو بک، علی پاشا اور فرہاد پاشا وغیرہ نے جاری کیے تھے۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ان سے اسلامی مدارس اور ان کے طلبہ واساتذہ کے مصارف ادا کیے جائیں۔ یہ اوقاف اس قدر وسیع تھے اور ان سے اس قدر آمدنی ہو رہی تھی کہ ان کے لیے ایک الگ بنک قائم کیا گیا جسے ''بنک آف اوقاف'' کہا جاتا تھا۔ حکومت نے اسے بھی ضبط کر لیا اور اس کے اندر جو سرمایہ تھا، اسے لوٹ لیا۔ غازی خسرو بک نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ ''یہ اوقاف مدارس پر صرف کیے جائیں اور ان مدارس میں قرآن کریم اور عربی زبان کی تعلیم دی جائے''۔ کمیونسٹ پارٹی نے مسلم اوقاف پر تو ہاتھ

صاف کر لیا لیکن کسی کیتھولک یا پروٹسٹنٹ چرچ کے اوقاف کو چھیڑنے کی ہمت نہ ہوئی، کیونکہ ان اوقاف کے وارث موجود ہیں اور مسلم اوقاف لاوارث ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی اس کھوج میں رہتی ہے کہ کون سا مسلم سٹوڈنٹ عربی زبان میں قابل ہے یا اس مذہب اسلام سے بڑی دلچسپی ہے تو وہ اسے دوسری طرح طرح کی ذمہ داریاں پیش کرتی ہے اور بھاری بھرکم تنخواہیں دیتی ہیں، مثلاً ترجمہ اور تعلقات عامہ کی ذمہ داریاں۔ اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص مسلمانوں کے درمیان کام نہ کرے اور اسلام کی خدمت کو شعار نہ بنا لے۔ جو شخص اس کی پیش کش کو مسترد کر دیتا ہے، اس پر ہر مصیبت ٹوٹتی ہے۔ اسے غدار اور ریاست کے ساتھ بے وفائی کرنے والا سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہاں تک الزام لگا دیا جاتا ہے کہ یہ انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک الزام ایسا ہے کہ اس کے تحت موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی نے ہفت روزہ ''البعث الاسلامی'' بند کر دیا تھا۔ یہ رسالہ ''انجمن مشیخت اسلام'' کی طرف سے نکلتا تھا۔ الزام یہ تھا کہ یہ رسالہ مذہب کی اشاعت کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ اور بورژوا طبقے کا نظام بحال کرنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کا صرف یہ ایک ہی اخبار تھا اور وہ بھی ہفت روزہ۔ حالانکہ یوگوسلاویہ میں بکثرت روزنامے ہیں، بلکہ ان میں دو دو بار اخبار نکلتے ہیں۔ جنسی رسائل کی بھرمار ہے۔ کیتھولک چرچ کی طرف سے بھی کئی روزنامے نکلتے ہیں۔ ان تمام اخبارات و رسائل میں کمیونسٹ پارٹی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اسے صرف مسلمانوں کے ایک ہفت روزے سے خطرات لاحق تھے، اس لیے اسے بھی بند کر دیا گیا۔

حج پر جانے کی بھی بڑی پابندیاں ہیں۔ جو شخص حج پر جانا چاہے، اس سے سونے کی معین مقدار میں سیکیورٹی لی جاتی ہے، تاکہ وہ ضرور واپس آئے اور کسی مسلم ملک میں جا کر آباد نہ ہو جائے۔ چنانچہ ایک مسلمان مرنے سے پہلے حج کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر زندگی بھر جفاکشی کرتا رہتا ہے، تاکہ وہ مطلوبہ مقدار میں سونا اور دیگر مصارف فراہم کر سکے۔ کمیونسٹ پارٹی نے اب (1984ء) مزید پابندیاں عائد کر دی ہیں اور نتیجتاً پچاس لاکھ مسلمانوں میں سے صرف ایک ہزار اشخاص حج سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی اسلامی تہواروں میں استعمال ہونے والے الفاظ کا بھی دھیان رکھتی ہے، اور پھر ان الفاظ کی جو چاہے، تاویل کر لیتی ہے اور اس کے مطابق بولنے والے کا محاسبہ کرتی ہے۔ یوگوسلاویہ کے انتہائی فاضل اور خدا پرست شیخ الاسلام حسین جوزو کو اس بنا پر جیل میں ڈال دیا گیا کہ انہوں نے بقونیا شہر میں ایک دینی تقریب میں مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اے برادرانِ اسلام''۔ چنانچہ انہیں مسجد کے اندر ہی گرفتار کر لیا گیا اور سیدھا جیل بھیج دیا گیا۔ حکام کا کہنا تھا کہ 'برادرانِ اسلام' کے الفاظ صرف اس وقت استعمال کیے جا سکتے ہیں جب ملک کے اندر کوئی سیاسی تنظیم موجود ہو۔

کمیونسٹ پارٹی کو یہ بھی دکھ ہے کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو پارٹی سرکل میں لانے میں کامیاب نہیں ہوئی، اور ان نوجوانوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے اس کی محنت رائیگاں گئی ہے۔ سکولوں میں الحاد اور کمیونزم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طلبہ تنظیمیں، جن کا ملک کی سیاست پر بڑا وزن ہے، مخلوط اور فحاشی آمیز کیمپ لگاتی ہیں جو کئی ہفتے جاری

رہتے ہیں اور کلچرل سرگرمیوں کے نام سے لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھا رکھا جاتا ہے۔ ریاست کی طرف سے نوجوانوں کو پھندے میں لانے کے لیے رہائشی فلیٹ، تعلیمی وظائف اور دیگر مالی امداد دی جاتی ہے۔ اجتماعی بدکاری کے لیے کلب قائم کیے جاتے ہیں، جن پر بڑی فراوانی سے سرمایہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ان تمام حربوں کے باوجود مسلمان نوجوانوں کو ان کے دین سے نہیں ہٹایا جاسکا۔

کمیونسٹ اقتدار کے بعد جسے چالیس سال ہو رہے ہیں، مسلمان نوجوان اپنے دین کو نہیں بھولا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو کی سرکردگی میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا۔ مسلمان نوجوانوں نے اپنی نمازوں کے لیے ایک قدیم تاریخی مسجد، جو سراجیو شہر سے بہت دور ہے، ڈھونڈ نکالی۔ اس کی تعمیر و اصلاح کی اور اب وہاں وہ رمضان میں افطاری کا اہتمام کرتے ہیں۔ نماز وتر اور تراویح ادا کرتے ہیں۔ تہجد اور تلاوت قرآن کا سلسلہ فجر تک جاری رکھتے ہیں۔ اعتکاف کرنے والوں سے یہ مسجد بھر جاتی ہے۔ اس مسجد سے نوجوانوں کو اس قدر دلچسپی ہوگئی کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی آنکھوں میں چکا چوند کرنے والی ہر پیش کش کو ہیچ سمجھنے لگے۔ یہ دیکھ کر کمیونسٹ پارٹی آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور حکام بدحواس ہو جاتے ہیں۔ مسجدوں کو تالا لگا دینے کا حکم جاری کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کا داخلہ مسجد میں بند کر دیتے ہیں۔ حکومت نے ان تمام نوجوانوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی جو ان سرگرمیوں کے شریک تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے اب اور طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے مسلمان نوجوانوں کو پارٹی میں لانے کے لیے تراشے ہیں، لیکن ان کا ہر حربہ ناکام رہتا ہے۔ نمازیوں کی تعداد میں نوجوانوں کا تناسب بوڑھوں سے بڑھتا جا رہا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی کو اس بات سے بھی صدمہ ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری قومیتوں سے ہر لحاظ سے جدا نظر آتے ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی چالوں میں نہیں آئے۔ اکثر پاک دامن ہیں۔ اخلاقی برائیوں سے کنارہ کش رہتے ہیں، جب کہ دوسری اقوام اخلاقی پستی میں نچلی سطح تک گر چکی ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ شراب کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتیں۔ جنسی آزادی میں بھی آخری حدوں کو چھو چکی ہیں، اور ان میں جنسی امراض کا گراف بہت اونچا جا چکا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی حکومت کے اندر اپنے پنجے مزید گہرے کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دوسری قومیتوں کی توڑ پھوڑ سے اپنا راستہ ہموار کر رہی ہے، مگر مسلمان ایک ایسا جن ہیں جو ان کی بوتل میں نہیں اتر رہا۔ کمیونسٹ پارٹی کی طویل حکمرانی اور دہشت و تشدد کے باوجود مسلمان ہی اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ سینکڑوں مسلمان اب تک جام شہادت نوش کر چکے ہیں، مگر وہ کمیونسٹوں کی دہشت گردی کا مقابلہ کیے جا رہے ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی یوگوسلاویہ کی دیگر تمام اقوام کے اندر خاندانی روابط اور خاندانی نظام کا تیاپانچا کر چکی ہے، کیونکہ اس ٹوٹے پھوٹے معاشرے کے اندر اس کے لیے حکمرانی آسان ہو سکتی ہے، مگر مسلمان خاندان پر اس کی سازشیں کارگر نہیں ہوئی ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے خاندانی نظام اور روایات کی ہر طرح سے حفاظت کی ہے اور جب یہ پارٹی اس سلسلے میں اپنی تمام چال بازیوں میں ناکام ہوگئی تو اس نے ہزاروں مسلمانوں کو جن میں بہترین نوجوان

اور علماء بھی ہیں، نذرِ زنداں کرنا شروع کر دیا۔ ماضی میں ان کے پیشرو بھی ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔

انہوں نے ماضی میں بھی مفتی عصمت متتیش اور جلیل القدر عالم عصمت بوصلاگیج کو شہید کر دیا تھا۔ مشرقی بوسنیا میں فوجا کی جامع مسجد میں بارہ ہزار سے زائد مسلمانوں کو یکایک موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دریائے درینا کے قوراجدہ پل پر چھ ہزار مسلمان ذبح کیے۔ توزلا شہر اور اس کے مضافات میں تین ہزار فرزندانِ توحید کو موت کے گھاٹ اتارا۔ مقدونیہ میں چھ ہزار افراد گولیوں کی بوچھاڑ سے بھونے گئے۔ ''تحقیقاتی عدالتوں'' کے ذریعے بارہ عظیم المرتبت علمائے دین کو پھانسی دی گئی۔ بوسنیا کے بیسیوں علماء جیلوں میں ڈال دیئے گئے، جن میں سرفہرست شیخ قیام دوبرایہ تھے۔ ''تحقیقاتی عدالتوں'' کا ڈراما بار بار دہرایا گیا اور ہر بار مسلمانوں کا ایک گروہ تختہ دار پر چڑھایا گیا۔

اب ماہ اپریل 1983ء کے آغاز سے یوگوسلاویہ کے اخبارات مسلمانوں کے خلاف پھر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ 12 اپریل 1983ء کے شمارے میں ''پولیتیکا'' اخبار نے چند مسلمان شخصیات پر ریاست کے منافی سرگرمیوں کے ارتکاب کا الزام لگایا ہے، حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں 1949ء میں مختلف مدت کی سزائے قید دی گئی تھی اور پانچ سال سے پندرہ سال جیل کاٹنے کے بعد یہ رہا ہوئے ہیں۔ اب ان کو دوبارہ جیل بھیج دیا گیا ہے۔ ان میں چند نمایاں لوگ یہ ہیں:

☆ علی عزت بیگووچ، جو بوسنیا کی آزادی کے بعد اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ پیشہ وکالت
☆ عمر بہمن (ٹیچر)
☆ رشید برفودا (ماہر معاشیات)
☆ مصطفیٰ اسابیج، امام مسجد
☆ ملیحہ صالح بک (خاتون کارکن معاشرتی بہبود)
☆ جولا بیجا (ملازمہ الیکٹرونکس کمپنی)
☆ اوہم بیجا (الیکٹرک انجنیئر)
☆ عصمت قاسم (ماہر فلکیات)
☆ حسن کرنجیج (امام مسجد)

یوگوسلاویہ کی سرکاری نیوز ایجنسی کے مطابق یہ لوگ ریاست کے خلاف تعصب برتتے ہیں، اور ان پر دفعہ 133 کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔ اور دوسرا الزام ان پر یہ ہے کہ یہ ریاست کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور باہر کی طاقتوں کے ساتھ ان کے رابطے ہیں۔

یوگوسلاویہ کے اخبارات روزانہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ان اشخاص کو سخت سے سخت سزا دی جا سکتی ہے۔ ایک مسلمان نے یہ بیان دیا ہے کہ ان لوگوں پر یہ الزام عائد کیا جانے والا ہے کہ یہ جمہوریہ بوسنیا کے اندر حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، تاکہ وہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے اور پھر یہ ملک یورپ کے اندر ایک اسلامی جمہوریہ کے طور پر نمودار ہو۔

اس ظالمانہ سیاست کی وجہ سے یوگوسلاویہ کی معاشی حالت بھی بہت خراب ہو چکی ہے۔ یوگوسلاویہ کے قرضے 19 ارب ڈالر سے بڑھ چکے ہیں۔ حالانکہ ستر کی دہائی میں یوگوسلاویہ تمام یورپی ممالک میں اقتصادی لحاظ سے بہتر تھا۔ اب یوگوسلاوی دینار کی قیمت بہت گر چکی ہے۔ 1975ء میں ایک امریکی ڈالر کے 1700 یوگوسلاوی دینار تھے اور اب 6500 دینار ہو چکے ہیں۔ پہلے یوگوسلاویہ کا شہری ملک سے باہر جانے میں آزاد تھا۔ اسے ویزا لینے کی

ضرورت نہ تھی، ماسوائے اسرائیل اور سعودی عرب کے۔ اب اس پر پروگریسو ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔ چنانچہ جو شخص سال میں پہلی مرتبہ ملک سے باہر جانا چاہے، اسے دو لاکھ دینار ادا کرنے پڑتے ہیں، اور اگر اسی سال دوبارہ جائے گا تو اس ٹیکس میں اضافہ ہو جائے گا، بلکہ ہر بار کے سفر پر یہ ٹیکس بڑھتا جائے گا۔ اشیائے خوراک کی قیمتیں بہت بڑھ چکی ہیں۔ مارکیٹ سے مکھن، چائے، دودھ اور گوشت ناپید ہو گیا ہے۔ یوگوسلاویہ زرعی ملک ہے اور اقوام متحدہ کی فہرست میں "ترقی یافتہ" ممالک میں شمار ہوتا ہے۔

عیسائیوں کو ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہیں۔ یوگوسلاویہ میں اس وقت عیسائیوں کے دو عظیم الشان الٰہیات کالج موجود ہیں۔ ایک آرتھوڈکس فرقے کا اور دوسرا کیتھولک فرقے کا۔ جہاں تک گرجوں اور مسیحی عبادت خانوں کا تعلق ہے، وہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان عبادت خانوں کو نبیذ (شراب کی ایک قسم) تیار کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ عمدہ نبیذ حضرت مسیح کا خون سمجھی جاتی ہے۔ کیتھولک چرچ کو ویٹی کن سے بھرپور مالی امداد ملتی ہے۔ اس پر حکومت کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ پادری لوگ باہر ہی سے تنخواہ لیتے ہیں۔ یہودی بھی آزاد ہیں۔ اس وقت یوگوسلاویہ میں دو ہزار یہودی ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں اور کنشت ہر شہر میں نظر آتے ہیں۔ ملک کی اکثر شاہراہیں یہودیوں کے ناموں پر ہیں، مثلاً بلغراد کی موشے پیاوا روڈ اتنی ہی بڑی ہے، جتنی خود مارشل ٹیٹو روڈ۔ صرف مسلمان وہ قوم ہے جس کے کسی فرد کو بیرونی دنیا سے رابطے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کسی کے بارے میں پتا چل جائے کہ وہ کسی مسلم ملک میں گیا ہے تو اس پر مقدمہ چلا کر خوفناک سزا دی جاتی ہے۔ یہ کام صرف کمیونسٹ پارٹی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

بوسنیا کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی

1980ء میں یوگوسلاویہ کا آمر مطلق مارشل جوزف ٹیٹو فوت ہو گیا۔ چنانچہ 1980ء سے لے کر 1990ء تک کا زمانہ یوگوسلاویہ کے اندر انتہائی خلفشار، ابتری، لوٹ مار، لوٹ کھسوٹ، تشدد، دہشت گردی اور معاشرتی انحطاط کی کارروائیوں اور داستانوں کا زمانہ ہے۔ مارشل ٹیٹو کی موت سے اس ملک کی تاریخ نے نیا رخ اختیار کر لیا۔

تبدیلی کا سب سے بڑا دھما کا 1981ء میں کوسوو میں ہوا۔ کوسوو میں البانوی مسلمان بستے ہیں، جن کی وہاں بھاری اکثریت ہے۔ یوگوسلاویہ اس وقت شدید اقتصادی بحران میں تھا اور اس کا سب سے زیادہ اثر کوسوو پر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ البانوی مسلمانوں نے ان حالات کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ بغاوت بڑے بڑے مظاہروں، ہڑتالوں اور تخریبی کارروائیوں کی صورت اختیار کر گئی۔ اسے کچلنے کے لیے یوگوسلاویہ کی فوج استعمال کی گئی۔ ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا، لیکن اس کے باوجود تحریکِ بغاوت جاری رہی۔

یہ لاوا جو کئی سال سے پک رہا تھا، رکنے والا نہ تھا۔ کوسوو کے بعد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی احتجاجی شعلے بھڑک اٹھے۔ پورے ملک میں عوامی غیظ و غضب کی لہر دوڑ گئی، اور اب پورا یوگوسلاویہ سراپا احتجاج بن گیا۔ صرف 1987ء میں یوگوسلاویہ کے اندر جو ہڑتالیں ہوئیں، ان کی تعداد 1570 تھی۔

اشتراکیت سے لوگ بے زار ہو گئے اور قومی تحریکوں کے اندر نئی زندگی دوڑ گئی۔ خود سرب کمیونسٹوں نے کمیونزم کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور متعصب قوم پرست بن گئے اور انہوں نے خود مارشل ٹیٹو کے قائم کردہ آہنی نظام پر حملے شروع کر دیئے۔ جمہوریہ سربیا کے مقابلے میں دوسری پانچ جمہوریتوں کی مخالفت بھی شروع کر دی۔ ان کے خیال میں قیادت صرف جمہوریہ سربیا کے پاس ہونی چاہیے، جب کہ دوسری پانچ جمہوریتیں اب حقوق و اختیارات میں جمہوریہ سربیا کے ہم پلہ تھیں اور اب یہ صورت سربوں کو گوارا نہ تھی۔ سربوں نے اپنے قدیم نظریات کو زندہ کرنا شروع کر دیا اور سرب قوم کی قیادت میں ''عظیم تر سربیا'' کی بحالی کا نصب العین اختیار کر لیا۔ سربوں کے ان عزائم کا اندازہ اس یادداشت سے لگایا جا سکتا ہے جو ''سرب اکیڈمی برائے سائنس و آرٹ'' نے 1986ء کو حکومت کو پیش کی تھی۔ اس یادداشت میں اکیڈمی نے ''وفاق یوگوسلاویہ'' میں سربوں کی قیادت کو مستحکم کرنے کا تفصیلی پروگرام پیش کیا تھا۔

سرب قوم پرستی کو بڑے زور شور سے زندہ کیا گیا کہ 1989ء میں ایک متعصب اور قوم پرست لیڈر میلوسوک (Milosvic) کو سربیا کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ یہ شخص ایک نہایت مضبوط مرکزی حکومت کے علم برداروں میں سے تھا۔ یہ دیکھ کر دوسری جمہوریتوں کے اندر سرب تسلط کے خدشات مزید بڑھ گئے۔ خاص طور پر آزادی پسند سلوو ینیا اور کروشیا نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ سلوبودان کا انتخاب اس کی قیادت دیکھ کر کروشیا کے اندر سخت ردعمل ہوا۔ اور جب مارچ 1990ء میں کمیونزم کے سقوط کے بعد کروشیا میں پہلی مرتبہ الیکشن ہوا تو کروشیا کی ''نیشنل ڈیموکریٹ کروشین یونین'' دو تہائی اکثریت سے جیتی۔ اس پارٹی کی جیت دراصل متعصب سرب لیڈر کے اقتدار پر آ جانے کا ردِ عمل تھی۔ اس پارٹی کا سربراہ فرانوتو جمان (Franjotodjman) جمہوریہ کروشیا کا نیا صدر منتخب ہو گیا۔ یہ شخص بھی قوم پرست کروات جنرل تھا۔ مارشل ٹیٹو کے اقتدار کے دوران یہ جلاوطن رہا ہے۔

سیاسی میدان میں سربیا اور کروشیا کے اندر برق رفتار تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ان تبدیلیوں کا یوگوسلاویہ کے مسلمانوں پر بہت بڑا اثر ہوا اور مسلمانوں نے ضرورت محسوس کی کہ سیاسی طور پر انہیں بھی اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے۔ بوسنیا و ہرزیگووینا میں یہ احساس خاص طور پر شدت سے پیدا ہوا کہ ان کی بقا و استحکام کا دارومدار وہاں کی غالب مسلم اکثریت کی یک جہتی اور اتحاد پر ہے۔ اس صورتِ حال کا احساس کرتے ہوئے ڈاکٹر علی عزت بیگووچ نے مارچ 1990ء میں اسلامی پارٹی تشکیل دی جس کا نام ''ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی'' رکھا۔ بوسنیا کی زبان میں اس کا مخفف ''ایس ڈی اے'' تھا۔ یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے اندر بہت مقبول ہوئی۔ ایک تو بوسنیا و ہرزیگووینا اور سنجق و کوسوو (سربیا) اور مقدونیہ کے مسلمان اپنی طاقت کو منظم کرنے کی شدید ضرورت محسوس کر رہے تھے اور دوسرے اس کے بانی اور سربراہ ڈاکٹر علی عزت بیگووچ بذاتِ خود بڑی مشہور و مقبول مجاہد شخصیت تھے اور عوام میں ان کا بڑا احترام اور وقار تھا۔ موصوف قانون داں اور اسلامی مفکر تھے اور کمیونسٹ دور میں دو مرتبہ جیل جا چکے تھے۔ پہلی مرتبہ 1949ء میں ''جنگ مسلم موومنٹ'' کو خلاف قانون قرار دیا گیا، اور دوسری مرتبہ 1983ء میں، مارشل ٹیٹو کی وفات کے تین سال بعد جب ملک کے اندر عام بے چینی پیدا ہوئی اور عوامی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایس ڈی

اے مارچ 1990ء میں قائم ہوئی اور جب اکتوبر 1990ء میں بوسنیا و ہرزیگووینا میں سقوطِ اشتراکیت کے بعد پہلی مرتبہ ملکی انتخابات ہوئے تو یہ پارٹی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی اور علی عزت بیگ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا کے منصب صدارت پر فائز ہو گئے۔

اب سابق یوگوسلاویہ میں تین شخصیتیں سیاسی میدان میں نمایاں ہو گئیں۔ ایک آرتھوڈکس سرب لیڈر میلوسوک، دوسرا کیتھولک کروات لیڈر تو جمان صدر کروشیا اور تیسرے مسلم لیڈر علی عزت بیگ صدر بوسنیا۔ 1991ء اور 1992ء میں یوگوسلاویہ کے اندر جو بحران پیدا ہوا، وہ ان تین لیڈروں کے گرد گھومتا رہا۔ یہ تینوں یوگوسلاویہ کے تین سب سے بڑے نسلی اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

اسلامی مذہبی کمیونٹی کی تنظیم

بوسنیا و ہرزیگووینا اور یوگوسلاویہ کی دوسری مسلم آبادیوں پر آسٹریا، ہنگری کے اقتدار کا پورا عرصہ (1878ء۔1914ء) مسلمانوں کے لیے شدید آزمائش کا زمانہ تھا۔ آسٹریا وہنگری کے حکمران اور مذہبی وسیاسی رہنما مسلمانوں سے صلیبی اور بعد والی جنگوں کا انتقام لیتے رہے اور انہوں نے مذہبی لحاظ سے مسلمانوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ 1909ء میں جب آئینی طور پر بھی ہنگری والوں نے یوگوسلاویہ کے تمام علاقوں کو اپنی ریاست میں مدغم کر لیا تو مسلمانوں کو اپنے مذہبی رسوم و شعائر کی ادائیگی کے لیے محدود پیمانے پر ایک ادارہ حکومت کی نگرانی میں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ مذہبی ادارہ دوسری عالمی جنگ تک قائم رہا، مگر عملاً یہ غیر مؤثر رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ان کا تسلط ختم ہوا اور مسلمانوں کی مملکت قائم ہوئی تو پہلے تو مسلمانوں نے خوشیاں منائیں، مگر پھر ان کی ساری خوشیاں ہوا ہو گئیں، کیونکہ اس نئی مملکت پر آرتھوڈکس سربوں نے غلبہ پا لیا اور مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا، حالانکہ آسٹریا وہنگری کے مظالم سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں نے سربوں کا پورا ساتھ دیا تھا۔ سلافی مملکت نے 1921ء میں جو دستور نافذ کیا تھا، وہ اگرچہ تمام مذہبی گروپوں کو یکساں حقوق دیتا تھا، مگر عملاً سارے حقوق آرتھوڈکس عیسائیوں کو حاصل تھے۔ باقی مذہبی گروپ مذہبی آزادی سے بڑی حد تک محروم رہے حتیٰ کہ کیتھولک فرقے کے پیروکار بھی سربوں کے ہاتھوں نالاں رہے۔ 1931ء کے دستور کا بھی یہی حال تھا۔ مسلمان اس گروہی امتیاز کے خلاف مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور اپنے تشخص کی حفاظت کے لیے جانیں لڑاتے رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے (1945ء) کے بعد مارشل ٹیٹو کا دور آیا اور کمیونزم کی لہر دوڑ گئی، جس کے نتیجے میں مذہب مجموعی طور پر نفرت وکراہت کا نشانہ بن گیا۔ اس کی زیادہ زد اسلام پر پڑی۔ مسلمانوں کی اوقاف کی زمینیں اور جائیدادیں بھی قومی ملکیت کے قانون کے تحت حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو شدید ضرب لگی۔

1959ء کے آئین میں مسلمانوں کی طویل جدوجہد اور لاتعداد قربانیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے مذہبی اداروں اور مذہبی رسوم کا نظام بحال کرنے کی دفعہ 3 میں کہا گیا: ''اسلامی مذہبی کمیونٹی اپنے مذہبی شعائر ادا کر سکے گی اور اپنے مذہبی فرائض اور اسلامی احکام کی تعلیم علانیہ دے سکے گی۔ اسے یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے دینی، تعلیمی اور رفاہی

امور کا انتظام کرے۔''

مالی امور کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے یوں مشکل ہوگیا کہ مسلمانوں کے عظیم الشان اوقاف جو زرعی زمینوں اور بھاری بھرکم عمارتوں کی صورت میں تھے اور علی الخصوص غازی خسرو بک نے، جو بہت سی جائیدادیں دینی تعلیم وتربیت کے لیے وقف کر دی تھیں، وہ کمیونسٹ حکومت نے اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ چنانچہ مذکورہ دستور کی دفعہ 14 میں مسلمانوں کے وسائل وذرائع کی یوں نشان دہی کی گئی:

☆ مسلم کمیونٹی کے اداروں کی املاک اور ان کی آمدنی (اس میں وقف شامل نہیں)
☆ چندے جو مسلم گروہ کی طرف سے جمع کیے جائیں
☆ چندوں سے ہونے والی آمدنی
☆ تحائف، اور وصیتیں
☆ مذہبی خدمت کی خاطر جمع ہونے والا ٹیکس
☆ حکومت کی امداد
☆ دیگر آمدنی، جس کا ذریعہ واضح ہو

مذکورہ بالا تمام مالی ذرائع ناکافی تھے۔ مسلمانوں کا بڑا ذریعہ آمدنی زراعت تھا اور جب ان کی زمینیں حکومت نے ہتھیا لیں، تو وہ مفلوک الحال ہوگئے۔ ٹیٹو حکومت نے 14 اپریل 1960ء کو نیا معاہدہ جاری کیا جسے ''مسلم کمیونٹی کا سوشل سیکیورٹی سسٹم'' کا نام دیا گیا۔ اس طرح کا معاہدہ اپریل 1952ء اور دسمبر 1958ء میں بھی ہوا تھا، مگر مسلمانوں نے اسے کمیونسٹوں کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ''دل بہلاوا'' قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ اب 1960ء کے معاہدے کی رو سے مسلم مذہبی کمیونٹی کے ملازمین (امام، خطیب، مدرس، مفتی، موذن اور دیگر خدام) کے لیے تنخواہوں اور مالی وظیفوں اور علاج کے لیے کچھ سہولتوں کا انتظام کیا گیا۔

بوسنیا: تحریکِ آزادی اور جہاد

''یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کے ملازمین کا مالی تحفظ علی الخصوص بیماری، بڑھاپے، قوتِ کار کے فقدان اور وفات کے حالات میں ہمیشہ سے پریشان کن رہا ہے۔ اس مسئلے کو زیادہ پیچیدہ اس بات نے بنا رکھا تھا کہ علماء وائمہ کی گزر اوقات شروع سے صدقات اور چندوں پر ہوتی تھی جو مسلمانوں کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ اوقاف کی آمدنی سے تنخواہیں لینے والے بہت کم افراد ہوتے تھے۔ اب ان لوگوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ اگر کوئی فوت ہوجاتا ہے تو اس کی تھوڑی بہت آمدنی بھی ختم ہوجاتی ہے اور اس کا اہل وعیال غربت اور کسمپرسی کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تک یہی حالات رہے اور اس مشکل کا کوئی علاج نہ نکالا گیا۔ جب معاملہ انتہائی سنگین صورت اختیار کر گیا تو کچھ ذمہ دار لوگوں نے مذہبی ملازمین کے لیے مالی ذرائع کی تلاش شروع کی، جن سے کچھ نہ کچھ اس خدمت کو سرانجام دینے والوں کی مدد کی جاسکے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے کوششیں بسیار کے بعد

دینی مدرسوں کے اساتذہ اور کچھ اماموں کے لیے جزوی طور پر سیکیورٹی کا انتظام کیا گیا، مگر یہ انتظام صرف دس بارہ فیصد ملازمین کی اشک شوئی کرسکا۔ یہی صورتِ حال تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے تاریک سایے چھا گئے اور یہ معمولی سی اصلاح بھی ختم ہوگئی۔ اہل دین غربت اور بے روزگاری سے تنگ کر ان دینی شعائر کو خیر باد کہہ گئے اور دوسری سول اور فوجی ملازمتوں کی طرف نکل گئے۔ ان میں با صلاحیت اور اعلیٰ قابلیت کے مالک افراد بھی تھے۔ دینی مناصب خالی ہو گئے اور پھر ان مناصب کو بعد میں ان لوگوں نے پُر کیا جو ان کے اہل نہ تھے، نہ علمی لحاظ سے اور نہ اخلاق و کردار کے پہلو سے''

مسلمانوں کی تنظیم سخت مشکلات میں مبتلا ہوگئی، جن پر قابو پانا آسان نہ رہا۔ چنانچہ 1952ء کا معاہدہ ڈوبے ہوئے، شکستہ دلوں کے لیے کسی قدر خوشخبری لے کر آیا اور 25 فیصد افراد تک اس کے اثرات پہنچے۔ اس معاہدے کی رو سے ماہانہ تنخواہوں کے علاوہ پنشن کا انتظام بھی کیا گیا۔ مگر اس میں بھی بہت سے نقائص باقی رہ گئے جو 1960ء کے معاہدے میں دور کیے گئے اور تمام ملازمین کے لیے مذکورہ سہولتیں، جن میں تعلیم اور علاج بھی شامل ہے، فراہم کردی گئیں۔

''اسلامی تنظیم'' کے ملازمین کی رائے ہے کہ یہ نیا معاہدہ یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ حکومت نے ''اسلامی تنظیم'' کو اس لیے تسلیم کیا ہے کہ معاشرے کے اندر اس تنظیم کے بڑے اثرات تھے اور ان اثرات کے آگے جھک کر حکومت نے 33 دفعات پر مشتمل وہ عہد نامہ جاری کیا جو اپریل 1960ء میں وجود میں آیا۔

اس وقت مسلمانوں کی ''دینی تنظیم'' کا ڈھانچہ یہ تھا: علاقائی کمیٹی جو علاقے کے مسلمانوں میں سے چیدہ افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ چند علاقائی کمیٹیوں کو ملا کر ''مجلس نیابتِ اسلامی'' تشکیل دی جاتی تھی جس کے تابع ان علاقوں کے اندر پائے جانے والی کمیٹیاں ہوتی تھیں اور پورے صوبے یا جمہوریہ پر مشتمل ایک ''مذہبی کونسل'' ہوتی تھی۔ اس طرح کی مذہبی کونسلیں چار تھیں۔ ایک جمہوریہ بوسنیا میں (اس کے تحت جمہوریہ کروشیا اور جمہوریہ سلووینیا کا بھی مذہبی نظام تھا) دوسری سربیا میں، تیسری مقدونیا میں اور چوتھی ماؤنٹی نیگرو میں۔ ہر مذہبی کونسل کے ساتھ ایک مجلس انتظامیہ ہوتی تھی جس کا صدر ایک عالم دین ہوتا تھا اور پھر پورے یوگوسلاویہ کی سطح پر ایک ''سپریم مذہبی کونسل'' تھی، جس کے آئینی لحاظ سے 35 ارکان ہوتے جن کو مذہبی کونسلیں منتخب کرتی تھیں اور پھر پورے وفاق یوگوسلاویہ کا ایک رئیس العلماء یا مفتی اعظم ہوتا تھا جو اس پورے مذہبی نظام کا سب سے بڑا نگران ہوتا تھا۔ پھر ہر جمہوریہ کا الگ دینی سربراہ ہوتا تھا جسے مفتی کہا جاتا تھا۔ یہ پورا نظام مسلمانوں کی دینی ضروریات پورا کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مثلاً مسجدوں کی امامت و خطابت اور دیکھ بھال مرمت و تزئین وغیرہ۔ قبرستان کا انتظام، نکاح اور طلاق کے معاملے سیکولر کورٹ کے تحت سرانجام پاتے تھے، لیکن مسلمان سیکولر کورٹ میں دولہا اور دلہن کی رجسٹریشن کرانے اور باہمی رضامندی کی شہادت دینے کے بعد مذہبی کمیٹی میں آکر شرعی طریقے سے نکاح کرتے تھے۔

تحریکِ آزادی

یوگوسلاویہ ٹوٹا تو تمام جمہوریاؤں نے اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا کے صدر علی عزت بیگووچ کی حکومت نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ دوسری جمہوریاؤں (کروشیا، سلووینیا، مقدونیہ) کے اعلان آزادی کو تو اقوام متحدہ نے تسلیم کر لیا اور انہیں اپنا ممبر بنا لیا۔ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا کی حکومت کے اعلان کو تسلیم نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ پہلے اپنے ملک میں ریفرنڈم کرائے کہ جمہوریہ کے عوام آزادی و خودمختاری چاہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا یہ امتیازی سلوک سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم علی عزت نے ملک میں ریفرنڈم کرایا۔ جمہوریہ کی سرب آبادی نے خودمختاری کے حق میں رائے دی۔ 16 اپریل 1992ء کو اقوام متحدہ اور دنیا کے ممالک نے اس نئی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ جمہوریہ سربیا کے عیسائی صدر میلوس وک نے بوسنیا کی آزادی کو مسترد کر دیا۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ سابق یوگوسلاویہ کی اصل وارث سرب قوم ہے۔ اس لیے بوسنیا کی "بغاوت" کو ہم قبول نہیں کریں گے۔ جمہوریہ ماؤنٹی نیگرو نے جمہوریہ سربیا کے ساتھ مل کر ایک وفاق بنا لیا اور دونوں نے بوسنیا کے خلاف اس کی خودمختاری ختم کرانے، اسے کامل طور پر اپنے "وفاق" میں مدغم کرنے یا اس کا بیشتر حصہ ہضم کرنے کے لیے اس پر جنگ ٹھوس دی۔ سرب لیڈر شپ کا یہ نظریہ محض ایک دھوکا تھا کہ وہ "وفاق یوگوسلاویہ" کی وارث بن کر اسے کسی نہ کسی حد تک قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا اصل نظریہ اس رزمیہ نظم میں جھلک رہا ہے جو سربیا کے تمام تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی تھی اور اب بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار انتہائی قابل اعتراض اور صلیبی تعصب کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جن میں دین اور قرآن کی توہین کی گئی ہے۔

اس وقت بوسنیا و ہرزیگووینا میں کام کرنے والی سیاسی پارٹیاں یہ تھیں:

1۔ ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی: یہ اسلامی پارٹی ہے اور بوسنیا و ہرزیگووینا کے اسلام پسند نوجوانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے صدر علی عزت بیگووچ ہیں۔

2۔ بشناق مسلم پارٹی: بشناق بوسنیا کے مسلمانوں کا پرانا نسلی نام ہے اور یہ ان کے ساتھ اس قدر چسپاں ہو چکا ہے کہ بشناق سے مراد مسلمان لیے جاتے ہیں۔ جس طرح ملائیشیا میں "ملائی" کا لفظ مسلمان کے ہم معنی ہو چکا ہے۔ اس پارٹی کا صدر عدلی ذوالفقار بادیچ ہے۔ اس پارٹی نے مسلمانوں کو ان مشکل حالات میں فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچایا اور مسلمانوں کی اصل نمائندہ جماعت کے ووٹ کم کیے۔

3۔ سرب ڈیموکریٹک پارٹی: سرب قیادت کی حامی تھی اور بوسنیا و ہرزیگووینا کی خودمختاری کے خلاف تھی، اور "عظیم تر سربیا" کے نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے جمہوریہ سربیا کا مکمل ساتھ دیا۔ اس پارٹی کے ارکان بوسنیا کی "سرب ملیشیا" میں شامل ہوئے اور جمہوریہ سربیا سے اسلحہ اور عسکری تربیت لے کر بوسنیا کے اندر مسلمانوں کی آبادیوں پر شدید حملے کیے۔

ڈاکٹر علی عزت بیگووچ

بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں کے قائد اور آزادی کے بعد پہلے صدر ڈاکٹر علی عزت بیگووچ تھے جو اب انتقال کر چکے ہیں۔ موصوف 1925ء میں بوسنیا کے ایک قصبے میں وہاں کے مشہور مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے اور

پھر بچپن ہی میں اپنے والدین کے ہمراہ سراجیوو میں منتقل ہو گئے۔ 1943ء میں انہوں نے ثانوی تعلیم مکمل کی۔ 1946ء میں معاشیات میں سراجیوو یونیورسٹی سے گریجویشن کر لی۔ موصوف چھ مختلف علوم میں پی ایچ ڈی ہیں۔ 1952ء میں جامعہ ازہر، قاہرہ سے فراغت کی۔ اس سے پہلے بوسنیا کی تین اہم شخصیات ازہر سے فارغ ہو چکی تھیں، جن سے علی عزت بیگووچ متاثر ہوئے۔ ایک خانجی مصنف: ''الجوہر الاسنی فی تراجم علماء و شعراء بوسنہ'' اور دوسرے قاسم دوبروچا، اور تیسرے حسین جوزو، جو بوسنیا کے نہایت ذہین اور صالح نوجوان تھے۔ ان کو پورے یوگوسلاویہ کا رئیس العلماء مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے ''غلاسنیق'' (احیائے نو) کے نام سے ایک مجلہ بھی جاری کر لیا تھا۔ یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ حکومت نے اس کی انقلابی سرگرمیوں کو دیکھ کر اسے رئیس العلماء کے منصب سے برطرف کر دیا۔ یہ تینوں حضرات بوسنیا کی ممتاز اسلامی شخصیتیں شمار ہوتی ہیں۔ دورِ حاضر میں احیائے اسلام کی جو تحریک بوسنیا سے اٹھی، وہ ان عظیم المرتبت مجاہد علماء کی کوششوں کا ثمر ہے۔ جامعہ ازہر کی تعلیم کے دوران یہ حضرات حسن البنا کی تحریک ''اخوان المسلمین'' سے متاثر ہو گئے تھے اور اسی فکر کو انہوں نے بوسنیا کی نئی نسل کے اندر پھیلایا۔ انہوں نے بوسنیا میں ''ینگ مسلم ایسوسی ایشن'' قائم کی جس نے ایک فلاحی اور رفاہی ادارے کا روپ دھارا لیکن اس کا اصل نصب العین احیائے اسلام تھا۔

ڈاکٹر علی عزت بیگووچ نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اپنے مذکورہ شیوخ کے نقشِ قدم پر چل کر کیا اور بوسنیا کے اندر اسلامی فکر کی اشاعت اور اسلام کے احیاء کو زندگی کا مشن بنا لیا اور پھر ایک مومن و مجاہد کی طرح کمیونسٹ آمریت کا مقابلہ کیا۔ 1949ء میں جب ''ینگ مسلم ایسوسی ایشن'' کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تو ڈاکٹر علی عزت کو گرفتار کر لیا گیا۔ موصوف پندرہ سال تک مسلسل جیل میں رہے، جہاں ان کے ایمان میں مزید تازگی، اسلامی فکر میں مزید پختگی اور انقلابی عزائم میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔ دوسری مرتبہ انہیں 1983ء میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ پہلے ان کو چودہ سال قید کی سزا سنائی گئی، جسے کم کر کے بارہ سال اور پھر نو سال کر دیا گیا، مگر وہ پانچ سال اور آٹھ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہو گئے اور جیل سے نکلے تو ''سوشلسٹ ریپبلک یوگوسلاویہ'' زندگی کے آخری سانس لے رہی تھی۔ ڈاکٹر علی عزت بیگ نے اپنے ہم خیال نوجوانوں کے تعاون سے مارچ 1990ء میں ''ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی'' قائم کر لی، جو اسلامی تحریک کا تسلسل ثابت ہوئی اور بالآخر یہی پارٹی بوسنیا و ہرزیگووینا کو سربوں اور ان کے ساتھیوں سے آزادی دلانے میں کامیاب ہوئی۔

ستمبر 1992ء تک بوسنیا و ہرزیگووینا کے مسلمانوں اور جمہوریہ سربیا کے مابین جنگی پوزیشن یہ تھی

1۔ مسلمان ساناج (فدایانِ اسلام):

یہ نو دستوں پر مشتمل تھا۔ ہر دستے میں 200 مجاہدین تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بہت کم تھا۔ جو کچھ تھا، وہ بھی ہلکی نوعیت کا تھا۔

2۔ عرب مجاہدین:

ان کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔ انہوں نے بوسنیا کے مسلمان مجاہدین کو فوجی تربیت دی۔ یہ نوجوان صحیح

جہادی تصورات اور شریعت کے سچے پابند تھے۔

3۔ بوسنیا ہرزیگووینا محاذ:

یہ محاذ ... سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اچھا تربیت یافتہ تھا اور ہلکے پھلکے اسلحے سے دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔

4۔ کروائٹس محاذ نمبر ایک (H.V.O):

یہ کروات ڈیموکریٹک پارٹی کے کارکن تھے۔ ان کی تعداد 70 ہزار تھی۔ ان میں 10 فیصد مسلمان بھی تھے۔ یہ کروشیا کے ساتھ الحاق کرتے تھے۔ کروشیا کی خودمختاری کے علمبردار تھے۔ یہ بوسنیا و ہرزیگووینا کی حکومت کے خلاف تھے۔ اور بوسنیا و ہرزیگووینا میں کروائس کے علاقوں کی علیحدگی چاہتے تھے۔

5۔ کروائٹس محاذ نمبر 2 (H.O.S):

یہ تین ہزار فوجیوں پر مشتمل تھے۔ یہ بوسنیا و ہرزیگووینا کی تقسیم کے خلاف اور آزادی و خودمختاری کے حق میں تھے۔ اس میں مسلمانوں کا تناسب بھی زیادہ تھا۔

6۔ سرب فورسز:

80 ہزار سپاہی، جن کا تعلق وفاقی فوج سے تھا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار سرب ملیشیا کے سپاہی، 400 ٹینک، 600 بکتر بند گاڑیاں، سابق یوگوسلاویہ کا پورا توپ خانہ، پوری فضائیہ، بھاری جنگی اسلحہ، گولہ بارود اور دیگر جنگی سازوسامان۔

بوسنیائی مسلمانوں کی معاشرت

شہر سراجیوو ایک کشادہ وادی کے دامن میں دریائے درنیا کے کنارے واقع ہے۔ اس پر رومن حکمران کوس لمن الملک ہونے کے دعوے کرتے رہے۔ پھر سلافی نسل کے بادشاہ آکر براجمان ہو گئے۔ 1443ء میں ترک مسلمان آ گئے اور یہ شہر 1878ء تک ترکوں کی عدل گستری اور اسلام کی خوشبو سے چار صدیوں تک مہکتا رہا۔ پھر اس کا دور غلامی شروع ہو گیا اور اب تک ایک مرتبہ پھر یہ آزاد فضا میں اسلام کے زیر سایہ دوبارہ واپس آ جانے کے لیے مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔

سراجیوو کی مشہور ترین عمارت قصر "سرائے" ہے۔ یعنی ترکی زبان میں "مرکز حکومت"۔ پچھلی دونوں عالمی جنگوں میں یہ شہر ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہا مگر آج یہ ماڈرن کیپٹل ہے اور اس کی آبادی پانچ لاکھ سے زائد ہے۔

سراجیوو سارے یورپ میں اسلامی طرز تعمیر کے لحاظ سے شہرت رکھتا ہے۔ اس میں چاروں طرف مسجدیں اور قدیم تاریخی درگاہیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک جامع غازی خسرو بیگ ہے۔ نہ صرف یوگوسلاویہ، بلکہ پورے یورپ میں اس کا چرچا ہے۔ اس کا مینار 47 میٹر بلند ہے۔ دوسری جامع جلر خین ہے جو بوسنیا و ہرزیگووینا کی قدیم

ترین جامع ہے۔ جامع حاجی حسانو اور جامع علی باشا سولہویں صدی عیسوی کے اندر وجود میں آنے والے اسلامی طرز تعمیر کا نادر نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ جامع فرہاد بک بھی قابل دید جگہ ہے۔

اور آگے بڑھیں تو جامع مثیغینا آتی ہے جو 1528ء میں تعمیر کی گئی اور 1700ء میں اسے دوبارہ مرمت کیا گیا۔ اس کی دو دیواروں پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جامع سراج مایا بھی 1528ء میں بنائی گئی تھی۔ اس کو 1892ء میں دوبارہ مرمت کیا گیا۔ جامع سفید بھی بہترین تاریخی مقام ہے۔ جامعۃ المغربیۃ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کے ستون مخروطی شکل کے ہیں۔ آج مجموعی طور پر سراجیوو میں ستر مسجدیں ہیں جہاں خدائے واحد کی عبادت ہوتی ہے اور کتاب اللہ کی روح پرور صدائیں گونجتی ہیں۔

سراجیوو کی سیر کرنے والے کو اسلامی طرز کے قدیم بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں ایک بازار صفارین ہے۔ یہ سراجیوو کے پرہجوم بازاروں میں سے ایک ہے۔ کئی بار یہ بازار آتش زدگی کا شکار ہوا۔ آخری بار 1852ء میں اس میں آگ لگی۔ شعلے بجھ گئے تھے مگر اب یہ سیاحوں کے لیے مرکزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ سب سے بڑا بازار باش چارسیا ہے۔ یہ شہر کا تجارتی اور گھریلو صنعتوں کا مرکز کہلاتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں یہ بازار قائم کیا گیا جب کہ یہاں اسلام کی حکمرانی عروج پر تھی اور پھر بار بار اس کی تجدید و تعمیر کی گئی۔ قدیم دور سے چلی آنے والی روایتی دستکاری کی دکانیں یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس بازار سے گزرنے والا دیکھے گا کہ بوڑھے مرد پرانے طرز کا روایتی لباس پہنے ظروف سازی اور دستی صنعتکاری میں مگن ہیں۔ اس عوامی بازار سے گزرتے ہوئے آپ کو گوشت بھننے کی خوشبو اپنی طرف کھینچ رہی ہوگی۔ دراصل یہاں چھوٹے چھوٹے ریستوران بنے ہوئے ہیں۔ قدامت کی جھلک ان کے در و دیوار سے عیاں ہے۔ عثمانی دور کے رواج کے مطابق ان میں بیٹھنے کے لیے لکڑی کے تخت پوش بچھے ہوں گے۔

کسی مسلمان یا عرب زائر کو سراجیو کا حال سن کر بڑی حیرت ہوگی۔ تعلیم و ثقافت کے لحاظ سے یہاں یورپی ذوق عام ہے مگر جب صبح ہوتی ہے تو چاروں طرف سے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اذان کی آواز کانوں میں گونج جاتی ہے۔ ہاں یہ یورپ تو ہے مگر اسلام کا مرکز چار صدیوں تک اسلام کی راجدھانی بنے رہنے کے بعد اب پھر یہ ماضی کی تجدید کر رہا ہے اور یہی تجدید یورپ کے صلیب پرستوں کو ناگوار گزر رہی ہے اور وہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلے ہوئے ہیں۔

جمعے کے روز جب مسجد میں اذان ہو جاتی ہے تو لوگ مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں۔ خطیب سے پہلے وہ مسجد میں قرآن کریم کی تلاوت یا ذکر اذکار کرتے ہیں۔ خطیب منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتا ہے۔ یہ خطبہ سرب زبان میں ہوتا ہے جو پورے یوگوسلاویہ کی سب سے اہم زبان ہے۔ عام لوگ عربی زبان نہیں سمجھتے۔ البتہ خطبے کے اندر عربی الفاظ بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں۔ مسجد نمازیوں سے بھر جاتی ہے۔ نماز کے بعد خطیب حاضرین کو حدیث سناتا ہے یا کوئی کلمہ نصیحت بیان کرتا ہے۔ مسجد کے دروازے پر مسلمانوں کی تنظیم رابطہ اسلامیہ کی طرف سے ایک صندوقچی رکھی جاتی ہے جس میں لوگ اپنا چندہ ڈالتے رہتے ہیں۔ ان چندوں سے جمع ہونے والی رقوم مسجد کی ترقی کرنے کے

علاوہ فقراء و مساکین کی امداد، عبادت گاہوں کی تعمیر، مدرسوں کے قیام اور دیگر فلاحی کاموں پر صرف کی جاتی ہیں۔
زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم بھی اجتماعی طور پر جمع اور خرچ کی جاتی ہیں۔

رابطہ اسلامیہ نے سراجیوو میں ایک سوشل کلب بھی قائم کر رکھا ہے۔ مسلمان فراغت کے وقت میں وہاں اکٹھے ہوتے ہیں اور وہاں مشاہیر قراء باری باری قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں یا نوجوان لیکچر دیتے ہیں اور اپنے دینی و معاشرتی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ دینی تقریبات بھی اسی کلب میں منعقد کی جاتی ہیں۔ گویا یہ کلب ایک دینی اور ثقافتی رہنمائی کا مرکز ہے جہاں مقامی مسلمان جمع ہو کر اوقات فراغت کا صحیح استعمال کر لیتے ہیں۔

رمضان المبارک میں پورے یوگوسلاویہ میں عام طور پر بوسنیا و ہرزیگووینا میں خاص طور پر مسلم معاشرے پر پوری طرح دینی چھاپ لگ جاتی ہے۔ گھروں میں اور مسجدوں میں ذکر کرنے والوں اور عبادت گزاروں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ مسجدوں میں صبح و شام دینی موضوعات پر تقریریں ہوتی رہتی ہیں اور یہاں کا خصوصی رواج یہ ہے کہ روزانہ نماز عصر کے بعد مسجدوں میں حسن قرأت کا مقابلہ منعقد ہوتا ہے۔ کچھ مسجدوں میں یہ مقابلہ نماز فجر کے بعد ہوتا ہے جس میں نوعمر اور نوجوان لڑکے حصہ لیتے ہیں۔ رمضان میں اجتماعی افطاری ہوتی ہے۔ خوشحال لوگ خصوصی طور پر اس میں حصہ لیتے ہیں۔ افطار پارٹیوں میں طرح طرح کے کھانے پیش کیے جاتے ہیں اور بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔
عید الفطر بھی مسلمانوں کی شکوہ و قوت کے اظہار کا دن ہوتا ہے۔ تمام لوگ نئے لباس زیب تن کر کے نماز عید کے لیے مختلف مساجد میں اکٹھے ہوتے ہیں اور نماز کے بعد باہمی ملاقاتوں اور مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔
اسی طرح عید الاضحیٰ میں جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے اور گوشت مستحقین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم رابطہ اسلامیہ کے ذریعے زیادہ تر سراجیوو کے ریلی جس (Religious) انسٹی ٹیوٹ میں خرچ کی جاتی ہے۔ حکومت نے جب سے اوقاف کی املاک کو اپنے قبضے میں لیا ہے مسلمان مجبور ہو گئے ہیں کہ مساجد و مدارس اور مساکین کی امداد زکوٰۃ فنڈ سے کریں جو رابطہ اسلامیہ کے پاس جمع ہوتا ہے۔

حج کا مسئلہ عرصہ دراز تک کھٹائی میں پڑا رہا۔ 1974ء کی دستوری ترمیم کے بعد یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کو حج کی سہولت ملی ہے۔ اس سے پہلے بہت کم تعداد میں لوگ مختلف حیلوں بہانوں سے حج کا فریضہ ادا کرتے رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ایک حج مشن بھی بھیجا جاتا ہے، جس کا بظاہر کام حجاج کی خدمت ہے، لیکن واپسی پر اس مشن کے ارکان حکومت کو رپورٹ پیش کرتے ہیں کہ کیا کیا حالات پیش آئے۔

مسلمان اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا بہت شوق رکھتے ہیں، مگر یہ تعلیم انہیں ہر جگہ میسر نہیں ہے۔ دینی تعلیم کا انتظام چند شہروں میں پایا جاتا ہے۔ یوگوسلاویہ کے تعلقات مصر، عراق اور شام کے ساتھ دوسرے مسلم ممالک کی نسبت بہتر رہے ہیں، اس لیے نوجوانوں کی ایک ایسی تعداد مل جاتی ہے جو ازہر، بغداد یونیورسٹی اور دمشق یونیورسٹی سے پڑھ کر آئے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ بوسنیا کے مسلمان دین کا صاف اور سادہ تصور رکھتے ہیں۔ دوسرے مسلم ممالک میں جو بدعات و خرافات رائج ہیں، وہ یہاں نہیں ہیں۔ قبر پرستی تو ان کے اندر نہیں ہے، البتہ ایصال ثواب اور مردوں کے حق میں دعائے مغفرت کی روایت عام ہے۔ قبریں مساجد سے ملحق صحن میں بنائی جاتی ہیں اور

ان کی تعمیر کا وہی طرز ہے جو ترکی میں نظر آتا ہے۔ قبر زمین سے اوپر اٹھی ہوئی ہوگی اور سرہانے کی طرف قبر کے اوپر لال رنگ کی ترکی ٹوپی یا پیچ دار عمامہ رکھا ہوا ہوگا۔

بوسنیا و ہرزیگووینا اور سنجق و مقدونیہ کے مسلمان تو بالعموم بدعات سے پاک ہیں۔ البتہ کوسوو (جو ہور یہ سربیا کی مسلم آبادی) میں صوفیاء کا ایک گروہ پایا جاتا ہے، جس نے بعض ایسے طریقے اختیار کر رکھے ہیں جو خرافات کہے جاسکتے ہیں۔ مسلمانوں کے ضعف و انحطاط کے دور میں یہ صوفیاء کے فرقے باہر سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ ''درویشوں'' کے نام سے بھی ایک گروہ کوسوو میں پایا جاتا ہے جو دین سے بالکل بیگانہ ہے۔ اور یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کے اندر دین کے چہرے کو مسخ کرتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے شراب نوشی حلال کر رکھی ہے۔ مال بٹورنا ان کا اصل مطمح نظر ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اصلاً مسلمان نہیں ہیں، بلکہ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کو دین سے دور رکھنے کے لیے یہ گروہ یہاں بھیج رکھے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ عام مسلمان ان گروہوں سے نفرت کرتے ہیں، بلکہ بعض ذمہ دار علماء اس طرح کے بگڑے ہوئے لوگوں کی بیخ کنی کرتے رہتے ہیں۔

سب سے پر رونق اور جوش و جذبہ سے لبریز تقریب کسی نئی مسجد کا افتتاح ہوتی ہے۔ جب مسجد تعمیر ہو جاتی ہے تو شہر میں یا قصبات و دیہات میں اس کے افتتاح کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ رئیس العلماء کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ افتتاح کرے یا اس کا کوئی نمائندہ آ جائے۔ ملک کی دیگر نامور اسلامی شخصیتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، بلکہ آرتھوڈکس اور کیتھولک چرچ کے نمائندوں کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ یہ تمام مدعوئین اور عام حاضرین مسجد کے قریب ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں اور پھر ایک جلوس کی شکل میں مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں۔ جلوس کے آگے آگے چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں ہوتی ہیں جنہوں نے ہاتھوں میں سبز پرچم اٹھا رکھے ہوتے ہیں اور خود انہوں نے زرق برق لباس پہن رکھے ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے رئیس العلماء اور دیگر مہمان ہوتے ہیں اور ان سب کے پیچھے عام لوگ رواں دواں چل رہے ہوتے ہیں۔ یہ جلوس پانچ ہزار افراد سے لے کر بیس ہزار افراد تک ہوتا ہے۔ سب لوگ نئے کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ خواتین بھی ایک طرف الگ تھلگ جلوس میں شریک ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنا روایتی ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا ہوتا ہے جو پورے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے۔ بالعموم بوسنیا کے دیہاتوں میں خواتین ایسا لباس پہنتی ہیں۔ ان کے چہرے اور ہاتھ ننگے ہوتے ہیں۔ اسی کو وہ اپنا پردہ تصور کرتی ہیں۔

زیر افتتاح مسجد کے مناروں پر سبز جھنڈے لہراتے ہیں۔ جب جلوس مسجد میں پہنچ جاتا ہے تو رئیس العلماء اور مہمان سٹیج پر بیٹھ جاتے ہیں اور تقاریر شروع ہو جاتی ہیں جن میں مسجد کی اہمیت اور اسلام کی فضیلت اور احکام اور سیرت و سوانح بیان کیے جاتے ہیں۔ عیسائی نمائندے بھی تقریریں کرتے ہیں اور اخوت و بھائی چارے کی روح برقرار رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ اس اثناء میں نماز کا وقت آنے پر اذان دی جاتی ہے اور نماز قائم کر دی جاتی ہے اور تمام ہجوم نماز میں شریک ہو جاتا ہے۔ نماز کے بعد کھانا ہوتا ہے۔ یہ دن گویا ایک میلہ ہوتا ہے جو رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ بازاروں میں خریداری ہوتی ہے اور مسرت و شادمانی کا بھرپور سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

مسجدوں کا ذکر ہوا ہے تو یہ بھی بتا دینا مناسب ہوگا کہ آج کل بوسنیا میں مساجد کی تعمیر کا رواج بڑھتا جا

رہا ہے۔ان نوں نئی مساجد کی تعمیر کا سالانہ تناسب 40 مساجد ہیں ۔صرف سراجیو شہر میں 70 مسجدیں ہیں ۔ پہلے تو لوگ شہروں میں مسجد بناتے رہے جہاں اب ضرورت سے زیادہ ہی تعمیر ہوگئی ہیں ۔اب دور دراز دیہات میں مسجدیں بنانے کا رجحان پیدا ہوگیا ہے ۔۔ تین چوتھائی نئی مسجدیں دیہات ہی میں بن رہی ہیں ۔ان کے مصارف مسلمان اپنے چندوں سے پورے کرتے ہیں ۔تعمیر مساجد کے ساتھ نوجوان نسل کا رخ بھی علی الخصوص دیہات میں مسجدوں کی طرف روز بروز بڑھ رہا ہے جہاں ان کو ناظرہ وحفظ قرآن کے ساتھ دینی و اخلاقی مسائل کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

شادی بیاہ کا طریقہ بھی یہاں کے مسلمانوں کے اندر اسی طرح کا ہے جس طرح دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے اندر ہے ۔البتہ یورپ کی فضا اور کمیونسٹ حکومت کے قوانین کی وجہ سے دو باتیں نمایاں ہیں ۔ایک یہ کہ مسلمان نوجوان شادی کے لیے خود کسی لڑکی کا انتخاب کرتا ہے اور شادی سے پہلے اس سے متعارف ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ یوگوسلاویہ کے قانون کے مطابق اسے سرکاری دفتر میں جا کر اپنی شادی رجسٹر کروانی ہوتی ہے ۔قانون کی رو سے تو یہ رجسٹریشن اقرار شادی کے لیے کافی ہے ،مگر مسلمان نوجوان شادی کے مراسم ادا کرتا ہے ۔دولہا ،دلہن اور ان کے رشتہ دار مولوی صاحب کے پاس "اسلامی مذہبی فرقے" کے دفتر میں جاتے ہیں اور وہاں باقاعدہ شریعت کے مطابق نکاح پڑھایا جاتا ہے ۔اس کے بعد لڑکے کی طرف سے ولیمہ کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں فریقین کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب مدعو کیے جاتے ہیں ۔اسلامی اور مغربی اثرات کا نتیجہ ہے کہ ولیمہ کی تقریب میں پہلے قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے ،پھر نوجوان عوامی رقص پیش کرتے ہیں اور شادی کے مروجہ گانے گاتے ہیں ۔یوگوسلاویہ کے مسلمان معاشرے میں مہر اور جہیز کے مسائل نہیں پائے جاتے ۔اتنا کافی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے رشتہ دار دونوں کی رضامندی اور باہم تسلی پر مطمئن ہو جائیں ۔مہر صرف ٹوکن کی شکل میں طے کیا جاتا ہے ،جسے یہاں "شرعی مہر" کہا جاتا ہے۔

یوگوسلاویہ (بوسنیا اس کا ایک حصہ) میں مسلم گھرانہ اس وقت مرحلہ آزمائش سے گزر رہا ہے ۔کچھ خاندان تو دینی تعلیمات کے سائے میں امن واستقرار سے بہرہ یاب ہیں ،جب کہ کچھ خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں ۔اس کا سبب یہ ہے کہ دینی تبلیغی و تربیت اور یورپ کی مادی تہذیب کی کشش کے درمیان ایک مدت سے کشمکش چلی آرہی ہے ۔اس کشمکش میں کچھ خاندان تو ثابت قدمی دکھا رہے ہیں اور کچھ شکست کھا جاتے ہیں اور دینی تعلیم کا باریک سا دھاگہ بھی ٹوٹ جاتا ہے ۔چنانچہ بعض ایسے خاندان نظر آئیں گے جن میں بزرگوں اور نوجوانوں کے مابین تصادم کے حالات پیدا ہو چکے ہیں۔

مسلم نوجوان دوسرے غیر مسلم نوجوانوں کے راستے پر چل پڑے ہیں ۔شراب نوشی ،عریاں و نیم لباس اور مخلوط مجالس میں شرکت کے لحاظ سے ان میں اور غیروں میں کوئی فرق نہیں ملے گا ۔اس تہذیبی توڑ پھوڑ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قدیم نسل اور جدید نسل کے مابین کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں ۔جدید نسل ترقی چاہتی ہے مگر قدیم نسل کے کچھ حضرات جو پرانی عادات و روایات کے حامل ہیں ترقی و تبدیلی کو ہر پہلو سے مسترد کرتے ہیں اور اپنی سابقہ

روش سے سرموسر کنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ۔اس سوچ نے دونوں کے مابین بُعد پیدا کردیا ۔

البتہ اب یوگوسلاویہ کے اندر اسلامی تحریک اٹھ چکی ہے اور نوجوان نسل کے اندر اس کے اثرات روز افزوں ہیں اور یہ تحریک نئی نسل کو ذہنی و فکری الجھنوں اور عمل و کردار کی خرابیوں سے نکالنے میں کامیاب ہو رہی ہے ۔اس سلسلے میں بوسنیا کے اسلامی مجلے ''تاسنیق'' میں ایک بوسنوی محقق نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''جس مرحلے میں ہم اپنی دعوت لے کر اٹھے، یہ تعمیر افکار اور تصحیح تصورات کا مرحلہ ہے۔ یہ حقیقی اسلام کی تلاش کا مرحلہ ہے۔ نئی نسل مذہبی منافقت اور مذہب کے جھوٹے مظاہر پر ناک بھوں چڑھا رہی ہے۔ مسلم معاشرے کے مختلف طبقات میں جو خوفناک جہالت و پسماندگی پھیلی ہوئی ہے اس سے وہ نالاں ہے۔ اسلام کی نمائندگی اسے چند بے جان مراسم کے اندر ملتی ہے جن کی اسلام کے اندر کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ نسل اللہ تعالیٰ کے بے وسیلے کی تلاش میں قبروں اور روضوں کی زیارت پسند نہیں کرتی۔ اس کو اس بات سے بھی بیر ہے کہ اصلاح کے لیے امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ نسل نو کی نظر میں اسلام ان کھوکھلے مظاہر اور بے اصل مراسم کی وجہ سے اپنا تقدس اور احترام کھو چکا ہے، لہٰذا یہ نسل حقیقی اسلام کی خواہاں اور داعی ہے۔ وہ اسلام جس کی پشت پر علم و معرفت ہو اور وہ بدلتی ہوئی انسانی زندگی کی رہنمائی کر سکتا ہو۔''

عام مسلمان نوجوان جدید تعلیم کی طرف تیزی سے لپک رہا ہے۔ وہ یونیورسٹیوں کے تمام شعبوں میں تخصص حاصل کرنا چاہتا ہے، خواہ وہ نظری علوم ہوں یا سائنسی علوم۔ پرشتینا میں جو کوسوو کا صدر مقام ہے اور جہاں دس لاکھ کے قریب مسلمان رہتے ہیں ایک عصری یونیورسٹی قائم کی گئی ہے جس میں 1971ء میں مسلمان طلبہ اور طالبات کی تعداد 13 ہزار تھی۔ کوسووہی میں پرائمری، مڈل اور ثانوی سکول بھی جاری کیے گئے ہیں، جن میں 38 ہزار لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ عصری سکولوں میں تعلیمی نصاب لادینیت پر مبنی ہے۔

بوسنیا کی مسلم خاتون دونوں طرح کے حالات سے گزر رہی ہے۔ ایسی مسلم خواتین بھی ہیں جو حقیقی معنوں میں گھر گرہستن ہیں اور بچوں کی اسلامی تربیت اور خاوند کی خوشنودی کو شعار بنائے ہوئے ہیں۔ اور ایسی خواتین بھی ملتی ہیں جو باہر کام کرتی ہیں۔ وہ ڈاکٹر، ٹیچر، اکاؤنٹنٹ، نرسنگ کے پیشے سے وابستہ ہیں یا فیکٹری کی مزدور اور دفتر کی عہدیدار ہیں۔ بلکہ سیاسی میدان میں بھی انہوں نے پیش رفت کی ہے۔ پارلیمنٹ کی ممبر اور بیرونی ملکوں میں سفیر کے عہدے تک پہنچی ہیں۔ بوسنیا میں وزیر صحت بھی ایک مسلمان خاتون رہی ہے۔ عورتوں کا ایک گروہ ایسا بھی بروئے کار آ چکا ہے جو اسلام کی تبلیغ کرتا ہے، دینی اجتماعات اور مسلمانوں کے ثقافتی مراکز میں یہ خواتین تقریریں کرتی ہیں، ان کے پاس اونچی اونچی علمی ڈگریاں ہیں۔

مسلمانوں کے شہروں میں آپ کو دور سے جو خاص علامت نظر آئے گی وہ مسجدوں کے اونچے اونچے مینار ہیں، جو آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہوتے ہیں اور مسجدوں کے گول گول گنبد جو جھرمٹ کی شکل اختیار کیے ہوئے

ہیں۔ عام گھروں کا طرزِ تعمیر تو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یکساں ہے۔ البتہ مسلمان شہروں کے اندر ''اسلامی محلے'' ملتے ہیں۔ ان میں مسجدیں ملیں گی۔ ان کی گلیاں تنگ ہوں گی اور عمارتیں اس طرز کی جو مشرق وسطیٰ کے لوگوں کا ذوق ہے۔ ان شہروں میں روایتی بازار بھی قائم ہیں، مثلاً لوہاروں کا بازار، تانبے کے برتن بنانے والوں کا بازار، مٹھائی کی دکانیں، عوامی ریستوران اور چائے خانے۔ جدید ذوق کے مسلمان ایسے محلوں کو چھوڑ کر نئی آبادیوں میں اپنا مسکن بنانا پسند کرتے ہیں۔

دیہات میں مسلمانوں کی بود و باش کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہمسائے میں مل کر رہنا پسند کرتے ہیں تا کہ انہیں اپنی اسلامی روایات کا تحفظ مل سکے۔ دیہاتوں میں عیسائیوں کی آبادیوں میں ''ہمسائیگی'' کا یہ رواج نہیں ہے۔ دیہاتی مکان زیادہ تر ایک منزل کے ہوتے ہیں۔ دو اور تین منزلوں کے مکانات خال خال ہوتے ہیں۔ ہر منزل میں بالکونی ہوتی ہے جس میں اوقات فرصت میں بچے اور عورتیں بیٹھ کر ہلکا پھلکا کام کر لیتے ہیں۔

کوسوو میں گھروں کی اسلامی طرز کی تعمیر پر بڑی توجہ دی جاتی ہے۔ ان کے گھروں میں بھی منارے اور برج بنے ہوتے ہیں، جنہیں وہ ''کول'' کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں کا ایک خصوصی امتیاز یہ بھی ہے کہ گھر میں عورتوں کے بیٹھنے کے لیے ایک مخصوص جگہ ہوگی۔ یہ جگہ مکان کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور پائیں باغ کے اندر بھی۔ یہاں عورتیں پردہ داری میں بیٹھ کر تفریح کا وقت گزارتی ہیں۔ دیہات کے مرد گھر میں فارغ اوقات میں نہیں بیٹھتے۔ وہ بستی کے قہوہ خانوں میں چلے جاتے ہیں۔

شہر ہوں یا دیہات، مسلمانوں کے مکان کا ایک یہ وصف بھی چلا آ رہا ہے کہ ان کے ارد گرد اونچی پردہ دیوار ہوگی جو پتھر سے اٹھائی گئی ہوگی یا اینٹوں سے۔ درمیان میں مین گیٹ ہوگا۔ یہ طرز انہیں عثمانی دور میں اسلامی تہذیب کی بدولت ملا ہے۔ جدید مکانات میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے ہاں مذہبی گیتوں اور ترانوں کا بھی رواج ہے۔ یہ ترانے اور نظمیں مذہبی تہواروں مثلاً میلاد النبی ﷺ اور ہجرت وغیرہ کی تقریبات میں پڑھی جاتی ہیں۔ دعائیں اور مناجاتیں بھی پر تاثیر لحن کے ذریعے پڑھی جاتی ہیں جو دلوں میں ایمان کی تازگی پیدا کرتی ہیں اور عام سامعین کو وجد میں لے آتی ہیں۔

چیچنیا میں اسلام اور مسلمان

فلسطین، کشمیر، فلپائن، صومالیہ، بوسنیا و ہرزیگووینا اور چیچنیا، عراق، افغانستان اور پاکستان غرضیکہ عالم اسلام کے بیشتر علاقوں میں مسلمانوں کا خون، جیسے کسی صلیبی جنگ میں، بہایا جا رہا ہے۔ موجودہ دفاعی جنگوں کی احیائی تحریکوں کی بجائے آزادی کی جنگیں کہنا چاہیے۔ 1991ء میں سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد

چیچنیا کو روس اپنے قبضہ اقتدار میں رکھنے کے لیے اپنی پوری عسکری قوت استعمال کر رہا ہے یہاں ''احیائی تحریکوں'' کے اس سلسلے کے تحت اسلامی جمہوریہ چیچنیا کے امن پسند مسلم عوام کی تحریک آزادی کی بجائے اس عجیب وغریب ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے عام حالات کا جائزہ لیا جائے گا، اس لیے کہ چیچنیا کے بارے میں اہل پاکستان کو معلومات کم حاصل ہیں۔

چیچنیا قفقاز کے شمال مشرق میں واقع ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ آزادی کے اعلان سے قبل چیچنیا اور انگوشیا ایک ہی ملک تھے لیکن روس نے سازش کے تحت انگوشیا کو الگ کر دیا، تاکہ چیچنیا کی افرادی قوت کم ہو جائے اور یہاں کے مجاہدین پر قابو پانا آسان ہو جائے۔ اس کا رقبہ تیرہ ہزار تین سو مربع کلومیٹر ہے۔ 1991ء کے اعداد وشمار کے مطابق یہاں کی کل آبادی پندرہ لاکھ سے زیادہ تھی، جس میں دس لاکھ مسلمان، تین لاکھ روسی، ایک لاکھ انگوشی، 41 ہزار آرمینی، 3 ہزار داغستانی، 51 ہزار تاتاری، 4 ہزار ترک اور 5 ہزار یہودی آباد تھے۔ اس کے شمال مشرق میں داغستان، شمال مغرب میں اوستیدیا اور انگوشیا اور جنوب میں جارجیا واقع ہے۔ دینی اعتبار سے یہاں کے باشندے حنفی مسلک کے ماننے والے راسخ العقیدہ سُنّی مسلمان ہیں۔ کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد روس نے دیگر مسلم علاقوں کی طرح یہاں بھی مسلمانوں کی عملی زندگی سے دین اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی عبادت وشعائر کی ادائیگی، اسلامی روایات کی پابندی، عربی زبان، یہاں تک کہ عربی حروف ابجد کو بھی قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ ان تمام پابندیوں کے باوجود یہاں کے مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ دین اسلام سے اپنا رشتہ قائم رکھا، بلکہ خفیہ طور پر نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا کہ ان کے ذہنوں میں دینِ اسلام کی عظمت اور اسلامی تہذیب کی بالادستی رچ بس گئی، اور یہ ان مخلص اور دور اندیش مسلمان بزرگوں ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ نئی نسل الحاد وگمراہی اور اباحیت زدہ تہذیب میں ضم ہو جانے سے محفوظ رہ گئی۔

اسلام کا ورود

چیچنیا تک اسلام کی دعوت پہلی صدی ہجری کے دوران ہی پہنچ گئی تھی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اس ملک پر اسلامی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ 18 ہجری میں آذربائیجان کو فتح کرنے کے لیے عتبہ بن ابی فرقد رضی اللہ عنہ اور بکیر بن عبداللہ دونوں کی قیادت میں الگ الگ فوجیں روانہ ہوئیں۔ ایک لشکر حلوان سے داخل ہوا، جب کہ دوسرا لشکر موصل سے داخل ہوا اور یہ دونوں فوجیں خلیفہ ثانی کی ہدایت کے مطابق اپنی منزلِ مقصود کی طرف آگے بڑھیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آذربائیجان کو فتح کر کے اسلامی مملکت کے دائرے میں داخل کرانے میں کامیاب ہوئیں۔

اس کے بعد خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سراقہ بن عمرؓ کو ایک عظیم اسلامی لشکر کے ساتھ باب الابواب ''دربند'' کی مہم پر روانہ کیا اور اللہ کے فضل سے یہ علاقہ بھی فتح کر لیا گیا۔ پھر سراقہ بن عمرؓ نے گردونواح کے علاقے فتح کرنے کے لیے اپنی ٹکڑیاں روانہ کیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شروان، داغستان اور آس پاس کے ملکوں پر فتح نصیب کی، اور یہ تمام ممالک اسلامی خلافت کے دائرے میں داخل ہو گئے اور اس کے بعد یہ فوجیں چیچنیا کی طرف بڑھیں اور

سے 19 ہجری / 640ء میں فتح کرلیا (یعنی سندھ و ہند سے بھی پہلے)

اپنی روایت کے مطابق مسلم فاتحین نے اس علاقے میں بھی علماء و مبلغین کی ایک جماعت چھوڑ دی، تاکہ نومسلموں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات اور قرآن کی تلاوت کرنا سکھائیں اور وہاں کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دیں، مساجد و مدارس قائم کریں تاکہ اس ملک میں اسلامی تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلے۔

تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفانؓ (23 تا 35ھ) کے عہد میں اللہ تعالیٰ نے سراقہ بن عمرو کی قیادت میں مسلمانوں کو آرمینیا کے شہر اران اور تفلیس پر فتح نصیب کی۔ پھر اس مسلم کمانڈر سراقہ نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے قرب و جوار کے ممالک کو بھی فتح کرلیا اور فتوحات کا یہ سلسلہ مغرب سے ساحلی علاقوں میں بحر قزوین تک پہنچ گیا۔ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد یہاں کے لوگ مرتد ہونے لگے تو حضرت عثمان غنیؓ نے شام کے گورنر حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو ان کی سرکوبی کی ذمہ داری سپرد کی تو حضرت معاویہؓ نے حبیب بن مسلم کی قیادت میں ایک عظیم لشکر کو ان ممالک کی طرف روانہ کیا، تاکہ وہ ان مرتدین کا قلع قمع کرکے یہاں اسلام کی بالادستی قائم کریں۔ تفلیس میں اسلامی فوج نے داخل ہوتے ہی وہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ شفقت، محبت اور نرمی کا برتاؤ کیا۔ ان کی ہر طرح سے دل جوئی اور خبر گیری کی اور اپنے حسن سلوک سے یہاں کے عوام کا دل جیت لیا اور یہاں کی اکثریت برضا و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔

حضرت علی بن ابی طالب کے دور خلافت میں سعید بن ساریہ خزاعی اور اشعب بن قیس کندی بالترتیب آذربائیجان کے گورنر مقرر ہوئے۔ حضرت علیؓ نے سوچا کہ آذربائیجان کو صرف فتح کر لینے ہی میں وہاں اسلام کی جڑیں مضبوط نہیں ہوں گی۔ اگر فتح کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے، تو کچھ دنوں کے بعد ارتداد کا سلسلہ پھر ابھر سکتا ہے۔ لہٰذا یہ مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت کو مستقلاً آباد کیا جائے جو نومسلموں کی دینی تربیت کے علاوہ تبلیغ و دعوت کا فریضہ بھی انجام دے۔ چنانچہ عرب مسلمان آذربائیجان میں آباد ہو گئے۔ وہاں انہوں نے مسجدیں تعمیر کیں۔ مصر اور شام سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ہجرت کرکے ان علاقوں میں آباد ہوگئی اور پھر ان لوگوں نے یہاں بہتر انداز میں اسلام کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ آذربائیجان کے بعد قفقاز کے بیشتر علاقے بھی اس حکومت کے دائرے میں آچکے تھے۔ یہ جارجیا، آرمینیا اور چیچنیا کے علاقے تھے۔

اموی دور حکومت میں ولید بن عبدالملک (86-90ھ) نے اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھاتے ہوئے وسط ایشیا اور قفقاز کے علاقے کے باقی ماندہ ممالک کو فتح کرنے کے لیے فوجوں کو روانہ کیا۔ اسلامی فوجوں کا ان ممالک کے باشندوں کے ساتھ سلوک نہایت مشفقانہ اور مساویانہ رہا، جس کی بدولت یہاں کے باشندے اسلام سے قریب ہونے لگے، بلکہ بعض معتدل پسند غیر متعصب عیسائی خاندانوں نے بھی بازنطینی حکمرانوں کے بالمقابل مسلمانوں کا ساتھ دیا۔

خلافت عباسیہ (132-656ھ) نے بھی بلاد قفقاز میں اسلام کی نشر و اشاعت کی طرف پوری توجہ دی۔ علماء اور مبلغین کی جماعتوں کو ان ممالک میں سکونت اختیار کرنے کی غرض سے بھیجا، تاکہ وہ یہاں کے مقامی

باشندوں کو اسلام کی تعلیمات دیں اور اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ چیچنیا کے باشندوں کی اکثریت بھی اپنا پرانا مذہب ترک کرتے ہوئے دین اسلام میں داخل ہو گئی۔ چیچنیا اموی دورِ حکومت کے اخیر میں اسلامی حکومت کا تابع ہو چکا تھا۔ عباسی دور میں یہاں مسلمانوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور یہ اسلامی مملکت کا ایک اہم ملک بن گیا۔

عباسی حکومت جب زوال وضعف کا شکار ہوئی تو قفقاز کے ممالک نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تفلیس اور نجارنی میں آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ پھر جب سلجوقیوں کا غلبہ ہوا تو قفقاز پر پانچویں صدی ہجری کے آخر تک ان کا تسلط قائم رہا۔ پھر جب سلجوقیوں کی حکومت کمزور ہوئی تو شمال کے عیسائیوں نے تفلیس پر پھر سے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ یہ صورتِ حال یونہی چلتی رہی، یہاں تک کہ منگولوں نے پورے عالم اسلام پر قبضہ کر لیا اور اپنی سفاکیت اور وحشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے ملک میں ہلاکت و بربادی کا بازار گرم کر دیا۔ 656ء میں بغداد پر قبضہ کرنے کے بعد بلادِ قفقاز کا رخ کیا۔ منگولوں نے یہاں بھی انسانیت سوز وحشیانہ مظالم کا ارتکاب کیا۔

جب منگولوں کی انتقامی و تخریبی کارروائیوں کا طوفان کچھ تھم گیا اور انہوں نے دیگر مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ کچھ نرمی کا برتاؤ کیا تو پھر اسلام، عیسائیت اور بودھ مذہب کے ماننے والوں نے ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مبلغین اسلام کو اس ضمن میں کامیابی ملی اور وہ منگولوں کی ایک بڑی تعداد کو اسلام کے دائرے میں لانے میں کامیاب ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ اسلام دشمن کی بجائے اسلام دوست کے مبلغ بن گئے۔ جب چنگیز خان کو اپنی موت کے قریب آنے کا احساس ہوا تو اس نے اپنی تاتاری حکومت کو اپنے چاروں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔

1۔ اجتائی۔ اس کے حصے میں مملکت کا مشرقی حصہ آیا، جس میں چین اور اس کے اطراف شامل تھے۔

2۔ چغتائی۔ مملکت کے وسطی حصے کا مالک بنا۔

3۔ باتو بن جوبی۔ اس کے حصے میں مغربی حصے کی بادشاہت آئی۔

4۔ تولوی۔ اس کے حصے میں بلادِ فارس آیا، جس کے اندر آگے چل کر ہلاکو خان نے ایشیا کے بڑے حصے کو شامل کر لیا۔

مملکت کے جنوبی حصے یعنی آذربائیجان کے علاقے پر تسلط کے لیے ان بھائیوں کے درمیان کشمکش ہوئی، جس نے منگولوں کی طاقت کو کمزور کر دیا اور پھر یہ وسیع سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہو گئی۔ پھر ان کے درمیان قفقاز کے علاقے پر تسلط کے لیے بھی جنگ ہوئی، اور ایک زمانے تک یہ علاقہ جنگ و جدل کا مرکز بنا رہا۔ یہاں تک کہ عثمانی سلطنت کے قیام کے بعد یہ سلسلہ بند ہوا اور یہ پورا علاقہ عثمانی سلطنت کے دائرے میں آ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی مملکت کے دائرے کو وسیع کرنے اور ہر طرح سے اسلام کی مدافعت کرنے پر عثمانی حکومت کا اہم رول رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنانِ اسلام عثمانی خلافت کو ختم کرنے کے درپے ہوئے۔ چیچنیا اور بلادِ قفقاز بھی عثمانی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ عثمانی سلطنت کی بھی یہ پالیسی رہی ہے کہ جب کبھی انہوں نے کسی علاقے

کو فتح کیا تو تعلیم وتربیت کی غرض سے وہاں جید علماء کی جماعت کو بھیجنے کا اہتمام کیا، تاکہ اس علاقے میں اسلام کی دعوت تیزی سے پھیل سکے۔ اسی طرح عثمانی سلاطین کی یہ روایت بھی رہی ہے کہ انہوں نے جس کسی ملک کو فتح کیا تو وہاں مساجد ومدارس کا جال بچھا دیا، جہاں اسلامی علوم وفنون کے ساتھ سائنسی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

روس اور مغربی ممالک کو اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی کم کرنے کی غرض سے ان علاقوں میں عیسائی مشنری بھیجنا شروع کیے، لیکن مغرب کی یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں۔ عثمانی سلاطین نے مسیحیت کو پھیلنے سے روک دیا، بلکہ الٹا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض عیسائی قبائل بھی اسلام کے دائرے میں آ گئے۔

لیکن روس چیچنیا میں عیسائیت کو فروغ دینے کی کوششوں سے باز نہیں آیا، بلکہ عسکری اور فوجی مہمات کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ چنانچہ روس نے 1850ء میں چیچنیا پر پوری طرح قبضہ کر لیا، اس نے طاقت کے زور پر حکومت شروع کی۔ چونکہ یہاں کے عوام کی اکثریت مسلمان تھی، اس لیے اسلام اور مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ چیچنیا کے شہروں اور دیہات میں موجود تمام مساجد کو مسمار کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر دارالسلطنت غروزنی سے قریب ایک شہر بیفورونی میں متعدد مساجد، خانقاہوں اور اجتماعی عبادت کے دیگر مقامات کو روسی حکومت نے بند کر دیا۔ مساجد اور مدارس کو بند کرنے اور ان کو مسمار کرنے کا یہ سلسلہ 1943ء تک چلتا رہا۔ انہوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو سائبیریا ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن مساجد کی تالابندی اور جبری جلاوطنی نے چیچنیا کے مسلمانوں کے عقائد میں کوئی کمزوری پیدا نہیں کی، بلکہ ان کی ایمانی قوت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی دینی عقائد اور اسلامی شعائر کی حفاظت کی۔ روسی حکمرانوں نے جب یہ دیکھا کہ اس طرح کی تادیبی کارروائیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے یہاں کے جلاوطن (مہاجر) باشندوں کو 1978ء میں وطن واپس آنے کی اجازت دے دی، لیکن اس وقت یہاں پورے ملک میں کوئی ایک مسجد بھی نہیں رہ گئی تھی۔

1978ء میں سائبیریا کی جبری جلاوطنی سے واپس آنے کے بعد مسلمانوں نے ازسرنو مساجد کی تعمیر کا آغاز کیا۔ انتہاپسند اشتراکیت نے جن مساجد کو مسمار کر دیا تھا، ان کو ازسرنو تعمیر کیا گیا۔ وہ پھر اپنے علماء کے گرد جمع ہونے لگے، جنہوں نے حکومت کے مظالم کی پروا نہ کرتے ہوئے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ روسی حکومت نے صوفیا کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے ابتدا میں صرف دو مسجدیں کھولنے کی اجازت دی۔ پہلی مسجد شہر بدیفوردنی میں اور دوسری سورہوہی میں کھولی گئی۔ پھر شہر نوفیہ میں پانچ مسجدیں کھولنے کی اجازت دی گئی اور مسلمانوں کو صرف ان مساجد کی حدود تک دینی شعائر ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے باوجود روسی حکمران اگر کسی عالم کو مقبول ہوتا دیکھ لیتے تو اسے کسی نہ کسی الزام میں جیل میں بند کر دیتے یا اسے قتل کرا دیتے۔ مسلمانوں کے متعلق روسی حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ یا تو وہ عیسائیت قبول کر لیں یا پھر تہذیبی اعتبار سے روسی کلچر کو اختیار کر لیں۔ خلاف ورزی کی صورت میں ان کو معاشی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا جاتا یا ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ اسلام سے مرتد ہونے والوں کے لیے خصوصی مراعات دی گئیں۔ ان کو تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ انہیں فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر

دیا جاتا۔ ان کے بچوں کی تعلیم و کفالت کا انتظام حکومت کے سپرد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ساتھ سختی برتی جاتی۔ ان کے لیے کوئی رعائت نہ تھی۔ بچوں کو ان کے والدین سے الگ کر کے دور دراز شہروں میں بھیج دیا جاتا۔ سرکار نے اوقاف کی تمام املاک پر قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کی تعلیم میں حکومتِ روس کی مداخلت

روسی حکومت نے چیچنیا کے مسلمانوں کے نظام تعلیم میں بھی مداخلت کی۔ نصاب تعلیم سے دینی مضامین کو خارج کر دیا اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ نئی نسل اسلام اور اسلامی تعلیمات سے پوری طرح نابلد ہو جائے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے عربی زبان کے استعمال پر پابندی عائد کر دی، کیونکہ یہ قرآن کی زبان تھی۔ اس کی جگہ روسی زبان کو مسلط کر دیا، اور ہر طرح کی ملازمت کے لیے روسی زبان میں مہارت کو لازمی قرار دیا۔ عربی رسم الخط میں مقامی زبان لکھنے پر بھی پابندی تھی۔ خلاف ورزی کی صورت میں سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ ملک کے تمام قرآنی مدارس بند کر دیے گئے۔ حفظ و تجوید سب ختم ہوئے۔ پورے قفقاز میں چیچنیا سمیت صرف دو مدرسے باقی رہ گئے۔ ایک بخارا میں اور دوسرا تاشقند میں، جہاں تیس سے چالیس طلبہ کو ہر سال تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔

اسلام کو ختم کرنے کی روسی حکومت کی ان تمام کوششوں کے باوجود چیچنیا کے مسلمانوں نے عربی زبان اور اسلامی تہذیب کو ختم نہیں ہونے دیا، بلکہ علمائے دین نے خفیہ طور پر عربی زبان، قرآن، حدیث اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تعلیم کا انتظام کیا، اور نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کی۔ ان کو قرآن کی زبان سکھائی اور روسی حکومت کے ناپاک ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

روسی حکمرانوں نے پیداوار کے تمام وسائل پر قبضہ کر لیا۔ چیچنیا کے کاشت کاروں کو ان کی فصل کی پیداوار سے محروم کر دیا۔ ان کے ساتھ غلاموں کا سلوک کیا۔ کاشت کار لوگ سرکاری حکام کی مرضی کے مطابق کاشت کرتے اور جب فصل تیار ہو جاتی یا پھل پک جاتے تو روسی حکام تمام پیداوار لے جاتے اور کسانوں کے لیے بس اس قدر چھوڑتے کہ سانس کا رشتہ باقی رہے۔ یہاں کی زمین کافی زرخیز اور معدنیات سے بھرپور ہے۔ یہاں پٹرول، سونا، چاندی اور لوہا وغیرہ کے قیمتی معدنی ذخائر موجود ہیں، جس کو روس نے اپنی اقتصادی ترقی کے لیے خوب استعمال کیا۔ اگر کوئی کاشت کار اپنی غربت اور بدحالی کی شکایت کرنے کی جرأت کرتا تو اس کی سزا موت ہوا کرتی تھی۔ مقامی بازاروں پر روسی فوجوں کا قبضہ ہوتا۔ لہٰذا انسان وہی سامان خرید سکتا تھا جو ان کے لیے متعین تھا، اور وہی چیز کھا سکتا تھا جو ان کے لیے مخصوص کر دی گئی ہوتی۔ وہ اپنی ضرورت، مرضی اور خواہش کے مطابق کوئی چیز نہیں خرید سکتا تھا۔

علماء کرام کی خدمت

ابتدا ہی سے علماء نے روسی سامراج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور بعض اہم کامیابیوں سے بھی ہمکنار ہوئے۔ روسی سامراج کے خلاف اس طرح کی مقابلہ آرائیوں کی قیادت شیخ منصور نے کی اور 1785ء میں انہوں نے روسی فوج کا زور ختم کر دیا۔ 1787ء میں قرم میں دولتِ عثمانیہ اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ امام منصور روسی فوجیوں پر خفیہ حملے کر کے ان کے حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے، جس کی بدولت دولت عثمانیہ کی اسلامی

فوجوں کو شیخ منصور کی فوجوں کے ساتھ ملنے کا موقع مل گیا اور اس کے بعد روسی فوجوں کو باقی علاقوں سے بھی اپنی حصار بندی کو اٹھانے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ امام منصور اپنی فوجوں کے ساتھ برابر جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ 1791ء میں ان کو قید کر لیا گیا۔ سپیشل کورٹ نے ان کو عمر قید کی سزا دی۔ 1793ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

روسی سامراج کے خلاف قاضی القضاۃ ملا محمد کمراوی نے بھی زبردست فوجی معرکہ آرائی کی، یہاں تک کہ دین وملت کی حفاظت کرتے ہوئے 1834ء میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کے بعد ان کے شاگرد حمزہ خزاتی نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اپنے ملک کو روسی سامراج سے آزاد کرانے کے ضمن میں متعدد معرکوں میں حصہ لیا، یہاں تک کہ 1835ء میں شہید ہو گئے۔

ملا محمد کمراوی کے دوسرے شاگرد شیخ محمد شامل (جو امام شامل کے نام سے مشہور ہیں) بھی ایک ماہر فوجی کمانڈر، بے مثل قائد اور زبردست مجاہد آزادی تھے۔ وہ دشمن کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ان کے ارادوں اور سازشوں کو بھانپ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے جنگی منصوبوں اور شاندار کامیابیوں کے ذریعے دشمن کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ امام شامل نے روسی فوجوں سے معرکہ آرائی کے دوران بار بار نصرت و کامیابی کے پرچم لہرائے۔ انہیں "شیر قفقاز" کہا جاتا ہے۔

امام شامل کے رفقاء میں حاجی مراد کا نام بھی قابل ذکر ہے، جن کی دلیری اور شجاعت پر ٹالسٹائی نے ایک ناول لکھا تھا، جس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ حاجی مراد کو پانچ سو شہسواروں کے ساتھ "اوان صقول" میں قلعے کے اندر محفوظ روسی فوجوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ یہ مرد مجاہد اپنے شیر صفت نوجوانوں کے ساتھ کسی طرح قلعے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں موجود دشمنوں کو اپنی تلواروں کی نوک پر لے لیا۔ دشمنوں میں کوئی نہیں بچا، مگر جس نے اپنی جان کی امان طلب کی۔

امام شامل اور ان کے رفقاء پچیس سال تک مسلسل روسی فوجوں سے لڑتے رہے، اور جب اس کے اسلحہ و بارود کے ذخائر ختم ہو گئے تو وہ پہاڑوں کی طرف نکل گئے اور پھر یہاں سے روسی فوج سے لڑتے رہے۔

چیچنیا کے خلاف روس کی موجودہ جنگ

1990ء میں سوویت یونین کی تحلیل ہو گئی۔ اس میں شامل مسلم ممالک نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہر مملکت نے اپنے مستقبل سے متعلق سوچنا شروع کیا اور انہوں نے کامل آزادی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بعض مملکتوں کی طرح چیچنیا نے بھی فوری طور پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ 25 نومبر 1990ء کو یہاں کے باشندوں نے ایک عوامی قومی کانفرنس منعقد کی جس میں چیچنیا اور انگوشیا کے تمام افراد کے نمائندے موجود تھے۔ کانفرنس نے چیچنیا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ پارلیمانی طرز حکومت کی سفارش کی۔ جنرل جوہر دودائیف نے روسی فوج سے استعفیٰ دے دیا اور چیچنیا کی عوامی کانفرنس متین کے صدر ہو گئے اور پھر اپنی پوری زندگی چیچنیا کے عوام اور یہاں کی سرزمین کی مطلق آزادی کے لیے وقف کر دی اور بار بار کہا کہ سابق سوویت یونین سے الگ مستقل اسلامی جمہوریہ چیچنیا کے قیام کا وقت آ گیا

چیچنیا کی جانب سے کامل آزادی کا اعلان سنتے ہی روسی حکومت پاگل ہوگئی۔ مسلمانوں سے خلاف ان کی دیرینہ دشمنی اور بغض ونفرت عود کرآئی اور اس نے طے کیا کہ یہ جمہوریہ روس کے ماتحت رہے گی۔ روس نے اس مملکت کے وجود میں آنے سے قبل ہی اسے ختم کردینے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے لیے درج ذیل اقدامات کیے

1۔ انگوشیا کے عوام کو چیچنیا سے الگ ہوجانے کی ترغیب دی۔

2۔ چیچنیا کے عوام کا سیاسی طور پر محاصرہ کیا۔

3۔ چیچنیا کی سرحدوں پر کثیر تعداد میں روسی فوج کو تعینات کردیا۔

4۔ جنرل دودائیف کی حکومت کی مخالف پارٹی کی مدد کی۔

5۔ فوجی مداخلت شروع کردی۔

روس نے چیچنیا کی آزادی اور خودمختاری کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ صدر بورس یلسن نے 18 نومبر 1991ء کو ایمرجنسی کا اعلان کردیا۔ دو ہزار روسی سیکیورٹی فورس کو چیچنیا میں اتار دیا، تاکہ ان کی آزادی کو کچل دیا جائے اور یہ ملک ایک بار پھر روس کے ماتحت ہوجائے، لیکن چیچنیا کے مجاہدین نے اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ انہوں نے حملہ آور روسی فوجوں کا محاصرہ کرکے ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا اور ان کو قیدی بنالیا۔ کچھ دن کے بعد یہ فوجیں روس واپس چلی گئیں۔

روس نے 15 اکتوبر 1994ء کو حزب اختلاف کی مدد کرنے کے بہانے فوجی مداخلت کی کوشش کی۔ 26 نومبر 1994ء کو جدید ترین اسلحے اور ساٹھ بھاری ٹینکوں کے ساتھ داخل ہوگیا۔ دوسری طرف صدر دودائیف کی قیادت میں اسلامی فوجیں صف آرا ہوگئیں اور روسی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی۔ ان کے 35 ٹینک تباہ ہوگئے اور باقی پر اسلامی فوجوں کا قبضہ ہوگیا، لیکن فوجی حملوں کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔

چیچنیا کی بڑھتی ہوئی طاقت روس کے لیے مزید پریشانی کا سبب بن گئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس ملک کی آزادی کے بعد قفقاز کی دیگر اسلامی سلطنتیں بھی آزادی وعلیحدگی کا اعلان کردیں گی۔ پھر یہ تمام علاقے تیل، سونا، چاندی، لوہا جیسی بیش قیمت معدنیات سے مالا مال تھے۔ روس کسی قیمت پر بھی چیچنیا کی آزادی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ روس کی طرف آذربائیجان اور دیگر ملکوں سے سپلائی ہونے والے تیل کے پائپ بھی چیچنیا سے ہوکر ہی گزرتے تھے۔ روس اس چھوٹی سی ریاست کو اس بات کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا کہ اس کے تیل کے کنوؤں اور پائپ لائنوں پر اس کا قبضہ ہوجائے۔

آذربائیجان اور قفقاز کے دیگر علاقوں کو روس سے ملانے والی ریلوے لائن بھی چیچنیا سے ہوکر گزرتی تھی اور چیچنیا کی آزادی کی صورت میں اس ریلوے لائن پر اس کا قبضہ ہوجاتا۔

روس کے اکثر ایٹمی [illegible] اسٹیشن بھی چیچنیا ہی میں تھے۔ جہاں سے روس [illegible] کو بجلی سپلائی ہوتی تھی۔ سوویت یونین کی تین [illegible] ریڈ انڈین کا بہت بڑا [illegible] کا ذخیرہ تھا جس پر 1991ء کے بعد چیچنیا نے قبضہ کرلیا۔

ان تمام اسباب وعوام کے پیش نظر روسی صدر بورس یلسن نے چیچنیا کے خلاف فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا۔

روسی وزیر دفاع گراشوف نے چیچنیا کے خلاف روسی جنگ کا اعلان کر دیا۔

9 جنوری 1995ء کو روسی فوجیں اپنے جنگی طیاروں اور بھاری ٹینکوں کے ساتھ حرکت میں آ گئیں۔اور دارالحکومت غروزنی پر سخت حملے کیے لیکن مجاہدین کے سامنے شکست کا سامنا ہوا۔

امریکی صدر بل کلنٹن نے روس کے حق میں بیان دیتے ہوئے اعلان کیا کہ چیچنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ روس کا داخلی معاملہ ہے۔

21 اپریل کی شب کو غروزنی شہر سے 35 کلومیٹر دور ایک قصبے میں روسی فضائیہ کی زبردست گولہ باری سے بلاد قفقاز کا مایہ ناز قائد، صدر جنرل دودائیف نے جام شہادت نوش کیا۔روس نے چیچنیا میں بڑے پیمانے پر باقاعدہ فوجی مداخلت کا فیصلہ امریکا اور برطانیہ سے مشورے کے بعد کیا۔سوال یہ ہے کہ امریکا، برطانیہ اور روس کو اس چھوٹے سے اسلامی ملک کی آزادی سے کیا خطرہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ آج مغرب نے اسلام کو اپنا سب سے بڑا دشمن مان لیا ہے۔ درخصوصاً امریکا نے تو ''تہذیبوں کے تصادم'' کے حوالے سے بزعم خود صلیبی جنگ کا آغاز کر رکھا ہے۔لیکن کشمیر، فلسطین، فلپائن، بوسنیا اور چیچنیا کے مجاہدین ہر مورچے پر ان کا مقابلہ دلیری اور شجاعت سے کر رہے ہیں۔ان شاء اللہ تمام سازشوں اور حربوں کے باوجود آخرکار فتح مجاہدین کی ہوگی۔

بتانِ رنگ و بو توڑ کر ملت میں گم ہو جا!

جولائی 1920ء کی ایک صبح فرانس کا جرنیل، ہنری گورو اپنی فوج کے ساتھ دمشق میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا جامع امیہ کے پہلو میں واقع باغ میں پہنچا جہاں سلطان صلاح الدین ایوبی کا مقبرہ موجود ہے۔ اس نے اپنے فوجی بوٹ قبر پر مارے اور چلایا "صلاح الدین! اٹھو، ہم واپس آ گئے ہیں۔ یہاں ہماری موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ صلیب کو ہلال پہ فتح حاصل ہو چکی۔"

اسی زمانے میں جب برطانوی جرنیل، ایلن بی نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو اس نے بھی کہا "آج صلیبی جنگیں لڑنے والوں کی خواہشیں پوری ہو گئیں۔" گو مغربی منافقت کے عین مطابق کچھ عرصے بعد جنرل ایلن بی نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا "یروشلم ہم نے جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے فتح کیا، اس میں مذہبی جذبہ یا انتقام شامل نہیں تھا۔"

سچ یہ ہے کہ مغرب ان منہ توڑ شکستوں کو آج تک نہیں بُھلا پایا جو اسلامی دور کے آغاز میں اسے مسلمانوں نے دی تھیں۔ یہی وجہ ہے، جب مغرب کی خفیہ سازشوں اور کچھ اپنی کوتاہیوں کے باعث امتِ مسلمہ زوال پذیر ہوئی تو مغربی قوتوں کا ایجنڈا بن گیا کہ عالم اسلام کو کبھی متحد نہیں ہونے دینا—— یہ ان کا سب سے بڑا کابوس ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو منتشر کرنے کی خاطر انھیں کئی ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ افتراق آج بھی اسی طرح چلا آ رہا ہے۔

عالم اسلام پہ حملہ آور مغربی قوتیں جدید اسلحے سے لیس تھیں۔ اس کے باوجود انڈونیشیا سے لے کر موریطانیہ اور صومالیہ تک سینکڑوں مجاہدین و مصلحین نے بے سروسامانی میں نو آبادیاتی طاقتوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ یہی نہیں، انھوں نے احیائے اسلام کے لیے بھی بھرپور کوششیں کیں تاکہ دنیا بھر میں پھیلے مسلمان اسلامی جھنڈے تلے متحد و طاقتور ہو جائیں۔

سید قاسم محمود مرحوم کی کتاب میں انہی مسلم رہنماؤں، مجددین، مجاہدین اور مصلحین کا تذکرہ ہے جو اپنے اپنے زمانے میں احیائے دین کی مساعی جمیلہ کرتے رہے اور مغربی طاقتوں سے بھی جا ٹکرائے۔ ان میں سے بہت سوں نے اپنی جان قربان کر دی مگر دین و امت پہ آنچ نہ آنے دی۔ احیائے اسلام کی یہ عظیم تاریخ بیان کر کے مرحوم نے گویا قلم کی حرمت کا حق ادا کر دیا۔ ان فرزانوں کی داستانیں آج بھی ان مسلمانوں کو ولولہ تازہ بخشتی ہیں جو دورِ جدید کی نو آبادیاتی قوتوں سے نبرد آزما ہیں۔

اوریا مقبول جان